



۱۳ ۱۴ ۱۵

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

خدا بخش لائبریری



۱۳ ۱۴ ۱۵

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

رجسٹریشن نمبر ۳۳۴۲۴/۷۷

تیرھواں، چودھواں اور پندرھواں شمارہ

۱۹۸۰ء

اس سہ ماہی مجلّے میں انگریزی، اردو، فارسی یا عربی میں ایسے مضامین شائع ہوں گے جو خدا بخش لائبریری کے نادر مواد پر مبنی ہوں، یا لائبریری سے کسی نہ کسی قسم کا تعلق رکھتے ہوں۔

قیمت : ۴۵ روپے

سالانہ زرِ خریداری:
اندرونِ ملک : ۶۰ روپے
پاکستان : ۱۲ ڈالر
یوروپ : ۸ پونڈ
امریکا اور دیگر ممالک : ۲۴ ڈالر

محبوب حسین نے برقی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، دہلی میں چھپوا کر خدا بخش لائبریری، پٹنہ سے شائع کیا

پیارے لال شاکر

کے

ماہنامہ

العصر

(۱۹۱۳ - ۱۹۱۷ء)

کا انتخاب

خدا بخش لائبریری، پٹنہ

۱۹۸۰ء

العصر کے اس انتخاب میں شامل لکھنے والے اور تصویر والے

اشاریہ

●●

پیش گفتار

پیارے لال شاکر میرٹھی باشندہ میرٹھ، شاگرد حضرت شوکت میرٹھی، مذہباً عیسائی... مدتوں منشی نوبت رائے نظر سے دوستی اور رفاقت رہی اور کلام میں بھی ان سے مشورہ کرتے رہے[1]۔

پیدائش میرٹھ میں ۱۳ مارچ ۱۸۸۰ء کو ہوئی، ۲۰ فروری ۱۹۵۶ء کو وفات پائی۔ قبر پہاڑ گنج دہلی کے مسیحی قبرستان میں ہوئی[2]۔

جوانی اور ادھیڑ عمر میں لکھنؤ میں رہے اور آخر عمر دہلی میں دریا گنج دہلی کے محلہ کلاں محل میں واقع مسیحی بستی میں گزری۔ (اس انتخاب میں لکھنؤ کے العصری عہد کی ایک تصویر کے ساتھ آخر عمر کی ایک تصویر مسٹر تھامس کی عنایت سے شائع کی جا رہی ہے)۔

انگریزی، اُردو، فارسی پر عبور تھا اور سنسکرت اور ہندی سے واقف تھے۔ "میگھ دوت" کا ترجمہ ان کی یادگار ہے۔ آخر میں مسیحی لٹریچر کی طرف توجہ تھی اور پادری اسٹیورڈ کے ساتھ مدتوں یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ بہت سے مضامین لکھے، بہت سے ترجمے مسیحی دعاؤں اور نغمات حمد کے بھی کیے۔ ایک رسالہ "کوہِ نور" بھی نکالا تھا، اور میتھوز لائل کے ساتھ مل کر ایک رسالہ "زندگی" بھی مدت تک نکالتے رہے[2]۔

اولاد میں ایک بیٹا مہندر کمار تھا، جو بچپن ہی میں گھر سے نکل گیا تھا اور پھر اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ ایک بیٹی پریم لتا ہیں، یہ پونہ کے مسٹر ایل۔ ڈبلیو تھامس کی بیوی ہیں۔ بڑی بیٹی پربھاوتی کی شادی بمبئی میں ماسٹر علی بخش سے ہوئی تھی۔ ان کی تین لڑکیاں تھیں، خورشید، مینا کماری اور مدھو[2]۔

الہ آباد کا ماہنامہ "ادیب" اور لکھنؤ کا ماہنامہ "العصر"، اُردو کے دو چوٹی کے رسالے تھے، جن سے شاکرؔ کا نام وابستہ ہے۔ "ادیب" انڈین پریس الہ آباد کا پرچہ تھا۔ یہ جنوری ۱۹۱۰ء میں نکلا اور ساڑھے تین سال چل کر جون ۱۹۱۳ء کا پرچہ نکل کر بند ہو گیا۔ ایک سال چار ماہ نوبت رائے نظر اس کے ایڈیٹر رہے، ان کے بعد ایک سال آٹھ ماہ پیارے لال شاکر نے مرتب کیا اور آخری چھ مہینے حسیر عظیم آبادی نے۔

انڈین پریس کی ملازمت چھوڑنے کے بعد شاکر نے "العصر" کے نام سے اپنا ذاتی پرچہ نکال کر "ادیب" کی پیاس بجھائی۔ مارچ ۱۹۱۳ء میں اس کا پہلا شمارہ نکلا اور دسمبر ۱۹۱۷ء میں آخری۔ کاغذ، کتابت اور طباعت کے ساتھ ساتھ مشتملات کا وہ اعلیٰ معیار جو "ادیب" کو چھوڑ کر کسی دوسرے اُردو پرچے میں کم ہی مل سکے گا ذاتی پرچہ ہونے کے باوجود "العصر" نے برقرار رکھا، یہ غیر معمولی بات ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مضامین کا تنوع اور خالص ادب کے ساتھ ساتھ سماجی اور سائنسی علوم پر متوازن زور بھی اسی انداز پر قائم رہا۔

یہ **العصر** کے اٹھاون شماروں کا انتخاب ہے، جو پانچ سال (مارچ ۱۳ء تا دسمبر ۱۷ء) پر پھیلا ہوا ہے۔ اس انتخاب میں ۳ تحریریں "العصر" کے تعارف کے طور پر، ۳۲ مشاہیر کی نادر عکسی تصویریں، ۹ مشاہیر کی تحریریں (ابو الکلام آزاد، عبداللہ عمادی، ندرت میرٹھی، رشید احمد صدیقی، عبدالماجد دریابادی، شرر، نادر کاکوروی اور اقبال اور حالی) ۱۳ مشاہیر پر تفصیلی مضامین اور ۹ نظمیں، ۱۵۰ مضامین اور ۳ نظمیں اُردو زبان کے

۱۔ خمخانۂ جاوید (ج ۴) ۱۹۲۶ء ۲۔ پیارے لال شاکر کے داماد مسٹر ایل۔ ڈبلیو تھامس کے خطوط سے ماخوذ۔

مسائل پر، ۵ تحریریں غالب کے بارے میں، ۴ مضامین اسلام، ہندوئت، پارسیت کے تحت علمی و فنی ترقیوں پر، ۳ مضامین علوم و فنون پر، ۳ تاریخ ہند پر، ۵ ایتھے، ۵ مضامین مذہبی عقائد و افکار پر ——— اور ۸ ا مضامین فلسفہ و سائنس اور صنعت و حرفت پر ہیں۔

یہ سب وہ تحریریں اور تصویریں ہیں جو 'العصر' کے سوا شاید کہیں اور نہ ملیں گی۔ **تصاویر میں :** پیارے لال شاکر، مظہر الحق، رابندر ناتھ ٹیگور، سروجنی نائیڈو، گھوشال، تعشق، اوج گیاوی، رشید احمد ارشد، فیروز الدین مراد، اور مانی جائسی کی یہ تصاویر کسی دوسری جگہ مشکل ہی سے ملیں گی۔ **ابوالکلام آزاد** کے یہ مضامین کسی دوسری جگہ شائع نہیں ہوئے۔ عبداللہ عمادی، ندرت میرٹھی اور رشید احمد صدیقی کے مضامین اپنے مصنفوں کی طرف نسبت کے سبب اہمیت رکھتے ہیں۔ ایشور چند ودیا ساگر پر اردو میں اتنا طویل مضمون کسی دوسری جگہ اتفاق ہی سے مل سکے گا۔ عماد الملک، نصیر حسین خیال، حالی، تعشق لکھنوی، بیان یزدانی میرٹھی، مضطر خیرآبادی، نظر لکھنوی اور نولکشور کے وارث پراگ نرائن کے بارے میں معاصرانہ شہادت کی اہمیت رکھنے والی ایسی تحریریں کسی دوسری جگہ کم ملیں گی۔ **اُردو زبان** کی ترقی کے مسائل اور اُردو صحافت کے بارے میں ۱۹۱۴ء کے آس پاس کی صورت حال پر کچھ اتنا مواد خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ مرزا غالب کے بارے میں اس رسالے میں منظوم و منثور جو بھی کام کی چیز نظر آئی انتخاب میں لے لی گئی ہے۔ اقبال کی ایک نظم 'درد عشق' کا بھی نقش اول 'العصر' میں مل جاتا ہے۔ زبان اُردو اور اکابر ہندوستان کے بارے میں منظومات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی نادر کاکوروی اور حالی کی دو نادر نظمیں بھی منتخب کر لی گئی ہیں۔ مع بعد زبان اور صحت زبان کے مسائل پر تبصروں کے ذیل میں یا عام مضمون کے طور سے جو تحریریں قابل توجہ نظر آئیں انھیں لیا گیا ہے۔ پھر اسلام، ہندومت اور پارسیت کے بارے میں چند علمی دلچسپی کے حامل مضامین کے ساتھ تحریر، جادہ اور ہندسہ کی تاریخ پر مضامین منتخب کئے گئے ہیں۔ تین مضمون، تاریخ ہند کے بارے میں ہیں۔ پانچ تحریریں ایتھے کے طور سے ہیں۔ پھر حکمت و اخلاق (مذہبی افکار) اور اس کے بعد فلسفہ و سائنس پر سب سے بھاری بھر کم حصۂ مضامین ہے، جو صنعت و حرفت پر ختم ہو گیا ہے۔ آخر میں تمام مجلدات کی فہرست مضامین بھی تمام و کمال دے دی گئی ہے۔

لکھنے والوں میں کچھ تو معروف نام ہیں: فضل حق آزاد، ابوالکلام آزاد، حالی، شرر، بشیر الدین احمد دہلوی، (نذیر احمد کے لڑکے) بے، آر، رائے (لاہور کے جرنلسٹ)، قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی، رشید احمد صدیقی، عبدالماجد دریابادی، سید جالب دہلوی، تیرتھ رام فیروزپوری، حکیم حبیب الرحمن (ڈھاکہ)، سید حسن برنی (صاحب البیرونی)، آغا رفیق بلند شہری۔ شمس اللہ قادری، ضیاء الدین احمد برنی (عظمت رفتہ وغیرہ کے مصنف)، سید محمد یوسف قیصر بھوپالی، شفق عماد پوری، مانی جائسی، نادر کاکوروی، ندرت میرٹھی، نواب ذوالقدر جنگ رشید احمد ارشد تھانوی، فیروز الدین مراد (علی گڑھ یونیورسٹی کے طبیعیات کے پروفیسر)، مرزا سلطان احمد (مرزا غلام احمد قادیانی کے بھائی)، موہن لال فہیم لکھنوی (ناول نگار) آرسی دت (مشہور مورخ)، رام رچھپال سنگھ شیدا دہلوی (دہلی سے ایک گلدستہ نکالتے تھے)۔

کچھ لکھنے والے وہ ہیں جو عام طور سے تو معروف نہیں لیکن ادیب، زمانہ، اور العصر میں مستقلاً لکھتے تھے، یعنی عبدالخالق خلیق دہلوی، سید محمد فاروق شاہ پوری، قطب الدین خاں راقی، لطافت حسین خاں، محمد ابراہیم خاں تجلی۔

کچھ نام بالکل غیر معروف ہیں یعنی بیدھنگر دلی، نوشتر منگر دلی، عشقی، قمر، ولی الدین چشتی، کیول سنگھ، سید ابراہیم محب، محفوظ الحق احسن، یوسف قریشی، ضیا، عباس بدایونی — ناظر، انجمن دوست، نقاد سخن اور سید القلم غالباً عبدالماجد دریابادی اور نظر لکھنوی کے قلمی نام ہیں۔

اس انتخاب کی اشاعت اُردو علوم و ادبیات کے ارتقا میں ایک بھولی بسری کڑی کی بازیافت ہے۔ ایسی بازیافتوں سے ماضی میں بھرا ؤ آجاتا ہے اور مستقبل کے لیے اعتماد اور حوصلہ مندی۔

عابد رضا بیدار ●●

فہرست

مشاہیر کے بارے میں

غلط نامہ

- ص ۲ کا آخری لفظ 'جو'، ص ۶۶ پر عنوان کے نیچے کا ہندسہ '(۱)' ص ۱۱۷ کا زیریں حصہ 'اساتذہ اُردو کی فارسی شاعری'، ص ۲۳۴، ۲۳۸-۳۹، ۲۳۹، ۲۴۵-۴۶، ۲۴۹، ۲۵۱-۵۲، ۳۵۳، ۳۶۱، ۴۴۲، ۴۹۰، ۵۳۴ پر پیشانی کے عنوانات رواں ـــــ اور' ص ۴۲۹، ۴۷۱، ۴۹۸، ۵۱۶، ۵۳۵، ۵۵۷ پر رسالہ کا نام 'العصر' نظرانداز/ قلم زد کر دیے جائیں۔
- ص ۴۹۲-۹۷ کا مضمون 'سادگی' انشائیے کے سیکشن میں شمار کی جائے۔ ص ۲۴۱-۴۲ پر دو لخت نظم 'زبانِ اُردو' کو مسلسل سمجھا جائے۔
- ص ۵۸۰ پر 'فہرست مضامین' کے بعد 'جلد اوّل' اور ص ۵۸۲ پر 'جلد دوم' بڑھایا جائے۔
- کتابت کے اغلاط : ص ۳۰۹ / سطر ۱۱ 'شہر پور' کی جگہ 'شہریور' پڑھا جائے۔

برقی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج نئی دہلی میں طبع ہوئی۔



پیارے لال شاکر میرٹھی
ایڈیٹر ادیب و العصر

ادب اُردو کا ماہوار باتصویر رسالہ

العصر

مرتبہ

پیارے لال شاکر (میرٹھی)

جلد اوّل

مارچ لغایت جولائی ۱۹۱۳ء

جس مین

ساٹھ سے زائد نامور اہل قلم کے تقریباً پچاسی مضامین

پونے تین سو صفحات مین درج ہین

اور

تیس نایاب و نادر تصاویر شامل ہین

مقام اشاعت دفتر "العصر" لکھنؤ

العصر کے قواعد

یہ باتصویر ماہوار رسالہ جو اردو علم ادب کی ترقی کا اعلیٰ نمونہ ہی ہر ماہ کے آخر مین لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے۔ ملک کے نامور اہل قلم، مُسلّم الثبوت اساتذہ اور بہترین انشاپردازاِسے وقیع، دلچسپ اور مفید بنانے مین سرگرم ہین۔ مضامین کی نوعیت ایسی ہی جو ہر طبقہ کے لیے دلچسپ ہو۔ کوشش کیگئی ہے کہ اس کے مضامین نثر ہون خواہ نظم، تعلیم یافتہ مستورات کے لیے بھی اُسی قدر دلچسپ، مفید اور خوشگوار ثابت ہون جسقدر تعلیم یافتہ اصحاب اور بالغ نظر حضرات کے لیے۔

اسکی ضخامت ۵۶ صفحات ہوتی ہی اور صفحہ مین دو کالم ہونے کی وجہ سے اسمین معمولی تقطیع کے ایک سو صفحات سے زائد گنجائش رکھی گئی ہی۔ اس کے علاوہ ہر ماہ التزاماً ایک رنگین اور متعدد عکسی تصاویر دی جاتی ہین جنمین مشہور مصورونکی صناعی کے نمونے، مشاہیر حضرات کے فوٹو، تاریخی عمارات کے نقشے، اور دیگر دلچسپ واقعات کے مرقعے ہوتے ہین۔ بعض تصاویر کے متعلق مشہور شاعرونکی نظمین بھی حاصل کی جاتی ہین جو تصویر کی دلکشی کو دوبالا کر دیتی ہین۔ قدردانون کی ترقی کے ساتھ ساتھ اسکے حجم اور تصاویر کی تعداد مین اضافہ ہوتا رہیگا۔

تصاویر کے علاوہ اسکی لکھائی چھپائی مین بھی اعلیٰ درجے کا اہتمام کیا جاتا ہی اور قیمتی کاغذ پر نہایت صفائی کے ساتھ تصاویر چھاپ کر اسمین اضافہ کیجاتی ہین جو اسکی مقررہ ضخامت سے علٰحدہ ہوتی ہین۔ بہر نوع قدردانانِ علم ادب کے لیے ایسا پرچہ مہیا کیا گیا ہی جو کمی قیمت کے ساتھ انگریزی میگزینون سے مشابہ ہی۔

اسکی سالانہ قیمت للعہ مع محصول ہی۔ اس قیمت مین ان خصوصیات کے ساتھ کوئی پرچہ نہین مل سکتا بلکہ اس ارزانی کے ساتھ اسقدر تصاویر بھی کہین دستیاب نہین ہو سکتین۔ نظر برین معزز ناظرین رسالہ سے استدعا ہی کہ اگر یہ خدمات قابل قبول ہون تو علاوہ ذاتی قدردانی کے اسکی توسیع اشاعت مین بھی حتی الامکان امداد فرمائین۔

خریداری کے لیے پیشگی قیمت آنا ضروری ہی۔ نمونہ مفت نہین بھیجا جائے گا بلکہ ۸ر وصول ہونے یا ویلیو پے ایبل کی اجازت آنے پر ارسال ہوگا۔ نام اور پتہ صاف اور خوشخط لکھا جائے تاکہ پرچہ پہنچنے مین دقت نہ ہو۔

اس رسالہ مین مذہبی مباحث اور موجودہ پالٹیکس پر کوئی مضمون نہ چھاپا جائیگا۔ نا تمام مضامین بھی نہین لیے جائینگے۔ جس مضمون کے ساتھ تصویر کی ضرورت ہو اُسکا مضمون نگار حضرات خود بندوبست فرمائین۔

طلباء اور کم استطاعت اصحاب کے لیے "العصر" کا ایک سستا ایڈیشن بھی شائع ہوتا ہی۔ اسمین صرف ایک تصویر ہوتی ہی اور کاغذ ایوری فنش کے بجائے دیسی استعمال کیا جاتا ہی۔ اسکی سالانہ قیمت ؏ مع محصول ہے۔

جملہ خط و کتابت پتہ ذیل پر ہونی چاہیے:

پیارے لال شاکر (میرٹھی) مالک و ایڈیٹر رسالہ العصر۔ لکھنؤ

ایڈیٹوریل

کچھ اپنی نسبت

توکل علی اللہ العصر کا پہلا نمبر پیش ناظرین کیا جاتا ہے۔ مضامین کے لحاظ سے ملک خواہ کچھ ہی راے قائم کرے، اسکو اختیار ہے، مگر ہم درخواست کرتے ہین کہ سب سے پہلے اُس تمہیدی مضمون کو جسمین کسی حد تک توضیح مقاصد کی گئی ہے، ملاحظہ فرما لیا جائے کہ العصر کے ذریعہ سے کن خدمات کی انجام دہی کا ارادہ کیا گیا ہے۔

یہ بات بے تامل یقین کر لینی چاہیے کہ مین معمولی استعداد کا آدمی ہون۔ نہ تو مجھے زباندانی کا غرہ ہے، نہ تجربہ کاری کا دعوا۔ ہان، چونکہ گذشتہ دس بارہ سال سے اخباری دنیا سے مجھے خاص تعلق رہا ہے اسلیے اب اسی کوچہ کی ہوا مین سما گئی ہے، اور اس کا شوق بدرجہ اتم دامنگیر ہو گیا ہے، اور اسی وجہ سے خیال ہے کہ ملک کے اہل درد حضرات کی بدولت شاید کسی قابل ہو جاؤن۔

ملک مین بہت سے موقت الشیوع رسالے شائع ہوئے اور ہوتے ہین۔ باستثناے چند، انکا اجرا زیادہ تر تجارتی اغراض سے ہوا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا ہی نقص ہے جو اخبارات و رسائل کے حق مین زہر قاتل کا اثر رکھتا ہے کیونکہ تجارتی پرچون کے ایڈیٹر عموماً بدلتے رہتے ہین، اور ایڈیٹرون کی تبدیلی کے ساتھ پرچون کا مقررہ معیار یا امتیاز خصوصی قائم نہین رہتا۔ ع ہر کہ آمد عمارت نو ساخت۔ اس جگہ اس امر کا اظہار کر دینا نامناسب نہو گا کہ العصر میرا ذاتی پرچہ ہے یعنی محض ایڈیٹر ہی نہین بلکہ مین ہی اس کا پروپرائٹر بھی ہون۔ پس اگر ملک نے اس کی قدر کی تو کچھ شک نہین کہ کم از کم میری حیات مستعار تک العصر جاری رہیگا انشاء اللہ تعالے۔

العصر کو مین نے اپنی معاش کا ذریعہ نہین بنایا ہے، بلکہ اسکو مین محض اپنا شوق پورا کرنے کے لیے خالص علمی و ادبی خدمات کی غرض سے شائع کرتا ہون۔ اس سے جو کچھ آمدنی ہوگی، وہ اسی کی بہتری مین صرف ہوگی۔ ہان اس روز کا نہایت بیتابی کے ساتھ انتظار کرتا ہون کہ مین اپنا تمام وقت اسکو زیادہ بہتر اور کار آمد بنانے کی سعی مین صرف کر سکون۔

اب اس مختصر نوٹ کو ختم کر کے ملکی اخبارون، رسالون، اور اہل قلم کی سچی رایون کا انتظار کرتا ہون، اور گوش بر آواز ہون۔ کاش!

ندائین آنے لگین ان سعیکم مشکور

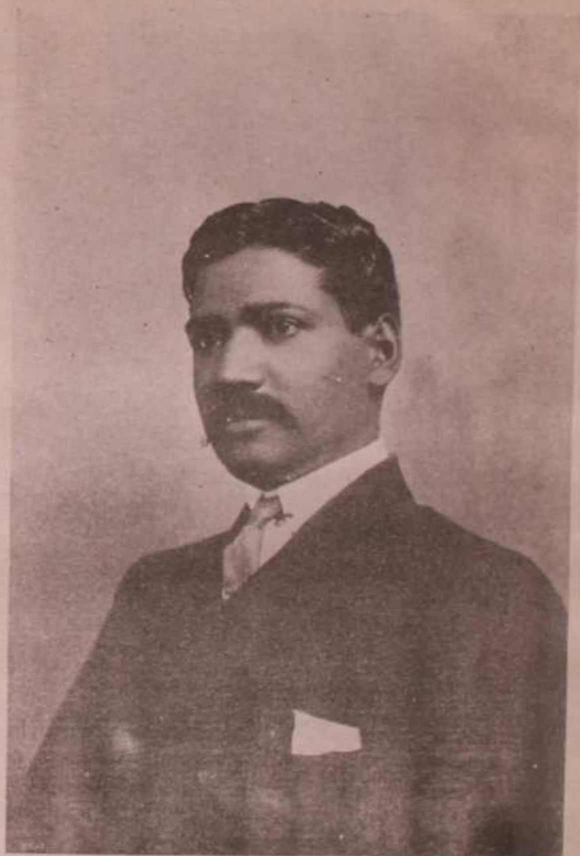
ایک گزارش

ہم سمجھتے ہین کہ ہمارے معاونین العصر کو اُس حالت سے گرا ہوا نہ پائین گے جسکا اشتہار مین وعدہ کیا گیا تھا۔ تاہم ترقی کی ابھی بہت گنجایش ہے، اور ہماری بھی یہ کوشش ہوگی کہ ہر نمبر گذشتہ نمبر سے بدرجہا بہتر ہو۔

تصاویر کے متعلق چند باتین خاص طور پر قابل گزارش ہین۔ ہمین گندم نما جو فروشی منظور نہین، اس لیے ہم پہلے ہی اس بات کو جتا دینا مناسب خیال کرتے ہین کہ العصر کی تصاویر کی کوئی خاص تعداد مقرر نہین کی گئی ہے۔ اس نمبر مین ایک رنگین اور چھ سادہ تصویرین دی گئی ہین۔ ممکن ہے کہ آیندہ نمبر مین اس سے زیادہ تصویرین ہون، اور اسی طرح اس تعداد سے کم تصویرین ہونے کا بھی امکان ہے۔ لیکن اس سے یہ نہین سمجھنا چاہیے کہ ہم مصارف سے گھبراتے ہین۔ ہرگز نہین۔ پرچے کے مصارف کا جو بجٹ تیار کیا گیا ہے، اُسمین کسی طرح تخفیف نہین ہو سکتی۔ اگر کسی نمبر مین تصویرون کی تعداد کم ہوگی تو ہم اُس کمی کو اُس نمبر کے صفحات کی تعداد بڑھا کر پورا کر دین گے۔ ہماری راے مین حسن طلبی کا اقتضا بھی یہی ہے!

العصر کے متعلق ہم نے ہر قسم کی خوش سلیقگی کا خاص لحاظ رکھا ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ صورت و سیرت دونون کے لحاظ سے العصر بہترین ماہوار ثابت ہو۔ اگر ہمارے معاونین کو کوئی نقص محسوس ہو، تو وہ صفائی کے ساتھ ہمین تحریر کر دین۔ ہمین اُن کے مشورون سے فائدہ اُٹھانے مین ہرگز عار نہو گا۔

ہمارے ارادے بہت وسیع ہین! اور یہ ظاہر ہی ہے کہ ایسے مہتم بالشان مقاصد کی کامیابی کُل ابناے وطن اور حامیان اُردو کی دستگیری پر منحصر ہے۔ جو





مسٹر مظہر الحق بیرسٹر ایٹ لا - بانکی پور

جو بلوہ کانپور کے مقدمہ میں ماخوذین کی طرف سے وکالت کر رہے ہیں



MR. MOHAMED 'ALI, B.A., (STANDING)

AND

DR. MUKHTAR AHMED ANSARY.



مسز اینی بیسنٹ

(اپنے اخبار "نیو انڈیا" کے مقدمہ میں آپ خاص کوشش
کر رہی ہیں، اور اگر اپنی کوششوں میں کامیاب
ہو گئیں تو کچھ شک نہیں کہ اخبارات
ہند کو بہت مدد حاصل ہوگی)



پنڈت ایشور چندر ودیا ساگر



بابو رابندر ناتھہ ٹیگور



مسز سروجنی نائیڈو



رائٹ آنریبل سید امیر علی، ایم-اے-ایل-ایل ڈی-سی-آئی-ای
(حال مین آپ مسلم لیگ (لندن) کی صدارت سے مستعفی ہوے ہین



THE HON'BLE NAWAB 'IMADUL-MULK BAHADUR MOULVI
SYED HUSAIN BILGRAMI, B.A., C.S.I.,
CHIEF ADVISER TO H. E. THE PRIME MINISTER OF HYDERABAD DECCAN.



آنریبل مسٹر ایس سنہا

(اڈیٹر رسالہ "ہندوستان ریویو" الہ آباد)



مسٹر بی گھوشال ، ایم اے ، ایم آر اے ایس



پنڈت رتن ناتھ صاحب در المتخلص بہ سرشار (لکھنوی)



SHAMSUL 'ULAMA MOULANA ALTAF HUSAIN, "HALI."



سيد محمد مرتضیٰ "بيان" ۽ "يزداني" (ميرٺهي) مرحوم

Alhilal Press



میر تعشق لکھنوی (مرحوم)



افتخار الشعرا خان بہادر اعتبار الملک مولوی سید افتخار حسین صاحب مضطر اقتدار جنگ



سید الشعراء حضرت صمیم (بلند شہری)



حافظ محمد یعقوب صاحب اوچ (گیاوی)



آنریبل رائے بہادر منشی پراگ نراین بہارگو مرحوم



لالہ سری رام صاحب ایم اے (دہلوی)

مولف ''خمخانۂ جاوید''



نواب ذوالقدر جنگ بہادر، ایم اے، بیرسٹر ایٹ لا ۔
(صدر مجلس استقبالیہ اُردو کانفرنس منعقدہ لکھنؤ سنہ ۱۹۱۶ء)



نواب نصیر حسین خان صاحب "خیال"
(پریسیڈنٹ اُردو کانفرنس منعقدہ لکھنؤ سنہ ۱۹۱۶ء)



M. MOHD. HUSAIN SAHIB.

محوی



KHAN BAHADUR MIRZA SULTAN AHMAD SAHIB.

EXTRA ASST. COMMISSIONER, PUNJAB.



M. RASHID AHMAD SAHIB.

ارشد



مولوی بشیرالدین احمد صاحب دہلوی



مولوی محمد عبدالرزاق صاحب
مولف البرامکه و نظام‌الملک طوسی



قاری محمد سرفراز حسین صاحب عزمی دہلوی (علیگ)
سیاح جاپان و انگلستان
[مصنف شاہد رعنا - سعید - سعادت - درد دل - قطرات اشک - دل کا عجائب خانہ - اسلام بانی قاری]



شیخ فیروز الدین مُراد صاحب ایم ایس سی بی اے

SHEIK FIROZ UD DIN MURAD B.A., M.Sc.



منشی تلوک چند صاحب "محروم"



مسٹر سید کلب احمد صاحب مانی (جانسی)

کتبہ مقبرۂ مرزا محمد امین
(فرزند سلطان ابراہیم قلی قطب شاہ)
واقع گولکنڈہ
(بخط کوفی و طغرا)

کتبہ برج قادریہ، واقع رایچور (دکن)



نقل طغرا جامع مسجد، بیرون قلعہ، واقع رایچور (دکن)



طغرا "یا اللہ محمد علی ولی اللہ" بر قبر بیرون قلعہ گولکنڈہ (دکن)
(جانب غرب واقع لودھاواڑی اندرون رمنہ)

الاخلاق

تمہید

مشرق کے علوم و فنون، صنائع و تجارت، معاشرت و سیاست، مختصراً یہ کہ تمام مظاہرِ زندگی اصلاح طلب ہین۔ اس لیے یہ صحیح ہے کہ مشرق کو کسی صلاح سے استغنا نہین، لیکن یہ ایک ناقابلِ انکار صداقت ہے کہ قوم مین مذہبی، سیاسی، اجتماعی، وغیرہ گونا گون اصلاحات کا آغاز اُس وقت تک کامیاب نہین ہوتا جب تک کہ اسکے افراد مین ایک ایسا گروہ نہ موجود ہو جس مین طولِ فکر، حسنِ تمیز، اصابتِ رائے اور جراءتِ اخلاقی ہو۔

یہ گروہ عموماً نوجوانون مین سے پیدا ہوتا ہے کیونکہ اُن مین بڑھاپے کی عافیت اندیشیون کے بدلے جوانی کی ولولہ خیزیان ہوتی ہین، جو اُن کو حریت پسندی، بلندی اور حق گوئی کی طرف بڑھاتی ہین۔ اس لیے ایک مصلح کا فرضِ اولین نوجوانانِ قوم کی اخلاقی اور دماغی پرداخت ہے۔

تعریف

جس طرح کہ سنگِ چقماق مین آگ پوشیدہ ہے، اسی طرح انسان مین گوناگون صدہا قوی پوشیدہ ہین۔ ان قویٰ سے جب ابتداءً کام لیا جاتا ہے تو کسی قدر تعمد و تکلف کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن جب عرصہ تک برابر سلسلۂ استعمال جاری رہتا ہے، تو پھر ان کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ ان کے استعمال کے لیے قصد و ارادہ کی ضرورت نہین رہتی بلکہ جب موقع ہو، از خود کارفرما ہونے لگتے ہین اور اگر بہت زیادہ عرصہ تک اُن کا استعمال جاری رہتا ہے تو وہ اس طرح جزوِ زندگی بن جاتے ہین کہ اُن سے علیحدگی کے لئے نہ صرف ارادہ کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ تکلیف ہوتی ہے۔ جب انسان کی مختلف

کے استعمال کا اس درجہ تک خوگر ہو جاتا ہی تو یہ خوگری عادت یا خلق کہلاتی ہے۔

اخلاق کی شکل پذیری

تم نے بارہا دیکھا ہوگا ایک آہنی تار بالکل سیدھا تھا، اگر جب کسی شکل پر لپیٹا گیا تو اُسکی بھی وہی شکل ہو گئی، اور اگر زیادہ عرصہ تک لپٹا رہا تو وہ شکل تار میں اُس درجہ راسخ ہو گئی کہ اس کا سیدھا کرنا دشوار ہو گیا۔ تو یہی اخلاق کی بھی بعینہ یہی حالت ہی۔ وہ ابتداءً بے شکل ہوتے ہیں لیکن جب عرصہ تک ایک مخصوص اسلوب پر استعمال کیے جاتے ہیں تو وہ ایک خاص شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

اقسام اخلاق

گو ہماری زبان میں اخلاق کا استعمال اکثر اخلاقِ حسنہ، بلکہ اخلاقِ حسنہ کی ایک خاص صنف یعنی خاطر مدارات کے معنی میں ہوتا ہی، چنانچہ خوش اخلاق اُس شخص کو کہتے ہیں، جو ملاقات میں اعتنا و التفات کو کام فرماتا ہو۔ مگر واقعہ یہ ہی کہ اخلاق کا دائرۂ معانی اس قدر تنگ نہیں۔ اخلاق مجموعۂ عادات کا نام ہی۔ اگر عادات اچھی ہیں تو وہ شخص خوش اخلاق ہی، اور اگر بُرے ہیں تو بد اخلاق ہی۔

میں اسوقت اخلاق کی پیش پا افتادہ تقسیم حمیدہ و ذمیمہ سے گذر کے دو اور تقسیمیں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

(۱) اخلاق طبیعی۔ یہ وہ اخلاق ہیں جو انسان اپنے ساتھ لیکے پیدا ہوتا ہی۔ ان کا استیصال ناممکن، مگر تقویت و تضعیف ممکن ہی۔ تم نے دیکھا ہوگا، بعض لوگوں میں ان کی صحبت کے عام اخلاق کے خلاف بعض عادتیں پائی جاتی ہیں، یہ وہی عادات ہیں جن کو ہم فطری کہتے ہیں۔

(۲) اخلاق کسبی۔ یہ وہ اخلاق ہیں جو انسان صحبت سے سیکھتا ہی اور رفتہ رفتہ وہ اُس میں قریباً اتنے ہی جاگزین ہو جاتے ہیں، جتنے کہ اخلاق طبیعی راسخ ہوتے ہیں۔

یہ تقسیم ہنٹ کی تھی، پروفیسر ڈیوی امریکی نے اخلاق کی حسب ذیل تقسیم کی ہے۔

وہ اخلاق جن کا تعلق۔

۱۔ ادراک سے ہی۔

۲۔ جذبات سے ہی۔

۳۔ ارادہ سے ہی۔

اخلاق متعلق بادراک وہ اخلاق ہیں جن کے ذریعہ سے کذب و صدق وہم و شک ظن و یقین وغیرہ میں تمیز ہوتی ہی۔

اخلاق متعلق بہ جذبات وہ اخلاق ہیں جن کا تعلق جذبات سے ہی، جیسے حُسن دوستی، لذت پسندی وغیرہ۔

اخلاق متعلق بارادہ وہ اخلاق ہیں، جن کا تعلق ارادہ سے ہی، جیسے صبر، استقلال، علم وغیرہ۔

سرچشمہائے اخلاق

انسان میں اخلاق کے تین سرچشمے ہیں

(۱) وراثت

(۲) مؤثرات

(۳) ارادہ

وراثت۔ عموماً بچہ جس شخص سے جس قدر قریب ہوتا ہی اُسی قدر اُس سے زیادہ مشابہ ہوتا ہی، مثلاً بچہ سب سے زیادہ والدین سے قریب ہوتا ہی، اس لیے وہ نسبتاً سب سے زیادہ والدین سے مشابہ ہوتا ہی۔ والدین کے بعد والدین کے والدین سے قریب ہوتا ہی، اس لیے تیسری یا چوتھی پشت کے لوگوں کی بہ نسبت اُن سے زیادہ مشابہ ہوتا ہی، و ہلم جرا۔ مگر یہ قاعدہ کلیہ نہیں بسا اوقات اس کے خلاف شہادتیں ملتی ہیں۔

مؤثرات خارجیہ۔ اس کی دو قسمیں ہیں:۔

(۱) فضاء مادی، جیسے آب و ہوا جنانچہ تجربہ سے ثابت ہوتا ہی کہ معتدل

ممالک کے لوگ عموماً راحت طلب، عیش پسند اور کاہل ہوتے ہیں لیکن غیر معتدل ممالک کے لوگ چاق و چوبند، چست، چالاک، محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں۔ غیر معتدل ممالک میں گرم ممالک کے باشندے سریع الانفعال ہوتے ہیں، وہ جسقدر جلد خوش ہوتے ہیں اُسی قدر جلد ناراض ہوتے ہیں۔ سرد ممالک کے باشندے بطی الانفعال ہوتے ہیں مگر جب متاثر ہو جاتے ہیں تو وہ تاثر پھر جلد زائل نہیں ہوتا۔ وغیرہ

۲۔ فضاء اخلاقی: احباب، اسے ہم معمولی بیک لفظ صحبت یا سوسائٹی۔

اسمبس کہتا ہے کہ انسان اپنے والدین سے زیادہ اپنے ہم نشینوں سے مشابہ ہوتا ہے۔ صحبت کے اثر کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک پیشے کے لوگوں میں بہت سے اخلاق مشترک ہوتے ہیں، بلکہ یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ اگر دو نہایت ہی قریبی رشتہ دار دو مختلف پیشے کرتے ہوں تو اُن دونوں کے اخلاق باہم دیگر اس سے کم مشابہ ہوتے ہیں جتنے کہ دونوں کے اخلاق اپنے اپنے ہم پیشہ لوگوں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ "ایک فرانسیسی مثل ہے کہ تم اپنے ہم نشینوں کو مجھے بتا دو، میں تمھیں یہ بتا دوں گا کہ تم کیسے ہو"

ارادہ اخلاق کے دو سبب یعنی اسلاف اور صحبت (سوسائٹی) کا انتخاب انسانی قدرت سے باہر ہے لیکن تیسرا سبب یعنی ارادہ اسکی قدرت میں ہے۔ چنانچہ یہ صحیح ہے کہ وراثت اور صحبت کا اثر نہایت قوی ہوتا ہے مگر تاہم انسان کا ارادہ اگر قوی ہو تو اس اثر کو زائل کر سکتا ہے۔

اگر ہم عبرت آموز نظر سے اشخاص کی زندگی کا مطالعہ کریں گے تو ہم کو بہت سے لوگ ایسے ملیں گے جن میں اُن کے بزرگان خاندان اور اُن کی صحبت کے خلاف اخلاق موجود ہونگے۔ یہ بالکل بدیہی ہے کہ ان اخلاق کا سرچشمہ نہ وراثت ہوگی اور نہ صحبت، اب جو چیز رہ جاتی ہے وہ طبیعت کا میلان اور ارادے کی مساعدت ہے پس یہی دو چیزیں انکا سرچشمہ ہونگی۔ اسی بناء پر علماء اخلاق کا یہ خیال ہے کہ انسان کا مستقبل وراثت اور صحبت سے زیادہ اُسکے ارادے پر موقوف ہے۔ اس نظریہ کی مزید تائید اس واقعے سے بھی ہوتی ہے کہ دنیا میں جتنے ارباب اخلاق پیدا ہوئے ہیں وہ ایسی قوموں میں سے پیدا ہوئے ہیں جن کی اخلاقی حالت نہایت بدتر تھی اور قطعاً ان میں سے اتنے بڑے ارباب اخلاق کے پیدا ہونے کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔

ارادے کے مدارج مختلف ہیں۔ بعض اشخاص کا ارادہ فطرتاً نہایت قوی ہوتا ہے اور بعض کا کمزور اور بعض کا متوسط درجے کا۔

جس طرح جسم ورزش اور نگہداشت سے بڑھتا ہے بعینہ یہی حالت ارادے کی بھی ہے۔ اگر کوشش کی جائے تو ایک کمزور ارادہ قوی اور ایک قوی ارادہ قوی تر ہو سکتا ہے۔ بچپن میں تمام قوائے انسانی کا آغاز ظہور ہوتا ہے اس وقت وہ ہر طرح کی تربیت قبول کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں اس لیے ارادے کی تربیت اور تقویت کا بہترین زمانہ طفولیت کا زمانہ ہے۔ اسی لیے مغرب میں بچوں کو تیسرے یا چوتھے ہی برس سے استواری عزم و پختگی ارادہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔

اخلاق کی آراستگی

اخلاق کی ماہیت اور اسباب کے معلوم ہونے کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُن کی آراستگی یا تہذیب کا کامیاب ترین ذریعہ کیا ہے؟

قدرت نے انسان میں مختلف قوئ ودیعت کیے ہیں، جن کی نشو و نما کے لیے غذا اور ورزش کی ضرورت ہے، مگر جس طرح کہ اُن قوی کے جوہر مختلف ہیں اسی طرح اُن کی غذا اور ورزش مختلف ہے۔ جسمانی قوی کی غذا اور ورزش ماکولات و مشروبات اور العاب (جیسے جمناسٹک) ہیں، مگر اخلاقی قوی کے لیے یہ چیزیں بیکار ہیں۔ ان کی غذا افکار عالیہ اور ان کی ورزش زمانہ کی کشمکش ہے۔ جس طرح کہ ہر شخص کے جسم کے لیے ایک ہی قسم کی غذا اور ایک ہی نوعیت اور ایک ہی حد تک کی ورزش مفید نہیں اسی طرح ہر شخص کے لیے ایک ہی نوعیت کے افکار عالیہ اور ایک ہی نوعیت و شدت کی کشمکش زمانہ مفید نہیں، اس لیے آراستگی اخلاق کے شائق کیلئے دو امر نہایت ضروری ہیں۔

۱۔ اخلاقی غذا کے لیے ایسے افکار کا انتخاب جو اُس کی طبیعت کے

کے مناسب ہون۔

۲۔ زندگی کی اُن کشمکشون سے اجتناب جو اُس کی طبیعت کے غیر مناسب ہون۔

شرائط کامیابی

جس طرح انسان کی جسمانی ترقی کیلیے اسلاف کی صحت آب و ہوا کی عمدگی قوی کے استعمال و تعطیل مین اعتدال حزن و مسرت مین توازن وغیرہ شرائط ہین اسی طرح اخلاقی ترقی کے لیے بھی چند شرائط ہین۔

اولین شرط والدین کے جسم و عقل کی تندرستی ہے۔ مگر افسوس کہ جسقدر یہ شرط مقدم ہے اُسی قدر اس کی طرف سے غفلت کی جاتی ہے مائین جو بچون کے پالنے مین رات کو رات اور دن کو دن نہین سمجھتین اور ماں باپ جو اولاد کی تعلیم و تربیت مین کسی چیز سے بھی دریغ نہین کرتے عموماً اس نہایت اہم شرط سے چشم پوشی کرتے ہین۔ وہ اپنی صحت لذائذ زندگی یا غفلت کی بدولت تباہ کر دیتے اور اُس کا خمیازہ نہ صرف وہ خود کھینچتے ہین بلکہ اُن کے بعد آنے والی نسلین پشتہا پشت تک کھینچتی رہتی ہین۔ یہ واقعہ ہے کہ ہزارہا بچون کی جسمانی دماغی اور اخلاقی کمزوری کے ذمہ دار اُن کے والدین کی کمزوری ہے۔

دوسری شرط حسنِ تربیت ہے بیشک یہ صحیح ہے کہ جوانی یا بڑھاپے مین اصلاحِ اخلاق محال نہین لیکن قریب بمحال ضرور ہے کیونکہ انسان جس وقت پیدا ہوتا ہے اُسوقت وہ ایک لوحِ سادہ ہوتا ہے۔ وہ ہر قسم کے نقوش قبول کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے لیکن جب ایک نقش کھنچ جاتا ہے تو اُس کا مٹنا اکثر دشوار طلب اور کبھی ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس لیے جو قوم چاہتی ہے کہ اُس کی آیندہ نسلون کی اخلاقی حالت عمدہ ہو اُس کو چاہیے کہ اس سادہ لوح پر شروع ہی سے عمدہ نقش کھینچے۔ اس کے لیے اس کو حسب ذیل امور ملحوظ رکھنا چاہئین:۔

۱۔ ایسی فضا کا انتخاب جو اخلاق رذیلہ کی سمیت سے محفوظ ہو۔

۲۔ اخلاقی قوی کا صحیح اندازہ تاکہ جو حصہ کمزور ہو اُس کو خاص طور پر قوی کیا جائے۔

۳۔ مرکز نظر کے لیے کوئی بلند شے پیش کرنا۔

۴۔ افکار عالیہ کی تلقین۔

۵۔ روزانہ زندگی مین اصولِ اخلاق کا نفاذ۔

حسب ذیل قوی کو خاص طور پر اُبھارنا چاہیے:۔

۱۔ حقیقت پرستی۔

۲۔ جرأتِ اخلاقی۔

۳۔ استواری عزم۔

ابتدائی تربیت اور شرق

شرق مین بچون کی اخلاقی تربیت کا بہترین آلہ قمچی یا تسمہ سمجھا جاتا ہے یہ نہایت سخت غلطی ہے۔ مارنے سے بجز اسکے کہ بچے کے دل مین معلم کی ہیبت اور اس عادت سے نفرت پیدا ہو اور کوئی فائدہ نہین ہو سکتا۔

بچے کی اخلاقی تربیت کا صحیح ترین اصول یہ ہے کہ جس عادت سے باز رکھنا منظور ہو پہلے اُسکے فوائد اور نقصانات اُسکو سمجھائے جائین، اور اُس کے بعد اُسکے چال چلن کی نگرانی رکھی جائے۔ فراموشی کے وقت اُسکو یاد دہانی کی جائے، یاد دہانی کے ساتھ بچے کو اُس کے فوائد و مضار کی طرف متوجہ کیا جائے۔ اس طرح بچہ بہت جلد خود بخود تعمیل حکم کرنے لگے گا۔

بچے کی پہلی اخلاقی درسگاہ گھر ہے اور اس کے بعد مدرسہ کا نمبر ہے گھر مین صرف زمین تیار ہوتی ہے تخم پاشی درحقیقت مدرسہ مین آکر ہوتی ہے۔ اس لیے جس طرح زمین کے تیار کرنے مین سخت توجہ کی ضرورت ہے اسی طرح تخم پاشی اور اُس کی آبیاری کے لیے بھی اعتنا شدید کی حاجت ہے۔ نصاب مین اخلاقی کتابون کا داخل کرنا یا دار الطلبہ و کلاس روم مین اخلاقی تقریرون کا ہونا، اُسوقت تک مفید نہین ہو سکتا جب تک کہ خود مدرس کی شخصیت با اخلاق نہو۔ کتاب کے نقوش اور تقریرون کے ہوائی توجہات مسلم ہین۔ مگر مردہ لیکن مدرس زندہ معلم ہے اور بظاہر ہے کہ

کہ انسان پر جو ایک زندہ معلم کا اثر ہو سکتا ہے وہ ایک مردہ معلم کا نہین ہو سکتا۔ پس اگر مدرس کی کتابِ زندگی مین اخلاقی سبق نہین تو محض نصاب کی کتابون یا دار الخطابہ مین بلاغت کار تقریرون سے اخلاقی تربیت کی امید غلط امید ہے۔

دیگر امور کی طرح یہ نکتہ بھی مغرب کے پیش نظر اور مشرق کے پس پشت ہے۔ مغرب مین بچون کے لیے صنعت معلم اور مربی زبردست شخصیت و علمیت کے لوگ ہوتے ہین مگر مشرق مین اس کے بالکل برعکس ہے۔ بوخر الذکر مین بچون کی تعلیم و تربیت کم درجہ کا کام سمجھا جاتا ہے۔ اس کو صرف وہ لوگ کرتے ہین جو دیگر ذرائع سے معاش پیدا نہین کر سکتے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مشرق کے فرزند اعلی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی مغرب کے فرزندان سے اخلاق مین پیچھے رہتے ہین۔

ابو الکلام آزاد

العصر

فلسفۂ تشکیکیہ

عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے
ہستی کے مت فریب مین آجائیو اسد

عالم مین ہزارون چیزین مرئی اور غیر مرئی، محسوس اور غیر محسوس ہمارے سامنے مین لیکن اُن کی حقیقت و ماہیت ہم سے مخفی ہو ہم تجربہ، اعتبار، استقرا اور دلائل سے اصلیت اور واقعیت کے پردے پر پردہ اُٹھاتے جاتے ہین اور آخر چند نتائج تک پہنچ کر رہ جاتے ہین۔

ہم مین بعض محتاط اس بنا پر کہ اس سے پہلے بھی ہم ایسے نتائج تک پہنچے لیکن وہ واقعی نہ تھے، نیز ہمارے قوائے فکر و عمل اسقدر کمزور ہین کہ تحقیق واقعیت اور اثباتِ حقیقت کا بارگران نہین اُٹھا سکتے اور حقائق و ماہیاتِ اشیاے عالم اس درجہ مخفی و تاریک ہین کہ موجودہ آلاتِ فکر و نظر اُس کو روشن نہین کر سکتے، ہمارے ہر نتیجہ کو حقیقت سے عاری اور واقعیت سے معطل قرار دیتے ہین بلکہ کبھی کبھی وہ خود اِس کے انکار کی جراٴت کرتے ہین کہ عالم مین کوئی حقیقت ہو، اُنکی نظر مین ہر شے تخیل اور دماغ کا اختراع ہو۔

دوسرا گروہ اُسکے بالمقابل ہی جو مدعیانہ کہتا ہو کہ عالم حقائق سے معمور ہو ہمارے تجارب، اعتبارات و دلائل صحیح اور ہمارے نتائج و استنباطات قطعی ہین۔ اشیا حقائق واقعیہ ہین، اور برہان و تجربہ نے جن نتائج تک پہنچایا ہو، وہ اس وقت تک یقینی ہین جب تک اُن کے خلاف کوئی دلیل صحیح نہو۔

ایک معتدل گروہ آگے بڑھتا ہو اور فریق اول کو مخاطب کرتا ہو، دوستو! جب تم آلاتِ فکر کو ناکافی، دلائل کو غیر موصل الی المطلوب اور عالم کو حقایق سے عاری تعین کرتے ہو تو تم کیونکر کہتے ہو کہ ہم کسی شی مین کوئی حقیقت نہین پاتے؟ کیا ابھی تم نے جن خیالات کو ظاہر کیا کہ ہمارے آلاتِ عمل و فکر ناکافی ہین، دلائل غیر موصل الی المطلوب ہین، اور عالم حقائق سے عاری ہی، کیا تم خود انکی صحت کا یقین کر کے اِن اصول کی حقیقت کے قائل نہین ہو گئے؟ اور اگر اُن کو بھی تم حقیقت نہین کہتے تو نہ کہو کہ ہمارے دلائل ناکافی ہین، آلاتِ عمل ناقص ہین، عالم سراسر نقشِ تخیل۔

پھر یہ گروہ دوسرے فریق کی طرف مخاطب ہوتا ہے: دوستو! یاد ہوگا کہ تم نے اپنی گفتگو میں کہا ہے کہ ہمکو دلائل و تجارب نے جن نتائج و استنباطات تک پہنچایا ہے وہ اُس وقت تک یقینی ہیں جب تک اُنکے خلاف کوئی دلیل صحیح قائم نہو: اِن فقرون سے ظاہر ہے کہ تم اپنے موجودہ دلائل و نتائج کو تحقیقی اور غیر ممکن الخطا نہیں سمجھتے ہو۔ پھر کیا یہ ممکن نہیں کہ جن معلومات و تخیلات کی صحت کی بناپر اِن دلائل و نتائج کو تم یقینی سمجھتے ہو وہ صحیح نہون اور تم قلت معلومات یا نقص آلات نظر یا خطاے طرق فکر کی بناپر غلطی سے صحیح یقین کر بیٹھے ہو۔ اور مسائل متعددہ مین تم کو اپنی یہ غلطی روزانہ نظر آتی ہے۔ پھر کوئی سبب معقول نہیں ہے کہ تم اپنے موجودہ حقائق و نتائج کو اگر غلط نہ یقین کرو تو صحیح بھی یقین نہ کرو۔

یہ تین فرقے فلسفہ کے تین اسکول یا تین اصول ہیں:-

۱۔ اول توہمیہ یا سوفسطائیہ:- جو عالم مین حقیقت کا قائل نہیں یعنی نفی حقیقت کرتا ہے۔

دوم - ایقانیہ: جو عالم مین حقائق کا قائل اور اُن کے علم و معرفت کا مدعی ہے یعنی اثبات حقیقت کرتا ہے۔

سوم تشکیکیہ یا لاادریہ: جو ان دونون کے وسط مین ہے۔ نہ وہ توہمیہ کی طرح نفی حقیقت کرتا ہے اور نہ ایقانیہ کی طرح اثبات حقیقت بلکہ وہ نفی و اثبات دونون مین متردد ہے۔ وا تمامت دلائل اور نتائج سب اُسکے سامنے ہین لیکن اُن مین سے نہ وہ کسی کی صحت کا مدعی ہے اور نہ کسی کی خطا کا - وہ کہتا ہے کہ: ممکن ہے کہ صحیح ہو اور ممکن ہے کہ صحیح نہ بھی ہو۔

فرقہ تشکیکیہ جسکو عربی مین عموماً "لاادریہ" کہتے ہین اور جو لفظی ترجمہ ہے Agnostic کا آج سے تقریباً چار سو برس قبل اس کی بنیاد یونان مین پڑی تھی۔ اس مذہب کا مؤسس اول یونانی فلاسفر پیرہن ہے جو ۳۶۰ قبل مسیح مین پیدا ہوا تھا۔ سکندر کے حملہ مشرق مین یہ شریک تھا۔

اس لیے اکثر مورخین کا یہ بیان ہے کہ پیرہون نے ایران و ہندوستان کے فلسفہ کو بھی ان ممالک کے علما سے حاصل کیا تھا۔

پیرہون کے فلسفہ کا سنگ بنیاد جس کی طرف اوپر کی سطرون مین بھی اشارہ ہو چکا ہے یہ ہے: کہ انسان جب عدم سے وجود مین آتا ہے اُسکے چارون طرف سینکڑون ہزارون چیزون کا وجود ہوتا ہے۔ اب اسکے لیے دو راہین ہین۔ ایک تو یہ ہے کہ جو چیز وہ سمجھتا ہے اُس کو وہ حقیقت غیر قابل نقض سمجھ لے، یا ہر چیز کا انکار کر دے کہ وہ حقیقت سے معریٰ ہین اور یہ دونون افراط و تفریط سے خالی نہین اس لیے اب انسان کے سامنے صرف تیسری راہ ہے کہ کسی شے پر کوئی حکم نہ کیا جائے۔

حقیقی لاادری اس سنگ بنیاد کو حقیقت نہین سمجھتا۔ کیونکہ یہ بھی حکم علی الشی ہے اور وہ نہین جانتا کہ یہ صحیح ہے یا نہین۔ اکثر اشخاص بظاہر حال اس نظریہ کو سُن کر ہنس دین گے لیکن حقیقت مین یہ کوئی ہنسنے کی شے نہین ہے بلکہ ایک دقیق امر ہے۔ بعض لوگ نافہمی سے اعتراض کرتے ہین کہ دنیا مین سینکڑون چیزین ہین جن کا علم ہم کو نہایت آسانی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ مثلاً حرارت نار، برودت آب، صلابت سنگ، نرمی حریر، ہاتھ سے چھو کر، آنکھ سے دیکھ کر، زبان سے چکھ کر اور کان سے سن کر تم بدیہی شے پر فطرۃً اور بداہتہً مختلف علم کرتے ہو اور کبھی تم کو شک نہین ہوتا۔ پھر کیونکر کہتے ہو کہ ہم کسی شے پر حکم نہین کرتے۔

لیکن اس قسم کے اعتراضات حواس و آلات فکر کے طرق علم و معرفت سے ناواقفیت کی بناپر پیدا ہوتے ہین۔ اولاً یہ سمجھنا چاہیئے کہ ہمارے تمام دلائل و براہین کا مبنیٰ کیا ہے؟ صرف دو چیزین ہین، استعمال حواس اور استقرا۔ لیکن ان مین سے کون سی چیز ہے جو خطا سے معصوم ہے؟

حواس علی الاکثر پانچ ہین یعنی باصرہ، سامعہ، ذائقہ، لامسہ، شامہ۔ باصرہ سے ہم صرف نور اور لون کا احساس کرتے ہین۔ سامعہ آواز

کو دریافت کرتی ہی، ذائقہ لذت کو، لامسہ سختی و نرمی کو، اور شامہ بو کو۔ اب جو تم کسی چیز کو دیکھتے ہو تو کہتے ہو کہ یہ پتھر ہے، لیکن تم نے کیونکر جانا کہ پتھر ہی؟ آنکھ تمکو صرف اُس کا سیاہ یا سپید رنگ بتاتی ہی، اور قوت لامسہ صرف اُس کی سختی کو محسوس کرتی ہی، لیکن کیا پتھر ہونے کے ثبوت کیلئے صرف یہی مقدمات کافی ہین کہ یہ شے سیاہ اور سخت ہی، اور جو شے سیاہ اور سخت ہو وہ پتھر ہی، اس لئے یہ پتھر ہی؟ کیا یہ ممکن نہین کہ ایک لوہے کے ٹھوس جسم پر یا ایک منجمد مادہ پر سیاہ رنگ چڑھا دیا جائے؟ تمکو خود اس قسم کی غلطیان ہمیشہ پیش آتی ہین۔

ثانیاً: تمکو حواس کی غلطی سے بھی انکار نہو گا، جب تم کسی سریع الحرکۃ شے پر سوار ہوتے ہو تو تمھاری سریع الحرکۃ سواری ساکن اور ساکن زمین متحرک نظر آتی ہی، کبھی کبھی تم کو چاند متحرک نظر آتا ہی، حالانکہ اُس کے نیچے ابر حرکت کر رہا ہی، اور اس قسم کی سیکڑون مثالین تم خود پیش کرتے ہو، پھر کوئی وجہ نہین کہ اور دوسرے امور مین جن مشاہدات و تجارب پر تم اپنے اصول و نتائج کی بنیاد قائم کرتے ہو، وہ حواس کی غلطی سے محفوظ ہون۔

ثالثاً: حواس سے تم ایک شے کا مشاہدہ کرتے ہو، اُس پر ایک حکم قائم کرتے ہو، اور اُس کو تم مبنی علی المشاہدہ اور مبنی علی البداہت سمجھتے ہو، حالانکہ تمھین خبر نہین کہ جلدی مین غیر مشاہدہ باتون کو بھی طے کر گئے ہو۔ جب تم نے ایک سیاہ شے کو دیکھ کر کہا کہ پتھر ہی، تو تم نے فرض کر لیا ہی کہ ہماری نظر ہم کو دھوکا نہین دے رہی ہی، معلوماتِ سابقہ کی بنا پر بغیر چھوئے تم نے سختی بھی محسوس کر لی، اسکے بعد تم نے یہ فرض کیا ہی کہ یہ صفات جس مین ہون وہ پتھر ہی، لیکن ان مین سے ہر ایک محتاجِ دلیل ہی۔

فرقۂ تشکیکیہ، ایقانیہ کے مقابلہ مین حسب ذیل دس اصول قائم کرتا ہی:

(۱) مقدارِ عمر، ترکیبِ جسم، قوتِ حواس اور درجۂ احساس مین تمام انسان مختلف ہین، اور اس لیے ایک ہی شے مین مختلف اشخاص کو جو مقدارِ عمر، ترکیبِ جسم، قوتِ احساس اور درجۂ احساس مین مختلف ہین مختلف حیثیات اور خصائص نظر آتے ہین۔

(۲) اخلاقی اور تشریحی حیثیت سے افرادِ انسان مختلف ہین، اسلیے مختلف امور کے متعلق ان کے احساسات بھی مختلف ہونگے۔

(۳) ایک ہی انسان مین بتعدد اعضاے حاسہ مین اس کا یہ نتیجہ ہو کہ ہر عضو ایک خاص کیفیت، مقدار وغیرہ کو محسوس کرتا ہی، اس لیے یہ کیونکر کہا جا سکتا ہی کہ جو خصوصیت و خاصیت تم کو نظر آ رہی ہی وہ خود اُس شے مین موجود ہو، یا فعل اعضاے حاسہ مین ہی؟

(۴) ایک ہی انسان ایک ہی شے کو خواب، بیداری، حزن اور غم، پیری اور ضعف کی مختلف حالتون مین مختلف طور سے محسوس کرتا ہی، پھر کس طرح یقین کیا جائے کہ تم جو ایک خاص حالت مین ایک شے محسوس کرتے ہو، اور پھر دوسری حالت مین اُس کو ایک اور شے محسوس کرتے ہو، کیونکر کہا جائے کہ ان مختلف حالات کے احساس مین کون سا احساس صحیح ہی؟

(۵) کسی شے پر کوئی حکم عموماً اسکے صفات و خصائص ظاہری پر موقوف ہوتا ہی، اور صفات و خصائص کا یہ حال ہی کہ قلت و کثرت اور زیادت و نقص کی حالت مین بالکل بدل جاتے ہین۔ اب جب تم ایک مقدار مخصوص کو مشاہدہ کر کے اُس پر کوئی خاص حکم قائم کرتے ہو تو کیا یہ غیر ممکن ہی کہ اُس کی کم و بیش مقدار مین وہ صفات و خصائص بدل جائین؟

(۶) کسی شے کے متعلق جب کوئی حکم کوئی انسان کرتا ہی تو یہ حکم صرف مشاہدہ پر مبنی نہین ہوتا، بلکہ اُس مین اُس کی تربیت خاص، عقائد خاص، پابندی بعض قوانینِ خاص اور سوسائٹی کے مخفی اثرات کا بہت کچھ حصہ شامل ہوتا ہی، یہی وجوہ ہین کہ مختلف التربیۃ، مختلف العقائد، مختلف الاقالیم اشخاص مسائل کثیرہ مین ہمیشہ مختلف الآرا رہتے ہین۔

(۷) اشیاے عالم باہم اس قدر مختلط ہین کہ ایک دوسرے

معدہ نہیں ہوسکتیں، اس لیے یہ کیونکر ممکن ہو کہ جس شے پر تم کوئی حکم کرتے ہو وہ مستقلاً بھی اُس شے کے لیے صحیح ہو؟ تم اشیا کے خصائص بتلاتے ہو لیکن کیا اُس میں مواد مختلطہ کے خصائص شامل نہیں؟ جب تم آنکھ سے ایک رنگ دیکھتے ہو تو کیا اُس میں اخلاطِ چشم کے خصائص داخل نہیں؟

(۸) ایک ہی شے مختلف قرب و بعد، مختلف جوانب و سمت رویت مختلف اسباب رویت کی بنا پر مختلف نتائج پیدا کرتی ہو پھر ایک خاص مقدارِ قرب و بعد، ایک خاص سمت رویت، بعض خاص اسباب رویت میں جو چیز نظر آتی ہو بالکل ممکن ہو کہ دوسری حالتوں میں وہی شے او کیفیات میں نظر آئے۔ پھر اُن میں سے کونسی حقیقی ہو؟

(۹) قلت و کثرت التفات و توجہ مختلف نتائج ظاہر کرتی ہو پھر جس مقدارِ توجہ و فکر سے تم ایک حالت کا اندازہ کر رہے ہو اُس سے کم یا زیادہ توجہ و فکر کی حالت میں دوسری حالتیں پیدا ہوتی ہیں، کون صحیح ہیں۔

(۹) ہم جب کسی چیز پر کسی قسم کا حکم کرتے ہیں تو عموماً ہمارے حواس نامعلوم قیود اور بندشوں میں گرفتار ہوتے ہیں ہم نہیں کہ سکتے کہ جب ہم اُن سے آزاد ہوتے تو ہم کیا حکم کرتے؟

اِن اصول عشرہ کے علاوہ فرقۂ تشکیکیہ کے اور بعض اہم اصول بھی ہیں جن کی تفصیل وقت طلب ہو۔

فلسفۂ تشکیکیہ کا سنگِ بنیاد جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہو مسیح سے ۳۰۰ برس قبل رکھا گیا تھا، اسکے بعد ہمیشہ اسکے اعوان و اتباع ہر عصر میں موجود رہے ہیں فلاسفہ یورپ میں بھی اس خیال کی کمی نہیں مشہور فیلسوف ہکسلے و اسپنسر اسی فلسفہ کے مرید تھے، حقیقت یہ ہو کہ ایک فلسفی اسرار عالم کو جس حد تک کھولتا ہو اُسکے سامنے پھر گرہیں نظر آتی ہیں، اُن کو کھولتا ہو تو کچھ اور عقدے جابجا پیدا ہو جاتے ہیں ؎

فلسفی سرِ حقیقت نتوانست کشود
گشت رازِ دگر آن راز کہ افشا می کرد

وَمَا اُوتِیتُم مِنَ العِلمِ اِلَّا قَلِیلًا، جب انسان کی بے بسی کا یہ عالم ہو کہ محسوسات میں بھی اسکو مشکل سے تیقن و عدم تیقن کے فیصلہ کرنے میں کامیابی ہوتی ہو تو جو امور ماورائے احساس و مافوق الطبیعۃ ہیں اُنکی نسبت کیونکر فیصلہ ہو گیا کہ باطل محض اور حدیث خرافہ ہیں، افی اللہ شک؟ فاطر الارض و السماء!

ابوالکلام آزاد (دہلوی)

العصر

روح اور اُس کا مسکن

اور حکماء مادیین کے احکام و آراء

مشاہیر علما کے احکام و آراء

جو لوگ علم کیمات کی تاریخ سے واقف ہین اُن کے لیے یہ کہنا ضروری نہین کہ نباتات مین بھی روح فرض کی گئی ہے۔ اریزو کا مشہور طبیعی انڈریا سیسل پینیس (۱۵۱۹ - ۱۶۰۳) جو اس وقت تک اطالیا مین دوران خون کا مکتشف سمجھا جاتا ہے اُس نے اپنی کتاب ڈی پلینٹس لائبری مین نباتاتی روح کی ماہیت اور اُسکے مسکن کے متعلق ایک طویل بحث چھیڑی ہے۔

روح کو کہان رہنا چاہیے؟ اسکے متعلق ہمین دقیقہ رس سیسلپینس کے تفصیلی دلائل کے تتبع کی چندان ضرورت نہیں ہے۔ صرف اسقدر جان لینا کافی ہوگا کہ بالآخر روح نباتاتی کو وہ اُس مقام پر رکھتا ہے جہان تنا اور جڑین آکے ملتی ہین۔

یہ مقام جو بعد کو کولیٹ یا گردن کے نام سے مشہور ہوا اسکے تعلق لینوس کے بعد بھی ایک توہم پرستانہ عزت کے ساتھ یہ خیال کیا جاتا ہا کہ یہان زندگی کا کوئی خاص مرکز قائم نہین کیا گیا ہے۔

لیکن فرانس کا ایک مشہور عالم برگنڈین میربٹ المتوفی ۱۹۰۶ء اپنی کتاب مین صاف صاف کہتا ہے "ہم نباتات کی روح کے متعلق کچھ نہین جانتے۔ اسلیے نباتات کے علم وظائف الاعضا مین اس کا فرض کرنا نہ بھی مفید نہین۔"

روح اور مادہ کے زیرین طبقہ مین جو باہمی تعلق ہے اسکی تاریخ کے گذشتہ اوراق اگر کافی مقدار مین اُلٹین تو ہمین نظر آئے گا کہ ابتدا ارسطو عقلی کامون کے لیے نظام عصبی مین کوئی جگہ تسلیم نہین کی گئی تھی۔ حکیم سمجھتے تھے کہ روح دل مین رہتی ہے۔ ارسطو کا بھی یہی خیال تھا۔

یہ خیال ہمد زبوبین کے مشہور فلسفی ڈیکو کے وقت تک زندہ رہا۔ چنانچہ وہ ڈیکارٹ کے علی الرغم ہمیشہ یہی کہتا رہا کہ نفس کا مسکن دماغ نہیں بلکہ دل ہے۔

حجاب حاجز

یونانیوں کا ایک دوسرا قدیم خیال یہ ہے کہ روح یا نفس حجاب حاجز کا مسکن (Diaphragm)[1] ہے جسکی یادگار ہماری زبان کے ایک لفظ (Phrenzy) جنون میں ابھی تک باقی ہے۔ کیونکہ وہ لفظ فرین (Phren) سے مشتق ہے جو یونانی زبان میں حجاب حاجز کو کہتے ہیں۔ فرین سے بہت سے الفاظ مشتق ہوئے جن میں سے بعض متداول اور بعض قلیل الاستعمال ہیں مثلاً Phrenopathia جو اب عقل کے علاج کے لیے بہت کم استعمال کیا جاتا ہے یا Phrenetic جو اس وقت تک عام طور پر ایسے شخص کو کہتے ہیں جسکی عقل میں بآسانی ہیجان اور برانگیختگی پیدا کی جا سکے۔ یا (Phrenitis) جو درحقیقت اشتعال دماغ کے بالکل مرادف ہے۔ اسی طرح Phrenology جو ایک فرضی علم کا نام ہے اسی فرین سے مشتق ہوا ہے۔

یہ خیال کہ روح کا مسکن حجاب حاجز ہے کیونکر پیدا ہوا؟ اسکا سمجھ میں آنا چنداں مشکل نہیں۔ یہ حجاب حاجز سانس کے لیے اس درجہ ضروری ہے کہ اسپر جذبات کے شدید ہیجان کا بہت سخت اثر پڑتا ہے۔ ہر جاندار محسوس کرتا ہے کہ جذبات کے ہیجان سے سینہ ابھر آتا ہے اور سانس پھولنے لگتی ہے۔ اسلیے جذبات کا ہیجان سینے اور اسکے خاص عضلہ حجاب حاجز میں پیدا ہوتا ہے یا رہتا ہے۔ یہ ہے وہ دلیل جو قدما اس خیال کی تائید میں بیان کرتے تھے!

جذبات اور مختلف اعضاء شکم

خیالات قدیم زمانہ سے جس کا آغاز ہمارے حافظہ کی دسترس سے باہر ہے تلی (طحال) کے متعلق یہ خیال نہیں کیا جاتا ہے کہ وہ غیظ و غضب اور رشک و حسد کا گھر ہے؟ انگلستان کا سب سے بڑا شاعر شیکسپیر بھی پیٹ کے مختلف حصوں میں تقسیم جذبات کے مذہب کو تسلیم کرتا تھا۔ مثلاً وہ محبت کی جگہ جگر کو قرار دیتا ہے۔ البتہ وہ دوسرے نظریہ بھی سے ناواقف نہیں ہے۔ بلکہ یقیناً دماغ کے متعلق بھی سن چکا ہے کہ وہی روح کا گھر ہے۔ چنانچہ وہ "شاہ جان" کے ڈرامے میں پانچویں ایکٹ کے ساتویں سین میں کہتا ہے: "بہت دیر ہو گئی اسکی تمام خونیں زندگی فساد پذیر طور پر متاثر ہو چلی ہے۔ اور اسکا دماغ (جسکے متعلق بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ روح کی ناپائدار قیام گاہ ہے) اپنی ہرزہ سرائیوں سے فانی ہستی کے ختم ہونے کی پیشین گوئی کر رہا ہے۔"

روح اور معدہ

بلجیم کا قدیم کیمیادان وان ہیلمنٹ (المتوفی ۱۵۷۷-۱۶۴۴) غالباً ارباب علم میں سب سے آخری شخص ہے جو روح کی جگہ سر کے باہر مانتا ہے۔ وان ہیلمنٹ کے نزدیک روح قعر معدہ میں رہتی ہے اور اسکے ثبوت میں جو دلائل پیش کرتا ہے وہ ایک عجیب و غریب قسم کا ذخیرۂ دلائل ہے۔ اسکے نزدیک اگرچہ روح کے تمام حرکات و احساسات دماغ اور اعصاب کے ذریعہ سے ظاہر ہوتے ہیں مگر اسکا اصلی تخت حکومت قعر معدہ ہی میں ہے اور وہ خود بھی ذہن معدہ میں رہتی ہے" اسکی تائید میں وہ کہتا ہے: "جذبات کا عظیم الشان ہیجان ہمیشہ بالائے معدہ پر محسوس ہوتا ہے" نیز یہ کہ "اگر ایک شخص کا سر توپ کے گولے سے اڑ جائے تو اس کا دل تھوڑی دیر تک حرکت کرتا رہیگا لیکن

---

[1] ڈائی ایفرم (Diaphragm) ایک یونانی نژاد لفظ ہے۔ یہ ایک حیوانی عضلہ کا نام ہے جو سینے اور شکم میں حائل ہے۔ علوم طبیہ کا جب عربی میں ترجمہ ہوا تو اسکے لیے کوئی نیا لفظ نہیں وضع کیا گیا بلکہ اسی کو معرب کر لیا چنانچہ متقدمین کی تصانیف میں ڈائی ایفرم بصورت "ذی افرغما" اکثر ملتا ہے۔ متاخرین نے اس کے لیے "حجاب حاجز وضع کیا" جو ڈائی ایفرم کا قریباً لفظی ترجمہ ہے۔

اگر بالائے معدہ کوئی شدید صدمہ پہنچے تو فوراً دل کی حرکت بند ہوجائیگی اور اُسی کے ساتھ اس کا شعور یا آگہی بھی رخصت ہوجائے گی۔"

اپنے اس خیال کی تعبیر وہ اس نازک انداز مین کرتا ہے:

"اگرچہ وہ ایک جگہ رہتی ہے مگر مقامی حیثیت سے نہین رہتی۔ تم دیکھتے ہو کہ بتی مین روشنی رہتی ہے۔ ٹھیک یہی مثال معدہ اور روح کی ہے۔"

روح اور مرکزی نظام عصبی

روح کے سر سے باہر کسی دوسری جگہ رہنے کے متعلق ان خیالات کے ساتھ خیالات کے بعض دوسرے مدرسے بھی موجود ہین جنکے نزدیک نفس کا تعلق مرکزی نظام عصبی سے ہے۔ ولادت مسیح سے تین سو برس قبل اسکندریہ کے ہیروفلس کا خیال یہ تھا کہ مقدمتالر اس کے سوراخون مین (جو تمام جسم مین سب سے زیادہ اندرونی سوراخ ہین) جو سیال مادہ ہوتا ہے اُسی مین روح رہتی ہے، خاص کر چوتھے سوراخ کو وہ مسکن عقل سمجھتا تھا۔

ہیروفلس کا یہ خیال ہمارے لیے بہت ہی دلچسپ ہے، کیونکہ یقیناً اس سوراخ کے نیچے نظام عصبی کے بعض نہایت اہم مراکز موجود ہین۔ انصاف یہ ہے کہ سب سے پہلے کلاڈیس گیلن (متوفی ۲۰۰ء) نے یہ تعلیم دی تھی کہ "دماغ ہی وہ جگہ ہے جہان روح اور ذہن دونون رہتے ہین۔"

ہم گیلن کی موت اور ویسیلی اسکی عظیم الشان تصنیف کی درمیانی صدیون کو نظر انداز کرسکتے ہین کیونکہ دماغی نوحوں کے لیے کسی مقام کے تعین کے متعلق وضاحت کے ساتھ غور کرنے مین اُن سے کسی قسم کی مدد نہین ملتی۔

علم تشریح کا اب الاباء ویسیلی اس (۱۵۱۴-۱۵۶۴) جسکے لیے علم وظائف الاعضاء کے مسائل کسی طرح بھی دلچسپی سے خالی نہ تھے نفس کے متعلق اس حیثیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ اسکا تعلق دماغ سے ہے، حسب ذیل عالمانہ ریمارک کرتا ہے:-

"لیکن دماغ اپنے وظائف[1] تخیل استدلال، غور اور حافظہ یا اور کسی طرح، غرضکہ خواہ تم اس شخص کا مذہب اختیار کرو یا اُس شخص کا، اور چاہے تم اصلی روح کی چند قیام گاہون کا نام لینے کو ترجیح دو یا کوئی ترتیب درجہ بندی قائم کرو، کیسے انجام کردیتا ہے؟ مین اسکے متعلق کوئی بھی رائے قائم نہین کرسکتا، اور نہ میرے خیال مین اسکے متعلق کوئی امر علم تشریح سے یا ان علماء الٰہیات کی امداد سے دریافت ہوسکتا ہے جو حیوانات کو قوت استدلالی بلکہ ان تمام قوتون سے محروم سمجھتے ہین جنکو ہم اصلی روح کہتے ہین۔"

"اسلیے کہ دماغ کی ساخت کے لحاظ سے بندر، کتا، بلی، گھوڑا، اور تمام چوپائے جن کا امتحان مین نے اب تک کیا ہے بلکہ تمام پرندے اور ہر قسم کی مچھلیان تک انسان سے ہر ایک شے مین مشابہت رکھتی ہین، اور نہ تشریح کے وقت ہمین کوئی ایسا فرق نظر نہین آتا جس سے یہ معلوم ہوسکے

---

[1] اصلی عبارت مین لفظ function ہے؛ انگریزی مین فنکشن اور ڈیوٹی دو ایسے لفظ ہین جنکے معنی اگرچہ متحد ہین مگر محل استعمال مختلف ہے۔ عربی مین فنکشن کے لیے بحالت مفرد "وظیفہ" اور بحالت جمع "وظائف" آتا ہے۔ ڈیوٹی کے لیے بحالت مفرد "واجب" اور بحالت جمع "واجبات" استعمال کیا جاتا ہے، لیکن اردو مین فنکشن اور ڈیوٹی دونون کے لیے لفظ "فرض" ہی بولا جاتا ہے جو اگرچہ صرفاً غلط نہین ہے مگر توسیع زبان اور تدقیق علمی کے لحاظ سے صحیح نہین، اسی لیے ایک عرصے سے ہم وظیفہ اور وظائف کو فرائض کے معنون مین استعمال کرتے ہین تاکہ اپنے صحیح معنون مین یہ الفاظ رائج ہوجائین۔ یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ اردو کے بڑے بڑے مترجمون نے بھی آجتک اس فرق کو محسوس نہین کیا، اور ہر جگہ فرض ہی کا لفظ لکھتے رہے جب تک ملک مین عربی دان مترجم علوم جدیدہ پیدا نہونگے اردو کی بدبختی لاعلاج رہے گی۔ اس حقیقت پر روئیے تو بہت سے مدعیان علم و ترجمہ کو شاق گذرتا ہے۔ یہ دوسری مصیبت ہے۔

کہ حیوانات کے وظائف سے بعین اسطرح بحث کرنا نہیں چاہیے' جس طرح کہ ہم انسان کے وظائف سے بحث کرسکتے ہیں۔"

"اور اگر جسم و دماغ کے باہمی تناسب کے لحاظ سے دیکھیے تو سب سے زیادہ ایپ اور اسکے بعد کُتّے کا دماغ بڑا نظر آتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جن جانوروں کے متعلق معلوم ہوگیا ہے کہ اُنھیں اصلی روح کے قوئی ملے ہیں اُنکے دماغ بھی نسبتہً بڑے ہیں۔"

"مین نے ورزشین علماء الٰہیات اور دنیادار فلاسفہ کی تحریرون میں تین جونون کے متعلق جو کچھ پڑھا ہے اُسپر مجھے حیرت ہوتی ہے۔"

اس آخری فقرہ میں ڈیلی اس جس خاص راے سے اتفاق نہ کرسکا وہ لوگون کا یہی خیال تھا کہ دماغ کا ایک بہت ہی اندرونی جوف قدرت نے صرف احساسات کے لیے رکھا ہے۔ مثلاً اس کا درمیانی حصہ تخیل کے لیے ہے۔ آخری حصہ حافظہ کے لیے وغیرہ وغیرہ۔

دراصل اس خیال کے موجد علماء عرب ہین جسے بعد مین ڈنس اسکوٹس اور طامس آکنیونس وغیرہ نے اختیار کیا۔

روح اور پی نی ال گلینڈ

ان کوششون کے بعد روح مین ایک مقامی حیثیت پیدا کرنے کے لیے جو کوشش کی گئی اُس کا بانی ایک فرانسیسی عالم رینی ڈیکارٹی ہے۔ یہ کوشش جس قابلیت سے کی گئی تھی اُسیقدر اسے شہرت بھی حاصل ہوئی۔ یورپ کے فلسفی اعظم نے روح کو پی نی ال گلینڈ[1] مین رکھا ہے۔

یورپ کے اس جلیل القدر فلسفی نے روح کے قیام کے لیے پی نی ال گلینڈ کو تجویز کیا۔ مقامی مسکن کے اس انتخاب کی تائید مین دلائل تو کیا البتہ اُن کی ایک نمایش ضرور تھی۔ اسکے موجودہ خیال کے مطابق روح ایک ایسی شے تھی جو نہ تو تقسیم ہوسکتی تھی اور نہ جگہ مین پھیل سکتی تھی۔ اس لحاظ سے اسکے رہنے کے لیے جسم کا کوئی حصہ سادہ اور تنہا پی نی ال گلینڈ کے برابر موزون نہ تھا۔ ڈیکارٹ کہتا تھا کہ یہان روح ایک حاکم یا نگران کی طرح رہتی ہے' تمام حواس اسے اطلاع دیتے رہتے ہین اور وہ اُن اطلاعات کے مناسب ہر طرف احکام جاری کرتی ہے۔ مگر ڈیکارٹ کے خیالات کا ایک پہلو بالکل تاریک تھا۔ کیونکہ اسکے متبعین کو ادنی درجہ کے حیوانات مین نفس ناطقہ کے وجود سے انکار تھا' اور اس بنا پر اُنکی یہ تعلیم تھی کہ وحشی مخلوقات کے اعضا کی حرکت نادانستہ اور بلا ارادہ ہوتی ہے۔ اس فلسفیانہ حماقت کا عملی نتیجہ یہ نکلا کہ بعض ڈیکارٹیون نے ادنیٰ درجہ کے حیوانات پر صریح ظلم کیے۔

ڈیکارٹ کی بڑی بدقسمتی سے جب اس خوردبین کے ذریعہ سے اس عضو کا امتحان کیا گیا' تو معلوم ہوا کہ اسمین کچھ لاخر خلیے' کوملا' چونا' اور بعض اور ارضی مادہ کے بلورات ہوتے ہین۔ غرض روح کے لیے یہ ایک نہایت ہی ناموزون قیامگاہ تھا۔

اسکے بعد اب ہمین اس موضوع پر ایک جلیل القدر انگریز اور اپنے آغاز عمر مین ہاروے کے شاگرد طامس ولس ایم۔ ڈی کے خیالات پر توجہ کرنا چاہیے۔ ولس نے اگرچہ اعصاب پر بہت کچھ لکھا ہے مگر عام ناظرین کو ڈیکارٹ کی طرح اسکے خیالات بہت کم معلوم ہونگے۔ ڈیکارٹ کے خیال کے بموجب تو روح حتی الامکان قریباً ایک ناقابل تقسیم نقطہ ہے جو ایک ایسے عضو مین رہتا ہے جو بالکل بسیط و وحید ہے۔ مگر ولس کے نزدیک دو روحین ہین جن مین سے ایک خون مین وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی ہے اور دوسری نظام عصبی مین رہتی ہے۔ ولس کا دعوی تھا کہ روح خون مین اسطرح رہتی ہے جیسے آگ مین شعلہ اور نظام عصبی مین اسطرح جیسے آگ مین روشنی۔ دماغ سے روح کا جس طرح کا تعلق ہے اسکی تشریح ولس نے یہ کی ہے:

"خون کا سب سے زیادہ ہلکا اور روح آمیز حصہ شرائین کے ذریعہ سے دماغ کی طرف بڑھتا ہے' یہان پہنچ کے اُنکی تقطیر ہوتی ہے اور حراتی روحین نکلتی ہین۔ یہ روحین دماغ کے گلے اور پچھلے حصون پر چڑھتی ہین اور

---

[1] دماغ کے بالکل اندرونی حصے مین ایک چھوٹا سا غدود مٹر کے دانے کے برابر ہوتا ہے جسکو موجودہ علم تشریح کی اصطلاح مین پی نی ال گلینڈ کہتے ہین۔

وہاں سے تمام اعصاب میں اُتر جاتی ہیں"

اختیاری احساسات و حرکات کے لیے وہی روحیں ہیں جو دماغ کے اگلے حصہ میں رہتی ہیں اور پچھلے حصہ میں جو روحیں رہتی ہیں وہ غیر اختیاری حرکات کے لیے ہیں۔

موجودہ تجارب کی روشنی میں یہ آخری خیال دلچسپ ثابت ہوا ہے۔

اگرچہ جس طرح بیان کیا گیا ہے ہم حرف بحرف اُسے تسلیم نہیں کر سکتے تاہم یہ خیال اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے جو اب ایک امر واقعہ ہے یعنی یہ کہ دماغ کے پچھلے حصے کی تمام کارروائیاں شعور کے دائرے سے باہر ہوتی ہیں

یقیناً وِلس کو یہ خیال جھلملاتا ہوا نظر آیا تھا کہ احساسات اور اُنکی یادگاریں دماغ کے مایۂ خمیر کے تغیرات ہیں۔ چنانچہ اس نے ان صورتوں کا تذکرہ اسی انداز میں کیا ہے۔

وِلس کی ایک کتاب جس کا نام "حیوانات کی روح کے متعلق" ہے اسم با مسمّٰی ہے۔ اس کتاب میں وِلس نے روح کو دماغ کے نصف دائروں میں رہنے کی اجازت دی ہے۔

لیکن بہرحال وہ بیان بھی اُن لوگوں کی بدولت چین سے رہنے نہ پائی جن کو یقین ہو گیا تھا کہ رہنے کے لیے کوئی محدود جگہ جسمانی ڈھانچے کے اندر چاہیے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ اس خیال کی مخالفت کرتے رہے جب ہم علم سائنس کے درخشاں نوجوان ڈنمارکی نیکولس سٹینسن المتوفی [illegible] کے پاس آتے ہیں تو ہم اُس اولین کوشش کے پاس آتے ہیں جو موجودہ رائے کے اظہار کے لیے کی گئی ہے یعنی یہ کہ "وظائف" کی جگہ دماغ کے اندر ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے جسے علم القیافہ والے نقل کرتے ہیں اور علم وظائف الاعضاء والے مانتے ہیں۔

اسٹینسن نے جہاں عصبی مادہ کے سفید مغز میں ریشوں کے وجود پر بحث کی ہے وہاں اس خیال کو اس طرح ادا کیا ہے۔

"اگر درحقیقت سفید مادہ بالکل ریشہ دار ہے تو ہم کو یقیناً یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ ان ریشوں کی ترتیب کسی خاص ایسی وضع پر رکھی گئی ہے جس کے ساتھ یقیناً حرکات کا اختلاف وابستہ ہے۔

لیکن اس تجربہ کے ساتھ اتنے مشکلات ہیں کہ نہ معلوم کسی خاص طرح کی تیاری کے بغیر ہم اس طریق امتحان کو عمل میں آتے کبھی دیکھ بھی سکیں گے یا نہیں؟"

"ہم کو اس خاص طریقہ کی تیاری کے لیے دو سو برس تک انتظار کرنا پڑا"

یہ خیال علماء کے دل میں عرصہ سے جاگزیں تھا کہ ایک روح تو مرکزی ہے اور دوسری اعصاب، حواس اور متحرک اعصاب میں کارفرما ہے۔ چنانچہ سر اسحٰق نیوٹن جیسے دماغی قوتوں کے دیوتے نے بھی یہی فرض کیا ہے۔

لیکن مشہور جرمن منکر جارج ارنسٹ المتوفی [illegible] جو احتراق کے خیال کا بانی ہے، اُس نے پھر یہ خیال ظاہر کیا کہ روح تمام جسم میں ساری و نافذ ہے۔ اُس نے کہا کہ روح درحقیقت ایک "حساس ہوا" ہے جو تمام جسم میں نافذ ہو کے ہر عضو اور ہر نسیج پر قابض ہو جاتی ہے۔ اسکے ان خیالات کو ہوائیت اور ان خیالات کے قائل کو ہوائی کہتے ہیں۔

اس مسئلہ کے متعلق موجودہ ارباب فکر اب اس سوال پر پہنچے ہیں کہ کیا احساس کے لیے صرف دماغی عمل کی ہمراہی کی ضرورت ہے یا اسکے ساتھ زیرین مرکزوں اور پی تی ال گلینڈ کی معیت بھی ہونی چاہیے؟ اس سوال کا جواب اس مسئلہ کا حقیقی حل ہے۔

اس وقت علماء حیات میں ایک شخص بھی نہیں ملے گا جو یہ کہتا ہو کہ احساس میں بیداری پی تی ال گوارڈ کی کارگذاری سے پیدا ہوتی ہے کیونکہ نظام عصبی کے متعلق جو تجارب ہوئے ہیں وہ اس نتیجہ کے منافی ہیں رہا ذہن اور ہیجان جذبات کے لیے کسی مقام کی تعیین کا مسئلہ تو اُسکی حالت یہ ہے کہ احساس کے مادی تعلقات کے متعلق علمی دستکاری طور پر جو کچھ تحقیق ہو چکا ہے اُس سے علماء قیافہ نہ آگے بڑھے ہیں نہ پیچھے ہٹے ہیں۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیے کہ جان جوزف گال المتوفی

سنہ ۱۸۲۰ء) جسکے متعلق مشہور ہی کہ وہ علم القیافہ کا بانی ہی اوہ بھی اسکا قائل تھا۔ کیونکہ یہ تو اُس پر ایک بہتان ہی۔ وہ بیچارہ نہ تو اس نام کا واضع ہی اور نہ ان خیالات و عقائد کا بانی جن کا نام علم القیافہ رکھا گیا۔

یہ صحیح ہی کہ گال پر اس خیال کا رنگ چڑھ گیا تھا کہ بعض عقلی اوصاف کا مسکن دماغ ہی مگر کب؟ جب اُسکا سن آگیا تھا۔

اُس نے بجا طور پر یہ فرض کیا ہی کہ عقلمندانہ گفتگو اور یادداشت کے لیے خاص خاص مرکز ہین۔

بیشک گال نے جرمنی کی مختلف یونیورسٹیون مین مختلف دماغی وظائف پر تقریرین کین لیکن جس حیثیت سے آج ہم علم القیافہ کو جانتے ہین، یہ بات اسمین گال کے ایک رفیق نے پیدا کی جو کمتر ایک عالم اور زیادہ سے زیادہ ایک ہر دل عزیز خطیب تھا۔

علم القیافہ کے عقائد یا اسکی ہرزہ سرائیان اسقدر مشہور اور ان کی تغلیط اتنے بار ہو چکی ہی کہ اب ہم انکے دام تزویر مین تو نہین آسکتے۔ البتہ یہ ممکن ہی کہ ہم مین سے بہت سے لوگ ایسے ہون جنکو اس جوش و خروش کا علم نہ ہو جو علم القیافہ نے گذشتہ صدی کے ابتدائی سالون مین پیدا کیا تھا۔

ایڈنبرا مین علم القیافہ کی جو سوسائٹی قائم ہوئی تھی اسمین ۱۲۰ ممبر تھے۔ لندن کی سوسائٹی مین ۳۰۰ ممبر تھے۔ اور گلاسگو کے "اینڈرسن کالج" مین اسکی ایک کرسی (چیر) قائم کی گئی تھی۔

اب یہ سوال نہین ہی کہ روح کہان رہتی ہی؟ سوال صرف یہ ہی کہ دماغی نسیج کا کون سا تغیر ایسا ہی جس کی وجہ سے عقلی عمل کے لیے جسمانی عمل کا رفیق پیدا ہوتا ہی یعنی جب تو ار عقل کام کرتے ہین تو اُنکے ساتھ تو ار جسمانی بھی کام کرنے لگتے این۔ رہا یہ کہ ان دونون عملون مین نہایت شدید ارتباط و وابستگی ہی، تو یہ ایک ایسا امر ہی جسمین کسی کو شک نہین۔

ابھی تھوڑے عرصہ قبل تک علماء قیافہ اسپر قائم تھے کہ وہ احساس کے حالات کو اُن عصبی خلایا کے حالات پر محمول کر دیا کرتے تھے جو ایک گورے رنگ کے مادہ مین ہوتے ہین۔ یہ مادہ ایک غلاف مین لپٹا ہوا اُن نصف دائرون مین ہوتا ہی جو دماغ کے اندر ہوتے ہین۔

لیکن آکسفورڈ کے ڈاکٹر میک ڈوگل وظائف الاعضائی علم القیافہ کے ماہر ہین۔ انھون نے بعض ایسی شہادتین پیش کی ہین جن سے پتہ چلتا ہی کہ بعض ایسے نقطے ہین جہان عصبی خلایا کے اعمال آکے ملجاتے ہین اس طرح جیسے احساس کا مرکز یہی خلایا ہین۔

یہ مسئلہ تمام تر خصوصیین (اکسپرٹس) کی دلچسپی کا ہی اور وہی اسکو حل بھی کر سکتے ہین۔

لیکن اگر یہ مسئلہ حل ہو جائے، جب بھی یہ واقعہ تو بدستور باقی رہے گا کہ علم طبیعی (نیچرل سائنس) کو کسی ایسے نفس کا علم نہین جو مادہ سے علیحدہ ہو، بلکہ جو کچھ اسکے علم و تجربہ مین آیا ہی وہ یہ ہی کہ ایک خاص قسم کا مادہ ہی جس کا تعلق اس شے کی بقا و ترقی سے ہی، جس کو ہم نفس کہتے ہین۔

ابوالکلام آزاد (دہلوی)

العصر

غرائب الافلاک

اولم ینظروا فی ملکوت السماوات والارض وما خلق اللہ من شئی؟

گرمیوں کی راتوں میں جبکہ آسمان ابر و غبار سے صاف، اور چھوٹے بڑے ستاروں سے جگمگا رہا ہو تو کون ایسا بیدل ہے جسکی نظر ایک بار اس باصرہ نواز جمال طبیعی کی طرف نہ اٹھ جانے لگی ہو؟ ان دیکھنے والوں میں کتنے ہی ایسے ہونگے جو ایک بار تو ضرور اپنے دل سے پوچھ لیتے ہونگے کہ :-

چیست این گنبد طلسمی کار؟

لیکن اگر آج جبکہ فطرت کے نوامیس و اسرار کے کشف و ادراک میں انسان کو اس درجہ توغل و انہماک ہے، ہمارے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے تو آج سے بہت پہلے اسوقت بھی لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہو چلا ہے، جبکہ نوامیس طبیعتہ سے انسان کے جہل اور عدم ارتقاء فکری کا یہ حال تھا کہ وہ ہر اثر طبیعی کے لیے ایک علحدہ خدا مانتا تھا، اور اسطرح اسکے ہزارہا خود ساختہ معبود تھے جن کے ہیاکل و معابد میں اسکا سر نیاز خم اور دست دعا بلند ہوتا تھا۔

حیوان اور انسان، دونوں ایک ہی شے کو دیکھتے ہیں، وہ تماشا گر حیوان کیلیے ضرورت کی ہوتی ہے اور اسکو اس وقت اس شے کی حاجت بھی ہوتی ہے تو وہ رکتا ہے اور اس سے متمتع ہوتا ہے، ورنہ ایک غلط انداز نظر ڈالتا ہوا گذر جاتا ہے،

لیکن انسان بہر حال رکتا ہے اور سوچتا ہے کہ یہ کیا ہے؟ کہاں سے آئی؟ کیونکر آئی؟ وغیرہ وغیرہ

یہی شے ہے جسکو "تجسس و تفحص" کہتے ہیں، اور یہی انسان کے تمام علوم و معارف کا سرچشمہ، اور اسکے مساعی و مجاہدات ذکریہ کا محرک اصلی ہے اور اسی لیے قرآن کریم نے جا بجا تدبر و تفکر پر زور دیا ہے،

لیکن یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اس تجسس کے عمل کا آغاز زمین اور اسکے قرب و جوار کی اشیاء کے بدلے سب سے پہلے آسمان سے ہوتا ہے!

تم نے دیکھا ہوگا کہ بچے جب پوری طرح بولنے لگتے ہیں اور اپنی ماں کی آغوش میں شب کو صحن میں بیٹھتے ہیں تو کون و مانی الکون کے متعلق انکے سوالات کا آغاز آسمان اور ستاروں ہی سے ہوتا ہے وہ پوچھتے ہیں کہ آسمان کیا ہے؟ کیا ستارے اسمین جڑے ہوے ہیں؟ چاند بھی جڑا ہے؟ چاند کیا چلتا ہے کیا اسکے بھی ہماری طرح پاؤن ہیں۔

اسکے مقابلہ میں آب و آتش خاک و باد اشجار و اثمار حیوانات و جمادات یعنی جو چیزیں زمین کے متعلق ہیں انکی نسبت سوال کی نوبت بمشکل سن شعور تک پہنچنے کے بعد آتی ہوگی۔

نوع کا دماغ بالکل افراد کے دماغ کے مشابہ ہوتا ہے پس جسطرح کہ افراد کے دماغ پہلے سما و مانی السما کی تحقیق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اسیطرح غالباً نوع کا دماغ بھی سب سے پہلے سما و مانی السما کی طرف متوجہ ہوا۔

وجہ تقدم خواہ صرف یہی ہے یا اسکے علاوہ اور اسباب بھی ہیں مگر تاریخ علوم کا یہ ایک مسلمہ مسئلہ ہے کہ انسان کا قدیم ترین سرمایہ علمی آسمان ہی کے متعلق ہے۔

دنیا کے قدیم ترین لوا برداران علم ہندوستانی مصری اور کلدانی ہیں اور تاریخ علوم کا یہ ایک اہم مبحث رہا ہے کہ ان میں سے شرف اولیت کا حقدار کون ہے۔

اس بحث کا نہ تو یہ موقع ہے اور نہ ضرورت ہے اس لیے ہم اس کو نظر انداز کرتے ہیں، شرف اولیت خواہ کسی کو حاصل ہو، مگر تینون قومون میں علوم فلکیہ نہایت ترقی کر چکے تھے انکے جانشین یونانی ہوے، یونانیون میں بھی علوم فلکیہ کی گرم بازاری رہی۔

ان تمام مباحثین نے علوم فلکیہ کی بیحد خدمت کی اور بعض مسائل تو ایسے دریافت کیے کہ اگر آج باین ہمہ تقدم علوم و توسع ذرائع اکتشاف وہ مسائل دریافت ہوتے تو علمی دنیا صدائے تحسین و آفرین سے گونج اٹھتی۔

ان اسلاف کے دریافت کردہ بعض قواعد ایسے ہیں جن سے گو بوقت کسی وجہ خاص سے صحیح نتائج نہ نکالے جا سکیں، مگر یہ قواعد بجائے خود بالکل صحیح اور بہترین قواعد ہیں اور آج ہمارے بہت سے مسائل کا مبنی و اساس۔

مثلاً زمین، آفتاب، اور ماہتاب کو لو، زمین سے یہ دونون ستارے بہت دور ہیں مگر ان دونون کے بُعد میں کیا نسبت ہے؟ ارسترافس نے آج سے دو ہزار دو سو برس پہلے قیاس سے کہا تھا کہ یہ نسبت انیس اور ایک کی ہے یعنی چاند زمین سے جسقدر دور ہے سورج اس سے ۱۹ گونہ زیادہ دور ہے۔ ہر چند کہ ارسترافس کا یہ قیاس صحیح نہیں آفتاب و ماہتاب کے بُعد میں اس سے کہین زیادہ نسبت ہے مگر با این ہمہ جس قاعدہ کی بنا پر اس نے یہ نتیجہ نکالا تھا وہ قاعدہ بالکل صحیح اور اس درجہ دقیق و غامض ہے کہ اس زمانے کے فلکیین میں سے عوام ایک طرف خواص کا ذہن بھی شاید وہان تک نہ پہنچا۔

تمام علوم کی طرح علم الافلاک پر بھی تقدم و تاخر اور ترقی و تنزل کے مختلف دور گزر رہے ہیں۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ یہ اوج ترقی پر تھا، نئے ستارون کے اکتشافات، مقدار رفتار، سمت رفتار، ایام طلوع و غروب وغیرہ وغیرہ مسائل کی تحقیقات سے اسکے سرمایہ میں اضافہ ہوتا رہتا تھا، پھر وہ زمانہ آیا کہ تنزل شروع ہوا، یہان تک کہ بالآخر رفتار ترقی جمود و سکون سے بدل گئی، اسوقت کے علم الافلاک کا سرمایہ صرف اسلاف کے آرا و افکار تھے۔

یہی حالت رہی یہان تک کہ گلیلیو اطالی پیدا ہوا گلیلیو نے اس جمود کو حرکت سے بدلا اور اس انقلاب عظیم کی داغ بیل ڈالی جو ہم اسوقت دیکھ رہے ہیں۔

دراصل اس انقلاب کا سبب وہ چھوٹی سی دوربین تھی جو اس نے سنہ ۱۶۰۹ء میں بنائی تھی۔ اس دوربین سے اس نے ستارون کو دیکھنے

مین مدد لی اس تجربہ مین جب اسکو کامیابی ہوئی تو اسی اصول پر اُس نے ایک بڑی دوربین بنائی۔ اس بڑی دوربین کا پہلا کارنامہ یہ ہی کہ مشتری کے گرد گردش کرنے والے چاند نظر آ گئے۔

گلیلیو کی دوربین ایک خاص حد تک بڑھائی جا سکتی تھی۔ پس اگر آلات رصدیہ کی ترقی اس دوربین تک آ کے رک جاتی تو یقیناً یہ انقلاب اسقدر عظمت و وسعت اختیار نہ کر سکتا۔

لیکن بند ٹوٹ چکا تھا اور عرصہ کے رکے ہوے پانی مین حرکت شروع ہو گئی تھی، یہ قاعدہ ہی کہ جب کسی جمود طویل کے بعد حرکت شروع ہوتی ہی تو پھر بغیر کسی شدید امتداد کے وہ نہین رک سکتی۔ چند ہی سال گذرے تھے کہ اسی اصول پر بلور سے دوربینین بنائی گئین جو بہت زیادہ بڑھائی جا سکتی تھین، چنانچہ اسی زمانہ مین ہرشل نے اتنی بڑی دوربین بنائی جس کا چونگا ۴۰ قدم رفیٹ لمبا تھا۔ اس دوربین سے اُس نے وہ ستارے دیکھے، جو گو حجم مین آفتاب سے بہت زیادہ بڑے ہین مگر اپنے بعد مسافت کی وجہ سے کروڑون سال مین اُن کی روشنی ہم تک پہنچتی ہی۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ نور کی رفتار فی ثانیہ (سکنڈ) دو لاکھ میل ہی

دوربین کی اس غیر معمولی ترقی نے اکتشافات کا دروازہ کھول دیا اور ایسے ایسے عجیب و غریب حقائق ہیئت بے نقاب ہوے جنکا وہم و گمان بھی قدما کو نہ تھا۔

تم نے بارہا تارون بھری رات مین چھوٹے چھوٹے صدہا ستارے چمکتے ہوے دیکھے ہون گے، مگر شاید کبھی تمھین ان کی اصلی حقیقت کا وہم بھی نہ ہوا ہو گا۔

یہ ترقی یافتہ دوربین بتاتی ہین کہ یہ ستارے جو ہمین اسقدر صغیر الحجم مثل نقطے کے نظر آتے ہین، دراصل ہمارے آفتاب کی طرح بڑے بڑے آفتاب ہین۔ ان مین سے بعض ایک ہین اور بعض دو کا مجموعہ۔ انکے رنگ کی طرح ان کا مادہ قوام یا مایۂ خمیر بھی مختلف ہی بعض گیس سے ہیں اور بعض چھوٹے چھوٹے ذرات سے مرکب ہین۔

اسی طرح ایک ستارہ ہی جسے عرب "غول" کہتے ہین۔ اس ستارہ کی یہ حالت ہی کہ کبھی کبھی اسقدر ماند پڑ جاتا ہی کہ بمشکل نظر آتا ہی۔ عنترہ عبسی ایک مشہور شہسوار اور نبرد آزما عربی شاعر ہی وہ کہتا ہی ؂

والغول بین یدی یظہر تارۃ
ویکاد یخفی مثل ضوء المشعل

ترجمہ:۔ اور ستارہ غول کبھی تو اسقدر پر نور ہوتا ہی کہ خوب ظاہر و واضح نظر آتا ہی اور کبھی اسقدر ماند ہو جاتا ہی کہ مشعل کی روشنی کی طرح معلوم ہوتا ہی کہ چھپ جانے کو ہی

اس تغیر و ظلمت و نور کے اسباب پہلے غیر معلوم تھے مگر اب تحقیق ہو گئے ہین۔ اصل یہ ہی کہ جسطرح ہماری زمین کے گرد چاند گردش کرتا ہی اسی طرح اس ستارے کے گرد بھی ایک اور ستارہ گردش کرتا ہی۔ یہ دوسرا ستارہ خود روشن نہین ہی بلکہ تاریک ہی۔ اس لیے جب وہ گردش کرتے کرتے غول کے اس حصے کے سامنے آ جاتا ہی جو ہماری زمین کے بالمقابل ہی تو غول کا نور کم ہو جاتا ہی اور ہماری نظر سے تقریباً مخفی و مستور ہو جاتا ہی۔ پھر یہ دوسرا ستارہ جسقدر ہٹتا جاتا ہی اُتنا ہی غول بھی نظر آتا جاتا ہی، یہان تک کہ بالکل درخشان اور چمکتا ہوا نمایان ہو جاتا ہی۔

ستارہ "قطب" دراصل چار ستارون کا مجموعہ ہی، جن مین سے تین تو نہایت درخشان ہین اور ایک کسی قدر کم روشن ہی۔

"رجل الجبار" دراصل دو آفتاب ہین۔ اس مین سے ایک سفید اور ایک نیلگون ہی۔

تم نے دیکھا ہو گا کہ شب کو چمکتے ہوے تارون مین چند ستارون کے گچھے یا جھرمٹ نظر آتے ہین۔ موجودہ تحقیق یہ ہی کہ اس قسم کے ستارے کم از کم ایک لاکھ ۲۰ ہزار ہین، بلکہ اغلب یہ ہی کہ تمام ستارون مین سے ایک ثلث اسی طرح مزدوج ہین۔

جس طرح ہمارا عالم شمسی ہے اسی طرح ان نجوم مزدوجہ کے بھی عوالم شمسیہ ہیں۔ بالفاظ واضح تر جسطرح ہمارے عالم میں ایک آفتاب ہے جو اپنی جگہ پر ساکن ہے اور اسکے گرد تمام دوسرے سیارے گردش کرتے ہیں اسی طرح ان نجوم مزدوجہ میں بھی ایک ستارہ مثل مرکز کے اپنی جگہ پر قائم ہے اور باقی ستارے اسکے گرد پھر رہے ہیں۔ البتہ ہمارے عالم اور ان ستاروں کے عوالم میں فرق یہ ہے کہ ہمارے عالم کے ستاروں کے حجم میں باہم بہت فرق ہے مثلاً ہمارا آفتاب مشتری سے ۱۰۴۷ گونہ بڑا ہے اور اپنے تمام سیارات مجتمعہ سے ۷۴۵ گونہ۔ مگر ان نجوم مزدوجہ کے عالموں میں شاید اسقدر تفاوت نہیں وہاں بڑے سے بڑا ستارہ چھوٹے سے چھوٹے ستارے سے چار گونہ بڑا ہے۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ اغلب یہ ہے کہ ان ستاروں میں سے ہر ستارہ ہمارے آفتاب کے مانند ہے یعنی اتنا ہی یا اُس سے زیادہ بڑا ہے اور اسکے گرد دیگر سیارات گردش کرتے ہیں۔ اس خیال کا جزو اول یعنی کبر حجم تو ایک غیر مختلف فیہ مسئلہ ہے، البتہ دوسرا جزو یعنی اسکے گرد ستاروں کی گردش البتہ ایک حد تک محل نظر ہے، کیونکہ اسکے ثبوت کی کوئی دلیل نہیں، اور برعکس اسکی نفی کی تائید میں دلائل ملتے ہیں۔

پہلے رصد کا قاعدہ یہ تھا کہ رصدگاہ میں بیٹھکے آسمان کی طرف دیکھتے رہتے تھے ظاہر ہے کہ یہ طریقہ کسقدر وقت ضائع کرنے والا اور موجب تعب و دقت تھا، مگر اختراعات کی کثرت و آلات و ادوات کے توفر نے جہاں اور بہت سی انسانی مصائب کو کم کیا، وہاں اس علمی مصیبت کو بھی تسہیل کر دیا۔

علماء نے رصدگاہوں میں بیٹھنا کم کر دیا، اسکے بدلے دوربینوں کو اسطرح رکھا کہ وہ ستاروں کے ساتھ ساتھ گھومتی جائیں پھر ان دوربینوں سے آلات تصویر کو اسطرح ملا دیا کہ وہ بھی دوربینوں کے ساتھ ساتھ گھومتے ہیں اور اجرام سماویہ کے ہر رخ کا عکس ان آلاتِ تصویر پر پڑتا ہے اسطرح بغیر رصدگاہوں میں بیٹھنے کی زحمت گوارا کیے وہ تمام باتیں معلوم ہو جاتی ہیں جو کئی کئی دن تک بیٹھنے کے بعد معلوم ہوتی تھیں۔ یہ آلات تصویر ستاروں کی ہر نقل و حرکت کی تصویر لے لیتے ہیں۔ گویا اب یہی آلات تصویر ان علماء راصدین کی قائم مقامی کرتے ہیں جو رصدگاہوں میں لیل و نہار مراقب رہا کرتے تھے۔

اس طریقہ سے علاوہ اقتصاد وقت و محنت کے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ستارہ خواہ کتنی ہی دور ہو اسکا نور چاہے جسقدر بھی کم ہو اور حرکت خواہ کتنی ہی خفیف ہو مگر لوحِ تصویر پر ہر نقل و حرکت پوری پوری آجاتی ہے اور وہ دقیق و تاریک چیزیں جو آنکھ کی دسترس سے باہر تھیں اور اسلیے رہ جاتی تھیں اب کسی طرح نہیں رہ سکتیں؟

فن آلات سازی کی ترقی نے وہ وہ غیر معقول کرشمے دکھائے ہیں کہ اگر آج سے چند صدیاں پہلے یہ آلات ہوتے تو صاحب آلات ساحر یا شعبدہ باز سمجھا جاتا۔ اگر آج سو برس پہلے کے لوگ زندہ ہو جائیں اور دنیا کے موجودہ حالات دیکھیں تو غالباً اپنے آپ کو عالم خواب یا کسی طلسم کدہ میں سمجھیں کیونکہ آج اسرار و نوامیس طبیعت کے انکشاف اور آلات کی ترقی سے جو حیرت انگیز کام انجام پا رہے ہیں، ان تک پہلوں کا وہ تخیل بھی نہ پہنچا تھا جو ساحروں اور اجنہ کی ہوش ربا داستانیں تصنیف کیا کرتا تھا۔

ترقی آلات کی ایک مثال وہ آلہ ہے جسکو رنگ نما[1] spectroscope کہتے ہیں اس آلہ سے نور کے مختلف رنگ جدا کیے جاتے اور ان رنگوں کے

---

[1] یہ نام دو لفظوں سے مرکب ہے ایک اسپیکٹرا اور دوسرا اسکوپ۔ اسپیکٹرا جمع ہے اسپیکٹرم کی جو ایک لاطینی نژاد کلمہ ہے۔ اسپیکٹرم کے لغوی معنی ہیں وہ مختلف رنگ جو آنکھیں بند کرنے کے بعد نظر آتے ہیں۔ مگر اصطلاح میں نور کے ان رنگوں کو کہتے ہیں جو ایک مثلث آلہ کے ذریعے سے جسے prism کہتے ہیں جدا کر کے اس طرح دکھائے جاتے ہیں گویا وہ کسی جالی پر پھیلا دیے گئے ہیں۔ اسکوپ کے معنی ہیں "نما"، پس اسپیکٹرا اسکوپ کے لفظی معنی ہوئے "الوان نور نما" اور یہی اس آلہ کی تعریف ہے۔ لیکن "الوان نور نما" کی ترکیب طویل و ثقیل تھی، اگر نور حذف کر دیا جائے اور

امتحان و اختیار سے اس جسم منور کے مادہ کا سُراغ لگایا جاتا ہے مثلاً ایک جسم منور مسی ہے تو اسکے نور کی تحلیل سے سبز خطوط پیدا ہونگے یا اگر رنگ کا ہے تو نیلگون خطوط پیدا ہون گے، و قس علیٰ ذلک۔

اس آلہ رنگ نما سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس جسم منور کا قوام جامد ہے یا کوئی گیس؟ اور آیا وہ کسی گیس کے لفافہ مین ملفوف ہے یا نہیں؟

جس طرح ٹرین کی سیٹی سے اسکے قرب و بُعد اور سمت کا اندازہ ہو جاتا ہے اسی طرح اجرام سماویہ کے نور سے انکی سمت و سرعت رفتار کا بھی علم ہو جاتا ہے صرف شعاعون یا انکے عکس کو دیکھکے علماء فلک معلوم کر لیتے ہین کہ یہ ستارہ آرہا ہے یا جا رہا ہے اور نیز یہ کہ اسکی رفتار سریع ہے یا بطی؟ غرضکہ اجرام علویہ کے متعلق ہماری معلومات کا ایک بڑا ذریعہ انکا نور ہے۔ صرف ایک نور سے ہم ان کے مادہ، قوام، سمت، رفتار، اور سرعت و بطی سیر کو معلوم کر لیتے ہین، لیکن اُس آلہ رنگ نما سے استفادہ آسان نہین کیونکہ اس سے صرف خطوط نظر آتے ہین اور انُ خطوط سے عناصر کا اندازہ کیا جاتا ہے، بعض عنصر مثلاً لوہے سے متعدد اور مختلف اللون خطوط پیدا ہوتے ہین، مگر چاندی کے خطوط اس سے مختلف اور سونے کے ان دونون سے متباین ہوتے ہین، پس اصلی اقتضا اس امر کی تمیز ہے کہ کون خط کس عنصر کے سبب سے پیدا ہوا ہے؟ اور آیا یہ متعدد خطوط کسی ایک عنصر کا نتیجہ ہین یا چند عناصر کے؟ اور وہ عناصر کون کون ہین؟

اسکے لیے ضرورت ہے کہ راصد (رصد گاہ سے مطالعہ فلک کرنے والا) تجربہ کار، دقیق التمیز اور صادق التخمین ہو۔

اس آلہ رنگ نما کے استعمال سے معلوم ہوا ہے کہ ستارہ شعریٰ جو ہم سے کئی ملین پر ہے فی ثانیہ ۱۰ میل کے حساب سے ہم سے دور ہوتا ہے ڈیڑھ برس تک یہی حالت رہتی ہے، اسکے بعد اسی شرح رفتار سے وہ قریب ہونا شروع ہوتا ہے۔

علماء فلک نے پچاس ملین تصویرین ایسے ستارونکی لی ہین جو مختلف مجامع مین منقسم ہین، خود مجامع کی بھی دو قسمین ہین، آلہ رنگ نما سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونون قسمون کی سمتین بالکل مقابل و محاذی ہین۔

یہ بھی دریافت ہوا ہے کہ ہمارا نظام شمسی یعنی آفتاب مع اپنے تمام سیارون کے ۱۰ میل فی ثانیہ کے حساب سے سماک رامح کی طرف بڑھ رہا ہے اور جسطرح ہمارا نظام سماک رامح سے ملنے کے لیے اسکی طرف جا رہا ہے اسیطرح خود سماک رامح بھی ہمارے نظام شمسی کیطرف بسرعت تمام آرہا ہے۔

قدیم علم الفلک مین صرف ایک آفتاب مانا جاتا تھا، مگر موجودہ علماء نے جدید آلات رصدیہ کی مدد سے ایک ہزار ملین آفتاب دریافت کیے ہین یہ تمام آفتاب مع اپنے سیارات کے اس فضاے بسیط مین گردش کرتے رہتے ہین، جب کبھی دو آفتابون مین تجاذب ہوتا ہے اور وہ قریب آجاتے ہین تو انکی رفتار ۴ سو میل فی ثانیہ ہو جاتی ہے، اس حساب سے وہ ایک گھنٹے کم مین مقابل بھی ہو جاتے ہین اور جدا بھی ہو جاتے ہین،

آفتابونکی کثرت، انکی گردش، اور تجاذب و تقارب کے وقت انکی سرعت رفتار کی بنا پر علماء فلک کا خیال ہے کہ دو آفتاب خواہ کتنی ہی دور ہون مگر ان کا تصادم ہر وقت ممکن ہے اور ظاہر ہے کہ جسوقت دو ایسے آفتابون مین جو چار سو میل فی ثانیہ کے حساب سے چل رہے ہون تصادم ہوگا تو کیسی قیامت برپا ہوگی!

یہ ہین ان صدہا غرائب افلاک مین سے چند عجائب، جو جدید علم الفلک نے ہمین بتائے، پس علم الفلک اپنے قدیمی مرکز پر رہتا تو تکلم حقایق اسیطرح ہمیشہ مستور و مخفی رہتے جسطرح کہ اس دور جدید سے پہلے تک رہے۔ ابو الکلام آزاد (دہلوی)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰ ۲) الوان کو رنگ سے بدل دیا جائے تو یہ رنگ نما ہو سکتا ہے یہ ترکیب سبک و سہل ہے اور بآسانی زبانون پر جاری ہو سکتی ہے اسی لیے ہم نے رنگ نما کو اختیار کیا۔ البتہ اس صورت مین معنی لغوی معنی اصطلاحی کی نسبت عام ہوجاتے مگر اول و استعمال سے اس نقص کی تلافی ہو جائے گی اور تھوڑے عرصے کے بعد رنگ نما سے بھی اسیطرح خاص کا استفادہ ہونے لگا جسطرح کہ آج خوردبین، "دوربین"، مرغ باد نما وغیرہ سے خاص خاص آلات ہی متبادر ہوتے ہین۔ منہ۔

(سائنس کا ایک سبق)

قدرت کا وہ ناز پروردہ کرشمہ جو اپنی تدریجی ترقی کی رفتار مین مختلف صورتین بدل کر بالغ ~~عقل~~[1] مین انسان کی شکل بنکیا ہو ہوا اُسکو ہمارے اِس نظام سیارہ (زمین) مین سب سے پہلے جن چیزون سے سابقہ پڑا ہوگا وہ یہی معمولی چیزین تھین جو مدت العمر اسکے ساتھ رہین فرش خاک اُس کا بچھونا رہا ہوگا۔ اور ہوا کی گرمی اسکے مزاج مین بالیدگی پیدا کرتی ہوگی روز کے عبور رجحان سے اسکے دل مین ایک نئی قسم کا اہتزاز پیدا ہوگا اور آئے والی ضرورتون نے اسے کچھ اور سامان فراہم کرنے پر مجبور کیا ہوگا اب نے پہلے پہل ہمت کر کے دریا کے پانی کا پتہ لگایا ہوگا اور پتھرون سے نکالی ہوگی۔ یہ دریافت اپنی حیثیت کی پہلی دریافت ہوگی جس کی نوعیت اس وقت بیکار رہی کہ آئندہ نسل کو ترقی کرنا ہو تو اُس کی صورت یہ ہے کہ اپنی قابلیت اپنے آپ مین خود پیدا کرے!

بہت دن گذر گئے ہون گے اور اس نے دیکھا ہوگا کہ دنیا کی تعینی چیزین یا مین (فی زعمہ) سب کی سب اسی مٹی ہوا پانی اور آگ کی جنس اور ہر ایک مین کوئی نہ کوئی جزان کا ضرور پایا جاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ کیمیاوی تحلیل سے اجزا کی بساطت یا ترکیب دریافت کی جاتی کے واسطے اس نے فقط اپنی وجدانی شعور اور دماغی احساس سے کام ایک نتیجہ مرتب کر لیا کہ جب اسکی محدود دنیا کی تمام چیزون مین انھین کی آمیزش ہے تو خود انھین کسی کی آمیزش نہونی چاہیے (دیکھو تاریخ الارض مطبوعہ مصر ۱۹۰۹ء صفحہ ۷)۔

تجربہ اور حکمت کا یہ پہلا سبق تھا جسپر سائنس کا ایک بڑا دفتر تیار ہوا۔ عناصر کی اصطلاح مقرر ہوئی اور مان لیا گیا کہ مٹی ہوا آگ پانی یہی چار عنصر ہین۔ ابتدا مین یہ ایک سطحی تحقیقات تھی جو ایک سرسری انکشاف سے پیدا ہوئی تھی۔ اسکو ساتھ آٹھ ہزار برس ہونے کو آئے ہین آؤ! دیکھین اس دیرینہ دریافت مین کچھ اضافہ بھی ہوا یا نہین۔

اضافہ ہوا اور ہوتا جاتا ہے ابھی کل کی بات ہے کہ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی (مرحوم) ہم قسم مین علماء زندہ کو مخاطب کر کے فرماتے تھے ؎

از عناصر سہ و خصست آمد اینک بے شمار
تو ہمان در گرد آتش بد آبشی و باد

لیکن آج منکشف ہوا کہ وہی عناصر جو اسوقت ہمارے شمس العلماء کے خیال مین ۷۳ تھے اب اُنکی تعداد ۸۰ تک پہنچ گئی ہے جنھین چھ روشنی دینے والے عنصر ہین۔ جدید تحقیقات سے ثابت ہے کہ عناصر اربعہ بھی مرکب ہین اور انھین بھی اجزا پائے جاتے ہین۔ لیکن ان اجزا سے ترکیب ممکن بھی ہے یا نہین؟ یہ مسئلہ بحث طلب ہے!

اصل یہ ہے کہ اجزا دو طرح کے ہین۔ ایک تقویمی اور دوسری تحلیلی اجزائے تقویمی وہ ہین جن سے ذات کا قوام ہو جیسے جسم کے لیے مادہ و صورت یا انسان کے لیے حیوان اور ناطق ہونا۔ اجزائے تحلیلی وہ ہین جو ہیات کل کے معدوم ہونے پر حاصل ہوے ہون۔ جیسے ایک خط کے چار ٹکڑے کہ ہر ٹکڑا جزو تحلیلی ہے۔

مثلاً ہوا مین چار چیزین ہین:- (۱) آکسیجن (۲) نیٹروجن (۳) کاربونک ایسڈ گیس (۴) واٹری ویپر۔ لیکن کیا درحقیقت ان اجزا سے ہوا کا قوام بھی ہے؟ یقیناً اس کا جواب نفی مین ملے گا، کیونکہ یہ اجزا کل سے موخر ہین اور کسی جز کو کل سے موخر ہونا چاہیے بیشک یہ اجزائے تحلیلی ہین! اور اب آج

---

[1] عمر رشاہت ہے کہ علامہ سیوطی نے شیخ ہمارے ایک کی صورت مین یا انسان کچھ زرد پچاہے اور نرم تونگ کے کتنی کی شکل اختیار کی ہے بالغ عدن کا واقعہ ہوا ہے کی پہلی کتاب مستر نکوین الارض مین مذکور ہے اس بالغ کا اصل نتیجہ دس حوا کا مسودہ پھیلایا یعنی دو آدم جلا دو زمان کی تحقیق کی حسب اعراب اہم عہد بنی عباس مین جزیرہ ابن عمر تھا

تو اجزائے تحلیلی پر جزئیت کا اطلاق خود بطور سامحہ ہے مع ہذا بے اجزائے تقویمی کے ترکیب بھی نہیں ہو سکتی لہذا ہوا کو مرکب کہنا صحیح نہیں ہے اس توضیح کے لیے ہم چند اصول مرتب کرتے ہیں:۔

(۱) جتنے مادیات ہیں، وہ یا بسیط ہیں یا مرکب۔

(۲) ہر مرکب کی انتہا لامحالہ کسی بسیط پر ہوگی، ورنہ تسلسل لازم آئے گا۔

(۳) جتنے مادیات ہیں ان سب کا قوام عناصر سے ہے۔

(۴) عناصر حقائق میں ایک دوسرے سے متخالف ہیں۔

(۵) مجموعہ اجزا کی حقیقت بعینہ کل کی حقیقت ہے جیسے مجموعہ حیوان ناطق بعینہ انسان ہے۔

عناصر میں مثلاً ایک عنصر ہوا ہے۔ وہ بسیط ہے یا مرکب؟ اگر مرکب ہے تو اسکے اجزا ہوائی ہی ہیں یا کسی اور عنصر کے؟ اگر کسی اور عنصر کے ہیں تو اسکے سب عنصر ہوائی ہونا چاہیے (از روے اصول پنجم) حالانکہ وہ ہوا کے متخالف ہیں (از روے اصول چہارم) اور اگر وہ اجزا بھی ہوائی ہیں تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرکب ہیں یا بسیط؟ ہم مرکب ہیں تو (مثلاً) عنصر کوئے مرکب ہونگے جسکو ہم ابھی باطل کر آئے ہیں اور اگر بسیط ہیں تو وہ ثابت ہے الغرض قول فیصل یہ ہے کہ مثلاً ہوا اگر مرکب ہے تو بہ ترکیب تحلیلی مرکب نہ بہ ترکیب تقویمی۔

اس بحث سے تو یہ ثابت ہو گیا کہ عناصر چار اور یہ چاروں بسیط ہیں۔ جدید تحقیقات سے انمیں جو اجزا دریافت ہوئے ہیں وہ اجزائے تحلیلی ہیں جن سے کسی جسم کی ترکیب نہیں ہو سکتی۔

اب ہم یہاں یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ موجوداتِ عالم کی دو حیثیتیں ہیں: ایک محسوس اور دوسری غیر محسوس۔ دوسری حیثیت کو اس بحث سے تعلق نہیں۔ محسوسات میں کرہ زمین ہے اور اسکے محیط کرۂ ہوا، اور اسکے گرداگرد اجرام سماوی وغیرہ انمیں بھی دو قسمیں ہیں ایک عناصر دوسرے افلاک۔ عناصر کی تعداد معلم ثانی ابو نصر فارابی نے صرف چار بتائی ہے یعنی پانی مٹی آگ ہوا لیکن درحقیقت یہاں کا نہیں بلکہ ان پیشتر مسلمانوں سے جابر ابن حیان طرطوسی متوفی ۱۶۱ھ کا مذہب ہے جو امام جعفر صادق کے شاگرد رشید تھے اور جن کو انگریزی فرانسیسی میں جیبر کہتے ہیں۔

اہل یورپ جابر کو فن کیمیا کا موجد بتاتے ہیں۔ جابر کی رائے میں ہر جسم کی ترکیب کے لیے ضروری ہے کہ اسمیں یہ چاروں عنصر مختلف نسبتوں سے جمع ہوں اور کوئی نہ کوئی عنصر بقیہ عناصر پر غالب ہو مٹی کا عنصر غالب ہوا تو جسم ٹھوس ہوگا، مائیت کو غلبہ ہوا تو اسمیں سیلان کی کیفیت ہوگی، ہوا کے جز میں زیادتی ہونے سے گیس[۱] اور آتشی کیفیت بڑھنے سے جسم محترق ہو جائیگا خواہ باحتراق شدید جیسے چراغ کی روشنی، یا باحتراق خفیف جیسے لوہے کا زنگ۔

عام طور سے احتراق کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ جسم محترق ہو اسمیں تدریجاً پراگندہ ہوتا جائے اور اس سے روشنی و حرارت بڑھتی جائے لیکن متقدمین علماء عرب نے یہ تعریف کی ہے کہ جسم کسی ایسے جزو سے جس سے حموضت اور ترشی کی تولید ہوتی ہے (مثلاً آکسیجن) متحد ہو جائے اس سے روشنی یا حرارت پیدا ہوئی تو یہ احتراق شدید ہو ورنہ خفیف۔ جیسے آکسیجن کے ساتھ جست اور پارے کا اتحاد۔ متاخرین علماء یورپ میں موسیو لاوازیے کی بھی یہی رائے ہے اور موسیو برتلو نے بھی اسکو پسند کیا ہے۔

لاوازیے یورپ کا ایک مشہور عالم تھا۔ اسکا قول ہے کہ "علم کیمیا کا موضوع یہ ہے کہ اجسام کو عناصر میں تحلیل کر سکیں، اور اسکی غایت و غرض تحلیل اجسام ہے" برتلو اسپر یہ ریمارک کرتا ہے کہ "کیمیا علم تحلیل و ترکیب کا نام ہے اور یہ ترکیب عناصر مرکبات سب میں عام ہے اور اسکی کوئی حد محدود نہیں ہے"

اجسام محسوسہ کی دوسری قسم (افلاک) کے متعلق عام رائے حکماء اسلام کے خلاف ہے اور اعتراض کیا جاتا ہے کہ مسلمان افلاک سبعہ میں تھا ایک

[۱] گیس جس کو اہل مصر "نماذ" اور اہل عرب "ہمو جنیہ" کہتے ہیں اس گیس کی دریافت کا فخر بھی جابر ہی کو حاصل ہے۔ ۱۲

سیارہ کے وجود کے قائل تھے اور انھیں زحل اور اسکے حلقون وغیرہ سے اطلاع نہ تھی۔ اعتراض کی بنیاد جس قیاس مع الفارق پر رکھی گئی ہے وہ یہ ہے کہ حکماء اسلام ہر فلک کو خاص خاص سیارون سے منسوب کرتے ہین، جسکا مطلب وہ یہ سمجھے کہ مسلمانون کی نگاہ ہر فلک مین ایک ہی ایک سیارہ تک محدود ہے۔ حالانکہ یہ صریح الزام لایلزم ہے۔ کواکب سبعہ سے افلاک کے منسوب کرنے کے یہ معنی نہیں ہین کہ اور سیارون کا علم ہی نہ رہا ہو نہیں اہل عرب کا مذہب یہ تھا کہ خاص سیارے بھی سات ہین اور اسی سبب سے وہ افلاک کو بھی انھیں سیارون سے منسوب کرتے تھے لیکن ساتھ ہی وہ اسکے بھی قائل ہین کہ اور بھی کئی چھوٹے چھوٹے سیارے ہین جو انھیں سیارون کے گرد گردش کرتے ہین۔

ابن ماجہ کا قول ہے کہ چھوٹے چھوٹے سیارون مین جو بڑے بڑے سیارون کے گرد گردش کرتے ہین بعض ایسے بھی ہین جو حرکت مین کسی کے تابع نہیں ہین۔ اس قول کا مطلب اب سیکڑون برس کے بعد یورپ مین تحقیقات سے یہ ظاہر ہوا کہ زحل کے گرد ۹ سیارے گردش کرتے ہین۔ قاعدہ یہ ہے کہ جتنے چھوٹے سیارے کسی بڑے سیارے کے گرد گردش کرتے ہین ان سب کی گردش اسی سمت کو ہوتی ہے جس سمت کو خود وہ بڑا سیارہ گھومتا ہے لیکن زحل کے سیارات تسعہ مین ایک ایسا سیارہ دریافت ہوا ہے جسکی حرکت فی نفسہ مستقل اور حرکت زحل کے برعکس ہے۔

افلاک کے یہ معنی نہیں ہین جو آجکل مستعمل ہین۔ حکماء عرب کواکب کے اس مدار کو فلک کہتے ہین جو طبائع عنصری کے گونا گون تغیرات کی آخری حد ہو۔ افلاک کی یہ اسلامی تعریف کئی صدی قبل کی ہے جدید تحقیقات نے اتنے دنون کے بعد خیالات بھی ظاہر کیا تو فلک کا الفلک هذا الاثیر المحیط بالاشیاء فی الفضاء الذی فیه مدارات الکواکب۔ الاثیر کو بدل ڈالو تو مطلب ہر رنگ ایک رہتا ہے۔

افلاک کو عناصر کا آخری تغیر اس لیے کہتے ہین کہ عناصر مین تبدیلی ترقی کی تو ارضیت سے مائیت مین، مائیت سے ہوائیت مین، اور پھر ناریت مین، لیکن

غایت اتصال سے جسمین ہر ایک بالقوہ مستعد ہو کہ صعود خواہ ہبوط سے جسم متصل مین تحلیل ہو جائے یہ استحالہ اکثر اوقات بالفعل بھی ہوتا ہے صعود سے جن اجسام کا استحالہ ہوگا ان مین لطافت زیادہ ہوگی۔ افلاک تک پہنچ کر یہ استحالہ ختم ہو جاتا ہے اور افلاک تمام اجسام متصلہ سے استعداد زیادہ لطیف ہین کہ قوت حاسہ انھین ادراک بھی نہین کر سکتی۔ لطافت مین کواکب بھی افلاک کے پہلو بہ پہلو ہین لیکن فلاسفۂ اسلام قائل ہین کہ حرکات کواکب کی آواز سُنی جا سکتی ہے اہل یورپ پہلے تو اس دعوے محض پر خوب مضحکہ اُڑاتے رہے، مگر آخر البرٹس صاحب نے ایک آلہ ایجاد کر کے یہ ادعا پاس کر دی۔ اس آلہ مین ٹیلیفون اور فونوگراف دونون کے خواص ہین اس کا رُخ جس مین شیشہ لگا ہوتا ہے ستارہ کی طرف کر دیا جائے تو اسکی روشنی اسکے ذریعہ سے آلہ مین آجائے گی اور وہان وہ آواز کی شکل مین منتقل ہو جائے گی۔

استحالہ کی کیفیت یون سمجھو کہ حرارت کا درجہ جتنی گرنے سے تحت الصفر نیچے اتر گیا تو پانی ایک جسم جامد یعنی برف مین تحلیل ہو جائے گا اور اگر حرارت بڑھتے بڑھتے سو درجہ سے متجاوز ہو گئی تو بخارات پیدا ہون گے اور اسی پانی کا گیس بن جائے گا۔ اب اگر اس گیس کی تحلیل کیجائے تو ایک ایسا جزو محترق ملے گا جو لیمپ مین پٹرول کی طرح روشن ہو جائے گا۔ بڑے بڑے شہرون مین ہوائی گیس سڑکون کی روشنی کے لیے اسی سے بناتے ہین جو در اصل ہیڈروجن یعنی وہ جز ہے جس سے پانی کی تولید ہوتی ہے۔

جب کبھی حرارت کی کمی یا زیادتی کا کوئی ذریعہ ملے گا تو ان اجسام کی تعداد بڑھ جائے گی جن مین بالفعل استحالہ ممکن ہے سخت سے سخت دھات کو بھی (مثلاً لوہا اور پلاٹینم یعنی امریکن سپلور) ڈیڑھ دو ہزار درجہ تک کی حرارت پہنچا کر پگھلا سکتے ہین اور آزوت (جو ہوا کا جزو اصلی و اساسی ہے) اور آکسیجن (جس سے ترشی اور رطوبت کی تولید ہو جاتی ہے) جیسے اجسام ہوائی بھی حرارت کے درجہ تحت الصفر گر جانے سے پگھل جاتے ہین۔ آزوت کو پگھلانے کے لیے ۱۱۰ درجہ تحت الصفر سے کم اور آکسیجن کے لیے ۶۰ درجے کم اور

ہیڈروجن کے لیے ۴۳۰ درجے حرارت کم کردینی چاہیئے۔

نمائش پیرس میں ہوا پانی میں مستحیل کرکے عام نظارہ کے لیے ایک شیشہ میں بحفاظت پیش کی گئی تھی، تماشائی جب اس میں رومال وغیرہ ڈالتے تھے تو وہ بھیگ جاتا تھا لیکن باہر نکالتے ہی رومال سے ایک کثیف دھواں نکلتا تھا۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ جب حرارت پہنچیگی تو بخارات پیدا ہونگے۔

ہوا کو ٹھوس پتھر کی شکل میں بھی بنا کر دکھا سکتے ہیں، پروفیسر ڈیس نے کئی مرتبہ اسکی آزمائش کی، اسمیں ایک مقناطیسی قوت بھی پائی جاتی ہے کہ لوہا اگر اس سے چھو جائے تو شکل چھوڑ دیگا۔ ہوا اس ٹھوس حالت میں ایسی سرد ہوتی ہے کہ ابھی تک اسکا صحیح اندازہ نہیں ہو سکا، غالباً نقطۂ انجماد سے ۲۳۰ درجہ نیچے ہو۔ جعفر برمکی وزیر اعظم خلافت عباسیہ نے جس پیر مرد کو زخم چشم کی دوا کے لیے ۳ تولہ ہوا کا سفوف استعمال کرنے کی ہدایت کی تھی وہ آج اگر ہوائی منجمد کی حقیقت سے مطلع ہوتے تو شاید اپنے حکیمانہ مزاج پر انھیں ناز ہوتا۔

عبداللہ عمادی

قوّتِ خیال

انسانی عنصر مین دو بڑے قیمتی جوہر رکھے گئے ہین **عقل** اور **خیال**۔ عقل مفاہیم کلیہ کا خزانہ اور خیال جزئیات کا خزانہ ہو۔ اِن دونون ظرفون مین مظروف آتے جاتے رہتے ہین لیکن بہت کم انسان ہین جو مفاہیم کلیہ اور جزئیات ذہنیہ کی ایک دوسرے سے شناخت کرسکین۔ مثلاً ہمارے ذہن مین جب انسانیتِ کلی کا خیال آئیگا تو فوراً معلوم ہوجائیگا کہ یہ وہی انسانیت ہو جو تمام افرادِ انسانی مین پائی جاتی ہے۔ یہ وہی ماہیتِ کلیہ ہو جس سے تمام افرادِ انسانی متصف ہین پس مفہوم کا جملہ افراد پر صادق آنا مفہوم کلیہ ہو اور ہر فرد کی نسبت جُدا جُدا خیال ہونا مفہوم ذہنی ہو۔ مثلاً زید کا تصور عقل مین نہین ہو بلکہ خیال مین ہو۔ بمبئی اور کلکتہ وغیرہ کے تصور کا خزانہ عقل نہین بلکہ خیال ہو۔ جب ہم غور کرتے ہین تو یہ فرق فی الفور محسوس ہوجاتا ہو یعنی بمجرد انتقال اور صدور کے معلوم ہوجاتا ہو کہ فلان شے کا تصور عقل مین ہو اور فلان کا خیال مین۔

خیال مین **قدرت** نے بڑے بڑے اثر رکھے ہین اور اسکو بوالعجب حکمتون سے مرکب کیا ہو۔ تمام کاروبار اور تمام سلطنتون کا انتظام محض خیال ہی پر موقوف ہو خیال مین ایک قوتِ مقناطیسی بھی موجود ہو جو ایک انسان سے دوسرے انسان پر سرایت کرتی ہو۔ مثلاً کسی شخص کی جانب تمھارے دل مین رنج اور کدورت ہو تو فوراً اُس کے دل مین بھی کدورت پیدا ہوجائیگی اور جس طرح تم اُس سے کھنچوگے وہ بھی تم سے کھنچے گا۔ "**دل سے دل کو راہ**" ہونے کے یہی معنی ہین۔ ایسے ہی ہر شخص کو اپنے دوست یا دشمن کی غائبانہ حالت بھی اسی خیال کے ذریعے سے معلوم ہوجاتی ہو۔ مثلاً کوئی حرمان نصیب عاشق فراق یار مین تمام رات بسترِ غم پر لوٹے اور یار دلدار کسی رقیب کے پہلو مین رہے مگر صبح ہوتے ہی جب اِن دونون کی آنکھین چار ہونگین تو شب کا پردہ کھل جائیگا اور عاشق شرم آلود نگاہون کو دیکھکر صاف کہہ دے گا ؎

مجھکو گھڑی گھڑی کی خبر رات ہجر کی
تم تھے جہان وہین مرا یک خیال تھا — مؤلف

جن لوگون نے کچھ حاصل کیا ہو صرف تصفیۂ خیال اور انجماد و اجتماع خیال سے۔ خیال ہمیشہ منتشر رہتا ہو اور اسکو انسانی تعلقات زیادہ منتشر رکھتے ہین جب کسی شخص پر مصائب نازل ہوتے ہین اور افکار کا ہجوم ہوتا ہو تو قوتِ خیال بھی تھک جاتی ہو کیونکہ اُسکو کسی ایک کام پر جمنے کا موقع نہین ملتا۔ بہت سے خیالات کا تراکم اور تزاحم ہوکر ایک خیال بھی اپنے ظرف مین جمکر نہین رہ سکتا۔ روح جوہرِ بدن ہو خیالات کی اصلاح چاہتی ہو مگر بہت سے خیالات کا جمنا تو در کنار ایک خیال بھی پیر قدم نہین جما سکتا۔ پس ناقص اور فاسد خیالات کو دل سے نکالنا انسان کا پہلا فرض ہے۔

کسی کی نسبت تمھارا عمدہ خیال ہوگا یا جس کو تم عمدہ بہتر اور پیارا سمجھوگے وہ بھی تمکو ویسا ہی سمجھے گا اور اُسکو تمھارے ایسے خیال کی کسی ذریعے سے ضرور اطلاع ہوجائے گی جب کوئی "**ہچکی**" لیتا ہو تو عوام یہ خیال کرتے ہین کہ ہمکو کوئی یاد کر رہا ہو اور جب عورتون کی "**بائین آنکھ**" پھڑکتی ہو تو وہ یہ خیال کرتی ہین کہ اُن کا کوئی پیارا اُن سے ملے گا۔ یہ کیا بات ہو وہی قوتِ خیال ہو جس کی کشش کا اثر دل سے گزر کر انسانون کے جسم تک پہنچتا ہو۔ **تصوّف** کے تمام نکتے مسمریزم وغیرہ کے شعبدے اسی قوتِ خیال سے وابستہ ہین۔

حیوانات مین اگرچہ عقل نہین لیکن قوتِ خیال ضرور ہو جس کو واہمہ کہو یا آنقوہ مشہور ہو کہ برفستانی ملک کے طیور جب موسم سرما مین کابل وغیرہ سے آتے ہین تو وہان انڈے دیکر چھوڑ آتے ہین اور گو وہ ہندوستان کی جھیل

اور نالابون مین ایک عرصے تک رہتے ہین لیکن محض خیال کی سرگرمی سے اُن کو سیتے ہین اور ہندوستان سے واپس جانے پر پہنچا پاتے ہین۔ گویہ بات ایک عام قصے کے طور پر مشہور ہے۔ لیکن جب ہم خیال کی مقناطیسی قوت پر نظر ڈالتے ہین تو ہمکو چندان تعجب معلوم نہین ہوتا۔

خیال بھی بے شک عمدہ چیز ہو لیکن تصفیہ خیال بڑی چیز ہو۔ اسکی مثال ایسی ہو کہ جسطرح خالص سونا ناقص دھات ملنے سے مغشوش ہوا اور پھر کوئی شخص کیمیائی قوت سے تجزیہ کر کے سونے کو علٰحدہ کر دے۔ اِسی طرح تصفیہ خیال سے ناقص خیالات جُدا ہو کر انسان کا دل سچے اور پاک خیالات کا مسکن بن جاتا ہو۔ جب انسان اپنے دل کو تصفیہ کی صیقل سے صاف کرتا ہو تو دل آئینہ کی طرح روشن ہو جاتا ہو اور اسکو عجائبات قدرت معلوم ہونے لگتے ہین اُمور قدرت مین جو تدبر اور تفکر کی ہدایت کیگئی ہو تو اُسکے یہی معنی ہین کہ دل کو ناقص خیالات سے صاف کرو تو جلوۂ حقیقت تمکو نظر آئیگا آئینۂ زنگ اور کدورت سے صاف ہو تو اصل جوہر آشکارا ہو جائے۔ اب رہا یہ امر کہ تصفیہ خیال کیونکر ہو اور اسکے لیے کونسا بہتر ذریعہ اور آلہ ہو تو مین جواب دونگا کہ اُس سچے معبود سے لو لگانا چاہیے جس کے وجود کی کم و بیش تمام مذاہب ہدایت کرتے ہین گو بسا اوقات جھوٹ مین سچ اور کھوٹے مین کھرا ملا ہوا ہوتا ہو۔ یہ امر ہر شخص کے کانشنس پر منحصر ہو کہ جس طریقے کو وہ بہتر سمجھتا ہو اُسکے ذریعے سے منزل مقصود پر پہنچنا چاہتا ہو خواہ اُس کا خیال کیسا ہی ہو۔

ہر شے کے واسطے حد اور انتہا ہو مگر خیال کا میدان اسقدر وسیع ہو کہ اُسکے لیے فی حد ذاتہ کوئی انتہا قائم نہین کی جاسکتی۔ ابھی یہ خیال سمندر مین پیرتا ہو ابھی یہ خیال آسمان مین ٹکٹکی لگاتا ہو۔ ابھی یہ خیال اپنے گھر کی چاردیواری مین محدود ہو جسطرح خدا کی ماہیت کا معلوم ہونا محال ہو ایسے ہی انسان کیلئے ظاہر و باطن مین خیال کا اندازہ و تخمینہ محال ہے۔

انسانی خیال کی تاریخ بھی کوئی ایسی نہین جس سے اُسکے مختلف حالات کا پورا نقشہ اُتر سکے۔ مگر ہان جتنی انسانی تاریخین موجود ہین ایک مجمل طور پر انسانی خیال کے نقش کو لوحِ خاطر پر مرتسم کرتی ہین۔ فرہاد و شیرین کا قصہ۔ لیلیٰ مجنون کا افسانہ۔ نل دمن کی داستان۔ وامق و عذرا کی کہانی تغیرات خیال کا نمونہ ہین۔

یہ دل کیا تھا ایک خیال تھا خیال ہی نے تیشۂ فرہاد مین روانی اور بازو مین طاقت پیدا کی ورنہ کون اُمید کے بھروسہ پر اتنی مدت تک سنگ تراشی کرتا۔ اگر مجنون کا خیال کسی قدرتی خوبی سے نہ لپٹا ہوا ہوتا تو عرب کے دشوار گزار میدان اور پُرخار جنگل ایک جلیل القدر شہزادہ پاپیادہ طے نہ کرتا اور لیلیٰ کے تصور مین اپنی عمر عزیز کو فضول نہ کھوتا۔ آہ کیا خیال تھا کہ ایک معشوق مجازی کے پردے مین شاہد حقیقی کی تلاش تھی۔ معشوق ظاہری کا نہ ملنا ہی دلالت کرتا ہو کہ اسکو شاہد باطنی کا جلوہ نظر آگیا تھا اور وہ ایک ٹٹی کی آڑ مین شکار کھیلتا تھا۔ واہ یہ خیال بھی کیا رفیق طریق ہو کہ کبھی ہمارا ساتھ نہین چھوڑتا۔ زوال مین سایہ بھی ساتھ نہین دیتا۔ مگر یہ خیال اُسوقت بھی بار بار کشور دل مین اورنگ نشین ہو کر جلوہ ریزی کرتا ہو۔ ایک شاعر نے اپنے خیال کو کس خوبی سے باندھا ہو ؎

میرا خیال بعد مرے پُرفشان رہے
افسوس ہو کہ مین نہ رہون او جلان رہے

ریل سے تارے نگاہ سے جلد پہنچنے والا یہی خیال ہو۔ تار برقی تو دو گھنٹہ مین لندن تک پہنچتی ہو مگر ہم اپنے خیال کو آناً فاناً مین عالم بالا تک پہنچا سکتے ہین۔

علما و جُہلا کے خیال مین صرف صحت و غیر صحت کا فرق ہوتا ہو ورنہ ماہیت شے مین کچھ اختلاف نہین۔ علما ایک صحیح خیال اُس شے کا کر سکتے ہین جس کو وہ سوچتے ہین برعکس اسکے جہلا غلطی کرتے ہین محسوسات مین تو شاید جاہلون کا خیال بھی چندان غلط نہین ہوتا مگر تصورات مین اکثر غلط ثابت ہو جاتا ہو۔ اسیواسطے ناقص خیال کے درست کرنے کا آلہ تعلیم

قرار دیا گیا ہے

سو یہ خیال شاید منطق سے زیادہ کوئی شے نہیں صغریٰ کبریٰ اور نتیجہ خیال ہی کی شطرنج ہو۔ مبارک ہین وہ لوگ جن کا خیال صحیح اور درست ہو۔ یہ حکماء متقدمین کا خیال ہی تھا جسنے زمین کو متحرک ثابت کردیا ورنہ جمیع اقالیم کے باشندے ساکت خیال کرتے تھے اور کر رہے ہین۔ یہ خیال کتنا وسیع ہو کہ ہر طبیعت مین نئی شکل سے پیدا ہوتا ہو اور ایک دوسرے کا خیال لگا نہین کھاتا۔

جب قومی خیال ایک سمت مین یکسان ہو جاتا ہو اُسوقت اُس قوم کی ترقی شروع ہونے لگتی ہو۔ قومی خیال کی شراب ایسی طربنک ہو کہ سرپرستان قوم اسکو وحشی اور شائستگی سے جو محض حیوان بنانیکے آلات ہین کہین بہتر سمجھتے ہین اور اسکی مداومت کو دل و جان سے پسند کرتے ہین۔ اگر یہ قومی خیال نتھا تو نپولین کی فوج ظفر موج کبھی مصر و فرانس پر قابض ہوتی۔ قومی خیال کے والدائے بڑے مبارک لوگ ہین۔ پچھلے از منہ مین لوگ ان کو ولی کہتے تھے اور اُس زمانے مین قومی سرپرست اور لیڈر بولتے ہین۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ قوتِ خیال فی حد ذاتہ ہر حال مین اپنا اثر دکھاتی ہے اور اسکی کوئی حد اور انتہا نہین تو ہم اتنا ضرور کہین گے کہ اسکی توسیع مین علمی مذاق کو ضرور شامل کرنا پڑیگا کیونکہ بغیر علمی تائید کے یہ قوتِ خیال کچھ بھی نہین۔

نُدرت میرٹھی

حیات بعد الممات

(۱)

زندگی کیا ہے؟ عناصر کا ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے؟ انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

کائناتِ عالم کے نظامِ تمدن میں خلاقِ عالم نے کچھ ایسی گوناگونی و دل فریبی پیدا کر دی ہے کہ عقل انسانی باوجودیکہ عقل کل کی ایک ذاتی جزو ہونے کا دعوی کرتی ہے اس کی عقدہ کشائی سے بالکل عاجز و حیران ہے۔ بظاہر تو قدرت کی کرشمہ سازیاں انسانی قلوب کو اپنا گرویدہ بنا ہی لیا کرتی ہیں لیکن نہایت جانفرسا و پریشاں کن خیالات ہیں جو دماغ میں ایک جوہر مختل کی طرح ہمیشہ چکر لگایا کرتے ہیں اور جن کا ماخذ یہ ہے "حیات بعد الممات" یعنی ہستی انسانی کے فنا کے بعد صورت تکوین و وجود کیا رہتی ہے۔ یہ نہایت ہی اہم و جامع مسئلہ ہے۔ یہی وہ خیالات ہیں جو زمانہ کے مختلف دور میں قومی رفارمروں نے ترقی و وسعت دے دے کر لوگوں کو سکھائے اور ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ لیکن ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک لاینحل مسئلہ ہے۔ بہرحال جہاں تک لوگوں نے اسکی تحقیقات کی ہے اُس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا تعلق انسانی ہستی سے بالکل روحانی ہے، اور بقاء ہستی کا تعلق ایک دوسرے عالم سے ہے جسے ہم عالم ارواح کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ عالم ارواح خود ایک مسئلۂ متنازعہ ہے۔ کچھ لوگ اسکے وجود کے قائل ہیں اور کچھ اسکی ہستی کے منکر۔ علمائے ہنود آواگون (تناسخ روح) کے پیرو ہیں اور انکا عقیدہ ہے کہ روح (ہستی) ہمیشہ نقل قالب کرتی ہے اور اُسکی اچھی یا خراب حالت اُسکے پچھلے افعال کی جزا یا سزا ہے۔ اسکا فنا، نقل قالب کرتے کرتے بالکل پاک ہو کر ہستیٔ حقیقی میں مل جانا ہے جس کو وہ نروان یا آتما کا پرماتما میں وصل ہو جانا یا دوسرے الفاظ میں "واصل بحق ہو جانا" کہتے ہیں۔ اسلامی فلسفہ اسکے بارے میں کچھ اور کہتا ہے۔ فی نفسہٖ دونوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے لیکن عقائد میں کچھ متمائز تفریق نظر آتی ہے۔ وہ سزا و جزا کے تو ضرور قائل ہیں لیکن ایک دوسرے طریق سے۔ وہ کیا؟ روح انسانی کا مرکز اصلی ذات حقیقی ہے۔ پتلۂ خاکی کے فنا ہو جانے کے بعد روح (جو غیر فانی ہے اور جسکے ہر دو فرقے قائل ہیں) کچھ مدت مقررہ کے لیے ایک دوسرے عالم میں رکھی جاتی ہے جسے عالم ارواح کہتے ہیں۔ کسی ایک خاص روز میں کائنات عالم فنا ہو جائے گی اور اُس روز ہر ہستی کی روح کو اپنے اپنے افعال کی سزا یا جزا ملیگی۔ سزا یہ ہوگی کہ دوزخ میں روحیں ڈالی جائینگی اور جزا یہ ہوگی کہ بہشت میں۔ ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان دونوں عقائد میں کس درجہ کی روحانیت پائی جاتی ہے اور قریب قریب جتنے فرقے ہیں وہ سب اپنے اصول کو روحانیت کی عمیق تہ میں رکھتے ہیں۔ نئی روشنی کے سائنٹفک لوگ اس مسئلہ ہی سے کچھ بیزار ہیں کہ وہ اس پر خامہ فرسائی نہیں کرتے۔ بہرحال ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ واقعی قابل اطمینان حل زندگی کن کن اصولوں پر مبنی ہے۔ ہر چیز کے ثبوت کا انحصار اسکے عملی یا ذہنی تجربات پر ہے۔ ہر شخص جو کچھ بذات خود دریافت یا معلوم کرتا ہے وہ دوسروں پر ظاہر کرتا ہے اور اُسکی تعلیم دیتا ہے۔ اُسکے خیالات کا صائب ہونا اُسکے مذاق سلیم پر منحصر ہے۔ اب تک انسان نے جو کچھ ایجادیں کیں یا اصولات قائم کیے اُسے بذات خود ایک دفعہ تجربہ کر لیا ہے یا مشاہدات کی رُو سے ایک حقیقی اصول قائم کر لیا ہے۔ اس امر کو جانے دیجیے کہ اُسکے تجربات کو لوگوں نے صحیح مانا یا نہیں یا اُسکے خیالات کا ایک صحیح معیار قائم کر سکے یا اُسکو غلط ٹھیرایا لیکن شخص مذکور نے خود تو

اُسکو جان لیا ہی۔ اسی طرح مسئلہ فنا و بقا کو ہر شخص تسلیم تو ضرور کر لیا۔ تسلیم کرنے سے یہ مراد نہیں کہ جو کچھ اصول ٹھیرا دیے اُسکو مان لیا بلکہ یہ کہ ہر شخص ایک دفعہ پیدا ہوتا ہی اور پھر مرجاتا ہی اور اسکو خود ہی یہ تلخ ایک نہ ایک دفعہ ہمیشہ جھیلتا ہی۔ لیکن کوئی شخص آج تک ایسا نہ پیدا ہوا (فرضی و مذہبی قصص سے قطع نظر کرکے) جو یہ بتا سکے کہ وہ کس حالت سے مَرا؟ مرنے کے بعد کیا کیا مراحل پیش آئے؟ کیا اُسکو اپنی پچھلی ہستی یاد تھی؟ کیا اُسکو معلوم تھا کہ مرنے کے بعد پھر اُسکی کیا حالت ہو گی؟ کیا نقل قالب کرتے وقت اُسے نقل کی کیفیت محسوس ہوئی تھی؟ اُس دوسرے عالم کی کیا کیفیت تھی وغیرہ وغیرہ۔ میرا تو خیال ہو کہ کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جو اِن سوالات کا اطمینان بخش جواب دینے میں سچا اُتر سکے۔ کوئی شخص عالمِ ارواح سے انھیں حواس انھیں خیالات کے ساتھ واپس نہیں آسکا کہ اُس سے وہاں کی کچھ کیفیت معلوم ہو سکتی۔ اب اگر کوئی شخص کہہ سکتا ہو کہ یہ سب باتیں کشف و ضمیر سے معلوم ہوئیں تو یہ مسئلہ ذرا توضیح طلب ہی۔ یہ بات غالباً ہر شخص مان لیگا کہ ہر فرد انسانی میں ایک نہایت اہم و زبردست قوّت ہوتی ہی جسے ہم قوّتِ اِرادی کہتے ہیں۔ قوّت ارادی ہی گویا اس مرکبِ عنصری کی روح رواں ہی۔ یہی قوّت ہر فرد میں یکساں صورت میں پیدا کی گئی ہے اور اسکے خواص و واقعیت ہر حالت میں تمام بالکل ایک طرح کی ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص کہے کہ "نہیں قوّتِ ارادی بالکل یکساں نہیں پیدا کی گئی ہے" تو اُسکا دعویٰ بالکل بے جا ہے۔ کیونکہ پتلۂ خاکی کا صانع حقیقی ایک ہی ہے اور مادۂ تکوین وجودِ حیاتِ انسانی ایک ہی مادۂ کثیف یا لطیف سے مرکب ہی۔ حیات و ممات بالکل عناصر اربعہ کی ترتیب و پریشانی پر منحصر ہے۔ بہرحال انسان بصورت ساخت و وجود ہمیشہ یکساں ہی۔ تقریباً شرح بدیہ تفریق ساخت و ہستی سے بالکل جداگانہ ہی۔ یہاں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ ہر انسان کی قوّتِ ارادی ایک ہی۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ کسی میں کم کسی میں زیادہ یہ انسان کے مختلف قوائے ذہنی کے سریع الحس یا بطی الحس یا مضبوط یا کمزور ہونے کی وجہ ہی۔ کشف و ضمیر کیا ہیں؟ اپنے قوائے ذہنی و قوّتِ ارادی میں ایک ایسی حرکت غیر متناہی پیدا کرنا کہ جب اُس میں ذرا سی ہل چل ڈال دیجیے ذاتِ خود میں وہ روشنی کا تلاطم پیدا ہو کہ انسان (مراد ہستیِ انسان) اپنی موجودہ حالت کو بالکل بھول جائے اور عالمِ استغراق میں ہو کر اپنی ہستی کو چشمِ باطن بیں سے ملاحظہ کرے۔ بہرحال یہ تو صوفیائے کرام کا کشف تھا۔ علمائے فلسفۂ جدیدہ یہ کہیں گے کہ کشف وہ ہی کہ انسان اپنی قوّتِ ارادی کو اس درجہ تکمیل کو پہونچائے کہ وہ کسی دوسرے شخص کے قوائے ذہنی کو اپنی قوۃ ارادی کے ذریعہ سے متاثر کر سکے۔ اب اگر عالمِ ارواح کا پتہ کسی نے لگا لیا ہوگا تو محض اپنی قوّتِ ارادی ہی سے۔ لیکن جہاں تک ہم دیکھتے ہیں یہ معلوم ہوتا ہی کہ جتنے مہا تما رشیوں پیغمبروں اور درویشوں نے اس عالم راز کا پتہ لگایا سبھوں نے اُسے مختلف حالتوں میں پایا اور ہر ایک نے مختلف اُصول قائم کیے۔ ہنود کے علما نے اِس عالم کو دوسری حالت میں پایا۔ اسلامی فلسفہ اسکی بابت کچھ اور کہتا ہی۔ مہاتما بُدھ کے اقوال اور ہیں۔ مسیحی پیشواؤں نے ایک دوسرا پہلو اختیار کر لیا۔ غرض مختلف مذاہب میں مختلف صورت میں عالمِ ارواح کی تعلیم دی گئی ہی۔ قطع نظر مذہبی اختلاف کے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آخر اس قدر تفریق کی وجہ کیا ہی؟ سب سے بڑی وجہ اس باہمی اختلاف کی یہ ہی کہ پیشواؤں نے اصول تو سادے و آسان مقرر کیے لیکن امتداد زمانہ سے اُس میں فروعات ایسی پیدا کر دی گئیں کہ اب وہی سہل الاصول قواعد کچھ ایسے پیچیدہ ہو گئے کہ ایک ناقابل بیان صورت میں پائے جاتے ہیں۔ یہ آفت ہر مذہب میں پائی جاتی ہی۔ یہ کوئی نئی بات بھی نہیں ہی۔ روحانیت کا مسئلہ ہی ایسا ہی۔ عوام تو

کچھ بھی نہیں سکتے، رہے تعلیم یافتہ لوگ ان میں بھی ایک معقول تعداد محض تقلید ہی تقلید کرتی ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو شاید سمجھے ہوئے ہیں لیکن ان کا سمجھنا ہی کیا وہ بالکل صم بکم رہتے ہیں۔ بہرحال یہ بات نہیں ہے کہ اس عالمِ اجسام کے سوا اور کوئی عالم ہی نہیں ہے۔ لیکن ہاں یہ ضرور ہے کہ ابھی اس کی کافی چھان بین نہیں ہو سکی ہے اور لوگ اس کے آخری زینہ تک نہیں پہنچے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ متقدمین نے اسکی تلاش میں بڑی سرگرانی کی ہے اور روحانیت اور عالمِ ارواح پر بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھی ہیں لیکن افسوس ہے کہ اب تک قابلِ اطمینان صورت نہیں پیدا ہو سکی۔ اس کے فرقے بھی بالکل جدا ہو گئے لیکن وہ بھی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچے۔ مختلف مذاہب ہوئے لیکن وہ بھی آخر میں ناکامیاب رہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ سب باتیں لاطائل و فضول ہوئیں لیکن ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ قابلِ اطمینان راستہ ابھی تک اُن لوگوں کو نہیں ملا ہے۔ اگر لوگوں نے اس کا پتہ لگا لیا تو پھر اُنکی تعلیم میں یہ اختلاف کیوں ہے؟ ہر ایک پیشوا کو ایک ہی تعلیم دینی چاہیے تھی۔ کیونکہ سب لوگوں نے ایک ہی قوتِ ارادی سے عالمِ ارواح کا پتہ لگایا تھا۔ روحانیت کا سوال اب تک حل نہیں ہوا اور "حیات بعد الممات" ایک ایسے گہرے راز سے تعلق رکھتا ہے کہ انسان کو فنا ہونے کے بعد ہی معلوم ہو سکتا ہے اور جب وہ فنا ہو گیا تو اُسکے معلومات بھی فنا ہیں اور یہ مسئلہ جوں کا توں ہی رہ گیا۔

مادۂ تکوین و وجود و ہستی میں اگر فلسفۂ جدیدہ کا لحاظ رکھا جائے تو اثباتِ باری میں ایک نہایت اہم رُکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ جن اشیاے موجودہ میں مذاہبِ مختلفہ نے ایک نادیدہ دستِ تصرف کو صانعِ حقیقی گردانا ہے اُن کی ساخت و صنعت میں علماے متاخرین نے ایک ترکیب و ساختِ مادی کا اصول قائم کیا ہے۔ اِن دو مخالف تعلیموں کا ہمارے مضمون سے ایک گہرا تعلق ہے۔ جن متقدین نے اصولِ روحانیت کو صورتِ ہستی کا ایک حقیقی معیار گردانا ہے اُنکی تعلیم کا دائرہ دُنیا (مراد نظامِ عالم کی صورتِ موجودہ) ہی تک جا کر ختم نہیں ہوتا بلکہ وہ صورتِ حال و صورتِ ماضی کا انتہائی ایک نہایت جامع و اہم مستقبل رکھتے ہیں اور منزلِ ہستی کو عالمِ بقا کے زائرین نہیں بلکہ مہاجرین کی جادہ پیمائی کا ایک دور وسطی سمجھتے ہیں۔ مسئلہ روحانیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہمیں یہ ماننا پڑتا ہے کہ انسان کا لبدِ خاکی کو چھوڑنے کے بعد ایک اور ہی عالم میں ہوتا ہے۔ لیکن صورتِ ہستی بقاے دوام کی منزل پر پہنچنے کے بعد ایسی نہیں رہتی کہ اُس پر اصولِ ہستی کو مدِ نظر رکھ کر ہم وجودِ حقیقی کا اطلاق کر سکیں۔ وجودِ حقیقی سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ شے (روح۔ آتما۔ ہستی وغیرہ) بصورت کسی خاص نوعِ معلومہ کے ہو بلکہ وہ ایسی صورت میں ہوتی ہے جس پر محض ایک ہستی کا اقدام ہو سکتا ہے۔ قدم ہستی کے وجود کا معیار دنیا کے لوگ نہیں کر سکتے۔ اب یہاں سے یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے کہ انسان کشف و ضمیر سے اُس وجودِ حقیقی کا اندازہ کیسے کر سکتا ہے؟۔ عالمِ دوام و بقا کے وجودِ ہستی کا معیار اُس حواس سے کیونکر معلوم ہو سکتا ہے جبکہ عالمِ ارواح کے وجود کا نظام صورتِ موجودہ سے بالکل جداگانہ ہے۔ دنیاوی بعض اپنی اُس صورت کو کیونکر معلوم کر سکتی ہیں جو اپنے قالب کو دنیا کے پورے نظامِ تمدن میں ٹھیک چھوڑ کر پرواز کر گئی ہیں۔ ہر شے کی صورتِ ماسبق صورتِ موجودہ سے اِن حالتوں میں اختلاف کرنے لگتی یا اِن وجوہ سے چیزیں بطورِ خود اختلاف کرنے لگتی ہیں (۱) شے مذکور کا نظامِ اسباب (۲) مختلف حواسِ خمسہ سے معیار قائم کرنا (۳) عالمِ مختلفہ کے مختلف نظامِ قدرت۔ اِن اصولوں کو مدِ نظر رکھ کر ہم موجودہ مذہبی تعلیم کی کسوٹی پر کہاں تک پچے اُتر سکتے ہیں۔ صرف مسئلہ روحانیت کو لے لیجیے کیونکہ ہمیں کسی اور شے سے یہاں مطلب نہیں ہے عالمِ دنیا و عالمِ بقا کے ہستیِ دوام میں کتنی تمام تفریقیں نظر آتی ہیں

اس بات میں تو غالباً کسی فرد کو عذر نہ ہوگا کہ صرف روح ہی ایک ایسی شے ہے جو ان دونوں عالم میں ایک بین تفریق ڈالے ہوئے ہے۔ لیکن روح بذاتِ خود ایک مسئلۂ معرکۃ الآرا ہے۔ بہرحال خواہ جو کچھ ہو میرا مطلب اُس شے موجودہ سے ہے جو قالب انسان کو چھوڑ کر علیحدہ ہو جاتی ہے اور جسکے نکل جانے پر انسان کو مردہ کہا جاتا ہے۔ اب صورتِ حال و صورتِ مستقبل سے اسکا مقابلہ کرکے ہم اُنھیں اصولات کو مدنظر رکھ کر اسکا معیار قائم کرینگے جنھیں ہم اوپر درج کر آئے ہیں۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے اسکا اندازہ ہر سہ اصولات سے ہو سکتا ہے۔

(۱) شی مذکور کا نظام اسباب۔ نظام اسباب ملاحظہ فرمائیے۔ انسان کے وجود کی بنا اُسکے قالب میں یا نظامِ جسم میں ایک حرکت غیر امتزاجی پیدا ہونا۔ مختلف عادات۔ حرکات۔ سکنات وغیرہ سے اُسکا تربیت پانا۔ اخلاقی و معاشرتی زندگی بسر کرنے سے روح پر نیک اثر ہونا اور بُرے خیالات و افعال قبیحہ سے اُسکو متاثر کرنا۔ ان صورتوں سے انسان کے اعضای رئیسہ متاثر ہو کر روح پر اپنا ایک گہرا تصرف اور اُسکی شکل نوعیہ میں تفریق ڈالتے رہتے ہیں۔ ہر سہ دفعات بذات خود ایک نہایت بسیط مضمون سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۲) مختلف حواس خمسہ کا معیار قائم کرنا۔ جن حواسات سے لوگ معیارِ ہستی قائم کرتے ہیں چونکہ وہ بذاتِ خود اختلاف رکھتے ہیں اس لیے ثبوت میں بھی اختلاف ہونا ضروریات سے ہے۔ جس شخص نے کسی چیز کی ماہیت محض آواز سن کر دریافت کی ہے اُس کے خیالات گو بذاتِ خود درست ہوں لیکن اُس شخص کے خیالات سے مطابقت نہیں کر سکتے جس نے اُس کو چھو کر دریافت کیا ہے۔ اثباتِ وجودِ ہستی کا جس شخص نے محض قیاسی اصول قائم کیا ہے جیسکہ فلسفیوں اور منطقیوں نے دعوے کیا ہے؛ اُنکا دعوے ازسرتاپا اختلاف کرے گا اُن لوگوں سے جنھوں نے اس کا عملی اصول قائم کیا ہے جیسا کہ صوفیوں اور درویشوں کا اصول ہے۔

اب رہا تیسرا اصول" عالم مختلفہ کے مختلف نظام قدرت"! ہر شے دو مختلف عالم میں ہونے سے اختلاف کرنے لگتی ہے۔ اگر کوئی شخص عالم خواب میں ہو تو اُسے وہ چیزیں جو اُس نے عالم بیداری میں دیکھی ہیں مختلف نظر آئیں گی۔ کیونکہ ایک تو اُسکے دماغ کی کیفیت حال دگرگوں ہے اور دوسرے ہر دو نظام اسباب ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ اسکے خلاف کرنے کا یہ باعث نہیں ہے کہ اُس شخص نے اُن چیزوں کو ہر حالت میں مختلف پایا بلکہ وجہ یہ ہے کہ ہر عالم میں نظام قدرت ہی جداگانہ ہوتا ہے۔

آمدم برسر مطلب۔ ان حواساتِ ظاہری سے عالم ارواح کا پتہ ہم کیسے لگا سکتے ہیں جبکہ اسباب دریافت ہر حالت میں اختلاف رکھتے ہیں یعنی دنیا کے نظام اسباب اور ہی ہیں۔ حواسات بالکل جداگانہ ہیں۔ عالم ارواح ان تمام باتوں سے بالکل مبرّا و منزّہ ہے۔ رہا کشف و ضمیر کشف و ضمیر سے انسان کسی دوسرے عالم کا پتہ نہیں لگاتا بلکہ وہ ذاتِ خود میں اس درجہ منہمک ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی ذاتِ ہستی کو بالکل بھول جاتا ہے۔ اس لیے اگر اُس نے کسی بات کا پتہ لگایا تو بس یہی لگایا کہ ذاتِ خود سے ذاتِ موجودہ کو کیا تعلق ہے؟۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ انسان اپنے جذبات میں بالکل جذب ہو جاتا ہے (لفظ انسان یہاں پر بحث طلب ہے۔ انشاءاللہ آئندہ کسی نمبر میں ہم لفظ "انسان" کے مادہ و معنی پر کافی روشنی ڈالینگے) گویا وہ اُس وقت ایک دوسرے عالم میں ہوتا ہے لیکن وہ عالم ارواح میں نہیں ہوتا۔

عالم ارواح کی ایک یہ بھی صفت ہے کہ وہ روح کے پرواز ہو جانے کے بعد روح کا مسکن ہو جاتے ہیں اور جب تک روح کو جسم سے تعلق ہے اُس کا وہاں تک گزر ہونا ناممکن ہے۔

رشید احمد (صدیقی)

ایشور چند رودیاساگر

کلکتہ کے مغرب مین تقریباً ۵۰ میل کے فاصلے پر بیر سنگھا ایک مقام ہے گذشتہ صدی کے شروع مین ضلع بنگال پورے بیز جی باندھ دیا دھیا نام کا ایک غریب برہمن خاندان اس جگہ آکر آباد ہوا - اس کنبہ کا سربراہ رام جے تارک بھوشن نامی ایک شخص تھا جسکی بیوی درگا دیوی وہان کے ایک نامی گرامی پنڈت اما پتی تارک لنکر کی بیٹی تھی - رام جے چونکہ ایک عجیب خیال کا آدمی اور سیر وسیاحت کا شایق تھا اس لیے وہ بسا اوقات سالہا سال تک گھر سے غائب رہتا تھا اور اس اثنا مین اپنی بیوی کو اُس کے باپ کے پاس چھوڑ جایا کرتا تھا - لیکن اما پتی تارک لنکر چونکہ خود نہایت مفلوک الحال تھا اس لیے درگا دیوی اور اس کے بچون کا بوجھ اسکے واسطے اور بھی تکلیف دہ ثابت ہوتا تھا - نتیجہ یہ ہوا کہ غریب عورت کو اپنا اور اپنے بچون کا پیٹ پالنے کے لیے چرخہ کاتنا پڑا - لیکن اس سے اسقدر کم آمدنی ہوتی تھی کہ وہ امدادی روپیہ جو اُسے وقتاً فوقتاً اپنے باپ کی طرف سے ملتا تھا ملا کر بھی اپنے کنبہ کو بمشکل فاقہ کشی سے بچا سکتی تھی - ان لڑکون مین سب سے بڑے کا نام ٹھاکر داس تھا جو اپنی عمر کے پندرھوین سال مین اپنی مان، اپنے چھوٹے بھائی، اور اپنی چار بہنون کے گزارے کیلئے روزی تلاش کرنے کلکتہ پہنچا - ہر چند مان اور باپ دونون کی طرف سے وہ ایسے خاندانون سے تعلق رکھتا تھا جو سنسکرت مین فضیلت رکھنے کے لیے مشہور تھے تاہم وہ خود اس زبان مین بہت کم مہارت رکھتا تھا اور چونکہ اُسے اپنے سنسکرت کے مایۂ علم مین اصلاح یا اضافہ کرنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی اس لیے ناچار اس نے انگریزی کی تھوڑی بہت واقفیت حاصل کرنے کی کوشش شروع کی کیونکہ اس زمانہ مین اس زبان کی تھوڑی بہت شدبد رکھنے والون کو یورپین تاجرانہ کوٹھیون مین ملازمت مل جایا کرتی تھی - یہ واقفیت اس نے ایک تاجر کے کلرک سے حاصل کی - اس کوشش مین اکثر اوقات اسے شام کی روٹی کے بغیر ہی گزارہ کرنا پڑتا تھا - کچھ مدت کے لیے ایک فیاض منش شودر نے اپنے خرچ سے اسکی رہائش اور خوراک کا انتظام کر دیا لیکن اس شخص کی آمدنی چونکہ خود اس کے اپنے اخراجات کی بمشکل کفیل ہو سکتی تھی اس لیے ٹھاکر داس کو بیچ بیچ مین فاقہ کرنا پڑتا تھا جس سے تنگ آکر آخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ اپنی پیتل کی تھالی فروخت کر کے تھوڑی سی نقدی حاصل کر لون - لیکن جب وہ تھالی بیچنے چلا تو اُسے کوئی خریدار نہ ملا مایوس ہو کر واپس لوٹ آیا - رفتہ رفتہ مفلسی یہان تک قادر ہوئی کہ ایک دن اُسے بالکل کھانا نہ ملا اور بھوک کے اضطراب کو دور کرنے کے لیے وہ بازار مین ادھر ادھر پھرنے لگا - اسطرح چلنے پھرنے سے بھوک اور بھی تیز ہوئی اور وہ تھک کر ایک عورت کی دوکان کے آگے جو خشکہ بیچتی تھی بیٹھ گیا اسے اس حالت مین بیٹھا دیکھکر اس عورت نے سبب دریافت کیا - اس نے جواب دیا مجھے پیاس بہت لگ رہی ہے ذرا سا پانی پیا چاہتا ہون - عورت نے خیال کیا برہمن دیوتا ہے خالی پیٹ پانی پلانا ٹھیک نہ ہوگا اس لیے اُس نے اسے تھوڑے سے چاول دیے جنھین وہ جلدی جلدی کھا گیا - اس کی یہ حالت دیکھکر اسنے پوچھا کیا تمنے آج کھانا نہین کھایا؟ جس کا جواب بلا تبہہ اس نے نفی مین دیا - عورت رحمدل تھی - اسکی حالت دیکھکر دل پسیجا - تھوڑا دہی اور چاول کیلے کے پتہ پر ڈالکر اس کے آگے رکھ دیے اور کہہ دیا آئندہ کبھی اس طرح بھوکے ہو تو میرے یہان چلے آیا کرو - اس واقعہ کے تھوڑی مدت بعد اُسے آٹھ روپیہ ماہوار کی ملازمت ملگئی -

غریب درگا دیوی کے لیے یہی ایک بڑی بھاری رقم تھی - انہی ایام مین ٹھاکر کی شادی ایک فاضل پنڈت کی بیٹی بھگوتی دیوی سے ہو گئی اور ان کا پہلوٹھا بچہ ایشور چند رپیدا ہوا -

ایشور چندر ابھی ماں کے پیٹ ہی میں تھے کہ ان کے دادا رام جے کو خواب میں نظر آیا کہ میرے خاندان میں ایک بیٹا پیدا ہوگا جو تمام خاندان کا نام روشن کرے گا اور اپنے ہموطنوں کو بیشمار فوائد پہنچائیگا۔ اسی قسم کی پیشین گوئی بھوبنند بجٹاچاریہ نامی ایک جوتشی نے بھی کی تھی۔ بالآخر ستمبر ۱۸۲۰ء میں بھگوتی دیوی کے گھر وہ مضبوط صحت ور اور خوبصورت بچہ پیدا ہوا جسکی صورت دیکھکر ہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ ساری توقعات پوری کر دکھائیگا۔

بچہ چونکہ ورتبیھ راس میں پیدا ہوا تھا اس لیے بڑھا رام جے اسے مذاقاً "بچھڑا" کہا کرتا تھا اور فی الحقیقت اسے اپنی زندگی کے اندر مختلف غلطیوں اور تعصبات کا مقابلہ کرنے میں ایک سانڈ کی طرح جد وجہد کرنا پڑی۔ بچہ اپنے دادا کی طرح جسمانی طور پر مضبوط تھا چنانچہ ایک موقعہ پر جب عالم شباب میں وہ کسی سیاحت کو طے کر رہا تھا اسکا ایک ریچھ سے مقابلہ ہو گیا جس نے ہر چند اسے بہت زخمی کر دیا تاہم اس نے اسے لوہے کا ڈنڈا مار کر جان سے مار دیا۔

جب ایشور چندر کی عمر پانچ برس کی ہوئی تو انھیں بیر سنگھ کی ایک پاٹ شالا میں تعلیم حاصل کرنے بھیجدیا گیا جہاں اُنھوں نے کالی کنت چٹوپادھیا نامی معلم سے بنگالی زبان کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ آخرالذکر انکی تعلیم سے پدرانہ دلچسپی رکھتا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی بھر شاگرد کی اس سے خوب ہی محبت رہی۔

نوجوان ایشور چندر بڑا ہی شوخ طالب علم تھا۔ وہ اپنے ہمسایہ کے باغیچے سے پھل پھول توڑ لاتا، انکی فصلیں خراب کرتا اور کپڑے جو دھو کر خشک کرنے کے لیے دھوپ میں رکھے ہوتے انھیں خراب کر دیتا۔ یہی وجہ تھی کہ ہمسایہ کے لوگ اکثر اس کے شاکی و نالان پائے جاتے تھے لیکن باوجود اسکے اُستاد نے کبھی اس سے زیادہ مار پیٹ کا سلوک نہین کیا۔

ایشور چندر کی عمر ۹ برس کی تھی کہ ان کے والد ٹھاکر داس انھیں زیر تعلیم دلانے کلکتہ لے گئے۔ ان دنون سڑکون کی حالت نہایت خراب تھی جسکی وجہ سے ۶۰ میل کا فاصلہ تین یوم میں پورا ہوا اور یہین سے انکی پیادہ روی کی وہ طاقتین ترقی پذیر ہونا شروع ہوئین جو بعد میں انکے اندر نمایان طور پر موجود پائی جاتی تھین۔ بسا اوقات اُنھون نے بیر سنگھا اور کلکتہ کا درمیانی فاصلہ صرف ایک دن مین طے کیا اور ایک موقع پر اُنھون نے ۲۵ گھنٹہ مین ۱۰۰ میل کا فاصلہ طے کیا تھا۔ چلنے مین بڑے بڑے مضبوط جوان ان کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے اور بارہا دیکھا جاتا تھا کہ وہ اپنے ہمسفرون کو آرام دلانے کی خاطر ان کا بوجھ بھی اپنے ہی سر پر رکھ لیتے تھے۔ اپنی عمر کے آخری حصہ مین بھی جب کہ امراض اور بڑھاپے کی وجہ سے انکی جسمانی حالت بہت کمزور ہو چکی تھی ایک روز جبکہ وہ کرمٹانڑ مین جہان وہ علٰحدگی کی زندگی بسر کرتے تھے اپنے دوستون اور رشتہ دارون سمیت سیر کرتے پھر رہے تھے ان کے پوتون مین سے ایک نے جو جوان عمر تھا کہا "دیکھون آپ مجھ سے بھی زیادہ تیز چلنے والے ہین۔ کسی روز ہمارا اور آپ کا مقابلہ ضرور ہوگا" عمر رسیدہ ایشور چندر نے جواب دیا کہ "کسی روز کیا ابھی کرکے دیکھ لو" اتنا کہکر اُنھون نے دھوتی کو خوب کس لیا اور تھوڑے ہی عرصے مین اس نوجوان اور اس کے بعض ہمراہیون کو چند فرلانگ پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گئے۔ شیخی باز نوجوان نے ان تک پہنچنے کی جان توڑ کر کوشش کی مگر رہ گیا۔ بوڑھا بابا دور سے اسکی کوششون کو دیکھتا اور مسکرا کر چپ رہ جاتا تھا۔

جب ایشور چندر کو کلکتہ پہنچا دیا گیا تو ان کے والد ٹھاکر داس کو صرف ۸ے ماہانہ ملتے تھے لیکن اس پر بھی اُنھون نے اس بات کا مصمم ارادہ کر رکھا تھا کہ انھین بہتر سے بہتر ممکن تعلیم دلائی جائے۔ ایک شریف النفس کایستھ نے باپ بیٹے پر رحم کھا کر انھین نہ صرف اپنے ہان رہنے کے لیے جگہ دی بلکہ کھانے کپڑے کا بھی بندوبست کر دیا۔ اس کنبہ کے سبھی آدمی بالخصوص ایک بیوہ عورت (رئیمنی) ایشور چندر سے بے حد محبت کرتی تھی اور اسنے اپنے بیٹے سے بھی بڑھ کر سلوک کیا کرتی تھی۔ ایشور چندر نے جہان اپنی خود نوشت سوانح عمری مین اس کا ذکر کیا ہے وہان لکھا ہے کہ مین نے رئیمنی سے بڑھکر مہربان محبت کرنے والی اور فراخدل عورت نہین دیکھی

اس پاکباز عورت کی تصویر مدت العمر میرے دل پر نقش رہے گی۔ وہ ایک دیوی تھی جسکی مین اپنی مان سے بھی بڑھکر تعظیم کرتا ہون اور بڑھاپے مین بھی جب کبھی اسکی یاد آتی ہو تو بے اختیار آنکھون سے آنسو نکل پڑتے ہین"۔ ایشور چندر جب تک زندہ رہے ہمیشہ عورت کی عزت و تکریم کرتے رہے۔ اِس احساس کی بنا عام خیال کے بموجب اس نیک سلوک کے باعث ان کے دل مین قائم ہوئی تھی جو ریتی نے ان سادہ اس خنکر بیچنے والی عورت نے ان کے والد سے کیا تھا۔

کلکتہ پہنچنے کے بعد ابتدائی تین ماہ کا عرصہ ایشور چندر نے ایک ورنیکولر پاٹ شالا مین بسر کیا جہان اُنھون نے تھوڑی بہت بنگالی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد انھین سنسکرت کالج مین داخل کرا دیا گیا جس جگھ عمر رسیدہ پنڈت پرانے طریق پر طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے معلم اور متعلم دونون فرش پر بوریہ بچھا کر بیٹھا کرتے تھے۔ حاضری مین باقاعدگی یا پابندی اوقات کا فریقین کو خیال نہ ہوتا تھا اور معلمون مین سے بعض دن کا ابتدائی حصہ سو کر گذارا کرتے تھے۔ تعلیم کے آٹھ کورس مقرر تھے جن کی سرسری تفصیل حسب ذیل تھی:-

(۱) گرامر یعنی ویاکرن۔
(۲) علم ادب یعنی ساہتیہ۔
(۳) علم کلام۔
(۴) قانون یا سمرتی۔
(۵) فلسفہ۔
(۶) ویدانت۔
(۷) علم نجوم۔
(۸) آیورویدہ۔

ظاہر ہو کہ ان سب کو ختم کرنے کے لیے ایک مدت درکار ہوتی تھی لیکن اس زمانہ کے معلم بڑے قابل اور فاضل لوگ ہوتے تھے اور تعلیم نہایت اطمینان بخش طریقہ پر دی جاتی تھی۔ ایشور چند رکو جنوری ۱۸۲۹ع مین اس جگھ داخل کرایا گیا تھا اور ۱۸۴۱ع تک اس جگھ زیر تعلیم رہے۔ بالآخر جب انھون نے تعلیم ختم کی تو ان کی عمر ۲۱ برس کی تھی۔ اس جگھ اُنھون نے جو ۱۲ سال بسر کیے اس کے دوران مین اُنھون نے علوم کی شاخون مین سے چھ مین کامیابی حاصل کی۔ ان کی تعلیم کا زمانہ نہایت ہی شاندار تھا یعنی ایسا جو صرف نادر قابلیت اور خوبی کے لوگون کو نصیب ہو سکتا ہو۔ وہ بڑی کامیابی کے ساتھ کالج کی ایک جماعت سے دوسری مین ترقی کرتے رہے۔ سوائے ایک کے وہ تمام امتحانات مین نمبر اول پر رہے اور ہمیشہ انعام اور وظائف حاصل کرتے رہے۔ زمانہ طالب علمی کے تیسرے سال مین ساہتیہ کے پروفیسر نے انھین اپنی جماعت مین داخل کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ انکی عمر اسوقت صرف ۱۱ سال کی تھی لیکن آخر کار اسے بھی انکی قابلیتون کا قائل ہو کر داخل کرنا پڑا۔ ۱۲-۱۳ سال کی عمر مین سنسکرت کے ایسے عمدہ شلوک لکھ سکتے تھے کہ سب لوگ انکی تعریف کرتے تھے۔ زمانہ طالب علمی ہی مین ان کا رسوخ اسقدر بڑھ چکا تھا کہ ایک پنڈت کو انکی سفارش پر فلسفہ کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ تعلیم ختم کرنے سے پہلے وہ خود بھی گرامر کے قائم مقام پروفیسر مقرر ہو گئے اور ایکمرتبہ جب نیائے شاستر کے ایک دقیق مسئلہ پر انکی پنڈت رام موہن ترک سدہانت سے جو اپنے عصر کا بڑا نامور فیلسوف ہو گذرا ہے بحث ہو گئی تو انھون نے اسے اندر دے استدلال مغلوب کر دیا جب اس واقعہ کی خبر بڈھے ٹھاکر داس کو ملی تو دوڑ فوراً کالج مین پہنچا اور پنڈت جی کے پاؤن کی خاک اپنے بیٹے کے سر پر رکھی تاکہ وہ انکسار کا سبق سیکھ سکے۔ ایک اور عمر رسیدہ پروفیسر کو انکی دور اندیشی اور عاقبت بینی کے خیال پر یہان تک اعتماد تھا کہ جب اس نے بڑھاپے مین ایک جوان لڑکی سے دوبارہ شادی کرنے کا ارادہ کیا تو اس مسئلہ پر ان سے رائے لینی ضروری خیال کی بحالیکہ ان دونون ان کی عمر صرف ۲۰ سال کی تھی۔ ایشور چندر نے اپنے معلم کے دلائل کو بڑے صبر و تحمل سے سنا اور وہ صرف اسی نتیجہ پر پہنچ سکے کہ بڈھے پنڈت کا اپنی پوتی کی عمر کی لڑکی سے

شادی کرنا حد درجے کی خود غرضی اور ناعاقبت اندیشی پر دلالت کرتا ہو۔ اس لیے اسے صاف لفظون مین بتادیا کہ آپ اگر یہ کام کرین گے تو سخت غلطی کے مرتکب ہونگے۔ لیکن اسوقت ان کے کہنے کی پروا نہ کی گئی اور نہ صرف بڈھے نے اس لڑکی سے شادی کر لی بلکہ وہ ایشور چندر کو اپنی بیوی دکھانے کے لیے ساتھ بھی لے گیا۔ وہ اپنے معلم کے ہمراہ بہت کچھ تامل کے بعد گئے اور لڑکی کو دو روپیہ منھ دکھائی کے دیئے۔ وہ غور سے اس کا منھ دیکھے بغیر واپس ہونے ہی کو تھے کہ بڈھے نے ان کا بازو پکڑ کر اسکا چہرہ پورے طور پر دیکھنے پر مجبور کیا۔ ایشور چندر نے اس حسین لڑکی کے چہرہ کی طرف دیکھا اور فوراً وہان سے لوٹ آئے۔ جب اُنھون نے اس بات پر غور کیا کہ قدرتی طور پر اس غریب کو عنقریب مختلف دشواریان اور مصیبتین پیش آنے والی ہین تو بے اختیار انکی آنکھون سے آنسو نکل پڑے۔ ان کے خیالات بالکل سچ ثابت ہوئے اور لڑکی چھوٹی عمر ہی مین بیوہ ہو گئی۔

جب ایشور چندر نے سنسکرت کالج کا آخری امتحان پاس کر لیا تو انھین ودیا ساگر (بحر العلوم) کا خطاب دیا گیا۔ اسکے علاوہ کالج کے سارے پروفیسرون نے جُدا جُدا طور پر انھین سندات دین کیونکہ انمین سے ہر ایک کو اس قسم کے ہونہار شاگرد کا معلم ہونے پر فخر تھا۔ ان دنون انکی عمر صرف ۲۱ سال کی تھی۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہو کہ چھوٹی عمر ہی مین وہ کسقدر ذہین اور محنتی تھے۔

لیکن خالی ذہانت رکھنے سے کسی شخص کو قابل ذکر قابلیت حاصل نہین ہوسکتی۔ معلوم ہوتا ہو کہ ودیا ساگر کو ہمیشہ اس مقولہ کی صداقت کا اعتراف تھا کہ "ذہانت کے ساتھ غیر معمولی محنت سے بھی کام لیا جانے تو انسان اس رفعت پر پہنچ سکتا ہو جو دُنیا مین اس کا نام روشن کرے۔" اگر کسی شخص کو ودیا ساگر کے برابر ذہانت حاصل ہوتی لیکن وہ غیر معمولی محنت اور جد و جہد کا معتقد نہ ہوتا تو شاید اُن حالات مین کام کرتے ہوئے جو ایشور چندر کو پیش آئے وہ کبھی ان کے برابر ناموری حاصل نہ کر سکتا۔ جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہو

ودیا ساگر ایک بہت غریب خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد کی آمدنی صرف اتنی تھی کہ جس سے وہ بمشکل اپنا اور اپنے کنبہ کے لوگون کا گذارا چلا سکتا تھا۔ اِن حالات مین جیسا بُرا بھلا کھانا کپڑا نصیب ہوتا اسی کو غنیمت سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ اتنی توفیق حاصل نہ تھی کہ کوئی اچھا سا مکان کرایہ لیا جائے یا کوئی نوکر کام کرنے کے لیے رکھین۔ ان وجوہ سے ودیا ساگر کو بچپن مین خراب کھانا، بُرے کپڑے، مضر صحت مکان اور ادنیٰ نواحات مین زندگی بسر کرنا پڑتی تھی۔ انھین اپنے والد اور بھائیون کے سبھی کام مثلاً سودا خریدنا، کھانا پکانا، جھاڑو دینا، کپڑے دھونا، صفائی کرنا خود ہی کرنا پڑتے تھے۔ اِن بواعث سے انھین صبح اور رات کے پہلے حصہ مین مطالعہ کرنے کا بہت کم وقت ملتا تھا۔ لیکن ان مشکلات پر بھی جب کبھی انھین وقت ملتا وہ مطالعہ مین منہمک رہتے تھے۔ بسا اوقات دیکھا جاتا تھا کہ سبزی پک رہی ہو اور یہ کتاب لیے پاس بیٹھے پڑھ رہے ہین یا مدرسہ کو جارہے ہین تو راستہ مین کتاب دیکھتے جاتے ہین۔ ان کے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا اور وہ وقت کی بے حد قدر کرتے تھے۔ لیکن اس پر بھی چونکہ انھین بہت کم اور ناکافی وقت مل سکتا تھا اسلیئے وہ بہت رات تک مطالعہ کرتے تھے۔ سُنا گیا ہو کہ وہ رات کے دس بجے سوتے تھے، اور ان کے اصرار پر ان کا والد ۲ بجے انھین جگا دیا کرتا تھا۔ اسوقت سے لیکر صبح تک وہ برابر مطالعہ مین مصروف رہتے تھے۔

ان کے سونے کی جگہ ایک ۲ بہ ۲ فٹ کے برآمدہ مین تھی جہان وہ اتنی ہی لمبی چوڑی چٹائی پر لیٹ رہتے تھے۔ لیکن جب ان کا تیسرا بھائی انکے پاس آکر رہنے لگا تو ایک ہمسایہ نے ازراہ عنایت ان کے رہنے کے لیے ایک چھوٹا سا کمرہ دیدیا جس کا فرش بہت سیلا تھا جہان مچھر کھٹمل اور جھینگر بکثرت تھے۔ لیکن جو شخص دن رات مین اسقدر محنت کرتا ہو اسے مچھرون کھٹملون یا جھینگرون کی کیا پروا ہو سکتی ہو۔ چھوٹی عمر مین وہ پستہ قد تھے اور انکا سر غیر معمولی طور پر بڑا تھا۔ اس لیے ان کے ہم جماعت

طلبہ انھین "جبورے کالی" یا "کسورے جائی" کہا کرتے تھے جس سے مُراد جیسور کی اس مچھلی سے ہے جس کا سر بہت بڑا ہوتا ہے۔ ان کا والد باوجود محبت کرنے کے اکثر اِن سے سختی کا سلوک کرتا تھا۔ کالج کی تعلیم کے ابتدائی ایام مین وہ ہر روز رات کے وقت ان کا سبق سُنتا اور ذرا سی غلطی بھی ہو جاتی تو اُنھین مارتا پیٹتا تھا۔ ان ایام مین وہ اس بات پر بھی مُصر رہتا تھا کہ رات کو فلان وقت سے پہلے نہ سوتا اور اِس سے پہلے کبھی ان کی آنکھ لگ جاتی تو انھین بڑی سختی سے بیدار کیا جاتا تھا۔ کبھی کبھی نیک دل ریسنی ان کی شفارش کر دیا کرتی تھی لیکن ایک موقع پر تو ان کے والد نے انسے اسقدر سختی کا سلوک کیا کہ باوجود ایک مطیع اور فرمانبردار لڑکا ہونیکے انھین بھاگ کر رام دھن گنگولی (ایک ہمسایہ) کے مکان مین پناہ لینا پڑی۔ اتفاقات زمانہ سے آخر ایک وقت ایسا بھی آیا جب یہ سنسکرت کالج کے پرنسپل بنے اور رام دھن گنگولی ان کے ماتحت چھوٹی حیثیت مین کام کیا کرتا تھا۔ انھین واپس اپنے والد کے مکان پر پہنچایا گیا لیکن باپ کی طرف سے ان کے ساتھ جو بدسلوکی ہوتی رہی تھی اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عمداً اس کے احکام کی خلاف ورزی کرنے لگے۔ طبیعت کے ایسے پکے تھے کہ جب ایک بات کا مصمم ارادہ کر لیا تو مار پیٹ کے باوجود اپنے ارادہ سے باز نہ آئے۔ لیکن آخر کار ان کے والد کو اپنی غلطی محسوس ہو گئی، اور اس نے ان سے محبت و نرمی کا سلوک کرنا شروع کر دیا۔ اس واقعہ سے والدین ایک بہت اچھا سبق حاصل کر سکتے ہین۔ نہ صرف والدین بلکہ استادون اور تمام بااختیار لوگون کا فرض ہے کہ وہ بجائے سختی کے نرمی سے کام لیا کرین۔ انسانی طبیعت کو مطیع کرنیکا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہین کہ نرمی اور محبت کا سلوک کیا جائے۔ حد درجہ کے شریف، مطیع، اور نیک بچے بھی غیر معمولی سختی اور عدم توجہی سے نافرمانبردار اور گستاخ بن جاتے ہین۔ جب دیکھا جائے کہ وہ اس غلط راستے پر چلنے لگے ہین تو لازم ہے کہ وہ شخص جو ان پر اختیار رکھتا ہو فوراً اپنی روش بدلکر ان سے مہربانی اور ہمدردی کا سلوک کرنے لگے۔

جب وہ کالج مین تعلیم پا رہے تھے اور ان کی عمر ۱۴ برس کی تھی انکی شادی دین مے دیوی سے ہوئی جو شتر گھن بھٹاچارجی نامی ایک مرفہ الحال اور عزت دار برہمن کی خوبصورت بیٹی تھی۔ اپنی بیوی سے انھین شروع ہی سے بے حد محبت رہی اور اسی کے بطن سے ان کا بیٹا نارائن چندر اور چند لڑکیان پیدا ہوئین۔ اسکا انتقال ان کے دو سال قبل ہو گیا تھا۔

سنہ ۱۸۴۱ء مین جب اُنھون نے سنسکرت کالج کی طرف سے "ودیا ساگر" کا خطاب حاصل کیا تو اس کے ساتھ ہی ان کی زندگی کے پہلے اہم حصہ کا خاتمہ ہو گیا یعنی اُس حصہ کا جس مین اُنھون نے اپنی مشرقی تعلیم مکمل کی تھی۔ لیکن یہ تعلیم انکی اس کامل تعلیم کا محض ایک جزو تھی جسکی بدولت وہ اپنی زندگی مین کارہائے نمایان سر انجام دے سکے۔ انھین اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے انگریزی سیکھنا ضروری تھا جو سنسکرت کالج مین اُنھون نے بدرجۂ اقل سیکھی تھی۔ کالج سے نکلنے کے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے انکے دل مین اس بات کی تیز خواہش پیدا ہوئی کہ انگریزی زبان سیکھین اور وہ واقعہ یہ تھا کہ سنہ ۱۸۴۱ء مین انھین فورٹ ولیم کالج کا ہیڈ پنڈت مقرر کیا گیا جہان وہ انگریز سویلینون کو ملک کی ورنیکولر زبانین سکھایا کرتے تھے۔ اس حیثیت مین ہر روز ان کا واسطہ انگریز طلبہ سے پڑتا تھا اور چونکہ اسی سلسلے مین انکا اکثر دیگر نامی گرامی انگریزون سے میل جول ہوتا تھا اس لیئے قدرتی طور پر ان کے دل مین اس بات کی کوشش پیدا ہوئی کہ انگریزی کی خاصی تعلیم حاصل کرین۔ پس اُنھون نے بڑی محنت استقلال اور ہمت کے ساتھ اس زبان کو سیکھنا شروع کیا اور تھوڑے ہی عرصے مین اس پر بخوبی قادر ہو گئے۔ اس زبان مین بہت جلد اُنھون نے یہان تک قابلیت حاصل کر لی کہ اِنکے انگریزی مضامین کی عام

طور پر تعریف کی جاتی تھی۔ مشہور و معروف ڈاکٹر درگا چرن بنرجی (راجہ بابو سریندر ناتھ بنیرجی کے والد بزرگوار تھے) اور راج نرائن باسو ہر دو صحاب نے انھیں انگریزی سیکھنے مین بہت کچھ مدد دی اور انہی ایام مین انکی ملاقات مشہور و معروف زمیندار راجہ راد ہاکنت دیب بہادر، مشہور بنگالی مصنف اکشے کمار دت اور بعض دیگر مشاہیر بنگال سے ہوئی۔ وہ خود بعض عمر رسیدہ عالمون کو سنسکرت پڑہایا کرتے تھے اور ان کا طریق تعلیم ایسا عجیب اور جدید تھا کہ جو مضمون سنسکرت کالج کے دیگر پروفیسر برسون مین پڑہاتے اسکو یہ تھوڑے عرصہ مین پڑہا سکتے تھے۔ لہذا ایک شاگرد کی خاطر جس نے بعد مین ایک لائق استاد ثابت ہو کر ان کا نام بخوبی روشن کیا انھون نے سنسکرت کی مشہور ویاکرن (گرامر) مگدہ بودھ کو رات بھر کے اندر اندر خلاصہ کر کے بنگالی زبان مین لکھ لیا تھا۔

جن دنون وہ ہیڈ پنڈت کا عہدہ رکھتے تھے ہندوستان کے لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل تھے۔ وہ فورٹ ولیم کالج کا معائنہ کرنے گئے اور بہت دیر تک ان سے گفتگو کرتے رہے جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۴۴ء سے ۱۸۴۵ء تک بنگال کے مختلف حصون مین ۱۰۱ ورنیکولر اسکول جاری ہو گئے۔ ان اسکولون سے ان طلبہ کو بہت فائدہ حاصل ہوا جو سنسکرت کالج سے تعلیم پا کر نکلتے تھے کیونکہ ان اسکولون کے لیے معلم مقرر کرنے کا کام ودیاساگر کے سپرد تھا۔ اس مین شک نہین کہ انکی اس کارروائی سے سنسکرت کالج کے پروفیسر بہت ناراض ہوئے تاہم حقیقت یہ ہے کہ انھون نے جن استادون کو مقرر کیا ان سب کی حالت مین کبھی اپنے ضمیر کا خون نہین کیا۔ راستی کے اسقدر پابند تھے کہ ایک موقعہ پر کسی بات پر سنسکرت کالج کے پرنسپل سے تکرار ہو گئی جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان سے کوئی ایسی بات کرانا چاہتے تھے جسے یہ اپنے ضمیر کے خلاف پاتے تھے۔ آخر کار یہ اپنے عہدہ سے استعفا دینے پر آمادہ ہو گئے گو بعد مین یہان تک نوبت نہ پہنچنے پائی تاہم ان کے اس طریق عمل سے ان کے افسرون کی نظر مین انکی وقعت اور بھی زیادہ ہو گئی۔

اپنے موجودہ عہدہ پر وہ ۵۰ ر ماہوار تنخواہ پاتے تھے جو کسی طرح بھی زیادہ متصور نہین ہو سکتی لیکن جب ایک موقعہ پر سنسکرت کالج مین انھین گرامر کے پروفیسر کی جگہ دی جانے لگی جس سے انھین ۹۰ ر زیادہ ملنے کی امید تھی تو انھون نے اپنے نفع کی پروا نہ کرتے ہوے یہ عہدہ مشہور و معروف تارا ناتھ ترک واچسپتی کو دلا دیا کیونکہ وہ انھین اپنے سے زیادہ قابل شخص سمجھتے تھے۔ یہی وہ موقع تھا جبکہ اُنھون نے ۵۴ گھنٹہ مین ۔۔ میل کا فاصلہ طے کیا اور وہ بھی محض اس غرض سے کہ تارا ناتھ سے لکھکر اس عہدہ کے لیے عرضی دلائین۔ جب اس فاضل پروفیسر اور انکے باپ نے ودیاساگر کی زبانی یہ پیغام سنا تو ان کی حیرت کی کچھ انتہا نہ رہی اور وہ یک زبان ہو کر کہنے لگے "ودیاساگر! تم انسان نہین فرشتہ ہو!" اس واقعہ سے اس بات کا پورے طور پر ثبوت ملتا ہے کہ لارڈ ہارڈنگ کے قائم کردہ اسکولون کی آسامیان پُر کرنے مین اُنھون نے کس قدر دیانت داری سے کام لیا ہوگا۔

۱۸۴۶ء مین فورٹ ولیم کالج سے ان کا تعلق قطع ہو گیا اور وہ سنسکرت کالج کے اسسٹنٹ سکرٹری بنے۔ فورٹ ولیم کالج مین اُنھون نے پانچ سال تک جو کام کیا تھا اس سے دیگر فوائد کے علاوہ اُنھین ایک خاص فائدہ یہ حاصل ہوا کہ اُنھون نے انگریزی کی تعلیم حاصل کر لی۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کالج مذکور سے ان کا تعلق ان کی خوش نصیبی کی دلیل تھا کیونکہ اسی کی بدولت انکے خیالات کو وسعت اور آرا کو اہمیت حاصل ہوئی اور اسی کے وسیلے سے اُنھون نے بحیثیت ایک مصلح و ہوا خواہ بنی نوع انسان بڑے بڑے معرکے کے کام سر انجام دیئے۔ یہ خیال غیر درست نہ ہوگا کہ حامی تعلیم کی حیثیت مین ان کے کام کی ابتدا فورٹ ولیم کالج ہی مین ہو گئی تھی۔ کیونکہ وہان پر کالج کا کام کرنے کے علاوہ پرائیویٹ طور پر بھی وہ تدریس کا کام کرتے تھے۔ اس سے ہر چند کہ انھین کوئی خاص مالی

فائدہ نہین ہوا تاہم ان کے دل مین اس بات کا رجحان ضرور پیدا ہو گیا کہ سنسکرت تعلیم کو سادہ اور جدید اُصولون پر قائم کیا جائے اور یہی وہ بات تھی جو بعد مین ان کے لیے موجب شہرت ثابت ہوئی بسنہ ۱۸۴۶ء مین جب وہ سنسکرت کالج کے نائب سکرٹری بنے تو اس بارے مین انھین کام کا کافی موقعہ مل گیا اور بہت جلد اُنھون نے اپنے ضبط انتظام اور باقاعدگی سے شہرت حاصل کر لی۔ لیکن جب کالج کے سکرٹری یا منتظم خاص نے انکی بعض اصلاحی کارروائیون پر اعتراض کیا تو انھین مجبوراً اپنے عہدہ سے دست بردار ہو کر پرائیویٹ زندگی اختیار کرنا پڑی۔ ان کے ذاتی اعزاز اور خودداری کا ثبوت ایک اور واقعہ سے بھی ملتا ہے جو انہی ایام مین ہوا تھا۔ سنسکرت کالج کے نائب سکرٹری کی حیثیت مین انھین ایک روز ہندو کالج کے مسٹر کر کے ہان جانے کا اتفاق ہوا جس نے ان سے اچھا سلوک نہ کیا۔ جب یہ اس سے ملنے گئے تو اس نے انھین نہ تو کرسی دی اور نہ اچھی طرح پیش آیا بلکہ ٹانگین پھیلا کر آرام چوکی پر لیٹا رہا۔ ودیا ساگر کو اس سے رنج تو بہت ہوا لیکن اُنھون نے اسوقت اس معاملہ کو رفت گزشت کر دیا اور مسٹر کر سے جو کام تھا اسے سرانجام دیکر واپس چلے آئے۔ لیکن اُنھون نے اپنے دلمین اس بات کا عہد کیا تھا کہ مین مسٹر کر کو اس بارے مین ضرور سبق سکھاؤن گا چنانچہ بہت جلد ایک موقع اس قسم کا درپیش ہوا کہ مسٹر کر ان سے ملنے کے لیے آئے۔ ودیا ساگر نے کمرے سے تمام کرسیان اُٹھوا دینا اور خود اسی حالت مین جیسکر جس مین اُنھون نے مسٹر کر کو بیٹھا دیکھا تھا نوکر سے کہا کہ صاحب کو اندر آنے دو۔ اس حالت مین مجبوراً صاحب کو کھڑا رہنا پڑا اور ودیا ساگر کے ہاتھون اپنی اس طرح توہین ہوتے دیکھکر وہ سخت ناراض ہوئے یہان تک کہ آخر اس کی بڑی سختی سے شکایت لکھ بھیجی تعلیمی کونسل کے سکرٹری نے ودیا ساگر سے کیفیت طلب کی جسکے جواب مین اُنھون نے لکھا کہ مین اس سبق پر عمل کر رہا ہون جو خود مسٹر کر نے مجھے سکھایا تھا۔ اس بیان کو اطمینان بخش سمجھا گیا اور مسٹر کر کو جواب لکھ دیا گیا کہ آپ ودیا ساگر سے اپنے طور پر اس معاملہ کو طے کر لین۔ چنانچہ بعد مین ایسا ہی ہوا۔

سنسکرت کالج سے ودیا ساگر کا تعلق صرف تھوڑے ہی دن قطع رہا کیونکہ دسمبر سنہ ۱۸۵۰ء مین انھین علم ادب کی پروفیسری کا عہدہ پیش کیا گیا جسے اُنھون نے اس شرط پر منظور کر لیا کہ مجھے پرنسپل یا اس انسٹی ٹیوشن کے افسر اعلیٰ کے برابر انتظامی اختیارات دیے جائین۔ ان کا تقرر اس وقت عمل مین آیا تھا جبکہ سنسکرت کالج مین طلبہ کی تعداد کے بتدریج کم ہوتے جانے سے تعلیمی کونسل کو اس بات کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہین انسٹی ٹیوشن کو بند ہی نہ کرنا پڑے۔ پس سب سے اول اُنھون نے ودیا ساگر کو جو کام تفویض کیا وہ یہ تھا کہ کالج کی ترقی کے متعلق اپنی رپورٹ پیش کرین اور اس کام کو اُنھون نے ایسے حسن طریقت سے سرانجام دیا کہ کونسل نہ صرف انکی اعلیٰ قابلیت اور دانشمندی کی قائل ہو گئی بلکہ جو طریق عمل اُنھون نے اپنی رپورٹ مین قائم کیا تھا اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے بھی رضامند ہو گئی۔ پس اس نے انکی اصلاحات مجوزہ کو سربسر منظور کر لیا اور انھین باقاعدہ طور پر کالج کا پرنسپل مقرر کر دیا۔ اس طرح پر اختیارات حاصل ہو جانے پر اُنھون نے بہت سی اُن اصلاحات کو عمل مین لانا شروع کیا جنھین وہ اس وقت جب چند سال پیشتر نائب سکرٹری کی حیثیت سے عمل مین نہ لا سکے تھے، حاضری کی باقاعدگی اور دیگر اُمور مین پروفیسرون اور طلبہ دونون کو یکسان طور پر تنبیہ کی گئی۔ سزائے جسمانی کا طریقہ موقوف کر دیا۔ تعلیم انگریزی کو جبری بنا دیا گیا اور اس بات کی عام اجازت دیدی گئی کہ کالج مین چھوٹی ذاتون کے لڑکے بھی پڑھ سکتے ہین۔ علاوہ برین سنسکرت تعلیم کو ایسے طریق پر مرتب کیا گیا کہ اسمین بہت کچھ سادگی پیدا ہو گئی اور وہ زمانہ موجودہ کے معیار تعلیمی کے مطابق اور ضروریات کو پورا کرنے کے قابل ہو گئی۔

ان کا منشائے دلی یہ تھا کہ کالج کو ایک ایسے دار العلوم کی حیثیت دیجائے جہاں نہ صرف سنسکرت کی اعلیٰ وارفع تعلیم حاصل ہو سکے بلکہ اس کے ذریعہ سے ورنیکولر لٹریچر کی اصلاح ہو اور یہاں سے جو استاد تعلیم پاکر نکلین وہ تعلیم عامّہ کی اشاعت مین مدد دے سکین۔ یہ بیان کرنا غیر ضروری ہوگا کہ مناسب وقت گذرنے پر ان کا یہ منشا تمام وکمال پورا ہو گیا لیکن اسمین کلام نہین کہ اس کے حصول مین انھین بڑے صبر اور محنت و استقلال سے کام لینا پڑا۔ قریب قریب جتنے معلم ان کے ماتحت کام کرنے والے تھے وہ سب کسی وقت مین انکے اُستاد رہ چکے تھے اور ان سب کو ضبط کے دائرۂ انتظام مین لانا واقعی ایک مشکل کام تھا۔ لیکن انھون نے اپنے ذہن رسا کی مدد سے ایسی ایسی ترکیبین سوچین کہ بڈھے طوطون کو بھی پڑھا ہی لیا۔

قبل ازین بیان کیا جاچکا ہے کہ وِدیاساگر بڑے خوش مزاج تھے۔ اس خوبی کے علاوہ قدرت نے انکی طبیعت مین مذاق سلیم کا مادہ بھی کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ سزائے جسمانی سے انھین جو نفرت ابتدا ہی سے تھی اسکی وجہ غالباً یہ تھی کہ بچپن مین وہ خود اس کا شکار رہ چکے تھے اور اسی کی وجہ سے چند مرتبہ انھین اپنے والد کے احکام کی بھی خلاف ورزی کرنا پڑی تھی۔ شروع سے آخر تک ان کے دل مین یہی خیال پختہ رہا کہ کسی تعلیمی انسٹی ٹیوشن کی کامیابی کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ اُستادون اور طالبعلمون کا باہمی برتاو حُسن سلوک پر مبنی ہو۔ ہر کام مین طلبا اپنے استادون کی امداد پر کمربستہ ہون اور اُستاد بجائے خود ان سے مہربانی اور نرمی سے پیش آئین۔ جن دنون وہ کالج کی عمارت مین رہتے تھے متعدد طلبہ کالج کا وقت ختم ہونے کے بعد ان کے پاس پرائیویٹ طور پر ملنے جاتے اور وہ ہمیشہ ان کی تواضع کسی نقل سے یا دلچسپ گفتگو کے ذریعے سے کرتے تھے۔ ایسے موقعون پر وہ ہمیشہ انھین صیغہ واحد حاضر مین مخاطب کرتے جس سے طلبہ کی انسے پوری بے تکلفی تھی۔ لیکن بوقت ضرورت وہ انہی طلبہ سے سختی کے ساتھ بھی پیش آسکتے تھے گو ایسی صورتون مین انکی سختی صرف عارضی اور اسی قدر ہوتی تھی جتنی کہ ان کے خیال مین ان کے لیے مفید ہو جسوقت وہ نقص جو اس بد مزگی کا موجب بنا ہو دور ہو جاتا ان کا نرم دل فوراً پگھل جاتا تھا اور وہ پھر اسی نرمی سے سلوک کرنے لگ جاتے تھے۔ ایک موقعہ پر اُنھون نے تمام جماعت کو عمداً احکام کی خلاف ورزی کرنے پر خارج کر دیا لیکن جب اگلے روز وہی طالب علم ان کے مکان پر جاکر معافی کے طلب گار ہوئے تو اُنھون نے ان سب کو تہ دل سے معافی دیدی۔ اسوقت دوپہر کا وقت تھا اور جس وقت طلبا رخصت ہونے اُتر رہے تھے انھین سے ایک نے یونہی مذاقیہ طور پر دوسرے سے کہا کہ اگر وِدیاساگر کا دل ویسا ہی رحیم ہوتا جیسا کہ مشہور ہے تو وہ یقیناً ہمین کچھ کھانے کے لئے کہتے۔" یہ الفاظ ہر چند کہ دبی زبان سے کہے گئے تھے تاہم وہ وِدیاساگر کے کان مین پڑ گئے۔ اُنھون نے تمام طلبہ کو واپس بلا کر کچھ کھانے کو دیا جس پر طلبہ مین سے ایک کہنے لگا۔ "بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایسے نیک نفس کے دل مین غصہ رہ سکے؟"

جسوقت سنسکرت کالج کے تعلیمی سسٹم مین ترمیم کی گئی تو بنگالی زبان مین بہت سی درسی کتابون کا لکھنا بھی لازم ٹھہرا۔ بالآخر یہ کام بھی وِدیاساگر کے ذمہ پڑا اور اُنھون نے سنہ ۱۸۵۱ء اور سنہ [illegible] کے درمیان متعدد کتابین شائع کین۔ اِن کی علمی مصروفیتون کی ابتدا سنہ ۱۸۴۷ء سے ہو چکی تھی جبکہ اُنھون نے درسی کتابون کے علاوہ "سکنتلا" اور "سیتر بن باس" (سیتا کی جلاوطنی) ایسی بعض معرکۃ الآرا کتابین لکھین۔ مسٹر رومیش چندر دت آنجہانی انکی علمی قابلیت کا ذکر بدین الفاظ کرتے ہین:۔

ادبی قابلیت کے معاملہ مین اس وقت تک بنگال بھر مین کوئی شخص انکے پایہ کا نہ سمجھا جاتا تھا حتیٰ کہ بعد مین لوگ بابو بنکم چندر چٹرجی کی قابلیت کی داد دینے لگے۔

فی الحقیقت اُنھون نے اور ایک بنگالی مصنف بابو اکشے کمار دت نے

مگر زمانہ حال کی شاندار بنگالی نثر کی بنا قائم کی تھی۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ اُنھون نے زندگی کے آخری ایام تک جاری رکھا اور بیان کیا جاتا ہو کہ اُنھون نے صرف پانچ گھنٹہ مین شیکسپیر کا مشہور و معروف ڈراما Comedy of Errors "بھرنتی ولاس" کے نام سے لکھا تھا۔

سنسکرت کالج کے پرنسپل کی حیثیت مین ودیاساگر نے جو خدمات سرانجام دین انکی حکام بالادست نے یہان تک قدر کی کہ ۱۸۵۵ء مین انکی تنخواہ دوگنی کردی گئی اور اُنھین چار اضلاع کا خاص انسپکٹر مدارس اس غرض سے مقرر کیا گیا کہ وہ اس نئی تعلیمی پالیسی کو رواج دین جسکی ابتدا ۱۸۵۴ء کی مشہور تعلیمی مراسلت کے ذریعے سے ہوچکی تھی۔ اس پالیسی کا مطلب یہ تھا کہ ورنیکولر تعلیم کا آسان زینہ بنانا چاہیے۔ اس عہدہ کے لیے ان سے بہتر شخص کا انتخاب ناممکن تھا کیونکہ جس تندہی محنت اور قابلیت سے اُنھون نے کام کیا اس سے بہت کم لوگ کام لے سکتے مین اُنھون نے چارون اضلاع مین لڑکون اور لڑکیون کے لیے متعدد ماڈل اسکول جاری کرائے اور بنگال کے اول نارمل اسکول کی خود ہی بنا قائم کرکے اسکی نگرانی کی۔ ۱۸۵۸ء تک سب کام اچھی طرح چلتا رہا حتی کہ آخرکار اس سال بنگال مین ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن کا عہدہ قائم ہوا اور اسپر ایک نوجوان سویلین کا تقرر عمل مین آیا۔ اس نوجوان نے جس کا نام مسٹر گارڈن ینگ تھا ودیاساگر کے کام کی قدر نہ کی اور ۱۸۵۸ء کے قریب انھین بالواسطہ طور پر سرکاری ملازمت سے دست بردار ہونے پر مجبور کیا۔ ودیاساگر سے اس شخص کا جو سلوک تھا اس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہو کہ اس نے ایک زنانہ اسکول کے متعلق رقوم اخراجات کی ادائیگی منع کردی۔ یہ اسکول سر ایف ہالیڈے لفٹنٹ گورنر بنگال کی زبانی منظوری سے کھولا گیا تھا البتہ اس کے متعلق مسٹر ینگ کی باضابطہ منظوری نہ لی گئی تھی۔ لفٹنٹ گورنر موصوف ودیاساگر پر بہت مہربان تھے اور انھین بہت عزت کی نظر سے دیکھتے تھے جب انھین اس حادثے کی خبر پہنچی تو اُنھون نے ودیاساگر کو اس عہدہ سے جسکی تنخواہ انھین ۵۰۰ روپیہ ماہوار ملتی تھی مستعفی ہونے سے منع کیا لیکن ودیاساگر نے سمجھ لیا تھا کہ میرا اب اس عہدہ پر رہنا میری خودداری مین فرق لاتا ہو۔ پس اُنھون نے استعفا داخل کرہی دیا۔ اس استعفا کو منظور کرتے ہوئے نواب لفٹنٹ گورنر نے انھین اطلاع دی کہ "ہندوستان مین اشاعت تعلیم کے بارے مین آپ نے جو کوشش بڑی سرگرمی سے مدت دراز تک کی ہے اس کا گورنمنٹ تہ دل سے اعتراف کرتی ہو"۔

اس زمانہ مین ودیاساگر کی عمر ۳۸ برس کی تھی۔ بہ اعتبار ایک معلم و ادیب کے اُنھون نے خاصی شہرت حاصل کرلی تھی۔ اس زمانہ کی تمام تعلیمی انجمنون سے ان کا تعلق تھا اور وہ کلکتہ یونیورسٹی کے ممبر بھی تھے۔ ان کے ریٹائر ہونے کا افسوس ان کے ہندوستانی و یورپین احباب کو یکسان طور پر ہوا اور اندیشہ تھا کہ آئندہ انکی ذات سے پبلک کو استفادہ حاصل کرنے کا موقع نہ مل سکے گا لیکن خوش قسمتی سے یہ خیال غلط ثابت ہوا کیونکہ بقول مشروت اُنھون نے ملازمت کی نسبت ملازمت سے علیحدگی کے ایام مین اپنے آپ کو زیادہ مفید ثابت کر دکھایا۔ انھین اپنی کتابون سے معقول نفع حاصل ہورہا تھا اور تعلیمی کام سے انکی دلچسپی بدستور سابق تھی حتی کہ آخرکار ان کی بے غرضانہ کوششون کا نتیجہ کلکتہ کے میٹرو پولیٹین انسٹی ٹیوشن کی صورت مین نمودار ہوا جو اپنی قسم کے انسٹی ٹیوشنون کے لیے ایک قابل فخر و یادگار نمونہ تھا۔ انکی مدد سے مسٹر بیتھیون نے کلکتہ مین جو زنانہ اسکول قائم کیا تھا اس کے ساتھ آنریری سکرٹری کی حیثیت مین انکا تعلق مدتون قائم رہا اور وہ چار سو روپیہ ماہوار کے خرچ سے اپنے وطن مین تین اسکول بھی برابر چلاتے رہے۔ انکے علاوہ اُنھون نے مختلف حصونمین متعدد اسکول قائم کیے اور ان کے چلانے مین مدد دیتے رہے۔

(۲)

اسمین کچھ شک نہین کہ ودیا ساگر نے تعلیمی حلقہ مین بہت کچھ کوشش کی لیکن جس مخصوص کام کے لیے اسوقت تک انکا نام روشن ہو اور جو بات زمانہ آئندہ مین بھی ان کی شہرت برقرار رکھنے والی ہو وہ مجلسی اصلاح کے میدان مین انکی دلیرانہ کوشش اور غریبون اور محتاجون کی فیاضانہ مدد ہو۔ مجلسی اصلاح کے بارے مین سب سے پہلی کوشش جو انکی طرف سے عمل مین آئی وہ یہ تھی کہ وہ سنسکرت کالج کے پروفیسرون کے خلاف رائے ادنیٰ ذات کے لڑکون کو بھی کالج مین داخل کرنے پر زور دیتے تھے اور اسبارے مین انھون نے یہان تک مصمم ارادہ کر رکھا تھا کہ اگر گورنمنٹ انکی اس کارروائی مین مانع آتی تو وہ اپنے عہدہ سے دست بردار ہونے تک کیلئے آمادہ تھے۔ دوسری کوشش جو ان کی طرف سے عمل مین آئی یہ تھی کہ زنانہ اسکول کے متعلق منتظمون نے ان سے مدد چاہی اور وہ اس کے لیے پورے طور پر آمادہ ہو گئے بجالیکہ اس کارروائی سے کلکتہ کے راسخ الاعتقاد ہنود مین بہت اضطراب پھیل گیا تھا۔ لیکن سب سے معرکہ کی فتح جو انھون نے اہل بنگالہ کے غیض و غضب کے شدید طوفان مین حاصل کی غریب ہندو بیوگان کے حقوق کی حمایت کے متعلق تھی۔ اس موقعہ پر بنگالیون مین جسقدر ہلچل اور اضطراب پیدا ہوا اسکی مثالین بہت کم دیکھنے مین آتی ہین۔ مسٹر دت فرماتے ہین :-

بنگال کے ہر شہر اور ہر گاؤن مین اسی بات کا چرچا تھا۔ مشہور بنگالی شاعر ایشور چند رگپت اور بنگالی گویتون کے سردار دشرتھی نے نوم ان مصلح کی نسبت طرح طرح کے طنزیہ اشعار کہے۔ گاؤن کے لوگ جب کبھی اکٹھے ہو کر بیٹھتے تو اس مسئلہ پر گفتگو کرتے تھے۔ شانتی پور کے جلاہون نے ساریون کے کنارون پر ازدواج بیوگان کے گیت بنکر نمودار کیے۔ غرض بنگال کے ہر گھر مین کیا مرد اور کیا عورتین اسی انقلاب عظیم کے متعلق چرچا کرتے تھے۔

اس پر اکتفا نہ کر کے بعض گنوار لوگون نے ان سے ذاتی طور پر بھی گستاخانہ سلوک کیا۔ بعض نے مارپیٹ کی دھمکی دی اور بعض انکی جان کے لیوا بنے۔ لیکن اس سے ان کے ارادہ یا ہمت مین ذرا فرق نہین آنے پایا۔ ایک روز انھون نے سنا کہ فلان دولت مند آدمی نے اپنے نوکرون کو میری زدوکوب کے لیے متعین کیا ہو اور وہ اس بات کا مشورہ کر رہے ہین کہ کوئی مناسب موقع ملے تو بدسلوکی کی جائے۔ یہ خبر پاتے ہی وہ بڑی دلیری سے اس امیر کے مکان پر جا پہنچے۔ نوکرون مین سے ایک نے ان کے آنے کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے "مین نے ایسا سنا تھا۔ سوچا کہ تم لوگون کو میری تلاش کی خواہ مخواہ تکلیف اٹھانا پڑے گی۔ اب مین تمھارے سامنے کھڑا ہون جو کچھ جی مین آئے مجھ سے سلوک کرو۔" اتنا سنکر وہ سب شرمندہ ہو گئے اور انھون نے فوراً معذرت طلب کی۔

ایک اور موقع پر جب وہ ریل مین سفر کر رہے تھے ایک پرانے خیال کا پنڈت بھی انہی کے کمپارٹمنٹ مین سوار تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ مین جس سے گفتگو کر رہا ہون وہی ودیا ساگر ہے۔ بے سمجھے سوچے انکی نسبت طرح طرح کی بدکلامیان کرتا رہا۔ ایشور چندر بھی چپ چاپ سنا کیے اور اس بات کو ظاہر نہ ہونے دیا کہ مین ہی وہ شخص ہون۔ منزل مقصود پر پہنچکر جب دونون گاڑی سے اترے تو کسی ذریعے سے پنڈت کو معلوم ہو گیا کہ یہی ایشور چندر ہین جنکی توہین خود اسی کے منھ پر کرتا رہا ہون۔ بہت نادم ہوا یہان تک کہ غش کھا کر گر پڑا لیکن انھون نے اپنے ہاتھ سے اسے ہوش مین لانے کی کوشش کی اور بعد مین ہر طرح کا اطمینان دلایا۔

عقد بیوگان کی تحریک کے ایام مین ودیا ساگر کو طرح طرح کی مشکلات پیش آئین۔ لیکن غصہ کے اس طوفان مین وہ چٹان کیطرح استقلال کے ساتھ کھڑے رہے۔ وہ اپنے دشمنون کے رکیک حملون کا جواب طرح طرح کو دیتے تھے اور دیانت دارانہ نکتہ چینی کا" فاضلانہ بحث اور قومی استدلال کے ذریعے سے ان کی کوششون کا سمجھدار لوگون کے دلون پر جو اثر پڑتا تھا اسکا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہو کہ اس زمانے کے بڑے بڑے آدمی

شلاً پرسن کمار ٹیگور، رام گوپال گھوش، پرتاب چندر سنگھ، دوارکا ناتھ متر، زیندر ناتھ سین وغیرہ بھی ان کے حامی تھے۔ انھین ایام مین جب عقد بیوگان کی حمایت مین ایک ناٹک کا کھیل کیا گیا تو ان بڑے بڑے آدمیون مین سے بعض نے اس مین پارٹ لیے اور کیشب چندر سین نے اسٹیج مینجر کے فرائض ادا کیے۔ اس تمام تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۵۶ء مین گورنمنٹ نے عقد بیوگان کو قانوناً جائز ٹھیرایا اور ودیا ساگر نے اپنی زیست مین کم از کم ستر ایسی شادیان کرائین۔ کسی شخص کے لیے اس قدر کامیابی واقعی بہت اہم ہو لیکن اس جد وجہد مین ان کا روپیہ بھی بہت صرف ہوا۔ چونکہ ان اخراجات کے لیے انکی آمدنی پورے طور پر مکتفی نہ ہو سکتی تھی اس لیے اُنھون نے کم و بیش ۵۰ ہزار روپیہ قرض لیا اور مدت العمر خود ہی اسے اُتارنے کی کوشش مین لگے رہے۔ انکے بعض دوستون نے ادائیگی قرضہ کے لیے چندہ جمع کرنے کی تحریک کی لیکن اُنھون نے بڑی سختی سے انھین ایسا کرنے سے باز رکھا۔ اُنھون نے عقد بیوگان کو اپنی زندگی کا مدعائے عظیم بنا لیا تھا اور اس مدعا کو حاصل کرنے مین انھین اپنی جان تک کی پروا نہ تھی چنانچہ اپنے بیٹے نارائن چندر کی شادی کے موقعہ پر اُنھون نے اپنے بھائی سے کہا تھا کہ ہندو بیوگان کے متعلق اپنی کوششون کو مین اپنی زندگی کا سب سے زیادہ نیکی اور پارسائی کا کام سمجھتا ہون۔

معلوم ہوتا ہے کہ بیوگان کو مدد دینے کا مصمم ارادہ ودیا ساگر کے دلمین چھوٹی عمر ہی مین ہو چکا تھا چنانچہ انکی عمر ابھی ۱۴ سال ہی کی تھی کہ اُنھون نے دیکھا کہ ایک لڑکی جو بچپن مین ان کے ساتھ کھیلا کرتی تھی شادی کے بعد بہت جلد بیوہ ہو گئی اور ایک اور بیوہ کے گھر ناجائز بچہ پیدا ہوا جسے اس عورت کی شرمناک کارروائی پر پردہ پوشی کرنے کے لیے گلا گھونٹ کر مار دیا گیا۔ وہ آخر دم تک اپنے اُصول پر قائم رہے گو ان کے بہت سے دوستون نے ایک بار حامی بھر کر بعد مین انکا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ایک تقریب پر جبکہ کسی بیوہ کی شادی ہونیوالی تھی اور ودیا ساگر اسمین شریک ہونے جا رہے تھے اُنھون نے مشہور و معروف مصلح راجہ رام موہن رائے کے بیٹے رام پرشاد کو ہمراہ چلنے کیلیے کہا لیکن جب وہ متامل ہوا تو اُنھون نے بانی برہمو سماج کی تصویر کی طرف جو دیوار سے لٹک رہی تھی اشارہ کر کے کہا کہ بہتر ہو آپ اسے وہان نہ لٹکائین بلکہ اُتار کر ردی مین پھینکدین۔

ودیا ساگر نے تمدنی اصلاح کے متعلق جو بیشمار کوششین کین ان مین ایک وہ بھی تھی جو اُنھون نے کلین براہمنون مین کثرت ازدواج کی خرابی کو روکنے کے بارے مین کی۔ اس معاملے پر انکی توجہ انکی ایک رشتہ دار عورت نے مبذول کرائی تھی جسکی شادی ایک کلین براہمن سے ہو چکی تھی اور جو اپنے شوہر کے تغافل سے تنگ آ چکی تھی۔ اُنھون نے حسب معمول اس کام کو پوری کوشش سے شروع کیا اور ایک سے زیادہ عرضی ہزارہا لوگون کی دستخطی گورنمنٹ کی خدمت مین پیش کی۔ اس تحریک سے اس معاملے کے انسداد کے لیے کوئی قانون تو پاس نہ ہوا البتہ عام رائے مین بہت کچھ اصلاح ہو گئی اور اس وقت سے یہ خرابی دن بدن کم ہوتی گئی۔

یہان پر ودیا ساگر کے اصلاحی کامون کا سلسلہ ختم ہوتا ہے اور اب ان کے اس کام کا ذکر کیا جاتا ہے جو اُنھون نے بہ حیثیت ہوا خواہ بنی نوع انسان کیا اور اس مین یہان تک کامیابی حاصل کی کہ کل بنگالی قوم آجتک ان کا نام عزت و تکریم کے ساتھ لیتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بچپن کی عمر ہی سے انھین رفاہ عامہ کا خیال پیدا ہو چکا تھا چنانچہ جن دنون وہ سنسکرت کالج مین ۱۵۔۱۶ سال کی عمر مین وظیفہ یاب تھے تو بوقت ضرورت اپنے بیمار ہم جماعتون کی تیمار داری کرتے۔ کسی شکستہ حال فقیر کو دیکھ پاتے حسب استطاعت اسکی مدد سے دریغ نہ کرتے اور اگر خود پاس نہ ہوتا تو دوسرے سے مانگ کر دینے کو بھی موجب عار نہ سمجھتے تھے۔ جن دنون کالج مین تعطیلین ہوتین وہ دیہات مین جا کر بیمارون اور

محتاجون کی خبرگیری اور امداد کیا کرتے تھے۔ جب انھین فورٹ ولیم کالج مین جگہ ملگئی تو ان کے وسائل امداد بھی کسیقدر وسیع ہو گئے۔ اس زمانے مین انھین ۵۰ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی اور اس مین سے حتی الامکان کافی روپیہ بچا کر وہ اس سے غریب غربا کی مدد کرتے تھے۔ محتاجون کی خبرگیری کرنے مین انھین خاص طور پر آنند (مسرت) حاصل ہوتا تھا اور متعدی امراض کے مریضون کے پاس جانے سے بھی نہ ڈرتے تھے۔ کوئی اجنبی خواہ غریب ہی کیون نہ ہو وہ اسکی مدد پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ ایک موقعہ پر ایک شخص کو جو کسی کھاتے پیتے گھرانے مین نوکر تھا ہیضہ ہو گیا۔ آقا نے مارے ڈر کے اسے گھر سے نکال دیا۔ وہ غریب بازار مین پڑا دم توڑ رہا تھا کہ ودیا ساگر کی نظر اسپر پڑ گئی۔ یہ فوراً اسے اُٹھوا کر اپنے ہان لے گئے اور جب تک صحت یاب نہ ہوا اسکی تیمارداری کرتے رہے جن تین اسکولون کا ذکر قبل ازین ہو چکا ہے ان کے علاوہ اُنھون نے اپنے گاؤن مین ایک خیراتی شفاخانہ بھی کھلوایا جس کا ماہوار خرچ سو روپیہ تھا جن دنون وہ خاص انسپکٹر مدارس کی حیثیت مین دورہ کیا کرتے تھے تو انکی یہ حالت تھی کہ راستے مین کسی شخص کو بیمار و نحیف پڑا پاتے تو اسے اُٹھوا کر پالکی مین ڈالتے اور خود ساتھ ساتھ چلتے جاتے حتی کہ کسی سرائے تک پہنچ جاتے اور وہان ہر طرح اس کے آسائش و علاج کا انتظام کرکے آگے بڑھتے جب کہین جاتے تو کچھ متفرق سکے پاس رکھ لیتے اور راستے مین کوئی حاجتمند نظر آتا تو اسکی امداد سے بالکل دریغ نہ کرتے تھے۔ کوئی شخص جو ان کے پاس جا کر اپنی مصیبت کی کہانی بیان کرتا ضرور ان سے مدد حاصل کرتا تھا اور کوئی نہین کہہ سکتا کہ انھون نے در پردہ کتنی بیوگان اور یتیمون کی کھانے کپڑے لتے اور ضروری سامان کے ذریعے سے مدد کی۔ وہ متعدد غریب لڑکون کو اپنے ہان رکھ کر ان کی تعلیم کا انتظام کرتے تھے۔ اسطرح ایک موقعہ پر تو ایک سو لڑکے ان کے ہان کھانا کھاتے اور تعلیم حاصل کرتے تھے۔ گداگر اور اجنبی ان تک بڑی آسانی سے رسائی حاصل کر سکتے تھے اور اسی وجہ سے اُنھون نے کبھی کوئی دربان نہین رکھا کہ مبادا کوئی حاجتمند ان سے ملے بغیر واپس چلا جائے۔ چند آدمی قرض کی بلا مین اسطرح پھنسے ہوئے تھے کہ ان کا رہا ہونا دشوار اور ناممکن نظر آتا تھا اور وہ تباہی کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اُنھون نے اپنے پاس سے انکی مدد کرکے قرض سے انھین خلاصی دلائی۔ ایک بوڑھا برہمن ۲۴۰۰ روپیہ کا مقروض تھا اور قرض خواہ اس غریب کی جو تھوڑی بہت پونجی تھی اسکی تاک مین لگا ہوا تھا۔ انھین جب اس معاملہ کی خبر ملی تو اپنے طور پر معاملہ کو اوپر ہی اوپر طے کر دیا اور برہمن کو مطلق خبر نہ ہو سکی کہ مجھ پر یہ مہربانی کس نے کی ہے۔ لیکن یہ سب کوششین ۱۸۵۶ء کے قحط کے موقعہ پر ان کی عظیم الشان امدادی کوششون کے مقابلہ مین ہیچ تھین۔ ان کے گاؤن مین قحط سے سخت مصیبت نازل تھی۔ جب یہ وہان پہنچے تو دیکھا کہ ان کی والدہ نے غربا کی امداد پہلے سے شروع کر رکھی ہے۔ وہ اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر ایک سو غریبون کو روزمرہ کھلایا کرتی تھین لیکن ودیا ساگر کی نظر مین یہ مدد ناکافی تھی۔ اُنھون نے اپنے خرچ سے وہان اور آس پاس کے گاؤن مین لنگر جاری کر کے ایسا انتظام کیا کہ ایک ہزار غربا کو روزانہ مفت کھانا ملتا رہا۔

وہ ادنٰی سے ادنٰی ذات کی عورتون کو اپنے ہاتھ سے کھانا دیکر اپنے رشتہ دارون کے لیے ایک مثال قائم کرکے دکھاتے تھے۔ صرف کھانا کھلانے کو انکی امداد کے لیے غیر مکتفی سمجھ کر اُنھون نے حاملہ اور زچہ عورتون کے لیے جداگانہ مکانات کھلوا دیے۔ ان کی ان تمام کوششون کا اعتراف بارہا گورنمنٹ کی طرف سے ہوا لیکن اس اعتراف کا سب سے بڑا ذریعہ، "ودیا ساگر" "ودیا ساگر" کے وہ بلند نعرے تھے جو ہر روز سیکڑون ہزارون بھوکون اور محتاجون کے منہ سے خود بخود نکلتے تھے۔ اس کے تین سال بعد بردوان مین ایک مہلک قسم کا بخار پھوٹ نکلا جہان اُنھون نے اپنی رفاہ عامہ کی کوششون سے پورے طور پر کام لیا۔ ان کا موطن

ان کے ہزارون روپیہ خرچ ہوگئے مگر انھین اسکا کبھی خیال نہین آیا کیونکہ اس کام سے انھین جسقدر خوشی ہوتی وہ اور کسی طرح نہ ہوتی تھی اور گوان کی آمدنی ان غیر معمولی اخراجات کے لیے کبھی کفتی نہ ہوئی تاہم وہ خوش تھے کہ مین اس کو بہترین مصرف مین لا رہا ہون۔ اسباب مین انکے دلی خیالات اور محسوسات کا اظہار انکی وصیت سے ہوتا ہے جس مین اُنھون نے نہایت دور کے رشتہ دارون اور متوفی دوستون کے کنبہ والون تک کو فراموش نہین کیا۔

ان حالات مین یہ بات ذرا بھی تعجب خیز نہین کہ رام کرشن پرمہنس ایسے شخص کو جو بنگال مین زمانۂ حال کا سب سے بڑا مذہبی آدمی ہو گذرا ہو اور جس کے پیرو ہزارون کی تعداد مین موجود ہین یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ودیا ساگر کے مکان پر جا کر ان سے ملاقات کرے جب اس نے اس معاملہ کا ذکر اپنے بعض مقلدون سے کیا تو وہ اس پر نہایت متعجب ہوئے لیکن اس نے انھین بتایا کہ اگر ایسر ایشور کی مہربانی نہ ہوتی تو ودیا ساگر اتنا بڑا آدمی نہ بن سکتا۔ اس کے بعد ایک موقع پر سوامی جی خود ودیا ساگر سے ملنے گئے اور کہنے لگے کہ "مین ندی نالے اور دریا عبور کرکے آپ ساگر (سمندر) دیکھنے آیا ہون"۔ ودیا ساگر نے اُسی لہجہ مین جواب دیا "مجھے آپ کے تشریف لانے کی بہت خوشی ہے لیکن میری دانست مین آپکو ساگر مین کھاری پانی اور کوڑیون کے سوا اور کچھ نہ ملے گا" سوامی جی نے استعارہ کی لطافت کو قائم رکھتے ہوے کہا "مین جس سمندر کے پاس آیا ہون وہ دودھ شہد وغیرہ رتنون (جواہرات) سے بھرا ہوا ہو اور مجھے پوری توقع ہو کہ مین اس کے اندر سے انمول موتی حاصل کرسکونگا" اس پر لطف گفتگو کے بعد دونون مین بہت دیر تک بات چیت ہوتی رہی اور آخر دونون خوشی خوشی ایک دوسرے سے جُدا ہوئے۔

لیکن باوجود مذہبی خیال اور مذہبی خصلت کا انسان ہونے کے معلوم ہوتا ہو کہ ودیا ساگر کسی خاص مذہبی فرقہ سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ ایک موقعہ پر اُنھون نے کہا تھا کہ:۔

اس قسم کے فرقے در اصل باہمی تفرقہ پیدا کرتے ہین۔ اگر ایک شخص اس بات کا قائل ہو کہ میرے پاپ گنگا اشنان سے دور ہو جائین گے اور دوسرا اس بات کا کہ شوجی کی بھگتی ہی کے ذریعے سے انسان کو موکش حاصل ہو سکتی ہو تو دونون کو ان کے عقائد مبارک رہین۔ میرے لیے وشویشور (شوجی) اور ان پورنا (گنگا) میرے والدین ہین اور مین تہِ دل سے انھی کی پرستش کرتا ہون۔ مین کسی حالت مین فرقہ بندی کا حامی نہین ہو سکتا کیونکہ اگر کوئی فریق غلطی پر ہوا تو مین دوسرون کے گناہون کا جوابدہ ٹھیرایا جاؤنگا اور پرماتما مجھے جھوٹ کے لیے سزا دینگے۔

غرض یہ کہ اُنھون نے اپنا مذہبی عقیدہ کبھی کسی پر ظاہر ہی نہین کیا گو اس مین شک نہین کہ اپنے ماتا پتا (والدین) کی وہ ان پورنا اور وشویشور ہی کی طرح پرستش کرتے رہے۔ وہ ہر روز صبح اُٹھکر انھین یا انکی تصاویر کو پرنام کیا کرتے تھے اور کسی اہم کام کو شروع کرنے سے پیشتر ان کی آشیش (برکت) ضرور حاصل کر لیتے تھے۔ والدین کی تعظیم ان کے دل مین یہان تک گھر کر چکی تھی کہ ازدواج بیوگان کے معاملے کو چھیڑنے سے پہلے بھی اُنھون نے ان سے اجازت حاصل کرنا ضروری سمجھا اور اگر ان کے ایک مرتبہ والد کی سختی سے تنگ آکر سرکش ہو جانے کے معاملے کو مستثنے قرار دیدیا جاے تو انکی ساری عمر مین ایک بات بھی ایسی نظر نہین آتی جو انکی پابندی فرض و تعظیم والدین پر حرف لانیوالی ہو۔ ان کو سب سے بڑی محبت اپنی ماں سے تھی اور اسی سے یہ فیاض منشی ورثہ مین ملی تھی۔ ایک موقع پر صرف اپنی ماں کی خوشی پوری کرنے کے لیے وہ کلکتہ سے پیدل چلکر اپنے گاؤن مین پہنچے تھے۔ راستے مین اُنھون نے کہین آرام بھی نہ کیا اور دو بڑے دریاؤن کو جو خوب چڑھاؤ پر تھے عبور کرکے عین وقت پر اسکے پاس جا پہنچے! اُنھون نے عزم کر لیا تھا کہ اگر مجھے گاؤن جانے کے لیے فورٹ ولیم کالج سے چھٹی

دالی تو نوکری چھوڑ دونگا۔ باپ سے انھین جو باتین ورثہ مین ملین وہ کام کی باقاعدگی اور سلیقہ اور پوری محنت تھین۔ چونکہ ان کے والدین پاک صاف اور محبت سے معمور دل رکھتے تھے اس لیے خدا نے انھین جو بیٹا دیا وہ ہر پہلو سے کامل نمونہ کا درجہ رکھتا تھا جن دنوں انکی شہرت بنگال مین چارون طرف پھیلی ہوئی تھی ان دنون بھی انھون نے اپنے والدین کی خاطر داری سے اور انکی خدمت کا کام سرانجام دینے مین انکار نہین کیا۔ جب وہ کرم آتار مین سادہ زندگی بسر کرنے والے سنتھالیون کے ساتھ جنگل مین رہا کرتے تھے تو ان کے ساتھ گھل مل گئے تھے کہ وہ انھین اپنی ہی برادری کا آدمی سمجھنے لگے تھے۔ ہر روز صبح کے وقت ان لوگون کی جھونپڑیون مین جاتے اور انھین کسی چیز کی ضرورت ہو تو بہم پہنچاتے تھے۔ بھوکون کو روٹی ننگون کو کپڑا اور بیمارون کو دوا دینا ان کا فرض تھا اور بسا اوقات انھین پھل اور مٹھائی بھی دیا کرتے تھے۔ انکے لیے انھون نے ایک اسکول کھولدیا اور ان کی مچھلیان خود خرید کر ان کی آمدنی مین اضافہ کرنے کا طریقہ نکالا۔ انکے جنگلی ناچ سے وہ بہت خوش ہوا کرتے تھے۔ یہ لوگ جنگل کی سبزی ترکاری بطور تحفہ انکے روبرو پیش کرتے جسے وہ بڑی خوشی سے قبول کر لیتے تھے۔ ان مین سے بعض انھین ازراہ محبت باپ اور بھائی اور بعض چچا کہا کرتے تھے اور وہ ان مخاطبون کے برادرانہ سلوک سے بہت ہی خوش ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک سنتھال کسی عورت کو ہمراہ لیے ان کے پاس آیا اور ان سے اس کے لیے کپڑا مانگا۔ انھون نے جواب دیا میرے پاس اسوقت اس کے دینے لائق کوئی کپڑا نہین ہے۔ لیکن سنتھال انکی طرف سے انکار کا لفظ سننے کا عادی نہ تھا۔ اس نے ودیاساگر سے الماری کی چابی لیکر خود ہی بکس کھول لیا اور اس بے تکلفی سے گویا وہ خود ہی اس گھر کا مالک ہے ایک قیمتی کپڑا انکالکر اس عورت کے

حوالہ کر دیا۔ ودیاساگر اس شخص کی اس بے تکلفی سے بہت ہی خوش ہوے۔ سامان عیش سے انھین فطری نفرت تھی۔ ایک بار انھون نے ایک گھوڑا گاڑی رکھ لی تھی مگر پھر جلدی ہی اسے بیچ ڈالا۔ لباس انکا بے حد سیدھا سادہ ہوتا تھا۔ یعنی ایک معمولی دھوتی، چادر اور پاؤن مین سلیپر۔ وضع کی پابندی اسقدر تھی کہ لفٹنٹ گورنرون سے بھی اسی لباس مین ملاقات کی۔ اس قسم کے سادہ کپڑے پہننے کی وجہ سے بعض اوقات عورتین ان کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتی تھین۔ جن دنون وہ انسپکٹر مدارس تھے تو ایک موقع پر کسی دیہاتی اسکول کا معاینہ کرنے گئے۔ اسکول کی عمارت کے قریب بہت گنوار ان کی صورت دیکھنے جمع ہو گئے۔ عورتین بھی بہت تھین اور وہ قدرتی طور پر اس بات کی متوقع تھین کہ کوئی بڑا آدمی شاندار کپڑون والا دیکھنے مین آئے گا لیکن جب وہ دھوتی چادر پہنے ایک عام آدمی کی طرح پیدل چلتے نظر آے تو انکی حیرت بہت بڑھ گئی۔ ایک بڑھیا جو گھنٹون دھوپ مین کھڑی انکا انتظار کرتی رہی تھی اسے تو کسی طرح اس بات کا یقین ہی نہ تھا کہ یہ شخص ودیاساگر ہو سکتا ہے۔ انکی طرف بہت دیر تک گھورتی رہنے کے بعد وہ آخر کار کہنے لگی "کیا مین اس اُڑیہ قلی کو دیکھنے اتنی دیر تک دھوپ مین جلا کی! نہ گاڑی، نہ چپکن، نہ چغہ، نہ پگڑی، نہ گھڑی ہار، ارام رام ایسا آدمی! اور لوگ کہتے تھے وہ اتنا بڑا آدمی ہے! واہ کیسا پاگل پن ہے!"

لیکن گو وہ خود اسقدر سادہ لباس پہنتے تھے، اور خانگی معاملات مین نہایت کفایت شعاری برتتے تھے تاہم اپنے شاندار کتب خانے کی کتابونکو خوب بنا سنوار کر رکھتے تھے۔ یہان تک کہ ولایت سے انکی جلدین بندھوانے مین بہت سا روپیہ صرف کیا کرتے تھے۔ آخری ایام مین وہ کسی شخص کو اپنی کتاب عاریتاً نہ دیتے تھے اسکی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی کتابون سے بے حد محبت کرتے تھے اور لیجانے والون پر انھین ایک طرح کی بے اعتباری تھی جو کسی طرح بے وجہ نہین

کہی جا سکتی۔ ایک بار ایک دوست ان سے ایک نہایت قیمتی مسودہ مطالعہ کی غرض سے مانگ کر لے گیا لیکن بجائے پڑھنے کے اس نے اسے بیچ ڈالا۔ اس طرح پر اُسنے اس مسودہ سے نفع تو حاصل کیا مگر وہ نفع ذہنی نہین بلکہ مالی تھا۔ کچھ مدت بعد ودیا ساگر نے اس سے کتاب واپس مانگی تو بڑی ڈھٹائی سے کہنے لگا "مدت ہوئی کہ کتاب آپ کو واپس کر چکا ہون۔"

سطور بالا مین جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس سے اس بات کا بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ودیا ساگر ایک ایسا شخص تھا جس پر ہر قوم یا ہر ملک کو فخر حاصل ہو سکتا ہے۔ انکی زندگی کی ہر بات مین کوئی نہ کوئی سبق ضرور پایا جاتا ہے۔ انمین وہ تمام صفات موجود تھین جو کسی شخص کو بڑا بناتی ہین اور انمین سب سے زیادہ قابل ذکر خوبیان صداقت، مہربانی، سادگی، استقلال، آزادگی، فیاضی، اور جوش تھین۔ والدین کی وہ جسقدر تعظیم کرتے تھے اسے دیکھتے ہوئے پورانک زمانہ کا سمان نظرون مین پھر جاتا ہے۔ زمانہ طالب علمی مین اُنھون نے جو سختیان اور تکالیف جھیلین ان سے ہر نوجوان نہایت قیمتی سبق حاصل کر سکتا ہے۔ ان کا زمانہ اُستادی ہمارے روبرو زمانہ قدیم کے رشیون کی مثال پیش کرتا ہے جو جنگلون کے اندر رہ کر اپنے مقدس آشرمون مین بڑے پیار و محبت سے اپنے چیلون کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ بہ اعتبار ایک سوشل ریفارمر کے اُنھون نے جو کام کیے وہ انکی فیاضانہ فطرت کو بخوبی واضح کرتے ہین۔

ایشور چندر ودیا ساگر نے ۷۰ سال سے زائد عمر حاصل کر کے ۲۹ جولائی سنہ ۱۸۹۱ء کو انتقال کیا۔ جس وقت ان کی ارتھی شمشان کو لے جانے لگے تو ہزارہا مرد و زن، پیر و جوان، ہر مذہب و ہر ملت کے لوگ اس کے ہمراہ تھے اور وہ سب کے سب اس بات پر متفق تھے کہ اگر زمانہ حال مین کسی شخص نے سادہ زندگی بسر کرتے ہوئے اعلیٰ مقاصد کو پیش نظر رکھنے کی عملی مثال قائم کی ہے تو وہ ودیا ساگر تھا جسے ہزارہا غریب لوگ "دیا ساگر" کہکر خوش ہوتے تھے۔

تیرتھ رام

آنریبل مولوی سیّد حسین بلگرامی

مملکتِ آصفیہ اس خیال سے کہ اُس کے حکمران اسلامی روایات کے علمبردار ہیں اور اس لحاظ سے کہ وہاں اس گئی گذری حالت مین بھی جوہر شناسی اور علم پروری کی وہی خصوصیات نمایان ہین جو کسی زمانہ مین دولتِ عباسیہ اور فرمانروایانِ قرطبہ کے ساتھ مختص سمجھی جاتی تھین اقطاعِ ہند مین بانمود سمجھی جاتی ہو۔ شروع سے لیکر اب تک دولت نظام مین ترقی و صلاح کے کئی دور ہو چکے ہین لیکن مورخین کا اجماع ہو کہ سرسالار جنگ اعظم کا زمانہ حیدرآباد کا "عہد زرین" تھا حقیقت حال بھی یہی ہو کہ اس دانشمند مدبر کے وقت مین حیدرآباد کے سیاسی اقتدار اور ملکی عظمت کا دائرہ اسقدر وسیع تھا کہ آج ہماری نگاہین اُن کا حصر کرنے سے عاجز ہین۔ اُن تمام تاثیرات کے اعتبار سے جو وزارتِ عظمیٰ کی بدولت دکن کو نصیب تھی اُس شہرت اور وقعت کو دیکھتے ہوے جو اُس عہد مین حیدرآباد کو شاہی خاندان کو حاصل ہوئی اور علم دوستی اور معدلت پروری کے اُس جوش کا اندازہ کرتے ہوئے جس سے اپنے اپنے وقت پر ہر شخص نے فائدہ اُٹھایا بے جا نہو گا اگر یہ کہا جاے کہ حیدرآباد مین سالار جنگی کارنامے اُسی عزت و شان سے دیکھے جاتے ہین جو کبھی بغداد مین برامکہ اور دارالسلطنت سلاجقہ مین نظام الملک طوسی کے حصے مین آئی تھی۔

سرسالار جنگ کے عملیات کی نمایان کامیابی کا ایک گہرا اور سچا راز یہ بھی تھا کہ اُنھون نے اپنے گرد ہندوستان کے تمام لائق اور یکتا افراد جمع کر رکھے تھے۔ حیدرآباد کی تعلیمی حالت اُسوقت ایسی نہ تھی کہ وہان کی آب و ہوا سے قابل جوہر پیدا ہو سکتے اور اسکی ضرورت تھی کہ بیرونی حصص سے ایسے اشخاص چیدہ چیدہ بلائے جائے جنکی دماغی قوتین حیدرآباد کے عروج کا مرکز قرار پائین۔ سر سالار جنگ کا سا دور بین آدمی اس ضرورت سے قطع نظر نہین سکتا تھا چنانچہ اُنھون نے شمالی ہند کے بہت سے نامور لوگون کو ازراہِ قدردانی حیدرآباد طلب کیا اور اُن کے سپرد وہ گرانبار فرائض کئے گئے جن کے انجام دینے کی اُنہین فطرتی قابلیت موجود تھی۔ اِن لوگون مین جو بزرگ سب سے پیشتر حیدرآباد کے سیاسی پلیٹ فارم پر نمودار ہوے وہ آنریبل مولوی سید حسین صاحب بلگرامی تھے جن کے چہل سالہ کارنامے اسبات کے شاہد ہین کہ جسطرح وہ ارکان دولت نظام کے زمرہ مین اپنے اور ہمعصرون سے پہلے شریک ہو کر الفضل للمتقدم کے مصداق ہوے اسیطرح بے لوث کارگذاری اور مستقل شہرت کے میدان مین بھی وہ کسی سے پیچھے نہین رہے۔

مولوی سید حسین صاحب بلگرامی ہندوستان کے اُس طبقے سے تعلق رکھتے ہین جنکی قابلیت اور علمیت اور اُسی کے ساتھ اجتہادِ رائے مسلم ہو۔ بلگرام اودھ کا مشہور قصبہ ہو اور اُسکی خاک کچھ ایسی مردم خیز واقع ہوئی ہو کہ آجتک وہان سے متعدد نامور اور ذی شہرت اصحاب نکل چکے ہین۔ تو طن کے لحاظ سے مولوی سید حسین صاحب کو اُنھین اسلاف کی جانشینی کا فخر ہو جنکی عظمت کا نقارہ

آج بھی اُسی زور شور سے بج رہا ہے۔ لیکن باریک بین نگاہیں مولوی صاحب کی بزرگی و ناموری کا حصہ دار تمام ہندوستان کو سمجھتی ہیں اور واقعیت بھی یہی ہے۔

آنریبل مولوی سید حسین بلگرامی ہندا جانے اس نام میں کیا جادو ہے اور دو چار الفاظ کے اس مجموعے میں کیا تاثیر ہے؟ قلم اس جادو اور اس تاثیر کا فوٹو کھینچنے سے عاجز ہے لیکن ذوق سلیم ان کی کیفیات کا اندازہ کر سکتا ہے کہا جاتا ہے کہ لفظوں کے ظاہری معانی کے علاوہ باطنی مطالب بھی ہوتے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو ہم کہیں گے کہ آنریبل موصوف کے نام نامی سے جو معنوی مطلب ذہن نشین ہوتا ہے وہ عبارت ہے سوز و گداز قوم سے، تمام ہمدردی سے، بے لوث محبت سے، حقیقی خدمت ملک سے، ایثار نفس سے، علم دوستی سے، صاف گوئی سے، راستبازی سے اور اُن تمام اوصاف سے جو اس یگانۂ روزگار کے حصے میں آئی ہیں۔ ایک بات اور بھی عجیب ہے کہ اس نام کی تاثیر مسمریزم کی طرح محدود یا پابند نہیں ہے بلکہ لامحدود اور غیر پابند سارے خطے ہند میں یہ تاثیر پھیلی ہوئی ہے اور مسلم، ہندو، عیسائی، پارسی ہر ایک کے قلب اُس سے متاثر ہوتے ہیں۔

مولوی صاحب کے حالات ملک میں اس کثرت سے زبان زد ہیں کہ اُن کا تفصیلی اعادہ تحصیل حاصل سے زیادہ نہو گا۔ مختصراً یہ سمجھ لینا چاہیے کہ آپ بلگرام کے ایک معزز و موقر خاندان کے رکن رکین اور فرد فرید ہیں۔ آپ کا خاندان عراق عرب سے بلگرام آیا تھا۔ عہد مغلیہ میں آپ کے بزرگوں کا رسوخ بہت بڑھا ہوا تھا۔ اور جب ہند کی عنان حکومت برٹش گورنمنٹ کے قبضے میں آئی اُس وقت بھی آپ کے خاندانی عروج و ترقی کی رفتار یکساں طور پر تیز رہی۔ آپ کے خاندان میں علم و فضل کا چرچا جو کچھ آجکل ہے وہی حالت بزرگوں کی بھی تھی اسی وجہ سے آپ کی تعلیم کا انتظام بھی نہایت معقول رہا گویا آپ کو عربی، فارسی یا انگریزی کی جو تعلیم دلائی گئی وہ بالکل باصول تھی۔ انگریزی زبان دانی میں آپ کو جو یدِ طولیٰ حاصل ہے اُسکی بنیاد گویا بزمانہ طالب علمی پڑ چکی تھی۔ مطالعہ علمی کا شوق آپ کی طبیعت ثانیہ بنا ہوا تھا۔ کتابوں کے ساتھ آپ کو عشق تھا حیدر آباد میں بھی باوجود فرائض منصبی کی گرانباری کے آپکا بہت کچھ وقت لائبریری میں کٹتا تھا جسکو بیش بہا اور نادر کتب کا مجموعہ کہنا بالکل صحیح ہو گا۔

مضمون نویسی اور انشا پردازی کا شغف بھی آپ کو ابتدا سے ہے چنانچہ جب آپ لکھنو میں تھے تو ایک انگریزی اخبار نکال رکھا تھا جسکی ترتیب و تالیف آپ ہی کے ذمہ تھی۔ اِن تمام باتوں نے آپ کی شہرت کا دائرہ بہت وسیع کر رکھا تھا۔ چنانچہ جب سنہ ۱۸۷۳ء میں نواب سر سالار جنگ بہ تقریب دورہ شمالی ہند آئے تو آپ کو اُن سے تعارف حاصل کرنے کا بہت اچھا ذریعہ پیدا ہو گیا۔ نواب سر سالار جنگ کی مردم شناس نظر آپکے جوہر طبعی کو پہچان گئی چنانچہ آپکو لکھنو سے حیدر آباد لیجانا پڑا اور وہاں آپکو صدارت عظمی کے معتمد خصوصی (یا پرائیوٹ سکرٹری) کا منصب تفویض ہوا۔ وزیر اعظم دکن کی پرائیوٹ سکرٹری شپ کی ذمہ داریاں کوئی معمولی نہیں ہوتیں لیکن مولوی سید حسین صاحب بلگرامی نے جس خوبی اور دانشمندی سے اپنے فرائض انجام دیئے ہیں اُن کی یاد ہنوز تک حیدر آباد والوں کے دلوں میں موجود ہے۔ رازداری کی صفت آپ میں نہایت حقیقی صفت ہے اور نواب سر سالار جنگ کا اعتماد کلی حاصل کرنے میں اس سے بیش بہا امداد پہنچی۔ نواب موصوف آپ پر اپنا دلی عندیہ تک ظاہر کرنے میں حیص بیص نہ کرتے تھے۔ حیدر آباد میں اَب بھی کچھ لوگ ایسے موجود ہوں گے جو نواب صاحب اور سید صاحب کے بے تکلفانہ اور راستبازانہ برتاؤ کی چشم دید شہادت دیسکیں گے۔

سنہ ۱۸۸۴ء میں حضرت غفران مکان میر محبوب علیخان مرحوم تخت نشین ہوئے اور انتظام مملکت کے لیے اسٹیٹ کونسل مقرر ہوئی۔ اُسکے

سکرٹری بھی مولوی سید حسین مقرر ہوئے۔ اسٹیٹ کونسل کے ختم ہونے پر مولوی صاحب موصوف کو حضور نظام مرحوم کے پرائیویٹ سکرٹری شپ کا قلمدان سپرد ہوا۔ اس خدمت کو آپنے بہت زمانہ تک انجام دیا اور غائت درجہ کی نیکنامی اور راستبازی سے جو لوگ ریاستی کاروبار سے واقف ہیں اور اُسکی پیچیدگیوں کا کچھ تجربہ رکھتے ہیں، وہ مولوی سید حسین صاحب کی مشکلات کا ایک حد تک اندازہ لگا سکتے ہیں لیکن مولوی صاحب نے اس خداداد قابلیت و عقلمندی سے اپنا کام انجام دیا ہو کہ شاید و باید۔

آخر آخر میں آپ کے تفویض نظامت و تعلیمات عامہ ممالک محروسہ سرکار عالی کا عہدہ تفویض ہوا تھا اور وظیفہ یاب ہونے سے پیشتر تک آپ اسی منصب پر مامور تھے۔ ہم اسوقت آپ کی تعلیمی خدمات کا تبصرہ کرنے پر آمادہ نہیں، نہ قلت گنجایش اسکی اجازت دیگی، لیکن یہ ضرور کہینگے کہ آپ نے اگرچہ حیدرآباد یونیورسٹی علیحدہ قائم نہیں کی، صنعتی تعلیم کو بڑے پیمانہ پر جاری نہیں کیا، تعلیم نسوان کو بھی بہت محدود حالت میں رکھا، تاہم حیدرآباد کے حالات و واقعات کا اندازہ کرنے کے بعد اس صیغے میں آپ سے جو کچھ ہو سکا وہ کم نہیں ہے۔ ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مولوی سید حسین صاحب بلگرامی کو ہر ایک قسم کی تعلیم رائج کرنے کی فکر دامن گیر رہتی تھی لیکن حکام بالادست کی طرف سے اُنھیں کسی قسم کی امداد نہیں پہنچی۔ آج جو کچھ تعلیم وغیرہ کا چرچا حیدرآباد میں ہو رہا ہو وہ سب مولوی صاحب کی ذاتی کوششوں کا نتیجہ ہو۔ اکثر یہ اعتراض ہوتا ہو کہ آپ کے زمانہ میں صنعتی تعلیم کی طرف مطلق توجہ نہیں کی گئی لیکن یہ صحیح نہیں ہو، توجہ ضرور ہوئی ہو، ہاں اُسکے نتائج کچھ زیادہ مستقل اور دیرپا نہیں نکلے اور اُسکی اصلی وجہ وُہی تھی جو ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ ہمیں اتفاق سے اُس زبردست یادداشت کی ایک نقل ملگئی ہو جو آپ نے ممالک محروسہ سرکار عالی میں تعلیم صنعت و حرفت کو رواج دینے کے متعلق قلمبند فرمائی تھی۔ یہاں اُسکا اقتباس درج کیا جاتا ہو کہ ناظرین بھی اسکو پڑھکر آپ کی اصابت رائے کا اندازہ کر سکیں:-

سررشتہ تعلیمات سرکار عالی کی بنیاد اُن ہی اُصول پر جاری ہو جنکی پابندی قدیم سے چلی آتی ہو۔ غور کیا جاے تو نوعیت سب کی یکسان ہو۔ غریب امیر، عہدہ دار، ساہوکار، مزارع، اہل حرفہ سبھی کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا ہو یا وہ علوم جن سے لکھنے پڑھنے میں مدد ملے اور دفتر یا حجرہ میں بیٹھکر دماغ سے کام لینے کی عادت پڑ جائے۔ ظاہر ہو کہ یہ طریقہ تعلیم کا فرض کر لیتا ہو کہ امیر و غریب سب کو دُنیا میں یہ آزادی یا آسایش معیشت پیدا کرنے کیلئے فقط دماغ ہی سے کام لینا بس ہو۔ املا و انشا کا فن، ساری مشکلوں کو حل کر سکتا ہو...... کچھ شک نہیں کہ یہ صفات جنکا ذکر اوپر ہوا بجاے خود کسب کے قابل ہیں اور نہایت درجہ مفید ہیں...... مگر شاید تمام آبادی ملک کا اگر حساب کیا جاے تو سَو میں پانچ بھی ایسے نہ نکلیں گے جن کو انشا و املا سے کام لینے کی بالعادت ضرورت رہتی ہو پس عامۂ خلائق کا تمام تعلیمی وقت ایسے فنون کی تحصیل میں صرف کرانا اُصول تعلیم کے خلاف ہو۔ عموماً رعایا کو اُس قسم کی تعلیم دینا چاہیے جو کسب معیشت میں اُنکو مدد پہنچاے اور اُن کے اذہان کو اسقدر صیقل دیدے جس سے وہ اپنے روزمرہ کے معاملات کو جلد سمجھ سکیں...... جو بچے فقط چشم و دماغ سے پڑھنا اور ہاتھ سے لکھنا سیکھتے ہیں اور اُن اعضا سے اور کوئی کام نہیں لیتے اُن سے کیونکر اُمید کیجا سکتی ہو کہ وہ سن رشد کو پہنچکر ہل درست چلا لیں گے یا کوئی دستکاری کا کام بھی بہتر کر سکینگے ...... حاصل تقریر یہ ہو کہ مزارعین و اہل حرفہ وغیرہ کی اولاد کو محض کتابی تعلیم نہ دینا چاہیے بلکہ ایک معتد بہ حصہ اُن کے تعلیمی وقت کا صنعت اور حرفت کے سکھانے میں صرف کرنا چاہیے۔ کتابی تعلیم اُن کو فقط اسقدر دینا چاہیے کہ وہ لکھنے پڑھنے میں دوسرے کے محتاج نہ رہیں اور اپنی صنعت و حرفت میں عقل و فہم سے کام لے سکیں اور اُس میں اختراع و ایجاد کرنے پر

قادر ہون۔

ان خیالات کے اظہار فرمانے کے بعد آپ نے تجویز بنائی ہو کہ اضلاع دکن مین کہان کہان صنعتی مدارس کھولے جانے چاہیئے۔ اس یادداشت سے کم از کم اسقدر پتہ ضرور چلتا ہو کہ آپ بھی اُسی صنعتی تعلیم کے مویّد تھے جسکی ضرورت عام طور پر ہندوستان مین محسوس ہو رہی ہو۔

اسی طرح یہ اعتراض بھی بسا اوقات وارد کیا جاتا ہو کہ باوجود تعلیم نسوان کے بہترین اور پُرجوش حامی ہونیکے آپ کے زمانۂ نظامت مین مدارس نسوان نے خاطرخواہ ترقی نہین کی لیکن یہ اعتراض بالکل بودا اور نادرست ہو۔ حیدرآباد مین دو ایک زنانہ اسکول بہت خوبی سے کام کر رہے ہین۔ اس سے زیادہ زنانہ اسکولون کی ضرورت کیا تھی؟ اسکول تو بہت سے قائم ہو سکتے تھے مگر پڑھنے والیان کہان سے آتین۔ ہان اگر والدین مین لڑکیون کو تعلیم دلانے کا شوق ہو جائے تو مدارس کی کثرت مفید ہو سکتی ہو۔

مولوی سید حسین صاحب بلگرامی کا زمانۂ زندگی زیادہ تر حیدرآباد مین گذرا ہو۔ وہان کے کئی انقلابات اُنکی نظرون کے سامنے ہوئے اُنھین ریاستی زندگی کا خاص تجربہ ہو چنانچہ اسوقت تک وہان کتنی سازشین ہوئین، پارٹی فیلنگ کا زور بڑھا، وزارتین بدلین، حسد و عناد کی گرم بازاریان رہین، لیکن آپ کی کوہ وقاری دیکھنے کے قابل ہو کہ آپنے اپنے اُصول سے ذرہ بھر جنبش نہین کی، ایک سیدھا راستہ جو شروع مین اختیار کیا اُس پر سے نہین ہٹے۔ انقلابون اور سازشون اور دھڑہ بندیون کے طوفان نے آپ کی طبیعت پر کوئی اثر نہین کیا۔ آپ ہر دور مین یکسان معزز و ممتاز و معتمد رہے، اور یہی اعتماد و امتیاز تھا جسکی وجہ سے حضور نظام مرحوم کی آپ پر خاص نظرعنایت تھی۔ آپ نے کئی مرتبہ فرائض منصبی سے سبکدوش ہونے کے لیے استعفا دیا لیکن مرحوم نے نامنظور فرمایا حضور حال کی تعلیم و تربیت کا ایک حصّہ آپ کے سپرد تھا اور یہ بڑی خوشی کی بات ہو کہ زمانۂ حال مین گورنمنٹ نظام نے آپ کی سالہا سال کی تجربہ کاری سے فائدہ اُٹھانے کے لیے آپ کو مشیر وزارت مقرر فرما کر حد درجہ کی بالغ نظری کا ثبوت دیا ہو۔ گورنمنٹ نظام سے آپ کو جو خطابات حاصل ہین اُن کی تفصیل یہ ہو۔ نواب علی یار خان، موتمن جنگ، عماد الدولہ، عماد الملک بہادر، اور گورنمنٹ ہند کی طرف سے جہان ایک مرتبہ آپ وائسرائیگل کونسل کے اور بالآخر مجلس وزیر ہند کے رُکن مقرر ہوئے، آپ سی۔ ایس۔ آئی کے خطاب سے ممتاز ہین۔ انگریزی سوسائٹی مین آپ کو جو نمایان وقعت و امتیاز حاصل ہو اُسکا حال بھی کسی باخبر سے پوشیدہ نہین۔ آپ ہندوستانیون اور انگریزون کے میل جول کے زبردست حامی ہین۔ علی گڈہ کالج مین ایک دفعہ آپ نے اسی بحث پر نہایت قابل قدر خیالات ظاہر فرمائے تھے۔

ملکی خدمات سے الگ ہو کر دیکھیئے تو آنریبل نواب عماد الملک مولوی سید حسین بالقابہ کے قومی کارنامے بھی قابل رشک نظر آتے ہین۔ علی گڈہ کالج کے آپ مربیون مین ہین اور حیدرآباد مین علیگڈہ کاز کو جو تقویت پہنچی وہ سب آنریبل بلگرامی کی مساعی کا نتیجہ تھی۔ ٹرسٹیان کالج کے آپ کچھ عرصے تک پریسیڈنٹ رہ چکے ہین۔ دو مرتبہ آپ نے کانفرنس کی صدارت فرمائی اور اپنی بیش بہا آرا سے قوم کو مستفید ہونے کا موقع دیا۔ مملکت آصفیہ کی بے نظیر علم دوستی کی مثالین جو دور آخر سے تعلق رکھتی ہین زیادہ تر نواب صاحب قبلہ کی بدولت قائم ہوئین۔ کئی اہل قلم اور مصنف دولت نظام کے وظیفہ خوار ہین اور ان سبھون کو آپ ہی کی کوشش سے فراغ بالی نصیب ہوئی ہو۔

نواب عماد الملک بہادر کی علمی کارگذاریون کا تبصرہ جداگانہ مضمون کا محتاج ہو۔ ہم یہان چند سطرون مین ان کا مختصر ذکر کرین گے۔

آپ کی انگریزیت، عربیت اور فارسیت مسلم ہو۔ آپ کی انگریزی زبان دانی کا اقرار یورپین اہل قلم تک کو ہو۔ آپ کے کئی مضامین انگریزی زبان میں چھپکر شائع ہو چکے ہین۔ اسلامی ڈیپوٹیشن نے جو اڈریس شملہ پر حضور ویسرائے بہادر کی خدمت میں پیش کیا تھا اُسے آپ ہی نے قلمبند فرمایا تھا۔ اُسکے متعلق اہل الرائے اصحاب کا خیال ہو کہ لٹریری حیثیت سے بھی وہ ایک یادگاری چیز ہو۔ آپ کی "تاریخ دکن" جو انگریزی زبان میں مدون ہوئی ہو قابل دید چیز ہو جسمین زبان دانی کے علاوہ تاریخی تحقیقات کی حدین کھنچی ہوئی پائی جاتی ہین۔ بہت زمانہ ہوا آپ نے قرآن مجید کا ترجمہ شروع کیا تھا لیکن بعض موانعات کے باعث اُسکی تکمیل اُس زمانے میں نہو سکی۔ اب معلوم ہوا ہو کہ آپ کی توجہ اس طرف پھر مبذول ہوئی ہو۔ خدا کرے آپ اس کار خیر کو جلد تر اتمام کو پہنچائین۔ اسلامی دُنیا کی یہ سخت ترین ضرورت ہو جس کی آپ کے ہاتھون پورے ہونیکی اُمید کی جاتی ہے۔

سطور بالا مین آپ کے حالات جو کچھ درج کیے گئے ہین وہ محض ایک خاکہ ہو ورنہ آپ کے واقعات زندگی اور آپ کی مختلف النوع خدمات کے تذکرہ کیلئے رسالون کی ضخامت سے کام نہین نکل سکتا۔ آپ کی ذات ہندوستان کے لیے مغتنمات سے ہو۔ اگر ہمارے گوش شنوا اور چشم بینا ہون تو آپ سے ہم بہت سے مفید سبق حاصل کر سکتے ہین۔ خدائے پاک و برتر آپ کا سایہ ہمایہ ملک اور قوم کے سر پر عرصۂ مدید تک قائم رکھے اور آپ کے فیضان سے خاص و عام کو مستفیض ہونے کا موقع عطا فرمائے۔ آمین!۔

آنریبل نواب عماد الملک بہادر مولوی سید حسین بلگرامی سی ایس آئی

تمہید ہندوستان کے مسلمانوں میں کسی کا نام اس قدر مانوس و مشہور نہیں ہے جیسا نواب عماد الملک بہادر مولوی سید حسین بلگرامی کا ہے۔ آپکی عالمانہ قابلیت اور قوت فیصلہ کے سبب سے یورپ والے اور ہندی سب واجب التعظیم سمجھتے ہیں۔ ملک ہند کی سب سے بڑی ریاست میں وزارت کی کرسی اور اعلی خدمتوں پر ان کا رہنا اس بات کا شاہد ہے کہ وہ اعلی ترین عہدہ جو گورنمنٹ نے ان کو عطا کیا تھا انکے لیے کتنا مناسب و موزون تھا۔ لوگون کو عموماً یہ بات شاید نہ معلوم ہوگی کہ حیدرآباد کوئی چالیس برس سے مسلمانوں کے جوہر قابلیت کے دکھانے اور ناموری حاصل کرنے کا میدان بنا ہوا ہے اور اس بات کے لیے امتیاز نواب مختار الملک مرحوم کے طفیل سے حاصل ہوا ہے وہ ہمیشہ اس فکر میں رہتے تھے کہ لائق سے لائق لوگون کو ڈھونڈھ کر سرکار نظام میں جگہ دیجائے۔ اس مضمون کا زیر بحث یہی وہ شخص ہے جو شمالی ہند کے مسلمانوں میں سب سے پہلے حیدرآباد کے عہدہ دارون میں داخل ہوا اور زیادہ تر اسی کی ہمت کشی اور انتہائی راست بازی کا نواب مختار الملک پر یہ اثر پڑا کہ انھون نے ہندوستان ہی سے عہدہ داران ریاست کے تقرر کا عام ارادہ کر لیا اور پھر اسی ارادہ نے بتدریج یہ عملی صورت اختیار کی کہ حیدرآباد کے حال اور آئندہ طبقہ کے واسطے ایک قابل قدر اور گران بہا نظیر قائم ہو گئی۔

خاندان آپکے آبا و اجداد گیارھویں صدی ہجری (۱۶۰۰ء) میں ہندوستان آئے اور ہردوئی ملاقہ اودھ میں جہان اسوقت ایک چھوٹے سے راجہ کا عمل تھا۔ سکونت اختیار کی۔ آپکے دادا اس خاندان کے پہلے شخص ہیں جو گورنمنٹ کی اعلی خدمت پر سرفراز ہوئے اور اپنی آخر عمر میں بادشاہ اودھ کی طرف سے گورنر جنرل کے دربار میں سفیر مقرر ہو کر آئے۔ یہی زمانہ تھا جب سرکار نظام کی طرف سے میر عالم سفیر ہو کر کلکتہ میں آئے ہوئے تھے۔ آپکے دادا کی عمر زیادہ تر کلکتہ ہی میں گزری ان کے سب لڑکے وہین پیدا ہوئے اور وہین سے تعلیم پائی۔ آپکے والد اور چچا نے نصاب علوم مشرقیہ کی تکمیل مدرسہ عالیہ میں کی جسے لارڈ وارن ہیسٹنگز نے قائم کیا تھا اور غالباً مسلمانون میں سب سے پہلے یہی لوگ ہیں جنھون نے اس مدرسہ میں انگریزی زبان حاصل کی ۱۸۲۸ء میں آپکے والد ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی مجسٹریٹ مقرر ہوئے اور ۱۸۵۸ء تک بنگال و بہار کے مختلف اضلاع میں نہایت قابلیت و امتیاز کے ساتھ سرکاری خدمتوں کو انجام دیکر وظیفہ یاب ہوے۔ آپکے چچا آنریبل سید اعظم الدین حسن خان جب ملکی خدمتون کی طرف متوجہ ہوے تو پہلے لارڈ ہسٹنگز کے ایڈی کانگ اور ترجمان مقرر ہوے پھر پولیٹیکل ایجنٹ کے عہدہ پر مامور ہو کر امرائے سندھ کی ریاستون میں بھیجے گئے کیونکہ وہ لوگ اپنے ملک میں کسی یورپین کے آنے کے روادار نہ تھے اسی زمانہ میں دریائے سندھ کی نگرانی و صدارت کا عہدہ بھی انھین کے سپرد تھا۔ اسکے بعد صوبہ بہار میں ڈپٹی کلکٹر اور ناظم محکمہ بندوبست مقرر ہوے اور آخر عمر تک اسی اقتدار کے ساتھ رہے۔ ہندوستان کے لوگون میں یہ پہلے شخص تھے جنکو گورنمنٹ نے طبقۂ ستارۂ ہند میں شامل ہونے کا اعزاز عطا کیا جس زمانہ میں ان کا تقرر چوبیس پرگنہ میں تھا گورنمنٹ نے ان کو دو مرتبہ مجلس وضع قوانین بنگال کا رکن بھی مقرر کیا تھا انکے خلعہ بند لوگون میں یہ بزرگ نہایت ہی ممتاز تھے۔ ان کا گھر اور مال و متاع غدر میں باغیون نے لوٹ لیا تھا۔

ابتدائی حالات مولوی سید حسین بلگرامی ۱۸۴۲ء میں بمقام گیا پیدا ہوے اور چودہ برس کی عمر تک عربی فارسی کی تحصیل طالب علمانہ حیثیت سے کرتے رہے انگریزی کی تحصیل آپنے بہاگلپور میں شروع کی وہان سے پٹنہ کے سکول میں بھیجے گئے ۱۸۵۸ء میں پٹنہ اکیڈمی سے انٹرنس اور ۱۸۶۶ء میں درجہ اول کے اعلے طبقہ میں گریجوایٹ ہوے۔ آپ کے والد مرحوم یہ چاہتے تھے کہ جن ملکی خدمتون پر وہ خود مامور تھے اسی صیغہ میں یہ بھی داخل ہون لیکن بمقتضائے مذاق علمی آپ نے صیغہ تعلیمات میں ملازمت پسند کی اور صوبجات متحدہ کی کوشش سے پارلیمنٹ میں ملازم اور لکھنؤ کے کیننگ کالج میں عربی زبان کے پروفیسر مقرر ہو گئے کچھ عرصہ کے بعد آپنے اوقات فرصت کو ایک ماہانہ انگریزی میگزین کے تالیف کرنے اور ترتیب دینے میں

سوت کرنا شروع کیا۔ "اس طرح گویا اس سلیس طرز بیان اور شستگی زبان کی بنا ڈالی جو آپ کی ہر انگریزی تحریر کی خصوصیات میں سمجھی جاتی ہے۔"

۱۸۷۳ء میں سر سالار جنگ اعظم لکھنؤ تشریف لائے اور جنرل بیرو کی وساطت سے آپ کو ان سے ملاقات کرنے کا موقع ملا۔ سر سالار جنگ بہادر کی نگاہ مردم شناس نے نوجوان پروفیسر کی خداداد لیاقت کا اندازہ کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حیدرآباد میں ایک خدمت قبول کرنے کی آپ سے خواہش کی گئی۔ سر سالار جنگ جو نظم و نسق ملکی کے جو منصوبے پیش نظر رکھتے تھے اور جنھوں نے حیدرآباد کی تاریخ پر بڑا اثر ڈالا ہے ان کی تکمیل کے لیے اپنے ہم خیال لوگوں سے کام لینا زیادہ پسند کرتے تھے، اور ریاست میں ملکی مواد چونکہ اس زمانہ میں چنداں بکار آمد نہ تھا اس سبب سے انھوں نے چند سال کے لیے بیرونی اعانت و امداد سے کام لیا۔ آپ کا شمار ان لوگوں میں ہے جو دکن میں دور دور سے کھنچ آئے انھیں مولوی چراغ علی، مولوی نذیر احمد، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک (جو اب سے کچھ پیشتر علی گڑھ کالج کی مجلس امنا (ٹرسٹیان) کے سکریٹری تھے) قابل ذکر ہیں۔

ملازمت حیدرآباد حیدرآباد میں مراجعت کرنے کے بعد سر سالار جنگ بہادر نے پرائیویٹ سکریٹری کی خدمت پر آپ کو مقرر کرنا چاہا مگر مولوی سید حسین بلگرامی جون ۱۸۷۳ء تک حیدرآباد نہیں آئے۔ آنے کے بعد وزیر اعظم کے پرسنل اسسٹنٹ مقرر ہوئے۔ آپ ہمیشہ اس قدر شناس وزیر کے شکرگزار و فرمانبردار رہے۔ سرکار نظام سے وظیفہ یاب ہونے کے بعد آپ نے اپنے تعلقات کا اظہار اس اعلیٰ مدبر ملک دکن کے ساتھ ان پر اثر الفاظ میں کیا تھا:—

"اب سے چالیس برس پہلے میرے قدردان آقا سر سالار جنگ نے مجھے بلایا۔ ان کا کریکٹر ایسا تھا اور مردم شناسی و معاملہ فہمی کا وسیع تجربہ ایسا رکھتے تھے کہ جس شخص کو ایک دفعہ ان سے سابقہ پڑا وہ ہمیشہ ان کا دم بھرا کرتا تھا۔ ہر قوم و ہر مذہب کے لوگ یکساں وزیر اعظم کے جاں نثاروں میں تھے۔"

۱۸۷۶ء میں سر سالار جنگ نے یورپ کا سفر کیا اور ان کے کاشان میں ان کا جو ان کے اسسٹنٹ بھی تھے نواب صاحب کے ساتھ آپ نے روم، پیرس وغیرہ کی سیر کی اور جہاں جہاں وزیر اعظم دکن کے استقبال کے جلسے ہوئے ان سب میں آپ بھی شریک رہے۔

یورپ سے واپس آنے کے بعد امور عامہ کی معتمدی پر آپ کا تقرر ہوا جس صیغہ میں اور شعبوں کے علاوہ تعلیمات عامہ پر پورا اختیار حاصل تھا۔ آٹھ برس تک اس عہدہ پر آپ ایک معتمد کی حیثیت سے رہے اور بہت کچھ مفید اصلاحیں کیں۔ ۱۸۸۴ء میں اعلیٰ حضرت غفران مکان کی تخت نشینی ہوئی اور مولوی سید حسین بلگرامی ان کے پرائیویٹ سکریٹری مقرر ہوئے اور "علی یار خان بہادر مؤتمن جنگ" کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ کئی برس کے بعد "عماد الدولہ" پھر "عماد الملک" کا خطاب ملکی خدمات کے حسن کارگذاری کے صلہ میں اعلیٰ حضرت مرحوم نے مرحمت فرمایا۔ گو چند سال کے لیے آپ کے ذمہ جو خدمتیں تھیں وہ معتمد پیشی کے صیغہ میں منضم ہو گئی تھیں لیکن بحکم اعلیٰ حضرت مرحوم آپ کو اس خدمت کی پوری تنخواہ اور اعزاز اور تمام منافع وظیفہ یاب ہونے کے زمانہ تک ملا کیے۔

انڈیا کونسل کی ممبری سے قبل از وقت مستعفی ہو کر جب آپ ولایت سے واپس تشریف لائے تو اس کے کچھ عرصہ بعد جب نواب میر یوسف علی خان بہادر سالار جنگ ثالث کو قلمدان وزارت تفویض ہوا تو گورنمنٹ نظام نے آپ کی سالہا سال کی تجربہ کاری سے فائدہ اٹھانے کے لیے آپ کو مشیر وزارت مقرر فرمایا اور کچھ شک نہیں کہ آپ نے نہایت ہی عمدگی کے ساتھ اس خدمت کو انجام دیا۔ اب آپ سرکاری خدمات سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔

حیدرآباد کا صیغہ تعلیمات بڑے بڑے مدارج پر اقتدار و اعزاز حاصل کرنے کے بعد نواب عماد الملک بہادر نے اپنے جوہر قابل اور وسعت معلومات کو صیغہ تعلیمات میں صرف کرنے کی ہمت کی۔ صدارت تعلیمات ممالک دکن جو اس زمانہ میں کس مپرسی کی حالت میں تھی آپ نے پسند کی اور ۱۸۸۳ء سے اپنے وظیفہ یاب ہونے کے زمانہ یعنی ۱۹۰۲ء تک آپ صیغہ تعلیمات ریاست دکن کے ڈائرکٹر رہے اور باوجود بہت سی مشکلوں کے آپ نے اس صیغہ میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ لندن ٹائمز لکھتا ہے کہ "آپ کی جن بہبودیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ چند در چند اہم مشکلیں آپ کو پیش آئیں ان میں تعلیمی

کے سلجھانے کے لیے ایسی کل راہ تدابیر اختیار کی گئیں جن کا خیال میں آجانا ہی نظر کی وسعت اور علم کی بے لوث محبت پر جو علم کو علم سمجھ کر کی جائے اور نیز آپ کے عالمانہ مذاق پر دلیل واضح ہے جس سے آپ کا روشن خیال اور ہوا خواہ اشاعت علم ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ آپ کے زمانۂ نظامت میں ملک دکن کی تعلیمی حالت میں روز بروز ترقی ہوتی رہی۔ ذیل کے شمار و اعداد سے اس بات کا بیّن ثبوت ملتا ہے کہ صیغۂ تعلیم میں آپ کے کارنامے کس درجہ قابل ستائش ہیں:—

طلبہ	مدارس	سنین
۲۰۶۶۴	۲۵۴	۱۸۸۶-۸۷
۴۰۹۷۵	۵۸۰	۱۸۹۱-۹۲
۵۵۲۴۲	۸۱۲	۱۸۹۶-۹۷
۵۶۹۷۲	۸۴۷	۱۹۰۱-۰۹

مگر بمقتضای راستی جو آپ کا امر امتیازی ہے نظام کلب کے مجمع میں ۲۷ اگست سنہ ۱۹۰۵ء کو آپ نے یہی کہا کہ تعلیمات میں جیسی ترقی چاہیے تھی میرے کیے نہ ہو سکی اور جو کچھ ہوئی وہ نہایت محدود ہے اور یہ بات آپ نے اس بنا پر کہی تھی کہ بہ نسبت اور مقاموں کے حیدرآباد کے طبقۂ عوام میں بیداری کے آثار زیادہ تر ظاہر نہیں ہوئے۔ آپ نے یہ بھی بیان کیا کہ برٹش انڈیا کے مقابلہ میں حیدرآباد کی رفتار تعلیم میں بہت سست ہے اور حیدرآباد کو اس کے قدم بقدم رہنے میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔

تعلیم کے باب میں آپ کی قطعی رائے یہ ہے کہ تعلیم کی غایت درستی اخلاق کو سمجھنا چاہیے۔ آپ فرماتے ہیں:—

میں نے اس بات پر بحیثیت ناظر تعلیم زور دیا کہ تعلیم تربیت سے علٰحدہ نہ ہونے پائے مغربی تعلیم بغیر اس تربیت کے جو یورپ میں تعلیم کی جزو لاینفک ہے مشرق کے ناتربیت یافتہ لوگوں کو ضرور مضر ہوگی۔

آپ اس بات کو سمجھ اور متعلم دونوں کی سخت غلطی سمجھتے ہیں کہ چند کتابیں رٹ کر فقط امتحان میں کامیاب ہو جائے کو مد نظر رکھیں۔ آپ گورنمنٹ کالج کے طلبہ کی تعلیم کے تمدن طرز قدار اور سرگرمی سے سائی ہیں اس بات پر آپ بہت زور دیتے ہیں کہ لڑکوں میں لیڈی معلم رکھی جائیں تاکہ اپنا اثر بچوں پر ڈالیں کیونکہ کم سنی کے زمانہ میں خیال کیجیے جبکہ طبایع بہت آسانی سے اثر پذیر ہو سکتی ہیں۔ اس طرز تعلیم کے لیے آپ نے ایک کمیٹی قائم فرمایا جس کے الفاظ یہ ہیں "محبت داری اور تربیت"۔

آپ ہی کے ساعی جمیلہ کا یہ اثر ہے کہ بچوں کی تعلیم کے لیے حیدرآباد میں عموماً لیڈی معلم مقرر کرنے کا رواج ہے۔

عام کارگزاریاں

نواب عماد الملک بہادر کا وجود و امتیاز فقط عمدہ جلیلہ پر فائز ہونے اور محض حسن کارگزاری کے سبب سے نہیں ہے بلکہ آپ کا ایک قدیم معزز خاندان سے ہونا، عربی و فارسی کے علم ادب میں عالمانہ استغراق رکھنا، حقیقۃ اسلام کا فدائیوں کی طرح ذوق بالجزم کرنا، وہ صفات ہیں جن کا اثر آپ کے ہم مشرب لوگوں کے دل پر بہت پڑا ہے۔ حیدرآباد کی ذمہ دارانہ اور محنت طلب خدمات پر فائز رہنے کے باوجود بھی آپ فرصت کا تھوڑا بہت وقت نکال لیا کرتے تھے۔ اور وہ بالعموم مفید ترین کاموں پر صرف ہوتا تھا۔ سرسید احمد خان مرحوم نے اپنے ہم خیال احباب میں آپ کو شمار کیا ہے۔ چنانچہ مولانا حالی حیات جاوید کے حصہ دوم صفحہ (۱۰۵) میں یوں تحریر فرماتے ہیں:—

"نواب عماد الملک کو ان کی نیکی اور راستبازی اور علم و فضل اور بے تعصبی اور اسلام کی حقیقی خیر خواہی اور خیر اندیشی کی وجہ سے وہ ایسا ہی عزیز رکھتے تھے جیسے سید محمود کو اور ان کی نسبت یہ کہتے تھے کہ وہ انسان نہیں بلکہ ایک فرشتہ مجسم ہے۔"

کتنے ہی سال تک آپ علیگڑھ کالج کے ٹرسٹی رہے اور اب بھی ہیں جو لوگ اس مدرسے سے تعلق رکھتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ کالج ان قابل قدر اور بے ریا کوششوں کے لیے جو آپ نے اس کے لیے کی ہیں کس قدر زیر بار احسان ہے۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں جو ایجوکیشنل کانفرنس بمبئی میں ہوئی اس میں صدر نشین آپ ہی تھے وہاں جو تقریر آپ نے کی ہے وہ علمی لحاظ سے اہل اسلام کے لیے مفید مشوروں سے پر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب سے سرسید نے کانفرنس منعقد کی مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کی خوبیوں کا احساس پیدا ہو گیا ہے لیکن اس کے علاوہ جو فائدے اس سالانہ مجلس سے

جو مختلف مقامات مین منعقد ہوتی رہتی ہی مرتب ہوے ہین اور جس مین اقطاع ہند کے مختلف شہرون سے مسلمان آکر یکجا ہوا کرتے ہین بعضین نواب عماد الملک نے بہت توضیح سے اسی جلسہ مین جس کے وہ صدر نشین تھے بیان فرمائے ہین۔ آپ فرماتے ہین:—

اس کانفرنس کے سالانہ مجمع ترین خاتمون پر متضمن ہین۔

اول یہ کہ مختلف بلاد کے سربرآوردہ مسلمانون مین پہلے ارتباط بڑھنے کا باعث ہین۔ بہت لوگ انہین ایسے یکجا ہو جاتے ہین جنہین یون کبھی ملنے کا اتفاق نہوتا۔ دوسرے یہ کہ لوگون کو اس بات کا موقع ملتا ہی کہ مسئلۂ تعلیم مین ایک دوسرے کی رائے سے اور اپنے اُن دوستون اور ہم مذہبون کے تجربہ سے مستفید ہون جو ہندوستان کے بلاد مختلفہ کے رہنے والے ہین۔ آخری اور سب سے بڑھکر اہم یہ غایت ہی کہ جلسے فرقہ کے سربرآوردہ لوگ باہم ملین اور جن قومی منافع مین مشارکت ہی اُن کے ترقی دینے مین مشورہ کرین اور ان کے حاصل کرنے کی باتفاق فکر کرین اسکے علاوہ کانفرنس سے یہ بھی مقصود ہی کہ ہم ایسے ذرائع سوچ کر پیدا کرین جن سے اہل مغرب کی سی شائستگی کا ہم مین رواج ترقی پذیر ہو اور علیگڈھ کے اینگلو اورینٹل کالج کو اس مقصود کے حاصل ہونے کا ذریعہ سمجھکر جہانتک ہم سے ہوسکے اسکی اعانت کرین۔ یہ ایک ایسی تعلیمگاہ ہمارے پاس موجود ہی جو ایسے اصول پر قائم ہوئی ہی جس کی خوبی کا دوسرے قومون نے اعتراف کر لیا ہی اور جس مین بہت کچھ ابتک کامیابی حاصل بھی ہو چکی ہی۔

باب تعلیم مین تجربہ کار رہنے کا رودگار سمجھکر گورنمنٹ نے آپ کو یونیورسٹی کمیشن کا رکن مقرر کیا جسکے صدر سر تہامس ریلے تھے اس کمیشن کا مقصد تھا کہ مشرقی اقوام پر مغربی تعلیم کا جو براثر پڑا ہو اُسکے انسداد کے وسائل دریافت کرین آپنے کمیشن کے ساتھ تمام ملک ہند کا دورہ کیا جس سے آپ کو اس بات سے مطلع ہونے کا بہت اچھا موقع ملا کہ اہل ہند کو تعلیم کے متعلق کیا کیا خطرے در پیش لاحق ہین۔

وایسرائے کی کونسل

آپ کے وسیع تجربہ سے فائدہ حاصل کرنے کی غرض سے لارڈ کرزن نے امپیریل لیجسلیٹو کونسل مین آپ کو شریک کیا جس مین یہ اہم مسئلہ زیر بحث و مطمح نظر تھا کہ ملک ہند کی یونیورسٹیون مین کیا کیا اصلاح ہونا چاہیے۔ سنہ ۱۹۰۳ع کا بجٹ جس مین ابتدائی تعلیم اور اسکے بعد والے درجون کے واسطے زیادتی مصارف کی منظوری زیر بحث تھی اُس پر آپنے جو اسپیچ کی ہی وہ نہایت مہتم بالشان ہی یہ ثابت کرتا تھا کہ آپ جج اشخاص مناسب وقت اور مناسب مقام پر ملک کے لاکھون کروڑون ناتعلیم یافتہ لوگون کی طرف سے بحث کر رہا ہی۔

ہندوؤن اور مسلمانون کا مسئلہ

کانگریس والون مین بعض لوگون نے یہ عقیدہ قائم کر رکھا تھا کہ پولیٹکل یا سیاسی امور مین ملک کے ترقی کرنے کو مسٹر بلگرامی سد راہ ہین۔ مگر جو لوگ آپ کو جانتے ہین ان سے پوچھیے کہ یہ اعتراض الزام وارد کرنے کی کوئی وجہ نہین۔ کہا جاتا ہی کہ کانگریس کو آپ ناپسند کرتے تھے۔ ہان اس حیثیت سے ناپسند کرتے تھے جس حیثیت سے کہ کانگریس قائم ہوئی تھی نہ یہ کہ اسکے نفس مطلب کے مخالف ہون۔ یہی وجہ تھی کہ مرحوم سر سید احمد خان نے جب اینٹی کانگریس کی تحریک کی تو اس کی طرفداری کرنے پر کمر باندھ کر آپ اٹھ کھڑے ہوے۔ لارڈ منٹو بالقابہ کی خدمت مین تمام مسلمانان ہند کی طرف سے جو ڈیپوٹیشن اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ع کی پہلی تاریخ کو حاضر ہوا اور اس وفد نے جو مراتبین آپ سے حاصل کین اُن سے ظاہر ہوتا ہی کہ جو اہل اسلام کے دل مین آپ کی کس قدر عظمت ہی۔ اور اس وفد نے جو اڈریس پیش کیا تھا وہ اسی قادر الکلام ادیب کے رشحات قلم کا نمونہ تھا جسکے احتجاج مین ادب شائستگی اور طرز بیان مین قدرت قابل ستایش تھی۔ خود وایسرائے نے فرمایا کہ "یہ درخواست بہت پر مغز ہی اس سے گویا مسلمانان ہند کی سیاسی ترقی کا راستہ پڑا" اور وایسرائے نے امید دلائی کہ طبقہ اہل اسلام کو مطمئن رہنا چاہیے کہ اگر ملک مین انتظامی ریفارم جاری ہوگا تو اس طبقہ کے سیاسی حقوق و منافع کا ضرور لحاظ کیا جائیگا اس تقریر کا جسقدر لحاظ کیا گیا عموماً لوگ اس سے واقف ہین۔

مگر یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ جو وسعت جس کا مسلم جو آپ اس کے مرتبے سے چشم پوشی کرتے ہیں آپ کو مرحوم مسٹر آنند موہن بوس کے ساتھ بے انتہا محبت و تعلق خاطر تھا مسٹر گوکھلے ایسے استثناء افراد کے آپ ہمیشہ مداح رہے۔ اس سے بھی بڑھکر یہ بات ہے کہ جس زمانہ میں آپ تعلیمات حیدر آباد کے صدر تھے مختلف مذہب اور فرقے کے لوگوں کے ساتھ آپکا سلوک یکسان تھا جو بیّن ثبوت اس بات کا ہے کہ آپ کو کسی مذہب کی طرفداری کا خیال نہ تھا۔ آپ کے ماتحت دو انسپکٹر تھے ہندو و دو مسلمان ایک یوریشین ریاست کے چھ ہائی اسکولوں کی ہیڈ ماسٹری بھی اسی طرح ہندو مسلمان اور یوریشین اصحاب میں تقسیم تھی۔

ہندوؤں اور مسلمانوں میں انتخاب جداگانہ کے مسئلہ میں جب لارڈ مارلے کے ریفارم اسکیم سے تعلق تھا آپنے صاف صاف کہدیا کہ یہ امر نہایت ہی ضروری ہے اور یہی ایک صورت ہے جس سے فریقین میں کبھی نزاع واقع نہوگی آپنے فرمایا

ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمان تھوڑے سے ہیں۔ انکے منافع کا لحاظ رکھنا ضرور ہے۔ ابھی تک انکے حقوق بہت اچھی طرح محفوظ ہے۔ ہر قسم کے نظام جمہوریت میں جماعت قلیل کے حقوق فنا و نزاع ہوا کرتے ہیں ایسے حقوق کی حفاظت خود انگلینڈ میں ابھی نہیں ہو سکتی جہان سب لوگ یکسان ہیں اور کسی قسم کا مذہبی یا قومی اختلاف واقع نہیں ہوا ہے علیحدہ علیحدہ انتخاب ہونا فریقین کے لیے متحد ہو کر کسی شخص واحد کے حکم میں ہو جانے کی نفی نہیں کرتا بلکہ اس قسم کے اتحاد کا مؤید ہے۔ اگر انتخابی مجلس میں دونوں فرقوں کے لوگ شریک ہوے اور دونوں سے باہم ووٹ لیا گیا تو ہمیشہ دونوں فرقوں میں نزاع ہوا کرے گی۔ ہندو محض کثرت عدد کے سبب سے بآسانی مسلمانوں کو شکست دیا کرینگے۔ اور اس وجہ سے ہندوستان کے اکثر مقامات میں دونوں فرقوں کے درمیان تعصب پھیلا ہوا ہے ہندو ہمیشہ چاہیں گے کہ ہندو ہی کو انتخاب کریں اور اس سے باہمی رنجشیں اور کدورتیں بڑھتی رہیں گی۔

انڈیا کونسل قانون مجریہ ۱۸۵۸ء کی رو سے لارڈ مارلے کو جو اختیارات کونسل سے ملے انھوں نے فوراً اس سے فائدہ اٹھایا اور مسٹر گپتا اور مولوی سید حسین بلگرامی کو انڈیا کونسل کا رکن مقرر کیا۔ آپنے نومبر ۱۹۰۷ء کی گیارھوین تاریخ کو رکنیت کی کرسی کو مزین کیا اور لنڈن ٹائمز نے اس خبر کو اس طرح شائع کیا:—

ایک واقعہ جو تاریخ کی رو سے مہتم بالشان و قابل توجہ ہے۔ انڈیا آفس میں سکریٹری آف اسٹیٹ کی کونسل سے باضابطہ منظوری صادر ہونے کے بعد اسی ہفتہ کے اندر اور اس دفتر کے قائم ہونے کے پچاس برس بعد وقوع میں آیا کہ ایک ہندوستانی شخص پہلے پہل اسکا رکن مجلس مقرر ہوا۔"

پھر اسی مضمون کا ایک شائبہ لارڈ مارلے کی اس آخری اسپیچ میں تھا جو مجلس عامہ میں انھوں نے کی۔ انھوں نے اپنی کونسل کے ہندوستانی ممبروں کے تقرر کے نتائج بواسطہ و بلا واسطہ کا ذکر کر کے فرمایا کہ بہر طور یہ تحریک ہندوستان سے بہت ہی مہتم بالشان ہوئی ہے جو ہندوستان اور انگلینڈ کے درمیان مضبوط و مستحکم تعلقات رکھنے کے باب میں ہے۔"

آپ اس آفس کی تین کمیٹیوں میں کام کرتے رہے جو کونسل کے ماتحت تھیں یعنی مالگذاری اور عدالت امور عامہ اور اسٹور۔ جس زمانہ میں ریفارم اسکیم تیار ہو رہی تھی آپنے مسلمانوں کے حق میں نہایت مفید کام اس آفس میں کیے۔ لارڈ مارلے نے کئی دفعہ اپنے دونوں ہندوستانی مشیروں کی حسن کارگزاری کا اعتراف کیا۔ اسمیں شک نہیں کہ انھوں نے ان دونوں ممبروں سے اہل ہند کے اصل ارادہ کی حالت کا صحیح اندازہ کیا۔ حسب معمول آپ کی اختتام خدمت کا زمانہ ۱۰ نومبر ۱۹۱۷ء ہوتا مگر سوء اتفاق سے انگلستان کی سخت سردی سے آپکی طبیعت بے مزہ رہنے لگی۔ اس سبب سے نومبر ۱۹۰۹ء میں آپ مستعفی ہوے۔ بزمانہ قیام انگلستان آپنے مسلمانوں اور ہندوستان کے دوسرے فرقوں میں بڑا رسوخ پیدا کیا تھا اور ان فرقوں میں باہم ارتباط پیدا کرنے کے لیے بعض تحریکیں کی گئیں ان سب میں آپ شریک ہو گئے۔ جنوری ۱۹۰۸ء کی پہلی تاریخ کو طبقہ ستارہ ہند میں شامل ہونے کا

امتیاز اپنے حاصل کیا۔

تصنیفات و تالیفات آپ تمام عمر طالب علم رہے۔ عربی و انگریزی کے علم ادب پر جو قدرت آپ کو حاصل ہو اسکے لحاظ سے ہندوستان کے ادیبون کے طبقۂ اول مین آپکا شمار کیا جاتا ہو۔ آپ کا تاریخ دکن کا مجموعہ یعنی

Historical and descriptive sketch of His Highness the Nizam's dominions,

اور سوانح عمری سر سالار جنگ اول مرحوم بہت مستند کتابین سمجھی گئی ہین پہلی کتاب ممالک محروسہ سرکار نظام کی مفصل تاریخ ہو جس مین ملک کی زراعت و معدنیات کا بھی مفصل حال درج ہو۔ آپکو نظم کی طرف بھی توجہ ہو اپنی انگریزی نظمین آپنے احباب مین شائع کرنے کی غرض سے طبع کرائی ہین جو مشرقی جذبات سے معمور ہین اور ایک ہندوستانی شاعر کا قابل قدر کلام خیال کی جاتی ہین۔ ترجمۂ قرآن مجید اسلامی نقطۂ خیال سے قطع نظر اپنے جداگانہ فوائد کے لحاظ سے بھی ایک گران قدر علمی خدمت سمجھے جانے کے قابل ہو۔ ان چیزون کے علاوہ آپکے قلم سے آجتک بیشمار علمی ادبی و تاریخی مضامین ایسے نکلکر مقبول ہو چکے ہین جنکے اندر مستقل دلچسپی اور دوامی انتفاع کا سامان موجود ہو۔

خاتمہ نواب عماد الملک بہادر اگرچہ کوئی مشہور مقرر نہین ہین لیکن انکی سیدھی سیدھی اور پرزور دلائل کے سننے مین ایک خاص لطف آتا ہو۔ وہ گفتگو مین تکلفات کو راہ نہین دیتے۔ مقصود اصلی بغیر کسی ہیر پھیر کے بیان کرتے ہین اور جو کچھ کہتے ہین وہ موثر اور دلنشین ہوتا ہو بہت سی علمی مجالس جو حیدرآباد مین قائم ہین وہ انکی مدد اور رہنمائی سے قائم ہوئی ہین۔ انھین حیدرآباد سے نہایت محبت ہو بلکہ فی الحقیقت انھون نے یہان توطن اختیار کر لیا ہو۔ ان کی پرائیوٹ زندگی بہت ہی سادہ طور پر بسر ہوتی ہو ان کی فرصت کا بڑا حصہ لائبریری مین صرف ہوتا ہو جہان نے خود نایاب و بیش قیمت کتابون کا ایک قابل تعریف ذخیرہ ہو۔ انکے شوق کتب بینی کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہو کہ وہ جب کبھی وقارآباد کو جاتے ہین جو شہر سے فاصلہ پر ہو اور جہان آپ کا باغ واقع ہو تو سامان ہمراہی مین زیادہ تر وہ تصنیفات ہوتی ہین جو اکثر انکے زیر مطالعہ رہتی ہین۔ طویل جسم بلند بالا حیدرآبادی سپید دستار زیب سر شاندار چہرہ پر کتری ہوئی داڑھی سیاہ آنکھین جن سے خلوص مذاق اور بردباری ٹپکتی ہو خوش مزاج و خوش خلق۔ نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی بہادر دکن کے مشہور فاضل اور صاحب تصانیف کی ظاہری و باطنی خوبیون کا یہ ایک مجمل گر دلکش خاکہ ہو۔ خدا انھین عرصۂ دراز تک زندہ و قایم رکھے اور آپکے فیوض سے خاص و عام کو بہرہ اندوز ہونے کا موقع عطا فرمائے۔ آمین!

نواب نصیر حسین خان صاحب خیالؔ

نواب خیالؔ قوم کے اُن منتخب اور برگزیدہ لوگوں میں ہیں جنکا نام دنیائے اُردو میں ہمیشہ عزت و احترام سے لیا جائے گا! اور لیڈرِ وطن کے اُن مشہور سپوتوں میں ہیں جن کی ذات سے ہماری بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔

نواب صاحب موصوف حسینی و حسنی سیّد پوتڑوں کے رئیس اور ایک خاندانی بزرگوار ہیں، آپ کے مورثِ اعلیٰ عرب سے ایران آئے۔ وہاں اِس خاندان کو خاص عروج و وقار حاصل ہوا اور بالآخر قدرت و اقتدار اتنا بڑھا، کہ سیّد حسین فیروزی شاہِ طہران ہو گئے اور ان کے پوتے کبیر المشائخ گورنر ہرات رہے، اور دوسرے اراکینِ خاندان بھی مراتبِ اعلیٰ پر پہنچے، پھر اس خاندان نے ہندوستان کا رُخ کیا، اور اپنی عظمت و وجاہت ساتھ لایا، اور اسکے اکثر ممبر صوبہ داری اور وزارت کے درجہ تک پہنچے، مغلوں کے عہد میں اس خاندان نے عدیم المثال ترقی کی، اور یہ اُسی قدیم وجاہت و بزرگی کا اثر تھا کہ قطب الملک نواب سیّد عبداللہ خان اور امیر الامرا نواب سیّد حسین علیخان "بادشاہ گر" کہلائے اور عرصہ تک سلطنتِ مغلیہ ان دو مشہور بھائیوں کے زورِ بازو سے چلتی رہی۔

امیر الامرا سید حسین علیخان شروع میں صوبہ دار بہار مقرر ہوئے اور عظیم آباد میں عرصہ تک رہے، یہ صوبہ ان کی جاگیر میں تھا جب نواب صاحب ممدوح فرخ سیر کو ساتھ لیکر نکلے، اور اُسے بادشاہ بنا کر وزیر ہوئے تو انکی جاگیر اُن کے چھوٹے بھائی نواب نجم الدین علی خان بہادر (نواب خیالؔ کے پردادا) کے ہاتھ آئی، اور وہ بہار میں مقیم ہو گئے، اور اسطرح یہ خاندان دہلوی سے بہاری بن گیا۔ ساداتِ بارہہ کے زوال کے بعد اِس خاندان کا بھی شاید بہار میں زوال ہو جاتا، لیکن نواب علی وردی خان مہابت جنگ (صوبہ دار بنگالہ) کے تعلقات اور رشتہ داری سے اِس کا وہ اگلا عروج عرصہ تک قائم رہا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے وقت تک اِس خاندان کی عظمت و حشمت بدستور قائم و برقرار رہی۔

صوبۂ بہار اپنی زرخیزی کے ساتھ ہمیشہ مردم خیز بھی بنا رہا ہے۔ دلّی جب مٹی تو عظیم آباد (پٹنہ) آباد تھا۔ دلّی کے باکمالوں نے اسطرف کا رُخ کیا، اور امیر الامرا کے خاندان نے دلّی والوں کو اپنے یہاں جگہ دیکر عظیم آباد کو گویا شاہجہان آباد بنائے رکھا۔

عرصے سے اُردو کی نشوونما دلی میں ہو چکی تھی، امیر الامرا اور اُن کا خاندان مرزا عبدالقادر بیدل کا دلدادہ تھا، اسلئے اُردو کے حامی اور

سلطانِ عصر کی گذشتہ اشاعت میں نواب صاحب ممدوح کی تصویر شائع ہو چکی ہے (ایڈیٹر)

نواب اُس کے سرپرست تھے۔ اِس ذریعے سے یہ زبان بہار و عظیم آباد میں پھیلی، جسے بعد کو اسی خانوادہ کے ایک دوسرے بزرگ نواب علی وردی خان، مہابت جنگ، صوبہ دار بنگال و بہار نے چمکایا، اور پھر مہاراجہ شتاب رائے نے اس کی وہ پرورش کی، کہ آخر وہاں راجہ کلیاں صاحب کمال پیدا ہوا، جس نے شعر و شاعری میں اپنا ایک الگ اسکول قائم کرکے زباندانی کا سکّہ جما دیا۔ نواب ہدایت علیخان اسد جنگ (متخلص بہ ضمیر) اور اُن کے مشہور فرزند نواب غلام حسینخان صاحب سیّد المتاخرین، اسی گھرانے کے ایک رکن اور اُردو کے سرپرست اور مربیوں میں سے تھے۔

غرض نواب صاحب خیال کا خاندان امارت و وجاہت ذاتی کے ساتھ علم و ادب کے لیے بھی ہمیشہ مشہور و معروف رہا ہے، اور آج سے نہیں، دو سو برس سے یہ اُردو کی پرورش و خدمت کر رہا ہے، اور غالبًا اسی کو یاد کرکے، اور بہار میں اس زبان کی پامالی کو دیکھ کر، نواب صاحب نے اپنے ایڈریس میں یہ گرم فقرہ ارشاد فرمایا ہے کہ۔۔۔

افسوس کہ امیر الامرا سیّد حسین علی خان کی جاگیر اور مہاراجہ شتاب رائے کی زمین ایسی شکار گاہ بنی! واقعی اِن سے زیادہ اور کس اس زبان کا ایسا درد ہو سکتا ہے!!

اس خاندان کی دوسری شاخ پانی پت میں ہے جس کے رکن اعلیٰ شمس الدولہ نواب لطف اللہ خان بہادر صادق وزیر محمد شاہ تھے، وہاں یہ خاندان نوابزادوں کے لقب سے مشہور ہے، پانی پت کے خواجگان اور نوابزادے ایک دادا کی اولاد ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ جس طرح بہار میں یہ خاندان امارت و ریاست کے ساتھ علمیت و فضیلت کے لیے بھی مشہور رہا، اسی طرح پانی پت میں بھی دو سو برس سے سیاست اور علم و فضل دونوں کا مرکز دکھائی دیا، اور وہاں خواجہ حالی مرحوم اور یہاں خان بہادر شاد ظلّہ اس قدیم مشہور خاندان کے ایسے بزرگ ہیں جنھیں زمانہ عرصہ تک یاد رکھے گا۔

غرض ایسے قدیم اور علم و فضل سے بھرے ہوئے خاندان میں آپ ۱۸۸۱ء میں بمقام عظیم آباد پیدا ہوئے۔ آپ کے گھر کا ادب قاعدہ اور آپ کے گھرانے کی تہذیب و زبان عام طور پر تسلیم ہے اور اس لیے اس کی تقلید کی جاتی ہے۔ اُس وقت کے اُمرا اور رؤسا کی طرح آپ کی تعلیم بھی شروع ہوئی، اور درسیات تمام کرکے انگریزی کی طرف مائل ہوئے۔ علم ادب اور زباندانی کا خاندانی شوق چونکہ کمسنی ہی سے تھا اور قدرت نے بھی اُن کے لیے موزون دل و دماغ عطا کیا تھا، اس وجہ سے قلم و قرطاس کے سوا کسی اور طرف مائل نہیں ہوئے اور ہوش سنبھالتے ہی مضمون نگاری کی جانب متوجہ دکھائی دیے، مشہور رسالہ "حسن" (حیدر آباد) میں اکثر آپ کے مضامین فرضی ناموں سے نکلا کیے، وہ پرچہ بند ہوا تو اس ادب و لٹریچر کے شوق و ذوق کی پیاس اور چشموں سے بجھائی گئی، اور جبکہ نوجوان رؤسا دوسرے دوسرے مشاغل میں پھنستے ہیں آپ نے ۱۶ برس کی نوخیز عمر میں (۱۸۹۷ء) عظیم آباد سے ایک رسالہ "ادیب" نکالا۔ اس کے ادب و لٹریچر کو دیکھ کر سر سیّد مرحوم اور مولوی عبدالحلیم شرر نے اُس وقت پیشین گوئی کی تھی کہ اگر یہ رسالہ جاری رہا تو عظیم آباد اور صوبہ بہار دلی اور لکھنؤ کی تقلید سے آزاد ہو جائے گا۔

۱۸۹۹ء میں آپ کی شادی ہوئی اور اسی تعلق سے کلکتہ میں قیام ہوا تو "ادیب" کو بند کرنا پڑا، لیکن آپ کے اشہب قلم کی رفتار کسی وقت میں سست نہ دکھائی دی۔ عادت کے مطابق فرضی ناموں سے مختلف اخبار و رسائل میں مضامین لکھے جو مقبول عام ہوتے رہے۔ ۱۹۰۲ء میں آپ کا ایک مشہور و معروف مضمون "اصلاح" میں "ناصح بے غرض" کے نام سے نکلا اور ملک میں ایک انقلاب سا ہو گیا، اور ایک عرصہ کے بعد غالبًا یہ وہ مضمون تھا جس میں دوستوں کے اصرار سے آپ نے نام کا اظہار کیا تھا۔ پھر ۱۹۱۱ء میں مولوی ظفر علی خان کی سخت فرمائش پر

۔۔۔مرثیہ اور مرزا دبیر" پر ایک مبسوط مضمون دکن ریویو کے متعدد نمبرون مین شائع ہوا کیا، اور آپکے زور قلم اور تنقیدی نظر کی دنیا نے اردو نے اور اِسی مضمون سے مرثیہ کی غرض و غائت سمجھ مین آئی۔ پھر ایک عجیب و لطیف مضمون "تالاؤن کا مارا آغا" ۱۹۱۳ء مین ادیب (الہ آباد) کے کئی نمبرون مین آپکے نام نامی سے شائع ہوا۔ یہ مضمون اور خصوصاً اُس کی تمہید اُردو کی جان ہے اور حقیقتاً وہ لٹریچر ہے جس کی نظیر ادبیین اور پکوک پیپرز کے سوا کہین اور نہین مل سکتی۔ اُردو مین یہ بالکل نئی چیز تھی اور اس سے نواب صاحب کی فارسی پر بھی وہ قدرت معلوم ہوتی ہے جو اس زمانہ مین مفقود ہے! یہ قصہ اسطرح پڑھا گیا کہ ہزارون کو ابتک اسکے فقرات یاد ہین۔ یہ مضمون اس لیے لکھا گیا تھا کہ دوسرے اس رنگ کو اور رشوخ کرین مگر اس کا تتبع آسان نہ تھا اور جہانتک مجھے علم ہے ابتک اس انداز مین کوئی قلم نہ اُٹھا سکا!

مجھے جہانتک غور کرنے کا موقع ملا نواب صاحب جب کوئی چیز لکھتے ہین تو اُسے اپنا کر لیتے ہین اور اُن کے قلم سے ہمیشہ کوئی نئی بات ہی نکلتی ہے جو مقبول عام ہو جاتی ہے۔ اُردو کانفرنس صدارتی ایڈریشن ہی دیکھیئے کہ کس انداز و پرواز سے زمانہ کے سامنے پیش کیا کہ آئندہ اس مادہ مین جو کچھ بیان ہوگا ہمیشہ اُسی کی تقلید کی جائے گی۔ اس خطبہ نے نہ صرف اُردو کی بھولی بسری داستان ہی کہ سنائی اور موجودہ گردنکو پس پشت ڈال دیا بلکہ مادر وطن کی وہ ہم ہزار سالہ تاریخ بھی بیان کر دی ہے جس سے ہمارے معلومات مین وسعت و ترقی ہوگئی۔ ہندو مسلم دختہ کو بھی اسطرح سلجھا دیا کہ آجتک بڑے سے بڑے مقرر سے بھی نہو سکا۔ نہ کبھی کانگرس کا ایسا سیر ایڈریس سنایا گیا، اور نہ لیگ کے کسی صدر نے ایسا جامع و مانع بیان ہمارے سامنے پیش کیا۔ اُنکے معلومات کو دیکھیئے اُن کی تحقیقات پر نظر کیجیے، اور خطبہ کی اسپرٹ و پالیسی کو سمجھیے اُسکے لٹریچر "زبان" اور اُس کے ادب و طرز ادا کو سراہیئے۔ یہ ایڈریس

ہر اعتبار سے ہماری قومیت کو مستحکم کرنے والا اور ہماری زبان کو سیلائز ڈ (مہذب) زبانون کے ہم رتبہ ثابت کرنے والا ہے۔

علمی و ادبی مشاغل کے ساتھ ساتھ نواب صاحب موصوف نے ایک حد تک دیگر قومی معاملات مین بھی حصّہ لیا ہے۔ ۱۹۰۶ء کے مشہور معروف مسلم ڈیپوٹیشن مین جو بمقام شملہ لارڈ منٹو کی خدمت مین حاضر ہوا تھا آپ شریک اور اسکے سرگرم کارکن تھے اور نظام اسکیم مین شروع سے اخیر تک مشورہ دیتے اور کام کرتے رہے۔ آپ مسلم لیگ کے بانیون مین نہ صرف شمار ہوتے بلکہ ابتک اُسکے سرگرم ممبر ہین۔ ۱۹۰۶ء مین آپ نے مسلم لیگ کی شاخ بنگالے مین قائم کی اور نواب سر شمس الہدیٰ کے ساتھ بحیثیت جوائنٹ سکریٹری عرصہ تک کام کرتے رہے۔ تعلیمی معاملات سے انھین خاص دلچسپی بلکہ شغف ہے۔ ۱۹۰۴ء مین ایشیاٹک سوسائٹی کے ممبر منتخب ہوے۔ تعلیمی کانفرنس (علیگڈھ) کی آواز بنگالہ مین زیادہ تر آپ ہی کی کوششون سے عام ہوئی۔ ۱۹۰۸ء مین علیگڈھ کالج کے آپ ٹرسٹی مقرر کیے گئے اور اس تعلیمی انسٹی ٹیوشن سے آپ کی دلچسپی کچھ چھپی ہوئی نہین ہے۔ مسلم انسٹی ٹیوٹ کلکتہ آپ کی عنایات اور مہربانیون کا ہمیشہ ممنون رہا ہے۔ طلباء کے ساتھ انھین خاص محبت ہے اور ہمیشہ ان کی امداد پر تلے رہتے ہین۔

۱۸۹۹ء مین آپ کی شادی کلکتہ مین نواب انتظام الدولہ مرزا احمد بیگ (وزیر شاہ اودھ) کی صاحبزادی سے ہوئی جن سے دو صاحبزادے ہوے۔ لیکن افسوس کہ وہ نونہال آٹھ آٹھ سال کی عمر پاکر رحلت کر گئے اور جب سے موصوف عملی دنیا سے الگ ہو کر گوشہ عافیت مین زندگی بسر کرنے لگے ہین۔ عرصہ سے اُن کی صحت اچھی نہین رہتی۔ پٹنہ کو تو کبھی کا خیرباد کہا جا چکا ہے لیکن کلکتہ مین بھی اب برائے نام ہی قیام رہتا ہے۔ عموماً پہاڑون پر رہتے اور وہان تنہائی مین علمی تحقیقات مین زندگی بسر کرتے ہین۔ فی الحال مرثیہ گویون کا ایک تذکرہ

مرتب کر رہے ہیں۔ گارسن دی تاسی کا مشہور تذکرہ شعرائے اُردو، (ہسٹری دی لٹریچر ہندوی) جو فرنچ زبان میں اور چار جلدوں میں ہے۔ آپ اس کا اُردو ترجمہ کر رہے ہیں۔ یہ کام سرعت سے جاری ہے خدا کرے اُن کی صحت اتنی درست ہو جائے کہ یہ چیزیں جلد پبلک کے ہاتھوں تک پہنچیں

العصر کے صفحات کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں اس مضمون کو تمام کرتا اور نواب صاحب کے لیے دعا کرتا ہوں کہ ع اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

محفوظ الحق احسن (عظیم آبادی)

شمس العلماء خواجہ حالی

اُردو شاعری کا جنم بھوم ہندوستان ہی لیکن اُسکی نشو و نُما فارسی شاعری کے زیر اثر ہوئی ہی۔ قاعدہ ہی کہ ابتدائی تاثرات کا رنگ انسانی طبائع پر آخر عمر تک گہرا رہتا ہی۔ اسی اُصول سے جب اُردو شاعری کے مختلف پہلوؤن پر نگاہ کرتے ہین تو ہمین اسباب سے کہ سنسکرت اور بھاشا کا اسپر پرتو تک نہین پڑا تعجب نہین ہوتا۔ میر و سودا سے لیکر غالب و مومن تک ایک لکیر کے فقیر بنے رہے ہین۔

ان صاحب کمالون کے علوِ مرتبت مین کسکو شک ہو سکتا ہی۔ خصوصًا غالب کے، جنھون نے اِس اندھی تقلید کے نقصانات کا اندازہ کرکے آخر اپنے لیئے ایک دوسرا راستہ تلاش کرلیا۔ لیکن اسے ان بزرگون کا طبعی رجحان کہیئے یا بعض خارجی و اضطراری اسباب کا نتیجہ کہ اپنے گلدستے کو اپنے باغ کے پھولون سے زیب دینے کی جگہ اُنھین اصفہان و شیراز کے باغبانون کا منت پذیر ہونا پڑا۔

اور اس ایک فروگذاشت سے اُردو شاعری مین بعض ایسے عیوب پیدا ہو گئے جو ابتک اُسکے صاف و شفاف دامن کو داغدار بنائے ہوئے ہین۔

عرب سے قطع نظر خود عجم کی شاعری نے ابتک کئی پلٹے کھائے لیکن اُردو شعرانے جو راگ روز اول سُنا تھا اُسی پر آخر تک سر دھنتے رہے۔ ہم اساتذۂ اردو کی دماغ سوزیون کے دلی اعتراف کا ثبوت کئی دفعہ زبان قلم سے بھی دیچکے ہین اور اسمین کلام نہین، اُنھین کے کارنامے آج بھی اُردو لٹریچر کی لاج قائم رکھے ہین لیکن اس حقیقت سے چشم پوشی نہین ہوسکتی کہ اگر اُنھون نے "اصلیت" سے ذرا بھی کام لیا ہوتا تو اُردو شاعری مین تاثیر کلام کے اعتبار سے بھی کوئی کمی نہ رہتی۔ ہمارے بعض شعرا نے جنمین میر، درد، غالب، داغ، مجروح وغیرہ خصوصیت سے ذکر کے قابل ہین اپنے کلام مین تاثیر پیدا کرنیکی کوشش بہ کامیابی کی ہو اور اکثر نے جذبات انسانی اور واردات عشق کی صحیح اور سچی تصویر اُتارنے مین کمال دکھایا ہو جسکا اقرار آجکل بھی کیا جاتا ہو جبکہ ایک گروہ بدقسمتی سے ملک مین ایسا پیدا ہو گیا ہو جسنے ایشیائی شاعری کی ہجو گوئی کا بار اپنے ذمے رکھا ہو۔ اُن اُستادون کا کلام جو مبالغہ و تصنع سے بری ہو بلحاظ محسوسات قلب کے لحاظ سے ہر طرح قابل قدر ہو اور چونکہ یہ باتین فطری وسیع النظری اور نازکخیالی کا نتیجہ ہوتی ہین اسلیئے نہین وہ بے مزگی اور سیٹھاپن نہین ہو جو عموماً چبائے ہوئے لقمے مین ہوتا ہو لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہو کہ یہ دلپذیر عملی نظیرین شاذ و نادر پائی جاتی ہین۔ الغرض سنسکرت اور بھاشا بلکہ عربی کے ساتھ بھی اعتنا نہ کرنیسے جو نقصانات ابتک عائد ہوئے اور ہورہے ہین اُن کی تلافی اور بھی مشکل ہوتی اگر یہی سلوک مغربی خیالات کے ساتھ بھی کیا جاتا جن سے مستفید ہونے کے لیے ہمین حکومت برطانیہ عظمی کا منت پذیر ہونا چاہیئے۔ طرز معاشرت اور عادات و خصائل کیطرح حکمران جماعت کے علم ادب کا اثر مفتوح قوم پر پڑنا ضابطہ قدرت کی سب سے پہلی دفعہ کے عین مطابق ہو۔ اسلامی ادبیات کا اثر ہندوؤن پر جیسا کچھ پڑا اُسکا ثبوت کایستھون اور کشمیری پنڈتون مین مل سکتا ہو۔ نسیم اور سرشار اور سرور ایسے جادو نگار اگر اس دُنیا مین نہین ہین تو چکبست اور ابر وغیرہ بجائے خود مثالین ہین۔ برٹش گورنمنٹ کے ظل عاطفت مین ہندوستانیون کو مغربی طرز پر تعلیم پانے کا موقع ملا اور اس سے جہان اور بہت سے مادی و اقتصادی فوائد حاصل ہوئے وہان علمی منافع بھی نظرانداز نہین کیئے جا سکتے۔ لٹریچر کیطرف ہمین ان دنون جو تھوڑا بہت اعتنا پیدا ہو گیا ہو وہ سب اُس یورپی تشویق کا نتیجہ ہو جو نت نئی صورتون مین آئے دن جلوہ گر ہوتی رہتی ہو۔

ممکن نہ تھا کہ مغرب اور مشرق باہم ملین اور ایک دوسرے کے معائب و محاسن سے متاثر نہون۔ مشرق کے متعلق مغرب نے جو رائے قائم کی ہو ہمین اُس سے یہان کوئی بحث نہین لیکن ہمارے لیے بہت سی باتون مین مغرب نے آئینہ کا کام دیا ہو اور اسی آئینہ مین جس پر جدید اُصول تنقید کی جلا کیگئی تھی ہمین اپنے علم ادب کے خط و خال نظر آئے ہین اور ہمین ایک حد تک معلوم ہو گیا ہو کہ اسکی حالت کیا تھی؟ اَب کیا ہو؟ اور آئیندہ کیا ہونی چاہیئے؟

فارسی، عربی، اور دیگر زبانونکی شاعری مختلف طبقون مین منقسم کی جاسکتی ہو۔ مثلاً

عشقیہ شاعری

رزمیہ شاعری

اخلاقی و مذہبی شاعری

نیچرل شاعری

قومی شاعری۔

عشق و محبت کے عنوان سے جسقدر رسالہ ہمارے اسلاف نے مہیا کیا ہو اُس سے ایک نہین بلکہ بیسیون اور سیکڑون مندر پیکر حسن کی پرستش کیلئے تیار ہو سکتے ہین۔ رزمیہ شاعری کی کمی انیس و دبیر کے مراثی نے پوری کردی ہو۔ اخلاقی اور مذہبی صنف سخن کی ترتیب جُداگانہ طور پر ہمارے یہان نہین ہو لیکن اساتذۂ اُردو کی غزلیات اکثر و بیشتر اخلاق و آداب کے مضامین سے ملو پائی جاتی ہین۔ نیچرل شاعری اُردو مین مفقود تھی لیکن مولنا آزاد نے ایک ایسی شاہراہ کی داغ بیل ڈالدی ہو جس پر چلنے کے بعد "برگ درختان سبز" کا ذوق آفرین منظر خود بخود آنکھون کے سامنے آجاتا ہو۔

نیچرل شاعری کیطرح قومی شاعری کا نام لیوا ابھی شعرا اُردو مین کوئی نہ تھا لیکن انگریزی مثل ہو کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہو اور حقیقت شناس نظرون سے پوشیدہ نہین کہ جسطرح یہ مثل قدیم زمانے مین اُن نتائج کے اعتبار سے جو علمی اور تمدنی دُنیا مین ظہور مین آچکے ہین صحیح ثابت ہوئی ہو اُسیطرح آج بھی وہ صحیح ہو۔ مغربی تعلیم کے اثر سے ہندوستان مین بھی خیالات و جذبات کا جو انقلاب لازمی طور پر پیدا ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔ ایک طرف اگر ہربرٹ سپنسر اور ہکسلے کے فلسفہ نے ارسطو و بوعلی سینا کی شہرت پر اپنا حق جمایا تو دوسری طرف گولڈ اسمتھ، ٹنیسن، اور بیرن کا رنگ تخیل ورڈزورتھ کی مصوری پر غالب آنے لگا۔ صحیفہ فطرت کے حقیقی جستجو کرنے والون کی اُردو مین کمی تھی لیکن شمس العلما، مولنا آزاد مرحوم کا "مجموعۂ نظم" اسبات کا ثبوت ہو کہ اُردو مین بھی "معرفت کردگار" کے ایک ایک ورق مین دفتر کی وسعت پیدا کی جا سکتی ہو۔ ہمارے ادبیات کی خوش قسمتی ہو کہ آجکل علمی رسائل مین بعض اوقات نیچرل

نظمین اس پایہ کی شائع ہوتی رہتی ہین جو اپنے صحیح معنون مین اُردو شاعری کا بہترین حصہ سمجھی جانے کی مستحق ہوتی ہین۔

رنگینی قومی شاعری؟ اسکا وجود متقدمین کے کلام مین نہین ہو اور متاخرین مین بھی حالی سے پہلے کسی نے اسپر توجہ نہ کی تھی۔ قاعدہ ہو کہ ضرورت سے اسباب خود بخود مہیا ہوتے ہین۔ مسلمانون کی حالت جیسی کچھ زبون تھی اُسکی صحیح اور سچی تصویر یہان دکھانا تحصیل حاصل ہو۔ مختصراً سمجھ لینا چاہیے کہ حکومت کے ساتھ دولت و عزت اور اخلاق و آداب بھی اُنسے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ جہالت، لاعلمی، خودغرضی اور وہ تمام عیوب جو کسی تنزل پذیر قوم کے جزو لاینفک خیال کیے جاتے ہین مسلمانون مین موجود تھے۔ ضرورت تھی ایک ایسے شخص کی جو انھین ذلت و ادبار کے اس قعر سے نکالے اس اہم منشا کی تکمیل کے لیے سر سید مغفور کی ذات مقدر ہو چکی تھی۔ مرحوم نے اپنی بیش قیمت عمر فلاکت زدہ مسلمانونکی فلاح و بہبودی کی کوششون مین صرف کردی اور آج اس مردہ قوم مین جو کچھ زندگی کے آثار پائے جاتے ہین وہ انھین کی مسیحائی کا صدقہ ہو۔

سر سید نے اپنے مبارک مقصد کی تکمیل کیلئے اپنے گرد و پیش بہت سے قابل آدمی جمع کرلیے تھے۔ مولنا حالی بھی اُسی قومی نورتن کے روشن اور درخشندہ جواہر ہین۔ شک نہین کہ سر سید کو ایک ایسے شخص کی ضرورت بھی تھی جو اپنی سحر آفرینیون سے اعجاز کا کام لیکر جمود کو حرکت مین لاوے اور جو اپنی ولولہ انگیز صدا سے دلون مین جوش پیدا کرے۔ تاثیر کلام نے دُنیا مین اکثر بڑے بڑے کام کیے ہین اور اسکے متعلق متعدد تاریخی روایات مشہور ہین۔ حالی کی معجز بیانی نے اگرچہ سولن کیطرح یونان والونکو سیلمس کا قبضہ نہین دلا دیا اور نہ لارڈ بائرن کیطرح دول یورپ کو یونان کی امداد پر آمادہ کرکے اُسکی بغاوت کی شاخ مین حکومت خود اختیاری کا پھل لگایا لیکن اتنا سب کو معلوم

ہو کہ جس زمانے مین سرسید کشتی اسلام کو جہالت و فلاکت کے بھنور مین چکر کھاتے دیکھکر اُسکے محفوظ رکھنے کی ساعی مین مصروف تھے اور بہت کم لوگ اُنکی پروا کرتے تھے اُسی وقت حالی کی ایک جگر دوز چیخ نے سلمانون مین وہ ہلچل ڈالدی کہ سوتے بیدار ہو گئے، بیٹھے اُٹھ کھڑے ہوئے اور جو لوگ کھڑے تھے وہ دوڑنے لگے۔

مسدس جزر و مد اسلام یا مسدس حالی دُنیا کے اُن علمی ادبی کارنامون مین شمار کیا جاتا ہو جن کا پائدار اثر کسی قوم کے اخلاق معاشرت اور تمدن پر پڑ سکتا ہو۔ حالی نے جسوقت اسلام کی گزشتہ شان و شوکت کی تصویر دکھا کر موجودہ ادبار و ذلت کا مرقع مؤثر الفاظ مین پیش کر کے سلمانون سے صاف صاف کہ دیا کہ جس کی یہ حالت ہو۔ مصرع

وہ قوم آج ڈوبیگی گر کل نہ ڈوبی

یہ ایک بجلی تھی جو آنکھون کے سامنے دوڑ گئی، رعد کی کڑک تھی جسنے دلونکو ہلادیا۔ وہ دماغ جو اپنے متعلق کبھی سوچنے کے عادی نہ تھے روشن ہو گئے۔ پہلو مین درد پیدا ہوا اور درد بھی قوم کا۔ نگاہین منزل مقصود کی تلاش مین ادھر اُدھر دوڑنے لگین اور ان تمام تحریکون سے کم از کم اسقدر فائدہ ضرور مرتب ہو گیا کہ سلمانوں کو اپنی پست حالت کا اندازہ ہو گیا اور انھین اپنا ایک نصب العین مقرر کر کے اُسکی جد و جہد مین مصروف ہونا پڑا۔

فردوسی کی ایک خاص نظم کی بابت کہا جاتا ہو کہ اگر وہ اسکے سوا اور ایک سطر بھی نہ لکھتا تاہم یہ نظم اُسکے کمال فن کی کفالت کرتی۔ مسدس حالی کا بھی یہی حال ہو۔ حالی کی علمی شہرت اسی کے بدولت ہوئی اور انھین قومی رہنمائی کی سند اسی نے دلوادی ہو۔ بہت سے لوگ جو حالی کو غلطی سے شاعر نہین سمجھتے وہ بھی مسدس کی خوبیون کے معترف ہین اور اُسکے مطالعہ سے اثر اندوز ہوتے ہین۔

خیال کرنے کی بات ہو کہ تیرہ سو سال کے اسلامی واقعات کا نظم مین قلمبند کرنا کہ زبان کی لطافت، واقعات کی صحت طرز بیان کی خوبی اور سب سے زیادہ یہ کہ کلام کی تاثیر کا کوئی پہلو نظر انداز ہونے پائے کوئی آسان بات نہ تھی لیکن مولینا حالی نے ان تمام مرحلون کو جس خوش اسلوبی سے طے کیا ہے وہ انھین کا حق تھا اور اسکا انصاف کچھ وہی کر سکتے ہین جنھین مبدء فیاض سے مذاق سلیم و وجدان صحیح کا وافی حصہ ملا ہے۔ یہان اُن لوگون سے سوال نہین جو فطرتاً نکتہ چین اور عیب جو واقع ہوئے ہین یا جنھین یہ بات خواہ مخواہ قہر معلوم ہوتی ہو کہ دہلی و لکھنؤ کے آگے پانی پت کا نام بھی لیا جائے۔

مسدس حالی سہل ممتنع کا بہترین نمونہ ہو اور تسلسل مضمون کا اسقدر لحاظ کیا گیا ہو کہ اگر کہین درمیان سے دو ایک بند چھوڑ کر پڑھا جائے تو مطالب کی وہ وضاحت نہین باقی رہتی۔

تاثیر سخن اور سوز و گداز کے ماسوا مسدس حالی کی ایک بلا اتیاز خصوصیت یہ بھی ہو کہ اُسکا مطالعہ لڑکون، جوانون، اور بوڑھون کیلئے یکسان معنی خیز و موثر اور فرحت بخش ہو۔ یہ صفت اُردو کی شاید کسی اور کتاب مین نہوگی۔ فارسی مین "گلستان" البتہ یہی صفت رکھتی ہو۔

مسدس حالی کو نئی طرز کی شاعری کا سنگ بنیاد خیال کیا جاتا ہو اور یہ خیال اصلیت سے بعید نہین ہو۔ حالی کی تقلید شعراء اُردو کو اس وجہ سے ناگزیر تھی کہ خیالات کا جو انقلاب علمی نقطہ خیال سے پیدا ہوا تھا وہ بہر حال پُرانی اور بے کیف شاعری کے حق مین ضرور سم قاتل تھا جن لوگون نے دور بین نظر سے کام لیکر اس رمز کو شروع سے سمجھ لیا اُنھون نے حالی کے اتباع پر اپنے طرز سخن مین تبدیلی کر دی۔ اگر وہ ایسا نکرتے تو بھی زمانہ ایک نہ ایک دن

اُنھین ایسا کرنے پر مجبور کرتا۔

مولنا حالی کی اُس شہرت کا کفیل جو اُنھین آج ملک کا سرمایۂ ناز اور قوم کا چشم و چراغ بنائے ہوئے ہو اُن کا جدید رنگ کا کلام ہو لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئیے کہ یہ رنگ اختیار کرنے سے پہلے وہ شاعری کے کوچہ سے نابلد تھے۔ اُن کے ابتدائی حالات سے ناظرین واقف ہونگے لیکن ہم سیاق عبارت کیلئے یہان اختصار مدنظر رکھکر اُن کے سوانح قلمبند کرتے ہین اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ اُنھون نے کن کن تجربون کے بعد موجودہ طرز سخن کی پابندی اختیار کی ہو۔

مولنا حالی پانی پت کے ایک معزز خاندان کے سپوت ہین۔ پانی پت مین ایک محلہ انصاریونکا ہو۔ یہ خواجہ ملک علی صاحب کی اولاد مین جو ہرات سے ہندوستان آئے۔ بزرگ آدمی تھے۔ بادشاہ نے سر آنکھون پر لیا۔ پانی پت اور اُسکا ملحقہ علاقہ اُنھین بطور مدد معاش دیا گیا۔ آپکو اُس پرگنہ کا منصب قضارت بھی حاصل تھا۔ نرخ بازار کا تعین، نماز عیدین کی امامت، بزرگو نکے مزارات کی تولیت بھی ان کے تفویض تھی۔ مولنا حالی نسلاً انصاری اور بطناً سید ہین۔ آپ کے والد بچپن ہی مین اختلال دماغ کے عارضہ مین مبتلا ہو گئے تھے۔ ۹ سال کی عمر مین سایۂ مادری بھی سر سے اُٹھ گیا۔ ایسی حالت مین باقاعدہ تعلیم و تربیت کا ہونا بظاہر غیر ممکن تھا۔ لیکن حالی کو تحصیل علم کا فطرتی شوق تھا اور اپنی ذاتی کوشش سے اُنھون نے وہ کچھ کر دکھایا جو دوسرون کیلئے باوجود ہر قسم کی سہولت و آسانی کے محال سمجھا جاتا ہو۔

میر ممنون دہلوی کے بھتیجے اور داماد سید جعفر علی فارسی کے ماہر کامل تھے۔ مولنا حالی نے فارسی اُنھین سے پڑھی۔ عربی کی تعلیم مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری سے پائی۔ ۱۷ سال کی عمر مین آپ کی شادی ہوگئی تھی۔ اسوقت تک آپ کی تعلیم درجۂ تکمیل کو نہ پہنچی تھی اور اس معاشرتی پابندی کے بعد ناممکن تھا کہ وہ اسکا سلسلہ بدستور جاری رکھتے لیکن جن لوگون کی قسمت مین ناموری لکھی ہوتی ہو اُن کیواسطے حصول مقصد کا راستہ خود بخود صاف ہو جاتا ہے۔ ان کے دل مین تحصیل علمی کا شوق باقی تھا۔ اور حُسن اتفاق سے سُسرال بھی خوشحال ملا کہ گھر بار کی فکرون کا ناقابل برداشت بار ان پر نہ پڑ سکا۔ طلب صادق تھی۔ اگر کوئی رُکاوٹ بھی ہوتی تو اُسکا خیال نہ ہوتا۔ بسم اللہ کہکے آپ دہلی چل کھڑے ہوئے۔ اس زمانے مین دہلی کی حالت گئی گذری نہ تھی۔ اہل کمال کا مجمع تھا۔ طالبان کمال کیلئے دلی چھوڑ اور کوئی جگہ بمشکل ہو سکتی تھی حالی دلی پہنچے اور ۱۸۵۵ء تک وہین رہے اور علوم منطق و فلسفہ اور صرف و نحو وغیرہ کی تحصیل انتہائی درجہ تک با اطمینان تمام کی۔ دلی سے پانی پت واپس آنیکے بعد بھی آپ کا علمی مطالعہ برابر جاری رہا۔ ۱۸۵۶ء مین ضلع حصار کی محکمۂ کلکٹری مین ایک مختصر سی جگہ پر مامور ہوئے لیکن ۱۸۵۷ء کے پرآشوب زمانۂ غدر کی پریشانیون مین یہ جگہ بھی چھوڑنا پڑی۔ لیکن امن و سکون ہو جانے کے بعد اُنھین گورنمنٹ پنجاب کے دار الکتب (بک ڈپو) مین ایک جگہ مل گئی۔ یہان آپ کے ذمہ یہ خدمت سپرد تھی کہ کتابون کی عبارت زمانۂ حال کے مذاق کے مطابق درست کیا کرتے تھے اور حشو و زوائد سے پاک کر کے اُسے جدید نونے پر لاتے تھے۔ اس خدمت پر آپ جب تک مامور رہے آپ کا قیام لاہور مین رہا۔ اُسوقت لاہور آجکل کا لاہور نہ تھا۔ جس شخص نے دہلی کے ارباب کمال کی دلچسپ صحبتون کے لطف اُٹھائے ہون اُسکی دلبستگی کا سامان لاہور مین کیا ہوتا۔ پھر وطن اور اہل وطن کی مفارقت اُسپر مستزاد تھی اور سب پر طرہ یہ ہوا کہ اُسی زمانے مین وہان چیچک اور ہیضہ کی دست برد نے شہر کو وحشت ناک بنا دیا تھا۔

بے دیار و بے وطن آدمی کیلئے اس مصیبت مین اسکے علاوہ اور کیا ہوسکتا تھا کہ اپنی بیتی اپنے آپ سے کہکر دلکو ڈھارس دے۔ اُنکی بعض قدیم غزلو مین جہان لاہور کی پریشان کن زندگی کی حسرتناک تصویر کھینچی ہو وہان بزرگان دہلی کی یاد بھی آگئی ہو اور اسکےباعث یہ بیان بہت دردناک ہوگیا ہو۔ مثلاً ایک غزل مین فرماتے ہین ؎

دلاتی ہے صبا کس کو چمن یاد   نہ مین بُلبُل نہ گھر میرا چمن ہے
کرون تجھ سے بیان کچھ دردِ غربت   گر جوشِ سخن ُمہر دہن ہے
ہے لاہور مین اگر سو جانے   یہی دُنیا یہی دار المحن ہے
یہان بیگانگی ہے اسقدر عام   کہ بُلبُل ناشناسائے چمن ہے
مجھے تنہا نہ سمجھین اہل لاہور   تصور مین مرے اک انجمن ہے
مری خلوت مین ہے ہنگامۂ بزم   خموشی مین مری ذوقِ سخن ہے
بتاؤن تم کو ہون کس باغ کا پھول   جہان ہر گل بجائے خود چمن ہے
بتاؤن تمکو ہون کس مصر کی بو   جہان غربت وطن رشکِ ختن ہے
نہ لینے دیگا جنت مین بھی آرام   یہی گر جذبۂ مہرِ وطن ہے

یہ اشعار بھی اُسی زمانے کے تصنیف ہین ؎

شہر و دریا سے باغ و صحرا سے   بو نہین آتی آشنائی کی
بخت ہمداستانی شیدا   تونے آخر کو نارسائی کی
صحبت گاہ گاہی رشکی   تونے بھی ہم سے بیوفائی کی

لیکن اُنھین لاہور مین بہت زیادہ عرصہ تک قیام نہین کرنا پڑا۔ چار برس کے بعد وہ اینگلو عربک سکول" دہلی کی مدرسی پر مقرر ہوکر وہان سے واپس آئے۔ دلی واپس آکر حالی کو وہی لطف ملا جو شاعرون کے الفاظ مین بُلبل کو رہائی کے بعد چمن کی سیر سے حاصل ہوتا ہو یا غریب الوطن مسافر کو غربت کی کلفت و مصیبت جھیلنے کے بعد وطن پہنچکر عزیز و اقارب یا احباب کی ملاقات سے۔

ابھی مولٰنا حالی عربک سکول مین مدرس ہی تھے کہ اتفاق سے نواب آسمان جاہ مرحوم جو کسی زمانے مین دولت آصفیہ کے مدار المہام اور اسلامی معارف پروری کے روایات کے حامل تھے، کالج دیکھنے کیلئے علیگڈھ آئے۔ مولٰنا حالی بھی موجود تھے اُن کو بھی باریابی کا موقع دیا گیا اور آپ کے لیے ۷۵ روپیہ ماہوار کا علمی وظیفہ مقرر ہوگیا۔ ۱۸۸۷ء مین جب مولٰنا حالی علیگڈھ ڈیپوٹیشن کے ساتھ جس کو خود سر سید کی سرگردگی کا فخر حاصل تھا حیدرآباد گئے تو آپ کا وظیفہ بھی بڑھا کے پورے سو روپے کر دیے گئے۔

اِن واقعات سے معلوم ہوسکتا ہو کہ آپ کی زندگی کا بہترین حصہ دہلی مین بسر ہوا ہو اور اگر میر و غالب اپنے مطول قیام دہلی کے لحاظ سے دہلوی اور ناسخ و آتش اسی اعتبار سے لکھنوی کہلائے جانیکے مستحق ہین تو مولینا حالی نے کیا قصور کیا ہو کہ اُنھین دہلوی کہنا تو ایک طرف رہا اُنکی زبان آجتک ہدف و ملامت کا نشانہ بنائی جاتی ہو۔ یہ ایک اُصولی بحث ہو۔ اسکا تصفیہ ماہران علم اللسان کر سکتے ہین لیکن اسکے باوصف ہمارے خیال مین دہلوی یا لکھنوی کا اضافی لقب مولینا حالی کی دستار فضیلت کا طرہ نہین بن سکتا بلکہ اُن کا کمال اُن کی عظمت کی دلیل ہو۔

زمانۂ قیام دہلی مین مولٰنا حالی کو اُن ذی کمال ارباب فن کی صحبت مین شریک ہونے کا موقع ملا ہو جو اپنے وقت کے فرد فرید تھے۔ ایشیائی شاعری کی زندگی اُس زمانے مین اُن کے دم سے وابستہ تھی۔ وہ شاعر تھے اور شاعر گر بھی۔ یہ بات ناممکن تھی کہ اُن کے ذوق شعر گوئی کو دیکھکر مولٰنا حالی کو شوق نہ پیدا ہوا ہو۔ فطرت سے اُنھین وہ صفات عطا ہوئی تھین جو شاعر کو شاعر بناتی ہین۔ اُنسے کام لینے کے لیے ایک معمولی سی تحریک کی ضرورت تھی۔ غالب سا مردم شناس شاعر مولٰنا حالی کی نسبت کہتا تھا کہ اگر تم شعر نہ کہوگے تو

ظلم کرو گے۔ بالآخر اُنھین بھی ان بزرگون کا ہمنوا ہونا پڑا اور آج اُن کا پُرانا کلام دیکھکر ہم اندازہ کر سکتے ہین کہ ابتدا مین ان کا رنگ طبیعت کیا تھا۔

غالب کا نام اُردو شعراء کی فہرست مین "فلسفی شاعر" کے لقب سے لکھا جاتا ہو۔ حالی کو بھی زانوے تلمذ انھین کے آگے تہ کرنا پڑا کسی مجبوری سے نہین بلکہ اس سبب سے کہ جس راستے پر چلنے کو یہ کمر بستہ تھے اُسکی رہنمائی غالب سے بہتر کوئی نہ کر سکتا تھا۔ کہا جاتا ہو کہ ابتداءً نواب شیفتہ سے اصلاح لی۔ نواب موصوف کے ساتھ انھین ایک عرصہ تک یکجائی حاصل تھی ممکن ہو کہ شاگرد بھی ہو گئے ہون البتہ اسمین کلام نہین کہ نواب شیفتہ جو خود بھی مشاق شاعر تھے، اُنکی صحبت بھی مولنا حالی کی تشویق و تحریص کا باعث ہوئی۔ نواب مصطفےٰ خان شیفتہ پہلے مومن کے شاگرد تھے پھر غالب سے اصلاح لینے لگے۔ جہانگیر آباد سے جو اُنکی ریاست تھی غزلین بغرض اصلاح غالب کے پاس آتی تھین۔ حالی بھی جب تک جہانگیر آباد مین رہے اُنکا کلام بھی غالب کے پاس نظر ثانی کی غرض سے آیا کرتا تھا۔

یہ کہنا تحصیل حاصل ہو کہ مولنا حالی کا ابتدائی کلام زلف و رُخ، ساق و ساعد کے تذکرہ سے مالامال رہا ہو گا۔[1] ابتدا مین یہ امر نا ممکن العمل تھا کہ وہ اس طرز سخن کے عیوب سے جنھین لنگے اور تمام ساتھی محاسن سمجھتے ہون واقف ہو جاتے۔ اُنھون نے اسوقت تک جو کچھ پڑھا تھا یہی پڑھا تھا اور جو کچھ دیکھا تھا یہی دیکھا تھا۔ دُنیا مین کوئی اصلاحی کام بغیر کسی ذاتی مشاہدہ و تجربہ کے آجتک نہین ہوا اور حقیقت حال بھی یہی ہو کہ جب تک انسان کو بطور خود کسی چیز کے حسن و قبح نہ معلوم ہون وہ اُس کے متعلق اچھی یا بُری رائے کسطرح قائم کر سکتا ہو۔

گورنمنٹ پنجاب کے بُک ڈپو کی ملازمت سے پیشتر قیاساً مولنا حالی کے خیالات وہی تھے جو طرز قدیم کے تعلیم یافتہ آدمی کے ہو سکتے ہین لیکن بُک ڈپو کا تعلق اس قسم کا تھا کہ جو کوئی کتاب کسی زبان سے ترجمہ یا تالیف ہو کر شائع کیجاتی وہ پہلے اُنکی نظر سے گذرتی۔ اس قسم کی کتابون مین تراجم کا حصّہ زیادہ تھا۔ اِن کے مطالعہ سے مولنا حالی کو مغربی لٹریچر پر عبور کرنے کا بہت اچھا موقع مل گیا اور جب مغرب کے طرز ادا اور اسلوب بیان سے جسمین دلفریبی کے ساتھ اصلیت کا بھی پہلو عموماً موجود ہوتا ہو مانوس ہو گئے تو اُنکی آنکھین کھلین اور اُنھون نے دیکھا کہ اُنکی شاعری کا درجہ کیا ہو۔ اصلی پھولون کے آگے مصنوعی پھول کبھی پسند نہین ہوتے۔ اُنھون نے معلوم کرلیا کہ ہماری شاعری بالکل پست حالت مین ہو اور جس چیز سے یورپ والے اخلاق و معاشرت کی اصلاح کا کام لیتے ہین ہمارے یہان وہ حد درجہ مخرب اخلاق بنگئی ہو اور اُس سے اصلاح و ترقی مین امداد حاصل کرنے کی توقع اُسوقت تک بالکل فضول ہو جب تک اسمین اُسکے حقیقی اوصاف نہ پیدا کیے جائین۔ خیالات کی یہ اُلجھن تھی جسمین مولنیا حالی شروع شروع مین یقیناً گرفتار ہونگے لیکن فراست و ذکاوت کی امداد سے بالآخر اُنھون نے نتیجہ نکال لیا کہ اُردو شاعری نہایت ذلیل ہو رہی ہو اور فائدے کی جگہ اس سے ملک اور قوم کو نہایت سخت مضرت پہنچ رہی ہو۔ اور جب اُردو فن سخن کے چہرے کے بدنما خال و خط جنھین تصنع اور استعارون کے پوڈر نے چھپا رکھا تھا اِسطرح ظاہر ہو گئے تو جس راستے پر پہلے قدم جمے تھے اُسے یک قلم ترک کرنے کی ٹھان لی۔ خیالات مین انقلاب آیا اور خود اُنھین کے لفظون مین

---

[1] یہ صرف قیاس ہی قیاس ہو ورنہ دیوان حالی کی قدیم غزلیات سے بھی اسکا ثبوت نہین ملتا۔ راقم الحروف کا خیال ہو کہ مولنا کی صرف وہی قدیم غزلین شامل دیوان کیگئی ہین جو ایک حد تک مذاق جدید کے موافق بھی جا سکتی ہین اور جنھین بوئی کلام کا اُنھون نے علحدہ کر دیا

"جس شاعری پر ناز تھا اُس سے شرم آنے لگی"

مولنا حالی اپنے طرز کے موجد اور نیچرل اور قومی شاعری کے مجدد ہیں۔ اس اعتبار سے اُن کا مرتبہ شعرائے اُردو میں وہی ہے جو انگریزی میں گولڈ اسمتھ کا ہے جس نے اپنے بیان کی شاعری کو جو بمنزلہ ایک چمن کے تھی فضول گوئی اور مبالغہ پسندی کی جھاڑیوں سے صاف کیا ہے۔ مولنا حالی اور گولڈ اسمتھ میں ایک طرح کی یوں بھی مماثلت ہے کہ دونوں کو ابتدا میں خاص و عام کی مخالفت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ گولڈ اسمتھ کے یہ الفاظ اس کا ثبوت ہیں:۔

اے میری پیاری نظم! تو اُن موقعوں سے پہلے بھاگنے والی نظم ہے جہاں نفسانی خواہشوں کی طغیانی ہوتی ہے۔ تو اس بے قدری کے زمانے میں بجائے اس کے کہ دلوں کو اپنی طرف مائل اور پاک شہرت حاصل کرے ہر طرح ملامت کیجاتی ہے۔ تیری بدولت عام جلسوں میں مجھے شرمندہ ہونا پڑتا ہے لیکن جب تنہا ہوتا ہوں تو تجھ پر فخر کرتا ہوں۔

مولنا حالی بھی ایک عرصہ تک "ملامت" اور "شرمندگی" کا نشانہ بن چکے ہیں۔ ایک بات اور بھی ان کے خلاف مخالفت کا جوش بڑھانے کی باعث ہوئی اُسے نفس شاعری سے حقیقت میں کوئی تعلق نہیں مولنا حالی سرسید کی تعلیمی مہم میں ہمیشہ دست راست کی حیثیت سے شریک تھے۔ اُس زمانے میں عامہ مسلمین سرسید سے نہایت بدظن تھے اور اُن کے رفقا کو بھی کافر و بدعتی سمجھتے تھے۔ ممکن ہے کہ اگر سرسید کا ساتھ دینے کا "الزام" اُن کے سر نہ ہوتا تو انکی جدید طرز شاعری کی شاید اس درجہ لے دے نہ ہوتی۔ ہر کیف اعتراضات اور اختلافات عامہ جسطرح مصلحان قوم کے لیے ناگزیر چیزیں ہیں اسی طرح علوم و فنون کے نقطۂ خیال سے بھی۔ ہمارے کنسرویٹو علماء آج بھی فلسفۂ جدیدہ کے نام سے برافروختہ ہو جاتے ہیں۔ انگلینڈ میں جارج سوم کے وقت میں جب دُخانی انجن وغیرہ ایجاد ہو رہے تھے تو دستکاروں کا غیض و غضب انتہائی درجے پر پہنچا ہوا تھا۔ ڈیوڈ ہیوم نے جو انگلستان کا ایک وسیع النظر مورخ تھا جب اپنے رسالے شائع کیے تو پادریوں میں اُسکی مخالفت کا ایک طوفان عظیم برپا ہو گیا تھا۔ مختصر یہ کہ اصلاح کا کام کچھ عرصہ تک اعتراضات کا ہدف بنا رہتا ہے۔ حالی کیونکر مستثنے رہتے؟ مخالفت کی ترکش میں کوئی تیر نہ تھا جو اُنپر نہ چھوڑا گیا ہو لیکن اُنکی سلامت روی اور مستقل مزاجی نے سپر کا کام دیا اور جو کچھ گولڈ اسمتھ نے اپنی نظم کو خطاب کر کے کہا تھا کہ

جہاں کہیں تجھپر نکتہ چینی ہو تو وقت کا مقابلہ کیجیو اور باد مخالف کے جھگڑوں پر غالب آئیو اور اپنے دردناک نالوں سے سچ کی مدد کیجیو

وہ مولنا حالی نے اپنے قول و فعل سے ثابت کر دکھایا۔ ایکدفعہ جو مشاعرے سے یہ لکھکر اُٹھے کہ ؎

بلبل کی چمن میں ہمزبانی چھوٹی — بزم شعرا میں شعر خوانی چھوٹی
جب سے دل زندہ تو نے ہمکو چھوڑا — ہم سے بھی تری رام کہانی چھوٹی

تو پھر نہ جھکے۔ بزم نشینوں کا اصرار، پچھلی اُنسیت، دوستوں کی مروت، ان تمام نے دامن پکڑا مگر حالی نے یہ لکھکر پیچھا چھڑایا ؎

اب اُمید الفت ہے نہ چاہت نہ جوانی نہ اُمنگ — سر ہے سودا سے تہی عشق سے دل ہے خالی
گر غزل لکھیے تو کیا لکھیے غزل میں آخر — نہ رہی چیز وہ مضمون سُجھانے والی

جو تجویز ہونہار ہوتی ہے اُسکی کامیابی کے اسباب بھی خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ حالی کو چار طرف سے معترضین اور مخالفین دشمنی کی نظروں سے گھور رہے تھے لیکن سرسید اور اُنکا گروہ ہمدردانہ محبت کے ساتھ انھیں دیکھتا تھا اور پھر جیسے جیسے تعلیم پھیلتی گئی اور لوگوں کے خیالات میں صلاحیت آتی گئی ویسے ویسے مخالفت کی جگہ اُنس کو ملتی گئی۔

کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر تعلیمات کا نام نامی ایک عرصے تک اُردو کے یورپین محسنین کے زمرہ میں لیا جائیگا۔ کرنل صاحب نے اپنی

ذات سے مشرقی علوم وفنون کو جو تقویت پہنچائی ہے وہ باخبر اصحاب سے مخفی نہین۔ آپ نے ایک مجلس مشاعرہ بھی قائم کی تھی اور اُسمین جدت کا یہ پہلو رکھا تھا کہ بجائے مصرع طرح کے کسی خاص عنوان پر شعراء کو طبع آزمائی کا موقع دیا جاتا تھا۔ مولٰنا آزاد نے بھی سب سے پہلے اسی گلشن مین جدت طرازی کے نغمے سنائے تھے اور حالی کی نظمین برکھارت، نشاط اُمید، مناظرہ رحم وانصاف، حب وطن وغیرہ اسی مشاعرے مین پڑھی گئی تھین۔ گویا فکر کے سانچے مین جذبات کی تصویرین جو آئندہ ڈھلکر نکلنے والی تھین اُن کا یہ ابتدائی نمونہ تھا۔

لیکن مولٰنا حالی کے علمی کارنامون مین جنکا تعلق اُنکی عمر کے اولین حصہ سے ہے دو ایک کتابین اور بھی قابل ذکر ہین مثلاً تریاق مسموم جو اُن کے ایک ہموطن مسلمان کی ایک کتاب کے جواب مین ہے جس نے مسیحی ہونیکے بعد اسلام پر اپنے خیال کے مطابق چند اعتراضات قلمبند کرکے کتابی صورت مین شائع کیے تھے۔ اسیطرح آپ نے ایک کتاب تعلیم نسوان کے متعلق لکھی تھی جو آج شاید کمیاب ہے لیکن ہمارے خیال مین اُسکی دوبارہ اشاعت خالی از نفع نہوگی اور اس زمانے مین جبکہ نصاب تعلیم مستورات کی تکمیل مین دقتین واقع ہو رہی ہین مولٰنا حالی ایسے مبصر کی تصنیف کی موجودگی بہت کارآمد ہو سکتی ہے۔ اس کتاب کے صلے مین تعلیمی دربار دہلی کے موقع پر آپ کو گورنمنٹ کے جانب سے چار سو روپیہ کا اعزازی انعام بھی عطا ہوا جو لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھون آپ کو ملا تھا۔ یہ کتاب غالباً پنجاب کے مدارس مین کچھ عرصہ تک داخل کورس بھی رہ چکی ہے۔ ان دونون کتابون کے علاوہ آپنے طبقات الارض پر ایک کتاب کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ اصل کتاب فرانسیسی زبان مین تھی۔ مصر کے ایک عالم نے اُسکا عربی ترجمہ کیا اور مولٰنا حالی نے اُسے اُردو کا لباس پہنایا۔ یہ علمی خدمات ہر طرح مستحق شکریہ تھین اور ساتھ ہی انسے حالی کی لیاقت وعلمیت کا سکہ بھی بیٹھ سکتا تھا لیکن آپ کی مابعد کی تصنیفات اور شاعری نے آپ کی منزلت کو جس رُتبہ پر پہنچا دیا ہے وہ اول الذکر کے ذریعے سے ناممکن تھا۔

مولٰنا کی مستقل تصانیف کی فہرست یہ ہو سکتی ہے:—

حیات سعدی

مسدس حالی

دیوان حالی

شکوۂ ہند

یادگار غالب

حیات جاوید

ان کے علاوہ آپ کی بیشمار نظمین مستقل قدر وقیمت کی چیزین ہین اور بہت سے علمی مضامین شرح تہذیب الاخلاق اور دوسرے ملکی رسائل مین وقتاً فوقتاً شائع ہو چکے ہین بجائے خود ایک ضخیم کتاب بنسکتے ہین۔ حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید مین اول الذکر شیخ سعدی شیرازی کی ثانی الذکر مرزا اسد اللہ خان غالب کی اور آخری کتاب سر سید احمد خان کی مشرح اور مبسوط لائف ہے۔ یہ کتابین آجکل ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقے مین عام طور پر متداول ہین۔ غالب کے کلام اور تصانیف کی تنقید یادگار غالب مین جس پیرایے مین کیگئی ہے وہ حالی ہی کا حق تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت مین غالب کے واقعی طور پر پہچاننے والونمین اُن کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔

"حیات سعدی" غالباً اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے اور اُسکے محاسن وفضائل کے متعلق اسیقدر کہنا کافی ہوگا کہ "سعدی شیرازی" کو ہندوستان جدید سے روشناس کرنیکی خدمت "سعدی پانی پتی" سے بہتر کوئی نہ انجام دیسکتا تھا۔

سر سید کی لائف اُس مقدس بزرگ اور قومی خادم کی تمام عمر کی جانکاہی اور جانفشانیون کی مطول داستان ہی۔ جو لوگ سر سید کے متعلق ذرا ذراسی بات بھی دریافت کرنے کے خواہشمند ہون اُنھین اِس کتاب کا مطالعہ ازبس ضروری ہی۔

یہ تینون کتابین مفصل ریویو کی محتاج ہین۔ محض دو ایک سطرون سے اُنکی ظاہری و باطنی خوبیون کا انکشاف ناممکن ہی۔ اِس مضمون مین چونکہ ہمین اپنی رائے زنی کو اُنکی شاعری تک محدود کرنا ہی اس لیے ہمین افسوس ہی کہ اُنکی نثر تصانیف کی بابت تفصیل سے نہین لکھ سکتے۔

اب ہم مولانا حالی کی شاعری پر نگاہ تنقید ڈالتے ہین۔ سب سے پہلے ہم اُن کے دیوان کو لیتے ہین اُسکے بعد اُنکی متفرق نظمون کو دیکھین گے۔ مسدس حالی کی نسبت ہمین جو کچھ کہنا تھا وہ تمہید مین گذر چکا ہی۔

سنہ ۱۸۹۳ء مین مولانا حالی کا دیوان شائع ہوا۔ ولی دکھنی کا کلیات جب پہلے پہل دلی مین آیا تھا تو اُسوقت وہان کی علمی مجالس مین جو کیفیت پیدا ہوئی تھی وہی ہندوستان کے شعری حلقون مین دیوان حالی کی اشاعت سے دیکھنے مین آئی۔ اپنے اپنے وقت مین دونون نئی چیزین تھین اور دیکھنے والون کے لیے حیرت و استعجاب بڑہاتی تھین لیکن ان دونون کے ابتدائی تاثرات مین فرق ہی۔ ولی کے کلام کی تقلید کا شوق بہت جلد تمام ہندوستان مین پھیل گیا اور آج بھی اُسکی لکیر کے فقیر یہان کونے کونے مین موجود ہین لیکن حالی کے کلام کو یہ عزت نہین ملی۔ اُنکی روش سے اہل ملک پہلے سے کچھ واقف تھے لیکن دیوان حالی کی اشاعت تک وہ قابل مصنف کی ہمہ گیر طبیعت کے رنگ سے ناواقف تھے۔ عام مذاق کو دیکھتے ہوے پُرجوش خیر مقدم کی توقع حضرت حالی کو خود بھی نہ تھی اور ایسا ہی ہوا کہ اُنکے مجموعۂ افکار نے قدامت پسندونکو بجائے خوش کرنے کے ملول کر دیا۔ اعتراضات کی بھرمار اور مخالفت کے طومار سے اُنھون نے حالی کا ناطقہ بند کرنا چاہا لیکن مستقبل شناس آنکھین اب سے کئی صدیون آگے تک کے واقعات نگاہ مین رکھتی ہین۔ حالی یہ بھی جانتے تھے کہ اس قسم کی مخالفت بھی لازمی چیز ہی اگر اسکا مقابلہ ثابت قدمی سے کر لیا تو میدان مارا ہوا ہی۔ یہی بات آخر کو سچ ثابت ہوئی۔ وہی طبائع جن کے لیے کلام حالی زہر سے زیادہ تلخ تھا اُسمین اب شہد و شکر کی حلاوت پاتی ہین۔ اسمین شک نہین کہ ابھی باشندگان ہند کی ایک کثیر تعداد ایسی ہی جو اُنھین قدما کی عظمت کا مستحق نہین جانتی تاہم اُن کے کلام کے سود مند نتائج کا ہر شخص کو اقرار ہی اور حالی کی سب سے بڑی جیت یہی ہی۔

دیوان حالی مین سب سے پہلے اور مقدمہ اور دیباچہ کے بعد قطعات کو جگہ دی گئی ہی جو اخلاقی نکات پر مبنی ہین۔ پھر غزلیات کی باری آتی ہی۔ اُسکے بعد رُباعیات ہین۔ آخر مین قصائد، ترکیب بند، مرثیے، قطعے، متفرقات، اور تاریخین ہین۔ دیوان کا مقدمہ بجائے خود فن شاعری پر ایک مبسوط اور معرکۃ الآرا کتاب ہی۔ اس مین شعر کی مدح و ذم، تاثیر سخن، مختلف ممالک کی شاعری کے مدارج، اسلام اور شاعری، شاعری کے عروج و زوال، شاعری اور سلطنت کے تعلقات، عہد وسطیٰ اور زمانۂ اخیر کی شاعری کا فرق، سوسائٹی پر شاعری کا اثر، غرض اس قسم کے اکثر نہایت نازک اور دلچسپ مسائل پر بہت خوبی سے معنی خیز رائے زنی کی ہی۔ اُردو شاعری کے عیوب روز روشن کی طرح ظاہر کیے ہین، لیکن اساتذۂ متقدمین کا ذکر نہایت متانت اور تہذیب سے کیا گیا ہی۔ خواہ مخواہ کسی کو اعتراضات کا نشانہ نہین بنایا۔ آخر مین اُردو فن شعر کی اصلاح

کے باب مین جو قابل قدر خیالات ظاہر کئے گئے ہین وہ حصہ بہی خواہان ادب اُردو کے خاص غور وخوض کا محتاج ہی جو شعرا قدیم شاہراہ سے ہٹکر حالی کے قدم بقدم چلے ہین اُنسے قطع نظر اگر پرانی شاعری کے دلدادہ اور حالی کے نام پر خار کھانیوالے حضرات اُسے ٹھنڈے دل سے دیکھین تو ممکن نہین کہ اُنھین حالی کی رائے سے اتفاق نہ کرنا پڑے۔

یہ ممکن ہی کہ حالی کے مخالفین اُنکی شاعری کو کسی پایہ کا نہ سمجھین اور یہ بھی ہوسکتا ہی کہ حالی کی شاعری کسی پایہ کی نہ بھی ہو تاہم مقدمہ دیوان حالی اپنے ذی منزلت مصنف کی اصابت رائے کی کافی دلیل ہی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہی کہ حالی کو فن شاعری کے اصول و فروع اور اُسکی تاریخ پر کتنا قابو حاصل ہی۔ جس مسئلہ پر قلم اُٹھایا ہی اُسکے ہر پہلو پر نظر ڈالی ہی اور اپنے خیالات کی تائید عقلی دلائل کے ساتھ مشرق و مغرب کے اُن اہل الرائے اشخاص کی آرا سے کی ہی جو ہر طرح مستند اور قابل قبول سمجھی جاسکتی ہین۔

اخلاقی قطعات، گلستان کے باب ہشتم کے نصائح کا گویا جواب ہین جو سبق آموز باتین اُنھین سوجھی ہین اُنھین نظم کا لباس پہناکر قوم کے سامنے پیش کردیا ہی۔ چند عنوان مختلف قطعون کے درج کئے جاتے ہین۔ ناظرین اُنسے نفس مطلب کا قیاس کرسکتے ہین۔ "چھوٹون کا بڑا بن جانا" "شعر کی طرف خطاب" "بے تمیزی ابنائے زمان" "آزادی کی قدر" "قحط اہل اللہ" "فیشن کی تعریف" "استفادہ" "اسراف" اور علیٰ ہذا القیاس۔

ان مین سب سے بڑی خوبی یہ ہی کہ نصیحت کی تلخی کو قصے اور مکالمے کی چاشنی دیکر خوشگوار بنایا ہی۔ پند و موعظت کا بہترین طریقہ یہی ہی کہ اُسے گفتہ آید در حدیث دیگران کے مصداق اسطرح ادا کیا جائے کہ سامع کو اسکی تمیز نہو کہ خطاب اُسیکی طرف ہی۔ دوسری خوبی اِن قطعات مین یہ ہی کہ جن مضامین پر طبع آزمائی کیگئی ہی وہ زمانہ جدید کی ضروریات کے مطابق ہین۔ وہ زخ و جنت اور حشر و نشر کی موشگافیون سے سروکار نہین رکھا بلکہ جو بات کہی ہی وہ مچی تلی اور آج کل کے رنگ مین۔ اس فرق کو بوضاحت ذہن نشین کرنے کیلئے ہم اُن کا ایک منتخب قطعہ درج کرتے ہین۔ اس سے ناظرین کو ہمارے منشا کے سمجھنے مین آسانی ہوگی۔ فرماتے ہین ؎

حالی سے کہا ہمنے کہ ہی اسکا سبب کیا — جب کرتے ہو دم کرتے ہو ثروت کی مذمت
لیکن بخلاف آپکے سب اگلے سخنور — جب کرتے تھے کرتے تھے بخیلو نکو ملامت
حالی نے کہا رو کے نہ پوچھو سبب اسکا — یارون کیلئے ہی یہ بیان موجب رقت
کرتے تھے بخیلو نکو ملامت سلف اُس وقت — جب قوم مین افراط سے تھی دولت و ثروت
اور اب کہ نہ دولت ہی نہ ثروت ہی نہ اقبال — گھر گھر پہ ہی چھایا ہوا افلاس و فلاکت
ترغیب سخاوت کی ہی اب قوم کی ایسی — پروانگی آج ہی چیونٹیون کو جیسی اذیت

بعض قطعے اختصار مضمون و کثرت معنی کے اعتبار سے بے مثل ہین "قحط اہل اللہ" کے عنوان سے ایک جگہ فرماتے ہین ؎

کل خانقاہ مین بھی حالت عجب طاری — جو تھا سو چشم پرنم۔ اپنا تھا یا پرایا
"دنیا سے اُٹھ گئے سب جو تھے مرید صادق" — یہ کہکے شیخ کا دل بیساختہ بھر آیا
ہم نے کہا "مریدی باقی رہی نہ پیری" — یہ کہکے ہم بھی روئے اور سبکو بھی رلایا

"شعر کو خطاب کرکے آپ نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہی اُسکے صحیح ہونے مین کسکو شک ہوگا۔ کہتے ہین ؎

اے شعر دلفریب نہو تو تو غم نہین — پر تجھپہ حیف ہے جو نہو دلگداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام — ہان سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
اہل نظر کی آنکھ مین رہتا ہی گر عزیز — جو بے بصر ہین اُنسے نہ رکھ ساز باز تو
چپ چاپ اپنے پیچ سے کئے جا دلون مین گھر — اونچا ابھی نہ کر علم امتیاز تو

پہلے دو شعر اس امر کی تشریح ہین کہ شعر فی الحقیقت کسکو کہتے ہین آخری دونون اشعار کی لے گولڈ سمتھ کی تان کا مزا دیتی ہی جو کہتا

ہو کہ "تو وقت کا مقابلہ کیجیو اور باد مخالف کے جھگڑون پر غالب آئیو"
ترکِ سوال" کی نصیحت کس جدت کے ساتھ نئے پیرایے مین کی ہو۔ معنوی طور پر گویا یہ بھی جتا دیا ہو کہ مہذب اور ترقی یافتہ اقوام گداگری کو سخت عیب خیال کرتی ہین۔ دیکھیے ؎

عادت تھی اک فقیر کی کرتا تھا جب سوال　　　انگریز کے سوا نہ کسی سے تھا مانگتا
مدت تک اُسکی جب یہی دیکھی گئی روش　　　پوچھا کسی نے اُس سے کہ اسکا سبب ہے کیا
بولا کہ عادت اس لیے کی ہو یہ اختیار　　　چھٹ جائے تا کہ مجھسے یہ لپکا سوال کا
پہلے تو بھاگو انسے ملتی تھی روز بھیک　　　آتا تھا مانگنے مین بہت بھیک کا مزا
پر جب سے ہو سوال کا اس قوم پر مدار　　　منت سے عجز سے کبھی ملتا نہین ٹکا
امید ہے کہ مانگنے کی چھوٹ جائے لت　　　گر چند روز اور رہا اس سے سابقہ

ظاہر ہو کہ پند و نصیحت مین زبان اور لطف بیان کا چٹخارا بہت مشکل سے پیدا ہوتا ہو خصوصاً جب شاعر کو خود یہ باتین ناپسند ہون۔ جو لوگ اس قسم کے قطعات مین واسوختِ امانت یا مثنوی میر حسن کا مزا ڈھونڈھتے ہون وہ غلطی پر ہین۔ مجلسِ وعظ ہمسِن احباب کی صحبت کیطرح کبھی کیفیت انگیز نہین ہو سکتی۔ البتہ کہین کہین کلام کی روانی اور محاورات کے استعمال سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہو۔ مثلاً ؎

ارے خود پرستو طبیعت کے بندو　　　ذرا وصف اپنے سنو کان دھر کے
نہین کام کا تمکو اندازہ ہرگز　　　جدھر ڈھل گئے ہو بہے بس اُدھر کے
جو گانے بجانے پہ آئی طبیعت　　　تو چیخ اُٹھے دو دن مین ہمسائے گھر کے
چڑھا بھوت عشق و جوانی کا سر پہ　　　تو پھر گھاٹ کے آپ ہین اور نہ گھر کے
جو کھانا تو بیحد جو پینا تو اَت گت　　　غرض یہ کہ سرکار ہین پیٹ بھر کے

زبان و طرزِ بیان کی کمی قطعات مین رہگئی ہو اور یہ کمی بعض اوقات ناگزیر ہوتی ہو اُسکی تلافی غزلیات مین بہت کچھ ہو گئی ہو۔
غزلیات حالی دو حصون مین باعتبار اوقاتِ فکر تقسیم ہو سکتی ہین یعنی قدیم و جدید۔ دونون قسم کی غزلون کا مقابلہ کرنیسے رنگِ طبیعت کے تدریجی تغیرات کی تمیز بآسانی ہو جاتی ہو۔ قدیم غزلون کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہو کہ ابتدا مین بھی آپ کا مذاق بہت سنجیدہ اور متین تھا۔ یہ ہو سکتا ہو کہ اس مجموعہ مین آپ کی وہ غزلین عمداً نہ شامل کیگئی ہون جنمین مستی سرسہ اور کنگھی چوٹی کے مضامین لکھے گئے ہون۔ کیونکہ ہمارا خیال ہو۔ اسکی بابت ہم اوپر بھی کہین کنایۃً لکھ چکے ہین کہ پہلے پہل انسان کو اسی قسم کے خیالات نظم کرنے پڑتے ہین تاہم اگر ان قدیم غزلونکو جنکی صراحت موجود ہو بالکل ابتدائی نہ سمجھا جائے تو بھی ان سے یہ قیاس ہو سکتا ہو کہ رنگ جدید اختیار کرنیسے پیشتر اُنکی شاعری کا کیا عالم تھا۔ ہمارے خیال مین اُصولاً یہ سخت غلطی ہو گی اگر ہم کلام حالی مین میر، جرأت اور داغ کی خصوصیات تلاش کرین جب حالی نے اپنا مشرب ہی جُدا رکھا تو اُنمین پُرانی باتو نکا ہونا ایسا ہی ناممکن ہو جسطرح افلاطون کا شیکسپیر بن جانا۔ دیکھنا صرف یہ ہو کہ شاعری کا جو مفہوم حالی نے قرار دیا ہو اُس لحاظ سے اُن کے کلام کی کیا حالت ہو اور جب ہم اس معیار پر اُسکو دیکھتے ہین تو وہ کھرا اُترتا ہو۔ اُنکی پُرانی غزلین بھی اُنکی اعتدال پسندی اور سلامت روی کا ثبوت ہین۔ دیکھیے یہ مطلع کس قدر بلیغ ہے ؎

ہو جستجو کہ خوب سے ہو خوب تر کہان　　　اب ٹھیرتی ہو دیکھیے جا کر نظر کہان

اسی کے ساتھ یہ شعر غالب کے طرزِ بیان کی یاد دلاتا ہو ؎

یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر　　　تھا اُسکو ہم سے ربط مگر اسقدر کہان

مندرجۂ ذیل مطلع باعتبار اختصار و طرزِ ادا کے کتنا اچھا ہو ؎

رنج اور رنج بھی تنہائی کا　　　وقت پہنچا مری رسوائی کا

ایک غزل کے یہ چند اشعار قابل ملاحظہ ہین ؎

پیش از ظہورِ عشق کسیکا نشان نہ تھا　　　تھا حسن میزبان کوئی مہمان نہ تھا

ملتے ہی اُنکے بھول گئین کلفتین تمام | گویا ہمارے سر پہ کبھی آسمان نہ تھا
کچھ میری بیخودی سے تھا ازیان نہین | تم جانتا کہ بزم مین اک خستہ جان تھا
اِت اُسکو بات بات پہ سو سو دئے جواب | مجکو خود اپنی ذات سے ایسا گمان تھا

اور دیکھئے فرماتے ہین ؎

اب وہ اگلا سا التفات نہین | جس پہ بھولے تھے ہم وہ بات نہین
رنج کیا کیا ہین ایک جان کے ساتھ | زندگی موت ہے حیات نہین
ذرہ ذرہ ہے مظہر خورشید | جاگ اے آنکھ دن ہو رات نہین

زندگی کو کس خوبی سے موت ثابت کیا ہو- اور آخری شعر معرفت شناسی کا گویا آئینہ ہو- اسیطرح ایک یہ شعر کسقدر مضمون خیز ہو ؎

کوئی محرم نہین ملتا جہان مین | مجھے کہنا ہو کچھ اپنی زبان مین

یہ مختصر انتخاب اُنکی قدیم غزلیات کا ہو- جدید طرز پر جو کچھ کہا ہو وہ دُنیا ہی اور ہو- مضمون آفرینی کے ساتھ سوز و گداز اور درد کا پہلو ہاتھ سے جانے نہین پایا- ان غزلون مین ایک بڑی خوبی یہ ہو کہ اکثر مسلسل اور قطعہ بند ہین، شروع سے آخر تک ایک ہی مضمون کے اشعار لکھے گئے ہین اور سلسلۂ خیالات کے اسطرح قائم رہنے سے عجیب لطف پیدا ہو جاتا ہو، شادمانی الوداع، جوانی الوداع، اس زمین مین کہتے ہین اور کس حسرت سے کہتے ہین ؎

اے بہار زندگانی الوداع | اے شباب اے شادمانی الوداع
اے بیاض صبح پیری السلام | اے شب قدر جوانی الوداع
روز گار ضعف و سستی الصلا | وقت سعی و جانفشانی الوداع
فرصت عشق و جوانی الفراق | درد عیش و کامرانی الوداع
تجکو سمجھے تھے نسیم جاودان | اے نسیم جاودانی الوداع
آلگا حالی کنارے پر جہاز | الوداع اے زندگانی الوداع

ہم اوپر ایک جگہ کہ چکے ہین کہ حالی کے کلام کو خود اُن کے مقرر کردہ معیار پر جانچنا چاہئیے- اس لیے ہمین یہان یہ دیکھنا ہو کہ مولنا نے غزل گوئی کے کیا اُصول رکھے ہین اور پھر یہ کہ خود اُنھون نے اُنکی پابندی کہان تک کی ہو- عشقیہ مضامین کے متعلق آپکی رائے ہو کہ وہ ایسے جامع الفاظ مین ادا کیئے جائین جو دوستی اور محبت کی تمام انواع و اقسام اور تمام جسمانی اور روحانی تعلقات پر حاوی ہون-

نفس مضمون کے متعلق آپ کا خیال ہو کہ اسکا دائرہ وسیع کرنا چاہیئے یعنی محض عشق و محبت کی باتون پر محدود نکرنا چاہیے بلکہ جس بات کا سچا جوش اور ولولہ اُٹھے خواہ اُسکا منشا خوشی ہو یا غم یا حسرت یا ندامت یا شکر یا شکایت . . . . . . یا حُبِ وطن یا قومی ہمدردی . . . . . . یا کوئی جذبہ جذباتِ انسانی مین سے اُسکو بھی غزل مین بیان کرسکتے ہین-

لیکن حقیقت یہ ہو کہ مولنا کا یہ مشورہ بہت بعد از وقت ہو- متقدمین نے خود غزلیات کا انحصار عشقیہ باتون پر نہین رکھا- ہان اُن کے یہان حُبِ وطن، ایثار نفس، قومی ہمدردی اور اسی قبیل کے مضامین پر بہت کم توجہ کیگئی ہو اور شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ اُن کے زمانے مین اسکی ضرورت نہ تھی- ہان آجکل اس قسم کے جوش آفرین خیالات کے ذریعے سے قوم کے جمود کو توڑنا فرض تھا اور اس مین کلام نہین کہ اس مقصد کی تکمیل مولنا حالی کے دم سے ہوئی مختصر یہ کہ مولنا کی غزلیات اُن مضامین سے لبریز ہین جنکی تاثیر کسی مردہ قوم مین زندگی کی حرکت پیدا کرسکتی ہو- فرماتے ہین ؎

معنی کا تم نے حالی دیا اگر بہا یا | یہ تو بتاؤ حضرت کچھ کرکے بھی دکھایا
اے بانگ طبل شاہی دن ہوگیا اب آخر | خواب گران سے تو نے اب تک نہیچ جگایا
تقلید قوم ہو پر گر ہو مدار تحسین | تو ہمنے دوستو کی تحسین سے ہاتھ اٹھایا

آپ کا ہو جبھی پسر وارث | جو ہنر کا بھی اُسکے گر وارث

گھر ہنرور کا ناخلف نے لیا	تیرا ہو کون اے ہنر وارث
ہو اگر ذوق کسب سے آگاہ	کریں میراث سے حذر وارث
قوم بے پیر دین بیکس ہے	گئے اسلام کے کدھر وارث

جو جذبات قومی امراض کے حق میں اکسیر سمجھے جاتے ہیں اُنکے اُکسانے میں مولنٰا حالی نے کمال دکھایا ہو۔ جو لوگ اپنی پست حالت دیکھکر ہمت ہار بیٹھے تھے اُنھیں اسطرح ڈھارس دیتے ہیں ؎

ہو کہیں اقبال کی نوبت کہیں ادبار کی	سبکو کرنی ہونگی پوری اپنی اپنی باریان
زیست ہے جنکو جو جائے بسر کرنی محال	اتنی بھی اے عاقلو اچھی نہیں بیزاریان

غمِ دوران کے ہیں سب شکوہ سنج	یہ بھی ہو یارو اکوئی رنجو نہیں رنج
رنج و شادی یان کے ہیں سب بے ثبات	اور اگر سوچو تو شادی ہے نہ رنج

پہنچ اے خضر کہ موقع ہے مددگاری کا	ڈگمگاتی ہو بہت دیر سے منجدھار میں ناؤ
اے شرافت تجھے بکنا ہو اگر مفت تو بک	آجکل کیجئے کیا ہو یہی بازار میں بھاؤ
قافلے ساتھ کے پہنچے حرم کے لگ بھگ	وقت اب ہاتھ سے جاتا ہو جو آتے ہو تو آؤ

قوم کے ظاہر و باطن کی تصویر جو مندرجۂ تحت شعروں میں الفاظ کے ذریعے کھینچی ہو کتنی صحیح اور سچی ہو ؎

خوبیاں اپنے میں گو بے انتہا پاتے ہیں ہم	پر ہر اک خوبی میں داغ اک عیب کا پاتے ہیں ہم
دلمیں درد عشق نے مدت سے کر رکھا ہو تنگ	پر اسے آلودۂ حرص و ہوا پاتے ہیں ہم
ٹھہرتے جاتے ہیں جتنے چشم عالم میں بھلے	حال نفسِ دوں کا اُتنا ہی بُرا پاتے ہیں ہم
گو بھلائی کرکے ہم جیسو سے خوش ہوتے ہیں جی	تہ نشیں اُسمیں مگر دُور ریا پاتے ہیں ہم
ہو رہے نیکنامی دوش پر اپنے مگر	داغ رُسوائی کے کچھ زیر ردا پاتے ہیں ہم

نور کے جتنے گھٹے دیکھے ہیں اے حالی مگر
رنگ کچھ تیری الاپوں میں نیا پاتے ہیں ہم

ان اشعار کی کیفیت اور خیالات کی حقیقت قابل داد ہو ؎

صلح ہے اِک مہلتِ سامانِ جنگ	کرکے ہیں بھرنے کو یان خالی تفنگ
عہد گیتی پر نہ بھولیں کامران	آخر اسکی آشتی لائیگی رنگ
علم کیا، اخلاق کیا، ہتھیار کیا،	سب بشر کے مارنے کے ہیں ڈھنگ
کام کا شاید زمانہ ہو چکا	دلمیں اب اُٹھتی نہیں کوئی اُمنگ
کاہشوں سے پرورش پاتی ہو روح	اب لگا کھایا پیا سب آکے انگ

حمد کے یہ چند شعر معانی کے اعتبار سے کسقدر دلچسپ اور مضمون خیز ہیں ؎

کامل ہو جو ازل سے وہ ہو کمال تیرا	باقی ہو جو ابد تک وہ ہو جلال تیرا
کاوش میں ہو آتی وگدا میں ہو طبیعی	جو حل ہوا نہوگا وہ ہو سوال تیرا
دل ہو کہ جان تجھ سے کیونکر عزیز رکھیے	دل ہو سو چیز تیری جان ہو سو مال تیرا

لیکن نیچے کے یہ دو شعر اور ہی کیفیت سے پُر ہیں ؎

نہ جی رُکھائی سے تیری چھوٹے نہ بے نیازی سے آس ٹوٹے
ہے سدا نامراد جو یان اُنھیں بھی اُمیدوار دیکھا

خبر نہیں یہ کہ کیا ہو کیسا ہو کون ہو اور تو کہاں ہے
پہ اپنے میں اور تجھ میں جتنے علاقہ اک اُستوار دیکھا

نعت کا یہ شعر کتنا بلیغ ہو۔ اِس سے زیادہ صحیح تعریف ناممکن تھی ؎

قال ترا اور حال نشۂ وحدت میں	اوڑھنا تیرا خدا اور بچھونا خدا

مسئلۂ عشق کی نزاکت و دقائق سے مولنٰا حالی بے خبر نہ تھے لیکن بعض متقدمین کی بدولت عشق بھی لڑکوں کا کھیل بن گیا اور رفتہ رفتہ عوام الناس اس پاک جذبہ کو بھی شاہد بازی کا مرادف سمجھنے لگے۔ حالی کو معلوم تھا کہ اس حالت میں جبکہ اُسکے حقیقی معانی سے بےخبری کا یہ عالم ہو عشق و محبت کی تعلیم قوم کیلئے غیر مفید ہوگی۔ یہی سبب ہے کہ اُنھوں نے اکثر اسکا ذکر ایسے الفاظ میں کیا ہو جس سے تشویق کی جگہ تخویف کا پہلو نکلتا ہو۔ کہتے ہیں ؎

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا	جس گھر سے سر اُٹھایا اُسکو بٹھا کے چھوڑا

ابرار تجھسے ترسان احرار تجھسے لرزان
جو زد پہ تیری آیا اُسکو گرا کے چھوڑا

ریونکے راج چھینے شاہونکے تاج چھینے
گردن کشونکو اکثر نیچا دکھا کے چھوڑا

آگے چلکر تو صاف صاف کہدیا ہے ؎

جیتے جی موت کے تم مُنھ مین نجانا ہرگز
دوستو دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز

عشق بھی تاک مین بیٹھا ہے نظر بازون کی
دیکھنا شیر سے آنکھین نہ لڑانا ہرگز

چاہتا اک طلعت مکروہ ہے برقع مین نہان
کسی دلالہ کے دھوکے مین نہ آنا ہرگز

ہاتھ ملتے نہون پیری مین اگر حسرت سے
تو جوانی مین نہ یہ روگ لگانا ہرگز

یہ چارون شعر مولنا حالی کی ایک مشہور غزل سے لیے گئے ہین۔ یہ غزل سرتاپا مرصع ہے اور تسلسل کلام مین جہان دہلی کا ذکر آگیا ہے وہان حسرت و یاس کا عجیب عالم پیدا ہوتا ہے ؎

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سُنا جائیگا ہم سے یہ فسانا ہرگز

ڈھونڈھتا ہے دل شوریدہ بہانے مطرب
دردانگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

صحبتین اگلی مصور ہمین یاد آئینگی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

لیکے داغ آئیگا سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈرون مین نجانا ہرگز

چپے چپے پہ ہین یان گوہر یکتا تہ خاک
دفن ہوگا کہین اتنا نہ خزانا ہرگز

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمھارا دلّی
ہمکو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

کر دیا مر کے یگانون نے یگانہ ہمکو
ورنہ یان کوئی نہ تھا ہم مین یگانا ہرگز

داغ و مجروح کو سُن لو کہ پھر اس گلشن مین
نہ سُنے گا کوئی بُلبل کا ترانہ ہرگز

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھوگے کبھی لطف شبانا ہرگز

بزم ماتم تو نہین بزم سخن ہے حالی
یان مناسب نہین رو رو کے رُلانا ہرگز

حالی کی نظرون سے دہلی کا سمان جو گذرا تھا اُسکے درہم برہم ہونے پر جو الم انگیز جذبات پیدا ہوسکتے ہین اُنھین حالی سے زیادہ کون محسوس کر سکتا تھا۔ حق یہ ہے کہ حالی نے یہ داستان چھیڑ کر اپنے ساتھ سامعین کو بھی خوب رُلایا ہے اسیطرح قومی انقلاب کا فوٹو بھی بعض اوقات نہایت موثر طریقے پر دکھایا ہے۔ اسلامی عروج و زوال کا مرقع ایسا نہین کہ کوئی دیکھکر اپنے دل کو قابو مین رکھ سکے ؎

پھر زخم پھوٹ نکلا حالی نہ چھیڑنا تھا
فصل خزان کا قصہ ذکر گل و چمن مین

وہ قوم جو جہان مین کل صدر انجمن تھی
تنے سنا بھی ہے اُسپر کیا گذری انجمن مین

وہ دن گئے کہ موتی مشہور تھے عدن کے
ہے کال موتیون کا اب بحر عدن مین

قبر اویس پر ہے بس قُرب قرن کا
زندہ اویس کوئی باقی نہین قرن مین

خرد و بزرگ سارے ہین بدحواس گویا
لُٹنے کی قافلے کی پہنچی خبر وطن مین

حالی بس اب نہین یان سننے کی تاب باقی
مانا کہ ہے بہت کچھ وسعت ترے سخن مین

نوک زبان تیری سینون کو چھید ڈالا
ترکش مین ہے یہ پیکان یا ہے زبان دہن مین

رُباعیات حالی بھی دیگر اصناف سخن کیطرح مفید خیالات کی جامع ہین۔ کہین وحدت کا ترانہ ہے کہین صلح کُل کی لے اور کہین انقلاب عالم پر فلسفیانہ جذبات کا اظہار۔ یہ دو رُباعیان جن مین وجود و وحدت باری تعالی کی پُراثر اور سچی دلائل سے کام لیا گیا ہے بہت مشہور ہین ؎

کانٹا ہے ہر اک جگر مین اٹکا تیرا
حلقہ ہے ہر اک گوش مین لٹکا تیرا

مانا نہین جسنے تجکو جانا ہے ضرور
بھٹکے ہوئے دل مین بھی ہے کھٹکا تیرا

ہندو نے صنم مین جلوہ پایا تیرا
آتش پہ مغان نے راگ گایا تیرا

دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے
انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

قومون کے باہمی اتفاق اور میل جول کی خوبی یون ظاہر کی ہے

ہندو سے لڑین نہ گبر سے بیر کرین
شر سے بچین اور شر کے عوض خیر کرین

جو کہتے ہین یہ کہ ہے جہنم دُنیا
وہ آئین اور اس بہشت کی سیر کرین

دُنیا کے فانی ہونے سے کسکو انکار ہوگا لیکن یہی خیال بسا اوقات بڑے کامون کی تکمیل مین حارج ہوتا ہے۔ اس نکتہ کو مولنا حالی یون ادا فرماتے ہین ؎

دُنیائے دنی کو نقش فانی سمجھو   روداد جہان کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا   ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو

غزلیات اور رُباعیات کے بعد قصائد ہین۔ متقدمین نے قصائد نگاری کے جو اُصول موضوعہ مقرر کئے ہین اُنکے اعتبار سے خصوصیت کے ساتھ یہ صنف حالی کے مذاق سے کوئی مناسبت نہین رکھتی۔ لیکن انکی جدید مدحیہ نظمین اور قصائد اسبات کا ثبوت ہین کہ اس خارزار مین بھی اُنھون نے اپنا علیحدہ راستہ نکال لیا ہے۔ حال مین آپ کی ایک تازہ نظم حضور نظام میر عثمان علیخان فرمانروائے دکن کی تخت نشینی کے موقع پر شائع ہوئی تھی اُسکے چند اشعار مندرجہ ذیل سے اُن کا رنگ طبیعت ظاہر ہوگا۔ سعدی کیطرح حالی کا بھی کہنا یہی ہے کہ ؎

چہ حاجت کہ نہ کرسی آسمان   نہی زیر پائے قزل ارسلان
گو پائے عزت بر افلاک نہ   بگو روئے اخلاص بر خاک نہ

مبالغہ اور تصنع کی گلکاریون سے کلام مین گلزار کی سی دلفریبی پیدا کرنیکی جگہ آپنے ممدوح کو اُسکی ذمہ داریون سے آگاہ کرنا پہلا فرض سمجھا ہے۔ فرماتے ہین ؎

فلک مرتبت میر عثمان علیخان   مبارک تمھین مسند شہریاری
مبارک ہو تمکو وہ دشوار منزل   جہان چپے چپے پہ ہے ذمہ داری
مبارک بزرگون کی میراث تمکو   جنھون نے کہ جھیلی ہین گرم و سرد ساری
اب انکی جگہ آپ کو ہے اُٹھانا   خدا کی امانت کا یہ بوجھ بھاری
جو بے بس ہین دینا ہے انکو سہارا   جو بے یار ہین اُنکی کرنی ہے یاری
تھکے جو ہین اُن کو کامی بنانا   بڑھانا دل اُنکا جو ہین کار ہاری
جگانا اُنھین نیند کے جو ہین ماتے   پڑھانا اُنھین علم سے جو ہین عاری

قصائد کے بعد مدحیہ قطعات ترکیب بند اور تاریخی قطعے ہین اور شاعرانہ تلمیس مناسبت کے لحاظ سے بہت اچھے ہین لیکن ہمارے خیال مین انکی عظمت و منزلت یہ چیزین نہین بلکہ انکی وہ نظمین ہین جنکے عملی نتائج سے مسلمان آج متمتع ہو رہے ہین۔ انکی تعداد ایک دو نہین بلکہ بیسون ہے اور انمین سے بعض اپنی شہرت کے لحاظ سے مسدس کے بعد ہی جگہ پانے کا استحقاق رکھتی ہین۔ مثلاً قصیدۂ الغیاثیہ اور شکوۂ ہند۔ اول الذکر جس موثر پیرایہ مین لکھا گیا ہے اُسکا اندازہ چوٹ کھائے ہوے دل خوب کر سکتے ہین۔ اسے شروع سے آخر تک دیکھئے اور عالم سکوت مین اسکی معنی آفرینیون اور طرز بیان کی خوبیون کا موازنہ کیجئے۔ اللہ اللہ کس جوش محویت مین کہتے ہین ؎

اے خاصۂ خاصان رُسل وقت دُعا ہے   اُمت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

یہی حال شکوۂ ہند کا ہے۔ ایک ایک لفظ تیر و سنان کا کام کرتا ہے۔ مولنا حالی کے مبصر اور عالی دماغ شاعر ہونیکی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اُن کا کلام محل اور موقع کے مناسب ہوتا ہے اسلئے سامع کے دل و دماغ پر اُسکا اثر ضرور پڑتا ہے۔ یہ صفت اکثر جدید رنگ کے شاعرون مین مفقود ہے اور اسی وجہ سے مخالفین نئی شاعری کو غلطی سے بالعموم بے اثر اور روکھی پھیکی کہنے لگتے ہین۔

حالی کے پہلو مین ایک ستم رسیدہ دل ہے اس لئے اُن کی زبان سے جو بات نکلتی ہے وہ عموماً سوز و گداز کی مجموعی کیفیات سے مملو ہوتی ہے۔ مرزا غالب، سر سید، اور حکیم محمود خان کے مرثئے اسکی کافی شہادت ہین۔ غالب کا مرثیہ مجروح نے بھی لکھا ہے لیکن حالی کو نہین پہنچے۔ حکیم محمود خان کے نوحہ کی تمہید مین دہلی کی بربادی اور تباہی کا حال کتنا عبرت خیز ہے۔

مولنا حالی کے فیضان قلم سے مذکور و اناث دونون کو فائدہ پہنچا ہے اور بعض خاص نظمین تو خالص طبقہ نسوان سے متعلق لکھی ہین مناجات بیوہ اس قبیل کی پہلی نظم ہے اور "چپ کی داد" غالباً سب سے آخری۔ مجھے وہ دن نہین بھولتا جب مین نے "چپ کی داد" خود مصنف کی زبان سے سُنی تھی۔ حضور نظام میر محبوب علی خان خلد مقام کی جوبلی چہل سالہ

کا جشن حیدرآباد مین عام طور پر منایا گیا تھا۔ مولنا حالی جو اس دولت ابد مدت کے قدیم متوسلین مین سے ہین مہاراجہ مدارالمہام کی دعوت پر وہان تشریف لائے تھے۔ "ینگ مِنس ڈیبیٹنگ فورم" کے اہتمام سے بھی ایک جلسہ قرار پایا تھا۔ مولوی عزیز مرزا مرحوم، مولوی مظفر علیخان، مولوی عبدالحق وغیرہم شریک تھے۔ مہاراجہ کشن پرشاد بہادر وزیر اعظم دولت آصفیہ صدر نشین تھے۔ مولنا حالی بھی حیدرآباد مین تھے اسلیے آپ سے بھی تشریف آوری کی درخواست کیگئی تھی۔ تازہ نظم لکھنے کا موقع نہین تھا۔ آپ نے جلسہ مین "چپ کی داد" سنائی تھی جلسے کی شہرت عام ہو چکی تھی۔ وقت مقررہ پر نواب میر فیاض علیخان کی پُر فضا کوٹھی حاضرین سے پر تھی۔ اِس ذوق و شوق کے باوجود اکثر احباب کا خیال تھا کہ عالم نسوان کے متعلق مولنا حالی اُن خیالات پر کیا اضافہ کر سکینگے جو دس پندرہ سال کی طول طویل مدت مین مولوی محب حسین نظم و نثر کے ذریعے سے ملک کے سامنے وہان پیش کر چکے تھے لیکن جس وقت مولنا نے اپنی متین اور موثر آواز مین پہلا ہی شعر پڑھا کہ ؎

اے ماؤ بہنو بیٹیو دنیا کی عزت تمسے ہے　　ملکونکی بستی ہو تمھین قومونکی عزت تمسے ہے

تو حاضرین کی چیرز نے زمین کو آسمان پر اٹھا لیا اور اسکے بعد تو خود رفتگی کا سا عالم تھا۔ مہاراجہ صدر نشین نے اپنی تقریر صدارت مین اس نظم پر دلی پسندیدگی کا اظہار کرکے یہ تمنا کی تھی کہ اسے کم از کم مملکت نظام کے مدارس نسوان کے نصاب مین داخل کیا جائے۔

اسمین کلام نہین کہ مولنا حالی کا کلام اگر انتخابی شکل مین کورس کی کتابون مین داخل کیا جائے تو بہت فائدہ مند ہوگا۔ پنجاب کی کتابونمین پہلے ہی ایسا کیا جاتا ہے لیکن ضرورت ہے کہ ہر حصہ ملک کی اُردو کتابین جو لڑکون یا لڑکیون کے لیے تالیف کیجائین اُنمین کلام حالی کو نمایان جگہ دیجائے۔

مولنا حالی اور اُن کے کلام کے متعلق تفصیلی بحث کی گنجائش یہان اِس سے زیادہ نہین نکل سکتی ورنہ ابھی دو ایک پہلوؤن پر روشنی ڈالنے کی ضرورت تھی۔ تاہم اُمید ہے کہ ان سطور سے ناظرین کو اُنکی شاعری کے متعلق ہمارے ذاتی خیالات کا اندازہ ہو جائیگا اور وہ خود بھی آخری فیصلے پر آسانی سے پہنچ سکین گے۔

حالی کا دم ہندوستان مین غنیمت ہے۔ اُنکی قومی خدمات اگرچہ زیادہ تر مسلمانون تک محدود ہین لیکن اُنکی شاعری ہندو، مسلمان، پارسی، عیسائی، سبھون کیلئے یکسان نتیجہ خیز ہے۔ اسکے علاوہ ہندوستان کی مختلف اقوام کے درمیان میل جول اور محبت آمیز روابط قائم کرانے کے وہ ہمیشہ حامی رہے ہین۔ یہ راز اصحاب ہنود سے بھی چھپا ہوا نہین ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام کے قدر دان مسلمانون سے قطع نظر اور لوگ بھی کثرت سے ہین اور خیالات و جذبات مین جیسے جیسے اصلاح ہوتی جائیگی اسیطرح کلام حالی کی ہر دلعزیزی کا حلقہ وسیع ہوتا جائیگا۔

کم از کم تعلیم یافتہ مسلمانون مین اُنھین "قومی شاعر" کا پوزیشن ضرور حاصل ہے اور اُنکی یہ حیثیت اسلامی جماعتون مین عام طور پر بلا اختلاف عقائد تسلیم کیجاتی ہے۔ اب اُن کے مخالفون کا بھی وہ زور نہین رہا اور اُن کی شہرت ہندوستان سے گذر کر یورپ تک جا پہنچی ہے۔ انگلینڈ مین اُنکی رباعیات کا ترجمہ انگریزی مین چند سال پیشتر ہو چکا ہے۔ گویا وہان والون پر ثابت ہو گیا ہے کہ ہندوستانی دماغ بھی انسانی زندگی کی رمز شناسی اور نیچر کی زبردست طاقت سے استفادہ حاصل کرنے کا کم و بیش ملکہ رکھتے ہین۔

حالی کا سب سے بڑا وصف بقول ایک نکتہ رس نقاد کے یہ ہے کہ اُن کا کام اور کلام ایک ہے۔ حقیقت مین قول و فعل کی جو دلپسند مطابقت مولنا حالی کی ذات بابرکات مین ہے وہ کسی اور مین نہوگی۔ آجکل ہندوستان مین ایسے ہی شاعرونکی ضرورت ہے۔ ہمین میر و سودا

یا امیر و داغ کی عظمت سے انکار نہین بلکہ بہت سی باتوں مین ہم اُنھین حالی سے بہتر سمجھتے ہین لیکن زمانۂ جدید کی تمدنی و معاشرتی اور ادبی ضروریات کا جنکی تکمیل پر ابقاءِ قومی کا انحصار ہے تقاضا ہے کہ حالی ایسے شاعر پیدا ہون۔ ہم مخالفین کی تشفی کیلئے اُن تمام عیوب و نقائص کو تسلیم کرتے ہین جو وہ حالی کی "متشاعرانہ" سخن سنجی مین بتاتے ہین لیکن اس کے باوجود بھی ہم اُن کی شاعری کو فضول اور یاوہ گوئی نہین سمجھتے بلکہ برخلاف اسکے ہمارا عقیدہ ہے کہ اُن کی شاعری بہت کچھ مفید نتائج کا سبب ہے جس سے مسلمان بالخصوص متمتع ہوئے ہین۔ خود اُن کا یہ شعر اُن کے حسب حال ہے ؎

گو کہ حالی اگلے اُستادون کے آگے ہیچ ہے
کاش ہوتے ملک مین ایسے ہی اب دو چار ہیچ

سید محمد فاروق

اساتذۂ اُردو کی فارسی شاعری

زبان اُردو کی ترکیب امتزاجی پر جسنے غور کیا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ زبان جو اسوقت انڈیا کی لنگوا فرینکا ہے کن کن عنصرون سے مرکب ہوئی ہے اور ایشیا و یورپ بلکہ افریقہ تک کی زبانین کسطرح اسمین کم و بیش دخیل ہین۔ ہماری زبان کے اصل الاجزا کی طرف غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ہندی سرزمین مین فارسی تخم بویا گیا۔ اُسکا ثمرہ ہے "اُردو" اور پنجابی مرہٹی، گورکھی، بنگالی وغیرہ یہ پراکتین سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہین مین نے جو ہندی کا لفظ استعمال کیا ہے اِس سے مراد اُسوقت کی ہندوستانی بولی ہے جو اُس قطعہ ملک مین مستعمل تھی جہان اُردو نے جنم لیا ہے خواہ وہ برج بھاشا ہو اور خواہ سندھی اور مرہٹی۔

فارسی مین عربی سیلاب کچھ اسطرح اُمنڈ کر آیا کہ فارسی حروف تک بدل گئے۔ اسی لیے فردوسی کی زرین یادگار شاہنامہ سمجھا جاتا ہے جسمین بہت کم عربی الفاظ لائے گئے ہین۔ ابتو یہ شوق زمانہ نے سرد کر دیا ہے لیکن ہمارے بچپن کی بات ہے کہ اچھے فارسی دان اچھی فارسی اُسکو کہتے تھے جسمین عربیت کا حصہ کم اور بہت کم ہو اور بیدل جیسی کاہش و کاوش کرتے تھے یہ اُنھین کی وضع پرستی تک محدود تھی۔ اس مختصر سی تمہید سے غرض صرف اتنی ہے کہ اُردو زبان عربی کی کچھ بہت زیادہ بلاواسطہ ممنون نہین ہے اور اگر چند عربی غداق بزرگون سے اُردو نے ذرا نفع اُٹھایا ہے تو وہ شمار کے قابل نہین۔

یہ عجیب بات ہے کہ فارسی شاعری کی ابتداء خود رہین منت اسلام ہے لیکن خود فارسی شاعری پر بحیثیت شاعری عربی کا کوئی خاص اثر نہین ہے۔ عرب کی شاعری کی بنا سادگی جوش اور تقاضاء فطرت پر ہے لیکن فارسی شاعری کو اس حصہ سے کوئی بہرہ نہین ملا۔ بات یہ ہے کہ تمدن کی اعلیٰ ترقی معاشرت کی انتہائے معراج اور پھر آزادی و آزادروی کا فقدان فارسی شاعری کی جان ہے۔ ایسی حالت مین وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا چنانچہ خود عرب شاعری نے بھی دوسری صدی مین یہی رنگ اختیار کر لیا اور آورد کے ساتھ آمد کا تبادلہ ہو گیا۔ شہادت کیلیے آج بھی گھر گھر دیوان متنبی موجود ہے۔ عرب کی اصلی شاعری سے یہ اور انکے معاصر کتنے دور ہین یہ ایک ہی نگاہ مین معلوم ہو سکتا ہے۔

اُردو شاعر کو تکمیل شاعری کے لیے ضرورت تھی کہ وہ ہندی اور فارسی دونون سے علی وجہ الکمال واقف ہوتا کیونکہ دنیا مین صرف اُردو زبان ہی ایک ایسی زبان ہے جسکو شاعری کا امتحان

پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی

اُردو علم ادب نے ابتداء سے آجتک کئی چولے بدلے اور تغیرات کی مختلف منزلیں طے کین لیکن ماہران علم اللسان واقف ہین کہ اس قسم کی تبدیلیان ہر زبان کیلئے لابدی ہین البتہ فی زماننا اُردو کی ادبی دُنیا مین خیالات کے اعتبار سے جو خوشگوار انقلاب نمودار ہو رہا وہ بلحاظ اپنے مستقل فوائد کے قابل قدر چیز ہی حقیقت یہ ہی کہ برٹش گورنمنٹ کے زیر سایہ جہان ہمین اور بہت سی برکات سے متمتع ہونے کا موقع ملا ہے وہان ایک یہ بھی ہی کہ ہمارے خیالات وجذبات مغربی خیالات و جذبات سے متاثر ہو رہے ہین اور یہ مُلکی لٹریچر کے حق مین ایک مبارک فال ہے۔

بیشک اسکا فیصلہ وقت کرے گا کہ مغربی تاثیرات نے ہمارے علم ادب کو واقعی کوئی نفع پہنچایا ہی یا نہین لیکن ارباب نظر موجودہ واقعات سے آئندہ نتائج کے اخذ کرنے سے قاصر نہین اور اُن کا خیال ہی اور اُسکی صحت کے کئی قابل قبول ثبوت بھی موجود ہین کہ مغربی لٹریچر کا اثر اُردو ادب کیلئے بہر نوع منفعت بخش ثابت ہوگا۔

یہ ادبی انقلاب جسکی طرف ہم اُوپر اشارہ کر چکے ہین حقیقت مین اُس وقت سے شروع ہوا ہی جب سے ہمین انگریزی تعلیم کی بدولت مغربی خیالات پر عبور کرنیکی قدرت حاصل ہوئی ہی لیکن اُسکی اصلی بنا اُسی وقت پڑ چکی تھی جب کلکتہ مین فورٹ ولیم کالج کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ اور اُن کی پُرجوش جماعت نے اول اول اُردو کے خزانہ کو جن جن گرانمایہ جواہر سے لبریز کیا ہی اُسکی شکریہ آمیز یاد بھی خاہان ملک کے دلون سے کبھی محو نہین ہو سکتی آج بھی ہمارے ملک مین جو اور جسقدر علمی تحرکین قوت سے فعل مین آرہی ہین وہ سب کی سب ڈاکٹر صاحب موصوف کے مقرر کردہ معیار پر چلائی جاتی ہین۔ فروعات مین اگر کوئی اختلاف ہو تو وہ چندان قابل وقعت نہین۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کی مساعی جمیلہ اور اُن کے کارآمد

نتائج کا اعتراف کرینگے باوجودیہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ اُن کے اہتمام سے جسقدر بھی کتابین نکلین وہ بجائے خود خوبیون کا مجموعہ ہونگے سرتاپا مشرقی رنگ مین تھین اور مغربی خصوصیات سے وہ بالکل بے تعلق اور علیحدہ تھین اور شاید یہی سبب ہے کہ اس زمانے مین جبکہ خیالات کی رَو ایک دوسرے جانب کو جا رہی ہے "طوطا کہانی" "باغ و بہار" "بیتال پچیسی" کے صفحات ہمارے لیے مستقل دلچسپی اور دلبستگی سے قطعاً خالی نظر آتے ہین۔

علم ادب اُردو کی شاندار شہ نشین مین جس نئے ستون کی کمی تھی وہ دراصل پنجاب کے نامور ڈائرکٹر تعلیمات کرنل ہالرائڈ کے ہاتھون اضافہ ہوا۔ ہمارا مطلب اس سے یہ ہے کہ مغربی لٹریچر سے مشرقی طبائع کو مانوس کرنیکی اہم لیکن دشوار خدمت سب سے پہلے کرنل موصوف نے اپنے ذمہ لی ہے اور انصافاً کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے خزانۂ ادب مین جسقدر نئی نئی چیزین یورپ وغیرہ سے لاکر رکھی گئی ہین وہ سب اُنھین کے حُسن تدبیر کا نتیجہ ہے۔

یہ بات بھی اکثر دیکھی گئی ہے کہ ابتدا مین خواہ کوئی کام کتنا ہی مشکل کیون نہو لیکن اگر اُسکی تحریک جاری رہے تو باوجود خارجی اسباب کے مخالف و متضاد ہونیکے کچھ نہ کچھ آدمی ہاتھ بٹانے والے پیدا ہو جاتے ہین خصوصاً ایسی حالت مین کہ وہ کام سربسر اُنھین لوگون کے فائدہ کا ہو چنانچہ ہم دیکھتے ہین کہ کرنل ہالرائڈ کی تحریص و تشویق نے اُنکے گرد ایسے بہت سے آدمی جمع کر دیئے تھے جو پہلے پہل اُن کے مددگار تھے لیکن آخر کار وہ اُردو لٹریچر کے اول محسنون مین شمار ہونے لگے۔ اِین پروفیسر آزاد اور مولانا حالی خصوصیت سے قابل تذکرہ ہین۔

قاعدہ کی بات ہے کہ جبتک کسی تحریک کا آغاز نہین ہوتا اُسکی مخالفت اور موافقت ہونا یا اُسکی ترقی کے اسباب کا فراہم کرنا ایک غیر یقینی امر ہوتا ہے لیکن جب تحریک چل نکلتی ہے تو یہ باتین خود بخود پیدا ہو جاتی ہین۔ یہ بھی کچھ خدا ہی کیطرف سے ہوتا ہے کہ مفید اور نفع رسان کامون کے ہمدرد بسا اوقات اُس طبقے سے نکل کھڑے ہوتے ہین جن سے اسکی خواب مین بھی توقع نہین ہو سکتی۔ اِسی جگہ دیکھ لیجیے اُردو علم ادب مین جتنی نئی نئی چیزین آپ کو ملین گی وہ تقریباً سب کی سب ایسے لوگون کی محنت شاقہ کا ثمرہ ہونگی جنھین اپنی عمر کا معتدبہ حصہ قدیم تعلیم و تربیت کے نذر کرنے کے علاوہ یورپین علم ادب وغیرہ سے آگاہی حاصل کرنیکا موقع تک نہین ملا۔ مولانا آزاد، مولوی حالی، پروفیسر ذکاء اللہ، مولوی نذیر احمد، نواب محسن الملک انھین سے کون بزرگ کس کالج کے تعلیم یافتہ تھے اور کسے یورپ جا کر یا ہندوستان مین بیٹھکر مغربی خیالات پر عبور کرنیکی نوبت آئی تھی لیکن یہی لوگ ہین جنکے زورِ قلم نے اُردو ادب کی کایا پلٹ دی اور یہی وہ مبارک نفوس ہین جنکی زبردست مساعی کاوشون نے اُردو لٹریچر کی تاریخ مین ایک شاندار اور روشن باب کا اضافہ کیا ہے۔

بہرکیف اسے اتفاقی بات سمجھو یا کسی خاص سبب کا لازمی نتیجہ کرنل ہالرائڈ نے جو پودھا نصب کیا تھا اُسکے سینچنے والے بہت جلد کئی ایک پیدا ہو گئے اور گو ابھی تک اس پودھے مین پورے طور پر پھل نہین آئے لیکن کوئی یہ بھی نہین کہ سکتا کہ یہ خشک ہو جائیگا۔ سر سید، آزاد، حالی، مہدی علیخان، چراغ علی، شبلی، ذکاء اللہ، نذیر احمد سبھون نے اپنا پسینہ اس ہونہار نہال کی آبیاری مین صرف کیا اور اُسکی نشو و نما کا سامان بہم پہنچایا۔ مذہبی و علمی، ادبی، معاشرتی، تاریخی، سوانحی مضامین و کتب جو اِن حضرات کے قلم سے نکلے اس درخت کی مختلف شاخین سمجھی جا سکتی ہین۔ اِن مضامین پر ان بزرگان قوم نے جو کچھ لکھا خوب اور بہت خوب لکھا کہ اخلاف کے لیے اُنکی یہ کتابین نمونہ کا کام دیتی ہین لیکن ابھی ایک چیز کی کمی تھی یعنی جدید اُصول پر قصے اور فسانے لکھے جانے کی ضرورت تھی۔ گو یہ ضرورت ایک

حد تک مولننا نذیر احمد کی بعض کتابون از قسم مراۃ العروس وغیرہ سے پوری ہوگئی تھی لیکن انصاف یہ ہو کہ یہ کتب عورتون کیلئے لکھی گئی تھین اور اسلئے عمداً انمین بعض اُن اُصول سے احتراز کیا گیا تھا جو مغربی ناولون کے بنیادی پتھر تسلیم کیئے جاتے ہین۔

اس مسئلہ پر رائے زنی کرنا تحصیل حاصل ہوگا کہ اُردو مین قصّہ نگاری کا قدیم رنگ کیا تھا کیونکہ جو لوگ اُردو جاننے اور پڑھنے والے ہین ممکن نہین کہ اُنھون نے خود طلسم ہوشربا' بوستان خیال' یا فسانۂ عجائب کی بعید از خیال اور خلاف عقل وقیاس سرگذشتون کا مطالعہ کیا ہو یا کم از کم اُنکی حالت سے آگاہ نہون۔ اِن کتابون کے مصنفین کی جدت اور مضمون آفرینی مین کسکو شک ہو سکتا ہو لیکن اسکے باوجود کہنا پڑتا ہو کہ یہ فسانے اصلیت سے خالی تھے اور اسوجہ سے اُن سے وہ کام نکل سکا جو یورپ مین آج ناولون کے ذریعہ سے ہو رہا ہو۔ وہان ان ناولون اور قصّون سے اخلاقی' تمدنی' اور معاشرتی فوائد حاصل ہوتے اور ہورہے ہین اور ہمارے یہان اِن پُرانے افسانون سے صرف تفریح طبع مقصود سمجھی جاتی رہی ہو۔ اسی شوق نے جو زیادہ تر اُمرا اور حکمرانون کے دلون مین جاگزین تھا ہمارے یہان داستان گویون کی ایک خاص جماعت پیدا کردی تھی جسکے "باقیات الصالحات" آج بھی ہندوستان کی اسلامی دیسی ریاستون مین اپنے اسلاف کے کمال کا علمی ثبوت دینے کے لیے موجود ہین۔ لیکن اب ان باتون مین کوئی لطف نہ رہگیا تھا اور خیالات اور مذاق کے تغیرات کے ساتھ ضروری تھا کہ اِس صنف خاص مین بھی کچھ مسالہ اُن لوگون کی ضیافت طبع کی غرض سے مہیا کیا جاتا جن کا وجدان صحیح دیو' جن' بھوت' پریت کے دور از خیال اور غیر سبق آموز قصص مین کوئی دلچسپی نہین لے سکتا تھا۔ اِس اہم ضرورت کی تکمیل کا احساس سب سے پہلے پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی کو ہوا اور وہی اُردو کی جدید طرز کی فسانہ نگاری کے موجد ہین۔ ہم اوپر کسیقدر حیرت واستعجاب سے اس امر کا اظہار کرچکے ہین کہ اُردو زبان کے اولین مصلحین مین جتنے نام نظر آتے ہین وہ سب کے سب قدیم تعلیم وتربیت کے نمونے تھے۔ پنڈت رتن ناتھ بھی پُرانے زمانے کی یادگار تھے۔ انمین اتنی بات ضرور تھی کہ وہ انگریزی بھی جانتے تھے اور غالبًا مطالعہ کے زور سے اُسمین مہارت کامل پیدا کرلی تھی۔

یہ امر ابھی تک مابہ النزاع ہو کہ جدید فسانہ نگاری مین اولیت کا سہرا شرر کے سر ہو یا سرشار کے۔* قدردانان اُردو کے دو گروہ ہوگئے ہین ایک شرر کی فضیلت کا مدعی ہو دوسرا سرشار کی۔ ہمارے یہان اُصولی اور علمی بحثون مین بھی ذاتیات تک نوبت آجاتی ہو ورنہ اس قسم کے مسائل پر رائے زنی کرنا نہ صرف دلچسپی کا موجب ہوتا ہو بلکہ مفید بھی کیونکہ کسی زبان کی تاریخ اِن واقعات کے فیصلہ کُن تکملہ کے بغیر کسی طرح مکمل نہین کہی جاسکتی۔ بہرحال یہ بحث ایک عرصے تک جاری رہی اور دونون گروہ اپنے اپنے عقائد کی تائید عقلی ونقلی دلائل سے کرتے رہے ہم کو اسجگہ "سرشار وشرر کے قضیے کو از سرِنو تازہ کرنا منظور نہین لیکن ہماری ذاتی رائے اس باب مین یہ ہو کہ اگر مولننا حکیم برہم کی منطق کی رعایت سے یہ بھی فرض کرلیا جائے کہ "فسانۂ آزاد" جو سرشار کی شہرت علمی کی بنیاد ہو بعض اسباب سے جدید طرز کے ناولون کی فہرست مین جگہ پانے کا مستحق نہین تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ سرشار اُصولاً اُردو ناول نویسی کے موجد ضرور ہین۔ اس سے ہمارا منشاء یہ ہو کہ سرشار سب سے پہلے ہندوستانی فسانہ نگار ہین جنھون نے اُردو قصّون

---

* مولوی عبد الحلیم صاحب شرر خود سرشار کو مخاطب کرکے فرماتے ہین۔ مصرع

تم نے نئی نکالی فسانہ کی راہ واہ

اور یہ اس بات کا بین ثبوت ہو کہ جدید فسانہ نگاری مین اولیت کا سہرا سرشار کے سر ہے۔ (ایڈیٹر)

کو مافوق العادت واقعات سے لبریز کرنیکی جگہ اُنمین اصلیت کا رنگ پیدا کیا ہے۔

سرشار کی اولین تصنیف جس نے دُنیائے ادب مین اُنکی ناموری وعظمت کے جھنڈے گاڑ دیے ہین "فسانۂ آزاد" ہے۔ اُسکو اُردو قصص اور ناولون مین باعتبار مضمون کے وہی درجہ حاصل ہے جو انگریزی مین "ڈان کوکزاٹ" کو ہے۔ فسانہ کی شان نزول بھی یہی ہے کہ سرشار کے کسی دوست نے اس طرز کی کتاب تصنیف کرنیکی فرمائش کی تھی۔ سرشار نے مستقل کتاب مرتب کرنے کی جگہ پہلے جداگانہ مضمون کی حیثیت سے اسے اودھ اخبار مین چھپوانا شروع کیا اور جب اُنھین معلوم ہو گیا کہ پبلک کو اُس سے بے انتہا دلچسپی پیدا ہو گئی ہے تو اُسے کتابی شکل مین شائع کر دیا۔

"فسانۂ آزاد" مین جدید و قدیم رنگ کی آمیزش اس تناسب کے ساتھ کیگئی ہے کہ دونون مذاق کے لوگ اُسے پسند کرتے ہین۔ ہم اسجگہ فسانۂ آزاد کی خصوصیات کو نمبروار قلمبند کرنا چاہتے ہین:۔

۱۔ سب سے پہلی اور مفید ترین خصوصیت "فسانہ" کی یہ ہے کہ اُس مین جسقدر واقعات ہین وہ سب کے سب بلا استثنا، انسانی طاقتون سے تعلق رکھتے ہین۔ ہمارے پُرانے قصّون مین روحانی تصرفات کا منظر بہت دلکش الفاظ مین پیش کیا جاتا تھا لیکن یہی ایک بات ایسی تھی جو قصے کو صرف قصہ کی وقعت دلاتی تھی نہ اُس سے اخلاق و آداب پر کوئی اثر پڑتا تھا، نہ کوئی تاریخی یا تمدنی منافع مرتب ہوتے تھے، اور نہ کسی معاشرتی یا منزلی نتائج کا استنباط ہوتا تھا۔ کیونکہ جب پڑھنے والا یہ سمجھ لے کہ اس کتاب کا ہیرو محض روحانی طاقتون کی بدولت اپنی مشکلات سے عہدہ برآ یا اپنے مقاصد مین کامیاب ہوا تو اس سے اُسکی ہمت و جرأت و استقلال مین کوئی اضافہ نہین ہو سکتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مُہر سلیمانی یا الہ دین کے چراغ کا حاصل کرنا انسانی طاقت سے قطعاً خارج ہے۔ لیکن اگر اُسکی کامیابی اور مقصدوری خود انسانی کوششون کا نتیجہ ثابت کی جائے تو یقیناً اُس کے عزم اور ارادے بلند ہون گے اور وہ یہ خیال کرے گا کہ اس شخص کی طرح مین بھی اپنے دماغ اور ذہن سے کام لیکر مقصدور ہو سکتا ہون۔

۲۔ دوسری خصوصیت فسانہ کی یہ ہے کہ اسمین جسقدر باتین لکھی ہین وہ ایسی ہین کہ اُنکی اصلیت سے کسی کو انکار کی جرأت نہین ہو سکتی۔ کوئی منظر کوئی سین کوئی واقعہ ایسا نہین دکھایا گیا جسکی ہو بہو تصویر نہ کھینچدی ہو۔ مثال کے لیے "فسانۂ آزاد" کے ابتدائی صفحات دیکھیے جہان آزاد کتب وغیرہ کی سیر کرتے اور وہان کی کیفیت بامعان نظر دیکھتے پھرتے ہین۔ یہ حالات مطالعہ کیجیے تو ممکن نہین کہ وہی سمان آنکھون کے سامنے پھر نہ جائے۔

۳۔ ناول کی کئی قسمین ہین کسی مین کوئی تاریخی واقعہ درج ہوتا ہے، کسی مین رسم و رواج کی کیفیت دکھائی جاتی ہے، کوئی کسی خاص زمانے کی عام معاشرتی و تمدنی حالت کا آئینہ ہوتا ہے۔ فسانۂ آزاد اُس وقت کی لکھنؤ کی سوسائٹی کا دلچسپ ترین مرقع ہے۔ سرشار کی دو ایک اور تصانیف (سیر کہسار وغیرہ) اس خصوصیت کی مشترکہ طور پر حصہ دار ہین۔ سرشار لکھنؤ مین پیدا ہوئے۔ محمد شاہ کا زمانہ تھا اور یہ زمانہ عروج کا تھا۔ لیکن اسلامی سوسائٹی مین جہان تک اُسکا تعلق اودھ سے ہے دلفریب خوبیون کے ساتھ بعض قابل اصلاح عیوب بھی موجود تھے، اور تعجب معلوم ہوتا ہے کہ ان باریک باریک باتون کو جن پر اکثر خیال بھی نہین جاتا سرشار نے نہایت غور و خوض سے دیکھا اور جانچا۔ اُنھون نے کسی پر کوئی اعتراض نہین کیا، کسی قسم کا الزام نہین لگایا، لیکن محاسن کے ساتھ معایب کا ذکر اس انداز سے کر گئے ہین کہ نکتہ سنج طبائع اُن کا منشا فوراً دریافت کر لیتی ہین۔

۴۔ اُردو نثر مین بیگمات کی زبان خاص وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے اور اس امر خاص مین دہلی اور لکھنؤ والے دونون ہمنوا ہین کہ جس

محاورے کا ثبوت محلات کی گفتگو سے نہ ملے وہ قابل سند نہیں۔ یہ ایک جُداگانہ بحث ہے ورنہ ہم اسکے متعلق کچھ عرض کرتے۔ لیکن اسمین کلام نہین کہ بیگمات کی زبان کی نقل ہر شخص آسانی سے نہین اُتار سکتا۔ آجتک صرف دو چار آدمی ایسے گذرے ہین جنھون نے اس مین کمال کر دکھایا ہے اور انمین سرشار یقینی طور پر ممتاز ہین۔ اسکا ثبوت "فسانۂ آزاد" اور "سیر کہسار" کے صفحے صفحے سے ملتا ہے۔ وہی الفاظ، وہی محاورے، وہی لب ولہجہ، وہی انداز تقریر، وہی لوچدار باتین، وہی فصاحت، وہی لطافت گویا آپ اپنے کانون سے کسی خاتون کو گفتگو کرتے ہوئے سن رہے ہین۔

پردہ نشین مستورات کی زندگی مغرب کی نگاہون اور اُن لوگون کی نظرون مین جو اسلامی طرز معاشرت سے واقفیت نہین رکھتے ایک سربستہ راز بنی ہوئی ہے لیکن سرشار کے فسانۂ آزاد مین اسکے چہرے سے پردہ اُٹھا دیا گیا ہے۔ اور کم از کم لکھنؤ کی بیگمات کی سوسائٹی کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ صحیح اور بالکل صحیح ہے تعجب معلوم ہوتا ہے کہ جو کام ایک مسلمان اہل قلم عمدگی کے ساتھ نکرتا وہ سرشار نے کر کے اپنی واقفیت کا ثبوت دیا اگر یہ وصف اُسی شخص مین ہو سکتا ہے جسے اپنی آنکھو نسے محلات کی زندگی کا طور طریق دیکھنے کا موقع ملا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ سرشار کو ایسے مواقع خوش نصیبی سے ملے تھے۔ پڑوس مین مُسلمانون کے مکانات تھے۔ اُس زمانہ مین ہندو مسلمانون کے تعلقات بالکل برادرانہ تھے۔ سرشار کو اپنی عمر کے ابتدائی حصے مین ان گھرون مین جانے کا اکثر اتفاق ہوتا تھا اور یہی تجربہ اور مشاہدہ ہے جو اُن کی تصویر مین اصلیت کا رنگ پیدا کرنیوالا ہے مگر یہ ضرور ہے کہ اس مرقع مین بعض نقش و نگار خیالی اور فرضی ہین مثلاً حسن آرا اور سپہر آرا کی آزادانہ معاشرت اور ان کے ساتھ آزاد کے تعلقات کا اسدرجہ بے تکلف ہونا۔ یہ باتین بہت قبل از وقت ہین اسیطرح آزاد کو اُن کی محبوبہ کی جانب سے جنگ مین شریک ہو کر داد مردانگی دینے کی صلاح ایک ایسا فعل ہے کہ تاوقتیکہ عورتون کی تعلیم و تربیت باقاعدہ طریقے سے اُصولاً نہو وہ اس قسم کے جذبات کو کبھی اپنے دلمین جگہ نہین دیسکتین۔ تاہم تصویر کا یہ رُخ گویا ہے ان ت کا شاہد ہے کہ آزادی نسوان کی جو مساعی آجکل بعض اسلامی حلقون مین ہو رہی ہین اگر یہ کامیاب ہوئین تو تقریباً ایک صدی کے بعد مخدرات اسلام کی معاشرت منزلی یا جذبات اخلاقی مین جو تغیر ہوگا وہ غالباً اسی قبیل کا ہوگا۔

۵۔ زبان کی خوبیون کا ایک پہلو اور دکھانیکے بعد صرف اسقدر کہنا رہجاتا ہے کہ بیگمات کی گفتگو سے قطع نظر دوسری صورتون مین بھی فسانۂ آزاد کے مصنف نے اپنے اشخاص افسانہ کے طرز کلام کی نقل اُتارنے مین کمال کر دکھایا ہے۔ مُلّا اور واعظ سے افیونی اور سرائے کی بھٹیاری تک کی بول چال اس صفائی سے دکھائی گئی ہے کہ باید و شاید۔

۶۔ یہی مکالمون کا حال ہے۔ ناول نویس کے لیے یہ منزل بہت دُشوار گذار ہوتی ہے کیونکہ اُسے اپنا مافی الضمیر دوسرون کی زبان سے اسطرح ادا کرنا پڑتا ہے کہ سُننے والونکو یہ معلوم ہونے پائے کہ متکلم اور مخاطب کے درمیان کوئی توسل اور بھی ہے۔ سرشار اس وقت پر بھی بخوش اسلوبی غالب آئے ہین اور اُنھون نے اس راستے کو اسطرح طے کیا ہے کہ کسی جگہ تکان کے آثار نہین پائے جاتے۔

۷۔ سرشار کے فسانہ کے کیرکٹر بوتے ہوئے ہین اور یہ صفت بھی بہترین ناولون کا حصہ سمجھی جاتی ہے۔ آزاد اور خوجی پر اُن کا طبعی رنگ اتنا گہرا ہے کہ وہ جہان کہین اور جس جگہ بھی نظر آتے ہین دور سے شناخت ہو جاتے ہین

آزاد اور خوجی کی جو شہرت اب علمی و ادبی دُنیا مین پائی جاتی ہے اُسکی مثال الف لیلہ کے خاص خاص کیرکٹرون کے سوا اور کسی کو نصیب نہین ہوئی۔ یہ بھی سرشار کے باکمال ہونے اور اُنکی تصنیف کے قبولیت عامہ کا فخر حاصل کرنیکی ایک واضح دلیل ہے۔

۸۔ اسمین شک نہین کہ تاریخی ناول فن فسانہ نگاری کا بہترین عنصر سمجھا جاتا ہے لیکن بسا اوقات اُسمین صحیح اور مستند واقعات کے ساتھ

عشق و محبت کی سرگزشت کا فرضی پیوند لگایا جاتا ہے جس سے اصل کتاب پایۂ اعتبار سے ساقط ہو جاتی ہے۔ البتہ یہ نقص اُن ناولوں میں نہیں ہوتا جنمیں کسی خاص ملک، قوم، ملت، یا کسی خاص وقت کے مراسم اور رواج یا سوسائٹی کی عام حالت دکھائی جاتی ہے۔ اس قسم کی تصانیف ہر زمانہ میں دلچسپی کی چیز سمجھی جاتی ہیں کیونکہ اُن کے ذریعے سے سچے حالات بلا فرق معلوم ہونے کی وجہ سے آنیوالی نسلیں بھی اُن سے دلچسپی لے سکتی ہیں اور اسطرح کتاب کی عمر غیر محدود ہوتی ہے۔ سرشار کا فسانہ اور سیر کہسار اسی قسم کے ناول ہیں جنمیں اگر واقعات سب فرضی ہیں لیکن اُنھیں گرد و پیش کے جن حالات و واردات کے ساتھ منسلک کیا ہے اُن کے صحیح اور دلچسپ ہونے میں کلام نہیں جسطرح ہم ان کتابوں کے مطالعہ سے لکھنؤ کی قدیم سوسائٹی (جسکی کچھ جھلک اس زمانے میں بھی وہاں پائی جاتی ہے) کے متعلق آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔ اسیطرح آئندہ زمانے میں بھی اگر کسی کو یہ شوق ہوا تو اُس کیلئے معلومات کا بہترین ذریعہ فسانۂ آزاد یا اسی قسم کا اور لٹریچر ہوگا۔ اس نتیجہ پر پہنچنے کے بعد غالباً سب کو اعتراف ہوگا کہ "فسانہ" کا شمار جائز استحقاق کے ساتھ کم از کم اُردو کی اُن زندہ جاوید کتابوں میں ہونے کے لائق ہے جو اپنی مستقل دلبستگی اور دوامی مفاد کے سبب خاص و عام سے قبولیت کا سرٹیفکٹ لیکر مدت مدید تک رواج پذیر رہتی ہیں۔ اس قسم کی تصانیف مصنف کیلئے عموماً سرمایۂ ناز ہوتی ہیں اور اس لحاظ سے اگر سرشار کو فسانۂ آزاد پر فخر ہو تو کچھ نازیبا نہیں۔

اکثر معترضین کا خیال ہے کہ بہت سے محاسن کے ساتھ فسانۂ آزاد میں چند عیوب بھی ایسے موجود ہیں جو نظر انداز نہیں ہو سکتے مثلاً کتاب کی ضخامت اسقدر ہے کہ طوالت بعض مرتبہ مطالعہ کی دلچسپی کو کم کر دیتی ہے اسیطرح مضامین اور واقعات کا غیر مسلسل ہونا بھی اُصول تنقید کے لحاظ سے قابل اعتراض ہے۔ بعض اہل نظر فسانۂ آزاد کو جدید ناول نویسی کا نمونہ ہی نہیں سمجھتے۔ یہ باتیں ایک زمانہ تک معرض بحث میں رہ چکی ہیں اور یہاں اُن کا اعادہ تحصیل حاصل ہوگا۔

فسانۂ آزاد کے علاوہ سرشار کی اور تصانیف بھی ہیں لیکن درحقیقت اُن کا علمی امتیاز فسانۂ آزاد سے قائم ہوا ہے۔ تصنیفات مابعد میں سے سیر کہسار، جام سرشار اور کامنی خصوصیت سے قابل تذکرہ ہیں لیکن انمیں سے کوئی فسانہ کے رتبہ کی نہیں۔ سیر کہسار تک تو خیر لیکن اسکے بعد شاید ضرورتاً انھیں ایسی کتابیں لکھنا پڑیں جو عموماً "بھرتی" کے لقب سے یاد کیجاتی ہیں۔ پی کہاں، ہشو، بچھڑی ہوئی دُلھن وغیرہ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قلم برداشتہ لکھی گئی ہیں۔ اِن سے تفریح کے سوا اور کوئی فائدہ نہیں متصور ہو سکتا۔

ایک رائے سرشار کی کتابوں کے متعلق یہ بھی ہے کہ اُن کے تمام ناولوں میں فسانۂ آزاد سے لیکر "ہشو" اور "پی کہاں" تک ایک ہی قسم کی سوسائٹی کا رنگ دکھایا ہے اور ایک ہی طرح کے کیرکٹر پیش کئے گئے ہیں۔ یہ خیال بالکل صحیح ہے لیکن اسکی وجہ یہ تھی کہ جس معاشرت کی تصویر اُنھوں نے دکھائی ہے اُسکے اور صرف اُسی کے خط و خال سے وہ بخوبی واقف تھے۔ اگر دوسری راہ وہ اپنے لیے نکالتے تو شاید اُنھیں بھی اس قسم کے الزامات کا ہدف بننا پڑتا کہ

عرب میں دہقون کا کیا ذکر

یا

مغربی ہیروئین کی سیاہ اور جعد ار زلفیں کہاں۔

ہمارے خیال میں اگر سرشار تاریخی ناولوں کی طرف توجہ کرتے تو غالباً اپنی قابلیت سے اُسمیں بھی مرد میدان ثابت ہوتے لیکن یہ رنگ اُن کے طبعی مذاق کے بالکل مخالف تھا اور ابتداً اُنھیں اس دُشوار گذار گھاٹی کے طے کرنے میں ناقابل بیان مشکلات کا سامنا ہوتا اور اسپر غالب آنے کے بعد بھی یقیناً اُنھیں پبلک میں یہ رسوخ نہ حاصل ہوتا جو فسانۂ آزاد کی وجہ سے ہوا۔

کسی کتاب یا کسی مصنف کی تصانیف کی قدر و منزلت یہ دیکھنے سے بھی معلوم ہو سکتی ہے کہ اُس کتاب یا اُن کتابوں کی وجہ سے اُس زبان کے عام علم ادب پر کیا اثر پڑا۔ سرشار نے ناول نویسی کی جدید شاہراہ دکھا کر اُردو اہل قلم کا ایک معقول گروہ اُس پر چلنے کیلئے تیار کر دیا ہے اور اب جسقدر نئے ناول لکھے جاتے ہین وہ اُصولی طور پر سرشار کے نمونے پر ہوتے ہین۔ اُصول سے ہمارا یہ مطلب ہے کہ اگرچہ سین، پلاٹ، اور واقعات کی ترتیب کے لحاظ سے بعض جدید ناول فسانۂ آزاد سے افضل ثابت ہوئے ہین، لیکن فی الحقیقت یہ فسانۂ آزاد کے اتباع و تقلید سے اس لئے باہر نہین کہے جا سکتے کہ سب سے پہلے فسانۂ آزاد ہی نے جدید قصہ نویسی کا نمونہ پیش کر کے دکھایا تھا کہ قدیم و جدید افسانون مین ما بہ الامتیاز فرق کیا ہے اور فطرت انسانی کے کارنامے کس طرح آشکارا کرنا چاہئے۔ بہرحال اس سے انکار نہین کیا جا سکتا کہ سرشار کی تصنیفات نے اُردو کے فن افسانہ نویسی کو خاص تقویت پہنچائی ہے اور اسکا اعتراف تو اُن لوگون کو بھی ہے جو سرشار کو اُس عزت کا مستحق نہین سمجھتے جو اُنھین ملک نے دے رکھی ہے۔

جدید طرز کے افسانون کے ماسوا سرشار کی علمی خدمات کی تفصیل کچھ اور بھی ہے جسے ہم اختصار کے ساتھ اس جگہ قلم بند کرین گے۔ سب سے پہلے اُن کے مضامین مراسلۂ کشمیر اور اودھ پنچ وغیرہ مین نکلتے اور مقبولیت حاصل کرتے رہے۔ سنہ ۱۸۸۱ء مین اُنھون نے علم طبیعیات کی ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ کر کے شمس الضحیٰ نام رکھا۔ انگریزی اُنھون نے کننگ کالج لکھنؤ مین پڑھی تھی اور گو وہ کسی امتیازی ڈگری کے مالک نہ تھے لیکن ذاتی لیاقت اس پایہ کی تھی کہ شاید ہر قسم کا کام وہ انگریزی مین کر سکتے تھے۔ ایڈوکیٹ اور پاینیر مین اُن کے مضامین وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے تھے۔ مراسلات ڈفرنیہ کے نام سے اُنھون نے لارڈ ڈفرن کے خطوط کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ یہ خطوط مطالب کے اعتبار سے بہت دقیق ہین اور اسکا صاف و صحیح ترجمہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ سرشار کی قابلیت انگریزی دانی مین "فاضلانہ" ضرور تھی۔

عربی فارسی کی تعلیم اُسوقت شرفائے ہنود مین عام طور پر رائج تھی اور سرشار بھی ان دونون زبانون مین یدطولیٰ رکھتے تھے۔ چار برس کی عمر مین انکے باپ پنڈت بیج ناتھ کا انتقال ہو گیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شفیق باپ کا سایہ سر سے اُٹھ جانیکے باوصف تعلیم اُنکی باقاعدہ ہوئی۔ اسکا ثبوت اُن کے علمی مضامین سے بھی ملتا ہے۔

سنہ ۱۸۷۸ء مین منشی نولکشور نے اودھ اخبار کا انھین ایڈیٹر مقرر کیا۔ اِنکے زمانے مین جو شہرت اور ہردلعزیزی اس اخبار کو حاصل ہوئی، اُسکی نظیر اُسکی پچھلی اور مابعد کی زندگی مین نہین ملتی۔ خصوصاً جس زمانے مین فسانۂ آزاد باقساط اُسمین شائع ہوتا تھا اُسوقت اودھ اخبار کی مانگ بہت بڑھ گئی تھی اور شاید یہ پہلی کامیابی تھی جو کسی اُردو اخبار کے حصہ مین آئی۔

اودھ اخبار سے قطع تعلق ہو جانیکے بعد وہ اپنا خاص رسالہ "عسکر سرشار" نکالنے لگے جسمین یہ التزام رکھا گیا تھا کہ اُسکے ہر نمبر مین ایک مکمل ناول نکلتا تھا۔ "پی کہان"، "بچھڑی ہوئی دُلھن"، اور "گورِ غریبان" اسی مین نکلے تھے۔

سنہ ۱۸۹۵ء مین جب مین حیدرآباد گیا تو حضرت سرشار وہان پہلے سے موجود تھے۔ مولٰنا عرشی جو دربار آصفی کے نامور فارسی گو شاعر گذرے ہین اُن سے سرشار کے روابط بہت بڑھے ہوئے تھے اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ مجھے بھی عرشی صاحب کے توسط سے اُن کی خدمت مین نیاز حاصل کرنیکا موقع بارہا ملا۔ عجیب طباع اور بذلہ سنج آدمی تھے جبتک بیٹھے رہتے حاضرین کو اپنی دلچسپ باتون سے محظوظ کیا کرتے۔ ہزاکسلنسی مہاراجہ کشن پرشاد اُس زمانے مین وزیر افواج نظام تھے۔ اُن کے دولتکدہ پر حضرت سرشار رہتے تھے۔ مہاراجہ بہادر اُن پر بہت عنایت کرتے تھے۔ آخر دم تک سرشار پھر اُن سے جُدا نہوے۔ حیدرآباد مین بھی حضرت سرشار نے اپنے علمی مشاغل کا سلسلہ از سر نو جاری کر لیا تھا۔

حضور نظام مرحوم کی سالگرہ کی یادگار مین دبدبۂ آصفی اور محبوب الکلام نثر اور نظم کے پرچے مہاراجہ بہادر کی سرپرستی مین حضرت سرشار کے اہتمام سے شائع ہوتے تھے۔ بالخصوص دبدبۂ آصفی ان کے مضامین سے لبریز رہتا تھا لیکن اکثر مضامین دوسرون کے نام سے چھپتے تھے تاہم طرز تحریر سے یہ ثابت ہوجاتا تھا کہ اسکے مصنف حضرت سرشار ہی ہین۔

سرشار اسم بامسمیٰ سرشار تھے۔ آبِ آتشین سے اُنھین اس درجہ اُنس تھا کہ کسی وقت اُسکی کیفیت سے خالی نہوتے تھے۔ جہان کہین جاتے تو ملازم کے ساتھ ایک بوتل ضرور ہوتی۔ مینوشی کا شغل اُن کی خلوت و جلوت کا رفیق تھا۔ اس بے اعتدالی نے جہان ایک طرف اُنکے قوائے جسمانی کو صدمہ پہنچایا وہان دوسری طرف اُنکے آفتابِ کمال کو بھی گھن لگا دیا تھا۔ قاعدے کی بات ہو کہ انسان جسقدر عمر اور سن ہوتا ہو اُسیقدر اُسکا ہنر پختگی پاتا جاتا ہو لیکن سرشار کی جُداگانہ کیفیت تھی جیسے جیسے وہ بڑھتے گئے ویسے ویسے اُن کے جوہر فن کی جلا ماند پڑتی گئی اور اگر بسبب غائر نظر سے دیکھا جاے تو سبب قوی یہی ہوگا کہ اُنھون نے "بنت العنب" کو منھ لگا کر خود کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔

سرشار کا اصلی نام پنڈت رتن ناتھ در تھا لیکن وہ زیادہ تر اپنے تخلص سے مشہور ہین۔ اسکے باوجود بہت کم لوگون کو معلوم ہوگا کہ فن شعرگوئی مین بھی اُنھین مہارت تھی۔ بیشک وہ شاعر تھے اور کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے لیکن اُنکی علمی عظمت کی کفالت اُنکی دوسری تصانیف سے ہوتی ہو نہ کہ اُن کے چند متفرق اشعار یا دو ایک مختصر مثنوی اور نظمون سے جن کے کہین کہین کے اشعار اکثر لوگو نکو یاد ہین تحفۂ سرشار ایک مثنوی ہو لیکن اُس سے پختگی کلام اور رنگینی خیالات کا ثبوت کچھ زیادہ نہین ملتا۔ تاہم قیاس سے کہا جا سکتا ہو کہ اگر سرشار نے شعرگوئی کیطرف کچھ اور توجہ کی ہوتی تو وہ اپنے زمانے کے ایک اچھے شاعر ہوتے ایک شعر اُن کا یہ ہو۔ ناظرین مضمون کی نزاکت کا اندازہ کرین ؎

حال سب میری سخت جانی کا بارہا کہتی ہے مڑ کے خنجر سے

دو شعر اور دستیاب ہوئے ہین جو تبرک سمجھے جانے کے قابل ہین ؎

پینے پہ جب آتے ہین تو پھر بس نہین کرتے میخانے مین سنتے نہین سرشار کسی کی

سیاہ بخت و تیرہ روزگار ہم بھی ہین جوابِ زلفِ پریشان یار ہم بھی ہین

شاعری مین حضرتِ اسیر لکھنوی کے شاگرد تھے۔ لیکن اُنکے اشعار گواہ ہین کہ اُنھون نے صنائع و بدائع کی پابندی مین اپنے اُستاد کی پیروی نہین کی بلکہ صاف اور شُستہ زبان کو ترجیح دی ہو۔ تحفۂ سرشار کی تمہید اسکے ثبوت مین پیش کیجا سکتی ہو جسمین کہتے ہین ؎

لندن کی بلا دو آتشہ مے آ پیرِ مغان کدھر چھپا ہے

دا تا پوا شراب اچھوتی خوشبو خوش رنگ تیز جو تھی

سرخوش شرابِ ناب لادے بوتل مُنھ سے مرے لگادے

بدمست ہون پی کے ایک چلو زاہد کو بنائین خوب اُلو

برسادے شراب ناب ساقی دکھلا دے آفتاب ساقی

فتوے کا شی کا کون مانے لاکھو نمین یون کھلے خزانے

رم جھم یہ برس رہا ہے پانی بے مے ہے حرام زندگانی

ساقی نامہ سرشار سے اچھا کون لکھ سکتا تھا جسکے گھر کی شراب لونڈی تھی۔ ظرافت کا مادہ اُن کی طبیعت مین کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اسکا رنگ اُن کی تمام تصانیف مین موجود ہو اور اوپر کا چو تھا شعر بھی اُنکی شوخ کلامی اور آزادمشی کا ثبوت ہو۔ مندرجۂ ذیل شعرونمین صبح صادق کی کیفیت کس دلکش پیرائے مین دکھائی ہے ؎

جھلکا جھلکا سپیدۂ صبح ہلکا ہلکا سپیدۂ صبح

تارے چھپتے ہین جھلملا کر ہے نور سا جلوہ گر فلک پر

بھینی بھینی مہک گلونکی اور نغمہ زنی وہ بلبلون کی

اے ساقی مہ لقا بدہ مے اے مردِ خدا بخواب تا کے

وقتِ سحر اور خنک ہوا ہو بے مے سب کر کرا مزا ہے

اِک چلّو کے دینے مین بہ تکرار — اُٹھو جاگو سحر ہوئی یار
مرغان چمن بہ نکہت رانی — جون برہمنان بید بخوانی
نوبت رنگت جما رہی ہے — شہنائی مزا دکھا رہی ہو

بعض مختص المقام تشبیہین اور استعارے نہایت پُر لطف ہین مثلاً طیور کی خوش الحانی کی مشابہت برہمنون کی وید خوانی سے کس قدر کیفیت خیز ہو اسیطرح "کاشی کا فتویٰ" جو کہین گذر چکا ہو نئی چیز ہو اور لطف سے خالی نہین۔ اگر ہندو شعرا اپنے مذہبی اور قومی خصوصیات کو اسیطرح اُردو تلمیحات و استعارات مین داخل کر سکین تو یقیناً عجیب دلپسند اضافہ ہوگا۔

اِسی مثنوی مین ہندوستان کی گزشتہ عظمت کا فوٹو اِن الفاظ مین پیش کیا ہو ؎

اَب ہند مین کیا رہا ہو بھائی — فریاد ہے ہندوؤ دُھائی
مصری اسی باغ کے تھے اِک گل — شاگرد تھے ہند کے جزو کل
اِک پھول اسی چراغ کے تھے — اِک بوند اسی ایاغ کے تھے
سقراط سے لیکے تا بہ لقمان — طفل مکتب تھے اہل یونان
آگے اسکے زمین سے تا مہ — سب کرتے تھے زانوئے ادب تہ
رامائن مین دکھائے وہ ڈھنگ — ہومر کا بھی جم سکا نہ کچھ رنگ
رنگت مٹن کی بھی ہو پھیکی — سُبحان اللہ والمیکی
کالیداس آن خدائے بنیش — سرمایۂ ناز آفرینش
جھنڈو بید کی مین بھی گر ہو تھے — یونانی جیب مین پڑے تھے
دعویٰ جس کو ہو جان مل کا — دیکھے وہ فلسفہ کپل کا

وہ علم وہ فضل اَب ڈبویا
جو کچھ سیکھا تھا اب وہ کھویا

غزلیات کہنے کے سرشار معمولاً عادی نہ تھے لیکن اکثر ان کے زمانۂ حیات مین انھین کے اہتمام سے بمقام حیدرآباد مہاراجہ شادی شاد کی ڈیوڑھی مین مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ سرشار خود تو کچھ نہ کہتے تھے لیکن مقامی شعرا کو اصرار کے ساتھ شرکت کے لیے مدعو کرتے تھے اور ان کی خاطر سے اکثر مشاہیر کو وہان جانا پڑتا تھا اور اسطرح مشاعرے نہایت رونق سے ہوا کرتے تھے۔

تاہم کچھ تو شاید اس وجہ سے کہ حیدرآباد مین اُنھین باوجود علمی مذاق کی کثرت کے اپنے ہم خیال نہ مل سکے اور کچھ اس وجہ سے کہ شراب خانہ خراب نے اُن کو زیادہ تر گوشہ نشینی کی زندگی پر مجبور کر دیا تھا اُن کے دم سے وہان وہ علمی چرچا نہ ہونے پایا جس کی اُمید سرشار ایسے مشہور نثار کی موجودگی سے بہر صورت ہو سکتی تھی۔ خود محبوب الکلام اور دبدبۂ آصفی جو ایک معنی مین اُن کے ذاتی رسالے تھے اُن کی عدم توجہی سے کچھ زیادہ ہر دلعزیز نہو سکے مضامین وغیرہ کے اعتبار سے بھی وہ بہت کم رُتبہ تھے البتہ کبھی کبھی کوئی مضمون ایسا نکل جاتا تھا جس کی طرز بیان کہ اُٹھتی تھی کہ یہ حضرت سرشار کی جودت طبع کا نمونہ ہے۔

حیدرآباد اُنھین موت کھینچکر لیگئی تھی اور وہ پھر وہین کے خاک کے پیوند ہوے۔ ۲۷ جنوری ۱۹۰۳ء کو حیدرآباد مین اس خبر نے حیرت و استعجاب کی ناقابل بیان کیفیت پیدا کر دی تھی کہ پنڈت رتن ناتھ سرشار مرگِ ناگہانی کے شکار ہوئے۔ چونکہ اس سے پہلے اُن کی علالت کا حال بھی کسی کو نہ معلوم ہوا تھا اس وجہ سے غیر متوقع انتقال سے سب کو سکتہ سا تھا۔ بہرکیف جس مٹی مین امیر و داغ کی ہڈیون کا پیوند ہونا مقدر ہو چکا تھا وہی سرشار ایسے اہل کمال کا بھی مدفن بنی ع

خدا بخشے بہت سی خوبیان تھین مرنے والے مین

سید محمد فاروق

میر تعشق لکھنوی

خواجہ آتش اور شیخ ناسخ کے کارنامے اُردو شاعری کی تاریخ مین ایک یادگاری خیر سمجھے جاتے ہین۔ اسلیے کہ انھین ذی حوصلہ نفوس کی بدولت لکھنو دہلی کی تقلید سے آزاد ہوا اور بجاے خود ایک مرکز بن گیا۔

اگرچہ یہ امر ابھی تک مابہ النزاع ہے کہ دہلی سے علیحدہ ہو کر لکھنو نے جو رنگ اختیار کیا وہ کس حد تک ادبی و علمی نقطۂ خیال سے فن سخن اُردو کے لیے مفید ثابت ہوا۔ تاہم اس واقعہ کے عظیم الشان ہونے مین شبہ نہین لیکن انصاف سے دیکھا جاے تو لکھنو کے مرثیہ گو شعرا نے جو کام کیا ہے وہ آتش و ناسخ کی خدمات سے کہین زیادہ مستحق ستایش ہے۔

اُردو شاعری مین مرثیہ گوئی کی گری ہوئی حالت کا اندازہ کچھ اس ضرب المثل سے ہو سکتا ہے جسکا استعمال انیس و دبیر وغیرہما کی مساعی جمیلہ کے بعد تقریباً ترک ہو گیا ہے۔ پیشتر "بگڑا شاعر مرثیہ گو" ہوا کرتا تھا لیکن مرثیہ گوئی اب ایک مستقل فن ہو گئی ہے اور کوئی شاعر جس مین خداداد ذہانت کے ساتھ ذاتی قابلیت بھی نہ ہو وہ مرثیہ گوئی کے تمام مراحل بہ خوش اسلوبی طے کرنے کی جرأت نہین کر سکتا۔ مختصر یہ ہے کہ لکھنو کے مرثیہ گویون نے نہ صرف اُردو شاعری کی شاخ مین ایک دلکش و دلفریب پھول کا اضافہ کیا ہے بلکہ اپنے وطن کے لیے بھی ایک مستقل اور پائدار ذریعہ شہرت پیدا کر دیا ہے۔ میر تعشق کا نام نامی ان اساتذہ کی فہرست مین نہایت جلی حرفون مین لکھا گیا ہے جنھون نے میر انیس اور مرزا دبیر کے لگاے ہوے پودھے کی آبیاری گویا اپنا فرض سمجھ رکھا تھا اور اس فرض کے ادا کرنے مین اُنھون نے اپنی بیش بہا عمر کا سب سے زیادہ حصہ صرف کر دیا۔

میر تعشق مرحوم کی مرثیہ گوئی کوئی پوشیدہ بات نہین ہے لیکن اکثر شیدائیان ادب کو غالباً اس سے آگاہی نہ ہوگی کہ انھین غزل گوئی مین بھی مہارت حاصل تھی۔ کارپردازان "معیار" کا خدا بھلا کرے کہ میر صاحب کی جستہ جستہ غزلیات کا ایک مختصر مجموعہ تیار کر کے شائقین کے مستفید ہونے کا سامان بہم پہنچا دیا ہے۔ ورنہ کوئی یہ بھی نہ جان سکتا تھا کہ تعشق نے سیکڑون مرثیون سلامون اور رباعیون کے علاوہ غزلین بھی کہی ہین جن کے مطالعہ سے یہ عقدہ حل ہو سکتا ہے کہ غزل گوئی کا میدان بھی انکا مارا ہوا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ان کی غزلیات اُن تمام محاسن کا مجموعہ نہون جو اس صنف کلام کی خصوصیات مین داخل سمجھی جاتی ہین لیکن اسکے باوجود بھی کسی کو انکی قادر الکلامی اور طباعی مین شک کرنے کی گنجائش نہین۔ اس مختصر مضمون مین سب سے پیشتر انکے حالات بالاختصار قلمبند کیے جاتے ہین اور اسکے بعد انکے کلام پر ایک سرسری تنقیدی نظر ڈالی جائیگی۔ اور اصل غزلیات کے اقتباسات باخبر ناظرین کو بجاے خود انکی شاعری کے متعلق راے قائم کرنے مین کافی سہولت پیدا کر دین گے۔

میر تعشق کا نام سید مرزا تھا اور سید صاحب کے نام سے بھی مشہور ہین

آپ کے والد محمد مرزا انس اساتذۂ لکھنو میں غیر معمولی وقعت رکھتے ہیں آپکے بھائی سید حسین مرزا عشق بھی جن کی روایات شاعری و مرثیہ گوئی کے علم بردار آجکل حضرت رشید ہیں مستغنی عن التعریف ہیں۔ یہ لوگ بجائے خود آفتاب تھے جو آسمان شعر و سخن پر اُفق لکھنو سے طلوع ہوے اور اُردو کی دنیائے ادب کو اپنے نورانی شعاع سے ایک عرصہ تک منور رکھا حضرت انس مرحوم کا شمار ناسخ مغفور کے رشتہ تلامذہ میں ہوتا ہے اور بجا ہوتا ہی۔ اسی طرح جناب عشق کی محققانہ قابلیت و اجتہادی لیاقت آجتک ضرب المثل بنی ہوئی ہی۔ غرض کہ میر تعشق اُس مشہور خاندان کے ایک ممتاز رکن تھے جس کے اسلاف نے دنیاے شاعری میں غیر معمولی کارہائے نمایاں کیے ہیں اور جس کے اخلاف کو اس وقت تک اپنے ذی رتبہ اجداد کا نام روشن رکھنے کا فخر حاصل ہی۔ صاحب خمخانۂ جاوید نے حضرت تعشق کو بھی جناب ناسخ کا تلمیذ رشید ہونا بیان کیا ہی لیکن اڈیٹر معیار جن کے ذرائع معلومات زیادہ تر مستند سمجھے جاسکتے ہیں دیوان تعشق کے دیباچہ میں اسکے متعلق کوئی حوالہ نہیں دیتے۔ تاہم تعشق کی عزت و شہرت کا کفیل خود انکا کمال ہو نہ کہ سلسلۂ تلمذ۔ اس لیے دیکھنے کی بات صرف یہ ہی کہ انکا کلام کیسا تھا نہ یہ کہ وہ شاگرد کس کے تھے۔ اگرچہ یہ دریافت بھی خالی از دلچسپی نہی کہ وہ کونسا چابکدست جوہری تھا جس نے اس در شاہوار کی آب و تاب اور جلا بڑھانے کی خدمت انجام دی۔

حضرت تعشق کے حالات زندگی اس درجہ کمیاب ہیں کہ اُن کے دیباچۂ دیوان میں بھی جس میں نسبتہً تفصیلی کوائف کا مکمل ہونا ضروری تھا، چند معمولی باتوں کے سوا کچھ نہیں لیکن غور سے کام لیا جاے تو یہ منکشف ہوتا ہی کہ حضرت تعشق ایک قناعت پسند اور گوشہ نشین بزرگ تھے۔ مذہبی رنگ اُن میں زیادہ تھا، شاید یہی سبب ہو کہ اُن کے تعلقات کے کسی سرکار دربار سے وابستہ ہونے کا ثبوت نہیں ملتا۔ ورنہ کم از کم لکھنؤ میں بہت سے لوگ اس وقت بھی چشمدید حالات بیان کر سکتے تھے۔ آپ کی عمر کا معتد بہ حصہ کربلاے معلّی میں بسر ہوا لیکن خمیر لکھنو کا تھا۔ بالآخر یہیں کی خاک میں پیوند ہوے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مرحوم کی اولاد معنوی آپ کے ضخیم و جسیم مجموعۂ مراثی ہیں جن سے آپ کا نام قیامت تک قائم رہے گا۔ مجموعۂ غزلیات بہت مختصر ہے۔ بیان کیا جاتا ہی کہ آپ کی غزلیات کا بیشتر حصہ تلف ہوگیا ہی۔ جسکی صحت کے تسلیم کرنے کے بعد اُردو زبان کی شوم بختی کا اعتراف کرنا پڑتا ہی۔ تاہم جو کچھ بھی موجود ہی وہ اسکا حق رکھتا ہی کہ اُردو کے ایک نامور شاعر کی یادگار کے طور پر وقعت و منزلت کی نظر سے دیکھا جاے۔

حضرت تعشق کا دیوان غزلیات جس کے وجود میں لانے کا شرف جناب آبر لکھنوی کے حصہ میں آیا ہی کم و بیش پینتالیس صفحات پر ہے جس میں سرورق اور دیباچہ کو بھی شامل سمجھنا چاہیے۔ ساحر صاحب کا یہ ارشاد قابل غور ہے:۔

آپکے کلام کا زیادہ حصہ مرثیہ، سلام، رباعی کا ہی۔ غزل گوئی کم کی تاہم جس قدر بھی حصہ غزلیات کا ہی وہ کمیاب نہیں بلکہ نایاب زمانہ ہی۔ حسن اتفاق اور اُردو ادب کی خوش قسمتی سے ایک مجموعہ آپ کے کلام کا دستیاب ہوگیا جس کو ملک میں پیش کرکے میں بجاے خود نازاں ہوں کہ اگر کوئی مجھسے اُردو کی خدمت ہو سکی ہی تو وہ یہی ہی کہ میں اُس کلام کو پردۂ خفا سے باہر لایا جس پر لکھنؤ کی اُردو شاعری کو فخر و ناز ہے

ایک دفعہ رسالۂ معیار میں جناب عزیز لکھنوی نے حضرت عشق کی غزل گوئی کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی تھی:۔

"یہی وہ شاعر ہے جسکو ہم تمام خوشگویان اہل دہلی کے مقابل میں تن تنہا پیش کرتے ہیں"

سطور بالا کے مطالعہ سے اندازہ ہو سکتا ہی کہ لکھنؤ کے علم دوست شعرا حضرت تعشق کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ ضرور نہیں کہ انکا

یہ خیال قطعی طور پر صحیح ہوتا ہم اس سے ایک حقیقت کا انکشاف یقینی ہوتا ہے جس مین مبالغہ کے ساتھ سچائی کو بھی تھوڑا بہت دخل ہے ۔

کلام تعشق پر ایک چھلتی ہوئی نظر ڈالنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ دو خصوصیتین اُسکا جزو لاینفک بنی ہوئی ہین ۔ اول پُرگوئی اور دوسرے پختہ مشقی ۔ شق اول کے متعلق صرف اسی قدر کہہ دینا کافی ہوگا کہ اُنکی بہت کم غزلین آٹھ ۔ دس شعر یا اس سے کم کی ہین ۔ ورنہ ساری غزلیات کافی طور پر طول ہین اور پھر لطف یہ ہے کہ اگر اُنکا مسیحی رنگ پیش نظر رکھا جائے تو ایک شعر بھی بھرتی کا نہین معلوم ہوتا بعض غزلون مین مقطع ندارد ہے لیکن اسکے باوجود بھی کسی غزل کی حیثیت اس قدر مختصر نہین کہ کوئی ستم ظریف غالب مرحوم کی طرح اُنھین بھی کم از کم مقطع کی عدم موجودگی کے سبب سے "صاحب دیوان" ہونے کی مشکلات سمجھائے ۔ اس سے ایک قیاس اور بھی ہوتا ہے کہ ممکن ہے یہ نامکمل غزلین زیادہ طویل ہون یا ان زمینون مین دو غزلہ یا سہ غزلہ بھی کہا گیا ہو ۔ اس "طول کلامی" سے اتنا فائدہ ضرور ہوا ہے کہ حتی الوسع دلپسند اور موزون قافیہ کوئی بچنے نہین پایا ۔ ورنہ ناتجربہ کار شاعر بہترین قافیہ اول تو نکال نہین سکتے اور اگر خوش قسمتی سے ایسا ہوتا بھی ہے تو برجستہ بندش نہونے کے سبب اُس مین کوئی لطف نہین پیدا ہوتا ۔

پختہ مشقی کے متعلق صرف اسی قدر کہنا کافی ہوگا کہ تعشق نے اپنے لیے جو رنگ پسند کیا اُس مین کسی قسم کی خامی نہین پائی جاتی ۔ یہ سوال کہ اُنکا یہ رنگ بالعموم مطبوع ہے یا نہین جداگانہ پہلو رکھتا ہے جسکا جواب ضمنی طور پر دوران تنقید مین خود بخود ادا ہو جائیگا ۔ تاہم اس مین شبہہ کی گنجائش نہین کہ لکھنؤ کے ایک خاص طبقہ مین اُنکا کلام نمایان منزلت رکھتا ہے جسکے بیشتر افراد آتش کے بعد شاعری کا سہرہ اُنکے سر دیکھنا چاہتے ہین ۔ اُنکے حسن عقیدت کا اس سے کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ "خوشگوئی" کو رکاب گنج کی لٹھی سمجھتے ہین ۔ رکاب گنج مین حضرت تعشق کا مکان تھا ۔

کلام تعشق کی خصوصیت عمومی جسپر ناظرین کی نگاہ سب سے پہلے پڑتی ہے ضایع و بدایع لفظی ہے یعنے اُنکے بیشتر اشعار لفظی تناسب و تشبیہات و استعارات کا گورکھ دھندا ہین ۔ اس سے سمجھنا چاہیے کہ ان کا فطرتی جوش طبیعت جو شاعری کے لیے آب حیات سے کم نہین ہوتا اس سے حقیقت مین جو کام لینا چاہیے تھا نہین لیا گیا بلکہ اُنھین لیکر کہین سے کہین پہنچگیا ۔ اسکی مثال بعینہ آب روان کی ہے کہ اگر اس سے اصولاً فائدہ اُٹھانا منظور ہو تو اُسکے لیے خاص تدابیر اختیار کرنا پڑتی ہین ورنہ وہ بالاختیار خود قابل کاشت زمین کو سیراب کر سکتا ہے اور بنجر کو بھی اور آخری صورت مین اس سے زیادہ کچھ حاصل نہین ہے تا کہ جا بجا خار دار جھاڑیان یا اسی قسم کے بے مصرف پودے عارضی طور پر نکل آتے ہین ۔ حاشا و کلا یہان تعشق پر کوئی ایراد و اعتراض مقصود نہین بلکہ جو کچھ کہا گیا ہے تمثیلاً کہا گیا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ چاہتے تو اپنی طبیعت کے زور سے اُس شاعری کے جوہر بھی اسی طرح دکھا سکتے تھے جو اپنی صفات معنوی ، درد ، تاثیر ، سوز و گداز کے اعتبار سے اہل دل کی نظر مین وقیع سمجھی جاتی ہے اور جسکے دلپذیر نظائر سے کلام تعشق بھی کلیۃً مبرا نہین کہا جا سکتا ۔ حضرت تعشق کا طبعی رنگ ان چند شعرون سے بخوبی آشکار ہو سکتا ہے ؎

سوئے دریا خندہ زن وہ یار جانی پھر گیا ۔۔۔ موتیون کی آبرو پر آج پانی پھر گیا
سوئیان سی کچھ دل وحشت مین چبھنے لگین ۔۔۔ ٹھیک ہونے کو لباس ارغوانی پھر گیا

راہ مین صاحب اکسیر کھڑے ہین مشتاق ۔۔۔ خاکساران در یار چلے آتے ہین

تری گرمیان جب کبھی یاد آئین ۔۔۔ دم سرد بھرنے لگا دم کسی کا

یہی مضامین اگر میر و غالب کے رنگ مین ادا کیے جاتے تو سننے والون کے

قلوب اثر پذیر ہوتے اور ضرور ہوتے۔ لیکن تعشق کے یہ اشعار سننے والون کا دل و دماغ کو اپنی باطنی خوبیون کے عوض ظاہری اور لفظی بھڑک پر متوجہ کرتے ہین۔ تعشق پر کچھ منحصر نہین کسی شاعر کا کلام ہو۔ اگر اُس مین یہ التزام کیا جائے کہ ایک مصرعہ مین لباس کا ذکر آئے تو دوسرے مین سوئیون کا تذکرہ ضرور ہو؛ "خاکساران دریا" کے "مشتاق" "صاحب اکسیر" ہی بنائے جائین؛ "گریبان" یاد آئے "تغیر" کسی کا "دم" "دم سرد" بنے اور علیٰ ہذا القیاس تو یقینی طور پر اُس سے زیادہ جذبات کی پامالی اور حسیات کی بے قدری کا افسوس ناک منظر کہین اور نہین مل سکتا۔

ایک بات یہ بھی ہو کہ جب شاعر کو اس رنگ مین بدرجۂ کمال غلو پیدا ہو جاتا ہو تو اپنے اس رنگ کو ہر ایک موقع پر قائم رکھنے کے لیے اُس کو بسا اوقات نہایت معمولی و متداول تشبیہون اور استعارون سے کام لینا پڑتا ہو۔ اسکی وضاحت کے لیے مندرجۂ ذیل اشعار کافی ہونگے؎

لکھا تھا خط مین اُنھین حال آہ سوزان کا   سنا ہے راہ مین بجلی گری کبوتر پر

مرغ وحشی کی طرح اُڑ کے گیا جانب دشت   حال خط مین جو رقم تھا تری سودائی کا

کمال خط مین رقم تھا جو شوق گردن کا   تمام رات رہی چاندنی کبوتر پر

کیا ہو تیغ نگہ سے کسی پری نے شہید   بجا ہے مہر سلیمان ہو اپنے محضر پر

جن الفاظ پر خط کھینچ دیا گیا ہے وہ ایک دوسرے کی مناسبت سے جبراً و قہراً شعر مین لائے گئے ہین گویا شاعر کے خیال مین اگر ایسا نہ ہوتا تو قانون شعری کے لحاظ سے قابل الزام ٹھہرنے کا خدشہ تھا۔ منصفی شرط ہو ان شعرون مین تاثیر جذبات یا سوز و گداز کا کوئی بھی پہلو نکلتا ہے۔ اس قسم کے پا اُفتادہ مضامین اور بے لطف تشبیہات کسی جدت کے لیے سرمایۂ نازش ہو سکتی ہین لیکن تعشق ایسے جدید سخنگو اجن کی مرثیہ گوئی کا مرتبہ ادبی و علمی اعتبار سے نہایت ارفع ہے اُن کی منزلت و وقعت مین کوئی اضافہ نہین کر سکتین۔ ممکن ہو کہ مخصوص طبایع اس قسم کے تلازمہ کو دلچسپی کی نگاہ سے دیکھین لیکن فن سخن کے ماہرین جانتے ہین کہ مکاکات شاعری کو ان سے کوئی تعلق نہین۔ شعر کی سب سے بڑی تعریف یہ ہے کہ سامع کو مجذوب بنادے۔ یا دوسرے الفاظ مین یون کہنا چاہیے کہ شعر وہی ہے جسکے مضامین و جذبات سے سامع مثل شاعر کے متاثر ہو لیکن جب شعر کا دارومدار محض چند الفاظ کی ظاہری نشست و برخاست ہو تو اُس مین لطائف معنوی کا نام کہان جس سے سننے والے کے دل پر کوئی مستقل اثر پڑ سکے۔ مندرجۂ ذیل اشعار اسی قبیل کے ہین؎

کہتے ہو قیامت کی ہوا بند ہوئی ہے   دم آج رُکا ہے مگر اے یار کسی کا

دیکھنا کیسی مبارک ہوگی صیادی تجھین   دام مین طائر جو آئیگا ہما ہو جائیگا

کیا کنوئین مجکو دکھائیگی مری آوارگی   چاہ میرے واسطے نقش پا ہو جائیگا

دل جل کے رہ گئے ذقن رشک ماہ پر   اُس قافلے کو پیاس نے مارا ہی کاہ پر

بخیہ جراحت دل نازک مزاج کا   موقوف ہے حضور کی تار نگاہ پر

دود غم سے جو تپان تھا وہ ملا دل مجکو   اس لیے دفن کیا ہو لب ساحل مجکو

بالکل معمولی مضامین ہین جن مین جذبات و ذوقیات کا پتہ نہین۔ انکو پڑھکر کسی کا دل کیا خوش ہوگا۔ تاہم اس سے یہ نتیجہ نکالنا بحث غلطی ہوگی کہ تعشق کا دیوان اسی قسم کے اشعار کا مجموعہ ہو؛ نہین بلکہ اُسے ایک دوکان سمجھنا چاہیے جس مین "پھیکے پکوان" کے علاوہ طبقۂ خواص کے کام و زبان کے لذت یاب ہونے کا سامان بھی موجود ہے مثلاً مندرجۂ ذیل اشعار جن مین لکھنو کا رنگ غالب ہے بہ جستگی و تازگی مضامین کے لحاظ سے قابل داد ہین۔ کہتے ہین؎

شب کو گیا باغ مین جلوے تمھارے ہو گئے   چاندنی کے پھول جو ٹوٹے ستارے ہو گئے

برق موجیں بن گئیں موتی شرارے ہو گئے — دل جلے جب غرقِ دریا میں تمہارے ہو گئے
رات کو تیرا مجھے دھوکا ہوا اے ماہ رو — بیخودی میں جا بجا کیا کیا اشارے ہو گئے

ذیل کا اقتباس بھی اسی نوعیت کا ہے ؎

باغ میں پھولوں کو ڈر آئی سواری آپکی — کس قدر ممنون ہے بادِ بہاری آپ کی
بیوفائی آپ کی غفلت شعاری آپکی — میرے دل نے عادتیں سیکھی ہیں ساری آپ کی
سیکڑوں ہیں ٹوٹے جاتے ہیں ہم اُڑ اُڑ کے جام — مفسدہ پرداز ہے چشمِ خماری آپ کی

اسی طرح جب نظرِ غائر سے دیکھا جائے تو اکثر غزلوں میں درد اور سوز و گداز کی تصویریں بھی دیکھنے میں آ جاتی ہیں۔ مثلاً یہ اشعار واقعی موثر ہیں ؎

بھرے ہیں آنکھوں میں آنسو اداس بیٹھے ہو — یہ کس غریب کی تربت کے پاس بیٹھے ہو
بیان شمع ہے ہم خاک ہوں گے پروانو — یہ حال دیکھنے کو آس پاس بیٹھے ہو
قفس میں بھی ہے اسیر و تمہیں وہی سودا — لگائے فصلِ بہاری کی آس بیٹھے ہو

اس غزل میں یہ شعر بیت الغزل کی حیثیت رکھتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

مجھی کو ناز سے دیکھا جلا جو پروانہ — تم ایک بزم میں مردم شناس بیٹھے ہو

معنی آفرینی اسکا نام ہے اور طرز ادا نے اور جان ڈالدی ہے۔ سبحان اللہ مرحبا!

جذبۂ تاثیر کے لحاظ سے یہ اشعار بھی لائق توصیف ہیں ؎

کچھ نہ کچھ گورِ غریباں پر بھی ساماں ہو گیا — چاند تارے چرخ سے ٹوٹے چراغاں ہو گیا

دل پر مردہ خلد میں جاکر کیا ہو جائیگا — ہم جہاں ہوں گے وہ گھر ماتم سرا ہو جائیگا
خبر کسی کو ضعیفوں کے قتل کی نہ ہوئی — ہم ایک قطرۂ خون تھے زبانِ خنجر پر

ذیل کے اشعار ایک غزل سے لیے گئے ہیں۔ پہلے دونوں شعروں میں حسرت و یاس کا رنگ بہت اچھا دیا گیا ہے۔ تیسرے شعر میں انداز بیان بہت عجیب ہے۔ چوتھا شعر جدت یا معنی آفرینی کے اعتبار سے نہ سہی لیکن حیثیت مجموعی اچھا ہوا اور ایک سچے واقعہ کی حقیقت کا اس سے انکشاف ہوتا ہے ؎

یادِ غم دل سے کبھی جاتی نہیں — اب تو بھولے سے ہنسی آتی نہیں
کچھ خبر ملتی نہیں دل کی مجھے — آج نالوں کی صدا آتی نہیں
قبر میں رکھکر مجھے کہنے لگے — کیوں؟ طبیعت اب تو گھبراتی نہیں
بے ترے رہتی ہے الجھن رات بھر — کروٹیں لیتے ہیں نیند آتی نہیں

ایک غزل ہے ؎

اس چمن میں کیوں کوئی حاجت پیدا کروں — مثلِ غنچہ دامنِ دل سے قبا پیدا کروں

اس میں بھی تین شعر نہایت پرکیفیت ہیں اور عجیب و غریب انداز میں کہے گئے ہیں ؎

موجِ دریائے بلا کی چاہیے کشتی مجھے — ہو جو بالکل ناموافق وہ ہوا پیدا کروں
مجھسے لاکھوں خاک کے پتلے بنا سکتا ہے تو — میں کہاں سے ایک تیرا ساخدا پیدا کروں
طائرِ بے آشیاں ایسا ہوں بجلی گر پڑے — ایک تنکے کا اگر میں آسرا پیدا کروں

تم دامنِ نظارہ سے دو خلعت آخر ۱ محتاج کفن کو ہے تن زار کسی کا

تلاشِ شبِ وصل میں پھر رہا ہوں ۲ مرا آپ دیوانہ پن دیکھتے ہیں

میں ابروں کے سامنے ہوں تارک الصلوٰۃ ۳ کس سے کہوں کہ لائق سجدہ جبیں نہیں

اب اگر تخفیف ہوتی ہے تو گھبراتا ہوں میں ۴ درد دل اتنے دنوں سے ہو کہ عادت ہو گئی

روئی شیریں جب کسی طائر کو دیکھا کوہ پر ۵ فرطِ الفت سے یہ جانا روح ہے فرہاد کی

(۱) دامنِ نظارہ کی ترکیب نہایت اچھوتی اور دلکش ہے۔ یہ مضمون بھی صاف و دلپسند ہے
(۲) اسمیں مصرع ثانی کا استفہام غایت درجہ لطیف و برجستہ ہے۔ مضمون میں بھی تازگی موجود ہے۔
(۳) اسکا مضمون نہایت بلند ہے۔ اس قماش کا کلام شاعروں کو بقائے دوام کا تمغہ بخشتا ہے۔ کاش اسکی مثالیں اور کثرت سے ہوتیں! نہایت وسیع و بلیغ مضمون ہے اور سجدہ نہ کرنے کی توجیہ کس درجہ معقول، بامعنی اور

دلنشین ہے گویا نیازمندی اور خاکساری کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔

(۴) اس شعر کا مضمون بالکل نیچرل اور مطابق قانون قدرت ہے۔ اسی مضمون کو حضرت غالب نے بھی کس خوبی سے فرمایا ہے ؎

رنج کا خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج　　مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آسان ہو گئیں

تعشق کا شعر بھی نہایت بلند پایہ ہے اور ادائے بیان میں ایک خاص قسم کی نزاکت موجود ہے۔

(۵) پانچویں شعر کا مضمون جدت کے لحاظ سے قابل تعریف ہے۔ طائر اور روح انسانی میں ایک خاص مماثلت ہے جس نے شاعر کے مطلب میں حیرت انگیز لطف پیدا کر دیا ہے۔

اس زمین میں ہماری آنکھیں، تمھاری آنکھیں، تعشق کی ایک مطول غزل ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ اس میں انھوں نے نہایت شگفتہ اشعار نکالے ہیں۔ ورنہ قدرتاً اس قسم کی طرحوں میں آورد کا رنگ زیادہ ہوتا ہے اور شاعر کو رعایت لفظی، بعید از قیاس تشبیہات وغیرہ سے کام لینا پڑتا ہے۔ تعشق کی اس غزل کا غالب حصہ صاف و شستہ اشعار سے مملو ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

جوش پر تھیں صفت ابر بہاری آنکھیں　　بہہ گئیں آنسوؤں کے ساتھ ہماری آنکھیں
دور سے دیکھ کے تم کو کوئی جی بھرتا ہے　　کر رہی ہیں فقط ایام گذاری آنکھیں
لطف دیکھا نہ کسی چیز کا اشکوں کے سوا　　آئی تھیں رونے کو دنیا میں ہماری آنکھیں
تم کو شرم آتی ہے ہم قابل نظارہ نہیں　　نہ رہا حسن تمھارا نہ ہماری آنکھیں
کور ہو جاؤں مگر عشق میں رونے کو نہ روک　　ناصحا دل سے زیادہ نہیں پیاری آنکھیں
فرش ہو جاتی ہیں تم پاؤں جہاں رکھتے ہو　　ادب آموز محبت ہیں ہماری آنکھیں
بعد مدت کے ذرا ہوش میں آیا ہوں میں آج　　پھر دکھا دے مجھے ساقی وہ خماری آنکھیں

ان دو شعروں کا انداز بھی دیکھئے ؎

سوز فرقت میں ذرا درد رہتا ہے　　کچھ کلیجے میں درد رہتا ہے
کہتے ہیں دل کی چوٹ کا ہو فسانہ　　منھ تعشق جو زرد رہتا ہے

یوں بھی چھوٹی بحروں میں انکے اشعار بیشتر صاف ہیں ہر ایک غزل میں دو ایک شعر نکل آتے ہیں جنکی بندش اور برجستگی بعض اوقات میر کے کلام کی یاد دلا جاتی ہے۔ اسکا اندازہ ذیل کے انتخاب سے بخوبی ہو گا ؎

چھوٹ جائیں ہم عذاب ہجر سے　　اب تو کوئی ایسی صورت کیجیے
دور جانا ہے کہ ہے قصد عدم　　مہرباں اب ہم کو رخصت کیجیے
لوگ کہتے ہیں مسیحا آپ کو　　کچھ علاج درد فرقت کیجیے
موت ہے غارتگری کی تاک میں　　جمع کیا اسباب راحت کیجیے

ہم ہیں سو حسرتیں ہیں اور دل ہے　　مہرباں دیکھنے کی محفل ہے
شب فرقت میں کوئی پاس نہیں　　ایک بس میں ہوں اک مرا دل ہے
زور سے آہ کر نہیں سکتا　　زخم دل میں وہ سخت مشکل ہے

نہ چونکے حضور آپ سوتے تھے غافل　　پکارا کیا رات بھر دل ہمارا
نہ تھی آس پھرنے کی جو آس کلی ہے　　گلے مل کے رخصت ہوا دل ہمارا

تلاش یار کا تھا دھیان کل تک　　ہمیں ہے اپنے دل کی جستجو آج
ہوا ترک محبت پر نہ راضی　　رہی تا دیر دل سے گفتگو آج
ترے در پر پڑے دم توڑتے ہیں　　نکلتی ہے ہماری آرزو آج

آخر میں تعشق مرحوم کی ایک غزل کے جو بہ حساب ترتیب دیوان کی آخری غزل ہے چند اشعار لکھکر اس مختصر مضمون کا بھی خاتمہ ہے ؎

خلخال اسکے پاؤں کی گر بنا ہیں گے　　طوق گلوئے فتنۂ محشر بنائیں گے
اپنا مزار متصل در بنائیں گے　　گھر بھی تمھارے گھر کے برابر بنائیں گے
کہتے ہیں وہ یہ سرمہ کا دنبالہ کھینچکر　　اس نیچے کو توڑ کے خنجر بنائیں گے
چھلا حضور ہاتھ کا دیدیجیے ہمیں　　دل کے جہاز کا اسے لنگر بنائیں گے
فرماتے ہیں مرے دل نازک کو توڑ کر　　دیکھیں تو شیشہ گر اسے کیونکر بنائیں گے

سید محمد فاروق (شاہپوری)

سیّد محمد مرتضیٰ بیاؔن یزؔدانی میرٹھی

زمانہ کسی وقت اور کسی دَور میں کاملین فن سے خالی نہیں رہتا۔ جس طرح اقطاب و ابدال کی نسبت بیان کیا جاتا ہو کہ یہ روحانی رہنما ہر زمانے میں موجود رہتے اور اپنے فیوض و برکات سے ایک عالم کو سیراب کیا کرتے ہیں اُسی طرح جسمانی دنیا بھی مقتدر اشخاص کے وجود پُر جود کے فیضان و بخشش سے کبھی محروم نہیں رہتی۔ یہ ضرور ہو کہ بعض اصحاب خلقی طور پر نام و نمود کی خواہش نہیں رکھتے اور اس وجہ سے اُنھیں عام طور پر رُوشناس ہونے کا موقع نہیں ملتا اور اکثر انقلاب عالم کی عبرت انگیز کیفیات سے اس درجہ متاثر ہوتے ہیں کہ اُنھیں ذاتی طور پر اپنے آپ کو پبلک کے سامنے لانے میں پس و پیش ہوتا ہی، اور اس طرح اُنکے کارنامے پردۂ خفا میں مستور رہ جاتے ہیں۔ انھیں لوگوں میں اُن اشخاص کا بھی شمار ہو سکتا ہو جو اپنی قابلیت و علمیت کے لحاظ سے ہر طرح قابل عزت ہوتے ہیں لیکن ناقدری اور نامرتبہ شناسی چونکہ عوام کی آنکھ پر پردہ بنکر پڑ جاتی ہو اس لیے وہ اُنکی صحیح پوزیشن کو معلوم نہیں کر سکتے۔

"گرے" نے جو انگلستان کے طبقۂ شعراء کا ایک ممتاز رکن ہونے کی حیثیت سے معرفی سے مستغنی ہو اپنے مشہور و معروف مرثیہ میں اسی مسئلہ پر کس قدر غائر نظر ڈالی ہو اور کتنی فلسفیانہ دقت پسندی کا ثبوت دیا ہو۔ وہ کہتا ہو کہ کتنے آبدار موتی سمندروں کی تہ میں اس طرح رہ جاتے ہیں کہ انسانی آنکھ تک اُن کی ضو بھی نہیں پہنچتی اور کتنے ہی خوشرنگ پھول ایسے جنگلوں میں کھلتے ہیں جنکی گوناگوں دلچسپیوں کا آدمیوں کو علم بھی نہیں ہوتا"۔ گویا وہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہو کہ جس طرح بہت سے قیمتی موتیوں اور دلفریب پھولوں کی رسائی انسان تک نہیں ہوتی اور وہ سمندروں اور جنگلوں میں پوشیدہ رہجاتے ہیں اسی طرح کتنے قابل دماغ ایسے ہونگے جن کے کارنامے بجائے خود سرمایۂ ناز اور کارآمد ہونے کے باوصف گمنامی کی حالت میں رہ جاتے ہیں اور اہل دنیا کو اُن سے مستفید ہونے اور تمتع حاصل کرنے کا موقع بھی نہیں ملتا۔ غور سے دیکھیے "گرے" نے گویا اُن بے نشان لیکن ذی احترام لوگوں کی اصلی صورت کھینچ کر دکھا دی ہو جنکی خدمات فاضلہ اور صفات عالیہ اُنھیں مشاہیر عالم میں نمایاں قوت دلانے کے لیے کافی تھیں لیکن استحقاق کے باوجود وہ شہرت نہ پا سکے، اور اُنکی ذہنی و دماغی کاوشوں کے نتائج دنیا پر آشکار نہ ہو سکے۔ سچ پوچھیے تو یہ اُنکی نہیں بلکہ ہماری بدنصیبی ہو کہ ہم اُنکے خرمن فضل و کمال کی خوشہ چینی سے بھی محروم رہے۔

ہر ملک، ہر قوم، ہر فرقے، اور ہر طبقے میں اس قسم کے گمنام لیکن اقبالمند لوگ گذر چکے ہیں اور اب بھی اگر کھوج کرو تو تمھیں بہت سے مل سکتے ہیں۔ ہندوستان اس وقت علوم و فنون کی کساد بازاری میں مشہور آفاق ہو اور اسلیے یہاں تحصیل کمال کی تشویق و تحریص کے اسباب بھی مفقود ہیں لیکن اگر کوشش سے تلاش کیا جائے تو یہاں اب بھی آپ کو ایک معقول تعداد ایسے بزرگ سیرت اصحاب کی مل سکتی ہو جو اپنے اوصاف کے لحاظ سے آنکھوں پر بٹھائے جانے کے قابل تھے یا ہیں لیکن کسی نہ کسی وجہ سے ہم اُنھیں جانتے تک نہیں گویا جس عالم گمنامی میں وہ پیدا ہوئے اُسی بیخبری میں وہ پیوند خاک ہو گئے یا ہو جائیں گے۔

اُردو شاعری کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالیے تو شعراء قطار در قطار نظر آئینگے۔ ناموں کی گنتی کرنا ہو تو اکثر تذکرے موجود ہیں۔ ان میں جہاں بہت سے مستحق اعزاز و تکریم نظر آئینگے وہاں بھرتی کے بھی ہوں گے۔ میرؔ و سوداؔ انشاؔ و مصحفیؔ، ناسخؔ و آتشؔ، اور غالبؔ و ذوقؔ بلاشبہہ ہمارے علم ادب کے قابل فخر محسنین میں ہیں اور انکے احسانات سے اُردو شاعری کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی لیکن ان محسنوں اور سرپرستوں کی تعداد یہیں پر نہیں ختم ہو جاتی بلکہ بہت سے ایسے بھی تھے جنھوں نے بمصداق

نیکی کُن و بدریا انداز

اُردو اور ادب اُردو کے لیے کیا کچھ نہیں کیا لیکن کسی سے داد طلب نہیں ہوے اور پبلک اُنکے کارناموں سے ناواقف رہگئی۔

حضرت بیاؔن ویزدانی اُردو شعراء کے اسی طبقہ میں شمار ہو سکتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ عوام ان سے ایک حد تک شناسائی کا فخر رکھتے ہیں تاہم اُن کی اجتہادی قابلیت و بےنظیر علمیت کے لحاظ سے اُنکا دائرۂ شہرت بالکل محدود رہا اور عام طور پر کسی کو اُنکے کلام کی عظمت، اُنکے ذاتی اوصاف، اور خاندانی حالات سے آگاہی نہیں۔ طبقۂ خواص میں گو اُنکے کلام کو بہت بڑی حد تک رسائی حاصل ہو لیکن وہ بھی اُنکی شناسائی مرتبہ نہیں رکھتے۔

حضرت بیاؔن اس زمانہ کے سربرآوردہ شعراء میں سے تھے جنکی علمیت اور نکتہ شناسی انصافاً اُنھیں بہت سے پیشرو مشاہیر سے ممتاز ثابت کرتی ہو۔ ایسے ذی علم لوگوں کا تذکرہ خالی از افادہ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ہم کسی قدر تفصیل سے اُن کے حالات قلمبند کرتے ہیں اور اسکے بعد اُن کے کلام پر اپنی ناچیز رائے کا اظہار کریں گے۔ ان سطور کے مطالعہ سے ناظرین قیاس کر سکتے ہیں کہ بیاؔن کا درجہ شاعری میں کیا ہو اور اُنھوں نے اپنے دل و دماغ سے کام لیکر اپنی فطرتی طباعی اور سخن سنجی کا کیسا کچھ ثبوت دیا ہے۔

سید محمد مرتضیٰ نام تھا۔ بیاؔن ویزدانی تخلص کرتے تھے۔ انکے والد سید گوہر علی کے آٹھ لڑکے تھے جنمیں سے ایک حضرت بیاؔن سے بڑے تھے اور باقی چھوٹے۔ ذاتی فضائل و اوصاف سے قطع نظر حضرت بیاؔن نسباً بھی بڑے آدمی تھے۔ انکا خاندان ساداتِ رضوی سے تھا اور مذہب شیعہ اثنا عشری تھا۔ اِن کے نانا سید عمرِ دراز علی جھانسی اور کالپی میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور اُنکے زمانۂ حیات تک بیاؔن اور اُنکی والدہ زیادہ تر اُنھیں کے پاس رہتے تھے۔

سید بیاؔن میرٹھ کے رہنے والے تھے لیکن اُنکے آبا و اجداد بجارچہ ضلع بلند شہر میں سکونت رکھتے تھے۔ سید بیاؔن کا ننھال میرٹھ کے قریب کسی موضع میں تھا اور انھیں تعلقات نے بالآخر میرٹھ کو اُنکا گھر بنا دیا۔

سید عمرِ دراز علی بیاؔن کے نانا نہایت اعزاز و امتیاز کے آدمی تھے جھانسی وغیرہ میں اب تک اُنکے مدّاح اور جاننے والے موجود ہیں۔ ایک مدت تک جھانسی میں ڈپٹی کلکٹری کی اور وہیں ۱۲۶۶ھ میں بیاؔن پیدا ہوے۔ چار سال کی عمر میں شفیق نانا کا سایہ اُٹھ گیا۔ لیکن دوراندیش باپ نے انکی تعلیم و تربیت کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیکر اُسے کما حقہ انجام تک پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

سید گوہر علی خود ایک قابل بزرگ تھے اور جیسا کہ پہلے زمانہ میں شریف خاندانوں کا عام دستور تھا وہ پڑھے لکھے تھے اور علوم مشرقی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ سید بیاؔن کی ابتدائی تعلیم اُنھوں نے خود کی اور جب تعلقات ملازمت کی وجہ سے وہ اس کام سے معذور ہوے تو مرزا باقر علی بیگ نے جو "میرٹھ میں فرقۂ شیعہ کے پیش نماز تھے" سید بیاؔن کی تعلیم کی تکمیل کرائی۔

مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے سید انشا کی تعلیم کا ذکر کرکے اُنکے ذاتی جوہر کو اِن الفاظ میں نمایاں کیا ہے:۔

باپ کے بے مثال دے سکتے ہیں کہ عزیز بیٹے کو اس خوبصورتی سے تعلیم کیا
مگر بیٹا جو جوہرِ ذاتی طبیعت اپنے ساتھ لایا تھا اُسکی کوئی مثال نہیں ہو۔

یہی کیفیت سید بیاؔن کی ہو۔ اُن میں خداداد قابلیت کا مادہ موجود تھا جو باپ اور اُستاد کی بزرگانہ اور شفقت آلود توجہات کے ساتھ سونے میں سہاگے کا کام کر گیا۔ اُنھیں کتب بینی کا شغف بے حد تھا اور اسکے ذریعے اُنھوں نے تجربے، مشاہدے، اور معلومات کے وہ تمام درجے بسہولت طے کر لیے جنپر عبور کرنا معمولی آدمی کے حیطۂ امکان سے باہر ہوتا ہو۔ اُنکی بلند نظری اور وسعتِ خیال کا ثبوت اُنکے کلام سے بھی ملتا ہو جسکے دیکھنے والے کو بہت جلد معلوم ہو جاتا ہو کہ شاعر کا دماغ گوناگوں جذبات و کمالات کا ایک بیش قیمت مخزن ہو۔

ذہنی قابلیت کے علاوہ سید بیاؔن کو حسنِ سیرت و حسنِ صورت مساوی طور پر مبدء فیاض سے عطا ہوے تھے۔ وہ نہایت خوشرو، وجیہ، خلیق،

انکسار اور ہمدردی کی صفات بھی اُن میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ طبیعت حساس بھی بلا کے تھے۔ ہر شخص سے اُسکے مذاق کے موافق گفتگو کرتے تھے۔

وہ بہت خوبصورت تھے اور رنگ گورا چٹا تھا۔ اسکے متعلق ایک دلچسپ واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ غدر کے زمانہ میں جبکہ امن و امان کا جنازہ ملک سے اُٹھ چکا تھا سید بیانؔ کو بعالمِ طفلی کہیں ایک مقام سے دوسرے مقام تک جانا پڑا اتفاق سے راستہ میں باغیوں کی ایک جماعت سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ اُن نامرادوں نے انھیں انگریز کا بچہ سمجھکر گرفتار کرلیا اور ڈیڑھ سو روپیہ لیکر چھوڑا۔

شروع جوانی میں اُنھیں ایک مرض لاحق ہوگیا تھا جسے دماغی عارضہ کہہ سکتے ہیں لیکن اُسکی ماہیت و نوعیت کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ مؤلف "خمخانۂ جاوید" کا خیال ہے کہ "اس عارضہ کو بظاہر وہم سے منسوب کیا جاسکتا ہے" اس باب میں جو حالات سید بیانؔ کے برادرِ عزیز سید حسین صاحب میرٹھی سے دستیاب ہوئے ہیں وہ بے کم و کاست درج کرتے ہیں۔ سید صاحب موصوف شہرت و قابلیت میں اپنے برادرِ معظم کے شریک و سہیم ہیں اور صوبجات متحدہ میں بعہدۂ تحصیلداری ممتاز ہیں۔ علمی رسالوں میں آپ کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں جن سے آپ کی مستعدی طبیعت کا بھی اندازہ ہوسکتا ہے۔ آپ رقمطراز ہیں:-

حالتِ مرض یہ تھی کہ قریب دو سیر وزن کی کپڑے کی گٹھری بناکر دماغ پر رکھے رہتے اور کہتے تھے کہ دماغ بغیر اسکے اُڑا جاتا ہے۔ تاریک کمرے میں شب و روز رہتے تھے۔ اُسکے دروازوں پر چقیں اور پردے پڑے رہتے کہ روشنی مطلق نہ آسکے۔ گھڑی کے چلنے اور چھالیہ کاٹنے کی آواز بھی اُنھیں ناقابلِ برداشت تکلیف دیتی تھی۔ نہایت خفیف شور سے بھی وہ سخت پریشان ہوجاتے تھے۔ اگر کسی ضرورت سے باہر نکلتے تو چھتری لگاکر۔ کہتے تھے کہ تاروں کی روشنی سے اذیت پہنچتی ہے اور کانٹے سے دماغ میں چبھتے ہیں۔ اس مرض میں وہ تمام عمر مبتلا رہے۔ البتہ چند سال کے بعد مرض میں وہ شدت نہ رہی تھی جو آغاز میں تھی۔ شور سے اب مطلق پریشان نہ ہوتے تھے۔ مکانِ تاریک کی نشست ترک کردی تھی۔ کپڑے کی گٹھری سر سے کندھوں پر اُتر آئی تھی۔

ان باتوں پر غور کرنے کے بعد سوائے اسکے کیا نتیجہ اخذ ہوسکتا ہے کہ انکا دماغ نہایت نازک واقع ہوا تھا لیکن اس کے باوجود بھی اُنکی دماغی کاوشیں بدستور جاری تھیں۔

سید بیانؔ کئی اعتبار سے واقعی شاعر تھے۔ شاعری اور جنون کا ایک درجہ رکھا گیا ہے۔ جس طرح عالمِ جنون میں انسان کو اور باتوں کا کوئی احساس نہیں ہوتا اسی طرح حقیقی شاعر کی توجہ بھی فروعات کی طرف نہیں جاتی۔ وہ اپنی دُھن میں مست رہتا ہے اور عالمِ خیال کی محویت اُسپر طاری رہتی ہے۔ اُسے قید علائق سے محفوظ رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تعلقاتِ نکاح چونکہ آدمی پر غیر معمولی ذمہ داری کا بار ڈالدیتے ہیں اور طرح طرح کے آلام اور تردّدات میں پھنسادیتے ہیں اس لیے انگلستان کے اکثر شعراء نے شادی نکرنا ہی اپنے لیے اچھا سمجھا تھا۔ ہماری ذاتی رائے میں مناکحت ہر انسان کے لیے ایک اخلاقی اور معاشرتی فرض ہے اور مذہب نے اسکی ضرورت و اہمیت جس طریقہ پر تسلیم کرائی ہے اُس سے بھی کسیکو انکار کی جرأت نہیں ہوسکتی باایںہمہ یہ ایک ناقابلِ برداشت بوجھ ہوتا ہے جسکے اُٹھانے کی اگر کسی میں طاقت نہ ہو تو وہ معذور سمجھا جاسکتا ہے۔ سید بیانؔ ذاتی طور پر دنیاوی علائق سے مستغنی واقع ہوئے تھے۔ وہ طبعاً آزادی پسند تھے۔ لباس، خورش، کسی چیز میں وہ تصنع و آرایش یا تکلف کے پابند نہ تھے۔ بے غل و غش زندگی بسر کرنا اور چمنِ سخن کی اپنے خونِ جگر سے آبیاری کرنا اُنکا نصب العین تھا۔ اسی لیے اُنھوں نے کوئی شادی نہیں کی اور باوجود اصرار کے "سنتِ پیغمبری" سے اپنے "گلو" کو بچائے رکھا۔

آزاد منشی کے ساتھ ظرافت میں بھی وہ یکتا تھے۔ مزاج میں استقلال بدرجۂ اتم موجود تھا۔ آخری دفعہ جب بیمار پڑے تو آثارِ موت ظاہر تھے۔ لیکن مستقل مزاجی کا عالم وہی تھا۔ بسترِ مرگ پر بھی خلقی ظرافت نے ساتھ نہ چھوڑا اور عزم و استقلال کے وہی دم خم تھے۔ مرنے سے پہلے ایک کارڈ اپنے عزیز بھائی کو لکھا تھا جسے اس مصرعہ پر ختم کیا تھا ع

بدلے مُردن من غم مخور بقای تو باد

آخر وہ وقت بھی آگیا جس سے کسی ذی روح ہستی کو چارہ نہیں بہ سنہ ۱۹۰۰ء کے موسم سرما میں سید بیان مرض الموت میں مبتلا ہوئے اور تقریباً دو مہینہ کی علالت کے بعد میرٹھ میں انتقال کیا۔ اِنّا لِلّٰہ وانا الیہ راجعون ؏

رہے گر کوئی تا قیامت سلامت
پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت

سید بیان کی شاعری پر نظر

حضرت بیان کی شاعری کا پایہ بہت ارفع و اعلیٰ ہے اور وہ اپنے فضائل و محاسنِ کمال کے وسیلہ سے اُس درجہ تک پہنچ گئے تھے جو معمولی شاعروں کے منتہائے نظر سے بھی اُدھر ہے۔ علمیت، دماغی قابلیت، طبع کی جولانی، فکر کی بلندی، خیالات کی نیرنگی، یہی باتیں ہوتی ہیں جو شاعر کے کلام کو مستند اور قابلِ قدر بنا دیتی ہیں اور انھیں اوصاف کی بدولت بیان نے بھی اپنی لافانی عظمت کا سامان مہیا کر لیا ہے۔

بیان کے کلام پر غائر نظر ڈالنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ ہر بیشہ کے شیر اور ہر میدان کے مرد تھے۔ پرگوئی کے ساتھ مضامین آفرینی کا پہلو عموماً نظر انداز ہو جاتا ہے لیکن بیان نے سب کچھ کہا ہے اور جو کچھ کہا ہے بہت زیادہ کہا ہے۔ افسوس ہے کہ اُن کا کلیات اب تک شائع نہیں ہوا اور نہ ہر شخص بجائے خود اندازہ کر سکتا کہ خیالات و جذبات پر انھیں کہاں تک قدرت حاصل تھی اور اُنکی سخن سنجی و نغز گوئی کن کن دلچسپیوں اور رنگینیوں کا دلفریب مجموعہ بنی ہوئی تھی ہمیں میر سید حسین صاحب کی مہربانی سے بیان کے مختلف صنائع سخن پر غلط انداز نظر ڈالنے کا موقع ملا ہے اور اُسکے دیکھنے کے بعد ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ موجودہ شاعرانِ اُردو میں تو کوئی ایسا نہیں جو اُنکی نظیر کے طور پر پیش کیا جا سکے بلکہ شعرائے اسلاف میں بھی اکثر سے بیان اگر بڑھ نہیں نکلے تو کم بھی نہیں رہے۔

بیان کے ایک پختہ کار سخن گو ہونے کی اس سے زیادہ قوی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ جس رنگ میں چاہتے تھے بے تکلف کہتے تھے۔ زبان پر اُنھیں خاصہ قابو تھا۔ وزن دار اور موزوں الفاظ گویا اُنکے سامنے ہر وقت ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے تھے۔ خیالات کی گوناگوں کیفیات کبھی میر کے رنگ میں نظر آئینگی کبھی غالب کے۔ کہیں ذوق کی متانت اپنی ہو بہو تصویر میں جلوہ گر ہو گی کہیں جرأت و داغ کی شوخیِ بیان کا لطف حاصل ہوگا۔ اس نیرنگی کے باوجود اُنکی خاص طبیعت کا رجحان مطالعہ کرنیوالے کے قلب پر خود بخود ظاہر ہو جاتا ہے اور یہ خصوصیت اُنکے ہر صنف کلام میں موجود ہے۔

بیان کی اُردو غزلیں بہت دھوم دھام کی ہیں اور اُنکی پرگوئی کی مثال مشاہیر میں وزیر لکھنوی کے سوا کسی اور میں مشکل مل سکتی ہے لیکن بیان نے موخر الذکر کی پیروی رعایات لفظی کے اعتبار سے کہیں نہیں کی۔ اور اگر کسی جگہ کی بھی ہے تو خوبی سے۔ نہ اس طرح کہ سامع کا خیال معانی و مطالب ہٹ کر الفاظ کی طرف چلا جائے۔

کئی کئی زمینوں میں سہ غزلہ اور چار غزلہ تک کہا ہے لیکن کہیں اور کسی پہلو سے بھرتی نہیں۔ شعر کے بعد شعر پڑھیے اور آمد کا لطف اٹھایئے۔ اُنکے کلام کا بعض حصہ ایسا ہے کہ اگر کوئی شخص سرسری نظر سے بھی دیکھے تو غالب کے اشعار کا دھوکا ہوتا ہے۔ وہی ترکیبیں، وہی الفاظ کی نشست، وہی خیالات کی پیچیدگی، وہی مضمون کی دقت۔

اصل یہ ہے کہ اس قسم کی ہمہ گیر طبیعت ہر کس و ناکس کے حصہ میں نہیں آتی جن سخن وران کامل کو قدرتی طور پر فضل و کمال کا یہ درجہ ملتا ہے وہ ماں کے پیٹ سے صاحب فن پیدا ہوتے ہیں اور لاریب کہ بیان بھی ایک فطری شاعر تھے اور انکے جوہر کمال کو اُنکے ذاتی علم و قابلیت نے اور جلا دی تھی۔ بچپنے ہی سے اُنھیں شعرگوئی کا شوق دامن گیر تھا اور اپنے والد کی ناراضی کے باوجود وہ فکر سخن میں منہمک رہتے تھے۔ ہمارے یہاں بالعموم مشاہیر کے حالات زندگی شرح و بسط سے منضبط کرنے کا طریقہ مروج نہیں ورنہ بیان کی شاعری کے مختلف مدارج پر غور کرنا خالی از دلچسپی نہ تھا۔ تاہم دو تین اشعار انکی

ابتدائی مشق کے جو ہم پہنچے ہیں اُنکے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہو کہ آغاز ہی سے اُنکی طبیعت کس قدر معنی یاب واقع ہوئی تھی۔ تقریباً پندرہ برس کی عمر کے یہ تین اشعار اُنکی یادگار ہیں ؎

گھبرا کے جہاں سے یہ تم کُش تہ گر جلے — اور در ہو ترا بند تو بتلا کہ کدھر جائے
بس بسکہ اندھیرا اُترا آنکھوں کے آگے — واں تک تو نظر آؤ جہاں تک کہ نظر جائے
رشک آئے جو غمخوار مرا حال : کستا — ہر جا نسکوں اتنک دیری خبر جائے

سخن فہم حضرات دیکھیں گے کہ دوسرا شعر کس قدر بلیغ ہو اور تیسرے شعر میں غالب کے رنگ کی جھلک موجود ہو۔ یہ صفت ہر شخص میں نہیں ہو سکتی اور پھر اس عمر میں اس پایہ کے شعر کہنا کوئی معمولی بات نہیں۔

بیاںؔ فنِ شعر میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ صاحب "خمخانۂ جاوید" نے انھیں سید احمد حسن فرقانی کا شاگردِ رشید لکھا ہو اور اسی تلمذ کے ساتھ وہ اکثر علمی حلقوں میں مشہور بھی ہیں لیکن فی الحقیقت اُنھوں نے زانوِ شاگردی کسی کے آگے تہ نہیں کیا۔ میر سید حسین صاحب برادرِ حضرت بیاںؔ سے اس بارے میں استصواب کیا گیا تھا اسکے جواب میں آپ لکھتے ہیں کہ

برادر مرحوم حقیقت میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ میر احمد حسین فرقانی اُن کے ماموں تھے۔ برادر مرحوم اُنکی تعظیم کرتے تھے اور اسلئے اُنکو اپنا اُستاد بھی کہتے تھے۔ ورنہ حقیقت میں اُنھوں نے اُنکو ایک شعر بھی بغرضِ اصلاح نہیں دکھلایا بلکہ بحیثیت شاعرانہ اُن میں اکثر مباحثہ بھی ہو جاتا تھا۔

درحقیقت جو صاحبِ کمال "الشعراء تلامیذ الرحمٰن" کے مصداق اپنی طبیعت میں خود جوہرِ فن رکھتے ہیں وہ دوسروں کے مشورہ سے عموماً مستغنی ہوتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہو کہ اُستاد کی نظرِ تربیت سونے کو اکسیر کر دیتی ہو اور شاگرد کے ذاتی اوصاف کو اور چمکا دیتی ہو۔ بیاںؔ اس سے محروم تھے لیکن اُنھوں نے اپنی زوردار طبیعت کی بدولت اپنے لیے خود ایک ایسی شاہراہ پیدا کر لی جہاں ذوقِ سلیم کے سوا اور کسی رہنما کی ضرورت نہیں ہوتی۔

بیاںؔ کا کلام اُنکے کمال کی دلیل ہو۔ اُنھوں نے جس طرح چاہا اپنی طبیعت کا رنگ دکھایا اور اسمیں شک نہیں کہ اُنکا ہر رنگ چوکھا ہی رہا۔ غالبؔ کے کلام کی ایک مابہ الامتیاز خصوصیت اُنکے خیالات کا اچھوتا پن ہو۔ معمولی سے معمولی بات کو وہ جدت کے ساتھ کہتے ہیں کہ سُنکر جی خوش ہو جاتا ہو۔ بیاںؔ بھی اس امر خاص میں غالبؔ کے پَے بہ پَے ہیں۔ مبتذل مضامین کو وہ ایسی شگفتگی سے باندھتے ہیں کہ سنکر لطف آ جاتا ہو۔ بعض جگہ محض ایک دو لفظ سے وہ شعر میں جان ڈالدیتے ہیں۔ ذیل میں دو چار شعر اسی نمونہ کے ملاحظہ ہوں ؎

اُٹھے زمیں سے لالۂ خونیں کفن کی طرح — محشر ہے ایک کھیت شہیدانِ یار کا
پینی گلے سے تیغ تو سودا نشہ و ہوا — یہ جونک خون چوس گئی جسمِ زار کا
لائے گھسیٹ کر ترے در سے شہید کو — دامن لہولہان ہے ، وزِ شمار کا
دامنِ دشتِ قیامت ہے اکا دکھی سی گلی — گل کھلائے غضب اے چاکِ گریباں تونے

خیالات کی جدت ان اشعار میں ملاحظہ ہو ؎

ترے چلنے سے سینۂ زمیں کے — اُٹھا اک درد محشر کے بہانے
ہمیں نے پنجۂ دستِ جنوں سے — کیے ہیں کوہ کی چوٹی میں شانے
کون آتا ہے قیامت کسے شرم آتی ہو — کہ مرا خون چھپایا تہِ داماں تونے

رفتارِ معشوق سے محشر برپا ہونا، دستِ جنوں سے کوہسار کے ٹکڑے اُڑانا، یا معشوق کا عرصۂ قیامت میں شرمسار آنا، اُردو شاعری کے متداول مضامین ہیں مگر بیاںؔ نے ہر مضمون کو جدت کے ساتھ نظم کیا ہو۔ رفتارِ یار سے زمین کے سینہ میں محشر کے بہانے درد اُٹھنا بالکل نیا خیال ہو۔ تیسرے شعر کے معنی بھی نہایت لطیف ہیں کہ خود قیامت نے معشوق کے محجوب ہونے کے خیال سے عاشق کے خون کو اپنے دامن میں چھپایا ہے۔

ذیل کے اشعار کس درجہ بلیغ واقع ہوے ہیں۔ ان کی داد اہلِ نظر خوب دیں گے ؎

کھولی آنکھ وقتِ نزع بیمارِ محبت نے — کیسا پردہ رکھتا تھا کوئی آنکھوں میں نہاں تھا
کس رشک مہر و ماہ کا آوارہ گرد ہوں — ہو آسماں لقب مرے مشتِ غبار کا

رکھا ہے پاؤں واں ترے مشتاقِ دید نے   ہے شمعِ طور نام جہاں خار خار کا

بے ٹھکانوں کو ڈھونڈھتا ہوں میں   کہ پتے ہیں ترے ٹھکانے کے

میرے نالوں سے کانپتی ہے برق   تنکوں میں تنکے ہیں آشیانے کے

ہر ایک شی میں پنہاں تیرا مقام نکلا   توڑا جو بت کدہ کو بیت الحرام نکلا

سو خر اللہ کر طرح میں بہ تبدیل قافیہ ایک غزل لکھی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ صفائی زبان اور سلاست بیان خصوصیت سے قابل غور ہے ؎

ڈھنگ بیڈھنگ ہیں زمانے کے   رنگ بیرنگ ہیں زمانے کے

موسے شکلیں نے باندھ لیں شکلیں   یہی سر بنگ ہیں زمانے کے

اک نیا رنگ روز لاتے ہیں   آپ ہمرنگ ہیں زمانے کے

واہ رے نقش! واہ رے نقاش!   آئینے دنگ ہیں زمانے کے

گردشِ آسمان فلاخن ہے   آدمی سنگ ہیں زمانے کے

تیسرے شعر کا مضمون کس قدر لطیف ہے اور آخری شعر میں گردش آسمان کو فلاخن سے اور انسان کو پتھر سے کتنی قریب الفہم اور معنی خیز تشبیہ دیگئی ہے۔

اِن اشعار پر بادی النظر میں غالب کا دھوکا ہوتا ہے ؎

سرِ شوریدہ پائے دشت پیما شامِ ہجراں تھا   کبھی گھر تھا بیاباں میں کبھی گھر میں بیاباں تھا

گئے تھے رونے دھونے بیٹھے ہیں تلووں کو   فرو رگ رگ میں نشتر تھے نہاں نس نس میں پیکاں تھا

انکا منجملہ اربابِ وفا ہو جانا   میرے نزدیک ہے بندے کا خدا ہو جانا

غمِ الفت گلوگیر نفس ہے پھیر دو خنجر   نہیں آسان ہو مشکل، ہمیں آسان مشکل ہے

مشکل ہے، قاتل ہے۔ اس زمین میں سید بیان نے چو غزلہ کہا ہے اور چاروں غزلیں بہت دھوم دھام سے لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک غزل جسکا ایک شعر یہ ہے بہت مشہور ہے اور اربابِ نشاط کی زبان پر چڑھی ہوئی ہے ؎

چلی آتی ہیں نذریں دھوم سے دربارِ قاتل ہے   کسی کا سر ہتھیلی پر کسی کے ہاتھ میں دل ہے

چاروں غزلیں مصنف کے اصلی رنگ طبیعت کا دل فریب نمونہ ہیں اور اسمیں شک نہیں کہ انکا ہر شعر دوسرے شعر سے بڑھا ہوا ہے۔ جو لوگ غزلوں میں تنگو لفظ و دیدہ مضمون کی تصویر دیکھنا چاہیں وہ ان اشعار کو ملاحظہ فرمائیں ؎

شہادت منزلِ مقصود ہے ملاح قاتل ہے   یم موجِ بیتابی دم شمشیر ساحل ہے

تگ و تازِ سمندِ جسم تا ایوانِ قاتل ہے   اُتر لے اے سرِ شوریدہ اب نزدیک منزل ہے

مزا پھرتا ہے ہونٹوں پر تلاشِ خونِ بسمل ہے   زباں بگڑی ہوئی ہے کیا چٹوری تیغِ قاتل ہے

وہ مجنوں ہوں وہ اسیر شاہدِ لیلیٰ شمائل ہے   زمیں جسکا بیاباں چرخ ناقہ عرش محمل ہے

وہ محفل محفلِ شادی ہے ہر سو رقصِ بسمل ہے   شہیدِ ناز ہے دولھا، دلھن شمشیرِ قاتل ہے

یہ شعر کس موثر انداز میں کہا گیا ہے ؎

قیامت کی نگاہِ یاس نے کیوں نیچا مارا   کہ قاتل نیم بسمل ہے دم شمشیر بسمل ہے

"شاہدِ لیلیٰ شمائل" کی تعریف اُوپر ایک مطلع میں گذر چکی ہے۔ اسی محمل کے قافیہ کو ایک مقطع میں پھر اُسی شان سے نظم کرتے ہیں ؎

مرا دل لے بیاں مجنوں ہے اُس لیلیٰ شمائل کا
غبارِ عالمِ ایجاد جس کی گردِ محمل ہے

ذیل کے شعر میں تکرار کتنی پُرلطف ہے اور مضمون بھی نہایت شگفتہ ہے ؎

وہ بیٹھا چشمِ تصور میں گلی ہے چشمِ شوق اُس سے   تماشا ہے کہ بیل قاتل بیٹھا ہے اور نیل میں قاتل ہے

وہ کہتے ہیں مرا پیکاں میں کہتا ہوں مرا ارماں   وہ کہتے ہیں مرا مسکن میں کہتا ہوں مرا دل ہے

"نگاہِ یاس" والا شعر نہایت پُراثر ہے۔ زار و نالی کے مضامین انکے کلام میں کم نظر آتے ہیں بااینہمہ جو کچھ کہا ہے خوب کہا ہے۔ یہ شعر کتنا حسرت آمیز ہے ؎

خدا ٹھنڈا رکھے اے شمع تجھکو   کھڑی روتی ہے بیکس کے سرہانے

اسی طرح ارمان کی "جوان مرگی" کا ماتم بہت پُردرد ہے ؎

عمر بھر قید رہا ہائے جوانمرگ ہوا   کچھ بھی دنیا میں نہ دیکھا مرے ارماں تو نے

اس غزل کا مطلع قابل دید ہے اور دنیائے فانی کی کیفیات کا آئینہ ہے کہتے ہیں ؎

کیا ہوا اُن کو ستارے تھے جو مہماں تو نے   کچھ بتایا نہ لبِ گورِ غریباں تو نے

ناظرین سخن فہم نے غور کیا ہوگا کہ بیان کس قسم کے شعر گو تھے اور انکا قدرتی رجحان کس طرف تھا۔ جدت پسندی کے باوجود انکے کلام کا حصہ ایسا بھی ہے جو سلاست اور سادہ گوئی کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً ؎

لو نپکا کسی کی آرزو سے | ہماری آرزو نپکی لہو سے
یہ نو نے گی ہوئے گل سے واعظ | مری توبہ کو کیا نسبت وضو سے

تماشہ اُٹھایا اثر بانے | چلے محشر کو ٹھی میں وبانے
نگاہیں قہر میں ڈوبی ہوئی ہیں | گلے تم زہر میں چھریاں بجھانے
مرے مجموعۂ خاطر یہ تو نے | کیا جو تیرے گیسو سے صبا نے

یہ بے شام فرقت یہ بے شام غربت | نہ ہوگی نہ ہوگی سحر دیکھ لینا
وہ پوشیدہ رکھتے ہیں اپنا تعلق | ادھر دیکھ لینا اُدھر دیکھ لینا

…ب مجھے کھو کے ندوڈ کر اگر روئیگی شمع | جان پڑ جائیگی کیا خاک میں پروانے کی
…جلوے ڈال دیا چشم تماشا پہ نقاب | یہ نئی وضع ہے ظالم ترے شرمانے کی

…گے بھی نقد امرزش کی محشر میں ضرورت ہو | شہنشاہا! کمی کیا ہو تری سرکار رحمت میں
…جاں پہ شور ہوئے دل پہ راہ گنج خوں تیں | کہیں ملا نجائے جنگ بنقاد ووقت میں

مضامین کی دھوم دھام اور الفاظ و ترکیب کی بلند پائگی کے اعتبار …ے جس شخص کی غزلیں بسا اوقات قصیدوں کا دھوکا دیتی ہوں اُسکے …قصیدہ کا کیا کہنا۔ ہمیں افسوس ہے کہ سید بیان کا کوئی اُردو قصیدہ ہمیں …دستیاب نہیں ہوا۔ اُنکے قصائد جہاں تک قیاس کیا جاسکتا ہے عموماً فارسی …میں ہیں۔ سید بیان اُردو کی طرح فارسی کے ایک نغزگو اور جیّد شاعر تھے۔ …اس میں یزدانی تخلص کرتے تھے۔ فارسی قصائد کے مطالعہ سے اندازہ …ہوسکتا ہے کہ وہ اس معرکہ میں بھی اپنے اچھوں سے نمبر لیگئے ہیں۔ اُصولاً …کے قصیدے خاقانی کے اور ادائے مطالب کے لحاظ سے انوری کے قصیدوں …کے ہم پلہ ہیں۔ منقبت حضرت علی کرم اللہ وجہہ میں ایک قصیدہ کہا ہے …جسکی تشبیب قابل دید ہے۔ فرماتے ہیں ؎

…تو شاکوکب ان گل کہ بگلزار رسید | نالہ شبگیر زد ولالہ بہ دیوار رسید
…سنبل پیچ پیچ چو شانہ آراست | کس صبا شانہ کش طرۂ طرار رسید
…اں گل اگر فرو بہانے دارد | خار راسر و قدے داں کہ ز رفتار رسید
…در سن چمن جلوۂ عطار گشود | پنبہ ساں غنچہ ازاں جلوۂ عطار رسید

سرو خضریست کہ پیرایۂ خضرا در بر | لب جو صورت عباس علمدار رسید
رنگ چوں آل محمد بہ ریا ہیں دادند | غلۂ سبز چو سادات باشمار رسید
از سمک تا بہ سمانیست وجودِ غلطے | گل ز گلزار و ز جو ماہیِ بے خار رسید

سرو کی تشبیہ حضرت عباس علمدار سے کس قدر لطیف و بامعنی ہے۔ اسی طرح آخری شعر میں خلش نہ ہونے کا ثبوت ماہی بیخار سے کتنا اچھا بہم پہنچایا ہے۔

میرٹھ میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا تھا۔ اُس میں سید بیان بھی شریک تھے۔ اسکے لیے ایک قصیدہ بڑے معرکہ کا کہا ہے تشبیب کتنی بلند ہے ؎

ساقی بیاور کہ زدن کا وان باراں آمدہ | وز کوہساراں قطرہ زن ابر بہاراں آمدہ
اُردی بہشت آمد کنوں گلشن بہشت آمد کنوں | از خشت خشت آمد کنوں ہم گل در ایوان آمدہ
از گل نشاط انگیختن وز باد عنبر بیختن | از ابر لؤلؤ ریختن وز چاک داماں آمدہ
مرغ انطرب دستاں نہ ذگلخند وچوں مستاں نزند | چخماق دہستاں نزند برقے کہ رخشاں آمدہ

قصائد میں حصۂ غالب مدح ممدوح کا ہوتا ہے لیکن چونکہ تعریف میں مبالغہ سے زیادہ کام لیا جاتا ہے اس لیے سامعین کے دل پر اُسکا اثر چنداں نہیں ہوتا۔ سید بیان نے اسی قصیدہ میں مسٹر محمود مرحوم اور آنریبل نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی کی تعریف نہایت معنی خیز طور پر کی ہے اور چونکہ اسمیں واقعیت کو بھی دخل دیا گیا ہے اس لیے مضمون مزیدار ہوگیا ہے۔ مسٹر محمود کی تعریف میں کہتے ہیں ؎

ترکان تازی را اگر بر حجازی را اگر | محمود غازی را اگر با فر سلطاں آمدہ
دانش ورش را کج کند دانائے ہشتش کج کند | عزت کلاہش کج کند فرّش فراواں آمدہ

مولوی سید حسین بلگرامی کی مدح میں یہ شعر داد طلب ہیں ؎

آن سید جیّد حسین آں مصطفیٰ را نور عین | صدر شرف را زیب زین در بزم اعیاں آمدہ
گویند نامی گوہر است و بلگرامی گوہر است | لا بل گرامی گوہر است کز معدن عدناں آمدہ

منشی عبد الکریم سی آئی ای کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں ؎

بخلوت در ندیم بارگاہ و عزتِ بےچونی | بجلوت در بشیرِ قیصرِ ہندوستاں منم

دو دستِ امتناں گسترد و انگشتِ عطا پُر   باقلیم دوآب اندر و تجابِ این ہانم

سید بیان کے قصائد و غزلیات کا ذکر اُس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ اُنکے نعتیہ کلام پر بھی سرسری نظر نہ ڈالیجائے۔ اس صنفِ خاص میں متاخرین شعرائے اُردو میں حضرت محسن کاکوروی نے قابلِ رشک امتیاز حاصل کیا ہی۔ حضرت غلام امام شہید بھی مداحِ رسولِ امی کی حیثیت سے نہایت ناموری پا چکے ہیں۔ ان بزرگوں کے کلام کی مابہ الامتیاز خصوصیت اُنکی وہ تاثیرِ کلام ہی جو صرف سچے عاشقانِ نبیؐ کے دلوں میں پیدا ہو کر زبان اور قلم سے نکل سکتے ہیں۔ مضامین آفرینی کے اعتبار سے نواب رضوان مرادآبادی بھی ذکر کے قابل ہیں۔ لیکن فی الحقیقت بہت کم شاعروں نے اس طرف توجہ کی ہی۔ ہر شاعر کے دیوان میں چند نعتیہ غزلیں موجود ہونگی لیکن وہ صرف تیمناً و تبرکاً داخل کیجاتی ہیں۔ امیر مینائی لکھنوی نے البتہ پورا دیوان نعتیہ قصائد و غزلیات کا مرتب کیا ہی اور اُردو میں اس قسم کے مستند کلام کی جو کمی تھی وہ اس سے بہت کچھ پوری ہو گئی ہی۔ سید بیان کا نعتیہ کلام محسن و شہید کے برابر نہیں رکھا جا سکتا لیکن اُنھوں نے بھی آں حضرت کی شان میں اپنی طرز میں اچھا کہا ہی اور بعض بعض چیزیں تو وہ اس قدر موثر ہیں کہ گویا دل سے نکلی ہیں۔ اُنکی ایک نعتیہ غزل بہت مشہور ہے جسکا مطلع ہے ؎

خواب میں زلف کو مکھڑے سے ہٹائے آجا   بے نقاب آج تو او گیسوؤں والے آجا

اس غزل کا یہ شعر بیحد کیفیت انگیز ہے ؎

ہوں سیہ کار مرے عیب کھُلے جاتے ہیں   کملی والے مجھے کملی میں چھپالے آجا

اسی کے چند اور اشعار قابلِ داد ہیں ؎

بیکسی پر مری خوں روتے ہیں بیجانے آجا   راہ میں چھوڑ گئے قافلہ والے آجا
پہنچا محبوب تو شاطرِ رحمت نے کہا   خلوتِ راز میں لے ناز کے پالے آجا   ق
رنگ وحدت ہے جہاں غنچۂ خلوت ہے جہاں   لے گُلِ گلشنِ لولاک لما۔ لے آجا
صورتِ لالہ ہے پُرداغ بیاں کا سینہ   پڑ رہے ہیں ترے بیمار کے لالے آجا

ایک نعتیہ غزل اور قابلِ تذکرہ ہی جو ایک متداول زمین میں لکھی گئی ہی۔ اس میں بھی چیدہ چیدہ اشعار دیکھنے کے لائق ہیں ؎

ضیائے دیدۂ حق بیں ہی رُخسارہ محمد کا   کہ ہے اللہ کا دیدار نظارہ محمد کا
قمر سمجھیں کہ ہم قرآن رُخسارہ محمد کا   یہ سیپارہ محمد کا وہ صد پارہ محمد کا
وہ محبوبِ الٰہی ہے کیا ہے اُسنے مہ پارہ   کریگا سامنا کیا کوئی مہ پارہ محمد کا
اذاں ہی شور اُس سلطانِ بیکس کی شاہی کا   سدا بجتا ہی پانچوں وقت نقارہ محمد کا
وہ شافی میرے دردِ دلکا وہ کافی میرے دردونکا   میں دکھیارا محمد کا میں دکھیارا محمد کا

نعتیہ کلام کے آخر پر منقبت حضرت علی کے یہ چند اشعار درج کیے جاتے ہیں تاکہ ناظرین کو سید بیان کی پُرگوئی اور قادرالکلامی کے ساتھ اُنکی وسیع [illegible] کا بھی اندازہ ہو سکے لکھتے ہیں ؎

خانۂ حق میں علی سا گلعذار آنیکو ہے   باغِ ابراہیم میں فصلِ بہار آنیکو ہے
جھومتا ہے بادِ فردوس سے کعبہ کا غلاف   گلفشانِ شاخسارِ ذوالفقار آنیکو ہے
قلعہ کن خیبر شکن عنتر فگن اژدر شگاف   دیو در عفریت کش ضیغم شکار آنیکو ہے
بعض بندے جسکو نادانی سے کہتے ہیں خدا   وہ مقدس بندۂ پروردگار آنیکو ہے
لافتیٰ اِلّا علی کا غلغلہ اُٹھنے کو ہے   آیۂ لاسیفَ اِلّا ذوالفقار آنیکو ہے

چوتھے شعر میں نصیریوں کی طرف اشارہ ہی جو حضرت علی کو (معاذ اللہ) خدا کہتے ہیں۔

مرثیہ بھی آجکل جداگانہ فن کی صورت اختیار کیے ہوئے ہی۔ اور اس فن میں انیس و دبیر یا اُنکے جانشینوں نے جو نام پیدا کیا ہی اُسکے آگے کسی دعوی قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ غالب نے بھی اس میدان میں کو[illegible] سیان میں کرلی تھی حالانکہ جذبات نگاری کا فطری ملکہ جو اُنھیں تھا اُس کی نظیر کسی اور شاعر کے کلام میں ملنا غیر ممکن ہی۔ بیان نے میر انیس کی طر[illegible] تین چار مرثیے کہے ہیں اور بجائے خود وہ بہت کچھ قدر کے شایاں ہیں! مسدس کی فخریہ تمہید یوں لکھی ہے ؎

خورشیدِ آسمانِ شرف ہے سخن مرا   دریائے فیض کانِ شرف ہے سخن [illegible]

...چہ خدا ایگانِ شرف ہے سخن مرا شاہنشہِ جہانِ شرف ہے سخن مرا

اس زور شور سے کوئی لشکر بڑھا نہیں

اس اوج موج سے کوئی دریا چڑھا نہیں

...س کیا عدو کو ستم ہے زباں مری گویا زبانِ تیغِ دو دم ہے زباں مری

...تیغ علی کی طرح علم ہے زباں مری سیفِ خدا خدا کی قسم ہے زباں مری

نقب پکارتے ہیں کہ معجز نگار ہوں

مدحت طرازِ بادشہِ ذوالفقار ہوں

...مراثی کو بلا استیعاب دیکھتے ہوئے یہ کہہ دینا مشکل ہو کہ سید بیاںؔ کا مرثیہ گوئی ...ں کیا درجہ ہو۔ تاہم اوپر کے دو بند اُنکے انداز کے ذہن نشین کرنیکے لیے ...فی ہیں۔ انیسؔ و دبیرؔ دنیا میں دوبارہ نہیں آسکتے۔ لیکن اُنکے خاندان ...وں نے اپنے گرامی منزلت بزرگوں کا نام اچھی طرح روشن کیا ہو گویا ...ی تک مرثیہ گوئی اُن لوگوں کا موروثی ترکہ ہو۔ یقینی بات ہو کہ اُردو ...بان کی ترقی کے ساتھ ساتھ اُنکی ملکیت کے دعویدار بھی پیدا ہوتے جائینگے ...ور ایکدن اپنا حصہ لیکر رہیں گے۔ سید بیاںؔ اور اسی قسم کے دوسرے ...شعرا کی یہ کوششیں اُسی دعوے کا ابتدائی ثبوت ہیں اور اسی قبیل ...ے شعرا غالباً ایکدن اپنی مساعی جمیلہ سے دنیا پر ثابت کردینگے ...ہ کوئی علم اور کوئی فن کسی خاص شخص یا کسی خاص طبقہ کی ملکیت نہیں ...ہوتا بلکہ صاحبِ ہمت کے آگے پہاڑ بھی سرنگوں ہوتا ہو۔

سید بیاںؔ کے مراثی گو انیسؔ و دبیرؔ کی ٹکر کے نہیں ہیں لیکن اُن کے ...تصنیف کردہ "سلام" بہر صورت اس قابل ہیں کہ لکھنؤ کے مشاہیر کے ...مقابل لائے جائیں۔ مونسؔ کا ایک مشہور سلام ہو جس کے چند اشعار ...سب ذیل ہیں ؎

...اب نارِ سقر سے معاف ہم بھی ہیں ز حیدرِ ہاشم و عبد مناف ہم بھی ہیں

...ل کہ تیغ علی نے کہا کہ بسم اللہ پڑھیں حضور پہ تیغ کے غلاف ہم بھی ہیں

...کی تو دور سے کعبۂ خلیق اللہ کہ مستحق ثواب طواف ہم بھی ہیں

نجف ہو یا کہ ہو جنات عدن ہو یا کہ بہشت علی جہاں ہیں وہیں بے اختلاف ہم بھی ہیں

صراط بال سے باریک ہو تو ہو مونسؔ

کچھ اسمیں فرق نہیں موشگاف ہم بھی ہیں

اسی ردیف و قافیہ میں سید بیاںؔ کے اشعار دیکھیے ؎

سخن کے معرکہ میں گرم لاف ہم بھی ہیں برنگِ تیغِ علی بے غلاف ہم بھی ہیں

زبانِ چیں سے کہا آستین مولا نے کہ سیفِ دستِ خدا کے غلاف ہم بھی ہیں

زمیں پکاری کہ خاکِ درِ حسینؑ ہوں میں کہا فلک نے شریکِ طواف ہم بھی ہیں

کہا حسینؑ کے اعضا نے قطع ہو ہو کر مقطعات بلا اختلاف ہم بھی ہیں

بیاں بہشت میں مونسؔ سے چلکے کہتے ہیں

کچھ اسمیں فرق نہیں موشگاف ہم بھی ہیں

مقطع میں سید بیاںؔ نے شاعرانہ شوخی سے کام لیا ہو۔ مونسؔ اپنے موشگافی کے دعوے میں بال برابر فرق تسلیم کرتے ہیں اور بیاںؔ اپنے موشگاف ہونے میں اتنا فرق بھی جائز نہیں رکھتے۔ عبد مناف کا قافیہ بیاںؔ نے بھی یوں نظم کیا ہے ؎

کہا یہ حُرنے شہِ دیں سے ہو کے پیوستہ کہ سروِ گلشنِ عبد مناف ہم بھی ہیں

اس سلام میں سید بیاںؔ نے قافیہ پیمائی کی شان نہایت عمدگی سے دکھلائی ہو بعض نامانوس اور دقیق الفاظ کو غایت خوبی سے نباہا ہو۔ ملاحظہ ہوں ؎

یہ آفتاب کا ہے قول حیطۂ ابیض سے برائے مسندِ شہ زرباف ہم بھی ہیں

غبارِ شاہ کا ہے قول روشنائی میں عیونِ شمس و قمر کے شیاف ہم بھی ہیں

پکارے گر کے صنم جب علی نے کی تقطیع کہ بیت رب کے زحاف ہم بھی ہیں

اس شعر کا مضمون کتنا بیساختہ ہے ؎

رسول کہتے ہیں مولا کے خاکساروں سے فلک کرے تو کرے انحراف۔ ہم بھی ہیں

ایک اور سلام کا مطلع کس قدر پُر درد ہو ؎

صدا ابجرائی آتی تھی لبِ شمشیرِ قاتل سے رگیں پیاسے گلے کی خشک ہیں کٹتی ہیں مشکل سے

اسکا ایک اور شعر مضمون و طرز بیان کے لحاظ سے خوب ہو لیکن پیاسے باندھا

یاے اول کانوں کو اجنبی سا معلوم ہوتا ہے ؎

لب دریا پیاسے رہ گئے حضرت بھی غم ہے — کہ ایک اک موج اب تک سر کو ٹکراتی ہے ساحل سے

دو ایک معرا نظمیں "محرم نامہ" وغیرہ کے نام سے لکھی ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

آگیا ساقیِ غم کا مینا — توڑ دے ساغر پھوڑ دے مینا
آنا آنا دوڑ کے آنا — خندۂ جام کو آنکھ دکھانا
بارہ مہینے عیش پہ لپکے — ہفتہ عشرہ اشک بھی چپکے
شیشۂ سبز تڑاق سے ٹوٹے — ساغرِ سرخ پڑاق سے ٹوٹے
ساغرِ دل میں مینا بھر دے — خونِ جگر سے مینا بھر دے

شاعری خوب ہے لیکن جذبات صحیح نہیں۔ طرز بیان ایسا ہونا چاہیے تھا کہ سامعین کے دلوں کو گداز کرے۔ ان اشعار کو سنکر قلوب پر رنج و غم کے اثرات طاری نہیں ہو سکتے بلکہ خیال کو تلازمے اور استعارے اپنی طرف پھیر لیتے ہیں۔ مولنا حالی کا وہ اصولی اعتراض جو آپ نے مثنوی گلزار نسیم کے اُس حصہ پر کیا ہے جہاں بکاؤلی پھول چوری جانے پر گریہ و فریاد کرتی ہوئی یہ کہتی ہے ؎

ہے ہے مرا پھول لے گیا کون — ہے ہے مجھے داغ دے گیا کون
شبنم کے سوا چرانے والا — اوپر سے تھا کون آنے والا

سید بیان کے شعروں پر بھی صادق آتا ہے۔ لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ وہ اس مضمون کو پُر درد انداز سے لکھنے پر قادر نہ تھے۔ اِسی قسم کی ایک اور نظم کے مندرجہ تحت اشعار سے ہمارے خیال کی تصدیق ہو جائیگی ؎

چاند محرم کا نظر آیا — آنکھ میں یا لختِ جگر آیا
تڑپ رہے ہیں رسول کے جانی — بند ہوا ہے دانہ پانی
روتے ہیں بچے پیاس کے مارے — دُرِ نجف بے آب ہیں سارے
شاہ کا سر اور نیزۂ اُمت — نقل ہے جس کی مہرِ قیامت
رہتے تھے جس جا ہونٹ نبی کے — ایسے گلے پر دانت چھری کے

صاف و سادہ الفاظ ہیں لیکن کم و بیش تاثیر سے مملو ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے مضامین لکھنے پر قادر تھے۔ یہ اتفاقی بات ہے کہ کسی نظم میں طبیعت کا رجحان کسی خاص سمت ہو جائے۔ واجد علی شاہ اختر کا فارسی مرثیہ بہت دردانگیز لکھا ہے۔ مفصلہ ذیل انتخابی شعروں میں ہستیِ ناپائدار کا خاکہ اچھا کھینچا ہے ؎

بیا تا بنالیم چوں قمریاں — کہ شاہاں کجا یند و میراں کجا
بگورِ شہِ تاجداراں خرام — نہ پاداش و ہاروں نہ کوس و لوا
نہ آں تاج بینی نہ آں تارکش — بزنداں سرائے سکندر درآ
کنوں یکدرم نیست زینساں اثر — فیا حسرتا ثم وا حسرتا
نشیند یکے تا نہ خیزد دگر — ابر تخت اقبال نکبت جا
مکاری سرود الرحیل الرحیل — منادی زند الفنا الفنا

سید بیان جس زمانہ میں ایشیائی شاعری کے چمن کو اپنی آبیاریِ فکر سے نشو و نما کا سامان بہم پہنچا رہے تھے اُسی وقت ہندوستان میں وہ گروہ نمودار ہو رہا تھا جس کی دوربیں نگاہوں نے بتا دیا تھا کہ مغربی شاعری کے اتصال سے اُردو شاعری میں یقینی طور پر انقلاب آنیوالا ہے۔ موخر الذکر گروہ کے افراد کی انقلاب انگیز کوششیں شروع ہو چکی تھیں اور پروفیسر آزاد و مولنا حالی کے مقلدوں کی ایک نئی جماعت کے ہاتھوں ایشیائی طرز سخن کی اصلاح کا کام شروع ہو چکا تھا۔ سید بیان ان حالات سے کیسے ناواقف رہ سکتے تھے۔ غالباً انھوں نے بھی اس بات کو تسلیم کر لیا تھا کہ ہماری قدیم شاعری ترمیم و اصلاح کی محتاج ہے۔ اُنکے کلام میں قومی غزلیات موجود ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بزم عزائے قوم میں جہاں حالی اپنا مرثیہ پڑھ پڑھ کر فدائیان قوم کو تڑپا رہے تھے سید بیان بھی آنسو بہانے کے لیے پہنچ گئے تھے۔ انکے یہاں اکثر قومی طرحیں ہوتی تھیں اور اُنپر وہ خود اور اُنکے تلامذہ طبع آزمائی کرتے تھے۔ انھوں نے ایک مسدس "ایشیائی شاعری کی الوداع" کے عنوان سے لکھ کر

قدیم شاعری کا حق رفاقت ادا کیا ہو جسکا ایک بند یہ ہے ؎

نکاراج تیرا اب اے شاہزادی   غمی سے مبدل ہوئی تیری شادی
مرادوں کے بدلے ملی نامرادی   زمانہ نے تصویر تیری مٹادی
نہ وہ چاند سی شکل نکھری ہوئی ہے
نہ وہ عنبریں زلف بکھری ہوئی ہے

ایک قومی غزل کا انتخاب ہدیۂ ناظرین ہے ؎

کیا عالم سکوت میں ہے گلستانِ قوم   کوئی نہیں ہے بلبلِ جادو بیانِ قوم
وہ ٹوٹ کر گرا کہ سنبھل نہیں کوئی   اللہ کس زمیں پہ رکھوں آسمانِ قوم
اب تک تو کچھ گیا نہیں دیکھ آنکھ کھولکر   مٹ جائیگا تو پھر نہ ملے گا نشانِ قوم

کانفرنس والے قصیدہ میں علم کی ضرورت ان الفاظ میں بتائی ہے ؎

شاہنشہِ دیں گفتہ است باشمع و آئیں گفتہ   ولو کان بالصیں گفتہ است ایں گفتہ بیان کردہ
ہم علم ابداں بایدت ہم علم ادیاں بایدت   ہم ایں و ہم آں بایدت کا علم علماں آمدہ
خواہ سرت دیہیم را ازکف مدہ تعلیم را   کیں فاتح است اقلیم را فتحش نمایاں آمدہ

حضرتِ بیاں نیچرل نظمیں بھی خوب لکھتے تھے۔ نمونہ کے طور پر ہم ایک نظم کے چند اشعار نقل کرتے ہیں۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ نیچرل مضامین کو کس ندرت اور کس خوبی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ جاڑے کے عنوان سے لکھتے ہیں ؎

دھوم مچاتی سردی آئی   دانت بجاتی سردی آئی
ڈھک گیا منھ اور چھپ گئے ہاتھ   جآء والبرد مع الجآت
دانت کی ڈونڈی گھر کا اکھاڑا   روئی کے پیچ نے سب کو پچھاڑا
گھر گھر بانٹی دولت اس نے   سب کو دیا ہے خلعت اس نے
کسی کا شالی مول میں بھاری   کسی کا کمبل تول میں بھاری
آگ سے بچ بچ لاگ ہے سب کو   اس اولاد کی آگ ہے سب کو
گود میں لی چھاتی سے لگالی   آج کل آگ ہے ننھی بالی
شب کو انگیٹھی سب کے قریں ہے   کوکوں پہ اب مہر نہیں ہے

مولانا جعفر علی کا مرثیہ ترکیب بند لکھا ہے۔ پہلے بند کے یہ دو چار شعر دنیا کی حالت کا آئینہ ہیں ؎

اے جہانِ گذراں کچھ نہیں   غیرِ خداوندِ جہاں کچھ نہیں
وادیِ امکاں میں عبث دوڑ آتو   ماحصلِ ریگِ رواں کچھ نہیں
کھانہ طلسماتِ فلک کا فریب   گنبدِ نیرنگ ہے یاں کچھ نہیں
عالمِ شہود نہیں کوئی شے   آئی صدا غیب سے ہاں کچھ نہیں

اُن کے بعض حصۂ کلام سے ظاہر ہوتا ہو کہ وہ بڑے واقف کار شخص تھے۔ انگریزی الفاظ بہت برجستہ استعمال کرتے تھے اور غیر زبان کے الفاظ ہونے کے باوصف اس طرح باندھتے تھے کہ بھدے نظر نہ آئیں۔ میرٹھ کے ایک سکول میں کوئی جلسہ منعقد ہوا تھا۔ صاحب ضلع وغیرہ رونق افروز ہوے تھے۔ وہاں اُنھوں نے ایک نظم پڑھی تھی جسمیں انگریزی الفاظ کی کھپت قابل دید ہے ؎

لال کُرتی کا سپاہی ہے گلاب   کالی پلٹن کا ہے سنبل سوجر
جھانکتی ہے صورتِ نرگس خوشی   کہتی ہیں کلیاں چٹک کر کم ہیر
کرتے ہیں پتے مسرت کے چیرز   دیتے ہیں طائرِ خوشی کا لکچر
لیتی ہے بلبل کنارِ شوق میں   کہتے ہیں ہنس ہنس کے گل مائی ڈیر

مسٹر محمودؔ کی تعریف میں ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

در روے آں شیوا بیاں ازدو ایڈیسن زباں   پیچیدہ حکمت در دہاں لب زیرِ دنداں آمدہ
تا درادب بکشادہ لب زی درگش بکشادہ لب   سحبان اقتصاے عرب ہومر زیوناں آمدہ

اس سے معلوم ہوتا ہو کہ انھیں مختلف ممالک کے قدیم و جدید علوم تاریخ و ادب پر کافی دسترس حاصل تھی ورنہ ہمارے بزرگ جن کی تعلیم پرانے طرز پر ہوئی ہو اُن کے لیے ایڈیسن اور ہومر سے روشناس ہونا کچھ کم حیرتناک بات نہیں۔

معلوم ہوتا ہو سید بیاؔن کو سہرا لکھنے کا شوق تھا۔ ذوقؔ و غالبؔ والی طرح پر کم و بیش تین چار سہرے لکھے ہیں اور دوسری زمینوں پر بھی طبع آزمائی کی ہو۔ ہم انکے منتخب اشعار نیچے لکھتے ہیں اور ان کے متعلق

اپنی رائے محفوظ رکھتے ہیں ؎

بنا ہے کعبۂ ابرو کا طاق چھو چھو کر　　نقاب نور حرم کی حریم کا سہرا
گلوں کو جان کے حمان سر فراز کیا　　گواہ ہے ترے خلقِ عظیم کا سہرا
کلی جو غنچۂ گل کو چراغِ حُسن کی لو　　تو بنگیا یدِ بیضا کلیم کا سہرا
پھول جھڑتے ہیں ترے خندۂ پیشانی سے　　ہے بنا تا تماشا حسنِ حسیں کا سہرا
پھول چوٹی کا وہی ہے جو بھیسر پر چڑھ جائے　　کیوں نہ اِترا کرے چڑھتے تے سرسہرا
دام ہم رنگ زمیں بود گرفتار شدیم　　رُخ پر نور پہ کندن تو ہی پُر زر سہرا
بیٹھی ہیں تارِ نظر پر جو چچا کی نظریں　　بنگیا روشنیٔ صبح کرتہ سہرا
بوسے دیتا ہے جبیں پر کبھی رُخساروں پر　　زانکہ منظور نظر داشتہ اِیں ہر سہرا
گرمیٔ حسن سے ٹپکے جو عرق کے موتی　　بنگئے رُخ کی شعاعوں میں اُلجھکر سہرا

اشعار کو تضمین کرنے میں بھی بیاؔن کو امتیاز حاصل تھا۔ تاریخ کے مشہور و معروف مطلع سرِ دیوان پر کس برجستگی اور چُستی سے مصرعے لگائے ہیں کہ دل سے بیساختہ مرحبا نکلتی ہے ؎

مرا دیدہ وہ ہے صبحِ آدمِ ثانی کے طوفاں کا　　مرا پہلو ہے مشہد کشتۂ امید وارماں کا
مرا حلقوم ہے مغرب ہلالِ تیغِ بُرّاں کا　　مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

ایسے ہی وزیر کے ایک شعر کو تضمین کیا ہے اور خوب کیا ہے ؎

حُسن وقبحِ روے زیبا کھُل گیا　　شرح کے خط سے معما کھُل گیا
ہو بہو مضمون سارا کھُل گیا　　عاقبت بیٹوں پہ نکتا کھُل گیا
حُسنِ عارض عارضی تھا کھُل گیا
خط کے آتے ہی لفافا کھُل گیا

رعایتِ لفظی و معنوی کے اعتبار سے تاریخ کے شعر والی تضمین بالکل اچھوتی ہے۔ اس شعر پر اور لوگوں نے بھی مصرعے لگائے ہیں مگر کوئی بھی اسکی خوبی کو نہیں پہنچے۔

تاریخی مادے بھی بہت با معنی اور برجستہ کہتے تھے۔ کسی عزیز کے یہاں لڑکا پیدا ہونے کی تاریخ کہی ہے ؎

ہوا احسانِ عظیم احدی سے لڑکا　　گلِ رخ دیکھکے جس کا دلِ بلبل پھڑکا
رُخِ فرزند سے ہے حق کی تجلی پیدا　　طور کا شعلۂ خاموش دوبارہ ابھڑکا
جوشِ عشرت کا ہوا نوبتِ اقبال بجی　　چرخ پر سے خوشی و عیش کا بادل کڑکا
زینتِ تاجِ سعادت ہے یہ تابندہ گہر　　فکرِ تاریخ میں یوں طبع کا توسن بھڑکا
دیکھکر روے ولا ہاتفِ غیبی نے کہا
زیب کیا دیتا ہے ماں باپ کو موتی لڑکا
۱۳۱۵ھ

اپنے والد کے انتقال کی تاریخ کہی ہے ع گوہر افتاد ز تاجِ آفاق۔
۱۳۱۰ھ

رباعیاتِ بیاؔن بھی قابل قدر چیزیں ہیں۔ بطور نمونہ دو ایک درج کی جاتی ہیں ؎

کیا نور ہے کیا نور ہے کیا نور ہے تو　　باطن سے عیاں بصر سے مستور ہے تو
عرشِ صمدی کجا۔ کجا جبلِ ورید　　کتنا نزدیک کس قدر دور ہے تو

حضرت کو حبیبِ دردِ امت پایا　　کیا شستۂ شبہہ یدِ قیامت پایا
رحمت کا زلال اور شفاعت کی شکر　　بیمار نے کس مزے کا شربت پایا!

اکثر رباعیوں میں فخریہ مضمون باندھا ہے ؎

پروردۂ خلاقِ جہاں ہے یہ فقیر　　سُن اسکی صدا کہ خوش بیاں ہے یہ فقیر
خلاق نے بھرا ہے کوٹ کر مغزِ سخن　　ہرچند کہ مُشتِ استخواں ہے یہ فقیر

فیضِ سخن آفریں ہے دمساز مرا　　کیوں روحِ قدس نہو ہم آواز مرا
بیٹھے رہیں بس چرخِ چہارم پہ مسیح　　دکھلائے سخن زمیں پہ اعجاز مرا

پہیلیاں بھی کہتے تھے مثلاً یہ انگشتری کی پہیلی ہے :-

ہت ترے سر پر پتھر پیٹ میں انگلی

غرض کہ ہر فن میں کمال رکھتے تھے۔ اُردو میں نثر بھی خوب لکھتے تھے لیکن اُنکی نثر بعض اوقات مقفیٰ ہونے سے نثر غالب کی لطافت سے عاری ہوتی تھی۔ بااینہمہ اکثر جگہوں پر بیساختہ لکھ گئے ہیں اور مقفیٰ ہونے کے باوجود اُس میں کوئی سُستی یا اور عیب نہیں پیدا ہونے پایا۔ ایک

جگہ دفترِ وجود کے عنوان سے لکھتے ہیں :-

دفترِ وجود ایک سپید و سیاہ کتاب ہے۔ آسمان و زمین کے پٹھے لگے ہوئے ہیں۔ منقش جلد بندھی ہے۔ بحرِ محیط کا دائرہ اُسکی لاجوردی جدول شمار کی گئی ہے۔ کوہِ بسیط کا احاطہ اُسکا گنجان حاشیہ قیاس کیا گیا ہے۔ ایام و لیالی یعنی دن اور رات اُسکے کالے اُجلے ورق ہیں۔ ذرّوں نے ورق پر رُوپہلی افشاں چُنی ہے۔ ستاروں نے سنہرے نقطے لگائے ہیں۔ مہتاب نے جلد پر چاندی کا کام کیا ہے۔ دھوپ نے اوراق پر سونا پھیرا ہے۔ نشو و نما کی رنگ آمیزیاں صفحاتِ کتاب کے مینائی نقش و نگار ہیں۔ لالہ و گل کا ظہور، سرو و سنبل کی نمود حواشی کی پھول پتیاں ہیں ؎

دلچسپ مرقع ہے ہر اک نقش ہے یاں کا   نقشہ کسی اُستاد نے کھینچا ہے جہاں کا

نثرِ آزاد کی رنگینی اور نثرِ غالب کی لطافت کو یہ نثر نہیں پہنچ سکتی لیکن اس سے اتنا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر سید بیان کو اُردو میں "پنج رقعہ" لکھنے کی خدمت سپرد کیجاتی تو وہ اسے کس عمدہ اسلوب سے پورا کرتے۔

صندلینہ کی جبین سیر کے عنوان سے انکا ایک نثر مضمون اُس طرزِ تحریر کا نمونہ ہے جو کسی زمانہ میں اُردو اہلِ قلم کا نصب العین تھا۔ اس قسم کی تحریریں اب بھی ناولوں میں نظر آجاتی ہیں لیکن تبدیلِ مذاق کے ساتھ اب انکے قدرداں یہاں رہے نہیں :-

قامت کی شوخیاں رَو میں، قیامت کے فتنے جلو میں، پتی ہلتی تو ٹھٹک جاتی، پتا پڑتی تو جھجک جاتی، نرگس آنکھیں بچھا کر تسلیم کرتی تو سمندِ ناز سے نیچے اُترتی، شوخی کا سمند تراکے بھرتا تو آنچل سبزہ پر اٹکھیلیاں کرتا۔ بوستاں کی کلیاں صدقے جاتیں۔ گل سے پیرہن کی لپٹ جاتی تو نکہتِ گل دوڑ کر لپٹ جاتی۔

حضرت بیان کے احسانات جو اُردو زبان پر ہیں یہیں ختم نہیں ہو جاتے بلکہ انکا قلم ہر طریقہ سے اُردو علم ادب کی خدمت کرتا رہا ہے۔ ایک عرصہ تک جلوۂ طور اُن کے مفید مطلب مضامین سے مزین ہوتا رہا ہے۔ "طوطیِ ہند" کا نام انھیں کی بدولت آج تک چل رہا ہے۔ وہ مدت تک اُسکے باقاعدہ ایڈیٹر تھے۔ اُسکے پہلے دو صفحے تیر بہ پنچ کے عنوان سے چھپتے تھے جسکے ظریفانہ مضامین خود حضرت بیان کی ظرافت پسند طبیعت سے نکلتے تھے۔ ایک عرصہ تک اَودھ پنچ سے معرکہ آرائی رہی۔ اَودھ پنچ کے بیسیوں نامہ نگار اپنے پرچہ کی مدد کے لیے کمربستہ میدان میں نکل آئے تھے مگر اس شیر نے تن تنہا سب کا جواب دیا اور اپنا نام رکھ لیا۔

آخر میں اُنھوں نے اپنا ایک خاص رسالہ لسان الملک کے نام سے جاری کیا جو بارہ برس تک نکلتا رہا۔ اس میں مضامین نظم و نثر مساوی طور سے درج ہوتے تھے۔ انکی غزلیات اور انکے شاگردوں کے کلام کے لیے بھی اسمیں گنجایش نکالی جاتی تھی۔ لسان الملک ۱۸۸۹ء میں جب جاری ہوا تھا شاید اُسوقت تک نظم و نثر کا مشترکہ مذاق پیدا کرنیوالا کوئی پرچہ نہ نکلا تھا۔ علمی مضامین کے علاوہ ادبی مسائل پر بھی زوردار تحریریں ہوتی تھیں۔ مولانا حالی کی مثنوی حقوقِ اولاد پر ایک اعتراضی مضمون نظم حضرت بیان نے اسی پرچہ میں مسلسل چھپوایا تھا۔

لسان الملک میں ایک عرصہ تک حل المطالب کے نام سے ایک سلسلہ مضامین نکلتا رہا ہے۔ یہ حضرت بیان کی شرح دیوانِ غالب ہے۔ غالباً یہ شرح کتابی صورت میں آج تک شایع نہیں ہوئی ورنہ ادب اردو میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہوتا۔ نمونہ کے طور پر ایک شعر کی شرح درج کیجاتی ہے جس سے بیان کی نکتہ رسی اور سخن فہمی کا بھی ایک حد تک اندازہ ہو جائیگا :-

شعرِ غالب :- سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

لغات :- سبزہ - روئیدگی، خط - ریش، محاسن، کاکل - سر کے اوپر کے بال لیکن استعمال زلف و گیسو وغیرہ سب پر ہوتا ہے۔ زمرد - پنا، ایک ہرے رنگ کا جواہر ہے۔ حریف - مدمقابل، دم - سانس، افعی - سانپ

معنی :- مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ جب تک معشوق کے سبزۂ خط نہ آیا تھا کاکل افعی کی طرح پیچ کھاتا رہا اور عاشقوں کو زہریلی اداؤں سے ایذائیں دیتا رہا۔ مگر

کے اثر سے سانپ اندھا ہو جاتا ہے اور اسکی نیش زنی کی طاقت بالکل جاتی رہتی ہے
اسکی کیا وجہ کہ خط زمردی پیدا ہوا اور زلف کی ایذا رسانی کا وہی عالم رہا۔ شاید
یہ وہ افعی ہے جس پر زمرد کا اثر نہیں چلتا۔ مراد یہ ہے کہ خط کے آنے سے سلطان
حسن کی سپاہ کمزور ہو جاتی ہے۔ ہمارے معشوق کا بڑھا ہوا حسن خط کے آنے سے
بھی نہیں گھٹتا۔ ظاہر ہے کہ صاف چھپ پر زلف کی اداؤں میں کمی نہیں آتی۔ ماحصل ہے

یہ آدمی ہے کہ برسوں جمال رہتا ہے   وگرنہ ماہ کو اک شب کمال رہتا ہے

شرح معانی و مطالب کا اسلوب عموماً عام فہم ہے لیکن اس شعر کے حل میں ناکام کوشش کی گئی ہے

اسکی صحت میں ہمیں کلام ہے۔ مختصر یہ کہ سید بیان ایک جامع کمال شخص تھے۔ انکی
ادبی حیثیت ناظم و ناثر ہونے کے اعتبار سے یکساں ممتاز و مستند ہونی چاہیے اور یہی وجہ ہے کہ
انکی عمر نے وفا نہ کی ورنہ اردو ادب کی بہت سی تشنگیاں سید بیان سے پوری ہوتیں۔ ایسے
ذی ہنر مشاہیر کی موت کی تلافی اگر کوئی چیز اس عالم میں کر سکتی ہے تو وہ انکے بیش قیمت کا
گئے ہیں۔ سید بیان آج دنیا میں موجود نہیں لیکن انکے کارنامے اور انکی علمی خدمات ادبیا
ہمیشہ انکے نام کو صفحہ تاریخ میں روشن رکھینگی انھوں نے خود ہی کہا ہے ؎

نفس گم اور سخن باقی رہیگا   نہ ہوگا نار اور ہوں گے ترانے

اعتبار الملک جناب مضطر (خیرآبادی)

ایشیائی شاعری کی دنیا مین جناب مضطر کا نام کسی تعارف کا محتاج نہین۔ آپ کے مختلف عاشقانہ اشعار لوگون کو یاد ہین۔ آپ کی طبیعت کی روانی اور پُرگوئی بھی حد کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ کلام مین عاشقانہ رنگ کے ساتھ تصوف کی جھلک بھی موجود ہے اور یہ تصوفانہ مذاق خاندانی ہے۔ اول تو آپ سید رضوی ہین۔ دوسرے یہ کہ آپ کے آباؤ اجداد عارف اور صوفی گذرے ہین۔ زہد و ریاضت مین ساری عمرین گذاردی ہین اور درویشانہ کمالات و خرق عادات کا ظہور ہوا کیا آپ کے پردادا حضرت سید عشوق علی صاحب قدس سرہ عارف کامل تھے۔ ان کے زہد و عرفان کی روایات مشہور ہین۔ آپ کے والد ماجد کا نام مولانا حافظ سید احمد حسین ہے اور رسوا تخلص فرماتے تھے۔ آپ کے دادا کا نام مولانا سید تفضل حسین خان صاحب ہے۔ آپ کے بڑے بھائی مولانا حافظ سید محمد حسین صاحب بسمل تھے۔ حضرت بسمل کی شاعری کا ہر سخن شناس معترف و مداح تھا۔ حضرت بسمل نواب صاحب بہادر ٹونک کے اُستاد تھے۔ حضرت مضطر کا قیام ٹونک مین حضرت بسمل ہی کے زمانہ سے تھا اور موجودہ خطاب (افتخار الشعرا اعتبار الملک خان بہادر اقتدار جنگ) بھی دربار ٹونک ہی سے ملا ہے اور وہی درجہ جو آپ کے برادر معظم حضرت بسمل کو دربار مین تھا آپ کو حاصل ہوا۔

مشہور زمانہ شمس العلما مولانا محمد عبد الحق صاحب (خیرآبادی) آپ کے

ماموں تھے۔ آپ کی والدہ ماجدہ محض فارغ التحصیل فاضلہ ہی نہ تھیں بلکہ شاعرۂ بے بدل بھی تھیں۔

جناب مضطر کی ولادت ۱۲۸۲ھ میں ہوئی اور عربی فارسی کی تعلیم اپنی والدہ ماجدہ سے پائی۔ مرحومہ بڑی ادیبہ تھیں اور عربی فارسی قصاید اُن کی تصنیفات میں موجود ہیں۔ جناب مضطر نے شاعری میں اپنی والدہ ماجدہ ہی سے اصلاح لی۔ انھوں نے گیارہ برس کے سن میں جو پہلی غزل لکھی اُس کا مطلع حسب ذیل ہے ؎

ڈھونڈھتے ہم کیوں دوائے دردِ دل　　تم اگر ہوتے بجائے دردِ دل

اس مطلع کی اصلاح آپ کی والدہ نے اس طرح فرمائی ؎

ڈھونڈھتے ہم کیوں دوائے دردِ دل　　کاش تم ہوتے بجائے دردِ دل

پھر آپ نے اپنی ایک غزل حضرت امیر مینائی کے پاس بغرض اصلاح بھیجی۔ اس غزل کا مطلع تھا ؎

داغ ہیں سیکڑوں نہاں دل میں　　طرفہ پھولا ہے گلستاں دل میں

حضرت امیر نے مصرعۂ اول کو یوں بنایا

سیکڑوں داغ ہیں نہاں دل میں

جناب مضطر نے پھر ایک اور غزل بھیجی جناب امیر نے غزل واپس بھیجکر ارقام فرمایا کہ "آپ کے کلام کو اصلاح کی حاجت نہیں اور جو کچھ دخل دیا گیا وہ استحسانا۔ تم فقیر امیر کا نام روشن کرو گے"

ریاست ٹونک سے جناب مضطر کا تعلق بہت قدیم ہے۔ آپ کے دادا سفیر ریاست تھے۔ نواب صاحب بہادر ٹونک نے ۱۹۰۳ء میں جناب مضطر کو اودے پور میواڑ کا وکیل مقرر فرمایا۔ اسکے بعد صدر پولیٹکل ایجنٹ رہے پھر منصب اُستادی نواب صاحب پر فائز ہوئے۔ یہ اعزاز حضرت بسمل کی وفات کے بعد حاصل ہوا۔ جناب مضطر نے نظامت نمبیا ہیڑہ کی خدمت بھی بہت خوبی سے ادا کی اور آپ کے نظم ونسق کا اعتراف کیا گیا۔ ریاست کے عہدۂ سول ججی پر بھی مامور رہے۔ پھر بعض وجوہ سے آپ کا تعلق ریاست گوالیار سے ہو گیا اور وہاں بھی معزز عہدہ پر فائز ہوئے۔ الغرض ہر قسم کا اعزاز آپ کو حاصل ہوا اور اکثر اسناد بھی منجانب ریاست ملیں۔

آپ کے سوانحی حالات طویل کو بالاختصار بیان کرنے کے بعد اب آپ کی شاعری کا مختصر تبصرہ کیا جاتا ہے۔

رنگ تغزل میں جناب مضطر کی بعض غزلیں بہت مشہور ہو چکی ہیں بعض اشعار میں داغ کا رنگ پایا جاتا ہے۔ مثلاً ذیل کے اشعار میں داغ ہی کے کلام کا لطف حاصل ہوتا ہے ؎

علاج دردِ دل تم سے مسیحا ہو نہیں سکتا　　تم اچھا کر نہیں سکتے میں اچھا ہو نہیں سکتا
تمھیں چاہوں تمھارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں　　مرا دل پھیر دو مجھ سے یہ جھگڑا ہو نہیں سکتا
دمِ آخر مری بالیں پہ مجمع ہے حسینوں کا　　پھر آ نا اے قضا اس وقت پردا ہو نہیں سکتا

اُسنے یہ کہکے پسِ وصل پشیمان کیا　　واہ وا آپنے اچھا مجھے حیران کیا
کیوں خفا ہوتے ہو جا ہو تو تلاشی لے لو　　دوسرا دل ہو مرے پاس تو قربان کیا

ہے انکے سوا کون خدا دل و دین کا　　وہ آپ ہی اللہ ہیں سب کچھ ہیں انھیں کا

خبِ فرقت تمنا بے کلی ہو جاتی تو اچھا تھا　　کسی پر جان بھی قربان ہو جاتی تو اچھا تھا
لگا کر ٹھوکریں کہتے ہیں وہ گورِ غریباں پر　　یہ بستی اور بھی ویران ہو جاتی تو اچھا تھا

ذیل کے شعر میں معشوق کے ترک ستم کو عجب خوبی سے ظاہر کیا ہے معشوق کی ستم شعاری میں بھی ایک شان محبت وہ خاپیدا کی ہے یعنی ہم پر معشوق کو کرنے میں ایسا لطف ملتا تھا کہ پھر ہمارے بعد کسی پر ظلم ہی نہیں کیا اس کا ایسا ستم دوست اسکو کوئی نہ ملا اور گویا ہم نے مٹ کے معشوق کو بارحم بنا دیئے۔

ستم کی خو نہ رہی شیوۂ جفا نہ رہا　　مجھے مٹا کے انھیں کوئی حوصلہ نہ

ذیل کے شعر میں بعد مرگ حسرت وصال کو بہت ہی اچھوتے انداز طریقہ سے بیان کیا ہے۔ مدفن و دامن کا قافیہ بھی حسن کا ہے۔ باقی اشعار بھی بہت بامزہ ہیں۔

گذرا سوقت ہوا ہے سر مدفن ان کا　　اٹھو لے دست طلب چھو لو ذرا دامن انکا
یہ بھی تمنا ہے کہ روز محشر　　لب پہ ہو نام ترا ہاتھ میں دامن انکا
کھل پڑا دل جو بہا تو اٹھانے کے لیے　　خاک پر لوٹ گیا گوشہ دامن انکا

حق رسم محبت کا کچھ تو ادا کرنا　　وعدہ کے ستم کرنا تھم تھم کے جفا کرنا
اے عمر تو ہو جانا ختم اسکی جدائی میں　　بیشک وہ جفا برتے تو مجھ سے وفا کرنا

ان دونوں اشعار میں آخری شعر اے عمر تو ہو جانا الخ میں عشق جفائے یار کو کتنا عزیز ثابت کیا ہے اور عدہ کیسی اچھی قائم کی ہے کہ جب تک وہ مجھپر جفا کرے اے عمر تو مجھ سے وفا کرنا یعنی مجھ کو زندہ رکھنا۔ ؎

دعا سے کچھ ہوا التجا سے کچھ نہ ہوا　　بتوں کے عشق میں یاد خدا سے کچھ نہ ہوا

ذیل کا یہ شعر محض عاشقانہ ہی نہیں ہے بلکہ سچا واقعہ بیان کیا ہے یعنی ہم نے بتوں کے عشق میں جو یاد خدا کی وہ بالکل رائگان گئی خدا کی یاد میں ترک ماسوا کامل طور پر مع خلوص تو ضرور ہے ورنہ دعا اور التجا بیکار ہے۔ ؎

مہریں لگی ہوئی ہیں خط سرنوشت پر　　پیشانیوں پہ داغ تری آستان کے ہیں

ذیل کے شعر کی شوخی ملاحظہ ہو۔ مصرعہ ثانی میں اہل وفا کا خوف معشوق کی زبان سے کس طنزیہ لہجہ میں بیان کر گئے ہیں ؎

کون نکلا یہ مرے پاس سے گھبرا کر مضطر　　ان سے اللہ بچائے جو وفا کرتے ہیں

ذیل کا یہ شعر بھی خاص لطف رکھتا ہے اگر خود عشق یار میں گم ہوں مگر میرا عشق روز روشن سے زیادہ ظاہر اور مشہور عام ہے کہ معشوق کو دیکھکر فوراً ہی لوگ پکار اٹھتے ہیں کہ یہ معشوق مضطر کے ہیں۔ بہت اچھا رنگ تغزل اور حسن و عشق کے تعلقات کا اعلے نمونہ ہے ؎

تمھارے نام سے سب لوگ مجھکو جانتے ہیں　　میں وہ کھوئی ہوئی شے ہوں کہ پتہ جسکا تم ہو

مرتے دم یاد بتان جائے مری جان کے ساتھ　　میرا اللہ اٹھائے مجھے ایمان کے ساتھ

جناب مضطر کا ذیل کا شعر بھی قابل داد ہے۔ چارہ گر سے بدگمانی اور رقابت نئے رنگ سے ظاہر کی ہے کہتے ہیں کہ میرے معشوق کو دیکھکر میرے علاج کو آیا ہے یعنی اسیر عاشق ہو چکا ہے اسلیے میں اسکا علاج نہیں کروانا چاہتا مجھے خوف جان ہے ؎

آیا ہے انکو دیکھ کے میرے علاج کو　　اب اور کچھ گمان مجھے چارہ گر سے ہے

ذیل کے دونوں شعروں میں دوسرا شعر حد درجہ لطف انگیز ہے۔ جدائی میں کثرت یاس یا ناامیدی وصل سے راحت و سکون پیدا ہونا جذبات فطرت میں داخل ہے جب انسان کسی شے کے ملنے سے مایوس ہو جاتا ہے تو آخر کار صبر ہو جاتا ہے اور صبر باعث آرام ہے۔ ؎

حسن نے قہر کیا شام نہ آفت ڈھالی　　آرزو وصلت میں بدنام ہوئی جاتی ہے
ہے یہی یاس تو کچھ دن میں جدائی تیری　　سبب راحت و آرام ہوئی جاتی ہے

اپنے قول وفا کو بھول گئے　　تم تو بالکل خدا کو بھول گئے
ان سے دو دن بھی جا نہ بیٹھ سکی　　مضطر بے نوا کو بھول گئے

دل میں رکھے تجھے او جان کا نقصان کر کے　　ہائے ظالم تجھے کیسے کوئی مہمان کرے
مضطرب بختی الفت نہیں جھیلی جاتی　　میرا اللہ یہ مشکل مری آسان کرے

اب کون پھر سکے ہے بت دشمن دین سے　　اللہ کے گھر کیوں نہ چلے جائیں یہیں سے

حال میں جناب مضطر کا ایک حمدیہ دیوان بنام "نذر خدا" شائع ہوا ہے اور نعتیہ دیوان "نیاز مصطفے" زیر طبع ہے۔ یہ حمدیہ دیوان اپنی سادگی بیان میں خاص انداز رکھتا ہے۔ کچھ انتخاب ملاحظہ ہو ؎

زندگی پاتے ہی دروازہ فنا کو دیکھا　　آنکھ کھلتے ہی خدائی میں خدا کو دیکھا

یہ قیمت ۱۲ علاوہ محصول مسلم پبلشنگ کمپنی لکھنؤ سے مل سکتا ہے۔

حسن سے جلوۂ وحدت کا پتہ چلتا ہے   سجنے پردوں میں خدائی کے خدا کو دیکھا
بس گئی دل میں محبت تو کھلے زندان   اٹھ گیا گھر سے پردے تو خدا کو دیکھا

الٰہی تو ہی اپنی حکمت کو سمجھے   کہ درد و دوا دردمندوں میں ڈالا

نگ صد نقش تو ہی جسکی تصویر میں ہے   کار پرداز قضا پردۂ تقدیر میں ہے
دل میں اپنا ہی تو ہی شوق شہادت پیدا   جان دینے کا مزا خنجر و شمشیر میں ہے

یہی غرض تھی کیا غرض اسکی جلوے کا کام ہے   فکر خودی میں کیوں پڑوں مجھکو خدا کا کام ہے
پردہ کو ناز ہے تیرا جلوہ چشم شوق ہے   دید ہے کیا غرض ہمیں تیری ادا سے کام ہے

کوئی گھر جا میں نالے لیا کوئی حق اللہ لگا   [illegible]

گریۂ عشق میں آنکھوں کی کمی پڑتی تھی   اسلئے پھوڑ دیا قلب کا چھالا میں نے

ترے سامنے دست حسرت پسارے   چلے خالی ہاتھوں یہ سامان والے

ساغر میں بزم خرابات کے جھگڑے ٹوٹے   تو نے خود جنکو بھرا تھا وہی شیشے ٹوٹے
پھول گلشن کے چنے شاخ سے پتے توڑے   جو کھلنے بھی نہ پائے تھے وہ غنچے توڑے

عجب ہے قدرت تری نرالی ہے   تو نے مٹی میں جان ڈالی ہے
جب میں آیا تو ہاتھ خالی تھا   جب میں اٹھا تو ہاتھ خالی ہے

صحرا میں غریبوں کا نگہبان بھی ہے   مشکل جو کرے وقت پہ آسان بھی ہے
رحمت کا تم دوں میں سامان بھی ہے   یہ جان ہے کیا چیز مری جان بھی ہے

واہ وے دردِ دل یہ اثر تیرے ہاتھ ہے   تو جو مانگ جائے تو اثر تیرے ہاتھ ہے
غنچہ اور گل کو خداوند کھلائیگا تو ہی   خوبیِ رنگِ گل گلزار تیرے ہاتھ ہے
کون پوچھیگا بھلا میدان محشر میں مجھے   میری عزت داور داور تیرے ہاتھ ہے

یاد محبوب میں بیدار رہے آٹھ پہر سوچ   عشق میں پڑکے دو اٹھ دل بیدار نہ سوچ
اسکی رحمت کے بھروسے پہ بسر کر اپنی   کیسی گذرے گی قیامت میں دل زار نہ سوچ

باغ عالم میں ٹھہرنے کا بھروسہ کیا ہو   بوئے گل ہم نے تو دیکھی ہے ہوا کی پابند

تری حمد جاری ہے سب کی زبان پر   پکارا گیا تو زمین آسمان پر

تصدق ہے تیری خدائی تجھی پر   ہے زیبا تری کبریائی تجھی پر

یہی ذوق ہے جو گلوں کو بہ ہر شان جل جلالہ   یہ بلبل کا جلوہ ہے جو سوز ہر شان جل جلالہ
یہی چاند گردم پاس ہے جو یہی شمع دل کی آس ہے   یہی غم زدوں کا حکیم ہے جو بہر شان جل جلالہ

الٰہی دکھا دے دیار مدینہ   بنا مجھکو گرد و غبار مدینہ
بنا مسکن ذات محبوب خالق   تو ہے عزت و افتخار مدینہ
گدا کر کے لے چل کہ حاصل ہو مجھکو   سلام شہ کامگار مدینہ
الٰہی بنا دے مری خاک کو تو   غبار سر رہگذار مدینہ

حسرت دیدار کی جینے میں کچھ نہیں مزا   میں بھی تو تجھکو دیکھ کر بندہ تھا خدا کا

نہیں دل دکھانا گوارا ہے تجھے   سنی اسکی جس نے پکارا تجھے

اُسکا جلوہ ہے شمعِ بزمِ جہان — اُسکی رحمت سحابِ عالم ہے

سب دواں کی جو آرزو جانتا ہے — یہ تونے ہی دی اسکو تو جانتا ہے
بن کسی چارہ گر داروے دردِ پنہان — نہ میں جانتا ہوں نہ تو جانتا ہے

تکبر زمانہ کا توڑا ہے تونے — گلا نخوتوں کا مروڑا ہے تونے

مخلوق کا سراپا آرام تو ہی ہے — عالم کا سعادن سحر و شام تو ہی ہے

غرض دیوان حمدیہ (نذر خدا) میں جناب مضطر نے اپنی مشاقی اور پرگوئی کو ثابت کر دیا اور غالباً اپنے رنگ میں یہ پہلا دیوان ہے جس میں صرف حمدیہ غزلیں ہی ہیں۔ اساتذہ نے صرف تبرکاً و تیمناً اپنے دیوانوں میں کچھ اشعار لکھے ہیں یا کوئی نظم مسلسل لکھی ہے مگر جناب مضطر نے پورا دیوان لکھا ہے۔ نقادانِ سخن کو بعض تراکیب اور محاورات فصحائے اُردو کے خلاف اس دیوان میں مل سکیں گے لیکن جذبات کے خلوص کو ایک ہی طرزِ خاص میں مختلف طور سے ادا کرنا اہم کام ہے اس لیے "نذر خدا" قابلِ قدر شے ہے۔ ہر منصف سخن فہم حضرت مضطر کی طباعی کی داد دے گا۔

ناظر

(نظر لکھنوی کی غزل پر ایک سرسری نظر)

منشی نوبت رائے صاحب نظر کے نام سے کچھ ارباب سخن تو ضرور واقف ہونگے۔ آپ ہندو شعرا میں ایک امتیازی درجہ رکھتے ہیں۔ پہلے آپ نے ایک پرچہ "خدنگ نظر" نامے نکالا تھا۔ پھر اسکے بعد آپ کی رسائی الہ آباد کے ادیب (مرحوم) میں ہوئی۔ اس کے بنگالی مالک نے آپ کو ادیب کا ایڈیٹر مقرر کیا مگر بعد چندے آپ وہاں سے علحدہ ہوے۔ اب آپ اودھ اخبار کے ایڈیٹر ہیں۔ ادیب زمانہ میں بھی آپ کی تنقیدیں شائع ہوا کی ہیں اور اس میں شعرائے اردو کے کلام کا حسن و قبح دکھایا جاتا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ آپ زبان اردو کے نقاد اور فن شاعری کے ماہر ہیں۔ کسی شاعر کی تنقید لکھنا اس بات کی کافی شہادت ہو کہ وہ خود فن شاعری میں دستگاہ رکھتا ہو اور وہ جو کچھ کہتا ہو مضامین و مفہوم شعر اور بندش کے لحاظ سے قریباً بے عیب ہو۔ ہم نے نظر صاحب کی رنگ تنقید سے یہ نتیجہ ضرور اخذ کیا ہو کہ وہ مرغیان سخن میں ہیں۔ اور معمولی شعرا کا کیا ذکر امیر مینائی ایسے سخنگو بھی منھ کی کھا گئے ہیں۔ داغ وغیرہ کو بھی ماننے کے طور پر نہیں مانتے ہیں۔ آپ کو جناب نظم صاحب نظم لکھنوی سے تلمذ ہو۔ نظم صاحب خوشگویان لکھنؤ سے ضرور تھے مگر ان کی شہرت کا اثر محدود تھا۔

مجھے اس مختصر مضمون میں کوئی ناگوار بحث شعر و شاعری کے متعلق مقصود نہیں ہو مگر انصافاً اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ کسی ماہر فن نقاد کے کلام میں خود ایسی کمزوریاں نہ ہونا چاہییں جو بدیہی طور پر نظر آئیں۔ میں ذیل میں جناب نظر کی ایک مختصر غزل پر اپنے کچھ خیالات ظاہر کرنا چاہتا ہوں اہل نظر انصاف سے دیکھیں کہ میں نے جو شکوک ظاہر کیے ہیں وہ بیجا ہیں یا بجا و صحیح۔ اس میں شک نہیں کہ اگر تنقید بے تعصبی سے کی جائے تو اس سے فن شعر گوئی پر اچھا اثر پڑتا ہو اور جذبۂ احتیاط بھی پیدا ہو سکتی ہو۔ جناب نظر کی یہ غزل زمانہ میں چھپی ہو مطلع ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں ؎

بے پر و بالی ہوئی ہو باعثِ شادی مجھے
خانۂ صیاد میں حاصل ہو آزادی مجھے

مصرعۂ اولیٰ میں بے پر و بالی ہو جانے کو باعث شادی قرار دے لینا ایک مفروضہ خیال ہو۔ اُس کو خاص باعث شادی کیونکر مان لیا جائے اس لیے کہ بے پر و بالی رنج کا باعث ہو سکتی ہو نہ کہ شادی کا سبب۔ مصرع ثانی میں وہ خانۂ صیاد میں اپنے کو آزاد کہتے ہیں حالانکہ یہ بالکل محال ہو۔ خانۂ صیاد میں گرفتاری کے بغیر رہنا ممکن نہیں۔ طائر قفس ہی میں رہ سکتا ہے۔ اس لیے یہ آزادی بالکل نئی ہو۔ خصوصاً آپ کسی نازک خیالی اور مضمون آفرینی سے اپنے دعوی کو ثابت نہ کر سکے۔ آزادی آپ کو صرف اس قدر حاصل ہو کہ پنجرہ میں ادھر سے ادھر پھدکتے پھرتے ہیں اور قفس کی تیلیوں سے زمین و آسمان وغیرہ کو دیکھ سکیں۔ اگر اسی کا نام آزادی اور بے پر و بالی کا نام

شادی ہو تو حسن تخیل کا خاتمہ ہو۔ اس لیے کہ بے پروبالی میں تو طائر فکر مقید ہو جاتا ہو اور وہ پھڑک بھی نہیں سکتا بہر حال یہ مطلع کیا مفہوم اور کیا نازک خیالی دونوں طور پر اگر بالکل بے معنی نہیں تو بالکل ادنی درجہ کا مطلع ہو اور کسی نقاد سخن کو ایسا مطلع اپنے سے منسوب کرنا چاہیئے۔

پھر فرماتے ہیں ؎

سب سے پہلے درد الفت کو کیا میں نے قبول
نالہ و فریاد کی حاصل ہو ایجادی مجھے

مصرعہ اولی میں جو دعویٰ کیا گیا ہو اس کو صحیح مان لینے کے بعد یہ خیال ظاہر کیا جا سکتا ہو کہ جب آپنے درد الفت کو قبول کیا تو عاشقانہ صبر و تحمل کی شان یہ ہو کہ ضبط نالہ و فریاد کیا جائے اور جب نالہ و فریاد کیا تو گویا درد الفت ناگوار خاطر ہوا اور پھر دوسری بات یہ ہو کہ نالہ و فریاد کی ایجاد حاصل ہونا تک تو غنیمت تھا ایجادی چہ معنی دارد ایجادی میں آزادی اور جلادی کی سی یلے فاعلی یا مصدری نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ ایجاد خود مصدر ہو اور اس کے بعد حاصل ہونا ایجاد کی مزید توضیح ہو اب (ی) کا اضافہ شائد در زائد ہو گیا۔ اور یہ فصاحت سے بالکل بعید ہو۔

پھر فرماتے ہیں ؎

اپنے دل کا مجمع حسرت نظر میں ہو ابھی
کیا پسند آئے کوئی گنجان آبادی مجھے

مصرعہ اولی میں کہا گیا ہو کہ دل کی حسرتوں کا مجمع ابھی میری نظر میں ہو اور دوسرا مصرعہ بطور ثبوت ہو ہر دل خصوصاً عاشق کا دل مجمع حسرت ہی سے بھرا رہتا ہو اور تا دم مرگ رہتا ہو حسرتیں مجسم نہیں ہوا کرتیں۔ یہ خاص کیفیتیں ہیں جن کا احساس دلی جذبات اور دماغی خیالات کو ہوا کرتا ہو اس کا بدل گنجان آبادی نہیں ہو سکتی۔ اگر دل سے حسرتیں ہی نکل جائیں تو گنجان آبادی اور صحرا دونوں یکساں ہیں مفہوم کے لحاظ سے یہ شعر بھی بہت پست ہو اور شاید دوسرے مصرعہ میں آئے کی جگہ (آئیگی) چاہیے۔

پھر فرماتے ہیں ؎

بعد مُردن میری میت کا تبسم ہو گواہ
اپنے مرنے کی ہوئی ہو کس قدر شادی مجھے

مرنے کے بعد تبسم کا ثبوت کسی طرح پر مان لیا جائے۔ مرنے بعد انسان کے لب کسی قدر بدنمائی سے لٹک جاتے ہیں اور اُن سے جو کیفیت نظر آتی ہو وہ غمیں اور یاس آلود ہوتی ہو اس سے کوئی شگفتگی اور تبسم کا اظہار نہیں ہوتا۔ دوسرے مصرعہ میں اس زبردستی کے دوئے تبسم کو وجہ شادی بیان کیا ہو گر ثبوت نہ دیکھا۔ کاش کسی طور پر یہ کہا جاتا کہ مرنے کے بعد غم سے نجات ملی اس وجہ سے میں اپنی موت سے خوش ہوا تو کچھ موزوں ہو سکتا تھا۔

پھر فرماتے ہیں ؎

مشق دل کو خون کرنیکی جو الفت میں رہی
رفتہ رفتہ آگیا کچھ فن جلادی مجھے

عاشقی میں دل کے خون کرنے کی مشق معمولی بات ہو اور یہ بات بھی جذبات عشق سے مخصوص ہو۔ مگر اسکو جلادی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ جلاد جن معنوں میں استعمال کیا جاتا ہو وہ محتاج بیان نہیں۔ کوئی عاشق جلاد نہیں ہو سکتا۔ جلادی ایک ذلیل پیشہ ہو وہ کہاں اور اس معنوی فرق کو ارباب سخن سمجھ سکتے ہیں۔

پھر فرماتے ہیں ؎

سانس لینے میں صدا دیتا ہو ہر تار نفس
ساز درد عشق ہوں کہتے ہیں فریادی مجھے

سانس اور تار نفس ایک ہی چیز ہو۔ اس لیے سانس لینے میں تار نفس کا صدا دینا بالکل لغو ہوا۔ اس لیے سانس کی جگہ آہ سے معنی درست ہو سکتے ہیں۔ آواز نالہ و فریاد میں نکلتی ہو اور سانس لینے میں جو کیفیت محسوس ہوتی ہو وہ آنکھ سے دیکھی جاتی ہو اور یہ وہ بات ہو جو حضرت جناب نظم کو نہیں ہر شخص کو حاصل ہو۔ تار نفس ساز درد جب ثابت ہوتا کہ مصرعہ اولی میں

ف ہماری دانست میں یہ شعر قابل داد ہے۔ (اڈیٹر)

درد سلانہ سانس یا آہ بھری جائے حالانکہ آپ نے محض سانس لینا کہا ہے
مصرعہ اولیٰ اگر یوں ہوتا تو شاید کچھ مفہوم درست ہو جاتا۔ ع

نغمہ سنج درد پنہانی ہے ہر تار نفس

اس مصرعہ سے اب آپ کے مصرعہ ثانی کا ساز درد عشق درست ہو گیا اور بغیر اس کے شعر بالکل بے تال سر تھا۔ اور یہ مثل اُسکے حسب حال تھی کہ من چہ می سرایم و طنبور من چہ می سراید ؎

زندگی کا لطف تھا زندہ دلی تک اے نظرؔ
مرگیا جب دل تو یکساں ہے غم و شادی مجھے

مقطع میں کوئی نئی بات نہیں ہے بالکل پامال مضمون ہے لیکن غائر نظر سے دیکھئے تو مردہ دلی سے غم و شادی یکساں نہیں نظر آتے بلکہ جب تزکیہ نفس سے جذبات پر قابو اور قدرت حاصل ہو جاتا ہے تو غم و شادی کا فرق اٹھ جاتا ہے اور یہ صفت اُن لوگوں کی ہے جو اپنے دل کو روحانی جذبات سے زندہ کر چکے ہیں اور یہ بات اہل اللہ کو حاصل ہوتی ہے اور جو لوگ انتہائے غم و ہم میں شکستہ خاطر ہو جاتے ہیں اگر ان کی شکستہ خاطری کے اسباب دور ہو جائیں تو پھر یہ سامان عیش و راحت کا طالب ہو گا۔ ایک صوفی اور اہل اللہ واقعی سامان شادی و راحت کا خواہاں نہیں ہوتا۔ مولانا روم نے اس خیال کو موزون فرمایا ہے ؎

نقش اثر در رہ است این کہ مردہ است   از غم بے آتشی افسردہ است

جناب نظر کی غزل میں صرف آٹھ ہی شعر چھپے ہیں اور ان سب کی یہ حالت ہو شاید یہ غزل غیر اصلاحی ہو۔ یہی تو ایسے اساتذہ اردو موجود ہیں جن کو کلام دکھا کر عیوب سے پاک کر لیا جائے۔

راقم نے جو خیالات جناب نظر کی غزل پر ظاہر کئے ہیں ان کو ناظرین ملاحظہ فرمائیں شاعری کا اہم فرض یہ ہے کہ جس خیال کی تصویر اتاری جائے وہ پوری ہو، اور مفہوم شعر سمجھنے میں دل و دماغ کو الجھن نہ ہو۔ اب اسکے بعد نازک خیالی اور مضمون آفرینی کے مدارج طے کرتا ہے اور ہر شاعر اپنے مبلغ علم و معلومات اور وسیع النظری کے موافق شعر کہتا ہے۔ اچھوتے اور پامال مضامین کے فرق کو وہی سمجھتا ہے جس نے اساتذہ کے کلام فارسی و اردو کی اچھی طرح سیر کی ہے۔

"سخن دوست"

ضمیمہ رسالہ العصر، ماہ ستمبر ۱۹۱۳ء

زمانہ مجھکو بُرا کہہ رہا ہے کہنے دو
مین جانتا ہون زمانے کا اعتبار نہین

آج کئی ماہ کے بعد زمانہ نے کروٹ لی۔ ماہ اگست ۱۹۱۳ء کا پرچہ میری نظر سے گزرا اس مین وہ مضمون بھی بتصرفِ خاص نقل کیا گیا ہے جو "العصر" کے جولائی نمبر مین "ہالکو بچالیہ اس" کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ یہ درصل "اکسیر سخن" کا مقدمہ ہے جسکو منشی پریم چند نے تحریر فرمایا تھا۔

ایڈیٹر صاحب زمانہ ایک مدت سے ہم پر خاص مہربانی فرماتے ہین ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۳ء مین کئی دفعہ وہ ہمارے متعلق بے سروپا باتین لکھ چکے ہین جنکی ہمنے کچھ پروا نہین کی۔ اس دفعہ آپنے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے یعنی مذکورۂ بالا مضمون نقل کرتے وقت جابجا تحریف ہی نہین کیا بلکہ یہ بھی لکھا ہے کہ "اکسیر سخن" کے نام سے جو نظمین کتابی صورت مین شائع ہوئی ہین تحقیقی طور پر ثابت ہوا ہے کہ وہ سرور مرحوم کی تصنیف ہین۔

وسط ۱۹۰۹ء مین میری ایک نظم رسالہ مخزن مین شائع ہوئی تھی جسکا عنوان "آہ" تھا۔ اسوقت تک سرور مرحوم سے مجھ سے خط و کتابت نہ تھی۔ صرف کانپور مین ایکدفعہ سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ اس نظم کی انھون نے بہت داد دی اور یہین سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا جو انکی زندگی تک برابر جاری رہا۔ اسی زمانہ مین میرا ایک نثر مضمون بعنوان "ہالکو بی کالیداس" مخزن مین شائع ہوا تھا۔ میرے مکرم میر کرامت اللہ صاحب تیر (امرتسری) نے تحریک کی مین خود ہی کالیداس کی تصنیف کا ترجمہ کرون۔ آخر کار مین اس پر آمادہ ہوا اور ترجمہ کے لیے "رتو سنگھار" کو انتخاب کیا۔ اس سلسلہ کی سب سے پہلی نظم (فصل خریف) دسمبر ۱۹۱۰ء کے زمانہ مین شائع ہوئی۔ اس نظم کی اشاعت کے بعد ایڈیٹر صاحب زمانہ نے بقیہ نظمین زمانہ مین شائع کرنے کی غرض سے طلب کین چنانچہ دو اور نظمین (ہمنت اور برکھا رت) انھین دیگئین۔ یہ تینون نظمین سرور مرحوم کی زندگی ہی مین زمانہ مین شائع ہوئی تھین۔ اسکے بعد بھی یعنی وسط ۱۹۱۲ء مین ایڈیٹر صاحب زمانہ نے بقیہ نظمین طلب کین مگر مین نے کتابی صورت مین چھپوانے کے خیال سے ان نظمون کی اشاعت مناسب نہ سمجھی مگر چند ماہ کے بعد ہی کرمی جناب [illegible] کی فرمائش پر اس سلسلہ کی ایک نظم "بسنت رت" جو موسم کے لحاظ سے بھی باموقع تھی انھین بھیجدی جو مارچ ۱۹۱۳ء کے مخزن مین شائع ہوئی اور بعد اشاعت مخزن بازار اس نظم کو اخبار "آزاد" مین نقل کیگئی۔

اس سلسلہ کی تین نظمین سرور مرحوم کی زندگی ہی مین زمانہ مین شائع ہو گئی تھین آج تک صاحب زمانہ نے کوئی تردید نہین کی۔ اسکے بعد ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۳ء تک بھی گویا حقیقت حال سے بیخبر رہے اب ۱۹۱۳ء مین اُنکو تحقیقی طور پر ثابت ہوا ہے کہ "رتو سنگھار کا ترجمہ مسٹر شاکر کی مدد سے حضرت سرور مرحوم نے کیا ہے اور اکثر موسمون کی نظمین زمانہ مین ہدیۂ ناظرین ہوچکی ہین۔" اسکے آگے تو شاید یہ بھی دیکھیے کہ "مسٹر شاکر نے ان نظمون کے مجموعہ کو اکسیر سخن کے نام سے اپنے نام سے شائع کیا ہے۔ زمانہ مین اشاعت کے لیے بھی یہ نظمین ہمکو انھین سے ملی تھین اور اُن کے آخر مین انھین کا نام ثبت تھا۔" مین لکھ چکا ہون کہ زمانہ مین اکسیر سخن کی تین نظمین سرور مرحوم کی زندگی ہی مین شائع ہو گئی تھین ۱۹۱۱ء مین جب "ہمنت" والی نظم زمانہ مین شائع ہوئی ہے اُسوقت جناب سرور کانپور ہی مین ایڈیٹر صاحب زمانہ کے مہمان تھے۔ اگر ایڈیٹر صاحب زمانہ عدم واقفیت کی وجہ سے معذور تھے تو سرور مرحوم نے کیونکر اپنی نظمون کو غیر کے نام سے چھپنا گوارا کیا۔ یہ بالکل خلاف عقل اور قیاس بات ہے کہ کوئی مصنف اپنی تصنیف کو دوسرون کے نام سے شائع ہوتے دیکھے اور سکوت اختیار کرے۔ لطف یہ کہ زمانہ کے جن پرچون مین میری یہ نظمین شائع ہوئی ہین انھین مین سرور کی نظمین بھی چھپی ہین اسلئے ضرور ہے کہ سرور نے زمانہ کے یہ پرچے دیکھے ہونگے۔

اب اصل کیفیت ملاحظہ فرمائیے۔ اوائل ۱۹۰۹ء مین بمقام الہ آباد ایک پنڈت جی سے زیادہ ربط و رسم ہو جانے پر مین نے ان سے درخواست کی کہ بعض سنسکرت نظمون کا اردو ترجمہ کرا دیجیے۔ انھون نے درخواست منظور کی چنانچہ مین نے "گنگا لہری" سے

متعدد انگریزی اور ہندی ترجمے بھی رتو سنگھار اور سگھند دت[1] کے منگائے۔ ترجمہ کرتے وقت ان سے بھی مدد لی جاتی تھی۔ جب رتو سنگھار کا نثر ترجمہ ہو چکا تو اسکو نظم کرنے کی فکر ہوئی۔ خریف کا موسم قریب تھا۔ لہذا سب سے پہلے یہی نظم کیگئی۔ سرور مرحوم سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہو چکا تھا۔ لہذا مین نے انسے درخواست کی کہ آپ بھی ان نظمونکو دیکھ لیا کرین۔ اُنھون نے منظور کیا اور یہ بھی لکھا کہ نثر ترجمہ بھی بھیجدیا کیجیے تاکہ مجھے تفہیم مطالب مین آسانی ہو۔ اسطرح جناب سرور کی شاعرانہ قابلیت سے مین نے استفادہ کیا۔ چار فصلین سرور مرحوم کی زندگی ہی مین نظم ہو ئین اور بقیہ[2] دو انکی وفات کے بس ڈیڑھ برس بعد لکھی گئین۔ بالفرض اگر اصلاح و مشورے وہ چار نظمین صاحب زمانہ کے نزدیک سرور کی ہو گئین تو ان دو نظمونکی نسبت وہ کیا کہتے ہین۔

سنہ ۱۹۱۲ء مین اڈیٹر صاحب زمانہ نے یہ نظمین کتابی صورت مین شائع کرنیکی غرض سے طلب کین اور ۲۵ ۔ ۳۰ جلدین معاوضہ تحریر کیا۔ اگر مین نے دلی شکریے کے ساتھ اسکو نامنظور کیا۔ جب یہ نظمین بغرض اشاعت آپکو نہ دی گئین بلکہ خلاف امید اس سلسلہ کی ایک نظم نقاد (مارچ سنہ ۱۹۱۳ء) مین شائع ہوئی تب شاید انتقام حال کا خیال سے ضرورت ہوئی کہ رتو سنگھار کے اصل مترجم کا پتا لگایا جائے اور نہایت خوشی کی بات ہے کہ بزعم خود آپ اسمین کامیاب بھی ہوئے۔ گو اکسیر سخن کی اشاعت کے ساتھ آٹھ ماہ بعد ہی سہی۔ ع این کار از تو آید و مردان چنین کنند

اس موقع پر یہ ظاہر کر دینا بھی غالباً نامناسب نہ ہوگا کہ طالبعلمی کے زمانہ ہی سے میری طبیعت شعر گوئی کیطرف مائل تھی۔ سنہ ۱۹۰۱ء مین حضرت شوکت میرٹھی مدظلہ سے تلمذ اختیار کیا۔ مگر نظمین لکھنے کا ذوق سنہ ۱۹۰۶ء یا سنہ ۱۹۰۷ء مین ہوا اور اُسوقت سے مخزن اور زمانہ اور دیگر رسائل مین نظمین شائع ہو ئین۔ تحفہ سرحد کی اڈیٹری کے زمانہ سے شعر گوئی کا بہت کم موقعہ ملا۔ مگر اُس زمانہ مین بھی ملک مین میرا تعارف شاعر ہونے کی حیثیت سے ہو چکا تھا۔ جولائی سنہ ۱۹۰۷ء مین مین زمانہ کا سب اڈیٹر و مینیجر ہوا۔ اُسوقت بھی منشی دیا نرائن مجھے شاعر کی حیثیت سے جانتے تھے۔ قیام الہ آباد کے زمانے مین مضمون نگاری ہی میرا ذریعہ معاش تھا۔ مختلف اخبارات و رسائل کو مضامین نظم و نثر معاوضہ زر نقد دیتا تھا۔ چنانچہ خود زمانہ بھی انھین پرچون مین شامل ہے اور جب کی اڈیٹری کے بعد اس سلسلہ کو جاری رکھنے کی ضرورت نہ رہی۔

تعجب تو یہ ہے کہ آغاز سال سے ان تک اڈیٹر صاحب زمانہ کو یقین تھا کہ مین شاعر ہون اور اسکی وجہ بھی معقول تھی کیونکہ مین کئی فرمائشی نظمین زمانہ کے لیے لکھ چکا تھا۔ ایکدفعہ ایک تصویر کے متعلق تاکید کی گئی تھی کہ تین روز کے اندر اندر نظم لکھکر بھیجدیجائے۔ اسکے جواب مین نظم فسون بہ سوتی بھیجی گئی جو زمانہ بابتہ ماہ جون سنہ ۱۹۱۰ء مین شائع ہوئی۔ جنوری سنہ ۱۹۱۲ء کے پرچے کے لیے بھی ایک خاص نظم کی فرمائش کیگئی لیکن کچھ تو اس وجہ سے کہ ادھر مین سخت پریشانیون مین مبتلا رہا اور کچھ اس لحاظ سے بھی کہ اس سے پیشتر زمانہ ما زادہ مین دو ایک مرتبہ مجھ پر بیجا حملے ہو چکے تھے تعمیل ارشاد کی جرأت نہ ہوئی۔

سرور مرحوم کا بہت سا غیر مطبوعہ کلام ابتک میرے پاس موجود ہے۔ بعض نظمین مین نے ادیب مین شائع کرائین اور بعض العصر مین چھاپی ہین۔ ان کے علاوہ ابھی کافی ذخیرہ ہے جسکی اشاعت کا حق مرحوم کے برادر کلان نے تحریر کے ذریعہ سے مجھے مرحمت فرمایا ہے۔ یہ مجموعہ کم و بیش دس بارہ جز کا ہوگا۔ کچھ نظمین انمین ایسی ہین جو جناب سرور نے بزمانۂ قیام الہ آباد کہی تھین اور جام سرور (جلد دوم) کے لیے بھیجدی تھین۔ بعض وہ نظمین ہین جو خاص میری فرمائش پر کہی گئی تھین۔ جلد دوم کے مرتب ہونیکی صلاح ہو رہی تھی کہ مجھے الہ آباد سے وطن واپس جانا پڑا۔ دسمبر مین وہ خود آنیوالے تھے کہ پیغام اجل آگیا۔ ابتک جلد دوم معرض التوا مین ہی۔ اب کوئی مہینہ بھر سے وہ کلام چھپ رہا ہے۔ اسکی اشاعت کے بعد ملک خود اندازہ کر لیگا کہ مین نے جناب سرور کے کلام کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ اڈیٹر صاحب زمانہ نے خود بھی سرور مرحوم کا یہ کلام بغرض اشاعت مجھ سے طلب کیا تھا اور میرے ہی ذریعے سے انھین اسکی اطلاع ہوئی تھی۔ میری تحریر سے پیشتر انھین معلوم بھی نہ تھا کہ میرے پاس سرور کا کچھ کلام ہے۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ مین سرور کے اس کلام کو بھی اپنے نام سے شائع کرتا۔

رفع بدگمانی و ازالہ غلط فہمی کے خیال سے یہ چند سطور لکھنے کی ضرورت واقع ہوئی ورنہ مین اپنا وقت اس قسم کے بحث مباحث کی نذر نہین کر سکتا۔ جنکو خدا نے عقل و تمیز کی نعمت عطا فرمائی ہے وہ خود اپنی قوت فیصلہ سے کام لین گے اور زمانہ کی اس دل شکن روش پر نفرین کرین گے۔

شاکر (میرٹھی) ۲۵ اکتوبر سنہ ۱۹۱۳ء

[1] سگھند دت کلام ... کا ترجمہ منظوم مکمل ہو چکا ہے [illegible] جلد کتابی صورت مین شائع ہو گا۔ [2] اس موقع پر [illegible] [illegible]

[illegible]

(رائے بہادر منشی پراگ نراین صاحب بھارگو)

نورِ نگاہ چشم تمنا سے اُٹھ گیا
مرحوم ایک ہی تھا جو دُنیا سے اُٹھ گیا

زمین کھا گئی آسمان کیسے کیسے

آسمان علم و ہنر رائے بہادر آنریبل منشی پراگ نرائن بھارگو بھی اُن مشاہیر زمانہ بزرگوں میں سے تھے جن کو دُنیا باوجود اپنی نیت نئی گردشوں کے روز نہیں پیدا کر سکتی وہ لوگ حیات جاودانی کے مستحق ہیں جن کا نام نامی محبت و عزت سے لیا جاتا ہے۔ انتزاع سلطنت اودھ کے بعد شہر لکھنؤ پر جو آئے دن زمانہ کی آفتیں اور مصیبتیں نازل ہوا کیں کہ اہل و متاع و آبرو کے ساتھ اُنکا وطن عزیز بھی چھوٹنے کو تھا کہ یکایک ایک فرشتہ رحمت منشی نولکشور صاحب مرحوم کی صورت میں پردۂ غیب سے ظاہر ہوا اور ندا کی کہ "آؤ میں تمھیں اپنے ظل عاطفت میں پناہ دونگا اور تمھاری بگڑی کو بنا دونگا" منشی صاحب مرحوم نے اپنے گرد اہل کمال کا مجمع ہی نہیں اکٹھا کیا بلکہ اس گئے گزرے وقت میں بھی علم کی آبرو رکھ لی۔ انھیں اہل کمال کی دعاؤں کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو وارث بھی ایسا عنایت فرمایا جو گویا اطبن اور ہی سے ملک و قوم کا درد ساتھ لایا تھا۔ اُنھوں نے اپنی قلیل زندگی میں کافی شہرت نیکنامی حاصل کی جو کارخانہ جات آپ نے وراثت میں پائے تھے اُن کو اپنی خداداد لیاقت و قابلیت سے بدستور جاری رکھا۔ بلکہ اُن کو اور زیادہ ترقی دی۔ پبلک مفاد کے لیے اِن صوبجات میں جو تحریک ہوتی تھی اُنمیں آپ کا عملی حصہ ہمیشہ زیادہ ہوتا تھا۔ یوں تو آپ کو سیاسی تمدنی تعلیمی اور حرفتی مسائل سے یکسان دلچسپی تھی مگر مؤخر الذکر صیغوں میں آپ زیادہ منہمک نظر آتے تھے۔ اور حق یہ ہے کہ تعلیمی اور صنعتی صیغے ہی انسان کو زیادہ فائدہ پہنچانے والے ہیں بالخصوص ہندوستان ایسے ملک میں۔

رائے بہادر منشی پراگ نرائن صاحب بھارگو نے اپنی والدہ مرحومہ کی یادگار میں دریائے گومتی لکھنؤ کے کنارے نہایت خوبصورت اور عالیشان گھاٹ اور مندر بنوایا تھا اور اسکے ساتھ ہی ایک پاٹ شالہ

بھی قائم کی جسمین نادار طلبا کو نہ صرف مفت تعلیم دیجاتی ہو بلکہ اُن کی رہائش اور طعام کا بھی معقول انتظام ہو۔ ہندو یونیورسٹی مین آپنے تیس ہزار کی بیش بہا رقم چندہ مین دی۔ آگرہ کالج اور بریلی کالج کے آپ ٹرسٹی تھے۔ آگرہ الورا اور لاہور کے بھارگو بورڈنگ ہوس محض آپ ہی کی وجہ سے ابتک قائم ہین۔ صنعتی تعلیم مین آپکو بغایت دلچسپی تھی۔ ایک اسکیم آپکے زیر غور تھی کہ آپکے کارخانون کے ساتھ ایک اسکول کھولا جائے جسمین مزدورون کو مشین وغیرہ چلانے کی تعلیم دیجائے۔ سنہ ۱۹۰۷ء مین حرفتی تعلیم کی جو کمیٹی گورنمنٹ نے قائم کی تھی آپ اُسکے ممبر تھے۔ اس کمیٹی مین یہ طے پایا تھا کہ کانپور مین ایک ٹیکنالاجیکل انسٹی ٹیوٹ بہت جلد قائم کیا جائے۔ جب بہت عرصہ ہوا اور یہ انسٹی ٹیوشن قائم نہوا اور جنگ کی وجہ سے ملک کو عام طور پر یہ محسوس ہونے لگا کہ صنعت و حرفت کے بغیر ملک کو خوشحالی میسر نہین ہو سکتی اور اس ترقی کے لیے تعلیم کا ہونا ضروری ہی تو آپنے معاً اسی کونسل مین اِسکے متعلق ایک رزولیوشن بھی پیش کیا، مگر حضور لفٹنٹ گورنر بہادر کی درخواست پر واپس لے لیا۔ رُڑکی کالج کی نسبت آپ نے گورنمنٹ کو نہایت صائب رائے دی تھی جسکا اعتراف گورنمنٹ گزٹ مین عمدہ الفاظ مین کیا گیا۔ اسی رائے کا اثر تھا جو رُڑکی کالج کے آپ ممبر بنا دیے گئے۔ صوبجات ہٰذا کی صنعت و حرفت کی ترقی کی تدابیر سوچنے کے لیے سنہ ۱۹۱۴ء مین بورڈ آف انڈسٹریز قائم ہوا تو آپ بھی اُسکے ممبر ہوے۔ اُسی سال آپکو حضور لفٹنٹ گورنر بہادر نے اپنی کونسل کا ممبر نامزد فرمایا۔ اور سنہ ۱۹۱۶ء مین جدید کونسل مین تو آپ دوسری مرتبہ بھی ممبر انتخاب ہوے۔ پھر اپریل سنہ ۱۹۱۷ء مین صوبجات ہٰذا کی انڈسٹریل کانفرنس کے آپ پریسیڈنٹ مقرر ہوے۔ آپ کا صدارتی اڈریس بہترین اڈریسون مین شمار کیے جانے کے قابل ہی۔ اسی سال آپ بارھوین انڈین انڈسٹریل کانفرنس کے استقبالیہ کمیٹی کے چیرمن تھے

مگر قضا و قدر کے معاملات مین کسیکو دخل ہی افسوس کہ آپنے چند دن پیشتر داعی اجل کو لبیک کہی۔ علاوہ اُسکے مرحوم کے سیکڑون کارِ فادہ عام کے امور ایسے ہین جن سے ہزارہا بندگانِ خدا کو عظیم فائدے حاصل ہوے۔

آہ! کون جانتا تھا کہ ایسا ہمہ تن خیر جس کے دلمین ہر وقت ملک و قوم کا درد رہتا تھا ہم سے اتنی جلد چھین لیا جائےگا۔ ہم پراگ نرائن کے لیے نہین رو رہے ہین بلکہ لکھنؤ کی بیوائین یتیمین اور کس مپرس طالب علمون کے حال زار پر نوحہ کنان ہین لکھنؤ کے پُرانے رئیسون کی طرح ہزارہا بندگانِ خدا آپکے بھی دامن دولت سے وابستہ تھے۔ لاکھون روپیہ خیر خیرات مین آپ صرف فرماتے تھے سیکڑون شریف حاجتمندون کی آپ اسطرح خفیہ مدد کرتے تھے جس کی کسی کو خبر نہوتی تھی۔ حیف! آج اُنکے گھر دن مین کہرام برپا ہی۔ سچ ہی کہ ایسے لوگ زندۂ جاوید ہین۔ موت اُنکے اجسام پر تو قبضہ کر لیتی ہی مگر اُنکے نیک نام کو جو جریدۂ عالم پر ثبت ہو چکا ہی ہرگز ہرگز نہین مٹا سکتی!

ناظرین! مرحوم کے ذاتی صفات اور ذاتی خوبیان ایسی تھین کہ جس شخص نے خواہ وہ انگریز ہو یا ہندستانی ہو بنگالی ہو یا دکھنی ہندو ہو یا مسلمان آپ سے ایک مرتبہ ملاقات کر لی بس پھر اُن سے محبت ہو جاتی تھی۔ آپ کے دوستون کی تعداد بیشمار تھی ہر شخص سے آپکے تعلقات ایسے تھے کہ حقیقی بھائیون مین نہین ہوتے۔ اور یہی وجہ تھی کہ آپکے زمانۂ علالت مین چند ہی خود غرض احباب ہونگے جنھون نے اگر آپ کی کم و بیش خدمت کی ہو۔

ایک مرتبہ ایک ڈپارٹمنٹ کے افسر آپ کی خدمت مین گئے اور بیان کیا کہ فلان چپراسی نے ایسی حرکت کی ہی کہ وہ ڈسمس کر دیا جائے آپ بھی پہلے پہل بہت ناراض ہوے کہنے لگے کہ اُس نے ایک دو مرتبہ ہم کو بھی دھوکا دیا اور ہم غور کر رہے تھے کہ اُسکو کیا سزا دی جائے پھر کہنے

نہایت دھیمی آواز سے دریافت کیا کہ کیدن صاحب اُسکو تنخواہ کیا ملتی ہے جواب ملا کہ پانچ روپیہ۔ آپ نے فرمایا کہ آجکل جب ہر چیز اسقدر گران ہے ایک شخص جسکے پیچھے ایک کنبہ بھی ہو پانچ روپیہ ماہوار مین کیسے گذر کر سکتا ہے جب پیٹ نہین بھرتا بال بچے پریشان کرتے مین تو انسان ہر کام کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔ میری راے مین اُس کی تنخواہ اُتنی ہی کر دی جائے جتنی دیگر چپراسیون کی ہے یعنی سات روپیہ ماہوار اور پھر تین ماہ کے بعد رپورٹ بھیجیے کہ اُسکی عادتین درست ہوئین یا نہین۔ ناظرین یہ تعجب کی بات نہین ہے کہ اُسکی شکایت پھر مرحوم کے کان تک نہ پہنچی۔

اگر بار خاطر نہو تو ایک اور واقعہ بیان کیا جائے۔ ایک دفعہ ایک بڈھا مسلمان آپ کی خدمت مین حاضر ہوا آپ نے کہا کہ اب کی مرتبہ تو بہت مدت کے بعد آئے ہین کہیے آپ کچھ تیار کر کے بھی لائے؟ اُسنے تنزیب کی تین ٹوپیان پیش کین اور کہنے لگا کہ حضور اسکے تیار کرنے مین عرصہ لگا اسی لیے حاضر نہو سکا۔ پوچھا اُن کی قیمت کیا ہے؟ اُسنے جواب دیا کہ حضور ایک دس روپیہ کی۔ ایک پندرہ کی اور ایک پینتیس کی۔ آپ نے تینون ٹوپیان لے لین اور اُسکو ساٹھ روپیہ دلوا دیے بعد مین جب دریافت کیا گیا کہ کیا واقعی اتنی قیمت کی یہ ٹوپیان ہین تو آپ نے جواب دیا کہ اِس شخص نے مطبع مین چالیس برس ملازمت کی ہے اب اِسکو پنشن ملتی ہے۔ مگر اُس پنشن مین گزارہ نہین ہوتا۔ جب تکلیف مین ہوتا ہے تو یہ ہمارے پاس آتا ہے اور ہم سے کچھ لیجاتا ہے۔ ٹوپیون کا بہانا ہوتا ہے تاکہ اسکو یہ محسوس نہو کہ مین نے بلا محنت کے یہ روپیہ لیا اور ہمین یہ خیال نہو کہ ہم نے مفت روپیہ دیدیا۔ ناظرین اس قسم کی سیکڑون مثالین ہین جن سے آپ کی غربا پروری اور اپنے ملازمین کے ساتھ محبت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

آپ کو ہر کام کے کرنے مین ایک خوشی محسوس ہوتی تھی۔ چنانچہ جن احباب کو آپکے زمانۂ علالت مین دیکھنے کا موقع ملا ہے وہ اِس بیان کی تصدیق کر سکتے ہین کہ جس وقت ڈاکٹر آپ کے پھوڑون پر اپریشن کرتا تھا اُس وقت بھی آپ اپنی خوش مزاجی کو نہین چھوڑتے تھے۔ اُردو اور ہندی لٹریچر کی خدمت جو آپ کے مطبع نے آپ کے دوران عہد مین کی وہ مخفی نہین ہے مشرقی اور ہندوستانی زبانون نے جتنی ترقی آپ کے زمانہ مین آپ کے مطبع کے ذریعے سے کی اسکی دوسری مثال نہین ملے گی۔

عدالت جوڈیشلی کے فاضل جج کی تقریر کا یہ فقرہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مرحوم صوبجات ہی کے لیے نہین بلکہ اقطاع ہند کیلئے مفید ترین انسان تھے۔

مضمون کو ختم کرتے وقت ہماری یہ دعا ہے کہ مرحوم کے صاحبزادہ بلند اقبال کو خداوند عالم توفیق خیر عطا فرمائے اور اپنے باپ دادا کی طرح ناموری بخشے۔ اور اپنے ملک و قوم کی خدمت کرنے کا شوق عطا فرمائے۔ آمین۔

عشقی

(لکھنؤ کا قومی ہفتہ)

ہفتہ کرسمس میں جو چہل پہل اور رونق امسال لکھنؤ میں رہی وہ بہت کم کسی شہر میں دیکھی گئی ہوگی کانگریس کے علاوہ دیگر متعدد مختلف کانفرنسیں انھیں دنوں میں اس تاریخی شہر میں منعقد ہوئیں جن میں شرکت کی غرض سے ہر صوبہ کے تعلیم یافتہ طبقہ کے ممتاز ترین اصحاب بلا اختلاف عقائد وہان مجتمع تھے اور صوبجات متحدہ کے لوگ تو جوق جوق موجود تھے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان مختلف جلسوں میں سے بعض کی مفصل اور بعض کی مختصر کیفیت ہدیۂ ناظرین کی جائے سب سے پہلے بالفعل ہم انھیں کانفرنسوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جن سے ہمیں بھی کسی قدر تعلق ہے۔

اردو کانفرنس

اردو کانفرنس جس کے انعقاد کی تیاریاں تین مہینے سے مسلسل جد وجہد ہو رہی تھی، بالآخر ۲۹ دسمبر کی صبح کو ٹھیک ۱۰ بجے قیصر باغ کی خوشنما بارہ دری میں منعقد ہوئی۔ بارہ دری مذکور کی آرائش کا اہتمام کارکنان آل انڈیا مسلم لیگ در عالیجناب سر راجہ صاحب محمود آباد کے ارشادات کی نگرانی میں تھا اور اگرچہ اس سبب سے کہ لیگ کا سالانہ جلسہ ایک روز بعد سے شروع ہونے والا تھا تمام انتظامات مکمل نہ ہوئے تھے تاہم بارہ دری کی محرابوں اور ستونوں پر رنگین کاغذ کی پھول پتیاں جس خوش سلیقگی کے ساتھ لگائی گئی تھیں ان سے ایک خاص دل آویزی کی شان پیدا ہو گئی تھی۔ بارہ دری کے وسطی کمرے میں جانب مغرب ایک بلند و وسیع پلیٹ فارم (چبوترہ) ہشت پہلو اور نمایان طور پر جلسے کے واسطے بنایا گیا تھا جس پر کوچین اور گدے دار کرسیان رکھی ہوئی تھیں۔ اس چبوترے کی پشت پر ایک دوسرا چبوترہ خاص اردو کانفرنس میں شریک ہونے والی خواتین کے لیے تیار کیا گیا تھا جہان پردے کا اچھا انتظام تھا کہ شاید اس سے پہلے کسی جلسے میں نہیں کیا گیا۔ اور اس حسن انتظام کے تمام تر ذمہ دار ڈاکٹر ناظر الدین حسن صاحب ایم اے ایل ایل ڈی بیرسٹر ایٹ لا تھے۔ وہ چیز جسے ہم اردو زبان کے نام سے موسوم کرتے ہوں اس وقت تک پوری طرح ترقی پذیر نہیں ہو سکتی جب تک خود ہماری ماؤں کو اس تحریک میں پوری دلچسپی نہ ہو۔ اسی خیال کی بنا پر اس بات کا خاص اہتمام کیا گیا تھا کہ طبقہ ذکور کے ساتھ ساتھ طبقہ اناث کی نمایندگی سے بھی اس جلسے کو بہرہ وافر حاصل رہے۔ اور اگرچہ خواتین کے پاس رقعات دعوت کسی قدر دیر میں پہنچے اور ایک حد تک انھیں لکھنؤ ہی کی خواتین تک محدود رکھنا پڑا تاہم لکھنؤ اور مضافات لکھنؤ کی تقریباً بیس تیس خواتین اردو کانفرنس کے اجلاسوں میں شریک رہیں۔

۸ بجے سے بارہ دری میں مجمع ہونے لگا اور ۹ بجے سے پہلے پہلے وسطی کمرہ اور ڈائس کی سب کرسیاں پر ہو گئی تھیں۔ ٹھیک ۹ بجے جناب نواب سید نصیر حسین صاحب خیال (پریسیڈنٹ) رونق افروز ہوئے اور پرجوش نعرہ ہائے آفرین کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ جلسے میں ہر صوبے کے معزز اصحاب شریک تھے جن میں سے خاص خاص اصحاب کے نام یہ ہیں:۔ عالی جناب سر راجہ صاحب جہانگیر آباد۔ آنریبل مسٹر محمد علی جناح۔ آنریبل مسٹر مظہر الحق۔ سید نبی اللہ صاحب۔ آنریبل مسٹر یعقوب حسن سیٹھ۔ سیفی الدولہ نواب علی حسن خان صاحب۔ شیخ شاہد حسین صاحب۔ مولوی نظام الدین حسن صاحب۔ مسٹر مارگولیتھ (جو یورپ کے مشہور عالم ہیں اور آجکل ہندوستان کی سیاحت کر رہے ہیں)۔ آنریبل نواب نواب علی چودھری صاحب۔ نواب آغا محمد شفیع خان صاحب۔ آنریبل میان فضل حسین صاحب۔ نواب سلطان علی خان صاحب۔ منشی احتشام علی صاحب۔ آنریبل مسٹر فضل الحق۔ مولانا آزاد سبحانی۔

پروفیسر مرزا محمد ہادی صاحب۔ مسٹر ممتاز حسین۔ حاجی موسیٰ خان صاحب۔ نواب فتح علی خان صاحب قزلباش۔ سید حبیب اللہ صاحب مسز نائیڈو (انگریزی زبان کی مشہور شاعرہ) وغیرہ۔

سب سے پہلے عالی جناب نواب ذو القدر جنگ بہادر ایم اے بیرسٹر ایٹ لا صدر مجلس استقبالیہ نے اپنی نہایت ہی فصیح و بلیغ تقریر صدارت پڑھی جس کے مطبوعہ نسخے تمام حاضرین کو تقسیم کر دیے گئے تھے اور بجنسہ العصر کے اس نمبر میں تمام و کمال شائع کی جاتی ہے۔ اس خطبے میں خیر مقدم اور بعض رسمی تذکروں کے علاوہ مختصراً اُن متعدد مباحث پر ایک سرسری بحث کی گئی تھی جو زبان اُردو کی توسیع و ترقی کے لیے تمام اہل ملک کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ یہ صدارتی خطبہ ایسی سلیس اور فصیح عبارت میں لکھا گیا ہے کہ یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ جناب نواب صاحب نے ادبِ اُردو کا ایک نہایت ہی پاکیزہ نمونہ پیش کیا ہے جو محض اپنی ادبی خوبیوں کی بنا پر اس قابل ہے کہ تمام اُردو خوان اصحاب اس سے لطف اندوز ہوں۔

نواب ذو القدر جنگ بہادر کی تقریر کے خاتمہ پر سید نبی اللہ صاحب (ایم اے ایل ایل ایم بیرسٹر ایٹ لا) لکھنؤ نے ایک مختصر تقریر میں تحریک پیش کی اور لکھنؤ کے مشہور شاعر مولانا سید علی نقی صاحب صفیؔ نے حسب ذیل شعر میں جو فی البدیہہ موزوں کیا گیا تھا اس تحریک کی تائید کی ؎

صفی کل تذکرہ ہوگا کہ یہ بھی کہتا تھا ۔۔۔ تہ دل سے میں اس تحریک کی تائید کرتا ہوں

جس کے بعد نواب نصیر حسین صاحب خیالؔ نے جن کی صدارت کا پہلے سے اعلان ہو چکا تھا کرسی صدارت کو زینت بخشی اور ایک مختصر تقریر میں اس قدر افزائی کا شکریہ ادا کر کے اپنا صدارتی خطبہ پڑھنا شروع فرمایا۔ یہ خطبہ اگرچہ نہایت طولانی ہے مگر زبان اُردو کی قدیم تاریخ کے متعلق قیمتی معلومات کا ایسا ایک قابل قدر ذخیرہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ حقیقت میں یہ کوئی خطبہ نہ تھا بلکہ اگر اسے زبان اُردو کی ایک مستقل تاریخ کہا جائے تو بیجا نہیں۔ العصر کی محدود ضخامت سے اس خطبہ کو بالاقساط شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ کوشش تھی کہ اسی نمبر سے اس کی اشاعت ہوتی مگر چند وجوہ سے ایسا نہ ہو سکا۔ نواب صاحب نے خود ایک نسخہ تصحیح فرما کر ہمیں ارسال کیا ہے جس کے لیے ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں یقین ہے کہ جو حضرات اس خطبہ کو بالاستیعاب مطالعہ فرمائیں گے وہ بہت محظوظ ہوں گے۔

خطبۂ صدارت کے بعد ہز ہائنس نواب صاحب رامپور کا حسب ذیل تار پڑھ کر سنایا گیا۔ جو اُنھوں نے اُردو کانفرنس کے صدر نشین کے نام روانہ فرمایا تھا:-

اُردو کانفرنس کے اغراض و مقاصد نہایت قابل تحسین ہیں اور مجھ کو اس میں شبہ نہیں کہ آپ کی (یعنی صدر جلسہ کی) رہنمائی میں جو کارروائی اُن کو کامیاب بنانے کے متعلق کی جائے گی وہ بہت پسند کی جائے گی۔ میں کانفرنس کی کامیابی کا بدل خواہاں ہوں۔

اس کے بعد حسب ذیل تجاویز جناب صدر پیش ہوئیں جو باتفاق آرا و بکمال جوش منظور ہوئیں۔

(الف) یہ کانفرنس سید علی محمد عارف یادگار جناب تسلیمؔ مرحوم اور مشہور محب وطن پنڈت بشن نرائن در تخلص بہ آبر اور نواب سید محمد صاحب آزاد لیس کلکتہ اور آنریبل منشی پراگ نرائن بھارگو والے بہادر کی وفات پر اپنے دلی رنج و ملال کا اظہار کرتی ہے کہ بزرگان موصوف قوم کے ایک فرد اور زبان اُردو کے محسن و سرپرست تھے۔

(ب) یہ کانفرنس اس پیش قرار عطیہ کا کمال احسان مندی کے ساتھ شکریہ ادا کرتی ہے جو حضور نظام خلد اللہ ملکہ کی جم پرور اور دریا دل سرکار نے پانچ ہزار روپے سالانہ کی صورت میں انجمن ترقی اُردو کو دینا منظور فرمایا ہے اس بر محل امداد نے درحقیقت انجمن کی بنیادیں مستحکم کر دیں اور کام کرنے والوں کی ہمت اور حوصلے بڑھا دیے ہیں۔

(ج) ہز ہائنس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ خلد اللہ ملکہا کے اُن احسانات عظیم کا جو مدد سے اُردو علم و ادب بالخصوص کر انجمن ترقی اُردو پر کیے ہیں

اعتراف کرنا یہ کانفرنس اپنا فرض سمجھتی ہے۔ علاوہ دیگر گران قدر عطیوں کے سرکارِ عالیہ نے ایک معقول سالانہ رقم حال میں انجمن ترقی اُردو کے واسطے عطا کی ہے جس کا یہ جلسہ شکریہ ادا کرتا ہے اور اِس ضمن میں جناب ممدوح کی تصانیفِ اُردو پر جو حضور کے علمی ذوق کی سب سے نمایاں دلیل ہیں نہایت مسرت کے ساتھ خراجِ تحسین پیش کرنے کی جرأت کرتی ہے۔

بعد ازاں مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو نے مختصراً انجمن ترقی اُردو کی گذشتہ کیفیتوں، موجودہ کارروائیوں، اور پیش نظر تجویزوں پر تقریر کر کے شرکائے کانفرنس کو انجمن کے اغراض ومقاصد پر توجہ دلائی اور اِس معنی خیز جملے کو اپنے نہایت موثر الفاظ میں بیان کر کے کہ "چندہ مانگنے والا دنیا میں سب سے بڑا سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا میں چندہ نہیں مانگنا چاہتا" اپنی تقریر کو ختم فرمایا۔

پھر مولانا سید سلیمان ندوی نے ایک نہایت ہی فصیح، مدلل اور پُراثر تقریر فرما کر حسبِ ذیل تجویز جلسہ کے سامنے پیش کی:۔

اس جلسہ کی رائے میں نہایت ضروری ہے کہ زبان اُردو کا ایک مرکزی کتب خانہ وسیع پیمانے پر قائم کیا جائے اور اُس کے آغاز کرنے کے لیے کم سے کم دس ہزار روپیہ نقد اور مصارف دائرہ کے واسطے معقول سالانہ رقم کا انتظام کیا جائے۔ یہ کام ایک منتخب جماعت کے سپرد ہو جو اِس وقت سے سرمایہ کی فراہمی اور پھر کسی مناسب مقام پر کتب خانہ قائم کرے

اِس تجویز کی تائید مختصراً مولانا آزاد سبحانی صاحب نے پروفیسر مرزا محمد ہادی بی۔ اے رسوا اور خواجہ امیر احمد صاحب انصاری نے فرمائی اور تحریک باتفاق آرا منظور ہوئی۔

اِس دوران میں چونکہ گیارہ بج چکے تھے اور کانگریس کے آخری جلسہ کی شرکت کے واسطے حاضرین جلسہ میں سے بعض اصحاب اُٹھنے لگے تھے لہٰذا مزید کارروائی ملتوی رکھی گئی اور اجلاس اول ختم کر کے اعلان کر دیا گیا کہ اجلاس ثانی دوسرے دن شام کو ۵ بجے ہوگا۔



حسب قرار داد روز اول دوسرا اجلاس ٹھیک ۵ بجے شروع کر دیا گیا اس مجلس میں اگرچہ بعض وہ اصحاب شریک نہیں تھے جو پہلے دن [illegible] ہوئے تھے لیکن مجمع پہلے دن سے بھی زیادہ تھا اور رفتہ رفتہ اصحاب کی تعداد اس مجمع میں یقیناً بڑھ گئی تھی۔ جناب نواب نصیر حسین صاحب خیالؔ کو تشریف لانے میں چونکہ کسی قدر توقف ہوا اس وجہ سے جناب مولوی نظام الدین حسن صاحب کی صدارت میں کارروائی جلسہ شروع ہو گئی مگر دس منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ نواب صاحب تشریف لے آئے اور ان کی صدارت میں بقیہ کارروائی ہوتی رہی۔

پہلے انجمن ترقی اُردو کی شاخ بمبئی کے نمائندے مولوی حبیب الرحمن خان صاحب نے ایک تقریر کے ذریعے سے مندرجہ ذیل تحریک جلسے کے سامنے پیش کی:۔

اُردو کانفرنس کا یہ اجلاس زور دیتا ہے کہ شہر احمد آباد کی جماعت تعلیم المعلمین اُردو (اُردو ٹریننگ کلاس) جو بمبئی گورنمنٹ نے تین سال سے بطور آزمائش جاری کی ہے آئندہ بہت جلد مستقل کر دی جائے۔

جس کی تائید جناب حاجی ریاض الدین صاحب نے فرمائی اور اپنی تقریر کے دوران میں حاجی صاحب نے مختصراً اُن کوششوں کا بھی حوالہ دیا جو صوبۂ بمبئی میں اشاعتِ اُردو کے متعلق ہو رہی ہیں۔

اسکے بعد جناب پروفیسر بی گھوشال صاحب ایم اے نے "ترقی زبان بذریعۂ تراجم" پر اپنا قابل قدر مضمون پڑھنا شروع کیا جس میں اسلاف اسلام کی علمی کوششوں کا ایسی فیاضی کے ساتھ اعتراف کیا گیا تھا کہ ہر طرف سے اِس بنگالی مسیحی مقرر کی انصاف پسندی اور رواداری پر تحسین و آفرین کی بارش ہو رہی تھی اور تمام اصحاب حتی کہ ہمارے محترم آنریبل مسٹر ظہیر الحق

بھی اس بات پر سخت متحیر تھے کہ ایک بنگالی نژاد شخص کیونکر ایسی سلاست اور لہجے کی ملائمت کے ساتھ ایسا عالمانہ مضمون اُردو مین پڑھ سکتا ہو اور اسلامی علوم اور مسلمانون کی بےنظیر علمی خدمات پر اس درجے کیسے حاوی ہو سکتا ہو حقیقت تو یہ ہو کہ عموماً اس مضمون کو پڑھ کر اور خصوصاً پروفیسر صاحب کی زبان سے سُن کر کوئی یہ نہین کہہ سکتا کہ یہ کسی غیر مسلم یا بنگالی شخص کا لکھا ہوا ہو۔ صاحب صدر جلسہ نے وعدہ فرمایا ہو کہ اس مضمون کو وہ اپنے صرفے سے طبع کرا کے ملک مین شایع فرمائین گے۔

اس مضمون کے خاتمے پر خواجہ میر احمد صاحب انصاری بی اے نے ایک پُر زور اور مدلل تقریر کر کے حسب ذیل تحریک جلسے کے سامنے پیش کی:-

"چونکہ اس صوبے کی یونیورسٹی مین اہل ملک اور گورنمنٹ کی بابار سفارش کے باوجود ابھی تک اِن صوبجات کی زبان کو کالج کے نصاب مین شامل نہین کیا گیا ہو لہٰذا یہ جلسہ گورنمنٹ اور الٰہ آباد یونیورسٹی سے باصرار درخواست کرتا ہو کہ کالج کے نصاب مین اُردو کو ایک مستقل مضمون کی حیثیت سے داخل کیا جائے۔"

تحریک مندرجۂ بالا کی تائید جناب پروفیسر مرزا محمد ہادی صاحب بی اے (المتخلص بہ رسوا) نے نہایت دلچسپ تقریر کے ذریعے سے فرمائی جسمین اُنھون نے اس بات پر خاص طور سے زور دیا کہ یونیورسٹی کے امتحانات مین السنۂ مشرقیہ کے جو پرچے ہوتے ہین اُن مین یہ ہدایت ہوتی ہو کہ ترجمے یا جواب مضمون انگریزی مین لکھے جائین اور چونکہ مشرقی ادب کو انگریزی لباس پہنانا دشوار بلکہ محال ہو (یہان اُنھون نے فارسی سے انگریزی ترجمون کی بعض نہایت پُر لطف مثالین بیان کین جنھین سُن کر لوگ خوب ہنسے) اس وجہ سے یونیورسٹی کی اس ہدایت کا نتیجہ اول تو یہ ہوتا ہو کہ مشرقی علم ادب مین اُن طلبہ کو کوئی معقول دستگاہ نہین ہونے پاتی۔ دوسرے اُن کی ذہنی ترقی پر بوجہ اس کے کہ اس ذریعہ سے سمجھ کر یاد کرنے کے بجائے رٹنے کی ضرورت زیادہ ہو جاتی ہو نہایت خراب اور مضر اثر پڑتا ہو۔ مرزا صاحب موصوف کی پہلے یہ خواہش تھی کہ کانفرنس کی طرف سے جو رزولیوشن پیش ہو وہ صرف اسی ایک پہلو پر یونیورسٹی کو توجہ دلائے مگر خواجہ امیر احمد صاحب کا رزولیوشن چونکہ زیادہ جامع تھا اس لیے اُنھون نے اسی کی تائید کے سلسلے مین اپنے خیالات کو بوضاحت ظاہر کرنے کے لیے موقع نکال لیا۔

ہان یہ تو لکھنے سے رہ ہی گیا کہ دوسرے جلسے کی کارروائی شروع ہونے کے بعد سب سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد کا مندرجۂ ذیل تار پڑھ کر سنایا گیا جو موصوف نے اپنے بندی خانے (واقع رانچی) سے صدر اُردو کانفرنس کے نام بھیجا تھا:-

"مین تہِ دل سے اس پہلی آزاد مجلس کو مبارکباد کہتا ہون جو قومی زبان کی ترقی کے لیے منعقد ہوئی ہو اور خدا سے دعا کرتا ہون کہ وہ کانفرنس کے عزائم رجحان کار اور طریق عمل مین رفعت و وسعت فرمائے۔"

مولانا عبد الحلیم صاحب شرر نے ایک بیش قیمت مضمون لکھا تھا جس کی سُرخی تھی "ہندوؤن کا تعلق زبان اُردو سے" صاحب موصوف نے جلسہ مین تقسیم کرنے کی غرض سے اس کو چھپوا بھی لیا تھا۔ اب مولانا نے اپنا پُر مغز مضمون پڑھنا شروع کیا، مگر صاحب موصوف کی آواز سارے مجمع تک نہین پہنچ سکتی تھی، لوگون کی خواہش ہوئی کہ مولانا کے بجائے کوئی دوسرے صاحب اسے پڑھین، چنانچہ جناب مولوی عبد الحق صاحب بی اے سکرٹری انجمن ترقی اُردو نے اس خدمت کو انجام دیا۔ افسوس ہو کہ وقت کم تھا اور ابھی کئی تحریکات باقی تھین، اس وجہ سے مضمون تمام و کمال نہین پڑھا جا سکا۔ "العصر" کی موجودہ اشاعت مین یہ مضمون

بھی تمام وکمال شائع کیا جاتا ہو

ختم مضمون پر ایک صاحب نے جو غالباً فرنگی محل کے مدرسہ سے تعلق رکھتے ہیں یہ اعلان کیا کہ مشہور شاعر مولانا آسی رضا فرنگی محلی نے اپنے دیوان کے پچاس نسخے انجمن ترقی اُردو کو عنایت فرمائے ہیں۔

اسکے بعد مولانا عبد الحلیم صاحب شرر نے ایک مختصر تقریر کے ذریعے حسبِ ذیل رزولیوشن جلسہ کی منظوری کے لیے پیش کیا۔

یہ کانفرنس اُردو انسائیکلوپیڈیا تیار کیے جانے کی اُس تحریک کو جو لکھنؤ کے بعض ذی علم حضرات نے شروع کی ہو بہت وقعت کی نگاہ سے دیکھتی ہو اور تمام اہلِ وطن کو توجہ دلاتی ہو کہ وہ اِس کارِ عظیم میں جہان تک ممکن ہو سعی و امداد کریں۔"

سیّد سجاد حیدر صاحب (پرائیوٹ سکرٹری راجہ صاحب محمود آباد) اور سیّد سلیمان صاحب (جانشین علامہ شبلی) نے مختصراً اس رزولیوشن کی تائید فرمائی۔

یہ رزولیوشن ختم ہوا تو جناب سیّد سجاد حیدر صاحب (یلدرم) نے حسبِ ذیل تحریک پیش کی:-

یہ کانفرنس ترقی و اشاعت اُردو کے لیے نہایت ضروری سمجھتی ہو کہ بتدریج ہماری کتابیں اور اخبارات ٹائپ (سیسے کے حروف) میں چھاپے جائیں اور لوگوں کو ٹائپ سے مانوس کیا جائے۔

سیّد صاحب موصوف جو ماشاء اللہ تعلیم جدید کے خوش ترین ثمرات میں سے ہیں اور مغربی تہذیب لوازم تہذیب کے بدل شیفتہ ہیں اُنکی طرف سے اِس قسم کی تجویز کا پیش ہونا چندان مضائقہ نہ رکھتا تھا مگر ستم یہ ہوا کہ انجمن ترقی اُردو کے لائق سکرٹری بھی اُن کے ہم آہنگ ہو گئے جنھیں اب اُردو کتابوں کے چھپوانے کا تلخ تجربہ ہو رہا ہے اور اُنھوں نے اُردو زبان کی اشاعت عام کے لیے اس کی ضرورت جتا کر اس تحریک کی تائید فرمائی۔ سیّد جالب صاحب ایڈیٹر ہمدم نے اُن تجربات کی بنا پر جو لیتھو پریس کے متعلق اُنھیں ایک اخبار نویس کی حیثیت میں اتنی مدت سے حاصل ہوئے ہیں اور نیز اُن علمی مشاغل کے سبب سے جن کا ہمدرد مرحوم کے سلسلے میں اُن کو اور مسٹر محمد علی مالک و ایڈیٹر ہمدرد کو سامنا کرنا پڑا، اس تحریک کی مخالفت کی اور اس مخالفت کی تائید مسٹر ظفر الملک علوی ایڈیٹر الناظر نے کی۔

یہ مسئلہ حقیقتاً اسقدر اہم اور اتنے پہلو رکھتا ہو کہ اس قسم کی کانفرنسون میں اس کا پیش ہونا کچھ مفید نہیں ہو سکتا کیونکہ اسمین ضرورت ہو اُن لوگون کی رایون کی جنھون نے سنگی چھاپہ اور ٹائپ کے چھاپون کے متعلق کافی تجربات حاصل کیے اور اِس مسئلہ پر بحیثیت ایک ہنر و فن کے غور کیا ہو جنھون نے خطِ نستعلیق کے محاسن و معائب پر اور اس ایک بڑے خط سے بدلنے کے مفاد و مضرت پر گہری نظر ڈالی ہو جنھون نے اُس اثر کا صحیح اندازہ کرنے کی کوشش کی ہو جو مختلف قسم کے حروف کے مطالعہ سے انسان کی قوتِ باصرہ پر پڑتا ہو اور جنھون نے اِس مسئلہ کی تحقیق پر اپنے وقت عزیز کا کوئی گران قدر حصہ صرف کیا ہو کہ ٹائپ کے رواج سے اُن ملکون کو کیا اقتصادی منافع حاصل ہوئے جن میں اُردو کی ہم مشرب و ہمرنگ زبانیں مروج ہیں۔

اِس تحریک پر بہت سے اصحاب بحث کرنے کو تیار تھے مگر وقت کہان تھا کہ کسی کی کچھ سُنی جاتی۔ لہٰذا بالآخر یہ طے کیا گیا کہ سردست اِس مسئلہ کو ملتوی کیا جائے اور کسی اور موقع جلسے پر اس کی بحث اُٹھائی جائے۔

اُس کے بعد سیّد جالب نے حسبِ ذیل تحریک پیش کی:-

یہ جلسہ قرار دیتا ہو کہ ہندوستان کی مشترک زبان کی حیثیت میں زبان اُردو کی ترقی و تقویت کا کام تمام فرقہاے آبادی کی اعانت سے سرانجام دینے کے قابل بنانے کے لیے انجمن ترقی اُردو کو جس پیمانہ تک وسعت دینے کی ضرورت ہو اُس کی تدابیر سوچنے اور عمل میں لانے کے لیے چند

متعدد اصحاب کی ایک کمیٹی مامور کی جائے اور اس کو حسب ضرورت اپنی طاقت مین اضافہ کرنے کا اختیار دیا جائے۔

پنڈت کشن پرشاد کول بی ملے ایڈیٹر ہندوستانی نے اسکی تائید کرتے ہوے یہ صاف طور پر ظاہر کر دیا کہ ہندوؤن سے اس بات کی توقع رکھنا عبث ہوگا کہ وہ انجمن ترقی اُردو مین اُسوقت تک پوری دلچسپی ظاہر کرین گے جب تک کہ وہ مسلمانون کی تعلیمی کانفرنس کا ایک شعبہ بنی ہوئی ہو۔ اور ہندوؤن کا یہ کہنا بالکل حق بجانب ہو کیونکہ مسلمانون سے کون توقع رکھتا ہو کہ وہ ہندو سبھا کے کسی شعبے مین کبھی کوئی دلچسپی لے سکین گے۔

یہ تحریک بہ اتفاق آرا منظور ہوئی، اور یہ بھی طے پا گیا کہ پنڈت کشن پرشاد کول ایڈیٹر ہندوستانی اس کمیٹی کے سکرٹری مقرر ہون۔

اس موقع پر کلکتہ کے ایک بزرگ نے جن کا نام نامی خان بہادر ملا صالح [illegible] ہو اہل کلکتہ کی طرف سے کانفرنس کو آئندہ سال کلکتہ مین اجلاس کرنے کی دعوت دی۔ اُس کے بعد جناب مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو نے صاحب صدر جلسہ اور دیگر مہمانان کانفرنس کا شکریہ مناسب الفاظ مین ادا کیا اور جناب ممدوح نے آخری الفاظ مین یہ توقع ظاہر کی کہ آئندہ سال جب پھر اُردو کانفرنس کا انعقاد ہوگا تو ہم اس وقت سے زیادہ کامیابی حاصل کر سکین گے۔

اب کہ ۹½ بج چکے تھے، صاحب صدر نے جلسہ کو برخاست کیا اسکے بعد بعض اصحاب کی خواہش کی بنا پر تحریک کی گئی کہ بزم مشاعرہ قائم ہو چنانچہ بہ اتفاق مرزا محمد ہادی صاحب رسوا اس جلسہ کے صدر منتخب ہوے۔ بزم مشاعرہ مین سب سے پہلے مولانا تعفی نے اپنی وہ نظم سنائی جو فی الحقیقت اُنھون نے اُردو کانفرنس مین پڑھنے کے لیے لکھی تھی جسکا موقع منتظمین کانفرنس دوران اجلاس مین نہ دے سکے۔ اس کے بعد مسٹر ظہر علی آزاد نے اپنی نظم برق کے چند بند سنائے چونکہ اب زیادہ آگئی تھی اور لوگ کھانا کھا کر نہین آئے تھے، اس لیے بزم مشاعرہ جلد ختم کر دی گئی۔

اُردو پریس کانفرنس

یہ ثابت کرنے کے لیے کسی طویل بحث کی حاجت نہین کہ ہندستان کی مشترکہ زبان اُردو کے پریس کو اپنی تقویت و اصلاح کے لیے اپنے صیغہ کی ایک مستقل انجمن اور سالانہ جلسہ مشورت کی ضرورت ہو اور جبتک اپنے مشترکہ فوائد کی حفاظت مین وہ اس قسم کے اتحاد عمل کی صورت نہ پیدا کرے گا، ان جلیل القدر فرائض کی ادائگی سے جو اہل ہند کی اصلاح و ترقی کے متعلق اُس پر عائد ہین ہرگز عہدہ برآنہ ہو سکے گا۔ اس لیے ملکی پریس کی کانفرنس درحقیقت ایک نہایت اہم ملکی تحریک ہو۔ جس سے ہندوستانی پبلک کو پوری دلچسپی لینی چاہیے۔ اور محبان وطن کو حتی الامکان اس کی ترقی و کامیابی مین مدد دینی چاہیے۔ وہ لوگ بڑے تنگ خیال و ناعاقبت اندیش ہین جو صرف اتنی کہ دو تین یا شخصی کاوشون کی بنا پر ایسی ضروری تحریک کی وقعت گھٹا لین یا اُسکی کامیابی کے راستہ مین رکاوٹین پیدا کرین۔ بہرحال اُردو پریس کانفرنس کا پہلا اجلاس جیسا بھی منعقد ہوا وہ یقیناً بہت کچھ ہمت افزا ہو اور صرف کوئی ایسا مغرور و خود پرست شخص ہی اس کی وقعت گھٹانی چاہے گا جو تنگدلی کے باعث اپنے بھائیون کی کوششون مین مدد نہ پہنچائے اور پھر اُن کی کوششون کو جو وہ ساری جماعت کی فلاح و بہبود کے لیے کرتے ہین محض اس بنا پر نظر حقارت سے دیکھے کہ وہ خود انمین شریک نہ تھا۔ خدا کا ہزار ہزار شکر ہو کہ اُردو پریس مین ایسے اشخاص کی تعداد بہت کم ہو اور تمام ارکین کی متفقہ سعی و کوشش جب مخلصانہ طریق پر عمل مین آئیگی تو انشاء اللہ اُن کی مخالفت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

اس کانفرنس کا پہلا اجلاس حسب قرارداد ۳۱ دسمبر کی شب کو گنگا پرشاد ورما لائبریری (نظیر آباد) لکھنؤ مین بصدارت منشی رام چپال سنگھ

صاحب شیدا دہلوی ایڈیٹر "ہندوستان" لاہور منعقد ہوا۔ اور بنگال صوبجات متحدہ آگرہ واودھ، دہلی، پنجاب اور بمبئی کے اُردو اخبارات ورسالجات کے قریباً ۵۰ قایم مقاموں نے اس میں حصّہ لیا اور تقریباً ۲۵ اُردو اخبارات ورسائل کے ایڈیٹروں نے ہر حصّۂ ملک سے تار وخطوط بھیج کر بوجہ ناگزیر شرکت سے مجبوری اور مقاصد کانفرنس کے ساتھ اپنی موافقت کا اظہار کیا۔ مسٹر موڈی سکرٹری انڈین پریس ایسوسی ایشن بھی جلسہ میں تشریف رکھتے تھے۔ اول پنڈت کشن پرشاد کول صاحب ایڈیٹر ہندوستانی نے ایک تقریر میں عارضی کمیٹی لکھنؤ کی طرف سے بیرونی ڈیلیگیٹوں کا خیر مقدم کیا اور اُردو پریس کے لیے ایک کانفرنس کی ضرورت جتائی۔ بعد ہٗ شید جالب دہلوی ایڈیٹر ہمدم نے اپنی تقریر میں موجودہ کانفرنس کے قیام اور عارضی کمیٹی لکھنؤ کی کارروائیوں کا بالاختصار ذکر کیا اور آخر میں مسٹر شیدا ایڈیٹر ہندوستان لاہور کے لیے صدارت کانفرنس کی تحریک پیش کی جو باتفاق رائے پاس ہوئی اور شیدا صاحب نے کرسی صدارت پر تشریف لاکر اپنا اڈریس پڑھا، جو اگرچہ بہت تنگ وقت میں تیار کیا گیا تھا، لیکن ادبی پہلو سے نہایت دلچسپ تھا اور اُردو پریس کی زار و نزار حالت پر توجہ دلاتے ہوے اراکین پریس میں اتحاد عمل وامداد باہمی کی ضرورت جتاتا اور اُردو پریس ایسوسی ایشن کے لیے کئی مفید تجاویز پیش کرتا تھا۔ ہم کوشش کرینگے کہ آئندہ نمبر میں اس تقریر کو تمام وکمال درج کرسکیں۔ تقریر صدارت کے بعد حسب ذیل رزولیوشن باتفاق رائے پاس ہوے:-

(۱) اس جلسے کے حاضرین جنمیں ہندوستان کی مشترکہ زبان اُردو کے متعدد اخبارات ورسالجات کے ایڈیٹران شامل ہیں، جو مختلف فرقوں اور جماعتوں کے حقوق وفوائد کی نیابت وحفاظت کرنے والے ہیں، اسکی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور قرار دیتے ہیں کہ اُردو پریس کے فوائد کی حفاظت کے لیے، ایک اُردو پریس ایسوسی ایشن قائم کی جائے جسکا صدر مقام فی الحال لکھنؤ ہو، جلسہ کے تمام شرکا اس ایسوسی ایشن کی ممبری قبول کرتے ہیں۔ اور اپنی تعداد میں اضافہ کا اختیار رکھتے ہیں۔

محرک: سید جالب ایڈیٹر ہمدم۔ موید: مسٹر شفاعت علی۔

(۲) اُردو پریس ایسوسی ایشن کا مقصد یہ ہوگا کہ ہندوستان کے اُردو پریس کو بذریعہ تمام آئینی وسائل کے جبریہ قوانین اور اُن کے عملدرآمد کی نقصان رسانی سے محفوظ رکھے۔ اور قانون سازی کے اُردو پریس کی جائز آزادیوں میں رخنہ ڈالنے اور حکام انتظامی کے اخبار نویسوں ووقائع نگاروں اور اراکین پریس کے جائز کام میں مخل انداز ہونے سے اُن کی حفاظت کرے۔

محرک: مسٹر نذیر احمد علیگ ایڈیٹر ساوات۔ موید: منشی محمد صدیق حسن ایڈیٹر اللوتیغ

(۳) اس انجمن کی ایک انتظامی کونسل ہوگی جسمیں حسب ذیل عہدہ دار ہونگے:-

(۱) پریسیڈنٹ (۲) وائس پریسیڈنٹ ۲-(۳) سکرٹری ایک (۴) جوائنٹ سکرٹری ایک اور خزانچی ایک اور ہر صوبے سے حسب ذیل تعداد اراکین لی جائیگی۔

پنجاب ۱۲۔ صوبہ متحدہ ۸۔ بہار ۲۔ بنگال ۲۔ بمبئی ۳۔ صوبہ دہلی وصوبۂ سرحدی۔ اجمیر وممالک متوسط ایک ایک۔

محرک: منشی دین محمد صاحب ایڈیٹر میونسپل گزٹ۔ موید: شیخ حبیب الحسن صاحب ایڈیٹر شیعہ کالج نیوز

(۴) اراکین کونسل کی ایک کمیٹی انجمن کونسل کے قواعد وضوابط مرتب کرنے کی غرض سے بنائی جائے جو بعد ترتیب قواعد ممبران کونسل سے اگر ممکن ہو تو جلسہ طلب کرکے ورنہ بذریعۂ خط وکتابت منظوری لے اور بعد ازان اُن کو چھپوا کر اراکین ایسوسی ایشن کو بھیجدے۔

محرک: منادی عباس حسین ایڈیٹر تمدن۔ موید: پنڈت کشن پرشاد کول ایڈیٹر ہندوستانی۔

ترتیب قواعد و ضوابط کی کمیٹی کے لیے حسب ذیل اصحاب منتخب ہوے۔ مولانا سید سلیمان صاحب ایڈیٹر معارف، پنڈت کشن پرشاد صاحب کول ایڈیٹر ہندوستانی۔ سید جالب صاحب دہلوی ایڈیٹر ہمدم۔

(۵) اُردو پریس کانفرنس اس زمانہ مین جبکہ ایک مہیب عالمگیر جنگ تین بر اعظمون مین برپا ہے اور سلطنت برطانیہ اپنی تمام تر طاقت و کوشش حق و آزادی کی حمایت و حفاظت کے لیے خرچ کر رہی ہے تاج برطانیہ کے ساتھ جس کے زیر سایہ بہت سی اقوام جملہ حصص دنیا مین آزادی و آسائش کی زندگی بسر کر رہی ہین اپنی گہری عقیدتمندی اور وفاداری کا اظہار کرتی ہے اور اِس ہولناک جنگ کو فتحمندانہ نتیجہ تک پہنچانے کے لیے اُردو پریس کے ہر قسم کی امداد پر آمادہ ہونے کا یقین دلاتی ہے۔

تحریک منجانب صدارت۔

(۶) اُردو پریس کانفرنس قانون مطابع کی غیر آئینی نوعیت اور اُس کی قطعاً غیر ضروری سخت گیریون کے خلاف اُردو اخبارات کے نمایندون کے متفقہ محسوسات کا اظہار کرتی ہے اور حکومت کو باصرار تمام اِس حقیقت پر توجہ دلاتی ہے کہ موجودہ حالات مین یہ قانون مطابع نہ صرف غیر ضروری بلکہ حکومت و رعایا دونون کے لیے ازحد مضرت رسان ہے اور اس کا جلد سے جلد منسوخ کیا جانا اہل ہند کی آئندہ ترقی اور نیز حکومت کے مفاد کے لیے ازبس ضروری و لازمی ہے۔

محرک:- قاضی عبد الغفار صاحب ایڈیٹر صداقت کلکتہ۔ موید:- مسٹر بانکے دیال ایڈیٹر جھنگ سیال لاہور۔

(۷) (الف) اُردو پریس کانفرنس کے اِس جلسہ کی راے مین اُردو پریس ایسوسی ایشن کو اخبارات کے حقوق کی حفاظت کے لیے ایک مستقل سرمایہ قائم کرنا چاہیے جسکی فراہمی کے لیے تین صورتین اختیار کی جائین۔ (۱) ایسوسی ایشن کی کل آمدنی کا دس فیصدی مستقل طور پر اسی سرمایہ کے لیے مخصوص کر دیا جائے (۲) ہر ممبر چندۂ ممبری کے علاوہ کوئی رقم عطیہ کے طور پر اسی مد مین دیا کرے۔ (۳) تمام ان مقتدر و متمول اصحاب سے جو اُردو اخبارات کی موجودہ حالت سے ہمدردی رکھتے ہین حسب ضرورت مالی اعانت کی درخواست کی جائے۔

(ب) اس سرمایہ کو ایسوسی ایشن کے مقاصد کی کامیابی کے لیے صرف کیا جائے اور اخبارات کے حقوق کی حفاظت کے لیے ملک مین تقریرون اور تحریرون کے ذریعہ سے اس تحریک کو پھیلایا جائے۔

(ج) اِس سرمایہ کے متعلق ضروری قواعد و ضوابط بنانا بھی اسی کمیٹی کے سپرد کیا جائے جو پریس ایسوسی ایشن کے قواعد مرتب کریگی اور بعد منظوری کونسل اُنکو ایسوسی ایشن کے قواعد و ضوابط مین شامل کر دیا جائے۔

محرک:- چودھری غلام حیدر صاحب۔ موید:- سید ظفر احسن صاحب قائم مقام رسالہ نظام المشائخ دہلی۔

(۸) اِس کانفرنس کی یہ راے ہے کہ تمام اردو اخبارات اس بات کی کوشش کرین کہ ایسے معاملات مین جن کا تعلق اُردو اخبارات یا مطابع سے ہو خواہ بہ اغراض حفاظت حقوق خواہ بضرورت مدافعت باہمدگر امداد کرین اور جہان تک پریس کا تعلق ہے بغیر ایسوسی ایشن کی اطلاع یا مشاورت کے ایسی کوئی کارروائی نہ کرین جسکا اثر دوسرے کسی اخبار پر حسرتخیز ہوتا ہو اور جہان کوئی ایسا مناقشہ پیدا ہو وہان اِس ایسوسی ایشن کے ذریعہ سے صفائی و مبادلۂ خیالات کیا جائے۔

محرک:- نواب عبد اللہ خان صاحب ایڈیٹر اسلامک میل بمبئی۔ موید:- مولوی صبغة اللہ صاحب شہید ایڈیٹر النظامیہ۔

(۹) اُردو پریس کانفرنس کا یہ جلسہ گورنمنٹ سے استدعا کرتا ہے کہ اُردو پریس کو ہندوستان کی پبلک کا نمایندہ و ترجمان ہونے کی حیثیت مین سرکاری کاغذات اور رپورٹون کی بہمرسانی و سرکاری اشتہارات کی اشاعت اور دیگر معاملات کے متعلق اُن جملہ سہولتون اور رعایتون کا مستحق سمجھا جائے جو عموماً اینگلو انڈین اخبارات کو اس وقت حاصل ہین۔

محرک :۔ سید جالب دہلوی ایڈیٹر روزانہ ہمدم مؤید :۔ ناشاکر ایڈیٹر العصر

(۱۰) اُردو پریس کانفرنس کا یہ جلسہ قرار دیتا ہی کہ اُردو پریس ایسوسی ایشن کی طرف سے اس وقت کم از کم ۲ قائم مقام انڈین پریس ایسوسی ایشن مین شرکت کے لیے بھیجے جائین - اور فی الحال ایسے اشخاص اس غرض سے منتخب کیے جائین جو انڈین ایسوسی ایشن کا مقررہ چندہ ادا کر کے شرکت کے لیے تیار ہون -

محرک :۔ حاجی ریاض الدین احمد بریلوی قائم مقام اخبار مفید روزگار بمبئی

مؤید :۔ مولوی کرم اللہ خان صاحب ایڈیٹر الندوہ -

(۱۱) اُردو پریس کانفرنس آنریبل منشی پراگ نرائن صاحب بھارگو رائے بہادر کی بے وقت موت پر اپنے دلی رنج و ملال کا اظہار کرتی ہی مرحوم صرف زبان اُردو کے محسن و سرپرست ہی نہ تھے بلکہ ہندوستان کے سب سے بڑے اُردو مطبع اور صوبہ ہذا کے سب سے پُرانے روزانہ اُردو اخبار اودھ اخبار کے مالک تھے نیز یہ کانفرنس اُس نقصان کو بھی محسوس کرتی ہی جو آپکی وفات سے نہ صرف ہماری جماعت کو بلکہ ملک و قوم کو پہنچا ہی -

محرک :۔ ناشاکر ایڈیٹر العصر - مؤید :۔ پنڈت کشن پرشاد صاحب کول بی اے ایڈیٹر ہندوستانی -

مندرجہ ذیل اصحاب اُردو پریس ایسوسی ایشن کی طرف سے انڈین ایسوسی ایشن کی ممبری کے لیے منتخب کئے گئے :۔ قاضی عبد الغفار صاحب ایڈیٹر صداقت - جناب شیدا دہلوی ایڈیٹر ہندوستان لاہور - پنڈت کشن پرشاد کول ایڈیٹر ہندوستانی - سید جالب دہلوی - ایڈیٹر ہمدم اور رزولیوشن نمبر ۲ متعلقہ کونسل کے سلسلہ مین مندرجہ ذیل عہدہ دار و اراکین کونسل منتخب ہوے -

پریسیڈنٹ قاضی عبد الغفار ایڈیٹر صداقت کلکتہ - وائس پریسیڈنٹان جناب شیدا دہلوی ایڈیٹر ہندوستان لاہور - سید جالب دہلوی ایڈیٹر ہمدم سکریٹری پنڈت کشن پرشاد کول ایڈیٹر ہندوستانی - جوائنٹ سکریٹری ناشاکر ایڈیٹر العصر - خزانچی مولوی اکرام اللہ خان صاحب ایڈیٹر الندوہ لکھنؤ

اراکین کونسل

پنجاب :۔ ایڈیٹران ہندوستان - میونسپل گزٹ جھنگ سیال پنجاب کسان - وکیل - العصر - ستارہ صبح -

صوبجات متحدہ :۔ مساوات - ہندوستانی - نئی روشنی - ہمدم - اودھ اخبار دلگداز - البرید - نیر اعظم -

بنگال :۔ صداقت -

بمبئی :۔ اسلامک میل - مفید روزگار -

اجمیر :۔ صلح کل -

دہلی :۔ دہلی گزٹ -

آخر مین سید جالب صاحب نے ایک مختصر تقریر مین حاضرین کو قیام ایسوسی ایشن پر مبارکباد دیتے ہوے سرگرمی سے کام کرنے اور باہم اتفاق و اتحاد قائم رکھنے پر توجہ دلائی اور صدر کے شکریہ پر جلسہ ۱۲ بجے شب کے برخاست ہوا بعد مین پتہ لگا کہ تعداد اصحاب جو شرکت پریس کانفرنس کا ارادہ رکھتے تھے اجلاس مسلم لیگ کی خلاف توقع طوالت کے باعث نہ آ سکے -

---

آل انڈیا پریس ایسوسی ایشن

آل انڈیا پریس ایسوسی ایشن کا سالانہ اجلاس ۲۸ دسمبر کی شام کو بوجہ دیگر مصروفیتون کے ملتوی ہونے کے بعد ۲۹ دسمبر کو چھ بجے شام کے کانگریس کے پنڈال مین مسٹر ہارنیمن قابل ایڈیٹر بمبئی کرانیکل پریسیڈنٹ انڈین پریس ایسوسی ایشن کی صدارت سے منعقد کیا گیا چونکہ کانگریس کی سبجکٹ کمیٹی کا اجلاس اسوقت تک ختم نہین ہوا تھا اس لیے بہت سے اراکین پریس ایسوسی ایشن مین شمولیت کا موقع نہ پا سکے تاہم ہر حصہ ملک کے صاحبان اخبار و مطابع کی ایک معقول تعداد جلسہ مین شامل ہوئی

اور مسٹر ہارنیمن کی سالانہ رپورٹ سنانے کے بعد اُسکو پاس کیا گیا۔ رپورٹ نسبۃً مختصر تھی اور اُس سے یہ معلوم کر کے افسوس ہوتا تھا کہ ہندوستان کے اراکین پریس قوانین کی سختی اور دیگر مشکلات کے شاکی ہونے کے باوجود اپنی ایسوسی ایشن کے کام میں دلچسپی نہیں لیتے اور بعض صاحب کے ذمہ موعودہ عطایا چندہ کی بقایا چار سو روپے سے زائد موجود ہے ہندوستان کے اخباروں کو اکثر نادہند خریداروں کی شکایت رہتی ہے لیکن جب خود اہل اخبار اپنی ایسوسی ایشن کے متعلق نادہندی کی افسوسناک مثال قائم کرتے ہیں تو اُن کی شکایت کا پبلک پر کیا اثر ہو سکتا ہے بہرحال حاضرین جلسہ نے پریس ایسوسی ایشن کا کام زیادہ سرگرمی سے کیے جانے کی ضرورت جتائی اور صوبجات میں ماتحت ایسوسی ایشنیں قائم کرنے اور اراکین پریس کو ممبر بنانے کے لیے مرکزی انجمن کی طرف سے کسی عہدہ دار کے دورہ کرنے کی تجویز ہوئی۔ بعد میں نئے سال کے لیے عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آیا اور مسٹر ہارنیمن دوبارہ پریسیڈنٹ اور مسٹر مودی سکرٹری منتخب کیے گئے اسکے ساتھ ہی کونسل کے اراکین کا بھی انتخاب ہوا اور بنگال صوبجات متحدہ پنجاب بمبئی و مدراس کی طرف سے چھ چھ اور ممالک متوسط کی طرف سے تین صاحب منتخب کیے گئے۔ بہار کے لیے فی الحال صرف مسٹر سچیدانند سنہا ایڈیٹر ہندوستان ریویو کا انتخاب ہوا اور دیگر اراکین کا انتخاب ملتوی رکھا گیا۔ آخر میں ویسرائے کی خدمت میں جانے والے وفد کا ذکر آیا

سید جالب ایڈیٹر ہمدم و مسٹر کشن پرشاد کول ایڈیٹر ہندوستانی نے اُردو پریس کانفرنس کے آئندہ اجلاس لکھنؤ کے لیے جو ۳۰ دسمبر کی شام کو دفتر ہندوستانی میں منعقد ہونے والا تھا۔ مسٹر ہارنیمن و مسٹر مودی پریسیڈنٹ و سکرٹری مرکزی انڈین پریس ایسوسی ایشن کو دعوت دی اور اُنھوں نے مہربانی سے شرکت کا وعدہ فرمایا پھر صدر کے شکریہ پر جلسہ ۵ بجے برخاست ہوا۔

انڈین انڈسٹریل کانفرنس

ملک کی حقیقی ضروریات اور باشندوں کے اصلی مفاد کو مدنظر رکھ کر دیکھا جائے تو حرفتی کانفرنس کی اہمیت سیاسی و تمدنی مجالس سے کہیں زیادہ ہے لیکن افسوس ہے کہ اس مرتبہ کانفرنس مذکور کے سالانہ سیشن لکھنؤ میں اول سے آخر تک چند در چند حادثات و سوء اتفاقات کا سامنا رہا اور جس رونق و کامیابی کی امید تھی وہ حاصل نہ ہونے پائی۔ سب سے بڑا سانحہ دیج نرسا جو حرفتی کانفرنس کی کامیابی میں یقیناً مخل انداز ہوا یہ تھا کہ لکھنؤ ہی کے نہیں بلکہ صوبجات متحدہ کے سربرآوردہ حرفتی لیڈر اور انڈسٹریل کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کے لائق صدر بابو پراگ نرائن عین اجلاس کانفرنس کے وقت یکایک کلکتہ میں انتقال فرما گئے اور بیرونی مہمانوں کے خیر مقدم اور صوبہ اودھ کی حرفتی و کاروباری حیثیت کی تشریح کے متعلق جو قابلانہ تقریر اُنھوں نے تیار کی تھی وہ اُنکی زبان سے ادا نہ ہو سکی اور اجلاس کانفرنس کو بارونق و کارآمد بنانے میں اُنکی زبردست شخصیت سے جن کوششوں کی امید تھی وہ عمل میں نہ آنے پائیں۔ دوسرے کانگریس کو حکومت خود اختیاری کے رزولیوشن کی بحث خلاف توقع طوالت پذیر ہو جانے کے باعث اپنی ایک زائد نشست ۳۰ دسمبر کو منعقد کرنی پڑی جس کی کارروائی بارہ بجے دوپہر کے قریب ختم ہوئی اور لوگ تین چار گھنٹہ برابر اجلاس کانگریس میں شریک رہنے کے بعد اسقدر تھک گئے کہ ۲½ بجے حرفتی کانفرنس کے اجلاس کی شرکت اُن کے لیے سخت دشوار ہو گئی اور آل انڈیا مسلم لیگ کی پہلی نشست نے بھی جو ۲ بجے سے شروع ہونے والی تھی بہت سے ممتاز اشخاص کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ ایک اور سوء اتفاق یہ پیش آیا کہ آنریبل راجہ سیتا ناتھ رائے صاحب پریسیڈنٹ انڈسٹریل کانفرنس کے مطبوعہ اڈریس کی بہت سی کاپیاں ۲۹۔ دسمبر کی سہ پہر کو خدا جانے کس طرح کانگریس پنڈال کے باہر تقسیم کر دی گئیں لہٰذا سطح لوگوں کو تقریر صدارت سننے کا کچھ اشتیاق

باقی نہ رہا۔ خدا جانے یہ بے قاعدہ کارروائی کیوں ہوئی اور تعجب ہو کہ دوسری طرف اخبارات کو ایڈریس پہلے سے بھیجکر اجلاس کے روز اُسکی اشاعت کا موقع دینے پر توجہ نہیں کی گئی اور پریسیڈنشل ایڈریس کا اُردو ترجمہ شائع نہیں کرایا گیا حالانکہ اسکی اشاعت ملکی زبان میں دیگر ایڈریسوں سے کہیں زیادہ ضروری تھی۔ اسیطرح کانفرنس کی سالانہ کارروائی کی رپورٹ بھی پہلے سے شائع نہیں کی گئی جو ممبران کو اُس پر غور کر کے سالانہ اجلاس میں کچھ مفید تجاویز پیش کرنے کا موقع ملتا چنانچہ مسٹر مہتا نے اِس پر اعتراض کیا اور اجلاس میں اسکے متعلق خاص بحث ہوئی جس کے بعد گو رپورٹ منظور کر لی گئی لیکن امید ہو کہ آئندہ کے لیے کارکنان کانفرنس متنبہ ہو جائینگے۔ اجلاس نا وقت منعقد ہونے کے باعث کئی مفید و ضروری مضامین جو لائق صاحب نے نہایت محنت سے لکھے تھے نہ پڑھے جا سکے۔ اور سرگباشی بابو پراگ نرائن صاحب و مسٹر جی سُبرامنی آئر آنجہانی کی وفات پر اظہار افسوس کیے جانے کے علاوہ صرف چار نئے رزولیوشن پاس ہوے اور ایک رزولیوشن میں گذشتہ اجلاس حرفتی کانفرنس کے پچھلے رزولیشنوں کا نمبر ۲ سے نمبر ۱۳ تک سوائے نمبر ۶ و نمبر ۱۲ کے اعادہ کر دیا گیا ہو۔ نئے رزولیوشنوں میں پہلے کا جو سر وٹھلداس ٹھاکرسی نے پیش کیا اور مسٹر نگا سوامی آئر کی طرف سے اس کی تائید ہوئی یہ مطلب تھا کہ ہندوستان کی جو ریلیں ابھی تک سرکاری انتظام میں نہیں ہیں وہ جتد بیج موقع ملنے پر لے لیجائیں۔ دوسرے رزولیوشن کے ذریعہ سے اُن سوالات پر جو حرفتی کانفرنس سے پوچھے گئے ہیں ایک یادداشت مرتب کرنے کے لیے جو ممبران کمیٹی میں شہر اور اسٹینڈنگ کانفرنس میں منظور کیجائیگی پانچ اصحاب کی ایک کمیٹی بنائی گئی اور آنریبل راے سیتا ناتھ راے پریسیڈنٹ آنریبل مسٹر مہولکر سکرٹری اور مسٹر وٹھلداس دامودر ٹھاکرسی و آنریبل مسٹر منموہن داس رامجی و مسٹر وی ایس ممبران قرار پائے ایک اور رزولیوشن کے ذریعہ سے کانفرنس کے نظام اساسی پر ممبران کمیٹی

کی رائیں طلب کرنے کا وقت ۳۱ مارچ ۱۹۱۶ء تک اور آخری مسودہ و رپورٹ شائع کرنے کا وقت ۳۰ ستمبر ۱۹۱۶ء تک مقرر دیا گیا جس سے امید بندھتی ہو کہ نظام اساسی اگلے سالانہ اجلاس میں پیش اور منظور کیا جا سکے گا۔ آخری رزولیوشن میں نئے سال کے لیے کانفرنس کی اسٹینڈنگ کمیٹی کے جو سکرٹریان کو مشورہ دیگی ایسے اصحاب صوبہ وار منتخب کیے گئے جو خود بڑی بڑی حرفتوں کے مالک و مہتمم یا ملک کی حرفتی ضروریات سے واقف ہیں آنریبل مسٹر مہولکر و مسٹر منموہن داس رامجی اس کانفرنس کے جوائنٹ سکرٹریان اور مسٹر جے کے مہتا اسسٹنٹ سکرٹری منتخب ہوے اور سکرٹریوں کو اخراجات کے لیے ۵ ہزار روپیہ کی اپیل کرنے کا اختیار دیا گیا۔ سب سے زیادہ مفید تجویز یہ پاس ہوئی کہ حرفتی کانفرنس کا صدر دفتر امراوتی کے دور افتادہ مقام کے بجاے بمبئی میں رکھا گیا جہاں وہ انشاء اللہ بہت سا مفید کام کر سکے گا اور خاص ماہرین کا مشورہ و امداد بھی اُسکو حاصل ہو سکے گی۔ اِس میں کلام نہیں کہ آنریبل مسٹر مہولکر نے حرفتی کانفرنس کی ترقی و تقویت میں بہت کچھ قابل تحسین کام کیا ہو اور حرفتی ہندوستان اُن کے احسانات سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا لیکن انھی پر عالم ضعیفی میں سارے کام کا بار ڈالنا اور صرف اُنھی کی خاطر امراوتی میں کانفرنس کا صدر مقام رکھنا اسپر ناموزون تھا اور لکھنؤ کے اجلاس میں خواہ دوسرا کام کتنا ہی کم ہوا لیکن صدر مقام کی تبدیلی اور سکرٹری شپ میں دوسرے قابل و مستعد اصحاب کی شرکت سے ترقی کا ایک نیا باب کانفرنس کے لیے کھل گیا ہے۔

تیئیسویں آل انڈیا سوشل کانفرنس

۲۷ جنوری کو ۱۰ بجتے ہی لوگ جوق جوق پنڈال میں سوشل کانفرنس کی شرکت کے لیے آنے شروع ہو گئے۔ جب دعا تحریک و تائید کے بعد بابو جوتی سروپ صاحب صدر جلسہ قرار پائے اس کے بعد پنڈت منوہر لال

زتشی نے اپنی مطبوعہ تحریر استقبالی کمیٹی کی جانب سے پڑھی جناب صدر نے نہایت مفصل خطبۂ صدارت پڑھا جس مین زیادہ تر ہندؤون کے لیے معاشرتی اصلاحات کی تدابیر بتلائی گئی تھین آپنے فرمایا کہ سوشل کانفرنس کا کام مستقل طور پر ہونا چاہیے اور اُسکی پاس کردہ تجاویز پر عمل کرنے کے لیے ایک مجلس انتظامیہ قائم ہونی چاہیے۔ زنانہ تعلیم پر آپنے بہت زور دیا لیکن وہ صرف گھریلو تعلیم کے حامی ہین یعنی کسب معاش کے لیے تعلیم دلانا نہین چاہتے۔ صغرسنی کی شادی کے مضر اثرات پر ایک بسیط ریویو فرما کر آپنے اُسکے ترک کیے جانے کی خواہش کی۔ شادی بیوگان نہ کرنا بہت بڑی اخلاقی غلطی ہے جس کو جانتک ہو سکے جلد ترک کر دینا چاہیے۔ آپنے فرمایا کہ پرانے زمانہ مین اسکی اجازت تھی چنانچہ ارجن نے امریکہ جا کر ایک بیوہ سے شادی کی تھی (خوب) اِس قبیح رسم کی وجہ سے اسوقت ہندوستان مین ہر پانچ عورتون مین ایک بیوہ ہے۔ زمانۂ قدیم مین ہندوستان مین پردہ کا قطعی رواج نہ تھا۔ چنانچہ سوئمبر (انتخاب شوہر) کی رسم اُسکی شاہد ہے۔ ذات پات کا قطعی وجود نہ تھا بلکہ یہ جو چار فرقے ورن ہملے یہان ہین اُنکی تفریق گُن (عمل) اور کرم (قسمت) کی بنا پر ہے۔ چھوت چھات کی پابندی آپکے خیال مین ترقی کی راہ مین بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ چنانچہ راجسوئیگ کی رسوم مین تمام ہندوستان کیا بلکہ یورپ تک کے لوگ آ کر شریک ہوتے تھے اور ساتھ مل کر کھانا کھاتے تھے۔ شادی کے لیے ہمین مختلف ذاتون کیا بلکہ قومون سے اپنا جوڑا تلاش کرنا چاہیے۔ آپنے جہیز دینے اور بنگال اور بعض دیگر حصص ہند مین لڑکی کے والدین سے شادی کے قبل ایک رقم معین کر لینے کے رواج کی سخت مخالفت کی اور نعرہ ہاے تحسین کے شور مین بیٹھ گئے اُسکے بعد کئی رزولیوشن پیش ہوے جو حسب رواج تحریک تائید کے بعد پاس کیے گئے۔ پردے کی مخالفت کا رزولیوشن مسز کمودنی بوس بی اے نے پیش کرتے ہوے نہایت فصیح و بلیغ انگریزی مین اُس کے بُرے نتائج پر بحث کی اور اُس کا سبب یہ بتلایا کہ اسلامی حکومت مین اُن لوگون کا دستور تھا کہ خوبصورت عورتون کو ہندؤون سے چھین کر اپنے حرم مین داخل کر لیا کرتے تھے اور کچھ اُنکے اثرات کی وجہ سے ہندؤون نے پردہ کی رسم کو اختیار کر لیا جو ہر طرح خلاف صحت ہے اسکی تائید مسز رشنوی ایم اے اور مسز برج لال نہرو نے کی عورتون کی تعلیم کے متعلق جو رزولیوشن تھا اس کو ہیمنت کماری چودھری بی اے نے پیش کیا اور مسز گوداوری نے اسکی تائید کی جلسہ مین اگرچہ محرکین کو صرف ۱۰ منٹ اور موئیدین کو صرف ۵ منٹ کی اجازت دی گئی تھی مگر بعض اصحاب کی تقریرین اسقدر دلچسپ تھین کہ لوگون نے خود اُنکو اور موقع دلایا۔

بابو بھیدپرشاد بوس ایم اے پرنسپل شہنشاوری پروفیسر سبرونمانیا آئر مسٹر ہری پرشاد سنگھ نے انگریزی مین اور بابو جوالا پرشاد صاحب نے اردو مین اچھی اچھی تقریرین کین بعض اصحاب نے ہندی بولنے کی بے حد کوشش کی مگر صرف ۲ منٹ تک وہ غیر معروف الفاظ کے برتنے پر قادر رہے اور بعد مین پھر روزمرہ کی اردو بولنے لگے چند صاحب البتہ آخر تک اس کوشش مین کامیاب رہے گو زبان کی لکنت اور الفاظ سے بیگانگی خود اُن کے لب و لہجے سے مترشح ہوتی تھی مگر ہم اپنے بھائیون کو اُن کی سعی کی داد دیتے ہین بیشک وہ جس بات کا ارادہ کر لیتے ہین استقلال سے عمل کر کے دکھلا بھی دیتے ہین، خواہ اُن کا روزمرہ اس زبان سے جسمین اُنھون نے تقریر کی کتنا ہی مختلف ہو مگر ہم اس امر کی تعریف کیے بغیر نہین رہ سکتے کہ اُنھون نے ہندی کو اپنی زبان ثابت کرنے مین پورا پورا زور لگایا اور ایک حد تک اُسمین کامیاب بھی ہو گئے۔

انڈین نیشنل کانگرس

کانگرس کا یہ اجلاس ہر اعتبار سے منظیم تھا کیا بلحاظ حاضری اور کیا بلحاظ پریسیڈنشل اڈریس اور کیا باعتبار دیگر تقریر کنندگان کی فصیح و بلیغ

تقریروں اور ہندو مسلم اتحاد اور قومی جوش کا ایک قابلِ دید نظارہ تھا۔ کانگریس پنڈال ریلوے اسٹیشن سے تھوڑی دور پر بنایا گیا تھا۔ اُسکے گرد و نواح میں اور سڑک کے دونوں طرف بیشمار خیمے ڈیلیگیٹوں کی رہائش کے لیے نصب تھے۔۔۔۔ ۱۷۰ والنٹیرز ڈیلیگیٹوں کی آسائش اور جلسہ کے انتظام میں مصروف تھے۔ استقبالی کمیٹی نے صرف ۹ ہزار نشستوں کا پنڈال میں انتظام کیا یعنی حاضرین کی تعداد کا اُس نے بالکل غلط اندازہ کیا تھا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ تین روپیہ اور پانچ روپیہ والے وزیٹر ٹکٹ ۲۰ دسمبر کو ہی ختم ہوگئے تھے اور دس روپیہ والے ۲۴ دسمبر کو۔ ۲۶ دسمبر کو کسی قیمت کا بھی ٹکٹ ملنا محال تھا۔ لہٰذا ہزارہا آدمی کانگریس کا اجلاس دیکھنے سے محروم رہے صبح دس بجے ہی سے پنڈال میں تل رکھنے کی جگہ نہ رہتی تھی بیشمار آدمیوں کو کھڑا رہنا پڑا۔ پلیٹ فارم پر ممبران استقبالی کمیٹی اور سابق پریزیڈنٹان و لیڈران کانگریس اور معزز مہمان متمکن تھے اور اُنکے ایک طرف معزز خواتین اور زنانہ ڈیلیگیٹ جن میں بنگال، بمبئی، مدراس کی تعلیم یافتہ لیڈیز شامل تھیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اول روز کے اجلاس میں جس وقت مسٹر موزمدار چند اراکین کانگریس کے ساتھ تشریف لائے تو کئی منٹوں تک نعرہ ہاے چیرز کا شور بلند رہا۔ مسٹر تلک، مسز اینی بیسنٹ اور آنریبل مسٹر جناح، راجہ صاحب محمود آباد، مسٹر گاندھی کی آمد پر بھی پُرتپاک خیر مقدم ہوا آنریبل پنڈت جگت نرائن پریزیڈنٹ استقبالی کمیٹی نے ڈیلیگیٹوں کا خیر مقدم کرتے ہوے قومی مسائل پر ریویو کیا۔ اُسکے بعد آنریبل سر سریندرناتھ بنرجی کی تحریک اور آنریبل مسٹر مدھولکر اور مختلف صوبجات کے تمام مقاموں کی تائید سے آنریبل مسٹر موزمدار صدرِ جلسہ منتخب ہوے۔ کانگریس کے خطبۂ صدارت کی یک سطر میں تعریف ہوئی ہے۔ اس میں صاف الفاظ میں ہندوستانیوں کی خواہشات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس میں اعتدال کو ملحوظ رکھا اور اعلیٰ درجہ کی منطق سے کام لیا گیا ہے۔ فصاحت بلاغت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے قبل ازیں کانگریس کے کسی اجلاس میں ایسی تقریر نہیں ہوئی جس میں سلف گورنمنٹ کے سوال پر اس تکمیل کے ساتھ ایسی بلاغت اور عالی پیرایہ میں بحث کی گئی ہو۔ دوسرے روز کے اجلاس میں اول روز سے بھی زیادہ ہجوم تھا جس وقت مسلم لیگ کے صدر اور ارکان تشریف لائے تو حاضرین نے بڑا پُرجوش خیر مقدم کیا۔ اسی روز سر جیمس مسٹن معہ لیڈی مسٹن صاحبہ تشریف لائے۔ تمام حاضرین نے نعرہاے چیرز سے اُن کا خیر مقدم کیا۔ ہز آنر نے پریزیڈنٹ سے مصافحہ کیا اور اُنکے قریب نشست اختیار کی۔ سر جیمس مسٹن کی موجودگی میں قانون اسلحہ کی منسوخی کا رزولیوشن پیش ہوا اور اس پر بڑی موثر تقریریں ہوئیں۔ مسٹر [illegible] ڈیلیگیٹ بہار کی اُردو تقریر جو ظرافت کا پہلو لیے ہوے تھی نہایت دلچسپ تھی۔ قانون پریس کی منسوخی کا رزولیوشن بھی اسی روز پیش ہوا اور اسکے متعلق مسٹر ارنیمن ایڈیٹر بمبئی کرانیکل نے زبردست تقریر کی۔

۲۹ دسمبر کا اجلاس کانگریس کی تاریخ میں ایک خاص دن تھا کیونکہ اس روز سلف گورنمنٹ کا رزولیوشن پیش ہونے والا تھا لیکن بہت لوگ ٹکٹ نہ ملنے کی وجہ سے مایوس رہے۔ ایک شخص نے ایک وزیٹر سے تین روپیہ والا ٹکٹ ایک دن کے لیے ستر روپیہ کو خریدا۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی ایک رزولیوشن پر کانگریس میں آجتک ایسے زبردست مقرروں اور نامی گرامی اصحاب کو ایک ہی روز میں سننے کا کا اتفاق کہیں میسر نہیں ہوا۔ سلف گورنمنٹ کا رزولیوشن آنریبل سر سریندرناتھ بنرجی نے پیش کیا۔ مسٹر تلک، مسز اینی بیسنٹ، مسٹر جناح، پنڈت مالوی، راؤ بہادر مسٹر مدھولکر، آنریبل مسٹر مظہر الحق، مسٹر حسن امام، مسز سروجنی نائیڈو اور کئی دیگر زبردست مقرروں نے اسکی تائید کی۔ وہ لوگ جنہوں نے اس روز کا اجلاس دیکھا ہے اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتے ہیں۔ اُسی اجلاس میں یہ مژدہ بھی سنایا گیا کہ کانگریس اور لیگ دونوں کے اتفاق رائے سے مسلمانوں کی نیابت کا خاطر خواہ فیصلہ ہوگیا ہے۔ صوبجات متحدہ میں مسلمانوں کی نیابت کا حق ۳۰ فیصدی تسلیم کیا گیا ہے اور کوئی مسودہ یا تحریر جس سے مسلمان یا ہندو یا غیر مسلمان حاضر الوقت کونسل کی دو تہائی مخالفت کریگی اُسکو کوئی غیر سرکاری ممبر کونسل میں پیش کرنے کا مجاز نہو گا۔ غرض ہندو مسلم اتحاد کی وجہ سے اس اجلاس کانگریس کو زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔

اُردو انسائیکلوپیڈیا

"دائرۃ المعارف" یا اُردو انسائیکلوپیڈیا، جسکی تحریک شائع ہوچکی ہے، اسکے متعلق علم دوستون کی اطلاع کے لیے معلومات ذیل بالاجمال شائع کیے جاتے ہین۔

بعض لوگون نے بجائے خود یہ سمجھ لیا ہے کہ اس تحریک سے انگریزی انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا ترجمہ مقصود ہے، لیکن یہ خیال قطعاً غلط و بے بنیاد ہے۔ درحقیقت ہماری دائرۃ المعارف اس سے بالکل علحدہ اور ایک مستقل تالیف ہوگی، مشرقی مسائل مین یہ تالیف خود یورپ کو حق دیگی اور تحقیقات کا ایک نیا سرمایہ دنیا کے سامنے پیش کرے گی، مغربی مباحث مین بے شبہ برٹانیکا اسکا ایک ماخذ ہوگی، ہر مضمون پر حتی الامکان بہترین مضمون نگار تلاش کرکے ان سے اور تمام مستقل مضامین لکھائے جائین گے، البتہ جن مباحث پر کوئی بھی قابل اطمینان لکھنے والا نہ مل سکے گا وہان بے شبہ مجبوراً ترجمہ پر قناعت کرنا پڑے گی لیکن ایسے مواقع نادر الوقوع ہون گے۔

کام کا جو خاکہ پیش نظر ہے وہ یہ ہے کہ علوم کو مختلف صیغون مین تقسیم کر دیا گیا ہے اور ہر صیغہ کو ایک مستقل ایڈیٹر کے ہاتھ مین تفویض کر دیا جائیگا۔ ابتک سترہ عنوانات تجویز ہوے ہین: (۱) **مذہبیات** جو دنیا کے تمام ادیان و مذاہب، تصوف، روحانیت وغیرہ کے ذکر پر مشتمل ہوگا۔ (۲) **لسانیات** جسکے تحت مین دنیا کی مختلف زبانین اور انکے لٹریچر آجاتے ہین۔ (۳) **تاریخ** (۴) **جغرافیہ** (۵) **فلسفہ**، نفسیات، الٰہیات، منطقیات، اخلاقیات، جمالیات وغیرہ جملہ مباحث فلسفیہ پر یہ عنوان حاوی ہے۔ (۶) **حکمیات** یعنی سائنس مثلاً طبیعیات، نباتیات، حیوانیات وغیرہ (۷) **ریاضیات** جسکے ذیل مین ہندسہ، حساب، جبر و مقابلہ وغیرہ شامل ہین۔ (۸) **طبیعات**، ڈاکٹری، یونانی، ویدک وغیرہ اس کے زیر عنوان آجاتے ہین۔ (۹) **سیاسیات** یعنی اصول سیاست، قانون (۱۰) **عمرانیات**، اقتصادیات، منزلیات وغیرہ کا یہ عنوان جامع ہے۔ (۱۱) **حربیات** فن حرب، اصول جنگ، بحری و بری وغیرہ (۱۲) **صناعیات** اسکے ماتحت فنون لطیفہ، فنون نافعہ دونون آجاتے ہین۔ (۱۳) **لہویات** یعنی وہ جسے انگریزی مین GAMES AND SPORTS سے موسوم کرتے ہین مثلاً گھوڑدوڑ، پولو وغیرہ کا ذکر اس ذیل مین آجائیگا۔ (۱۴) **تعلیمات**، مسائل متعلق بہ تعلیم و تربیت (۱۵) **زرعیات**، علم زراعت و فلاحت (۱۶) **تجارت** (۱۷) **متفرقات علوم** یا متفرقات یعنی معلومات کی وہ ضروری چیزین جو کسی خاص عنوان کے تحت مین نہین آسکتین۔

ان مین سے ہر صیغہ کے لیے ایک مستند فاضل بطور صیغہ وار ایڈیٹر کے کام کریگا اور اسطرح گویا ۱۷ صیغہ وار ایڈیٹر ہونگے۔ ان اصحاب کے اسماء گرامی ابھی قطعیت کے ساتھ نہین پیش کیے جاسکتے تاہم کوشش ہورہی ہے کہ بہتر سے بہتر انتخاب عمل مین آئے۔

صیغہ جات بالا مین سے ہر ایک صیغہ بجائے خود متعدد شعبون پر تقسیم ہوگا، ہر شعبہ کا ایک ناظم ہوگا، اور اسکی مدد کیلیے متعدد مضمون نگار و مترجم ہونگے، مثلاً صیغہ مذہبیات کے تحت مین اسلام، ہندوازم، مسیحیت، یہودیت، بدھ ازم، تصوف وغیرہ کے متعدد شعبے ہونگے اور ہر شعبہ کے ذیل مین مختلف عنوانات ہونگے جن پر وہی لوگ مضمون لکھین گے جو اسکی اہلیت منصب رکھتے ہونگے، مذہبی جنبہ داری سے متعلق یہ التزام رکھا جائیگا کہ ناظم و مضمون نگار وہی اصحاب ہوسکین گے جنکی قیادت و سرداری اس مذہب یا فرقہ کے لوگون کے نزدیک مسلم ہوگی، ہندوازم پر کوئی ہندو ہی لکھیگا، زرتشتیت پر کسی پارسی سے لکھوایا جائیگا، خود اسلامی فرقون مین شیعہ، حنفی، اہلحدیث، احمدی غرض ہر فرقہ سے متعلق اسی کے مسلم علماء سے مضامین حاصل کیے جائینگے۔ اسیطرح صیغہ حکمیات، ارضیات، طبیعیات، کیمیائیات وغیرہ آٹھ دس شعبون مین تقسیم ہوگا، اور ہر شعبہ کیلیے مستقلاً ایک پورا اسٹاف ہوگا۔ ناظمین شعبہ و مضمون نگار حضرات کی تعداد اسوقت ایک سو تک پہنچ چکی ہے اور امید ہے کہ ابھی اضافہ ہوتا رہیگا۔ مراسلت کے ذریعہ سے اس عظیم الشان کام کے مراتب تفصیل کے ساتھ طے ہو رہے ہین، ایک دن کا کام نہین، ایک سال کا نہین، مدتون کا ہے اور بغیر تفصیلات کے طے کیے کام شروع کر دینا سخت خطرناک غلطی ہوگی۔ کام کرنیوالی چند جماعتین ہونگی، سب سے پہلے چیف ایڈیٹرون و سب ایڈیٹرون کی ایک مرکزی جماعت لکھنؤ مین ہوگی جسکے ارکان مولانا سید سلیمان ندوی، راقم، مسٹر عبدالوالی بی اے سابق ایڈیٹر معلومات اور دو ایک حضرات ہونگے۔ دوسری جماعت صیغہ وار ایڈیٹرون کی ہوگی جنکا ذکر گزر چکا، تیسری جماعت ہر صیغہ کے ماتحت شعبہ جات کے ناظمین کی ہوگی۔ اور پھر ہر شعبہ سے متعلق عام مضمون نگارون کی ایک جماعت ہوگی۔ یہ چارون جماعتین علمی کام کرنے والی ہونگی۔ انکے علاوہ ایک مختصر جماعت شوریٰ بھی ہوگی جسکے ارکان وہ بزرگ ہونگے جن کا فضل و کمال مسلم ہے مگر جو بسبب کبر سنی یا کسی مشغولیت کے اس کام مین کوئی نمایان عملی حصہ نہین لے سکتے۔ ان اصحاب کی رائے و مشورہ سے پورا فائدہ اٹھایا جائیگا اور یہی ارکان شوریٰ سمجھے جائینگے۔

عبدالماجد بی اے

اڈیٹوریل

انجمن ترقی اُردو

شکر ہو کہ مدت تک خوابِ غفلت میں مدہوش رہنے کے بعد انجمن ترقی اُردو اب پھر بیدار ہوئی ہو اور سب سے پہلا کام جو ضروری خیال کیا گیا از سرِ نو قواعد وضوابط کی اشاعت ہو۔ گویا جو کام اپریل ۱۹۰۳ء میں کیا جا چکا تھا اب پھر اسکی تجدید ہوئی ہو۔ ترقی اسی کا نام ہو!

اس دس گیارہ برس کے عرصہ میں انجمن ترقی اُردو نے کئی پلٹے کھائے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ہمیشہ قابل ہاتھوں میں رہی، مگر اسپر بھی ہنوز روزِ اول ہو۔ اس دفعہ جن مستعد ہاتھوں میں اسکی باگ دی گئی ہو، انکے نام نامی ہی اس امر کی کافی ضمانت ہیں کہ اب انجمن ترقیِ اُردو میدانِ عمل میں قدم مارے گی چنانچہ حسبِ ذیل عہدہ دار مقرر ہوے ہیں۔

پریسیڈنٹ۔ عالیجناب نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی بہادر سی آئی ای

سکرٹری۔ جناب مولوی عبد الحق صاحب بی اے (دہلوی)

اسسٹنٹ سکرٹری۔ جناب مولوی سید علی حیدر صاحب طباطبائی نظمؔ (لکھنوی)

یہ ایسے نام ہیں جن کی موجودگی میں انجمن ترقیِ اُردو کا مستقبل نہایت شاندار و دلفریب نظر آتا ہو۔ ہر تحریک کی قدر و منزلت اوسکی کامیابی و اہمیت کا اندازہ اُسکے کارپردازوں کی قدر و منزلت و وسیع الخیالی سے کیا جاتا ہو، اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہماری ملکی و مادری زبان کی احیا و ترقی و متوقعہ کامیابی کا اندازہ صاحبانِ موصوف الصدر کے گرامی قدر ناموں ہی سے ہو سکتا ہو۔ لیکن ہم ناموں کو سراہنا نہیں چاہتے بلکہ ہماری دلی تمنا یہ ہو کہ ہم اپنی آنکھوں سے انجمن ترقی اُردو کا کوئی عملی کام دیکھیں!

مناسب معلوم ہوتا ہو کہ اس جگہ ہم انجمن ترقی اُردو کے مشتہرہ قواعد وضوابط نقل کر دیں تاکہ ناظرین کو معلوم ہو سکے کہ انجمن کے مقاصد کیا ہیں، اور اُنکے حصول کے لیے کیا طریقہ تجویز کیا گیا ہو۔

قواعد وضوابط انجمن ترقی اُردو

۱۔ اِس انجمن کا نام "انجمن ترقی اُردو" ہوگا۔

۲۔ اسکے مقاصد حسب ذیل ہوں گے (۱) اصلاحِ زبان۔ یعنی اُردو زبان میں جو خرابیاں پیدا ہوتی جاتی ہیں اُنھیں دفع کرنا، اور غیر مانوس اجنبی الفاظ و محاورات جو غیر زبانوں کے بلا ضرورت زبان میں داخل ہوتے جاتے ہیں اُنسے بچنا۔ اور صحیح و فصیح زبان کے رواج دینے کی کوشش کرنا۔

(۲) جن اضلاعِ ہندوستان میں اُردو زبان کا رواج نہیں ہو۔ یا کم ہو۔ اُن میں اُردو زبان کے رواج دینے کی کوشش کرنا۔

(۳) قدیم کلام نظم و نثر کو ضائع ہونے سے بچانا اور جدید کو ترقی دینا۔

(۴) علمی کتب کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اصطلاحات کا لغت مرتب کرنا۔

(۵) اُردو زبان کی قدیم و جدید تالیفات و تصنیفات کا ایک کتب خانہ قائم کرنا۔

(۶) ہر صوبہ کی اُردو ٹکسٹ بکس کو زبان کے لحاظ سے جانچنا۔ اگر ناقص ہوں، تو اُس صوبہ کی گورنمنٹ سے اصلاح کی خواہش کرنا۔

(۷) اور اگر انتظام ممکن ہو اور انجمن کا سرمایہ مساعدت کرے تو اُردو زبان و ادب کے متعلق ایک ماہانہ رسالہ جاری کرنا۔

۳۔ ان مقاصد کے عمل میں لانے کے لیے حسب ذیل تدابیر اختیار کی جائینگی

(۱) السنۂ مشرقی و مغربی سے ایسی کتابوں کا ترجمہ کرنا جو ملک کے لیے مفید ثابت ہوں۔ اور تصنیفات و تالیفات کی ڈایرکٹری تیار کرنا۔

(۲) ایسی جدید تالیفات و تصنیفات کرانا جن کی اُردو زبان کو ضرورت ہو۔

(۳) قدیم اساتذہ کی ایسی قلمی کتابوں کا شایع کرانا، جو درحقیقت قابلِ قدر ہیں، اور جن کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو۔ یا جو کبھی کسی زمانہ میں طبع ہوئی تھیں اور اب نایاب ہیں۔

(۴) ماہران علوم و فنون سے علمی کتب و اصطلاحات علمیہ کا لغت مرتب کرانا۔

(۵) علاوہ اسکے جو صاحب اپنی کتاب کا حق تصنیف فروخت کرنا چاہیں

بشرطیکہ وہ کتاب انجمن کی رائے میں مفید اور عمدہ ثابت ہو، مناسب صلہ دیکر اُسے خرید کرنا۔

(۹) انجمن کے لیے ایک ایسا سرمایہ قائم کرنا جو اُسکی ضروریات کیلئے کافی ہو۔

(۱۰) انجمن کے مقاصد کی اشاعت و امداد کے لیے مختلف صوبوں اور مناسب مقامات میں انجمن کی شاخیں مقرر کرنا۔

۴ - انجمن اُن تمام تالیفات اور تصنیفات اور ترجموں کے لیے جو انجمن کی تحریک سے کرائے جائینگے، یا جن کا حق تالیف وہ خریدنا چاہیگی معقول صلہ دے گی۔ صلہ کی دو صورتیں ہونگی :-

(۱) یا تو انجمن نقد معاوضہ دیگی۔ اس صورت میں حق تصنیف انجمن کو حاصل ہوگا۔

(۲) انجمن کوئی نقد معاوضہ نہ دیگی۔ لیکن کتاب اپنے صرف سے طبع کردیگی۔

۵ - انجمن کے ارکان حسب ذیل ہونگے :-

(۱) سرپرست - امرا و روسائے ملک جو انجمن کو یکمشت ایک ہزار روپیہ یا ماہانہ یا سالانہ معتدبہ امداد عطا فرمائیں گے وہ انجمن کے سرپرست کہلائینگے۔

(۲) ارکان دائمی - جو یکمشت پانچ سو روپیہ عنایت کریں گے وہ رکن دائمی (لائف ممبر) قرار پائیں گے۔

(۳) ارکان معمولی - جو صاحب کم از کم ایک روپیہ ماہانہ یعنی عشرہ سالانہ یا اس سے زائد چندہ دینگے وہ رکن معمولی ہوں گے۔

(۴) وہ نامور ارباب قلم و صاحبان علم و فن انجمن کے ارکان شوری قرار دیے جائیں گے، جن کی خدمت میں انجمن کی طرف سے کوئی کتاب بغرض اظہار رائے یا دیگر امور متعلقہ انجمن مشورہ پیش کیے جائینگے اور وہ اُسپر اظہار رائے اور مفید مشورہ دینے کی زحمت گوارا فرمائیں۔

۶ - انجمن کا دفتر اور حساب کتاب آنریری سکرٹری کے پاس رہے گا اور انجمن کے متعلق ہر قسم کی خط و کتابت سکرٹری سے کیجائیگی۔ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں سکرٹری سال بھر کی کارروائی وحسابات کے متعلق رپورٹ پیش کرے گا اور ایسی رپورٹ عام طور پر شائع کیجائیگی۔

۷ - انجمن کی جو شاخیں ملک کے مختلف مقامات میں قائم ہونگی اُن کے سکرٹری انجمن کے جنرل سکرٹری کے اسسٹنٹ سکرٹری ہونگے اور اپنے اپنے صوبجات اور مقامات میں اُنکے مشورے اور صوابدید سے کام کرینگے۔ ایسی انجمنیں یا شاخیں بھی اپنی اپنی ایک سالانہ رپورٹ تیار کریگی۔

دستخط عمادالملک (سید حسین بلگرامی) دستخط عبد الحق

پریزیڈنٹ آنریری سکرٹری

کچھ شک نہیں کہ انجمن کے اغراض و مقاصد نہایت اہم و ضروری ہیں، اور ہم اُمید کرتے ہیں کہ جملہ ابنائے ملک و بہی خواہان اُردو ان مقاصد کو نظر استحسان دیکھیں گے بلکہ انکی تائید و تکمیل میں حتی المقدور سعی بلیغ اور امداد دلی فرمائیں گے۔

دوسرے مقصد کے تحت میں لکھا گیا ہے کہ "اگر انتظام ممکن ہو، اور انجمن کا سرمایہ مساعدت کرے تو اُردو زبان و ادب کے متعلق ایک ماہانہ رسالہ جاری کرنا" یہ درست ہے کہ ہر جماعت کو اپنے اغراض و مقاصد کے اظہار و اشاعت کے لیے اپنے ہی ایک رسالہ یا اخبار کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، لیکن ہم اسکے خلاف ہیں کہ انجمن اپنا پرچہ جاری کرے۔ اخبار یا رسالہ اُسوقت جاری کرنا چاہیے جب انجمن اس سے زیادہ ضروری و اہم مراحل کامیابی کے ساتھ طے کرلے۔ خدا کے فضل سے ملک میں بکثرت اخبار و رسائل جاری ہیں، مناسب ہے کہ انھیں میں سے کسی کو انجمن اپنا آرگن بنالے۔ خود العصر بھی اس خدمت کی انجام دہی کے لیے تیار ہے۔

انجمن ترقی اُردو کی رپورٹ بابت ۱۹۰۳ء میں مولنٰا شبلی نے تحریر فرمایا تھا کہ "ابتدا میں ہندو صاحبوں کو بطور خود یہ خیال پیدا ہوا کہ ان کو انجمن کی شرکت سے علحدہ رکھا گیا ہے، چنانچہ ایک ہندو اخبار نے اسکا اظہار بھی کیا ......" ہم سمجھتے ہیں کہ اب بھی یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ارکان شوری کی فہرست ۴۴ اصحاب پر مشتمل ہے۔ ان میں صرف

ہ ہندو ہیں۔ حالانکہ ملک میں بہت سے ہندو ایسے موجود ہیں جو اُردو زبان کے متعلق کافی واقفیت، استعداد، اور دلچسپی رکھتے ہیں۔ زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ ارکان شوریٰ کی فہرست میں ایک بھی لکھنوی ہندو کا نام نہیں۔ حالانکہ پنڈت برج نرائن صاحب چکبست بی اے، اور منشی جالپا پرشاد صاحب سکرٹری اودھ اخبار اور منشی مہاراج کشن صاحب قمر، اور منشی نوبت رائے صاحب نظر ہر طرح بجائے اہل تھے۔

ایک اور غلطی بھی انجمن سے ہوئی ہے کہ ارکان شوریٰ میں کوئی ہندوستانی مسیحی نہیں لیا گیا۔ ہمارا نام اس میں ضرور ہے مگر اسکو مشتے نمونہ! سمجھنا چاہیے ہندوستانی مسیحیوں میں پادری واعظ جونیل ناتھ صاحب ایم اے دہلی، مسٹر جے۔ آر۔ رلئے بزلٹ۔ لاہور، مسٹر سلیمان شکور گارڈنر (آپ اساتذہ لکھنؤ میں مستند سمجھے جاتے ہیں) مسٹر ڈانی ایل گارڈنر، رئیسان کنورپور چھاؤنی ضلع ایٹہ، ڈاکٹر ٹی۔ ڈیل صاحب لطیف اجمیری، پادری تاراچند صاحب دہلوی اجمیر (وغیرہ) ہندوستانی مسیحی جماعت میں اہل زباں کی سی قابلیت رکھتے ہیں۔ ہماری رائے میں کم از کم تین ہندوستانی مسیحی بھی ارکان شوریٰ بنائے جائیں تو نہایت مناسب ہوگا۔

ارکانِ شوریٰ میں ۳۸ نام مسلمان حضرات کے ہیں۔ ان ۳۸ ممبروں میں بہت سے نام زینت فہرست کے سوا کسی مصرف کے نہیں۔ مناسب ہے کہ کام کے آدمی نظر انداز نہ کیے جائیں۔ کیونکہ نام سے کام نہیں ہوتا بلکہ کام سے نام ہوتا ہے!

ہم اُمید کرتے ہیں کہ انجمن ترقی اُردو ہماری اس جائز نکتہ چینی سے فائدہ اُٹھاکر ہندوستان کے ہر فریق سے قابل قدر اصحاب کے نام ارکانِ شوریٰ کی فہرست میں داخل کرے گی، ورنہ اُسے اپنے مقصد میں کما حقہ کامیابی نہ ہو سکے گی۔

انجمن تعلیم ابتدائی

گزشتہ پانچ سال میں مسئلہ تعلیم پر جس قدر توجہ کی گئی، اور جو کوششیں اس بارے میں کی گئی ہیں، انکی مثال ابتدائی تعلیم کی تمام تاریخ میں بھی نہیں ملتی۔ بالخصوص آنریبل مسٹر گوکھلے کی کوششیں اس بارے میں خاص طور سے بار آور ہوئی ہیں، اور اب ابتدائی تعلیم کا مسئلہ اُن معدودے چند مسائل میں شمار کیا جاتا ہے جن پر قوم کی آیندہ زندگی کا انحصار ہے۔ اب ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم کے لحاظ سے ہماری حالت نہایت خطرناک ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر ہم کو اس قعر ذلت سے نکلنا منظور ہے تو نہایت اہم مشکلات کا سامنا کرنا پڑیگا۔ لیکن اسی کے ساتھ ہم مایوس ہو کر ہمت نہیں ہارتے، بلکہ مسئلہ کی اہمیت اور اپنے فرائض کی ذمہ داری ہم میں وہ جوش و ولولہ پیدا کرتی ہے، جسکے روبرو ہر قسم کی مشکلات کے خوف بیجا معلوم ہوتے ہیں۔ گورنمنٹ بھی اپنی ذمہ داری کو اب، بہ نسبت سابق، زیادہ محسوس کرتی ہے، اور قدم بڑھانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اگر ہم دیدۂ بصیرت سے دیکھیں تو اکثر ایسے آثار نظر آئینگے جن سے قوی امید پیدا ہوتی ہے کہ آیندہ پانچ سال کا زمانہ ابتدائی تعلیم کے حق میں ایک نہایت مبارک زمانہ ہوگا، جس میں نمایاں ترقی ہوگی اور ہمارے قدم آگے بڑھتے نظر آئینگے۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر صوبجات متحدہ نے اُس رزولیوشن میں جس میں ایلمنٹری ایجوکیشن کمیٹی کے تقرر کا اعلان ہوا تھا یہ امید ظاہر کی تھی کہ

> اگر صوبجات متحدہ کی مالی حالت کو کسی خاص آفت سماوی کا سامنا نہ کرنا پڑا تو یہ ممکن ہو سکیگا کہ آیندہ پانچ سال بعد ابتدائی تعلیم پر گورنمنٹ پنیتیس لاکھ روپیہ سالانہ نامزد صرف کر سکے، اور اس طور سے ابتدائی مدارس کے طلباء میں تین یا ساڑھے تین لاکھ کا اور اضافہ ہو سکے۔

یہ سب باتیں نہایت ہمت افزا ہیں۔ لیکن اسکے ساتھ یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان کوششوں کا بہت کچھ حصہ جو گورنمنٹ اب ظاہر کر رہی ہے، اُن کوششوں کا نتیجہ ہے جو رعایا کی جانب سے کانگرس، کانفرنسوں اور کونسلوں میں کی گئی ہیں، اور جنکو اخبارات نے اپنے زور قلم سے تقویت بخشی ہے۔ پس اگر ہم گورنمنٹ کی پالیسی کی تبدیلی سے پورا فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں، اور ہماری یہ خواہش ہے کہ ابتدائی تعلیم جلد لازمی و مفت کر دی جائے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم ہمیشہ مستعد رہیں اور اس مسئلہ کو کبھی نظر انداز نہ ہونے دیں۔

حال میں ایک ایلمنٹری ایجوکیشن لیگ الہ آباد میں، قائم ہوئی ہے جو ان

صوبجات کی تعلیمی ترقی میں بدل وجان کوشش کریگی۔ اس لیگ کے اغراض مقاصد حسب ذیل ہیں:-

(۱) ابتدائی تعلیم کے مفت ولازمی کیے جانے کے خیال کو عوام الناس میں بذریعہ مضامین لکچر و کانفرنس وقتاً فوقتاً اشاعت دینا۔

(۲) ابتدائی تعلیم کے مفت ولازمی کیے جانے کے مسئلہ پر بذریعہ عرضداشت وغیرہ گورنمنٹ کو توجہ دلانا۔

(۳) ایسے ابتدائی درجہ کے مدرسے کھلوانے کی کوشش کرنا جن میں غربا کے لڑکوں کو مفت تعلیم دی جاسکے اور اُن ابتدائی درجہ کے مدرسوں کی حالت کو سنبھالنا جو ردی حالت میں ہیں۔

لیگ کی کوشش ہمیشہ یہ ہوگی کہ وہ سب فرقوں اور سب مذہبوں کے لوگوں کی ہمدردی اپنے کام کے ساتھ وابستہ کرسکے اور بلا لحاظ مذہب وملت سب کی بھلائی کی کوشش کرے۔ البتہ اگر ممکن ہو تو غریب اور نیچ قوموں کی تعلیم کی طرف زیادہ توجہ کرے۔ یہ امر کہ لیگ کے مدرسوں میں کون سی زبان میں تعلیم دی جائے، اُن لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے گا جو مدرسے کے قرب وجوار کے باشندے ہوں۔ حتی الامکان یہ کوشش کی جائیگی کہ اُردو ہندی دونوں زبانیں ہر مدرسہ میں پڑھائی جائیں۔

پراونشیل لیگ میں عنقریب تمام اضلاع کے ممبر شریک ہونگے اور انکے اغراض ومقاصد کے انجام دینے کے لیے ایک انتظامی کمیٹی مع عہدہ داران کے منتخب کیجائے گی اور لیگ کا صدر دفتر الٰہ آباد میں ہوگا۔ لیگ اس امر کی کوشش کریگی کہ اپنی شاخیں رفتہ رفتہ عنقریب تمام اضلاع میں کھولے جو اس کے زیر نگرانی کام کریں۔ لیکن پراونشیل لیگ خود مدرسے کھولنے کی ذمہ داری اپنے سر نہ لیگی۔ بلکہ یہ کام شاخوں کے سپرد ہوگا کہ جہاں ممکن ہو اور شاخیں ذمہ داری لینے کے لیے تیار ہوں وہاں مدرسے کھولے جائیں۔ پراونشل لیگ اپنے سکرٹری اور دیگر عہدہ داروں اور کام کرنے والوں کے ذریعہ سے شاخوں کو اس امر میں مدد دیگی کہ وہ اپنے اپنے اضلاع میں کمیٹیاں قائم کرسکیں، اور مدرسے کھول سکیں، لیکن مدرسوں کے لیے سرمایہ بہم پہنچانے اور اُنکی نگرانی کرنے کی ذمہ داری اُنھیں اضلاع کی کمیٹیوں اور شاخوں پر واجب ہوگی۔ ملکی معاملات کے لحاظ سے ان صوبجات کی جو کیفیت ہے وہ ظاہر ہے۔ یہاں کی آب وہوا قومی انجمنوں کی سرسبزی وشادابی کے لیے کچھ بہت زیادہ موافق نہیں ہے۔ پس اس امر کو ملحوظ خاطر رکھکر یہ امید کرنا کہ لیگ کے قائم ہوتے ہی کوئی خاص عجیب وغریب ترقی نمایاں ہوگی، امید موہوم ہے۔ لیگ اس امر کی ذمہ داری نہیں لیتی کہ وہ کسی بڑے پیمانہ پر عوام الناس کی تعلیم کا انتظام کریگی۔ لیکن ہم اس امر کی اُمید ضرور کرتے ہیں کہ موجودہ حالت میں ابتدائی تعلیم کے مسئلہ کو لیگ کے قائم ہونے سے خاص تقویت ہوگی اور بہت کچھ فائدہ پہنچے گا۔ علاوہ بریں یہ بھی اغلب ہے کہ لیگ کے ذریعہ سے اہل اسلام واہل ہنود پالیٹکس کے دنگل سے باہر نکل کر ان متفقہ اغراض ومقاصد کے حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے بغلگیر ہوسکیں گے اور بہت سی غلط فہمیاں دور ہوسکیں گی۔ بلاشبہہ یہ کام مشکل ہے اور بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑیگا۔ لیکن اگر ہم اپنی دُھن کے پکے ہیں، اگر ہمارے ارادوں وعقائد میں استقلال موجود ہے اگر ہم ایثار نفس کے لیے تیار ہیں تو کچھ شبہہ نہیں کہ ہمکو کامیابی ہوگی اور ہمارا صوبہ تعلیمی معاملات میں سب سے پیچھے نہیں رہے گا۔

مذکورۂ بالا تحریر چند نہایت ممتاز ہندو مسلمانوں کے دستخطوں سے شائع کیگئی تھی اور ۲۰ اگست انعقاد جلسۂ لیگ کی تاریخ قرار پائی تھی۔ اس جلسہ کو جیسی کچھ کامیابی ہوئی وہ نہایت حوصلہ افزا اور اُمید دلانیوالی ہے۔ ہر فرقہ اور ہر مذہب کے لوگ اس میں موجود تھے۔ پہلا رزولیوشن ڈاکٹر تیج بہادر سپرو نے پیش کیا اور دیگر صاحبوں نے اُسکی تائید کی۔ رزولیوشن حسب ذیل تھا۔

یہ جلسہ عوام الناس کے لیے ابتدائی تعلیم کو نہایت ضروری ولازمی سمجھتا ہے اور طے کرتا ہے کہ ان صوبجات کے لیے ایک ایلیمنٹری ایجوکیشن لیگ قائم کیجائے جس کے اغراض یہ ہوں۔ (۱) ابتدائی تعلیم کی اشاعت میں کوشش کرنا

جہاں مدرسے نہوں، وہاں نئے مدرسے قائم کرانا جن میں تعلیم جہانتک ممکن ہو مفت دیجائے اور جو مدرسے ردی حالت میں ہوں اُنکی حالت سنبھالنا (۲) لازمی اور مفت تعلیم کے مسئلہ پر بذریعہ لکچر و مضامین و کانفرنس وغیرہ لوگوں کو توجہ دلانا (۳) مفت و لازمی تعلیم کے مسئلہ پر گورنمنٹ کی توجہ مبذول کرانا۔

دوسرا ارزولیوشن لیگ کے ممبروں، اور انتظامی کمیٹی و عہدہ داروں کے انتخاب کے باب میں تھا۔ قریب سو اصحاب شریک لیگ ہوے ہیں، جن میں الہ آباد، لکھنؤ، کانپور، بنارس، فیض آباد، بریلی، گورکھپور، علیگڈھ، اور دیگر اضلاع کے حضرات شامل ہیں۔ آنریبل پنڈت موتی لال نہرو صاحب لیگ کے پریسیڈنٹ منتخب ہوے ہیں، اور آنریبل راجہ سر محمد علی محمد خاں صاحب بہادر کے سی آئی ای وائس پریسیڈنٹ۔ علاوہ آپ کے آنریبل پنڈت مدن موہن مالوی، پنڈت بشن نرائن در، راے بہادر بابو گنگا پرشاد ورما، اور ڈاکٹر ستیش چندر بنرجی صاحب بھی وائس پریسیڈنٹ منتخب کیے گئے ہیں، اور لیگ کے سکرٹری پنڈت ہردے ناتھ کنزرو قرار پائے ہیں۔

لیگ کی ممبری کی درخواست و زرِ چندہ اور دیگر خط و کتابت بنام آنریری سکرٹری الیٹرری ایجوکیشن لیگ ملا بنک روڈ، الہ آباد آنی چاہیے۔

مذکورۂ بالا تحریرات ظاہر ہے کہ جو اصول لیگ نے ظاہر کیے ہیں، ان میں صاف طور پر اس بات کی خواہش کی گئی ہو کہ ہندو و مسلمان، دونوں قومیں، اِس کار باب میں کوشش کریں اور ابتدائی تعلیم کے دائرہ کو وسیع کرنے میں متفقہ کوشش سے کام لیں۔ یہ ابتدائی تعلیم کے لازمی اور مفت ہونے کی پہلی منزل ہو۔ آنریبل مسٹر گوکھلے نے ابتدائی تعلیم کے لازمی اور مفت ہونے کا جو مسودہ کونسل میں پیش کیا تھا، اگرچہ وہ نامنظور کر دیا گیا، مگر آیندہ وہ وقت بھی ضرور آے گا جس میں مسودۂ مذکور دوبارہ پیش ہو کر پوری قوت کے ساتھ پاس ہوگا۔ اُس وقت سے پہلے اہل ملک کا فرض ہو کہ وہ اپنے دست و بازو پر بھروسا کریں اور ابتدائی تعلیم کے دائرہ کو وسیع کرنے کی غرض سے ہر صوبہ میں متفقہ کوشش سے کثیر التعداد سکول کھولیں، اور جن امور میں اُنکے درمیان اختلاف ہے، جو اُسکا فیصلہ آپس میں کر کے، اس تحریک کو ترقی دیں اور اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دیں کہ وہ اس میدان میں دوش بدوش رہکر چلنے کے لیے تیار ہیں، اور ایک دوسرے کے حقوق کی عزت کرتے ہیں۔

دیسی زبانوں سے ہماری غفلت

اگر ہماری تعلیمی درس گاہوں میں تہذیب و تربیت کے حصول کا ذریعہ دیسی زبانیں قرار دی جائیں تو یہ فعل سب سے زیادہ فائدہ رساں، معقول اور اقتضاے فطرت کے موافق ہوگا۔ لیکن مشکل یہ ہو کہ ہم ان زبانوں کو پسند نہیں کرتے، اور یہ غلط اندازہ ہمارے ذہن نشین ہوگیا ہو کہ اگر ہونہار طلبا کی تعلیم میں دیسی زبانیں استعمال کیجائیں گی تو بتاہ کُن نتائج پیدا ہوں گے۔ فی الحقیقت ہندوستانی طلباء کی قسمت بہت ہی زبوں ہو، اور غضب یہ ہو کہ اسے زبوں تر بنانے کی کوشش کا سلسلہ برابر جاری ہو۔ ہندوستان کے تعلیم یافتوں کی اوسط عمر ماہرین فن کے تخمینہ کے بموجب ۲۵ سال سے زیادہ نہیں ہو۔ اسپر بھی اس چند روزہ زندگی کا بیشتر حصہ ایک نہایت مشکل اجنبی زبان، انگریزی، کی تحصیل و تکمیل میں صرف ہو جاتا ہو۔ طلباء کی تمام اعلیٰ قوتیں انگریزی کے ہجاء، صرف و نحو اور ادبیات کے مطالعہ میں صرف ہو جاتی ہیں، جن میں سے اول الذکر دونوں محض خیالی اور نہایت عسیر الحصول ہیں، اور موخر الذکر بھی موجب پریشانی ہو۔ ہندوستانی طلباء کو صرف انگریزی میں کمال حاصل کرنے کے لیے اپنے گراں قدر ایام عمر میں سے بارہ سال کا زمانہ درکار ہوتا ہو، اور اس طرح سائنس وغیرہ کی نہایت ضروری نظری و عملی شاخوں کے مطالعہ کے لیے جو وقت باقی رہتا ہو وہ بہت ہی ناکافی ہوتا ہو۔ نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ دیسی زبانوں کے ادبیات اور علوم و فنون کے حصول کا کسی کو خیال ہی نہیں رہتا۔

"ویدک میگزین" کا یہ خیال بالکل صحیح ہو کہ ہماری ہندوستانی یونیورسٹیاں انگریزی زبان سے محبت کے باب میں لارڈ میکالے سے بھی بڑھ گئی ہیں۔ لارڈ موصوف کو ہندوستانی ادبیات اور علوم و فنون سے بالکل محبت نہ تھی اور

علی ہذا القیاس ان یونیورسٹیوں کو بھی صرف انگریزی سے محبت ہے۔ اسکی وجہ غالباً وہ غلط خیال ہے جو ہماری بدقسمتی سے ان لوگوں کے دماغوں میں جاگزیں ہوگیا ہے کہ ہندوستانی طلباء صرف انگریزی پڑھنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں، اور انکی زندگی کا منتہائے خیال محض تعلیم انگریزی ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر وہ ہر سال انگریزی کے بڑے بڑے مشکل نصاب مقرر کرتی ہیں اور اسی پر اکتفا نہیں بلکہ روز بروز اس بوجھ کو اور بھی وزنی کرنے کی فکر انھیں ہر وقت لگی رہتی ہے۔ ہر سال وہ اس قدر کتابیں منظور کرتی ہیں، اور اتنے زائد از ضرورت مضامین مقرر کرتی ہیں جو ایک سال کی میعاد کے لحاظ سے نہ صرف نامناسب ہی ہیں بلکہ طلباء کی پریشانی کی موجب ہیں اور اس کا نتیجہ صریح یہ ہے کہ طلباء کی استعداد میں ترقی مسدود ہوتی جاتی ہے لیکن اسپر بھی انھیں اصرار ہے کہ انگریزی کے ناگوار اور تکلیف دہ نصاب میں چند اور کتابوں کا اضافہ طلبا کے لیے اچھے نتائج پیدا کرنے کا موجب ہوگا۔ یہ اُمید کس قدر غلط اور خلافِ واقع ہے!

لیکن ہمیں اس امر کے فوائد و نقصانات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے کہ ہم اس بارِ گراں کو کس طرح ہلکا کر سکتے ہیں، اور ہمارے سابقہ علوم و فنون میں سے کون سا قابلِ حفاظت سرمایہ ہے جس کی حفاظت کرنے پر اب ہم بھی قادر ہیں۔ بقول ہمصر وکیل اگر اس مہلک مرض کا دفعیہ مقصود ہے تو ہندوستانی نوجوانوں کو اپنی دیسی زبانوں میں تعلیم دینا ضروری ہے، اور اسکے ساتھ ہی کار آمد انگریزی علوم بھی اُنھیں اس قدر پڑھانا چاہیے جو عملی اور صحیح طریقوں سے چند مہینوں میں حاصل ہو سکتے ہیں۔ ہمیں یہ کام اس طریق سے فوراً شروع کر دینا چاہیے کہ ہم دیسی زبانوں سے پھر ایسا ہی فائدہ اُٹھانا شروع کر دیں جیسا کہ ان سے اُٹھانا چاہیے۔ ہمیں اپنے اسکولوں میں، کالجوں میں، غرض کہ ہر حالت میں انھیں عزت کی جگہ دینا چاہیے۔ اور سب سے پہلے ہائی اسکولوں میں انھیں ذریعۂ تعلیم مقرر کرنا چاہیے۔ اگر ہم سے ہو سکے تو یہ کام ایسا ہے جو بغیر کسی توقف کے انجام پا سکتا ہے۔ آنرز کا نصاب اس وقت بھی دیسی زبانوں میں پڑھایا جا سکتا ہے۔ ایف۔ اے کا نصاب ایک ہی سال میں دیسی زبانوں میں تیار ہو سکتا ہے۔ ہمارا یقین ہے کہ اگر کوشش کیجائے تو بی اے۔ کا کورس بھی زیادہ سے زیادہ دو سال تک تیار ہو سکتا ہے۔ صرف مستقل ارادہ اور اپنی دیسی زبانوں کی سچی محبت درکار ہے۔

ہماری رائے میں اُردو زبان کی روز افزوں ترقی اور ہر دلعزیزی اس بات کی کافی ضمانت ہے کہ ہم اسکے ذریعہ سے ہر قسم کے کورس تیار کرنے پر قادر ہو سکتے ہیں۔ علمی مصطلحات کی کمی بے شک ایک بہت بڑی رُکاوٹ ہے لیکن اس رُکاوٹ کو بآسانی رفع کیا جا سکتا ہے۔ انجمن ترقی اُردو اپنے مقاصد کے لحاظ سے اصطلاحات کا لغت تیار کر سکتی ہے اور اُس لغت سے انگریزی اور دوسری زبانوں کے علوم و فنون اور نصاب تعلیم کی کتابوں کے تراجم اُردو زبانوں میں شائع کیے جا سکتے ہیں۔ اس سے جو فوائد عظیم مُلک کی موجودہ اور آیندہ نسلوں کو حاصل ہوں گے اُنکو بلا مبالغہ کے ساتھ بیان کرنا ناممکن ہے۔

رسالۂ اَدیبؔ الہ آباد

الہ آباد کا نامور رسالہ "ادیب" جو اپنی ظاہری اور معنوی خوبیوں کے لحاظ سے دنیائے ادب میں چوٹی کا رسالہ سمجھا جاتا تھا اور جس کے علمی و لٹریری کارنامے مدت تک اربابِ ذوق نہیں بھول سکتے، افسوس ہے کہ جولائی ۱۹۱۳ء سے بند ہوگیا اور تشنہ کامانِ ادب کو اپنی یاد میں دلکش حسرت چھوڑ گیا۔ اسکے بند ہو جانے کا افسوس گو تمام ہی خواہانِ اُردو کو ہے، لیکن جو صدمہ ہمکو یا حضرت نظرؔ لکھنوی کو محسوس ہو سکتا ہے وہ اور ہی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اُردو میں صرف ادیبؔ ہی پہلا رسالہ تھا جو یورپ اور مصر و قسطنطنیہ کے زرین رسائل کے مقابلہ میں فخریہ پیش کیا جا سکتا تھا۔ اُسنے ظاہر کر دیا تھا کہ نفاستِ طبع اور مذاقِ سلیم کا احساس ابھی ہندوستان کے افراد سے مفقود نہیں ہوا ہے۔ اس گلشنِ ادب کی آبیاری کا فخر اولیں جنابِ نظرؔ کو حاصل رہا۔ موصوف نے ایک برس چار ماہ اُسکو ایڈٹ کیا۔ اسکے بعد ہم ایک برس آٹھ ماہ تک اپنی امکانی کوشش سے اسکی خدمت کرتے رہے۔ ہمارے بعد میر حسین چھ ماہ ادیبؔ کی خدمتگزاری اور اپنے فرائضِ ایڈیٹری کی ادائی میں مصروف رہے، لیکن افسوس ہے کہ اس

تیسرے دور کا مستقبل جس قدر شاندار بتایا گیا تھا اُسی قدر مبارک ثابت ہوا۔

ادیب کو دیگر اُردو رسائل کی طرح عام ناقدردانی کی شکایت کبھی نہیں ہوئی بلکہ پبلک نے جس فراخ دلی سے ادیب کی قدر افزائی فرمائی اتنی کسی دوسرے رسالہ کو مشکل سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ہمارے زمانہ میں وہ پندرہ سو چھپتا تھا اور تقریباً تیرہ سو اُسکے خریدار تھے۔ ہمعصر ہندو (لاہور) کا یہ قیاس بالکل خلاف واقع ہے کہ "ادیب کو مالی مشکلات یا خسارہ نے اس ناخوشگوار انجام کے لیے تیار و آمادہ کیا ہے" اور یہ الزام بھی ہمعصر موصوف کا نہایت بیجا اور غلط ہے کہ "ملک کے بہترین رسالے اُردو داں پبلک کی شریری بدمذاقی اور ناقدردانی کے سبب بیموت مر رہے ہیں اور جو زندہ ہیں وہ بھی کچھ بہت اطمینان بخش حالت میں نہیں ہیں ...... الخ" اس کے بند ہو جانے کا سبب اُردو پبلک کی ناقدردانی اور بدمذاقی ہرگز نہیں ہے، بلکہ وہ اسباب اور ہی ہیں، جن کا اظہار یہاں کچھ بے ضرورت اور غیر مفید معلوم ہوتا ہے۔

ہمعصر ہندو نے یہ بھی لکھا ہے کہ ادیب نے ساڑھے سات سال اُردو کی خدمات انجام دیں۔ خوب! ادیب کے بند ہو جانے سے زیادہ ہمیں ایسے اخبار نویس حضرات پر افسوس آتا ہے جن کے معلومات اس قدر کوتاہ اور خیالات اس قدر پست ہیں کہ وہ سیاسی اور اقتصادی معاملات تو کجا ایک معمولی واقعہ کے متعلق بھی صحیح معلومات بہم نہیں پہنچا سکتے۔

یادش بخیر ادیب پر دو آنسو بہاتے ہوئے ہمعصر "آگرہ اخبار" نے العصر کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن نامبارک الفاظ میں اور بُری پیشین گوئی کے ساتھ۔ ہم اسکو بھی غنیمت سمجھتے ہیں ع

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

لیکن ہم صرف اس قدر التماس کی جرأت کرتے ہیں کہ وہ بھی ہندو کی طرح رائے قائم کرنے میں اس قدر عجلت سے کام نہ لیا کریں، اور قیاسی شبدیز کی جولانی دکھاتے ہوئے مستقبل کے واقعات کو حال یا گزشتہ سے مشابہ نہ مان لیا کریں۔ ممکن ہے کہ خاکم بدہن العصر کا بھی وہی حشر ہو جو ادیب کا ہوا، مگر ایسی پیشین گوئی بدشگونی میں داخل ہے، اور جب ہی خواہان اُردو العصر کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو اُنکو ایسے الفاظ سے ہمارا حوصلہ پست نہ کرنا چاہیے، بلکہ انکا فرض ہے کہ اب پہلے سے زیادہ خود کوشش کریں اور ہمارا حوصلہ بڑھائیں تاکہ العصر پورے طور پر ادیب کا قائم مقام ہو سکے۔ گو ہمارے خیالات کی جولان گاہ اُس سے بھی بہت وسیع ہے۔

اُردو پریس کانفرنس

منشی رام چہپال سنگھ صاحب شیدا (دہلوی) ایڈیٹر اخبار ہندوستان کی تقریر صدارت

برادران ہم قلم و معاصرین محترم!

آپ کی مردم شناسی قابل داد ہے کہ جبکہ تمام تعلیم یافتہ ہند کا عطر اس تاریخی شہر میں مہکا ہوا ہے یعنی جبکہ اور ہند کے تقریباً تمام بہترین دماغ دار الخلافہ اودھ میں نہایت اہم اور متبرک مقاصد سے مجتمع ہیں۔ آپ نے اس بے نظیر موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

آج جو لوگ لکھنؤ میں اطراف و جوانب ہند سے فراہم ہوئے ہیں وہ ہندوستان میں برٹش عہد حکومت کے شجر بار دار کے نہایت شیرین پھل ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ہندوستان کی تمام معدنی دولت سے زیادہ قیمتی ہیں۔ حقیقتہ مختصر یہ کہ اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو ہندوستان نیو زیلینڈ کے مشابہ ہوتا۔ بس ایسے وقت میں جبکہ ہندوستانی قوم نے اپنے عمل ارتقا کی دوڑ میں نہایت لیر قدم اٹھایا ہے بڑا ہی تعجب ہوتا اگر قومی مشینری کے سب سے ضروری پرزے کے پیچ کو کسنے کی پروا نہ کی جاتی۔

صاحبان! میرا تو یہ عقیدہ ہے اور امید ہے کہ آپ بھی اس خیال میں میرے ہم نوا ہوں گے کہ تمام سوشل، پولیٹیکل، اخلاقی اور اقتصادی اصلاحوں کی اصلی بنیاد ایک

آزاد اور زبردست پریس

ہے۔ خیالات ہی تو ہیں جو افراد یا اقوام کو چھوٹا یا بڑا بناتے ہیں خیالات جس قدر بلند اسی قدر ارادے اعلیٰ اور جیسے ارادے ویسے ہی اعمال اور افعال سرزد ہوا کرتے ہیں۔ اور جیسے افعال ویسے ہی ادنیٰ اور اعلیٰ حالتیں رونما ہوتی ہیں۔ اس لیے جس قوم کے خیالات اعلیٰ وہی قوم اعلیٰ اور افضل ہے۔ آپ پر مخفی نہیں کہ اچھے اور نفیس خیالات کی اشاعت کا بہترین اور کارگر ذریعہ پریس ہے بس پریس ایسا آزاد ہونا چاہیے جیسی ہوا۔ آپ پر بخوبی روشن ہے کہ ہندوستانی قوم کے خیالات جو نشو و نما پا رہے ہیں اور جو یقیناً ترقی اور بلندی کی طرف جا رہے ہیں یہ سب پریس کی کرشمہ سازی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ

اپنی طاقت کا احساس

پورے طور پر آپ کو ہے یا نہیں۔ لیکن اگر آپ غور کریں تو مخفی نہ رہیگا کہ اعلیٰ انگریزی تعلیم یافتہ جماعت ملک کی آبادی کا نہایت جزوی عنصر ہے۔ ان کے خیالات کی اشاعت و تائید و حمایت کا سہرا محض دیسی پریس کے سر ہے۔ اردو، ہندی، بنگالی، گجراتی، مرہٹی، تامل اخبارات کا گزر ان کروڑوں ہندوستانی ہاتھوں تک ہے جہاں انگریزی پریس کی رسائی نہیں ہے۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ سو کروڑ ہندوستانی اُردو زبان پڑھ سکتے ہیں خواہ آپ اس کا نام ہندی رکھ لیجئے یا اُردو اور وہ کروڑ سمجھتے ہیں عموماً بڑے شہروں اور قصبات کے ایک ایک محلہ میں دو دو چار چار اور دیہات میں ایک گاؤں کی کل آبادی کیلیے ایک ہی پرچہ کفایت کرتا ہے پس اُردو اخبارات کے خریدار اگر کروڑوں تک نہیں تو اس کے پڑھنے والے اور اُن سے واقعات کا علم اخذ کرنے والے کروڑوں سے کم تعداد میں نہیں ہیں آپ دیکھ رہے ہیں کہ

اہل ہند کی وفاداری

پر نہ صرف تمام یورپ بلکہ اہل برطانیہ تک حیران ہیں کیونکہ باشندگان انگلینڈ نے تو اینگلو انڈین اخبارات کی وساطت سے ہمیشہ یہ سنا تھا کہ ہندوستان میں غداری اور بغاوت کی آگ شعلہ زن ہے اور یہ ملک ابادکستوں اور بم بازوں کا مسکن ہے۔ لیکن بخلاف ان کی توقعات کے

انھون نے دیکھا کہ جنگ شروع ہوتے ہی والیان ریاست سے لیکر ادنیٰ کاشتکار تک سلطنت کے لیے تن من دھن سے سینہ سپر ہو گئے تو اُن کے استعجاب کی کوئی حد نہ رہی لیکن یہ انتہائی جذبۂ وفاداری عامۃ الناس مین کس نے پیدا کیا؟ کیا انگلشمین اور سول ملٹری گزٹ نے کیا یا پائنیر اور اسٹیٹسمین اور مدراس میل نے نہین بلکہ ورنیکلر پریس نے لیکن ان قابل قدر خدمات کا صلہ اُردو پریس کو یہ ملا ہو کہ وہ پہلے سے زیادہ مشتبہ نظر سے دیکھے جانے لگا۔ اور ان مین بعض کی ہستیان پریس ایکٹ کے تصدق ہو چکی ہین اس لیے نہین کہ ان مین مغویانہ مضامین درج ہوے تھے بلکہ اس وجہ سے کہ اُن کے مالک حکام کی نظر مین ان نامعلوم افعال کے جن کا پبلک کو کچھ علم نہین مرتکب ہوے تھے یا ہونے والے تھے جو امن عامہ کے لیے خطرناک خیال کیے جا سکتے تھے۔

پریس ایکٹ

کی سختیون کے مسئلہ نے اس وقت ملک کی توجہ کو بڑے زور شور سے اپنی طرف متوجہ کیا ہو۔ ہماری تمام پولیٹیکل پبلک باڈیز نے اس پر کھلے الفاظ مین عام طور سے اظہار کر دیا ہو۔ انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ متفق اللفظ ہین کہ یہ قانون جسقدر نامناسب ہو اُس سے بڑھ کر اُس کا عملدرآمد مخل آزادی ہو۔ ملک کی اعلیٰ ترین جوڈیشل عہدہ دارون نے اس قانون کو بے اصول قرار دیا ہو بلکہ کلکتہ اور مدراس ہائی کورٹ کے چیف جسٹس صاحبان اپنی رائے کا اظہار کر چکے ہین کہ یہ قانون صرف اصلی جرم کا انسداد نہین کرتا بلکہ اس قدر دور رس اور وسیع اور ہمہ گیر ہو کہ معصوم سے معصوم تحریرین اسکی رو سے قابل تعزیر ٹھہرائی جا سکتی ہین آپ صاحبان مین سے کوئی صاحب کوئی فقرہ لکھیے خواہ وہ کیسا ہی وفاداری کے جذبات سے لبریز ہو لیکن اس عجیب قانون کی رو سے مین اُسے سڈیشن ثابت کر سکتا ہون مثلاً کوئی اخبار لکھے کہ ہم بڑے ادب کے ساتھ اپنی عادل گورنمنٹ سے یہ التجا کرتے ہین کہ ہندوستانیون کو فوج مین کمیشنڈ عہدے عطا کیے جائین تاکہ ہم ہندوستانی جنگ یورپ مین اپنے سپاہیانہ جوہر بہتر طور پر دکھلا سکین پریس ایکٹ یہ کہتا ہو کہ اگر لفظاً یا معناً اشارتاً یا کنایتاً یا اور کسی طرح سے کوئی ایسا خیال ظاہر کیا جائے جس سے گورنمنٹ قائم کردہ از روے قانون کی اہانت یا تحقیر کا پہلو نکلتا ہو یا اُس کے خلاف نفرت کا جذبہ پھیلتا ہو تو وہ سڈیشن ہو اب کوئی ضرورت سے زیادہ ذی حس ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کہہ سکتا ہو کہ چونکہ ہندوستانیون کے لیے کمیشنڈ عہدے مانگے گئے ہین جو ابتک نہین دیے جاتے لہذا اخبار نے یہ خیال پبلک کے سامنے پیش کیا ہے کہ گورنمنٹ ہندوستانیونکو کمیشنڈ عہدے فوج مین نہین دیتی اور یہ خیال گورنمنٹ کی غیر فیاضانہ پالیسی اور ہندوستانیون کے ساتھ اس پہلو مین انصاف کرنے کی عدم آمد کو یاد دلاتا ہو اور اس سے پبلک مین گورنمنٹ کے خلاف نا انصافی کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہو لہذا اُس نے سڈیشن کا ارتکاب کیا ہو اور یہ بھی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اختیار مین ہو کہ وہ اس اخبار سے اسی ارتکاب جرم کے بہانہ سے ضمانت طلب کرے۔ فی الحقیقت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اختیارات پریس کے متعلق اس قدر وسیع ہین کہ اُس کو وجہ بتلانے کی بھی ضرورت نہین وہ وجہ صرف گورنمنٹ کو بتلاوے گا۔ ایسا بھی عموماً ہوتا ہو کہ پرنٹر کے بدل جانے سے یا مکان پریس کے تبدیل کرنے پر ضمانتین طلب کر لی گئی ہین۔ اس کے معنی یہ ہین کہ اخبارات ہند کے پرنٹر خواہ خضر یا حضرت مسیح یا مہاراجہ بھرتری یا گوپی چند یا گورو گورکھ ناتھ جیسے زندہ جاوید لوگون کے سوا ان لوگون مین سے ہونا چاہئین جو لقمۂ اجل سے محفوظ نہین رہ سکتے۔ یا یہ کہ وہ عمر بھر کے لیے اسی پرنٹری کے کام کے لیے پابند رہین۔ زندگی کے دوسرے شعبون مین قدم رکھنے کی اُن کو ممانعت ہو۔ اور پریس ایسے مکانون مین ہونے چاہئین جنھین نہ زلزلہ گرا سکے یا دور حوادث جنکی دیوارون کو ہلا سکے۔ آگ جلا نہ سکے سیلاب اُن کو بہا نہ سکے اگر طاعون یا ہیضہ پھیلے تو بھی مکان پریس اس رتبہ سے کسی دوسرے محفوظ کوارٹر مین منتقل نہ ہو سکین ورنہ ضمانت داخل کرنے کا حکم موجود ہو۔

صاحبان! تمام دنیا میں اصول قانون یہ ہے کہ جب تک کسی شخص سے کوئی جرم سرزد نہوا ہو وہ معصوم اور بے گناہ سمجھا جاتا ہے لیکن ہمارا قانون پریس اِس اصول کی بیخ و بُن پر بھی کلہاڑا رکھتا ہے یعنی آج ایک شخص ایک نیا پریس جاری کرتا ہے یا اخبار نکالنا چاہتا ہے تو بھی مجسٹریٹ کو اختیار ہے کہ اُس سے ضمانت طلب کرے۔ ابھی اُس نے کاغذ پر ایک سطر نہیں چھاپی ہے ابھی تک اُس نے کوئی اخبار نکال کر سڈیشن کا ارتکاب نہیں کیا ہے لیکن یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ وہ ضرور مرتکب جرم ہوگا۔ اور یہ فرض کر لینے کا اختیار ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو حاصل ہے۔

جائز نکتہ چینی کی بندش

صاحبان جائز نکتہ چینی کا دروازہ اِس قانون نے بالکل بند کر دیا ہے آپ کی قلمون کو روک دیا گیا ہے فرض کر لیجیے کہ کسی ضلع مین مقامی حکام کوئی غلطی کرتے مین کیونکہ وہ آخر فرشتے نہین ہوتے غلطی کا ہر وقت امکان ہے تو اُس غلطی کی تلافی کس طرح ہو کیونکہ کس اخبار مین یہ طاقت ہے کہ وہ اپنا فرض دیانت داری سے ادا کر کے اُن لوگون کے اعمال پر نکتہ چینی کرے جن کے اختیار مین ہے کہ ۵۰۰ سے لیکر ۱۰ ہزار تک کی ضمانت طلب کر لین یا اگر داخل ہے تو اُس کو ضبط کر لین بس اخبارات کا کام اب یہ رہ گیا ہے کہ ہمہ تن ہمہ دم نکشیدم اور وقت بیوقت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹون کی شان مین قصیدے لکھتے رہین اور اُن کے ہر فعل پر آمنا و صدقنا کے نعرے لگاتے رہین۔ ہر قانون مین جرم کے لئے نیت ایک نہایت ضروری عنصر ہے لیکن یہان نیت کو بھی بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے نیت آپکی کیسی ہی نیک ہو اور آپ ہزار آرٹیکل اپنے جذبہ وفاداری سے لبریز لکھے ہون لیکن اگر ایک فقرہ کہین ایسا لکھا گیا ہے جسکے معنی کچھ اور بھی ہوسکتے ہین یا سرکاری مترجم نے جس کا ترجمہ کچھ اور کر دیا ہے تو بھی آپ قانون کی زد مین آسکتے ہین چنانچہ ایسا بارہا ہو چکا ہے جس وقت دہلی مین جب وہ ناگوار واقعہ گزرا جس سے یہ تمام ملک کو افسوس ہے یعنی کسی بد اطوار کمبخت نے ہندوستان کے سب سے بڑے حاکم لارڈ ہارڈنگ کی

اور رحم دل جدید وائسرائے کا قصد جان کیا تو لاہور کے اخبار جھنگ سیال نے اپنے جوش وفاداری کا اظہار کُھلی چٹھیون کے ذریعے سے کیا اور اِس بد اطوار کمبخت کے نام جس سے اِس فعل شنیع کا ارتکاب ہوا تھا اپیل کی کہ وہ مردون کی طرح اپنے تئین جوالۂ پولیس کر دے تاکہ تمام ہندوستانیون کے دامن سے یہ داغ دُھل جائے لیکن اِس چٹھی مین ایک فقرہ ایسا تھا جس کو چغل خور لوگون نے ایسے معنی پہنا دیے جو چٹھی کے باقی تمام خیالات سے لگا نہین کھاتے تھے اور آپ یہ سُن کر حیران ہون گے کہ محض اِس فقرہ کی بنا پر اخبار مذکور کی ۲ ہزار کی ضمانت ضبط ہو گئی۔ ایسا ہی ہندوستان کے ساتھ ہوا کہ ایک نہایت وفادارانہ ایڈیٹوریل آرٹیکل مین جس مین اہل ہند کو ترغیب دی گئی تھی کہ گورنمنٹ کے لیے اِس جنگ مین اپنی جانین نثار کرین چار لفظون کا ایک جملہ قابل اعتراض سمجھا گیا اور اُس پر گورنمنٹ کو بضرورت محسوس ہوئی کہ اخبار کو تنبیہ کی جائے۔ اور محض ایڈیٹر کے ۵۰ سالہ گذشتہ رویہ کے خیال سے کوئی سخت اسٹیپ لینا مناسب نہین سمجھا گیا ورنہ عجب نہ تھا کہ ضمانت طلب کر لیجاتی یا مقدمہ چلایا جاتا پس صاحبان جب تک یہ قانون موجود ہے ہندوستانی پریس اور خاصکر دیسی پریس اپنے فرائض کو پورے طور پر ہرگز ادا نہ کر سکے گا اسمین محض اہالیانِ اخبارات ہی کو خطرہ نہین بلکہ آزادی تحریر کے نہونے سے گورنمنٹ رعایا کے دلی جذبات کے علم سے محروم رہتی ہے جن کا جاننا ارباب حل و عقد کے لیے نہایت ضروری ہے کیونکہ رعایا کی خواہشات اور خیالات سے ہر وقت باخبر رہنا اعلیٰ درجے کے نظام سلطنت کے لیے نہایت ضروری ہے۔

اندرونی اصلاح

صاحبان پریس ایکٹ کا منسوخ کرانا اُردو پریس کی ترقی کا صرف ایک پہلو ہے۔ اور یہ امر گورنمنٹ کے اختیار مین ہے کہ وہ ہماری اِس عاجزانہ درخواست کو شرف قبولیت بخشے لیکن اس کو چھوڑ کر پریس کی اصلاح بہت کچھ ہمارے ہاتھ مین ہے اور اُس کے لیے آپکو مل جُلکر کام کرنے اور جد و جہد

دینے کی ضرورت ہے۔

سب سے اول یہ امر میں آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستانی قوم میں باہمد گر مغائرت اور بیگانگی کے خیالات کا دور کرنا اخوت اور حب الوطنی کے جذبات کو ترقی دینا بعض آپ کی مساعی جمیلہ پر منحصر ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ دنیا کی ہوا کس طرف ہے۔ ہماری تمام قومی تحریکوں کا عام میلان اتحاد اور یگانگت کی جانب مائل ہے آپنے ملاحظہ کیا کہ ابھی دو تین روز ہوئے نیشنل کانگرس اور مسلم لیگ نے سلف گورنمنٹ کے متعلق اتفاق رائے ظاہر کیا ہے۔ قانون اسلحہ۔ قانون پریس ہندوستانیوں کیلئے اعلیٰ فوجی مناصب کے لیے ملک کی دونوں قومی مجلسوں نے ایک ہی آواز بلند کی ہے۔ بہت سے معاملات میں ہندو اور مسلمان لیڈر ہمخیال ہو گئے ہیں۔ جو جزوی اختلافات تھے وہ مٹ گئے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اب ہندوستانی تیس سال کے بعد صحیح معنی میں ایک قوم بن گئے ہیں لہٰذا میں بڑے ادب کے ساتھ ہندو اور مسلمان اخبارات سے (اگرچہ یہ تفریق بھی فضول ہے کہ فلاں اخبار ہندو اور فلاں اخبار مسلمان ہے) گزارش کرتا ہوں کہ اُن باتوں سے آیندہ ہمیشہ احتراز کریں جو اِن دو عظیم الشان قوموں کو یکجائی قریب لانے کے دو رہے جائیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اختلاف رائے نہ رہے۔ اختلاف تو باعث زینت ہے۔ اختلاف تو ہمیشہ رہیگا لیکن میں صرف یہ کہتا ہوں کہ مخالفت نہ ہے۔ میں اس مسئلہ کے متعلق میں خیال کرتا ہوں کہ اگر ایک اصول کے ہم سختی سے پابند ہو جائیں تو کبھی اُلجھن پیدا نہ ہو اور وہ یہ کہ ایک دوسرے کے گزشتہ اور موجودہ بزرگوں کا نام ہمیشہ ادب و احترام سے لیا جائے۔ ادب کو ہمیشہ ملحوظ رکھیں بحث ہوتی رہے۔ مباحثے ہوتے رہیں لیکن تہذیب او رشائستگی کو جو ہماری مشرقی تہذیب کا جزو لاینفک ہے اور جس پر ہم دونوں قوموں کو بجا طور پر ناز ہے کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

پریس بوریو

اُردو پریس کی بہتری کے لئے میرے خیال میں ایک تجویز ہے کہ ایک سررشتہ قائم کیا جائے جس کے ماتحت چند قابل مترجم بھی ہوں اور وہ اُردو اخبارات کے مضامین کے خلاصے جو گورنمنٹ کی وفاداری سے مملو ہوتے ہیں ہر ہفتہ ترجمہ کرکے ایک رپورٹ ہر صوبہ کی گورنمنٹ اور حکام اضلاع کے پاس بھیجا کریں کیونکہ ہم کو سب سے بڑی دقت یہ پیش ہے کہ اُردو پریس کا صرف تاریک پہلو حکام کے زیر نظر رہتا ہے اور انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ اُردو پریس نے کہاں تک گورنمنٹ کی خدمت کی ہے۔ اس محکمہ کا یہ بھی کام ہو کہ وہ اخبارات کو بھی وقتاً فوقتاً مشورہ دیتا رہے۔ اور گورنمنٹ جب کسی اخبار سے ضمانت طلب کرے یا منسوخ کرنے کا ارادہ کرے تو پہلے پریس بوریو سے اُن قابل اعتراض مضامین یا فقرات کا ترجمہ بھی کرالیا کرے تاکہ اُردو اخبارات ناکردہ گناہ مجرم نہ قرار دیے جایا کریں۔

اخبارات کی زندگی اور موت

کا سوال اب سامنے آگیا ہے۔ کاغذ کی گرانی نے اہالیان اخبارات کے چھکے پست کر دیے ہیں اور اندیشہ بلکہ یقین ہے کہ کاغذ ابھی اور گراں ہوگا۔ سیاہی اور دیگر سامان پریس کا نرخ بھی کہاں تک پہنچ گیا ہے آپ پر مخفی نہیں ہے۔ دوسری طرف اخبارات کی خریداری بہت کم ہوتی جاتی ہے۔ انگلینڈ اور بمبئی کے اخبارات اپنی قیمتیں اضاعف کر چکے ہیں اور مزید اضافہ قیمت کی فکر میں ہیں۔ ان حالات میں اُردو اخبارات اگر باہمی قرارداد سے اپنی قیمتوں میں اضافہ نہیں کریں گے تو اُن کا زندہ رہنا محال ہے۔ لاہور میں جو اُردو اخبارات کا مرکز ہے تمام ماکان اخبارات اضافہ قیمت کے سوال پر متفق ہیں۔ بجز ایک دو معاصرین کے جن کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ اتنی تمام اخبارات مر جائیں تب وہ تنہا میدان میں رہ جائیں گے اور جو نقصان آجکل وہ اُٹھا رہے ہیں اُس سے سب کی کسر پوری کر لیں گے۔

دوسری اندرونی اصلاح

یہ ہوگی کہ آپ اردو پریس مین آیندہ کام کرنے والے تیار کرین۔ اس معاملہ مین ایک بڑی تنگ خیالی سے کام لیا گیا ہو۔ خود غرض لوگون نے نوجوانون کی جو اس فیلڈ مین داخل ہونا چاہتے تھے کبھی حوصلہ افزائی نہین کی۔ اس لیے ہر ایک اخبار کے دفتر مین دو دو چار چار گریجوایٹ یا انڈر گریجوایٹ بطور امیدوارون کے رکھے جائین علاوہ ازین جو مراعات اور سرپرستی انگلو انڈین اخبارات کو حاصل ہین۔ اردو پریس اُن سے محروم ہو۔ مثلاً ہر قسم کی رپورٹین اور سرکلر اردو پریس کیونکہ نیز ہر قسم کے سرکاری اشتہارات اُن کو دیے جاتے ہین۔ لیکن تمام اردو اخبارات کو نہین۔ اس لیے ہمین گورنمنٹ سے یہ بھی گزارش کرنی ہو کہ اردو پریس کے ساتھ بھی وہی برتاو کیا جائے۔ تاکہ انھین جز و لازم کا تجربہ حاصل ہو بلکہ اگر ممکن ہو تو انھین کچھ وظائف بھی دیے جائین کیونکہ سر دست اخبار نویسی کے لیے خاص کالج قائم کرنے مشکل ہین۔

علاوہ ازین جہان تک ممکن ہو اخبارات کو شخصی ملکیت سے نکال کر مشترکہ سرمایہ کی کمپنیون کے زیر اہتمام لایا جائے کیونکہ شخصی انتظام چند شخصون کی زندگی اور تندرستی تک وابستہ رہتے ہین شخصی انتظامات مین ایک بڑا نقص یہ ہو کہ اکثر اخبارات ذاتی منافع کے سامنے پبلک کے اغراض کو قربان کر دیتے ہین۔ لاہور کے بعض پریسون مین حلوہ پریس کے اخبارات کی تنخواہ دو دو ماہ تک تقسیم نہین کیجاتین ایک پریس مین یہ دستور ہو کہ تنخواہ ۵ تاریخ کو دیجاتی لیکن اُس وقت بھی دو پیسہ روپیہ کاٹ لیا جاتا ہے۔ مین نے حساب لگایا ہو کہ یہ کٹوتی ۲۰۰ روپیہ سالانہ فیصدی سود کی شرح تک پہنچتی ہو۔ سوال ہو سکتا ہو کہ جہان اس قسم کی سختیان ہین وہان لوگ کیون کام کرتے ہین بات یہ ہو کہ جو آدمی ایک دفعہ پھنس گئے اُن کا اُس جال سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہو ایک غریب کے لیے یہ مشکل ہو کہ وہ یہ قربانی کر سکے کہ ۲۵ روپیہ کی تنخواہ کا

نقصان گوارا کرے۔ نہ اُن کے پاس عدالت بازی کے اخراجات اور مہلتون تک آخری ڈگری حاصل کرنے کے لیے صبر ہوتا ہو۔ ان حالات مین وہ غلامون کی سی زندگی بسر کرتے رہتے ہین۔ اس لیے صاحبان علم اخبار و پریس کے لیے بھی کچھ قواعد بنانے چاہئین۔ ان کی علالت اور ضعیفی اور مرگ مفاجات کی صورت مین ان کے اہل و عیال کی قابل رحم حالت کی بھی کچھ فکر کرنی چاہیئے۔ اگر پراویڈنٹ فنڈ قائم ہو جائے تو اُن کے لواحقین کے لیے ابر رحمت کا کام دے گا۔

یاد رفتگان

آج اس جلسہ مین اُردو پریس کے کئی زبردست کارکن اصحاب ہمین یاد آئے بغیر نہین رہ سکتے۔ آنریبل رائے بہادر گنگا پرشاد صاحب ورما اگر آج زندہ ہوتے تو اُن کی با اثر شخصیت اور اُن کے قیمتی مشورون سے اس جلسہ کو کس قدر تقویت حاصل ہوتی۔ آنریبل رائے بہادر منشی پراگ نرائن صاحب بھارگو مالک اودھ اخبار کی وفات حسرت آیات ایک ایسا تازہ زخم ہو جو ابھی تک ریس بھی نہین ہوا۔ اس وقت آپ کا یہان موجود نہونا ہم سب نہایت حسرت کے ساتھ محسوس کر رہے ہین۔

شکریہ

صاحبان! طول کلامی سے خاکسار کو ہمیشہ سے نفرت ہو۔ اس لیے آپ کو مطمئن رہنا چاہیے کہ مین زیادہ عرصہ آپ کی سمع خراشی نکرون گا۔

آپ خیال کرتے ہون گے کہ مین نے ابتک اُس رسم کو ادا نہین کیا جو ہر جلسے کے صدر کا فرض اولین سمجھا گیا ہو۔ اور اُس پر رواج کی مُہر لگی ہوئی ہو وہ یہ کہ کرسی صدارت کے لیے اپنی ناقابلیت کا اعتراف اور دوسرے ہی سانس مین عزت افزائی کا شکریہ۔

اُردو اور اُس کی ترقی کی صورت

شائستہ سوسائٹی کی زبان فلسفیانہ مگر نیم شائستہ کی شاعرانہ ہوتی ہو۔ زبان کی تبدیلی کچھ تو سبب اور کچھ نتیجہ ہوا کرتی ہو۔ دماغی قوی کے تغیرات کا
(میکالے)

ڈارون کے مسئلہ ارتقا نے مملکتِ خیال مین ہونچال کا کام کیا۔ علمی دنیا مین ایک ہلچل سی پڑ گئی۔ حسنِ اعتقاد کی بنائی ہوئی عمارتین زمین پر آ رہین۔ اکثر مسائل قدیمہ کی بنیادین تک ہل گئین۔ اسپنسر نے اُس کو ہاتھون ہاتھ لیا اور اس کے زبردست قلم نے کیا انسانیات کیا فلسفہ اخلاق کیا عمرانیات سب مین بیشتر مسائل کی دیوارین ارتقا کے اینٹ چونے سے اُٹھائین۔ فلسفہ یورپ مین جان سی پڑ گئی۔ ترقی کے راستہ پر جو علوم ٹھٹک سے گئے تھے آگے قدم ڈالنے لگے۔ تقابل و ملاغ ہر شاخِ علم مین ارتقا کا پانی دینے لگے۔ زبان کا انسان سے چولی دامن کا بلکہ یون کہیئے جسم و جان کا ساتھ ہو پس فلسفہ زبان کا ارتقا کے اثر سے بچنا محال تھا۔ فلسفہ السنہ نے بھی روپ بدلا اور بہت کچھ ترقی کی آیندہ اُمید ہو سکتی ہو۔ مین چاہتا ہون کہ اُردو پر بھی مسئلہ ارتقا کی روشنی پڑے۔ اُسکی گذشتہ تاریخ نئے اصول پر لکھی جائے اور اُسکی آئندہ ترقی کا بنیادی پتھر نئے مسائل پر رکھا جائے۔ اِس مضمون مین مین صرف سرسری نگاہ تاریخ اُردو پر ڈالونگا اور چند ترقی کی صورتون کی طرف اشارہ کرونگا۔ پوری طرح اِس کام کو انجام دینے کے لیے فرصت اور ضخیم جلدین درکار ہین۔

وسطی ایشیائی اقوام مین اسلامی تہذیب نے جب نئے جوش و خروش کے ساتھ ساتھ لوگون مین بلند نظری اور عالی ہمتی پیدا ہو گئی تھی۔ تہذیب اسلام اس زمانہ مین موزون ترین اور بہترین تھی بس اسلامی قومین اپنے گرد و پیش کی نسبتاً کمزور اقوام پر حاوی ہو جانے کی کوشش کرنے لگین۔ یہ ایک قدرتی بات تھی اور کامیابی ہونی ضرور ہی تھی۔ چنانچہ محمود کی افواج قاہرہ نے ہندوستان کا دروازہ کھول دیا اور زبردست اقوام شمالی کی ہندوستان کی طرف چیونٹیون کی سی رو لگ گئی مگر ان اقوام کی زبان مادری فارسی تھی یا ترکی۔ ہندوستان کے اُس حصہ مین جو اُن کا جولانگاہ رہا، فارسی و ترکی لفظ برج بھاشا مین ملنے لگے۔ اسطرح گویا محمود کے تاریخی حملون نے اُردو کا بیج بویا!

شہاب الدین غوری نے جس دن اسلامی جھنڈا پرانی دہلی مین اُڑایا اُسی دن سے تاریخ اُردو شروع ہوتی ہو۔ فاتح کی زبان جُدا مفتوح کی بولی الگ۔ ناممکن تھا کہ مفتوح بالکل ہی اپنی زبان کو چھوڑ دیتے یا فاتح مغلوب کی بولی اختیار کرتے۔ ایسی صورت مین کاروبار چلتے تو کیونکر؟ اظہار و تبادلہ خیالات ہوتا تو کس ذریعہ سے؟ آخر کار لین دین اور بول چال مین رفتہ رفتہ پٹھان بھاشا اور ہندو فارسی کے لفظ ملانے لگے۔

قانونِ انتخاب قدرت نے ایک زبان زمانہ کے ڈول کے مطابق ڈھالنی شروع کی۔ کسی نئی زبان کا بن جانا کچھ کھیل تو نہین برس نکلتے رہے پشتین گزرتی رہین زبان کا پودہ آہستہ آہستہ پھوٹنے لگا۔ ایک نئی زبان محسوس ہونے لگی۔ امیر خسرو نے پہلے پہل اِس پر نظر توجہ کی اُن کے بعد زبان تو ضرور آگے بڑھتی رہی مگر ہندوستان کی آئے دن کی لڑائیون اور اندرونی فسادون نے حسبِ خواہ ترقی نہ ہونے دی۔ اور کوئی ایسا شخص نہ نکلا جس کا اُردو کلام یا تحریر ہم تک پہنچی ہو۔ ہوتے ہوتے سلاطین مغلیہ کا دور دورہ ہوا ملک مین ایک حد تک امن قائم ہوا۔ اول اول

تو فارسی کا بہت زور و شور رہا بادشاہ سے لیکر اکثر سپاہیوں تک کی رگوں میں تازہ ولایتی خون دوڑ رہا تھا۔ گرچہ ناممکن تھا کہ اپنے گرد و پیش کا اثر قبول نہ کرتے، کچھ اثر اُن پر ضرور ہوا لیکن اُن کی نسلیں بعد کی آب و ہوا میں پیدا ہوئیں پھلیں پھولیں۔ اُن کے لیے ایران افغانستان اور ترکستان میں وہ اصلی دلچسپی کس طرح ہو سکتی جو اُنکے باپ دادا کو تھی جس آب و ہوا میں پیدا ہوئے ہوش سنبھالا جن صحبتوں میں ہنسے بولے اُن کا اثر قبول کرنا ایک ہونی بات تھی انہیں فارسی سے ویسی دلچسپی نہ رہی، ایران کی میٹھی میٹھی بولی طبقۂ عوام میں اوپری معلوم ہونے لگی چنانچہ شاہجہان کے زمانہ ہی میں اُردو بازاروں سے شرفا کی ڈیوڑھیوں تک جانے لگی اور کہیں کہیں شاعرانہ صحبتوں میں بھی اُسے بار ملنے لگا جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور دریائے سندھ کے اُس پار سے آمد و رفت کم ہونے لگی فارسی گھٹنے اور اُردو بڑھنے لگی۔ یہاں تک کہ ایک وہ مبارک دن آیا کہ ولی نے اپنے مقدس ہاتھوں سے اُردو شاعری کا پودہ لگایا حاتم فغاں اور آرزو نے پانی دیا، آب و ہوا اس تھی لوگوں کو قدرتی میلان تھا ہی۔ دہلی کے ہر گلی کوچے سے غزل کی صدا آنے لگی سودا کی بلند پروازیوں نے فارسی قصیدوں کا چربہ اُتارا میر کی دلکو لگتی باتوں اور سیدھی سادھی اُردو نے سعدی کی غزل کا ڈول ڈالا درد کی صاف نظر نے اُردو میں تصوف کا رنگ جمایا، میر حسن کی بینظیر مثنوی نے زبان کو اور وسعت دی۔ اُس زمانہ میں لکھنؤ میں شعر و سخن کی بے انتہا قدر تھی۔ دلی وہ دہلی نہ رہی تھی شعرا جوق جوق لکھنؤ پہنچنے لگے یہاں تک کہ میر بد دماغ نے بھی لکھنؤ کو شرف بخشا۔

نظم اُردو کے اس تاریخی بیان کو آگے بڑھانے سے پہلے ایک بات قابل غور ہے۔ دوران ارتقا میں ایک زمانہ ایسا آتا ہے کہ ترقی کا قافلہ پھر جاتا ہے اور پرانی باتیں تازہ ہوتی معلوم ہوتی ہیں۔

"علم الحیات" میں اسکو اصول رجوع الی الاصل سے تعبیر کیا جاتا ہے جسم حیوانی کے مدارج ترقی کا سراغ لگانے میں اُسکی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ اچنبھا سا ہوتا ہے۔ مسٹر ڈارون نے اپنی کتاب "ابتداء الانواع" میں اس بارے میں چند حیرت انگیز امور لکھے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ہی نوع سے مختلف اقسام کے صورت پذیر ہونے کے دوران میں بعض بچے کئی کئی پشت کے بعد اپنے کسی جد اعلیٰ کی آنکھ چونچ رنگ اور پر پرزے نکالتے ہیں افراد انسانی میں باپ دادا کا ہم صورت و ہم عادت ہونا محتاج ثبوت نہیں۔ قومیں بھی بہ حیثیت مجموعی اس قانون سے بری نہیں پامپی، ماریس اور سلا نے روما میں بادشاہت کی داغ بیل ڈال دی تھی جولیس سیزر نے تاج نہ قبول کیا لیکن حقیقت میں بادشاہ بن بیٹھا۔ لوگوں نے اسکی شخصی حکومت محسوس کی اور دفعتاً قدیم جمہوری اصولوں کی طرف مائل ہوئے اور نئے سرے سے پرانی طرز حکومت قائم ہوئی قدیم باتوں کی طرف عود کرنا چند روزہ ہوتا ہے مگر بہت ہی کارآمد ذریعہ ترقی میں کچھ جان سی پڑ جاتی ہے اور صدیوں کی ترقی سیڑھیوں میں ہونے لگتی ہے ترقی السنہ پر بھی یہ قانون ٹھیک بیٹھتا ہے۔

تاریخ اُردو کے جس درجہ تک ہم نے اپنا سرسری بیان پہنچایا ہے اُس سے آگے شعرائے اُردو بالکل فارسی کی طرف مائل نظر آتے ہیں مثلاً میر اور درد کے کلام اور خیالات کی سادگی و اصلیت کو نظر انداز کر کے شاعروں نے اُن کے سخن کے اُس پہلو کو مد نظر رکھا جس میں فارسی کی جھلک تھی مصحفی آتش ناسخ نسیم لکھنؤ میں، شاہ نصیر ذوق مومن غالب دہلی میں، فارسی خیالات میں کم و بیش ڈوبے نظر آتے ہیں مرزا نوشہ کا حال تو سب جانتے ہیں کہ فارسی نے انہیں ایسا گرویدہ کیا کہ اُردو کو ننگ سمجھتے رہے اور اپنی بینظیر و خداداد قابلیت کو ایک غیر زبان میں جس کا ہندوستان میں دوبارہ زندہ ہونا ناممکن تھا صرف

کیا فارسی کی رنگینی بلند پروازی موشگافی اور ترکیبوں کی بھرمار سے اُردو اور شستہ و فصیح و بلیغ ہوگئی۔ نئے لفظ اُردو کے قالب میں ڈھل گئے بیسیوں پاکیزہ و نفیس محاورے بن گئے۔ نازک سے نازک خیال ہیچ گویان ہند اپنی مادری زبان میں انتہا سے لطافت و فصاحت سے ادا کرنے لگے۔ ہماری مادری زبان اس طرح شستہ و پاکیزہ ہوکر اُس خداداد دماغ کیلیے تیار ہوئی جو اُس زمانے میں مرثیہ گوئی کی مشق کر رہا تھا اُسکے پاک جذبات اور پاکیزہ خیالات اُسکی جولانی طبع اور نازک خیالی اُس کا مذاق سلیم اور قدرتی ملکۂ شاعری اُس کی باریک بین نظر اور اُسکی ستھری منجھی ہوئی زبان نے اُردو کو آسمان پر جا بٹھایا۔ اُردو اُردو ہوگئی اور شاعری میں آج دنیا کی کسی زبان سے گھٹی نہیں میر انیس کا یہ کہنا ہے

مری قدر کر اے زمین سخن — تجھے بات میں آسمان کر دیا
سبک ہو چلی تھی ترازوے شعر — مگر ہم نے پلہ گران کر دیا

نری شاعرانہ تعلّی نہیں بلکہ ایک امر واقعی ہے۔ اُردو میں ابتک صرف حسن و عشق کے راگ گائے اور بلبل و گل کے فسانے دہرائے جاتے تھے۔ زلف و جعد کے ستم بیان اور دہن و کمر کے معمے حل کیے جاتے تھے۔ بادشاہوں اور امیروں کی بیجا مدحت یا بیہودہ لفاظی و بے نتیجہ موشگافی ہوتی۔ مثنویوں میں شرم کا پردہ اُٹھتا اور دیو پری کا قصہ ہوتا۔ انیس کے مرثیوں نے سرشت انسانی کے اُن پاک سوتوں کو کھولا جو افضل ترین جذبات اور اعلیٰ ترین خیالات کے منبع ہیں۔ سچ تو یوں ہے کہ جس طرح فرقہ پیوریٹن کے طفیل انگریزی کو ملٹن کی پیراڈائز لاسٹ ملی اُردو کو مذہب تشیع کی بدولت مراثی میر انیس نصیب ہوے۔ ایک وہ زمانہ آنے والا ہے کہ میر انیس کے مراثی شکسپیر کے ناٹکوں کی طرح پڑھے جائیں گے اور انھیں پر اتنی ضخیم جلدیں لکھی جائیں گی جن کے پڑھنے کے لئے عمر طبعی کافی نہ ہوگی۔

انصاف کا خون ہوگا اگر یہاں اُس اُستاد یگانہ کا ذکر نہ کیا جائے جس کا نام ہمارے دماغوں میں میر انیس کے نام کے ساتھ حافظہ لازماً ادا کرتا ہے۔ مرزا دبیر اور میر انیس ایک باغ کے دو پودے ہیں۔ دونوں نے ایک ہی ہوا اور ایک ہی نہر کے پانی سے نشو و نما پائی۔ دونوں نے اُردو پر گرانبہا احسانات کیے۔ فرق ہے تو صرف اتنا جتنا کہ شکسپیر اور بین جانسن میں تھا۔ میر انیس جہاں اُستاد تو دبیر اُردو کے بڑے شاعر۔ اگر کوئی ایسا جلسہ ہوتا جہاں دنیا کے بڑے بڑے شاعر زندہ ہوکر جمع ہوں تو وہاں ہماری طرف سے یہی دو شخص ہوں گے انیس اور دبیر۔ انیس پہلے اور دبیر دوسرے۔

میر انیس کے بعد جو دور شروع ہوا اُس میں شاعر پھر سادگی کی طرف مائل ہوے۔ یہ دور ابھی ختم نہیں ہوا۔ داغ اور امیر نے زبان کو اور جلا دی۔ داغ کے کلام نے زبان کو نکھارا اور دلوں میں چٹکیاں لیں طبیعتوں کو گرمایا۔ امیر نے زبان کو سنجیدہ اور متین بنایا خیالات کو گرمایا اور نازک خیالی کو ہاتھ سے نہ دیا۔ مگر ان دونوں سے زیادہ قابل قدر اور نتیجہ خیز کام اُس بابرکت شخص نے کیا جس کے قلم سے مسدس "مدوجزر اسلام" نکلا۔ مولانا حالی نے اُردو شاعری کو حسن و عشق کے تنگ کوچے سے نکال کر اصلیت و واقعیت کی شاہراہ پر ڈالا۔ یہ زمانہ انگریزی کے اُس زمانہ سے مشابہ ہے جبکہ پوپ کے اثر سے انگریزی میں لفاظی اور بناوٹ بے انتہا آگئی تھی۔ اسٹوارٹ خاندان کے زہریلے اثر سے شاعری میں ناپاک اور پوچ خیالات کے سوا کچھ نہ تھا۔ کوپر کی نظموں نے اُس دور کا خاتمہ کیا۔ مولانا حالی نے اسی طرح اُردو کا رخ پھیر دیا۔

نثر اُردو کی تاریخ ابھی بہت مختصر ہے۔ یہی وہ میدان ہے جس میں بہت کچھ کرنا ہے اور جس پر زبان کی آئندہ وسعت و ترقی کا دارومدار ہے۔ میں تاریخ نثر اُردو کو دو دوروں پر آسانی کے لیے تقسیم کیے لیتا ہوں۔

پہلے دور کی ابتدا میر امن دہلوی کی "باغ و بہار" سے ہوئی۔ میر امن کی سیدھی سادھی ٹھیٹ اردو اور ہیر پھیر سے خالی طرز بیان ہمیشہ دلچسپ رہیگا۔ شاہ عبدالقادر کا ترجمہ قرآن مجید بھی اُسی دور کی یادگار ہے۔ اردو نثر کے محققوں کو آئندہ اس ترجمے سے بڑی مدد ملے گی۔ اُسی زمانہ میں خواجہ امان نے بوستان خیال کا ترجمہ کیا۔ رقعات غالب پر پہلا دور ختم ہوتا ہے۔ مرزا غالب نے عجیب خوبی کے ساتھ اُردو کی سادگی میں فارسی کی ترکیبیں ملائیں گرچہ بات اُن کو دوسرے دور سے ملاتی ہے وہ اُن کا بے تکلف مطابق قدرت پیرایۂ ادا ہے۔ تعجب اس پر آتا ہے کہ نئی طرز تحریر کا اُردو میں بانی وہ شخص ہے جو ہمیشہ فارسی کا شیدا اور اُردو کو حقارت سے دیکھنے والا تھا۔ دیکھیں اس راز کے حل کرنے میں بھی کچھ مسئلہ ارتقا جس کے اصولوں پر ہم نے اس مضمون کی بنا ڈالی ہے مدد دیتا ہے یا نہیں۔

ہم اپنے باپ دادا سے صرف گوشت پوست صورت شکل ہی ورثہ میں نہیں پاتے بلکہ بہت سے آبائی دماغی خصائل جذبات و میلان ماں کے پیٹ سے لاتے ہیں۔ مرزا غالب کا غیر معمولی رجحان فارسی کی طرف اور اُس کا صحیح مذاق میری رائے میں موروثی اثر تھا۔ علاوہ ازیں یہ بھی یاد رہے کہ وہ اُس عہد میں پیدا ہوئے جبکہ عموماً لوگ فارسی کی طرف مائل تھے جیسا ہم اوپر کہہ آئے ہیں۔ غالب کے موروثی میلان کو زمانہ کے رُخ نے حد کو پہنچا دیا لیکن غدر کے بعد فارسی رخصت ہو گئی کیونکہ علوم کا وہ چرچا ہی نہ رہا تھا بول چال میں مدت سے اُردو تھی۔ عام خط و کتابت میں کم و بیش اُردو برتی جانے لگی مرزا غالب کا اپنے گرد و نواح کے اثر سے بچا رہنا قانون قدرت کے خلاف تھا۔ انھوں نے بھی خطوں میں اُردو لکھی اور چونکہ لاجواب دل و دماغ لائے تھے اور مذاق صحیح پایا تھا اور وہ عبارت میں موتی ڈالا جو نئے زمانہ کے مطابق اور اپنا آپ ہی نظیر تھا۔

دور دوم میں مولانا آزاد کو میں پہلے رکھونگا۔ انکی طرز تحریر میں فارسی کا اثر بہت کچھ باقی ہے۔ اُنھوں نے فارسی کی رنگینی کے ساتھ ساتھ سیدھی سادھی اُردو کو ہاتھ سے نہ دیا۔ ظہوری کی اغلاطی اور قافیوں کی تتبع نہ کی مگر نفیس استعاروں اور ستھری تشبیہوں کو نہ چھوڑا۔ اُن کی نثر اچھی خاصی شاعری ہے۔ آبحیات نے نثر اُردو میں لطافت نفاست و فصاحت کا عجیب و غریب نمونہ پیش کیا۔ دربار اکبری میں مولانا آزاد نے اپنی طرز تحریر سے واقعات تاریخی کا لطف دوبالا کیا۔ سخندان پارس فلالوجی میں اگر علمی حیثیت سے اعلیٰ درجہ کی نہ ہو تو بھی اُردو میں تو یقیناً اپنی قسم کی ایک ہے۔

مولانا آزاد کے بعد سرسید کا نمبر ہے۔ میرے خیال میں نثر اردو میں جو اُن کا رتبہ ہے وہی اُن کی زندگانی جاوید کے لیے کافی ہے جبکہ ہندوستان سے عموماً تصنیف مفقود تھی اُردو میں کسی مصنف کا پیدا ہونا جتنا تعجب خیز ہے اُتنا ہی قابل غور ہے۔ سرسید جن لوگوں میں پیدا ہوئے جن رنگوں میں رہے وہ روز بروز بدل رہے تھے۔ معمولی دماغ کا آدمی پرانی سوسائٹی کے آہستہ مگر یقینی زوال کو اُس وقت تک کبھی محسوس نہ کرتا جب تک کہ دفعتاً تہذیب قدیمہ کی عمارت زمین پر نہ آ رہتی۔ سرسید کی سی قابلیت کا شخص نا ممکن تھا کہ واقعات بین کو دیکھتا اور نہ سوچتا۔ پرانی تہذیب کا دن آ لگا تھا اور غدر کے بعد تو مغربی خیالات نے نہایت سرعت سے پڑھنے لکھنے اُٹھنے بیٹھنے کھانے پینے اوڑھنے پہننے چلنے پھرنے غرض ہمارے تمام معاشرتی (سوشیل)، پولیٹیکل دماغی اور اخلاقی حالات میں حیرتناک تبدیلی پیدا کر دی۔ کوئی سن رسیدہ بزرگ اس پر گردن ہلائیں تو میری اُن سے بادب درخواست ہے کہ اپنے ولایت رفتہ صاحبزادے کی زندگی کو اپنی زندگی سے ملائیں اور پھر..... خیر تو سرسید نے تبدلات زمانہ کو سب سے پہلے محسوس کیا اور ساتھ ہی یہ بھی ٹھیک ٹھیک نتیجہ نکالا کہ ہماری بہبودی مغرب کی عاقلانہ تقلید کے سوا اور کسی طرح ممکن نہیں

اِس خیال کے پختہ ہونے کی بڑی وجہ مسلمانون کا ناگفتہ بہ افلاس اور روزافزون ادبار تھا۔ بزرگ سرسید کے دل پر امتِ محمدی کی حالت دیکھکر غم واندوہ کے نشتر چلنے لگے۔ اُنھون نے ٹھان لی کہ کچھ ہی ہو اپنی طرف سے مسلمانون کی حالت سنوارنے مین کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھون گا۔ چنانچہ اُنھون نے پہلے مغربی تہذیب کو سمجھا اور خیال کیا سمجھا مگر صرف سمجھنے سے اصلاح قوم ممکن نہ تھی۔ خیالات کا اظہار ضروری تھا اسکے لیے اُردو سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اِس طرح اُردو مین لکچر دینے لگے اور پھر تہذیب الاخلاق مین اُنکے مضامین اور اُن احباب کے جن پر اُنکا رنگ چڑھ چلا تھا نکلنے لگے۔ اُنکی نفیس کتاب خطباتِ احمدیہ نے اُردو دان حضرات کی آنکھین کھول دین کہ اُردو مین بھی عالمانہ مطالب ادا ہو سکتے ہین۔ خطبات کا بیان صاف دلپذیر و زبان ٹھیٹ اور ستھری خیالات محققانہ و تعصب سے بری ہین۔ خطبات مین سرسید کی نوئی فکر کی کافی جھلک موجود ہے۔ مگر اُن کی جدت طرازی تفسیر مین کماحقہ ظاہر ہوئی۔ للہ آپ لوگ یہ نہ سمجھین کہ مین تفسیر مین اُن کا ہمخیال ہون ہمخیال ہونا نہ ہونا اور بات ہے مین صرف یہ دکھانا چاہتا ہون کہ سرسید فی الحقیقت محقق تھے اور اُنھون نے جو کچھ سوچا سمجھا اُسکو نیک نیتی اور بلا تامل کے ساتھ اپنے نرالے پُرزور طرز مین ادا کر دیا۔ اُن سے جو لغزشین ہوئین یہان اُن سے بحث نہین۔ اِس طرح اگر دیکھا جائے تو اُن کی نامکمل تفسیر اُردو کی پہلی تصنیف ہے۔ اور سرسید پہلے محقق ہین جو مسلمانون مین دو تین صدی کے بعد پیدا ہوے۔

مولانا حالی کی سادہ شستہ اور روان تحریر کا بھی بڑا اثر اُردو ادب پر ہوا۔ مولانا موصوف پہلے شخص ہین جنھون نے اُردو مین تنقید کی ابتدا کی۔ مقدمہ شاعری اور یادگارِ غالب کے پاکیزہ مقالے اُردو مین اپنی آپ ہی نظیر ہین۔ مقدمہ، یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید اُردو ادب کے نہایت قیمتی نمونے ہین۔ اِسی طرح مولانا شبلی کی سیرۃ النعمان، الفاروق، الکلام وغیرہ نے اُردو کو تاریخی معلومات اور عالمانہ تنقید سے مالا مال کیا۔ اُردو مین ناول کی جو شی پیدا کی گئی اور کی جا رہی ہے اُس کو وہ خوب سمجھتے ہین جنھون نے رینالڈ، ڈکنس اور جس اسٹن وغیرہ کے ناول پڑھے ہین۔ ناول کی اصلیت کو صرف اُس شخص نے سمجھا جس کے زبردست مذاقِ قلم سے ابن الوقت، فسانۂ مبتلا اور ہمارے گھرون کی بولتی چالتی تصویرین یعنی مرأۃ العروس اور بنات النعش جیسے ناول نکلے۔ مولانا نذیر احمد کا ترجمہ کلام مجید بھی یادگار رہے گا۔ مولانا سید احمد دہلوی نے فرہنگ آصفیہ لکھ کر اُردو پر بڑا احسان کیا اور جلی عمدہ اور تفلیس لغت کا سہرا اُنکے سر رہا۔ مولوی سید علی بلگرامی نے تمدنِ عرب کا نہایت پاکیزہ ترجمہ کیا۔ لطف یہ ہے کہ اتنی ضخیم کتاب مین شروع سے آخر تک زبان سادہ و شستہ اور طرزِ تحریر یکسان چلا گیا۔ سید بلگرامی کا ترجمہ ترجمہ نہین معلوم ہوتا بلکہ اُردو کی ایک تصنیف کا دھوکا ہوتا ہے۔

مضمون چلتے چلتے ایک دفتر ہو گیا اب مین اُن رسائل کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہون جن سے اُردو کی ترقی ممکن ہے۔ گزشتہ بیان کے خاتمہ پر انصاف مقتضی ہے کہ اُردو اخبارون اور رسالون کی طرف کم سے کم اشارہ ضرور کیا جائے۔ اخبارون مین اودھ اخبار اور پیسہ اخبار نے اپنی بساط کے موافق اُردو کی خاصی خدمت کی اور اُنکی دیکھا دیکھی تمام ہندوستان مین اچھے بُرے اخبار شائع ہونے لگے۔ رسالون مین مخزن نے تعلیم یافتہ احباب کے لیے ایک نیا راستہ نکالا اور رسالون مین طرز جدید کی بنا ڈالی۔ کئی رسالے اِن کے قدم بقدم چلے اور بہت کچھ اُردو کی خدمت کی۔

حکمت قدرت کا ایک قانون یہ ہے کہ وہی جاندار ترقی کر سکتے ہین جو اپنے گرد و پیش کے تغیر پذیر سانچے مین ڈھلتے چلے جاتے ہین۔ انسان حیوانون سے یون افضل ہے کہ وہ بے بس بے زبانون کی طرح صرف

ڈھلتا ہی نہیں جاتا بلکہ اپنے آپ کو ڈھالتا جاتا ہے اور تمام تبدیلیوں کو سمجھتا اور اپنے گرد و پیش میں خود بھی تغیر پیدا کرتا ہے۔ اس ہمہ گیر تغیر میں اگر انسان کی کوئی ضروری اور کارآمد شے نہ بدلے اور نئی حالت کے مطابق نہ ہو تو وہ صرف ایک نقص اور عیب ہی نہ ہوگی بلکہ آئندہ ترقی میں بہت کچھ رکاوٹیں پیدا کرے گی۔ اِس وقت مسلمانوں کی حالت کو لیجئے۔ ہم لوگ خدا خدا کر کے اب اُس نیند سے چونک تو گئے ہیں جس میں پڑے ہوئے خواب دیکھ رہے تھے اور نئی حالت نئے اسباب گرد و پیش کے مطابق ہونے کی کچھ کچھ کوشش کر رہے ہیں مگر نقص ملاحظہ ہو کہ مسلمان نوجوان کالجوں میں مختلف علوم حاصل کرتے ہیں انگریزی میں گئے تو دفتر کے دفتر نئے علوم پر لکھ مارے مگر اپنی مادری زبان میں بالکل گونگے اور بے بس ہوتے ہیں۔ اُردو میں سچے علمی مضامین کا مفقود ہونا ہمارے دعوے کا بین ثبوت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کتنا بڑا نقص اور ہماری مجموعی ترقی میں کتنی بڑی رکاوٹ ہے۔ اگر اپنی مادری زبان ہم اُردو ہی رکھنی چاہتے ہیں تو ہماری ترقی کامل اس وقت تک ہرگز نہ ہوگی جب تک موجودہ علوم ہماری زبان میں انگریزی فرنچ یا جرمن کی طرح نہ آ جائیں۔ اِس میں شک نہیں کہ ایک دن اُردو کا علوم سے مالا مال ہونا بالکل قرین قیاس ہے اگر اُسے ارتقائے قدرتی کے رحم پر چھوڑ دیں اور ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں ایسا ہونا ممکن ہے مگر کب؟ دوسرے یہ کہ ایسی صورت میں ہم نے انسان ہو کر کیا تیر مارا؟ ہمارا فرض ہے کہ اُردو میں نئے علوم کی اصطلاحیں گھڑیں یا اور زبانوں سے مستعار لیں الفاظ کے معنی قائم کریں۔ زبان کے قواعد منضبط کریں اور اس طرح آئندہ نسلوں کی جولانی طبع اور علمی تحقیقات کے لیے راستہ صاف کر دیں پس پہلی صورت اُردو کی ترقی کی یہی ہے کہ اُسکو علمی زبان بنا دیں۔ اسکی ابتداء یوں ہو سکتی ہے کہ سینٹفک رسالے شائع کیے جائیں۔ اُنمیں مختلف علوم پر مضامین لکھے جائیں اور نئی اصطلاحیں قائم کی جائیں

مولوی محمد علی صاحب ایک سن رسیدہ قابل قدر شخص حیدرآباد میں ہیں اُنھوں نے کیمسٹری کی اصطلاحیں بنائیں اور ایک رسالے کی صورت میں چھپوا دیں۔ ناقدری اور بے توجہی کے باعث وہ رسالہ بکا بھی نہیں مجھے کچھ اصطلاحوں اور گاسوں کے نام یاد ہیں۔ ملاحظہ ہو اور انصاف کیا جائے کہ جیسے طلیسون ہیڈ، وجن، حیتون ممار بن، کربتون جیڈسو کلورکا اینڈ حسی قلوتہ میں ادا ہر ایک کی وجہ تسمیہ بھی اُنھوں نے لکھی ہے اور اس میں شک نہیں کہ کمال کیا ہے۔ سر خورشید جاہ بہادر مرحوم و مغفور نے نیچرل فلاسفی کی ایک کتاب کا ترجمہ اُردو میں کروایا۔ جو ستہ شمسیہ کے نام سے چھپا۔ اس میں بھی مترجم صاحب نے بہت سی اصطلاحیں گھڑی ہیں چنانچہ الیکٹریسٹی کے لیے برق اور الیکٹرک بیٹری کے لیے مورچہ برق فرمائے ہیں۔ مگر یہ شخصی کوششیں ہیں اگر سب مل کر کمر ہمت باندھ لیں تو کامیابی نہ ہونا کیا معنی۔

خاتمہ پر صرف اتنا اور عرض کروں گا کہ زمانے کے تیور زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ ایک دن ہندوستان میں راس کماری سے ہمالیہ کی چوٹی اور دریائے سندھ سے برہم پتر تک ایک زبان بولی جائے گی۔ مختلف زبانیں اپنے اپنے بچاؤ اور ہندوستان پر چھا جانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ جو زبان ہندوستان کی روز افزوں سوشیل و پولیٹیکل اور حالت کے مطابق ترین اپنے کو ثابت کرے۔ وہی نئے ہندوستان کی ملکہ بنے گی۔ اور زبانیں خواہ سنسکرت جیسی وسیع اور پختہ یا فارسی جیسی شیریں و دلکش کیوں نہ ہوں مردہ زبانوں میں شمار ہوں گی کوئی وجہ نہیں کہ ہماری ہونہار زبان اس ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہے۔ اگر سب محبان اُردو کمر ہمت اور ایمانداری سے اپنی قابلیتیں اسکی ترقی میں صرف کریں تو قیاس کہتا ہے کہ میر انیس کی چہیتی زبان تمام ہندوستان میں اُسی طرح اپنا سکہ جاری کرے گی جس طرح شیکسپیئر کی پیاری زبان نے برٹانیہ اعظم دائرہ میں اپنی حکومت کا پھریرا اُڑایا۔

یوسف قریشی (علیگ)

العصر

تقریر

عالیجناب نواب ذوالقدر جنگ بہادر، ایم اے، بیرسٹر ایٹ لا، صدر انجمن استقبالیہ اردو کانفرنس لکھنؤ

حضرات و خواتین!

مجلس استقبالیہ کی صدر نشینی کے اعزاز کو جو میرے واسطے وجہ افتخار ہوا اور میری علمی تہیدستی کے باوجود مجھے دیا گیا ہو میں نے بشکر گذاری قبول کیا تھا اور آج بھی مسرت و نازش کے ساتھ اہلِ لکھنؤ کی جانب سے آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں علم سے وہ ارادت مندی اور وہ خالص محبت جس نے آپ صاحبوں کو دور دراز فاصلوں سے لاکر یہاں مجتمع کیا۔ بے شبہ ایسا قابل قدر جذبہ ہے کہ زیادہ ہر شکوہ مخلصین بھی جس کی محتاج ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ جذبہ جو بغیر تفریق مذہب و ملت اہل ہندوستان کی ملکی اور علمی کوشش اصلاح پر مبنی ہے روز افزوں ترقی کرتا رہے گا۔

انجمن ترقی اردو

قبل اس کے کہ میں کچھ اور عرض کروں مناسب ہے کہ انجمن ترقی اردو کی نہایت مختصر سرگذشت آپ کے سامنے اعادہ کر دی جائے کیونکہ ہر چند یہ مضمون پامال ہو پھر بھی ہمارے سلسلۂ بیان کی ابتدا اُسی سے ہونی چاہیئے۔

یہ انجمن قائم ہوتے ہی کچھ عرصہ کے بعد دیگرے اپنے سچے حامی علم و فضل میں مشہور اور محسنین قوم مولانا شبلی مرحوم مولوی حبیب الرحمن خان صاحب شروانی اور مولوی عزیز مرزا مرحوم کے آغوش محبت میں پرورش پاتی رہی۔ باایں ہمہ قوم کی بے اتفاقی کا اُسے ہمیشہ شکوہ رہا اور جیسا کہ ہمارے لائق سکریٹری مولوی عبد الحق صاحب کی مشرح رپورٹوں بابت سنین ۱۹۱۳ و ۱۹۱۴ و ۱۹۱۵ء کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے تقریباً

دس برس اُنکی حالت امید و بیم نے سب کو متردد رکھا مگر ان مشکلات مین بھی اُن صاحبون نے جو اسکے قیام کے بانی تھے ہمت نہ ہاری اور خصوصًا گذشتہ تین سال مین نہایت سرگرمی اور استقلال کے ساتھ اسکی بقا اور استحکام کی ہمارے موجودہ سکرٹری اور اُن کے بعض احباب برابر کوشش کرتے رہے۔ اُن کی پُراثر اور دل سوز تحریرون اور تقریرون کا آخر کچھ نہ کچھ ثمرہ بھی مل گیا اور سرکار نظام ریاست بھوپال اور بعض دیگر باثروت حضرات نے اسکی سرپرستی منظور فرما کر اُسے دوبارہ زندگی عطا کی ہے

تربیت کی تعلیم اور زبان یہ یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا مین کوئی قوم نامور اور کامیاب نہین ہو سکتی جب تک کہ اُس کا ہر فرد قومی خود داری کو اپنی جان سے زیادہ عزیز نہ رکھے خود داری کا یہ احساس یا اسکی حفاظت صرف صحیح تعلیم پر منحصر ہی۔ اور ہم مین یہ صلاحیت ہونی چاہیے کہ اپنی قومی ضروریات کے لحاظ سے جن کو ہم ہی سمجھ سکتے ہین اس تعلیم کے وسائل تلاش کرین اس وقت افسوس ہی کہ جنگ یورپ نے دنیا کو ایسا ہلا رکھا ہی کہ ہم اطمینان کے ساتھ اپنے قومی فوائد کی طرف متوجہ نہین ہو سکتے مگر ہم ہی شکر گزار ہین کہ اس زمانہ رستخیز مین برطانیہ عظمٰی کے طفیل امن و امان سے ہم آج جمع ہین اور اپنے اسباب ترقی پر غور کر رہے ہین۔ انہی اسباب مین سب سے اہم شے جس پر ہندو مسلمانونکی دنیوی ترقی کا انحصار ہی "زبان" ہی، حکیم ارسطو نے قومیت کی تعریف مین ایک زبان کا ہونا لازمی قرار دیا ہی۔ قومی اغراض کی تکمیل کے واسطے اگر ایک زبان نہو گی تو ہمخیالی ایک طرف مبادلۂ خیالات مین بھی سخت دشواریان پیش آئین گی۔ اور جبکہ ہندو مسلمانون کو بہ حیثیت ایک ہی قوم کے حدود ہندوستان مین رہنا ہی تو اُن کے لیے ناگزیر ہی کہ ایک دلی اور یکجہتی کے ساتھ اُن شرائط کی پابندی کرین جو قوم کی تعریف مین داخل ہین یعنی زبان ایک ہو خیالات ایک ہون، حالات تاریخی مین اتحاد ہو، آئین و قوانین ایک ہون، مذہب ایک ہو وغیرہ وغیرہ۔ اب سوائے مذہب کے اور کسی شرط مین ایسا اختلاف نہین ہی جو اصلاح پذیر نہو سکے۔ گو زبان کے متعلق بعض متنازعون نے بظاہر مسلمانون کو اُردو کا خاص حامی بنا رکھا ہی مگر وہ کون ہندو یا مسلمان ہوگا جو اُردو کے ہندوستانی یا مُلکی زبان ہونے سے انکار کرے۔ مسلمان اُسے اپنے قدیم وطن ایران توران یا عرب و عراق سے لے کر نہین آئے تھے۔ وہ ہندوستان ہی مین پیدا ہوئی اور اہل ہند کی، ہندو ہون یا مسلمان، گودون مین اُس نے نشو و نما پایا۔ اور آج ہندوستان کے مختلف حصون مین اگرچہ دوسری زبانین بولی جاتی ہین مگر اُردو ہی ایسی زبان ہی جو تمام ملک پر حاوی ہی۔ اس کا جاننے والا ہر حصۂ ملک مین بآسانی کاروبار اور بود و باش اختیار کر سکتا ہی جہان پنجابی، بنگالی، دکنی غرض ہر صوبے اور علاقے کے آدمی جمع ہون گے وہان سوائے اُردو کے اور کسی مُلکی زبان مین مبادلۂ خیالات غیر ممکن ہو گا۔ اسکے علاوہ اپنی بناوٹ اور قواعد کے اعتبار سے تمام ہندوستان مین اُردو ہی ایسی زبان ہی جو بآسانی دوسری زبانون کے الفاظ قبول کر لیتی ہی اور جس مین علمی زبان بننے کی سب سے زیادہ صلاحیت موجود ہی۔

اس موقع پر مجھے یہ اظہار تاسف کیے بغیر نہین رہا جاتا کہ گو آجکل قوم پرستی اور وطنیت کا ہنگامہ بڑھ گیا ہی اور ہماری سیاسی مجالس نے آزادی و خود مختاری کے مطالبون کا شور مچا رکھا ہی لیکن ابھی تک اِس مسئلہ پر انھون نے کوئی التفات نہین کی کہ اگر ہمین عام اور تمام اہل وطن کو ایک قومی حکومت کے دائرے مین لانا ہو گا تو اس متحدہ قومیت کی تہ بنیاد کون سی زبان ہو گی؟ اور اُس پیچیدہ مگر روز افزون اختلاف کو جو ترقی تعلیم اور دعویٔ روشن خیالی کے باوجود بدنصیبی سے تعصب نے زبان کے معاملے مین پیدا کر دیا ہی مٹانے کی کیا سبیل نکلے گی؟!۔

قومی اتحاد کا حقیقی وسیلہ خوشی کی بات ہو کہ اس جلسے مین ہندو مسلمان دونون قومین شریک ہین اور یہ اُن کی بے تعصبی کا نہین بلکہ ملک اور قوم کی سچی بہی خواہی اور راست روی کا ثبوت ہو کیونکہ اگر انصاف و معقولیت سکھانے والی تعلیم پاکر بھی ہم تعصب کی خوفناک بلا سے آزاد نہو سکے یا اُس بے گناہ زبان کی مخالفت کرتے رہے جس نے ملکی اتحاد کے راستے پر چلایا اور ہمین درحقیقت ایک قوم بنانا چاہا تھا، تو میرے خیال مین پھر نیشنل کانگرس ہو یا مسلم لیگ کسی کی وقعت بازیچۂ اطفال سے زیادہ نہو گی۔ ایسے ہمدردانِ وطن سے تو کہین زیادہ قابل ستائش اور قابل فخر ملک پرست شاید وہ مسلمان تھے، جنھون نے زمانۂ حکومت مین اپنی قومی زبانین عربی، ترکی، فارسی، ترک کر دین اور ہندوستانی (اُردو) کو اپنی مادری زبان بنا لیا تھا! پس حامیانِ لیگ و کانگرس اگر وہ میکیاولی کے شاگرد نہین ہین اور بے ثبات پولٹیکل اتحاد کے بجائے واقعی اہل ہند کے دلون کو اِسطرح متحد کرنا چاہتے ہین کہ ہر طرح کے تمام فرزندِ ہند ہندو ہون یا مسلمان پارسی ہون یا عیسائی سب مین قومیت کی سچی روح پیدا ہو جائے اور اُن کی ہندوستانیت دنیا مین ممتاز و نمایان ہو کر چمکے ——— تو اُن کو سب سے پہلے اپنی زبان کی بقا و استحکام کی کوشش اور اِس قسم کی جملہ ضروریات جو کسی فرقے سے تعلق نہین رکھتین بلکہ قومِ ہند پر حاوی ہین، اُن کے مہیا کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔ مثلاً ایک مرکزی دار العلوم (یونیورسٹی) یا مقامی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر ابتدائی درس گاہون کا قیام جن مین تمام علم و فن کی تعلیم ملکی زبان مین ہوا کرے۔ یہ اہم امور جن پر میری راے مین ہندوستان کی فلاح و بہبود کا انحصار ہو نہایت اطمینان کے ساتھ غور و فکر کے محتاج ہین۔ اور اگرچہ ایسی تجاویز کا عملی صورت مین آنا ابھی تک خواب و خیال معلوم ہوتا ہو لیکن اِس وقت ہندوستانی علم ادب کو درجہ کمال پر پہنچانے کی خواہش ہی بذات خود اہل ہند کی بیداری اور بہتر پذیری کی بڑی حوصلہ افزا دلیل روشن ہو گی کیونکہ سب جانتے ہین کہ اِس دورِ جدید مین قومون کی ساری عظمت و امتیاز کا سرچشمہ اُن کا علم ادب ہوتا ہو۔

علم ادب کی منزلت اب آردشیر کی تلوارون کا اور تیموری یلغارون کا زمانہ گذر چکا، اب جس قوم کو اعزاز و سربلندی کی آرزو ہو وہ روسو کا قلم اور والٹیر کی زبان پیدا کرے کہ انھین حقیر و نازک آلون نے عالمِ انسانیت مین انقلاب اُٹھائے اور سرزمین یورپ پر وہ ہنگامۂ رستخیز برپا کیا تھا کہ جس مین گردن فرازون کے سر اور بڑے بڑے شہنشاہون کے تاج تنکون کی طرح اُڑتے پھرے۔ اِس مین خلاف عادت یا جادوگری کی کوئی بات نہ تھی۔ جب تک افعالِ انسانی پر عقل و دماغ کی حکومت رہیگی اور دماغ اُس علم کی جو وہ حاصل کرے اطاعت کرے گا ——— اور ہمیشہ یہی ہو گا اُس وقت تک کچھ بھی شبہ نہین کہ ہر مصنف کی تحریر ایک ایسے دریا کی مثال ہو گی جس کے دامن مین بجلی کی ہزارون طاقتین پنہان ہون۔

جلسہ کا مقصود مجھے تسلیم ہو کہ اسوقت ملک مین عام بے حسی اور علم سے عبرتناک بدشوقی پھیلی ہوئی ہو اور ایسے ناساعد حالات مین بڑی بڑی امیدین باندھنا یا بار بار اہل مغرب کی ولولہ انگیز نظیرین پیش کرنا بظاہر جنگلون مین رہ کر شہرون کے ذکر سے دل بہلانا ہو لیکن گو ہندوستان کی قدیم داستانِ عظمت کو بھلا دیا جائے تاہم اُس کے مستقبل سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہین ہو۔ آج بھی یہ سرزمین وہی سنگ مرمر اُگلتی ہو جس سے وہ دلکش تاج محل بنا تھا۔ اِن کان کن صناع اور سب سے زیادہ ضرورت اُس دل کی ہو جو شاہجہان کے سینے مین تھا؛ پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہماری کانفرنس کا مقصد اگرچہ بنیادی مگر بالکل ابتدائی رکھا گیا ہو اور اِس اجتماع کا جس کی آپ صاحبون نے عزت بڑھا دی ہو، مدعا اسی قدر ہو کہ ملک مین ترقی علم ادب کا سچا شوق اور احساس پیدا کرے کہ اُس کے سہارے

علمی کام کرنے والوں کے حوصلے بڑھ جائیں اور انجمن ترقی اردو اپنی کوششوں کو جہاں تک ممکن ہو زیادہ وسعت دے سکے۔ اب خواہ اس میں ہمیں کامیابی ہو یا ناکامی، بے شبہ خود یہ مقصد نہایت حوصلہ افزا اور مبارک ہے۔

اس تحریک کے محرک ہمیں اس کے لیے اہل لکھنؤ اور کلکتے کے بعض محب وطن و دوست حضرات کا ممنون ہونا چاہیے جنھوں نے انجمن ترقی اردو کو اپنی پرانی چار دیواری سے قدم باہر نکالنے پر آمادہ کیا اور موجودہ جلسے کی بنیاد ڈالی۔ تعلیم یافتہ طبقے اور اخبارات نے بھی عام طور پر اس تحریک کو پسند کیا مگر ہمیں یہ فراموش نہ ہونا چاہیے کہ اس تمام احساس گرم جوشی کی تہ میں انجمن ترقی اردو کے لائق سکریٹری مولوی عبدالحق صاحب کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ شاید کسی صاحب مزاج فلسفی کا قول ہو کہ سب سے بلند آواز کا نام خاموشی ہے! میں اپنے فاضل دوست کو دل سے مبارکباد دیتا ہوں کہ اس بظاہر جمع ضدین قول کی انھوں نے اپنے کام سے عملی تصدیق کر دکھائی۔ چند سال سے جس خلوص و شوق کے ساتھ وہ انجمن ترقی اردو کا انصرام کرتے رہے زیادہ تر اُسی نے تمام اہل ملک کو زبان کی طرف متوجہ کیا اور بالواسطہ اس خیال کو تقویت بخشی کہ ترقی اردو کے حلقے کو بہت زیادہ پھیلانے کی ضرورت اور نیز گنجائش ہے۔ ضرورت کے متعلق تو کسی کو انکار ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ اگر اپنی زبان کو زمانۂ جدید کے مطابق علمی زبان بنانا منظور ہو تو ابھی اس کے لیے ہر شخص سمجھتا ہے کہ کیسے بڑے ساز و سامان محنت اہتمام کی احتیاج ہے۔ اور غریب انجمن ترقی اردو نے تو گویا اس سفر ہزار منزل کا پہلا مرحلہ بھی طے نہیں کیا لیکن ہمیشہ ایک نازک و حقیر پودے کو دیکھ کر ہی تناور درخت کا تصور ہوتا ہے اور اس اعتبار سے گو کم مایہ انجمن کا کام بجائے خود نہایت محدود تھا تاہم اس کا ایک منظم اور با اصول حالت پر آ جانا ہی بڑی بات ہے اور یقیناً اُسی نے ہندوستان کی عام ہوائے بیداری سے تقویت پا کر ہماری امنگ اور ہمارے منصوبوں کو یہ تازگی دی ہے۔

اس جلسے کی ضرورت بہرحال موجودہ تحریک جس طرح ہو عالم فکر و قول کی منزل سے گزر آئی اور آج اُس منشا کو پیش نظر رکھ کر جس کا میں نے اوپر ذکر کیا، یہ جلسہ خدا اُسے برکت و استقامت دے ہمارا سر آغاز عمل ہے۔ بے شبہ ملکی علم و ادب کے بہی خواہوں نے اپنی اپنی جگہ اس کے وسائل ترقی پر غور فرمایا ہوگا لیکن ان سب صاحبوں کے واسطے مبادلۂ خیالات اور بحث و گفتگو کی ایک مرکزی مجلس کا قیام بجنسہ نہایت ضروری اور مفید ہے کیونکہ اس نصب العین کا مجملاً دلوں میں ہونا کہ ہمیں اپنے علم ادب کو درجۂ کمال پر پہنچانا ہے کسی طرح کافی اور سود مند نہیں ہو سکتا خصوصاً اگر ہم جمہور اہل وطن کو اپنا شریک خیال بنانا چاہتے ہیں تو اس سے بہت کچھ زیادہ کہنا سننا پڑے گا۔ اور منزل مقصود تک پہنچنے کی جو جو شرطیں ہیں وہ سب تفصیل کے ساتھ سمجھنی اور سمجھانی ہوں گی تاکہ راستے کی طوالت اور نیز وہ سامان جو ہمیں کرنے ہیں نگاہ میں آ جائیں، اہل ملک اُن سے واقف ہوں اور کام کرنے والے اُسی کے مطابق اپنا نصاب عمل تیار کریں۔

اردو کی صحیح حالت سمجھنے میں دشواری کسی علم و ادب کا ذکر درمیان میں آتے ہی خواہ اُسے ترقی دینے کا کوئی منصوبہ زیر بحث ہو یا نہ ہو بالطبع یہ جستجو ہوتی ہے کہ اُس کی موجودہ حالت کیا ہے۔ اس میں کس قسم کا ذخیرہ کافی اور کون سا ناکافی ہے۔ اس میں کیا کوتاہی اور کیا کیا نقص ہیں اور اس کے کون سے پہلو قوی یا کمزور ہیں؟ کتنی کمی کی بات ہے کہ اردو کے بارے میں اس پہلے ہی سوال کا ہم کوئی قابل اطمینان جواب نہیں دے سکتے۔ زمانے کے اعتبار سے ہمارا علم ادب شاید دنیا میں سب سے کمسن نکلے گا۔ چاہیں ہم اس میں جو کچھ کام ہو چکا ہے بری بھلی جس قدر رکھتا ہے مختلف مضامین پر تحریر کی جا چکی ہیں اُن کا ہمیں

صحت کے ساتھ کوئی اندازہ نہیں۔ مجموعی طور پر ایک یہ بات کہ دنیا کی ہماری زبان میں جدید علوم مغربی بہت کم آئے ہیں یا شعر شاعری اور علوم دینی کی کتابیں بہ کثرت لکھی گئی ہیں کوئی قابلِ تشفی جواب نہیں ہے اُس میں اضافہ و افزایش ایک طرف یہ ہمارے علم ادب کی کیسی کس مپرسی اور پریشان حالی کی دلیل ہے کہ وہ بزرگ بھی جو اپنا شغلِ زندگی علم کی خدمت گزاری کو سمجھتے ہیں زبان اُردو کی مصنفات و مطبوعات سے کما حقہ واقف نہیں؟ مانا کہ زبانِ اُردو بہت پھیلی ہوئی زبان ہے اور اس کے مصنفین اور خادم برِ اعظم ہندستان کے دور دراز گوشوں میں چھپے پڑے ہیں جہاں دوسری مقامی بولیوں کا عام رواج اُس طرف ہمارے خیال کو بھی جانے نہیں دیتا۔ مگر یہ عذر کسی طرح لائقِ قبول نہیں بلکہ اُس سے اُلٹی ہماری ایک خاص کمزوری ثابت ہوتی ہے اور وہ یہ کہ دعویٰ کرتے وقت تو ہماری چشمِ تصور کے سامنے کشمیر سے میسو تمک اُردو کا پھریرا اُڑتا نظر آتا ہے پر جب زیادہ ٹٹولا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ گو یہ زبان ہندوستان کے تمام متمدن مقامات میں بولی اور سمجھی جاتی ہے مگر اُسے علمی حیثیت پنجاب صوبہ جات متحدہ یا بالائی بہار اور حیدرآباد کے علاقوں کے سوا کسی جگہ بھی حاصل نہیں ہے ..... لیکن بحث کے اِس پہلو پر زیادہ زور دینا غیر مفید ہوگا میرا اصلی مُدعا صرف یہ عرض کرنا ہے کہ آج جب کہ ہم اُردو کی توسیع و بہتری کی تدبیریں ڈھونڈھنے پر آمادہ ہوے ہیں قدرتی طور پر ہمارا پہلا کام اپنے موجودہ ذخیرے کی پوری پوری جانچ پڑتال کر لینا ہے اور اِس غرض کے لیے نہایت ضروری بلکہ ناگزیر ہے کہ وسیع پیمانے پر ایک مرکزی کتب خانہ اُردو قائم کیا جائے۔

مرکزی کتب خانہ کی ناگزیری کتب خانہ کی منزلت اور خصوصاً اِس زمانے میں جو فروغ اُسے ہوا ہے اُس کا بیان تحصیل حاصل ہوگا۔ سب جانتے ہیں کہ متمدن ممالک میں ترقیِ علم و تہذیب کی سب سے نمایاں علامت صمه کتب خانوں کی کثرت سمجھی جاتی ہے اور اِن ملکوں کے ساتھ دوڑ میں ہمیں برابری کا خیال گویا دیسی رتھ کو انگریزی انجن کے ہم رفتار چلانے کی سعی ہے لیکن مذکورۂ بالا تحریک سے خاص مقصود تو صرف اتنا ہے کہ اہلِ تلاش کو آسانی سے اُردو علم ادب کی حالت کا صحیح اندازہ ہو سکے اور بے شبہ جتنا زیادہ وسیع یہ کتب خانہ ہوگا اُسی قدر اپنے ادب کے متعلق ہماری معلومات زیادہ قابلِ اطمینان اور کامل ہوں گی۔ اِس تحریک کی جسارت مجھے اس وجہ سے اور ہوئی کہ غریب اُردو ابھی ایسی پُرمایہ نہیں ہے جس کی تمام کتابیں جمع کرنے میں کوئی بہت بڑا صرف برداشت کرنا پڑے گا یا جس کے انتظام میں زیادہ دشواریاں پیش آئیں گی۔ ایڈیٹر صاحب البشیر نے محض سعیِ ذاتی کے بھروسے پر اِس کام کا بیڑا اُٹھایا اور غالباً اُردو کتابوں کا معقول ذخیرہ اپنے یہاں فراہم کر چکے ہیں۔ پس میرے نزدیک صرف چند فیاض محبانِ قوم کی شرکت مذکورہ تجویز کا عملی سرانجام کر سکتی ہے جس کا فیض ہمیشہ جاری رہیگا اور جب عجب نہیں کہ آیندہ الازمانہ اُردو علم ادب کی سب سے بڑی خدمت تسلیم کرے۔ حکیم ارسطو اور فرانسیسی علماے قاموسی (انسائکلوپیڈسٹس) کی شہرتِ جلیلہ محتاجِ ذکر نہیں۔ بنی نوعِ انسان کے ان برگزیدہ محسنوں کا بڑا کارنامہ علوم کی جمع و ترتیب تھا۔ ہمارا مرکزی کتب خانہ دوسرے پیرائے میں اسی قسم کی ایک کوشش ہوگا۔ اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ وہ زبان جس کی کتابیں یہاں فراہم کی جائیں گی علمی ترقی کے جدید معیار سے بہت کم رتبہ اور بے بضاعت زبان ہے۔ البتہ ہمارا مقصودِ ادنیٰ حاصل ہو جائے گا اور جو کچھ اُردو میں ہو چکا ہے وہ ہمارے سامنے ہوگا تو آیندہ کام کا نقشہ تیار کرنے میں بہت آسانی ہوگی اور انفرادی طور پر بھی جب کوئی صاحب کسی مضمون پر قلم اُٹھائیں گے تو اُس کے متعلق اُردو میں جو کچھ کتابیں ہوں گی اُس سے انھیں آگاہی ہو جائے گی۔

اُردو کی ضروریات غرض اپنے علمِ ادب کی راہ میں ہمارا پہلا سامانِ ترقی کتب خانہ کا قیام ہے جسکے بعد دیگر علمی ضروریات زیرِ بحث آتی ہیں۔ ان ضروریات کا صحیح اندازہ کرنا یقیناً مجھے دشوار ہوتا اگر اصل یہ ہے کہ اور زبانوں کے مقابلے میں ہماری زبان اس درجہ تہیدست و پسماندہ ہے کہ ایک ہی نظر میں اُس کے نقص دکھائی دے جاتے ہیں اور جس طرح کسی حبشی کو شکایت تھی کہ اُس کی سیاہ تابی کو لوگ نام دھرتے ہیں اور فراخ پیشانی، کتابی چہرہ، خوبصورت دانتوں کی کوئی داد نہیں دیتا شاید اسی طرح اگر خوبیاں ہیں تو وہ بھی ہماری علم اور زیادہ برائیوں میں چھپ کے غائب ہو گئی ہیں۔ واقعی، جسے بیسویں صدی عیسوی کی علمی ترقیوں سے کچھ بھی واقفیت ہو وہ اِس رنج دہ کمی کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا جو کہ نی الحال جدید علوم طبیعی ہی کے نہونے سے ہماری زبان کے لیے موجبِ شرم و عار ہے۔ تمدن و معاشرت میں نئی نئی سہولتیں قابلِ ذکر سہی، خود انسانی عقل و دماغ کو بند توہم سے جس طاقتِ عقلی نے نجات دلائی ہے وہ یہی علوم تو ہیں۔ مگر اس ملک کے علم ادب میں ان کا کیا درجہ ہے؟ اس سوال کے جواب میں بہتر ہے کہ سکوت اختیار کیا جائے۔ کیونکہ اگر اِن معدود اور محدود کوششوں کو پیش بھی کیا گیا جو اِس بارے میں بعض بہی خواہانِ وطن نے کی ہیں تو مجھے اندیشہ ہے کہ اس سے اُلٹا اُن کوششوں کی بے سر و پائی کا راز فاش ہو جائے گا۔

یہ عذر کہ اِن جدید علوم کی ہمارے ملک میں مانگ نہیں، ظاہر کرتا ہے کہ گویا لکھنے والے موجود ہیں، پڑھنے والے میسر نہیں آتے، مجھے اِس کے ماننے میں تامل ہے۔ اہلِ قلم کی قلت دوسری بات ہے ورنہ مانگ کیے سے پیدا ہوتی ہے اور رہی ہمارے ہاں علم سے عبرتناک بیگانگی پھیلی ہوئی ہے یہ بھی اِس بات کا موقع ہے کہ بیہودہ اور فضول افسانوں کے بجائے ملک میں علمی رسالوں کی بہتات ہو۔ ہاں شرط یہ ہے کہ یہ تحریریں ایسی غیر مانوس اور دقیق نہ بنا دی جائیں کہ جن کے پڑھنے سے دل گھبرائے۔ مانا کہ یہ علوم ہماری زبان میں نئے ہوں گے مگر باتیں تو وہی ہیں جو ہمارے بھی مشاہدے اور تجربے میں آتی رہتی ہیں، اُن کا باترتیب و مفصل بیان باعثِ وحشت کیوں ہو دل پسند کیوں نہ ہو؟ پنجاب یونیورسٹی کی ابتدائی اُردو کتابوں میں جن میں اب کچھ ترمیم و تبدیلی کر دی گئی ہے حیوانات، نباتات اور جمادات پر اکثر مضمون نہایت مفید و دلچسپ پڑھائے جاتے تھے اسی طرح ان علموں کی اگر سادہ اور ذہن نشین پیرائے میں کتابیں شائع کی جائیں اور مغربیت کے بجائے طرزِ خیال دیسی لباس میں ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ عام طور پر مقبول و مطبوع نہ ہوں۔

علومِ نظری کے میدان میں زمانۂ حال کے مطابق اُردو میں کچھ نہ کچھ کام کیا جا چکا ہے نئی مؤلفات و تراجم میں بعض مشہور اور زیادہ تر کتابیں گمنام بھی ہو گئی ہیں اور ہمارا اس بارے میں ذریعۂ معلومات ایسا نامعتبر ہے کہ کم سے کم میں اُس کے متعلق کوئی قطعی رائے نہیں دیتا۔ لیکن دنیا کی اُن چیدہ اور مستند کلاسکل یا قدیم کتابوں کا جن کے مطالعہ بغیر آدمی کا علم ناقص لیا جاتا ہے زبانِ اُردو میں موجود نہونا درحقیقت ایسی کمی اور بدنصیبی ہے کہ اُس پر جتنا تاسف کیا جائے کم ہوگا۔ میں تمام اہلِ علم سے اور خاص کر انجمن ترقی اُردو کے فاضل سکرٹری صاحب سے بمنت درخواست کرتا ہوں کہ وہ جہاں تک ہو سکے اِس نقص کو دور کرنے کی کوشش فرمائیں۔ اگر ملک میں ایسے نامور معلموں کی تعلیم پھیلانے کا کوئی وسیلہ نہ نکلا تو اہلِ ہند سے جن کے زوال نے پہلے ہی انھیں دنیا کی ایک ذلیل قوم بنا دیا ہے کسی روشن خیالی اور حوصلہ مندی کی توقع نہیں ہو سکتی۔

فروغ و ترقی تو اُسکے بہت بعد کی منزلیں ہیں۔

اُردو جرائد کتابوں سے دوسرے درجہ پر زبان کی اشاعت و خدمت کا

ذریعہ اخبارات و رسائل ہین۔ یہ چیز ہم نے اہلِ مغرب سے لی تھی مگر عجیب بات ہو کہ اِس ملک مین جاندار زیادہ تر اُن لوگون کے قبضے مین ہے جو مغربی تعلیم سے نہ خود مستفیض ہوے نہ جدید تعلیم یافتہ لوگون سے کام لینے کی صلاحیت رکھتے تھے غنیمت ہو کہ پچھلے چند سال مین ایک امید افزا تبدیلی پیدا ہوئی ہو۔ انگریزی تعلیم یافتہ اپنی دیسی زبان مین اخبار نویسی پر ملتفت ہوے ہین اور ہمارے اخبارون مین کہین کہین نئی زندگی کے آثار نظر آنے لگے ہین لیکن ابھی تک یہ کام بہت اصلاح و ترقی کا محتاج ہو اور اگرچہ ہماری تحریک کو سیاسی معاملات سے کوئی علاقہ نہین تاہم ادبی حیثیت سے ضرور ہو کہ انجمن ترقی اُردو میدانِ ادب کے اِس اہم حصے کو نظر انداز نہ کرے اور جن جن طریقون سے ممکن ہو اعلےٰ رتبہ کی اخبار نویسی اور ساتھ ہی اخبار بینی کا ذوقِ صحیح پیدا کرنا بھی اپنے مقاصد مین داخل سمجھے۔

ترقی اُردو کی شاخین اسی فضا یعنی اشاعتِ زبان کے متعلق ایک ضروری مسئلہ ملک کے مختلف حصون اور شہرون مین انجمن ترقی اُردو کی شاخون کا قیام ہو بعض بہی خواہانِ اُردو کی توجہ اور نیز مولوی عبدالحق صاحب کی کوشش سے یہ کام شروع ہو گیا ہو لیکن جہانتک مجھ کو معلوم ہو ابھی صرف چند مقامات مین شاخین بنائی جا سکی ہین اور اُن کے فرائض و مقاصد کا بھی کوئی فیصلہ نہین ہوا ہو کہ انھین کس طریق پر اور کیا کیا کام کرنے چاہیین میرے خیال مین ہر شاخ کا ایک فرض اپنے اپنے مقام پر اُردو تصانیف کو مقبول و متعارف کرنا ہو تاکہ تعلیم یافتہ لوگ ملکی علم ادب کی قدر جانین اور اُنکی سرپرستی پر آمادہ ہون اِس کے علاوہ یہ شاخین عام جلسون کا انتظام کیا کرین جن مین مختلف مضامین پر صاف سلیس اُردو مین تقریرین کی جائین۔ اور اِس ذریعے سے لوگون مین شایستہ زبان کی اشاعت کے سوا پاکیزہ اور علمی خیالات بھی پھیلائے جا سکین اور تقریر کی تعلیمی حیثیت اہلِ وطن کو فائدہ پہنچائے، اِسی طرح مقامی انجمن اگرچہ مستقل مصنف یا ادیب پیدا کرنے کی ذمہ داری نہین لے سکتی یہ ممکن ہو کہ وہ انعامی مضامین بذریعہ اشتہار لکھواتی رہے اور اُردو اخبارات پر دازی نیز علمی تحریرون کا اپنے اپنے حلقے مین شوق بڑھائے اور آخر مین عمدہ اہلِ قلم تیار کرنے کا ایک عمدہ وسیلہ ثابت ہو۔

یہ دونون صورتین ایسی ہین جن مین روپے اور وقت کا بہت کم صرف اُٹھانا ہو گا اور اگر زبان کے جوشیلے حامی مل کر اس کام کو بھی خوبی و استقلال کے ساتھ نہ چلا سکین تو ہمین اپنی کامیابی سے مایوس ہو جانا چاہیے۔ البتہ کتب خانے قائم کرنے کا سوال ذرا زیادہ غور طلب ہو کیونکہ اُردو زبان کی منتخب کتابین جمع کر لینا خواہ اتنا دشوار نہ ہو، ایک کتب خانے کی خاطر خواہ نگرانی اور مصارف دہر کا بند و بست اُس وقت تک آسان نہین معلوم ہوتا جبتک کہ بعض صاحبان ثروت اس کی اعانت کا ذمہ نہ لے لین۔ بہ این ہمہ انجمن ترقی اُردو کو اس معاملے مین برابر اپنی شاخون سے سلسلہ جنبانی رکھنی چاہیے اور ممکن ہو تو اس کوشش مین اُن کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔

یونیورسٹیون مین اُردو کی خبرگیری اِن مرحلون سے گزر کر اب مین آپ صاحبون کی توجہ دو زیادہ اہم تجاویز کی طرف مبذول کرانی چاہتا ہون جنمین سے پہلی یونیورسٹیون مین زبانِ اُردو کی خبرگیری ہو۔ اِس وقت تک سرکاری یونیورسٹیون مین ہندوستانی ادبیات کو بہت کم رتبہ دیا گیا ہو۔ خصوصاً اُردو جن صوبون کی سرکاری زبان مانی جاتی ہو وہان بھی مڈل اور حد سے حد انٹرنس مدارس کے آگے اُس کی کوئی پرسش نہین ہوتی۔ دیسی زبانون کے ذریعے تعلیم کا خواب تو خدا معلوم کب ہندوستان مین پورا ہو گا لیکن اِس وجہ سے اُن کے ساتھ بےاعتنائی سراسر ظلم ہو۔ اور کچھ عجب نہین کہ انگریزی تعلیم یافتہ جماعت مین اپنی جماعت سے جو ناواقفیت اور بےتوجہی پائی جاتی ہو اُس کا ایک سبب یہی ہو

کہ ہمارے علومِ ادب کو تعلیم کے اونچے مدارج مین کوئی جگہ نہین دی گئی ہے۔ اسکے علاوہ یونیورسٹیون مین جو اُردو کتب نصاب مقرر ہین اُن مین کہین مضامین کے اعتبار سے کہین انشا پردازی کے لحاظ سے بہت کچھ اصلاح کی ضرورت ہے۔ اب تک یہ نصاب بالعموم انگریز افسرون کی نگرانی مین منتخب اور جاری کیے جاتے ہین اور یہ طریقہ اس امر کا سخت محتاج ہے کہ ہماری ادبی انجمنِ ترقی اُردو افسرانِ مذکور کی نظر مین اپنا اعتبار قائم کرے اور اپنے صلاح و مشورے سے اُنکے کام مین ممد و معاون ہو۔ اخباری یا انفرادی نکتہ چینی سے اِس معاملے مین کوئی نمایان فائدہ نہین ہو سکتا۔ اور یہان بھی کامیابی کا یقین اتحاد و اجتماع پر منحصر ہو رہا ہے۔ اور اِسی سلسلے مین مجھے اپنی دوسری تجویز کا خیال آیا جس سے میری مراد اُردو اکیڈمی کا قیام ہے۔

اُردو اکیڈمی

یہان اکیڈمی سے میرا مدعا ایک ایسی علمی جماعت ہے جو ملکی تصانیف و مطبوعات پر غیر سرکاری مگر با اثر نگرانی رکھے اور جو ذوقِ صحیح پیدا کرنے کی غرض سے اُس فنِ تنقید کی اُردو مین بنا ڈالے کہ جس سے ہمارا علم ادب قریب قریب بالکل ناآشنا رہا ہے۔ درسی کتابون کے متعلق یونیورسٹیون سے بحث و مکاتبت بھی اسی جماعت کے کے تحت مین دی جا سکتی ہے لیکن اس کا خاص کام زبانِ اُردو کی پبلک اور نئی کتابون پر اپنی مستند رائے کا اظہار ہونا چاہیے۔ اب تک ہمارے ہان دستور ہے کہ کسی کتاب کی تقریظ یا قطعۂ تاریخ لکھنے مین اُسکی نہایت ناروا مبالغے کے ساتھ تعریفین کی جاتی ہین۔ دوسری صورت جسکا آج کل تنقید کے نام سے رواج بڑھتا جاتا ہے یہ ہے کہ یا تو بغیر دیکھے بھالے کسی کتاب پر چند سطرین لکھ کر اس بوجھ سے سبکدوش ہو گئے اور یا کسی تصنیف یا خود مصنف سے ناراض ہوئے تو اُسکی چھوٹی چھوٹی فروگذاشتون کو بھی فاحش غلطیان ثابت کرنے مین ورق کے ورق سیاہ کر ڈالے۔ ایک اور غلط فہمی جس مین ہماری زبان کے بعض ہوا خواہ مبتلا ہین یہ ہے کہ کتاب کے مضمون سے کوئی بحث نہ ہو اور سارا زور تنقیدِ عبارت کے الفاظ محاورات اور روزمرہ کی خردہ بینی مین صرف کیا جائے اور اگر غریب لکھنے والے کے قلم سے دو چار ایسے الفاظ نکل گئے ہین جو کسی مشہور اُستاد کے دیوان مین نہین ملتے تو پھر وہ کتاب اس قابل نہین کہ پڑھی جائے کیونکہ اُس سے زبان خراب ہونے کا مہلک اندیشہ ہے!

غنیمت ہے کہ یہ بیماری اب ملک مین کم ہوتی جاتی ہے اور زبان کے متعلق بہت سے ناگوار مباحثے بھی اسی گوشۂ تاریکی مین سمٹ رہے ہین جس کے وہ مستحق ہین۔ مگر ان کلمات سے امید ہے کہ میرے منشا کا کسی حد تک آپ حضرات کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ مین اُس لباس کو جس مین کوئی مصنف اپنے خیالات پیش کرے زیادہ قابلِ لحاظ نہین سمجھتا۔ بلکہ جس قسم کی اکیڈمی تجویز کرنے کی مین نے جسارت کی ہے اُسکا مقصودِ اصلی خیالات کی پرکھ ہو گا۔ ہر کتاب کا ایک مجموعی اثر خواہ مصنف کا وہ منشا ہو یا نہو، پڑھنے والون کے دل پر مرتب ہوتا ہے۔ اِسی اثر کو سمجھنا اور سمجھانا اور پھر اُس کے عیب و صواب پر رائے زنی کرنا، صحیح معنون مین تنقید ہے اور اس کا مطلب خود اُن کو کچھ سکھانا اور مشورہ دینا ہے جو دنیا کو بذریعۂ تصنیف کچھ سکھانے کے دعویدار ہین۔ اسکی اہل صاحبانِ علم و فضل کی ایک منتخب جماعت ہی ہو سکتی ہے کہ جو "تعلیم المصنفین" کا یہ مفید و اہم کام اپنے ذمے لے اور اُردو اکیڈمی کے نام سے ہمارے علم ادب کی مستند اور مستقل رہنما ہو۔ اور گو بعض مصنفین پر اس جماعتِ علما کی باوزن رائین بظاہر زیادہ کارگر نہون گی لیکن کم سے کم آنے والے اہل قلم اور آنے والی کتابین اسکی تعلیم سے مستفید ہوئے بغیر نہین رہ سکتے۔ اور اسی طرح مجھے پورا یقین ہے کہ چند ہی سال مین آپ کی اکیڈمی مصنفاتِ اُردو کی علمی حیثیت کو بہ درجہا بہتر بنا سکے گی اور ہمارے ملکی علم ادب پر اُس کا

اتنا وسیع اور نمایاں اثر چھوڑے گا جو شاید کئی کالجوں کی تعلیم سے بھی نہ پڑ سکتا!۔

حضرات ۔ اگرچہ مضمون کی منزلت اور ہمہ گیری کا تقاضا تھا کہ اس پر بہت کچھ کہا جائے، مگر اب ہم سب جناب صدر نشین کا پر مغز ایڈریس سننے کے مشتاق ہیں۔ لہذا میں اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں اور مجلس استقبالیہ کی طرف سے پھر اس زحمت کا جو آپ نے گوارا فرمائی ہے شکریہ ادا کرتا ہوں ۔ فقط

(ہندوؤن کا تعلق اُردو سے)

مولانا مولوی عبد الحلیم صاحب شرر کا وہ مضمون جو اُردو کانفرنس لکھنؤ کے دوسرے اجلاس مین پڑھا گیا

حضرات! - علم الالسنہ یعنی فیلالوجی نے دنیا مین عجیب عجیب کرشمے دکھائے ہین۔ اِس عہد کے واقعات نظر کے سامنے کر دیے جبکہ سلف کو ابتدائی نسلون کی اطلاع کے لیے اپنے کارنامون کے زندہ رکھنے کی کوئی تدبیر نہین معلوم تھی۔ نوع انسان کے بچپن کے سفرون اور آغاز شعور انسانی مین آدمیون کی نقل و حرکت اور سیر و سیاحت کے حالات ہمین اسی زندگی بخش فن سے معلوم ہوے۔ ہمارے مجہول العہد بزرگون کے نقش قدم جو قدیم الایام کی جلاوطنیون اور صحرانوردیون سے صفحۂ زمین مین جابجا بن گئے تھے اُنھین ہم نے اِس جدید علمی عینک کی مدد سے دیکھ لیا۔ اور اُسی کی مدد سے روز بروز بعید سے بعید اور گہرے سے گہرے واقعات کا انکشاف ہوتا جاتا ہے۔

مگر سب سے بڑی برکت و نعمت وہ انکشافات ہین جو اس عینک کے ذریعے سے ہمین خود اپنی زبان کے اندر نظر آئے ہین۔ ہماری زبان سچ پوچھیے تو ایشیا کی اُس سراپا عظمت قوم کے تفرق و اتصال کی زندہ تاریخ ہے جس کی شاخین نکلین پھیلین چھوٹین۔ ملین۔ ہٹین۔ بڑھین۔ لڑین۔ ٹکرائین۔ اور پھر ایک ہو گئین۔

اسی علم الالسنہ کے طفیل مین فی الحال یہ ایک طے شدہ تاریخی مسئلہ ہے کہ قدیم الایام مین تمدن انسانی کا سب سے ممتاز اور عظیم الشان درخت جو تاریخ مین آریہ کے نام سے مشہور ہے وسط ایشیا کے ایک سرسبز خطے مین پھلا پھولا۔ اور جب اُسکی ایک ابتدائی قلم اُس سے کاٹ کے ارض مغرب اور یونان و روم کی سواد مین نصب ہو چکی تو اور زیادہ پھیلا اور اُس کی دو زبردست شاخین اِدھر اُدھر بڑھنے اور پھیلنے لگین یہان تک کہ ایک مشرق کی طرف بڑھ کے ہندوستان پر سایہ افگن ہوئی اور دوسری مغرب مین پھیل کے مملکت عجم کی بہار بن گئی۔ اِن دونون شاخون نے یہان تک فروغ پایا کہ قدیم درخت کا اصلی تنہ فنا ہو کے صفحۂ ہستی سے غائب ہو گیا۔ اور اُن دونون ممتاز و سرسبز شاخون نے ہندوستان و ایران کی زمینون مین اپنے لیے نئے تنے پیدا کر لیے۔ اب مقامی آب و ہوا کے اثر نے اُن کو ایک دوسرے سے جدا اور مختلف خصوصیات سے متصف کرنا شروع کیا۔ اور دونون مین جدا جدا خصائص و تخصصات پیدا ہو گئے۔

آریہ قوم کی اِن دو شاخون کے ایک ہونے اور اُس کے بعد پھر ملنے کی سچی تاریخ ہماری اُردو زبان ہے۔ مسلمانون کا ہندوستان مین آنا در اصل ہزار ہا سال کی مفارقت کے بعد اُن دونون شاخون کا ہم آغوش ہونا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ مسلمان عرب سے آئے اور وہ آریہ قوم سے نہین بلکہ

باغ عالم کے ایک دوسرے درخت کی شاخ ہین جو بنی سام کا درخت کہلاتا ہو اور شجرِ آریہ سے پہلے دنیا مین سرسبز ہو چکا تھا۔ یہ ایک حد تک صحیح ہو تا جران عرب ظہورِ اسلام سے پہلے بھی جنوبی ہند کے شرقی و غربی سواحل پر آآکے بستے رہے۔ اور اُس کے بعد بھی اُنکے آنے اور توطن اختیار کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے علاوہ جب پہلی صدی ہجری مین سلمانون نے ملک سندھ کو فتح کر لیا تو کثرت سے عربی خاندان آآکے سندھ کچھ کاٹھیاواڑ اور گجرات مین سکونت پذیر ہو گئے۔ یہ فی الحقیقت عربون اور بنی سام کا آنا تھا۔

لیکن مسلمانون کا وہ آنا جس نے ہندوستان پر گہرا تمدنی اثر ڈالا جس سے ہندوستان کی موجودہ معاشرت بنی اور اُسکی موجودہ زبان پیدا ہوئی اُس کا آغاز سچ پوچھیے تو محمود غزنوی کے حملون سے ہوا۔ یہ عربون کا آنا نہ تھا بلکہ ایرانیون اور فارسیون کا آنا تھا جو در اصل اُسی قدیم آریہ شاخ کے پھل پھول تھے۔ محمود غزنوی خاص عجمی نژاد اور آل ساسان کی نسل سے تھا۔ اور اُس کی فوج مین جو لوگ تھے وہی لوگ تھے جو ایرانی تھے یا تورانی۔ جن کو ایرانی اپنا ہم نسب اور ہم جد بتاتے تھے۔ غزنویون کے بعد غوری سلاطین اسلام کا عہد شروع ہوا۔ وہ بھی گو مذہباً مسلمان تھے لیکن بلحاظ انساب تورانی تھے۔ پھر غلامون کا عہد آیا اور وہ بھی تورانی تھے چند روز کے لیے سیدون کا کمزور زمانہ رہا اور پھر حکومت عجمی الاصل خاندانون کے ہاتھ مین آگئی۔ تو دھی تغلق اور مغل یہ سب تورانی اور اہلِ عجم کے بنی عم تھے۔ بہرحال ہندوستان مین مسلمانون کا جو تمدن و دربار قائم ہوا اور جس نے ہندوستان کی سوسائٹی کو اپنے رنگ مین رنگا وہ سامی نہین آریہ دربار تھا۔ اور اس مین مطلق شک و شبہ نہین کیا جا سکتا کہ اگرچہ یہ لوگ دین اسلام کے پیرو ہونے کی وجہ سے عربون کی عزت کرنے اور عربی معاشرت کے دلدادہ تھے مگر بذات خود آرین تھے اور اُن کا آنا آریہ قوم کی دو شاخون کا باہم ملنا تھا۔

فی الحال کوشش کی جاتی ہو کہ پرانا رشتہ زندہ کر کے یورپ والون کو اہل ہند کا بھائی بند ثابت کیا جائے۔ اور مسلمان ایک غیر قوم بتائے جائین جنکو آریہ قوم سے کوئی لگاؤ نہین حالانکہ واقعہ یہ ہو کہ جن مسلمانون نے ہندوستان پر حکومت کی اور اُس مین اپنا جدید دربار قائم کیا وہ بنی سام نہین آریہ تھے۔ عربی نہین فارسی بولتے ہوے ہندوستان مین آئے تھے۔ اہلِ ہند سے بمقابل اہل یورپ کے زیادہ قریب کا رشتہ رکھتے تھے۔ اِس کے ماننے مین ہمین عذر نہین کہ ایران کے آریون کو ہندوستان مین آنے سے پہلے عربی اثر نے مغشوش کر دیا تھا لیکن ایرانیون سے زیادہ یورپ کے آریون کو کلٹ ہن گاتھ۔ اور تاتاری قومین مغشوش کر چکی تھین۔ بہرحال اس مین ذرا بھی شک نہین کیا جا سکتا کہ اہل یورپ کے بہ نسبت یہ عجمی فاتح ہندوؤن کے زیادہ قریبی رشتہ دار تھے۔

لیکن سامی و آریہ دونون نسلون کے تازہ وارد مسلمانون نے گو کہ پہلون کی زبان عربی اور دوسرون کی فارسی تھی اس سرزمین پر قدم رکھتے ہی یہان کی زبان کی طرف غیر معمولی توجہ کی۔ اور اس ملک کی زبان کو نہایت ہی سرگرمی اور ذوق و شوق سے حاصل کرنا شروع کر دیا۔ اہل عرب ۹۳ھ مطابق ۷۱۱ء مین وارد سندھ ہوے تھے۔ اور پرانا عربی مورخ بلاذری لکھتا ہو کہ اُسکے اٹھائیس ہی سال بعد یعنی ولید بن یزید کے عہد مین اہل سندھ عربی بولنا در کنار اس زبان کی تعلیم مین ترقی کرنے لگے تھے۔ چند ہی روز مین عربی زبان سے کسب تھی نثر او شعرا نے یہان تک نمود حاصل کر لی کہ اُن کے اشعار بلاد عجم و عرب مین مشہور ہوے۔ اور اُن کا نام ارض عرب کی علمی صحبتون مین عزت سے لیا جانے لگا۔ چنانچہ اس عہد کا ایک شاعر لسان عرب جس کا لقب ہی سندھی تھا آج تک مشہور ہے۔ اُس کے ساتھ یہ بھی پتہ لگتا ہو

کہ سنوطن سندھ عربون نے بھی سندھی زبان ذوق و شوق سے سیکھنا شروع کر دی تھی۔

اِس کے تھوڑے دنون بعد عربون کا انہماک ہندستان کی زبانون مین یہان تک بڑھا کہ سندھی زبان کے عربی نژاد شاعر پیدا ہونے لگے جن کا کمال یہان کی مہذب صحبتون اور معزز دربارون مین بہت مقبول تھا۔ اس زمانے کا ایک مشہور سیاح بزرگ بن شہریار ناخدا جس کا سفرنامہ دارالسلطنت روس مین چھپا ہو لکھتا ہو "سنہ ۲۷۰ھ (۸۸۳ء) مین کسی ہندو راجہ نے مسلمان حاکم سندھ کو لکھا کہ مجھے مسلمانون کے عقائد سے مطلع فرمائیے۔ سندھ کے فرمانروا نے یہان کے ایک ماہر السنہ ہندو شاعر کو بلا کے حکم دیا کہ آپ عقائد اسلامیہ کو سندھی زبان مین لکھ دین۔ وہ ہندوستان کی کئی زبانین جانتا تھا۔ اور سب مین شعر کہتا تھا۔ اُس راجہ کی زبان مین ایک نہایت ہی فصیح و بلیغ نظم لکھی جسمین شریعت اسلامیہ کے کل اصول و عقائد موزون کر دیے تھے۔ اِس نظم کو سب نے پسند کیا۔ اور جب وہ راجہ کے پاس پہنچی تو شاعر کی قادر الکلامی کی بیحد داد دی۔ اس کا مشتاق ہوا۔ اور حاکم سندھ کو لکھا اس شاعر کو آپ میرے پاس بھیج دین۔ وہ شاعر گیا جس سے راجہ نے قرآن مجید کا ہندی زبان مین ترجمہ کرایا اور اُسے بہت کچھ انعام و اکرام دے کے رخصت کیا۔"

اس کے بعد جب قدیم سیاحان عرب اصطخری ابن حوقل بشاری اور مسعودی وغیرہ سندھ مین آتے ہین اُن کے بیانون سے یہ نتیجہ بخوبی اخذ کیا جا سکتا ہو کہ سندھ مین ہندو مسلمانون کا میل جول اِس قدر بڑھ گیا تھا کہ ہندو عربی معاشرت سے اس قدر متاثر نہین ہوے تھے جس قدر خود عرب ہندوستانی معاشرت سے متاثر ہو گئے تھے عربون نے یہان کی زندگی اختیار کر لی تھی یہان کی عورتون سے نکاح کر لیے تھے۔ یہان کی زبان بولتے تھے۔ اکثر یہین کے نامون اور لقبون کو اختیار کرتے تھے۔ اور یہین کے رسم و رواج کے پابند تھے۔

لیکن یہ ایک داستان کہن تھی جسے لوگون نے بھلا دیا۔ اور جن لوگون نے تحقیق و تدقیق سے تاریخون کے ورق نہین اُلٹے انھین اِس کا یقین بھی مشکل سے آتا ہو۔ مگر یہ کسی قدر سچ بھی ہو کیونکہ ہماری موجودہ معاشرت کو ہندو مسلمانون کے اُس میل جول سے بہت کم تعلق ہو۔ ہماری معاشرت کی بنیاد اُس وقت پڑی جب کوہ سلیمان کی گھاٹیون سے نکل کے ترکی و ایرانی مسلمان ہندوستان مین آئے۔ اور جب سنسکرت آمیز ہندی اور عربی آلود فارسی زبانین ملین۔ اور گرم و سرد پانیون کے ملنے سے یہ نہایت ہی خوشگوار سمویا ہوا پانی بنا جس سے ہماری اُردو زبان مراد ہو۔

اِن آریہ نسب مسلمانون کے آنے کا آغاز بظاہر محمود غزنوی کے حملون سے نظر آتا ہو مگر دراصل ابو ریحان بیرونی کی علمی کوششون سے ہوا جس کے وطن مین اگرچہ بڑا اختلاف ہو مگر میرے خیال مین سندھ کے فنا شدہ شہر بیرون یا نیرون کا رہنے والا اور اُس ہندی آمیز اسلامی تمدن کی آخری یادگار تھا جو حسب بیان متذکرۂ بالا سندھ مین قائم ہو گئی تھی۔ اُس نے عربی و سنسکرت دونو زبانون مین کمال پیدا کیا۔ ہندوستان کے اندرونی شہرون اور ہندوؤن کی قدیم علمی درس گاہون مین طالب علمی کی۔ ہندوؤن کے علوم عربی مین اور عربون کے علوم سنسکرت مین منتقل کیے اور برسون اُن شہرون مین رہ کے جہان اسلام کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ یہان کی مروجہ زبانین سیکھین اور ایک ایسا عجیب و غریب شخص بن گیا کہ آج تک مغرب کی علمی دنیا مین حیرت و ادب کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو۔

اُسی عہد سے وابستہ فارسی کا مشہور شاعر مسعود سعد سلمان ہو جس کی نسبت تذکرۂ مجمع الفصحا مین لکھا ہو "صاحب سہ دیوان بودہ تازی و ہندی و پارسی"۔ مولانا شبلی لکھتے ہین "تمام تذکرے متفق اللفظ ہین کہ ہندی

زبان مین اُس نے ایک دیوان لکھا تھا۔ اُس کا خاندان اگرچہ ملک عجم سے آیا تھا مگر وہ خود لاہور مین پیدا ہوا تھا۔ اور اسی وجہ زبان ہندی کا اتنا بڑا زبان دان ہو گیا کہ اِس کثرت سے وطنی زبان مین شعر کہتا تھا کہ اُن کا ایک مستقل دیوان مدوّن ہو گیا۔

یہ غزنویون کے عہد اولین کا ایک نامور مسلمان شاعر تھا۔ اس کے چند ہی روز بعد مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم لکھتے ہین کہ شہاب الدین غوری کے عہد مین ہندوستان کے مشہور ہندی شاعر چند کوبی نے پرتھی راج راسا لکھی تو اُس کے کلام مین کثرت سے فارسی عربی الفاظ موجود تھے۔

یون تو دو قومون کے ملتے ہی باہم مبادلۂ الفاظ شروع ہو جاتا ہے۔ مگر اِس لین دین کی حقیقی منڈیان دو ہوا کرتی ہین۔ اول بازار جہان ضروری اشیا کے خرید فروخت کے ساتھ لفظون کا سودا بھی ہونے لگتا ہے۔ اور دوسری نغمہ و سرود کی صحبتین۔ خصوصاً جب ایک قوم کی محفل مین دوسری قوم کے مغنی آئین اور اپنی زبان کے گیت دلکش نغمون مین سنائین۔ عوام پر بازار کا زیادہ اثر ہوتا ہے اور خواص یعنی امیرون۔ دولت مندون۔ اور معزز لوگون پر عیش و طرب کی صحبتین زیادہ اثر ڈالتی ہین۔ عام مسلمانون کے لیے بازارون مین الفاظ کے لین دین کی تجارت تو اُسی دن کھل گئی تھی جس دن مسلمان ہندوستان مین آئے تھے۔ مگر بزم طرب کی محفلین اُس وقت گرم ہو گئین جب مسلمان فرمانرواؤن نے اپنے دربار مین ہندو مغنیون کو جگہ دی اور ملکی طائفے نوکر رکھے۔ ساتھ ہی مشائخ صوفیہ نے اِدھر توجہ کی۔ اور موسیقی کے روکنے کے لیے مسلمانون کے دلون پر جو مذہبی پہرہ تھا وہ اُٹھ گیا۔ علما نے اِس سے اختلاف کیا۔ مگر قاضی حمید الدین ناگوری نے سلطان شمس الدین التمش کو اپنی ایک کرامت دکھا کے علما کے فتوون کے خلاف اور محفل سماع کا ایسا گرویدہ کر دیا کہ مشائخ کی محفلون مین طبل و سرود کا نغمہ گونجنے لگا۔

شمس الدین التمش نے عربی و عجمی مزاج و مشائخ کا شوق پورا کرنے کے لیے غالباً ایرانی مغنیون کو اپنے دربار مین جگہ دی ہو گی مگر اُس کا بیٹا فیروز شاہ گانے کا ایسا دلدادہ ہوا کہ بڑے بڑے گویے دور دور سے آ کے اُس کی محفل نشاط مین جمع ہو گئے۔ اور ہر شہر اور ہر قصبے سے گانے ناچنے والی عورتون نے دہلی مین آ کے بسنا شروع کر دیا۔ جن مین سے بعض چوٹی کے صاحب کمال مطربون اور مغنیون کو اُس کے دربار مین خاص جگہ مل گئی۔ فیروز شاہ کے بعد یہ سلسلہ برابر بڑھتا شروع ہو گیا۔ معز الدین کیقباد و جلال الدین خلجی علاء الدین خلجی دولت مغلیہ سے پیشتر کے وہ پُرانے تاجداران ہند ہین جن کو موسیقی کا بہت شوق تھا۔ اور اُن کے شوق نے دہلی مین خصوصاً اور سارے ہندوستان مین عموماً ہزارہا مطرب و مغنی پیدا کر دیے۔

ابن بطوطہ کو دہلی اور دولت آباد دونون شہرون مین "طرب آباد" نام کے محلے نظر آئے جن مین صرف ڈوم ڈھاڑیون کی آبادی تھی۔ اور یہی نہین کہ اُن مین فقط ہندو مغنی آباد ہون۔ ہندو مسلمان دونون تھے۔ مسلمان بھی معمولی مسلمان نہین بلکہ دیندار اور پابند شرع گویے جن کی وجہ سے اُن محلون مین مسجدین تھین۔ خوب آباد تھین۔ اُنہین پنج وقتہ نماز ہوتی۔ اور رمضان مین جماعت سے تراویح پڑھی جاتی۔ شاہی دربارون مین عموماً ارباب نشاط کے داروغہ یا چودھری مسلمان تھے۔ جو اکثر ایرانی الاصل ہوتے۔ اِن دو عنصرون کے ملنے سے فن موسیقی کے مسائل مین باہمی۔ ردوبدل اور دادوستد کے اصول کا جاری ہونا یقینی ہے۔ مگر اسی سلسلے مین موسیقی سے زیادہ اِس لین دین کے عمل کا الفاظ مین جاری ہو جانا لازمی تھا۔ ہندوستان کے گویے مسلمان اُمرا کے خوش کرنے کے لیے فارسی نغمون اور فارسی زبان کے گیتون کو سیکھتے ہون گے۔ اور ساتھ ہی مسلمان سلاطین و امرا اُن کی وطنی چیزین

بڑے ذوق و شوق سے سُنتے ہون گے۔ موسیقی کے ذریعے سے زبانون اور اُن کے الفاظ کا یہ ردّ و بدل شمالی ہند ہی مین نہین جنوب مین بھی بڑی وسعت کے ساتھ اُسی زمانے مین جاری ہو گیا تھا اور ابوریحان بیرونی اور مسعود سعد سلمان کے ایسے علما و شعرا نے علمی محفلون مین فارس و ہند کے تمدنون کے ملانے کی جو کوشش کی تھی وہ اربابِ نشاط کے ذریعے سے اخلاقی و معاشرتی محفلون مین بڑے زور و شور کے ساتھ جاری ہو گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بازارون مین عام لوگ دونون جداگانہ تمدنون کے ملانے اور ایک کو دوسرے سے قریب کر کے ایک کر دینے کے لیے جو نئے نئے نمونے پیدا کرتے وہ اربابِ نشاط کی معرفت امرا اور دولتمندون کی مُہذّب محفلون مین پہنچ کے پسند کیے جاتے۔ اور اُس کے بعد جب شعرا و اہلِ علم کی صحبت مین پہنچتے تو اُنھین سندِ صحت و مقبولیت مل جاتی۔

چند ہی روز مین یہ علمی تجارت اور زیادہ ترقی کر گئی۔ کشمیر کے حکمران سلطان زین العابدین نے جو فارسی کے علاوہ ہندی اور تبتی زبانون مین بھی پورا دخل رکھتا تھا اکثر عربی و فارسی کتابون کا ترجمہ ہندی مین اور بہت سی ہندی کتابون کا ترجمہ فارسی مین کرایا۔ اور سب سے پہلے اُسی کے حکم سے مہابھارت اور راج ترنگی (قدیم تاریخ کشمیر) کا ترجمہ فارسی مین ہوا۔

اُسی قریب زمانے مین امیر خسرو کے اشعار مشہور ہوے جنھون نے دہلی مین نشو و نما پایا تھا۔ وہ شاعری کے علاوہ موسیقی مین بھی کمال رکھتے تھے۔ اور ہندی نژاد ہونے کی وجہ سے ہندوستان کی ہر چیز کو پسند کرتے تھے۔ انھین ہندوستان کی زبان ہندوستان کی معاشرت ہندوستان کا موسیقی۔ ہندوستان کا مذہب۔ غرض یہان کی ہر چیز پسند تھی۔ اور انھون نے ہر چیز مین باہمی اتحاد اور ربط و ضبط کی کوشش کی۔ یہی نہین کیا کہ فارسی و ہندی دونون زبانون مین کمال پیدا کر کے سخن آفرینی کی۔ بلکہ اُنھون نے دونون جگہ کے علوم و فنون کے ساتھ دونون زبانون کو بھی ملایا۔ اور فارسی و ہندی الفاظ کو باہم مربوط کر کے اس مین نئے نئے جوڑ پیوند لگانا شروع کیے۔ ایک منظوم کتاب مین عربی فارسی اور ہندی کے ہم معنی اور مترادف الفاظ جمع کر دیے۔ جو خالق باری کہلاتی ہے۔ اور اگلے نصاب تعلیم مین داخل تھی۔ اِس کتاب مین مختلف لفظون کو ایک سلسلے مین منظوم کرنا ہی بجائے خود اُن کو باہم ملانا اور جوڑنا تھا۔

اِس کے بعد ہندوؤن نے فارسی پڑھ کے سلطنت کے دفاتر فارسی مین ملازمت شروع کی۔ اور اُسی کے مقابل بعض سلطنتون نے اپنے دفترون کو خالص ہندوستان کی وطنی زبان مین رکھا۔ اور مسلمان ملازمت کے لیے یہان کی وطنی زبان علمی حیثیت سے سیکھنے لگے۔

یہ تمام باتین صاف طور پر بتا رہی ہین کہ ان دونون مسلمانون اور ہندوؤن مین یہان میل جول اور ربط و ضبط کس قدر بڑھ گیا تھا۔ اور اِس ربط و ضبط اور اتفاق و یک جہتی کا پھل جو قیامت تک ہمارے گزشتہ اتحاد کو نہ بھولنے دے گا۔ وہ ہماری اُردو زبان ہے۔ اُس کا ٹھنا دراصل اُس مبارک عہد کی یادگار سمجھا جاتا ہے جب ہم دونون مین دوستی کے درجے سے بڑھ کے عزیزداری و قرابت کا رشتہ خوب مضبوطی کے ساتھ قائم ہو گیا تھا۔

ہر چیز کی تولید کے لیے والدین کی ضرورت ہے اور جس شخص یا جس چیز کی اصلیت کا پتہ لگانا ہو تو ہمین اُس کے حقیقی ماں باپ کو ڈھونڈھنا چاہیے۔ اُردو کے ماں باپ ہمین نظر آتے ہین کہ بھاشا اور فارسی ہین جو اُس وقت ہندوؤن اور مسلمانون کی زبانین تھین۔ بھاشا وہ اصلی زمین ہے جس مین یہ پودا اُگا۔ اور جس کی آب و ہوا مین اس کا نشو و نما ہوا۔ بمقابل اِس کے فارسی کو اس زبان کی ولادت مین باپ کی حیثیت حاصل ہے

جس نے تخم ریزی کی۔ اور زمین ہند کے بطن مین ایک نئے بچے کے لیے حیاتی مادہ پیدا کر دیا۔ جن لوگون نے مسئلۂ تولید مین غور کیا ہو وہ بخوبی جانتے ہین کہ ہر بچے مین جس قدر زیادہ اثر مان کا ہوتا ہو باپ کا نہین ہوتا۔ اُس کا سارا جسم تمام اعضا۔ گوشت پوست رگ پٹھے سب ان کے ہوتے ہین ایک فنا سن کی طرح پدری نطفے کے امتزاج سے اُس مین بعض پدری خصائل و عادات مخفی و مستتر رہا کرتے ہین۔ جو اکثر ثبوت دے دیا کرتے ہین کہ کس باپ کا بچہ ہو۔ اور اسی بنا پر مشہور ہے کہ "الولد سر لابیہ"

یہ دونون اثر اُردو زبان مین صاف نظر آ رہے ہین۔ اصلی ڈھانچہ۔ نظام نحوی۔ اصول اشتقاق سب خالص ہندی اور بھاشا کے ہین۔ فارسی و عربی الفاظ عزیز و پسندیدہ مہمانون کی طرح آ کے اس طرح مل گئے کہ یک جان دو قالب ہو گئے ہین۔ آخر زمانے مین بہت سی فارسی کی بندشین بھی پوری پوری ترجمہ کر کے زبان مین شامل کر لی گئی تھین بلکہ بعض شعرا نے یہانتک کیا کہ اُن فارسی بندشون کو اُسی فارسی ترکیب سے اُردو مین نقل کر لیا۔ لیکن غور سے دیکھیے تو وہ بندشین بالکل بے ربط ہین۔ اور اسی وجہ سے زبان مین کبھی نہ شامل ہو سکین۔ انشاء اللہ خان۔ اور مظہر جانجانان کی جو گفتگو مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے آب حیات مین نقل کی ہو اُسے پڑھکر حیرت ہوتی ہو کہ اُن دنون فارسی لفظون کے ساتھ فارسی بندشون کو بھی لوگ کس بے احتیاطی سے گفتگو مین شامل کر دیتے تھے۔ سید انشا کہتے ہین "ابتدائے سن صباسے تا اوائل ریعان اوراوائل ریعان سے الی الآن اشتیاق مالا یطاق تقبیل عتبۂ عالیہ کا رکھتا تھا کہ سلک تحریر و تقریر مین منتظم ہو سکے"۔ مرزا صاحب جواب دیتے ہین "اپنے تئین کو ان بھی بہ طفلی سے تجھ ایسے اشخاص کے ساتھ موانست اور مجالست رہا کی ہو"۔ اِس قسم کی چند بندشین مرزا غالب کے بعض شعرون مین بھی ہین لیکن اُن دنون لوگون کی زبان سے ایسی ترکیبین محض اس وجہ سے نکل جاتی تھین کہ درباری زبان فارسی تھی۔ فارسی شعروسخن اور ایرانی ادب کی مہذب صحبتون مین زیادہ قدر تھی۔ فارسی دانی کا اظہار بات کرنے والے کی علمی قابلیت کا ثبوت سمجھا جاتا تھا۔ اور لوگون کو اپنی لیاقت ظاہر کرنے کے شوق مین اِس کا خیال نہ رہتا کہ فارسی کے استعمال مین ہم کہان تک بے احتیاطی کر رہے ہین بعینہ جس طرح آج کل اکثر انگریزی دان حضرات انگریزی لفظون اور جملون کے استعمال مین بے احتیاطی کیا کرتے ہین۔ اسی کا یہ نتیجہ ہو کہ فارسی کا دور ختم ہوتے ہی اُس قسم کی تمام بندشین زبان سے نکل گئین۔ اور چھن چھنا کے وہ زبان باقی رہ گئی جس کا ماخذ چاہیے کہین سے ہو مگر اب اُردو ہو اور خالص اُردو۔

مین خیال کرتا ہون یہ اصول معلوم ہونے کے بعد کہ اُردو کا اصلی ڈھانچہ ہندوستانی ہو۔ اور اُس مین فارسی و عربی الفاظ کا فقط ضامن پڑ گیا ہو یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہو کہ اُردو مین ہندی و سنسکرت اور فارسی و عربی کو کس حد تک کتنا اور کس قسم کا تصرف کرنے کا حق حاصل ہو۔ اُردو کے ساتھ مذکورہ بالا زبانون کا رشتہ معلوم ہو جانے کے بعد یہ مسئلہ بہت بااصول طریقے سے صاف ہو جاتا ہو۔ اس کی بندشون نحوی ترکیبون ترتیب الفاظ۔ افعال کی گردانون صفات و روابط کے استعمال اور ضمائر و صفات سے کام لینے مین دخل دینا خاص سنسکرت اور بھاشا کا حق ہو۔ اُس مین اگر عربی زبان دخل دے تو وہ زبان کو بنا دے گی نہین بلکہ بگاڑ دے گی۔ اِس لیے کہ اُردو کا اصلی ڈھانچہ بھاشا و سنسکرت سے ماخوذ اور اُنھین کا بنایا ہوا اور بالکل آرین اصول کا ہو۔ فارسی کو اس مین دخل دینے کا کسی قدر حق ہو سکتا تھا۔ اِس لیے کہ وہ بھی آرین زبان ہو۔ مگر اُس کا کیا علاج کہ اُردو کا اشتقاق اور اُسکی نحوی ترکیبین بالکل بھاشا کے مطابق ہین سو ہی عربی اُسے تو اُس مین دخل دینے کا مطلق حق

ہی نہین ہو۔ بمقابل اِسکے عربی کو ترتیب و اصول نحوی چھوڑ کے صرف یہ حق حاصل ہو کہ اپنے ذخیرۂ الفاظ مین سے اُردو کو نئے نئے الفاظ دے۔ اس لیے کہ ولدیہ زبان مین اُس کا جو پہلا ضامن پڑا تھا اُس نے اُردو کی بندشون مین عربی الفاظ کو مہمان عزیز اور مانوس بنا دیا ہو اور جسطرح ہر باپ کو حق ہو کہ اپنے فرزند کو اپنے علمی و ادبی فنون سکھائے اسی طرح عربی کو حق ہو کہ اُردو کے لیے نئی اصطلاحین مہیا کرے اُسکے ذخیرے مین اپنے الفاظ سے وسعت و شائستگی پیدا کرے۔ اور دنیا کو دکھائے کہ یہ بچہ اگرچہ ہندی ماں کے بطن سے پیدا ہوا ہو مگر میرا فرزند ہو۔

آپ ملاحظہ فرماتے ہین کہ اُردو مین زبردستی چاہے جس زبان کے اسم ٹھونسے جائین مگر ربط نہین کھاتے اِس کے فطری اوزان سے باہر پڑتے ہین۔ و عربی الفاظ اس مین آتے ہی اُس کے سانچے مین ڈھل جاتے ہین۔ اور یہ امتیاز کرنا دشوار ہوتا ہو کہ وہ خالص اُردو لفظ ہین یا عربی سے لیے ہوے۔ اِس لیے جس طرح عربی و فارسی کے لیے یہ ناجائز ہو کہ اُردو کی نحوی ترکیبون اور بندشون مین دخل دین۔ اسی طرح بھاشا اور سنسکرت کے لیے ناجائز ہو کہ اِس زبان کے ذخیرۂ الفاظ مین ایسے غیر مانوس الفاظ داخل کرین جو اُس کے فطری اوزان اور تلفظ و نوعیت کے خلاف ہین۔

لیکن دونون کے حدود مقرر کر دینے کے بعد مین یہ کہنے پر مجبور ہون کہ زبان اُردو کا جو کھٹا دراصل سنسکرت اور بھاشا کا بنایا ہوا ہو اِس لیے یہ زبان خالص آرین زبان ہو۔ اور عربی و فارسی نے فقط اُسے اپنے خوبصورت الفاظ کا زیور و لباس پہنایا ہو۔ اس بنا پر مدت دراز سے میری راے ہو کہ جو لوگ اُردو نحو و صرف مرتب کرنے مین عربی قواعد زبان سے مدد لیتے ہین سخت غلطی مین مبتلا ہین۔ عربی کے قواعد ہماری زبان مین ہرگز پورے نہین اُتر سکتے۔

نحو و صرف کی اصلی عمارت افعال کی بحث پر قائم ہوا کرتی ہو۔ عربی اور میرا خیال ہو کہ تمام سامی زبانون مین فعلون کا اشتقاق بغیر کسی دوسرے فعل کے ملائے فقط ایک حرف کے بڑھانے گھٹانے یا حرکتون کے بدل دینے سے ہو جاتا ہو بخلاف اسکے آریہ زبانون مین بغیر کسی دوسرے فعل یا لفظ کے ملائے پورا اشتقاق نہین ہو سکتا۔

اسی طرح نحو اُردو کے صدہا مسائل ہین جن کے بیان کرنے کا وقت نہین ہو مگر وہ سب ثابت کرتے ہین کہ اُردو آرین زبان ہو۔ سامی نہین۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ثابت ہو جاتا ہو کہ اِس زبان کو جو اُنس اور جیسا اتحاد بھاشا اور سنسکرت سے ہو فارسی و عربی سے نہین۔ اور اسی کا یہ نتیجہ ہو کہ اُردو سے اگرچہ ہندو و مسلمان دونون کو قریبی تعلق ہو اور دونون اُس کے پیدا کرنے والے ہین مگر ہندوؤن کا تعلق زیادہ مضبوط اور بہت بڑھا ہوا ہو۔ ساری دنیا جانتی ہو کہ اولاد کے ساتھ جو محبت ماں کو ہوتی ہو باپ کو نہین ہو سکتی۔ لہذا صحیح یہ ہو کہ اپنی ماں کے اس فرزند کے ساتھ ہندوؤن کو بمقابل مسلمانون کے زیادہ محبت ہونی چاہیے جو اُسکے علاتی بھائی ہین مگر بخلاف اس کے ہم دیکھتے ہین کہ اکثر ہندو احباب نے اس کی طرف سے بے پروا ہو کے سرد مہری اختیار کر لی ہو۔

اس مین شک نہین کہ اس مین ہمارا بھی قصور ہو جب ہندوؤن نے ہندی کے درست کرنے اور ترقی دینے کی کوشش شروع کی تو ہم نے ہندی کو اُردو کی ایک رقیب زبان خیال کر کے یہ غلط دعوی کیا کہ اُردو ہماری زبان ہو اور ہندوؤن کی نسبت یہ تسلیم کر لیا کہ اُنھین اُردو سے اور اُردو کو اُن سے کوئی تعلق نہین۔ حالانکہ واقعہ یہ ہو کہ اُردو کا جسقدر حق ہندوؤن پر ہو اور جیسی محبت انھین اِس کے ساتھ ہونی چاہیے وہ بہ نسبت ہمارے متعلقات کے بہت زیادہ ہو۔ لیکن ہمارے اِس غلط دعوے کا یہ نتیجہ ہوا کہ قوم ہنود ہم سے اور زیادہ

گرم جوشی سے اُردو کی مخالفت شروع کر دی۔ اور یہ مسئلہ متعصبانہ طریقے پر روز بروز زیادہ ناگوار صورت پیدا کرتا گیا۔ مگر مین کبھی اس کو باور نہ کرون گا کہ ذی فہم اور متین و سنجیدہ ہندو حضرات ایک گھڑی کے لیے بھی اس بات کو جائز رکھتے ہون گے کہ اُردو کو کسی قسم کا نقصان پہنچے۔ اُنھین اُردو کا درد ہم سے زیادہ ہونا چاہیئے۔ اور یقیناً اس بات کو وہ کبھی گوارا نہ کرین گے کہ جس زبان نے پنڈت دیاشنکر نسیم اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ایسے صاحب کمال سخن سنج پیدا کیے جس مین ہزارہا نہین لاکھون ہندو شعرا و ادیب سخن آفرینی کے جوہر دکھا چکے ہین۔ اُسے ہملے ہندو دوست دشمن کی نظر سے دیکھتے ہون گے۔

اب وقت ہو کہ ہندو اور مسلمان اس اپنی پیدا کی ہوئی زبان کے سر پر اتفاق یک جہتی سے اپنا شفقت کا ہاتھ رکھین۔ اور ہماری حماقتون سے جو غلط فہمیان پیدا ہو گئی ہین اُن کو دور کرین اور دونون مل کے اس خوبصورت بچے کی پرورش کرین۔ جو اُنکے اگلے اتحاد کی زندہ برکت ہو۔ اور اُنھین کے آغوش مین کھیل کے ترقی کے درجے کو پہنچا ہو۔

بس اسی تمنا و آرزو پر مین آپ حضرات کی سمع خراشی موقوف کرتا ہون لیکن آخر مین اتنا کہے بغیر نہین رہ سکتا کہ اگر آپ اُردو زبان کے پیچھے ہو رہین تو ہندو مسلمانون مین اتفاق پیدا کرنے کی کوشش کیجیے۔ ورنہ وہی انجام ہوگا جو ماں باپ کی باہمی لڑائی اور جھگڑے فسادے اُن کے بچون کا ہوا کرتا ہو۔

خیالاتِ پریشان

یادش بخیر لکھنؤ، ماہ دسمبر میں "ایک عشرت کدہ بنا ہوا تھا اسکے چپہ چپہ میں دل کو کھینچ لینے کی جو تاثیر ہمیشہ سے ہے وہ اس مہینے میں پورے طور پر اپنی کہربائی طاقت کو کام میں لاتی تھی۔ سارا ہندوستان چاروں طرف سے اُمنڈا آیا تھا اور ہر طرف ایک میلا سا لگا نظر آتا تھا۔ اس کشش سے متاثر ہونا ہمارے لیے بھی ناگزیر تھا۔ اُدھر احباب کو بھی اصرار کا موقع ہاتھ آیا مخطوط ادبی کی وہ بھرمار رہی کہ بے لکھنؤ آئے چارہ کار نظر نہ آیا۔ آئے تو تھے کانفرنس دھیوں کی شرکت کے بہانے بچھڑے ہوئے دوستوں سے بھی خوب جی کھول کر مل لیتے لیکن آہ! یہ وہ حسرت ہے جو کبھی پوری ہونے والی نہیں۔

بہر حال اس موقعہ پر جہاں تک ممکن ہوا دلچسپی سے وقت گزارنے کی کوشش کی گئی برسوں اور مدتوں کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ دل و دماغ کثرتِ کار کی اُلجھنوں اور کشاکش سے فارغ اور ہجوم تردّدات و افکار سے آزاد تھا لیلائے کتاب کا دیوانہ جسکو بغیر کتاب دیکھے نہ معلوم ہو یہ کچھ اسکی قدر کر سکتا ہے۔ مگر کتاب تا کجا؟ آخر ایک دوست سے کہا کہ بھائی جاڑوں کی پہاڑ سی راتیں تنہائی و بے شغلی سے کاٹے نہیں کٹتیں، کوئی کتاب ہی دیکھنے کیلئے دیجئے انھوں نے بہت سے نام بتائے پر خیال تر دریائے لطافت کو لے لیا جسکے مصنف سید انشاء و مرزا قتیل کی نامی ہستیاں ہیں یہ قواعد صرف و نحو کی کتاب ہے مگر علم معانی و بیان و بدیع اور بہت سی مفید باتیں اس میں جمع کی گئی ہیں۔ یہ نادر کتاب چھپوا کر انجمن ترقی اردو نے ملک پر جو احسان کیا ہے وہ بڑے شکریہ کا مستحق ہے۔ بہر حال کتاب کو بڑے شوق و ولولہ سے آخر تک پڑھا اور

جسقدر کتاب کے وجود مین آنیکی مسرت ہوئی اُسیقدر بعض خیالات سے رنج بھی ہوا افسوس ہیکہ ہمارے پاس شیرین زبان ہی جسکی عمر بہت چھوٹی نہین ہی سیکڑون شاعر و ادیب اُسنے پیدا کیے لیکن بدقسمتی ہی کہ جس طریقے اور موضوع پر دریاے لطافت تصنیف کی گئی ہی ملک مین اور کوئی ایسی کتاب اُردو کی موجود نہین ہی اور کسی سے اتنا ہوا کہ اِدھر توجہ کرتا صرف دکن مین البتہ سکرٹری صاحب انجمن ترقی اُردو نے ایک بسیط و مفصل کتاب لکھی ہی مگر علم ادب اور نظم و نثر سے جو فنون لطیفہ اور علوم تعلق رکھتے ہین اُن مین کوئی ایسی کتاب نہین لکھی گئی جو مجموعی حیثیت سے انشا پردازی اور علم ادب کی تمام ضرورتون کو پورا کرتی ہو علم بیان و معانی و بدیع پر ضرورت ہی کہ ایک مستقل کتاب نہایت مفصل اور شرح تیار کی جائے جو تمام لوازم کو حاوی ہو۔ ایسے چھوٹے چھوٹے رسالے تو کئی نظر سے گذرے جن مین اختصار کے ساتھ ان علوم سے بحث کر دی گئی ہے، مگر وہ بھی فارسی و عربی کی تقلید مین ورنہ اور کچھ بھی نہین۔ فارسی کے قواعد کی کتابون مین بھی مختصراً اِن باتون کا ذکر آجاتا ہی۔ اس وقت تک اُدھر کسی کا خیال نہ گیا اور کسی شاعر و ادیب نے بھی اِس کی ضرورت محسوس نہ کی اور اب جو انجمنین ترقی اُردو کی خدمت کے لیے جابجا قائم ہو رہی ہین یا ہو چکی ہین اُن سے بھی توقع نہین کہ انگریزی ترجمون سے فرصت ملے۔ یہ صرف ہم لوگون ہی کا کام ہے کہ ایک ضخیم و بسیط کتاب ان علوم پر اُردو مین تیار کرین۔ اس وقت بھی ہندوستان مین اُردو کے ہزارون شاعر و علم ادب کے نام لیوا موجود ہین لیکن کتنے ایسے ہون گے جو اچھی طرح عروض جانتے ہون، علم قافیہ سے واقف ہون، اور معانی و بیان و بدیع پر اُن کو عبور حاصل ہو، زبان کی فصاحت و بلاغت کو سمجھتے ہون، اُس کا کوئی معیار اُن کے ذہن مین ہو۔ میرے خیال مین مشکل سے صرف چند ایسے لوگ نکل آئین گے ورنہ اکثر موزون طبع ہین۔ قدرت سے ایک طاقت دی گئی ہی اُس کو کام مین لانے کے سوا اور کچھ نہین جانتے۔

کاش! کوئی صاحب ہمت کر کے اس میدان مین قدم رکھین۔ اور بہتر ہوگا کہ یہ کام لکھنؤ مین کیا جائے۔ یہان نسبتہً آسانی رہے گی اول تو یہان ہر علم و فن کی کتابین بکثرت میسر آسکتی اور آتی رہتی ہین۔ پھر اُردو زبان کا یہ ایک صدر مقام و مرکز بھی ہے" اور اِس وقت جس قدر شعرا لکھنؤ مین ہین دعوے سے کہہ سکتا ہون کہ ہندوستان کے کسی بڑے سے بڑے شہر مین بھی اتنے نہ ہون گے۔

بہرحال عربی، فارسی، اُردو کی موجودہ کتابون کی مدد سے اگر لکھا جائے تو بہت کچھ کامیابی کی امید کی جا سکتی ہے۔ اِس مشکل کا آسان ہونا کچھ زیادہ دشوار نہین ہے۔ میرے خیال مین صرف ایک ماہانہ مشاعرہ کر دینا کوئی چیز نہین ہے اور نہ اس قسم کے جلسے تفریح کے سوا کچھ نتیجہ خیز اور مفید عام ہو سکتے ہین۔

اِسی دوران مین ایک اور خیال پیدا ہوا، اور وہ کس قدر دل دکھانے والا ہی۔ مین نے بچشم خود دیکھا ہے کہ قدیم مطبوعہ اور قلمی نایاب دواوین اور نادر اُردو و فارسی و عربی کتب کا ذخیرہ نخاس مین کوڑیون کے مول فروخت ہوا کرتا ہے۔ اس طرح سیکڑون عمدہ عمدہ کتابین ناپید و منتشر ہو گئین۔ کاش لکھنؤ مین کوئی ایسا کتبخانہ ہوتا جو ان جواہرات گران مایہ کو لٹنے سے بچاتا، اور کم سے کم اساتذہ کے دواوین و تذکرہ جات اور اُردو کی قدیم تصانیف یکجا نظر آتین۔

اب بھی اگر یہ خیال قوت سے فعل مین آجائے تو بہت کچھ کامیابی کی امید کی جا سکتی ہے۔ یہ ایک خاص قسم کا کتبخانہ ہوگا جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے بے مثل و لاجواب کہا جا سکیگا۔ ورنہ بہت کچھ مٹ چکا ہے اور جو کچھ ہے وہ مٹا جا رہا ہے۔ البتہ یہان یہ کہنا ضروری ہے کہ نولکشور پریس نے جو احسانات اُردو زبان بلکہ علمی دنیا پر کیے ہین، وہ کبھی فراموش کرنے کے لائق نہین۔ اُن کو بھول جانا کفران نعمت اور ایک ناقابل معافی گناہ ہی۔ سچ تو یہ ہے

کہ اگر اپنے تجارتی اغراض سے ایک بڑا کثیر سرمایہ اس نے نہ لگا یا ہوتا تو ہمارے قدیم اساتذہ کے دیوان اور تصانیف بالکل معدوم ہو چکے ہوتے اور ڈھونڈھے کہیں نہ ملتے۔ یہ کیا کم احسان ہے کہ ایک چیز میسر آجاتی ہے گو یہ پریس اپنی خراب اور غلط چھپائی میں بھی بدنام ہو گیا ہے، تاہم آپ کلیات میرہی کو لے لیجیے۔ میر کو خدائے سخن آپ کہتے ہیں، مگر سچ بتایئے کہ اُس کے لخت جگر یعنی کلام کی آپ نے کیا قدر کی؟ کیا یہ شرم کی بات نہیں کہ نہایت سٹرے کاغذ پر غلط سلط اور بدخط چھپا ہے اور آج تک کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ پورا کلیات نہ سہی، اُس کا انتخاب ہی ایک نہایت عمدہ صورت سے پوری صحت کر کے چھپوا یا جاتا۔ کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی اور یورپ کے مستشرق پریسوں سے سبق لینا چاہیے، جو سیکڑوں نسخوں سے صحت کر کے کس قدر عمدہ طور پر نایاب و نادر عربی، فارسی کتابیں ہزاروں لاکھوں روپیہ صرف کر کے طبع کراتے ہیں، اور وہ کتابیں بڑی بڑی قیمتوں پر ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہیں۔ لیکن ہماری بدنصیبی دیکھیے کہ قدیم مصنفین کی کتابوں کو ردی کے مول خریدنا اور دیکھنا بھی وبال جان سمجھا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس قوم و ملت میں اسلاف پرستی نہیں وہ کبھی شاہراہ ترقی پر نہیں آسکتی اور وہ قعر فنا کی طرف جا رہی ہے۔ یہ وقت ہے کہ ہم جس طرح یورپ کی اور بہت سی بیہودہ باتوں میں تقلید کرتے ہیں، ان مفید و کار آمد باتوں میں بھی پیروی کریں، اور علمی دنیا میں اپنے کو شرمندہ نہ ہونے دیں، دنیا میں غیرت و حمیت اگر کوئی چیز ہے، اور علم دوستی اگر کچھ اصلیت رکھتی ہے، تو بہتر ہے کہ اب بھی ہم خواب غفلت سے چونکیں، اور کھیل کود کی باتوں کو چھوڑ کر ادھر ہمتیں مبذول کریں۔ وقت کی رفتار برق کی رفتار سے کم نہیں۔ دن گزرتے جاتے ہیں، اور مشکلوں میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اگر ہم محنت کریں تو بہت کچھ ذخیرہ نایاب ہاتھ آسکتا ہے۔ افسوس ہم کو یہ خبر نہیں کہ قوموں کی ذہنی و مادی و روحانی ترقی کا اصلی راز یہی ہے کہ اسلاف کے کارناموں کی قدر کی جائے اور اُن کی یاد زندہ کی جائے۔ ہم دیکھیں کہ وہ کیا کر گئے اور کیا کرتے تھے جو دنیا میں اسقدر مقبولیت حاصل کی۔ ہم بھی وہی کام کیوں نہ کریں جس سے دوامی عزت حاصل ہو۔ مصر و شام میں جب تک یہ خیال پیدا نہ ہوا عربی کا لاجواب ذخیرۂ علوم و فنون مٹتا چلا گیا۔ ہزاروں لاکھوں جواہرات خاک گمنامی میں مل گئے۔ بعض کے نام رہ گئے، اور اکثر کے نام بھی معلوم نہیں۔ مگر یورپ کی تقلید میں کوشش ہو رہی ہے کہ قدیم تر تصانیف تلاش کر کر کے محنت و صرف زر کر کے جس طرح بھی ممکن ہو ملک میں شائع کی جائیں۔ مصر و شام پھر بھی پیچھے ہیں۔ جرمن اور فرانس نے اس قسم کی مساعی میں سب سے زیادہ حصہ لیا ہے اور ان دونوں سلطنتوں نے بڑی بڑی رقمیں احیاء علوم کے لیے صرف کر ڈالی ہیں محض علم پروری کے لیے طبقات ابن سعد جو تاریخ کی ایک مشہور و لاجواب کتاب ہے اور (دنیا میں مفقود تھی) جرمنی کے ایک مستشرق پروفیسر نے تقریباً بیس سال کی لگاتار محنت سے اُس کو بہم پہنچا کر طبع کرایا اور قیصر جرمنی نے جواب خون خوار مشہور ہے ایک لاکھ روپیہ صلہ میں دیا۔ اس طرح فرانس اور جرمنی کے علاوہ یورپ کے دیگر مقامات میں بھی بڑے پیمانے پر یہ کام ہو رہے ہیں۔ ہالینڈ میں ایک بہت بڑا پریس "بریل" ہے جس نے سیکڑوں ہزاروں عربی و فارسی کی قدیم و نایاب کتب بہم پہنچا کر اور متعدد نسخوں سے صحت کر کے طبع کر ڈالیں گیبن موریل سیریز خاص طور پر دیکھنے کے قابل ہے اور جس طرح انگریزی کتابیں جلد کی عمدگی اور نفاست طبع کے لحاظ سے بھی لائق دید ہوتی ہیں ویسے ہی یہ عربی و فارسی کی کتابیں بھی ہیں۔ بخلاف اس کے

ہمارے لائق علم دوستون کی یہ حالت ہے کہ اگر کوئی ایسی نادر کتاب پا بھی جاتے ہین تو اُس کو ہوا بھی نہین لگنے دیتے خواہ اُن کے بعد اُس کا حشر کچھ ہی ہو مصر و بیروت مین اس کا خوب احساس ہوگیا ہے مگر ایشیا مین اور ممالک کی یہ حالت نہین ہے۔ وہان علاوہ قدیم علمی وادبی وتاریخی اور لغت کی تصنیفات کے ایام جاہلیت کے شعرا کے دواوین کس قدر محنت وتلاش کے بعد عمدہ وخوبصورت طبع کیے گئے ہین۔ انکی شرحین لکھی گئین قدیم مدق الفاظ جو تب کیے گئے اُن کا حل جابجا کیا گیا، اور تمام ملک مین اُن کی قدر کی جاتی ہو۔ لیکن ہماری حالت اس کے بالکل خلاف ہو۔ اگر ہم اُردو کو زندہ رکھنا اور علمی زبان بنانا چاہتے ہین تو ضرورت ہے کہ ایسے جواہر پارون کا کھوج لگائین لیکن افسوس! ہماری حالت یہ ہو کہ پُرانی کتابون کا پڑھنا بھی بار ہے اور کیونکر نہ ہو۔ ایک کلیات سودا بازار سے لے آیئے، اور پڑھنا شروع کیجیے سیکڑون اور ہزارون الفاظ ایسے ملین گے جن کو اور لوگ تو کیا اہل لکھنؤ ودلی بھی نہ سمجھ سکین گے، جن کو اہل زبان ہونے کا بڑا دعویٰ ہے۔ اُن کی شرحین لکھنا، محنت اور متعدد نسخون سے اُن کی صحت کرنا اور برسہا برس کی لگاتار محنت کے بعد عمدہ چھپوانا تو ایک ایسا کام ہے جس کا خیال بھی دل مین نہین پیدا ہوتا۔ پڑھنا اور دیکھنا ہی تضیع اوقات وفعل عبث سمجھا جاتا ہے۔ مگر ایسا سمجھنا نہایت لغویت اور ہماری کوتاہی خرد کی دلیل ہے۔ اس کا نتیجہ ہوا کہ روزمرہ کی بول چال مین انسان کو جن الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے وہی رہ گئے اور اب الفاظ کا دائرہ روز بروز تنگ ہوتا جاتا ہے۔ ہزارون نئے عربی، فارسی، انگریزی الفاظ اُن کی جگہ لیتے جاتے ہین۔ ہم یہ نہین کہتے کہ جدید علوم کی ترقیون کی ضرورت نہین یا نئی اصطلاحات کی حاجت نہین، مگر اس شعبہ سے بے اعتنائی کرنا بھی ہماری بدمذاقی کی دلیل ہے۔ کیا دُنیا کے سب لوگ ایک ہی کام کرتے ہین۔ یہ بالکل کارخانۂ قدرت کے خلاف ہے کوئی کسان ہے اور کوئی تاجر ہر ایک فرقہ کی خدمات کی نوعیت جداگانہ ہے۔ پھر ہم کو کیون نہ اِس اصل سے باخبر ہونا چاہیے!

یہ داستان ایک درد انگیز داستان ہے۔ کاش کوئی باہمت کھڑا ہو۔ اور ایک جماعت کو اپنا رفیق سفر بنا کر اس بحر مین اپنی کشتی ڈالدے۔ مایوسی کی کوئی وجہ نہین۔ دُنیا کو اب نہین تو کبھی نہ کبھی ادھر توجہ کرنا پڑے گی مگر اُس وقت کام اور دشوار ہوجائے گا۔ اخلاف ہم اسلاف کی بے حسی پر نفرین کرین گے، اگر درحقیقت اُردو زبان کی قسمت مین عروج اور زندہ زبان بننا ہے تو یہ دن جلد آنے والے ہین۔ ورنہ ایک نہ ایک دن سبکو فنا ہے۔

آپ جانتے ہین اوس سے پیاس نہین بجھتی۔ دوسرے تیسرے دن پھر انھین دوست سے اور کتاب کی فرمایش کی گئی اور بہت سے نام سننے کے بعد خمخانۂ جاوید کو لے لیا۔ یہ ایک جدید تصنیف اور ضخیم تذکرۂ شعرا ہو۔ مین اخبارات مین اس کے ریویو بھی دیکھ چکا تھا اور عرصہ سے اشتیاق تھا۔ دیباچہ سے پڑھنا شروع کردیا۔ تذکرہ کی ضخامت دیکھکر تو خیال ہوا تھا کہ مدتون سے جو آرزو دل مین دبی تھی وہ آج پوری ہوگئی آب حیات کے بعد یہ تذکرہ اس کا تتمہ ہوا۔ اور اس مین شک نہین کہ ہندوستان کی عام زبان اُردو کا یہ اتنا بڑا تذکرہ ہے کہ نہ اس سے بڑا لکھا گیا اور نہ امید ہے کہ آیندہ لکھا جائے۔ مگر افسوس ع

ما درچہ خیالیم وفلک درچہ خیال

اس کے دوران مطالعہ مین جو خیالات پیدا ہوے اُن کا ذکر بھی کرنا مناسب ہے۔

دنیا کی ہر ترقی یافتہ وعلمی زبان میں شعر و سخن کو ادبیات وعلوم کا ایک جزو قرار دیا گیا ہے۔ اس کی خدمت کرنا اپنی قومی ہستی کا ایک ضروری رض سمجھا گیا ہے۔ مگر بدنصیب اردو کی حالت اس کے خلاف ہے۔ س پر ہنسا جاتا ہے اور اس کی تحقیر کی جاتی ہے۔ اس میں جس قدر علیم یافتہ لوگوں کی زیادتی ہے اتنی نہیں تو کسی قدر شعرا کی پست خیالی اور بعض دوسری وضعداریوں کو بھی دخل ہے۔ شاعر سے ی رفتار بھی اگر زمانہ کی رفتار کے قدم بقدم ہوتی تو ہمیں اپنے بھائیوں کی گلہ مندی کا اتنا موقع نہ ملتا۔ اب تک بہت سی پرانی باتیں بدستور ہیں جن کو سنتے سنتے کان تھک گئے اور دل اکتا گیا ہم ہیں کہ انہیں پر اڑے ہوئے ہیں۔ دنیا کی رفتار، ترقی تو یہ ہے باہم خبر رسانی کے لیے تار اور "لاسلکی" یعنی بے تار کی تار برقی یجاد ہو چکی، اور رات دن اس سے کام لیا جاتا ہے۔ سیکڑوں وس سے تھوڑی دیر میں تبادلہ خیالات کر لینا ایک کھیل ہو گیا ہے گر ہمارے شاعر ابھی تک کبوتروں ہی سے پیغام رسانی کا کام لے رہے ہیں اور ہمیشہ جواب میں خون کبوتر یا قاصد کی لاش آتی ہے۔ سواری کے لیے موٹر سائیکل ریلوے ایجاد ہو چکے، دم بھر میں سیلوں میلوں کا سفر کر سکتا ہے، اور ہر موسم میں موٹر لینڈو کا ہونا داخل وضعداری ہو گیا ہے۔ مگر ہمارا شاعر جب بیابان کی خاک چھاننے جاتا ہے تو پابرہنہ اور پھر خار مغیلان اس کے پیروں کو اس قدر چھلنی چھلنی کر دیتے ہیں کہ چلنا دشوار ہو جاتا ہے یا چلتے چلتے چھالے پڑ جاتے ہیں کہ قدم اٹھانا غیر ممکن ہو جاتا ہے۔ بیچارہ قیس جس کو صحرا نوردی کا خاص ذوق ہے اور جس کا فرض زندگی اس کے سوا ہے ہی نہیں کبھی سواری پر سفر نہیں کرتا۔ یہ دیوانہ سواری کو کیا جانے! نی لیلےٰ ان کی چہیتی جب ان کی خاطر کسی دشت و وادی کی طرف جاتی ہیں تو ناقہ محمل ہی سے کام پڑتا ہے۔ خاک اڑتی جاتی ہے اور نی لیلے شتربان کے شتر غمزے اٹھاتی ہوئی اس کی ٹھوٹھو کرتی ہوئی راستہ سے پھیر کر منزل مقصود کی طرف لانے کی کوشش کرتی ہیں تاکہ میاں قیس سے ملاقات ہو جائے۔ اسی طرح یورپ میں سائنس نے حربیات اور فنون جنگ میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ بم پھینکنا، گیس چھوڑنا، مشین گن توپوں سے گولے برسانا، اور سیکڑوں طریقے ہیں، جن سے دشمن کو جلد سے سخت نقصان پہنچایا جا سکتا ہے لیکن بھلے سادہ دل وسادہ مزاج شاعر اور اس کے معشوق میں عجیب قسم کی لڑائی ہوتی ہے۔ معشوق تیر نظر اور تیغ ابرو اور مژگان کی سنانوں سے کام لیتا ہے۔ اپنے حریف کو اسیر کرنے کے لیے زلفوں سے مشکیں کس لیتا ہے، اور سخت سزا دینا مقصود ہوتی ہے تو ناگنوں سے ڈسواتا ہے، اور اس قسم کے سیکڑوں مفروضہ مظالم ہیں جو عاشق زار کی جان ناتوان پر کیے جاتے ہیں۔ اور جو اس کے خرمن جان کے لیے برق خاطف کا کام کرتے ہیں۔ اور مزا تو یہ ہے کہ شاعر صاحب مرنے کے بعد بھی چین نہیں پاتے قیامت تک فریاد کیا کرتے ہیں۔ مگر داور حشر کے یہاں بھی ان کی شنوائی نہیں ہوتی ہے۔ غرض ایسی بہت سی باتیں ہیں جن کو مبالغہ کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔

خیر یہ تو مذاق تھا۔ انصاف شرط ہے۔ تیر نظر میں جو بات ہے وہ مشین گن میں کہاں۔ زلف کی ناگنوں سے ڈسوانا جو مزہ رکھتا ہے وہ امریکہ کی جان سلب کرنے والی برقی مشین سے کب حاصل ہو سکتا ہے محمل کی سواری میں جو لطف میسر ہے وہ موٹر اور ریلوے میں کیونکر میسر آئے۔ اس کا فیصلہ مذاق سلیم پر منحصر ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ہم کو بھی اصلاح خیالات کی ضرورت ہے۔ بیان میں بھی جدت چاہیے اور مضامین میں بھی ندرت۔ سڑی گلی ہڈیاں کب تک جھنجوڑا کریں گے۔ ادھر گو غزل جان شاعری ہے مگر نزاکت خیال کا خیال بھی لازمی ہے۔

میرا ایک اور بھی خیال ہے۔ وہ یہ کہ ترتیب دواوین و تذکرہ کا پرانا طریقہ یہ ہے کہ ردیف وار غزلیں اور نام ہوتے ہیں یہ نہایت فرسودہ طریقہ ہے اور اس کی پابندی فضول ہے زمانہ وار ترتیب ہونا چاہیئے! اس میں بڑی خوبی یہ ہے کہ بلند و پست کلام یک جا نہ ہوگا اور شاعر کی تدریجی ترقی کا حال دیکھنے والے پر کھلتا رہے گا عجب مشکل ہے کہ ردیف وار ہونے کی وجہ سے سنہ ۱۲۹۰ھ اور سنہ ۱۳۲۰ھ کی کہی ہوئی غزلیں یک جا ہو جاتی ہیں۔ دونوں کو پڑھنے سے اس قدر فرق بین نظر آتا ہے کہ قوت فیصلہ کو بھی حیران ہونا پڑتا ہے اور اوھر خیال منتقل ہی نہیں ہوتا کہ ایک غزل تیس برس پہلے کی کہی ہوئی ہے ہندوستان ہی میں امیر خسرو کو لیجیئے جن کی شہرت نہ صرف ایشیا بلکہ یورپ میں بھی ہے انھوں نے اپنے دواوین کو زمانہ کے لحاظ سے مرتب فرمایا۔ ایک دیوان ابتدائی ہے، دوسرا شباب کا تیسرا ادھیڑ عمر کا، اور چوتھا بڑھاپے کا۔ یہ غالباً چار دیوان ہیں۔

ایک بڑی خرابی ردیف وار میں یہ ہے کہ خواہ مخواہ ردیفیں پوری کرنے کے لیے زبردستی غزلیں کہنا پڑتی ہیں۔ اور وہ اس قدر بے مزہ اور فضول بکواس ہوتی ہے کہ پڑھنا بھی ناگوار ہوتا ہے۔ خود شاعر کا جی نہیں چاہتا کہ شامل دیوان کرے مگر رسم کی پابندی مجبور کرتی ہے محض آورد اور ہبوٹ ہوتی ہے۔ حالانکہ شاعری جھوٹ کا نام نہیں بلکہ حقیقی جذبات کا اظہار بصورت نظم اور اُس کو خوبی سے ادا کرنا شاعری ہے۔ شاعری مرقع جذبات اور تصویر افکار کا نام ہے۔ جب تک اُس میں کوئی بات کوئی اثر نہ ہو (خواہ وہ اثر غم ہو یا اثر مسرت،) اُس وقت تک صحیح معنوں میں وہ شعر نہیں بلکہ محض کلام موزون ہے حالانکہ ؎

شاعری نام ہے جذبات کی موزونی کا!

اب تذکروں کو لیجیے۔ اُن کی حالت اور زیادہ افسوس ناک ہو اصلاح طلب ہے۔ میری نظر میں صرف آب حیات ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ اُس کو تذکرہ کہا جا سکے۔ ضرورت ہے کہ ملک میں آب حیات کے اور حصے شائع کیے جائیں اور اُسی قابلیت سے لکھے جائیں جس طرح کہ آب حیات لکھا گیا ہے۔ صاحب خمخانہ نے بھی محنت کی ہے اور تذکرہ نویسوں نے بھی۔ مگر اُس کو تذکرہ کہنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ باوجودیکہ مصنف صاحب ایم۔ اے اور تعلیم یافتہ ہیں مگر خمخانہ ایک نظم کہنے والوں کی فہرست مع نمونۂ کلام ہے۔ دنیا کی ہر زبان میں سیکڑوں برائے نام شاعر پیدا ہوتے ہیں لیکن وہ اور اُن کا کلام بہت جلد فنا ہو جاتا ہے جس شاعر کا کلام زندہ رہے وہی اصلی شاعر ہے۔ اور صرف ایسے ہی شاعروں کے حالات و تنقید کلام لکھنا تذکرہ نویس کا فرض ہے تخلص اور نام اور ایک دو شعر لکھنا تو معمولی سی بات ہے کسی گلدستہ میں کسی کا کلام دیکھا اور درج تذکرہ کر لیا یہ تذکرہ نویسی نہیں ہے۔ اور ردیف وار ہونے کی وجہ سے ایک عجیب خلط ہو گیا ہے کہ سنہ ۱۲۲۰ھ ہجری اور سنہ ۱۳۲۰ھ کے شاعر ایک جا نظر آتے ہیں اور کلام میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

قدرت کا ایک مقررہ قاعدہ ہے کہ جب تک باہم تناسب نہ ہو حسن و خوبی نہیں پیدا ہوتی۔ حسن در حقیقت بالفاظ دیگر تناسب کا نام ہے۔ مگر ہمارے تذکروں اور دواوین میں یہ بات کہاں ہے آئی! خمخانہ پر اعتراض میرا مقصود نہیں بلکہ عام مذاق دکھانا ہے اور اُس کا نام مثیلاً لیا گیا ہے۔ اگر ہم اور ہمارے خیالات میں جدت نہیں، تازگی نہیں، اور ہمیشہ پرانی لکیر کے فقیر بنے رہے تو یقیناً ہمارا لٹریچر (علم ادب) بہت جلد فنا ہو جائیگا اور جلد مردہ ہونیوالا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی بے اعتنائی اور قدیم روش کے بزرگوں کی وضعداری، پھر کسی سلطنت کا سرپرست نہ ہونا اور برادران وطن کی مخالفت، یہ ایسی باتیں ہیں جو بظاہر بے حقیقت معلوم ہوتی ہیں

اگر گہری نظر ڈالی جائے تو سارا راز طشت از بام ہو جائے گا: اور جو نظر پر نقاب پڑی ہوئی ہے وہ اٹھ جانے سے اصل حقیقت منکشف ہو جائیگی۔

اس سلسلہ مین مجھکو ایک اور رونا ہے وہ یہ کہ ہمارے شعراء اور مصنفین کی قبرین نہایت کس مپرسی اور بیکسی کی حالت مین ہین اور بے نشان ہوتی چلی جاتی ہین عمر خیام کے مزار کی حالت آپ کو معلوم ہو گا اب کیا ہے؟ وہان یورپ کے سیاحون کا ایک میلا سا لگا رہتا ہے۔ بڑے بڑے عالم سیاح آتے اور پھول چڑھا جاتے ہین ہزارون مضمون اس پر نکل چکے۔ اُس کے نام سے متعدد کلب قائم ہین۔ مگر ہمارے اسلاف کی روحین فاتحہ کی بھی محتاج ہین اور اکثر کی قبرین مٹ چکی ہین اور مٹتی جاتی ہین اور ہم ایک آنسو بھی نہین بہاتے۔ کاش ادھر توجہ کرین اور جو رہ گئی ہین اُن کی خبر لین بہت ممکن ہے کہ آگے چلکر اُردو بھی دنیا کی ایک علمی زبان ہو اور اُس کا لٹریچر زندہ قومون مین دلچسپی سے پڑھا جائے جس طرح عمر خیام کی زیارت کو امریکہ و یورپ سے سیاح نیشاپور آتے ہین۔ ممکن ہے کہ اُسی طرح کہین کوئی علم دوست انیس کی قبر کو ڈھونڈھتا لکھنؤ آنکلے اور غالب کا کمال دہلی کی طرف اُس کو کھینچ لائے۔ ہمارے ان مشاہیر کو بہت زیادہ زمانہ نہین گزرا مگر "وائے برحال ما" بعض کی قبرون کے نشان بھی نہین رہے اور رہے بھی ہین تو وہ اس قدر دھندلے ہین کہ مٹے ہی سمجھیے!

یہ ہے میرے پراگندہ خیالات کا مجموعہ جس کو مین العصر کے ناظرین کے آگے پیش کر کے ملک سے استدعا کرتا ہون کہ للہ ذرا توجہ کیجئے، خاصکر دہلی و لکھنؤ کے باحمیت و غیرت پسند شعراء و علم دوست صحاب سے جو اُردو کے حقیقی مگر بے حس و بے شرم اخلاف ہین۔ وہ اخلاف ہین جنکی آنکھین ابتک نہین کھلین یا نئی روشنی سے چوندھیا کر رہ گئی ہین۔ اور کچھ نہین۔

محوی (لکھنؤی)

الہ آباد یونیورسٹی اور اُردو زبان

مستند شہادتون سے اس کا ثبوت مِل چکا ہو کہ الہ آباد یونیورسٹی کے تمام شعبون مین ہمارے ہندو بھائیون کا کتنا غلبہ ہو؟ اور کس طرح ہمارے برادران وطن کو ان صوبجات کے تعلیمی نظام مین عملی طور پر وہ فوائد بمقابلہ ہمارے بڑی حد تک حاصل ہین جو کاشی جی مین ایک جداگانہ قومی یونیورسٹی کے اجرا کے محرک ہوے ہین ایسی حالت مین الہ آباد یونیورسٹی کا اُردو کے ساتھ جس کو غلطی سے آنریبل پنڈت مدن موہن مالوی اور اُنکے دوسرے پیرون نے صرف مسلمانون کی زبان سمجھ لیا ہو، جو سلوک ہونا چاہیے وہ محتاج بیان نہین ہو۔ مگر جب تک الہ آباد یونیورسٹی اپنے آپ کو ان صوبجات کی ساری آبادی کی تعلیم کا ذمہ دار بتلاتی ہو اور اُسکے ساتھ ہی وہ ایک غیر قومی جماعت کہلاتی ہو۔ اور اپنی اغراض و مقاصد کا تعلق ہندوون اور مسلمانون کے ساتھ کاغذ پر یکسان ظاہر کرتی ہو اور سب آخری مگر اہمیت مین مقدم یہ ہو کہ جب تک صوبجات متحدہ کی گورنمنٹ کو اسکی عام نگرانی کا حق حاصل ہو۔ ہمارا فرض ہو کہ اسکی اصلاح مین کوشش کرین اور اُسکو صحیح معنی مین ہندو مسلمان عیسائی تمام فرقون کے لیے یکسان کارآمد بنوائین اور خصوصاً ہز آنر سر جمیس میسٹن کی چانسلری کے زمانہ مین جنھون نے اہل اسلام کی تعلیمی پستی پر توجہ فرمائی ہو یونیورسٹی مین تمام جماعتون کے فوائد کی یکسان حفاظت ہونے پر زور دین ہمین یاد ہو کہ آنریبل خواجہ غلام الثقلین مرحوم نے جن کا سا مخلص خادم قوم و ملک کو ملنا بظاہر نہایت دشوار معلوم ہو۔ الہ آباد یونیورسٹی کے متعلق ان صوبجات کی قانونی کونسل مین چند سوالات کیے تھے جن سے یونیورسٹی کے اندرونی معاملات پر مفید روشنی پڑتی تھی اسپر ہمعصر لیڈر الہ آباد نے جو مسلمانون کے اوبھرنے کی تمام جائز کوششون کو بدقسمتی سے ہندوون کے اثر و اقتدار کو صدمہ پہنچانے والا سمجھتا ہی خواجہ صاحب کی اس طرز عمل پر اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوے اکتوبر ۱۹۱۶ء کے ایک پرچہ مین لکھا تھا کہ " سمجھ مین نہین آتا کہ بعض معزز ممبران کونسل ان معاملات مین گورنمنٹ سے کیون سوال کرتے مین۔ یہ سوال کرنے والے عموماً آزادی اور ترقی کے حامیون مین سے ہین اور ہم خیال کرتے ہین کہ یہ قیاس بیجا نہ ہوگا

کہ یہ حضرات اس یونیورسٹی ایکٹ کے مخالف ہیں جو یونیورسٹی کو سرکاری اقتدار کے ماتحت رکھنا چاہتا ہے اور جو وہ اسکے جب ان کو یونیورسٹی کے کسی فعل یا فروگذاشت کے متعلق شکایت ہوتی ہے تو فوراً گورنمنٹ کو مداخلت کا مشورہ دینے کے لیے جھپٹ پڑتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ یہ شکایتیں یونیورسٹی کی سینٹ میں کی جائیں۔ ان خیالات کی بنا پر ہم آنریبل خواجہ غلام الثقلین سے ہمدردی نہیں کر سکتے جنھوں نے گذشتہ جلسہ کونسل میں چند سوالات یونیورسٹی کے اندرونی معاملات کی نسبت کیے۔ یہ سچ ہے کہ یہ حضرات سینٹ کے ممبر نہیں ہیں مگر ان میں منتخب ہونے کی صفات موجود ہیں اور اگر وہ پبلک کاموں کا بار اپنے اوپر زیادہ نہیں لینا چاہتے یا شکایات کے دور ہونے کا انتظار نہیں کر سکتے۔ تو اپنے دوستوں کے ذریعہ سے سینٹ میں سوال کرا سکتے ہیں۔ الہ آبادی لیڈر کے اس طریق استدلال پر تعجب ہونا چاہیے کیونکہ وہ الہ آباد یونیورسٹی میں ہندو عنصر کا ناجائز غلبہ قائم رہنا ضروری سمجھتا ہے۔ اور اس لحاظ سے جو کچھ اس نے لکھا ہے وہ ایک معنی میں ان لوگوں کی آواز ہے جو یونیورسٹی پر حاوی ہیں اور سالہا سال کی حکومت کے معاملات کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھنا اسی طرح اپنا حق سمجھنے لگے ہیں جس طرح انگلو انڈین اصحاب ہندوستان کے تمام انتظامی صیغوں پر اپنا اجارہ قائم رہنا قدرتی سمجھتے ہیں۔ اور ملکی باشندوں کو ان میں حصہ لینا اپنی حق تلفی سے تعبیر کرتے ہیں۔

یہ جتانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ الہ آباد یونیورسٹی کا اقتدار ملک کے جس حصہ پر قائم ہے اس میں اس رتبہ کا بہت بڑا حصہ شامل ہے جہاں اردو نہ صرف بطور مادری زبان کے بولی جاتی ہے بلکہ وہاں کی اردو ساری دنیا میں سند سمجھی جاتی ہے۔ لہذا اس علاقہ میں اردو کی تعلیم کا سب سے زیادہ انتظام ہونا چاہیے لیکن حیرت ہے کہ جتنا الہ آباد یونیورسٹی میں اردو کو حقیر سمجھا گیا ہے اتنا کسی دوسری یونیورسٹی میں نہیں سمجھا گیا۔ مدراس اور بمبئی کی یونیورسٹیوں میں اردو ایف۔ اے اور بی۔ اے تک مثل فارسی عربی سنسکرت اور لاطینی وغیرہ کے ایک مستقل مضمون کی حیثیت رکھتی ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی میں ایک دیسی زبان کا لینا لازمی ہے اور گو اردو اپنی شان کے موافق اہمیت نہیں رکھتی تاہم دوسری دیسی زبانوں کے ساتھ امتحانات یونیورسٹی میں ضرور شامل ہو جاتی ہے پنجاب یونیورسٹی میں ابھی تک اردو ایف اے اور بی۔ اے میں شامل نہیں تھی لیکن اب لڑکیوں کے لیے ایف۔ اے میں اردو کے رکھنے کا انتظام کیا گیا ہے اور اردو میں پروفیشنسی اور ہائی پروفیشنسی کے مستقل امتحانات بھی ہوتے ہیں جن میں تمام اشخاص حصہ لے سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں السنہ شرقیہ کے عام امتحانات سے بھی بالواسطہ اردو کو کچھ نہ کچھ حصہ پہنچ جاتا ہے۔ اس طرح پنجاب یونیورسٹی اگرچہ ان یونیورسٹیوں کے مقابلہ میں تو ضرور قابل الزام ہے جن میں زبان اردو بی۔ اے تک رائج ہے لیکن یہ فخر الہ آباد یونیورسٹی ہی کو حاصل ہے کہ اس میں اردو میٹریکولیشن کے امتحان پر ختم ہو جاتی ہے اور میٹرک میں بھی انگریزی سے اردو ترجمہ کا کوئی پرچہ نہیں تھا۔ کیا ارکان یونیورسٹی کا یہ خیال ہے کہ میٹریکولیشن کے امتحان تک اردو میں ہر طالب علم انتہا کا عالم فاضل ہو جاتا ہے کہ پھر یونیورسٹی کے اعلیٰ درجوں میں اس کو اردو سیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی؟ حالانکہ امر واقعہ اس کے سراسر خلاف ہے۔ اور خود ہمدم کے لیے انگریزی سے ترجمے کرانے کے سلسلہ میں ہم کو یہ ناگوار تجربہ ہوا ہے کہ الہ آباد یونیورسٹی کے میٹرک پاس تو کیا ایف۔ اے اور بی۔ اے پاس بھی اردو ترجمہ کی کافی لیاقت نہیں رکھتے۔ اور گو انگریزی کا مطلب سمجھتے ہیں مگر اس کو اردو میں ادا نہیں کر سکتے یا نہایت بھونڈے لفظوں میں ادا کرتے ہیں۔ برخلاف پنجاب یونیورسٹی کے جس کے انٹرنس پاس معمولی انگریزی ترجمہ سلیس اردو میں بآسانی کر سکتے ہیں اور خاصی اردو لکھتے ہیں۔ الہ آباد یونیورسٹی کی انتظامی مجالس میں نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان داخل ہیں لیکن جب وہ دیسی زبان کی اعلیٰ اہمیت کو کافی طور پر نہیں سمجھ سکتے تو ان کی مثال ان لوگوں کی ہے جو خود سوتے ہوں اور دوسرے سونے والوں کو

بنگالے کا کام اِن کے سپرد کیا جائے۔ اس لیے نئی نسل کے دماغون کی صحیح رہنمائی اور اُن کی علمی پرورش کسی طرح نہین کر سکتے۔ یونیورسٹی کی تعلیم ہمارے ملک مین نہایت ناقص ہے اور بے حد محنت کے بعد علم کا علمی فائدہ نسبتہً بہت کم ہوتا ہے۔ یہ حالت کافی طور پر ثابت کرتی ہے کہ ابھی تک ہم نے اس بات کو نہین سمجھا کہ ہمین کس قسم کی تعلیم کی ضرورت ہے۔ اور اس کے حصول کے بہترین طریقے کیا ہو سکتے ہین۔ جو طریقے ابتدا مین یونیورسٹیون کے قائم ہونے کے وقت پیش نظر رکھے گئے تھے وہ اسی طرح چلے آتے ہین اگر فرق ہوا ہے تو صرف یہ کہ طلبا کی مشکلات امتحانات مین پاس ہونے کے متعلق بڑھ گئی ہین اور مصارف مقابلۃً بہت زیادہ ہو گئے ہین۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ ہم وقت کا ساتھ دیتے۔ اپنی ضرورتون کے لحاظ سے اپنے طریقون مین تغیر و تبدل کرتے جاتے اور طلبا کے لیے بجائے مشکلات کے آسانیان پیدا کرتے اور ضروریات زندگی کے ساتھ ساتھ تعلیم کا خرچ گھٹاتے جاتے۔ تاکہ طلبا زیادہ تعداد مین تعلیم سے مستفید ہو سکتے۔ ایک ضروری اصول یہ پیش نظر رہنا چاہیے تھا کہ جون جون تعلیم ترقی کرتی جاتی، یونیورسٹی مین دیسی زبانون کی تعلیم بڑھتی جاتی۔ اگر یہ اصول سامنے رکھا جاتا تو اس وقت ہمارا لٹریچر اتنا مفلس نہ ہوتا۔ اور ہم اکثر علوم و فنون اپنی دیسی زبان کے ذریعہ سے پڑھا سکتے بہرکیف اب بھی اصلاح کے لیے کافی وقت ہے اور اِن یونیورسٹیون کو اُس مین قدم بڑھانا چاہیے جو ہندوستان کی مشترکہ زبان اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ زبان اردو کے حلقہ پر حاوی ہین۔ یہ فرض سب سے بڑھ کر الہ آباد یونیورسٹی پر عائد ہوتا ہے۔ اور افسوس ہے کہ اُس نے اس کی ادائگی مین بہت ہی سستی و غفلت کا ثبوت دیا ہے۔

کوئی معمولی عقل سے بہرہ ور انسان اس سے انکار نہین کر سکتا کہ دیسی زبان کی تعلیم ہر قوم کے لیے نہایت ضروری ہے اور وہ ملک کی تمدنی اور سیاسی زندگی پر بہت بڑا اثر رکھتی ہے۔ ماہرین کا اس پر اتفاق ہے کہ قوم کی ترقی زبان کی ترقی کے بغیر نہین ہو سکتی۔ جو لوگ یورپ مین ہندوستان کی یونیورسٹیون کے نظام اور نصاب تعلیم سے واقف ہین۔ وہ دیسی زبانون کی اہمیت پر ہمیشہ زور دیتے ہین۔ مسٹر تھیوڈور ماریسن نے جنکو ہندوستان کے طرز تعلیم کا طویل ذاتی تجربہ ہے کچھ عرصہ قبل انڈیا ہوس مین لکچر دیتے ہوئے اس مسئلہ کی تائید کی تھی۔ کہ ہندوستانی یونیورسٹیون مین تعلیم دیسی زبانون کے ذریعے ہونی چاہیے۔ آپ نے فرمایا کہ "ہمین ہندوستان مین ایسی یونیورسٹیان بنانی چاہئین جو دیسی زبانون مین تعلیم دین۔ اس سے انکار نہین ہو سکتا کہ انگریزی تعلیم ہندوستانیون کے حق مین مفید ثابت ہوئی ہے۔ اور مغربی خیالات نے ہندوستانیون کے دماغ کو ایک مفید راستہ پر لگا دیا ہے لیکن یہ اثر زیادہ مفید اور وسیع ہوتا اگر یہ خیالات مادری زبان کے ذریعہ سے شائع کئے جاتے۔ انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینے سے یہ نقصان ہوا ہے کہ ہندوستانیون کے علم اور خیالات سے اگرچہ تمام دنیا فائدہ حاصل کر رہی ہے لیکن خود ہندوستان کی زبانین استعمال کرنے والے لوگ اس سے بہرہ ور نہین ہو سکتے۔ طالب علم کے لیے ایک بڑی مشکل یہ بھی ہے کیونکہ اکثر الفاظ کے ٹھیک معنی دوسری زبان مین ادا نہین ہو سکتے۔ ہمین یونیورسٹیون مین دیسی زبانون کی توسیع و ترقی کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ وہ ہندوستانیون کے خیالات و جذبات کا صحیح ذریعہ بن سکین۔

اگر ہندوستانی اس معاملہ مین پوری سرگرمی سے کوشش کرتے اور گورنمنٹ ان کو کافی مدد دیتی تو اس وقت تک انگریزی کی صدہا کتابین ترجمہ ہو کر ہمارے لٹریچر کا جزو بن گئی ہوتین۔ اور اسی طرح عمدہ مفید اور اعلیٰ کتابین اور تخیل تیار ہو گئی ہوتین۔ پنجاب مین کرنل ہالرائڈ صاحب کی زیر سرپرستی مولانا محمد حسین آزاد مغفور اور مولانا حالی مرحوم نے لاہور کے بک ڈپو مین تھوڑے عرصہ مین کیسا عمدہ اور مفید لٹریچر جمع کر دیا۔ اسی طرح ایک صدی قبل کلکتہ مین ڈاکٹر گلکرسٹ صاحب نے ہندوستانی زبان کی تدوین کا کام بحیثیت پرنسپل فورٹ ولیم کالج شروع کیا

اور صرف اس زبان کی گریمر اور ڈکشنری ترتیب دی بلکہ اپنی زیر نگرانی دیگر قابل مصنفوں سے اُردو اور ہندی نثر میں کتابیں لکھائیں جیسے میرامن صاحب مولف چار درویش، سید محمد حیدر بخش حیدری مصنف طوطا کہانی، میر شیر علی افسوس مترجم باغ اُردو، میرزا علی لطف مولف گلشن ہند، منشی اکرام علی مترجم اخوان الصفا، سری للو لال جی مصنف پریم ساگر، یہی حضرات وغیرہم کے حلقۂ ادب کے برگزیدہ ارکین تھے۔ بمقابلہ اُس زمانہ کے آجکل اس قسم کی ادبی جماعتوں کی بہت زیادہ ضرورت ہے اور گورنمنٹ کی سرپرستی میں یہ کام بہت خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام پا سکتا ہے۔ باشندگان ہندوستان کا فرض ہے کہ یہ ضرورت ہر طریقے سے گورنمنٹ کے ذہن نشین کریں اور قوی امید ہے کہ گورنمنٹ نہایت فیاضی کے ساتھ مدد دینے کو تیار ہوگی۔ اگر ہندوستانی یونیورسٹیاں ڈگریوں کی ٹکسال بننے کے علاوہ کوئی ایسا کام بھی کرنا چاہیں جو ہندوستان کی آئندہ نسلوں کی تاریخ میں واقعی قابل قدر کہلا سکے تو وہ یہی کام ہے کہ وہ دیسی زبانوں کی توسیع و ترقی کو اپنا ایک اہم مقصد قرار دیں۔ افسوس ہے کہ اس وقت تک اس نہایت اہم کام کی طرف سے سخت غفلت برتی گئی اور سب سے زیادہ غفلت اس معاملہ میں جیسا کہ اوپر بیان گیا ہے الٰہ آباد یونیورسٹی کی طرف سے ظاہر ہوئی جس نے بجائے سابق غفلت کی تلافی کے حال میں اپنے طرز عمل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ آیندہ بھی اُس غفلت کو جاری رکھنا چاہتی ہے اور اس کو دیسی زبانوں کی اہمیت کا مطلق احساس نہیں ہے۔

بجائے اس کے کہ الٰہ آباد یونیورسٹی کی طرف سے دیسی زبانوں کی ترویج و توسیع کی تحریک ہوتی خود گورنمنٹ نے چند سال قبل یونیورسٹی سے اس کی تحریک کی۔ کیونکہ گورنمنٹ نہ صرف اس اصول سے واقف ہے کہ صحیح تعلیم صرف مادری زبان میں ہو سکتی ہے بلکہ اپنی رعایا کی بہبودی اور ترقی کی ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے بھی وہ اچھی طرح سمجھتی ہے کہ کسی قوم اور ملک کی ترقی کا بڑی حد تک اس کی زبان اور لٹریچر کی توسیع پر انحصار ہے اور گورنمنٹ کو اس میں مدد دینی چاہیئے چنانچہ گورنمنٹ نے الٰہ آباد یونیورسٹی کی توجہ اس معاملہ پر منعطف کرائی کہ وہ صوبجات متحدہ کی دیسی زبان کو ترقی دینے کے ذرائع پر غور کرے اور اپنی تجاویز سے گورنمنٹ کو اطلاع دے تا کہ جلد سے جلد عملی کام شروع کیا جا سکے۔ یونیورسٹی نے اس معاملہ میں کچھ عرصہ تک نیم دلچسپی سے چند ریزولیوشن پاس کئے اور آخر میں مسٹر گنگا ناتھ جھا فیلو الٰہ آباد یونیورسٹی کو یہ کام سپرد کیا گیا کہ وہ ایک اسکیم دیسی زبانوں کی ترویج کے متعلق پیش کریں۔ چنانچہ سینٹ کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۳۰ دسمبر ۱۹۱۵ء کی کارروائی سے اس معاملہ پر روشنی پڑتی ہے۔ اس جلسہ میں نواب حاجی محمد اسمٰعیل خان صاحب فیلو الٰہ آباد یونیورسٹی نے تجویز پیش کی کہ الٰہ آباد یونیورسٹی کے امتحانات ایف اے اور بی اے میں مثل مدراس یونیورسٹی کے ایک پرچہ اُردو کا بھی ہونا چاہیے۔ آپ نے یہ تجویز پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ "میں اس بات کو صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ اُردو سے میری مراد وہ عام زبان ہے جو ان صوبجات کے شہروں میں بولی جاتی ہے۔ میں اُردو اور ہندوستانی میں کوئی خط فاصل کھینچنا نہیں چاہتا۔ میرے ریزولیوشن کے لحاظ سے اُردو اور ہندوستانی ایک ہی چیز ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ کوئی ملک اخلاقی یا تمدنی ترقی نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اپنی زبان کو ترقی نہ دے۔ علاوہ ازیں اُردو نہ صرف اس صوبہ کی زبان ہے بلکہ تمام ہندوستان کی زبان ہے۔ ان حالات میں میں کوئی وجہ نہیں دیکھتا کہ یہ یونیورسٹی اُردو کو ترقی دینے کی کیوں نہ کوشش کرے۔ رہی یہ بات کہ یہ مقصد کس طرح حاصل کیا جائے میں خیال کرتا ہوں کہ جو فاضل ارکین یہاں مجمع میں ہیں وہ مجھ سے بہتر رائے سوچ سکتے ہیں میرے خیال میں سب سے بہتر یہ ہوگا کہ ایف اے بی اے اور ایم اے کو جواب مضمون دیا جائے انہیں بعض کتابیں اردو کی مقرر کر دی جائیں جن کو طالب علم پڑھیں اور وہ ان کو جواب مضمون لکھنے میں

دو دین۔ بہت سے اعلیٰ مصنف ہین اور مین مندرجۂ ذیل کی سفارش کرتا ہون۔ مولانا شبلی۔ آزاد۔ غالب۔ کرامت حسین۔ ابو الحسن وغیرہ۔"

سوائے اس طریقہ کے جو معزز محرک نے اس مقصد کے حاصل کرنے کا بیان کیا ہو کہ صرف جواب مضمون کا ایک پرچہ رکھا جائے۔ ہمین اُن کے لفظ لفظ سے اتفاق ہو۔ لیکن ہم خوش ہین کہ گورنمنٹ اِس معاملہ مین سبقت کر چکی تھی۔ جیسا کہ وائس چانسلر کے جواب سے معلوم ہوتا ہو۔ وائس چانسلر نے جواب دیا کہ "یونیورسٹی کے نصاب تعلیم مین دیسی زبانون کو داخل کرنے کے مسئلہ کی طرف کچھ عرصہ ہوا کہ گورنمنٹ نے یونیورسٹی کو توجہ دلائی تھی اور فیکلٹی آف آرٹس (شعبہ فنون) کے سامنے دو ایک سال ہوئے یہ مسئلہ پیش کیا گیا تھا۔ اس بارہ مین بہت غور و خوض کے بعد سنڈیکیٹ نے اپنے پچھلے جلسہ مین چند تجاویز منظور کی تھین اب تمام معاملہ ڈاکٹر گنگا ناتھ جھا کے سپرد کر دیا گیا ہو تاکہ وہ اس کی بابت مناسب تجاویز مرتب کرین جب یہ تجاویز آ جائین گی تو اُنپر متعلقہ فیکلٹیان غور کرین گی اور معمولی طریقہ پر اُن کو پیش کرین گی۔"

ہمارے خیال مین سارا معاملہ ڈاکٹر گنگا ناتھ جھا صاحب پر چھوڑ دینے کے بجائے بہتر ہوتا کہ ایک سب کمیٹی کے سپرد کیا جاتا جسمین کم از کم ایک مسلمان ممبر بھی ہوتا۔ جو اُردو کے متعلق ضروری تجاویز مرتب کرتا کیونکہ دیسی زبانون مین جو اہمیت اور مرتبہ اُردو کو حاصل ہو وہ کسی دوسری زبان کو نہین ہو۔ اور اگر کوئی زبان "ہندوستانی" کہلانے کی مستحق ہو تو وہ صرف اُردو ہی ہو۔ جو صوبجات متحدہ اور پنجاب کی عام زبان ہو اور دوسرے صوبون کے ہر شہر مین بولی اور سمجھی جا سکتی ہو۔

دسمبر ۱۹۱۶ء کے بعد کے جلسون کی روئداد چونکہ ابھی تک شائع نہین ہوئی اس لیے یہ نہین کہا جا سکتا کہ مسٹر گنگا ناتھ جھا نے کیا تجاویز مرتب کین۔ اور اُن پر یونیورسٹی مین کیا بحث ہوئی لیکن نتیجہ اس بحث کا ہمین معتبر ذرائع سے معلوم ہو گیا ہو جو نہایت قابل افسوس ہو یعنی دیسی زبانون کی تعلیم کی تحریک یونیورسٹی نے نامنظور کر دی اور اب گویا یہ مسئلہ ختم ہو گیا۔

اِس صورت مین پبلک اور اخبارات کا فرض ہو کہ گورنمنٹ اور یونیورسٹی کو اس فروگذاشت کی طرف پھر زور سے متوجہ کرین۔ اور یہ بات پورے طور پر ظاہر کر دین کہ ہم دیسی زبانون کو یونیورسٹی کے کسی دوسرے مضمون سے کم اہم نہین سمجھتے۔ اگرچہ الہ آباد یونیورسٹی پر اُردو کا سب سے زیادہ حق ہو لیکن فی الحال یونیورسٹی اُس کو اتنا ہی حصہ عطا کرے جتنا کم و بیش اُس کو دوسری یونیورسٹیون مین حاصل ہو۔ ہم اس بحث پر بار بار لکھین گے اور الہ آباد یونیورسٹی کو اُس کی ناگوار غفلت سے جگانے کے لیے برابر جھنجھوڑتے رہین گے۔

سید جالب (دہلوی)

ایک ہفتہ بھوپال مین

علیاحضرت جناب نواب سلطان جہان بیگم صاحبہ تاج انڈیا جی سی ایس۔ آئی، جی سی آئی ای۔ ایک ایسی فرمانروا ہین جو بلحاظ اپنی روشن ضمیری اور مدبرانہ فراست کے حکومت و ملک کی نظر مین ایک عدیم المثال عظمت و اقتدار رکھتی ہین اور اپنی شخصیت کے اعتبار سے علم و فضل مین یگانۂ روزگار ہونے کے علاوہ اصلاح ملک، ہمدردی ابنائے جنس مین یکتائے عصر ہین۔ یہ فخر اس لیے اور بھی بڑھ جاتا ہے کہ آپ طبقۂ نسوان کی "فرد بہترین" ہین اور مرد و عورت دونون کی ہمدردانہ رہنمائیون کی بدولت آپ ایک صائب الرائے لیڈر بھی تسلیم کی جا چکی ہین۔ سچ یہ ہے کہ آپکی ذات ہندوستان کے لیے مایۂ نازش ہے اور آپ کا زمانہ "تاریخ ہند کا ایک زرین ورق"۔

ریاست کے کار ہائے اہم مین مصروف رہنے کے باوجود آپ ایک زبردست مصنفہ کی حیثیت بھی رکھتی ہین اور اسی سلسلہ مین ہم ایک مرتبہ حضور ممدوحہ کی باریابی کا شرف سوا برس پیشتر حاصل کر چکے ہین۔ مگر حال مین ہمین پھر ایک ہفتہ بھوپال مین قیام کرنیکی ضرورت پیش آئی اور حضور سرکار عالیہ سے فخر ملازمت حاصل ہوا۔ یہ دیکھ کر کہ ایک صاحب اقتدار رئیسہ ملک اور ایک با عقیدہ والیۂ ریاست اپنی تمام تر بلند پایگی اور علو مرتبت کے ساتھ حسن اخلاق کا انتہائی نمونہ اور تواضع و انکسار کی اعلیٰ ترین مثال ہے ہمارے جذبات عقیدت مین ایک غیر معمولی تاثیر پیدا ہو گئی اور زبان پر آیا کہ

این سعادت بزور بازو نیست ۔ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

حضور ممدوحہ کے علمی ذوق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آپ نے بجون کے لیے "لٹریچر" بہم پہنچانے اور اُسے کتابی صورت مین شائع کرنیکا ہمین حکم دیا اور اپنی کثیر التعداد تصنیفات بھی جو دنیائے ادب مین ایک گرانبہا اضافہ ہین مرحمت فرمائی ہین اور ہماری عزت افزائی کیلئے کچھ کام ہمین دیا گیا ہے۔ قدردانِ "العصر" یہ سن کر خوش ہونگے کہ علیاحضرت اس ناچیز رسالہ کو نہ صرف دلچسپی سے ملاحظہ فرماتی ہین بلکہ اسکی علمی خدمات کی قدر بھی کرتی ہین۔ ہم عنقریب نواب بیگم صاحبہ کی تازہ تصویر اور مختصر حالات سے اوراق العصر کو زینت دینگے جن سے حضور ممدوحہ کے علمی تبحر کا اندازہ ہوگا۔ خدا سرکار عالیہ کی عمر و اقبال مین روز افزون ترقی بخشے۔ آمین!

ناسپاسی ہوگی اگر ہم ڈاکٹر جوہری صاحب کی مہمانداری اور جناب رشید تھانوی کی احباب نوازی کا شکریہ ادا نہ کرین جنکی وجہ سے ہمین اس مختصر سفر مین وطن در غربت کا لطف ملا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف ہمارے سچے حامی اور علیاحضرت کے معتمد ہین اور احمد آباد ڈسپنسری کا چارج اُن کے ہاتھ مین ہے۔ یہ احمد آباد حضور بیگم صاحبہ کی مستقل قیام گاہ ہے جسکو آپ نے بمبئی فورٹ کی طرح یورپین طرز پر آباد کیا ہے۔ بعض معزز افسران ریاست کے بنگلے اور کوٹھیان بھی اسی مین ہین۔ منشی رشید احمد صاحب رشید ہمارے بے تکلف کرم محترم دوست ہین اور عرصہ دراز سے بسلسلۂ ملازمت آپکا قیام بھوپال مین ہے۔ نظم و نثر مین اعلیٰ دستگاہ رکھتے ہین۔ آپ کے کلام کا مجموعہ "حسن تخیل" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اُردو کے بہترین رسائل مین آپ کے خیالات منظوم باعث تزئین سمجھے جاتے ہین۔ ہمین علیاحضرت کی مردم شناسی سے اُمید ہے کہ انکی تحریری قابلیتون کی قدردانی فرمائی جائیگی جسکے وہ حقیقی مستحق ہین۔ اسی سلسلہ مین مولوی محمد امین صاحب زبیری مہتمم تاریخ بھوپال کی عنایات و الطاف کا ذکر بھی ضروری ہے جو بحیثیت ایڈیٹر "ظل السلطان" ہمارے قابل فخر ہمعصر ہو۔ ایک غیر معمولی دل و دماغ کے آدمی ہین اور ہمکو اپنی متواتر لطف فرمائیون سے بھوپال مین رہین منت بناتے رہے ہین۔ "العصر" کی توسیع اشاعت مین بھی آپ نے خاص مدد دی اور متعدد خریدار بہم پہنچائے۔

پنڈت اودھ نرائن صاحب بسریا بی اے چیف سکرٹری ریاست و سید سخاوت حسین صاحب پرائیوٹ سکرٹری ہر ہائنس و ماسٹر ولی محمد

صاحب بی اے سکریٹری پرنس محمد حمید اللہ خان بہادر کی کرم گستریوں کا بھی خاص احساس ہمارے قلب پر ہے اور سید لیاقت علی صاحب ایم اے ایل ایل بی اسسٹنٹ معین المہام نے بھی اپنے اخلاقِ کریمانہ سے ہمیں شکرگزار بنایا۔

مولوی وہاج الدین حیدر صاحب بیرسٹرایٹ لا اسسٹنٹ نصیر المہام دنیائے شاعری میں ایک امتیازی شان رکھتے ہیں۔ "ماں بیٹے کی مراسلت" کے عنوان سے آپکی ایک ابتدائی نظم بہت مدت ہوئی شائع ہو کر ملک سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے۔ آپ کے جدید کلام سے بھوپال میں دو تین مرتبہ محظوظ ہونے کا موقع ملا۔ ناظرین العصر بھی آپ کے افکار تازہ سے جلد مسرت اندوز ہوں گے۔ آپکی تپاک آمیز ملاقاتیں بہت ہی مغتنم اور باعث دلچسپی تھیں۔

کسی گزشتہ نمبر میں ہم "کفایت شعاری" پر ریویو کر چکے ہیں جو ڈاکٹر سمائلز کی "تھرفٹ" کا اردو میں سب سے پہلا اتخاذ ہے۔ سید محمد مرتضیٰ صاحب سٹی مجسٹریٹ نے عرصہ ہوا اسکو اردو کا لباس پہنایا تھا۔ بھوپال میں جناب موصوف سے بھی نیاز حاصل ہوا۔ بہتر ہو اگر سید صاحب اپنی ترجمہ کردہ دیگر کتب کا بھی سیکنڈ ایڈیشن شائع کرادیں کیونکہ ایسی کتابوں کی ملک کو بہت ضرورت ہے۔

ملک حبیب احمد خان صاحب پریسیڈنٹ محکمہ اوقافِ ریاست کی ملاقات بہت ہی پُرلطف تھی۔ خلوص و اخلاق آپکا حصہ ہے۔ گو آپ شعر نہیں کہتے مگر طبیعت شاعرانہ رکھتے ہیں۔ آپکی تمام تر گفتگو نثر شاعری کا دلکش نمونہ تھی جسکا ذوق ابتک باقی ہے۔

پنڈت کشن سرن صاحب سٹی مجسٹریٹ حوالی شہر بھوپال نے سرسری ملاقات میں بھی کثرتِ التفات سے ممنون بنایا۔ منشی کاشی ناتھ صاحب کے برادر گرامی ہیں جو پنڈت تخلص کرتے تھے۔

مرزا ابوالفضل صاحب مترجم قرآن مجید وغیرہ جو ہمارے دیرینہ کرمفرما ہیں محض حسن اتفاق سے سید محمد حسن صاحب بی اے کنزرویٹر جنگلات کے یہاں غیر متوقع طور پر مل گئے۔ الہ آباد چھوڑنے کے بعد سے آجتک ہمیں اُن سے ملاقات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ آپ سے مل کر بیحد خوشی ہوئی۔ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو ظاہری ٹیپ ٹاپ اور نمائشی شان و شوکت سے قطع نظر کرکے خموشی کے ساتھ اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ آپ کسی خاص ضرورت سے بھوپال آئے تھے اور ہماری روانگی سے قبل ہی واپس تشریف لیگئے۔ سرکار عالیہ نے آپکو بھی کچھ تحریری کام سپرد فرمایا ہے۔

غرضکہ یہ سفر ہمارے لئے بہت سی مسرتوں کا باعث ہوا اور ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ علیاحضرت نواب بیگم صاحبہ دام اقبالہا نے اپنی وسیع النظری اور علم دوستی سے ملک کے چیدہ اور قابل ترین اصحاب کا انتخاب فرماکر ریاست میں مجتمع کردیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ریاست کا انتظام اعلیٰ پیمانہ پر ہے اور ہر شخص علمی ذوق میں منہمک ہے۔ خدا اس چمنستانِ علم کو ہمیشہ سرسبز و شاداب رکھے اور بقول جناب ارشد ؎

پاؤں پھیلائے رعایا چین سے سوتی ہے
علم و دولت کی ترقی ملک میں ہوتی ہے

(ایڈیٹر)

آسام مین اُردو حکومت

مخزن کے جدت طراز سرنامہ نے کلکتہ کو حکومت اُردو کی مشرقی سرحد قرار دیا ہے۔ کلکتہ ایجوکیشنل کانفرنس کی اُردو تقریرون نے غالباً سرمایۂ خیال بہم پہنچایا اور فورٹ ولیم کالج کی غیر فانی علمی کوششین اُس کی موید ہوئین ورنہ سب جانتے ہین کہ اُردو ہندو اور مسلم تمدن اور اُنکے کسر و انکسار امتزاجی کے نتیجہ کا نام ہے۔ ورنہ کلکتہ جو حدیث العہد آبادی اور تاریخی لحاظ سے انگریزی شہر ہے وہان اُردو کو نووارد مسافر کی حیثیت سے ڈھونڈھنا چاہیے۔ خدا بھلا کرے حضرت خیال کا کہ کلکتے نے تاریخ اُردو پر ایسی صاف و شفاف روشنی ڈالی کہ مخزن بیچارے کی حد بندی تمام نہ رہ سکی اور کلکتہ سے آگے مرشد آباد ڈھاکہ بھی اُسمین شامل ہوگیا۔ لیکن بہت کم لوگ جانتے ہین کہ بنگال کے تمام قدیم شہرون مین اُردو عام زبان ہے اور کل شرفاے بنگال خواہ اُن کا قیام کسی گوشہ ہی مین ہو اندر باہر اُردو بولتے ہین اور اُن کی زبان سوا ے تانیث و تذکیر کے کثیرالوقوع غلطیون کے روزمرہ یا لب و لہجہ کا فرق بہت کم ہے۔ اور یہان کی زبان سُن کر ایک متبصر زبان کے لیے یہ ماننا ناگزیر ہوجاتا ہے کہ اِن لوگون کے آبا و اجداد شاہی ہندوستان کے کس گوشے سے آئے تھے اور کہ دلّی و لکھنؤ مین کس کا اثر یہان کی زبان پر غالب ہے۔

مدت ہوئی مین نے ”بنگالیون کی اُردو شاعری“ کے عنوان سے ایک مضمون ادیب مرحوم مین شائع کرایا تھا۔ بنگالیون سے مراد بنگالی نژاد ہندو تھے ورنہ اگر یہ احتراز کی قید نہوتی تو اُس کی ضخامت سال بھر کیلیے بھی کافی نہو سکتی۔ میرا ارادہ تھا کہ بنگال کی اُردو کے متعلق وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ لکھتا رہون لیکن ہجوم اشغال کا خدا بھلا کرے کہ اب تک ارادہ ظہور مین نہین آیا۔ اب حضرت خیال کی معرکۃ الآرا اسپیچ نے گدگدی پیدا کی بلکہ سچ پوچھیے تو اُنھین کے اڈریس سے یہ خیال پیدا ہوا کہ اُنھون نے حدود اثر اُردو کے متعلق پوری توجہ نہین فرمائی ورنہ یہ ظاہر ہے کہ وہ سرحد بنگال سے کئی قدم آگے نکل جاتے اور لوگون کو معلوم ہوجاتا کہ اُردو نے جبکہ پریس اور انجمنون کا وجود بھی نہ تھا کہان تک اپنا عمل دخل کرلیا تھا۔

ہندوستان کا سرحدی صوبہ آسام جو ایک طرف مشرقی بنگال سے اور دوسری جانب مُتّحد برہما سے اپنا ڈانڈا ملاتا ہے وہ بھی جادوے اُردو کا مسحور نظر آتا ہے۔ آسام کے ہر شہر کے دوکاندار جیسی اُردو بولتے ہین اُس کا ذکر نہین بلکہ تعجب آتا ہے کہ وہان چار دیوان شعراے اُردو کی ایک تعداد کثیر نظر آتی ہے اور یہ وقت کا ذکر نہین بلکہ آج سے تیس چالیس برس اُدھر کی بات ہے۔ مین چاہتا تھا کہ المعاصر کے ناظرین کے لیے مختصراً اُن کا تذکرہ لکھون اور ساتھ ہی یہ خیال بھی تھا کہ اب تک بھی اُردو شاعری کا وہان چرچا باقی رہا ہو کہ آج ۶ جزو کا ایک رسالہ ”یادگار صحیفہ“ نام مری نظر سے گزرا۔ ۱۳۳۰ھ کا مطبوعہ ہے اور مدراس مین چھپا ہے۔ سلہٹ کی مشہور دیاول زبیدہ صحیفہ بانو صاحبہ نے اپنے نفیس اُردو اشعار جمع فرما کر شائع کیے ہین مجھکو معلوم ہے کہ بانو صاحبہ ۷۰ برس کی ضعیفہ خاتون ہین اور خدا نے عورت بنا کر تمام مردانہ صفتین

انکو عطا فرمائی ہین وہ سارے ہندوستان اور مقامات متبرکہ کی زیارت کر چکی ہین۔ ایک چھوڑ دو بار حج سے بھی مشرف ہوئی ہین۔ جب کچھ کہتی ہین تو صرف نعت مین کہتی ہین اور بخلاف تمام شعراے اُردو کے اپنا ذکر بصیغہ تانیث کرتی ہین۔ کلام مین سن کے طرح بختگی نہین ہی، اور نہ اسقام شاعرانہ سے کلام پاک ہی لیکن اُردو کا اِس حد تک چرچا کہ مردون سے گزر کر عورتین بھی شعر کہین شیدایان اُردو کے لیے باعث مسرت ہی۔ مین چاہتا ہون کہ سب سے پہلے حضرت صحیفہ کا کچھ کلام نقل کر دون اور پھر تذکرہ شعراے آسام شروع ہو گا۔

مین یہ ذکر کر دینا مناسب خیال کرتا ہون کہ آسام سے جتنی اُردو تصنیفین شائع ہوئی ہین اور جو صرف نثر مین ہین اُن کی تعداد بھی بہت ہی اور اُس سے بھی آسام مین حکومت اُردو کا پتہ لگتا ہی لیکن مین صرف شاعرون کا تذکرہ اِس لیے کرون گا کہ جب تک زبان پر پوری قدرت نہو خیالات اور جذبات کا اظہار نہین ہو سکتا۔

صحیفہ کہتی ہین ؎

تیری کنیز ہون مین مالک ہی تو خدایا | تھی مشت خاک تو نے انسان مجھے بنایا
تو رزق دینے والا تو جان دینے والا | تو نے مجھے کھلایا تو نے مجھے جلایا
تیری حمایتون نے رکھا مجھے بچا کر | تیری عنایتون نے مجھکو دیا دلایا
داری گلی کرم کر مجھپر کریم ہے تو | فارغ جلائے سارا میرا کیا کرایا

عاجز صحیفہ ہو نہ مین دم ضعیفہ ہون مین
مجھ کو نہ ٹرے بگڑنے جب تو نے ہی بنایا

داغ ہاے دل ہی سوزان دیکھیے | بن گیا سینہ گلستان دیکھیے

تو نگھبرا اے صحیفہ تجھے رحمت ہو نصیب | مغفرت تجھ کو لپٹ جائے گی جوش میں آ کر

مقبول عالم صاحب زر کی ہی بات آج | سچ ہی کہ مفلسون کا طرفدار کون ہی

ورنہ ان سے بڑھکے صحیفہ ہی تیرا شعر
سلہٹ مین آج اِس کا خریدار کون ہی

آشفتہ | حاجی منشی عبد اللہ خلف عبد الحمید باشندۂ سلہٹ حافظ ضیغم[1] کے شاگرد تھے۔ سلہٹ مین تست کے بعد اِن کی شاعری کا بڑا چرچا تھا۔ اُردو فارسی دونون زبانون مین شعر کہتے تھے۔ نساخ مرحوم کے ہم اُستاد اور دوست تھے ؎

دیکھنا اشوق شہادت عاشق دلگیر کا | کیا تڑپ کر چوم لیتا ہی گلا شمشیر کا
وادی وحشت مین ایسا پاؤن پھیلایا مرا | دیدۂ غول بیابان حلقہ ہی زنجیر کا

ہوا وہ حور مین انداز گر بشر کا سا | تو رنج خلد مین ہو گا ہمین سقر کا سا

کھل گیا ہی بیکشی مین جوہر انوار قدس | ہی تماشا گاہ بزم قدس کی ساغر شراب

دیکھے تو پرت بے پیرہن آئینہ | ہون مین حیران ہاے یہ تو غیرت آئینہ

بیخود | مولوی نذر جام علی باشندۂ بنیاچونگ بنگال کے ابتدا آ باشاعری مرزا جان طپش دہلوی کے شاگرد اور صاحب دیوان تھے ؎

پوچھے اگر کوئی کدھ بیخود کدھر گیا | تو دیجیو جواب اکرم بخت مر گیا

کھائے تو غم ہو پینے کو ہی اشک تر مجھے | متکلم ہون گھر سے خوب ہی اوسف کے ساتھ

حامد | خاندان مجموعہ داران سلہٹ مین ہمیشہ سے با اثر اور متمول خاندان رہا ہی اور علم و ہنر کا چرچا اب تک اس خاندان مین موجود ہے چنانچہ خان بہادر محمد بخت مجموعہ دار اُسوقت بڑا آغائی فیملی اور آسام کونسل کے

---

[1] حافظ اکرام احمد ضیغم رامپوری بہت برجستہ خواو و شاعر گزرے تھے۔ نساخ اور آنا دجہانگیر نگری جیسے شاعرون نے اُن کی دایہ عنایت سے دودھ پیا تھا۔ اقبال کے دور کے اُستاد اور اُنھین کی وجہ سے یہان بزم مشاعرہ کی گرمی تھی ۱۲

مبصر ہیں۔ اس خاندان نے سلہٹ میں اُردو کی اچھی خدمت کی اور بہت سے شاعر پیدا کیے۔ اللہ بخش مجموعہ دار خلف محمد مہدی مجموعہ دار کا تخلص حامد تھا۔ وہ اشرف علی مست کے شاگرد تھے ؎

ملنے کا میں نہیں کبھی گو لے کوئی ہزار
میں ہوں مری جبین ہے اور آستانِ دوست

خیر میں ہو شکر کیطرح اب نے قلم
لکھتے ہیں جب لب شکر فشان دوست

حسن | مولوی محمد حسن ولد مفتی محمد سالم خاندان علم و فضل سے تھے۔ مست کے شاگرد تھے۔ ۱۳۰۲ھ میں انتقال ہوا ؎

ہاتھ اُٹھاؤ مجھ سے اب کیا کام ہے تدبیر کا
ذبح کے قابل ہوں میں موقع ہے تکبیر کا

حمید | حاجی حمید بخت خلف حاجی سعید بخت۔ یہ بھی اسی خاندان مجموعہ داران سے تعلق رکھتے ہیں۔ حافظ ضیغم کے شاگرد اور ناسخ کے دوست تھے ؎

خواب میں شکل دکھائے گا وہ عیار کبھی
یہ بھروسا نہ مجھے اے طالع بیدار رہا تھا

وہ جو شب میرے گھر آیا تو گیا ہوش حمید
اور جس وقت ہوا ہوش تو پھر یار نہ تھا

خواجہ | مولوی عبد العزیز۔ اُن کے والد مولوی اظہر علی فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے منشی تھے۔ اُن کی تعلیم و تربیت کلکتے میں ہوئی۔ مولوی عصمت اللہ شیخ ارشد تلامذہ ناسخ سے اصلاح لیتے تھے۔ ناسخ اُن کے متعلق لکھتے ہیں کہ بہت ہی ذکی و ذہین تھے۔ ۱۲۸۲ھ میں رحلت کی ؎

دل لیکے جان مانگتے ہیں وہ بھی لیجیے
اب میرے آپکے کوئی جھگڑا نہیں رہا

دیر و حرم میں سب ہیں صورت ہیں نقش دیوار
دل لیکے آپ کو میں کہیں کا نہیں رہا

سعید | حاجی سعید بخت والد حمید بخت مجموعہ دار۔ یہ بھی اپنے بیٹے کیطرح حافظ ضیغم کے شاگرد تھے۔ تاریخ گوئی سے اُن کو خاص مناسبت تھی ؎

پہنا نہیں ہے سر سے اب ہر گز قرار رنگ
ہر آن میں بدلتی ہیں آنکھیں ہزار رنگ

سفیر | حاجی جلال بخش خلف حاجی حسین بخش مست کے شاگرد اور ناسخ کے ملاقاتی تھے ؎

سحر آفریں یہ سایۂ زلف سیاہ ہے
بنجائے کیا عجب ترے پھولوں کا ہار سانپ

علی احمد | مولوی محمد علی احمد خان لنگار سلہٹ کے بہت بڑے زمیندار اور ایک مشہور ذی حوصلہ رئیس تھے۔ داد و دہش مزاج میں بہت تھا۔ مگر شعر بہت کم کرتے تھے اور اپنے اشعار میں ناسخ مرحوم سے اصلاح لیا کرتے تھے ؎

ہوئے جبتک کہ نہ برباد غبار عاشق
دامنِ پاک صنم تک نہ رسائی شکل

پھر نہ ہوتا نہیں آنسو جدا سر اپنا
دھیان آتا ہے جو بیجان ترے زانو کا

چین آتا نہیں جو تجھ کو علی احمد آج
یاد مژگان ہے کہ کانٹا ہے ترے پہلو کا

مست | حکیم اشرف علی خلف احمد علی مجموعہ دار تلمیذ حافظ ضیغم۔ شعر و شاعری کا چرچا در حقیقت اُنھیں کی وجہ سے سلہٹ میں پیدا ہوا۔ بہت قابل اور ہر دو زبان میں شعر کہتے تھے۔ کتب متعددہ کے مصنف ہیں اور اکثر شائع ہو چکی ہیں۔ سلہٹ میں اُن کی طبابت کی بڑی گرم بازاری تھی۔ فن کشتی کے بھی بڑے واقف کار تھے۔ چنانچہ اس فن میں بھی اُن کا ایک رسالہ ہے۔ تصانیف کی فہرست حسب ذیل ہے: ترکیب الصلوٰۃ تصویر غم۔ رسالۂ سیف و بطاعون۔ رسالۂ چیچک۔ رسالۂ دفع السموم۔ رسالۂ کشتی ؎

ہر قلم تیغِ غضب سے سر جوان و پیر کا
قاتلو ابھی ہر جوڑ لے قاتل تری شمشیر کا

عجز نے میرے اُڑایا آپ کے دل کا غبار
خاکساری میں اثر ہے سرمۂ تسخیر کا

رات ان یوں جو ترسیتا ہے شال لیل
کس نے لا تجھے اے مست کہاں ہے پلا

آگئی بار عصیاں سے گرانبار اس قدر ہوں میں
یقین ہے ٹوٹ جائے حشر میں پلہ ترازو کا

ہوا
دیکھتے ہیں کھولکر وہ کٹے ہاتھ پاؤں کے
رہتے ہیں وصل میں سرِ بستر ہلال چار

ملوگے جورِ فلک پیر سے چھوٹے
ہم آئے تہِ تیغ جو زنجیر سے چھوٹے

شاید اضطراب نے میرے اثر کیا
ہیں اِن دنوں تو آپ بھی کچھ بیقرار سے

یٰسین مولوی عبدالستار، شاہ عبدالقادر کے صاحبزادے۔ مولوی وحشت سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ ناسخ کے دوست تھے—

سیلاب اشک ترے سمندر کا جوش ہو
گر چھ نہاں نظر سے رخِ خوے فشانِ دوست

حکیم حبیب الرحمن خان

ردِ تحقیق

بہت شور سنتے تھے پہلو مین دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خون نہ نکلا

ایک مشہور و معروف ادبی رسالہ کے ایڈیٹر نے ایک مضمون کے دوران مین ہندوستان کے علمی رسائل کا ذکر فرماتے ہوئے تحریر کیا ہے :۔

سنہ ۱۹۰۰ء مین پہلے پہل رسالہ دلگداز مولانا عبد الحلیم صاحب شرر نے نکالا تھا اس لیے اوّلیت کا فخر ممدوح کو ہے ۔۔۔۔

افسوس ہے کہ ہم اس بات کو ماننے کے لیے ہرگز تیار نہین ۔ وجہ یہ کہ ہم اُن علمی کوششون سے بخوبی واقف ہین، جو دلگداز کے ظہور سے پیشتر اردو زبان مین کی جا چکی ہین سنہ ۱۹۱۰ء مین ہمنے ایک مضمون دکن کے رسالہ زبان مین اُردو رسائل پر ایک سرسری نظر کے عنوان سے لکھا تھا، اُسمین ہم نے اُن پرچون کی ایک فہرست بھی دی تھی جو سنہ ۱۹۰۰ء سے پیشتر خالص علمی مذاق کے لیے شائع ہوئے تھے ۔ ذیل مین ہم اُس فہرست کو نقل کرتے ہین ۔ اس سے ناظرین العصر ملاحظہ فرما سکین گے کہ دلگداز کے وجود مین آنے سے پیشتر علمی مذاق مفقود نہ تھا :۔

نمبر	نام رسالہ	مقام اشاعت	نام ایڈیٹر	سنہ اجراء
۱	مراۃ العلوم +	بنارس	بابو بھیرون پرشاد	سنہ ۱۸۴۷ء
۲	مخزن علوم و فنون	"	منشی نیاز علی	سنہ ۱۸۵۶ء
۳	آب حیات ہند	آگرہ	بابو جنسی دھر	سنہ ۱۸۶۲ء
۴	مخزن العلوم	گوجرانوالہ	منشی گیان چند	سنہ ۱۸۶۶ء
۵	انسٹی ٹیوٹ	مظفر نگر	لالہ نہال چند	سنہ ۱۸۶۷ء
۶	اتالیق پنجاب	لاہور	مولانا آزاد	سنہ ۱۸۷۰ء
۷	مخزن مہابھارت	آگرہ	لالہ جوالا پرشاد	سنہ ۱۸۷۱ء
۸	دہلی سوسائٹی	دہلی	مولوی ذکاء اللہ	سنہ ۱۸۷۲ء
۹	معلم شفیق	حیدرآباد دکن	محب حسین محب	سنہ ۱۸۷۲ء
۱۰	الحمد شاکر علیہ	پٹنہ	حاجی سید ولایت علی	سنہ ۱۸۷۳ء
۱۱	مخزن الفوائد	حیدرآباد دکن	مولوی مسیح الزمان	سنہ ۱۸۷۳ء
۱۲	آستانۂ حکمت	آگرہ	حاجی سید الطاف علی	سنہ ۱۸۷۹ء
۱۳	اشاعت السنہ	امرتسر	مولوی محمد حسین	سنہ ۱۸۷۹ء
۱۴	تیرھوین صدی	آگرہ	خواجہ یوسف علی	سنہ ۱۸۸۰ء
۱۵	دانا	آگرہ	خواجہ یوسف علی	سنہ ۱۸۸۱ء
۱۶	مفید عام	لاہور	منشی گلاب سنگھ	سنہ ۱۸۸۱ء
۱۷	مظہر الزراعت +	میرٹھ	حکیم مقرب حسین	سنہ ۱۸۸۲ء
۱۸	متھرا سماچار	متھرا	پنڈت ام اِن لعل [illegible]	سنہ ۱۸۹۲ء
۱۹	والا جاہی	ریاست بھوپال	نواب صدیق حسن خان	سنہ ۱۸۹۳ء
۲۰	علوم و فنون	حیدرآباد دکن	حافظ منصب علی	سنہ ۱۸۹۳ء
۲۱	اشراق	لکھنؤ	مرزا ہادی	سنہ ۱۸۹۳ء
۲۲	ذخیرۂ تعلیم	حیدرآباد دکن	منشی عزیز الدین	سنہ ۱۸۹۴ء
۲۳	زراعت	بجنور	پنڈت سری لال	سنہ ۱۸۹۴ء
۲۴	نور بصر	کلکتہ	مولوی غلام حضرت	سنہ ۱۸۹۴ء
۲۵	طبیب	لاہور	حافظ فخر الدین	سنہ ۱۸۹۵ء
۲۶	مفید المزارعین	کانپور	خواجہ محمد حسین	سنہ ۱۸۹۵ء

نوٹ + جن پرچون کے نام کے ساتھ یہ نشان دیا گیا ہے، وہ اردو اور ناگری دونون زبانون مین شائع ہوتے تھے :۔

نمبر	نام رسالہ	مقام اشاعت	نام ایڈیٹر	سنہ اجراء
۲۷	مراۃ الوقت	لکھنؤ	پنڈت کشن سہائے	سنہ ۱۸۹۵ء
۲۸	افسانۂ ایام	دہلی	مولوی نصرت علیخان	سنہ ۱۸۹۵ء
۲۹	زمیندار	لاہور	منشی محبوب عالم	سنہ ۱۸۹۶ء
۳۰	باغبان	〃	〃	سنہ ۱۸۹۶ء
۳۱	شمس العلوم	احمد آباد	—	سنہ ۱۸۹۶ء
۳۲	مجمع علوم وفنون	لاہور	مولوی عبداللہ خان	سنہ ۱۹۰۶ء
۳۳	مرچنٹ	انبالہ	پنڈت شیو پرشاد	سنہ ۱۹۰۶ء

ہم نے عمداً اُن رسالون کے نام نظر انداز کردیے ہین جو سنہ ۱۹۰۶ء مین یا اس کے بعد شائع ہوئے ہین۔ اس بات کا بھی دعوی نہین کیا جاسکتا کہ یہ فہرست مکمل ہے۔ ممکن ہے، ان کے علاوہ اور بھی علمی مذاق کے پرچے جاری ہوئے ہون۔ بہرحال اب اس بات کو مان لینا چاہیے کہ اولیت کا فخر مولانا شرر کو حاصل نہین ہے۔

ہم ایڈیٹر صاحب موصوف کی اُن معلومات کی ضرور داد دیتے جو آپ کو "تجربات اور تحقیق و تدقیق کے بدولت حاصل ہوگئی ہین"۔ مگر ہمین سخت افسوس ہے کہ اس تاریخی مضمون مین اور بھی چند غلطیان اس قسم کی ہوگئی ہین کہ ہم اُن کی بھی تردید کیے بغیر نہین رہ سکتے۔ مثلاً آپ ادیب کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہین:۔

اس نام کے دو رسالے جاری ہوئے تھے .... ایک توحید آباد سے نکلتا تھا

اور دوسرا غالباً سنہ ۱۹۰۹ء مین فیروز آباد سے جاری ہوا تھا۔

اس بات کے ظاہر کرنے کی چندان ضرورت نہین کہ حیدر آبادی ادیب اب تک جاری ہے، اور کہ فیروز آبادی ادیب سنہ ۱۹۰۹ء مین نہین بلکہ سنہ ۱۹۰۶ء مین جاری ہوا تھا! مگر ہم یہ دریافت کرنے کی جرات کرتے ہین کہ لکھنؤ کے ادیب کیا قصور کیا جو آپ نے اُسکا ذکر نہین فرمایا۔ شاید آپ کو معلوم نہین ہے کہ سنہ ۱۹۱۰ء مین لکھنؤ سے بھی اسی نام کا ایک رسالہ مولوی ہدایت رسول کی ایڈیٹری مین شائع ہوا تھا۔

آگے چل کر آپ فرماتے ہین:۔

ہندوستان مین موجودہ طرز کے رسائل کا پیشرو ادیب فیروز آبادی تھا۔

"موجودہ طرزہ سے غالباً آپ کا منشا نظم و نثر کے مستقل لحاظ سے ہے۔ مگر جاننے والے جانتے ہین کہ معارف مین یہ خوبی موجود تھی، اور یہ ظاہر ہے کہ ادیب (فیروز آباد) معارف کے بعد معرض وجود مین آیا اور معارف کے بند ہونے سے پہلے ہی ختم بھی ہوگیا۔ اور اگر "موجودہ طرز" سے آپ کی مُراد جدید شاعری سے ہے، تو یہ منشا بھی خالی گیا۔ سنہ ۱۸۹۶ء مین جب منشی نثار حسین صاحب نثار نے پیام یار جاری کیا تھا تو مولوی عبدالحلیم صاحب شرر کبھی کبھی اُسمین یورپ اور ایشیا کا رنگ ملا کر نظم لکھتے تھے، اور جب اُنھون نے دلگداز جاری کیا تو اسمین بھی جدید طرز کی نظمین درج کرنے لگے۔ انبالہ سے بھی ایک اہوار رسالہ جاری ہوا تھا جسکا نام غنچۂ مراد تھا۔ غزلون کے علاوہ اسمین جدید طرز کی نظمین بھی ہوتی تھین۔ گویا علمی وادبی مذاق کے علاوہ جدید شاعری کی بنیاد بھی فیروز آبادی ادیب سے بہت پہلے پڑچکی تھی۔

ہم محقق نہین ہین، اور نہ ہمارا "مشاہدہ و تجربہ" وسیع ہے، باوجود اس کے ہم نے جو کچھ لکھا ہے، نہایت تحقیق سے لکھا ہے، اور وہ بھی محض اس غرض سے کہ رسالۂ مذکور کے مضمون زیر بحث کی وجہ سے بعض ناواقف حضرات مغالطہ مین نہ پڑجائین۔ امید ہے کہ ہماری اس نیک نیتی کو مخالفت پر محمول نہ کیا جائے گا۔

مرزا غالب کی ایک غزل

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

اس شعر میں معشوق کو جس بانکپن سے یاد فرمایا ہے وہ بس دل ہی خوب جانتا ہے۔ سبحان اللہ۔ اہل جفا، جمع کا صیغہ ایک شخص واحد کے لیے وہ لطف دے رہا ہے کہ "کسی" اور "کوئی" میں بھی یہ لطف نہ ہوگا۔ کیا تیکھا پن ہے ماشاء اللہ۔ اور پھر اپنی زندگی کے زمانہ میں اپنے اوپر جفا کا ہونا۔ حسن کے ساتھ غمزے کی کند چھری کا چلنا اور پھر اس غمزہ اور جفا کرنے میں معشوق کی تکلیف اور حسن کی پابندی اور قید۔ فنا حسن کا غمزے کی کشاکش سے آزاد ہونا۔ معشوق کا جو جفا کرتے کرتے تنگ آ گیا تھا آرام پانا اور اس کے لازمی نتائج یعنی صرف انھیں کا مورد غمزہ و جفا ہونا اور غیروں پر مہربانی اور لطف کا ہونا (کیونکہ ان کے مرنے کے بعد ہی تو معشوق جفا سے اور حسن غمزے کی کشاکش سے چھوٹے گا) معشوق کے در اصل نیک اور جفا کے عادی نہ ہونے کا یقین (کیونکہ عادت میں تکلیف نہیں ہوتی اور شعر میں غمزے کی کشاکش اور جفا سے چھوٹنے پر آرام آنا اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ ان کا عادی نہیں) یہ تمام باتیں جو بالکل نیچرل ہیں دو چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں اس خوبی کے ساتھ جمع کر دی ہیں کہ بیان نہیں ہو سکتی۔

منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد

سے اس شعر میں اپنا شیفتۂ انداز و ادا ہونا جو صرف انھیں کے واسطے برتے جاتے تھے اور صرف انھیں کا اس منصب شیفتگی انداز و ادا کے قابل ہونا اور ان کے بعد کسی کا در اصل قابل نہ ہونا خواہ ظاہر کیا جائے اور اس وجہ سے انداز و ادا کی معزولی کمال جامع طور پر بیان ہوتے ہیں۔ ایک خاص خوبی یہ ہے کہ پہلے مصرعہ میں اپنا شیفتہ ہونا اور دوسرے مصرعہ میں انداز و ادا کی معزولی ظاہر کر کے اپنی شیفتگی کو انھیں دونوں کے ساتھ مخصوص کرنا ایک خاص لطف رکھتے ہیں۔ یہاں پر یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ یہ ایک نیچرل بات ہے کہ اگرچہ ایک شخص کے بہت سے عاشق ہوتے ہیں اور سب بجائے خود دل و جان سے اس پر قربان ہیں مگر ہمیشہ ایک دوسرے کو جھوٹا دعوے دار محبت تصور کرتا ہے اور ہر شخص یہ خیال کرتا ہے کہ معشوق کے تمام جور و ستم میرے ہی اوپر ہیں۔ اور غیروں سے بیحد اختلاط ہے اور ہمیشہ اُن کی صحبت میں رہتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے عاشق دشمن اور معشوق میں بھی ایک خاص ادا کے ساتھ بُرے صفات پیدا ہو گئے مگر اس پر بھی یہ انھیں جور و ستم کا انھیں انداز و ادا کا شیفتہ ہے اور اُسی کو غنیمت سمجھ کر کہتا ہے:۔

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تری عادت ہی سہی
چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد — گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں کائنات کا وہ اصول بیان فرمایا ہے جس کو کبھی تغیر و تبدل نہیں۔ سائینس والوں نے لاکھ سر ٹپکا اور ہزار کوششیں کیں کہ وہ اصول دوسری شکل اختیار کرے مگر آخر امر مجبور ہو کر اُن کو بھی ماننا پڑا کہ جب شمع بجھے گی تو دھواں پیدا ہوگا اب دوسری خوبی اس اصول کے بیان میں یہ ہے کہ اپنے مطلوبہ دعوے کے استدلال کے واسطے وہ اصول بیان فرمایا ہے جس کو ہر شخص جانتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی اپنی نکتہ رسی اور باریک بینی کا بھی ثبوت دے گئے ہیں۔ یعنی اتنے بڑے دعوے کی دلیل میں وہ بات کہی ہے جس تک ہر شخص کا دماغ نہیں پہنچ سکتا اور یہی استادی اور قادر الکلامی کا ثبوت ہے

اب قبل کل شعر کا مطلب بیان ہونے کے ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ شمع ایک روشن شے ہے جس میں حرارت ہے اور دھواں جو قبل گل ہونے کے جسم شمع میں موجود تھا عام طور پر سیاہ ہوتا ہے۔ حرارت کا رنگ سرخ ہے (مثلاً خون) مسلاطبی کہ عشق ایک حرارت قلبی ہے اور اس کا تعلق خاص طور پر قلب سے ہے جو خود مرکز حرارت جسمانی ہے۔ اس لیے عشق کو شعلہ یعنی گرم اور روشن شے سے مثال دی ہے اور خوب دی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عاشق کا انتقال رنج و الم دل مرثیہ جگر کا کام ہے اور لباس ماتمی سیاہ ہوتا ہے اس لیے عشق ہی کو سیاہ پوش مان لیا ہے۔ اب دیکھیے کہ شعلہ کا سیاہ پوش ہونا کتنا ناممکن تھا مگر اس خوبی سے بیان ہوا ہے کہ گویا یہ سیاہی شعلہ میں اُسی طرح مضمر تھی جس طرح شمع میں دھواں۔ اب مطلب شعر کا بالکل آسان ہے۔ یعنی کہ میں ہی ایک یادگار عشق تھا بعد میرے عشق نے ماتمی لباس پہن لیا اور یہ لباس پہن کر شعلۂ عشق جو سیاہ ہو گیا یہ کوئی خلاف نیچر بات نہیں بلکہ جب شمع گل ہوتی ہے تب بھی سیاہ دھواں اُٹھتا ہے۔ گویا ہر روشن شے سیاہ ہو سکتی ہے۔ اب یہ کہنا کہ عشق کا جو ماتمی لباس ہے یہ صرف میری ہی وجہ سے ہے یہ ایک شاعرانہ تخیل ہے اور بجائے خود یہ بھی ایک خاص لطف رکھتا ہے جو معرض بیان میں بمشکل آسکتا ہے ان تمام گہرے نکات کے علاوہ شعر میں نہ کوئی تعقید ہے نہ الجھاؤ بلکہ سیدھے سادھے روزمرہ میں خدا جانے کیا جادو بھر دیا ہے کہ دل کے جذبات

خواہ مخواہ تر ہو جاتے ہین۔

خوں ہے دل خاک مین احوالِ بتان پر یعنی
اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

اِس شعر مین جو محاورہ باندھا گیا ہی اُس سے کون ناواقف ہے۔ مگر اتنا ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اس محاورہ کے معنی صرف قتل ہونا ہی نہین بلکہ بیچین ہونا بیتاب ہونا بیحال ہونا کامیاب نہ ہونا ضائع ہونا وغیرہ بھی لیے جاتے ہین۔ یہان پر یہ محاورہ جس خوبی کے ساتھ باندھا ہی وہ محتاج بیان نہین یعنی دل کا خون ہونا اُس عضو کا خون ہونا جو مرکز خون کا خود ہی خون ہو۔ شعر کا مطلب یہ ہی کہ جب تک مین زندہ رہا تب تک بتون یعنی معشوقان جہان کو یا صرف میرے معشوق کو مہندی لگانے کی ضرورت نہین ہوئی کیونکہ میرا خون ہی اُن کے دست نازک رنگنے کے واسطے کافی تھا۔ اب جبکہ مین مرچکا ہون تو کوئی ایسا نہین رہا جس کے خون سے وہ ہاتھ رنگین۔ پس جب خون نہین تو لامحالہ انھین محتاج حنا ہونا پڑا یعنی مہندی لگانے کی ضرورت درپیش آئی۔ اور اس مہندی لگانے سے میرا دل جس کو خون سے خاص تعلق تھا باوجود خاک مین مل چکنے کے خون ہو رہا ہی یعنی اُس کو قلق ہے بیتاب بیچین اور مضطرب ہی۔ ظاہر ہی کہ یہ کرب صرف اس وجہ سے ہی کہ مین اُن کے ناخن رنگنے کے قابل نہ رہا۔ پہلے مصرعہ مین لفظ بتان بہت سے معشوق یا حسین ظاہر کرتا ہی اور اگرچہ بادی النظر مین بہت سے معشوقون کا ہونا بوالہوسی اور بیہودگی ظاہر کرتا ہی مگر دراصل اس مین ایک اور خوبی ہی اور اس صیغۂ جمع سے جمع اور واحد دونون معنی نکلتے ہین۔ زبان کا قاعدہ ہی کہ کہین تو کُل کیلیے ایک جزو اور کہین جزو کیلیے کُل کہین ظرف کیلیے مظروف اور کہین اسکے برخلاف استعمال کرتے ہین۔ مثلاً ہم روز مرہ بولتے ہین یار لوگ وہان ڈٹے ہوئے تھے یعنی صرف ہم۔ اُستاد آتش فرماتے ہین ؎

غیر نے کی بیوفائی سب کی شامت آگئی
آگ ہو جاتے ہین وہ اہلِ وفا کو دیکھکر

یہان سب سے مراد عاشق صادق یعنی صرف ذات خاص اور اہل وفا سے بھی مراد صرف "مین" ہی ہے اور کوئی نہین۔ اسی طرح ہم بجائے چراغ یا لیمپ کے صرف روشنی کہنے پر اکتفا کرتے ہین پس یہان لفظ "بتان" سے مراد صرف ایک مراد معشوق بصیغۂ واحد ہی نہ کہ دُنیا بھر کے بت۔ اور اگر ہم اس کو جمع کا صیغہ بھی مان لین تب بھی اُس سے یہ مطلب ہی کہ مین حسینان جہان کا اتنا بڑا دلدادہ اور ایسا عاشق تھا کہ ہر کسی کی ادا پر جان دینے کو تیار رہتا۔ الغرض ہر حسین کا سچا عاشق تھا یہ بھی مرنے والے کا کمال ظاہر کرتا ہے۔ دوسرے مصرعہ مین بجائے ہاتھ یا کف دست کے صرف ناخن کا محتاج حنا ہونا باندھا ہی۔ یہ شاعر کی کمال نازک خیالی کی دلیل ہی کیونکہ کسی کے گورے گورے لانبے ہاتھ بجائے اس کے کہ کل ہتھیلی کو مہندی لگائی جائے صرف اُنگلیون کی پورون کو حنا بستہ کرنے سے بدرجہا خوشنما معلوم ہوتے ہین۔

درخورِ عرض نہین جوہرِ بیداد کو جا
نگہِ ناز ہے سُرمہ سے خفا میرے بعد

یہ شعر شاعر کے خاص رنگ مین رنگا ہوا ہے اور اگرچہ فارسیت اُردو پر غالب ہی مگر دراصل اُس نے شعر کا لطف دوبالا کر دیا ہے اور شاعر کی قادر الکلامی اور زبان کی لطافت نے وہ لفظ جمع کر دیے ہین کہ شعر کو ہزارون دفع پڑھیے مگر لطف بڑھتا ہی جائے گا۔ شعر کی خوبی سمجھنے کے لیے صرف عرض اور جوہر کا فرق معلوم کرنا کافی ہوگا۔ جو شے کسی ذات مین قدرتاً موجود ہو اور اُس سے جدا نہ پائی جائے وہ جوہر ہے اور جو شے مکسوبہ ہو یعنی بعد مین داخل یا شامل کر دی گئی ہو یعنی عارض کی گئی ہو وہ عرض ہی

مثلاً کپڑے میں تار و پود جوہر ہیں اور رنگ عرض ہیں۔اس مصرعہ میں عرض کے معنی ظاہر کرنا، عائد کرنا، پھیلانا وغیرہ ہیں۔مثال کے طور پر مرزا صاحب ہی کا ایک شعر عرض ہے:

عرض کیجئے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

اس کے ساتھ ہی ہمیں سرمہ کا بھی ایک جوہر ہونا اور اس کا پھیلنا بھی نظر میں رکھنا چاہیئے۔جب یہ سب باتیں معلوم ہو گئیں تو صاف ظاہر ہے کہ پہلے مصرعہ کا نتیجہ دوسرے مصرعہ میں اور دوسرے مصرعہ کی وجہ پہلے مصرعہ میں ظاہر فرمائی گئی ہے یعنی خواہ اس طرح کہیئے کہ چونکہ جوہر بیداد یعنی معشوق کے ظلم و ستم کو جگہ درخور و قابل عرض نہیں رہی یعنی میرے مرنے کے بعد جب کوئی شخص ایسا باقی نہ رہا جس پر اُس کا جور و ستم ظاہر ہو سکے۔مطلب یہ کہ بعد میرے جب کوئی عاشق اُس کے ظلم و ستم برداشت کرنے کے قابل نہیں رہا اس لیے اُس نے سرمہ لگانا چھوڑ دیا (خفا ہونا یعنی چھوڑ دینا)۔" یہاں یہ بھی سوال ہو سکتا ہے کہ سرمہ میں ہی کیا خصوصیت تھی جو بیان کیا گیا۔اِس کی وجہ مذکورۂ بالا رعایتوں اور خوبی بیان کے علاوہ کسی گوز دیدہ نظر کے چرکہ کھائے ہوئے دل سے پوچھئے کہ نگاہ سرمہ آلود کیا اندھیر کرتی ہے۔اُس پر طرہ یہ کہ شاعر نکتہ رس نے ایک اور چرکہ دیا ہے یعنی نگہ ناز لودہ سرمہ آلود۔

دوسرے معنی اس طرح پر بھی کیے جا سکتے ہیں کہ میرے مرنے کے بعد معشوق نے جو سرمہ لگانا چھوڑ دیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی بیداد برداشت کرنے کے قابل کوئی عاشق نہیں رہا۔اِس درخور عرض نہ ہونے سے دو معنی نکلتے ہیں ایک طرف تو غایت بیداد جو بالکل نیچرل طور پر عاشق کو محسوس ہوتی ہے، دوسری طرف اور عاشقوں کی نااہلیت (یہ خیال بھی نیچرل ہے کہ میرے سوا دوسرے عاشق صادق نہیں ہو سکتے)۔غرض شعر کیا ہے خوبیوں کا مخزن ہے یا بلاغت کا دفتر۔واقعی مرزا صاحب نے شعر نہیں کہا بلکہ کرامت کی ہے۔

ہے جنوں اہل جنوں کے لیے آغوش وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد

اس شعر میں انتہائے جنوں کی حالت کا وہ نقشہ کھینچا ہے کہ شاید ہی اس سے بہتر بیان ہو سکے۔مطلب یہ ہے کہ اہل جنوں کے لیے جنوں آغوش وداع ہے یعنی اہل جنوں کو جب دورہ جنوں ہوتا ہے تو اپنے آپے سے رخصت ہو جاتے ہیں دوسری بات یہ ہے کہ چاک اور گریباں ایک ہی پیراہن کا حصہ ہیں اور اس طرح پر وہ ایک دوسرے کے قریب ہیں بگر فرماتے ہیں کہ میرے بعد یعنی میرے آپے سے گزر جانے کے بعد یا دوسرے لفظوں میں مجھ پر جنوں کا دورہ ہونے کے بعد چاک اور گریباں میں جُدائی ہوتی ہے۔یعنی چونکہ اہل جنوں دورہ جنوں ہوتے ہی آپے سے گزر جاتے ہیں میں نے بھی پیراہن کے ایسے ٹکڑے ٹکڑے اور دھجیاں کر ڈالی ہیں کہ چاک کہیں گیا اور گریباں کہیں۔" غرض اس طرح پر اُن میں بھی جدائی دکھلائی ہے اور آغوش وداع کو نبھایا ہے۔نیز دوسرے مصرعہ میں پہلے کا ثبوت اور پہلے میں دوسرے کا نتیجہ اس بلاغت سے بیان فرمایا ہے کہ سبحان اللہ!۔

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

اس غزل کے ہر شعر میں اور بالخصوص اس شعر میں مرزا صاحب نے وہ کمال فن ظاہر فرمایا ہے کہ ماشاء اللہ۔سارے شعر پر نظر دوڑا جائیے ایک حرف کیا ایک نقطہ بھی، ایسا نہیں کہ جو زوائد لگا دیا جائے

اور پھر اس شعر میں بجائے درستی کے موجودہ خوبیاں بھی باقی رہ جاتیں عشق کی مثال "مرد افگن" سے اتنی عمدگی سے دی گئی ہے کہ بس انھیں کا حصہ تھا - کیونکہ جہاں تک جی چاہے تشریح کیے جائیے مگر شراب اور عشق میں ذرا بھی فرق نہ آئے گا اور بالخصوص جب وہ مرد افگن کی خاصیت کے ساتھ مخصوص کر دی گئی ہو - اس کے بعد پورے مصرعہ کو دیکھئے بالکل یہی معلوم ہوتا ہو کہ کوئی پکار پکار کر دعوت دے رہا ہے - دوسرے مصرعہ کے لفظ "مکرر" نے شعر کی خوبی کو اس اعلےٰ درجہ پر پہنچا دیا ہو جہاں معمولی خیال کا گذر نہیں - اور اس کے ساتھ ذرا اس پہلو پر بھی نظر رہے جو آپ کے حریف "مرد افگن عشق" ہونے کا شعر سے نکل رہا ہو کیونکہ ان کے بعد اس صلا کا ہونا اس بات کی قوی دلیل ہو - اب شعر کے معنی بالکل صاف ہیں یعنی میرے بعد جب کوئی شراب عشق کا جو مرد افگن ہو مقابلہ کرنے والا یعنی پینے والا نہ رہا یا دوسرے معنی میں عاشق صادق نہ رہا تو لب ساقی (معشوق) پر بار بار یہ صدا ہو کہ "چلو! حریف مرد افگن عشق کون ہوتا ہو چلو!!" - اس کے علاوہ لفظ مکرر میں ایک اور خوبی پوشیدہ ہو جو بیحد لطیف ہو اور صرف پڑھنے سے ظاہر ہو سکتی ہو - یعنی "مکرر" اس بات کو ظاہر کرتا ہو کہ دو بار آواز لگائی جا رہی ہو - ان میں پہلی آواز کے معنی تو وہی ہیں جو بیان ہوئے یعنی دعوت - اور دوسری آواز یاس اور ناامیدی کی ہو یعنی پہلے آواز دی اور جب کوئی نہ آیا تو خود ہی کہتا ہو کہ بھلا اب کون ہوتا ہو الخ - سبحان اللہ سبحان اللہ!! -

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد

قاعدہ ہو کہ جب کوئی مر جاتا ہو تو لوگ اس کے عزیزوں کی تعزیت کرتے ہیں یعنی شریک رنج و الم ہوتے ہیں اور ایسے موقعوں پر اکثر یہ گفتگو ہوتی ہو کہ اگر کسی کا کوئی مربی انتقال کر گیا ہو تو تعزیت کرنے والے بزرگ اپنے آپ کو اس کی سرپرستی اور خبرگیری کے لئے پیش کرتے ہیں - اسی طرح حسب موقع دوستی و ہمدردی وغیرہ کا اظہار کیا جاتا ہو - شعر کا مطلب یہ ہو کہ "جہاں تک میں دیکھتا ہوں میرے بعد مہر و وفا کی تعزیت کرنے والا دنیا میں کوئی نظر نہیں آتا - اور اس غم کے مارے مرا جاتا ہوں" مرنے سے دونوں معنی لیے جا سکتے ہیں - یعنی ایک تو در اصل مرنا دوسرے غم سے مرنا یعنی بیحد غمگین ہونا یہاں پر یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ عاشق اپنے آپ کو سچا دعویدار محبت اور پکا وفادار سمجھتا ہو - اور یہ خیال شاعرانہ نہیں بلکہ بالکل نیچرل ہو - مرزا نے اس مطلب کو کہ تمام دنیا کی مہر و وفا صرف میری ہی ذات میں جمع ہو دکیونکہ جب ہی تو ان کے بعد اس کی تعزیت لازم آئیگی اور باقی تمام دنیا میں ان کے بعد کوئی مہر و وفا کا نام لیوا بھی نہ رہیگا اور اس طرح اپنے سوا تمام عاشقوں کہاں خوبیوں سے معراج کے طور اور بانکپن کے ساتھ بیان فرمایا ہو یہ کچھ انھیں کا حصہ تھا - اور فی الحقیقت نیچرل جذبات کو اس انداز و ادا کے ساتھ بیان کرنا کچھ انھیں استادوں کا کام تھا -

آئے ہو بیکسی عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائیگا سیلاب بلا میرے بعد

سبحان اللہ مقطع کیا فرمایا ہو کمال کیا ہو - صرف دو لفظوں یعنی "میرے بعد" میں تمام یہ مضمون بھر دیا ہو کہ اس وقت میں بلائے عشق میں مبتلا ہوں اور عشق کے سینکڑوں لوازمات کا میں مورد ہوں - اول تو عشق ہی کیا کم ہو - ہزاروں بلاؤں کی ایک بلا اور ہزاروں مصیبتوں کی ایک مصیبت - پھر اس کے ساتھ رنج و الم حزن و ملال ہجر و فراق آہ و زاری بیکسی و بیچارگی غرض ہر طرف سے سیلاب بلا کا زور شور ہو

اور عاشق بیچارہ (یعنی مین) تن تنہا سب کو برداشت کرتا ہو اور ہون نہین کرتا۔ پس فرماتے ہین کہ "اے غالب! اس وقت تو خیر مین موجود ہون جو عشق اور اس کے ساتھ اُس کی تمام مصیبتون کو برداشت کر رہا ہون۔ مگر اس کے ساتھ ہی جب مین اس حالت پر غور کرتا ہون کہ میرے بعد یہ عشق بیچارہ مارا مارا پھرے گا اور کہین اس کو جگہ نہ ملے گی تو بے اختیار رونا آتا ہے"۔ ایک معمولی بات تھی کہ میرے بعد کوئی عاشق صادق یا عشق کی مصیبتون کو برداشت کرنے والا نہین رہے گا مگر اس کو اس لطافت اور خوبی کے ساتھ بیان کیا ہو کہ مضمون مین جان ڈال دی ہو۔ بھلا اس سے زیادہ لطف زبان اور جذبات قدرت کا بیان کیا ہوگا ؏

مغربی شاعری کو آج کل عام طور پر نیچرل اور اس در اصل نیچرل شاعری کو بخیال اخلاق الہامی شاعری کہتے ہین۔ مگر افسوس کہ ان کہنے والون کی آنکھون پر تعصب کی سیاہ عینک چڑھی ہوئی ہو جو صحیح اور غلط مین فرق نہین بتلاتی یا نئی روشنی کے آتشی شیشون کا تیر لگا ہوا ہو جس کی وجہ سے اُن کی آنکھین چوندھیا گئی ہین اور کچھ نظر ہی نہین آتا۔ ورنہ کبھی ایسی غلطی نہ کرتے اور اب بھی اگر تھوڑی دیر کے لیے اسے اُتار ڈالین اور ذرا انصاف سے دیکھین تو معلوم ہو جائے گا کہ در اصل دونون نیچرل ہین۔ ایک مین (مغربی شاعری مین) وہ باتین ظاہر کی جاتی ہین جن کا ہمارے ظاہری حسون مین سے کسی نہ کسی سے کچھ تعلق ہو اور دوسری (الہامی شاعری مین) مین نیچر کے اعلیٰ جذبات اس موثر پیرایہ مین بیان ہوتے ہین جن کو صرف دل و دماغ ہی محسوس کر سکتے ہین۔

ضیائے عباس (بدایونی)

مزار غالب اس کرسمس نمبر میں جناب خلیق دہلوی کی ایک نظم درج کی جاتی ہے جس میں مرزا غالب کی حالت زار بیان کر کے پبلک سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ لوگ ان کے مزار کو ہاتھوں سے بچائیں۔ دہلی کے چند خاص حضرات اس کے متعلق خاص کوشش فرما رہے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ معاونین ہمدرد بھی اس کار خیر میں حصہ لیں۔ چار برس ہوئے کہ مسٹر محمد علی نے "ہمدرد" میں ایک اپیل شائع کی تھی اور پبلک نے اس تجویز کو نہایت پسند کیا تھا۔ چنانچہ ایک معقول رقم جمع بھی ہوئی تھی جس کی رسید ہمدرد میں چھپی تھی۔ خود ہم نے بھی ادیب مرحوم میں حساب علیحدہ کھولا تھا اور ایک خاصی رقم اس سلسلہ میں وصول ہوئی تھی۔ جب ہم نے ادیب سے قطع تعلق کیا تو وہ رقم بھی انڈین پریس کے حوالہ کر دی۔ اس کے بعد ہم نے دو تین دفعہ مسٹر محمد علی کو تحریک کی کہ اگر کام شروع کرنے کا ارادہ ہو تو یہ روپیہ منگا لیا جائے مگر ان کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ اب چونکہ حکیم محمد اجمل خان اور خواجہ حسن نظامی جیسے افراد اس تحریک میں شریک ہیں لہذا پبلک کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ ان کا عطیہ رائگاں نہ جائے گا۔ ادیب کے ذریعہ سے جو رقم فراہم ہوئی تھی وہ اس کام کے لیے انڈین پریس سے منگوائی جا سکتی ہے۔ نہیں معلوم مسٹر محمد علی کے جمع کردہ چندہ کا کیا حشر ہوا۔

جو حضرات اس کار خیر میں حصہ لینا چاہیں وہ اپنے عطیات حکیم محمد اجمل خان صاحب کے نام نامی پر دہلی کے پتہ پر ارسال فرمائیں۔ (ایڈیٹر)

مزارِ غالب

ہین مہربان میرے خواجہ حسن نظامی   جنکی ہو ذاتِ اقدس وحدانیت کی حامی
مضمون نگار ویسے ہین دُور دُور نامی   جھڑتے ہین پھول مُنھ سے تھے ہو خوش بیانی

درگاہ مین ہو رونق فیضِ قدم سے انکے
اوصاف کیا بیان ہون میرے قلم سے انکے

ملنے کا شوق اُنسے دلمین ہوا زیادہ   درگاہِ اولیا کا مین نے کیا ارادہ
صحبت کا لطف آیا پایا مزاج سادہ   تعریف کر رہا تھا ہر ایک پیر زادہ

درگاہ دیکھنے کو بیتاب ہو رہے تھے
سیماب بھی وہین پہ سیماب ہو رہے تھے

جب سیر کرنے نکلے دیکھا مزارِ غالب   زیرِ زمین نہان تھی فصلِ بہارِ غالب
یاد آ رہا تھا سب کو وہ افتخارِ غالب   نظرون مین پھر رہا تھا عز و وقارِ غالب

حسرت برس رہی تھی رُوتی تھی خوش بیانی
اُردو لحد کے اوپر کرتی تھی نوحہ خوانی

سنگِ مزار بالکل ٹوٹا ہوا پرانا   چھایا تھا آسمانی تربت پہ شامیانہ
غالب کی صحبتون کا یاد آ گیا زمانہ   وہ نظم عارفانہ مضمون عاشقانہ

ہر بات مین ظرافت ہر شعر مین لطافت
پابندِ وضعداری دلدادۂ شرافت

غالب کی یاد دلمین ہر پھر کے آ رہی تھی   دُنیا کی بے ثباتی آنکھون مین چھا رہی تھی
حسرت نکل نکل کے آنسو بہا رہی تھی   دورِ زمان کی گردش نقشہ مٹا رہی تھی

مٹی کا میرزا کو پھر یاد کر رہا تھا
تربت کا ذرہ ذرہ فریاد کر رہا تھا

افسوس زندگی ہے بے اعتبار کیسی   ہر چیز دنیوی ہے ناپائدار کیسی
جاتی رہی بوستان سے فصلِ بہار کیسی   شکلین نہان ہوئی ہین زیرِ مزار کیسی

بزمِ سخن کی زینت روحِ روانِ دہلی
مٹ جائے اسطرح سے نام و نشانِ دہلی

کہتے تھے جس کو ساقی میخانۂ سخن کا   دن رات پینے والا پیمانۂ سخن کا
انداز ہی نیا تھا افسانۂ سخن کا   سو جان سے تھا فدائی جانانۂ سخن کا

ہر شعر شمع روشن کاشانۂ سخن مین
اُسکے ہی دم قدم سے رونق تھی انجمن مین

اللہ کیا لفظون مین اعجاز بھر رہا تھا   نازک خیالیون کا انداز بھر رہا تھا
اُردو کے شاعرون مین آواز بھر رہا تھا   سو لطف بھر رہا تھا سو ناز بھر رہا تھا

جذبات کی ہمیشہ تصویر کھینچتا تھا
قربان اس ادا کے شمشیر کھینچتا تھا

تھی چلبلی طبیعت شوخی بھری ہوئی تھی   طبعِ روان کی جدت اُڑ کر پری ہوئی تھی
شاخِ سخن چمن مین اُس سے ہری ہوئی تھی   حسنِ بیان مین کیا کیا جلوہ گری ہوئی تھی

باغِ کلام مین تھین رنگینیان ہزارون
گلچین کر رہے تھے گلچینیان ہزارون

ارض و سما کے نقشے اُسکے خیال مین تھے   حسنِ بیان و معنی نورِ جمال مین تھے
اوجِ فلک کے جلوے اوجِ کمال مین تھے   سُن سُن کے ہر غزل کو صوفی بھی حال مین تھے

حُسنِ کلام اُسکا حُسنِ جبین سے بڑھکر
اشعار کی زمینین عرشِ برین سے بڑھکر

افسوس قبر اُسکی ٹوٹی ہوئی پڑی ہے   بوسیدہ ہو گئی ہے پھوٹی ہوئی پڑی ہے
دستِ فلک سے بالکل لوٹی ہوئی پڑی ہے   بے غور ہے نظر سے چھوٹی ہوئی پڑی ہے

مٹنے کو ہو رہی ہے غالب کی یاد ساری
شعر و سخن لحد پر کرتے ہین آہ و زاری

غالب کے قدردانو اس قبر کو بنا دو   ٹوٹا ہوا پڑا ہے سنگِ لحد جما دو

یہ یادر کھنگان ہیں جو حق نے کہہ دیا۔ دو پیسہ جو ایک دیگا۔ دیگا اُسے خدا دو

ہیں ہمزبان میری خواجہ حسن نظامی

دلے ہوئے ہیں جالب اُسکے خلیق حامی۔ بیتیعی دہلوی

نقشِ بہارِ شہرِ غالب ہے تیرون کی طرح

آ دیا اے جلوہ فروزِ روئے زیبائے سخن — تو وہ مجنون تھا، تھا تھی جیسے لیلائے سخن
تجھسے اُردو کا ہوا روشن چراغِ شاعری — آسمان پر تو نے پہنچایا دماغِ شاعری
شاعرانہ کیفیت سے دیکر عوام الناس کو — تو نے زندہ کر دیا موسیقیٔ احساس کو
تو بہارستانِ وجدانی کو لایا جوش مین — اور کی تحریک پیدا فطرتِ خاموش مین
دل مین جذباتِ لطیفہ کا تلاطم کر دیا — روح کو ممنونِ اندازِ تبسم کر دیا
فلسفہ رنگِ تصوف کا عیان تجھسے ہوا — عام فیضِ لطفِ ادراکِ نہان تجھسے ہوا

ہان بقولِ خویش ہاکر دے وہ ہر ذرا اُستاد ہیچ
ورنہ ہر حسن غالب جیدائے میخانہ ہیچ

(ارشد تھانوی)

موتیون کی لڑی

(تخمیس بر غزل حضرت غالب مغفور)

ملی کیا شئے ازل مین ایک قسمت واژگون کی — ابھی سے زندگی وابستہ لیکن بیسکون وہ بھی
جو کچھ سرمایۂ عمرِ دو روزہ ہو کہون وہ بھی — بساطِ عجز مین تھا ایک دل یک قطرہ خون وہ بھی
سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگون وہ بھی

محبت گو ہے بیگانہ تصنع سے تکلف سے — مگر جب غیر بھی ملنے لگے کچھ بے تکلف سے
میسر ان سے اپنے کو کیا ہم نے تکلف سے — رہے آزردہ ہم اُس شوخ سے چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنون وہ بھی

اجل کے آسرے پر ہم نے چاہا تھا کہ دل ٹھہرے — ٹھہر جاتا جو ہوتے حسرت جیتے جی کے پہرے
نہ ہو جب مرکے بھی امیدِ آسایش تو پھر کیجئے — خیالِ مرگ کب تسکین دلِ آزردہ کو بخشے
مرے دامِ تمنا مین ہے اک صیدِ زبون وہ بھی

فغان سے پیشتر بھی دل تڑپتا تھا مگر کم کم — معاذ اللہ اب تو یہ قیامت کا ہو گیا عالم
کر گویا اک جہان بیقرار ی ہے دلِ پُر غم — نہ کرتا کاش نالہ مجھکو کیا معلوم تھا ہمدم!
کہ ہو گا باعثِ افزایشِ دردِ درون وہ بھی

تغافل، دلستانی کا ہم کو تی اندازہ فریاد — تجبر دلبری کا ہے کوئی اندازہ فریاد
یہ یون خونِ تمنائے دلِ جانباز فریاد — نہ تا شایر پرسشِ تیغِ جفا پر ناز فریاد
مرے دریائے بیتابی مین ہے اک موجِ خون وہ بھی

تشبیہ غالب

"العصر" مین دیکھ کر فی البدیہ

سامنے آنکھون کے کس کا پیکرِ تصویر ہے — جس کی خاموشی مین بھی اک لذتِ تقریر ہے
دیکھنے والے پکاری ہو لرادت کا وفور — چشمِ نظارہ کو حاصل ہو زیارت کا سرور
آ یہ ہے غالب جنت نشین خلد آشیان — باعثِ اعزاز دلی نازشِ ہندوستان
جو نظیر اپنی تھا خود اس عالمِ ایجاد مین — اور اب یہ ہے خاکِ جہانِ آباد مین
زندگی بھر جو رہا سرمستِ صہبائے سخن — مرتے مرتے بھی نہ چھوٹا جامِ مینائے سخن
مر گیا لیکن ہجومِ شوق باقی رہ گیا
مٹ گیا پھر بھی نہ نورِ ذوق باقی رہ گیا

بسترِ مرگ۔ تو پی گئے سو کون

ہے آرام زیرِ چرخ، کیا یہ حوصلہ کیجے　　امیدِ کامیابی ہو تو عرضِ مدعا کیجے
تو ظرفوں کے کیوں بیکار کوئی التجا کیجے　　مئے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے

لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

یہ کج ادا ہے، ستے میں عاشق کے دل میں اسے کہ ارمان　　کہ باقی کے بقول ان کلیاں نکلا ہے از بکان
گر سن مجھے دو لفظوں میں شرحِ عمرِ پنہان　　مرے دل میں ہے غالب شوقِ وصل و شکوۂ ہجران

خدا وہ دن کرے جب اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی　　حالی (ہاشمی)

دردِ عشق

اے دردِ عشق ہے گہرِ آبدار تو　　نامحرمون مین دیکھ نہو آشکار تو
پنہان تہِ نقاب تری جلوہ گاہ ہے　　ظاہر پرست محفلِ نو کی نگاہ ہے
آئی نئی ہوا چمنِ ہست و بود مین　　اے دردِ عشق اب نہین لذت نمود مین
ہان اخود نمائیون کی تجھے جستجو نہو　　منت پذیر نالۂ بلبل کا تو نہو
خالی تری شراب سے گلشن کا جام ہو　　پانی کی بوند گریۂ شبنم کا نام ہو
پروانہ سوزِ شمع یہ قسمت کو رو کے آئے　　ذوقِ تپش سے بزم مین آزاد ہو کے آئے
پوشیدہ کنجِ دل مین کہین راز ہو ترا　　اشکِ جگر گداز نہ غماز ہو ترا
گویا زبانِ شاعرِ رنگین بیان نہو　　آوازِ نے مین شکوۂ فرقت نہان نہو

یہ دور نکتہ چین ہے کہین چھپکے بیٹھ رہ
جس دل مین تو مکین ہے وہین چھپکے بیٹھ رہ

غافل ہے تجھ سے حیرتِ علم آفریدہ دیکھ　　جویا نہین تری نگہِ نارسیدہ دیکھ
اس بزم مین کسی کو نہین آرزو تری　　سوتی ہے تو ہٹے نہ کہین آبرو تری
رہنے دے جستجو مین خیالِ بلند کو　　حیرت مین چھوڑ دیدۂ حکمت پسند کو
جس کی بہار تو ہو یہ ایسا چمن نہین　　قابل تری نمود کے یہ انجمن نہین
یہ انجمن ہے کشتۂ نظارۂ مجاز　　مقصد تری نگاہ کا خلوت سرائے راز
ہر دل مئے خیال کی مستی سے چور ہے　　کچھ اور آج کل کے کلیمون کا طور ہے
محفل یہ مرمٹی ہے شرابِ مجاز پر　　اور اک طعنہ زن ہے سرورِ گداز پر
رہبر تو خضرِ فکر ہے اور ذوق دیدہ ہے　　ہاتھون مین انجمن کے پرانی کلید ہے
نایاب ہو کے اپنی حقیقت دکھا نہین　　جو عجز مین نہان ہے وہ قوت دکھا نہین
فکرِ بلند غرقِ شرابِ غرور ہے　　اس بے خبر کو راہ پہ لانا ضرور ہے
طے کرکے آسمان کو جو بے مدعا پھرے　　دیوانہ وار تیرا پتہ پوچھتا پھرے

بیتاب پھر جہان ہو ترے اشتیاق مین
گریان ہو چشمِ حسن بھی ترے فراق مین

اقبال

زبان اُردو

کھلے نصیب ہمارے جو لکھنؤ آئے　　کہ اِس چمن میں چمن سے رنگ و بو آئے
خلیق تند خشا سو نکے ادھر آئے　　ادب آ گئے زبان پر جو گفتگو آئے

یہ شہر وہ ہے جو اہلِ کمال کا گھر ہے
دُرِ سخن کا اِسی شہر میں سمندر ہے

بیان کی شوکتیں بھی یہیں جہان میں ہیں مشہور — یہ خطہ وہ ہے جہاں لطفِ بیان میں ہے مشہور
زبان وہ کہ جو اہلِ زبان میں ہے مشہور — یہ شہر وہ ہے جو ہندوستان میں ہے مشہور
یہی زمین تھی انیس و دبیر کا مسکن
یہی جگہ تھی جلال و امیر کا مسکن

زبانِ اُردو کی تاریخ کا یہ مدفن ہے — مگر لگا ہوا مدفن پہ سبز گلشن ہے
برس رہا ہے ابرِ کمال ساون ہے — بھرا ہوا گلِ مقصد سے سب کا دامن ہے
جہاں یہ اس لیے مجلس ہوئی عظیم الشان
کہ لکھنؤ میں ہیں جادو نگارِ سحر بیان

نہ مجھ کو فخر ہے نازک خیال ہونے کا — نہ مجھ کو فخر ہے شیریں مقال ہونے کا
نہ مجھ کو فخر ہے اہلِ کمال ہونے کا — نہ مجھ کو فخر عدیم المثال ہونے کا
اس انجمن کی شراکت پہ ناز کرتا ہوں
درِ سخن کو بصد عجز باز کرتا ہوں

یہ وہ زبان ہے شیریں کہ سب کو پیاری ہے — زبان کاہے کو ہے موجِ بہاری ہے
سرا میں کیوں نہ چلے یہ زبان ہماری ہے — یہ فخر کم ہے کہ ہندوستان میں جاری ہے
اسے گھمنڈ ہے ملکی زبان ہونے کا
بلند مرتبہ عالی نشان ہونے کا

عجب زبان رنگیلی نئی نویلی ہے — جو لال قلعہ کی شہزادیوں میں کھیلی ہے
سہیلیوں میں نہیں فارسی اکیلی ہے — کہ برج بھاشا بھی اس کی سگی چھبیلی ہے
ہزار ناز سے شاہ جہان نے پالا ہے
اسی سبب زمانے میں بول بالا ہے

سخن کا دودھ پلایا ہے نکتہ دانوں نے — کھلا کھلا کے بڑھایا ہے نکتہ دانوں نے
ہزار بار جلایا ہے نکتہ دانوں نے — کہیں کہیں سے ملایا ہے نکتہ دانوں نے
وہ استعاروں کے رنگین لباس پہنائے
کہ جن کو دیکھ کے توس قزح بھی شرمائے

دکھائی اہلِ قلم نے عجب قلمکاری — جو ایک بیل ہری ہے تو ایک گلناری
ہر ایک نظم میں تشبیہ کی طرح داری — مزا یہ ہے کہ صنائع کے ساتھ ہے جاری
جو سین باغ کا کھینچا بنا دیا گلزار
ہر ایک لفظ میں نسرین و نسترن کی بہار

مگر زمانے نے ان پر کیے ستم کیسے — کہ ملتی ہی نہ رہی گھس گئے قلم کیسے
نہ پوچھیے میں راہِ ترقی میں خارِ غم کیسے — کہ راستہ ہے کٹھن چڑھ گئے ہیں دم کیسے
مسافرانِ کمال و ہنر تھکے ہارے
غریب بیٹھ گئے گھر میں بھوک کے مارے

تمھیں بتاؤ ترقی کرے تو کون کرے — کتب میں جان کھپائے بھرے تو کون مرے
یہ بوجھ پیٹھ کے اوپر دھرے تو کون دھرے — قلم بنائے سیاہی بھرے تو کون بھرے
اسی سبب سے زبان اپنی رہ گئی محدود
کہ قدرداں زمانے سے ہو گئے مفقود

اب اہلِ علم کی کوشش ہے شان بن جائے — یہ آرزو ہے کہ علمی زبان بن جائے
جہان میں ساری زبانوں کی جان بن جائے — زبانِ اُردو جواہر کی کان بن جائے
ہر ایک قسم کے اس کو علوم سے بھر دیں
فلاسفی سے سجا دیں نجوم سے بھر دیں

انھی طریقوں سے ہو گا یہ مدعا حاصل — کہ ہر طرح کے ہوں تعلیم یافتہ شامل
فلاسفی کا کرے کوئی ترجمہ قابل — جو اتفاق باہم ہو تو کچھ نہیں مشکل
خلیق اُردو زبانوں میں انتخاب بنے
یہ بزم اپنے ارادوں میں کامیاب بنے

[illegible]

سر سید مرحوم کی یاد

یارب تو ہی ربِ انس و جان ہے — انعام ترا جہان جہان ہے
ہے تجھ سے صدف گہر بداماں — گل گل ز گل سے باغ خنداں
مفتاحِ سخن زبان ہے تجھ سے — تاثیر طلب فغان ہے تجھ سے
دل کھینچ ہی لے ترا بسیرا — دم بھرنے لگے زمانہ میرا
خامہ نہ کرے رقم میں خامی — پیدا کرے نام نیک نامی

نغمہ یہ اُسی کے ساز کا ہے — نالا اُسی نے نواز کا ہے
تھا جس کو سرِ ترقیِ قوم — نادان سے تھے جسکے سنگدل ہوم
وہ قوم کا خادم اور مخدوم — تھی جسکے فغان کی ہر طرف دھوم
کوشش کی کمر جب اُس نے کس لی — راحت کسی دن نہ یکنفس لی
نیچر ہوا قوم کے لیے وہ — بے سر ہوا قوم کے لیے وہ
کافر اُسے قوم نے بنایا — غصہ اُسے اسپہ بھی نہ آیا
آفت پہ اُٹھائی آفت اُس نے — پھر بھی نہ ہاری ہمت اُس نے
اپنا دیکھا نہ غیر دیکھا — کعبہ دیکھا نہ دیر دیکھا
جلسہ چھوڑا نہ کوئی دربار — صحرا چھوڑا نہ کوئی گلزار
پہنچا نہ کہاں کہاں وہ داعی — کس کس کا نہ وہ ہوا سلامی
جس بزم میں اُس نے بار پایا — اپنا ہی پہلے راگ گایا
مسجد مین یہی کی سبحہ خوانی — مندر مین یہی کتھا بکھانی
ہو حق یہی خانقاہ مین کی — حجت یہی درسگاہ مین کی
جُبّے کو کہین گلے مین ڈالا — پھیری کہین شیوجی کی مالا
ناٹک مین بھی جا کے سانگ لایا — ہر در سے غرض وہ مانگ لایا
فرہاد تھا اپنی دُھن کا جبتک — کی کوہ کنی بھی جان کنی تک
جانکاویون سے نہ باز آیا — تو قوم کو اپنے ڈھب پہ لایا
کس درجہ بلند حوصلہ تھا — ہر وقت یہ جوش و ولولہ تھا
اللہ رے بوڑھے تیری ہمت — سید تجھے ہزار رحمت!

اِس درجہ تھی تجھ کو اُلفتِ قوم
کی زیست تک اپنی خدمتِ قوم

ہماری زبان

اے سبع رواں اُردو بلکہ جانِ جہاں اُردو ہندو کہ مسلماں ہے
اس ہند میں مشرق کی، مغرب کی زباں اُردو سب پر ترا احساں ہے

کیا جوت لگائی ہے جو کچھ ترے ڈیوٹ نے روشن ہے زمانے پر
اندھیر مچایا ہے آپس کی رکاوٹ نے ایکا ہے مٹانے پر

کیا جھوٹ میں ایکا ہے ایسا کہیں دیکھا ہے گر آپ بھی مٹ جائیں
سوچا ہوا یاروں کا بے جا بھی تو برجا ہے مٹ جائینگے بازدین

اُردو جو نہیں سب کی ہندی ہو کب اس ڈھب کی سوچیں تو ذرا اسکو
تمہید یہ مطلب کی اب کی ہے نہ گو جب کی سمجھائیے کیا کس کو

کیتھی کے دھکیلنے سے دفتر میں بڑھی دقت سچ ہے کہ نہیں کہئیے!
شاہد مرے لفظوں پر حرفوں کی ہے خود قلت بس چپ بھی کہیں رہئیے

اُردو ہی زباں وہ ہے سب جسمیں سما جائیں پشتو ہو کہ انگریزی
تحریر و تلفظ میں، لہجے میں بھی آ جائیں اُف! اسکی ملاویزی

چلتی ہوئی گاڑی میں، اٹکاتے ہو کیوں روڑے آخر یہ زباں کس کا؟
اس عام شکایت سے نالاں ہیں ہمیں تھوڑے شاکی ہو جہاں اسکا

اُردو ہی زبان وہ ہے کہ مہ سکتے جسے ملکی انصاف کماں بکین
تھم جائے صدا اسمت دلِ سوختہ بلبل کی آزاد اپنا نکمن

(از [illegible])

حضرت گورونانک

جامِ توحید سے سرشار گورونانک تھے بزمِ عرفان کے قدح خوار گورونانک تھے
نورِ وحدت کے طلبگار گرونانک تھے زاہد و عابد و دیندار گرونانک تھے

آپکے پیش نظر عالمِ ہو رہتا تھا
آپکے وردِ زبان واہگرو رہتا تھا

ایک تھے ہندو مسلمان نظر مین اُنکی وید جھوٹا تھا نہ قرآن نظر مین اُنکی
ہیچ تھے عیش کے سامان نظر مین اُنکی تھے پرستان بیابان نظر مین اُنکی

ایک اونکار کا رہتا تھا جلال آنکھون مین
نور افگن تھا حقیقت کا جمال آنکھون مین

خواب دنیا ہے براکام ہے جھوٹا اسکا قول تھا آپکا آرام ہے جھوٹا اس کا
نیست ہر شکل ہے ہر نام ہے جھوٹا اسکا کفر سچا ہے نہ اسلام ہے جھوٹا اس کا

عمر ہستی کے سمندر مین گذارے ایسے
آب کی سطح پہ ہو پھول کنول کا جیسے

بر تمہ کا دھیان رہے ذات وہی ذات رہے نام کا جاپ کرو گیان کی ہر بات رہے
اونچون نیچون مین کھلے دل سے ملاقات رہے روز آپس مین تواضع مدارات رہے

ایک ہی باپ کے بیٹون مین لڑائی کیون ہو
ایک ہی بحر کے قطرون مین جدائی کیون ہو

ذاتِ حق کچھ حرم و دیر مین محدود نہین کونسی جا ہے جہان جلوۂ معبود نہین
کونسی شکل ہے جس شکل مین موجود نہین کونسا بحر ہے جس مین دُرِ مقصود نہین

صاف دل دیکھتے ہین حاضر و ناظر اُسکو
واقفِ سرِ نہان کرتے ہین ظاہر اُسکو

مرحبا پنج گرنتھی کی منوہر بانی بھر دئے کوٹ کے انمول رتن نورانی
قابلِ داد ہے نظمون کی گہر افشانی سیکھ لے آپ سے تعلیم کوئی روحانی

صبح صبح مین خضوری کا مزا آتا ہے
بزم وحدت کے تکلف کا مزا آتا ہے

نام مشہور ہوا آپکا یکتائی سے   مرشد دیر بنے حق کی شناسائی سے
فقر و تسلیم و قناعت سے شکیبائی سے   لاکھ کو ایک کیا طاقتِ گویائی سے

ذات مین محو رہے زندۂ جاوید ہوئے
خاکِ پا آپ کے سب زندۂ جاوید ہوئے

پاک بازون سے بھرا آپکا میخانہ تھا   حق تھی شیشے کی صدا، دین پیمانہ تھا
بالا کرتا تھا جنون عشق کا مستانہ تھا   رات دن حمد خدا گانے کو مردانہ تھا

بے بہا آپکی تصویر ہے تصویر نہین
شمع توحید کی تنویر ہے تصویر نہین

معتقد آپکے تھے ہندو مسلمان اکثر   اے خلیق آئی دم مرگ کرامات نظر
جسم خاکی نہ رہا رہ گئی خالی چادر   ایک نے دفن کیا ایک نے پھونکا جاکر

چادرہ چار ہوئے تقسیم کیا دونون نے
مرتبہ فقر کا ثابت کیا دونون نے۔ خلیق (دہلوی)

(امیر مینائی)

اے جگت اُستادِ اقلیمِ سخن کے تاجدار ۔ خاندانِ مصحفی کے جانشین یادگار
تجھ پہ صدقے ہے زباندانی سخن سنجی نثار ۔ ناز تجھ پر ہند کو اُردو زبان کو افتخار
بادشاہِ کشورِ معنی امیر لکھنوی
تجھ سے روشن ہو گیا نام امیر لکھنوی

اے سراجِ سخن مہرِ درخشانِ سخن ۔ زیبِ ایوانِ سخن شمعِ شبستانِ سخن
دُرِ غلطانِ سخن لعلِ بدخشانِ سخن ۔ ناظمِ ملکِ سخن روحِ سخن جانِ سخن
سحر ہے تیرا بیان اعجاز گویائی تری
شاعری کو کر گئی زندہ مسیحائی تری

خامۂ جادو رقم تیرا مصورِ باکمال ۔ چہرہ آرائے طلسمِ فکر و نیرنگِ خیال
ساحری فن ساحرِ افسونگرِ سحرِ حلال ۔ رو کشِ بہزاد و مانی نقش بندِ خط و خال
شاہدِ حسنِ معانی کا سراپا دیکھ کر
تیرے آگے دنگ ہے نقاش نقشا دیکھ کر

مثنوی قطعہ رباعی یا قصیدہ یا غزل ۔ خوشنما خوش قطع خوش اسلوب چسپاں برمحل
تازگی بر جستگی میں اک سے اک ضرب المثل ۔ بے عدیل و بے مثال و بے نظیر و بے بدل
سارے اصنافِ سخن پر قدرتِ کامل تجھے
نکتہ سنجی میں یدِ طولیٰ ہے فن حاصل تجھے

دلربا دلچسپ دلکش داستانِ حسن و عشق ۔ پُر اثر پُر سوز و درد آگین بیانِ حسن و عشق
دونوں دیوان میں ترے روحِ روانِ حسن و عشق ۔ ہر غزل ہر بیت ہر مصرع ہے جانِ حسن و عشق
شعر ہیں جو رنگ میں ڈوبے ہوئے تاثیر کے
ہیں وہ تیر ترکشِ غالب کے نشتر میر کے

نکہتِ زلفِ رسا و شرحِ جنگِ گرمِ تُرکِ مست ۔ نالہائے جانگداز و نغمہ ہائے دلنواز
شوخی و شرم و ادا و غمزہ و انداز و ناز ۔ یعنی حسن و عشق کے سامانِ صدہا راز و نیاز
اک مرقع میں ترے یکتا ہزاروں صورتیں
اک صنم خانے میں تیرے لاکھوں پیاری مورتیں

تھا الگ دلی سے رنگِ شاعرانِ لکھنؤ ۔ سادگی سے لائی رنگینی زبانِ لکھنؤ
مانتے ہیں سب کہ آتش کو جانِ لکھنؤ ۔ تجھ کو زیبا ہے کہیں گر روحِ روانِ لکھنؤ
کون کہتا ہے فقط ہندوستان میں دھوم ہے
اب تری اُردو زبان کی اک جہاں میں دھوم ہے

بجھ گیا دہلی میں جب ایوانِ شاہی کا چراغ ۔ شاعری گل ہونے والی تھی کہ چمکا نام داغ
لکھنؤ کو بھی دکھایا بختِ بد نے سبز باغ ۔ طوطی و بلبل ہوئے گویا شکارِ بوم و زاغ
طائرِ خوش لہجہ چہکائے چمن سے جا کے دور
ہو گیا گلزار دربارِ رئیسِ رامپور

تیرے نغموں سے ہوا آباد صحنِ گلستان ۔ رنگ پھر جمنے لگا پھولی پھلی اُردو زبان
مرحبا اے ہم صفیرِ بلبلِ ہندوستان ۔ تو نے پایا خلعتِ اُستادیِ خلد آشیان
مل گئے کیا کیا قلمروِ نظم کی جاگیر میں
بج گئے ڈنکے دیارِ مصحفی و میر میں

ساحری ہے شاعری یا ہے عمل تسخیر کا ۔ دل ہے قبضے میں اسی کے ہر جوان و پیر کا
جو ہے قائل جذبِ حسن و عشق کی تاثیر کا ۔ اُس کے سینے کو بناتی ہے نشانہ تیر کا
ہے ہیولائے ذوق پیدا اسکے سوز و ساز پر
نغمۂ جان بخش پر آہنگ خوش انداز پر

کوئی انشا اور سودا کا کوئی دیوانہ ہے ۔ مصحفی کا لب پہ افسوں میر کا افسانہ ہے
ذوق و غالب کا کسی کے ہاتھ میں پیمانہ ہے ۔ گرم کیا شعر و سخن کا جلسۂ رندانہ ہے
دورِ آخر میں تھے مدہوشِ صہبائے سخن
جام مینائی سے ہیں سرخوش جویائے سخن

شفق عماد پوری

زبانِ اُردو

ہے جو مشہور زمانے مین زبان اُردو | شکر صد شکر ترقی پہ ہے شان اُردو
اسکی تولید ہوئی شاہجہان کے گھر مین | اسطرح کرتی ہے تاریخ بیان اُردو
ماجد انی ہے شہنشاہونکی دلّی تک | فخر کی بات ہے شاہی ہے زبان اُردو
روزمرہ ہے جو دلی کے سخندانون کا | ہے حقیقت مین یہی روح روان اُردو
بامزیان حمل کیا کرتی تھین اِس جگہ کی | وہ تھی لال حویلی ہے مکان اُردو
جانچ لیتے ہین پرکھ لیتے ہین جو ہین ماہر | انکو معلوم ہے دو شہرون مین کہان اُردو
میر و غالب تھے یہان آتش و ناسخ تھے وہان | کیون نہ زندہ رہے پھر نام و نشان اُردو
چال مین ڈھال مین نوک پلک مین جیسی بانکی | لاکھ مین ایک ہے معشوق زبان اُردو
تیر کی شکل مین چلتے ہین فقرے اُسکے | شکلِ ابروے حسینان ہے کمان اُردو
کیا فصاحت و بلاغت کے ہین کھلتے اسمین | لوگ کہتے ہین خریدار ہے حیران اُردو
گرم بازار رہے گا کہ ہین ہزارون اُسکے | یہ چلتی رہتی ہے زمانے مین دکان اُردو
سب ہی باتونکی ہے چھیل مٹھائی اسمین | ذائقہ بخش ہے شیرین ہے زبان اُردو
قیصر ہند نے لندن مین اسے سیکھا ہے | کیون نہ لہرائے بلندی پہ نشان اُردو

[illegible] لکھنؤ ۱۲

اسمین بچپن ہی سے عادت ہے ملنساری کی — میل رکھتی ہے زبانون سے زبان اُردو

آفرین آفرین کہتے ہین سخن فہم خلیق

تیری ہر نظم حقیقت مین ہے جانِ اُردو

خیر مقدم انصاری

جسکی آمد کی خوشی آج ہو انسانونکو   جسکے دیدار کا ہے شوق مسلمانون کو
جسکے انوار سے زینت ہوئی کاشانونکو   صاف کرتی ہو صبا کیون چمنستانون کو

"باغ مین گل کھلے جاتے ہین کہ وہ آتے ہین"
"پنچھیان سر و اٹھاتے ہین کہ وہ آتے ہین"

اہل اسلام کا ہمدرد کوئی آتا ہے   شیر دل اور جوانمرد کوئی آتا ہے
تجربہ کار جہان گرد کوئی آتا ہے   یون تو لاکھون مین مگر فرد کوئی آتا ہے

ڈاکٹر نام کا اپنے ہے جو مختار احمد
ہو اسی قوم کے جانباز کی آمد آمد

تمکو معلوم بھی ہو آپ کی عزت کیون ہو   ڈاکٹر اور حکیمون پہ فضیلت کیون ہے
آپ سے قوم کے بچون کو محبت کیون ہو   آپکی دید کی ہر شخص کو حسرت کیون ہے

آبرو پائی ہو ہمت سے جوانمردی سے
قوم ہمدرد بنی آپکی ہمدردی سے

ہاتھ پر ہاتھ دھرے آپ سے بیٹھا نہ گیا   زخمی ترکون کو تڑپتے ہوے دیکھا نہ گیا
بس تیغ ستمگار سے سرکا نہ گیا   آپ ہی اُڑکے سر شمع پہ پروانہ گیا

یعنی ٹرکی مین گئے طبی مشن کو لیکر
ساتھ کچھ اور محبان وطن کو لیکر

ایک سے ایک سوا انمین ہنر رکھتا تھا   بات جو کہنے کی ہوتی تھی وہ کر رکھتا تھا
ہاتھ شافی تھا دوا اُن مین اثر رکھتا تھا   رات دن زخم رسیدون کی خبر رکھتا تھا

ظالمون نے جو دیا توڑ شکستہ دل کو
مومیائی سے دیا جوڑ شکستہ دل کو

آپ ٹرکی مین رہے رشک مسیحا ہو کر   کوئی مردہ بھی اگر تھا رہا زندہ ہو کر
چلنے پھرنے لگا بیمار بھی اچھا ہو کر   چشم امید رہی زخم پہ پھاہا ہو کر

سر مین گر درد ہوا سر کو دبا لے بیٹھے
آپ بیمار کی تسکین کو سرہانے بیٹھے

ہو کوئی ایسا جوانمرد مسلمانون مین   جو محبت کا نمونہ بنے انسانون مین
جان ڈالے نئی ترکیب سے بیجانون مین   تیر مارا ہی یہی آپ نے میدانون مین

بھولکر بھی نہ لیا ہاتھ مین تلوارون کو
یہ بڑا کام تھا اچھا کیا بیمارون کو

یون بہادر تھے بہت توپ چلانے والے   بڑھ کے میدان مین دو ہاتھ دکھانیوالے
ان سے بھی بڑھ کے ہین ہمت سے بڑھانیوالے   ہاتھ سے زخم رسیدون کو اُٹھانیوالے

قوم سیکھے گی سبق آپ سے ہمدردی کا
اے خلیق آپ نمونہ ہین جوانمردی کا

خلیق دہلوی

مسٹر رابندر ناتھ ٹیگور کو مبارکباد

آج کسکے نام پر ہندوستاں کو فخر ہے کسکی مضموں آفرینی پر جہاں کو فخر ہے
موج دریا بنگئی طبعِ رواں کو فخر ہے شاعری کو ناز، بنگالی زباں کو فخر ہے
ایشیا تو ایشیا۔ ہے آجکل یورپ میں شور
مستحق نوبل پرائز کے ہوئے مسٹر ٹیگور

ہوگئی مشہور دوراں خوش مقالی آپ کی خوش مقالی بنگئی ہے خوش بیانی آپکی
نیچرل مضمون۔ پاکیزہ خیالی آپ کی اہلِ مغرب مانتے ہیں باکمالی آپ کی
بانکپن میں سادگی ہے سادگی میں بانکپن
آفریں صد آفریں کہتے ہیں سب اہلِ سخن

کیا نرالے ہیں مضامیں کیا اچھوتا ہے کلام بزم کی آرائشیں ہیں رزم کے ہیں اہتمام
اہلِ عرفاں پی رہے ہیں بادۂ وحدت کے جام پریمیوں کو پریم کا رس آرہا ہے صبح و شام
باغ سمجھے ہیں منادل گر رہے ہیں ٹوٹکر
نیچری کہتے ہیں نیچر بھر دیا ہے کوٹ کر

ہر زمینِ شعر یوں اٹھی ہے میں گلزار ہوں مصرعہ مصرعہ کہہ رہا ہے ابرِ گوہر بار ہوں
لعل و گوہر جھڑ رہے ہیں جوہری بازار ہوں ہنس کے رہتا ہوں منہ میں موتیوں کا ہار ہوں
روز مرہ ہے سراسر شعر خوانی آپکی
ہے تصنع سے بری معجز بیانی آپ کی

آپ کے دیوان کا ہر شعر ہے رشکِ چمن ناز کرتی پھر رہی ہے باغ میں بوئے سخن
اور پروانے ہیں شاعر تم ہو شمعِ انجمن فخر کرتی ہے تمہاری ذات پر بزمِ سخن
عشق بازوں کے لیے ہیں عشق کی جانبازیاں
طفلِ مکتب کو سکھائی ہیں ادب دانیاں

واقعی علم ادب میں بوستاں کا آب ہو تجلیٔ مضموں میں اخلاق ہو آداب ہو
غیرتِ کانِ جواہر، گوہرِ نایاب ہو دوستوں کی دل لگی ہو محفلِ احباب ہو
بادۂ وحدت سے صوفی جھومتے ہیں وجد میں
شعر پڑھ پڑھکر اچھلتے گھومتے ہیں وجد میں

دیش بھگتی کے لیے نازک بیانی ہو گئیں بردباری انکساری خاکساری ہو گئیں
مادرِ ہندوستاں کی پاسداری ہو گئیں جاں نثارانِ وطن کی جاں نثاری ہو گئیں
بھر دیا جذبِ محبت نظم میں تاثیر ہے
سینہ جو کھینچا ہے بیتی جاگتی تصویر ہے

اہلِ مغرب چونک اٹھے قدر دانی دیکھکر مستحق انعام کا ہندوستانی دیکھکر
ہوگئے قائل طبیعت کی روانی دیکھکر آفریں کہنے لگے معجز بیانی دیکھکر
معدنِ علم و ہنر کے بے بہا الماس ہو
ہند میں تم شیکسپیر اور کالی داس ہو

قدر افزائی سے ہمت بڑھ گئی ہے آپ کی علم کی دنیا میں عزت بڑھ گئی ہے آپ کی
نیکنامی اور شہرت بڑھ گئی ہے آپ کی ساتھ دولت کے طبیعت بڑھ گئی ہے آپکی
فخر ایسی ذات پر کرتا ہے کل ہندوستاں
دو مبارکباد تم بھی اے خلیقِ شادماں

خلیق دہلوی

مسز سروجنی نائیڈو

روشن ہوئے ہیں جس سے علم و ہنر کے اختر — سمجھو اسی کو مرکز دنیا کی روشنی کا
شعر و سخن میں لیکن مغرب کے آسمان پر — چمکا ہوا ہے تارا لیڈی سروجنی کا

ہر ایک معترف ہے پائی ہے وہ طبیعت — تسلیم ہو چکا ہے ماہر ہے اپنے فن کی
قربان ہو رہی ہے ہر شعر پر فصاحت — ہر نظم بن گئی ہے تصویر بانکپن کی

دیکھو دکھا رہی ہیں تیری نشیلی نظمیں — گویا بھرے ہوئے ہیں صہبائے نو کے پیالے
اشعار تیرے سن کر مدہوش ہو رہے ہیں — میخانہ اپنا بھولے بیٹھے ہیں پینے والے

محفل میں کر رہا ہے گلپاشیاں تکلم — رونق ہے مجلسوں کی حسن بیان سے تیرے
بتلا رہا ہے اپنی مواجیاں تکلم — اک بحر جوش زن ہے طبع رواں سے تیرے

وہ عندلیب ہے تو جس پر نثار ہیں گل — کیا دلفریب تیری یہ نغمہ سنجیاں ہیں
کہنے کو گو چمن میں یوں تو ہزار ہیں گل — اُنہیں کہاں نصیب ایسی نکہت فشانیاں ہیں

پیش نظر ہوں جس دم ہندوستاں کے منظر — پھر کوئی آ کے دیکھے جولانیاں قلم کی
ہر شعر بن گیا ہے حب وطن کا زیور — ہر نظم پر گماں ہے تصویر ہے ارم کی

یورپ کے شاعروں میں پائی ہے تو نے عزت — سکہ جما ہوا ہے نقد سخن کا تیرے
مغرب کی سرزمیں پر قائم ہے تیری شہرت — سورج چمک رہا ہے کیا علم و فن کا تیرے

وہ نظم ہے اثر زا ہے جو اپنی سادگی سے — جذبات صادقہ کی تصویر بن گئی ہے
دل میں اتر گئی ہے از بسکہ دلکشی سے — ہر بات تیرے منہ کی شمشیر بن گئی ہے

دونی ہو تیری حرمت ہو عمر جاودانی — تو کرتی رہی ہے خدمت کس شوق سے وطن کی
دائم رہے جہاں میں یہ تیری خوش بیانی — قائم رہیں ہمیشہ شادابیاں سخن کی

قیصر (از بھوپال)

ترجمۂ رُباعیاتِ عُمر خیام

گو گوہرِ طاعتت نسُفتم ہرگز ... گرد گنہ از چہرہ نرُفتم ہرگز
نومید نیم ز بارگاہ کرمت ... زانرو کہ یکے را دو نگفتم ہرگز

موتی تری طاعت کا پرویا نہ کبھی ... چہرہ عرقِ شرم سے دھویا نہ کبھی
پھر بھی نہیں مایوس کرم تجھ سے کہ مَیں ... بندہ تیرے ہوا غیر کا جو یا نہ کبھی

آمد سحرے ندا ز میخانۂ ما ... کاے رندِ خراباتی و دیوانۂ ما
برخیز کہ پُر کنیم پیمانہ ز مے ... زان پیش کہ پُر کنند پیمانۂ ما

اِک صبح صدا آئی یہ میخانے سے ... اے رندِ خرابات مرے دیوانے
اُٹھ جام بھر ے سے ابھی جلد آج ... پیمانۂ تن سے یہ جان چھلکے

این کوزہ چو من عاشقِ زاری بودست ... کاندر طلب روے نگارے بودست
این دستہ کہ در گردن او می بینی ... دستیست کہ در گردنِ یارے بودست

یہ کوزہ بھی مجھسا کوئی بسمل ہوگا ... یا راس کا کوئی حورِ شمائل ہوگا
دستہ نہیں کوزے کا یہ ہاتھ اُسکا ہے ... جو گردنِ جانان میں حمائل ہوگا

چون عہد نمی کند کسے فردا را ... تو حالیا خوش کن دلِ شیدا را
می نوش بنورِ ماہ اے ماہ کہ ماہ ... بسیار بتابد و نیابد ما را

دل تنگ ہو سحر جو تجھے اس دم کو ... تو آج ہی خوش کرلے دلِ پُرغم کو
پی لے شبِ ماہ میں اے ماہ کہ چاند ... ڈھونڈ ھیگا پائے گا کہاں پھر ہم کو

سید ابراہیم محب

کلام نادر

(منشی نادر علی خان صاحب نادر کاکوروی مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ نظم)

خوشی سے خوشی کا نہونا ہی اچھا ... یہان جان رو رو کے کھونا ہی اچھا
رُلانا ہی اچھا ہے رونا ہی اچھا

تماشے جہان کے کبھی کم نہون گے ... زمانہ رہے گا مگر ہم نہون گے
نہون ہم ہمارا نہونا ہی اچھا

ہے جب گریہ انجام یہ زندگانی ... حیاتِ دو روزہ پہ ہنسنا ہے فانی
تو پھر ایسے ہنسنے سے رونا ہی اچھا

یہ فرشِ معطر ہے جب چار دن کا ... یہ مخمل کا بستر ہے جب چار دن کا
تو خاکِ لحد کا بچھونا ہی اچھا

بھری تلخیون سے ہے جب جانِ شیرین ... ستم آلودہ ہے جب یہان نانِ شیرین
تو ہاتھ ایسے کھانے سے دھونا ہی اچھا

مخمس

جو ندوۃ العلما کے دارالعلوم کی رسم فونڈیشن کے موقع پر ہز آنر سر جان ہیوٹ لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کی حضور میں پڑھنے کے لیے ایک دوست کی فرمائش سے لکھکر لکھنؤ بھیجا گیا تھا مگر کسی مصلحت سے وہاں پڑھا نہیں گیا اور ابتک شائع بھی نہیں ہوا۔

ڈر حادثات دہر کا پھر اس عمارت کو ہے کیا   رکھی گئی ہو علم اور صلاح پر جسکی بنا
ہیں راج اور مزدور جسکے اہل علم و اتقا   اور مستری جسکا ہے صوبہ کا خود فرمانروا
ہیوٹ نے ڈالی تیری نیو اے ندوہ کر شکر خدا

اب مشکلیں فضل خدا سے تیری آسان ہو گئیں   سر جان جو تیرا مربی۔ قوم ہے تیری معین
کی کے آخر جھک گئے ہیں تیری جانب اہل دین   لے مژدہ یہ سامان بجز تائید ربانی نہیں
پھر ڈر ہو کیا اس بیڑے کو جسکا خدا ہو ناخدا

بے گھر تھا تو اے ندوہ تجھکو گھر دیا سر جان نے   ویرانہ تھا آباد تجھکو کر دیا سر جان نے
موقع تجھے بہتر سے بہتر دیا سر جان نے   خاکہ تھا اک تو رنگ اسمیں بھر دیا سر جان نے
اب تو قدم آگے بڑھا خواہش ہو گر اس سے سوا

اس ملک کے اہل ملک سمجھو خدا ہے مہربان   آزاد ہوں مذہب میں آباد ہوں صحن جہان
ہو سلطنت اس قوم کی جو علم کی ہو قدردان   جلسوں میں پبلک کے شریک آکر ہوں حکام زمان
دیں ہمتیں اپنے خلق شاہانہ سے دل سب کے بڑھا

دیں علم کی ترغیب انہیں جو علم سے بیزار ہوں   انکو جگائیں نیند غفلت سے جو سرشار ہوں
خیر اور پیار انکو جتائیں جو کہ ناہموار ہوں   دیں واجبی حق جسکے ہیں انکو جو حقدار ہوں
جس قوم کو دیکھیں گرا ہیں دوڑ کر اسکو اٹھا

ممکن ہو کیونکر اس حکومت میں نہ دل والے قرین   بڑھ کر اس سے تو خالی حکومت کوئی عالم میں نہیں
وہ بادشہ قبضے میں جسکے آسمان ہے اور زمین   انکی حکومت میں بھی شادی ہے کہیں ماتم کہیں
باران رحمت ہے کہیں زحمت کہیں سیل بلا

حق یہ ہے جس ملک میں ہر قوم کی حاجات جدا   ہر قوم کا مقصد الگ ہر قوم کی حاجت جدا
رسمیں جدا ہر قوم کی مذہب جدا لغت جدا   نقشہ جدا رنگت جدا صورت جدا سیرت جدا
ہے انتظام اس ملک کا بس کام انگلش قوم کا

حالی

مباحثہ گلزار نسیم گلزار نسیم اُردو زبان کی ایک مشہور و معروف مثنوی ہے جو اپنی نثری اور شعری خوبیون کے لحاظ سے آج بھی باوجود اُن تغیرات کے جو مغربی لٹریچر کے اثر سے ہمارے مذاق علمی میں لازمی طور پر پیدا ہونے چاہیئے تھے ملک مین اسطرح ہر دلعزیز ہے جسطرح کہ قدیم سوسائٹی مین تھی۔ امتداد زمانہ سے اُسمین یہ خرابی ضرور پیدا ہوگئی تھی کہ اُسکا کوئی صحیح نسخہ دستیاب ہونا مشکل ہوگیا تھا۔ عام کتب فروشون کے پاس جو ایڈیشن ملتے تھے اُنمین اسقدر اختلاف تھا کہ کسی ایک کو دوسرے کے مقابلے مین مستند تصور کرنا محال تھا اور انھین اغلاط کی بدولت آجتک اس مثنوی پر بہت سے جا و بیجا اعتراضات کی بوچھار ہوتی رہی ہے۔ مسٹر چکبست لکھنوی نے یہ بہت اچھا کیا کہ گلزار نسیم کا صحیح نسخہ بہم پہنچا کر معہ ایک تنقیدی مقدمہ کے چھپوا دیا۔ اسکو شائع ہوئے کئی سال ہوگئے۔ اخبارات و رسائل نے اسپر حوصلہ افزا ریویو کیئے۔ لیکن قاعدہ ہے کہ مذاق کے اختلاف کیوجہ سے رائین بھی مختلف ہوجاتی ہین۔ مولنا عبدالحلیم شرر نے اپنے رسالہ "دلگداز" مین اس مثنوی کے نئے ایڈیشن پر اظہار رائے کرتے ہوئے جہان اُسکے محاسن پر روشنی ڈالی وہان معایب کو بھی نظر انداز نہین کیا۔ مولنا شرر کی نکتہ چینی کا جواب مسٹر چکبست نے "اودھ پنچ" مین چھپوایا اور جواب الجواب لکھنے مین شرر کے قلم سے "پنچ" کی شان مین بعض ایسے الفاظ بھی نکل گئے جو متانت اور تہذیب کے درجے سے گرے ہوئے تھے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ مولنا شرر نے "اودھ پنچ" کے ظریفانہ انداز کے مضامین کو دیکھکر جنمین جولانی فکر مضمون نگار کو کہین سے کہین پہنچا دیتی ہے اُسے "شہدے" کا لقب دیدیا ہو لیکن اگر وہ ایسا نہ کرتے اور یہ سمجھ لیتے کہ "پنچانہ" انداز کا اقتضا یہی ہے تو خوب ہوتا۔ بہرحال معرکہ چکبست و شرر کی شان نزول یہ ہے۔ پہلے تو یہ بحث صرف اُس طبقے تک محدود تھی جو "دلگداز" اور "اودھ پنچ" کا قدر شناس کہا جا سکتا ہے لیکن رفتہ رفتہ اسکی دلچسپی کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا اور اکثر اہم مسائل پر کئی نقادان فن کو قلم فرسائی کی ضرورت آپڑی۔ "مباحثہ گلزار نسیم" مین وہ تمام مضامین جمع کردیئے گئے ہین جو اس بحث سے متعلق ہین عام اس سے

کہ وہ شرر کی تائید اور چکبست یا وحشت کی مخالفت مین لکھے گئے ہون یا اسکے برعکس۔ اور خواہ وہ دلگداز مین شائع ہوئے ہون یا کسی اور خیال یا رسالے مین۔ خلاصۃ الحکماء میرزا محمد شفیع شیرازی ثم الکھنوی نے اس مجموعہ کو ترتیب دیکر گویا اس معرکۃ الآرا علمی مباحثہ کی یادگار قائم کی ہو اور اسمین شبہہ نہین کہ "مباحثہ گلزار نسیم" کے صفحات کو خیالات کی گوناگونی جذبات کی بوقلمونی، اور آرا کی نیرنگی نے ایک نہایت پرلطف چیز بنا دیا ہو۔ شروع مین ایک دیباچہ بھی ہو۔ لیکن میرزا صاحب سے ایک اصولی لغزش ہوگئی ہو یعنے آپ لکھتے تو ہین کہ۔

اس علمی جنگ مین جناب شرر اور جناب چکبست کے درمیان معرکہ پیش تھا۔ اب رہا یہ امر کہ ان دونون پہلوانان سخن مین سے کسکو فتح ہوئی اور کسکو شکست ہوئی اسکا فیصلہ کرنا ہمارا کام نہین۔ اسکا فیصلہ جناب احمد علی صاحب شوق منشی سجاد حسین صاحب، حافظ جلیل حسن صاحب جلیل وجناب حسرت موہانی وجناب طیش بگرامی وغیرہ نے کر دیا ہو۔

تاہم آپ کے انداز تحریر اور طرز بیان سے یہ ہویدا ہوتا ہو کہ آپ مسٹر چکبست کے طرفدار ہین۔ فی الحقیقت یہ کوئی قابل گرفت فعل نہین لیکن جب آپ نے تمام مباحث کو ناظرین کے پیش نظر رکھکر فیصلہ اُنھین پر چھوڑ دیا تو شرر کے متعلق یہ لکھنا عبث تھا کہ

آپ کے مضامین سے اکثر مقام پر بے جا غیض وغضب کا اظہار ہوتا ہو اور ہمکو مولنا شرر ایسے بزرگ کے قلم سے ایسے الفاظ نکلتے دیکھکر سخت تعجب ہو۔

یا یہ الفاظ:۔

برعکس اسکے انصاف ہمین یہ کہنے پر مجبور کرتا ہو کہ جناب چکبست کے قلم سے جو مضامین جناب شرر کے اعتراضات کے جواب مین شائع ہوئے ہین اُنمین پوری شان تنقید قائم ہو۔

اسی قسم کے اور بہت سے اقتباس پیش کیے جا سکتے ہین جن سے آپ مسٹر چکبست کے حامی ثابت ہوتے ہین۔ اور اگرچہ میرزا صاحب کے ان خیالات سے بہت بڑی حد تک ہم بھی موافقت رکھتے ہین تاہم اگر وہ اپنا عندیہ ظاہر نہ کرتے تو زیادہ مناسب تھا۔

اس کتاب مین کم نہ زیادہ پورے ۱۵ مضامین درج ہین۔ میرزا صاحب نے اس بات کی کوشش کی ہو کہ کوئی مضمون جو اس مباحثہ سے تھوڑا بہت بھی علاقہ رکھتا ہو اس مجموعہ مین شامل ہونے سے رہ نہ جائے۔ لیکن یاد پڑتا ہو کہ مولوی سید خورشید علی حیدرآبادی کا ایک مضمون اُسی زمانے مین مخزن مین نکلا تھا جو اگرچہ فی نفسہ اس مباحثہ سے بے تعلق تھا لیکن اگر وہ بھی لے لیا جاتا تو مولنا شرر کے اِس اعتراض کا ایک اور پہلو بھی روشن ہو سکتا تھا کہ "گلزار نسیم، دیا شنکر نسیم کی تصنیف نہین ہو" گلزار نسیم نسیم کی تصنیف ہو یا نہین، ہمین اس سے واسطہ نہین لیکن چونکہ سید خورشید علی کے مضمون سے اسقدر ضرور پتہ چلتا ہو کہ نسیم کے اس چراغ مین تیل بتی ایک دوسرے چراغ سے مستعار لیگئی ہو، اِس خیال سے اُس کے لیے اِس مجموعہ مین گنجائش نکالنا انصافاً ضروری تھا۔ سید خورشید علی کا مضمون کیا تھا؟ ایک قلمی مثنوی کے جس کا ایک غیر مطبوعہ نسخہ غالباً حیدرآباد کے کتب خانہ آصفیہ مین ابتک محفوظ ہو، متعدد مقامات کے اقتباسات تھے جو گلزار نسیم کے اقتباسات کے بالمقابل چھپوائے گئے تھے۔ اُس کے مطالعہ سے یا تو تامکن توارد شعری کا جو سرقہ کی حد تک پہنچ گیا ہو قائل ہونا پڑتا ہو یا کسی ایک کو دوسرے کا خوشہ چین ماننا پڑتا ہو۔

مضامین مندرجۂ "مباحثہ" مین چند مضامین ایسے بھی ہین جن کے مطالعہ سے بہت سے علمی وادبی نکتے ذہن نشین ہو سکتے ہین خصوصاً جنت کی ڈاک" کا سلسلہ جسکے تحت مین آتش کے

خطوط موسومہ شرر لکھے گئے ہین، جو سب "اودھ پنچ" مین چھپے تھے۔ مولنا شوق قدوائی کا مضمون بھی یقیناً قول فیصل کا درجہ رکھتا ہی لیکن بعض مبتذل مضامین اسمین ایسے بھی پائے جاتے ہین، جو اگر بہ حالت موجودہ نہوتے تو بہتر تھا۔ شلاً "ہوا خواہ نسیم" کی ہرزہ سرائی خیالات کی پختگی، تنقید کی قابلیت، توازن کی لیاقت کا تو گویا اسمین ایک سرے سے فاتحہ پڑھا گیا ہی ہان مثنوی سحر البیان کے عیوب گنوانے مین البتہ شاطرانہ کمال سے کام لیا گیا ہی حالانکہ جو اعتراضات بزعم خود کیئے گئے ہین وہ نہایت عامیانہ اور خود حضرت معترض کی ناواقفیت اور کم علمی کے شاہد ہین۔

بعض مضامین اور کارٹون اودھ پنچ کے ایسے بھی لئے گئے ہین جنمین ظریفانہ رنگ پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہی۔ جہان تک تفریح طبع کو تعلق ہی یہ دونون خاص دلچسپی کی چیز ہین۔ اور انکو دیکھکر کہنا پڑتا ہی کہ منشی سجاد حسین نے اپنی بے مثل قابلیت کی بدولت "اودھ پنچ" کو جس رتبہ تک پہنچایا تھا وہ اُنھین کا کام تھا۔

ساحشہ گلزار نسیم مین مسٹر چکبست والا اڈیشن مع مقدمہ کے شامل ہی جو اس کتاب کے خریدارون کو مثنوی کے جُدا گانہ نسخہ کی ضرورت سے مستغنی کر دیتا ہی۔ افسوس ہی کہ کتابت کی غلطیان "ساحشہ" مین اس کثرت سے موجود ہین کہ ہمین حضرت مولف کی توجہ اسطرف خصوصیت سے مبذول کرنا پڑی ہی۔ ضرورت تھی کہ پروف کی صحت کا خیال رکھا جاتا۔ معمولی لاپروائی بھی کتاب کی اصل خوبیون کو خاک مین ملا دیتی ہی۔ کتاب کے ملنے کا پتہ۔ مطبع منشی نولکشور لکھنؤ قیمت ۶؎ جو تقریباً پانچسو صفحات کی کتاب کیلئے کچھ زیادہ نہین۔

دیوان خیال جانان علاقہ کاٹھیاوار مین ریاست منگرول ایک مشہور جگہ ہی۔ یہان کے فرمانروائے سابق شیخ محمد حسین میان صاحب بہادر نہایت علم دوست اور باذاق رئیس گذرے ہین جنکی علمدوستی اور معارف پروری کی بدولت کسی زمانے مین منگرول رامپور کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ میان صاحب بہادر کو شعر و سخن سے نہایت درجہ دلچسپی تھی اور آپ کا دربار کملا و فن سے ہر وقت معمور رہتا تھا۔ ایک وقت تھا کہ داغ، جلیل، تسلیم، شمشاد، اور احسان ایسے نغز گو شعرا کو رئیس کی علمی قدر شناسی نے وہان کھینچ بلایا تھا۔ قاعدہ ہی کہ حاکم وقت کا رجحان طبیعت جسطرف ہوتا ہی اُسی جانب عوام الناس کی طبائع بھی جھک پڑتی ہین۔ انھین مولوی محمد عمر صاحب جنون شاگرد جلال مرحوم کو خاص امتیاز حاصل ہی۔ "خیال جانان" جسکا دوسرا نام "ریاض فکر" بھی ہی حضرت جنون کے کلام کا مجموعہ ہی جو ہمارے یہان بغرض اظہار رائے موصول ہوا ہی۔ اسکو دیکھکر انصافاً یہ کہنا پڑتا ہی کہ حضرت جنون ایک اچھے شاعر ہین، اور اگر مشق سخن کا سلسلہ قائم رہا تو اُن کے کلام کی پختگی اور نفاست روز افزون رہیگی۔

اس دیوان مین ایک جدت خصوصیت سے قابل ذکر ہی یعنی حضرت جنون نے اکثر ایسے مضامین قطعی طور پر ترک کر دیئے ہین جو ایشیائی شاعری کا مدت مدید سے جزو لاینفک بنے ہوے چلے آتے ہین لیکن کثرت استعمال سے مبتذل ہو گئے ہین۔ مثلاً کوہ طور اور موسیٰ، لیلی مجنون، مصر اور بازار، سکندر و آئینہ، اسیطرح بعض متروک الفاظ کے متعلق یہ التزام کیا گیا ہی کہ قصائد وغیرہ مین بھی آنے نہ پائین جیسے پہ، تمک، وے۔ اچھا ہوتا اگر جناب جنون چند اور مبتذل اور مخرب اخلاق مضامین کا استعمال بھی جائز نہ رکھتے مثلاً شب وصل، تیغ قاتل، بوس و کنار۔

زبان کے اعتبار سے حضرت جنون کا کلام اگرچہ اسوجہ سے مستحق ستائش ہی کہ آپ کا وطن کاٹھیاوار ہی جہان کی زبان ابھی

اسقدر ترقی یافتہ نہین ہو کہ اُسمین اصلاح کی گنجائش نہ سمجھی جائے تاہم آپ نے زبان کی صفائی، بندش کی درستی اور محاورات کے صحیح استعمال کو بہت خوبی سے نباہا ہو لیکن تاہم ایسی مثالین نظر آتی ہین جہان کسی محاورے یا لفظ کا استعمال صحت کے ساتھ نہین کیا گیا مثال کیلئے یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

میتوش اُٹھین اپنے قدح کی سنا مین خیر
اٹھا ہو ابر ادھر وہ کہین سے اُٹھا ہوا

"قدح کی خیر منانا" محاورہ ضرور ہو لیکن اس موقع پر اس کا استعمال غلط ہوا ہو۔

یا یہ شعر ؎

تو بھی آیا نہ اے خیال صنم　　رات بھر ہم تجھے پکارے ہین

اسمین "پکارے ہین" آجکل کے رواج کے اعتبار سے غیر فصیح ہو۔

اسیطرح اس شعر مین ؎

شوخ ہو جاینگے کہہ دیتے ہین اُنکے تیور
اول شب جو وہ شرماتے ہین شرمانے دو

"کہہ دیتے ہین" کے عوض "کہے دیتے ہین" ہونا چاہیئے۔

ان معمولی فروگذاشتون کے علاوہ حضرت جنون کا کلام داد کا مستحق ہو۔ بعض غزلین خاص طور پر دلچسپ پائی گئی ہین اکثر شعر تاثیر اور بیساختگی کی گوناگون خوبیون سے مالامال ہین۔ مثلاً

اگرچہ وصل سے محروم بس لیکن آس بندھی تھی　　کہ میرا نام شامل ہو ترے امیدوارون مین
وہی کچھ معتبر اب آپکے نزدیک ٹھہرے ہین　　گنا کرتے تھے جنکو آپ بھی بے اعتبارون مین
نہ سمجھا وقت پر مین ہائے اب سمجھا تو کیا سمجھا　　وہ مجھ سے کہہ گئے تھے کچھ چھپی چیزون کے اشارون مین

دل قسمت اُنسے جب پوچھا تو عجب حسن سے　　کہہ دیا مین نے کہ میرا مدعا کچھ بھی نہین
غیر سے وہ تذکرہ میرا ہی کرتے تھے مگر　　مین نے جب پوچھا تو جھنجھلا کر کہا کچھ بھی نہین

غزلیات کے ماسوا قصیدے، سہرے، قطعے اور خمسے بھی ہین اور سب اپنی اپنی جگہ اچھے ہین۔ شروع دیوان مین ایک دیباچہ شامل ہو جسمین مصنف کے سوانحی حالات پر کافی روشنی ڈالی گئی ہو لیکن ایک بحث کے درمیان مندرجہ ذیل شعر کو غلطی سے غالب کی تصنیف خیال کر لیا گیا ہو ؎

ڈیڑھ جزء بھی تو ہو مطلع و مقطع غالب
غالب آسان نہین صاحب دیوان ہونا

کتاب ملنے کا پتہ :- منشی عبدالرحمٰن محمد محسن صاحب خوشتر مدرسۂ اسلامیہ، منگرول (کاٹھیاوار) قیمت غالباً ۱۰/ ر

دو پوچھیں مرا حال یون متفق ہوئی　　مگر اُن کو دھوکا ہوا ہے کسی کا

پایل اور گھایل (بفتح یای تحتانی)

ان دو لفظون کو شعراے متقدمین و متاخرین دِلّی اور قائل وغیرہ کے قافیے مین ہمیشہ لاتے اور لاتے ہین۔ غالباً یہی وجہ ہو کہ صاحب نفائس اللغات نے پائِل کو بکسر ہمزہ لکھا ہو اور گھایل کا کچھ جیرہ نہین بتایا۔ اسکی نسبت جاہے جو کچھ اُن کا خیال ہو۔ حضرت جلال لکھنوی نے اپنے لغت "سرمایۂ زبان اُردو" مین دونون کو بکسر ہمزہ تحتانی لکھا ہو۔ حقیقت یہ ہو کہ کسرے کی دُم اُن مین اس ہمزہ کی بدولت لگی جو تحتانی پر بڑھایا گیا ہو۔ اس دُم کا دُگڑا یہی ہمزہ ہو۔ نہ یہ دُگڑا قدما بڑھاتے نہ اِنمین کسرے کی دُم پیدا ہوتی۔ واضح ہو کہ **یل** اُردو مین ایک کلمہ ہو جو کسی لفظ کے ساتھ مل کر کبھی فاعلیت اور کبھی مفعولیت اور کبھی نسبت اور کبھی صاحب کے معنی کا فائدہ دیتا ہو۔ بعض کلمات مین شامل ہونے سے اسکی تحتانی ساکن اور بعض مین مفتوح ہوتی ہو؛ یا یون سمجھنے کہ اسکے مرکبات مین جن کا جزو اول استعمال مین متحرک الآخر ہو اُن مین اس کی تحتانی ساکن اور جن کا جزو اول ساکن الآخر ہو اُن مین مفتوح ہوتی ہو۔ سوا ان دو صورتون کے تیسری صورت اسکی نہین ہوتی۔ جیسے بِجَلیل، نکیل، بتر عیل، ویل، وغیرہ مین ساکن اور راتریل، پٹریل، شتریل، کرتیل، اَریل، بِجَلیل، وغیرہ مین مفتوح ہو۔ اسی قبیل سے پایل اور گھایل بھی ہین کہ اول پانون اور یل سے اور دوم گھاو اور یل سے

مرکب ہو، پہلے جزوں میں بسبب ثقالت و کثرتِ استعمال تخفیف ہوکر یہ صورت رہ گئی۔ اب کہیے یہ دونوں الفاظ بکسرِ ہمزہ کیوں مشہور ہو گئے اصل تو یہ ہو کہ بول چال روزمرہ میں بکسرِ ہمزہ مشہور ہی نہیں بلکہ بفتح یا زبانوں پر ہیں۔ صرف قافیے میں شعرا کو پرانی تقلید مجبور کرتی ہو۔ اسکی وجہ یہ ہو کہ زبان اُردو جو پیدا ہوئی تو اسکی نشو و نما انھیں لوگوں میں ہوئی جن کی زبان اصل فارسی و عربی تھی۔ انھیں کے آغوش میں اس نوزائیدہ بچے نے پرورش پائی۔ اس لیے انھوں نے اکثر الفاظ اس زبان کے جو صورت یا لفظ وغیرہ میں فارسی و عربی الفاظ سے ملتے جلتے پائے انکی شکل بعینہٖ ویسی ہی لی۔ یہی سبب ہو کہ اکثر اردو الفاظ کے املا میں حروف مخصوصۂ تازی بھی پائے جاتے ہیں۔ بس پیشتر اردو کے اگلے شعرا نے پایل اور گھایل کو قایل سایل حایل مایل وغیرہ سے ملتا جلتا دیکھ کر انکی تحتانی پر بھی مثل اُنکے ہمزہ لکھ دیا۔ اور جب ہمزہ لکھا تو از روے قاعدہ اُسکو کسرہ کرنے کے لیے مجبور ہوے، کیونکہ ہمزہ جب حروفِ علت میں سے کسی پر آتا ہو اور اُن حروف کا مابعد ساکن ہوتا ہو تو اسکی حرکت انھیں حروف کے موافق ہوتی ہو۔ مثلاً واؤ مابعد ساکن پر جب آئے گا تو واؤ کی مناسبت سے مضموم ہوگا جیسے طاؤس کاؤس وغیرہ۔ اور الف مابعد ساکن پر جب آئے گا تو الف کی مناسبت سے مفتوح ہوگا جیسے ہیأت جرأت وغیرہ۔ اور یای مابعد ساکن پر جب آئے گا تو یے کی مناسبت سے مکسور ہوگا جیسے سائل مائل طائر زائر وغیرہ۔ پس اسی آخری صورت نے متقدمین کو پایل اور گھایل کی یے پر ہمزہ لکھ دینے کی وجہ سے دھوکے میں ڈالا۔ اور انھوں نے بلا تامل ہمزہ کو مکسور کرکے قافیے میں باندھ دیا۔ اصل میں ان اردو الفاظ کا چہرہ بگاڑنے کا باعث ہمزہ ہو۔ نہ یہ بڑھتا اور نہ قدما کو اسکے مکسور کرنے کے لیے قاعدہ مجبور کرتا۔ چوک صرف یہی ہوئی کہ ہمزہ لکھ کر یہ الفاظ قائل سائل مائل وغیرہ کے ہمشکل بنا لیے گئے۔ جب یہ جڑ پڑ گئی تو متقدمین کی دیکھا دیکھی شعراے مابعد (حضرت ناسخ و آتش وغیرہ) نے بھی انھیں کا تتبع کیا۔ مگر یہ تتبع شعرا ہی کے حصے میں آیا وہ بھی صرف قافیہ بندی تک محدود رہا۔ اس لیے کہ یہ ہمزہ دیکھ کر اُن کو قاعدۂ مذکورۂ بالا کے موافق اسے بالکسر ماننا اور نظم میں دل قاتل محمل وغیرہ کے قافیے میں لانا پڑتا تھا۔ جملہ ثقات اہل زبان جو شاعر نہ تھے اور جنھیں قافیہ بندی کی ضرورت نہ تھی اُن کا لہجہ برابر بفتح یا رہا اور اب بھی ہو بلکہ بول چال روزمرہ میں شعرا کی زبان پر بھی یوں ہی رہا۔ لہٰذا استاذی جناب بحر مرحوم نے اس کی اصلاح کی اور اس دھوکے کی ٹٹی (ہمزہ) کو بالکل دور کرکے قاتل باطل وغیرہ کے قافیے میں لانا ترک کر دیا اور تحتانی کے فتح کے ساتھ مقتل بادل وغیرہ کے قافیے میں لانا شروع کیا۔ گو یہ تصرف انکا صرف گھایل کے لیے مخصوص رہا۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

یہ وہی ہے بیکلی تو نے کہ دل میں ہے یہی کل ہے
کہ دھو کر زندگی سے ہاتھ پونچھوں تیرے آنچل سے
ستم کیا کیا نہ ہوگا اُس نشترِ طلعت کے کشتے پر
کرے گی پامالی اب نازِ معشوقانہ گھایل سے

باغ میرا ہوا برباد جو بادل آئے — پتھروں کی ہوئی بوچھار اگر پھل آئے
مجھے دیدار کی حسرت تھی چھری پھیری ہو — یوں تڑپتے ہوئے ہم آئے کہ گھایل آئے

حضرت استاد کے اس تصرف کو اکثر شعرا مثل جلال لکھنوی، امیر مینائی، تسلیم لکھنوی، داغ دہلوی وغیرہ نے مستحسن تسلیم کرکے کم و بیش ان کی تقلید کی۔ ان سب کے کلام میں گھایل، مایل اور قایل وغیرہ کے ساتھ قافیہ نہیں ان میں سے بعض نے تو صرف بکسرِ تحتانی ہی کے استعمال سے احتیاط کی مگر بوجہ پرانے اثر اور عادت قدیم کے دھڑکے سے بفتح تحتانی مقتل اور بادل وغیرہ کے قافیے میں لانے کی یکایک جرأت نہ کر سکے اور بعض نے پوری تقلید کی۔ چنانچہ حضرت تسلیم لکھنوی بفتح تحتانی قافیے میں یوں فرماتے ہیں ؎

گمان کیونکر نہ ہو خلد برین کا صحنِ مقتل پر — تصدق ہوتی ہیں حوریں مجھ سے زخمی گھایل پر

اشرف لکھنوی ؎
روح نکلی تن سے جب بیکل ہوئی — یون شب فرقت کی مشکل حل ہوئی
دید کی حسرت رہی دلمین مرے — تیغ ابرو سے نظر گھایل ہوئی

دلی لکھنوی ؎
تیغ قاتل تری پڑی ہکی — سر مین کیون نہ دُمِن گھایل کی

بعض پورے مقلد ہین، مگر اسے بفتح یا قافیے مین کہین لانیکا انھین اتفاق نہین ہوا اگر ہو تو ایسا کرنے مین ان کو کوئی تامل نہوگا۔

المختصر استاد مرحوم کے اس تصرف کا اعتراف جناب ظہیر احسن صاحب شوق نیموی عظیم آبادی نے تقلید ا" "الاصلاح" مین کیا ہے" اور حضرت جلال لکھنوی نے بھی اپنی لغت "سرمایۂ زبان اردو" مین گھایل کے بیان مین اسکا ذکر کیا ہے اور اس قدر تقلید بھی کی کہ دل اور قاتل وغیرہ کے ساتھ ہم قافیہ کرنے سے احتیاط کی ہے مگر پرانی لکیر کے فقیر ہونے کا اتنا اثر ضرور باقی رہا کہ آخر مین یہ لکھ دیا کہ

اتفاق جمہور فصحاے لکھنؤ کا لفت مذکور مین یاے تحتانی کے کسرے ہی پر ہے۔ یعنی مکسور ہی پڑھتے ہین اور دل و بسمل کے قافیے مین لاتے ہین۔

اب رہا پایل۔ اس کی تحقیق کی نسبت محققین کی کوئی تحریر یا تصرف میری نظر سے نہین گزرا، لیکن اس کے بفتح یاے تحتانی ہونے مین کوئی شک و شبہہ نہین اور اگر کہین قافیے مین باندھنے کی ضرورت پڑے تو میرے نزدیک بلا تامل یاے مفتوحہ ہی باندھنا چاہیے۔ اس لیے کہ جہان تک تحقیق کی نظر ڈالی جاتی ہے اس کی یے مکسور نہین ثابت ہوتی اور نہ اس پر ہمزہ کی کچھ اصل ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ پس پایل اور گھایل دونون بفتح یاے تحتانی بغیر ہمزہ صحیح و فصیح اور یاے مکسورہ و ازدیاد ہمزہ غلط اور قابل ترک ہین۔ واللہ اعلم بالصواب۔

خادم الشعرا محمد محمود احمد (لکھنوی)

نظم ہاشمی

(ملاحظہ ہو رسالۂ الناظر لکھنؤ بابت ماہ جون ۱۹۱۸ء)

لکھنؤ کا مشہور رسالۂ الناظر جو بوقت الشیوع ہونے کے لحاظ سے ملک کا ایک ہی پرچہ ہے، ہماری نظر سے ہمیشہ گزرتا رہا ہے اور اب بھی ہم اُسے شوق سے دیکھتے ہین مگر افسوس ہے کہ جسقدر وہ اپنی پابندی وقت کے لحاظ سے قابل قدر ہے اُسی قدر اپنی گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والی پالیسی کے اعتبار سے مضحکہ خیز بھی ہے۔ اُسنے اس پانچ سال کے عرصہ مین یعنی آغاز اجرا سے اِستک سیکڑون پلٹے کھائے، اور پچاسون معنوی و ظاہری رنگ بدلے۔ شروع مین وہ چالیس صفحہ پر شائع ہوتا تھا۔ بڑھتے بڑھتے اسّی صفحون پر پہنچ گیا۔ اور جو پھر رجعت قہقری اختیار کی تو ۴۰ و ۶ صفحون پر آ رہا۔ یعنی کبھی وہ ایک نظیر کا بھرا پُرا کشکول تھا جسمین فلسفیانہ علمی تاریخی ادبی معاشرتی و تعلیم نسوان کے متعلق غرض ایک ایک مضمون ہر قسم کا ہوتا تھا، اور نظمین بھی بکثرت غزلین بھی معقول تعداد مین۔ مگر اب اُس کشکول مین چند مختلف سوکھے ٹکڑون کے سوا کچھ نہین ہوتا۔ نہ نظم کا کوئی شمار ہے اور نہ مضامین کا جو کچھ جس صورت سے پایا بھر دیا۔ اور ایک دفتر بے معنی کی صورت بنا دی گئی۔ کبھی اُس کے آخر مین سیع مجیب جیسا علمی رسالہ ناتمام ضمیمہ کی طور پر شائع ہوکر رہ گیا، کبھی محاربات صلیبی جیسی تاریخی قابل قدر کتاب شائع ہوئی۔ کبھی علمی و تاریخی ضمیمے سے گزر کر شکسپیر کے ڈرامے کا ترجمہ چھپا۔ اور اب یہ دُم چھلا بھی اڑا دیا گیا۔ پہلے ترتیب مضامین اور تھی اب کچھ اور ہے۔ ہمین*

---

* نظیر کا کشکول مین نے اس وجہ سے کہا کہ اسی جون نمبر مین ایک مضمون چھپا ہے جسمین قابل مضمون نگار نے ظرافت کے رنگ مین ایڈیٹر الناظر اور دیگر رسائل کے ایڈیٹرون پر خوب خوب چھبتیان اُڑائی ہین اور ہلک مثلاً نظیر بنایا ہے"، اور حق یہ ہے کہ بجا طور پر بنایا ہے۔

اعتراف ہے کہ الناظر کے صفحات پر کسی زمانہ مین نثر مضامین اچھے اچھے نکل گئے ہین اور بعض نظمین بھی مگر جب سے حضرت شوق نے کنارہ اختیار کیا، اور ایڈیٹر صاحب کی وہ قدر افزائی (جسکا اظہار حضرت شوق کی ایک نظم نیرنگ خیال پر بصورت تنقید کیا گیا تھا) دیکھکر دیگر قلمی معاونین نے بھی رفتہ رفتہ کنارہ کشی اختیار کی اور یہین سے الناظر کے تنزل کی تاریخ کا پہلا باب شروع ہوتا ہے۔ اب اُس مین دو چار مضمون اور ایک آدھ نظم نظر آجاتی ہے۔ مگر جب اصول فن اور صحت زبان کے اعتبار سے دیکھا جائے تو دونون حصے قابل اصلاح نظر آتے ہین جس طرح کہ آج سے چند سال پیشتر تھے۔ بالخصوص حصہ نظم۔ اسکی وجہ شاید یہ ہو کہ الناظر کے عالی خیال ایڈیٹر نظم سے محض نابلد ہین مگر کیا ایسی حالت مین کہ اُس کا سب ایڈیٹر خود خوشگو شاعر اور زبان و اصول سے واقف ہے،

الناظر مین ایسی مہمل نظمون کا شائع ہونا افسوسناک نہین ہے؟ ملک مین یون تو اکثر ادبی رسالے ناقدری کے ہاتھون مٹ گئے۔ اب چند ماہ سے الناظر بھی گر رہا ہو اکثر مضامین نگار ٹوٹ گئے۔ مضامین کی تعداد گھٹ گئی ہے۔ صرف دو چار رطب و یابس مضمون چھپ جاتے ہین۔ مگر سید ہاشمی صاحب فرید آبادی کی توجہ آجکل الناظر کے حال پر خاص طور پر مبذول معلوم ہوتی ہے۔ سید صاحب کا نام اخباری دنیا مین نیا نہین ہے۔ علی گڈھ کالج سے وہ اپنی خودسری اور شوریدہ خیالی کی بدولت نکالے جانے پر ملک مین کافی شہرت پا چکے ہین۔ معلوم ہوتا ہے کہ کالج سے اخراج کے بعد اُن کے ذمہ کوئی کام نہین رہا ہے۔ اور غریب ایڈیٹر نے بھی اپنی ضرورتون کو ملحوظ رکھکر اسکو غنیمت جانا۔ ہمارے سید صاحب صرف نثار ہی نہین بلکہ شاعر بھی ہین۔ لیکن لکھنؤ سے انھین خاص پرخاش ہے چنانچہ اسی جون کے الناظر مین سب سے پہلا مضمون جو اردو تحریر اور ترجمے کے عنوان سے، مضمون پر شائع ہوا ہے اس کا اصل موضوع یہی ہے کہ لکھنؤ کے ارباب کمال اور مشاہیر کی تذلیل و تحقیر کی جائے۔

ہم ذیل مین سید صاحب کے چند فقرے درج کرتے ہین۔ جو ہمارے دعوے کا ثبوت ہین۔ صفحہ ۱ پر مولانا حالی پانی پتی کی مدح سرائی کے ضمن مین جن کی شاعرانہ قابلیت و واقفیت کی داد مرحوم اودھ پنچ صحیح معنی مین بار ہا دے چکا ہے تحریر فرماتے ہین:-

" سے خدا کی دین کہتے ہین اور ہم اسکی مہربانی سمجھتے ہین کہ جب دلی کے رنگ اڑ گئے تھے اور لکھنؤ والے ہذیان بک رہے تھے، شاعری کے ریفارمر نے پانی پت مین جنم لیا۔

اب نثر کے سلسلہ مین ارشاد ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۲۔

" درحقیقت یہی چیز جس مین میر حسن کی مثنوی اور نثر مین میر امن کی چار درویش کی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے۔ اور اسی توازن کا فقدان ہے جسکی بدولت فسانۂ عجائب زیادہ مقبول ہوئی اور نہ قابلیت رکھتی ہے کہ کبھی مقبول ہو"

مگر ہم کہتے ہین کہ سید صاحب کی یہ خودرائی اور چیز ہے اور زمانہ کا شاہد اور شے۔ آفتاب پر خاک ڈالنے سے کچھ نہین ہوتا۔ فسانۂ عجائب جتنہ مقبول و مشہور ہوئی دنیا جانتی ہے سرور اپنے رنگ کا آجتک بے مثل انشا پرداز مانا جاتا ہے۔ سید صاحب کی اور گلفشانی دیکھیے۔

" ہماری مراد یہ نہین ہے کہ اس مین فارسی عربی کا میل کم ہو۔ الفاظ پر ہم نہین ہوتے ہم فارسیت و عربیت پر نکتہ چین ہین۔ فسانۂ عجائب پہلے شخص کی بہترین نظیر ہے۔ اور دوسرا عیب عربیت کا پرانے مولویون کے ان جا بجا ملتا ہے"

صفحہ ۱۳ سطر ۲-۳ " غرض حقیقت مین یہ کافی ہے ممکن ہی نہین ہے کہ ہندوستان کے مقامات دور دراز سے لوگ اپنا مذاق سدھارنے دلی آیا کرین، یا لکھنؤ سو اس سے ہم پہلے ہی سے بے عقیدہ ہین"

لکھنؤ سے سید صاحب کی مخالفت کا راز کھل گیا۔ سچ یہ ہے کہ عقیدت ہی ایک ایسی شے ہے جو بسا اوقات انسان کو بھلے اور برے مین

تیز کرنے ۔ موقع نہیں دیتی ۔ ورنہ سچ پوچھیے تو آجکل دلی میں سوا تجارت کے کچھ نہیں رہا ہے ۔

زبان مٹ چکی ۔ شاعری برباد ہوگئی کوئی اہل سخن باقی نہیں رہا اخلاق کی بہتر شخص میں کمی ہے ۔ پنجابیت ساری دہلی پر چھا گئی ہے زبان میں سختی و کرختگی آگئی ۔ تشدید کا استعمال تمام الفاظ میں بہت بڑھ گیا ہے ۔ ہم بھی دہلی میں رہے ہیں اور یہ ہمارا ذاتی تجربہ ہے بغیر اس سے قطع نظر کرکے ہنسے مانا کہ لکھنؤ برا ہے ۔ یہاں والے بیچارے کیا جانیں نہ چاندنی چوک کی ٹھوکریں کھائیں اور نہ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر گھوڑے اور نہ قطب صاحب کی زیارت کی ۔ مگر سید صاحب جنکو دہلی سے خاصی عقیدت ہے جنکو دلی والوں کی ہر ادا میں حسن نظر آتا ہے اور جو خود بھی اطراف دہلی کے رہنے والے ہیں انہوں نے جو کچھ پایا ہے دہلی سے اور اس سبب سے انکی ہر بات گویا اہل دہلی کی بات اور ہر کلام ان کا گویا دلی کا ٹکسالی کلام ہو ۔ اب ذرا انکی خوبیاں بھی ملاحظہ کیجیے ۔

ابھی جون نمبر میں نالۂ یاس کے عنوان سے جو نظم آپ کی دو مضمون پر ترکیب بند کی صورت میں شائع ہوئی ہے اور جس پر نئی کے الناظر میں فاضل ایڈیٹر کا یہ تعریفی نوٹ ایک ماہ پیشتر چھپ چکا ہے ۔

" ہمارے دوست عزیزی سید ہاشمی بھی اس جلسہ میں شریک تھے اور ہماری طرح خلل اتحاد نہیں ہو گئے تھے ، بلکہ یک طبیعت اور درد نظم اس موقع کے لئے لکھ کر لائے تھے جنکو ان کے خاص لہجہ و انداز میں سنکر بہت حظ حاصل ہوا ۔ اگر الناظر کی تنگ دامنی مانع نہ آتی تو ہم اسی وقت ناظرین کرام کو اس سے لذت آشنا بناتے ۔ اب جو ان کے پرچہ کا انتظار کرنا پڑیگا ۔ یہ نالۂ یاس وہی نظم ہے جس کے لذت آشنا ہونے کا انتظار ایک ماہ پہلے سے ایڈیٹر صاحب الناظر کی سفارش پر ناظرین کر رہے تھے ۔ اور جو برار کانفرنس کے جلسہ ایلچ پور میں پڑھی گئی تھی ۔

لکھنؤ والوں کا زبان بگنا سید صاحب کے قلم سے آپ دیکھ چکے اب خود بدولت کی خوشگوئی و لطافت بھی دیدنی ہے ۔ اول بند کا پہلا مصرع

حسرتیں اس ملک پر اور عبرتیں اس قوم پر جسکے جی کے حوصلے اور ولولے سب جاتیں مر

دوسرے مصرعہ میں " سب جائیں مر " کی تعقید سے قطع نظر کرکے جو درا اصل اس جگہ زبان پر نہایت ناگوار و ثقیل ہے ۔ " ملک پر حسرتیں اور قوم پر عبرتیں " محاورۂ اہل زبان سے منافی ہے ۔ اہل زبان اس موقع پر اظہار افسوس و رنج کرتے ہیں اور یہی قاعدہ ہے ۔ مصرعہ یوں ہونا چاہیے ۔ حیف ہے اُس ملک پر افسوس ہے اُس قوم پر ۔ دوسرا شعر

ہو چلے معدوم جس کے جوہر انسانیت جسکی تجربت گران ہے عالم تہذیب پر

تجربت بسکون جیم تحتانی بالکل غلط ہے ۔ سید صاحب کو ضرورت شعری یا شاعرانہ کمزوری نے اتنا مجبور کردیا کہ مفتوح حرف کو ساکن نظم کر گئے ۔ چھٹا شعر

جسکا جینا بار ہے دنیا کو اور مخلوق کو جسکے انسانے پر شرماتی ہے تاریخ بشر

پہلے مصرعہ میں دنیا کو کے ہوتے مخلوق کو بالکل حشو و برائے بیت ہے جس سے شاعر کی کمزوری کا پورا ثبوت ملتا ہے ۔ ساتواں شعر

جسکے گھٹنے کی منادی ہو رہی ہو ملک ملک پھیل جائے وان سبلوا اسکا زہر یلا اثر

یہ لغات لکھنؤ کی زبان نہیں اور گھٹنے کی فصاحت سے تو ناظرین الناظر خود محظوظ ہوگئے ہونگے ۔ لکھنؤ کے ستی آدمی بھی ایسی لفظوں سے پرہیز کرتے ہیں ۔ بیب کا شعر

کاش یہ ہوتا کہ ایسی قوم نابنجار کو برق خاطف گر کے لیجاتی فنا کے غار کو

پہلے مصرعہ میں یہ ہوتا کہ بالکل برائے بیت اور حشو ناجائز ہے ۔ لکھنؤ والوں پر سخت زبان اور خود سید صاحب کی یہ خوش سرائی انصاف طلب ہے ۔ چھوٹا منہ بڑی بات ۔ یا خود را نصیحت و دیگرے را نصیحت ، اسی کا نام ہے ۔ افسوس صد افسوس ان فدائے فاذکو ۔ ! اسکی اصلیت کی بھی کوئی حد نہیں ۔

---

[1] غالباً سید صاحب کا گر پڑتے ہوں گے جس طرح کہ دہلی کے اور بعض مخمور لوگ کا شیوہ ہے ، اور شاید اسی کو ایڈیٹر صاحب خاص لہجہ و انداز سے تعبیر کرتے ہیں ۔

دوسرے بند کا پہلا شعر ؎

اے میرے دل کا اندازہ تلاطم ہاشمی کرئی دیکھے میری ایوسی پہ اسکی برہمی

لفظ ہاشم بکسر شین ہے اور برہم بفتح ہائے ہوز۔ دونوں کا قافیہ ہرگز نہین آسکتا تنگ بندی اور چیز ہے اور اصول فن اور شے۔ علاوہ ازین برہمی کا وجود غصہ کے وقت ہوتا ہے نہ مایوسی مین۔ اس سے بڑھکر سید صاحب کی وسعت معلومات کا گراہ عادل مندرجہ ذیل شعر کا قافیہ ہے ؎

ہے ابھی گہوارۂ تابان جلوۂ حسن سپید یعنی آتش زروان ہوا ابھی تنگ مین

برہمی کا قافیہ زمین سراسر ناجائز ہے۔ البتہ ہاشمی صاحب کے "دیوتا" نے اس قسم کی تنگ بندی کی ہے اور شاذ کو ناز کا قافیہ باندھا ہے۔ غالباً اپنے ممدوح دیوتا کی اندھی تقلید مین ہاشمی صاحب نے یہ جرأت کی ہے۔ سچ ہے جب الشئے یمی دعیم۔ ساتوین شعر کا دوسرا مصرع ؎

"پر دماغون مین ابھی ہے بوے عطر مینتی" اس مصرعہ مین ابھی کے بعد تک کی ضرورت اسی طرح ہے جس طرح کہ پہلے مصرعہ مین خود ہاشمی صاحب لائے ہین۔ میرے نزدیک مناسب تھا کہ آپ ان خیالات کو نثر مین ادا فرماتے۔ نظم کرنے کی زحمت بیکار گوارا فرمائی۔ تیسرے بند کا پہلا مصرعہ "ہوشیار اے بے خرد تا کے یہی بدمستیان" غریب ہاشمی کو ضرورت وزن نے پھر محل استعمال سے بے خبر کر دیا۔ "یہ بدمستیان" کا محل اور یہی "درستی وزن کیلئے کہ جانا کسی صورت سے درست نہین۔ پانچوان شعر۔

یعنی کو انسان بنناہی نہ تھا کچھ سہل پہ حق ادا اسلام کا کرنا ہوا اس بھی گران

شعر کی تقطیع کیجئے گر گئی۔ اول مصرعہ کا آخری ٹکڑا سید صاحب کی اس فصاحت ولطافت کی مثال ہے جسکی داد قابل ایڈیٹر ایک ماہ پیشتر اپنے ایڈیٹوریل مین دے چکے ہین۔ آٹھوین شعر کا دوسرا مصرعہ "تب کہین بنتا ہے جاکر ایک دشت بیکران" یہ جاکر کس ضرورت سے لایا گیا ہے ذرا سید صاحب ہی بتائین! بحر کی صفت بیکران ہونا چاہئے۔ اگرچہ معنا خرابی نہین مگر ترکیب مین اجنبیت ضرور ہے۔ چوتھے بند کا پہلا شعر

اوکہ تو اپنی ترقی پر بہت مغرور ہے دور ہے منزل سے اوبلاح کو سول دور ہے

"اوکہ تو" کی فصاحت سید صاحب کے حصہ کی ہے۔ فارسی کی اندھی تقلید اسی کا نام ہے۔

پالے ہے زنجیر آزادی کا ہو لیتو کر فشان دل طلسم عبدیت مین جب تر اسحور ہے

اس شعر کا مطلب ہاشمی صاحب خود سمجھین یا ان کے مداح و ممدوح ورنہ ہمارے نزدیک، المعنی فی بطن الشاعر کا مصداق ہے۔ چوتھے شعر کا دوسرا مصرعہ ؎ "تیرا قصر آرزو یک جرعۂ بے نور ہے" سید صاحب یہ وہی نقص فارسیت ہے "جسکی بہترین نظیر آپ فسانۂ عجائب کو کہتے ہین اور جس نے آپ کے خیال مین اس نادر کتاب کو نہ مقبول ہونے دیا اور نہ قابل مقبولیت رکھا۔ ساتوان شعر ؎

وہ محمد مصطفےٰ وہ صاحب ناز جلال ظلمتون مین اسم طہر جس کا شمع نور ہے

حضرت پیغمبر علیہ السلام کو صاحب ناز کہنا خلاف شان ممدوح ہے اور نام پاک کی جگہ اسم طہر لانا ایسی بدعت ہے جو کسی صحیح گو شاعر کے کلام مین نہین ملسکتی۔ طہر کے معنی پاک کرنے والا۔ نہ پاک۔ اس سے سید صاحب کی عربی دانی کا ثبوت ملتا ہے۔ کیون نہ ہو آخر ہاشمی ہین۔ آپکی شاعرانہ نوعیت کا ہم پہلے ہی اعتراف کر چکے ہین ورنہ مصرعہ یون ہو سکتا تھا "ظلمتون مین جسکا نام پاک شمع نور ہے" مگر ظلمتون مین نام پاک کا شمع نور ہونا بھی عجیب بے تکی منطق ہے ؎

پیشتر خطرے بہت کچھ تجھ سے تھے اترار کو کیونکہ وارث مصلح عالم کا تو مشہور ہے

نہین معلوم ہوا کہ وارث مصلح عالم کا سید ہاشمی نے کسے قرار دیا ہے۔ عالم تو بیشک نبی کا وارث ہوسکتا ہے بقوائے حدیث نبوی "العلماء ورثۃ الانبیاء" اور اگر یہان محض مسلم کی جانب خطاب ہے تو وارث کا لفظ ٹھیک نہین بلکہ لفظ پیرو یا کوئی اسی کا ہم معنی لفظ لانا چاہئے تھا۔ حضرت مصطفےٰ کی شان مین ارشاد ہوتا ہے ؎

جسنے بہکایا کرامت شق کی کذب کے یعنی گل کے چمن پر آئی خوشی مسرور ہے

بہکایا غالباً کاتب کی غلطی ہے۔ تبلایا یا اور کوئی لفظ اس کا ہم معنی

٭ جولائی نمبر مین تصحیح کر دی گئی ہے کہ بہکایا کے بجائے "جھلکایا" ہونا چاہئے مگر جھلکایا بھی دکھلایا اور تبلایا کے معنی مین استعمال کرنا بالکل غلط ہے!۔

ہوگا۔ ورنہ بہکانا حضرت کی شان مین ناقابل معافی گستاخی ہے ؎

تجھ سے ہے ہیہات صد تذلیل دینِ پاک کی — خندہ زن آج اپنے اک اک سفلہ مغرور ہے

اول مصرعہ مین صد تذلیل ہاشمی صاحب کی مخصوص فصاحت ہے جسکو ہم ناواقفان فن غرابت کہتے ہین۔ جسنے مصرعہ کو ستیاناس کر دیا ہے۔ مگر ہے تو ایجادِ بندہ اگرچہ گندہ۔ آخری بند کا پہلا شعر ؎

تُسے بھی دو بول اب اے صاحبانِ انجمن — یعنی پھر بھر جائے پیالون مین صہبائے کہن

سید صاحب کے دو بول صاحبانِ انجمن سے کیا خوب ہین۔ سبحان اللہ دو بول اور تمام حاضرین انجمن سے؟ یہ تو جانورونکی بولی ہے۔ دوسرے مصرعہ مین "پیالون مین" سے آگے "تب" لانا ضروری ہے ورنہ مصرعہ مہمل رہے گا دیکھئے "می" پھر گر گئی۔ پیالہ مین اظہار یا ضروری ہے پیالہ غلط ہے۔ دوسرا شعر ؎

وہ مبارک کوششین ہوتی ہین بار آور ضرور — جنکی ہون تائید پر اخلاص اور سچی لگن

اس مصرعہ کی فصاحت نظم کی جان ہے اور اس قسم کی فصاحتین سید صاحب کا مخصوص جوہر ہین اس نظم مین کئی جگہ پائیے گا۔ "سچی لگن" اگر لگاؤ اور دلی تعلق کے معنی مین کہا گیا ہے تو متروک اور مہمل ہے ؎

حوصلہ افزود ہے خود مشکلون کی نارسی — رک کے جو دریا بڑھے ہوتا ہے دونا موجزن

حوصلہ افزا کی جگہ حوصلہ افزود لانا سید صاحب کی فارسی دانی کو بھی مشتبہ کئے دیتا ہے۔ اور پھر "زیادتی" کی "یا" یعنی "اول" کا تقطیع سے گر جانا تو ہاشمی صاحب کی شاعرانہ قدرت و واقفیت کا ایسا ثبوت ہے جس پر مبتدی بھی بغیر مسکرائے نہین رہ سکتا۔ مگر نہین سید صاحب کو اپنے "دیوتا" کی تقلید مین سب کچھ جائز ہو گیا ہے۔ اس شاعری پر لکھنؤ والون کی شاعری پر تہمت ہذیان ایک غیرت دار آدمی ہی کر سکتا ہے۔ شاباش ہے آپ کی جرأت اور دیدہ دلیری کو ؎

اور چرچہ عام یعنی علم اور فن کا رواج — جنکی یہ سب جوت ہے دنیا مین اہلِ وطن

علم و فن کے رواج کی جوت آج سید صاحب ہی کے کلام سے دریافت ہوئی چراغ کی جوت ہوتی ہے مگر علم و فن کی یا انکے رواج کی جوت بھی کیا خوب! جوت غالباً روشنی کے معنی مین نظم کیا گیا ہے جو غلط در غلط ہے۔ اسی تا [illegible] کے بھروسہ پر سید صاحب لکھنؤ والون کے منہ آتے ہین "سبحان تیری قدرت!" ؎

خالصاً للہ للمخلوق ہو گر یہ سعی — اس سے بڑھکر نے عبادت نے کوئی کارِ حسن

"خالصاً للہ للمخلوق" کی عربیت جسکو مصرعہ کا لنگڑا پن بھی نہین سنبھال سکتا بڑی وزنی ہے حضرت! یہ وہی عیب ہے جسکی نسبت آپ فرما چکے ہین "اور دوسرا عیب عربیت کا پُرانے مولویون کے ہان جابجا ملتا ہے" مگر اس بیسوین صدی مین اہل علیگڑھ کے تعلیم یافتہ، دہلی کے تربیت یافتہ ناظم و ناثر کے کلام مین اس عیب کا ہونا کسقدر شرم کی بات ہے۔ ایسی حالت مین کہ وہ خود اُسے برا سمجھتا ہے۔ میرے نزدیک اُردو شاعری پر یہ تھوپ برسانا ہے۔ اور "سعی" بسکون "ع" چاہئے۔ لہذا اپنی کمزوری سے اسکو متحرک نظم کرنا ناجائز اور غلط ہے۔ سید صاحب خدا کے لئے شاعری کو چوپٹ نہ کیجئے۔ دوسرے مصرعہ مین فارسی حرف نفی "نے" نے جو حسن پیدا کر دیا ہے وہ صاحبان مذاق سلیم پر پوشیدہ نہین ہے ؎

کچھ کرو اخلاف جانین کہ تم کچھ کر گئے — ورنہ یون تو جی لئے بھی کتنے بہت اور مر گئے!!!

دوسرے مصرعہ کے آگے تین علامات تعجب ہین اور اس مصرعہ پر خط بھی ہے۔ معلوم وہ کیا خصوصیت ظاہر کر رہا ہے۔ یہ نہ کوئی مثل ہے نہ ایسا مصرعہ جسکی خاص طور پر داد دی جائے۔

اب چند وہ مصرعے ملاحظہ ہون جنکو فارسی عربی کے کثیر الفاظ نے غرابت کا جامہ پہنا دیا ہے۔ "جسکی جمعیت گراتی ہے عالمِ تہذیب پر"

یعنی اتصالِ حق اور انتقامِ ظلم و شر — یعنی آتش زیرِ دامن ہو ابھی سنگ زمین

گرفتنی یا عشرت کے طوفان فرو ماندہ کی ہے — سطح مین یا سوت سوکھے پربت یکجا کچھ نمی

الغرض گو اب گمانِ خواب پر شب کا نہین — تیرا قصر آرزو یک حجرہ بے نور ہے

دین فطرت کے ترنم کے لئے مامور ہے۔ ترنم کی غرابت شکوہ سنج فصاحت ہے "تجھ سے ہے ہیہات صد تذلیل دینِ پاک کی" ان اُلجھے ہوئے مصرعون کے علاوہ عبدیت، مجبوریت، انسانیت، فارسیت، عربیت ایسے مصدرونکی بھرمار بھی منافی فصاحت ہے۔ المختصر یہ نظم سنہ ۱۹ء کی ایک زندہ ادبی یادگار ہے۔ ہاشمی صاحب کا نام انجمن ترقی اُردو کے ارکانِ شوریٰ کی فہرست مین بھی شامل ہے اور جب ایسے قابل فرد اس مین شامل ہین تو ترقی معلوم!۔ آخر مین مومن کا یہ شعر پڑھتے ہوئے ہم ناظرین سے تضیع اوقات کی معافی مانگتے ہین ؎

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا — مین الزام اُسکو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

نقادِ سخن

تبصرہ

مشاہیر یونان و روما

انجمن ترقی اُردو نے ابتدائے قیام سے اس وقت تک جس قدر کتابیں ترجمہ و تالیف کرائی ہیں ان میں بلحاظ افادت و نفع رسانی کتاب زیب عنوان وہی درجہ رکھتی ہے جو نظام شمسی میں سورج کو حاصل ہے۔ انجمن کے دور جدید میں بہت اور قابل تعریف کام ہوا، اور اُردو میں کئی بلند پایہ کتابیں اضافہ ہوئیں لیکن اگر یہی ایک کتاب یعنی مشاہیر یونان و روما شائع ہوتی تو بھی ہم کو اس اعتراض کا کوئی حق نہ تھا کہ انجمن نے کچھ کام نہ کیا۔ بہت سی کتابوں کا ذخیرہ فراہم کر دینا یا ایک مفید اور کام کی کتاب چھاپنا دونوں قابل ستایش و تحسین کارنامے کہے جا سکتے ہیں لیکن یہ ہر صاحب ذوق سلیم تسلیم کرے گا کہ اول الذکر کارنامے کے مقابلہ میں آخر الذکر کارنامے پر انجمن زیادہ مبارکباد کی مستحق ہے۔

یوں تو ہر کتاب کی نسبت کہا جا سکتا ہے اور ہمارے ریویو نگار کہا ہی کرتے ہیں کہ "یہ کتاب اُردو میں ایک بیش بہا اضافہ ہے مصنف نے یہ کتاب لکھ کر اُردو کی بہت بڑی کمی پوری کی" وغیرہ وغیرہ لیکن اصل یہ ہے کہ اس قسم کی تعریف و توصیف اسی قسم کی کتابوں پر زیادہ صادق آتی ہے جیسی زیر تبصرہ کتاب ہے۔

یہ کتاب جس پایہ کی ہے اُس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ یہ بھی منجملہ اُن کتابوں کے ہے جنھوں نے یورپ کی کایا پلٹ کر دی۔ یہ ایک واقعہ ہے اور اس واقعہ کی تصدیق کتاب کے مطالعہ سے ہو سکتی ہے جو شخص یہ کتاب پڑھے گا اُس کو اس حقیقت پر یقین آ سکتا ہے کہ آیا وہ قوتیں کونسی ہیں جن سے ایک ترقی پذیر قوم صحیح راستے پر پڑ سکتی ہے ایک سپہ سالار، ایک مقنن، ایک حکمران، ایک اخلاقی ترقی کا خواہشمند

سب کی یہ کتاب رہنما ہو سکتی ہے، اور مصنفین فن حرب، قانون سیاست، اخلاق اور علم النفس وغیرہ کے لیے اس کتاب مین کافی مواد موجود ہے غرضکہ تاریخ کے مطالعے سے جو فوائد حاصل ہو سکتے ہین اُن کی یہ کتاب متضمن ہے خود مصنف خوشگوار طریقہ سے اُن علوم کے سبق ہم کو پڑھا دیتا ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو کے انتخاب اور کوشش سے اس بیش بہا جواہر کا اُردو مین اضافہ ہوا، اور سید ہاشمی صاحب جن کی جانکاہی محنت اور عرق ریزی نے اسکو اُردو کا لباس پہنایا، دونون کا شکریہ واجب اور انجمن مبارک باد کی مستحق ہے۔ کاش جس رتبہ کی یہ کتاب ہے اُس کے شایان شان اس کی لکھائی چھپائی مین بھی اہتمام کیا جاتا اور نہایت نفیس کاغذ پر خوشخط اور آب و تاب سے چھاپی جاتی کہ کتاب کی پہلی قدردانی یہی ہے کہ وہ اعلیٰ پیمانہ پر چھپوائی جائے۔ ہم یہ کہنے سے باز نہین رہ سکتے کہ "مشاہیر یونان و روما" پر معمولی کاغذ پر اور خراب چھپوا کر ظلم کیا گیا ہے۔ اس سے بھی زیادہ اِس امر کی ضرورت تھی کہ اس کتاب کا ترجمہ کسی اُردو کے ماہر یا اہلِ زبان کم از کم صحیح اُردو لکھنے والے سے کرایا جاتا۔

انجمن کی طرف سے اس سے پہلے ایک کتاب "مقدمات الطبیعات" شائع ہوئی ہے اُسے دیکھ کر ہم نے خیال کیا تھا کہ یہ ایک اتفاقی امر ہے لیکن اب یہ "مشاہیر یونان و روما" شائع ہوئی ہے۔ اِسے پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ انجمن نے کیون موجودہ صورت سے شائع کرنے کو جائز رکھا۔ اگر انجمن کو کوئی صحیح اُردو لکھنے والا اس کے ترجمے کے لیے نہ ملا تھا تو اُس کا فرض تھا کہ چھپنے سے پہلے اُس پر نظر ثانی کرتی اور تمام صرفی و نحوی اور روزمرہ و محاورہ کی غلطیاں جن سے اس کتاب کا ہر صفحہ ایک خارستان بنا ہوا ہے درست کر دی جاتین۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے قابل قدر مقدمے مین اس ترجمہ کی نسبت لکھا ہے کہ "میری رائے مین یہ اُردو ترجمہ بلحاظ طرز بیان، سلاست، فہم مطالب انگریزی ترجمہ پر فوقیت رکھتا ہے"۔ مولوی صاحب موصوف اُردو کے بہت بڑے انشا پرداز اور بہت بڑے نقاد ہین، اس لیے مجھے تو یہی شبہ ہے کہ یہ الفاظ اُن کے نہین ہین یا تو یہ جعلالحاقی ہے یا اگر انھین کی تراوش قلم ہے تو میری رائے مین انھون نے بلا ترجمہ دیکھے محض مترجم صاحب کے حسن ظن کی بنیاد پر لکھ دیا ہے۔ اس ترجمہ کی یہ حالت ہے کہ کوئی صفحہ تعقید لفظی یا دو چار قواعد اور محاورہ کی غلطیون سے خالی نہین ہے ہم نمونۃً چند غلطیان لکھتے ہین اُس سے کل کتاب کا اندازہ ہو سکتا ہے

ع "قیاس کن زگلستان من بہار مرا"

"طرفین نکل کر میدان مین" طرفین سے تو نکلا کرتے ہین لیکن خود طرفین کا نکلنا مترجم صاحب کی ایجاد ہے۔

"آپس مین جدی تھے" حرف جدی کوئی نہین بولتا یک جدی چاہیے۔

"چکر اور چک پھیریان .... لگنے پڑتے ہین۔

چک پھیریان مؤنث ہے۔

"بڑی اونچان پر سے" اونچائی تو سنا تھا اونچان نہ معلوم کیا بلا ہے۔

"سرار ادت رگڑے" سر ارادت رگڑنا کہان کا محاورہ ہے۔

"حارج آنے" حارج ہونا محاورہ ہے۔

"عادی آجانا" یہ بھی بالکل غلط ہے عادی ہونا یا عادی ہو جانا بولتے ہین۔

"گریائی اپنی رہی" گریائی جہلا کی زبان ہے۔

"دماغ لڑانے" دماغ کوئی نہین لڑایا کرتا عقل لڑائی جاتی ہے۔

"لوگون کو گرفتہ چھوڑ دیا گھوڑے تو گرفتہ دوڑ لے جاتے ہین"

لیکن مترجم صاحب نے لوگوں کو بگٹٹ چھوڑ دیا۔

"لگے بندھے سے زیادہ اٹھنے نہ لگے" مترجم صاحب کو محاورات کے استعمال کا بہت شوق ہے لیکن موقع و محل نہیں جانتے اُن کو یہ بھی نہیں معلوم کہ لگے بندھے کن کو کہتے ہیں اور پیسے لگے بندھے نہیں ہوا کرتے۔

"مخلات تقدیس سمجھا" مخلات تقدس چاہیے۔ عربی الفاظ استعمال کرنے کے لیے تھوڑی سی عربی دانی کی ضرورت ہے۔

"مذمت کرتا تھا" یہ محاورہ بھی مترجم صاحب کی ایجاد ہے کوئی عربی خواں اس ایجاد کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

"بات ور پڑی" بات در رہی محاورہ ہے۔

"معاملات ہاتھ تلے آ گئے" معاملات ہاتھ تلے آنا لغو ہے معاملات کی باگ ہاتھ میں آ گئی لکھتے ہیں۔

"بالوں بال بچ گئے" محاورہ تو بال بال بچنا ہے بالوں بال مترجم صاحب کی ایجاد ہے۔

"جب انھیں فی الواقعی بھی علم ہو گیا" اول تو فی الواقعی خود لغو ہے اور صرف کم سوادی بول سکتے ہیں۔ اور اگر یہاں فی الواقع ہی ہوتا اور ی کا دُم چھلا اضافہ نہ کیا جاتا تو بھی اس لفظ کے اس موقع پر استعمال کے لیے عربی دانی کی ضرورت نہ تھی صرف اُردو دانی کافی تھی۔ جب اُن کو اصل واقعہ کی اطلاع ہوئی یا حقیقت واقعہ کا علم ہوا یا اصل حقیقت یا حقیقت واقعی معلوم ہوئی وغیرہ وغیرہ لکھنا چاہیے تھا۔

"بالکلیۃ" یہ بھی ایک ایسی ہی غلطی ہے جیسی فی الواقعی کسی پڑھے لکھے کا کام نہیں کہ وہ کلیۃ کے ساتھ با لگا کر ترکیب کرے۔

"دعاؤں سے رجوع لانے" رجوع لانا بھی کیا خوب! رجوع کیا جاتا ہے۔

"اس کو گھسنا نہیں ملتا" واہ وا! کیا فصیح اور کیا صحیح زبان ہے! پھر فرمایئے کہ اُس کو گھسنا نہیں ملتا۔

"بند توہمات سے رہائی دلائی" یہ بند اور کھلے توہمات کیا بلا تھے جن سے رہائی دلائی۔

"خواہش اوچھتی ہے" یہ بالکل نیا محاورہ ہے ٹکسال باہر بولا جاتا ہو گا۔ اہل زبان نہیں بول سکتے۔ ہم سمجھے بھی نہیں کہ خواہش پوچھنے کا کیا مطلب ہے۔

"اطلاق نہ پاتا تھا" مترجم صاحب صحیح اُردو لکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ایسی ہی دُرفشانی فرماتے ہیں۔ اطلاق پانا کوئی محاورہ نہیں اطلاق ہونا اور کرنا ہے۔

"بزور زبردستی غلبہ پایا" ایک اُردو اور ایک فارسی لفظ میں واو عطف سے کیا خوب رشتہ جوڑا ہے۔

"فارقلیس کے تفویض کر دیے" اس جملے میں کے کیا خوبصورت معلوم ہوتا ہے بجائے کو نے کیا قصور کیا تھا جو اُس کی جگہ چھین لی گئی اور صحیح اُردو کا خون کیا گیا۔

"اس معاملے میں بڑے ربط و ضبط سے کلام کیا اور کسی قسم کی . . . . شکایت نہیں کی" اس جملہ میں ضبط کے ساتھ ربط کی ضرورت نہ تھی۔

"بطوع خاطر تمام قیدی اُس کے حوالے کر دیے گئے" مترجم صاحب جب لغت میں طوع کے معنی دیکھیں گے یا کسی سے دریافت فرمائیں گے تو اُن کو سخت شرمندگی ہو گی کہ بطیب خاطر میں تصرف کر کے بطوع خاطر کیوں لکھا۔

"دشمنا نگیوں" اس کی کیا ضرورت تھی کہ دشمنیوں کو ترک کر کے جاہل عورتوں کی تقلید کی گئی۔

"اور ان کی نو آبادیاں . . . . ساحلوں پر پڑی ہوئی تھیں" نو آبادیاں پڑی ہونے کا کیا مطلب ہے؟

"یونانیوں کا ویسا ہی چھتہ بن جاتا" مترجم صاحب نے شاید

یونانیون کو شہد کی مکھیان سمجھ لیا جو اُن کے لیے چھتہ بنانے کی ضرورت پڑی۔

"موسیٰ بچے اپنے دار سے"۔ دار کیا بلا ہو؟ اپنی اپنی باری چاہیے۔

"شخصی فتوی زدہ" مصیبت زدہ، مصیبت زدہ وغیرہ وغیرہ الفاظ کہے اور بولے جاتے ہین لیکن فتوی زدہ ایجاد بندہ ہو!

"توازن اُنھیں دونون ہاتھون مین تلار رکھ سکتا تھا۔ توازن تُلا نہیں کرتا قائم رہا کرتا ہو۔

"شاہنشاہیت"۔ مترجم صاحب بتلائیں کہ یہ لفظ عربی ہو یا فارسی۔

"اُسی وقت سے اُس کا ڈھال شروع ہوتا ہو"۔ مترجم صاحب کو خیال نہ رہا یہ معلوم نہ ہوگا کہ اس موقع پر محاورہ مین "ڈال" آتا ہو

"ہر ریاست پر حسب حیثیت سے چندہ ڈالا گیا" چندہ ڈالنا کہان کا محاورہ ہو۔

"جدید تحقیقاتون نے"۔ تحقیقات خود جمع ہو۔

"اُنھی کا پلّہ غالب رہا"۔ پلّہ بھاری رہنا چاہیے۔

"خاتون نے متحد ہو کر لڑائی چھیڑی جس مین آخیر تک فتح ازدیون کے ہی پہلو پر رہی"۔ لڑائی چھیڑی بھی غلط اور فتح پہلو پر رہی بھی مہمل اور کے ہی کیا؟ ہی کے چاہیے۔

"تمام جزیرہ اُن کے ماتحت آگیا"۔ اُن کے تحت مین آگیا یا ماتحت ہوگیا لکھنا چاہیے تھا۔

"قدرتی حُسن و جمال کو اس کی جلادت و صولت دُگنا رہی تھی"۔ جلادت نہ معلوم کیا بلا ہو اور دُگنا رہی تھی کیا چیز ہو۔

"ہنی بال ۔۔۔۔ سیلاب کی طرح ۔۔۔۔ اُترا"۔ سیلاب اُترا نہیں کرتا۔

"طرح طرح کے شبے اور اتہام اُٹھانے لگے"۔ شبے کرنا اور اتہام لگانا محاورہ ہو۔

"مستقل سکونت بنا کر"۔ سکونت بنانا مہمل ہو۔

"خاتمہ مسئلہ بحث و مباحثات مین"۔ محاورہ بحث و مباحثہ ہو۔

"محسن میزبانون پر حکومت چلانے کا حق طلب کرین"۔ حکومت چلانے کی بھی ایک ہی کہی۔

"اور جن عورتون کے شوہر اُتر جاتے وہ اس عرصہ تک برابر بیوگی کا سوگ رکھتی تھی"۔ شوہر اُتر جانے کا کیا مطلب ہو۔

یہ ایسی غلطیان ہین جو کوئی اہل زبان گو وہ معمولی لکھا پڑھا ہی کیون نہو ہرگز نہین کرسکتا۔ اِن غلطیون کے علاوہ مترجم صاحب نے کہین کہین اپنی شان اجتہاد بھی دکھائی ہو۔ اور کچھ نئے الفاظ وضع فرمائے ہین جو اس سے پہلے نہ قدیم اُردو مین دیکھے گئے اور نہ جدید اُردو مین اور نہ شہری اُردو مین سُنے گئے نہ دہاتی اُردو مین۔ مثلاً ایک جگہ آپ "جھانتا ہون" تحریر فرماتے ہین۔ ایک جگہ "چڑسیان" (یعنی چڑے کی پتلی پتلی پٹیان) لکھا ہو اور ایک جگہ "تقریبے" نیا لفظ ایجاد فرمایا ہے۔ ناظرین کو اگر ان جذبات آفرینون کے دیکھنے کا شوق ہو تو "مشاہیر کرنا درر ومۃ" ملاحظہ فرمائین یا سطور بالا پر ایک اور نظر ڈال لین اِن مین بھی کئی جدید محاورے اور الفاظ مترجم صاحب کی قابلیت اجتہاد کی شہادت دین گے۔

ہم نے سرسری طور سے کتاب کی ورق گردانی کرکے غلطیون کے دریا مین سے چند قطرے نمونتاً پیش کیے ہین اور نہ اُردو مین آجتک کوئی کتاب ایسی شائع نہین ہوئی جسمین اِسقدر طومار اغلاط موجود ہو جو کہ اس کتاب مین ہو۔ یہ مع مقدمے کے ۲۰۰ صفحے کی کتاب ہو۔ کوئی صفحہ خالی نہین ہو جسمین ایک دو بلکہ اس سے بھی زیادہ غلطیون سے ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے اہتمام نہ کیا گیا ہو۔ اگر یزی مین جس اس کتاب کا ترجمہ کیا تھا اُس کو سر کا خطاب دیا گیا تھا۔ مترجم صاحب

اِس کے مستحق ہین کہ اِن کو ڈالسین کا خطاب دیا جائے

مترجم صاحب جسطرح نئے الفاظ وضع کرنے مین مشاق ہین اسیطرح آپ کو شاعری مین بھی ید طولیٰ حاصل ہی اور خان قادر الکلامی مین نہایت بلند پرواز ہین۔ انگریزی ترجمہ مین جسقدر نظمین اور اشعار تھے مترجم صاحب کی جدت آفرین طبیعت کو کب گوارا تھا کہ اُن کا ترجمہ نظم ہی مین نہ کیا جائے۔ اِس مین بھی آپ کی طبع وقاد نے وہ وہ گل کھلائے ہین جن کو دیکھ کر دنیا کی ہر زبان کے بڑے بڑے شاعرون کی روحین وجد مین آجائین گی۔ گو اُردو کا کوئی مبتدی ان نظمون کو دیکھ کر ضرور چکرا جائے گا۔ ناظرین کے تفنن طبع کے لیے نمونۃً چند شعر پیش کیے جاتے ہین ؎

کھٹکنے: دے اشراب جلد پیالون کو اے لوگون کے سردار
جب تک کہ تو اپھنس کو آلیوے ایکبار

اس شعر کا دوسرا مصرعہ اور آلیوے ملاحظہ طلب ہی ؎

ہان نغمہ وتیرہ ہین ہم عنان   قدم زن ہر گلیون مین لضمان دان
ریگان و انا کے شولے ہین وان   جوانون کی ہین بے پناہ برچھیان
برقص وطرب جشن کا ہے سمان

نشان زدہ الفاظ ناظرین کی خاص توجہ کے مستحق ہین۔ اگر مترجم صاحب بطور خود اس کتاب کو چھپوا کر شائع کرتے تو ہم کو زیادہ اعتراض کا موقع نہ تھا لیکن یہ کتاب انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شائع ہوئی ہی جس کے قواعد وضوابط کی پہلی دفعہ یہ ہی کہ :-

"اصلاح زبان یعنی اُردو زبان مین جو خرابیان پیدا ہوتی جاتی ہین اُنھین رفع کرنا اور غیر مانوس اجنبی الفاظ و محاورات جو غیر زبانون کے بلا ضرورت زبان مین داخل ہوتے جاتے ہین اُن سے بچنا اور صحیح و فصیح زبان کو رواج دینے کی کوشش کرنا"

کیا یہی صحیح و فصیح زبان ہی جس کے رواج دینے کی انجمن کوشش کرتی ہی۔ اگر یہی ہی تو اُردو کی فاتحہ پڑھ لینا چاہیے۔ انجمن کا فرض ہی کہ جو کتاب اُس کی طرف سے شائع ہو اُس کی زبان قابل استناد ہو، اور اگر یہی لیل و نہار ہی تو ہم کو سخت افسوس ہی کہ انجمن اُردو کو فائدہ پہنچانے کے بجائے نقصان پہنچا رہی ہی اور کوئی وجہ سمجھ مین نہین آتی کہ اپنے ضوابط کی پہلی دفعہ کیون پامال کرتی ہی۔ اگر اِس کتاب کے بقیہ حصے ترجمہ نہ ہوے ہون تو میری رائے مین کسی دوسرے کو دیدیے جائین، اور اگر بدقسمتی سے وہ بھی ترجمہ ہو گئے ہون تو چھپنے سے قبل اُن پر نظر ثانی کرلی جائے۔ ہم ایک دوستانہ صلاح یہ بھی دیتے ہین کہ آئندہ ترجمہ کے لیے وہی طریقہ اختیار کیا جائے جو مولانا شبلی مرحوم کے عہد مین تھا کہ جس کتاب کا ترجمہ منظور ہوتا تھا اُس کا اخبارات و رسائل مین پہلے اعلان کیا جاتا تھا اور ترجمے کے نمونے طلب کیے جاتے تھے جس کا ترجمہ اچھا ہوتا اُس سے کل کتاب کا ترجمہ کرایا جاتا تھا۔ یہ طریقہ نہایت موزون اور مناسب تھا۔ اگر کسی خاص مصلحت سے اس طریقہ پر عمل کرنا پسند نہ کیا جائے تو برائے خدا ایسے شخص سے ترجمہ کرایا جائے جو صحیح و فصیح اُردو لکھ سکتا ہو، ایسے شخص کو کوئی کتاب ترجمہ کے لیے نہ دی جائے جو اُردو سے بالکل نابلد ہو، لیکن خود کو مجتہد سمجھتا ہو۔

قمر

قیود و تقلید، تجدید و تنقید

کیا یہ خیال صحیح ہے کہ قیودِ شاعری و تقلیدِ فصحا فطری جذبات و دلکش خیالات کے سدِ راہ ہیں؟ کیا ایشیائی مذاق تا بعِ البلدہ ہو تو تجھے حدود کی چار دیواری بھی دلی کی خانقاہوں اور لکھنؤ کے محلوں کی طرح ٹوٹی پھوٹی رہے؟ کیا ردیف و قوافی کا پابند قیودِ آزاد روش والے نو مشقوں سے بادصف کثرتِ مشق اچھی نظمیں نہیں لکھ سکتا؟ کیا قافیوں کی دلچسپ نشست، ردیفوں کے خوش نما پہلو اپنے موقع و محل پر دلیلِ حسنِ سخن نہیں بن سکتے؟ کیا مثنوی سے بڑھ کر آزادی کسی اور صنفِ نظم میں ہے؟ پھر حسنِ سخن کا پیدا ہونا اس صنف میں بھی کیوں مشکل ہے؟ کیا سبب ہے کہ گلزارِ نسیم و میر حسن کے سوا اور مثنویاں شہرت و قبولیت سے ممتاز نہ ہو سکیں؟ میر انیس چند مخصوص بحروں میں مرثیہ گوئی کرتے رہے اور مسدس کے دائرے سے نہ نکل سکے مگر فردوسی سے پہلوانِ سخن اور فضل سے مرد میدان کا مقابلہ کس نے کیا؟

تلوار کا شتی ہے مگر ہاتھ چاہیے

نئی شاعری کے نیچرل شاعر خواجہ حالی کا مسدس سب نظموں سے زیادہ کیوں مشہور و مقبول ہے؟ کیا وہی مسلسل مضامین بلا قیدِ مسدس مختلف بحروں اور متعدد زمینوں میں ہوتے تو انکا پایۂ سخن اپنی جگہ پر اتنا بلند رہتا؟

غزل کے مضامین سب سے نئے نہیں ہوتے وہی گل و بلبل وہی شمع و پروانہ، وہی نازو ادائے معشوقانہ، وہی سوز و گدازِ عاشقانہ مگر ردیفوں کے چسپاں، قافیوں کے درست و گرچیاں ہونے ہی سے ان میں تازگی آجاتی ہے۔

متروکات یعنی الفاظ واجب الترک و مستحسن الترک کی قیود زبان کی حسنِ صفا قائم رکھنے کے لیے ہیں۔ جو الفاظ زبانوں پر گراں گزرتے ہیں اور فصحا کے روزمرہ سے خارج ہو گئے ہیں ہمیں انھیں اپنے اشعار میں داخل کرنے کا کیا حق حاصل ہے؟ جتنے الفاظ و محاورات قدیمہ متروکِ فصحا ہو کر زبانوں پر بار اور فصاحت کے لیے ناگوار ہو گئے ہیں ہمیں ان کے اختیار کا کیا اختیار ہے؟ متروک زبان کی تقلید کیا ہم مقلد کے بدلے مجدد کہے جا سکتے ہیں؟

اگلے زمانے میں قیودِ شاعری سے بڑی قید یہ تھی کہ عربی فارسی کی کافی استعداد، عروض و قوافی، معانی و بیان، لغات و محاورات کے بغیر معلومات کوئی قلم اٹھاتا ہی نہ تھا اب یہ قید متروک و مرفوع القلم ہو گئی ہے۔ کیا ایسی آزادی قابلِ تحسین ہے؟ کیا ایسی کم سوادی و کم مائگی معراجِ کمال پر پہنچا سکتی ہے؟ کیا الفاظ کے خزانے پاس نہ ہوں تو قافیے مل سکتے ہیں؟ اور مل بھی جائیں تو فنِ قوافی سے ناآشنا رہ کر کیا اپنے محل پر مستعمل ہو سکتے ہیں؟ کیا بغیر علمِ معانی و بیان اچھے استعارات، پاکیزہ تشبیہات کی خوبیاں ذہن نشین ہو سکتی ہیں؟ کیا زبان و محاورات سے نابلد رہ کر قدم قدم پر لغزشوں سے سنبھلنے کا کوئی سہارا مل سکتا ہے؟

اردو کا کوئی جامع و مبسوط لغت موجود نہیں ہے جو تحقیق و تلاش سے مستغنی کر کے بڑے رہنما کا کام دے۔ قیدِ شاگردی کو ننگ و عار سمجھنے والے یہ سمجھ لیں کہ اہلِ زبان کی اصلاح و تربیت سے مستفید ہوئے بغیر کام نہیں چل سکتا۔

شاعری سے زیادہ تمام علوم و فنون کا جامع کوئی فن نہیں ہے۔ موسیقی کی نے اسکے ترانوں میں، مصوری کا مرقع بھی اسکے نگار خانوں میں، سحر سامری اسکی تاثیر سے مات، اعجازِ عیسوی اسکا قائل کرامات ہے۔ نیزہ و شمشیر سے زیادہ شاعری کی نوکِ قلم، تیغِ دو دم سے بڑھ کر اسکا مصرع تیز دم ہوتا ہے۔ ایسے فن سے زیادہ کس فن کے لیے استعداد و علم کی ضرورت اور استادِ شفیق کی حاجت ہو سکتی ہے۔ آج ہی دیکھ لیجیے پروفیسر اقبال، لسان العصر اکبر، مولانا شوق قدوائی، نظم طباطبائی یا اور چند بزرگ جنھیں انکی ہم نوائی کا فخر حاصل ہے سب کی شہرت و قبولیت کا راز قابلیت میں مضمر ہے۔ جلیل القدر جلیل ہوں یا حضرت ریاض کوئی بھی بغیر استفاضہ و استفادہ معراجِ کمال پر نہیں پہنچا ہے۔ پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مروجہ قیودِ شاعری سے آزاد، قید

تحصیل علم و فن سے آزاد، قید شاگردی سے آزاد ہو کر کوئی آزاد خیال کس طرح شاعر نازک خیال و سخنور بے مثال ہو سکتا ہے؟

حضرت قبلہ امیر مینائی کو داغ دہلوی پر ترجیح دینے والے، حضرت داغ کو امیر مینائی سے بڑھانے والے دونوں بالاتفاق ہم زبان ہیں کہ یہ آفتاب و مہتاب شاعری میں اپنا مثل نہیں چھوڑ گئے۔ فی زمانہ شعرا کے معدودے چند افراد بھی جو اپنی جامعیت و قابلیت میں فرد ہیں اگر اپنا مثل نہیں چھوڑ گئے تو قیود شاعری کیا معنی شاعری ہی سے اردو زبان آزاد ہو جائے گی۔ ہم افسوس کے ساتھ دیکھ رہے ہیں کہ تحقیق فن، جامعیت سخن، فراہمی سرمایہ لغات و محاورات، مشق شاعری کے بدلے صرف دو مادے زوروں پر ہیں۔ ایک تجدید، دوسرے تنقید۔

تجدید والوں کا نعرہ ہے کہ اگلوں کی تقلید چھوڑو، پرانی لکیر کے فقیر نہ ہو۔ شعر و سخن کو صرف معنی ہی نہیں بلکہ صورت کے اعتبار سے بھی بدل دو کسی کے نقش قدم پر نہ چلو، اپنی راہ الگ نکالو۔ سب قیدیں توڑ کر آزاد ہو جاؤ، وہ کر دکھاؤ کہ اگلوں سے اُس کا عشر عشیر نہ ہو سکا ہو۔ مگر ؎ کتنا آسان کر دکھانا مشکل۔ بے تقلید میں کامیاب ہوئے تجدید میں کامل کوئی نہ ہوا، یورپ والے مسلمانوں کے علوم و فنون کے پہلے کچے مقلد بن گئے پھر مجدد ہوئے۔

تنقید والوں کا شور ہے کہ کھوٹے سے کھرے کو الگ کر دکھاؤ، نکتہ چینی و خردہ گیری میں کسی کے حفظ مراتب کا خیال بھی ذہن میں نہ لاؤ۔ ہزار ہنر میں ایک عیب بھی کسی کا ڈھونڈھ کر ضرور نکالو، تہذیب کے پردے میں پردہ دری نہ بن پڑے تو دو چار آوازے کسو۔ تنقید اتنا بڑا ہنر ہے جسکا ہر عیب ہنر میں داخل ہے، اب زمانہ دوسرا ہے دور ہی اور ہے۔ آزادی چھوٹے سے چھوٹے کو بڑے سے بڑے کی عیب جوئی پر آمادہ کر دیتی ہے۔ جہاں کسی کی تنقیص کا خیال آیا تنقیدی عنوان قائم ہوا اور قلم و زباں نے ایک ہی حرف کے پھیر میں حرف گیری کا حق ادا کر دیا۔ کاش تنقیدی آزادی کے پانوں میں بھی ہلکی ہلکی بیڑیاں ڈال دی جاتیں کہ چل تو سکتی مگر حد سے باہر نہ نکل سکتی۔ تنقید معیار سخن بنکر کھوٹا کھرا پرکھتی ہے اُسکا بھی کوئی معیار ہونا چاہیے۔

قیود شاعری کی طرح تنقیدی اصول و ضوابط بھی منضبط ہو جاتے تو خوب ہوتا۔

میرے ایک معزز ہم وطن اپنے عنایت نامے میں تحریر فرماتے ہیں:- "پورب والوں نے خواہ مخواہ پچھم والوں کی تقلید کا پٹا گلے میں ڈال لیا ہے۔ اجتہاد کے درجہ پر اُسوں کا پہنچنا مشکل ہے۔" تقلید کا پٹا گلے میں موتیوں کے ہار سے قیمتی ہوتا اگر پچھم والوں کی ہم زبانی و ہم نوائی کا فخر حاصل ہو جاتا۔ پورب کے درجہ اجتہاد پر پہنچنے والا خواب فراموش ایک مطلع یاد دلاتا ہے: ؎

دعوے زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے
اظہار بوئے مشک غزالوں کے سامنے

اتنی ہمت ایسی سعی و محنت والے سو میں ایک دو بھی نظر نہیں آتے جو پورب میں رہ کر باکمال شاعر یا زباں داں ہونے کا خاص امتیاز حاصل کر لیں۔ وہ زمانہ گیا جب ہندیوں نے زبان فارس میں اتنی مہارت بہم پہنچائی تھی کہ تبع اصفہاں بھی اُنکا لوہا مان گئی تھی۔ پورب میں بھی جب اُردو کے خسرو و فیضی پیدا ہوں تو پچھم والوں کے مقابلے میں شاید دعوے اجتہاد کا موقع ملے اور یوں کہنے کو تو ایک قصیدے کی مضمون تعلّی میں حسب دستور شاعرانہ راقم سطور نے بھی لاف و گزاف کا حق ادا کیا ہے ؎

وہ عرفی ہوں کہیں سب فیضی ہندوستاں جسکو
وہ خاقانی ہوں سب جسکو کہیں اُردو کا قاآنی

یہ چند سطروں کا معمولی مضمون ختم ہی ہو جائے تو اچھا ہے مگر یہ بھی سُن لیجیے کہ لکھا کیوں گیا۔ ایک مہربان نے مجھ سے حسب ذیل سوالات کیے

(۱) اردو شاعری ردایف و قوافی، متروکات، تقلید اہل زبان، شاگردی وغیرہ اتنے قیود سے کیوں محدود ہو گئی کہ حسن سخن کی راہ، وسعت بیان کے راستے سب مسدود ہو گئے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

(۲) کیا جسکا زاد و بوم پورب ہو وہ باوصف کہنہ مشقی ماہر فن اور کامل فن ہونے کے اس قابل نہیں ہو سکتا کہ اُس سے استفادہ جائز ہو؟ آپ کے

میرے ایک دوست نے اصلاح چاہی تو پوربی ہونے کا عذر کیوں کیا گیا کیا آپ شاعر نہیں ہیں؟

(۳) امیر و مصحفی یا امیر و داغ کا ہم پایہ کوئی شاعر اب موجود ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو پھر مستند قابل اتباع کس کا کلام ہے؟

پہلے سوال کے جواب میں تحریر مذکورۂ بالا کافی ہے۔ دوسرے تیسرے سوال کا جواب مجھ سے نثر میں نہیں بن پڑتا اس لیے ایک قطعہ درج ذیل ہے جو کسی ایسے ہی موقع پر لکھا گیا تھا:-

قطعہ

لکھتے ہیں مجھکو خط میں مرے ایک مہرباں — کیا آپ نکتہ سنج نہیں نکتہ داں نہیں؟
کیا آشنا مذاقِ سخن سے نہیں زباں — کیا آپ ذوقِ نظم سے رطب اللساں نہیں؟
مینائے میر و غالبِ مے کش کے جام کی — دو گھونٹ بھی نصیبِ مے ارغواں نہیں؟
پایا نہیں جو بزم میں کیا دورِ مصحفی — کیا اب وہ سلسلہ نہیں یا خاندان نہیں؟
کوئی تو ہوگا بلبلِ خوش لہجۂ سخن — مانا کہ داغ بلبلِ ہندوستاں نہیں
زندہ کرے امیرِ خدائے سخن کا نام — ایسا اب ایک شاعرِ جادو بیاں نہیں
میں نے کہا بجا ہے یہ عجز و نیاز کی — بندہ نواز! ناز کا موقع یہاں نہیں
کہتے ہیں شعر کس کو سخن کس کا نام ہے — یہ امتیاز بھی مجھے اے مہرباں نہیں
جوہر شناس جسکو جواہر سے تول لیں — اب وہ متاعِ نظم کا یکہ گراں نہیں
ہیں وہ خم و قدح نہ وہ پیمانہ و سبو — وہ پیرِ مے فروش کی اونچی دکاں نہیں
اُسپر یہ لطف ہے کہ سخنور ہیں سیکڑوں — ایسا بھی کوئی شہر ہے شاعر جہاں نہیں
خالی نہیں ہیں نقص سے پہلے کے باکمال — دامن پہ جو یہ داغ کہ اہلِ زباں نہیں
پنجم کے شاعروں کی تو کیا بات ہو مگر — سب اک طرح کے فاضل و کامل یہاں نہیں
المختصر جو ماہرِ فن ہو کسی کا ہو — کچھ اُسکے اتباعِ سخن میں زیاں نہیں
کالج کی ڈگریوں پہ گئے ناز کیا شفق
شاعر کے پاس جب سندِ امتحاں نہیں

شفق عمادپوری

(تنقیدِ کُتب)

۱۔ عالم خیال
۲۔ مسدس توحید
۳۔ جذبات محب

مولوی محب حسین صاحب حیدر آبادی اُن مشاہیر اہل قلم مین سے ہین جنکی ذات سے مسائل ملک کو مختلف عنوان سے معتد بہ فائدہ پہنچ چکا ہو۔ آپ ایک عرصے تک معلم شفیق کے ایڈیٹر رہے اور اسکے ذریعے سے ملک مین اپنی عالمانہ قابلیتون کا سکہ بٹھایا۔ پھر اسی رسالہ کو آپنے "معلم نسوان" کا نام دیکر مستورات کی ضروریات تکمیل پر توجہ کی۔ اور ایک مدت مدید تک ہندوستان کی صنفِ نازک کی حالت درست کرنے کی سعی مین مصروف رہے۔ غالباً آپ مسلمانون مین پہلے شخص تھے جنھون نے تعلیم نسوان کی ضرورت جتانے کے ساتھ ہی پردۂ نسوان کی پرزور مخالفت کی۔ اِس خیال کے صحیح یا غیر صحیح ہونے پر ردّ و قدح فضول ہو لیکن مولوی محب حسین صاحب نے جس استقلال اور جرأت سے اپنے اِس خیال کی اشاعت کی اُس کا یہ نتیجہ ہوا کہ خاص حیدر آباد کیا معنی ہندوستان کے دوسرے اقطاع مین بھی لوگون کی توجہ اِس مسئلہ کیطرف متوجہ ہو گئی۔

"معلم نسوان" مولوی صاحب کا ذاتی پرچہ تھا اور سالہا سال تک اُنھون نے اُس کی ادیٹری کی ذمہ دارانہ خدمات نہایت قابلیت سے ادا کین۔ "معلم نسوان" کے بعد "علم و عمل" روزانہ کی ایڈیٹری کا قلمدان بھی آپ ہی کو تفویض ہوا تھا لیکن اس اخبار نے زندگی بہت تھوڑی پائی اور بہت پہلے قبل از وقت خاتمہ نے غالباً مولوی محب حسین صاحب کی علمی مساعی کا جو مستقل سلسلہ تھا اُسکو شکست کر دیا۔ تاہم مولوی صاحب کے کارنامے ایسے نہین ہین جو اُنکے نام کو بقائے دوام سے محروم رکھین۔ علاوہ نظم کے آپ کے منثور مضامین کا مجموعہ اگر مرتب کیا جائے تو کئی ضخیم کتابون کے برابر ہو۔ "عالم خیال" بظاہر آپ کے محققانہ و مدلل مضامین کا ایک نمونہ کہا جا سکتا ہو جو مختصر ہونے کے باوجود دلچسپی کا بہت کچھ سامان اپنے اندر رکھتا ہو۔ اس رسالہ مین خیال کی قوت اعمال کے نتائج دلایل و براہین کے ساتھ اسی طرح بتائے گئے ہین کہ عالمانہ طرز استدلال کے ساتھ صوفیانہ مذاق کی جھلک بھی موجود ہو۔ معلوم ہوتا ہو کہ مولوی صاحب کو آخر آخر اِس رنگ کا پیرو بننا پڑا ہو کیونکہ دور آخر کی آپ کی تصانیف عموماً اسی رنگ مین رنگی ہوئی ہین۔ مثلاً "وصال حق" اور "مسدس توحید" وغیرہ۔ موخر الذکر نظم مصنف نے اپنے "پیر و مرشد قبلۂ سالکین و کعبۂ عارفین شاہ محمد صاحب صدیقی دام ظلہم و فیوضہم" کی تعمیل ارشاد مین لکھکر کتابی صورت مین شائع کی ہو۔ مولوی محب حسین صاحب ایک پختہ کار شاعر ہین۔ اور ادق اور دشوار مسایل علمی کو جامۂ نظم پہنانے مین انھین ملکہ طاقی لگا دیا جاتا ہو۔

مُسدس توحید اس بات کا شاہد ہو کہ اِس مین مسئلہ توحید کی باریکیان اور وحدت الوجود کے نازک رموز نہایت دلپسند عام فہم طریق پر بیان کئے گئے ہین۔ آغاز نظم سے پہلے چند رباعیان اسی مضمون کے متعلق ہین اور پھر اصل مُسدس شروع ہوتا ہو جس کے مندرجہ ذیل دو ایک بند سے پوری نظم کی حقیقت اندازہ لگائے قائم کی جا سکتی ہو ؎

نئے نئے یہ تماشے ہین اُسکی قدرت کے یہ عکس آئینے مین ہین اسی کی صورت کے
گلون مین رنگ ہین پرتو اسی کی نگہت کے یہ لطف ہین نظارے مین اُسی کی الفت کے

اُسی کے حسن سے معمور سارا عالم ہے
اُسی کی مدح سرائی جہان مین پیہم ہے

ذرا تو غور کر اِس باغ پر کبھی نادان کہ کون شاخ مین پتون مین گل مین ہو پنہان
یہ کس کا رنگ ہو جس سے ہین بلبلین حیران یہ کس کا حسن ہے جو ہر درخت سے ہو عیان

ظہور کس کا ہو ہر آن باغ و صحرا مین
وہ ایک ہی تو ہو مشہود چشم بینا مین

بنو دیکھ کو دیکھ اور پھر سمجھ کہ ہو گیا ہو جا نثار کہ مردہ ہو یہ ذرہ سا

نہیں ہے جان تو کیسے ہوا شجر پیدا　　یہ بیج ہی تو ہو خود بڑھ کے اصل او رتنا
عیان جو بیج تھا اُس میں درخت پنہاں تھا
ہوا درخت جو ظاہر تو بیج ہی جان تھا
اسی طرح سے یہ عالم خدا کے اندر تھا　　وجود نور شہود علم سب بقدر تھا
ہوئی تجلی ثانی تو فرق اظہار تھا　　حباب و موج سے پھر تو جدا سمندر تھا
حباب و موج و سمندر جدا ہم گر ہیں
گر یہ ذات میں اپنی تو سب برابر ہیں

اس کے بعد ایک مولوی صاحب سے مکالمہ شروع ہو جاتا ہے اور اُن کے درمیان اس مسئلہ کے متعلق جو غلط فہمیاں جہالت اور تنگ خیالی سے پیدا ہو گئی ہیں ظاہر کی گئی ہیں اور اُسے اپنی اصلی شان میں دکھایا گیا ہے۔ مسئلہ توحید ایک نازک مسئلہ ہے اور اس کی باریکیوں کو مولوی محب حسین صاحب نے عمدگی سے ذہن نشین کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور جس بزرگی اور بلند آہنگی سے انھوں نے ان باریکیوں کو نظم میں سمجھایا ہے اُس سے اُن کی قدرتِ شعرگوئی کا پتہ چلتا ہے تاہم مثنوی "توحید" مولوی صاحب کے طرزِ سخن اور اندازِ بیان کا ایک سرسری خاکہ ہے اور جو لوگ آپ کے کلام کو اُس کی اصلی شان میں دیکھنا چاہتے ہوں انھیں جذبات محب کا مطالعہ کرنا چاہیے جو مولوی صاحب کے ہر قسم کے کلام کا مجموعہ ہے اس کی ترتیب و اشاعت کے لیے افضل النساء خانم صاحبہ کا ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے کاوش و محنت سے مولوی صاحب کے کلام کا ذخیرہ جمع کیا ہے اور ملک کے سامنے اسکو ایک مستقل اور مدون صورت میں پیش کیا ہے "جذبات محب" جسے کلیات محب کہنا زیادہ موزوں ہوگا تمام اصناف سخن کے بیش قیمت نمونوں سے مالا مال ہے غزلیات قصائد مسدس ترکیب بند ترجیع بند رباعیات قطعات سہرے تہنیتی و تعزیتی نظمیں غرض جملہ سے کوئی چیز مصنف کی طبع آزمائی سے بچی ہے اور ہر ایک میں مصنف کا طبعی رنگ صاف طور پر نمایاں ہے آپ کا مذاق سخن [illegible]

کی عام مروجہ شاعری سے جداگانہ ہے اور اس باب میں آپ مولانا حالی مغفور کے مقلد معلوم ہوتے ہیں۔ پھر بھی ان دونوں حضرات کا کلام اپنی اپنی جگہ جداگانہ امتیاز رکھتا ہے اور مولوی محب حسین صاحب نے نسواں کے متعلق جو کچھ اور جس قدر اور جس انداز میں لکھا ہے وہ ان کی خاص چیز ہے۔ اسکے علاوہ ان کی غزلیات قطعات اور دوسری چیزیں قومی ملکی تمدنی معاشرتی اخلاقی تاریخی نکات سے مملو ہیں۔ جو رائے زنی انھوں نے کسی بحث خاص پر کی ہے ممکن ہے کہ جمہور اس سے متفق نہوں لیکن اسمیں کسی کو شک کی گنجائش نہیں ہو سکتی کہ انھوں نے جو کچھ کہا ہے نیک نیتی سے کہا ہے متانت و تہذیب کا پہلو کہیں نظر انداز نہیں ہوا۔ ایک پُر اثر انداز میں کہا گیا ہے تنگ خیالی ہٹ دھرمی ضد کا دخل کا اسمیں شائبہ تک نہیں ہے۔ اس کے باوجود حیدرآباد میں مولوی صاحب کو جن جن مخالفتوں اور مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا ہے اس کا حال کچھ وہی جانتے ہونگے اور اسکی ادنےٰ مثال یہ ہے کہ اپنا رسالہ "معلم نسواں" آخر انھیں مجبور ہو کر بند کر دینا پڑا۔

جہاں تک معلوم ہوا ہے مولوی محب حسین صاحب شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں ہیں بلکہ یہ سب کچھ ان کی خداداد قابلیت فطری جودت کا نتیجہ ہے۔ اس لحاظ سے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ محض اپنی طبع رسا کے زور سے انھوں نے فن سخنگوئی میں استادانہ مہارت بہم پہنچائی اور بلا امداد غیرے اس کٹھن منزل کو طے کیا۔

اس جگہ مختصر کچھ نمونے آپ کے کلام کے درج کیے جاتے ہیں ان سے ناظرین اسکی عظمت و رفعت کا اندازہ کر سکیں گے ؎

اُسی کے حسن کا جلوہ ہے جا بسو کیا کیا　　ہر ایک گل میں اُسی کے ہیں رنگ و بو کیا کیا
رموز عاشق و معشوق کوئی کیا جانے　　ہزار طرز سے ہوتی ہے گفتگو کیا کیا
کیا ہے جہل و تعصب نے اعتقاد تو ذلیل　　دکھائے دیکھیے آگے ہماری خو کیا کیا
مری زبان پہ آیا جو نام پردہ نشین　　تو آئی کان میں آواز [illegible] کیا کیا

سُنا ہو جب کرینگے وہ اپنے ہاتھ سے قتل　　رگوں میں دوڑتا پھرتا ہو خود لہو کیا کیا

تیسرے اور چوتھے شعروں میں مصنف کا اصلی رنگ نظر آرہا ہو اور اُنکی جھلک اُن کے کلام میں بیشتر پائی جاتی ہو۔ مثالاً یہ چند اشعار دیکھئے:—

عمر بھر حرص و ہوس ہی نے کیا خوار و ذلیل　　ہم سے ناداں یہ بچے بھی سنبھالے نہ گئے
چاہیے یہ کہ چھٹے قوم سے ہر رسم فضول　　رسم جو تھی کہ اچھی اور یہ چالے نہ گئے
ہم نے چاہا تھا کریں پیش خیالات جدید　　بیچ پھولوں کے مگر سنگ پڑے اور گئے

یوں تو پیغامِ حیات ہیں ہزاروں انسان　　فائدہ جس سے ہو انساں کو وہ ہستی اچھی
گر نیشن کی ترقی ہو تو ہم باز آئے　　اس بلندی سے ہماری یہی پستی اچھی

رفاہ عام کا ہو کام دل کا مُدعا نکلے　　زبانِ خلق سے برسوں صدائے مرحبا نکلے
یہ تسبیح و مصلّے چھوڑ دے وہ کام کر جس سے　　دلِ مخلوق سے صدیوں ترے حق میں دُعا نکلے
جنونِ پردۂ نسواں نہیں جاتا دماغوں سے　　الٰہی اس مرض کی بھی کوئی اچھی دوا نکلے
حجابِ ظاہری سے کیا نگاہیں پاک ہوتی ہیں　　دلوں میں شرم کا پیدا ہو تو مصنوعی حیا نکلے
نہ چھوڑا عمر بھر قیدِ جفا سے بدگماں تو نے　　ہوئی تفتیش جب قیدی ترے سب بے خطا نکلے

پڑھنے کا شوق تو بچوں کے تو ہر جا ابھی سے ہو　　جو ہونے آلا ہو وہ ہویدا ابھی سے ہو
بچپن میں لڑکیوں کے تو ہیں کھیلنے کے دن　　پردے میں بیٹھنے کا تقاضا ابھی سے ہو
لازم کو لب پہ ہم میں جو پردے کی سختیاں　　مجلس میں کچھ فساد سا برپا ابھی سے ہو

غرض اسی طرح کہیں خیالات کی درستی اور رجال کی تعلیم دی گئی ہو کہیں کسی ملکی، معاشرتی، یا تمدنی ضرورت کا اظہار کیا گیا ہو کہیں کام کرنے کی ترغیب ہو کہیں قومی خدمات کی تشویش، کہیں علم کی خوبیاں، کہیں جہالت کی بُرائیاں بیان کی گئی ہیں، اور کہیں تہذیب جدید کے روشن و تاریک پہلو دکھانے کی کوشش ہوئی ہو:— مثلاً

جبریہ تعلیم کا قانون نافذ ہو تو کچھ　　ہو ازالہ جہل کے اِس خوفناک آزار کا
فیصدی چو رانوے سے بڑھ کے جاہل ہیں جہاں　　کیا اثر اس ملک نا خواندہ پر ہو دو چار کا

جو دولت چاہتے ہیں وہ علوم مغربی سیکھیں　　تجارت تحت صنعت تاج زریں ہو سلیمان کا

حیف ہے جو مرد جاہل سے ملا　　وہ ہوا کاہل جو کاہل سے ملا

جانیں گنوائیں مفت کئے خانماں تباہ　　اے ناسمجھ دیکھ کہ شہرت نے کیا کیا

گھوڑ دوڑ میں کلب میں طلا نیرہ جو ہوا　　تہذیب کا مدار رہو اب تو قمار پر

رسالت چاہتا ہے گر تو کر مخلوق کی خدمت　　پیمبر جان دیتے تھے اسی اجر عبادت پر
خوشی اس زندگی کا ہلوان کو نہیں سکتی　　کہ راحت آدمی کی منحصر ہو شغل محنت پر
سبب قوم کو تحصیل ہنر کی نہیں پڑا　　نہ فخر و ناز عزت پر نہ کوئی رنج ذلت پر
غلامی جس کا دایم یا تمالی یا اور مجبوری　　کھولے میں کیا کیا کیا ظلم ہو کہ ان عورت پر
زنا و فحش سے بیٹیاں کیونکر ہوں ان　　کہ قایم ہو تمدن گھر کا گھر قایم ہو عفت پر
انھیں چار ان ستونوں پر قایم ملک و دولت　　حکومت پر صناعت پر زراعت پر تجارت پر
مدارس میں فلاحت کی نہیں تعلیم حیرت ہو　　کہ اہل ہند کی ہو منحصر روزی زراعت پر
گزارے عمر بھر مُخطایہ قید خانے میں　　کوئی اس سے بھی بڑھ کر ظلم ہوگا اوقات پر

"کلام محبّ" میں تصوف کا بھی خاص حصہ ہو۔ مندرجہ ذیل اشعار نمونۃً درج ہیں:—

ہو اصلی مہر جلوے دلِ حزیں میں چھپا　　ہم ڈھونڈتے آپ سے کرتے ہیں پیدا حاصل
خودی کو چھوڑ کر پڑھتی ہی تو حائل ہو　　خودی اٹھی کہ ہوا خود بخود خدا حاصل
بھا ہو وہم کہ غیر خدا ابھی ہے موجود　　جو یہ خیال فنا ہو تو ہو بقا حاصل

"جذبات محبّ" کی تصویر عاشقانہ مضامین کی رنگینیوں سے مستغنی نہیں ہو لیکن انمیں بھی تہذیب و متانت کا رنگ و روغن دیکر جلا کی گئی ہو اور شگفتگی

بعض قابل گرفت الفاظ یا مضامین مل سکیں گے۔

قصاید میں اُس تعلی اور غلو سے کام نہیں لیا گیا جو ایشیائی شاعری کو بدنام کرنے والی ہے بلکہ جہاں ممدوح کی مدح کی گئی ہے وہاں سچی تعریف کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو۔

دندان تو جملہ در دہانند چشمان تو زیر ابروانند

کی طرح بے نمک نہیں بلکہ معنوی لطافت اور ادبی خوبیوں سے مالامال ہے۔

"دوسری نظمیں بھی قابل تعریف و مستحق ستایش ہیں "مسدس نسوانی" میں عورتوں کی موجودہ قابل اصلاح حالت اُن کی جہالت اور ان کی توہم پرستی کا نہایت سچا نقشہ کھینچا گیا ہے "رود موسیٰ" کی طغیانی سے جو نقصانات عظیم بلدہ حیدرآباد کو پہنچا اسکی کیفیت نہایت دردانگیز ہے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عدل و انصاف کے تاریخی وقائع غایت درجہ سبق آموز ہیں۔ رباعیات اور قطعات میں زیادہ تر اخلاقی نصایح نظم بند کی گئی ہیں جنکا اقتباس اور انتخاب مدارس کے کورس میں شامل کیا جائے تو یقیناً نفع بخش ہوگا۔

الغرض مولوی محب حسین صاحب ایک شاعر باعمل ہیں اور ان کی شاعری خیالی نہیں عملی شاعری ہے اور اس زمانہ میں ایسے ہی شاعروں اور اسی قسم کی شاعری کی ضرورت ہے۔

نکتہ چین نگاہیں کلام محب میں بعض الفاظ و محاورات قابل گرفت پا سکتی ہیں لیکن اول تو مولوی محب حسین صاحب شعرا کے اُس طبقہ سے تعلق نہیں رکھتے جس پر یہ پابندیاں عاید کی گئی ہیں۔ دوسرے چار سے زیادہ صفحات کی ضخامت کے اندر اس قسم کی دو چار دس بیس فروگذاشتیں کوئی چیز نہیں۔

مندرجۂ عنوان تینوں کتابیں جناب مصنف سے فیل خانہ حیدرآباد دکن کے پتہ پر مل سکتی ہیں۔ انکی قیمتیں علی الترتیب ۴ر ۴ر اور ۸ر ہیں۔

حیات النذیر

مولنا مولوی حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مرحوم کی ذات والا صفات عجیب و غریب خوبیوں کا مجموعہ تھی۔ ہندوستان کے اُن تمام مشاہیر میں جنکی خدمات علمی و ادبی نمایاں اعزاز کا استحقاق رکھتی ہیں مرحوم کا درجہ نہایت بلند اور بہ غایت ارفع تھا۔ آپ کے قومی کارنامے اگر ایک طرف آپ کو ملک و قوم کا حقیقی بہی خواہ ثابت کرتے ہیں تو دوسری طرف آپ کی قلمی خدمات اور دماغی کارگزاریاں آپ کو ادب اُردو کا ایک بے لوث، بے غرض، اور بے لاگ سرپرست ظاہر کر رہی ہیں۔ اُردو لٹریچر کی آج سے دس بیس برس پہلے کیا بساط تھی۔ فسانۂ عجائب اور اسی قماش کی چند کتابیں ہمارے خزانۂ ادب کی گویا بیش بہا پونجی سمجھی جاتی تھیں۔ لیکن دعا دینا چاہیے اُن بابرکت نفوس کو جنھوں نے اُردو کو اپنی مساعی جمیلہ سے اس قابل کیا کہ آج وہ بھی معاصر لسنہ سے آنکھ ملانے کا دعوے رکھتی ہے اور بجا رکھتی ہے۔ مولوی نذیر احمد مرحوم کا شمار اُسی مقدس طبقہ میں ہونا ہے جس کے افراد نے اُردو کو قعرِ ذلت سے نکال کر اوجِ رفعت پر چڑھانے کا سامان بہم پہنچایا ہے۔ اس بابرکت جماعت میں لحاظ اپنے کام کے وہ بہت سوں سے آگے ہیں لیکن پیچھے کسی سے نہیں۔ اُنھوں نے اُردو کی دست گیری اس حالت میں کی کہ اُسکی کوئی بات بھی نہ پوچھتا تھا۔ نونہال اُردو کے پروان چڑھانے کی کوشش آج خواہ کسی صورت میں ہو رہی ہو اور اسکے اطمینان بخش نتائج آگے چلکر خواہ کچھ ہی کیوں نہ نکلیں لیکن اِس نونہال کی پرورش جس زمانہ شناس اور علم دوست پارٹی نے ابتداءً کی اُسکا احسان کوئی بھول نہیں سکتا اور بلا شبہہ علمی حیثیت سے مولنا نذیر احمد کو اس پارٹی میں غیر معمولی نام و نمود حاصل تھی۔ ان تمام وجوہ سے اُردو زبان سب سے زیادہ بد قسمت اور اُردو کے موجود الوقت اہل قلم محسن کش سمجھے جانے کے مستحق تھے اگر مولنا کی سوانح عمری خود اسی زبان میں مدون نہ ہوتی جس کی فلاح و اصلاح کی دُھن میں اُنکی ساری زندگی نذر ہوئی تھی۔ یہ مسرت کا مقام ہے کہ مولوی سید افتخار عالم صاحب نے اُردو کو اس بدنصیبی سے اور اہل قلم طبقہ کو اس الزام سے "حیات النذیر" تالیف کرکے صاف بچا لیا ہے۔

حیات النذیر، جیسا کہ نام سے آشکارا ہے، مولنا نذیر احمد مرحوم کی مفصل، مدلل، اور مشرح لائف ہے جسکی تدوین کا امتیازی فخر سید افتخار عالم صاحب کو حاصل ہوا ہے۔ اسکا ملال ضرور ہے کہ باوجودیکہ اسکی ترتیب کا آغاز صاحب سوانح کے حین حیات ہو چکا تھا لیکن بعض موانع اُنکی زندگی میں اسکی اشاعت میں ہارج رہے۔ اور مولنا کے انتقال کے تقریباً بارہ مہینے بعد یہ شائع ہوئی ہے۔ اس تعویق کے لیے حضرت مولف خود متاسف و عذر خواہ ہیں اور اُن مجبوریوں کو پیش نظر رکھتے ہوے جو معمولی سی معمولی کتاب کی تیاری میں بھی بالعموم پیش آیا کرتی ہیں سید افتخار عالم صاحب پر کوئی الزام عائد نہیں ہو سکتا، جنھوں نے "حیات النذیر" ایسی ضخیم و مطول تالیف کی گراں قدر ذمہ واری اپنے سر لی تھی۔ قدر دانان علم و فن کو خوش ہونا چاہیے کہ اُن کے حلاوت اندوز ہونے کا سامان سید صاحب نے نہایت محنت و جان کاہی سے فراہم کیا ہے اور سید صاحب مستحق مبارک باد ہیں کہ اُنھوں نے اپنی غیر معمولی تلاش و جستجو سے وہ کام لیا ہے جس کی انجام دہی ہر ایک کے احاطۂ امکان سے قطعی خارج ہے جس دلچسپی سے اُنھوں نے یہ فرض ادا کیا ہے اُسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ خود مولنا مرحوم سید صاحب کی اس کوشش کو غیر مستحسن سمجھتے تھے اور آپ نے کسی قسم کی بھی امداد دینے سے قطعی انکار کر دیا تھا لیکن سید صاحب دُھن کے پکے اور خیال کے پورے تھے۔ تمام مشکلات کا سامنا جواں مردی سے کیا۔ گل چینی میں کانٹوں کی خلش بخوشی گوارا کی

اور بالآخر "حیات النذیر" کی شکل میں منتشر و پراگندہ پھولوں کو جمع کر کے ایک ایسا گلدستہ تیار کر دیا جسکی دلکشی و دلفریبی دیکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچ لینے کی صلاحیت بخوبی رکھتی ہے۔

اس مقام پر حیات النذیر کی تقسیم و ترتیب کا اجمالی تذکرہ غالباً خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ شروع میں، فہرست مضامین کے بعد، جناب حاجی محمد حمید اللہ خاں صاحب بہادر، اے۔ ڈی۔ سی، فرزند اصغر علیا جناب بیگم صاحبہ بھوپال کی شبیہ ہے جن کے نام نامی پر اس کتاب کو معنون ہونے کا فخر حاصل ہُوا ہے۔ پھر اُس زبردست ہیرو کا عکسی فوٹو ہے جس کے زبردست کارنامے اس ضخیم و حجیم سوانح عمری میں قلم بند کیے گئے ہیں۔ مضامین کے اعتبار سے سب سے اول مولوی عبد الحق صاحب بی۔ اے کا لکھا ہوا مقدمہ ہے، اور اُسکے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کو مقدمہ نگاری کا فی الواقع ایک خاص ملکہ حاصل ہے۔ اسکے بعد مولنا شبلی، خواجہ حالی، اور مفتی انوار الحق وغیرہم کے وہ ریویو شامل کر دیے گئے ہیں جو ان فضلاء نے اس کتاب کے مطالعہ کے بعد تحریر کیے تھے۔ پھر مصنف کا خاص دیباچہ ہے اور پھر اصل کتاب کے مطالب شروع ہو گئے ہیں جن کی تقسیم باعتبار مدارج حالات و ترتیب واقعات سات حصوں پر اس طرح کی گئی ہے کہ

حصۂ اول میں پیدائش سے لیکر قبل ملازمت کے واقعات ہیں

حصۂ دوم میں ابتدائے ملازمت سے اُس زمانہ تک کے واقعات ہیں کہ مولنا حیدرآباد نہیں گئے تھے

حصۂ سوم میں حیدرآباد کی ملازمت اور تعلقات کا تذکرہ ہے

حصۂ چہارم میں مولنا کا حلیہ، اخلاق و عادات، طرز معاشرت وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے

حصۂ پنجم میں انکی تصانیف و تالیفات و تراجم پر ایک مبسوط تبصرہ ہے

حصۂ ششم میں اُنکے مذہبی اعتقادات و تلقینات کا پہلو دکھایا گیا ہے

حصۂ ہفتم میں چند ضمیمے شامل کیے گئے ہیں۔ ان میں سے کئی اس قابل تھے کہ انھیں اصل متن میں جگہ دیجاتی تو انسب تھا۔

سطور بالا سے سرسری طور پر اندازہ ہو سکتا ہے کہ لائق سوانح نگار نے اپنی تصنیف کو مکمل بنانے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ نہ کوئی پہلو جس سے مولنا نذیر احمد کی لائف پر روشنی پڑ سکتی ہو نظر انداز ہونے پایا ہے اور سچ یہ ہے کہ ایسے زبردست شخص کے حالات اسی کے مستحق تھے کہ اسی تفصیل و تکمیل کے ساتھ لکھے جاتے جس کی مدح "حیات النذیر" کے صفحات میں کھنچی ہوئی نظر آتی ہیں۔

مولنا نذیر احمد غیر معمولی شخصیت کے بزرگ گزرے ہیں اور اُن کے اوصاف کی گوناگونی اُنھیں اقران و امثال میں ممتاز درجہ دلانے کی شدومد سے سفارش کرتی ہے۔ اسی کے ساتھ اُن کے واقعات زندگی خصوصیت سے دلچسپ و سبق آموز ہیں۔ مولنا کا شمار بجا طور پر دنیا کے اُن مشاہیر میں ہونا چاہیے جنھوں نے نہایت چھوٹی ابتدا سے بالآخر کامیابی کے مدارج طے کیے ہیں اور اس امر خاص میں وہ کسی غیر کے نہیں بلکہ اپنی ہی سعی و جاں فشانی کے رہین منت ہو سکتے ہیں۔ فرینکلن کا مقولہ ہے کہ "اولو العزم آدمی، خواہ اُسکی حالت بظاہر کتنی ہی پست کیوں نہ ہو، تاہم وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچنے کا راستہ خود اپنی طبیعت سے نکال لیتا ہے"۔ مولنا نذیر احمد کے متعلق اگرچہ فی نفسہ اس قول کی تطبیق صحیح نہ ہو، پھر بھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک خود ساختہ کامیاب شخص گزرے ہیں۔ اور اُنکے حالات اور طور و طریق کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد ہر ایک آدمی، جو اس دنیا میں رہ کر شہرت و عظمت کے مراتب طے کرنا چاہتا ہے، کچھ نہ کچھ سیکھ سکتا ہے۔

"کامیاب زندگی" سے یہی مراد نہیں ہے کہ انسان فکر معاش سے مستغنی ہو یا اُسکے پاس گنج وافر موجود ہو۔ کیوں کہ حقاً "کامیابی" کی یہ صورت ہے تو ضرور، لیکن بالکل ادنی اور ابتدائی۔ ہاں وہ شخص بغتہ

"کامیاب" کہلانے کا بوجہ احسن مستحق ہے جسکا وقت، جسکا مال، جسکا دل، جسکا دماغ اُس کے بھائیوں، یا دوسرے الفاظ میں ابنی نوع انسان کے فائدہ میں کام آئے۔ تا نی الذکر شق سے قطع نظر، اور ہر ایک پہلو سے مولٰنا نذیر احمدؔ مرحوم کے کارنامے گویا اس بات کا ثبوت ہیں کہ انکی ذات ملکؔ و اہل ملک کے حق میں سرچشمۂ فیض و برکت تھی۔ سب سے زیادہ قابل ذکر انکی وہ علمی کوششیں تھیں جنھوں نے اُردو کے جسدِ بے روح میں فی الواقع جان ڈالی۔ اگر مولٰنا مرحوم کے علمی کارناموں پر مختلف حیثیت سے نظر ڈالی جائے اور پھر یہ بھی دیکھا جائے کہ ان سے کیا کیا بیش قیمت اور دیرپا نتائج حاصل ہوے اُسوقت انکی قدر و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے۔

آج کل تعلیم نسواں کی جو ہڑبونگ مچی ہے وہ بلاشبہ ایک طوفان بے تمیزی کی صورت پکڑتی جاتی ہے۔ حامیان تعلیم نسواں، جن میں سے اکثر خالص جوش ہمدردی کی بنا پر صنف نازک کی بہتری و فلاح کے وسائل سوچنے پر آمادہ ہوے ہیں، اپنی اپنی جگہ کیا کچھ نہیں کر رہے۔ نا اہل اسکول کھولنے کی فکریں ہو رہی ہیں، اعلیٰ تعلیم نسواں کے سامان بہم پہنچائے جا رہے ہیں، رسالے جاری کیے جاتے ہیں، نمائشیں ہوتی ہیں اور زنانہ کانفرنس کا خواب بھی دیکھا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن انصاف سے دیکھیے تو جو کام چپ چپاتے مولٰنا نذیر احمد کر گئے ہیں وہ اپنے علمی نتائج کے اعتبار سے ان تمام نقش برآب کوششوں سے کہیں افضل و اعلیٰ ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ تعلیم نسواں کے متعلق مرحوم نے جو کچھ کیا اُسوقت کیا جس وقت کوئی اسکی اہمیت پر غور کرنے والا بھی نہ تھا' یار و مددگار ملنا تو دوسری بات ہے۔

مولوی نذیر احمدؔ مرحوم پُرانی روشنی کے بزرگ تھے۔ تعلیم بھی اُنکی پُرانے طرز پر ہوئی تھی اور وضع قطع اور اکثر امور میں وہ قدامت پسند تھے۔ لیکن کیا عجیب بات ہے کہ "مرآۃ العروس" جسکو آپ کی مستقل اولین تصنیف ہونے کا فخر حاصل ہے، نہ صرف پُرانے خیال کے لوگوں میں مقبول و دل پسند ہے بلکہ نئی روشنی والوں کی زبان بھی اسکی تعریف میں ہمیشہ خشک دیکھی گئی ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس میں اور نیز اسی قماش کی دوسری کتابوں میں انشاپردازی وغیرہ کی خوبیوں کے علاوہ ہندوستانی طرز معاشرت کا وہ دلآویز اور صحیح فوٹو کھینچا گیا ہے کہ باید و شاید۔ مولوی عبدالحق صاحب مرآۃ العروس کی بابت لکھتے ہیں اور سچ لکھتے ہیں

مرحوم اگر مرآۃ العروس کے سوا کوئی دوسری کتاب نہ لکھتے تو بھی وہ اُردو کے باکمال انشاپرداز مانے جاتے اور ان کی حیات جاودانی کے لیے صرف یہی ایک کتاب کافی ہوتی۔

اسی طرح غور کیجیے تو اُنکی تمام تصانیف و تراجم میں بہت سی مشترک و غیر مشترک خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ خصوصاً کتب قانونی کے ترجمہ میں اصطلاحات جس نفاست سے چپاں کی گئی ہیں اُنکی داد نہیں دیجا سکتی۔ ایسے ہی علم ہیئت کی اصطلاحات جس عمدگی سے وضع اور استعمال ہوئی ہیں وہ مولٰنا نذیر احمدؔ ہی کا حق سمجھا جا سکتا ہے۔ ترجمۂ قرآن مجید اپنی لسانی خوبیوں کے لحاظ سے نہ صرف قابل تعریف ہے بلکہ آپ کا ترجمہ دیگر تمام تراجم پر حق فوقیت رکھتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مولٰنا شاہ عبدالقادر دہلوی کا ترجمہ اسوقت بھی کئی خصوصیات میں ممتاز سمجھا جاتا ہے، لیکن جمہور میں اب جس قدر رواج مولوی نذیر احمدؔ کے ترجمہ کا ہے وہ کسی دوسرے کا نہیں۔

اس مقام پر مولوی صاحب مرحوم کے تمام علمی کارناموں کا تذکرہ غیر ممکن ہے لیکن خوشی کی بات ہے کہ سید افتخار عالم صاحب نے حیات النذیر کے قابل رشک ہیرو کی زندگی کے جہان اور تمام واقعات پر کافی روشنی ڈالی ہے وہاں اُنکے علمی کارناموں پر بھی ایک مبسوط و مدلل تبصرہ لکھا ہے۔ یہ قرین قیاس ہے کہ مصنف کی اکثر آراء سے ہر شخص کو اتفاق نہ ہو لیکن اصولاً اُنھوں نے اپنی کوشش

کی تکمیل میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

ایک بات جو "حیات النذیر" کے مطالعہ کرنے والوں کی نگاہ میں کھٹکتی ہو وہ یہ ہے کہ سید صاحب نے اکثر مقامات پر اظہار آراء میں مفرط حسنِ عقیدت سے کام لیا ہے۔ ایک نکتہ سنج دوست کا خیال ہے کہ انھیں اپنے ہیرو کے عادات وخصائل پر رائے زنی کرتے ہوے کسی قدر زیادہ آزادی سے کام لینا چاہیے تھا۔ برخلاف اسکے انھوں نے اکثر قابل اعتراض امور کی توجیہ کچھ اس طرح کی ہے جو مذاق سلیم کو ناگوار ہوتی ہے۔ اکثر اس قماش کی تاویلیں، جو قبولیت کا درجہ نہیں پا سکتیں، نہ صرف فضول اور غیر موثر ہوتی ہیں بلکہ اس سے مصنف کی آزادانہ رائے زنی کی قدر بھی گھٹ جاتی ہے۔ حیدرآباد کے اکثر واقعات دوسری روشنی میں دکھائے گئے ہیں اور اس بات کا کہیں تذکرہ نہیں کیا گیا کہ مولنا اور نواب محسن الملک کے تعلقات وہاں ابتداءً کیسے تھے اور بالآخر ان دونوں بزرگوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہو جانے کے اسباب کیا ہوے۔ وہاں کے اکثر حالات اس انداز سے قلم بند کیے گئے ہیں گویا سید افتخار عالم صاحب نے حیدرآباد میں بیٹھکر انھیں دیکھا یا سنا تھا۔ لیکن غالباً ایسا نہیں ہوا کیونکہ حیدرآبادی پبلک کے مختلف طبقے مولنا نذیر احمد کے متعلق مختلف خیال ظاہر کرتے ہیں۔

اجتماع دولت اور مہمان نوازی کے عنوان سے مصنف نے جو کچھ پیش پا افتادہ تاویلیں کی ہیں اُن میں سے اول الذکر بحث پر مولوی عبدالحق صاحب نے جو کچھ لکھدیا ہے وہ کافی ہے۔ اگر مولنا نذیر احمد چاہتے تو اپنی دولت کے بہت سے صحیح مصرف سوچ سکتے تھے۔ بقول مولوی عبدالحق صاحب مولنا کرامت حسین کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ثانی الذکر عنوان پر جو کچھ لکھا گیا ہے اُسے کم از کم اسلامی تعلیم اور اسلامی روایات کے منافی ضرور سمجھا جا سکتا ہے۔

"امہات الامۃ" کی بابت ضرور افسوس کیا جا سکتا ہے کہ "مولویوں" نے اُسکے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خود سید افتخار عالم صاحب اُسکی طرز ادا پر گستاخی کا الزام لگاتے ہیں اور مولنا مرحوم پیرانہ سالی اور تجربہ کاری کے باوجود اپنی تیز زبانی کے مقر نظر آتے ہیں تو پھر "مولویوں" کو کیوں خالی خطاوار ٹھہرایا جائے۔ یہ ضرور ہے کہ اس زمانۂ آزادی میں کسی کتاب کا جلا ڈالنا حد درجہ قابل اعتراض بلکہ لائق نفرین سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ وہ کون سے وجوہ تھے جن کے باعث مولوی نذیر احمد مرحوم اس کتاب کے سارے نسخوں کو حوالہ نار کر دینے اور تباہ کر دیے جانے پر راضی ہو گئے۔

ایک کمی "حیات النذیر" میں اور محسوس ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ مولنا کی شاعری پر شرح وبسط سے کوئی بحث نہیں کی گئی۔ لیکن ایسا عمداً کیا گیا ہے۔ سید افتخار عالم صاحب نے مولنا کی نظموں کا ایک جداگانہ مجموعہ "نظم بے نظیر" کے عنوان سے شائع کیا ہے، جسکو ادب اُردو کی ایک بڑی خدمت کہنا چاہیے۔ اِسکے لیے شیدائیانِ لٹریچر کو سید صاحب کی سعی جمیلہ کی داد دینا چاہیے۔

آخر میں "حیات النذیر" کی ایک خوبی قابل تذکرہ ہے۔ یعنے سید افتخار عالم صاحب نے اِس ضخیم ومطول کتاب میں جس انداز اور طرز بیان سے کام لیا ہے وہ نہایت شگفتہ اور سلجھا ہوا ہے اور بقول مولنا شبلی اس پر مولنا نذیر احمد کے لٹریچر ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ خدا کرے سید صاحب کی یہ کوشش عند اللہ ماجور اور عند الناس مشکور ہو اور اُن کے رشحاتِ قلم سے اہلِ ملک کو آیندہ بھی مستفید ہونے کا موقع ملتا رہے۔

"حیات النذیر" کی قیمت تین روپے محاسن ظاہری وباطنی کے اعتبار سے گویا کچھ نہیں۔ شایقین کو دست طلب بڑھانا چاہیے۔

مولوی بشیر الدین احمد صاحب، اول تعلقدار (اچنور دکن)، یا دفتر رسالہ الناظر لکھنؤ سے یہ کتاب دستیاب ہو سکتی ہے۔

"سید القلم"

اہل اسلام کے علمی احسانات٭

{ ......وہ قوم نہایت بدنصیب ہے جو اپنے بزرگوں کے اُن کاموں کو
جو یاد رکھنے کے قابل ہیں بھلا دے۔ یا اُنکو نہ جانے۔ (سرسید مرحوم) }

حضرات! موجودہ اقوام کے طرز معاشرت پر غور کرنے سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر پانچ ہزار برس کی تاریخ عالم پر مسلسل نگاہ ڈالی جائے تو یہ بات ثابت ہوگی کہ ایک قوم کی تاریخ دوسری قوم کی تاریخ سے وابستہ ہے اور تاریخ تماشاگاہ عالم پر گذشتہ واقعات کو بار بار مشاہدہ کے لیے پیش کرتی ہے۔

اگر تاریخ اسلام میں اُن وجوہ پر غور کیا جائے جنکی بنا پر عرب کی شب تاریک روز روشن میں تبدیل ہوگئی اور آفتاب علم نصف النہار پر پہنچ گیا تو تاریخ بتلائیگی کہ اسکی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ خلفاء اسلام نے کتب خانوں کی بنیاد ڈالی۔ فنون کے ہر شعبہ کی سرپرستی کی۔ یونانی، عبرانی، سُریانی، سنسکرت کی تصانیف کے ذخیرے جمع کیے اور اُن تصانیف کا عربی و فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔

ابتدا ہی میں مسلمانوں کو اپنی فتوحات کی وجہ سے مختلف اقوام سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا اور جسقدر یہ تعلقات بڑھتے گئے اُسیقدر اُنکو دوسری قوموں کے علوم و فنون اور خیالات سے زیادہ واقفیت ہوتی گئی۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ قرون وسطیٰ میں مسلمانوں نے دنیا کی تمام قوموں کا علمی سرمایہ اپنی زبان میں منتقل کر لیا تھا۔ انہیں وجوہ سے مسلمانوں نے جس سرعت سے سلطنت رومتہ الکبریٰ کے صوبوں کو تھوڑی سی مدت میں زیرنگین کیا اُسی سرعت کے ساتھ فلسفہ اور سائنس کی مملکتوں کو بھی مسخر کر لیا۔

بنی اُمیہ

آغاز تراجم کتب یونانی

خلفاء بنی اُمیہ کے عہد سے تراجم علوم یونانی کی بنیاد پڑی۔ اول جو ترجمے ہوئے انکا تعلق صرف علم طب سے تھا۔ پھر فلسفہ اور حکمت وغیرہ کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا، اور چونکہ مسلمانوں میں یہودی اور مسیحی اطباء کے سبب سے علوم یونانی کا رواج ہوا تھا اسلیے عہد اسلام میں ان علما اور حکما کی کمال عزت کی جاتی تھی اور اُن کا اقتدار بھی وزرا سے کہیں زیادہ ہوتا تھا۔ نہ صرف یہی بلکہ تمام امورات معاشرت میں مسلمانوں اور غیر اقوام کے حقوق مساوی تھے۔

خالد بن یزید کے زمانہ میں کتب خانہ کی بنیاد ڈالی گئی۔ جب خلیفہ کو صنعت و حرفت کا خیال آیا تو مصر کے فلاسفروں کو جمع کیا اور علم صنعت کی کتابوں کا جو یونانی زبان میں تھیں عربی زبان میں ترجمہ کرایا۔ ۱۳۲ھ میں سلطنت بنی امیہ کا خاتمہ ہوا اور بنی عباس نے علم خلافت بلند کیا۔ دار السلطنت دمشق سے بغداد کو منتقل ہوا لیکن علماء نے جو سلسلۂ تراجم و تصانیف کا جاری کر رکھا تھا ویسا ہی ترقی کرتا رہا کہ آئندہ کامیابی کی ایک مستحکم بنیاد بن گئی۔

آغاز تراجم کتب سنسکرت

خلیفہ منصور عباسی نے قیصر روم سے کتب علمیہ کے عربی ترجمے منگائے۔ اسی قدردانی کے سبب دربار خلافت میں علماء و حکماء دور دراز ممالک سے آنے شروع ہوئے۔

خالد برمکی وزیر سلطنت نے فارسی النسل ہونے کی وجہ سے خاص کر

٭ یہ اس مضمون کا خلاصہ ہے جو مسٹر ن۔ ا۔ خوشحال ایم۔ اے نے اُردو کانفرنس (منعقدہ لکھنؤ) کے اجلاس دوم میں پڑھا تھا۔ مکمل مضمون کتابی صورت میں شائع ہوگا۔ (اڈیٹر)

کتب ایرانی کا ترجمہ کرایا۔ اُسی زمانہ سے ہندو علماء بھی بغداد کے دربار مین جمع ہونے شروع ہوئے۔ علاوہ تراجم کتب فلسفہ و طب و اخلاق کے علم ریاضی نے بھی عہد منصور مین بہت کچھ ترقی کی۔ چنانچہ ہندوستان کے ایک مشہور ریاضی دان اور نامور پنڈت نے دربار منصور مین حاضر ہوکر کتاب سدھانت بطور نذر پیش کی جس کا ترجمہ دربار کے ایک عالم محمد بن ابراہیم فرازی نے کیا۔

خلیفہ ہارون الرشید عباسی خلیفہ ہارون الرشید عباسی کو جیسے ارباب کمال میسر ہوے دوسرے خلفاء کو نصیب نہین ہوئے اس عہد مین سلطنت عباسیہ کمال عروج پر تھی یہ وہ زمانہ تھا جب قیصر و کسریٰ کے بادشاہون کا سامان اسلامی شاہزادیون کے جہیز مین نکالا جاتا تھا۔ مگر ملکی فتوحات سے زیادہ اس عہد مین علمی فتوحات ہوئین۔ اس خلیفہ نے اُس عظیم الشان دار العلم کی بنیاد ڈالی جس کا نام بیت الحکمت تھا جو دو حصون پر منقسم تھا۔ ایک کتب خانہ کے لیے اور دوسرا غیر زبانون کے تراجم کے لیے۔

وزیر یحییٰ برمکی کے کتب خانہ مین مشہور خوش نویسون کی لکھی ہوئی عربی یونانی قبطی کالدی ہندی کتابین عموماً اور فارسی کتابین خصوصاً بکثرت موجود تھین[1]۔ اسی نے بڑے بڑے نامی ہندو اور حکماء کو دربار مین بلا کر کتب سنسکرت کے تراجم پر مامور کیا چنانچہ ایک ہندی نے بھی جو خلیفہ کے دربار کا افسر الاطبا تھا چرک اور سسرت کا ترجمہ کیا۔

فن کاغذ سازی حکومت عباسی کا دور شروع ہونے کے بعد اہل عرب نے کاغذ پر لکھنا شروع کیا۔ جب فضل بن یحییٰ برمکی نے کاغذ بنانے کا حکم دیا تو مسلمانون نے بغداد مصر شام وغیرہ مین اسکے کارخانہ کھولے اسلیے اگر کاغذ بنانے کی صنعت کو فروغ دینے کا مسلمان دعویٰ کرین تو بجا ہے۔

خلیفہ مامون الرشید عباسی خلیفہ مامون الرشید عباسی کے علمی ذوق کی نسبت تاریخ شاہد ہے کہ یہ اسکی مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھا کہ بغداد اسکے عہد زرین مین مرکز علوم و فنون بن گیا۔ مامون کی والدہ ایرانی نژاد تھین اور اُس کا آتالیق سلطنت عباسیہ کا چشم و چراغ وزیر السلطنت یحییٰ برمکی ایرانی تھا۔ نیز خلیفہ کی عمر کا ایک بڑا حصہ فارس اور خراسان مین گذرا اسلیے اُس نے فارسی کی ہمیشہ قدر کی۔

فن تاریخ اور چونکہ فن تاریخ سے مسلمانون کو زیادہ دلچسپی تھی اسلیے تاریخ اور فارسی لٹریچر کا جسقدر سرمایہ ایران مین دستیاب ہوسکا عربی زبان مین منتقل کیا گیا۔ عربون نے ایرانی طرز معاشرت اختیار کی۔ فارسی شاعری کی نئی بنیاد پڑی۔ اور دنیا جانتی ہے کہ فن تاریخ کو مسلمانون نے کس عروج پر پہنچا دیا۔ آج یورپ باوجود ادعائے ہمہ دانی علامہ ابن خلدون کے فلسفۂ تاریخ کا متبع ہے۔

جو معاہدہ خلیفہ مامون نے یونانی فرمانروا میکائیل ثالث سے کیا تھا اس مین یہ بھی شرط تھی کہ قسطنطنیہ کا ایک کتب خانہ اُسکے حوالہ کر دیا جائے۔ نیز خلیفہ کے کارکن دور دراز ممالک سے نوادر قلمی کتابین جمع کرتے تھے۔ اس طور پر جو علمی خزانے خلیفۃ المامون کے ہاتھ آئے اُن کا ترجمہ بصرف زر کثیر عربی زبان مین کیا گیا۔ علاوہ اسکے بہت سے تراجم متمول اور علم دوست اشخاص کی علمی فیاضیون کی بدولت اُس زمانہ مین مرتب کیے گئے۔ چنانچہ ایک نسطوری طبیب نے اس قسم کا ایک سلسلہ بغداد مین قائم کر رکھا تھا۔ یہ شخص ارسطو، افلاطون، بقراط، جالینوس اور دیگر مشاہیر یونان کی تصانیف کے تراجم شائع کرتا تھا۔

اس زمانہ مین کوئی وزیر کوئی امیر کوئی عالم ایسا نہ تھا جسکے گھر مین کتب خانہ موجود نہ ہو یا کتابون کے مہیا کرنے مین بیدریغ روپیہ صرف نہ کرتا ہو۔

---

[1] دیکھو کتاب البرامکہ مصنفہ مولوی عبد الرزاق کانپوری۔

مسلمانان سلف مین عموماً علمی ذوق

مسلمانان سلف مین عموماً علمی مذاق کا اندازہ ان تاریخی واقعات سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ کہ بڑے بڑے اساتذہ کی مجالس املا مین چالیس بلکہ ستر اور کبھی سوا سوا لاکھ طلبار کا ہجوم ہوتا تھا۔ خیال فرمانے کی بات ہے کہ جس قوم کے افراد ایک ایک مجلس علمیہ مین سوا سوا لاکھ جمع ہو جائین اُس قوم کے سینے مین ذوق علمی کی آگ کیسی کچھ بھڑک رہی ہو گی۔[۱]

حضرات! یہ اعلےٰ درجہ کا علمی مذاق اُسوقت بھی بدستور قائم رہا جبکہ اختلافات اندرونی کی وجہ سے عربی سلطنت تین جداگانہ حصون مین تقسیم ہوگئی تھی۔ بنی عباس ایشیا مین، بنی فاطمہ مصر مین، اور بنی امیہ اندلس مین، جس طرح ایک دوسرے کے سیاسی رقیب تھے اُسی طرح علم و ادب اور حکمت و دانش کی سرپرستی مین بھی اُنکی یہی کوشش تھی کہ ایک دوسرے پر فوق لیجائے۔

قاہرہ کے کتب خانہ فاطمیہ مین ایک لاکھ پچاس ہزار نسخے ایسے موجود تھے جن کا خط نہایت پاکیزہ اور جلدین نہایت خوشنما تھین۔ اس کتب خانہ مین ایک شعبہ تراجم کے لیے مخصوص تھا۔

اندلس

خلفاے اندلس کی کتابون کی تعداد رفتہ رفتہ چھ لاکھ ہوگئی، جس کی فہرست ہی چالیس جلدون پر مشتمل تھی۔ اس شاہی کتب خانے کے علاوہ ستر کتب خانہ ایسے تھے جن مین ہر شخص جا کر اپنی معلومات کا دائرہ وسیع کر سکتا تھا۔ یورپ مین کاغذ بنانے کی صنعت مسلمانان اندلس کی بدولت آئی۔ قرطبہ مین عام دستور تھا کہ ہر امیر ایک جدا کتب خانہ قائم کرتا اور یہ کوشش کرتا تھا کہ اُسکے کتب خانے مین ایسے نادر نسخہ موجود ہون جن کی نظیر دوسرے کتب خانون مین نہ ملے۔ یہی وہ شہر تھا جہان سے علم کی روشنی سارے یورپ مین پھیلی۔

یورپ مین علم جغرافیہ

عرب کا مشہور معروف جغرافی ابو عبداللہ وطن چھوڑ کر قرطبہ مین آیا تھا اور اُسی نے وہ بے نظیر جغرافیہ لکھا جس کا لاطینی زبان مین ترجمہ ہو کر علم جغرافیہ یورپ کے ازمنہ متوسط مین پھیلا اور تین صدیون سے زیادہ تک یورپ نے محض اسی کتاب کی تقلید پر قناعت کی۔

اسپین مین تعلیم نسوان اور مذہب کا ایک اہم پہلو

موجودہ طرز معاشرت مین عورتون کا جاہل رہنا سوسائٹی مین کچھ اچھی نظر سے نہین دیکھا جاتا۔ شہنشاہ نپولین اعظم کا قول ہے کہ کسی قوم کو اعلیٰ درجہ کی ترقی دینے کا سہل طریقہ یہ ہے کہ اُس قوم کی ماؤن کو تعلیم یافتہ بنایا جائے۔ نتائج یورپ کے صدیون قبل اسپین و ایشیا کے عہد اسلام کا سب سے شاندار مہذب نظارہ اُس زمانہ کی تعلیم یافتہ عالی دماغ اور بلند حوصلہ خواتین اسلام کا علمی ذوق و شوق ہے۔

حضرات! یہ ایک امر مسلم ہے کہ عورتین تمدن کی بنیاد ہین اور ترقی تمدن کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ عورتون اور مردون کے حقوق برابر قائم کیے جائین۔

سائنس[۲]

حضرات! یورپ کو آجکل سائنس کی علمی و عملی ترقیون پر بڑا فخر ہے۔ ہان، شاید یورپ کی باریک بین نظر نے کسی راز سربستہ کو دریافت کر لیا ہو؟ شاید معماے حیات کے حل و عقد مین یورپ کامیاب ہو گیا ہو۔؟ ممکن ہے کہ ماہیت اشیا یورپ پر منکشف ہو گئی ہو۔ یا یورپ کی عقل دوربین اور فہم نکتہ رس نے فلکیات کے مسائل کما حقہ دریافت کر لیے ہون۔ کیا ایسے راز پر جس کی نسبت کہا گیا ہے۔

"کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معما را"

مادی خیالات۔ مادی سائنس اور فلسفہ کے مکاشفات کیا کسی نوع کی روشنی ڈال سکتے ہین؟ ہرگز نہین! بلکہ اس تمام ترکوشش کا یہ نتیجہ ہوا کہ سائنس نے ایک مدت کی کاہش و سرگردانی سے زمانہ کو

---

[۱] دیکھو کتاب "علماے سلف" مولفہ مولوی حبیب الرحمن خان شروانی مطبوعہ علیگڈھ۔

[۲] دیکھو کتاب "معراج الدین" مصنفہ مولوی نواب علی ایم اے پروفیسر بڑودہ کالج

دہریت اور الحاد کے گرداب مین ڈبو کر سمجھایا۔ اور سمجھایا بھی تو کیا کہ

"معلوم شد کہ ہیچ معلوم نشد"

مسئلہ ارتقا خود مسئلہ ارتقا کو دیکھیے جو نظام سائنس کا آفتاب بن چکا ہے اور جسے ہم ڈارون کا اکتشاف جدید سمجھتے ہین۔

حضرات! اس مسئلہ کی تعلیم مدارس اسلامی مین اُس وقت دیجاتی تھی جب یورپ اُس سے بالکل بیخبر تھا۔ اور ہم تو پھر بھی اُسکے محدود سمجھتے ہین وہ ہم سے ایک قدم آگے بڑھے ہوئے تھے اور جمادات تک کو اُسکے حیز عمل مین داخل سمجھتے تھے جیسا کہ مولانا روم علیہ الرحمہ نے اس مسئلہ کو صوفیانہ پیرایہ مین منظوم کیا ہے۔

آمدہ اول باقلیم جماد   وز جمادی در نباتی اوفتاد

سالہا اندر نباتی عمر کرد   وز جمادی یاد نا ورد از نبرد

وز نباتی چون بحیوان اوفتاد   نامدش حال نباتی ہیچ یاد

جز ہمان میلے کہ دارد سوے آن   خاصہ در وقت بہار ضیمران

باز از حیوان سوے انسانیش   میکشید آن خالقے کہ دانیش

ہمچنین اقلیم تا اقلیم رفت   تا شد اکنون عاقل و دانا و زفت

عقلہاے اولینش یاد نیست   ہم ازین عقلش تحول کردنی ست

تا رہد زین عقل پر حرص و طلب   صد ہزاران عقل بیند بو العجب

اور یہ بات قابل غور ہے کہ باوجود اس خیال کے کہ الحادی اور مادی خیالات سائنس کے لوازمات سمجھے جاتے ہین اسپین کے مسلمانون پر ملحدانہ خیالات کا کوئی اثر نہین پڑا جس سے یورپ کے مصلحان تمدن کو موجودہ طرز معاشرت پر کوئی فخر نہین ہے۔ کیا یورپ کا یہ اخلاقی اور روحانی تنزل اس بات کی دلیل نہیں کہ علم کا غلط استعمال حجاب اکبر ہوجاتا ہے؟

یورپ مین علم طب مسلمانون نے مسئلہ ارتقا کے علاوہ کیمیا کے بعض نہایت اہم اکتشافات دریافت کیے۔ مثلاً بارود جس سے یورپ کا فیوڈل سسٹم اُڑ گیا۔ گندھک و شورہ کا تیزاب جس سے اُنھون نے طب مین بھی کام لیا اور معدنیات کے کُشتہ جات یعنی رسائن کی بدولت تو اُنھین یورپ کی اُستادی کا فخر حاصل ہے چنانچہ یورپ کا پہلا طبی مدرسہ عربون نے اطالیہ کے ایک شہر مین قائم کیا اور یورپ نے پندرھوین صدی تک طب مین شیخ بوعلی سینا ہی کو مستند جانا۔

یورپ مین علم ریاضی علم ریاضی بھی سنسکرت سے ترجمہ ہوکر مسلمانون کی بدولت عربی زبان مین داخل ہوا اور یورپ مین عربون ہی نے حساب کے ہندی طریقہ کو رواج دیا۔ جبر و مقابلہ ہندوستان سے عرب مین گیا اور وہان جابر ایسے ریاضی دانون نے اُسے ترقی دی چنانچہ الجبرا کے نام ہی سے اسکے اشاعت کنندہ کا پتہ چلتا ہے۔

علم نجوم عربون نے اول اس علم کو ہندوؤن سے حاصل کیا۔ مابعد یونان سے جو علوم و فنون کا سیلاب آیا اُسمین نجوم کا بھی خاص حصہ تھا۔ پھر خلفاے عباسیہ اور سلاطین عجم کی سرپرستی نے احکام نجوم کو معراج کمال تک پہنچا دیا۔ قرون وسطیٰ مین سات سو برس تک علم ہیئت بھی یورپ مین مسلمانون ہی کے تحفظ مین رہا۔ اور پہلی رصدگاہ جو یورپ کو نصیب ہوئی وہی تھی جو خلفاے بنی امیہ کی سرپرستی سے اسپین مین قائم ہوئی۔

خیامی اصلاح جدید پارسیون مین جو سنہ مروج ہے جسکو وہ یزدجردی سمجھتے ہین یہ سنہ دراصل حکیم عمر خیام نیشاپوری کا مرتب کیا ہوا ہے جسکو ہم فخریہ خیامی کہہ سکتے ہین۔ خراسان کے اس دوسرے بوعلی سینا کے فضل و کمال کا اسوقت صحیح اندازہ ہو سکتا ہے جب سنہ جلالی کا گریگورین رول سے مقابلہ کیا جائے۔ بلکہ بعض علماء کی راے ہے کہ خیام کے سنہ جلالی سے گریگوری نے اپنا قاعدہ بنایا ہے۔ علماء مشرق و مغرب کا اس پر اتفاق ہے کہ جو نظام خیام نے مقرر کیا وہ اقوام سابقہ کے حساب سے سب پر فائق ہے۔

علم جرثقیل علم جرثقیل مین انھون نے گرتے ہوئے اجسام کے قوانین دریافت کیے

جسکو ہم نیوٹن کا اکتشاف جدید سمجھتے ہین اور قوت کشش ثقل کی ماہیت سے بھی وہ نابلد نہ تھے - فرانس کے ایک مشہور مصنف کا قول ہے کہ ہمکو اس امر کے بیان کرنے کی ضرورت نہین کہ مسلمانون کے عہد مین فن جر ثقیل کمال کے کس درجہ تک پہنچ گیا تھا -

فلسفہ جس طرح مسلمانان اسپین یورپ کے علمی علوم کے اُستاد ہین اسیطرح ابن رشد نے علم فلسفہ مین یورپ کو اُسی شاہراہ پر چلایا جس پر اہل چین واہل ہند غرض مشرق کی تمام قومین چل رہی تھین اور اسپین ہی وہ مرکز تھا جہان سے آفتاب فلسفہ کی شعاعین نکل کر یورپ کے علمی وعملی حلقون مین پھیلین - اطالیہ جرمنی انگلستان مین بھی فلسفہ ابن رشد پھیل گیا اور سیمیون کے فرانسسکن فرقہ نے اس فلسفہ کو خاص وقعت کی نگاہ سے دیکھا - پیرس کی یونیورسٹی کو اسکا مرکز بننے کا شرف حاصل ہوا - یہودیون مین بھی جو اُس زمانہ مین عقل ودانش کی کرسی پر متمکن تھے فلسفہ ابن رشد عام طور سے پھیل گیا تھا مشہور یہودی فیلسوف موسیٰ بن میمون نے اس فلسفہ کو تسلیم کرلیا تھا اور اُسکے شاگردون نے دنیا کے ہر حصہ مین اس فلسفہ کی اشاعت کا فرض ادا کیا اُسی زمانہ مین لوگ انگلستان فرانس واٹلی سے اسلامی درسگاہون مین اکتساب علم کے لیے آتے تھے چنانچہ ان مین کا ایک جوہر قابل دارالعلم قرطبہ سے نکل کر پاپاے روم کی کرسی پر صدر نشین ہوا - لاطینی عیسویت نے اپنے اصول مین بہت کچھ اسلام کی مطابقت کی - جیسا کہ نہ صرف فقہ اگسٹن بلکہ اُس زمانہ کے عیسوی فلسفہ سے بھی جنمین ایک فرقہ ابن رشد کو اور دوسرا فرقہ بوعلی سینا کو مانتا تھا ظاہر ہوتا ہے -

مسلمانان عرب و یورپ مین لٹریچر

مسلمان اور عیسائیون کے میل جول کا یہ ایک ادنیٰ مگر وسیع الکیفیت نتیجہ ہے کہ عربی زبان سے لاطینی زبان نے فائدہ اٹھایا - چونکہ لاطینی زبان یورپ کی ام السنہ تھی اس لیے ایک طرف جنوبی یورپ کی زبانون نے اس سے خوشہ چینی کی اور دوسری طرف مشرقی اثرات رفتہ رفتہ کوہستان پائرینیز کو عبور کر کے فرانس اور نارمنڈی تک پہنچ گئے انھین اثرات کا یہ نتیجہ تھا کہ جب نارمن قوم نے انگلستان کو فتح کیا تو وہ الفاظ جو عربی زبان و تراجم سے منتقل ہوتے چلے آتے تھے انگریزی زبان مین داخل ہوگئے اور انگلستان کی قدیم زبان جو ایک محدود زبان تھی وسیع اور لطیف بن گئی - لیکن ایسے مشہور اور معتبر مورخ نے انھین علمی اثرات کی بابت لکھا ہے کہ اس وقت تک یورپ کی ذہنی دماغی ترقیون مین جان نہین پڑی جبتک مسلمانون کے سائنس نے علوم وفنون کو یورپ کی خانقاہون سے جدا کر کے دارالعلوم مین نہین پہنچادیا -

اگر کسی کو اس امر سے اب بھی اختلاف ہو اور مسلمانون کی شاندار علمی فتوحات اور انکی عظیم الشان سربفلک عمارتین خدانخواستہ سرزمین یورپ سے نیست و نابود ہوجائین تو آسمان خود گواہی دیگا کہ یورپ کو مہذب بنانے مین مسلمانون نے کس درجہ حصہ لیا - چنانچہ ستارون کے عربی نام بھی اسکی شہادت دیتے ہین حضرات! اسی کے ساتھ اگر ہم مشرقی مسلمانون کے علمی مذاق پر تبصرہ کرین تو معلوم ہوگا کہ مشرقی دنیا مین علم وادب کی اشاعت مین وہ اپنے مغربی معاصرین سے گوے سبقت لیگئے تھے -

دارالعلم غزنی

سلاطین غزنویہ مین سلطان محمود کی علم پروری ایک ایسی خصوصیت امتیازی ہے جو علمی دنیا مین ہمیشہ یادگار رہے گی - چار لاکھ دینار سالانہ خزانہ شاہی سے اُسکے زمانہ مین علماء کو دیا جاتا تھا مگر اُس بادشاہ کی فیاضی صرف عالمون ہی تک محدود نہ تھی - اس نے اپنے عہد حکومت مین غزنی کی جامع مسجد کے متصل بہت بڑا دارالعلم بھی قائم کیا اور اس مین غیر زبان کی ہزارہا کتابین داخل کین - اس دارالعلم مین کتبخانہ کے علاوہ ایک عجائب خانہ بھی شاہی امداد سے قائم تھا - اس عہد کے اساتذہ مین سے عنصری بھی اپنے زمانہ کا مشہور فلاسفر ادیب تھا

شاعر گذرا ہے۔ ایکمرتبہ سلطان نے عنصری کے چند اشعار پر خوش ہو کر شاعر کے منہ کو تین مرتبہ موتی اور جواہرات سے بھروا دیا۔ اسدی طوسی کو دنیا جانتی ہے کہ مشہور شاعر فردوسی کا اُستاد تھا۔ سلطان نے کئی بار اسدی سے شاہنامہ لکھنے کی خواہش کی مگر وہ ہمیشہ ضعیفی کا عذر پیش کرتا رہا۔ آخر اُسکے نامور شاگرد نے شاہنامہ لکھکر بقاے دوام کی عزت حاصل کی۔

سلطان محمود کے مساعی جمیلہ سے غزنی شعرا اور فلاسفرون اور علماء سائنس کا مرکز بن گیا۔ اور یہ شہر قرون وسطی کے پلوٹا اور پیڈوا کی طرح مشہور ہوا اُسی زمانہ مین آل سبکتگین کا تذکرہ عتبی نے اپنی تاریخ یمنی مین کیا ہے۔

سلطان مسعود غزنوی سلطان مسعود بھی مثل اپنے باپ کے حکما اور علما کا قدردان تھا اور اُن سے اسقدر مانوس تھا کہ دربار ہمیشہ عالمون سے بھرا رہتا تھا۔ اسکے زمانہ مین الو رخان خوارزمی نے علم ہیئت پر کتاب مسعودی لکھکر ایک ہاتھی کے ہموزن چاندی انعام پائی تھی کتاب روضتہ الصفا مین ذکر ہے کہ اس سلطان نے کئی دار العلوم اور اسکول اپنے ملک کے شہرون مین جاری کیے۔ البیرونی کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ کے مسلمان ہندی علم ہیئت ریاضی نجوم فلسفہ و طب کے بیحد شائق تھے۔ انہی کی کتابین دیکھنے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اُس زمانہ مین سنسکرت کی کتنی کتابون کا ترجمہ کیا گیا۔ خود بیرونی سنسکرت زبان کا بہت بڑا عالم اور پاتنجلی کا مترجم گذرا ہے۔

سلطان بہرام بن مسعود سلطان بہرام بن مسعود غزنوی بہت بڑا تشنہ علم تاجدار تھا۔ اس بادشاہ نے علمی دنیا مین نئی روح پھونکی۔ مخزن اسرار کا مصنف اسی کے دربار کا وظیفہ خوار تھا اس سلطان نے کئی ہندی کتب کا ترجمہ کرایا۔ کلیلہ دمنہ اسی کے عہد مین ترجمہ ہوئی جس کو مرزا حسین واعظ کاشفی نے بدل کر انوار سہیلی کے نام سے موسوم کیا۔

آل سلجوق[۵۱]

حضرات! اب اس خاندان شاہی کا قصہ سُنیے جس نے اپنا ایوان حکومت غزنیون کے کھنڈرات پر قائم کیا۔

جب سلجوق اعظم کرغیز کے کوہستانی میدانون سے اُتر کر اپنی قوم کو بخارا مین لایا اور وہان مع اپنے تمام توابع کے مسلمان ہو گیا اوس وقت دنیائے اسلام کی یہ حالت تھی کہ دولت عباسیہ کا چراغ خود جھلملا رہا تھا۔ اسپین اور افریقہ خلافت عباسیہ کے اثر سے آزاد ہو چکے تھے۔ ایسے نازک زمانہ مین اسلام کی مذہبی اور سیاسی کمزوری رفع کرنے کے لیے ایک زبردست طاقت کی ضرورت تھی جو سلجوقیون کے وجود سے پوری ہوئی۔ اسلام قبول کرتے ہی ان خانہ بدوش وحشیون کی زندگی مین ایک انقلاب عظیم پیدا ہو گیا۔ اور انکے فتوحات نے مسلمانون کی مٹتی ہوئی شان و شوکت کو ایسا سنبھالا کہ لوگون کو صحابہ کرام کا زمانہ یاد آگیا۔ سلجوقیون نے مغربی ایشیا کی اسلامی سلطنتون کو ایک سلطنت مین شامل کر لیا۔ رومیون کی پیش قدمی کا انسداد کیا۔ نئی ترکی نسل مین مذہبی جوش پیدا ہوا، اور یہی سبب ہے کہ دولت سلجوقیہ کو تاریخ اسلام مین مہتم بالشان درجہ ملا ہے۔

خواجہ نظام الملک طوسی اور نظامیہ بغداد

خلیفہ مامون الرشید کے زمانہ کو اگر ابو عبد اللہ اور برامکہ پر فخر ہے تو الپ ارسلان اور ملک شاہ سلجوقی کا عہد نظام الملک طوسی اور عمر خیام پر ناز کر سکتا ہے۔ مورخین کا اسپر اتفاق ہے کہ یحیی برمکی اور صاحب ابن عباد کے بعد کوئی وزیر فضل و کمال مین خواجہ نظام الملک کا ہمسر نہین ہوا۔ علوم و فنون کی اشاعت مین جس فیاضی سے خواجہ نے کام لیا ہے وہ بھی اُسکا خاص حصہ تھا۔

۵۱ دیکھو کتاب نظام الملک طوسی مولفہ مولوی عبدالرزاق کانپوری۔

نظامیہ بغداد | خواجہ کی علمی یادگار ون مین نظامیہ بغداد کا نام تاریخ مین مشہور ہے۔ نظامیہ کی عمارت مین ایک حصہ خزینۃ الکتب کے لیے مخصوص تھا۔ چنانچہ تکمیل عمارت کے بعد خواجہ نے اُسمین ہزارون کی تعداد سے نادر اور بیش قیمت کتابین داخل کردین۔

نظامیہ پہلا مدرسہ ہے جس نے طلباء کے لیے وظیفہ مقرر کیا اور یہ مدرسہ ۳۸۰ برس تک قائم رہا۔ شیخ سعدی رح نے اسی مدرسہ کے وظیفہ سے تعلیم پائی تھی۔ محض نظامیہ کی تقلید مین مصر شام و عراق مین بہت سے مدارس قائم ہوے اور علم علم سارے وسط ایشیا مین بلند ہوا۔

تصانیف عہد سلجوقیہ | اس زمانہ مین بھی تصانیف کا سلسلہ بدستور قائم رہا خود نظام الملک ایک بڑا مصنف تھا اور اگر آپ اسکے قانون سلطنت کو غور سے مطالعہ فرمائین گے تو معلوم ہوگا کہ زمانۂ حال کا قانون اور ضابطہ بھی سلاطین سابق کے قانون کا خوشہ چین ہے۔

حکیم عمر خیام نیشاپوری | خواجہ نظام الملک کے ہمسبق حکیم عمر خیام نیشاپوری نے ملک شاہ سلجوقی کے حکم سے اصلاح رصد کی تھی۔ خیام کی تصانیف اسقدر مشہور ہین کہ ہمارے بیان کی محتاج نہین۔ اور خیام کے باثر ہونے مین کیا کلام ہو سکتا ہے جب کہ گذشتہ صدی مین شہر لندن مین عمر خیام کلب قائم ہو۔ یورپ والے خیام کو مشرق کا والٹیر کہتے ہین۔ فلاسفران یورپ مین شوپن ہار سلسلۂ خیامی مین داخل ہے اور اس کا فلسفۂ فی نفسہ کوئی نوایجاد فلسفہ نہین ہے۔

علم و پیشہ | اس عہد مین جسکی یہ تاریخ ہے شاید ہی کوئی ایسا بدنصیب مسلمان ہوگا جس نے محض علم کو معاش کا آلہ بنایا ہو ورنہ قوم کا ہر فرد پیشہ ور تھا۔ عربون کی تجارتی کوششین اُنکے علوم و فنون کی کوششون سے کچھ کم نہین۔ کئی صدیون تک وہ تمام عالم کا مرکز تجارت بنے رہے اور زمانۂ قدیم مین اُنھون نے وہی کام دیا جو یورپ مین وینیس نے اپنی ترقی کے زمانہ مین دیا تھا۔ اور پھر لطف یہ کہ باوجود اس حیرت انگیز تجارتی ترقی کے عربون نے نہ تو اپنے تمدن کی بنیاد تجارت پر رکھی نہ تجارت کو قومی دراز دستی کا آلہ بنایا اور نہ ترقی تجارت کو اپنے علمی مشاغل پر غالب ہونے دیا۔

اسی علمی ذوق و شوق کا یہ نتیجہ تھا کہ ایران کی مردہ شاعری مین جان پڑی۔ شیراز ہمیشہ علمی مرکز بنا رہا۔ بخارا مین دار العلم قائم کیا گیا مشہد کی علمی شان و شوکت قائم ہوئی۔ نیشاپور کو علمی فضیلت ملی تاجدارون نے جدا جدا کتبخانے قائم کیے نوح ابن منصور کا کتب خانہ ایک بے نظیر کتبخانہ تھا۔ عضد الدولہ نے شیراز مین ایک کتبخانہ قائم کیا سیف الدولہ کے کتبخانہ مین فن ادب کا ایک بیمثل ذخیرہ جمع ہوا۔ سہل بن مرزبان صاحب بن عباد محمد بن الحسین بغدادی کے کتبخانے یادگار زمانہ تھے اور طوس کے بارہ مین کہا گیا کہ :-

ہر دبیر و شاعر و مفتی کہ از طوسی بود — چون نظام الملک و غزالی و فردوسی بود

اور یہی نظامیہ بغداد اور اُسکے ماتحت مدارس تھے جنکی اعلیٰ تعلیم و تربیت نے علم کی روشنی پھیلا کر اُس عہد کے مسلمانون کو ایک زندہ قوم بنا رکھا تھا

مسلمانان ہند کا علمی مذاق

حضرات! ہندو مسلمانون کے صدیون کے باہمی تعلقات سے جو اہم نتائج پیدا ہوے اُن کا بیان اس مختصر تقریر مین نہین ہو سکتا لیکن بسبیل ایجاز اتنا کہنا کافی ہے کہ جب اہل اسلام ہندوستان مین آئے تو سب سے پہلے معاشرت مین ایک انقلاب عظیم پیدا ہوا۔ ذات پات کی بندشین جنھون نے ہر طرف سے انسانیت کو جکڑ رکھا تھا کمزور ہو گئین اور رفتہ رفتہ ان تعلقات نے سوشل حالات سے گذر کر علمی اور سیاسی شعبہ ہاے حیات کو بھی متاثر کیا۔ اسلامی مدنیت کی ترقی کو وہ میدان مل گیا جو اس عہد سے پیشتر اُسکو جگہ

ممالک مین مل چکا تھا اور جس مین وہ اپنے انتہائی نتائج ارتقا کو ایک عالم کے پیش نظر کر چکی تھی۔ مسلمانون نے یہان بھی متعدد دار العلوم اور مدارس قائم کیے۔ چونکہ وہ خود لٹریچر کے مالک تھے اور جانتے تھے کہ کسی قوم کو بے زبان کر دینا اُسکی ہستی کو مٹانا ہے، اسلیے اُنھون نے نہ صرف سنسکرت پر اپنی توجہ مبذول کی بلکہ اس ملک کی ایک قومی زبان یعنی بنگالی کو بھی ترقی دینا اپنا فرض سمجھا۔ یہ امر واقع ہے جسکے صحت سے انکار نہین ہو سکتا۔ افسوس ہے کہ عام مورخین بھی اس حقیقت کو ظاہر نہ کر سکے۔ میرے لیے بحیثیت ایک بنگالی ہونے کے یہ امر مایۂ صد افتخار ہے کہ میرے ہموطن کمار نرندر ناتھ لا نے "ترقی علوم بزمانۂ شاہان اسلام ہند" نامی مستند کتاب حال مین شائع کر کے اُس فرض کو ادا کیا ہے جو اسلامی علمی کارنامون کی طرف سے بنگالیون پر عائد ہوتا ہے۔

حضرات! اُنھون نے صرف اسی پر اکتفا نہین کیا بلکہ ہمارے اسلامی سلاطین ہند اُن سیاسی رموز سے بھی واقف تھے جس سے مختلف النسل قومین متحد ہو جاتی ہین۔ یہ سلاطین ہندوستان مین آکر ہندی ہو چکے تھے۔ صدیون سے آپس مین ایک نہایت دلکش مفاہمت ہو چکی تھی۔ ملکی رنگ اُن سلاطین اور بزرگان دین پر ایسا چڑھا کہ زبان و مذہب کے اتحاد اور محبت و اخلاص کے برقرار رکھنے مین ایثار کی انتہا کر دی۔ جنگ نہاوند کے بعد پارسیون نے نہین کیا تھا وہ کر گذرے، اپنی اصلی زبان کو بھی فراموش کر دیا۔ چنانچہ ہندو مسلمانون کے اتحاد و ایثار کی نظیر ایک جانب ہماری پیاری اُردو زبان ہے جو بھاشا کی ترقی یافتہ شکل ہے اور دوسری جانب وہ صوفیانہ خیالات ہین جنمین اور ویدانت کے حقیقی اصول مین کوئی فرق یا تفاوت نہین ہے۔

ہندوستان مین مذہبی اور سیاسی اتحاد

اسی وسیع الکیفیت اتحاد کا نتیجہ تھا کہ گرو نانک اور کبیر کے پیرو وجود مین آئے اور اب بھی بطور زندہ یادگار موجود مین رہا سیاسی اتحاد سو وہ راجہ اشوک کے بعد ہندوستان مین اُسوقت تک پیدا نہین ہوا جب تک شہنشاہ اکبر نے ہندو اور مسلمانون کو تمدنی طور پر ایک نہ بنا لیا اور یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ ہندوستان کی موجودہ معاشرت مین جہان ساسانیون اور یونانیون کا کچھ حصہ ہے وہان مسلمانون کا بھی بہت بڑا حصہ شامل ہے۔

عرب اور ہندوستان

عربون کے تجارتی تعلقات ہندوستان کے ساتھ ابتدائے زمانۂ تاریخی سے شروع ہوے لیکن ظہور اسلام کے کچھ ہی مدت بعد سندھ عربون کے تحت حکومت مین آگیا اور ہندوستان مین عرب پہلے پہل آئے۔ نوین صدی کا تذکرہ ہے کہ سندھ مین ہندو مسلمانون کا میل جول اسقدر بڑھ گیا تھا کہ ہندو عربی معاشرت سے اسقدر متاثر نہین ہوے جسقدر خود عرب ہندوستانی معاشرت سے متاثر ہو گئے تھے اسی صدی مین قرآن شریف کا کسی ہندو راجہ کی تحریک پر ہندی زبان مین ترجمہ کیا گیا۔

عربی دور ختم ہونے کے بعد ایرانی دور شروع ہوا۔

خاندان غزنی

خاندان غزنی کا مختصر بیان ہم اوپر کر آئے ہین۔ یہان صرف یہ کہنا کافی ہوگا کہ سلطان محمود غزنی کے زمانہ کے مسلمان ہندو فلسفہ سے خوب واقف تھے اور غزنیون نے متعدد ہندی کتابون کا ترجمہ کرایا، اور سچ پوچھیے تو اردو زبان کی بنا اسی سلطان کے وقت سے پڑی اور اُسی کی تعلیم و تربیت کا یہ اثر تھا کہ سلطان مسعود نے ممالک محروسۂ ہندوستان کی گورنری پر ایک ہندو سردار کو ممتاز کیا۔

خاندانِ غلامان

ان کو غلام نہ کہیے ہمارے ہمخیال صدر جناب نواب نصیر حسین خان صاحب خیال نے کیا خوب فرمایا ہے کہ "یہ غلام شاہون کا دل و دماغ لائے تھے

اور ہندوستان کے ساتھ اُنھون نے شاہانہ سلوک کیے۔ انھین کے وقت مین دلّی زبانون کا مرکز، اور علوم کا گھر بن کر غزنی اور بغداد پر چشمک زنی کر رہی تھی۔

سلطان ناصرالدین شاہ بلبن سلطان ناصرالدین کے زمانہ مین طبقات ناصری لکھی گئی جب چنگیز خان خراسان کی غارتگری مین مصروف تھا تو شاہ بلبن سریر آرائے دہلی تھا۔ لکھا ہے کہ وسط ایشیا کے پندرہ شاہزادے اسوقت دہلی مین پناہ گزین تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بلبن کے دربار مین متعدد علما و فضلا جمع ہو گئے تھے۔

امیر خسرو امیر خسرو کی شیرین کلامی اسی کے عہد مین مقبول ہوئی۔ خسرو نے خالق باری لکھ کر صرف دو زبانون مین یکسانیت ہی نہین پیدا کی بلکہ دو مذہبی قومون کے جذبات و خیالات کا آپس مین ایک رشتہ باندھا۔

سلطان علاء الدین خلجی سلطان علاء الدین خلجی کے بارہ مین صاحب فرشتہ کہتا ہے کہ اس بادشاہ نے بھی متعدد دار العلوم قائم کیے۔ اور پینتالیس مشہور علما ان مین تعلیم دیا کرتے تھے۔ اس زمانہ مین دلی مین ایسے ایسے اساتذہ موجود تھے جو اپنے اپنے علم و فن مین بخارا، سمرقند، بغداد، قاہرہ، دمشق، اصفہان، تبریز کے مشہور اساتذہ سے بڑھے ہوے تھے۔

ابن بطوطہ عربی مشہور سیاحون مین یہان پر صرف ایک سیاح کا نام آپ صاحبان کے روبرو پیش کرتا ہون۔ ابن بطوطہ سلطان محمد تغلق کے زمانہ مین افریقہ اور ایشیا کی سیاحی کرتا ہوا ہندوستان آیا تھا۔

فیروز شاہ تغلق فیروز شاہ تغلق شاہان ہند مین ایک مشہور بادشاہ گذرا ہے اُسی نے شہنشاہ اشوک کے دو پُرانے ستونون کو نہایت احتیاط سے محفوظ رکھا جب راجہ ناگر کوٹ کو شکست دے کر اسکا ملک اُسے سپرد کیا تو راجہ کے کتبخانہ کی چند کتابون کا فارسی زبان مین ترجمہ کرایا اور ایک کتاب کا نام دلائل فیروز شاہی رکھا۔ اس سلطان نے بھی متعدد دار العلوم ہندوستان مین قائم کیے۔ چنانچہ اُن مین سے ایک فیروز آباد مین بنا تھا جسکی عمارت تمام مدارس ہند سے زیادہ خوبصورت و شاندار تھی۔

سکندر لودھی سکندر لودھی کے زمانہ مین ہندوؤن نے فارسی زبان کی تحصیل شروع کی اور اُردو زبان اُسی کے زمانہ سے شروع ہوئی حالانکہ اُسکی بنیاد محمود غزنوی کے عہد حکومت مین پڑ چکی تھی۔ اس زمانہ مین بھی شاہی اعانت و سرپرستی کی بدولت تراجم و تصانیف کا بازار خوب گرم رہا ایک سنسکرت زبان کی کتاب اُرگر مہا بیدک کا ترجمہ کر کے اس کا نام طب سکندری رکھا جس کو ہندوستان کے تمام اطبا نے مستند مانا۔

دکن شاہان دکن مین بہمنی و عادل شاہی بادشاہون کے بارے مین صرف یہ کہنا کافی ہوگا کہ ان مین سے اکثر و بیشتر بجائے خود علم دوست اور ہنر پرور تھے۔ یہی نہین بلکہ ان کے وزرا بھی انھین کی طرح فضل و کمال کے قدردان و ماہر علوم و فنون تھے۔ ان بادشاہون نے دکن مین ہزارہا مدارس اور کتبخانے قائم کیے۔ یہی وہ سلاطین تھے جنکی علمی فیاضیون کی بدولت نہ صرف ہندوستان بلکہ ہر ملک و دیار کے علما مستفید ہوتے تھے۔ چنانچہ وہ ہر سال غیر ممالک کو جہاز بھیج بھیج کر فارس و ترکستان سے علما کو طلب کر کے اپنے دربار کی رونق بڑھاتے تھے حافظ شیرازی بھی ایک زمانہ مین یہین آنے مدعو کیے گئے تھے۔

گجرات گجرات کے اسلامی بادشاہون نے علم کو بڑی وسعت اور ترقی دی انھون نے بھی عرب و فارس و ترکستان سے علما کو طلب کر کے اپنے پایہ تخت مین جگہ دی۔

کشمیر کشمیر مین تو سلطان زین العابدین ہی کے عہد مین اکثر عربی و فارسی کتابون کا ترجمہ ہندی مین اور بہت سی ہندی کتابون کا ترجمہ فارسی مین ہو گیا تھا چنانچہ سب سے پہلے اُسی کے حکم سے مہابھارت اور راج ترنگنی کا ترجمہ فارسی مین ہوا۔

جونپور ابراہیم شرقی کے زمانے مین جونپور علما اور طلبہ کا مرکز بن گیا اور متعدد مدارس و دار العلم یہان بھی شاہی امداد سے قائم ہوئے۔

ملتان

ملتان شاہان اسلام کے زمانے مین علمی نقطہ نظر سے گجرات پر تفوق رکھتا تھا۔

بنگال

خود بنگالی زبان مین شاہی حکم سے سنسکرت کتابون کے ترجمہ کیے جاتے تھے اور انھیں کی بدولت بنگالیون کو اُن کی مادری زبان مین رامائن مہابھارت اور بھاگوت پران میسر ہوئین۔ اس ذریعہ سے یہ زبان رفتہ رفتہ ایک علمی زبان بن گئی۔

یہ ذوق صرف شاہان بنگال تک محدود نہ تھا۔ چنانچہ اسد اللہ ذبیلہ بیر بھوم کی نسبت لکھا ہے کہ اُس نے اپنی آمدنی کا نصف حصہ اسی مذاق کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔

اسلامی دور مین فرزندان بنگال کو ملک الشعراء بننے کا فخر حاصل ہوچکا ہے۔

خاندان مغلیہ

یہ مشہور بات ہے کہ قیصر ہند اکبر اعظم کو ہندوؤن سے کس قدر اُنس تھا۔ اُسی کے زمانہ مین ہندوؤن کا ربط و ضبط دوستی کے درجہ سے گذر کر قرابت و رشتہ داری کی حد تک پہنچ گیا تھا' اور ہندو مسلمانون کی تمدنی زندگی بالکل ایک ہوگئی تھی مسلمانون نے ہندوستان کو اپنا گھر سمجھ کر سنسکرت اور بھاشا مین نمایان ترقی کی۔ اکبر نے اپنے احکام سے بہت سی کتابون کے ترجمے کرائے۔ دیبی برہمن اور ملا عبد القادر بدایونی کی شرکت سے مہابھارت فارسی زبان مین ترجمہ ہوکر رزم نامہ کہلائی۔ ان ہی فضلا نے رامائن کا ترجمہ کیا۔ اتھروید کا ترجمہ حاجی ابراہیم سرہندی نے اور لیلاوتی کا ترجمہ فیضی نے کیا۔ نل دمن کو بھی مثنوی کا لباس اسی فاضل شاعر نے پہنایا۔ علاوہ ازین عہد اکبری مین بہت سی عربی اور فارسی کتابون کا سنسکرت زبان مین ترجمہ ہوا۔

شہنشاہ جہانگیر

جہانگیر نے بھاشا کی اعلیٰ نظمون پر بخشش و انعام دیکر شاعرون کے حوصلہ بلند کیے۔

صاحبقران شاہجہان

شاہجہان کے عہد بعدلت مین ہندوستان کی متحدہ ملکی زبان ترقی کرکے اردوے معلےٰ کے خطاب سے ممتاز ہوئی۔

مسلمان اور فنون لطیفہ

اسی ضمن مین اگر یہ بھی کہا جائے تو کچھ نامناسب نہ ہوگا کہ مسلمانون نے اپنی علمی ترقیون کے ساتھ ساتھ فنون لطیفہ مین بھی خاص دستگاہ بہم پہنچائی تھی۔ چنانچہ عہد شاہجہانی کی یادگار اُن کے کمال کا اعلیٰ ترین نمونہ تخت طاؤس ایک ایسی چیز بنی جسکو دیکھکر تمام دنیا نے اظہار تعجب کیا۔

مسلمانون نے اپنے کمالات صناعی کے ایسے ایسے عدیم المثال نمونے چار دانگ عالم مین چھوڑے جو عجائبات روزگار کہے جاتے ہین۔ خود ہندوستان مین تاج محل جسکو یوروپین سیاحون نے طلسم حیرت کہا ہے آج تک ایک عالم کو محو حیرت بنا رہا ہے۔

اسی طرح نادر قلمی تصاویر اور قسم قسم کے اعلےٰ پارچہ جات و اسلحہ و نقش دار ظروف مین جو جو صناعی و دستکاری دکھائی گئی ہے اُنکے رہے سہے نمونے آج بھی ہندوستان اور یورپ کے عجائب خانون کی رونق دوبالا کر رہے ہین۔

شاہزادہ دارا شکوہ

دارا شکوہ نے خود سنسکرت سے ہندوون کی مشہور و معروف کتاب بھاگوت گیتا اور جوگ بشسٹ رامائن کا ترجمہ کیا۔ اُسی نے اپنیشد کے ترجمہ کا نام سر الاکبر رکھا۔

شہنشاہ اورنگ زیب

اورنگ زیب کے زمانہ مین بھاشا معراج کمال پر پہنچی۔ ولی کے بعد زبان دانی کی ٹکسال شاہان اودھ کی سرپرستی مین لکھنؤ منتقل ہوئی اور سلطنت لکھنؤ کی بساط اُلٹ جانے کے بعد اُردو کا ستارہ بنگال مین چمکا۔ روہیلکھنڈ مین رامپور نے گلشن سخن بننے کی قابلیت پیدا کی۔ وسط ہند مین بھوپال کو اُردوے معلّی کی مہمانی کا فخر حاصل ہوا۔ بالآخر حضرت داغ نے اُردو کے گہوارہ کو

دلّی سے لیجا کر شاہ دکن کی امانت مین سپرد کر دیا۔

اِس طور پر سلاطین اسلام کے آغوش مین ملک کی عام مشترکہ زبان نے تربیت و پرورش پائی اور قدیم ہندوستان کی ایک متحدہ یادگار بنی۔ یہ ہین وہ گرانبار احسانات جو اسلام کے ہندوستان پر ہین جن کو بعض لوگ تجاہل عارفانہ سے بھولے ہوے ہین اور افسوس ہے کہ مٹی ہوئی سلطنت کے ساتھ اس متحدہ یادگار کو بھی مٹانا چاہتے ہین۔

حضرات: جو کچھ آپ نے سنا بظاہر ایک فسانہ معلوم ہوتا ہے مگر یہ کوئی معمولی فسانہ نہین ایک قوم کا ایشیا مین ہندوؤن سے ربط و اتحاد اور یورپ مین مسیحیون اور یہودیون سے ہمنوالہ ہم پیالہ و ہمنوالہ رہنا، خاص کر جب وہ قوم ایسی ہو کہ قیصر و کسریٰ کے بادشاہون کا سامان اس قوم کی شاہزادیون کے جہیز مین نکالا جائے اور پھر خوبی یہ کہ ملکی فتوحات سے زیادہ علمی فتوحات ہون، جو قوم ایسے ایسے شہر جن کی بنیاد ڈالے کہ صدیون تک یورپ اور ایشیا مین علوم و فنون و صنعت و حرفت و کمالات انسانی کے ماوا و ملجا بنے رہین، جس قوم کے عدل و مساوات و سیاست و حوصلہ مندی کی یہ کیفیت ہو کہ وہ قوم نہ صرف اپنے صنف نازک کو مساوات کا درجہ دے بلکہ تمام امور معاشرت مین غیر اقوام کے حقوق کی بھی محافظ بنے جس کے قانون سلطنت کا یہ عالم ہو کہ زمانۂ حال کا قانون اور ضابطہ اُسکا خوشہ چین ہو، جس کی تجارتی کوششین اُسکی علمی کوششون سے کم نہون اور پھر لطف یہ کہ نہ اُس قوم کی بنیاد تجارت پر رکھی جائے، نہ اُسکی تجارتی کوششین اُسکے علمی مشاغل پر غالب ہونے پائین، جس کی ترقی علم و ادب کا یہ حال ہو کہ ایک طرف مغرب مین یورپین لٹریچر اُسکی زبان سے مستفید ہو تو دوسری طرف ایک ملک کی مردہ شاعری مین روح پھونکے اور دوسرے ملک مین نہ صرف مقامی زبان کو فروغ دے بلکہ اپنے اتحاد و ایثار کی مثال مین وہان کی زبان کو ترقی دے کر ایک نئی اور دلکش زبان بنا ڈالے، جسکے علمی علوم مین یہ خوبی ہو کہ جب سائنس کے خزانون پر وہ دسترس پائے تو بشریت کی انتہائی سرحد یہ قرار دے کہ وہ صفات ملکوتی حاصل کرے نہ یہ کہ الحادی و مادّی خیالات کا قوم پر اثر ڈالے، جس قوم کے فلسفۂ تصوف کا یہ کمال ہو کہ ایک جانب لاطینی مسیحیت اور موسویت اور دوسری جانب ہندوؤن کی ویدانت سے شیر و شکر ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو اور اُسکے فنون لطیفہ کے بچے کھچے نمونے آج بھی عجائب خانون کی رونق بڑھائین، تو یہ ایسے واقعات نہین ہین جن پر ایک مبصر تنقیدی نظر ڈالے اور اُسکے وسیع الکیفیت نتائج کو حیرت کی نگاہ سے نہ دیکھے۔

حضرات! مین اگر اس مہتم بالشان علمی تحریک کے جزئیات سے بحث کرون تو میری تقریر بہت طویل ہوجائے گی لہذا مین صرف اس اجمال پر اکتفا کرتا ہون کہ ہر ملک مین اُسکی خصوصیت کے لحاظ سے مسلمانون نے علمی ترقی کے اسباب فراہم کیے۔ ایران مین علاوہ منقولات کے معقولات کو بھی ترقی دی۔ مصر و شام مین فقہ حدیث اسماء الرجال کو فروغ ہوا۔ اسپین مین ادب و شاعری اور تاریخ کا فن کمال کو پہنچ گیا۔ ہندوستان مین یونانی فلسفہ و طب کو فروغ ہوا۔ بالفاظ دیگر مسلمانون نے ۷۰۰ برس تک تمام اقطاع عالم مین علم کا چراغ روشن رکھا اور عہد قدیم سے علوم و فنون کو لے کر اُن مین قابل قدر اضافہ کر کے بحفاظت تمام عہد جدید کے سپرد کیا جس سے غیر اقوام کی موجودہ تہذیب کی بنا ڈالنے مین معقول مدد ملی۔ صاحبو! جبتک علم و انصاف دنیا میں قائم ہے مشرق و مغرب تمدن عرب کے اُن گران قدر اور ناقابل فراموش احسانات سے کبھی سبکدوش نہین ہو سکتا۔

اس بیان سے آپ لوگون نے اندازہ فرمالیا ہوگا کہ دنیا کی علمی ترقی مسلمانون کی تصانیف و تراجم کی کس درجہ ممنون احسان ہے اور ان تراجم کی بدولت خود مسلمانون کی علم زبان دانی مین کس قدر وسعت ہوئی۔ حضرات! موجودہ حالت کو پیش نظر رکھتے ہوے ضرورت اس امر کی متقاضی ہے کہ نہایت حریص اور طامع بن کر شل اُن اقوام کے جنھون نے دیکھتے دیکھتے اپنی زبان کو علمی زبان کی حد تک پہنچادیا ہے غیر زبانون سے مصالح اکٹھا کرکے اپنی زبان کی ترقی مین صرف کیا جائے اور جہان تک جلد ممکن ہو موجودہ ضرورت کے مطابق بنالی جائے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر سلسلۂ تراجم جاری رکھا گیا تو کچھ ہی دنون مین اُردو زبان بھی دنیا کی وسیع زبانون مین شمار کی جائے گی مین صرف تراجم ہی پر زور نہ دونگا بلکہ اس پیاری زبان کی حمایت مین آپ حضرات سے یہ بھی عرض کرونگا کہ اُردو زبان جبلی طور سے دنیا کی عالمگیر زبانون مین ایک ممتاز زبان بننے کی قابلیت رکھتی ہے اور اگر آپ صاحبان ہمت کرین تو آج بھی اُسکے قالب مین تازہ روح پھونکی جاسکتی ہے۔

حضرات! ہر قوم اپنا ایک مخصوص ماضی رکھتی ہے ایک مخصوص تاریخ ایک مخصوص روایات قومی کا ذخیرہ رکھتی ہے اور مخصوص حالات اور تجربات کی بنا پر اپنے ارتقا کے موجودہ منزل پر پہنچتی ہے اور ہر ملک ایک اصلی اور صحیح کیرکٹر ہوا کرتا ہے جس کا خاص تعلق اُس ملک کی زبان سے ہوتا ہے اور جس کا ضائع ہوجانا گویا قوم کا فنا ہونا ہے۔

یاد رکھیے! اُردو زبان ہرگز احسان فراموش نہین ہے۔ آپکی خدمات کے صلہ مین یہ پیاری زبان نہ صرف آپ کے اصلی اور صحیح کیرکٹر کو برقرار رکھے گی بلکہ آپ کو اتحادی ترقی کے اُس انتہائی زینہ پر پہنچائے گی جو آپ کے گذشتہ اور موجودہ لیڈران قوم اور محبان وطن کا نصب العین رہا ہے۔ اور ہے۔ فقط

بی۔ گھوشال

ہندوستان کے قدیم مذاہب

(پروفیسر رومیش چندر دت ۔ سی ۔ آئی ۔ ای آنجہانی کے ایک مضمون کا ترجمہ)

ہندوؤن کے مذہبی اعمال و رسوم اُن کا قدیم اور سخت نظام ذات اُن کے عجیب و غریب تیوہار اُن کے شاندار مندر و متبرک مقامات اور اُن کے سالانہ تیرتھ جاترا اُون کے متعلق اور اُن کی عورات کے اُن خانگی و صابرانہ مذہبی اشغال، اور اُن کے مردون کے اُن خود اختیار کردہ روزون اور کفارون کی نسبت متفاوت بہت کچھ لکھا گیا ہے جو یورپ کے قرون وسطی کے رسوم و اعمال کی یاد دلاتے ہین۔ مگر ہندو مذہب کے اُن عام پسند و دلچسپ تذکرون مین ہمکو فلسفہ کی وہ تہ نہین ملتی ہے جو ہندوستان سے بڑے براعظم کے باشندون کو ایک دوسرے سے متعلق اور متحد کیے ہوے ہے جسکی وجہ سے وہ لوگ ہزارہا سال تک یونانیون پارسیون مسلمانون اور مسیحون کے خارجی اثر کا مقابلہ کر سکے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ صرف ہندوستان ہی مین ہم کو زمانۂ سلف کے عقائد و رسوم و اعمال کا سراغ ملتا ہے جنکا سلسلہ ابھی تک جاری ہے اور جن کی نسبت کہنا چاہیے کہ وہ ابھی تک زندہ ہین۔ مصر اور بابل کے پرانے عقائد قصۂ پارینہ ہوگئے ہین یونان اور روم (اطالیہ) کا قدیم مذہب اب صرف نظم و دستکاری مین رہ گیا۔ قدیم میڈیا اور فارس والون کے عقائد پارسیون کی ایک جماعت مین باقی ہین (جو آجکل ہندوستان مین رہتے ہین)۔ چین مین کنفیوشس کے مذہبی اصولون کو بدھ مذہب نے تبدیل کر دیا۔ ہندوؤن ہی مین صرف زمانۂ گزشتہ و زمانۂ حال کے مابین ایک سلسلہ قائم ہے اور گو مذہبی عبادات کے طرق و دستورات مین ایک تغیر عظیم ہوگیا ہے مگر ہندو مذہب کے اصول و اندرونی خیالات آج بھی وہی ہین جو کسی زمانہ مین اُپنشدون اور ویدون مین تھے وہ ہزارہا برس سے مثل ایک ایسے چشمہ کے سوتے ہین جو قرب و جوار کی زمین کو تر و تازہ کرکے اسکو لہلہاتے سبزہ زار سے ڈھک دیتا ہے جس سے اُس مین ایک قسم کی جان پڑ جاتی ہے۔ نظر بر آن ایک طالب العلم کو لازم ہے کہ وہ زمانۂ حال کے ہندو مذہب پر نظر غائر ڈالے تاکہ اُسکو اُن اندرونی خیالات کی جھلک معلوم ہو جس سے وہ (ہندو مذہب) آریہ تہذیب کے زمانہ کے ابتدائی رسوم و اعمال سے وابستہ ہے۔ ہندوستان مین عبادت اور پرستش کا ابتدائی طریقہ قدرت کی پرستش کا تھا۔ قدرتی طاقتون (شکتیون) کو قربانیان چڑھائی جاتی تھین اور انھین کی عبادت کی جاتی تھی۔ آریون کے زمانے کی سب سے قدیم مذہبی کتاب رگ وید ہے اُس مین ایک ہزار اٹھائیس زمزمے ہین جو چار ہزار سال اُدھر ہندو پجاری اپنی عبادتون کے موقع پر گاتے تھے۔ اکاش یعنی خدا کئی نامون سے پکارا جاتا تھا۔ دیو (یعنی روشن آسمان) اندر (مینھ برسانے والا) ورن (آسمان یا اکاش) اندر جنگ کا دیوتا تھا اُس نے آریہ ہندوؤن کو اُن لڑائیون مین مدد دی تھی جو اُن کو سیاہ فام اصلی باشندون سے لڑنا پڑی تھین۔ اُس نے بنی آدم کو آب رحمت پہنچانے کے لیے رعد و برق کے ذریعہ سے بادلون (ورن یا ارلو) کو پھاڑا تھا۔

"ہم اُن بہادرانہ کارنامون کا راگ گاتے ہین جو اندر نے سرانجام کیے تھے۔ اُس نے اہی (ایک اژدہا کا نام) کو مارا اور زمین پر باران رحمت نازل کیا اور پہاڑی چشمون کے بہنے کے واسطے راستہ بنایا۔ اندر نے اہی کو جو پہاڑون پر تھا قتل کیا توشتری نے اُسکے واسطے رعد و برق بنائے تھے پانی سمندر کی جانب اس طرح بھاگا جیسے گائین اپنے بچھڑون کے پاس بھاگتی ہین" رگ وید ۱-۲-۳-۱-۳۲

زیادہ تر موثر اور زیادہ عالی خیال مناجات وہ ہے جو ایک گنہگار ورن سے کرتا ہے جو ہر چیز کو دیکھتا ہے اور جو گنہگارون کو زنجیرون سے باندھتا ہے اور اُن پر رحم کرکے اُن کو چھوڑ سکتا ہے۔

اتھر وید ۵ نمبر ۴-۵-۶

"اے ورن! ہم کو اُن گناہوں سے نجات دے جو ہمارے بزرگوں نے کیے ہیں۔ ہم سے وہ گناہ معاف کر جو ہم نے خود کیے ہیں جیسا ایک بچھڑے کو رسی سے اور ایک چور کو قید سے چھوڑ دیا جاتا ہو اسی طرح مجھکو بھی گناہوں سے نجات دے۔"

"اے ورن! ہم نے اپنی خوشی سے گناہ نہیں کیے ہیں بلکہ غلطی یا شراب یا قمار بازی یا غصے نے ہم کو گمراہ کیا تھا۔ بڑے چھوٹوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ اور نیند بھی گناہ کا رستہ بتاتی ہے۔" رگ وید ۷-۸۶-۵-۶۔

اسی طرح آفتاب کے بھی کئی نام تھے۔ ساوتری یا سورج یا آدتیہ مختلف مہینوں کے سورج کا نام۔ آگ تھا۔ یہ کل دیوتاؤں کا منھ خیال کی جاتی تھی اور آگ پر جو سوم لتا چڑھایا جاتا تھا اسکی بھی پرستش کی جاتی تھی۔ مارت طوفان باد کا نام تھا جو اندر کو بادلوں میں سے پانی نکالنے میں مدد دیتا تھا اور اوشا طلوع آفتاب کی پیاری دیوی ہے جو عام مخلوق کو خواب سے بیدار کرتی ہے۔ اور اُن کی پرورش کرتی ہے اور اُن کو اپنے اپنے کاموں میں بھیجتی ہے۔

"اے آسمان کی خوبصورت لڑکی! اپنی شعاع زرتار کو بلندی پر رکھ ہمکو دولت ثروت دے اور ہم کو روز روشن عطا کر۔ اسلیے کھانا دے صبح کی کرنیں بھیج اے صبح کی سفید پوش دیوی ہمارے واسطے روشنی لا اور شب کی گہری تاریکی کو دور کر۔ ہمارے بزرگوں نے تیرے جلال کا خیر مقدم کیا ہے اور اے تاباک دیوی ہم تیرا خیر مقدم کہتے ہیں کیونکہ تو اپنا رتھ آسمان پر اُسی طرح لیجاتی ہے جس طرح جہاز پانی میں تیرتا ہوا چلتا ہے۔ اے دیوی اپنے چمکتے ہوئے رتھ میں آ اور اپنی فرح بخش روشنی کو دور سے لا اور مثل ایک رقیق القلب عورت کے ہماری پرورش کر کیونکہ اب رات چلی گئی ہے جانوروں اور مویشیوں کو غذا دے اور روز روشن بخش تاکہ وہ خوشی سے بسر کریں۔ عام مخلوقات کو اپنے اپنے کاموں میں لگا اور طیور کو نغمہ سنجی کرنے دے۔" رگ وید ۱-۴۸-۱-۳-۵ و ۵-

زمانہ سلف میں قدرت کی طاقتوں کی مناجات کا یہ سادہ اور پرستش کا یہ عام پسند طریقہ تھا لیکن گو پجاری مختلف دیوتاؤں کو مختلف ناموں سے پکارتے تھے مگر ساتھ ہی اسکے وہ اس امر کو نہیں بھولے تھے کہ یہ سب دیوتا ایک وجود مطلق کے مظہر ہیں جو ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور جو سب کا خالق حقیقی ہے

"خالق مطلق سب سے بڑا ہے وہ سب کو پیدا کرتا ہے اور سب کو قائم رکھتا ہے وہ سب پر قادر ہے مبارک لوگوں کی آرزوئیں آسمان میں پوری ہوتی ہیں جہاں وہ وحدہٗ لاشریک رہتا ہے اور جو ستارہ خرس اکبر کے پرے ہے۔"

"ہمارا باپ وہ ہے جس نے ہم کو پیدا کیا ہے جو کل مخلوق و اشیا کو جانتا ہے وہ ایک ہے گو اُسکے نام بہت ہیں اور لوگ اُسکے جاننے کی خواہش کرتے ہیں۔" رگ وید ۱۰-۸۲-۲ و ۳-

ہندوستان میں وید مذہب کا اندرونی خیال اور اصلی فلسفہ یہ تھا اور گو ہم عام طور سے اِس مذہب کی نسبت کہہ سکتے ہیں کہ وہ قدرت کی مختلف قوتوں کے اُنکے مختلف ناموں سے پرستش اور عبادت کی تعلیم کرتا تھا مگر ساتھ ہی اُسکے ہم کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اُس زمانہ میں بھی ہندو لوگ قدرت کے ظاہری مشاہدات اور مظاہر میں گھس کر اس ایک طاقت (قادر مطلق) کے خیال کو پہنچ گئے تھے جس کی نسبت زمانہ حال کی سائنس بھی یہی کہتی ہے کہ وہی تمام عالم کو حرکت دینے والی اور اسکو قائم رکھنے والی ہے۔

اسی وحدانیت کے اصول کو جو تبدیل پذیر مشاہدات قدرت میں مخفی ہے اُپنشدوں میں جاکر پوری نشو و نما حاصل ہوئی جو وید کی تعلیم کا آخری نتیجہ ہیں وہ ایک حاضر و ناظر روح مطلق ہے جو اپنے آپ کو تمام عالم میں ظاہر کرتی ہے۔ جسمیں تمام عالم شامل ہے اور جسمیں انجام کار تمام عالم غرق ہوجائیگا۔

وہ عقل جس کا جسم روح ہے جس کی شکل روشنی ہے جس کی ماہیت

آکاش (یہ پانچوان عنصر ہو جو ہوا سے بھی زیادہ لطیف ہو) کے مانند ہو جہان سے کل کام، کل خواہشین، کل خوشبوئین اور ذائقے پیدا ہوتے ہین وہ جس مین یہ سب شامل ہو اور جو نہ کبھی بولتا ہو اور نہ کبھی متحیر ہوتا ہو۔

"وہ دل کے اندر روح ہو جو چاول کے دانے سے بھی چھوٹی ہو۔ جو جَو کے دانے سے بھی چھوٹی ہو اور جو دانے کے عشر سے بھی چھوٹی ہو وہ میرے دل مین بھی ہو اور وہ زمین سے بڑی ہو آسمان سے بڑی ہے اور تمام دنیا سے بڑی ہو۔"

"وہ جس سے تمام کام، تمام خواہشین، تمام خوشبوئین اور ذائقے پیدا ہوتے ہین، وہ جس مین یہ سب شامل ہین وہ جو کبھی نہین بولتا ہو اور کبھی نہین متحیر ہوتا ہو وہ میری روح میرے دل مین ہو جسکا نام برہم ہو۔ جب مین یہان سے کوچ کرون گا تو مجھکو وہ حاصل ہوگا۔ (چھندوگ اُپنشد ۳-۱۴-۱۴)

اور جب پُرانے زمانون کے غیر معین تصورات و تخیلات سے نکلکر سن عیسوی سے کئی صدی قبل ہندو فلسفہ کو پوری نشو و نما حاصل ہوئی اُس وقت ویدانت کے فلاسفی نے اِس اصول اعظم کو اختیار کیا جو کئی صدی قبل سے چلا آتا تھا اور اس کو مابعد کے ہندو خیالات کا ایک دائمی اصول قائم کیا۔

"سمندر ایک ہو وہ اپنے پانی سے مختلف نہین ہو مگر لہرین جھاگ قطرے اور اسکے دیگر حصص ایک دوسرے سے مختلف ہین۔ اسی طرح پر کل مخلوق ایک دوسرے سے مختلف ہو گر ان سب کی وجہ تخلیل علت العلل ہو۔ برہم سوتر ۲-۱-۱۵۔

"جو شکل آفتاب کے درحقیقت ایک ہو مگر عکس سے بظاہر معلوم ہوتا ہو کہ کئی ہین اور جو شکل سطح کے درحقیقت حصون مین تقسیم نہین ہو حالانکہ ظاہر مین ایسا ہی معلوم ہوتا ہو نور مطلق ایک کامل نور ہی جو منتشر و منقسم نہین ہو سکتا۔ برہم سوتر ۳-۲-۱۸

مگر اس سے یہ نہین خیال کرنا چاہیے کہ اس حکیمانہ اصول مین عوام کے عقائد شامل ہین بخلاف اسکے قدرت کی طاقتون کو جسکے مختلف نامون سے بہ حیثیت مختلف دیوتاؤن کی پرستش کی جاتی تھی قربانی چڑھانے کا پُرانا دستور وید کے زمانے سے (جو حضرت عیسی کے زمانے سے دو ہزار برس قبل تھا) اُن صدیون تک جاری رہا جو سن عیسوی کے ماقبل گزری تھین۔ اسمین شک نہین کہ جو جو صدیان گزرتی گئین یہ قربانیان زیادہ مستحکم اور نمائشی ہوتی گئین اور چونکہ پجاریون نے اپنی ایک علحدہ اور موروثی قوم قائم کی لہذا انھون نے بہت سے رسوم اور قواعد بنائے اور اس زمانہ کی مذہبی کتابون مین زیادہ تر قربانی کے تفصیلی حالات لکھے ہوے ہین۔ ابتدائی وید کے زمانے کے سادہ عقائد کسی قدر ظاہری اور نمائشی رسوم مین تبدیل ہو گئے اور یہ کل متبرک رسوم آریہ ہندوؤن پر محدود تھے۔ لاکھون غیر آریہ لوگ جنھون نے اپنے آریہ معلمون اور فرمانرواؤن کی تہذیب، زبان اور نیز مذہبی عقائد کو اختیار کر لیا تھا متعصبانہ خیال سے وید کے رسوم اور متبرک قواعد مین شریک نہین کئے جاتے تھے۔ اس طرح قلیل التعداد آریہ ہندوؤن اور کثیر التعداد غیر آریون مین جنھون نے اول الذکر کے طریق اختیار کئے تھے ایک عظیم اور قابل افسوس فرق برپا ہو گیا اور امتداد زمانہ کے ساتھ وہ مستحکم ہوتا گیا۔ ایک طرف تو آریہ جماعتین اس غرور اور تفریق کی وجہ سے جو زمانہ سلف اور زمانہ حال کی مہذب فاتح نسلون مین ہوتا ہو اپنے استحقاق کو غیر آریون کے خلاف محفوظ کرتی تھین دوسری جانب غیر آریہ نسلون نے آریہ تہذیب اور رسم و رواج کا بار پہن لیا اور مگدھ اور دوسرے صوبجات مین ملکی طاقت حاصل کرکے چاہا کہ وہ بھی اس دلفریب حلقہ (آریون کا حلقہ) مین شامل کئے جائین۔ اس مشکل کو حل کرنے کی ضرورت ہوئی۔ زمانے کو ایک ایسے شخص کی ضرورت ہوئی جو حالت معاملات کو ہموار کرے اور اس کام کے واسطے ایک شخص پیدا ہوا جسکا

نام گوتم بودھ تھا۔

حضرت عیسیٰ سے چھ صدی قبل ہندوستان میں بودھ مذہب نے عروج حاصل کیا۔ گوتم بودھ اپنے آپکو کسی جدید مذہب کا بانی نہیں خیال کرتا تھا۔ بلکہ اس کا قول تھا کہ وہ اصل ہندو مذہب تلقین کرتا ہے۔ وہ ایک ایسا ریفارمر تھا جو اپنے اصلاح کردہ مذہب کے دائرہ میں ہر قوم اور ہر نسل کے لوگوں کو بخوشی داخل کر لیتا تھا۔ اس کا مذہب اسی تزکیۂ نفس اور صفائے باطن اور تقدس کی تعلیم کرتا ہے جو اگر اُس جنم میں نہ حاصل ہو تو آئندہ جنموں میں حاصل ہو جائے گا۔ دیوتا انسان۔ اور عام مخلوق تقدس کے درجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اسکے حاصل کرنے کے واسطے بار بار جنم لیتے ہیں۔ اس جنم کا ہر کرم یا فعل دوسرے جنم میں اپنے اصلی نتیجہ کو دکھاتا ہے اور جب بالآخر متواتر تزکیۂ نفس سے وہ تعلق جو ہمکو زندگی کے ساتھ وابستہ کیے ہوئے ہے منقطع ہو جاتا ہے تو ہم اس مبارک حالت تقدس یا اُس نروان کو جو بودھ کی جنت ہے حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ تمام اصول پُرانے ہندو اُپنشدوں سے لیے گئے ہیں مگر گوتم بودھ نے اپنے اصول کی تلقین ہر شخص اور ہر قوم کو کی اور اس طرح اُس نے ایک ایسے عالمگیر مذہب کی اشاعت کی جس نے بالآخر سیلون سے لیکر سیبریا تک اور کشمیر سے لیکر چین و جاپان تک ایشیا کی اقوام کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

اس تزکیۂ نفس اور حصول نجات کے مذہب میں خاصکر اخلاقی مواعظ و نصائح بکثرت پائے جاتے ہیں اور بلحاظ اخلاقی رفعت و عظمت بودھ سے کوئی فوق نہیں لے گیا ہے۔ ہم ذیل میں پند و نصائح کا اقتباس کرتے ہیں۔

"۵۔ نفرت نفرت سے کبھی نہیں دور ہو سکتی۔ نفرت محبت سے دور ہوتی ہے۔ اس کی یہی خاصیت ہے۔"

"۵۱۔ ایک شخص کی عمدہ نصیحت جسپر وہ عمل نہیں کرتا ہو ویسی ہی ہے جیسے ایک خوشنما اور خوش رنگ پھول ہو مگر اُس میں خوشبو نہیں ہے۔"

"۱۲۹۔ سب لوگ سزا کے نام سے کانپتے ہیں سب جگ موت کے نام سے ڈرتے ہیں۔ یاد رکھو کہ تم بھی اُنھیں کی طرح ہو پس نہ کسی کو قتل کرو اور نہ کسی کو ایسا کرنے کی ترغیب دو۔"

"۱۳۰۔ سب جگ سزا کے نام سے کانپتے ہیں سب لوگ جان کو عزیز رکھتے ہیں یاد رکھو تم بھی انھیں کی طرح ہو نہ کسی کو ہلاک کرو اور نہ کسی کو ایسا کرنے کی ترغیب دو۔"

"۱۸۳۔ رشیوں اور منیوں کی ہدایت ہے کہ گناہ نہ کرو نیکی کرو اور اپنے باطن کو صاف رکھو۔"

"۱۹۷۔ ہم لوگوں کو خوشی سے زندگی بسر کرنا چاہیئے جو لوگ ہم سے نفرت کرتے ہیں اُن میں ہم کو اس طرح رہنا چاہیئے کہ نفرت ہمارے پاس سے چھو نجائے۔"

"۲۲۳۔ غصہ کو نرمی سے دور کرنا چاہیئے طامع کو فیاضی سے اور جھوٹے کو سچائی سے فتح کرنا چاہیئے۔"

"۲۵۲۔ دوسروں کی بُرائی تو بہت آسانی سے معلوم ہو جاتی ہے مگر اپنی بُرائی معلوم کرنا بہت مشکل ہے۔ ہر شخص اپنے ہمسایہ کی ذرا ذرا سی بُرائیوں کو اُچھالتا ہے مگر اپنی بُرائیوں کو اس طرح چھپاتا ہے جس طرح فریبی [illegible] کو قمار باز سے پوشیدہ کرتا ہے۔"

"۲۶۰۔ بال سفید ہونے سے انسان بزرگ نہیں ہوتا ہے گو کہ اُسکی عمر پوری ہو گئی ہو مگر اُس کو کہن سال کہنا بیکار ہے۔"

"۲۶۱۔ بزرگ وہ شخص ہے جس میں عقل، راستی، محبت، ضبط اور اعتدال ہو اور جو بُرائیوں سے پاک ہو۔"

"۳۹۳۔ کوئی شخص نسب یا خاندان کی وجہ سے برہمن نہیں کہلا سکتا۔ وہی شخص مبارک ہے اور وہی برہمن ہے جس میں سچائی اور دینداری ہے۔"

۳۴۹۔ اے نادان چکنے بالوں یا بکری کی کھال کی پوشاک سے کیا فائدہ جو تیرا باطن تو خراب ہو اور ظاہری صورت کو صاف بناتا ہو۔ (دھمپدا)

اس قسم کے مقولوں کی جانب بہت سی اقوام اور انسانوں کے خیالات رجوع ہوئے۔ حضرت عیسیٰ کی ولادت سے کئی صدی پہلے بودھ مذہب کے واعظ اور رہبان دور دراز ممالک فلسطین مصر یونان تک گئے اور وہاں کے لوگوں نے اُن کی تعلیمات اور تلقینات کو بغور سنا اور حضرت مسیح نے پھر ایک مرتبہ اُسی تحمل سخاوت، عفو اور محبت کے مذہب کی اشاعت کی جسکی اشاعت پانچسو سال قبل گوتم بودھ نے کی تھی۔ ہندوستان میں آریہ ہنود کا قدیم اور علیحدہ مذہب گوتم کے اصلاح کردہ اور عام مذہب کے ساتھ ہزار سال تک قائم رہا۔ برہمن اور آریہ قومیں اپنے قدیم استحقاق پر قائم رہیں مگر ہیچ اقوام کے لاکھوں اشخاص اُس دروازے میں داخل ہوئے جو اُس روشن ضمیر ریفارمر نے کھولا تھا۔ حضرت عیسیٰ کے قبل تیسری صدی سے لیکر اُنکے بعد ساتوین صدی تک ہندوستان کے ہر شہر میں ہندوؤن کے متبرک مقامات اور بودھوں کی خانقاہیں تھیں۔ ایک ہی گانوں میں ہندو اپنی قربانی کرتے تھے اور بودھ اپنے رسوم اور اعمال ادا کرتے تھے۔ ہندو اور بودھ صدیوں تک ایک مقام میں امن امان اور میل جول کے ساتھ رہے۔ ہندوؤن کی بے تعصبی کی ایک قابل غور خیال یہ ہو کہ ہزار سال کے اندر دیا سمجھا سے اس امر کے کسی جنگ آزما یا حملہ آور نے اپنی فتوحات میں ظلم کے کام کیے ہوں، ہم کو مذہبی ایذا رسانی کی کوئی مثال نہیں ملتی ہم مفرقوں کے عقائد اور مذاہب علیحدہ علیحدہ تھے مگر وہ باہم بڑی امن امان اور میل جول سے رہتے تھے۔

عام طور سے یقین کیا جاتا ہو کہ اب بودھ مذہب ہندوستان سے مفقود ہو گیا ہو کیونکہ اُس کو ہندو مذہب کی مستحکم عمارت کے مسار کرنے میں ناکامی ہوئی مگر نتیجہ بالعکس ہو۔ ہاں بودھ مذہب ہندوستان سے مفقود ہو گیا کیونکہ وہ اپنا کام انجام دے چکا تھا۔ ہندو متحد ہو گئے۔ ہندو مذہب نے رسوم اعمال کو قبول اور اختیار کر لیا ہو۔ اب آریہ اور غیر آریہ کا کوئی فرق باقی نہیں رہا پنجاب سے لیکر تراونکور تک (گو وہ بلحاظ پیشون کے مختلف ذاتون میں منقسم ہیں) تمام ہندو ایک ہی مذہب کے پیرو ہیں اور ایک ہی قسم کے رسوم و اعمال ادا کرتے ہیں ویدک زمانے کی قربانیاں جن سے غیر آریہ بوجہ تعصب خارج کیے گئے تھے اس علحدگی کی سبب سے یا تو بالکل معدوم ہو گئیں یا اب وہ صرف شادی یا غمی کے رسوم میں مستعمل ہیں جنکو ہر ہندو ادا کر سکتا ہو۔ بودھ مذہب کے رسوم و جاتروں کی تقلید کی گئی اور اُن سے زمانہ حال کے ہندو مذہب کے رسوم و اعمال سبقت لے گئے اور خود گوتم بودھ زمانہ حال کے ہندو اوتاروں کے طبقے میں داخل ہوئے۔ ہندوستان میں بودھ مذہب کی تاریخ کو سمجھنے کے واسطے اُن امور کا یاد رکھنا ضروری ہو۔ بودھ مذہب ہندوستان سے چلا گیا کیونکہ وہ اپنا کام ختم کر چکا تھا۔ زمانہ حال کے ہندو مذہب نے قدیم قربانیوں اور آریوں کے خاص اعمال و عبادات سے احتراز کیا ہو اور اُس نے آریوں اور غیر آریوں کو بھی متحد و متفق کر لیا ہو۔ ہندوستان میں گوتم بودھ کی کوشش کے یہ نتائج ہیں۔

اس طرح حضرت عیسیٰ کے بعد چھٹی و ساتوین صدی میں ہندوستان میں ہندو مذہب اس جدید طریقے سے شروع ہوا اسکے خاص خاص اصول وہی ہیں جو اُپنشدوں میں بیان ہوئے ہیں۔ وہ ایک وجود مطلق کو مانتا ہو جو حاضر و ناظر ہو۔ اس کا عقیدہ ہو کہ کائنات وجود مطلق سے پیدا ہوئی ہو اور بالآخر اُسی میں فنا ہو جائے گی۔ اُس کا یہ بھی عقیدہ ہو کہ اس جنم کے افعال کی سزا و جزا آئندہ جنم میں ملیگی اور نیز یہ کل روحیں بالآخر وجود مطلق میں جذب ہو جائیں گی اس عقائد کے لحاظ سے آج کا مذہب وہی ہو جو تین ہزار سال قبل تھا لیکن بلحاظ رسوم و اعمال و عام عقائد کے زمانہ حال کا ہندو مذہب ویدک زمانے کے مذہب سے نہایت مختلف ہو۔ ویدک کے

زمانے کے مذہب مین قدرت کی طاقتون کی پرستش پر زور دیا گیا ہو
زمانۂ حال کے ہندو مذہب مین قادر مطلق کی تین قدرتون کی تلقین کی گئی ہو جو تثلیث اہل ہنود کے نام سے مشہور ہین۔ اِن قدرتون کے نام برہما، بشن اور مہیش ہین۔ وید کے بھجنون مین قدرت کے دیوتاؤن کے کامون کی تعریف ہی۔ زمانۂ حال کے ہندو مذہب مین ان دیوتاؤن کے متعلق کثیر التعداد افسانے و قصے گڑھے گئے ہین۔ وید مذہب کی پرستش کا طریقہ یہ تھا کہ آگ کو قربانی چڑھائی جائے۔ زمانۂ حال کا ہندو مذہب بت پرستی کی تلقین کرتا ہو اور وہ فرحت بخش رسوم و اعمال و زیارتگاہون مین چلنے سے خوش ہوتا ہو۔

ہنود اور مختلف فرقون کے مذہبی رسوم و اعمال کے بارے مین بہت کچھ لکھا گیا ہو جو ہندوستان مین ایک ہزار برس سے جاری ہین۔ مگر ان عام پریشان بیانات مین ہم کو پھر وہ اصل چیز نہین ملتی ہو جو دس کروڑ لوگون کو متحد کیے ہوے ہو یعنی ہم کو اس مذہب کا اصلی جزو نہین معلوم ہو جو اب تک آجکل کے ہندوؤن کے دلون مین جاگزین ہو اور جو ان کو ایک زندہ قوم بنائے ہوے ہو۔ یہ سچ ہو ہندوستان کے باشندے شیوی اور وشنوی فرقون مین منقسم ہو گئے مگر ان مختلف فرقون مین محض نام کی بابت جھگڑا ہی جیسا کہ یورپ مین قرون وسطیٰ مین ہوتا تھا ہر فرقہ اپنے معبود کے نام سے وجود اعظم کی (شخصی خدا) پرستش کرتا ہو جو اپنے مخلوق کی ضروریات رفع کرتا ہو پیروانِ بشن کا اعتقاد ہو کہ خالق حقیقی نے انسان کی نجات اور راستی کو غالب کرنے کے واسطے اس زمین پر رام، کرشن یا بودھ کی شکل مین جنم لیا۔ اور اسطرح عبد اور معبود کے تعلقات مین قربت ہوئی اور وید کے زمانے کی طرح وہ معبود کو ایک ذاتی فیاض اور معاون دوست کی طرح خطاب کرنے لگا۔ کیونکہ عام لوگون کو ایک ایسے معبود کی ضرورت تھی جو بہ نسبت اُپنشدون کی روح مطلق کے زیادہ تر نزدیک ہو جسکا تعلق صاف صاف سمجھ سکے اور اِس ضرورت کو کرشن نے رفع کیا جس کو بودھ نے صدیون تک رفع کیا تھا کرشن کے افسانون نے بودھ کی پیدائش قصون اور کہانیون کو مٹا دیا اور بجاے بودھون کے متبرک مقامات کے متھرا، بندرابن، اور جگناتھ کی جاترائین قائم ہوئین اور بودھون کی خلوت گزین زندگی کے بجاے اِس قسم کی زندگی کا طریقہ شنو یا کرشن کے مقلدین مین قائم ہوا۔ ہندوؤن کا مذہبی جذبہ کئی صدیون سے ایک سادہ اور عام پسند طریقہ وحدانیت کی جانب کوشش کر رہا ہو۔ اور تنازعات فرقی اور کثیر التعداد بتون کی پرستش کے باوجود لاکھون ہندو پوشیدہ وحدانیت کے طریقۂ پرستش پر قائم رہے ہین یہ ایک ذاتی فیاض اور معاون معبود کا عقیدہ ہو جسکو ہندو پجاری شیو یا بشن کے نام سے پکارتا ہو۔

زمانۂ حال کے ہندو ریفارمرون کے جلیل القدر طبقہ مین اول شخص رامانج تھا۔ وہ گیارھوین صدی مین جنوبی ہندوستان مین پیدا ہوا اُس نے تلقین کی کہ خدا ایک ہو اُس کا نام بشن ہو اُس نے یہ بھی تعلیم کی کہ نجات کا ذریعہ عشق الٰہی ہو فرقون کی مخالفت کی وجہ سے اس کو وطن سے بھاگنا پڑا اور مثل دیگر نبیون کے اُس کی بھی عزت وطن کے باہر ہوئی۔ میسور مین اُس نے بادشاہ اور رعایا کو اپنا پیرو بنا لیا اور مرنے سے پہلے عقیدۂ بشن کے طریقے مین سات سو خانقاہین قائم کین۔

سلسلۂ ریفارمران مین رامانج کے بعد پانچوان نمبر رامانند کا ہے جس نے وحدانیت کے سادہ طریقہ کو شمالی ہند مین پھیلایا۔ اُس نے بنارس کو اپنا صدر مقام قرار دیا تھا گر وہ اس مذہب کی تلقین کے واسطے نزدیک و دور ہر مقام کو جاتا تھا۔ بخلاف اپنے پیشرو کے جس نے سنسکرت زبان مین کتابین لکھی تھین اُس نے اپنے زمانے کی زبان مین وعظ دیے اور اُسی زبان مین کتابین بھی لکھین۔ اور شمالی ہند کی ہندی زبان اُس برگزیدہ اور رہبر دلعزیز ریفارمر کی آغاز کی ہوئی عظیم مذہبی تحریک

ادیان مین
کس طرح قدیم مذاہب
کی وجہ سے بہت دولتمند ہوگئی۔

ہندوستان کی مذہبی اصلاح کی تاریخ مین کبیر کی طرح کوئی شخص مشہور نہین ہے۔ رامانند کا مرید تھا۔ اُس نے اپنے مرشد کے آغاز کیے ہوئے کام کو ہاتھ مین لیا۔ اُس کے دل مین یہ دلیر خیال پیدا ہوا تھا کہ ایک خدا کی پرستش مین اہل ہنود اور اہل اسلام دونون کو متحد کیجیے۔ وہ کہتا ہے کہ ہندوؤن کا خدا وہی ہے جو مسلمانون کا ہے خواہ اُس کو رام کہو خواہ اللہ کہو۔ منھ و صحیفے مالا پھیرنے، متبرک دریاؤن مین نہانے مندرون مین سجدہ کرنے سے کیا فائدہ ہے؟ اگر مناجات پڑھتے وقت یا جاترا کو جاتے وقت تمھارے دل مین مکر و فریب رہا ہے؟ اگر اللہ جل شانہ مسجدون مین رہتا ہے تو تمام جہان کس کا مسکن ہے؟ ہندوؤن کے خدا کا شہر بنارس ہے مسلمانون کے خدا کا شہر مکہ ہے لیکن اپنے دلون مین تلاش کرو اور وہان تم کو ہندو اور مسلمان دونون کا خدا ملے گا۔

کبیر نے جو کچھ وسط ہندوستان مین کرنا چاہا تھا اُسی کے کرنے کی کوشش نانک نے پنجاب مین کی تھی وہ ۱۴۶۹ء مین ہندوستان مین پیدا ہوا تھا لہٰذا وہ مارٹن لوتھر کا ہمعصر تھا اُس نے تلقین کی کہ ہندو و مسلمان مل کر ایک خدا کی پرستش اور عبادت کرین سکھون کی بڑی جماعت جس کی بنا اُس نے ڈالی تھی عرصہ دراز تک ایک صلح پسند اور مذہبی برادری رہی مگر بعد کے بعض واقعات نے اُن کو زمانہ حال کے ہندوستان کی سب سے جنگجو نسل بنا دیا۔

بنگال کا مذہبی ریفارمر چیتن تھا جو ۱۴۹۶ء مین پیدا ہوا تھا اُس نے بھی یہی تلقین کی کہ ہندو اور مسلمان باہم مل کر ایک خدا "وشنو" کی پرستش کرین۔ آجکل بنگال کی کل آبادی باستثنائے اعلیٰ اقوام کے وشنو کی پرستش کرتی ہے گجرات مین بھی ایک ریفارمر پیدا ہوا جسکا نام دادو تھا اُس نے بہت سی متبرک تصانیف چھوڑی ہین جن مین بیس ہزار اشعار ہین۔ ہندوستان کے مذہبی عقائد کا چشمہ ابھی تک خشک نہین ہوا ہے۔ گذشتہ صدی مین عظیم الشان رام موہن رائے اور دیانند سرستی نے ایک مرتبہ پھر اپنے ملک کے لوگون کو ذات واحد کی پرستش کی تلقین کی اور تمام ہندوستان مین اہل الرائے اور سرگرم لوگ زمانہ گذشتہ کی طرف توجہ مبذول کر رہے ہین اور اپنی قدیم مقدس کتابون اور قدیم فلسفہ کے مطابق اپنے مذہب و سوشل رسم و رواج مین اصلاح کرنے کی کوشش کر رہے ہین۔

ہندوستان کی قدامت پر جان دینا غیر لوگون کے واسطے ایک معما ہے تاریخ نسل انسان مین نہایت حیرت انگیز امر ہندوستان کے قدیم مذاہب و رسوم و اعمال کا وہ سلسلہ ہے جو آغاز زمانہ تاریخ سے لیکر زمانہ حال تک نہ حکومت کی تبدیلیون سے شکست ہوا اور نہ اُس مین یونانیون یا تورانیون مسلمانون یا عیسائیون کے خارجی اثر سے کوئی اثر پڑا۔ اور اگر ہم اُن پوشیدہ قوتون کے سمجھنے کی کوشش کرین جو قدیم ہندو خیالات مذہب اور فلسفہ کو قائم رکھے ہوئے ہین تو بھی ہمارے ذہن مین یہ امر صاف صاف نہین آسکے گا۔

قدیم ہندوؤن کے آلات موسیقی

زمانۂ موجودہ مین جب کہ شادی بیاہ کے جلسون اور محفل رقص و سرود مین انگریزی آلات موسیقی کا رواج عام ہوتا جاتا ہی بہت کم لوگون کو معلوم ہوگا کہ زمانۂ قدیم کے ہندوؤن مین اس قسم کے آلات کم و بیش مکمل حالت مین موجود پائے جاتے تھے یون تو اسیریا اور بابل کے قدیم باشندون مین بھی بعض آلاتِ موسیقی ایسے موجود تھے جنھین زمانۂ حال کے آرکیسٹرا کا بدل قرار دیا جاسکتا ہی اور قدیم مصری بھی اس فن سے ناواقف نہ تھے تاہم ہندوؤن نے اُن آلات کو جو ترقی دی وہ اُن کی شاندار تہذیب کے ہر طرح متناسب تھی اور یہی باعث ہی کہ اہل مغرب نے اکثر جدید آلات کی تیاری مین اُنھین قدیم باجون سے مدد لی ہی۔ ستار کی قسم کے آلات موسیقی تمامتر اہل ہند کی ایجاد ہین اور یہ بات کہ ایک ہی آلہ مین مختلف تارون پر اُنگلی کا دباؤ ڈال کر مختلف سُر پیدا کیے جاسکتے ہین اہل ہند کے کمالات موسیقی کا ایک ادنیٰ نمونہ ہی۔

ہندوؤن کی مذہبی کتب کے مطالعہ سے پایا جاتا ہی کہ ان مین یگیہ میدان جنگ، شاہی جلوس اور رنت دار کیرتن (رقص و سرود) کے موقعون کے لیے جدا جدا آلات موسیقی ہوا کرتے تھے۔ ماگھوی بودھ کے مصنف نے ایک سرتنی کا حوالہ دیا ہی جس مین مذکور ہی کہ یگیہ کے موقع پر بین (وینا) اور ونڈھی (ایک قسم کا طبلہ) سے کام لیا جاتا تھا۔ ڈھول، بانسری اور سنکھ کے رواج کا پتہ یجر وید مین بھی چلتا ہی۔ اس سے معلوم ہوتا ہی کہ ہندوؤن مین مذہبی مراسم کے موقعون پر مختلف آلات موسیقی سے کام لینے کا رواج زمانۂ قدیم سے چلا آتا ہی۔

ماہران علم موسیقی نے ہندوؤن کے آلات موسیقی کو چار مختلف اقسام پر منقسم کیا ہی:

(۱) تتھ یعنی اس قسم کے آلات جن مین تار لگے ہوئے ہون۔

(۲) ونذھ۔ ڈھول اور طبلہ کی قسم کے آلات۔

(۳) سشر۔ ہوا کی مدد سے بجنے والے آلات مثلاً بانسری سنکھ وغیرہ۔

(۴) گھن۔ ضرب سے بجنے والے آلات مثلاً جھانجھ۔ گھنٹے وغیرہ۔

افسوس کہ یہ تقسیم زمانۂ مابعد مین قائم نہین رہ سکی کیونکہ زمانۂ حال کا ہارمونیم اگرچہ ایک ایسا آلہ ہی جسکے بجانے مین ہوا سے مدد لیجاتی ہی مگر اسے سشر قسم کے آلات موسیقی مین داخل نہین کیا جاسکتا۔

تار دار آلات موسیقی مین سے بین بہترین قسم کا آلہ ہی ہندوستان مین اسکا استعمال بہت زیادہ ہی۔ نارد رشی کی نسبت مشہور ہی کہ وہ بین کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے۔ سرسوتی کو بھی جو ہندوؤن مین علم کی دیوی ہے بحر موسیقی مین ایک بین پر ہی کھڑا دکھایا گیا ہی جو سطح آب پر تیر رہی ہی۔ اسی سلسلہ مین یہ بیان کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہو گا کہ آتریہ ارنیک مین جس بین کا ذکر کیا گیا ہے وہ اس سے زیادہ ابتدائی قسم کی ہی جو ہندوستان کے زمانۂ عروج مین مستعمل تھی اس بین مین ایک کھوکھلا کدو جھلی سے منڈھا ہوا لگا ہوتا تھا۔ آتریہ ارنیک مین اس آلہ کی کیفیت نہایت دلچسپ پیرایہ مین جو استعارات سے پُر ہی بیان کی گئی ہی۔ زمانۂ حال کی سارنگی کو اسی قدیم آلہ کا تتمہ قرار دینا کچھ بیجا نہو گا۔

زمانۂ حال کی بین دو قسم کی ہوتی ہی:-

(۱) سُرتی بین۔

(۲) سود بین۔

ان مین سے اول الذکر ۲۲ سرتیون کی تفہیم کا کام دیتی ہی۔ آخر الذکر کے متعلق کپتان ولرڈ بیان کرتے ہین کہ:

یہ ایک نہایت مکمل اور موثر آلہ ہی۔ اگر کوئی عمدہ بین کسی ماہر گویے کے ہاتھ مین ہو تو بہترین قسم کے پیانو سے کم نہین ہوتی ہی فی الحقیقت ہندوستانی موسیقی کے اُلٹ پھیر کے لیے یہ آلہ بہترین سمجھا جا سکتا ہی۔ یہ آلہ ایسا مکمل ہوتا ہی کہ کسی تار پر ذرا سا غیر ضروری دباؤ بھی اسکی آواز مین فوراً اختلاف پیدا کر دیتا ہی چونکہ آواز مین ہر قسم کی تبدیلی پیدا کرنا بجانے والے کے اختیار مین ہوتا ہی اسلیے اسکی آواز سامعین کو نہایت خوشگوار محسوس ہوتی ہی۔ وائلن کو جو فوقیت باقی آلات موسیقی پر حاصل ہی وہ بھی محض اسی وجہ سے ہی۔

بین مین بالعموم سات تار ہوتے ہین۔ چار اوپر اور تین پہلو مین۔ موسیقی دانون نے اس آلہ کی مختلف قسمین بیان کی ہین۔

(۱) ایک تنتری جس مین صرف ایک تار ہوتی ہی یہ آلہ عابدون کے لیے مخصوص ہی لیکن عام طور پر گداگر اس پر گا کر بھیک مانگتے پھرا کرتے ہین۔

(۲) نکل۔ اسمین دو تار ہوتے ہین۔

(۳) تری تنترکا۔ اسمین تین تار ہوتے ہین۔

(۴) چتر۔ یہ سات تار والی بین کہلاتی ہی۔

(۵) وپنچی۔ اسمین نو تار ہوتے ہین۔

(۶) ست کوکلا۔ اسمین اکیس (۲۱) تار ہوتے ہین، اور اسکا عام نام سورمنڈل بھی ہی۔

ان کے علاوہ ایک قسم اور بھی ہوتی ہی جسے پناکی کہتے ہین اور اسے قوس کی مدد سے بجایا جاتا ہی یہ آلہ زمانۂ حال کے انگریزی آلہ وائلن سے مشابہ ہوتا ہی۔

ہوا کی مدد سے بجنے والے آلات کی جنھین سشر کہا جاتا ہی اور جنکی بہترین نظیر زمانۂ حال کی بانسری ہی کئی قسمین ہین جنمین سے بعض کے نام حسب ذیل ہین: ونس۔ پو۔ پوکا۔ مُرلی۔ مدھ کری۔ پنالی۔ تمبوکن چنگ۔ سرنگ۔ سنکھ وغیرہ۔ ونس سے مراد بانسری سے ہی اور اگرچہ عام طور پر وہ لکڑی کی بنی ہوئی ہوتی ہی تاہم زمانۂ قدیم مین بانس، صنوبر کی لکڑی، ہاتھی دانت، فولاد، کانسہ، چاندی اور سونے کی بانسریاں بھی بنائی جاتی تھین۔ بانسری کی بجائے خود بہت سی قسمین بیان کی گئی ہین جنمین سب سے چھوٹی کا نام اُدماکھی اور سب سے بڑی کا اشٹ منگل (۱۸ انگل) ہی۔ باقی اقسام کے نام انکی لمبائی وغیرہ کے اعتبار سے تری پرش، چترنگ، دیج دکتر، شن مکھ، منی، ادسوا گورو، آدتیہ وغیرہ ہین۔ پو شکل و صورت مین ۹ انچ لمبی ونس کی طرح ہوتی تھی مگر اسکے اوپر پیتل منڈھ دیا جاتا تھا۔ پوکا کی لمبائی ۱۰۔۱۲ انچ ہوتی تھی اور اسمین سُرون کے لیے پانچ سوراخ ہوا کرتے تھے۔ شاید اسکی موجودہ صورت وہ آلہ ہی جسے سپیرے بجایا کرتے ہین اور جسے لوگ غلطی یا غلط فہمی سے بین کہنے لگے ہین۔ مُرلی کا نام سری کرشن جی، آنند کند، اور گوپیون کی رس لیلاؤن کی بدولت اسقدر معروف ہو چکا ہی کہ کسی مزید توضیح کی ضرورت نہین۔ سرنگا سے مراد نرسنگھے سے ہی جو بیل یا بھینسے کے سینگ کا بنا ہوا ہو اس سے عام طور پر شاہی جلوسون، مندرون کی پوجا یا تہوارون مین کام لیا جاتا ہی۔ گڈریے بھی اکثر اسے بجایا کرتے تھے۔ سنکھ کا رواج آج تک مندرون اور دھرم شالاؤن مین پایا جاتا ہی۔

اونَدھ قسم کے آلات سے مراد ڈھول اور تاشہ کی مختلف اقسام سے ہی۔ ان آلات کی بجائے خود دو قسمین ہوتی ہین۔ ایک وہ جن پر جھلی منڈھی ہوئی ہو جیسے ڈھول۔ طبلہ۔ نقارہ وغیرہ اور دوسری قسم وہ جو صرف ہاتھ کے بنے ہوئے ہون، مثلاً جھانجھ۔ گھڑیال وغیرہ۔ نقارہ کا نام پہلے سنسکرت مین پٹکر تھا لیکن بعد مین سنگیت رتناکر کے مصنف نے اسکا نام مردنگ، مردال یا پچ رکھ دیا۔ مردنگ کا رواج آجتک کسی نہ کسی صورت مین موجود ہی اور اسکے متعلق کسی قسم کی تفصیلات مین پڑنا تحصیل حاصل ہوگا۔

ٹپاہ اسی مردنگ کی زیادہ قدیم صورت کا کام ہوا کرتا تھا۔ سنگیت رتناگر کا مصنف بیان کرتا ہو کہ ناٹک کے موقع پر ٹپاہ کے صرف ایک پہلو سے کام لیا جاتا تھا اور اس کے بجانے مین دونون ہاتھ حرکت مین آتے تھے۔ ظن غالب ہے کہ زمانۂ حال کا طبلا اسی ایجاد کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہو۔ گھٹ سے مراد گڑے سے ہو اور پنجاب مین لوگ ابتک اسے بڑے سُرتال کے ساتھ بجاتے دیکھے جاتے ہین اس کی پُرانی اور نئی وضع میں فرق صرف اسقدر ہو کہ پہلے اسکے مُنھ پر جھلّی منڈھ دی جاتی تھی۔ مگر آج کل ایسا نہیں کیا جاتا۔

نقارہ کی بھی بہت سی قسمین ہوا کرتی تھین۔ گھوس۔ دھوس۔ دھک۔ منڈی دھک۔ دکوس وغیرہ۔ مگر اب یہ سب قسمین معدوم ہوچکی ہین۔ دُندوبی۔ بھیری۔ نسان اور جمبو کی بڑی قسم کے نقاروں کے مختلف نام ہین۔ ان سے زیادہ تر فوجی ضروریات مین کام لیا جاتا تھا اور جب دشمن قریب آرہا ہو یا فوج کو فتح حاصل ہوگئی ہو اُسوقت انھین بجایا جاتا تھا۔

تل سے مراد چھوٹی قسم کے جھانج سے ہو۔ ہندوستان مین اس آلہ کو مجیرا کہتے ہین اور عام طور پر اس سے آج تک رقص و سرود کی محفل مین کام لیا جاتا ہو۔ اسمین بالعموم دھات کی دو چھوٹی چھوٹی محدب یا مقعر پیالیان سی ہوتی ہین جن مین سے ایک کو بائین ہاتھ مین باندھ لیا جاتا ہو اور دوسرے حصہ کو دائین ہاتھ مین لے کر اُس سے بجایا جاتا ہو۔ کپتان سیکوڈ ٹیلر بیان کرتے ہین کہ ہندوستانی موسیقی مین تال دینے کے لیے اس آلہ سے عام طور پر کام لیا جاتا ہو۔ گو بعض مقامات پر ان سے صرف مذہبی مراسم کی ادائگی مین کام لیا جاتا ہو۔ اور پنجاب کے بنا ؤون مین بعض ذاتین ایسی ہین کہ ان مین شادی بیاہ کے موقع پر انگریزی باجا بالکل نہین بجایا جاتا بلکہ کنبہ کا پروہت اسی قسم کا آلہ بجا کر برات کے آگے آگے چلتا ہو۔

اس آلہ کو بجانا پنجاب کا خود ایک خاص فن ہو اور جو لوگ اس مین مہارت تامہ رکھتے ہین وہ اسکے ذریعہ سے نہایت خوشگوار آواز پیدا کرسکتے ہین۔

اس قسم کے آلات موسیقی مین سے ایک گھنٹہ بھی ہو جسے مندرون اور شوالون مین لگایا جاتا ہو۔ گھنٹہ، گھنٹی کا یا جھرجھر یکار (گھنگھرو) بھی اسی قسم مین شامل ہین جنھین ناچ اور مجرے کے وقت ٹخنوں سے باندھ لیا جاتا ہو۔

گھڑیال کو قدیم زمانہ مین جے گھنٹہ کہا کرتے تھے۔ اس کا رواج آج تک پوجا پاٹ کے موقعون پر پایا جاتا ہو۔

آلات موسیقی کی یہ چند قسمین ہین جو قدیم ہندو موسیقی دانون مین مروج تھین۔ اس مین کلام نہین کہ یہ سب آلات نہایت سادہ ہوا کرتے تھے تاہم ان سے ہندوستانی موسیقی کی اکثر ضروریات بوجہ احسن پوری ہوسکتی تھین۔ اور جس مسالحے سے انھین تیار کیا جاتا تھا وہ بھی عام طور پر ملک کے اندر مل سکتا تھا۔ قدیم اہل ہند کے نزدیک درختون کی تین قسمین ہوا کرتی تھین۔

(۱) جنگل
(۲) دنل
(۳) شلیشول

جنگل سے مراد ایسے درختون سے ہو جو خشک زمین پر اُگتے ہون دنل سے مراد ایسے درختون سے جنھین بہت کم مقدار مین پانی ملا ہو اور شلیشول سے مراد اُن درختون سے لی جاتی تھی جن کو پانی بافراط ملتا رہا ہو۔

آلات موسیقی کی تیاری مین اول الذکر قسم کے درختون کو بہترین اور آخرالذکر کو بدترین سمجھا جاتا تھا۔ آخری قسم کے درختون مین سے کسی کی لکڑی چاہے کتنی خشک ہو اُسے آلات موسیقی کی تیاری کے لیے غیر موزون تصور کیا جاتا تھا۔ جا بجا ہدایات دی گئی ہین کہ آلات موسیقی ایسے درختون کی لکڑی سے تیار کیے جائین جو خشک

زمین پر اُگتے ہون اور عام طور پر خشک ہی رہتے ہون اگر کسی درخت کو کاٹ لیا گیا ہو اور اُس مین سے بڑے بڑے کونپل اور درخت اُگ آئین تو اُسکی لکڑی آلات موسیقی کی تیاری کے لیے بہترین سمجھی جاتی تھی۔ جا بجا اس بات کی ہدایت کی گئی ہے کہ پھیلے ہوئے گرہدار یا نازک درخت کی لکڑی سے بالکل کام نہ لیا جائے۔ عام طور پر رکت چندن (سرخ صندل) یا ساگون کی لکڑی سے کام لیا جاتا تھا۔ بانسری عام طور پر بانس کی تیار کیجاتی تھی۔ لیکن صندل اور ساگون کی بنی ہوئی بانسری کا بھی رواج تھا۔ بعض موقعون پر ہاتھی دانت، فولاد، دھات، سونے اور چاندی کی بانسریون کا بھی ذکر آتا ہے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بانس یا لکڑی کی بانسری پر پیتل کی چادر منڈھ لی جاتی تھی۔

نقارون کی تیاری مین جو کھال استعمال کی جاتی تھی اس مین بہت سی احتیاطون کو ملحوظ رکھا جاتا تھا ہدایت کی گئی ہے کہ اس مطلب کے لیے جو چمڑا استعمال کیا جائے وہ چھُری وغیرہ سے صاف اور آم کی کونپل کے رنگ کا ہو اور اسے ایک رات پانی مین تر رکھا گیا ہو۔ جس چمڑے پر چھُری لگی ہوئی ہو یا کوڑے کی ٹھونگون کے نشان ہون یا دیر تک دھوپ مین یا آگ کے سامنے پڑے رہنے کے باعث خراب ہو گیا ہو اُسے کبھی استعمال مین نہ لانا چاہیے۔ بہترین چمڑا وہ سمجھا جاتا تھا جو کسی بڑے جانور کا ہو اور جو خود بخود مرا ہو۔

مردنگ، ایک مخروطی قسم کا آلہ ہوتا تھا۔ مٹی کا بنا ہوا اور اسکے دونون طرف چمڑا لگا ہوا ہوتا تھا۔ بعد مین اسے بیج بر کرش۔ کھدر۔ یا ساگون کی لکڑی سے تیار کیا جانے لگا۔ اس آلہ سے میدان جنگ مین سپاہ کا حوصلہ بڑھانے مین مدد لی جاتی تھی۔ ڈنڈھی کا استعمال منڈرون سے مخصوص تھا اور اسکی تیاری مین آم کی لکڑی برتی جاتی تھی۔

یہ سوال کہ قدیم ہندوؤن مین آرچسٹرا کا رواج تھا یا نہین بڑی حد تک بحث طلب ہے۔ یورپ مین سب سے پہلے آرچسٹرا کا استعمال سولھوین صدی مین فرانس مین ناٹکون کے ساتھ شروع ہوا۔ جسمین بہت جلد نمایان اصلاحات رونما ہونے لگین حقیقت یہ ہے کہ جدید موسیقی کے ارتقا مین آرچسٹرا کو بہت کچھ دخل ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مشرق مین بہت مدت تک اس وجہ سے آرچسٹرا کا رواج شروع نہ ہو سکا کہ یہان اسکے حسب حال آلات موسیقی موجود نہ تھے باوجود اسکے یہ امر قابل ذکر ہے کہ قدیم ہند و موسیقی دانون نے بہت کم آلات موسیقی رکھتے ہوے بھی آرچسٹرا تیار کرنے کی کوشش ضرور کی اور اس کوشش مین انھین اگر پورے طور پر کامیابی حاصل نہ ہو سکی تو اسکی وجہ غالباً یہ تھی کہ قدیم ہندوستان مین آلات کی موسیقی کو قدرتی موسیقی سے دوسرے درجہ پر سمجھا جاتا تھا حقیقت یہ ہے کہ گلا اگر سُریلا اور آواز شیرین ہو تو اسمین آلات موسیقی کے بغیر بھی ایک ناقابل بیان لطف پایا جاتا ہے چنانچہ ایک انگریز مصنف تسلیم کرتا ہے کہ ہمارے تمام آلات موسیقی پیانو فورٹ ارغنون وغیرہ آواز کی موسیقی کے برابر لطف و راحت مہیا نہین کر سکتے کیونکہ اس قدرتی موسیقی سے جب چاہو جس انداز سے چاہو کام لیا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ قدیم ہندوؤن نے آرچسٹرا کی تیاری کی کوشش بہر حال کی تھی۔ اس سے ہماری ہرگز یہ مراد نہین کہ اُن کی وہ معمولی کوششین زمانہ موجودہ کے مکمل آرچسٹرا سے کچھ بھی تناسب رکھتی ہین۔ تاہم اس مین کلام نہین کہ انھون نے جو کچھ کیا انمین اصول وہی ملحوظ رکھے گئے تھے جو زمانہ حال کے آرچسٹرا مین پائے جاتے ہین۔

بھرت نے جس کا نام معاملات موسیقی مین سند تسلیم کیا جاتا ہے قدیم آرچسٹرا کا نام کتپ رکھا تھا جو بعد مین ورندیا برند ہو گیا

اور کون کہہ سکتا ہی کہ زمانۂ حال کی لفظ Band اور قدیم لفظ برند مین کتنا گہرا تعلق ہی۔ بھرت نے کتب کی تین قسمین مقرر کی ہین ایک تو وہ جس سے ناٹک کے سٹیج پر کام لیا جائے۔ دوسرے آلات موسیقی کا ایک عام مجموعہ اور تیسری قسم کا تعلق ان آلات موسیقی سے ہی جنھین ایک دوسرے سے ضرب دے کر بجایا جائے۔

قدیم ہندوؤن مین ناٹک کے موقع پر آرکیسٹرا کی جو تقسیم دیکھنے مین آئی تھی اُسکے متعلق ذیل کی دلچسپ واقفیت یقیناً دلچسپی سے خالی نہوگی۔ مردنگ بجانے والا اسٹیج کے سامنے وسط مین بیٹھتا تھا اور اسکے دائین بائین مین اور بانسری بجانے والے موجود ہوتے تھے۔ بیان کیا گیا ہی کہ زمانۂ حال کے تھیٹرون مین آرکیسٹرا کو اسٹیج کے سامنے رکھنے کا رواج اسی زمانہ سے قائم چلا آتا ہی۔

بحیثیت مجموعی کہا جا سکتا ہی کہ قدیم ہندوؤن مین ہر قسم کے آلات موسیقی بڑی حد تک درجۂ تکمیل حاصل کر چکے تھے اور گو وہ زمانۂ حال کے ترقی یافتہ آلات کا پورے طور سے مقابلہ نہ کر سکتے ہون تاہم اسمین شک نہین کہ ان مین سے بہتیرے اُن اصلاحات کی تحریک کا موجب ہوے ہین جن کی بدولت مغربی آلات موسیقی کو آج ہر لحاظ سے مکمل ہونے کا امتیاز حاصل ہی۔

تیرتھ رام

العصر

تقویم پارسیہ

فارسیوں کی تقویم کی وجہ تسمیہ بلحاظ اپنے سال اور مہینوں اور دنوں کے اور ان عیدوں اور جشنوں کے جو وقتاً فوقتاً منائے جاتے ہیں یا منائے جاتے تھے ایسی عجیب و دلچسپ ہے کہ شاید ہی کسی اور قوم کی تقویم ایسی ہو۔ اس تقویم سے فارسی قوم کے مذہبی عقائد اور ریت رسم اور توہمات پر ایک تیز روشنی پڑتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل فارس دوزخ بہشت۔ سزا جزا۔ بد و نیک اعمال کی میزان فرشتوں کی ہستی اور کام وغیرہ پر اعتقاد رکھتے تھے۔ وہ سورج کی پوجا کیا کرتے تھے۔ اور ماسوائے اسکے اورمزد اور آہرمن نیک اور بد دو بڑی روحوں کو مانتے تھے جو ایک دوسرے کی باہم مخالف ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان امور کے علاوہ اور باتیں بھی اس تقویم سے ظاہر ہوتی ہیں جن کا یہاں ذکر کرنا ضروری معلوم نہیں ہوتا۔

فارسی نظام شمسی کا سنہ نہایت ہی قدیم زمانہ میں شروع ہوا ہے۔ فارسی مؤرخین اور منجمین عموماً بتاتے ہیں کہ اسکا آغاز شاہ جم یا جمشید کے وقت سے ہوا ہے جو ۸۰۰ برس قبل مسیح سے بھی پہلے موجود تھا۔ فارسی سال میں تیس تیس دن کے بارہ مہینے ہیں۔ جن سے سال میں ۳۶۰ دن ہوتے ہیں۔ مگر ۳۶۵ کی تعداد پوری کرنے کے لیے ایک خاص مہینہ میں ۵ دن ایزاد کر دیتے ہیں۔ کچھ عرصہ تک تو ان کے درمیان لوند کا سال نہوا کرتا تھا جسکی وجہ سے انکا نوروز موسم بہار میں آکر پڑا کرتا تھا جبکہ آفتاب برج حوت میں داخل ہوتا ہے۔ اسی سبب سے ہر ۱۲۰ سال کے بعد لوند کا ایک مہینہ بڑھا کر سال کے تیرہ مہینے کر دیئے جاتے تھے۔ اور اسوقت تمام فارسی قلمرو میں بڑے شادیانے اور جشن منائے جاتے تھے۔ یہ مہینہ عرصۂ اول کے اختتام پر ماہ فروردین (مارچ) کے پہلے ہوا کرتا تھا۔ عرصۂ دوم میں آردی بہشت (اپریل) کے بعد ہوتا تھا۔ اور عرصۂ سوم میں خرداد (مئی) کے بعد ہوا کرتا تھا۔ اور وہ پانچ فالتو دن اسی مہینہ میں شامل ہوا کرتے تھے۔ یہی سلسلہ سنہ ۶۵۲ء تک جاری رہا جبکہ ساسانی خاندان کے آخری بادشاہ یزدگرد کو عربوں نے شکست دیکر تخت سے اتار دیا تھا۔ اور تب فارس خلفاء کی سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا تھا۔ اس وقت سے نظام شمسی کے سال کے ان فالتو دنوں کی جانب سے بے پروائی ہوتی گئی اور محمدی قمری شمار تمام مذہبی اور ملکی حالات میں داخل ہو گیا۔ یہی حال سنہ ۱۰۷۹ء تک رہا جس وقت فارس کے سلجوقی سلطان ملک شاہ جلال الدین نے جو خلفائے متقدی کا امیر الامرا تھا اس جنتری

کی اصلاح کی تب سے یہ جنتری اُسی کے نام نامی سے مشہور ہو گئی۔ اور نوروز برج حوت کے پندرہویں درجے سے ہٹا کر برج آذری کے پہلے درجے میں لایا گیا اور نوروز کا دن ہر چوتھے سال بڑھایا جانے لگا۔ اسی سبب سے اس چوتھے سال کو کبیسہ یا لیپ کا سال کہتے ہیں۔ مگر منجم اپنے زائچوں میں وہ فالتو دن اپنے آخری مہینے اسفندارمذ (فروری) میں بڑھاتے ہیں۔ لیکن عام طور پر پانچ ایام ماہ آبان (اکتوبر) میں بڑھائے جاتے تھے۔ کیونکہ یہ دن یزدگرد بادشاہ کی شکست کے موقع پر ترتیب کے سال میں اس مہینے کے بعد آئے تھے۔

یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ قدیم فارسی مہینہ ہفتوں میں منقسم نہیں ہوا کرتا تھا۔ اس لیے کہ ہر ایک دن اُسی فرشتہ کے نام سے موسوم ہوا کرتا تھا جو اُس دن پر مامور متصور ہوتا ہے اور ایسا ہی ہر ایک مہینہ بھی اُسی فرشتہ کے نام پر ہوا کرتا ہے جو اُس مہینہ پر مامور متصور ہوتا ہے۔ یہ فرشتہ اُن تمام عرصوں کے افعال پر اپنا حکم اور اثر رکھتا ہے جن کو (یعنی عرصوں کو) خدائے عالم الغیب نے اپنے زیر حکومت رکھ دیا ہے۔ اسی طرح ہر ایک دن کا فرشتہ اُن تمام افعال پر اپنا قابو اور اثر رکھتا ہے جس پر کہ وہ مامور اور مقرر ہے۔ یہ فرشتے دو انواع پر منقسم ہیں۔ جو فرشتے مہینوں پر مامور ہیں وہ اُن فرشتوں کے افسر سمجھے جاتے ہیں جو دنوں پر متعین ہیں۔ اور دنوں پر مامور فرشتے مہینوں پر مامور فرشتوں کے کارکنان کہلاتے ہیں۔ ہر بڑے فرشتے کے لیے اُسکے اپنے مہینہ میں ایک خاص دن مقرر ہوتا ہے جسکا وہ خاص لحاظ رکھتا ہے اور اُسکی خاص توجہ کا مرجع ہوتا ہے۔ ہر فرشتہ کے لیے خاص خاص دعا مقرر ہے جسکو زمزمہ کہتے ہیں۔ اور ایک فرشتہ کی زمزمہ خوانی دوسرے فرشتہ کی زمزمہ خوانی سے بہت ہی معزز اور قابل احترام سمجھی جاتی ہے۔ فارس کے بادشاہ اس بات پر بھروسہ کرتے ہوئے ہر روز نیا طلسم استعمال کیا کرتے تھے اور ہر ایک طلسم پر اُس دن کے فرشتہ کی بابت کچھ نہ کچھ کندہ ہوا کرتا تھا۔ اسی اعتقاد کے مطابق اُنکے دسترخوان پر بھی ہر روز نئی نئی قابیں آیا کرتی تھیں اور وہ ہر روز نئی پوشاک زیب تن کیا کرتے تھے۔ ہر امر میں ان فرشتوں کی رضا مندی لازمی سمجھی جاتی تھی۔

اور اسی لیے میلے اور عیدیں مقرر ہوئی تھیں۔ ان میلوں اور عیدوں میں مذہبی اور پولیٹیکل ہر دو عمل کی یادگاری ہوا کرتی تھی۔ جو دن مہینے کے فرشتوں کی زیر حفاظت سمجھے جاتے تھے وہ عام طور پر نہایت ہی خصوصیت کے ساتھ قابل تعظیم سمجھے جاتے تھے۔ قدیم زمانہ سے فارسی سال کا پہلا مہینہ بہاری نقطۂ مساوات لیل ونہار (Equinox) سے شروع ہوا کرتا تھا جیسا کہ مذکور ہوا اور ابتدا میں اسکو قدیہ آذر کہتے تھے۔ جسکے معنی ہیں آگ یا وہ فرشتہ جو آگ پر مقرر ہے۔ ان مہینوں کے نام اور اُنکے فرشتوں کے حالات اور عیدوں وغیرہ کا پورا بیان حسب ذیل ہے۔—

پہلا مہینا فروردین (مارچ) ہے۔ اور یہی اس مہینے کے فرشتے کا نام بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ فرشتہ فردوس کا خازن ہے اور فردوس کی نیکدل روحوں کی خاص حفاظت اور نگرانی اُسی کو تفویض ہے۔ اس مہینے کے روز اول پر جسکو نوروز کہتے ہیں ایک خاص میلا ہوا کرتا تھا جو چھ دن تک رہتا تھا اس جشن کے پہلے دن بادشاہ عوام الناس کی خوشنودی اور بہبودی پر خاص توجہ دیا کرتا تھا۔ دوسرے دن عالموں اور فال گیروں کو دعوت دیا کرتا تھا۔ تیسرے دن دین کے ہادیوں اور پجاریوں اور ملک کے مشیروں کی دعوت ہوا کرتی تھی۔ چوتھے دن شہزادے اور امرا مہمان ہوتے تھے۔ پانچویں دن شاہی بچوں کی ضیافت ہوا کرتی تھی اور چھٹے دن جو بادشاہ کا خاص دن کہلاتا تھا اس میں تمام رعایا اپنی اپنی لیاقت اور مرتبہ کے موافق بادشاہ کے حضور میں نذریں پیش کرتی تھی۔ نوروز سے پہلے کی شام کو ایک نہایت ہی خوش قطع اور وجیہ و پاکیزہ نوجوان جو نور مجسم و مشخص متصور ہوا کرتا تھا شاہی خوابگاہ کے دروازہ پر متعین کیا جاتا تھا۔ یہ نوجوان عین اُس وقت بادشاہ کی خوابگاہ میں داخل ہوا کرتا تھا جبکہ آفتاب اپنے افق سے اوپر آجاتا تھا اور بادشاہ فوراً اُس سے مخاطب ہو کر کہتا تھا: "تو کیا ہے؟ تو کہاں سے آیا ہے؟ تو کہاں کو جاتا ہے؟ تیرا کیا نام ہے؟ تو یہاں کیوں آیا ہے؟ اور تو کیا لایا ہے؟" وہ شخص ان سوالوں کا جواب اس نہج سے

دیا کرتا تھا "میں خوش قسمتی اور مبارک ہوں۔ خدا نے مجھے یہاں بھیجا ہے اور اپنے ساتھ نوروز کو لایا ہوں"۔ جب وہ یہ کہہ کر بیٹھ جاتا تو ایک اور شخص اپنے ہاتھ میں نقرئی قاب لیے ہوئے ظاہر ہوتا تھا۔ اُس قاب میں گیہوں۔ جو۔ مٹر۔ ماش۔ تل۔ اور چاول رکھے ہوئے ہوتے تھے۔ یعنی ان میں سے ہر ایک اناج کے سات سات خوشے اور نو نو دانے۔ شکر کی یا مصری کی ایک ڈلی۔ اور دو عدد نئے سکوک بھی۔ یہ سب اُس قاب میں رکھے ہوئے بادشاہ کو بطور تحفہ یا ہدیے پیش کیے جاتے تھے۔ اسکے بعد وزیر اعظم۔ سپہ سالار۔ خزانچی۔ اور محکمۂ جنگ کا سپرنٹنڈنٹ کمرہ میں داخل ہوتے۔ پھر شہر کے شرفاء حسب مراتب کمرہ میں تشریف لاتے تھے۔ تب مذکورۂ بالا اناج کی بنائی ہوئی ایک بڑی سی روٹی بادشاہ کے سامنے پیش کیجاتی تھی۔ بادشاہ تھوڑا سا اُس میں سے لیکر کھالیتا اور باقی حاضرین کے درمیان تقسیم کر دیا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ "لو۔ یہ نئے زمانے کے نئے سال کے نئے مہینے کا نیا دن ہے۔ تمام چیزیں جو زمانہ میں شامل ہیں نئی بنائی جائیں"۔ اسکے بعد بادشاہ اپنے اُمراء اور درباریوں کو قیمتی لباسوں سے ملبس کرتا اور برکت دیکر وہ تحفے اُنکے درمیان تقسیم کر دیا کرتا تھا جو وہاں لائے جاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ یہ رسم جمشید بادشاہ نے شروع کی تھی جو اُس وقت استخر (یعنی شہر پرسیپولس) میں پہلی ہی مرتبہ علانیہ طور پر داخل ہوا تھا۔ اور جس شہر کی تعمیر جمشید نے حال ہی میں کرائی تھی۔ علاوہ دیگر احکام کے ایک حکم اُسنے یہ بھی نافذ کیا تھا کہ فارسی سنہ بھی اُسی روز سے شروع ہونا چاہیے۔ اسی قسم اور اسی موقع کی اور بہت سی متفرق رسمیں آبان اور آسپندارمذ مہینوں کے بیان میں مذکور ہونگی۔ اِس دن کے علاوہ اُنیسویں دن بھی ایک خاص فرشتے کی عید ہُوا کرتی تھی اور وہ بھی اسی طرح ضیافتوں اور میلوں سے منائی جاتی تھی۔ لوگ اس عید میں بھی نئے لباسوں سے آراستہ ہُوا کرتے تھے اور تمام سلطنت میں کے جھنڈوں اور ریوڑوں اور گلوں کے حالات کا معائنہ ہُوا کرتا تھا۔

دوسرا مہینا اَردی بہشت (اپریل) کا ہے اور یہ اس مہینے کے فرشتہ کا نام بھی ہے۔ خیال کیا جاتا تھا کہ اس فرشتے کے ہاتھ میں بہشت کی کنجیاں ہیں اور وہ پہاڑوں اور آگ کا سپرنٹنڈنٹ ہے۔ تیسری تاریخ پر جو اس فرشتے کا دن ہے جنگ کرنا۔ آتش خانہ میں جانا۔ اور بادشاہ کے حضور میں درخواستیں گذراننا اچھا سمجھا جاتا تھا کیونکہ اس دن کو ان کاموں کے لیے سعد سمجھتے تھے۔

تیسرا مہینا خورداد (مئی) کا ہے۔ اس فرشتے کا اختیار تمام سمندروں دریاؤں اور ہر قسم کے پانیوں پر اور ساتھ ہی ہر قسم کے نباتات اور درختوں پر خیال کیا جاتا ہے۔ اس ماہ کی ۶ تاریخ پر جو اس فرشتے کا دن ہے شادی کرنا اور خدا اور فرشتوں سے دعائیں کرنا تاکہ وہ انکو ہر قسم کی آفات سے محفوظ رکھیں اور انکی تمام ضروریات مہیا کریں سعد اور باعث کامیابی تصور کیا جاتا تھا اور خوش قسمتی کا ایک سبب سمجھا جاتا تھا۔ اور ۶ تاریخ پر اس لیے خوشی منائی جاتی تھی کہ اُس روز فارس کی سلطنت نے غاصب ضحاک پر فتح حاصل کی تھی۔

چوتھا مہینا تیر (جون) ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ فرشتہ خورداد فرشتہ کے ماتحت ہے اور اُس سے کم درجہ پر ہے اور مویشیوں کی نگرانی اور انکی حفاظت اسکی تفویض میں ہے۔ اس ماہ کی ۱۳ تاریخ پر آبریزگان نامے ایک عید منائی جاتی ہے۔ جسکی تقریب پر ہر فرقہ کے اشخاص ایک دوسرے پر پانی چھڑکتے ہیں مگر امراء اور ذی مرتبت لوگ پانی کے عوض گلاب یا زگترے کے پھول یا خلوق یا اور کوئی خوشبودار عرق استعمال کیا کرتے ہیں۔ اس عید کی بنا بھی ایک خاص تاریخی واقعہ ہے۔ یعنی اس دن فریدون کے پوتے منوچہر اور تاتاری یا ترکی حملہ آور افراسیاب کے درمیان ایک عہد نامہ ہُوا تھا جسکی رو سے ہر دو سلطنتوں کی حدود بندی کے بارے میں یہ طے قرار پائی تھی کہ مشہور و معروف فارسی تیر انداز آرش نامی تیر چلائے اور جہاں اُسکا تیر گرے وہیں دونوں سلطنتوں کی حد قائم ہو جائے۔ چنانچہ اس قرارداد کے مطابق اُسنے تیر چلایا اور وہ تیر دریائے آمو کے دوسرے پار جا پڑا۔ پس وہی اُسوقت سے اِن دونوں حکومتوں کی حدود چلی آتی ہیں۔ آب ریزی کی یہ رسم اسی عید کے لیے مخصوص نہیں تھی بلکہ اور عیدوں میں بھی یہ رسم ادا کیجاتی ہے۔ مثلاً نوروز اور مہرجان کی عیدوں میں

اور تیرہ ماہ خورداد اور ماہ بہمن کی ۳۰ تاریخ پر بھی یہ رسم خصوصاً اصفہان میں ادا کی جاتی ہے۔

پانچواں مہینا **مُرداد** (جولائی)۔ یہ فرشتہ درختوں اور دیگر نباتات اور پھلوں اور بیجوں کے مشہور و معروف فرشتوں میں سے ہے۔ اِس فرشتے کے دن (۱۰ تاریخ) پر جشنِ نیلوفر نامی ایک جشن ہُوا کرتا ہے۔ کیونکہ اس رسم میں نیلوفر کے پوٹے مستعمل ہوتے ہیں۔ اس موقع پر جس قدر عرضیاں بادشاہ یا عظام حکومت کی خدمت میں پیش ہوتی تھیں وہ عموماً منظور ہو جایا کرتی تھیں اور عرضی دہندگان کی مرادیں بر آیا کرتی تھیں۔ لفظ "مرداد" کے معنی ہے "موت دینا"۔ اس لیے وہ موت کا فرشتہ خیال کیا جاتا تھا اور اکثر فرشتہ مرگ کے لقب سے ملقب ہُوا کرتا تھا۔

چھٹا مہینا **شہریور** (اگست) کا ہے۔ اس فرشتہ کے حوالے تمام معدنیات تھیں۔ اسکا دن ۴ تاریخ پر پڑتا ہے۔ مگر نہ تو اس دن پر اور نہ دوسرے ہی دن یعنی ۱۰ تاریخ پر کوئی رسم منائی جاتی تھی۔ یہ موخر الذکر تاریخ موسم خزاں میں آکر پڑا کرتی تھی اور اسکو خزان کہا کرتے تھے۔

ساتواں مہینا **مِہر** (ستمبر) کا ہے۔ یہ فرشتہ تیز فہم مخبر ہوا کرتا۔ آفتاب کا نظم و نسق اسکے ذمے متصور ہوتا تھا اور محبت و دوستی پر مامور سمجھا جاتا تھا۔ یہ بھی خیال کیا جاتا تھا کہ روزِ محشر پر لوگوں کو شمار کرنا اور انکو جزا و سزا دینا اِسکا کام تھا۔ لوگوں کا گمان تھا کہ قیامت کے دن یہ فرشتہ ایک پل پر بیٹھے گا اور جب سروش نامی فرشتہ لوگوں کے اعمال میزان میں وزن کر چکے گا تو اس پل پر سے اُن تمام روحوں کا گزر ہوگا۔ اگر کسی کے نیک اعمال اُس ترازو میں بال بھر بھی وزن میں زیادہ ہونگے تو بس اُنکے خیال کے مطابق اُس صاحب اعمال کے لیے فردوس کا دروازہ کھل جاتا ورنہ اسفل میں اُسکا حصہ مقرر ہو جاتا ہے جہاں پر اُنکے خیال کے مطابق اُنکو فردوس کی خوشیوں کے سات مدارج کے مقابل میں سات مختلف دُکھ بھگتنے پڑتے ہیں۔ ۱۶ تاریخ سے جو اُس فرشتے کا دن ہے اُنکی سب سے بڑی عیدوں میں سے ایک عید کا آغاز ہوا کرتا ہے جسکو مہرگان کہتے ہیں۔ یہ عید چند دن تک ہوتی رہتی ہے۔ اسکی بابت بہت سی روایتیں مشہور ہیں مگر ایک روایت سے یہ گمان غالب ہوتا ہے کہ یہ عید موسم خزاں کے نقطہ مساواتِ لیل و نہار کے وقت کی یادگار اور اُن کے سورج دیوتا کی شان میں ہوتی تھی اور ایسا ہی نوروز کے دن پر بھی جبکہ سورج برجِ آذری میں داخل ہوتا ہے سولھویں تاریخ پر خصوصیت کے ساتھ عید ہُوا کرتی تھی۔ اور روپے پیسے والے آدمی اُس وقت روغن بان لگاتے اور اپنے اوپر عرقِ گلاب چھڑکتے اور مختلف قسم کے پھل کھایا کرتے تھے۔ اُنکا خیال تھا کہ اگر ہم ان رسمیات کو عمل میں لائیں گے تو اُن بلیات سے محفوظ اور مامون رہیں گے جو آئندہ سال بھر آتی رہینگی۔ اس عید کے پہلے دن بادشاہ روغن بان سے اپنے آپ کو مسح کر کے اور مختلف الالوان لباسِ فاخرہ زیب تن کر کے اور ایک ایسا تاج پہن کر جسکی چوٹی پر ایک عظیم الشان مورت سورج دیوتا کی بنی ہوئی ہوتی تھی آراستہ اور ملبس ہو کر اپنے سریر سلطنت پر رونق افروز ہوا کرتا ہے۔ اُس وقت اُنکا بڑا پجاری ایک نفیس نقرئی طباق لیے ہوے جس میں مصری۔ شفتالو۔ بہی۔ سیب۔ لیموں۔ انار۔ عناب۔ سفید انگوروں کا ایک خوشہ اور سات گونہ بیری قرینہ سے چنی ہوئی ہوتیں اور اُسپر کچھ پڑھتے ہوے بادشاہ کے حضور میں پیش کیا کرتا تھا۔ بادشاہ اس طباق میں سے کچھ کھا لیا کرتا تھا اور اُسکے بعد اُسکے تمام اُمرا اور حکام اپنے اپنے مدارج اور مناصب کے مطابق اُٹھ اُٹھ کر بادشاہ کے حضور میں جاتے اور اُس طباق میں سے لے لیکر تناول کر لیا کرتے تھے۔ پھر بعد بادشاہ کے توشہ خانہ سے نفیس پوشاکیں اور دیگر قیمتی اور عمدہ اشیا لاکر اُنکے درمیان تقسیم کر دی جاتی تھیں۔ اِسدن لوگ اپنے بچوں کا نام رکھنا یا اُنکا دودھ چھڑانا سعد سمجھا کرتے تھے۔ اور یہ بھی دستور تھا کہ اگر آج کے دن بادشاہ کے ہاں لڑکا پیدا ہوتا تو فوراً وہ سورج دیوتا کا پجاری بنانے کے لیے بڑے جشن کے ساتھ مخصوص کر دیا جاتا تھا۔

آٹھواں مہینا **آبان** (اکتوبر) ہے۔ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ فرشتہ

خورداد کے ماتحت اور ہوا پر مامور ہے۔ اسکا دسواں دن اس فرشتے کے نام پر موسوم اور مخصوص ہوتا تھا اور اُس روز اس ایک خاص تواریخی واقعہ کی یادگار میں سالانہ عید منائی جاتی تھی کہ تیر ہی کے دن تاتار یا توران کا بادشاہ افراسیاب جسنے فارسیوں کو بارہ برس تک اپنے قبضہ میں رکھ چھوڑا تھا فارس کے ملک اور سلطنت سے بدر کر دیا گیا تھا۔ اسکے علاوہ اُس بارش کی یادگار بھی ہوا کرتی تھی جو اُنکی روایت کے موافق سات سال کی خشک سالی اور قحط کے بعد ہوئی تھی۔ چونکہ قدیم زمانہ میں یہ سال کا آخری مہینا ہوتا تھا اس لیے اس میں پانچ فالتو یوم ایزاد کیے جاتے تھے۔ اس موقع پر گیارہ دن تک لگاتار عید منائی جایا کرتی تھی۔ جسکا آغاز ۲۶ تاریخ سے اور انجام اگلے مہینے آذر کی یکم پر ہوا کرتا تھا۔ اس عید میں ماسوائے دیگر رسوم کے ایک یہ رسم بھی ادا کیجاتی تھی کہ مجوسی اونچے اونچے میناروں کی چوٹیوں پر مختلف قسم کے کھانے رکھدیا کرتے تھے تاکہ (جیسا کہ اُنکا اعتقاد تھا) پریاں اور فوت شدگان کی ارواح آکر وہ کھانا کھا جائیں اور اُن سے حظ اُٹھائیں۔ جب تک کہ یہ ضیافت اُنکے مفروضہ مہمان تناول کرتے رہتے تب تک پجاری باجوں اور گیتوں اور ناچ سے (جو ہاتھوں میں ہاتھ ملا کر کیا کرتے تھے اور جسکو دست بند کہتے تھے) اُنکو خوش کرتے رہتے تھے۔ ہر درجہ اور مرتبہ کے لوگ اس جلسہ کی تقریب پر نہایت ہی بے لگام خوشیاں منایا کرتے تھے۔ عمدہ عمدہ لباس پہنا کرتے اور ایک دوسرے کو بے باکانہ دعوتیں دیا کرتے تھے۔ اہل دولت و ثروت سے غریب غربا کو چھوٹے چھوٹے ہدیے جو درشتن کے نام سے موسوم ہوتے دیے جایا کرتے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ بادشاہ بھی مع اپنے امرا و شرفا کے پھولوں کے ہاروں (جسکو تباک کہتے تھے) اور ایک قسم کے گلوبندوں سے (جسکو زرکش کہتے تھے) آراستہ ہو کر عوام الناس کی خوشی میں شریک ہو کر اُنکو مشرف و ممتاز کیا کرتے تھے۔ علی الصبح جلوس سب سے پہلے آتش کدہ میں جاتا اور جب یہاں عبادت ہو چکتی تو لوگ بڑے جوش سے قسم قسم کے باجے بجانے اور خوش لحانی سے گانے اور خوب ناچنے لگ جاتے تھے۔ یہ راگ رنگ اکثر ٹولیاں ٹولیاں ہوکر رچایا کرتے تھے۔ اور ہنسانے والی طرح طرح کی نقلیں ہوا کرتی تھیں جسکے نقالوں اور گانیوالوں کو بڑی بڑی اجرتیں دی جاتی تھیں۔ اس مزدوری کو پانچ یعنی پانوٗں کی مزدوری کہا کرتے تھے۔

نواں مہینا **آذر** (نومبر) کا ہے۔ یہ فرشتہ آتش پر مامور تھا اور اس کا نواں دن اسکے نام سے کہلاتا تھا۔ اس روز تمام فارسی سلطنت میں آگ کے انبار کے انبار روشن کیے جاتے تھے اور زردشت کے حکم کے بموجب ملک کے تمام آتش گاہوں کا معائنہ کیا کرتے تھے۔ اس موقع پر تمام آتش گاہیں بڑی عمدگی اور تزک و احتشام سے آراستہ کیجاتی تھیں اور سب لوگ ناخن کاٹتے اور اپنے تمام بدن کے بال منڈاتے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ ہم ایسا کرنے سے اپنے سال بھر کے تمام گناہ اور قصور اُتار کر پھینک دیتے ہیں۔

دسواں مہینا **دی** (دسمبر) کا ہے۔ یہ فرشتہ نہ صرف اسی مہینے پر مامور تھا بلکہ اُن تمام دنوں پر بھی اختیار رکھتا تھا جو دی سے شروع ہوتے ہیں۔ مثلاً دی بہ آذر، دی بہ مہر، دی بہ دین۔ آٹھویں تاریخ (جو اس فرشتے کا دن ہوتا ہے) تمام پارسی سلطنت میں آگ کی شان میں ایک بڑا میلا ہوا کرتا تھا اس میلے کے آغاز کی بابت بہت سی مختلف روایتیں ہم تک پہنچی ہیں۔ ان میں سے ایک بڑی ہی عجیب و غریب ہے کہتے ہیں کہ اس سالانہ موقع پر موسم سرما نے ایک دفعہ دوزخ سے نکل آنے کا ارادہ کیا کیونکہ وہاں اُسکو بہت ہی گرمی لگتی تھی۔ فارسیوں کے آبا و اجداد نے یہ دیکھکر فوراً بڑے بڑے آتشی انبار لگا دیے اور اس سے اُسکو اس بات کا یقین دلایا کہ وہ ضرورت سے زیادہ فضل میں آگیا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ پھر زمین سے روانہ ہو کر تاریکی کے سایوں میں چلا گیا۔ اس موقع پر شب کی درخشندگی کے عام نظارہ کو دوبالا کرنے کے لیے بادشاہ اور اُسکے اہل دربار جھاڑیوں اور درختوں کی چھوٹی چھوٹی اور ہلکی ہلکی شاخیں کاٹ کر اور اُنکو ہوا کے پرندوں اور جنگل کے جانوروں اور درندوں کے جسموں کے ساتھ ترکیب سے باندھکر روشن کرکے اُن کو چھوڑ دیا کرتے تھے۔ پرندے تو آسمان میں اُڑتے اور جانور جنگلوں میں بھاگ گئے

جس سے آس پاس کے جنگل جل اُٹھتے تھے۔ اور یوں رات کے وقت روشنی کا شاندار نظارہ نظر آیا کرتا تھا۔ بعض قدیم مشرقی اور یورپ کے محققین اس قسم کی رسومات کا پتہ آج سے چار ہزار برس پیشتر تک لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ رسم اُسوقت شروع ہوئی تھی جبکہ فارسیوں کے پہلے بادشاہ کیومرث کے یکصد بیٹیوں اور بیٹیوں کی شادی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی فارسی بادشاہ ہے جسکو بائیبل میں عیلام کا بادشاہ کہا گیا ہے۔ بعض خیال کرتے ہیں کہ یہ عید اُسوقت کی یادگار منائی جاتی تھی جبکہ ہیبت ناک اژدہے کو اُسکے پوتے ہوشنگ نے ہلاک کر دیا تھا۔ مگر عام رائے یہ ہے کہ خوشی اس موقع پر کیجاتی تھی کہ اُسوقت آفتاب خط جدی پر داخل ہوتا ہے اور اسی وقت سے دن بڑے اور گرمی زیادہ ہونے لگتی ہے۔ چونکہ اس سخت موسم میں آگ بڑی پیاری معلوم ہوتی ہے اس لیے اس خوشی کا اظہار طبعی طور پر آگ کے تودے اور انبار لگا کر اور اُنکے سامنے بیٹھکر خوشیاں منانے کے سوا کسی اور طرح نہیں ہو سکتا کیونکہ اس حالت اور نظارہ سے وہ تمام خیالات اور احساس رفع ہو جاتے ہیں جو تاریکی اور سخت سردی سے پیدا ہوئے تھے۔ اسی زمانہ میں اسی قسم کی رسم انگلستان میں بھی ہوا کرتی تھی جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا تھا کہ اب ہم موسم سرما کو الوداع کہتے ہیں اور موسم بہار کے خیر مقدم کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ اس مہینے کی پندرھویں تاریخ ایک مشہور مورتی رسم کے لیے معین اور مخصوص تھی۔ یعنی اُسوقت آٹے یا مٹی کی بہت سی مورتیں اُن فوت شدہ بزرگوں کی بنایا کرتے تھے جو اُنکے خیال میں معزز تھے۔ اور ان مورتوں کو عام گزرگاہوں میں رکھا کرتے تھے بالخصوص چوراہوں اور چوکوں پر۔ اور انکی بڑی بھاری تعظیم اور تکریم کرنے کے بعد اُنکو جلا دیا کرتے تھے۔ اس موقع پر علی الصبح کچھ بولنے سے پہلے ایک سیب کھا لینا۔ اور ڈھاک کی جڑ کی دُھونی لینا بہت اچھا سمجھا جاتا تھا کہ ایسا کرنے سے آئندہ بارھویں تک کی زندگی بڑے امن سے گزرا کرتی ہے۔ خرابی اور بھوک رفع ہو جاتی ہے۔ ۲۰ تاریخ پر جسن کی عید ہوا کرتی تھی۔ لوگ اسکی گوشت اور سبزی کے ساتھ خاص طور پر پکایا کرتے اور سمجھا کرتے تھے کہ اس طلسم سے ہم دیوؤں کے حملوں سے بچے رہتے ہیں اور خاص خاص منتروں کے ذریعہ سے ہم دیوؤں کو اپنے گھر سے نکال دیا کرتے ہیں جہاں اُن دیوؤں کا پاس ہوا کرتا ہے۔ اور یہ خیال کرتے تھے کہ اگر طلسم اس موقع پر بنایا جائے تو بہت موثر اور مفید ہوا کرتا ہے۔

گیارہواں مہینا بہمن (جنوری) ہے۔ یہ فرشتہ تمام دیگر فرشتوں میں نور اور تجلی میں افضل ہے۔ سمجھا جاتا تھا کہ یہ فرشتہ تمام مخلوقات پر حکمران ہے مگر انسان اُسکی حکومت سے باہر ہے۔ کیونکہ انسان اور مزدہ کی خاص نگرانی میں ہے۔ اور مزدہ کے معنی ہیں علم کل۔ وہ تمام غیظ و غضب کا منتفی کرنیوالا اور تمام جھگڑوں کا فیصلہ کرنے والا متصور ہوتا ہے۔ ۲ تاریخ پر جو اس فرشتہ کا دن ہے اناج یا گوشت کی عید مناتے تھے اور اُس اناج اور گوشت کو سفید یا سرخ بہمن کے ساتھ اُبالا کرتے تھے اور جب رکابی تیار ہو جاتی تو اُسپر زرد بہمن اور مصری کوٹ کر اور ملا کر ڈال دیا کرتے تھے۔ وہ لوگ سفید بہمن کو دودھ میں پیس کر مقوی دماغ کے طور پر نوش کیا کرتے تھے۔ اس دن پر گھر کی بنیاد رکھنا، نئے کپڑے کاٹنا یا بنانا یا سینا، ناخن کاٹنا اور بال منڈانا، طبی جڑی بوٹی تلاش کرنا شبھ سمجھتے تھے اور انکا عرق یا تیل نکال لیا کرتے تھے۔

بارہواں مہینا سپندارمذ (فروری) ہے۔ اس فرشتہ کے سپرد کرۂ زمین ہے اور نیک مستورات کا بھی وہی محافظ و نگران متصور ہوا کرتا تھا۔ اس سبب سے پانچویں تاریخ جو اسکا دن تھا بیاہ و شادی کے لیے نہایت موزوں اور شبھ سمجھی جاتی تھی۔ اس دن کے ناموں میں سے ایک نام مردگیران (یعنی مرد ہلا پر حکومت کرنا یا آدمی لینا) تھا۔ اس عقیدہ کی بنا ایک قدیم رسم پر تھی جسکے ذریعہ سے اسدن پر مستورات کو خاص حکومتانہ اختیارات دیے جاتے تھے۔ اور خاوند اپنی بیویوں کے نہایت ہی زبردست احکام کی تعمیل کیا کرتے تھے۔ اور کنواریاں اس امر کی مجاز تھیں کہ اپنے حسب منشا خاوند چن لیا کریں۔

مہینوں کی جو ترتیب اوپر دی گئی ہے وہ وہی ہے جو فارس میں سلطان جلال الدین کی اصلاح کے وقت سے جاری ہے جسنے نہایت قدیم طریق کو جیسے اصل آتش پرستوں نے مرتب کیا تھا بحال کر دیا۔
پی۔ کے۔ داس

فن تحریر

جس وقت انسان وحشیانہ حالت سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہے اُس کو گویا ایک نئی زندگی ملتی ہے اس تغیر و تبدل کو فلسفے کی اصطلاح مین حیوانیت سے انسانیت مین آ جانا کہتے ہین اس زمانہ مین عقل آہستہ آہستہ ترقی کرتی ہے اور عقل کی ترقی سے تہذیب پیدا ہوتی ہے ترقی تہذیب کے لیے غور و خوض اور اظہار خیالات کی ضرورت ہوتی ہے یہی وہ زمانہ ہوتا ہے جبکہ زبان عالم وجود مین آتی ہے اسکے بعد رفتہ رفتہ عقائد و علمیات سے تعلق رکھنے والی کتابون کا ظہور ہوتا ہے ایسی کتابین نہایت بیش قیمت خیال کی جاتی ہین کیونکہ ان مین سب سے اول خداوند کریم کی لامحدود صفات کا بیان قلمبند ہوتا ہے ایسی ہی کتابون کی عزت و تعظیم کا اندازہ ویدون کے شہرۂ اعزاز و احترام سے کیا جا سکتا ہے ویدون نے ہندوستان کے پنڈتون کو تو اپنی محبت مین والہ و شیدا بنا ہی رکھا تھا لیکن میکسمولر وغیرہ علمائے مغرب کو بھی اپنا وارفتہ بنا لیا ہے جب انسان کو روحانی صداقت کا حفظ کرنا محال ہو جاتا ہے اسوقت وہ انھین قلمبند کرنے کی خواہش کرتا ہے علم تحریر کے عالم ظہور مین آتے ہی کتابین قلمبند ہونے لگتی ہین اور آہستہ آہستہ زیادہ تعداد مین کتابین لکھی جانے لگتی ہین یہی سلسلہ ہے جس سے کتابون کے مجموعے اور کتابون کے مجموعون سے کتبخانے ظہور مین آتے ہین۔

ایسی کتابین جو اعلی روحانی جذبات سے مملو ہون دل و دماغ سے پیدا ہوتی ہین ان کو زبانی یاد کرنا پڑتا ہے سنسکرت مین انھین "سمرتی گرنتھ" کہتے ہین۔ ان کے ذریعہ سے محفوظ کردہ خیالات کا اظہار و رواج ہوتا ہے ان مین زمانہ قدیم کے تاریخی قصے، مثالی کہانیان، شعر و سخن، بھجن اور گیت وغیرہ شامل ہوتے ہین۔ پرانے زمانہ کی مقدس مذہبی کتابین، اندرجال کے منتر اور شعبدے، اور نیز عملیات سفلی وغیرہ بھی ایسی ہی کتابون مین لکھے ہوئے ملتے ہین۔ ان کی زبان ایک عجیب بانکی ہوتی ہے اور اسی قسم کی زبانون سے دنیا کی تمام دلکش زبانین پیدا ہوئی ہین۔ ایسی زبانون کا رواج اور ان کی تکمیل کا

علم دادا سے باپ اور باپ سے بیٹے کو پہونچتا تھا۔ اسطرح پر قوت حافظہ بہت ترقی کرتی تھی اور یہ اسی حافظہ کا فیض تھا کہ ہمارے بزرگوں نے وید، اپنشد، سمرتی وغیرہ مقدس کتابیں ہزارہا برس تک محفوظ رکھیں۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو اس زمانہ کے موجودہ قدیم صحائف کب کے معدوم ہو گئے ہوتے۔ کچھ ہندوستان ہی پر موقوف نہیں بلکہ زمانۂ قدیم میں عبرانی زبان کی کتابوں کا رواج بھی اسی طرح ہوتا تھا۔ یونان کے ملک الشعرا "ہومر" کی قابل قدر تصانیف بھی اسی ذریعہ سے مشہور ہوئی ہیں۔ "الیڈ" اور "اوڈیسے" نامی مشہور منظوم کتابیں عرصۂ قدیم میں ملک الشعرا ہومر نے نظم کی تھیں، جو مرزا بینا ہو گیا تھا۔ اس کا قاعدہ تھا کہ وہ اپنے کلام کو گا گا کر ادھر ادھر سیر و سیاحت کرتا پھرتا تھا۔ ان نظموں کو لوگوں نے ہومر ہی کی زبان سے سنکر ازبر کر لیا تھا۔ جاپانیوں کی "کوجی کی" نامی کتاب کا رواج بھی اسی طریقہ پر ہوا تھا۔ ملک چین میں ٹائپ ملٹنگ اور پرنٹنگ مشین کے اجراء سے پہلے وہاں کی تاریخیں، پولیٹکل کتابیں، پند و نصائح اور مذہبی کتب بھی اسی طریقہ سے مروج ہوئی تھیں۔

معلومات سے تعلق رکھنے والی کتابوں کی ترقی ہوتے ہوتے آخر ان کا یاد کرنا مشکل ہو گیا اور بدیں وجہ ان کو تحریر کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ چونکہ اسوقت کاغذ نہ تھا لہٰذا پتھروں، سلوں، ہڈیوں، سینگ، ہاتھی دانت اور مٹی کے ظروف و اینٹوں پر کتابیں تحریر ہونے لگیں۔ علم طبقات الارض کے ماہرین کی رائے ہے کہ زمانۂ قدیم میں لوگ ہتھیاروں سے پتھروں اور سلوں پر کھود کر اپنے دلی خیالات قلمبند کرتے تھے۔ دنیا کی بہت سی پرانی کتابیں پتھروں اور سلوں وغیرہ پر تصاویر و نقوش کے ذریعے قلمبند کی گئی تھیں۔ تصاویر و نقش و نگار کے ذریعے اظہار خیالات کو فن تحریر کا پہلا زینہ سمجھنا چاہیئے۔ مصر میں خط تصویر کا بہت رواج تھا اور اب بھی وہاں اسقدر ذخیرہ اس کا موجود ہے کہ اسکو علم کی ایک علیحدہ شاخ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ بیشمار علماء اس فن تحریر کو حاصل کرنے اور زمانۂ قدیم کے نظم کردہ خیالات کو پڑھنے کے لیے سالہا سال محنت و مشقت کرتے ہیں۔

باشندگان چین نے متذکرہ بالا خط تصویر کو بہت ترقی دی ہے۔ جاپان، کوریا، تبت وغیرہ میں بھی چین سے نزدیکی ہونے کے باعث یہ طرز تحریر موجود تھا۔ جاپان میں اسکے علاوہ اسی کے مشابہ ایک اور طرز تحریر بھی مروج تھا۔ اسکا نام "اردھر" تھا۔

امریکہ کے قدیم باشندے جن کو غیر مہذب "انڈین" کہتے ہیں ایک خط تصویر کا استعمال کرتے ہیں۔ اینٹوں اور پتھروں پر لکھی ہوئی کتابیں زیادہ تر ملک مصر میں پائی جاتی ہیں یہ سب خط تصویر میں ہیں۔ وہاں کے بڑے بڑے ستونوں پر بیشمار کتبے ابتک موجود ہیں جو حضرت مسیح سے چار سو برس قبل کے ہیں۔ اس ملک کی قدیم تاریخ خط تصویر میں اینٹوں پر قلمبند ہے۔ اس عجیب و غریب خزانۂ کتب سے معلومات اخذ کرنے کی قابلیت کسی ملک میں نہیں ہے۔ اہالیان مصر کو تحریر صحائف میں خوب مہارت حاصل تھی۔ ان لوگوں کو شوق علم نے اس قدر وارفتہ کر دیا تھا کہ درخت، پتھر، چھال، اینٹ، چمڑا، جو کچھ بھی ان کو میسر ہوا اسی کو وہ بجائے کاغذ استعمال میں لائے۔ انھوں نے پہلے تو جانوروں اور پرندوں وغیرہ کی تصویریں کندہ کرکے اپنے دلی منشاء کو ظاہر کیا۔ مگر جب زیادہ لکھنے کی ضرورت پیش آئی تو یہ خط تصویر تکلیف دہ اور وقت طلب معلوم ہونے لگا۔ لہٰذا اس طرز تحریر میں اصلاح و ترمیم کرکے قدرے آسان نشان مقرر کئے۔ بعد ازاں کچھ اور زمانہ گزرنے پر حروف قائم کئے۔ مصر والوں کی زیادہ تحریریں انھیں تین قسم کے خطوط میں ۔۔ پائی جاتی ہیں۔

رفتہ رفتہ تحریر کی زیادتی ہونے سے علم ادب کی ضرورت محسوس ہوئی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دنوں میں روم و یونان وغیرہ ممالک میں تلفظ کے مطابق طرز تحریر کا ظہور ہوا۔ اس زمانہ میں پتھروں اور اینٹوں پر لکھنے سے لوگوں کو تکلیف ہونے لگی لہٰذا دیگر ذرائع کی تلاش و جستجو ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابتداً لکڑیوں کے دیدہ تختوں پر کتابت شروع ہوئی۔ باشندگان چین نے بانس پر لکھنے میں بڑی مہارت پیدا کی تھی۔ ہندوستان میں بڑے لوگوں

کی بہت سی تحریریں لکڑی کے تختوں پر لکھی ہوئی پائی گئی ہیں اور چین کا تو ذکر ہی کیا جہاں اسی قسم کی بیشمار تحریریں پائی جاتی ہیں

لکڑی پر لکھنے کا رواج اب سے کچھ قبل بھی ہندوستان میں تھا۔ چھاپہ کی ایجاد سے پہلے جو دقتیں تحصیل علم کے راستہ میں لاحق ہوتی تھیں، ان کا اندازہ صرف اسی سے ہوسکتا ہے کہ طلبا تختوں پر [illegible] کا برادہ ڈال کر بانس کی قلمی سے اپنا سبق لکھ کر یاد کرتے تھے۔ گویا سب سے بہترین ذریعۂ تعلیم یہی تھا۔ مارواڑیوں کی دوکانوں میں رنگین تختوں پر رنگ سے لکھنے کا رواج ابتک بہت سے مقامات پر پایا جاتا ہے جبکہ قاعدۂ فن التحریر کی عدم موجودگی کے باعث اب تک یہ کیفیت تھی تو پرانے زمانہ کی خوبیوں اور دقتوں کا کیا ذکر لہذا لائق صد آفرین ہیں ہندوستان کے وہ بزرگ علما جنہوں نے بھوج پتر وغیرہ پر بیش بہا کتابیں قلمبند کی تھیں۔ لکڑی پر لکھے ہوئے صحائف روم و یونان وغیرہ ممالک میں بھی پائے جاتے ہیں۔

لکڑی اور بھوج پتر کے بعد لوگوں نے درختوں کے پتوں پر بھی لکھنا شروع کیا۔ تاڑ کے پتوں پر ہندوستان میں لاکھوں کتابیں تحریر کی گئی ہیں جس زمانہ میں دنیا کی تہذیب اس قدر معراج ترقی پر پہونچ گئی کہ اب مضامین کا مجموعہ کتابی صورت اختیار کرنے لگا۔

ایک بات لکھنے سے نظر انداز ہوگئی، وہ یہ کہ بھوج پتر وغیرہ سے پیشتر ہندوستان میں بہت تحریریں تانبے وغیرہ کے پتروں پر کی جاتی تھیں۔ سونے اور تانبے کے پتروں (چادر) کا رواج ہندوستان میں زمانہ قدیم سے تھا چنانچہ ویدوں میں بھی اس کا ذکر ہے۔ بودھوں کے بھی بیشمار کتبے تانبے اور لوہے کی چادروں پر لکھے گئے ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دھات کے پتروں پر لکھنے کا طریقہ اہل ہند کا ایجاد ہے یعنی یہاں ہی سے یہ طریقہ دیگر ممالک میں پہونچا ہو چین جاپان وغیرہ ممالک میں بھی دھات کے پتروں پر تحریرات لکھنے کا طریقہ جاری تھا اور اب بھی جاری ہے۔ مگر اسیریا یونان وغیرہ ممالک میں کسی زمانہ میں دھات کے پتروں پر کتابیں لکھی جاتی تھیں بعض علما کا خیال ہے کہ ہندوستان والوں نے یہ طریقہ بابل والوں سے مستعار لیا تھا لیکن کوئی تاریخی ثبوت اس خیال کی تائید میں پیش نہیں کیا جاتا۔

پتھروں، ہڈیوں، اور تانبے اور لوہے کے پتروں پر لوگ اسی سلائیوں اور دیگر اوزاروں سے حروف کھودتے تھے۔ یہ بڑی محنت کا کام تھا۔ بعض لوگ یہی پیشہ کرتے تھے۔ اس میں کافی مہارت ہونے کے باعث وہ لوگ بآسانی اور جلد اس کام کو انجام دیتے تھے۔ بعض علما کا خیال ہے کہ ہندوستان میں دھات کے پتروں پر تحریرات کندہ کرنے والے کاریگر [illegible] وغیرہ اشیا کا بھی استعمال کرتے تھے۔ ان اشیا کی وجہ سے حروف کندہ کرنے میں بہت آسانی ہوتی تھی۔

ہندوستان میں زمانہ قدیم سے موئی کا رواج ہے جس طرح مختلف رنگ کے استعمال سے خوبصورت اور عمدہ تصویریں بنائی جاتی ہیں اسی طرح حروف کندہ کرنے اور لکھنے میں بھی مختلف رنگ کام میں لائے جاتے تھے جیوری میں برش استعمال ہوتا ہے اور یہ مسلم ہے کہ برش بنانا بھی قدیم باشندگان ہند جانتے تھے۔ رفتہ رفتہ لکھنے میں بھی برش کام آنے لگا لیکن برش سے لکھنے میں زیادہ وقت صرف ہوتا تھا۔ بالآخر قلم ایجاد ہوا۔ حقیقت میں قلم کی ابتدائی صورت برش ہی ہے۔ چین اور جاپان والے اب بھی برش سے لکھتے ہیں۔

جب لوگ بھوج پتر اور تاڑ کے پتوں پر لکھنے لگے تو فن تحریر کا خصوصیت کے ساتھ رواج ہوا۔ جابجا کے ترپ بہار میں ہندوستان کے نہایت قدیم بودھوں کے بیشمار صحائف بھوج پتر پر لکھے ہوئے پائے گئے ہیں۔ ان کتابوں کے بعض بعض حصے پیرس اور سینٹ پیٹرسبرگ میں ابتک رکھے ہیں۔ یہ کتابیں کم از کم پانچسو برس قبل مسیح لکھی گئی ہوں گی۔ یہ کتابیں ایسی عمدہ روشنائی سے لکھی گئی ہیں کہ اس قدر پرانی ہونے کے باوجود نہایت صاف ہیں۔

قدامت کے باعث بھوج پتر اور تاڑ کے پتوں پر لکھی ہوئی کتابیں ہندوستان میں بحد مقدس اور لائق تعظیم سمجھی جاتی ہیں کہ وہ اب بھی اپنی مذہبی سو

اور تقریبوں میں ان کا استعمال کرتے ہیں اور رجسٹر (نقوش) اور دستاویز (امین) اکثر انھیں پر لکھے جاتے ہیں۔

ایک زمانہ وہ تھا کہ چمڑے پر بھی کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ علما کی رائے ہے کہ کسی زمانہ میں دنیا کے جملہ قدیم ممالک میں چمڑے پر کتابت ہوتی تھی۔ ہندوستان میں بھی زمانۂ قدیم میں چمڑا ذریعۂ تحریر تھا لیکن "اہنسا پرمو دھرمہ" کی تعلیم شروع ہونے کے باعث چمڑے کا استعمال کم ہو گیا۔ تاہم شیر اور ہرن وغیرہ جانوروں کا چمڑا مقدس کاموں میں اب بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ صرف تحریر کتب میں ناپاکی کے خیال سے چمڑے کا استعمال ناجائز سمجھا جاتا ہے۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اسناد (ڈپلومہ) میں تو زمانہ ہماری گورنمنٹ بھی چمڑے کا استعمال کرتی ہے اور کتابوں کی جلد بندی میں تو چمڑے کا استعمال جملہ ممالک میں یکساں ہوتا ہے۔

مصر میں زمانۂ قدیم سے چمڑا لکھنے کے کام میں آتا تھا۔ چمڑے پر لکھنے کا طریقہ وہاں سب سے پہلے پرگامس کے راجہ نے ایجاد کیا۔ اس راجہ کی یادگار میں اسی زمانے سے چمڑے کے کاغذ کو "پارچمنٹ" کہنے لگے۔ پارچمنٹ کا قصہ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں۔

ملک شیریا کا بادشاہ سیلیوکس نکیٹر بہت مشہور ہو گذرا ہے۔ اس کی وفات کے بعد مغربی ایشیا کا "پرگامم" نامی ایک مقام آزاد و خود مختار ہو گیا۔ اس زمانہ میں وہاں ایک بہت بڑی لائبریری اور یونیورسٹی قائم تھی۔ اس لائبریری کو دنیا کی سب سے بڑی لائبریری بنانے کے لیے پرگامم کے راجہ نے بہت کوشش کی۔ لہٰذا اس نے مصر سے "پاپیرس" نامی کاغذ منگانا شروع کیا، لیکن بادشاہ مصر نے کاغذ بھیجنا بند کر دیا۔ پرگامم کے راجہ نے اپنی تمام کتابیں پارچمنٹ (چرمی) کاغذ پر لکھوائیں۔ یہ واقعہ حضرت مسیح سے ۲۰۰ برس قبل کا ہے۔ پارچمنٹ "پرگامم" ہی سے مشتق ہے۔

امریکہ کے سرخ رنگ والے غیر تہذیب یافتہ انڈین لکھنے میں زمانۂ قدیم سے چمڑے کا استعمال کرتے آئے ہیں۔ دلچسپ تصاویر کے ذریعہ سے ان کا تحریر پلند کرنا نہایت دلآویز ہے۔ چمڑے پر لکھی ہوئی کتابیں ان کی عجیب و غریب خط تصویر میں مرقوم ہیں۔ عبرانی زبان کی نہایت قدیم کتابیں بھی چمڑے ہی پر لکھی ہوئی ہیں۔

کاغذ سب سے پہلے اہل چین نے ایجاد کیا۔ سنہ ۱۵۳ء میں چین میں کاغذ سازی شروع ہو چکی تھی۔ علما کی رائے ہے کہ ہندوستان میں کاغذ چین ہی سے آیا ہے۔ یورپ میں کاغذ کا رواج مصر سے ہوا۔ دریائے گنگا کے کنارے ریاضت و عبادت کرنے والے مہرشیوں نے جس طرح ہندوستان میں تہذیب پھیلائی ویسے ہی دریائے نیل کے کنارے سے یورپ میں تہذیب پھیلی۔ اس دریا کے پانی میں پاپیرس نامی ایک نباتات پیدا ہوتی تھی۔ اس سے اہالیان مصر نے کاغذ بنایا۔ مصر کی نہایت قدیم کتابیں اسی پاپیرس کاغذ پر ہیں۔ ان کی مشہور و معروف تاریخ "مردہ انسانوں کی کتاب" پاپیرس ہی پر لکھی ہوئی تھی۔ اس کتاب کو مصریوں کی "گرز بیدان" سمجھنا چاہیے۔ پاپیرس کاغذ مصر ہی میں بنتا تھا جب مغربی تجارت بھی انھیں لوگوں کے ہاتھ میں تھی یہی باعث تھا کہ ان کی بلا منظوری پرگامم میں کاغذ نہ پہونچ سکا۔ اس پاپیرس ہی سے انگریزی زبان کا لفظ "پیپر" بنا ہے۔

دنیا کی تہذیب میں کاغذ، سیاہی اور قلم نے جس قدر حصہ لیا ہے کسی اور چیز نے نہیں لیا۔ اگر لکھنے کے یہ ذرائع نہ ہوتے تو نامعلوم دنیا کی تاریخ آج کیا ہوتی۔

فہم لکھنوی

سحر

علوم قدیمہ مین علم سحر کو دنیا مین شمس تہذیب کی شعاعین پھیلنے سے پہلے بہت زیادہ عظمت و اقتدار حاصل رہا ہو۔ کتب الہیہ توراۃ، انجیل اور قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہو کہ اک زمانہ مین سحر کی اہمیت و عظمت دنیا مین اسقدر رہی ہو کہ دنیا کا کوئی کام اُسکے اثر سے خالی نہ تھا۔ مذہب تھا تو اسی پر مبنی تھا اور انسانی زندگی کے امور ضروریہ تھے تو اسی سے وابستہ۔ یہان تک کہ اُس زمانہ کے لوگ دنیا کا قیام و نظام اسی پر منحصر سمجھتے تھے، لیکن تہذیب و تمدن اور علوم الٰہیہ کے نشوو نما پانے سے سحر و طلسمات مین تنزل پیدا ہوا اور مذہب نے تو اسکے افراد اور خیالات کے خلاف ایک ایسی زبردست جنگ کی کہ دنیا سے اُسکا اثر تقریباً مٹ ہی گیا۔ مذاہب مین سب سے زیادہ مذہب اسلام نے سحر اور اسی قسم کے دوسرے اُن ظنی علوم کی قوت توڑنے کی کوشش کی جو قدرت و کمالات الٰہی اور شان خداوندی مین ایک حد تک مداخلت کرنے والے تھے۔

اسلام نے اس قسم کے علوم حاصل کرنے اور اُن پر عمل پیرا ہونے کو حکم الٰہی کے خلاف قرار دیا اور آخران کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ پیروان اسلام نے علم سحر کو مذہب الٰہی کے خلاف سمجھ کر چھوڑ دیا اور پھر آہستہ آہستہ اس کا اثر کم ہوتے ہوتے تقریباً بالکل ہی جاتا رہا۔ لیکن تعجب ہو کہ مذہب اسلام کی ان سختیون کے باوجود آج سحر کے متعلق جسقدر معلومات ہمارے پاس ہین اور جتنی کتابین اس علم مین ملتی ہین اُن مین سے زیادہ حصہ مسلمان محققین کی تحقیقات اور زور قلم کا نتیجہ ہو۔

ہمارا یہ دعویٰ نہین ہو کہ متقدمین کی تصنیفات مین سے علم سحر کے متعلق کوئی کتاب اس وقت دنیا مین موجود نہین ہو۔ البتہ یہ ضرور ہو کہ حال کی تحقیقات مین علم سحر کے متعلق جسقدر لکھا گیا ہو وہ عموماً مسلمانون کی تالیفات اور تراجم کی مدد سے، اور ہمارا یہ مضمون بھی مسلمان مورخین اور محققین کی تحقیقات کا نتیجہ ہو جو مختلف عربی تاریخون اور علمی کتابون سے ماخوذ ہو۔

علم سحر اپنے مختلف شعبون کے لحاظ سے بہت سی اقسام پر مشتمل ہو جنمین سے بعض اعمال و اسرار ہین بعض روحانی اور جسمانی ریاضتین اور بعض ایسے حسابات، ترتیب الفاظ، حروف اور نقوش جن سے ایک خاص صورت و ہیئت حصول ظن کے لیے پیدا ہو جاتی ہو اور ان سب سے مقصود امور غیب اور اسرار و حالات مخفی پر اطلاع حاصل کرنا یا کسی شے اور شخص پر اثر ڈال کر خوارق العادت کام لینا وغیرہ ہو۔

سب سے پہلے علم سحر سے بابلیون اور کلدانیون نے کام لیا اُس زمانہ مین اس کا رواج بڑھتے بڑھتے اسقدر ترقی پر پہنچ گیا تھا کہ ایک حد تک جزو مذہب بن گیا۔ انھین سے یہ علم دوسرے ملکون اور شہرون مین پہنچا اور آج بھی جسقدر پایا جاتا ہو انھین کی یادگار ہو۔ بابلیوں کے علاوہ فارس اور مصر مین بھی عرصہ تک علم سحر کا اعتقاد رہا اور ہر زمانہ مین معتقدین سحر اسمین بہت سی عجیب غریب انوکھی باتین پیدا کرتے رہے۔

مورخین کی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہو کہ بابلیون پارسیون اور مصریون نے علم سحر مین جو ترقی حاصل کی اور جس ریاضت و محنت اور تعجب انگیز عقیدت سے اُسکو حاصل کیا اور اعتقاد اُسپر عمل کیا دنیا مین اس وقت تک کسی قوم اور ملک کو یہ بات نصیب نہین ہوئی۔ چنانچہ بابل و نینوا اور مصر کی پرانی عمارتین کھنڈرات زمین دوز راستے اور معابد اور جدید دریافت شدہ آثار قدیمہ کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہو کہ بابل و مصر وغیرہ کسی زمانہ مین سحر و طلسمات کا مرکز و معدن ہو گئے۔ عرب مین اسلام سے پہلے سحر کی ایک خاص قسم کہانت کا رواج تھا

جس مین عربون نے بہت سی نئی باتین اضافہ کین اور سحر کی اس خاص نوع کو درجۂ کمال پر پہنچا دیا۔

ظہور اسلام سے پہلے عرب مین کہانت کا اسقدر رواج تھا کہ کوئی کام کاہن کے مشورہ بغیر نہین کیا جاتا تھا۔ لیکن اسلام کے بعد اس کا اثر جاتا رہا اور سحر کی دوسری اقسام کا اہل عرب نے فارس وغیرہ سے حاصل کرکے یا دوسری زبانون کی کتب سے ترجمہ کرکے رواج دیا اور بہت سے رسائل اور ضخیم کتابین سحر وغیرہ علوم پر تالیف و تصنیف کین۔ لیکن اسلام کے بعد اہل عرب نے علوم سحر مین جو کچھ لکھا اُن کا اکثر حصہ محض علمی خدمت پر مبنی تھا اور بہت کم اعتقاد کے خیال سے ترتیب دیا گیا تھا۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے مین علم سحر کی بہت سی اقسام ہین جنکا احاطہ اس مختصر مضمون مین دشوار ہی اس لیے ہم ذیل مین صرف اُن اقسام کا ذکر کرتے ہین جو بہت زیادہ مشہور ہین۔

(۱) سحر و طلسمات

محققین علم سحر کا خیال ہی کہ علوم سحر اُن آثار یا قوت خیال و وہم پر مبنی ہین جو انسانی نفوس مین پائے جاتے ہین یعنی انسان ان آثار اور قوتون سے عالم عناصر مین تاثیر پیدا کرنے یا اُن کو اپنے اثر سے متاثر کرنے کی قوت رکھتا ہی۔

اس کا ثبوت اُن کے الفاظ مین یہ ہی کہ انسانی نفس مین حالت طبعی اور اسباب جسمانی کے خلاف کچھ آثار پائے جاتے ہین جو کبھی روح کی ایک خاص کیفیت سے پیدا ہوتے ہین جیسے کہ فرحت و سرور مین جسم کا خود بخود گرم ہوجانا اور کبھی نفسانی تصورات سے جیسے غلبۂ وہم سے امر موہومہ کا وقوع پذیر ہونا۔ اسکی حقیقت سمجھنے کے لیے یہ مثال کافی ہی کہ کوئی شخص مثلاً پہاڑ کی بلند چوٹی پر چڑھا ہوا ہو اور اسکا وہم یا خیال اس پر قائم ہوجائے کہ وہ اس چوٹی سے گرنے والا ہی تو یقیناً وہ چوٹی سے گر جائے گا۔ اسی طرح جو شخص اپنے خیال کو قائم کرکے کسی ایسی چیز کی مشق حاصل کرے جو بظاہر مشکل اور فوق العادت ہو اور وہم دور ہوجائے جیسے بلند پہاڑ کی ترچھی چٹان پر چڑھنا تو وہ آسانی سے چٹان پر چڑھ جائے گا اور ہرگز نہ گرے گا۔

یہ دونون صورتین ایسی ہین کہ اس علم کے جاننے والے اس سے بہت کام لیتے ہین۔ بہت دفعہ دیکھنے مین آیا ہی کہ ساحر جسم کو سادہ کر اور قوت خیال و وہم کو قائم کرکے لوہے یا تانبے کے باریک تار پر بے تکلف چلتے ہین یہان تک کہ سائیکل تک کو خاصی رفتار سے تار پر لیجاتے ہین اور گرتے نہین۔

ان دلائل سے یہ معلوم ہوجاتا ہی کہ اس قسم کی قوتین نفس انسانی مین موجود تو ہین لیکن حالت طبعی یا اسباب جسمانی سے انھین کسی نوع کا تعلق نہین بلکہ یہ تمام امور یا توتمین عارضی ہوتی ہین جو مختلف طریقون سے حاصل کی جاتی ہین اور بعض وقت خود بخود پیدا ہوجاتی ہین تو جب بدن انسانی مین اس قسم کی قوتون کا وجود تسلیم ہی تو بدن انسانی کے سوا بھی یہ قوتین دوسرے ابدان و اجسام مین بھی موجود ہونی چاہئین۔ کیونکہ ان کا تعلق جب بدن انسانی مین طبیعت اور اجسام کے اسباب سے نہین ہی بلکہ اسکے خلاف آثار و قوی ہین تو دوسرے اجسام و ابدان مین بھی اسی نوعیت سے ضرور پائی جانی چاہئین۔ اسلیے یہ کلیہ صحیح ہی کہ سحر و طلسمات کی قوت تمام اجسام مین پائی جاتی ہی اور وہ یا تو خود یا کسی دوسری قوت کی اعانت سے اُس سے کام لیتے ہین۔

اُن جانورون پر نظر ڈالو جنکے افعال و حرکات فوق العادت نظر آتے ہین اور جن سے بازیگر، مداری، بھان متی یا ساحر عجیب و غریب کام لیتے ہین۔ ہرچند کہ جانور خود اس قسم کی قوت حاصل کرنے یا اُس سے کام لینے کی عقل نہین رکھتے کیونکہ اُن کو قدرت نے

جزئیات کا ادراک دیا ہے کلیات کا نہین، اسلیے انسان اُن سے اُن کی طبیعت اور اسباب جسمانی کے خلاف کام لیتے اور انکو مجری طبعی کے خلاف امور کا خوگر بنا دیتے ہین، اور پھر یہ قوت ان مین مدت العمر باقی رہتی ہے۔

علم سحر کی یہ صنعت نہایت جامع اور وسیع ہے اور ضرورت تھی کہ ہم اسکو ذرا وضاحت سے لکھتے لیکن طوالت کے خیال سے ہم نے اسیقدر پر اکتفا مناسب سمجھا۔

سحر اور طلسمات اپنے آثار اور قوتون کے لحاظ سے بظاہر ایک ہی چیز ہین۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ساحر اپنے فوق العادت امور پیش کرنے اور حیرت انگیز کام دکھانے مین کسی خارجی چیز کا محتاج نہین ہوتا بلکہ جو کچھ کرتا ہے اپنی ذاتی قوت اور مشق وخیال سے، اور طلسمات البتہ خارجی اعانت کا محتاج ہے۔ ماوراے ازین سحر کے خلاف طلسمات مین اسرار اعداد، روحانیات کواکب، خواص موجودات اور اوضاع افلاک سے بھی مدد لی جاتی ہے جو صاحب طلسمات کے نزدیک عالم عناصر مین موثر ہین بعض کا خیال ہے کہ سحر ایک روح کا دوسری روح سے متحد ہونے کا نام ہے اور طلسمات مین روح کا اتحاد جسم سے ہوتا ہے جسکی توضیح اُن کے خیال کے بموجب یہ ہے کہ طبائع علویہ سماویہ کا طبائع سفلیہ کے ساتھ متحد و مربوط ہونا طلسمات کا اصل اصول ہے اور اسی وجہ سے صاحب طلسمات اپنے کامون مین ستارون کی گردش اور اُن کی ارواح سے کام لیتا اور اُن کے آثار وطبائع سے اپنے کامون کا نتیجہ حاصل کرتا ہے۔

چونکہ سحر کے افعال وحرکات انسانی نفس کی قوت غیر طبیعیہ سے وجود پذیر ہوتے ہین، اور فطرت نوعی اس قسم کی تاثیرات کے خلاف نہین ہوتین، اس لیے وہ افعال اور امور فوق العادت جو خاصان خدا سے ظہور پذیر ہوتے ہین سحر مین داخل نہین ہین۔ کیونکہ ان امور کا تعلق نہ فطرت نوعی سے ہوتا ہے اور نہ نفس انسانی کی قوت غیر طبیعیہ بلکہ ان کا وجود پذیر ہونا قوت الٰہیہ پر موقوف ہے جو برگزیدگان مذہب اور منزل من اللہ لوگون مین خدا کی طرف سے پیدا ہوتی ہے اور جس کے ذریعہ سے دنیا کو فوق العادت امور دکھا کر اپنے دعوے کا ثبوت پیش کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے امور کو جو قوت الٰہیہ کی تائید سے ظہور پذیر ہون معجزہ کہتے ہین اور جو امور فطرت نوعی یا نفس انسانی کی قوت غیر طبیعیہ کا نتیجہ ہون اُن کو سحر۔

بعض دفعہ معجزہ اور سحر مین ایک غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے اور مشکل سے پتہ چلتا ہے کہ یہ معجزہ ہے یا سحر، اور یہ صورت اُس وقت پیش آتی ہے جبکہ ساحر اپنے ملکۂ خاص یا تعلق روحانیات سے کواکب یا شیاطین یا ارواح خبیثہ سے امداد حاصل کرنے کی قوت حاصل کر لیتا ہے اور اُن کے ذریعہ سے بعض ایسے فوق العادت امور پیش کرتا ہے جو نفس انسانی کی قوت فطری سے بہت کچھ بلند و برتر ہوتے ہین، اسکی شناخت اس طور پر ممکن ہے کہ قوت الٰہیہ کی رو سے جو معجزہ ظہور پذیر ہوگا وہ عین حقیقت اور واقعہ نفس الامری ہوگا اور سحر اس کے خلاف۔

ابن خلدون مشہور مورخ لکھتا ہے کہ سحر وطلسمات کے تاثیرات نفسانی ہی کے اصناف مین سے ایک اور قسم آنکھ کے ذریعہ سے کسی پر اثر ڈالنا ہے اور یہ ایک خاص مشق وملکہ ہے جو ساحر حاصل کرتے ہین اور اس قوت یا ملکہ سے معمول پر حیرت انگیز اثر ڈال کر اُس سے عجیب غریب کام لیتے ہین بعض لوگون کی آنکھون مین فطری طور پر بھی اس قسم کی قوت ہوتی ہے کہ اُن کی نگاہ مقابل یا مخالف یا معمول پر بہت سے فوق العادت اثرات پیدا کرتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فطری قوت بے اختیار اثر کرتی ہے اور غیر فطری یا کسبی اختیاری ہوتی ہے

(۲) سیمیا یا اسرار حروف

عاملان علم سحر کی اصطلاح مین سیمیا اُن تصرفات الٰہیہ کا نام ہے

جو مخصوص حروف اسماء حسنیٰ اور کلمات الٰہیہ کے ماتحت عالم طبیعت میں ہوتے ہیں۔ یعنی قدرت نے اسماء حسنیٰ اور کلمات مخصوصہ میں کچھ ایسے اسرار وخواص ودیعت رکھے ہیں کہ عالم کون یا طبیعت پر اُن کا اثر ہوتا ہے اور وہ حروف جو اسرار ربانی اپنے اندر رکھتے ہیں عالم طبیعت میں تصرف کرتے ہیں۔

حروف وکلمات اور اسماء حسنیٰ کے تصرفات میں محققین کا اختلاف ہے: بعض لوگ حروف کے مزاج کو فعل تصرف کی حقیقت قرار دیتے ہیں اُن کے نزدیک حروف عناصر کی طرح طبیعت رکھتے اور حسب ذیل اقسام پر منقسم ہیں: آتشی۔ بادی۔ آبی۔ خاکی۔

ان چاروں طبیعتوں کے مخصوص حروف ہیں جو بہ قاعدۂ ابجد اس طرح منقسم ہیں کہ ابجد کے مسلسل کلمات میں سے پہلا حرف آتشی دوسرا بادی تیسرا آبی اور چوتھا خاکی ہے۔ اسی طرح تمام حروف مسلسل آتشی بادی آبی اور خاکی ہیں۔ اس اعتبار سے آتشی حروف سات ہیں یعنی ابجد کے مسلسل کلمات میں سات حرف آتشی ہیں یعنی ا۔ ہ۔ ط۔ م۔ ف۔ ش۔ ذ۔ اور سات بادی یعنی ب۔ و۔ ی۔ ن۔ ص۔ ت۔ ظ۔ اور سات آبی یعنی ج۔ ز۔ ک۔ س۔ ق۔ ث۔ غ۔ اور سات خاکی یعنی د۔ ح۔ ل۔ ع۔ ر۔ خ۔ س۔

اہل سیمیا کے نزدیک حروف اپنے مذکورۂ بالا امزجہ کے لحاظ سے موجودات پر مختلف اثر ڈالتے ہیں۔ مثلاً آتشی حروف سرد امراض کے دفع کرنے اور قوت حرارت زیادہ کرنے میں خاص طور پر موثر ہیں۔ آتشی حروف میں قوت حرارت بڑھانے میں مختلف حالتیں ہیں بعض اشیاء میں ان کی قوت حسی اعتبار سے اثر کرتی ہے اور بعض چیزوں میں حرارت حسی پیدا نہیں کرتی بلکہ حرارت کا مفہوم یا حکم پیدا کرتی ہے۔ غیر حسی حرارت کی مثال ستارۂ مریخ کا اثر ہے یعنی جس حرف سے مریخ کو نسبت ہوگی اُس کا اثر یہ ہوگا کہ جنگی کاموں اور قتل وغارت گری میں اُس سے مدد ملے گی۔ اسی طرح آبی حروف گرم امراض (بخار وغیرہ) کے دفع کرنے اور سرد قوتوں کو تقویت دینے میں خاص طور پر اثر رکھتے ہیں۔

بعض کے نزدیک حروف کے تصرفات عددی نسبت کے اعتبار سے ہیں یعنی حروف کے اعداد احاد عشرات اور مآت وغیرہ میں اگر باہم ایک قسم کی نسبت ہو تو اُن کا اثر قوی ہوگا اور اگر حروف کے اعداد کی نسبت باہم مختلف ہو تو اثر کمزور۔ مثلاً حرف ب کے عدد دو ہیں اور کاف کے ۲۰ اور راء کے ۲۰۰ یہ تینوں حرف احاد عشرات اور مآت میں باہم دو کی نسبت رکھتے ہیں۔ اسی طرح مذکورۂ بالا حروف اور دال میم اور تاء میں (کہ باہم چار کی نسبت رکھتے ہیں) نصف اور ضعف یعنی آدھے اور دُوگنے کی نسبت ہے۔

حروف کے امزجہ، طبائع، نسبت عددی اور حروف کے ذاتی خصائص وآثار چونکہ بظاہر عسیر الفہم ہیں اور کسی خاص فن یا علم سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ ذوق وکشف پر مبنی ہیں اس لیے اُن کے متعلق کوئی خاص قاعدہ وضع نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ عاملانِ علم سحر وغیرہ نے اپنی تحقیقات اور ذوق وکشف سے جو جزئیات پیدا کی اور اُنکے متعلق مخصوص قواعد ضبط کیے ہیں اُنھیں پر قیاس کر کے نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

(۳) سوالات کے جوابات نکالنا

سحر کی یہ نوع سیمیا کی ایک فرع ہے جسکو اصطلاح سحر میں زائچہ کہتے ہیں۔ اس سے مجاہدہ طاعت عبادت محبت اور تعشق وغیرہ امور متعلق ہیں اور حروف کے ذریعہ سے سوالات ضمیر وغیرہ بتائے جاتے ہیں۔

علامہ ابن خلدون نے اپنے مقدمۂ تاریخ میں اسکے متعلق ایک طویل بحث کی ہے اور اُسکے قواعد واصول کو شرح بیان کیا ہے جس کو طوالت کے خوف سے نظر انداز کیا جاتا ہے۔

---

(۴) رمل

سحر کی اقسام مین رمل کو ہر زمانہ مین عظمت و اقتدار حاصل رہا ہی اسکی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہی کہ ابتدا ً رمل یعنی ریت پر نقوش و خطوط انگلی سے کھینچ کر زائچہ بنایا جاتا تھا۔ لیکن علوم و فنون کی ترقی کے ساتھ یہ قاعدہ ترک کرنا پڑا اور پتون کا غذون وغیرہ پر خطوط و نقوش بنا کر اشکال حاصل کی گئین اور اب تو اس نے اتنی ترقی حاصل کی ہی کہ پانسہ یا قرعہ پھینک کر اشکال قائم کر لیتے ہین۔

سب سے پہلے اس سے اس طرح کام لیا گیا کہ ایک سانس مین نقطون کی چار سطرین بغیر شمار کے قائم کی گئین اور انکو دو پر تقسیم کرنے کے بعد اگر کچھ نہ بچا تو خط زوج (—) اور اگر ایک نقطہ باقی رہا تو خط فرد (۰) قائم کیا گیا۔ اسی دستور پر چارون سطرون سے ایک شکل چار مرتبہ کی بنائی گئی۔ اسی طرح نقطون کی سولہ سطرون سے چار شکلین بنائی جاتی ہین اور پھر ان چار شکلون سے چار شکلین اور پھر آٹھون کے امتزاج سے چار اور اسی طرح سولہ شکلین حاصل کی جاتی ہین۔ ان سولہ شکلون مین اُن کے خیال کے مطابق بارہ شکلین بارہ بروج کے اعتبار سے اور چار اوتاد فلک کے لحاظ سے۔ کل سولہ شکلون سے نتیجہ سوال حاصل کیا جاتا ہی جنکی طبیعت مرتب باہمی نسبت اور تعلق بروج و ستارگان سے عالم عناصر و موجودات پر احکام لگائے جاتے ہین۔

علم نجوم رمل ہی کے قاعدون سے مستنبط ہوا ہی۔ فرق دونون مین صرف اسقدر ہی کہ نجوم اوضاع طبیعت سے منسوب ہی اور رمل اتفاقات سے متعلق۔

بعض لوگون کا خیال ہی کہ رمل اسرار نبوت قدمیہ سے ہی جس کو حضرت ادریس و حضرت دانیال علیہم السلام نے ایجاد کیا یا اس سے زیادہ تر کام لیا۔ لیکن حقیقت یہ ہی کہ یہ نسبت کسی معتبر تاریخی ثبوت اور شہادت سے بالکل خالی اور دلائل عقل سے معرا ہی۔ پہلے کہ نبوت اس قسم کے علوم سے کام لینے کی محتاج نہین ہی۔ بلکہ نبی قوت الٰہیہ کے ذریعہ سے امور عجیب اور اسرار خفیہ کا اظہار کرتا اور معجزہ پیش کرتا ہی۔

رمل اور نجوم کے ذریعہ سے امور غیب اور ضمائر انسانی وغیرہ کا حال معلوم کیا جاتا اور مخفی چیزون کا پتہ بتایا جاتا ہی اور بھی ان سے بہت سے کام لیے جاتے ہین۔ یہان تک کہ اطبا ر متقدمین و متاخرین نے تو امراض کی تشخیص اور ادویات کی تجویز مین بھی ان سے مدد لی ہی۔

(۵) حساب نیم

ارسطو نے اپنی کتاب سیاست مین اس علم کا نہایت تفصیل سے تذکرہ کیا ہی اور اسکو علوم سحر کی اصناف مین قرار دیا ہی۔ اس سے غالب و مغلوب کا حال معلوم کیا جاتا ہی۔ یہ علم نہ روحانیات سے تعلق رکھتا ہی اور نہ تاثیرات نجوم سے اور نہ ظن و تخمینہ سے اسے کسی خاص قسم کی نسبت ہی بلکہ یہ صرف ایک حساب ہی جس سے بادشاہون اور دشمنون کے باہم غالب و مغلوب ہونے کا پتہ چلتا ہی۔ اس سے کام لینے کا قاعدہ یہ ہی کہ بہ قاعدہ جمل حریفین کے نام کے حروف کے اعداد علٰحدہ علٰحدہ جمع کیے جائین اور انکو علٰحدہ علٰحدہ نو پر تقسیم کر دیا جائے۔ تقسیم کرنے کے بعد اگر دونون نام کے بقیہ اعداد کم و بیش ہین اور دونون بحیثیت زوج یا فرد متحد ہین تو جس کے نام کے اعداد کم ہین وہ غالب رہے گا اور اگر ایک کے بقیہ اعداد زوج ہین اور دوسرے کے فرد تو جس کے اعداد زیادہ ہین وہ غالب ہی اور اگر تقسیم کے بعد دونون عدد برابر ہین اور زوج ہین تو مطلوب غالب اور اگر دونون فرد ہین تو طالب غالب۔

مذکورۂ بالا قاعدۂ تقسیم کے علاوہ اور بھی کچھ خبر انکا و اقسام ہین جن کا بیشتر حصہ عموماً انھین اقسام مین اضافہ کر لینے کے بعد حاصل ہوا ہی۔

یون تو سحر کے جاننے والے اور اس علم کے عالم کامل ہر زمانہ و ہر ملک مین رہے ہین لیکن عرب مین اسلام سے پہلے سحر کا بہت زور تھا یہان تک کہ بعض کامل الفن ساحرون نے اپنی قوت سحر کے بھروسہ پر نبوت تک کا دعویٰ کیا ہے جنمین سے شفی کاہن، جذیمۃ الابرش، ابن صیاد، سواد بن قارب، اسود عنسی، عامر بن عبداللہ، مسیلمۂ کذاب، سجاح، طلیحہ اسدی وغیرہ بہت مشہور رہین۔ ان مین سے بعضے ظہور اسلام کے بعد بھی موجود تھے۔

مسلمانون مین علم سحر اور کیمیا کے عالمون مین جابر بن حیان بہت بڑا شخص گذرا ہے۔ اس کے بعد مسلمہ بن احمد مجریطی، امام بونی، ابن علی، احمد بن علی، ابو معشر فلکی، ابو العباس غمری، صلاح الدین صفدی، بسطامی اور جویری وغیرہ ساتوین صدی ہجری کے بہترین عالمان سحر تھے۔

علوم سحر کی قدیم کتب کا ذخیرہ اب بہت کم ملتا ہے۔ البتہ نایاب قلمی کتاب کا ایک قابلِ قدر ذخیرہ مصر کے مشہور خدیوی کتبخانہ مین اس وقت تک موجود ہے۔

آغا رفیق (بلند شہری)

العصر

ہندسہ کی تاریخ

علوم وفنون قدیم مین شاید ہندسہ سب سے پُرانا علم ہو۔ یہ کہنا نہایت دشوار ہو کہ اسکی ابتدا کس زمانہ مین؟ کس ملک مین؟ اور کس آدمی کے وسیلہ سے ہوئی تھی۔ کسی قسم کے معتبر تاریخی کوائف موجود نہین ہین؛ جن سے اسکی ابتدائی تاریخ پر روشنی پڑے۔ صاحب فکر اس امر کو تسلیم کرین گے کہ عقل انسانی کی ابتدائی مصروفیتون اور کوششون کا پتہ لگانا ناممکن کے قریب قریب ہے۔ جس وقت انسان صفحۂ ہستی پر نمودار ہوا؟ اور اُس نے موجودات ارضی وسماوی پر پہلے پہل نگاہ ڈالی، تو اُس کے دل مین کیسے کیسے خیالات، کیسے کیسے ولولے، اور کیسی کیسی اُمنگین پیدا ہوئی تھین!؛ اور اُنھیں اُس نے کس طرح ظاہر کیا تھا؟ آیا حروف میں بند کیا تھا؟ یا صرف زبانی تحسین اور واہ واہ پر اکتفا کی تھی؟ ان سوالات کا جواب تلاش کرنے کی کوشش بالکل بے سود ثابت ہوگی؛ البتہ تصور سے کام لیا جا سکتا ہو۔ جب ہم کسی ایسی شے کو دیکھتے ہین جو ہمارے مشاہدہ مین پہلے کبھی نہ آئی ہو، اور نہ اُسکا کبھی ذکر سنا ہو، اُس وقت جو خیالات ہمارے دل مین اُٹھتے ہین، وہی ابتدائی انسان کے ذہن مین بھی تولد پذیر ہوے ہون گے۔

قدامت ہندسہ کی بابت تاریخی شہادت آثار قدامت سے جو ایشیائے کوچک، ایران، مصر، میکسیکو وغیرہ ملکون کے پُرانے شہرون کے کھنڈرون سے برآمد ہوے ہین، یہ ظاہر ہوتا ہو کہ زمانۂ قدیم بعید مین کئی قومون نے تمدن مین معتدبہ ترقی کی تھی۔ چاہے اُن کی ترقی بیسوین صدی کی ترقیون کے مقابلہ مین پاسنگ بھی نہ ہو، مگر اُن قومون نے اپنی اپنی ہمت کے مطابق علوم وفنون کو ترقی دینے کی کوشش کی تھی؛ اور وہ اُسکے نشان اور ثبوت پیچھے چھوڑ گئے ہین جو آثار قدیمہ کے محققون کی کوششون سے ہم پہنچ رہے ہین۔

اہل مصر ہم صرف تاریخی کوائف کی شہادت پر علم ہندسہ کی ابتدا

اور اسکی ترقی ایک خاص قوم سے منسوب کرینگے، جس سے بعد ازان اور قومون نے سیکھا اور اُن کی دماغی کوششون سے اسے نشو و نما حاصل ہوئی۔

ہندوؤن کے تمدن کی قدامت ہنوز ثابت نہین ہوئی ہے۔ جو کچھ ثابت ہوا ہے، اُسکی بنا پر ہم اپنے تئین زمانۂ قدیم کی قدیم ترین قوم نہین قرار دے سکتے۔ مگر مصر و بابل کے پُرانے تاریخی کوائف اور قدیم زمانہ کی یادگارین اُن قومون کے نہایت پُرانے تمدن پر معقول روشنی ڈالتی اور معتبر شہادتین پیش کرتی ہین۔ اس لیے اگر اہل مصر سے علم ہندسہ کی ابتدا منسوب کی جائے، تو غیر مناسب نہوگا۔ منتھو قدیم زمانے کا ایک نہایت ہی مشہور مصنف تھا جو مسیح سے تقریباً تین سو سال پیشتر ہو گزرا ہے۔ یہ ہیلیو پلس کے سورج دیوتا کے مندر کا پجاری اور مصری پروہتون کے منڈل کا پردھان تھا۔ یونانی زبان اور دیگر علوم و فنون کا جو اس زمانہ مین مصر یا اُسکے قرب و جوار کے ممالک مین رائج تھے ماہر تھا۔ اُس نے طالمی فلڈلفوس ثانی کے حسب فرمائش "تاریخ مصر" قدیم زمانہ سے لے کر اس بادشاہ کے عہد تک مرتب کی تھی۔ اس مین اُس نے اکتیس (۳۱) شاہی خاندانون اور تین سو ستر (۳۷۰) بادشاہون کے حالات قلمبند کیے تھے۔ اسکے بیان کی رو سے پہلا مصری بادشاہ جس کا نام مینس تھا ۵۰۰۰ ق م مین تخت نشین ہوا تھا۔ اُس نے بالائی اور نشیبی حصص مصر کو متحد کر کے حکومت کی تھی۔ اسی مورخ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اہرام مصر چوتھے خاندان کے ایک بادشاہ نے تعمیر کیے تھے، جس کی تصدیق نیول صاحب کی دریافتون سے ہو گئی ہے۔ یہ چار ہزار سال قبل مسیح کا واقعہ ہے۔ پروفیسر فلنڈرس پیٹری نے جو انگلستان کے ایک مشہور محقق ہین اور مصری یادگارون اور آثارون کے بھی بڑے ماہر سمجھے جاتے ہین شاہی مقبرون کو کھودا ہے، اور وہان سے کئی عجیب چیزین نکالی ہین جن کی بنا پر وہ کہتے ہین کہ مصر کے پہلے بادشاہ نے تقریباً[۱] ۵۵۰۰ ق م مین حکومت کی۔ گیارھوین شاہی خاندان کے بادشاہون کا زمانہ حرفتی ترقیون کے سبب سے بہت ہی مشہور سمجھا جاتا ہے۔ اسکے تیسرے رکن امینم ہات ثالث نے کئی عجیب عمارتین تعمیر کرائی تھین۔ اُس نے صحرا مین ایک مصنوعی جھیل بھی بنوائی تھی جس مین نیل سے کاٹ کر نہرین ڈالی گئی تھین۔ اسکے کنارے پر ایک مربع نما نہایت عالیشان عمارت بنوائی تھی جو بھول بھلیّون کا محل تھا۔ پتھر کا تھا۔ قرن الحجر جدید اور قرن الحجر قدیم کی کئی چیزین قاہرہ کے مشرق سے نکلی ہین۔ مثلاً پروفیسر ہینز نے چند برس ہوئے قاہرہ کے قرب مین ایک پُرانا کارخانہ دریافت کیا تھا جہان قدیم زمانہ مین چقماق وغیرہ کے سنگین اوزار اور ظروف بنتے تھے۔ جبل الساس متصل طیبہ مین جنرل پٹ ریورس اور پروفیسر ہینز نے زمین کے چند فٹ اندر سے پتھر کی بنی ہوئی اشیا دورانِ تحقیقات مین نکالی تھین۔ ان کی نسبت صاحب جو جنرل پٹ ریورس کے ہمراہ تھے لکھتے ہین "یہ چیزین مصری مندرون اور یادگارون سے بھی پُرانی ہین"۔ یہ آثار و علامات تمدن مصری کی قدامت پر دلالت کرتے ہین جو عالمان آثار قدیمہ کی رائے مین چھ اور بارہ ہزار سال کے مابین ہے۔

اہل بابل | براسوس شہر بابل مین تقریباً پونے تین سو سال قبل از مسیح، بیلس یا بیل دیوتا کے مندر کا پجاری تھا۔ یہ شخص بڑا مشہور فاضل تھا۔ کئی زبانون کا ماہر تھا بابلی، اکادی، اسوری اور قرب و جوار کے ملکون کی تاریخ اور علوم سے بھی واقف تھا۔

---

[۱] بحوالہ سیموئل لینگ ابتداء الانسان [۲] تمدن کی زندگی صفحہ ۱۷، مصنفہ ایس لینگ۔

اُس نے ڈھائی سو سال قبل مسیح مین ایک تاریخی کتاب مرتب کرکے انطیاکس اول کے نذر کی تھی جس کا نام "چلدکہ" یعنے "ملک کلدیہ" تھا۔ اس مین اُس نے بابل اور نینوہ کی نہایت قدیم زمانہ کی تاریخ بیان کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہی کہ اُن دونون ملکون مین ایک بہت قدیم زمانہ مین علوم و فنون کا چرچا تھا اور اُن مین بہت ترقی ہوئی تھی۔ جیسے منظو کے بیانات قدیم زمانہ کی مصری یادگارون اور کتبون اور نیز یونانی مورخون خلا ہرداطوس اور دیودرس سے ہوتی ہی' اسی طرح براسوس کے کوالف کی خط میخی کے کتبون اور خشتی کتابون کے بیانات سے جو بابل اور نینوہ کے کھنڈرون سے برآمد ہوئی ہین' اور نیز قدیمی یادگارون سے' پوری تائید ہوگئی ہی۔

اس بحث سے یہ دکھانا منظور ہی کہ مصر اور کلدیہ و اسوریہ کے کتبون اور یادگارون اور دیگر تاریخی کوالف سے بہت قوی شہادت اس قیاس کو تقویت دینے کے لیے موجود ہی کہ وہان ایک نہایت قدیم زمانہ مین علوم و فنون کو بہت رونق حاصل ہوئی تھی' اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا محال نہین ٹھہر سکتا کہ علم ہندسہ کی مصر مین ابتدا ہوئی تھی۔

کلدانی ہندسہ — بعض عالمون کا یہ خیال ہی کہ ابتدا مین جو قوم دریاے دجلہ اور فرات کے کنارون پر آباد تھی اُس نے حساب اور ہیئت مین سب سے پہلے ترقی کی تھی۔ اسوریہ اور بابل کی قدیمی یادگارون کی بناوٹ سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہی کہ وہان علم ہندسہ کا کچھ رواج تھا کیونکہ وہ اسکے وسیلہ سے آنے والے واقعات کی پیشین گوئی کیا کرتے تھے۔ وہان کے باشندے رمل کے بڑے شائق تھے۔ وہ زمین پر شکلین بناکر زائچے وغیرہ تیار کرتے تھے جس سے رفتہ رفتہ خطوط متوازی مثلث' اور مستطیل بنانے کی طرف مائل ہوئے۔ بعد ازان اُنھون نے زاویہ قائمہ اور دوائر بنائے جن کے محیط چھ حصّون مین منقسم کیے اور ہر ایک کو ساٹھ مین بانٹا جس سے اُن کی غرض محیط دائرہ اور قطر کے درمیان تناسب قائم کرنا تھا۔

اہل مصر کا ہندسہ — لیکن سب سے زیادہ ضروری اور قابل قدر ترقی اُس قوم کی ہی جو دریاے نیل کے کنارون پر آباد تھی۔ یونانیون نے جو یورپ مین علوم و فنون کے اُستاد سمجھے جاتے ہین' علانیہ اس امر کا اعتراف کیا ہی کہ اُنھون نے علم ہندسہ مصر والون سے سیکھا تھا اور جسے اُنھون نے بعد ازان بہت ترقی دی تھی۔ ہرداطوس تقریباً ساڑھے چار سو سال قبل مسیح مین سیاحت مصر کو گیا تھا۔ اُس نے اپنے سیاحت نامہ مین لکھا ہی کہ علم ہندسہ کی مصر مین اُس وقت ابتدا ہوئی تھی جب سی سوس طرس نے اپنی سلطنت کی قابل کاشت اراضی اپنی رعایا کے درمیان مساوی حصّون مین بانٹنے کا حکم دیا تھا۔ اس بادشاہ کے تاریخی وجود کی نسبت طرح طرح کے شکوک ظاہر کیے جاتے ہین۔ ہرداطوس اور دیودرس وغیرہ پرانے زمانہ کے مورخ کہتے ہین کہ یہ چکرورتی راجہ تھا۔ اُس زمانہ کی معلوم دنیا اس کے زیر نگین تھی۔ ہندوستان کی شمال مغربی سرحد اسکی سلطنت سے ملی ہوئی تھی۔ بارھوین شاہی خاندان کا ایک حکمران سنوسرت نامی بھی تھا جس سے یہ بڑے بڑے کارہاے نمایان منسوب کیے جاتے ہین۔ ہرداطوس یہ بھی کہتا ہی کہ ہر سال دریاے نیل اور اسکے معاونون مین سخت طغیانیان آتی تھین جن سے ملک کا بڑا حصہ تہ آب ہونے کے علاوہ مٹی اور ریت سے ڈھک جاتا تھا۔ دیہات' قصبہ جات' پرگنہ جات اور اضلاع کے حدود مٹ جاتے تھے۔ اس مشکل کو حل کرنے کی غرض

سلہ بحوالہ "ریڈمانٹ" مطبوعہ اکتوبر [illegible]ء

اہل مصر نے علم ہندسہ کا مطالعہ شروع کیا۔ یہ خیال معقول معلوم ہوتا ہے۔ نیل کے سالانہ سیلابون سے جو حدود برباد ہو جاتے تھے اُس سے رہائی حاصل کرنے کے لیے مصریون نے جو بڑے ذہین اور سمجھ والے تھے ضرور کوئی ترکیب نکالی ہو گی، اور شاید یہ ترکیب علم ہندسہ کی ہو۔

اِساقرطیس نے ۳۹۳ ق م مین اپنی ایک کتاب مین لکھا تھا کہ ہندسہ کا مطالعہ ہر ایک مصری نوجوان کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اسیطرح افلاطون، ارسطالیس، دیودرس، سقولس، ہران مستوطن سکندریہ، مشہور عالم جغرافیہ استرابو، دماقرطوس بھی اپنی کتابون مین لکھتے ہین۔ آخرالذکر یونانیون کے درمیان علم ہندسہ کی مہارت مین خاص شہرت رکھتا تھا۔

طالیس یا تالیس ملطی جو تقریباً پونے پانچ سو برس قبل مسیح مین گذرا ہے سیاحت کرتا ہوا مصر مین بھی گیا تھا۔ دیوجانس لائرٹس اسکی سوانحمری مین لکھتا ہے کہ اُس نے مصر کے مشہور شہر ہیلیوپولس مین مصری پروہتون سے علم ہندسہ سیکھا تھا، اور وہان چند ماہ تک رہا تھا، جسکے دوران مین اُس نے کئی مصری فنون سے واقفیت حاصل کی تھی۔

ہیروڈوٹس کہتا ہے کہ مصریون نے عملی مقاصد سے یہ علم نکالا تھا اور اسکا یہ خیال درست ہے۔ آجکل مصر کے پُرانے شہرون کے کھنڈرون کے نیچے سے کئی بڑی عالیشان عمارتون کے آثار نکلے ہیں اور بعض جگہ مصنوعی جھیلین اور بند وغیرہ کے نشانات دیکھے گئے ہین جن سے ظاہر ہے کہ انھون نے خاص عملی مقصد سے یہ علم نکالا تھا۔ آئسن لوہر (جرمن محقق آثار قدیمہ) نے ۱۸۷۷ء مین اپنی ایک کتاب مین جس مین اُس نے مصریون کے ریاضیات پر بحث کی ہے، یہ لکھا ہے کہ ایک مصری مسمیٰ احمس نے ایک چھوٹی کتاب الموسوم بہ "رہنمائے تخمینجات" سترہ یا بیس صدی قبل مسیح مین تیار کی تھی، جو پپیلہ گھاس پر لکھی ہوئی کھنڈرون کے نیچے سے برآمد ہوئی ہے۔ اسمین تخمینہ جات اور حساب کی بابت بہت سی باتین ہین۔ مگر ہندسہ کی نسبت بہت کم اطلاع ملتی ہے کیونکہ احمس نے اس علم کو ریاضیات کی ایک شاخ نہین قرار دیا ہے بلکہ حساب کا ایک قاعدہ مانا ہے جو تخمینون مین کام آتا تھا۔ اس کتاب سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اہلِ مصر مربع کا رقبہ نکالنا جانتے تھے مگر انھین یہ طریقہ معلوم نہ تھا کہ مستطیل، مثلث اور ذوارلعۃ الاضلاع کا رقبہ کس طرح دریافت کیا جاتا ہے۔ سرزمین فراعنہ کے باشندے مربع کے برابر دائرے بنایا کرتے تھے جس کا ایک ضلع قطر کا $\frac{8}{9}$ ہوتا تھا۔ جو $(\frac{16}{9})^2$ یا ۳٫۱۶۰۴ کے مساوی ہوتا ہے، اور ان کا یہ قاعدہ تقریباً درست تھا۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ وہ کھتون کا حجم کس قاعدہ سے دریافت کرتے تھے مگر انھون نے ایک خاص طریقہ حساب[1] سے مخروطی منارون کے حجم کا مسئلہ حل کیا تھا جو ہمارے آجکل کے زاویہ کے خط مماس اور جیب مستوی کے قاعدہ سے مشابہ ہو گا۔

اس سے ظاہر ہو گیا ہوگا کہ اہلِ مصر کے ہندسہ کی بابت کوئی معتبر کتاب اور کتبہ نہین ہے جس سے اسکی ماہیت واضح ہو۔ شاید محققون کی کوششون سے پُرانے کھنڈرون اور یادگارون سے ایسی تحریرین دستیاب ہو جائین جن کی بدولت یہ معلوم ہو کہ مصریون نے کس حد تک اس علم مین ترقی کی تھی۔ جو کچھ دریافت ہو سکتا ہے وہ صرف عمارتون اور انجنیری کامون، بندون کی طرز ساخت اور یادگارون اور کتبون سے معلوم ہوا ہے جسے علم بالواسطہ کہنا بجا ہو گا۔

---

[1] پی اور ریاضی دانٹ، ترجمہ محمد اکرام اشرف صفحہ ۱۰۳، اکتوبر ۱۹۰۲ء

یونانیوں کا علم ہندسہ

تاریخی کوائف کے اعتبار پر تسلیم کیا جاتا ہو کہ اہل یونان نے بابل اور مصر والون سے علم ہندسہ اور دیگر علوم و فنون حاصل کیے تھے جو ان ممالک کے ترقی کرنے والے باشندون نے اختراع کیے اور اُنھین فروغ دیا تھا۔ مگر شاگرد نے اپنی ستعدی طباعی اور عقلی کوششون سے اُستاد کو نیچا دکھایا۔ یہ بخوبی ظاہر ہے کہ یونانیون نے اسلاف سے علوم حاصل کیے۔ اور ان مین اتنی ترقی کی کہ اُن کی خارجی اصلیت کو بالکل ملیامیٹ کرکے اُنھین خاص اپنی اختراع بنالیا۔

یونان کی سائنس کا مبدا اور پیشواے اعظم طالیس باشندہ ملطیہ تھا۔ یورپ مین پہلے پہل اسی نے علوم و فنون کو جنکا مجموعی نام سائنس ہے رواج دیا تھا۔ اس حکیم اور اسکے شاگردون نے ریاضیات کو بہت تھوڑی ترقی دی تھی مگر اُس نے اور اُسکے مقلدون نے طبیعیات اور حقائق الاشیا اور مظاہر طبیعی کی دریافت کا ایک نیا طریقہ رائج کیا تھا اور اپنی توجہ کو اسی تک محدود رکھا۔ اگر طالیس اور اسکے مکتب کو یونانی حکما و علما کی ریاضی ترقیون کا مشعل بردار قرار دیا جائے تو غیر انسب نہ ہوگا۔

طالیس کے بعد فیثاغورث کا زمانہ آیا جو اطالی مکتب کا بانی سمجھا جاتا ہو۔ اُسی نے ابتدا مین علم ہندسہ کی تحقیقات اور ترقی کی طرف اپنی تمام تر توجہ مائل کی تھی۔ اُس نے ہندسہ مین استعمال ہونے والے آلات بنائے تھے تناسب کا قاعدہ نکالا تھا، رقبہ معلوم کرنے کا ڈھنگ وضع کیا تھا وغیرہ۔

اسکے بعد اسکے دو نامی شاگردون نے ہندسہ کی تحقیقات کا کام جاری رکھا۔ ایک کا نام بقراط (متوطن خیاس) اور دوسرے کا ارخی طاس (باشندۂ ترن توم) تھا اسکے بعد یونان مین جو فلاسفر اور اُنکے طبقے قائم ہوئے اُنھون نے اس علم سے بے پروائی نہین برتی بلکہ ان مین سے بعض ایسے تھے جو اس کی ترقی کی طرف خصوصیت سے متوجہ رہے۔ زینو، دماقریطس، انکساغورث، اور ہیپیاس، افلاطون، ارسطو اور کئی حکیم ہندسہ کی طرف متوجہ تھے۔

بہت سے حکیمون اور محققون کی مساعی متفقہ سے ہندسہ کی عمارت کی بنیاد مستحکم ہوگئی اور اسکی تعمیر مین اتنی ترقی ہوگئی کہ بعض نے خیال کیا کہ اسے ایک علم منضبط کی صورت دی جائے۔ اسکے علاوہ تین مشہور زمانہ مسائل کے غور و خوض کی طرف بھی ان کا خیال رجوع رہا۔ ان مین ایک تو ربع دائرہ، دوم تشدید سوم تثلیث زاویہ تھا جنکے وسیلے سے ارخی طاس وغیرہ نے خطوط مسطح اور منحنی دریافت کیے تھے۔ پھر خطوط منحنی کے خواص اور استعمالات معلوم ہوئے جن کا تعلق ارس طیوس کلان سے خاص ہو ہوتے ہوتے ان یونانی عالمون اور محققون نے ریاضیات مین غیر متناہی تسلیم کرلیا جسے ہوتے ہوتے غیر معمولی اہمیت نصیب ہوگئی۔ اسکے ساتھ حقائق ہندسہ کی تفتیش اور تشریح کے طرق بھی بحث مطالعہ رہے۔ بقراط نے طریقۂ استخراج وضع کیا۔ افلاطون نے طریقۂ تفریق و تشریح نکالا۔ اسی زمانہ مین منطق مین بھی بڑی ترقی ہوئی کیونکہ اسے ریاضیات سے بہت گہرا علاقہ ہو۔ ایک طرف تو سوفسٹ حکما کا گروہ تھا جو عقل سے سب چیزون کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش مین طرح طرح کے مغالطات اور محالات مین پھنس گئے۔ علم مناظرہ سے بھی اُسے بہت تقویت پہنچی تھی اور سب سے زیادہ سقراط کی تعلیم سے منطق کو فروغ حاصل ہوا تھا۔ ہوتے ہوتے ارسطاطالیس نے اسے خاص صورت دی۔ اسکے اصول و قوانین پر فلسفیانہ بحث کی جس سے ایک مرکز الآرا

کتاب تیار ہوگئی جو صدیون تک منطق کے امور مین سند تصور ہوتی ہے۔

علم ہندسہ اسوقت کمال پر پہنچا جب سکندریہ کے مہندس یونانیون کے ساتھ مل کر اُسے ترقی دینے لگے' اور یہ یونانی ہندسہ کا عہد طلا سمجھا جاتا ہے۔ اس زمانہ کے عالمان و محققان ہندسہ کا مجمل حال لکھنا محال ہے صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ سقراط' افلاطون اور ارسطو کے زمانہ مین فلسفۂ یونان کو جو شہرت اور عروج نصیب ہوا تھا وہی ہندسہ کو اقلیدس' ارشمیدس اور اپالیانوس کے عہد مین فروغ حاصل ہوا تھا۔ ان مہندسون کی کوششون سے ہندسہ نے ایک نہایت عمدہ اور منضبط علم کی صورت اختیار کی۔ اسکے اصول علوم متعارفہ کے قواعد تصور ہونے لگے اور وہ مہذب دنیا مین سند سمجھے جانے لگے۔ جس کتاب مین حکیم اقلیدس نے اصول ہندسہ کو واضح کیا تھا اُسکے نام سے آج تک مشہور چلی جاتی ہے۔ یہ شخص سکندریہ کا متوطن مگر یونانی الاصل اور بطالمۂ اول کے زمانہ مین تین سو برس قبل از مسیح گذرا ہے۔ اسکی کتاب جو یونانیون مین "استارخیا" یعنے "عناصر" یا "اصول ہندسہ" کے نام سے مشہور تھی خلفاے ہارون الرشید اور المامون کے زمانہ مین زبان عربی مین ترجمہ ہوئی تھی۔ اسکے بعد ارشمیدس آیا جو اطالی مہندسون کے طبقہ کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ اُس نے ہندسہ کی باریکیون پر خوب بحث کی اور اُن مسائل کو حل کرنیکی کوشش کی جو آجکل کیل کلس یعنی شمار ادق کے متعلق سمجھے جاتے ہین۔ یہ شخص اس علم کا اُستاد یکتا سمجھا جاتا ہے ۲۸۷ ق م مین پیدا ہوا اور ۲۱۲ ق م مین انتقال کیا۔ بعض عالمون کی راے مین ارشمیدس زمانۂ قدیم کا سب سے بڑا ریاضی دان تھا مگر بہت لائق اس کے ہمعصر اپالیانوس کو اشاٹنر' جرمن ماہر ریاضیات سے پیشتر تمام دنیا مین سب سے بڑا مہندس مانتے تھے۔ اس مین کلام نہین ہے کہ اشاٹنر کے ایجاد کردہ مسائل ہندسہ بہت ہی نادر اور نہایت ادق سمجھے جاتے ہین بلکہ اس اعتبار سے وہ ارشمیدس سے بھی فائق نظر آتا ہے۔

ان تینون مہندسون' ان کے ہمعصرون' اور مقلدون کی کوششون سے علم ہندسہ زمانۂ قدیم مین ترقی کی انتہا کو پہنچا۔ انکے جانشینون مین قابل ذکر ہپس قلیس' ڈیوقلیس' نکام دس' برسیوس اور زنودورس ہین۔ سکندریہ مین ہیرآن اور کلادیوس طالمی' دو نہایت نامور مہندس اور ریاضی دان گذرے ہین جنھون نے ہندسہ کے ذخیرۂ حقائق مین اضافہ کرنے مین اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہین کیا۔ اول الذکر نے پیمائش نظری کے مسائل پر علمی اصول سے بحث کی تھی' اور ثانی الذکر نے اُسکے ہیئتی پہلو کو لیا تھا۔ ہیرآن سب سے پُرانا یونانی مہندس ہے جس نے پیمائش نظری کے فن پر کتاب لکھی اور اپنی تحقیقات کے نتائج مین احمس مصری مہندس کے ساتھ گہرا تعلق ظاہر کیا تھا' مگر اس کی کتاب کا مسودہ بہت خراب ہوگیا تھا اس لیے صحت کے ساتھ یہ کہنا دشوار ہے کہ اسکی تفتیش کا میلان کس جانب تھا۔ مگر طالمی کا نسخہ عمدہ حالت مین ہے جو اہل عرب نے برسون تک حفاظت سے رکھ چھوڑا اور اب تک موجود ہے۔ اس نے علم مثلث کو ترقی دینے کی کوشش کی اور اس سے اجرام فلکی کے بعد کی پیمائش مین کام لینے کی بھی سعی کی تھی۔

اسکے بعد کئی اور مہندس اور ریاضی دان بھی پیدا ہوئے مگر انھون نے اپنی تمام کوشش اپنے پیشرو اُستادون کی تصنیفات کی تشریح اور ترتیب تک محدود رکھی۔ ان مین سے کئی سکندریہ کے رہنے والے تھے' اور یہ سب یونانی نسل تھے' کیونکہ اس علاقہ مین اُن کی ایک بڑی اور شاداب نوآبادی تھی جیسے

ایشیائے کوچک بحیرۂ روم وغیرہ مین انکی کئی بستیان تھین۔

رومیون کا ہندسہ۔ اہل روم نے جو لڑائی بھڑائی کے بڑے شائق اور ملک گیری کے فن مین بڑے طاق تھے تمام علوم فنون یونانیون سے حاصل کیے تھے۔ اُنھون نے انھین ترقی دینے کی کوشش نہین کی بلکہ روزانہ کاروبار چلانے کے لیے ضروری امور مین معقول دسترس پیدا کرلی۔ ان کا ادبیات اور ان کی نظم و نثر یونانی لٹریچر کا سانچہ یا ٹھپہ سمجھنا چاہیے۔ فن سنگتراشی مین بھی یونانی اُستادون کی تقلید کی۔ موسیقی، مصوری، اور دیگر علوم تمدن یونان سے لیے، مگر روم مین جا کر ان کی صورت ہی بگڑ گئی۔ علم ہندسہ اور ریاضیات بھی رومیون نے یونان سے سیکھا۔ اسے ترقی دینا تو درکنار اُلٹا اسے خراب کر دیا۔ فلسفہ سے رومیون کو کوئی مس نہ تھا کیونکہ وہ فن سپہ گری اور علم سیاست کا حصول اپنی زندگی کا بڑا مقصد سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے اُنھون نے سائنس کی تحقیقات کی پروا نہیں کی۔ البتہ قانون مین اُنھون نے اپنے اُستاد یونان کو مات دی۔ انکے اصول قوانین آج تک یورپ اور امریکہ کے تمدنی آئین کی بنیاد ہین۔ اُنھون نے ہندسہ اور ریاضیات صرف ضرورت کے مطابق حاصل کیا تھا اور اس سے روزانہ کاروبار زندگی مین کام لیتے تھے۔ اگر قیصر آگسٹس اپنی سلطنت کے تمام رقبہ کو ناپنے اور نقشہ تیار کرنے کی ہدایت نہ کرتا تو ہندسہ سپرد نسیان ہو جاتا۔ جولیس قیصر بھی اپنے زمانہ مین جو مسیح سے پچاس ساٹھ برس پیشتر گذرا سلطنت روما کی پیمائش کرانے کا خواہشمند تھا۔ علاوہ ازین انھین آئے دن قلعہ بندیون اور مورچہ بنانے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ ان وجوہ سے ہندسہ و ریاضیات کا مطالعہ صرف عملی مقاصد سے جاری رہا۔

زمانۂ حال کا ہندسہ۔ قرون وسطی مین ہندسہ کے مطالعہ سے سخت لاپروائی برتی گئی جیسے اور علوم و فنون سے غفلت کا برتاؤ کیا گیا تھا۔ ۹۹۹ء مین گربرٹ اور اسکے بعد پوپ سلوسٹر ثانی کو ہندسہ کے مطالعہ کا شوق ہوا، مگر اُنھون نے کوئی نیا مسئلہ نہین نکالا بلکہ متقدمین کی تحقیقات کے نتائج پر غور کرتے رہے۔ جب یورپ قرون وسطی مین عقلی رعشہ مین گرفتار تھا اُس وقت عربون کی ترقی کا زمانہ تھا اُنھون نے یونانیون کے تمام علوم کو اپنی زبان مین ترجمہ کیا جس سے بعد ازان اہل یورپ نے حاصل کیا۔ عربون نے ہندسہ کے مطالعہ مین بڑی مستعدی ظاہر کی تھی۔ اس غفلت اور لاپروائی کے زمانہ کا خاتمہ ۱۴۵۳ء مین ہوا، اور پیسا واقع اٹلی سے ایک مشہور مہندس اور ریاضی دان نکلا جس نے کئی نئے مسائل دریافت کیے۔ یہ شخص الجبرا مین بھی طاق تھا بلکہ یورپ مین الجبرا کا اسی شخص کے وسیلے سے رواج حاصل ہوا تھا۔ تقریباً دو سو برس تک اہل اٹلی ہندسہ اور ریاضیات کے اُستاد سمجھے جاتے رہے۔ مہندس پیسا کا نام لیونارڈو فبوناسی تھا جو ۱۱۷۰ء اور ۱۲۵۰ء کے درمیان گذرا۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد ۱۲۲۵ء۔ ۱۳۱۴ء لکہ یا غیوبو پیدا ہوا۔ اسکے ساتھ ہی اہل اٹلی کی علمی ترقیون اور عقلی مصروفیتون کے زمانہ کا آغاز ہوا۔ ٹارٹگلیا (۱۵۰۰ء–۱۵۵۷ء) کارڈن (۱۵۰۱–۱۵۷۶ء) اور لاڈوویکو فریری (۱۵۲۲–۱۵۶۵ء) نے علم ہندسہ مین بہت اضافہ کیا۔ انھون نے بعض بہت مشکل اور اہم مسائل ہندسہ دریافت کیے تھے۔ اسکے بعد اہل فرانس نے ہندسہ کے مطالعہ کی طرف توجہ کی۔ وی اٹی نے الجبرا اور ہندسہ مین کمال حاصل کیا تھا۔ یہ شخص ۱۵۴۰ء اور ۱۶۰۳ء کے درمیان گذرا ہے۔ اُس نے ایک دو نئے مسئلے دریافت کیے تھے۔ اسکے بعد ماورتھ (۱۵۰۰–۱۵۷۰ء)، پاسکل (۱۶۲۳–۱۶۶۲ء) دزارگ (۱۵۹۲–۱۶۶۲ء) وغیرہ پیدا ہوئے جنھون نے زمانۂ جدید کے ہندسہ کے اصول موضوعہ قائم کیے اور نئے طریقے اسکے

مسائل کو سلجھایا۔ یہ سب اپنے اپنے ڈھنگ کے مہندس اور ریاضی دان تھے۔ انھون نے پہلے پہل علم تراش ہاے مخروطی یا علم اشکال مخروطی کے مطالعہ کی طرف توجہ کی، اور اسکے اصول وضع کیے۔ انھون نے ظرف کے عدم انتہا کا تصور معقولیت کے ساتھ ظاہر کیا اور اس سے نواحی مکانی کی تفتیش مین کام لینے پر زور دیا۔

جب فرانس ہندسہ مین ترقی کر رہا تھا، اُسوقت انگلستان اور جرمنی مین بھی اسکی طرف توجہ ہو رہی تھی۔ ہنری سیول (۱۵۳۹ء تا ۱۶۲۲ء) نے آکسفورڈ مین اس علم پر لیکچرون کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ جان کیپلر (۱۵۷۱ء تا ۱۶۳۰ء) نے ہندسہ مین ترقی کی۔ خط مستقیم کی انتہا کا خیال اسی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اٹھارھوین اور انیسوین صدی مین جو ترقی ہوئی ہے اسکے بیان کی چندان ضرورت نہین، کیونکہ یہ زمانۂ حال سے متعلق ہے، اور اس سے وہ لوگ جو اسکولون اور کالجون کی تعلیم سے مستفید ہوتے ہین کم و بیش واقف ہین۔

(ماخوذ)

مملکت آصفیہ کے فرمانروا خاندان

۸۔ سلطنت عماد شاہی

۱۴۸۹ء/۸۹۵ — ۱۵۷۵ء/۹۸۲

دار الحکومت برار

عماد شاہی سلطنت کا بانی فتح اللہ عماد الملک قوم کا برہمن تھا۔ بیجانگر کی لڑائی مین گرفتار ہوکر دربار بہمنی مین آیا اور اسلام قبول کرکے مقربان شاہی مین شامل ہوگیا۔ بعد ازان اس نے بہت سے مہمات ملکی انجام دیے جس کے صلہ مین خواجہ محمود گاوان نے عماد الملک کا خطاب دلا کر برار کی صوبہ داری تفویض کی۔ محمود شاہ بہمنی کے زمانہ مین جب سلطنت بہمنیہ کو انحطاط شروع ہوا تو اس نے سب سے پہلے علم بغاوت بلند کیا' اور ۱۴۸۹ء/۸۹۵ مین اپنے نام کا خطبہ پڑھوا کر آزادانہ حکومت کرنے لگا۔ اسکے بیٹے علاء الدین نے احمد نگر والون سے بہت سا ملک لے لیا۔ پھر اسکے پوتے برہان عماد شاہ کو اُسکے وزیر تفال خان نے معزول کرکے خود سلطنت پر قبضہ کر لیا۔ لیکن بیجاپور اور احمد نگر والوں نے اتفاق کرکے برار پر یورش کی جس مین تفال خان مارا گیا اور ملک پر نظام شاہی قبضہ ہوگیا۔

شاہان عماد شاہی کی فہرست حسب ذیل ہے:

۱	فتح اللہ عماد الملک	۱۴۸۹ء/۸۹۵	۱۵۰۴ء/۹۱۰
۲	علاء الدین بن فتح اللہ	۱۵۰۴ء/۹۱۰	۱۵۲۹ء/۹۳۶
۳	دریا عماد شاہ بن علاء الدین	۱۵۲۹ء/۹۳۶	۱۵۶۰ء/۹۶۸
۴	برہان عماد شاہ بن دریا عماد شاہ	۱۵۶۰ء/۹۶۸	۱۵۷۴ء/۹۸۲
۵	تفال خان (غاصب)	۱۵۷۴ء/۹۸۲	۱۵۷۵ء/۹۸۳

۹۔ سلطنت بریدشاہی

۱۴۹۲ء/۸۹۷ — ۱۶۲۴ء/۱۰۳۴

دار الحکومت محمد آباد بیدر

اس خاندان کا بانی قاسم برید علاقہ گرجستان کا باشندہ تھا خواجہ شہاب الدین یزدی کے ہمراہ ولایت سے آیا اور محمد شاہ بہمنی کے غلامون مین شامل ہوگیا۔ خواجہ محمود گاوان کے بعد وزیر سلطنت مقرر ہوا' اور محمود شاہ کے عہد مین اسطرح دخیل سلطنت ہوا کہ بہمنی بادشاہ برائے نام بادشاہ رہگیا اس نے بحیثیت

وزیر ہونے کے شاہان بیجاپور و برار سے کئی بار لڑائیاں کین ١٥٠٤ء / ٩١٠ھ میں جب اس کا انتقال ہو گیا تو اس کے بیٹے امیر برید نے نہ صرف سلطنت پر قبضہ کر لیا بلکہ شاہی لقب بھی اختیار کر کے خود مختار بادشاہ بن بیٹھا۔ امیر برید کے بعد اس خاندان میں سات بادشاہ بر سر حکومت ہوئے امیر برید ثانی کے زمانہ میں جو اس خاندان کا آخری بادشاہ ہے شاہ بیجاپور نے بیدر پر قبضہ کر لیا ١٦٢٤ء / ١٠٣٣ھ میں ملک عنبر کے نظام شاہی لشکر نے اس شہر کو مکرر تاخت و تاراج کر کے اس خاندان کا استیصال کر دیا

شاہان برید شاہی کی فہرست حسب ذیل ہے

١	قاسم برید	١٤٨٧ء / ٨٩٢ھ	١٥٠٤ء / ٩١٠ھ
٢	امیر برید اول	١٥٠٤ء / ٩١٠ھ	١٥٤٢ء / ٩٤٩ھ
٣	علی برید اول	١٥٤٢ء / ٩٤٩ھ	١٥٧٩ء / ٩٨٧ھ
۴	ابراہیم برید	١٥٧٩ء / ٩٨٧ھ	١٥٨٦ء / ٩٩٥ھ
۵	قاسم برید ثانی	١٥٨٦ء / ٩٩٥ھ	١٥٨٩ء / ٩٩٧ھ
۶	علی برید ثانی	١٥٨٩ء / ٩٩٧ھ	١٦٠١ء / ١٠١٠ھ
۷	امیر برید ثانی	١٦٠١ء / ١٠١٠ھ	١٦٢٤ء / ١٠٣٣ھ

١٠ سلطنت نظام شاہی

١٤٩٠ء / ٨٩٦ھ — ١٦٣٢ء / ١٠٤٢ھ

دار الحکومت احمد نگر

اس خاندان کا مورث اعلیٰ نظام الملک حسن بحری قوم کا برہمن اور پاتری کا باشندہ تھا۔ بیجانگر کی لڑائی میں گرفتار ہو کر آیا تو محمود شاہ بہمنی نے اُسے مسلمان کر کے اپنے غلاموں میں شریک کر لیا۔ حسن بحری چونکہ لائق آدمی تھا اس لیے بہت جلد منظور نظر ہو گیا۔ عمدہ عمدہ منصب پر منصب ملنے گئے۔ یہاں تک ترقی کی کہ علاقہ مرہٹواری کا ناظم مقرر ہو گیا اور قوت بہم پہنچا کر خود سری اختیار کی قرب و جوار کے علاقوں پر حملے شروع کیے۔ ١٤٩٢ء میں بیدر کو فتح کر لیا۔ اس کے بعد بہمنی لشکر کے ساتھ ایک عظیم الشان لڑائی ہوئی جس میں اس کا کام تمام ہو گیا۔ اس کا بیٹا ملک احمد اس وقت جنیر میں تھا۔ جب اس کو باپ کے مارے جانے کا حال معلوم ہوا تو نظام الملک کا خطاب اپنے نام کے ساتھ شامل کر کے کوکن کا علاقہ فتح کر لیا۔ پھر احمد نگر آ کر اپنی مستقل حکومت کا سنگ بنیاد رکھا۔ ١٤٩٣ء / ٨٩٩ھ میں قلعہ دولت آباد فتح کر لیا اس کے بعد یکے بعد دیگرے نو بادشاہ بر سر حکومت ہوئے۔ مرتضےٰ نظام شاہ کی بیجا سختیوں سے سلطنت کو انحطاط ہونے لگا امرا میں نا اتفاقی پھیل گئی۔ اسی زمانہ میں مغلوں نے احمد نگر پر حملہ کیا۔ اس وقت کم سن میران حسین بر سر حکومت تھا۔ احمد نگر والوں نے جب شاہزادہ مراد کا مقابلہ کرنا چاہا تو چاند بی بی کو جو سلطان حسین نظام شاہ کی دختر تھی سلطنت کے تمام کاروبار حوالہ کیے۔ اس لائق و ہوشیار عورت نے بحیثیت نائب السلطنت ہونے کے سارے معاملات بحسن و خوبی انجام دیے اور اس جرأت و دلیری سے مغلوں کا مقابلہ کیا کہ حملہ آوروں کو پسپا ہونا پڑا۔ اسی اثنا میں بعض نا اہل امرا نے سازش کر کے چاند بی بی کو قتل کر ڈالا۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر خود شہنشاہ اکبر نے احمد نگر پر چڑھائی کر دی۔ تھوڑی سی مدت میں شہر فتح ہو گیا اور کم عمر بادشاہ قید کر لیا گیا لیکن اس فتح سے نظام شاہی سلطنت کا استیصال نہ ہو سکا۔ ایک حبشی غلام ملک عنبر نے جو چاند بی بی کے زمانہ میں بہت سے اعلےٰ عہدوں پر ممتاز رہ چکا تھا۔ پرینڈہ میں آ کر بقیہ ملک کے سنبھالنے کی کوشش کی اور مرتضےٰ نظام شاہ دوم کو بادشاہ بنا کر مغلوں کے ساتھ مدت تک معرکہ آرائی کرتا رہا۔ اس نے جہانگیر کے لشکر کو متعدد بار شکست دی لیکن جب اس کا انتقال ہو گیا تو ١٦٢٦ء / ١٠٣٥ھ میں شاہ جہان بادشاہ نے بقیہ ملک پر قبضہ کر لیا۔

ان بادشاہوں کی فہرست حسب ذیل ہے

۱	احمد نظام الملک	۱۴۹۰ء / ۸۹۶	۱۵۱۰ء / ۹۱۶
۲	برہان نظام شاہ	۱۵۱۰ء / ۹۱۶	۱۵۵۳ء / ۹۶۱
۳	حسین نظام شاہ	۱۵۵۳ء / ۹۶۱	۱۵۶۵ء / ۹۷۲
۴	مرتضٰی نظام شاہ	۱۵۶۵ء / ۹۷۲	۱۵۸۸ء / ۹۹۶
۵	میران حسین نظام شاہ	۱۵۸۸ء / ۹۹۶	۱۵۸۹ء / ۹۹۷
۶	اسمعیل نظام شاہ	۱۵۸۹ء / ۹۹۷	۱۵۹۰ء / ۹۹۹
۷	برہان نظام شاہ دوم	۱۵۹۰ء / ۹۹۹	۱۵۹۴ء / ۱۰۰۳
۸	ابراہیم نظام شاہ	۱۵۹۴ء / ۱۰۰۳	۱۵۹۵ء / ۱۰۰۴
۹	احمد نظام شاہ	۱۵۹۵ء / ۱۰۰۴	سنہ
۱۰	بہادر نظام شاہ	۱۵۹۵ء / ۱۰۰۴	۱۶۰۰ء / ۱۰۰۹
۱۱	مرتضٰی نظام شاہ دوم	۱۶۰۰ء / ۱۰۰۹	۱۶۲۵ء / ۱۰۳۵
۱۲	برہان نظام شاہ سوم	۱۶۲۵ء / ۱۰۳۵	۱۶۳۰ء / ۱۰۴۰
۱۳	حسین نظام شاہ سوم	۱۶۳۰ء / ۱۰۴۰	۱۶۳۳ء / ۱۰۴۳

۱۱ سلطنت عادل شاہی

۱۴۸۹ء / ۸۹۵ — ۱۶۸۶ء / ۱۰۹۸

دار الحکومت بیجاپور

اس سلطنت کا بانی یوسف عادل شاہ روم کے سلاطین عثمانیہ کی اولاد سے تھا۔ بیجاپور کی مشہور و مستند تاریخ بساتین السلاطین مین لکھا ہے کہ سلطان مراد کے دو بیٹے تھے۔ محمد خان و یوسف خان باپ کے مرنے پر سنہ ۱۴۵۱ء / ۸۵۵ میں جب بڑا لڑکا محمد خان فاتح قسطنطنیہ تخت نشین ہوا تو چھوٹے بھائی کے قتل کا حکم دیدیا لیکن ماں نے شاہی افسرون کو کچھ رشوت دے دلاکر لڑکے کی جان بچالی اور خواجہ علاء الدین گرجستانی کے حوالہ کیا تاکہ اُسے لے کر کہین بھاگ جائے۔ علاء الدین یوسف خان کو لیکر ترکی دار الحکومت سے نکلا اور ساوہ مین آکر پناہ گزین ہوا۔ یہان سے تجارت کے لیے ہندوستان آیا۔ محمد شاہ بہمنی کے زمانہ مین بیدر پہنچا اور خواجہ محمود گاوان سے یوسف خان کا سارا حال کہہ کر درخواست کی کہ اُسے شاہی غلامون مین شامل کرے۔ چنانچہ خواجہ محمود گاوان نے یوسف خان کا نام شاہی غلامون مین شریک کردیا۔ یوسف خان چونکہ پڑھا لکھا اور ہوشیار لڑکا تھا اس لیے بہت جلد منظور نظر ہوگیا سنہ ۱۴۸۷ء / ۸۹۲ میں جنیر کا صوبہ دار مقرر ہوا۔ اس کے بعد بیجاپور کا شہر قرار پایا۔ محمود شاہ بہمنی کے زمانہ مین جب سلطنت بہمنیہ تباہی کے قریب آپہنچی تو احمد نظام الملک کی تحریک سے اس نے بھی اپنی مستقل حکومت قائم کرلی اور سنہ ۱۴۸۹ء / ۸۹۵ مین بیجاپور کی جامع مسجد میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔

یوسف عادل شاہ کے بعد اس کے خاندان مین یکے بعد دیگرے نو بادشاہ برسر حکومت ہوے۔ منجملہ اُن کے ابراہیم اول علی عادل شاہ اور اُس کا بیٹا ابراہیم ثانی بڑے جاہ و جلال اور شان و شوکت کے بادشاہ ہوئے ہین۔ دور طوائف الملوکی مین عادل شاہی سلطنت کو خاص امتیاز حاصل تھا۔ اسکی عملداری یون تو پہلے ہی سے بڑھی ہوئی تھی مگر علی عادل شاہ کے زمانہ مین جب سلطنت بیجانگر تباہ و تاراج ہوگئی تو اُس کو اور بھی وسعت حاصل ہوگئی، اور اُس کے حدود شمال میں دریائے کرشنا سے لیکر جنوب مین آبنائے منار تک پھیل گئے اور اسمیں دھار انسٹر کرناٹک میسور و ملیبار کا تمام ملک شامل ہوگیا۔ ابراہیم ثانی شہنشاہ اکبر کا معاصر تھا۔ اُس کی بیٹی شاہزادہ دانیال سے منسوب ہوئی تھی اور اُسی لڑکی کے ہمراہ مشہور مورخ محمد قاسم فرشتہ دربار مغلیہ مین گیا تھا۔ اس بادشاہ کو علمی معاملات سے بے حد دلچسپی تھی اسکی فیاضی اور قدردانی نے بیجاپور کو مرکز علم وفن بنادیا تھا۔ عہدی

اور علاء ملک قمی جو فارسی کے مشہور و معروف شاعر تھے یہی کے دربار سے وابستہ تھے۔ اس کا جانشین محمد عادل شاہ بادشاہی کے طمطراق میں اپنے باپ سے کسی طرح کم نہ تھا۔ شاہ جہاں بادشاہ اپنی خط وکتابت میں اسکو ہمیشہ سلطان لکھا کرتا تھا۔ اس نے اپنے لیے جو مقبرہ بنایا ہے وہ نہ صرف ہندوستان بلکہ روئے زمین کے عجائبات میں شمار ہوتا ہے۔ اسکی بلندی ۲۰۶ فیٹ اور رقبہ ۱۸۳۳۰ مربع فیٹ ہے۔ ایسا بلند اور وسیع گنبد تمام دنیا میں کہیں نہیں پایا جاتا۔

سیواجی بھونسلہ جو سلطنت مرہٹہ کا بانی ہے ابتداءً محمد عادل شاہ کی فوج میں ملازم تھا۔ ترقی کرتا ہوا سپہ سالاری کے درجہ پر پہنچا۔ علی عادل شاہ ثانی کے زمانہ میں جب عادل شاہی سلطنت پر ضعف آنے لگا تو کوکن اور کرناٹک کے بعض علاقے اس نے داب لیے جس کو اسکے جانشینوں نے جدید فتوحات سے اور بھی وسعت دیدی۔ سکندر عادل شاہ بیجاپور کا اخیر بادشاہ ہے۔ اس کے زمانہ میں اورنگ زیب نے بیجاپور پر حملہ کیا اگرچہ سکندر نے بڑی جوانمردی سے مقابلہ کیا لیکن کچھ بن نہ آیا۔ ۱۶۸۶ء/۱۰۹۷ھ میں اورنگ زیب نے بیجاپور پر قبضہ کر لیا اور اسکو نظر بند کر کے اس کے لیے ایک لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔

سلاطین عادل شاہی کی فہرست حسب ذیل ہے:-

۱	یوسف عادل شاہ	۱۴۸۹ / ۸۹۵	۱۵۱۰ / ۹۱۶
۲	اسمٰعیل عادل شاہ	۱۵۱۰ / ۹۱۶	۱۵۳۴ / ۹۴۱
۳	ملو عادل شاہ	۱۵۳۴ / ۹۴۱	۱۵۳۴ / ۹۴۱
۴	ابراہیم عادل شاہ اول	۱۵۳۴ / ۹۴۱	۱۵۵۷ / ۹۶۵
۵	علی عادل شاہ اول	۱۵۵۷ / ۹۶۵	۱۵۸۰ / ۹۸۸
۶	ابراہیم عادل شاہ ثانی	۱۵۸۰ / ۹۸۸	۱۶۲۶ / ۱۰۳۵
۷	محمد عادل شاہ	۱۶۲۶ / ۱۰۳۵	۱۶۵۶ / ۱۰۶۷
۸	علی عادل شاہ ثانی	۱۶۵۶ / ۱۰۶۷	۱۶۷۲ / ۱۰۸۳
۹	سکندر عادل شاہ	۱۶۷۲ / ۱۰۸۳	۱۶۸۶ / ۱۰۹۷

۱۲ سلطنت قطب شاہی

۱۵۱۲ء/۹۱۸ — ۱۶۸۷ء/۱۰۹۹

دار الحکومت گولکنڈہ

اس خاندان کا بانی سلطان قلی ترکوں کے قبیلہ قراقوینلی سے ہے۔ اولاد چنگیز خان کے تنزل پر آذربائیجان میں اس قبیلہ نے ایک چھوٹی سی حکومت قائم کر لی تھی۔ مگر وہ بہت جلد ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اسی قبیلہ کے مختلف سرداروں میں تقسیم ہو گئی۔ اس سیاسی انقلاب میں کچھ علاقہ پیر قلی کے ہاتھ آ گیا جس کے بعد اسکا بیٹا اویس قلی بھی کچھ عرصہ کے لیے حکمران رہا۔ اسی اثنا میں ایک اور ترکی قوم آق قوینلی نے دیار بکر میں نشو و نما پانا شروع کیا اور انھیں امیر یعقوب بیگ کے زمانہ میں خوب عروج حاصل ہو گیا۔ یعقوب بیگ نے اپنے بھائی قراقوینلیوں پر سب سے پہلے ہاتھ صاف کیا اور اس قوم کے بہت سے سردار جو مختلف علاقوں میں حکمران تھے پکڑ پکڑ کر قتل کر ڈالے۔ اس طوفان بے تمیزی سے بچانے کے لیے اویس قلی نے اپنے لڑکے سلطان قلی کو دکن روانہ کر دیا اور وہ اپنے چچا اللہ قلی کے ہمراہ عراق عرب اور خلیج فارس سے ہوتا ہوا بیدر چلا آیا۔ سلطان محمود شاہ بہمنی نے اسکے ساتھ بہت سی مراعات کیں اور سلطانی چیلوں میں شامل کر کے اعلیٰ درجہ کی تعلیم دلائی اور جب سن رشد کو پہنچا تو مختلف خدمات ملکی تفویض کیے یہاں تک کہ ۱۴۹۵ء/۹۰۱ھ میں قطب الملک کا خطاب دے کر تلنگانہ کا صوبہ دار بنایا۔ قطب الملک سولہ سال تک سلطنت بہمنی کا مطیع و فرمانبردار رہا۔ لیکن ۱۵۱۰ء/۹۱۲ھ میں جب محمود شاہ کا انتقال ہو گیا تو دوسرے سرداروں کی طرح اس نے بھی اطاعت سے انحراف کر دیا اور گولکنڈہ کو مستقر حکومت

قرار دے کر قطب شاہی سلطنت کا سنگ بنیاد رکھا۔

قطب الملک نے راجگان ورنگل و بیجانگر سے متعدد لڑائیاں کین اور اپنی حکومت کو جنوب مشرق مین دریاے گوداوری کے کنارے کنارے بڑی دور تک وسعت دی۔ اسکے بعد برید شاہیون پر حملہ کرکے قلعہ میدک و کوڈس وغیرہ بھی لے لیا۔ اسکے بعد جمشید قلی سبحان قلی ابراہیم قلی پے درپے تخت نشین ہوے۔ ابراہیم کے زمانہ مین جب سلطنت بیجانگر تباہ ہوئی تو قطب شاہی علاقہ خوب وسیع ہوگیا اور دریاے پنار کے انتہاے جنوب تک اسکے حدود پھیل گئے۔ ابراہیم کے جانشین محمد قلی اور محمد قطب شاہ بڑی شان و شوکت کے بادشاہ ہوئے ہین۔ محمد قلی نے دکن مین اس کثرت سے عمارتین تعمیر کرائی ہین کہ کسی دوسرے بادشاہ نے کبھی نہین بنوائین اور اسی وجہ سے تاریخ مین یہ دکن کی عمارات کا باوا آدم کہلاتا ہے۔ عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ سے سلطنت کو انحطاط ہونے لگا۔ اورنگ زیب نے گولکنڈہ پر کئی مرتبہ حملے کیے ۱۶۸۷ء/۱۰۹۹ مین چھ مہینے کے محاصرہ کے بعد قلعہ فتح ہوگیا اور سلطان ابوالحسن تاناشاہ کو جو اس خاندان کا آخری بادشاہ تھا قلعہ دولت آباد مین قید کردیا۔

سلاطین قطب شاہی کی فہرست حسب ذیل ہے:-

۱	قطب الملک سلطان قلی	۱۵۱۲ء/۹۱۸	۱۵۴۳ء/۹۵۰
۲	جمشید قلی	۱۵۴۳ء/۹۵۰	۱۵۵۰ء/۹۵۷
۳	سبحان قلی	۱۵۵۰ء/۹۵۷	سنہ
۴	ابوالمظفر ابراہیم قطب شاہ	۱۵۵۰ء/۹۵۷	۱۵۸۰ء/۹۸۸
۵	ابوالمظفر محمد قلی	۱۵۸۰ء/۹۸۸	۱۶۱۲ء/۱۰۲۱
۶	سلطان محمد قطب شاہ	۱۶۱۲ء/۱۰۲۱	۱۶۲۶ء/۱۰۳۶
۷	عبداللہ قطب شاہ	۱۶۲۶ء/۱۰۳۶	۱۶۷۲ء/۱۰۸۳
۸	ابوالحسن تاناشاہ	۱۶۷۲ء/۱۰۸۳	۱۶۸۷ء/۱۰۹۹

۱۴- دکن پر مغلون کا تسلط

شہنشاہ اکبر نے پہلے پہل ۱۵۹۵ء/۱۰۰۳ھ مین دکن پر حملہ کیا۔ نظام شاہیون سے مدت تک لڑائی ہوتی رہی اور احمد نگر فتح ہوگیا مگر اس سے سلطنت نظام شاہی کا استیصال نہ ہوسکا۔ اسکے بعد سلاطین دکن نے باہم اتفاق کرکے مغلون کا مقابلہ کیا جسکی وجہ سے مغلون کو شکست اُٹھا کر واپس ہونا پڑا۔ لیکن اسی زمانہ مین دکن مین خانہ جنگیان شروع ہوگئی تھین جن سے مغلون نے خاطر خواہ فائدہ اُٹھایا اور ملک پر بتدریج تسلط حاصل کرلیا۔

شاہجہان نے دکن کے فتح کرنے مین بڑی کوشش کی اور دس برس کی جنگ و جدل کے بعد نظام شاہیون کا خاتمہ ہوا۔ اسی اثنا مین عادل شاہیون سے ایک لڑائی ہوئی جسمین بیجاپور والے بڑی ہمت اور دلیری سے لڑتے رہے لیکن مغلوب ہوکر انھین صلح کرنی پڑی۔ شاہجہان بادشاہ نے اورنگ زیب کو ۱۶۳۶ء/۱۰۴۶ مین تسخیر دکن پر مامور کیا۔ اس نے سب سے پہلے گولکنڈہ پر چڑھائی کی لیکن ایک سخت لڑائی کے بعد عبداللہ قطب شاہ نے مصالحت کرلی۔ اورنگ زیب جب واپس ہونے لگا تو بیدر کو فتح کرتا ہوا بیجاپور کی جانب روانہ ہوا۔ اثناے راہ مین شاہجہان کے بیمار ہونے کی خبر سُنی تو اس مُہم کو ادھورا چھوڑ کر دارالسلطنت کو واپس چلا آیا۔

اس وقت اہل دکن بڑی تباہی مین مبتلا تھے۔ شاہان دکن نے اپنے ملک کو اس غرض سے ویران کردیا تھا کہ غنیم کو آب و دانہ تک میسر نہ آئے، اور جو کچھ باقی تھا اُسے مغلون نے لوٹ لیا تھا۔ اتفاق سے کئی سال تک بارش بھی نہین ہوئی جسکی وجہ سے ایسا تکلیف دہ قحط پڑا کہ لاکھون جانین بھوک

بیاس کے نذر ہوگیئں۔

اورنگ زیب نے اپنے ایام حکومت مین تسخیر دکن کے لیے بہت کچھ جد وجہد کی چنانچہ بیجاپور اور گولکنڈہ کے میدانوں مین اسکی فوج پچیس سال تک لڑتی رہی لیکن کامیابی نہین ہوئی بہ نفس نفیس سال کی عمر مین خود دہلی سے نکلا کئی سال دکن مین رہ کر لڑائی جھگڑے کرتا رہا۔ ۱۶۸۶ء/۱۰۹۷ھ مین بیجاپور فتح ہوا۔ اسکے ایک سال بعد اہل گولکنڈہ نے شکست پائی، اور دونون بادشاہ مغلون کے ہاتھ گرفتار ہوگئے۔

ان جدید فتوحات سے سلطنت مغلیہ کو ایسی وسعت حاصل ہوئی کہ اس سے بیشتر کبھی نہین ہوئی تھی۔ مغلون نے بیجاپور اور گولکنڈہ کے علاقون کو ملا کر ایک صوبہ بنا لیا اور اسکے انتظام کے لیے دہلی سے صوبہ دار مقرر ہو کر آنے لگے۔ ۱۷۱۳ء/۱۱۲۵ھ مین یہ عہدہ نواب نظام الملک آصف جاہ کو ملا جو اُن کی اولاد مین اب تک وراثتاً چلا آتا ہے۔

سلاطین مغلیہ

(۱)	ظہیر الدین بابر شاہ	۱۵۲۶ء/۹۳۲ھ	۱۵۳۰ء/۹۳۷ھ
(۲)	نصیر الدین ہمایون	۱۵۳۰ء/۹۳۷ھ	۱۵۵۶ء/۹۶۳ھ
(۳)	جلال الدین اکبر	۱۵۵۶ء/۹۶۳ھ	۱۶۰۵ء/۱۰۱۴ھ
(۴)	نور الدین جہانگیر	۱۶۰۵ء/۱۰۱۴ھ	۱۶۲۷ء/۱۰۳۷ھ
(۵)	شہاب الدین شاہجہان	۱۶۲۷ء/۱۰۳۷ھ	۱۶۵۸ء/۱۰۶۸ھ
(۶)	محی الدین اورنگ زیب عالمگیر	۱۶۵۸ء/۱۰۶۸ھ	۱۷۰۷ء/۱۱۱۸ھ
(۷)	قطب الدین شاہ عالم بہادر شاہ	۱۷۰۷ء/۱۱۱۸ھ	۱۷۱۲ء/۱۱۲۴ھ
(۸)	معز الدین جہاندار شاہ	۱۷۱۲ء/۱۱۲۴ھ	ـــ
(۹)	فرخ سیر	۱۷۱۲ء/۱۱۲۴ھ	۱۷۱۹ء/۱۱۳۱ھ
(۱۰)	شمس الدین رفیع الدرجات	۱۷۱۹ء/۱۱۳۱ھ	ـــ
(۱۱)	رفیع الدولہ شاہجہان ثانی	۱۷۱۹ء/۱۱۳۱ھ	۱۷۲۰ء/۱۱۳۲ھ
(۱۲)	نصیر الدین محمد شاہ	۱۷۲۰ء/۱۱۳۲ھ	۱۷۴۸ء/۱۱۶۱ھ
(۱۳)	احمد شاہ	۱۷۴۸ء/۱۱۶۱ھ	۱۷۵۴ء/۱۱۶۷ھ
(۱۴)	عزیز الدین عالمگیر ثانی	۱۷۵۴ء/۱۱۶۷ھ	۱۷۵۹ء/۱۱۷۳ھ
(۱۵)	شاہ عالم ثانی	۱۷۵۹ء/۱۱۷۳ھ	۱۸۰۶ء/۱۲۲۱ھ
(۱۶)	معین الدین محمد اکبر ثانی	۱۸۰۶ء/۱۲۲۱ھ	۱۸۳۷ء/۱۲۵۳ھ
(۱۷)	سراج الدین بہادر شاہ	۱۸۳۷ء/۱۲۵۳ھ	۱۸۵۷ء/۱۲۷۵ھ

۱۴- شاہان آصفیہ

۱۷۲۴ء/۱۱۳۷ھ ـــ تا حال

دارالحکومت حیدرآباد

نواب نظام الملک آصف جاہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اولاد سے ہین۔ ان کے آبا و اجداد ماوراء النہر کے رہنے والے تھے ۱۶۵۵ء/۱۰۶۵ھ مین خواجہ عابد خان سمرقند سے آکر شاہجہان بادشاہ کے ملازم ہو گئے۔ ماہانہ پانچ ہزار منصب مقرر ہوا ان کے فرزند نواب غازی الدین خان فیروز جنگ اورنگ زیب کے وزیر اعظم تھے۔ انھون نے نواب سعد اللہ خان علامی وزیر شاہجہان بادشاہ کی دختر سے عقد کیا جن کے بطن سے نواب آصف جاہ بہادر تولد ہوئے۔ نواب آصف جاہ اورنگ زیب کے زمانہ مین بیجاپور کے عملدار مقرر ہوئے تھے۔ بعدہٗ شاہ عالم بہادر نے اودھ کا ناظم مقرر کیا۔ پھر فرخ سیر نے دکن کی صوبہ داری عنایت کی۔ محمد شاہ کی بادشاہت مین مالوہ کے صوبہ دار پھر سلطنت مغلیہ کے وزیر اعظم قرار پائے۔ محمد شاہ رنگین مزاج اور عیش پسند بادشاہ تھا۔ امور جہانداری سے اسکو مطلق دلچسپی نہ تھی جسکی وجہ سے سلطنت کو روز بروز تنزل ہونے لگا۔ آصف جاہ نے اس حالت کو دیکھ کر آئین شاہی مقرر کیا، اور بادشاہ کو انتظام سلطنت کی طرف توجہ دلائی۔ لیکن جب یہ باتین بادشاہ کو دبال جان ہوگئین تو آصف جاہ نے برداشتہ خاطر ہو کر دکن کی صوبہ داری کو وزارت عظمیٰ پر ترجیح دی۔

اصفہان شاہی حاصل کرکے حیدرآباد چلے آئے ان دونون نواب مبارز خان حیدرآباد کا صوبہ دار تھا - اس نے جائزہ دینے سے انکار کیا - فریقین مین بالا گھاٹ کے نیچے لڑائی ہوئی مبارز خان اور اُسکے دونون بیٹے مارے گئے - دکن کا تمام صوبہ آصف جاہ کے قبضہ مین آگیا -

آصف جاہ کے بعد نواب ناصر جنگ برسر حکومت ہوئے لیکن دوسرے بھائیون نے تخت کے لیے شورش برپا کردی - ان دنون دکن مین یورپ کی دو زبردست قومین قوت آزمائی کررہی تھین - انگریز ناصر جنگ کے اور فرانسیسی مظفر جنگ کے طرفدار تھے - فرانسیسیون کی سازش سے ناصر جنگ نے شہادت پائی - مظفر جنگ بادشاہ بنائے گئے لیکن چند مہینون کے بعد بعض فوجی افسرون نے انھین بھی قتل کر ڈالا - ان کے بعد صلابت جنگ تخت نشین ہوئے جنھین نواب نظام علی خان نے قید کرکے زمام حکومت اپنے ہاتھ مین لے لی -

اس زمانہ مین دکن کی سیاسی حالت بڑی پُرآشوب تھی - میسور مین ٹیپو سلطان، شمال مغرب مین مرہٹے روز بروز اپنی قوت و اقتدار کو بڑھا رہے تھے - کرناٹک مین انگریزون اور فرانسیسیون نے قسمت آزمائی شروع کردی تھی اور ہر چہار طرف قتل و خونریزی کا بازار گرم تھا - نظام علی خان کو اپنے چالیس سالہ عہد حکومت مین مرہٹون اور ٹیپو سلطان کے ساتھ کئی مرتبہ معرکہ آرائی کا اتفاق ہوا جس کا حال خاندان آصفیہ کی تاریخون مین تفصیل کے ساتھ مذکور ہے -

شاہان آصفیہ

(۱) نواب میر قمر الدین خان بہادر الملقب به نظام الملک آصف جاہ — ۱۷۲۴ء / ۱۱۳۷ھ — ۱۷۴۸ء / ۱۱۶۱ھ

(۲) نواب میر احمد علیخان ناصر جنگ بہادر — ۱۷۴۸ء / ۱۱۶۱ھ — ۱۷۵۰ء / ۱۱۶۳ھ

(۳) نواب مظفر جنگ بہادر — ۱۷۵۰ء / ۱۱۶۳ھ — ۱۷۵۱ء / ۱۱۶۴ھ

(۴) نواب میر محمد علیخان صلابت جنگ بہادر — ۱۷۵۱ء / ۱۱۶۴ھ — ۱۷۶۲ء

(۵) نواب میر نظام علیخان بہادر نظام الملک آصف جاہ ثانی — ۱۷۶۲ء / ۱۱۷۵ھ — ۱۸۰۳ء / ۱۲۱۸ھ

(۶) نواب میر اکبر علیخان بہادر سکندر جاہ آصف جاہ ثالث — ۱۸۰۳ء / ۱۲۱۸ھ — ۱۸۲۹ء / ۱۲۴۵ھ

(۷) نواب میر فرخندہ علیخان ناصر الدولہ بہادر — ۱۸۲۹ء / ۱۲۴۵ھ — ۱۸۵۷ء / ۱۲۷۳ھ

(۸) نواب میر تہنیت علیخان افضل الدولہ بہادر — ۱۸۵۷ء / ۱۲۷۳ھ — ۱۸۶۹ء / ۱۲۸۶ھ

(۹) نواب میر محبوب علی خان بہادر — ۱۸۶۹ء / ۱۲۸۶ھ — ۱۹۱۱ء / ۱۳۲۹ھ

(۱۰) نواب میر عثمان علی خان بہادر — ۱۹۱۱ء / ۱۳۲۹ھ — موجود

۱۵ - والیان کرناٹک

۱۶۹۲ء / ۱۱۰۳ھ — ۱۸۰۱ء / ۱۲۱۶ھ

دار الحکومت - ویلور و ارکاٹ

گولکنڈہ کی فتح کے بعد کرناٹک بھی مغلیہ علاقہ مین شامل ہوگیا اور انتظام مملکت کے لیے دربار مغلیہ سے صوبہ دار مقرر ہونے لگے - بہادر شاہ اول کے زمانہ مین یہ خدمت سعادت خان کو ملی جس نے کوشش کرکے اسکو اپنے خاندان مین موروثی کرلیا - ویلور اسکا دار الحکومت تھا - نظام الملک آصف جاہ نے جب دکن مین استقلال حاصل کرلیا تو کرناٹک بھی ان کا باج گذار صوبہ بن گیا لیکن سعادت اللہ کے جانشینون نے اطاعت سے انحراف کرنا چاہا جسکی بنا پر آصف جاہ نے اُن پر چڑھائی کی اور اس ملک کو فتح کرکے اپنے ایک تجربہ کار سردار محمد انور الدین خان کو یہان کا گورنر مقرر کردیا - آصف جاہ کی وفات کے بعد انور الدین خان نے بیحد قوت حاصل کرلی اور جب مرنے لگا تو اپنے اختیار سے اپنے فرزند محمد علیخان کو اپنا جانشین قرار دیا -

کرناٹک میں مدت سے فرانسیسی اور انگریز قوت آزمائی کررہے تھے والیانِ کرناٹک کو مرہٹوں اور ٹیپو سلطان کی لڑائیوں میں ان سے مجبوراً مدد لینا پڑی جسکی وجہ سے ان کو اس علاقہ میں بیحد اقتدار حاصل ہوگیا۔ سنہ ۱۷۶۱ء میں انگریزوں نے کوشش کرکے فرانسیسوں کو کرناٹک سے بیدخل کردیا اور والیان کرناٹک انگریزوں کے ماتحت ہوگئے۔ سنہ ۱۸۰۱ء میں محمد علی خان کے بیٹے عمدۃ الامرا نے تمام ملک انگریزوں کے حوالہ کردیا اور اپنی پرورش کے لیے پنشن منظور کرلی جو اُس کی اولاد میں ابتک جاری ہے۔

والیان کرناٹک

(۱) ذوالفقار علی خان	۱۶۹۲ء / ۱۱۰۳	۱۷۰۳ء / ۱۱۱۵
(۲) داؤد خان	۱۷۰۳ء / ۱۱۱۵	۱۷۱۰ء / ۱۱۲۲
(۳) سعادت خان	۱۷۱۰ء / ۱۱۲۲	۱۷۳۲ء / ۱۱۴۵
(۴) باقر علی خان	۱۷۳۲ء / ۱۱۴۵	—
(۵) علی دوست خان	۱۷۳۲ / ۱۱۴۵	۱۷۴۰ / ۱۱۵۳
(۶) صفدر علی خان	۱۷۴۰ / ۱۱۵۳	۱۷۴۲ء / ۱۱۵۵
(۷) محمد سعید سعادت اللہ خان	۱۷۴۲ / ۱۱۵۵	۱۷۴۴ء / ۱۱۵۷
(۸) محمد انور الدین خان شجاع الدولہ	۱۷۴۴ / ۱۱۵۷	۱۷۴۹ء / ۱۱۶۳
(۹) محمد علی خان	۱۷۴۹ء / ۱۱۶۳	سنہ ۱۷۹۵ء
(۱۰) عمدۃ الامرا (جسنے ملک انگریزوں کے حوالہ کردیا)	سنہ ۱۷۹۵ / ۱۲۱۰	سنہ ۱۸۰۱ / ۱۲۱۶

شاہزادگان کرناٹک

جو پرنس آف ارکاٹ کے لقب سے مشہور ہیں اور گورنمنٹ انگریزی کی طرف سے پنشن پاتے رہے ہیں۔

(۱) عظیم الامرا	سنہ ۱۸۰۱ء / ۱۲۱۶	سنہ ۱۸۱۹ء / ۱۲۳۴
(۲) اعظم جاہ	سنہ ۱۸۱۹ء / ۱۲۳۴	سنہ ۱۸۲۵ء / ۱۲۴۱
(۳) عظیم جاہ	سنہ ۱۸۲۵ء / ۱۲۴۱	سنہ ۱۸۳۱ء / ۱۲۵۰
(۴) محمد غلام غوث خان اعظم الامراء	سنہ ۱۸۳۲ء / ۱۲۵۰	سنہ ۱۸۵۵ء / ۱۲۷۲
عظیم جاہ (اگرچہ حقیقت پرنس آف ارکاٹ)	سنہ ۱۸۶۷ء / ۱۲۸۴	سنہ ۱۸۷۴ء / ۱۲۹۱
(۵) ظہیر الدولہ	سنہ ۱۸۷۴ء / ۱۲۹۱	سنہ ۱۸۷۹ء / ۱۲۹۶
(۶) انتظام الملک	سنہ ۱۸۷۹ء / ۱۲۹۶	سنہ
(۷) عمدۃ الامراء	سنہ ۱۸۸۹ء / ۱۲۹۰	سنہ ۱۹۰۱ء / ۱۲۹۹

مملکت آصفیہ کے مشہور واقعات

دکن پر رام نے یورش کی	سنہ ۲۰۰۰ ق م
راجہ اشوک برسر حکومت ہوا	سنہ ۲۳۶ ق م
اندھرا خاندان کا عروج (تلنگانہ میں)	سنہ ۲۴۰ ق م
اندھرا قوم نے گڈوہ پر حملہ کیا	سنہ ۲۴۰ ق م
پلاوا خاندان کرناٹک میں برسر حکومت ہوا	سنہ ۳۰۰ء
چلوکیا خاندان (مغربی شاخ) برسر حکومت ہوا	سنہ ۳۰۰ء
چلوکیا خاندان (مشرقی شاخ) برسر حکومت ہوا	سنہ ۶۱۵ء
اندھرا قوم کو پلاوا خاندان نے تباہ کیا	سنہ ۶۲۲ء
راشٹرکوٹا قوم نے چلوکیا خاندان کی مغربی شاخ پر غلبہ حاصل کیا۔	سنہ ۷۵۷ء / ۱۳۰
چلوکیا خاندان کی مغربی شاخ پھر بحال ہوئی	سنہ ۹۷۳ء / ۳۶۲
چلوکیا خاندان کی مشرقی شاخ کو چولا قوم نے تباہ کیا	سنہ ۱۰۲۲ء / ۴۱۳
یادو خاندان برسر حکومت ہوا	سنہ ۱۱۰۰ء / ۴۹۲
ککتیہ خاندان جسکو کاکیتیا خاندان بھی کہتے ہیں ورنگل میں برسر حکومت ہوا	سنہ ۱۱۰۰ء
بلالے دیوگیری بسایا اور یادو خاندان کو خود مختار بنایا	سنہ ۹۸۰ء / ۳۰۲
چلوکیا خاندان کی مغربی شاخ کو یادو قوم نے تباہ کیا	سنہ ۱۱۸۹ء / ۵۸۵
خاندان خلجی برسر حکومت ہوا	سنہ ۱۲۹۰ء / ۶۸۹
دکن پر مسلمانوں نے پہلی مرتبہ حملہ کیا	سنہ ۱۲۹۴ء / ۶۹۳

دکن پر ملک کافور نے حملہ کیا	۱۲۹۶ء / ۶۹۶ھ
دیوگڈھ کو مسلمانوں نے فتح کیا	۱۳۰۶ء / ۷۰۶ھ
ورنگل کو مسلمانوں نے فتح کیا	۱۳۰۹ء / ۷۰۸ھ
کرناٹک کو مسلمانوں نے فتح کیا۔	۱۳۱۰ء / ۷۱۰ھ
یادو خاندان تباہ ہوا	۱۳۱۸ء / ۷۱۸ھ
خلجی خاندان تباہ ہوا۔	۱۳۲۰ء / ۷۲۰ھ
خاندان تغلق برسر حکومت ہوا	۱۳۲۱ء / ۷۲۱ھ
سلطان محمد بن تغلق برسر حکومت ہوا	۱۳۲۶ء / ۷۲۷ھ
سلطنت بیجانگر قائم ہوئی اور شہر بیجانگر آباد ہوا	۱۳۳۶ء / ۷۳۷ھ
امرائے دکن نے بغاوت کی	۱۳۴۷ء / ۷۴۸ھ
سلطنت بہمنیہ قائم ہوئی	۱۳۴۸ء / ۷۴۹ھ
بہمنیوں نے گولکنڈہ کو فتح کیا۔	۱۳۶۲ء / ۷۶۴ھ
خاندان تغلق تباہ ہوا	۱۳۹۹ء / ۸۰۲ھ
عماد شاہی سلطنت قائم ہوئی	۱۴۸۵ء / ۸۹۰ھ
عادل شاہی سلطنت قائم ہوئی	۱۴۸۹ء / ۸۹۵ھ
نظام شاہی سلطنت قائم ہوئی	۱۴۹۰ء / ۸۹۶ھ
برید شاہی سلطنت قائم ہوئی	۱۴۹۱ء / ۸۹۷ھ
دکن میں پرتگیز آئے	۱۴۹۸ء / ۹۰۴ھ
قطب شاہی سلطنت قائم ہوئی	۱۵۱۲ء / ۹۱۸ھ
بہمنی نام کے بادشاہوں کا خاتمہ ہوا	۱۵۲۶ء / ۹۳۳ھ
تالیکوٹہ کی عظیم الشان لڑائی جس میں سلطنت بیجانگر کا خاتمہ ہوا	۱۵۶۵ء / ۹۷۲ھ
عماد شاہی سلطنت کو نظام شاہیوں نے تباہ کیا	۱۵۷۵ء / ۹۸۳ھ
شہنشاہ اکبر نے دکن پر حملہ کیا	۱۵۹۶ء / ۹۹۵ھ
محمد قلی نے شہر حیدرآباد کی بنیاد ڈالی	۱۵۸۹ء / ۹۹۸ھ
مغلوں نے احمد نگر فتح کرلیا	۱۶۰۰ء / ۱۰۰۹ھ
اہل بیجانگر کا چندراگری میں آباد ہونا	۱۶۱۴ء / ۱۰۲۳ھ
ملک عنبر نے برید شاہی سلطنت کو تباہ کیا	۱۶۲۳ء / ۱۰۳۳ھ
چندراگری کے راجہ نے انگریزوں کو مدراس کا علاقہ دیا	۱۶۳۹ء / ۱۰۴۹ھ
شاہجہان نے نظام شاہی سلطنت پر قبضہ کیا	۱۶۳۶ء / ۱۰۴۶ھ
اورنگ زیب نے بیجاپور فتح کیا	۱۶۸۶ء / ۱۰۹۸ھ
اورنگ زیب نے گولکنڈہ کو فتح کیا	۱۶۸۷ء / ۱۰۹۹ھ
سعادت اللہ خان والی کرناٹک مقرر ہوا	۱۷۱۰ء / ۱۱۲۲ھ
نواب آصف جاہ دکن کے صوبیدار مقرر ہوئے	۱۷۱۳ء / ۱۱۲۵ھ
نواب آصف جاہ نے کرناٹک فتح کیا	۱۷۴۳ء / ۱۱۵۶ھ
انورالدین خان والی کرناٹک مقرر ہوا	۱۷۴۴ء / ۱۱۵۷ھ
انگریزوں نے فرانسیسیوں کو کرناٹک سے بیدخل کردیا	۱۷۶۰ء / ۱۱۷۴ھ
عمدۃ الامراء نے کرناٹک انگریزوں کے حوالہ کیا	۱۸۰۱ء / ۱۲۱۶ھ

حکیم سید شمس اللہ قادری

آگرہ کی دو پُرانی یادگارین

بادشاہ جہانگیر کا تخت سنگ موسیٰ

یہ تخت آگرہ کے قلعہ مین شاہجہان کے محل کے بالاخانے پر دریا کے رُخ کٹہرے کے پاس خندق کے اوپر رکھا ہوا ہے جسکا طول (۱۰) فٹ (۷ ۱/۲) انچہ عرض (۹) فٹ (۱۰) انچہ دبازت چھ انچہ۔ بلندی ایک فٹ (۴) انچہ۔ پتھر کی ساخت مین لوہے کی آمیزش کی وجہ سے ایک جگہ سُرخی جھلکتی ہے جس کی نسبت مشہور ہے کہ اس مقام سے دو مرتبہ خون رواں ہوا۔ واللہ اعلم بالصواب

تخت کے اطراف مین اُبھرے حرفون کا یہ کتبہ ہو۔

سریر حضرت سلطان سلیم اکبر شاہ — ہمیشہ باد مزین بنور مہر آلم
بادشاہے کہ تیغ او ساند — چون دو بیکی بسر عدو دو نیم
باسعد این تختگاہ فرخندہ — تکیہ گاہ خدا لگان کریم
محک خسروان پئے تمک — مہر و مہ را عیار بر زر و سیم
مسند با صفا ز نور و ضیا — گوہر بے بہا چو دُرِّ یتیم
پئے تاریخ او بفکر شدم — مژدہ جستم از خدائے کریم
تا فلک تختگاہ و خورشید ست — گفت ماند سریر شاہ سلیم

تخت کے پایون پر دو شعر کندہ ہین:-

چون شاہ سلیم وارث تخت و نگین — بر تخت نشست بسعد گیتی آئین
شد اسم مبارکش جہانگیر چو ذات — وز نور عدالت لقبش نور الدین

ذیل کی عبارت خط نسخ مین مشرق کیطرف جو حرف جنابیتی ہو لکھی ہوئی ہو۔ چونکہ یہ عبارت خانہ روار کہ ہو اور باریک ہو لہذا ابانظر نہین آتی ہو۔

"ادام اللہ عیش از جلوس شاہ سلیم بعد آن نور الدین محمد جہانگیر بادشاہ غازی"۔

بلند مرتبہ ماہ فلک جو چکیم آہ — سریر شاہ جہانگیر ابن اکبر شاہ

الہ وردی خان کا حمام

شہر آگرہ کے محلہ چھیپی ٹولے کی گلی مین بائین ہاتھ کو جہان وہ کوچہ قلعے کے مغربی حصے سے جا ملتا ہو اُس سے ذرا اُدھر سنگ سُرخ کا ایک بڑا شاندار دروازہ کھڑا ہو جو جہانگیر بادشاہ کا بنوایا ہوا ہو۔ اس دروازے مین داخل ہونے کے بعد ہم اُس بڑے مربع قطع اراضی مین داخل ہوتے ہین جو الہ وردی خان کے حمام کے نام سے مشہور ہو۔ اب حمام کی حیثیت باقی نہین۔ فی زماننا اس مکان سے سرائے کا کام لیا جاتا ہو۔ معلوم نہین ہوتا کہ الہ وردی خان بانی اس عمارت کا کون شخص تھا۔ سیل چند کی کتاب "تعریف العمارات" مین اس کا ذکر نہین ہو لیکن راجہ رام نے "تعمیرات آگرہ" مین صرف اسقدر لکھا ہو کہ شاہجہان کے عہد مین یہ حمام الہ وردی خان نے بنوایا تھا۔ اس عمارت کا طول (۲۴۰) فٹ اور عرض (۱۴۴) فٹ ہو۔ دروازے پر یہ کتبہ ہو:-

در ایام شہنشاہ جہانگیر — کہ می زیبد با و عالم پناہی
بشہر آگرہ دار الخلافت — کہ باشد پائے تخت بادشاہی
بخیر الہ وردی خان بنا کرد — چنین پاکیزہ حمامے کہ خواہی
صفائش رو برو با روئے خورشید — فضائش با فلک در بارگاہی
ز موج آب و عکس قرص کل جام — ہمیشہ حوض او پُر ماہ و ماہی
پئے تاریخ بنیادش دلم را — بفضل فکر جستم از سیاہی
گرفتن دامن پاکان و گفتم — بنائے خیر حمام مسیاہی

بشیر الدین احمد (دہلوی)

(جھانسی کی رانی)

جھانسی وسط ہند (بندیلکھنڈ) میں واقع ہے جہاں زمانۂ قدیم میں بندیلا راجپوتوں کی حکومت کا جھنڈا لہرا رہا تھا مگر زمانۂ مغلیہ میں ان کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔

مدتوں یہاں گوساوی راجاؤں نے حکومت کی ہر گران کی حالت کمزور ہو جانے پر بوندیلا راجہ بیر سنگھ جو زبردست تھا گوساویوں پر غالب آگیا اور سلطنت پر اپنا قبضہ کر لیا۔ یہ بیر سنگھ دیو ہے جس نے شہزادہ سلیم کی تحریک سے ابوالفضل کا خون کیا تھا۔ مگر جب اکبر نے اس کی گرفتاری کا حکم نافذ فرمایا تو یہ شخص اسطرح فرار ہو گیا کہ کسی کو پتہ بھی نہ لگا کہ اسے زمین کھا گئی یا آسمان اور جب تک کہ اکبر کا دور حکومت رہا بیر سنگھ اس محفوظ قیام سے باہر نکلا جہاں اُس نے بھاگ کر پناہ لی تھی۔ مگر جہانگیر کے تخت نشین ہوتے ہی اُس نے پھر دوسرا جنم لیا اور جہانگیر کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی دردانگیز مصیبت کی داستان سنائی۔ کیونکہ یہ ساری آفتیں بیر سنگھ نے جہانگیر ہی کے لیے جھیلی تھیں بادشاہ نے اُسکے عوض خدمات کا اندازہ کر کے پھر اُسے اُس کا راج واپس دیدیا۔ مگر شاہ جہان کا زمانہ اِسے راس نہ آیا اور یکایک ایسا انقلاب ہوا کہ اسکا راج پھر چھین لیا گیا اور ۱۷۰۷ء تک جھانسی مغلیہ سلطنت کا ایک چھوٹا سا صوبہ ہی رہا۔

جب بہادر شاہ کے ہاتھ میں عنان حکومت آئی تو اُس نے جھانسی اپنے ایک خدمتگار یا جان نثار راجہ چھتر سال کو بطور جاگیر بخش دی۔ چھتر سال نے جب تک مغلیہ سلطنت کا زوال شروع نہ ہوا تھا آرام سے راج کیا لیکن اِدھر مغلیہ حکومت کا آفتاب غروب ہونے لگا اور اُدھر سرکشوں نے چھتر سال کا ناکون دم کر دیا خصوصاً مالوہ کا سلطان سردار اور الہ آباد کے نواب نے تو اِسے سونا تک حرام کر دیا تھا۔ چھتر سال سخت پریشانی کی حالت میں مبتلا تھا آخر مجبوراً اسے باجی راؤ پیشوا سے امداد طلب کرنا پڑی۔ مرہٹہ فوج نے چھتر سال کے دشمنوں کا کھلے میدانوں میں مقابلہ کیا اور اسطرح چھتر سال کو آرام نصیب ہوا۔

چھتر سال کی عمر زیادہ ہو چکی تھی اور بدقسمتی سے اُسکے کوئی اولاد بھی نہ تھی لہٰذا اُس نے اپنے مربی اور محسن باجی راؤ پیشوا ہی کو تخت کا

وارث قرار دیا۔ اس طرح سے جھانسی مرہٹہ حکومت میں داخل ہو گئی اور یہاں اُس وقت سے ایک مرہٹہ حاکم مقرر ہونے لگا۔

جھانسی کے پرانے حقدار گوساوی راجہ یہ دیکھ کر جل گئے اور ہر طرف سے مرہٹہ حاکم کو ستانا شروع کیا مگر باجی راؤ پیشوا نے ان کی سرکوبی کے لیے ایک زبردست لشکر رگھوناتھ راؤ نبھالکر کے زیر کمان روانہ کیا جس نے غنیم کو جھانسی کی حدود سے بھگا دیا۔ یہ کامیابی اور فتح دیکھ کر باجی راؤ اپنے لائق اور جان نثار افسر رگھوناتھ راؤ نبھالکر سے از حد خوش ہوا اور قدردانی کے طور سے اسے ہمیشہ کی حکومت بطور خاندانی حقوق کے عطا فرمائی۔ جب رگھوناتھ راؤ بھی ضعیف ہو گیا تو اسکے بھی کوئی اولاد نہ تھی آخر اُس نے اپنے بھائی شیو راؤ بھاؤ کو یہاں کی صوبیداری مرحمت کی۔

باجی راؤ کی کمزور طبیعت اور پست حوصلوں کی وجہ سے جو اُس کی سلطنت کا حال ہوا ہے وہ تو ظاہر ہی ہے کیونکہ اُسکے کل ماتحت حاکموں نے علم بغاوت بلند کر کے آزادی کا جھنڈا لہرانا شروع کر دیا تھا جنمیں ایک شیو راؤ بھاؤ بھی تھا۔

انگریزی جنرل ولزلی اور لیک نے پیشوائی کشتی کو ڈوبتے بچایا کیونکہ سندھیہ، ہولکر اور ناگپور کا راجہ مرہٹہ سلطنت کی بنیاد کو اکھیڑ ڈالنا چاہتے تھے مگر انگریزوں کی وجہ سے اُن کو یہ موقع نہ نصیب ہوا۔ شیو راؤ بھاؤ انگریزوں کے ساتھ تھا۔ اور اُس نے اپنی حیثیت کے موافق اچھی خاصی انگریزوں کو مدد دی۔

شیو راؤ کی بھی عمر زیادہ ہو جانے سے اُس نے زمام سلطنت اپنے پوتے رامچندر راؤ کے ہاتھ میں دیدی اور آپ اپنی عمر کے آخری حصہ برہمہ ورت کی پاک زمین بیٹھور میں گذارنے کے لیے چلا گیا۔

سنہ ۱۸۱۷ء میں انگریز اور رامچندر راؤ میں ایک معاہدہ ہوا جسمیں انگریزوں نے رامچندر راؤ کو جھانسی کا خاندانی حاکم قبول کیا اور یہ بھی قرار پایا کہ بوقت ضرورت رامچندر راؤ انگریزوں کا ساتھ دے سنہ ۱۸۳۲ء میں رامچندر راؤ کو راجہ کا خطاب دیا گیا اور اس نے اپنی خوشی سے نشان "یونین جیک" جھانسی کے قلعہ پر لگا دیا۔

رامچندر راؤ کی وفات کے بعد اُس کی بیوہ بیوی نے اپنے بجائے کرشنا راؤ کو جھانسی کا راج دیا کیونکہ رامچندر راؤ بھی لاولد تھا۔ مگر انگریزی حکومت نے اسے قبول نہ کیا کیونکہ کرشنا راؤ کا گدی پر کوئی حق ہی نہ پہنچ سکتا تھا۔ چنانچہ رامچندر راؤ کے چچیرے بھائی رگھوناتھ راؤ سوم کو انگریزوں نے گدی پر بٹھایا مگر یہ انتخاب اچھا نہ تھا۔ چند ہی روز میں اس گدی نشین نے خوب ہاتھ پاؤں نکالے عیش پسندی اور فضول خرچیوں نے ریاست کا خاتمہ کر دیا۔ نوبت باینجا رسید کہ ریاست کے جواہرات اور قیمتی چیزیں بھی رہن رکھی جانے لگیں اور مہاجنوں سے قرض بھی لیا جانے لگا۔

ریاست کی یہ نازک حالت دیکھ کر برٹش گورنمنٹ نے اُسے اپنے ہاتھ میں لیا اور راجہ کے لیے ایک معقول وظیفہ مقرر کر دیا۔ اسی حالت میں راجہ نے سفر آخرت اختیار کیا۔ اُن کے بعد بہت سے اور حقدار گدی کے لیے کھڑے ہو گئے مگر انمیں گنگادھر راؤ ابن شیو راؤ کو جو اسی خاندان کا ایک رکن تھا سرکار انگریزی نے گدی کے لیے تجویز کیا۔ کیونکہ گنگادھر راؤ کا حق سب سے زیادہ پایا گیا۔ مگر گدی پر بٹھاتے وقت سرکار نے یہ وعدہ لے لیا کہ جب تک ریاست قرض کے بوجھ سے سبکدوش نہ ہوگی عنان ریاست انگریز سرکار ہی کے ہاتھ میں رہیگی چنانچہ سنہ ۱۸۴۲ء تک ایک انگریزی افسر اس کام کے لیے مقرر کیا گیا جس نے تھوڑے ہی عرصہ میں ریاست کو اس بار گراں سے سبکدوش کروا دیا اور محاصل وغیرہ بھی برابر ہو گئے۔ مگر ۲۵۴،۰۰۰ روپے سالانہ انگریزی محافظ فوج کے خرچ کے لیے دینے تک گنگادھر راؤ کو پورے اختیارات نہ دیے گئے چنانچہ مذکورۂ بالا رقم کا اُنہوں نے سالانہ

انتظام کر دیا اور گنگا دھر راؤ اب جھانسی کا باختیار راجہ بن گیا جو ہمارے مضمون کی "ہیروئن" کا شوہر ہے۔

پونہ کے جنوب میں کوئی پچیس کوس پر کرشنا ندی کے کنارے ایک چھوٹا سا گاؤں وائی نامی واقع ہے۔ یہان کرشنا راؤ نامی ایک کرہاڑا برہمن پیشوائی سرکار کا وظیفہ خوار معاملت دار و تحصیلدار رہا کرتا تھا۔ اسکا ایک بڑا ہی منچلا لڑکا تھا جس کا نام بلونت تھا۔ اس کو شریمنت پیشوا نے اپنے محافظین میں رکھا تھا۔ بلونت کے بھی دو لڑکے موروپنت اور سداسیو نامی تھے۔ موروپنت تو اپنے باپ کے پاس پونہ ہی میں رہا کرتا تھا اور دوسرا یعنی سداسیو چیماجی آپا باجی راؤ دوم کے بھائی کا منظور نظر تھا یعنی چیٹنا نوکر بن گیا تھا۔

۱۸۱۸ء میں جب باجی راؤ دوم آخری پیشوا نے اپنا راج انگریزون کے ہاتھ میں دیدیا اور آپ بٹھور کو آٹھ لاکھ روپے کا سالانہ وظیفہ لیکر آ بیٹھا تو اسوقت آپا صاحب جنوبی ملک میں اقامت گزین تھا۔ یونہ کی انگریزی ریذیڈنٹ نے آپا صاحب کو سالانہ بیس لاکھ کے محصول کا ملک بھی دینے کو کہا اس شرط پر کہ آپا صاحب پونہ کی جاگیر کا خود انتظام کرین مگر آپا صاحب نے قبول نہ کیا اور سرکار انگریزی سے درخواست کی کہ میں اپنی زندگی کا بقیہ حصہ خدا کی یاد میں گزارنا چاہتا ہون لہذا مجھے کاشی باش ہونے کی اجازت دی جائے۔ سرکار انگریزی نے یہ درخواست منظور کی۔ کوئی چھ مہینے بعد باجی راؤ دوم بھی یہین رہنے آگیا مگر کچھ دنون کے بعد بٹھور چلا گیا اور وہین رہنے لگا۔ موروپنت بھی مع اہل و عیال اسکے ہمراہ چلا آیا اور پچیس روپے ماہوار پر آپا صاحب کا دیوان مقرر ہوا جس وقت موروپنت کاشی مین تھا تو بھاگرتھی دیوی یعنی موروپنت کی بیوی کے ایک لڑکی ۱۹ نومبر ۱۸۳۵ء کو پیدا ہوئی جس کا نام لکشمی بائی رکھا گیا مگر بچپن کا پیارا نام منو بائی تھا اور یہی حسن کی دیوی آخر مین جھانسی کی مشہور بہادر اور دلیر رانی ہونے والی تھی۔

منو بائی کی عمر ابھی چار سال کی بھی نہ ہوئی تھی کہ اس کے سر سے اسکی مہربان اور شفیق ماں کا سایہ اُٹھ گیا۔ اس کے بعد آپا صاحب کا بھی انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے منو بائی کے والد موروپنت کو کاشی چھوڑ کر بٹھور آنا پڑا۔ باجی راؤ پیشوا نے اس کی حالت پر ترس کھا کر اپنے ہی پاس رکھ لیا اور اپنے مکان کے قریب ہی ایک مکان رہنے کو عنایت کیا۔ مکان کا سارا کام کاج موروپنت ہی کے سر پڑ گیا اور منو بائی کو بھی اپنے بچپن کا زمانہ مردون ہی مین گزارنا پڑا۔ منو بائی کی باتون نے پیشوا کے تمام گھر والون کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ یہ بچی ہمیشہ میرے ہی پاس رہے۔ منو بائی کو پیار سے ہر شخص "چھبیلی" کہکر پکارا کرتا تھا۔ باجی راؤ پیشوا کے کمسن گود لیے لڑکے بھی تھے جن کے ساتھ منو بائی کھیلا کرتی بلکہ اپنے ہمسن بچون سے مار پیٹ مین بھی وہ کبھی نہین جھجکتی تھی۔

منو بائی کی سوتیلی مان چیما بائی کہتی ہے کہ منو بائی جب بالکل کمسن تھی تو لڑکون کے دیکھا دیکھی پتنگ بھی اُڑایا کرتی تھی۔ ہمیشہ اگر لڑکیون مین کھیلنے لگے تو خود رانی بن جائے۔ کچھ لڑکیون کو اپنی خادمہ بنائے انصاف بھی کیا کرے اور سزا بھی دیا کرے۔ الغرض وہ ساری باتین کیا کرتی تھی جو ایک بہادر رانی کے شایان شان ہو سکتے ہین۔

جب کبھی منو بائی کے وقت پیشوا کے لڑکون کا اتالیق آجاتا تو یہ لڑکی بھی جا بیٹھتی اور پڑھنے مین شریک ہو جاتی بلکہ بعض اوقات تو سواری تلوار کی مشق وغیرہ مین بھی حصہ لیا کرتی تھی اور دیکھنے والے خوش بھی ہوتے اور لڑکون سے اسے بازی لیجاتے ہوئے دیکھکر حیرت زدہ ہوتے تھے۔

الغرض منو بائی نے پیشوا کے لڑکون کے ساتھ رہکر لکھنا پڑھنا، سواری، نیزہ بازی، تیر اندازی اور تلوار کی مشق خوب اچھی طرح سیکھ لی۔

مونو بائی کی عمر جب شادی کے قابل ہوگئی تو اُس کے باپ موروپنت کو فکر ہوئی کہ اب کیا کیا جائے۔ اِس لڑکی کو کہاں بیاہوں اور کوئی اچھا سا بر اُس کے لیے ڈھونڈھنے لگا۔

حسنِ اتفاق سے ایک روز پیشوا کے پاس تاتیا دکشت مشہور نجومی ملاقات کے لیے آیا تو موقع پاکر موروپنت نے بھی اپنی لڑکی کی جنم پتری دکھلائی اور آئندہ کے لیے کچھ سوالات کیے نجومی نے جب مونو بائی کا زائچہ دیکھا تو ششدر سا رہ گیا اور موروپنت سے کہنے لگا کہ وہ زمانہ بہت قریب ہے کہ مونو بائی رانی کے لقب سے یاد کی جائے گی مگر نجومیوں کی یہ مقررہ باتیں ہوا کرتی ہیں وہ سُن کر خاموش ہو رہا اور اپنے دنیاوی کام کاج میں مشغول ہوگیا مگر شب و روز کسی طرح چین نہ پڑتی تھی کیونکہ برہمنان دکن وغیرہ میں یہ بھی ایک دستور ہے کہ لڑکی سن بلوغ سے پیشتر بیاہی جائے اور اس طور سے موروپنت کی فکر بھی بجا تھی۔ خیر۔

تاتیا دِکشت نے مونو بائی کے رانی ہونے کی پیشینگوئی تو کر دی مگر لڑکی کا خداداد حُسن اور خداداد لیاقت دیکھکر خود بھی متعجب ہوگیا۔ اب مونو بائی کی قسمت تو دیکھیے! اتفاق سے راجہ جھانسی کی بی بی کا انتقال ہوچکا تھا اور دِکشت کی وہاں تک رسائی بھی تھی جس وقت دِکشت شریمنت گنگا دھر راؤ راجہ جھانسی کے پاس گیا ہے تو اس نجومی نے مونو بائی کے حُسن خداداد اور اُسکے لیاقت وغیرہ کی اتنی تعریف کی کہ راجہ بھی سُن کے متحیر سا ہوگیا مگر یقین کیسے آوے! اپنے آدمی جھور کو بھیجدیے کہ مونو بائی کو دیکھ آئیں جب گنگا دھر راؤ کے آدمی مونو بائی کو اچھی طرح دیکھ کر جھانسی کو واپس آگئے اور مونو بائی کی خداداد لیاقت اور حسن و خوبصورتی کی سچی تعریف کی ہے تو راجہ جھانسی بھی دل و جان سے شادی کرنے کے لیے راضی ہوگیا۔

مونو بائی جھانسی لائی گئی اور شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ شادی ہوگئی اور رانی لکشمی بائی کے لقب سے پکاری جانے لگی۔

شادی کے سال بھر کے بعد نخل امید بھی بار ور ہوا مگر تین مہینے کے بعد باد سموم کے جھونکوں سے یہ پھول مُرجھا کر والدین کے دلوں پر داغِ مفارقت دے گیا جس کی وجہ سے رانی لکشمی اور راجہ گنگا دھر راؤ بہت ہی مغموم رہنے لگے۔ اپنے لخت جگر کے غم میں راجہ سخت بیمار ہوا۔ راجہ کے کوئی اور لڑکا تو تھا ہی نہیں۔ لہذا اپنے ایک قریبی رشتہ دار واسودیو نیو بھلکر نامی کا لڑکا آنند راؤ گود لیا۔ اور تخت و تاج کا وارث مقرر کیا رسوم ولیعہدی بڑی دھوم دھام کے ساتھ ادا ہوئے اور دامودھر راؤ گنگا دھر راؤ نام رکھا گیا معمول کے موافق راجہ نے بنڈیلکھنڈ کے پولیٹیکل ایجنٹ کے ذریعہ سے اس کارروائی کی سرکار ہند کو خبر بھی کر دی اور آپ کوئی دس سال کی حکومت کے بعد راہی ملکِ بقا ہوا۔

اب یہاں سے جھانسی کی قسمت نے پلٹا کھایا۔ راجہ کے مرنے کے بعد ایجنٹ کو متبنی مقرر کرنے کے بارے میں شکوک پیدا ہوگئے اور سارا کچا چھٹا سرکار ہند یعنی وائسرائے کو شملہ لکھ بھیجا اور اپنی رائے بھی ظاہر کی کہ سرکار ہند کو اب اختیار ہے کہ جھانسی کی حکومت میں اپنا انتظام کرے اور رانی کو ماہانہ پانچ ہزار روپئے وظیفہ مقرر کر دیا جائے چونکہ لارڈ ڈلہاوزی وائسرائے ہند دورے پر تھے لہذا جواب آنے میں چھ مہینے کی دیر ہوئی اس عرصہ میں رانی لکشمی بائی نے یہ سمجھ لیا کہ گورنمنٹ ہند نے اس گدی نشینی کو منظور کر لیا اور امور مملکت میں بھی کسی قسم کی دقت واقع نہ ہوئی۔

۱۸۵۴ء میں جب لارڈ ڈلہاوزی اپنے دورے سے واپس آئے تو فارن سکریٹری نے سارے کاغذات پیش کر دیے اور جھانسی کو حکومت سرکار میں داخل کر لینے کے وجوہ بھی دکھائے اس پر حضور وائسرائے نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ چونکہ ریاست جھانسی کوئی آزاد سلطنت نہ تھی بلکہ انگریزی سرکار کی ماتحت تھی راجہ کو بغیر مشورہ حکومت اعلیٰ متبنیٰ لینے کا کوئی اختیار نہ تھا لہذا ریاست جھانسی حکومت انگلیشیہ میں داخل کی جاتی ہے کیونکہ

راجہ کے کوئی وارث بھی نہیں ہوا (۱۸۵۳ء)

مذکورۂ بالا فیصلہ پر بعض مورخین خلاف ہے اور گے ناراض ہین کیونکہ ان دونون کا قول ہے کہ انگلشیہ سرکار کو جھانسی کی حکومت چھیننی نہ چاہیے تھی۔ مگر اس وقت اس سے ہمین بحث نہین۔

میجر ایلس وایسرائے کا فرمان لیکر رانی کے محل مین پہنچے اور رانی کو پردہ کے پیچھے بٹھا کر وایسرائے کا فرمان سنایا گیا کہ جھانسی حکومت انگلشیہ مین داخل کر لی گئی اور اُن کو معقول وظیفہ ملنے کے علاوہ اُنکی پوری پوری عزت بھی برقرار رہے گی۔ مگر یہ شاہی فرمان سنتے ہی رانی کے ہاتھون کے طوطے اُڑ گئے۔ دنیا آنکھون سے تلے اندھیر ہو گئی آنکھون سے آنسو کا دریا اُمڈ آیا۔ میجر ایلیس نے رانی کی بہت کچھ تسلی و تشفی کی لیکن رانی مارے غم و غصہ کے آپے سے باہر تھی کیا کیا جائے عقل کچھ کام نکرتی تھی آخر میجر مذکور رخصت ہونے لگا تو رانی کے منھ سے اتنا تو ضرور نکل گیا کہ "مین تو اپنی جھانسی نہ دون گی"

جھانسی کے الحاق کے بعد پولٹیکل ایجنٹ بندیلکھنڈ مسٹر جان مالکم نے رانی کے لیے چند باتون کی سفارش سرکار ہند سے کی جو حسب ذیل ہین۔

(۱) رانی کو تادم زیست پانچ ہزار روپیہ ماہوار وظیفہ دیا جائے۔

(۲) شاہی محل جسمین رانی رہا کرتی ہو وہ اسکا خاص سمجھا جائے۔

(۳) راجہ گنگادھر راؤ کی راے سے ریاست کے کل جواہرات اور تحویل رانی کو مرحمت کیے جائیں اور رانی کے متعلقین وغیرہ کو وظیفہ دیا جائے انکی ایک فہرست بنالی جائے۔

مذکورۂ بالا دونون باتین لارڈ ڈلہوزی نے فوراً منظور کرلین مگر تیسری بات ریاست کے جواہرات وغیرہ کی منظوری نہ دی کیونکہ راجہ کا اُن پر کوئی حق ہی نہ پہنچ سکتا تھا لہذا مسٹر مالکم نے کل جواہرات اور تحویل کا نقد روپیہ رانی کے حوالہ کر دیا۔

مذکورۂ بالا وظیفہ پر رانی راضی نہوئی اور اپنی حکومت حاصل کرنیکی کوشش کرنے لگی انگلستان کو اپنے وکیل بھی روانہ کیے کہ کورٹ آف ڈائرکٹرز کے سامنے ساری حقیقت بیان کرین مگر آخر کو کچھ حاصل نہوا کیونکہ عرضی جو اس معاملہ کے لیے لکھی گئی تھی۔ وہ اسقدر بیہودہ اور واہیات الفاظ سے پُر تھی کہ کورٹ نے بھی سرکار ہند کے فیصلہ سے اتفاق کیا۔ عرضی کا مضمون یہ تھا "ریاست جھانسی کچھ انگریزون نے نہین دی تھی۔ پیشوائی حکومت مین ہمارے بزرگون کو اُن کی حق خدمت کے صلے مین ملی تھی۔ انگریزون کو جھانسی کو اپنی حکومت مین الحاق کرنے کا کوئی حق نہین ہے" وغیرہ۔ الغرض ہزارہا روپیہ برباد کیا گیا مگر نتیجہ کچھ بھی نہوا اور رانی کو مجبوراً وظیفہ قبول کرنے پر راضی ہونا پڑا۔

کچھ دنون کے بعد اپنے گود لیے لڑکے کی رسم "اپنین" یعنی رسم جنیو بڑی دھوم دھام سے ادا کی تقریباً ایک لاکھ روپیہ خرچ کیا یہ روپیہ سرکار ہند کی اجازت سے اُسی فنڈ سے لیا گیا جو دامودر راؤ کے لیے بلوغت کو پہنچنے تک رکھا گیا تھا۔ رانی کو اس شرط پر لاکھ روپیہ دیا گیا کہ راجہ کے اپنی عمر بلوغت کو پہنچنے کے آگے واپس کر دیا جائے جس کے لیے دو چار معزز اشخاص بھی بطور ضمانت لیے گئے۔ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ مین غدر شروع ہو گیا اور اُس کے شعلے سارے شمالی اور درمیانی ہند مین پھیل گئے۔ پلٹنون کی پلٹنین انگریزون سے باغی ہو گئین اور بازار قتل و خون گرم ہو گیا۔ باغیون نے دہلی آکر بہادر شاہ خاندان مغلیہ کے آخری فرمانروا کو دہلی کے تخت پر بٹھا دیا۔

کانپور مین نانا صاحب باجی راؤ دوم کے متبنّی بیٹے نے بھی علم بغاوت بلند کرنا شروع کیا اور بٹھور مین یکم جولائی ۱۸۵۷ء کو پیشوا بن بیٹھا۔ اصل مین بغاوت کے بانی نانا صاحب اور اُس کا چچیرہ بھائی تانتیا ٹوپی ہی تھے جو ظلم انھون نے کیا ہو اُسکے لکھنے سے قلم قاصر ہے لکھنؤ مین باغیون کے ہاتھون برجیس قدر جو واجد علی شاہ کا لڑکا تھا نواب اودھ بنایا گیا اور یہ شعلے

بھڑکتے بھڑکتے جھانسی تک بھی پہنچے!

کپتان الگزانڈر اسکین کمشنر جھانسی کو یقین تھا کہ یہاں کی سپاہ ہرگز ایسی حرکت بیہودہ نہ کرے گی چنانچہ ابتدائے غدر سے ۳ جون ۱۸۵۷ء تک کپتان مذکور کا یہی خیال تھا۔ مگر دوسرے ہی روز یعنی ۴ جون انگریزون کے بنگلوں کو آگ لگا دی گئی تو حضرت کے کان کھڑے ہوئے اور [illegible] چنانچہ یہان پر بھی کھلم کھلا بغاوت شروع ہوگئی۔ یہ دیکھ کر فوراً سارے انگریز قلعہ مین جاکر پناہ گزین ہو گئے!

کپتان ڈنلپ اور دوسرے انگریز افسرون نے حتی الامکان فساد دور کرنے کی کوشش کی مگر اب کیا ہو سکتا تھا یہان تو اور بھی دوسری آگ بھڑک گئی جو مدتوں سے دبی ہوئی تھی۔ ساری سپاہ اور باشندے انگریزون کے خلاف ہو گئے۔ الغرض یہان کے بھی انگریزون کا وہی حال ہوا جو اور جگہون کے انگریزون کا ہوا ہے۔ باغیون کی جیت ہوئی اور اُن کا پورا قبضہ ہو گیا۔

اب باغیون کو اپنا ایک حاکم یا سردار مقرر کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ مسلمان نواب حسین علی خان کو حاکم مقرر کرنا چاہتے اور ہندو کسی ہندو کو یہ عہدہ دینا چاہتے تھے۔ دونون مین خوب کھینچا کھینچی ہوئی چونکہ ہندوؤن کی تعداد زیادہ تھی لہذا یہ قرار پایا کہ رانی لکشمی بائی کو اپنا سردار بنایا جائے ساری فوج اور باغی محل کو گئے اور رانی صاحبہ سے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ رانی صاحبہ یہ سُن کر از حد متعجب ہوئین کہ ہند مین بغاوت پھیل چکی ہے۔ تو اپنے محل مین تنہا اپنے بھگوان کی یاد مین پڑی رہتی تھی نہ دنیا سے کچھ کام تھا اور نہ اہل دنیا سے کسی طرح کا تعلق تھا۔ رانی لکشمی بائی کے لیے یہ بڑا ہی نازک وقت تھا کیونکہ رانی سے کہہ دیا گیا تھا کہ اگر آپ نے منظور نہ کیا تو ہم نے سداسیو راؤ کو راجہ بنانے کے لیے جھانسی بلایا ہے۔ یہ بھی اور مشکل آن پڑی کیونکہ سداسیو راؤ کا آنا رانی لکشمی بائی کے لیے گویا موت کا پیغام تھا۔ اگر کہیں وہ آجاتا تو یا رانی یہان سے نکال دی جاتی!

قتل کی جاتی لہذا مجبوراً رانی نے سرداری قبول کر لی۔

ساری سپاہ نے حلفاً اقرار کیا کہ جب تک دم مین دم ہے ہم رانی کے ساتھ رہین گے اور انگریزون کو ملک سے نکال کے دم لین گے۔ جس سے رانی کی اور بھی ہمت افزائی ہوئی اور ۱۰ جون ۱۸۵۷ء کو منادی کر دی گئی کہ خلق خدا کی ملک بادشاہ کا اور راج رانی لکشمی بائی کا!

جھانسی کی حکومت پاتے ہی رانی صاحبہ نے امورات سلطنت کی طرف خیال رجوع کیا۔ ہر ایک محکمہ کے لیے عہدہ دار مقرر کیے۔ فوج کی آراستگی کا انتظام کیا۔ شہر کی خاص مورچہ بندی کی اور ڈھونڈو پنت نانا صاحب کی طرف کمک کے لیے آدمی روانہ کیے۔ چونکہ شمال مغرب کی طرف انگریزون کے حملہ کا خوف لگا ہوا تھا لہذا رانی نے اپنی مورچہ بندی کا خاص انتظام کر لیا اور مقام کالپی مین ایک فوج رکھدی مگر ایک ماہ تک کوئی حملہ نہ ہونے سے ساری فوج جھانسی آگئی۔

جھانسی کے نکل جانے اور رانی کے تخت پر بیٹھنے سے انگریزون مین ایک کھلبلی سی پڑ گئی تھی مگر کیا کرتے مجبور تھے۔ فوج اتنی کافی نہ تھی جو مقابلہ کرتے۔ سارے ہندوستان کی ہوا بگڑ چکی تھی۔ مگر اس مین کچھ شک نہین کہ یہ ہمت کے بڑے پکے ہین۔ الغرض مارچ ۱۸۵۸ء تک انگریزون نے اپنی بگڑی ہوئی طاقت کو سنبھالا اور کچھ فوج جمع کر لی۔

ماہ مذکور کے ابتدا ہی مین خبر مشہور ہوگئی کہ جنرل سر ہیو روز ایک زبردست فوج لیکر جھانسی کو پھر فتح کرنے آرہا ہے مگر رانی مطلق نہ گھبرائی بلکہ اپنی بہادر اور جان نثار سہیلی رانی گنگا بائی بیوہ راجہ گنگا دھر راؤ کے ساتھ ملکر اپنی منتشرہ فوج کو جمع کیا اور شہر کی سخت مورچہ بندی وغیرہ کی۔

رانی لکشمی بائی یہ جانتی تھی کہ یہ بیل کبھی منڈھے نہین چڑھے گی ایک نہ ایک روز شکست فاش کا منحوس منھ دیکھنا ہی پڑے گا مگر کیا کرتی آخر عورت ذات سارا ملک باغی ہو چکا تھا اور لوگ بالکل ہاتھون مین تھے۔

لیکن اس پر بھی رانی صاحبہ نے بہت سے بارسوخ باغیون کو اپنا کرکے انگریزون سے صلح کرنے پر راضی کر لیا چنانچہ کچھ ہوشیار آدمیون کی ایک جماعت صلح کی شرطون کے ساتھ جنرل سر ہیو روز کی طرف روانہ بھی کی گئی مگر بدقسمتی تو دیکھیے! ابھی رانی کے وکیل جنرل موصوف کے پاس پہنچے بھی نہ تھے کہ سر ہیو روز جھانسی پر آن پہنچے اور چاندیری پر انگریزی حملہ ہو چکا۔ چونکہ یہان رانی کی کافی فوج نہ تھی لہذا انگریزون کو فتح ہوئی اور رانی کی فوج بھاگ آئی۔

چاندیری ایک مشہور مقام اکبری عہد مین تھا۔ یہان کی عمارات اور دوسری چیزین از حد مشہور تھین بغلیہ دور مین خصوصاً اکبر کے زمانہ مین تو ایک ضرب المثل ہو گئی تھی کہ "اگر کسی شہر مین محل ہی محل دیکھنا ہون تو چاندیری دیکھو"۔ چنانچہ یہان پر رانی کی فوج تھی مگر ناکافی اور یہی وجہ تھی جو یہ پہلی شکست رانی کو ہوئی۔

رانی کے بھیجے ہوے وکیل جب انگریزی لشکر مین سر ہیو روز کے روبرو صلح کے لیے گئے ہین تو انھین جاسوس سمجھ کر فوراً قتل کر دیا گیا اور کچھ بھی دریافت نہ کیا کہ یہ کیون آئے تھے۔

۲۳ مارچ ۱۸۵۸ء کو انگریزی فوج کے ہراول کے بڑے حصّہ نے جھانسی پر حملہ کیا جس مین خود قلب فوج کا حصّہ بھی آملا۔ تیرہ روز تک سخت جنگ رہی۔ اس جنگ مین رانی لکشمی بائی اور اُس کی بہادر سہیلی گنگا بائی نے جو ایک حساب سے اُس کی بہو بھی ہوتی تھی خوب داد جوانمردی اور بہادری کی دی جوہر دکھائے اپنے سپاہیون کا خوب دل بڑھایا نو بہ نو حوصلے دلا دلا کر آگے کیا اور ایسا بھی شہر کا بچاؤ کیا کہ دیکھنے والون کے چھکے چھوٹ گئے!

ایک مورخ (مسٹر ڈے) لکھتا ہو کہ "رانی لکشمی بائی اور رانی گنگا بائی کی ہمت دیکھکر قلعہ کی دوسری عورتون کو بھی ہمت آگئی اور انھون نے سپاہیون کو کارتوس وغیرہ لا لا کر دینا شروع کیا اور رہبر گر گولونکی بھی مطلق پروا نہ کی۔"

جب تانتیا ٹوپی نے سنا کہ جھانسی پر انگریزون نے حملہ کر دیا ہو تو فوراً اپنی فوج کے ساتھ جھانسی کیطرف کوچ کیا۔ اس کے ساتھ راجہ بانپور بھی شامل ہو گیا۔ تانتیا ٹوپی کے آنے کی خبر سن کر جنرل ہیو روز کو البتہ ذرا پریشانی ہوئی کیونکہ اُس کے پاس اسوقت سب سے زیادہ زبردست جو اُنکی فوج جمع ہو چکی تھی لہذا جنرل موصوف نے ایک منتخب سپاہیون کی جماعت بیتوا ندی کی طرف روانہ کی کہ تانتیا ٹوپی اور راجہ بانپور کو روکے کیونکہ رانی کے ساتھ اِن دونون کا ملنا انگریزون کے لیے اچھا نہ تھا۔

تانتیا ٹوپی جسوقت ندی کنارے پہنچا ہو تو اُس نے اپنی آمد کی خبر دینے کے لیے کئی سو مشعلین اپنی فوج مین روشن کر دین جنکو دیکھکر جھانسی کی رانی کی فوج کی جان مین جان آگئی اور مارے خوشی کے بندوقین سر کرنی شروع کین۔ اس سے انگریزی فوج دراصل پست ہمت ہو گئی اور ایک سخت پریشانی کی حالت مین بھی کلاب کیا کیا جائے۔ مگر سر ہیو روز کی دور اندیشی اور ہمت نے دلشکستہ فوج کو سنبھالا اور فوج کا کچھ حصّہ تانتیا ٹوپی کو روکنے کے لیے روانہ کیا گیا۔

اگرچہ تانتیا ٹوپی کو رانی لکشمی بائی نے پہلے کبھی نہین دیکھا تھا مگر اسکے آنے سے رانی کو ذرا ہمت سی آگئی اور قدم جم گئے۔ دوسری طرف ندی کنارے تانتیا اور انگریزون مین جنگ چھڑ گئی۔ یہ جنگ کوئی معمولی جنگ نہ تھی۔ کشتون کے پشتے لگ گئے مگر تانتیا کا طرز جنگ وہی پرانے طرز کا تھا جو سر ہیو روز کے آگے چل نہ سکا اور زیادہ نقصان ہونے سے سپاہ بھی دلشکستہ ہونے لگی اور سپاہ دل ہار کر بھاگنے لگی۔ اگرچہ تانتیا نے جہانتک ہو سکا اپنی سپاہ کو روکا اور دل بڑھا بڑھا کر آگے کرنے کی سخت کوشش کی مگر انگریزی باقاعدہ فوج کے سامنے نہ ٹھہر سکی!

تانتیا کے آنے سے دا تھی رانی اور ساری جھانسی کو ایک قسم کی

خوشی حاصل ہو گئی تھی مگر اب جبکہ اُن کے کانون مین تا لمنتیا کی شکست کی خبر پہنچی تو البتہ رانی اور فوج دلشکستہ تو ہو گئی مگر اپنے کام مین ویسی ہی بہ ثابت قدمی سے جمی رہی جیسی کہ پیشتر تھی اور جہانتک ممکن تھا اپنے بچاؤ کا رانی نے پورا انتظام کر لیا۔

سر ہیوروز ۲۲؍ مارچ سے ۵؍ اپریل تک رانی سے لڑتے رہے مگر اتنی مدت مین بھی شہر مین داخل ہونے کا موقع نہ ملا۔ رانی کی بہادری اور جنگی لیاقت دیکھ کر سر ہیوروز از حد متعجب تھا بلکہ کہتا بھی تھا کہ "ایک عورت نے کیا ناکون دم کر رکھا ہے۔ ایسی بہادر عورت مین نے کبھی نہین دیکھی" آخر جنرل ہیوروز نے ایک زبردست جماعت کوئی سو سے زیادہ بہادر اور تجربہ کار سپاہیون کی بنائی اور شہر کی مغربی سمت سے حملہ کرنے کی تاکید کر دی اس وقت افسوس ہے کہ رانی حاضر نہ تھی۔ دوپوجا مین مصروف تھی۔ اِس طرف ساری فوج اُمنڈ پڑی اور دوسری طرف سر ہیوروز نے سخت گولہ باری شروع کر کے کچھ بہادر انگریزی سولجرون کو سیڑھیون کے ذریعہ سے شمالی دیوار کی طرف سے شہر مین اُتار دیا اور اب جنگ کا کچھ نیا ہی رنگ ہو گیا کیونکہ انگریزون کے حملے اب دو طرف سے ہو رہے تھے۔ اور باقاعدہ فوج کی گولہ باری اہلِ جھانسی کے لیے کچھ اچھی نہ تھی۔

رانی لکشمی بائی انگریزون کے شہر مین داخل ہونے کی خبر ملتے ہی مع اپنی مددگار رانی گنگا بائی کے فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر باہر نکل آئی اور جنگ مین شریک ہو گئی دن بھر جنگ ہوتی رہی اور شام کو انگریزی سپاہ محل تک پہنچ گئی رات بھر بھی رانی نے اپنے سپاہیون کو بڑی بہادری اور لیاقت کے ساتھ لڑایا مگر انگریزی فوج کا زور زیادہ ہونے سے رانی کو پیچھے ہٹنا ہی پڑا یہان تک کہ انگریز محل کے اصطبل تک پہنچ گئے۔ یہان پر بھی ۴؍ اپریل کو دن بھر جنگ رہی اور رانی کی سپاہ نے اپنا خوب ہی بچاؤ کیا۔ رانی کا زور کم دیکھ کر رانی کے باپ نے رائے دی کہ اب یہان ٹھہرنا اچھا نہین بلکہ کہین نکل جانا چاہیئے مگر رانی نے اسے قبول نہ کیا لیکن آخر گنگا بائی کی تحریک سے اپنے کچھ سپاہی ساتھ لیے اور کچھ محل کی حفاظت یا بچاؤ کے لیے چھوڑ کر رات کے وقت کالپی کی طرف نکل گئی تاکہ تانتیا ٹوپی سے مل کر کوئی دوسرا انتظام کرے۔

۵؍ اپریل ۱۸۵۸ء کو جنرل سر ہیوروز نے قلعہ جھانسی پر اپنا قبضہ کر لیا جھانسی اور بیتوا کی لڑائیون مین انگریزون کے ایک سو سینتالیس سپاہی کام آئے جن مین چھتیس افسر تھے۔ اہل جھانسی کا کوئی پانچ ہزار کا نقصان بتلایا جاتا ہے صرف جھانسی مین کوئی ہزار آدمی جلائے یا گاڑے گئے۔

دوسرے دن یعنی ۶؍ اپریل کو رانی لکشمی بائی اپنے ہمراہیون کے ساتھ کالپی پہنچی جہان تانتیا ٹوپی نانا صاحب کے چچازاد بھائی کا صدر مقام تھا۔ یہان پر تانتیا کا زبردست توپ خانہ اور کل جنگی اشیاء کا ذخیرہ تھا۔ رانی لکشمی بائی کے لیے یہ پہلا ہی وقت تھا جو تانتیا ٹوپی سے ملاقات ہوئی۔ رانی کی خوب آؤبھگت کی گئی۔ رانی گنگا بائی کا باپ نارائن ترمبک شاستری بھی یہان موجود تھا جو تانتیا کا رہنما اور صلاح کار تھا۔ ترمبک شاستری سرکار انگلیشیہ کا ملازم تھا اور اب وظیفہ خوار تھا۔

۶ سے ۱۴؍ اپریل تک رانی تانتیا ٹوپی کے ساتھ صلاح و مشورہ کرتی رہی کہ کیونکر پھر انگریزون پر حملہ کیا جائے اس میعاد مین انگریزون نے جھانسی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جتنے بلوائی ملے تہ تیغ کیے اسی دن رانی لکشمی بائی کا بوڑھا باپ بھی تلوارون کی نذر ہوا۔ الغرض خوب کشت و خون ہوا جیسا کہ مسٹر مارٹن کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم پانچ ہزار آدمی فقط جھانسی مین مارے گئے۔

کالپی پر تانتیا نے حملہ کیا اور یہان بھی سر ہیوروز سے اچھی جنگ ہوئی مگر ہفتون کی جنگ کے بعد دونون طرف کچھ خاموشی سی چھا گئی۔ جو خلاف بات ہی کیونکہ ایک تو گرمی قیامت کی پڑ رہی تھی جو انگریزی فوجون

پریشان کر رہی تھی اور ہندی سپاہ کو کئی ہفتوں تک آرام نہین ملا کالپی کے بچاؤ کے لیے تانتیا نے رانی لکشمی بائی کو چپکے سے چھوڑا اور خود فوج جمع کرنے کے لیے گوالیار چلا گیا۔ لکشمی بائی کانچا سے کالپی چلی آئی جو کوئی چار کوس کے فاصلہ پر تھا۔ رانی لکشمی بائی یہان ۸ مئی سے ۲۴ مئی تک رہی چنانچہ آخری روز یعنی ۲۴ مئی کو جنگ شروع ہوئی اور پھر بازار موت گرم ہو گیا۔

بدقسمتی سے راجہ بانپور تانتیا ٹوپی اور رانی لکشمی کے سپاہیون مین ناچاقی ہو گئی۔ اگر یہ ناچاقی نہ ہوتی تو یقیناً جنگ کا رنگ بدل جاتا۔ تاہم نے مانا کہ سر ہیو روز کی فوج کتنی ہی بڑھ چڑھ کر تھی مگر رانی لکشمی ضرور کچھ اپنی جوانمردی کے جوہر دکھلاتی مگر یہ خدا ہی کو منظور نہ تھا چنانچہ آخری دن یعنی ۲۴ مئی کو رانی کی فوج انگریزی رسالے اور توپ خانہ سے مغلوب ہو گئی اور ایک سراسیمگی کی حالت مین بھاگنے لگی یہان تک کہ رانی کو بھی اسی حالت مین اپنی فوج کے ساتھ بھاگنا پڑا۔ اور جب رات کو راستہ پر مقام ہوا ہے تو رانی لکشمی بائی کو ایک درخت کے نیچے بستر کے بغیر سونا پڑا!

اس جنگ کا حال ڈاکٹر لو نے جو اس وقت حاضر تھا لکھا ہے "ایک سخت جنگ کے بعد آخر ہمین دشمنون پر فتح ہوئی جنکا نمبر ہم سے دس گنا زیادہ تھا۔"

رانی لکشمی بائی گوالیار کیطرف اپنی فوج لیکر بھاگ گئی۔ چونکہ اب جنگ کی امید نہ رہی تھی لہذا سر ہیو روز نے طبیعت علیل ہو جانے کی وجہ سے سرکار ہند سے رخصت مانگی اور یہ بھی لکھا کہ چونکہ گرمی شدت سے پڑ رہی ہے لہذا گورون کو اپنے اپنے صدر مقامون کو روانہ کر دیا جائے۔ چنانچہ جنرل صاحب کو حسب منشاء رخصت مل گئی اور گورون کے لیے بھی ویسا ہی حکم ہو گیا جیسا کہ جنرل نے لکھ دیا تھا۔

مگر جنرل موصوف نے ذرا سمجھنے مین غلطی کی کیونکہ رانی لکشمی بائی کا یہ پختہ ارادہ ہو چکا تھا کہ جب تک دم مین دم ہے مارونگی یا مرون گی۔ چنانچہ رانی گوالیار کی طرف چلی گئی تاکہ اپنی فوج کو انگریزون کے مقابل لڑنے کے قابل بنائے اور تانتیا جو رنگروٹ وغیرہ لانے گیا تھا وہ سب مکمل کرے۔

سندھیہ اور ہولکر دونون مرہٹہ سردار ایام بغاوت مین انگریزون کے ساتھ رہے تھے اور انھون نے بالکل باغیون کا ساتھ نہ دیا تھا۔ اب یہ کوئی تعجب کی بات نہین ہے کہ جس وقت رانی لکشمی بائی حدود سندھیہ مین داخل ہوئی ہے تو سندھیہ کے سپاہیون نے اس پر حملے کرنے شروع کیے اور آپ بھی اپنی فوج کے ساتھ تھا۔

جس وقت رانی نے سندھیہ کی خبر سنی، فوراً اپنے گھوڑے پر سوار ہوئی اور اپنی جان نثار اور بہادر ساتھی گنگا بائی کو ہمراہ لیکر سندھیہ کی ملاقات کو آگے بڑھی مگر انکی یہ دلیرانہ ہمت اور بے دھڑک اپنی فوج مین آتے دیکھ کر تو سندھیہ بالکل ہی متعجب ہو گیا۔ حملہ کرنے کو تو نہین کہا مگر ان دونون عورتون کو گرفتار کرنے کے لیے حکم دیا مگر تعجب ہے کہ سندھیہ کے سپاہیون نے رانی لکشمی بائی اور گنگا بائی کو گرفتار کرنیکی ہمت نہ کی! اور لکشمی بائی نے ایک حقارت آمیز اور تمسخرانہ لہجہ مین کہا کہ "مہاراج! جب مین آپ تابع نہین ہو سکتی ہون تو پھر مجھے کون تابع کر سکتا ہے! امین آپکو اپنا لباس نذر کرنے آئی ہون جو آپ ایسے اور اندوری امیر پہنا کرتے ہین لہذا آپ اپنا لباس مجھے عنایت کیجیے اور میرا لباس اور زیور آپ پہن لین!!!"

یہ سن کر سندھیہ از حد شرمندہ ہوا اور رانی لکشمی بائی کے سامنے ایک منٹ بھی نہ ٹھہر سکا بلکہ چپکے سے اپنے پلے تخت کو چلا گیا اور پھر وہان سے خدا جانے کیون آگرہ کو بھاگ گیا۔

مہاراجہ سندھیہ کے نکل جاتے ہی رانی لکشمی بائی داخل گوالیار ہوئی اور پھول باغ محل مین رہنے لگی۔ نانا صاحب پیشوا بنایا گیا اور راؤ اس کا حاکم گوالیار۔ سندھیہ کے خزانہ مین جو کچھ روپیہ ملا اُسے رانی لکشمی بائی

نے اپنے سپاہیوں میں تقسیم کروا دیا اور رام راؤ گوونڈ کو وزیر اعظم مقرر کیا
چار مرہٹہ سردار جن کو سندھیہ نے بغاوت کے جرم پر مقید کر رکھا تھا
رہا کیے گئے اور انھیں خلعت وغیرہ دیکر نئے سپاہی بھرتی کرنے کے لیے
روانہ کر دیا گیا کیونکہ یقین تھا کہ انگریز بہت جلد چنبل کے پار آ جائیں گے
شہر کے باہر کی فوج کی کمانڈ رانی لکشمی بائی کو دی گئی۔ شہر کے اندر
کی فوج کی سرداری تانتیا ٹوپی کو مرحمت ہوئی اور کل باغی راجاؤں کو خصوصاً
راجہ بانپور اور شاہ گڑھ کو خطوط روانہ کر دیے گئے کہ گوالیار کی نئی
حکومت میں آکر شامل ہو جائیں۔

مگر جب گورنر جنرل کو یہ خبر ملی کہ رانی لکشمی بائی نے گوالیار میں
نئی حکومت قائم کی ہے تو فوراً جنرل سر ہیو روز کو حکم دیا کہ جہاں تک
جلد ممکن ہو اپنے سپاہیوں کے ساتھ جاؤ اور رانی کا مقابلہ کرو۔ چنانچہ
۱۰؍جون کو جنرل موصوف ایک لشکر جرار کے ساتھ گوالیار پہنچے اور
جاتے ہی ایک زبردست حملہ کر دیا جس سے باغیوں کے پاؤں اکھڑ گئے
مرار میں بھی جنگ ہوئی مگر جنرل ہی فتحمند رہا۔ بھاگتے ہوئے باغیوں
کا پیچھا ذرا سختی سے کیا گیا جس سے باغیوں کا از حد نقصان ہوا۔

سر ہیو روز کے حکم سے برگیڈیر اسمتھ ۱۱؍جون کو انتری سے کوچ
کر کے ۱۷؍جون کو کوٹہ کی سرائے میں پہنچا جو گوالیار سے کوئی پانچ
کوس پر واقع ہے۔ یہاں پر جنگ ہوئی اور اسمتھ نے اپنے رسالہ کو
باغیوں پر حملہ کرنے کا حکم دیا جس میں رانی بھی پھنس گئی اور گھوڑے
کو ایسی ٹھوکر لگی کہ آپ بھی زمین پر آ رہی۔ اتنے میں ایک انگریز سوار نے
رانی پر حملہ کر کے اُسے مار ڈالا۔

رانی کے مارے جانے کی ایک اور بھی روایت بیان کی جاتی ہے
کہ ۱۸؍جون ۱۸۵۸ء کو رانی دوپہر کے وقت گنگا بائی کے ہمراہ پھول باغ
سے باہر آ رہی تھی کہ انگریز رسالہ کی ایک جماعت جھاڑیوں میں چھپی بیٹھی
تھی اُن کو آتے دیکھ کر بندوقوں کی بوچھاڑ برسانی شروع کی جس سے
رانی لکشمی بائی اور گنگا بائی کے سینے چھلنی ہو گئے۔

رانی کے محافظین نے اِس خیال سے کہ شاید کہیں رانی کی لاش
انگریزوں کے ہاتھ نہ آ جائے اِس لیے نارائن تربک شاستری کے دیرہ
پھول باغ ہی میں جلا دی۔

رانی کے یہ حالات بتلا رہے ہیں کہ رانی کا کوئی بُرا ارادہ نہ تھا اور
نہ اُس کی خواہش تھی کہ انگریزوں کے خلاف کوئی بغاوت کرے۔ اس میں
کوئی شک نہیں کہ اُسے انگریزوں سے اور خصوصاً گورنر جنرل سے ایک قسم
کا غصہ تھا جو کہ فطرتاً ہونا چاہیے تھا کیونکہ بیٹھے بٹھائے اُس کا راج لے لیا
گیا تھا۔ جس وقت جھانسی میں باغیوں نے اِسے آکر اپنا سردار بننے کے لیے
کہا ہے تو اس کا ارادہ صاف انکار کر دینے کا تھا مگر وہ مصلحت نہ تھی کیونکہ
اگر رانی ایسا کرتی تو سداشیو راؤ جھانسی کا مالک بننے ہی پر تھا جسکو یہ
پسند نہ کرتی تھی۔ اگر رانی باغی بھی ہوئی ہے تو صرف مجبوراً اگر ایسے وقت
باغیوں کا ساتھ نہ دیتی تو یہ اتنے روز جینے بھی نہ پاتی۔

بارہا رانی کا ارادہ ہوا کہ انگریزوں سے صلح کر لے مگر اپنے جاہل
ساتھیوں کی وجہ سے بیچاری ایسا نہ کر سکی اور خواہ مخواہ جنگ و جدل
کرنا ہی پڑا۔ رانی یہ جانتی تھی کہ ایک نہ ایک روز ناکامی اور شکست کا منحوس
منہ دیکھنا پڑے گا مگر افسوس ہے کہ وہ بالکل مجبور تھی۔

یہ حالات صرف رانی کے ذاتی اوصاف بتلانے کے لیے لکھے گئے
ہیں کہ ایک عورت نے کس خوبی اور جوانمردی سے مشہور تجربہ کار جنرل کا
مقابلہ کیا اور کس خوبی سے اپنی سپاہ کو لڑایا۔ مبارک ہے وہ زمین جس میں
ایسی عورتیں پیدا ہوں اور خوش قسمت ہیں وہ والدین جو ایسے باہمت
اور بہادر بچے پیدا کریں۔ جب تک ہندوستان کی تواریخ کے صفحے دنیا میں ناموافق
ہوا کے تھپیڑوں سے محفوظ ہیں اُس وقت تک رانی درگاوتی، ملکہ رضیہ بیگم اور
چاند سلطانہ کے ناموں کی طرح رانی لکشمی بائی کا نام بھی صفحہ دنیا پر ایک قابل قدر
یادگار رہیگا۔

قطب الدین خان راقم

نیک ارادہ

نیک ارادہ صرف اس وجہ سے اچھا نہین کہ اُسکے ذریعہ سے کوئی اچھا اور مفید کام ہوتا یا ہونے کی اُمید کی جاسکتی ہے۔ یا وہ کوئی اچھا اثر ڈالتا ہو یا کسی اہم مدعا کے لیے کوئی مناسبت اور موزونیت رکھتا ہو بلکہ اُسے صرف اس وجہ سے اچھا کہا جاتا ہو کہ وہ فی نفسہ اچھا ہے اور اُسکے ذاتی تذکرہ او موازنہ سے اُس کی قدر و منزلت اور اہمیت و قیمت اور بھی اعلیٰ اور بالاتر معلوم ہوتی ہے اور وہ اپنی ذاتی خوبی اور عمدگی کی وجہ سے اُن تمام میلانات رجحانات اور جذبات پر غالب آتا ہے جو انسان کے دل و دماغ مین مختلف محرکات کی وجہ سے وقتاً فوقتاً تموج ہوتے رہتے ہین۔

اگر کبھی ایسا اتفاق ہوجائے کہ بدبختی وقت یا کسی ممسکانہ تحریک کی وجہ سے ارادہ نیک اپنی جبلی خوبی اور اصلی طاقت کھو بیٹھے اور باوجود لگاتار کوششون اور جد و جہد کے اُس سے کچھ بن نہ سکے اور صرف ایک نیک ارادہ ہی رہ جائے تو بھی وہ اُس موتی کی طرح جو کبھی قدردان کے ہاتھون مین جانے کا موقع حاصل نہین کرسکتا اپنی جبلی ضیا کی وجہ سے ہمیشہ تابان اور درخشان رہے گا۔ اور اُسکی ذاتی قیمت باوجود اسکے کہ وہ کسی اچھے صرف مین نہین لایا گیا وہی رہیگی۔

ہر شے کی تین طرح سے قیمت پڑتی ہے۔

(۱) باعتبار جبلی یا ذاتی امتیازات اور خوبیون کے۔

(۲) باعتبار ذاتی اور اضافی خوبیون کے۔

(۳) باعتبار محض اضافی یا نمائشی خوبیون کے۔

دنیا مین بہت سی ایسی اشیا بھی ہین جنکی قدر و قیمت محض اُنکی ذاتی خوبی اور ذاتی وجاہت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یعنی خود ان کی ذات ہی اُن کی قیمت کا فیصلہ کرتی ہے۔ ایسی اشیا کا مفید اور بارثمر ہونا نہ اُن کی قیمت بڑھا سکتا ہے اور نہ گھٹا سکتا ہے۔ ایسی اشیا خود اپنی ذات مین ہی ایک ایسا جوہر فرد رکھتی ہین جو بغیر توسل عرضیات کے اُن کی قیمت کا فیصلہ کرسکتا ہے۔ ایسی اشیا یا ایسے عنصر اور ایسی طاقت کی قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے ہمین نہ کسی صراف کی ضرورت ہے اور نہ کسی نقاد اور محک کی۔ وہ اپنے مُنھ سے ہی اپنی قیمت بتاتی اور اپنا فیصلہ کرتی ہے۔ دوسرے الفاظ مین یہ کہ وہ خود ایک قیمت بلکہ ایک فیصلہ شدہ قیمت ہی ہوتی ہے۔ قیمت کی قیمت ڈالنا صحیح نہین۔ وہی شے نقاد اور صراف کی محتاج رہتی ہے جو مشکوک ہو یا اُسے کوئی مشکوک ظاہر کرے جو چیز اپنے اندر کھوٹ نہین رکھتی وہ اپنی آپ نقاد ہے۔ دوسرے نقاد خود اُسکی نقد قیمت اور نقد خوبی کا احساس کرکے یہ فیصلہ کرسکتے ہین کہ اُسکی قیمت کا نرخ کہاں تک پہنچ سکتا ہے ع نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز۔

ارادہ کی قیمت مطلق

محض ارادہ کی قیمتِ مطلق کی بحث مین جبکہ کسی قسم کے فائدہ کو بھی مدِنظر نہین رکھا جاتا بعض وقت یہ گمان پیدا ہوتا ہے کہ شاید یہ بلند پروازیِ تخیل کا نتیجہ ہو یا یہ کہ ہمین ارادہ پر عقل کو حاکم بنانے مین منشاے قدرت اور محرکات کے سمجھنے مین کوئی غلطی ہوئی ہو یا خود عقل کے فیصلہ مین ہی کوئی کمی اور کوئی لغزش ہو۔

اِس قسم کے شبہات اور شکوک پیدا ہونے کے وقت ہم عقل انسانی فراہم ہوتی ہے۔ لیکن ہم اکثر ایسی بحثون مین پڑکر اِس نقطۂ نگاہ سے ارادہ کی قیمت لگانے یا معلوم کرنے کے عادی ہین یہ ایک غلطی اور پست خیالی ہے کہ ہم اکثر ارادہ کی قیمت اُس صورت مین اعلیٰ قرار دینے کی کوشش کرتے ہین جب کہ اُس کا نتیجہ ہمیشہ مفاد ہی ہو۔ اس صورت مین ہم ارادہ کی ذاتی خوبی اور جبلی قیمت کم کرتے ہین۔

ارادہ ہمیں دوسری قوتوں کے ساتھ بطور ایک اہم قوت کے دیا گیا ہی اس کی ضرورت دوسری قوتوں کے مقابلہ میں کم نہیں ہی عقل و فراست کے مقابلہ میں ارادہ کی ضرورت زیادہ پڑتی ہی۔ کچھ شک نہیں کہ بعض دفعہ عقل و فراست کے آگے ہی ارادہ کو چلنا پڑتا ہی، یا ارادہ عقل ہی سے بعض دفعہ مشورت لیتا ہی اور یہ ضروری بھی ہی کیونکہ یہ دونوں ایک ہی عنصر کے کنبے یا ایک ہی قوائی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے کاموں اور تصرفات میں ایک بڑی حد تک وابستگی اور نسبت بھی ہی لیکن پھر بھی ارادہ کی عظمت و جبروت سے انکار نہیں کیا جا سکتا بے شک بعض دفعہ ارادہ کا طریق عمل جابرانہ اور قادرانہ بھی ہوتا ہی اور عقل کے مقابلہ میں اسکے عمل میں ایک قسم کا تحکم بھی پایا جاتا ہی مگر پھر بھی ان دونوں میں ایک نسبت اور وابستگی ہی تم دیکھ سکتے ہو کہ جب کبھی ہم کوئی ارادہ کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں ہی سے ایک شے یا ایک طاقت کبھی اس کی مزاحم ہوتی ہی اور کبھی اُس کی تائید میں ہو کر اُسکا پہلو لیتی ہی۔ ایسی مزاحمت کے وقت ارادہ کبھی قابو میں آ جاتا ہی اور کبھی قابو سے نکل جاتا ہی کبھی اسکی تائید سے اپنے جنون میں لگا رہتا ہی اور کبھی تائید کی کچھ پروا نہیں کرتا اپنی ہی دُھن مقدم رکھتا ہی۔ اگرچہ عقل و فراست باعتبار اپنے اجتہادات اور دلائل کے ایک بڑی مؤثر اور زبردست قوت ہی لیکن ارادہ کی قوت اور جبروت سے اسکی قوت اور اسکی جبروت نہیں مل سکتی۔ ارادہ بادیہ ہی اور عقل ساکن۔ عقل بتدریج اور بے تامل چلتی ہی اور ارادہ کی رفتار برسلا و تنات اپنے اندر ایک خاص قسم کی تیزی رکھتی ہی۔ عقل کبھی بھی فہم اور شعور سے باہر قدم نہیں رکھتی یا نہیں رکھنا چاہتی لیکن ارادہ بہت دفعہ حد فہم اور شعور سے باہر ہو جاتا ہی۔ ارادہ اپنے زور سے آگے بڑھتا اور ایک دُھن میں ایک عمل پورا کرنا چاہتا ہی بخلاف اسکے عقل و فراست حکمت اور تامل سے کام لیتی ہی عقل و فراست کبھی اندھی اور خود رو نہیں ہوتی بلکہ واقعات متصلہ اسباب حاصلہ کیفیات موارده اور نتائج متیقنہ کے تہیہ اور ترتیب کے مطابق چلتی ہی مگر ارادہ جوش میں اندھا بھی ہو جاتا ہی۔ ارادہ کی دو آنکھیں ہیں۔ کبھی کبھی دونوں آنکھیں جب کھلی ہوتی ہیں تو وہ مزید غور سے کام لیتا ہی لیکن جب کبھی ایک آنکھ بند ہو جاتی ہی تو وہ ایک طرف کے واقعات چھوڑ کر اور ان کی کچھ پروا نہ کر کے معطل و بیکار ہو جاتا ہی۔

ارادہ اور وقوف

ارادہ بھی ایک وقوف رکھتا ہی اور اُسے بھی ایک شعور حاصل ہی یہ کہنا کہ ارادہ کوئی وقوف یا کوئی شعور نہیں رکھتا غلطی ہو وہ ایک قوت ہی اور ہر قوت امتیازی پہلو سے ایک وقوف یا ایک حس فی ذاتہ رکھتی ہی۔ گو ہم اُسے وقوف اور شعور کے نام سے موسوم نہ کریں مگر وہ ایک وقوف ہی ہوتا ہی۔ ہر قوت میں ایک احساس ہوتا ہی اور ہر قوت ایک احساس رکھتی ہی ورنہ کیونکر کہا جا سکتا ہی کہ ہم ایک ارادہ کرتے یا کر سکتے ہیں۔ ارادہ کرنے میں ایک شے خود ارادہ میں ایسی بھی ہونی چاہیئے یا ہوتی ہی جو ہمیں دوسری طرف یا اپنی طرف توجہ دلاتی ہی۔ وہ کیا شے اور کون سی طاقت ہی جو ہمیں اس طرف کشاں کشاں لیے جاتی ہی۔ وہ صرف کوئی اور محرک نہیں ہوتا بلکہ اسکے ساتھ خود ارادہ یا اس کا احساس یا قوت احساس ہی جو اُسے اُس طرف توجہ دلاتی اور تحریک کرتی ہی۔ عقل و فراست کی ہدایات اور رشد سے جب ارادہ نکل کر اپنی دُھن میں لگ جاتا ہی تو وہ کسی ایسے محرک کے قابو میں ہو کر جاتا ہی جو خود اس پر بھی غالب ہی۔ وہی شے ارادہ کا احساس یا قوت احساس اور وقوف ہی یا یوں کہیئے کہ ارادہ بجائے خود ایک پُر زور احساس اور وقوف کا نام ہی۔

ہر ذی اعضا کی ہستی کی بناوٹ میں یعنی ایک ایسی ہستی میں

جو اغراض زندگی اور مقاصد حیات کی خاطر متناسب اور موزون بنائی گئی ہے ہم ہمیشہ بطور ایک بنیادی اصول کے فرض کر لیتے ہین کہ اس مین کوئی ایسا عضو اور ایسی قوت یا ایسا جذبہ نہین ملے گا جو اُس غرض اور اُس مطلب کے واسطے موزون اور مناسب نہو جو اُس خلقت سے مقصود اور مزعوم تھا اگرچہ ہم ایسا فرض کرنے مین کسی مہلک اور غیر متوقع غلطی کے مرتکب نہین ہوتے لیکن جب ہم عملی دنیا مین مشاہدہ کرتے ہین تو ہم پر اپنی غلطی اور اپنا سقم کھل جاتا ہے کیونکہ ہم یہ دیکھتے ہین کہ ہمارے اعضا اور قویٰ مین بعض عضو اور بعض قوتین اور بعض جذبات ایسے کامون کے واسطے ہی خاص کر دیے جاتے ہین جو قدرتی اغراض اور قدرت خشا کے ایک بڑی حد تک منافی ہوتے ہین۔ یہ صورت یا تو دنیع صورت پذیر ہوتی ہے کہ ہم اکثر اوقات فطری مقاصد کے اندازہ سے گر جاتے ہین یا اس لیے کہ ہم اُن امور اور اُن مصالح سے دور جا پڑتے ہین جو اس شعبہ مین لازمی ہین۔

ہم جو اکثر قوتون اور جذبات سے بجاے فوائد کے نقصان اُٹھاتے ہین اُس کی وجہ یہی ہوا کرتی ہے کہ ہم قوتون اور جذبات کے نازک خواص اور افعال سے بے خبر رہتے ہین ہمین قدرت نے بالمقابل دو قوتین عقل اور ارادہ ودیعت کر رکھی ہین اور ان دونون سے کوئی فرد بشر بھی حد امکان تک معرا اور خالی نہین یہ جدا بات ہے کہ پیمانہ اور مقدار مین کچھ فرق ہو۔

ہم یہ بات بآسانی سمجھ سکتے ہین کہ قدرت کی جانب سے بغیر کسی معقول معاوضہ کے ان دونون قوتون کا ہمین ودیعت کیا جانا فضول نہین ہے ارادہ بجاے خود کار آمد اور ضروری ہے اور عقل بجاے خود۔ اگرچہ ان دونون کے مقتضیات اور ان کے اغراض اور افعال مین بہت کچھ فرق ہے لیکن ان کی ودیعت ضرورت اور اس لحاظ سے انکار بھی نہین کیا جا سکتا۔ جو ہماری زندگی کے بڑے بڑے اور اہم واقعات مین ظاہر ہوتا ہو۔

ہست کا صحیح مُدعا ان قوتون کے عطا کرنے سے ہماری حفاظت بہبود مسرت اور کامیابی کا تھا۔ اس مدعا کو پورا کرنے کے واسطے اُن دونون قوتون کے ودیعت اور انتخاب سے ہماری انسانی نگاہون مین قدرت نے ایک بڑا مسلک اور قریب وہ تجویز اختیار کی ہے۔ وہ تمام کام جو مخلوق انسانی اور حیوانی اس مدعا کے پورا کرنے کے لیے کرتی ہے اور جس کے طرز عمل کا تمام قاعدہ یقینی طور پر فطری تمیز کا تجویز کردہ ہوتا ہے عقل و فراست اور ارادہ کے مقابلہ مین بعض دفعہ ہمین ایک پیچیدگی مین ڈالنے والے تغیر مین مبتلا دوسری تمیز اگر اکثر دفعہ ہمین صحیح مسلک کا نشان دیتی ہے تو بعض دفعہ بیرونی اغلاط کی وجہ سے غلط نشان بھی دے جاتی ہے ہم یہان بغیر کسی بحث کے یا اس استدلال کے مجاز ہین کہ فطری تمیز عقل اور ارادہ سے بھی ایک جداگانہ شے یا جداگانہ طاقت ہے۔ اگرچہ عقل و فراست اور فطری تمیز مین تمیز کرنا ایک پیچیدہ اور مشکل کام ہے مگر ہمین اپنے افعال اور اپنے خیالات کی تنقید سے کسی حد تک یہ معلوم کرنے کا موقع مل سکتا ہے کہ ہمین ایک فطری تمیز بھی حاصل ہے چاہے اُسے ایک مستقل قدرت کہو چاہے عقل و فراست کا ایک دوسرا پہلو۔

فطری تمیز اور عقلی فراست مین کسی حد تک چونکہ امتیاز ایک مشکل امر ہے اس واسطے با الفاظ دیگر ہمین یہ کہنا چاہیے کہ اکثر حالات ہمارے واسطے صرف ایک عقل ہی رہبر ہوتی ہے اور ہم عموماً اسی پر بہت کچھ مدار رکھتے ہین اور اسکے ذریعہ سے ہم اُس مدعا اور اس بات کی تلاش مین سرگردان رہتے ہین جو ہماری زندگی کا اعلیٰ مقصد شمار ہوتی ہے۔ چونکہ عقل و فراست اور فطری تمیز کی حقیقت نیک واقعہ ہوتی ہے اس واسطے جب ہم کوئی نیک ارادہ کرتے ہین تو عقل و فراست اور فطری تمیز بھی خوشی سے اس پر صاد کرتی ہے۔ ارادہ کی صحت اور غلطی کی نقاد عقل و فراست ہی ہے۔ اور عقل و فراست مین ایسی تنقید کا مادہ اُس صورت مین پیدا ہو سکتا ہے جب وہ بعض خارجی عوارض اور بعض فریب دہ اسباب سے پاک صاف ہو۔

ایسا تزکیہ سوائے اسکے نہیں ہو سکتا کہ انسان مشاہداتی اور تجربی رنگ مین علمی اور عملی پہلو سے اُن کا عابر اور مشاہد ہو۔

یہ تمام باتین اُس وقت حاصل ہوتی ہین جب تربیت اور تربیت کا اسکول اچھا ہو اور سیرت و کریکٹر کی تربیت مقدم رکھی گئی ہو۔

حضرت سلیمان فرماتے ہین:۔

خداوند کا خوف دانش کی ابتدا ہے لیکن احمق دانائی اور تربیت کو حقیر جانتے ہین۔

اے میرے بیٹے اپنے باپ کی تربیت کا شنوا ہو۔ اور اپنی مان کی تاکید کو مت ترک کر۔

تربیت گھر ہی کی چار دیواریون سے شروع ہوتی ہے اور گھر ہی تربیت کا ایک ابتدائی اسکول ہے۔

انسان کی ساری مہمات کا مدار ارادہ پر ہے اور ارادہ وہی اچھا ہے جو صحیح اور نیک ہو۔ ارادہ کی صحت اور سعادت تربیت پر موقوف ہے۔ تربیت صحیح مشاہدہ اور کامل تجربہ کی محتاج ہے۔ یہ دونوں اُسوقت حاصل ہو سکتی ہین جب سلسلۂ تعلیم صحیح اصول پر مبنی ہو۔ کوئی قوم اُسوقت تک ترقی نہین کر سکتی جبتک اُسمین قلبی عصبیت پائی جائے اور اسکا انحصار صحیح تربیت پر ہے۔

صحیح تربیت قوتون اور جذبات کی تزکی ہے۔

تزکیۂ قویٰ اور تزکیۂ جذبات موجب ہے صحیح اور نیک ارادہ کا۔

نیک ارادہ شروع ہے تمام کامیابیون اور تمام سعادتون کا۔

سلطان احمد

دوست

اہا! اس چار حرفی لفظ مین کیسے کیسے راز مخفی ہین جس کے اثرات مقناطیسی کشش سے دلون کو اپنی طرف کھینچتے ہین۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ہر حرف مین جدا جدا شان اور خوبیان معلوم ہونگی۔ لفظ "دوست" کا "د" وو دلون کے ایک ہو جانے کی دلیل کرتا ہے اور "و" وفاداری کی تصدیق کرتا ہے اور "س" سازگاری کا دندان شکنی سے ثبوت دیتی ہے "ت" ترقی کی تائید و ترغیب لاتی ہے۔ اگر ہر دوست اس چار حرفی لفظ کو بخوبی سمجھے اور اسی کو اصول دوستی مان لے تو زندگی بھر ایک دوسرے مین نفاق نہ پیدا ہو۔

یہ لفظ کس قدر پیارا اور شیرین ہے! اگر یہ پیارا اور شیرین لفظ کس کو زیبا اور کس کو شایان ہے اور اس بے بہا اسم کا کون مستحق اور کون غیر مستحق ہے۔ اس کے دریافت کرنے اور اس سے پورے طور سے آگاہی حاصل کرنے کی ہر فرد بشر کے لیے ضرورت ہے کیونکہ جس طرح ہر شاہ کو ایک زکی و ذہین وزیر کی سخت ضرورت رہتی ہے اسی طرح ہر شخص کو امیر ہو یا غریب ایک وفادار اور غمخوار دوست کی ضرورت ہے دنیا مین یہی سب سے بڑا اور بھاری رشتہ ہے۔ ہماری اچھی اور بری زندگی کا تمام دار و مدار اور ہماری آئندہ ترقی و تنزلی اسی پر منحصر ہے۔ برے وقت مین اسی سے امداد طلب کر سکتے ہین اور اسی سے رنج و راحت نصیب ہوتی ہے آفت اور مصیبت مین اسی سے غمخواری کی امید کر سکتے ہین اور اسی سے ہماری امید و حسرت نفع و قطع ہوتی ہین اور یہی ہمارے رنج و غم مین حصہ لیتے ہین انھین کے آگے ہم اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑتے ہین اور یہی ہمارے سوز و گداز اور راز و نیاز سے آگاہ ہوتے ہین انھین سے ہمارے ارادے اور حوصلے پست اور استوار ہوتے ہین۔ ہماری دلی تمنائین انھین سے وابستہ اور منقطع ہوتی ہین ہمارے دلی جذبات کا پورا ہونا نہ ہونا انھین پر موقوف۔ بلندی و پستی انھین کے

ذریعہ سے یہی رہبر، یہی رہزن یہی خیرخواہ یہی بدظن۔ غرضیکہ ہماری بھلی اور بُری زندگی کا تمام دار و مدار دوست ہی پر منحصر ہے۔ اگر دوست وفادار اور صادق ملا تو ہمارا رشتۂ الفت تاعمر پختہ اور مضبوط رہے گا اور ہم بہ راحت اپنی زندگی بسر کریں گے برخلاف اس کے اگر دوست خودغرض اور بے وفا ملا تو ہماری زندگی بالکل بے لطف اور برباد ہو جائے گی۔

یوں تو دنیا میں ہر شخص کے ہزاروں شناسا اور جان پہچان والے ہوتے ہیں اور لاکھوں سے واقفیت اور باہمی تعلقات ہوتے ہیں، تو کیا یہ تمام دوست ہی کہے جائیں گے۔ ہرگز نہیں۔ ہاں اسمیں شک نہیں کہ کل مومن اخوان مگر یہ تمام اُن میں سے نہیں جنھیں ہم دوست کے پیارے نام سے یاد کرتے ہیں اور جو آپس میں سنہری تار سے ایک دوسرے کے دلوں کو پیوست کرتے ہیں، باہم مصیبت میں ایک دوسرے کی امداد کرتے ہیں، اور جو ہمخیال اور یکدل ہو جاتے ہیں۔

دنیا کے تمام باہمی تعلقات اور رشتوں پر رشتۂ دوستی قابل ترجیح اور فوقیت دینے کے لائق ہے بادی النظر میں تو یہ بات کسی قدر ناموزوں اور نازیبا معلوم ہوتی ہے مگر بنظر تعمق دیکھا جائے تو بہت زیبا بہت راست اور بہت مناسب معلوم ہوگی اور وہ لوگ جن کو اس کا تجربہ پورے طور سے حاصل اور اس کی خوبیوں سے کماحقہٗ واقف اور اس کی صفات سے بخوبی آگاہ اور اُس کے فوائد سے اچھی طرح بہرہ ور ہیں یہی کہیں گے کہ اُس کی عظمت و عزت اور سود و زیاں جانتے ہیں اور انھیں کے دلوں میں اسکی حرمت و سطوت موجود ہے۔ کیونکہ یہ لوگ اچھی طرح جان گئے ہیں کہ خود ہماری ذاتی ترقی و تنزلی اسی پر منحصر ہے۔"

دوستی کیا ہے؟ دو شخصوں کا آپس میں ہمخیال ہونا اور ایک دوسرے کی صحبت کا اثر حاصل کرنا۔ دوستی ہی کیا بلکہ زندگی میں یہی سب سے بڑی اور گراں مایہ چیز ہے۔ ہماری اصلاح اور درستی اسی سے ہے اور جہالت و بربادی بھی اسی سے ہے۔ ہم اسی کے ذریعے اپنی بُری زندگی کو بھلی اور بھلی کو بُری بنا سکتے ہیں۔ ہم اسی کے ذریعے اعلیٰ ہو کر اسفل اور اسفل ہو کر اعلیٰ اور عالم ہو کر جاہل اور جاہل ہو کر عالم غنی ہو کر مفلس اور مفلس ہو کر غنی بن سکتے ہیں۔ کیونکہ صحبت کا اثر دل پر بہت جلد پڑتا ہے۔ لہذا چاہیے کہ جس کی صحبت میں زندگی بسر کرنی ہے اُسکے طبائع و خصائل سے پورے طور سے آگاہ ہو جائیں اور اُس کے حرکات و سکنات کی نہایت غور و فکر اور پوری طاقت متخیلہ سے جانچ کریں کہ آیا اُس کی صحبت سودمند ثابت ہوگی یا مضر۔

کسی شخص سے دوستی کرنے میں عجلت سے کام نہ لینا چاہیے کیونکہ بے سوچے سمجھے کی دوستی کا انجام بہت بُرا ہوتا ہے جس پر بعد میں پشیمانی حاصل ہوتی ہے جس طرح دوستی کرنے میں عجلت نہ کرنی چاہیے اُسی طرح دشمنی کرنے میں بھی جلدی نہ کرنی چاہیے۔ تم نے اس کو اپنا وفادار دوست جان کر جتنے دلی راز تھے اُس پر افشا کر دیے مگر اب کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے راز کو اپنے سینہ میں مقفل اور مخفی رکھے گا اور اُس کی کنجی اپنی زبان کے حوالے نہ کرے گا۔ غیر ممکن ہے۔ لہذا ہمیں جس سے دوستی کرنی منظور ہو تو پہلے نہایت ہی اطمینان سے اسکو محبت کی کسوٹی پر جانچ اور پرکھ لینا چاہیے کیونکہ دوستی کے بعد دوستی کا جاتا رہنا نہایت ہی خوفناک اور پُرخطر ہے۔

دوستی کا نباہنا بھی ایک مشکل کام ہے۔ کیونکہ کبھی کبھی کوئی ایسی بات ہو ہی جاتی ہے جس سے دلشکنی ہو جاتی ہے۔ دلشکنی کا پہلا زینہ مذاق ہے جب آپس میں گہری دوستی ہو جاتی ہے تو باہم یکدیگر مذاق کا بھی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے باوجودیکہ ایک دوسرے کو کامل یقین اور پورا بھروسہ ہوتا ہے کہ وہ میری ایسی باتوں سے برہم نہ ہوگا لیکن مذاق چیز ہی ایسی ہے کہ کبھی نہ کبھی ایک دوسرے کو بُرا معلوم ہو ہی جاتا ہے میرے نزدیک تو یہی بہتر ہے کہ رسم مذاق دوستوں سے اور صرف دوستوں ہی پر منحصر نہیں بلکہ کسی سے بھی نہ جاری رکھی جائے کیونکہ بعض اوقات مذاق بجائے شغل دلبستگی کے نفاق

پیدا کر دینے والا ہوتا ہے جس سے آپس میں پھوٹ پڑ جاتی ہے اور جانی دوست جانی دشمن بن جاتے ہیں کبھی کبھی یا اتفاقاً دھوکے سے ہم سے ایسی غلطی بھی سرزد ہو جاتی ہے جو خلاف اصولِ دوستی ہوتی ہے اور جس میں ہمارے دوست کی دلشکنی ہوتی ہے ایسے وقت میں جبکہ وہ ہماری خطا سے برانگیختہ ہو گیا ہو فوراً عفو خطا کا خواستگار ہو کر اُس کے دل کی کدورت کو دور کر دینا چاہیے ہم اپنے ایسے ناکردہ فعل سے پشیمان اور نادم تو ہوتے ہیں کہ اچھا نہ کیا مگر ہمیں اُس سے معافی طلب کرنے میں ندامت اور پشیمانی مانع ہوتی ہے جب واقعہ کو دو چار روز کا عرصہ گذر جاتا ہے تو پھر وہ اس زعم میں رہتا ہے کہ ابھی وہ اپنے ناروا حرکت کی معافی طلب کرنے آئے گا اور ہمیں یہ کہ ابھی وہ مجھ سے بات کرنے آئے گا اور میری اس خطا کی معافی بخشے گا مگر نہ یہ ہوتا ہے نہ وہ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک تو اپنا بنا بنایا وفادار دوست ہاتھ سے نکل جاتا ہے اور دشمنوں کی تعداد میں ایک اور بڑھتا ہے اور دوسرے جگ ہنسائی ہوتی ہے۔ لہذا ایسے نازک وقت میں ایک دوسرے کو ندامت سے خموش ہو کر نہ بیٹھ رہنا چاہیے بلکہ بغیر کسی کو اطلاع کیے اس بات کا آپس میں معافی کے ذریعہ سے بہت جلد فیصلہ کر لینا چاہیے کیونکہ جوں جوں وقت گذرتا جاتا ہے رشتۂ الفت میں رخنہ پڑتا جاتا ہے اور جب رشتۂ الفت ٹوٹ گیا تو وہ کسی طرح سالم نہیں ہو سکتا۔

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ ہمیں کن کن لوگوں کو اپنی دوستی کے لیے انتخاب کرنا چاہیے اور دوستی کو نباہنے کے لیے کن ذرائع کو کام میں لانا چاہیے۔

۱۔ دوستی اُس شخص سے کرنی چاہیے جو بغیر کسی غرض و مطلب کے خلوص دل سے ملتا ہو اور جس کا ظاہر و باطن پاک و صاف و یکساں ہو اور بجز دوست کو فائدہ پہنچانے اور نقصان سے بچانے کے کوئی غرض نہ رکھتا ہو۔ لارڈ ایورسن کا قول ہے کہ دوستی دو شخصوں کے درمیان ایک دوسرے کو فائدہ پہنچانے اور خوشی بڑھانے کی طرف ایک میلان کا نام ہے۔

۲۔ اُس سے جو ہم سے علم و فضل میں بڑھ کر ہو تاکہ اُس کی صحبت سے ہمارے علم و فضل میں ترقی ہو اور ہم اُس کے اوصاف حمیدہ سے فیضیاب ہوں۔

۳۔ اُس سے جو اپنے دلی خیالات دوست سے پوشیدہ اور دوست کے عیوب دوست سے مخفی نہ رکھتا ہو حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں "میں اُسی کو اپنا دوست صادق سمجھتا ہوں جو میرے عیوب سے مجھے آگاہ و متنبہ کرے"۔

۴۔ اُس سے جو دوست کی خوشی پر اپنی خوشی مقدم رکھتا ہو اور اپنے عہد و پیمان پر ثابت قدم و مستحکم رہتا ہو اور جو ایام مصیبت میں طوطا چشم نہ ہو جائے۔

۵۔ اُس سے جو خوشامد اور چاپلوسی کے پر خطر عیب سے بری اور مستغنی ہو اور جو دوست کا نفع و نقصان اپنا ہی نفع و نقصان سمجھتا ہو۔

۶۔ اُس سے بچنا چاہیے جو دوست نما دشمن ہو یعنی دوستی کے پردے میں دشمنی کا شکار کھیلتا ہو جو بظاہر تو دوستی کا دم بھرتا ہو اور درپردہ مار آستین ہو۔

۷۔ اُس سے بچا کرو جو ہم سے جاہ و ثروت میں بڑھ کر ہو۔ رئیسوں اور امیروں کی دوستی نہایت مخدوش اور خطرناک ہوتی ہے کیونکہ اُن کے نزدیک اپنی برسوں کی وفاداری اور جاں نثاری ایک آن میں نقش برآب ہو جاتی ہے۔ حکیم سولون کا قول ہے کہ شاہ کے مقرب اور دوست کی شطرنج کے مہروں کی سی مثال ہے جس طرح وہ چاہے اُن سے کھیل سکتا ہے کسی اور صاحب کا قول ہے کہ شاہ ایک دریائے بے پایاں کے مصداق ہے جب یہ لہر و موج میں ہوتا ہے تو دامن امید گوہر مقصد سے بھر دیتا ہے اور جب قہر و طغیانی میں ہوتا ہے تو نہایت ہی بے رحمی سے ہر ایک کی مشقت پر پانی پھیر دیتا ہے۔ بالغرض اگر کسی کو اُن سے دوستی ہو بھی تو اس کو نہایت ہی پھونک پھونک کر قدم رکھنا اور بہت ہی سنبھل سنبھل کر چلنا چاہیے، اور اُن کی

رضا پر رضامند اور اُنکی خوشی پر خوشنود رہنا چاہیے کیونکہ یہ لوگ فرائض آشنائی اور حق دوستی سے مطلق بے بہرہ اور بالکل ناآشنا ہوتے ہیں۔ اُن کے دماغوں میں یہی دھن سمائی ہوئی ہوتی ہو کہ ہم اس سے ہر طرح بڑھے چڑھے ہیں۔ انھیں ہماری عزت کرنی چاہیئے جن کے دماغوں میں ایسی بیجا دھن سمائی ہوئی ہو وہ مطلق لائق دوستی اور سزاوار آشنائی نہیں۔

۸۔ نادان کی دوستی سے بچو! کیونکہ یہ کسی مصرف کے نہیں یا اگر اپنی بہتری بھی کریں گے تو مضر ثابت ہوگی۔ کسی نے خوب کہا ہو "نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہو"۔

۹۔ بیکار شخص کی دوستی سے پرہیز کرو۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ اپنا دوست اگر کسی وجہ سے ملازمت سے برطرف یا نقصان کی وجہ سے اپنے پیشے سے بیکار ہوگیا ہو تو تم اُس سے دست بردار ہو جاؤ نہیں بیطر رُوئے سخن ان لوگوں کی طرف ہے جو اکل حلال اور محنت و مشقت کی کمائی سے پرہیز کرتے ہوں۔ اُن کی صحبت کا اثر ہم پر جلد پڑے گا۔ لہٰذا اُن سے پرہیز کرنا چاہیے۔

۱۰۔ مسافر کی دوستی نہ کرو۔ ہاں اُن سے ایسا میل جول پیدا کر لو کہ اگر اتفاقیہ اُس کے شہر میں جانا ہو تو وہ بھی تم سے خوش اسلوبی اور خوش اخلاقی سے پیش آئے مگر اُن سے بالکل ہی گہری دوستی نہ کر لو کہ اُس کے چلے جانے بعد اُس کی مفارقت کا تیر سینے میں کھٹکے

دوستی کے چند احکام

۱۔ دوستی ہم عمر اور ہم مذہب ہی سے بہتر ہو۔

۲۔ دوست صادق کی کبھی آزمائش نہ کرو۔

۳۔ دوستوں سے قرض لو نہ اُنھیں قرض دو۔

۴۔ دوست پر کوئی ایسا کام نہ ڈالو جو اُس کی حیثیت سے باہر ہو۔

۵۔ دوست کی پسند کی کوئی چیز تم خود نہ طلب کرو تاوقتیکہ وہ اپنی مرضی سے نہ دے۔

۶۔ مجمع احباب میں ایک کو دوسرے پر ہرگز ترجیح اور فوقیت نہ دو۔

۷۔ بجز خانہ داری اور رشتہ داری کے کوئی راز دوست سے پوشیدہ نہ رکھو۔

۸۔ اگر کسی آفت میں مبتلا ہو جاؤ تو دوست کی صلاح لو۔

۹۔ دوست اگر اپنی رائے کے خلاف ہو تو بُرا نہ مانو بلکہ آپس میں اُسکا تصفیہ کر لو۔

۱۰۔ اپنے شکوک بہت جلد رفع اور خطا کی بہت جلد معافی چاہو۔

۱۱۔ دوست کی بھلی بُری بات کا بُرا نہ مانو اور نہ اُسے آزردہ ہونے دو۔

۱۲۔ دوست کے کام میں کبھی مخل نہ ہو۔

۱۳۔ اپنے احسان کا کبھی اظہار نہ کرو اور حرف شکایت لب تک نہ آنے دو۔

۱۴۔ غیر مذہب دوست سے کبھی مذہبی بحث نہ کرو۔

۱۵۔ اپنے دوست کی نسبت اگر کوئی ایسی بات سُنائے جس سے نفاق پیدا ہو جانے کا خوف ہو تو اُس کی بات کا بغیر آنکھ سے دیکھے اور کان سے سُنے اعتبار نہ کرو۔

خورشید (نگر دلی)

تعلیم پر چند خیالات

علاوہ اُن تمام فوائد کے جو اس بیسوین صدی مین ہمکو حاصل ہین سب سے افضل و کار آمد حصول تعلیم کی سہولتین ہین۔ ہم ایک ایسے عہد مین زندگی بسر کررہے ہین جسمین کتابین ارزان کتبخانے مُفت ملرہے لاتعداد ہین اور اخبارات دلخوش کن اور مسرت افزا ہین۔ اسمین کوئی شک نہین کہ تعلیم سے انسان کو بہت بڑی مسرت حاصل ہوتی ہے لیکن اکثر لوگ جو اس بات کو غلط تصور کرتے ہین اُن کا یہ خیال لغو اور مہمل ہے ضرور اسمین صداقت ہے کیونکہ تعلیم محض سِکھانے پڑھانے کا نام نہین، جس سے لازمی طور پر انسان گھبرا کر تھک جاتا ہے بلکہ یہ ایک نہایت اشرف اعلیٰ شے ہے جو تزکیۂ نفس و روح کرتی ہے اور بنی نوع انسان کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتی اور فضیلت بخشتی ہے "علم ایک بہت بڑی طاقت ہے" نہ صرف طاقت بلکہ ایک ارفع و اعلیٰ طاقت، لیکن سوال یہ باقی رہجاتا ہے کہ اُس اعلیٰ طاقت تک کسطرح رسائی ہوسکتی ہے؟ اِس کا جواب انگریزی زبان کے ملک الشعرا ٹینی سن اسطرح دیتا ہے "خودی، خود شناسی، اور نفس کُشی، صرف یہ تین چیزین، ہماری زندگی کو اُس اعلیٰ طاقت کیطرف رہنمائی کرتی ہین"

تعلیم سے انسان کے مختلف قویٰ کی نشوونما اور علم الانسان سے واقفیت حاصل کرنا مقصود ہے۔ ہمین اپنی تعلیم کو مکمل کرنے کے لیے اس کو تین عنوانات مین تقسیم کردینا چاہیے:-

(۱) دماغی تعلیم
(۲) اخلاقی تعلیم

(۳) جسمانی تعلیم۔

جبتک ان تینوں پہلوؤں پر پورے طور سے توجہ نہ کی جائے گی اُس وقت تک تعلیم ہنوز اپنی ابتدائی حالت مین ہوگی، اور پھر تعلیم کا جو نصب العین ہے اُس تک پہنچنا بہت دشوار ہوگا۔

(۱)

تعلیم ایک قسم کی دل و دماغ، اور جسم و روح کی تربیت ہے ہمارے دماغوں کی تربیت کے لیے ہمین اشیا کا جیسی کہ وہ ہمارے گرد و پیش نظر آرہی ہین، مطالعہ کرنا چاہیے، اور چاہیے کہ اُس پر سے ہم اپنے زمانہ کی حرکات کا ایک صحیح خاکہ قائم کرین۔ صرف تحصیل علم سے تعلیم مراد نہین، اور نہ اس سے دماغ کو علم سے پُر کر دینا مقصود ہے، کیونکہ "وہ عالم جو علم سے بھرے ہوے دماغ کے ساتھ کچھ غور و فکر، اور درک و فہم نہین رکھتا اُس گدھے کے مانند ہے جس کی پشت پر کتابین لدی ہون" اِس لیے چاہیے کہ ہم غور و فکر کی عادت ڈالین اور ہر بات مین تفکر و تدبر سے کام لین، اور جب یہ عادت ہم مین پیدا ہوگئی تو سمجھ لینا چاہیے کہ ہماری نصف تعلیم مکمل ہوچکی۔

غلطی سے مدارس کے ساتھ ہی تعلیم کا اختتام سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ تعلیم ہماری زندگی کے ساتھ ختم ہونیوالی ہے، کیونکہ زندگی سے مراد ہے بکثرت ایام سے، اور ہر یوم تحصیل علم کا ایک مخزن ہے پس تعلیم کو زندگی بھر جاری رکھنے کے لیے علم کا ایسا شوق پیدا کرنا چاہیے جو کبھی اِس دنیا مین پورا ہی نہو، اور ہمین اُس کی تکمیل پر مطمئن نہ بنائے، تعلیم کو کسی وجہ سے خود غرضانہ عیش و تنعم کا ذریعہ نہ بنانا چاہیے، گو عیش و تنعم قابل رشک چیز ہے، کیونکہ یہ خدائی جلال و عظمت کا ایک زرین سرمدی خزانہ اور شرف بخش حیات ہے۔

تعلیم کا مقصد خشک صوفیوں، اہل فلسفیوں اور طامع و حریص اقتصادیون، کا پیدا کرنا نہین ہے بلکہ ایک ایسے نیک شہریون، کی نسل کا جو خالق و مخلوق کی نسبت اپنے فرائض سے باخبر ہون، جو دنیا مین صداقت و راستی سے چلنا چاہتے ہون اور جو اپنے اوقات کا صحیح استعمال کرتے ہون۔ لیکن مدارس کی تعلیم اِس اعلی مطمح نظر تک پہنچانے مین قاصر رہتی ہے کیونکہ "مدارس اور دار العلوم جیسا کہ لاک کا خیال ہے، ہم کو بہ نسبت دنیوی امورات کا اہل بننے کے یونیورسٹی کا اہل بنا دیتے ہین" ہم صرف یہ چاہتے ہین کہ ہمارے طلباء نقد و بحث کرنا سیکھین اور آزادانہ طور پر اپنے خیالات و آراء کو منتظم کرین لہذا مدارس کو "ٹکسال" نہ بنا دینا چاہیے جہان سے بطور سکہ جات ہزار ہا طلباء بلا طوع و رغبت، اور طبعی ذوق و شوق کے تیار ہو جاتے ہین ہر دار العلوم (اکیڈمی) کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ وہ نفوس کی تربیت کرے اور اُن کو معلومات کے ایک معقول ذخیرہ سے مالا مال کر دے جو ایسی بنا پر مبنی ہون جس پر اُن کی آئندہ زندگی کی عمارت تعمیر کی جا سکے!

زمانۂ قدیم کا ایک فلسفی کہتا ہے: "اُن تمام باتون کے علاوہ جو تو نے حاصل کی ہین درک و فہم حاصل کر" فی الواقع بغیر قوت ادراک اور صحیح عقل و فہم کے تعلیم اِس بکرہ کی طرح ہے جو بغیر زنجیر (سامان آرائش) کے ہو عموماً لوگ عقل و بصیرت کی قدر و قیمت نہین جانتے اُن کا شعار صرف کتابین پڑھ لینا ہے پس وہ محض سطحی اور ناپائدار زمین پر قدم فرسائی کر رہے ہین، وہ اپنی قوت حافظہ کو زور دے کر دماغ کے قوائے لطیفہ کی خرابی اور بربادی کر رہے ہین اور آخرکار بجائے صحیح معنون مین طالب علم ہونے کے صرف پیشہ ور متعلم بن جاتے ہین۔ اُن کے نزدیک صرف اُن چیزون کی تحصیل ضروری ہے جو زندگی مین اُن کے لیے عملی طور پر بکار آمد ہون۔ حالانکہ وہ اُس عظیم الشان ذخیرہ علوم سے کچھ فائدہ نہین اُٹھاتے جس کو انھون نے بغیر اپنی دماغی ضروریات کی مناسبت کے اطلاع بے دردی سے جمع

کرلیا ہو، اور یہی سبب ہو کہ سلسلۂ تعلیم کو مکمل کر چکنے کے بعد حصول علم مین اُن کے لیے کوئی مزید دلچسپی باقی نہین رہتی۔

ہر علم و فن مین سے کچھ نہ کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے اگرچہ کسی علم و فن کی بجائے خود تحصیل نہایت مفید نتائج اپنے اندر رکھتی ہو علیٰ ہذا تعلیم مین پورے طور سے کامیاب ہونے کے لیے ہمین ایک عالم دماغی کی آب و ہوا Intellectual atmosphere مین رہنا چاہیے وہان اُس مسرت و نشاط کا بخوبی لطف اُٹھایا جا سکتا ہو جو تبادلۂ خیالات کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہو جہان پر مغز علمی بحث و مباحث سے ہم مستفیض ہوتے ہین:- وہ بحث و مباحث جو مختلف اقسام علوم کے ماہر اور مدینۃ العلم کے دبستون کے سرگرم اور مستعد رہرو کیا کرتے ہین۔

(۲)

کسی قسم کی تعلیم فی زماننا یا زمانۂ آیندہ مین، بغیر اعلیٰ وصف اخلاق کے ذریعۂ مسرت و کامرانی نہین ہو سکتی۔ ہر مذہب کا ماحصل "اخلاق" کی تعلیم دینا اور صداقت و اُلفت کی دعوت کرنا ہو اور شاید یہ کہنا کہ "انسان بغیر مذہب کے ایک جسم ہو جس مین روح نہ ہو" مبالغہ سے خالی نہ ہوگا، تاہم اس مین صداقت کی ایک جھلک ضرور پائی جاتی ہو کیونکہ انتہائی درجہ پر مذہب کی پیروی انسان کو الوہیت تک پہنچا دیتی ہو، مذہب ہم کو فراخ دلی کے ساتھ صبر و تانی کی تلقین کرتا اور ہمارے خیالات کو وسعت دیتا ہو۔ یہ ہمکو اس دنیا کے علاوہ ایک دوسری دنیا کے لیے فکر کرنا سکھاتا ہو مذہب ہمارے سامنے خدا کا ایک مقدس خیال پیش کرتا ہو جو تمام حکمتون کا سرچشمہ اور تمام علمون کا منبع ہو۔

ایک تعلیم یافتہ آدمی بغیر عمدہ اخلاقی کیرکٹر کے، اپنی خود فروشانہ حرص و طمع مین مبتلا رہتا ہو۔ بس صرف کتابین پڑھ لینے سے لفظ "تعلیم" اپنے صحیح مفہوم مین نہین ادا ہو سکتا، اس لیے کہ اخلاق تعلیم کا جزو اعظم ہو جس کے بغیر وہ ہرگز مکمل نہین کہی جا سکتی ہر شہر و ملک اور ہر عہد کے تمام ادبیات مین "اچھی تربیت" سب آدمیون کے نزدیک، خواہ وہ ادنیٰ ہون یا اعلیٰ قابل تعریف رہی ہو۔ شریفانہ ضبط و تحمل اور خصائل محمودہ ہر سوسائٹی کی مابہ الامتیاز خصوصیتین رہی ہین اور شخصیتون کا بہت بڑا زیور سمجھی گئی ہین، لیکن وہ نسل انسانی کا درخشان ستارہ، باوجود حکمت کے عظیم الشان ذخیرہ اور علم کے زبردست خزانے کے اس موزون اور عمدہ ترین لقب، "Ideally educated man" کا مستحق نہین ہو سکتا محض اس لیے کہ اُس کا اخلاقی پہلو بالکل تاریک اور ناتربیت یافتہ تھا۔ تاریخ کے پارینہ اوراق کو اُلٹتے وقت ہماری نظر بہت سے مشہور فلاسفہ، ادبا، دوربین، مقررین، سیاست دان اور مقننین کی مثالون پر پڑتی ہو جو صرف اپنے دامن اخلاق پر دھبہ ہونے کی وجہ سے صحیح طور تربیت یافتہ لوگون کی صف مین کھڑے ہونے کے مجاز نہین ہین، اگرچہ یہ ان کے لیے ایک بہت بڑی بدقسمتی ہو تاہم احتیاجِ تعلیم صحیح کے اعتبار سے کوئی بیجا اور نامناسب نہین۔

سچ پوچھیے تو تعلیم گھر ہی سے شروع ہوتی ہو، جہان عورت یا بعض دیگر ان، ہی معلمہ ہوتی ہو، پس اگر ہم اپنی تعلیم کو آئیڈیل بنانا چاہتے ہین تو ہم کو علم و ادب کی تمام شاخون مین اپنی سوسائٹی کی "نصف بہتر" کو ضرور تعلیم دینا چاہیے۔

(۳)

ایک حکیمانہ مقولہ ہو:- "وہ لوگ جو جسمانی ورزش کرنے کے لیے وقت نہین پاتے وہ بیمار ہو جانے کا وقت بہت جلد پا لیتے ہین" بمقتضائے فطرت انسانی کوئی شخص بھی بیماری کی تکالیف برداشت کرنا پسند نہ کرے گا۔ لہذا جسمانی تکالیف و آلام سے محفوظ رہنے کے لئے ہم کو اپنے وقت کا ایک خاص حصہ جسمانی ورزش کے لیے وقف

کردینا چاہیے۔

اِس مشہور و معروف ضرب المثل "تندرست جسم مین صحیح دماغ" کا مصداق ہونا اُس وقت ممکن ہو جبکہ ہم راحت و طرب اور مسرت و اطمینان وغیرہ مفرحات قلب و دماغ سے صحیح طور پر حظ اُٹھا سکین، جو ایک بہت بڑے پیمانہ پر تربیت جسمانی کا نتیجہ ہیں یہ ہمارے اعصاب کو تقویت بخشتی اور ہمارے قواء کو مضبوط و مستحکم بناتی ہو لہذا ہم کو کافی ورزش کرنی چاہیے جس سے ہم ہر کام آسانی سے کر سکین یہی ورزش اور کثرت ہمارے تخیلات پر ایک گونہ صحت اثر پیدا کرتی ہو لیکن کس قدر افسوس کی بات ہو کہ مدارس مین طلبا کھیلون کی کچھ قدر نہین کرتے۔

مختصر یہ کہ ہماری تعلیم آزادانہ ہونی چاہیے تعلیم کا آئیڈیل ہماری سوسائٹی مین نیک افراد پیدا کرنا ہونا چاہیے جو خوف خدا بھی رکھین اور بنی نوع انسان کی تعظیم و تکریم کرین علاوہ ازین ہمکو اپنے پہلو مین ایک محبت بھرا ہوا دل رکھنا چاہیے تاکہ ہم تمام نسلِ انسانی کو متفق کرنے اور مدد کرنیکے قابل ہو سکین۔ الغرض تعلیم ایسی ہونی چاہیے جس سے ہمارے ابنائے جنس کے ساتھ اتفاق و یگانگت اور ہمدردی کا احساس ہمارے دلمین جگہ پکڑ لے، اور تمام علوم و فنون اس غرض سے سکھائے جائین کہ ہم مین بڑے بڑے دانشمند عقلا، اور محبان وطن پیدا ہون جو نسل انسانی کی فلاح و بہبود مین سرگرم رہین۔

آختر جوناگڑھی

اخلاقی اور تمدنی رنگ مین جزیات

بمصرِ حسن ہر جا یوسفے ہست — غلامِ روئے زیبائے تو باشد

اب یہ تھیوری بڑی بڑی فلسفی درسگاہون مین بھی مانی گئی ہے کہ جس کائنات مین ہم رہتے ہین اور جس مین ہم خود بھی شامل ہین وہ ذرات سے مرتب اور مرکب ہے۔ اگرچہ مختلف اجسام اس وقت بڑے بڑے نظر آتے ہین لیکن اگر اُن کا بنیادی سلسلہ دیکھا جائے تو وہی ذرات ہین جو اجسام سے چھوٹے اور اُن کے جزیات ہین۔

یہ کپڑا جو انسان پہنتا ہے اور بمصداق الناس باللباس جس پر تہذیب اور شعائر تہذیب کا بہت کچھ مدار ہے یا جس پر انسانیت کے شعائر کا ایک حد تک انحصار ہے، شروع مین چند مختلف اور منتشر تار اور اجزا ہی تھا۔ رشتہ برشتہ پیوستہ ہو کر کپڑا بنتا ہے۔ یہ قیمتی غلے اور لذیذ پھل جن پر انسانی زندگی کا بہت کچھ مدار ہے اُن بیجون کے ذرات ہین جو دیکھنے مین بہت ہی چھوٹے ہوتے ہین۔

پیپل اور بڑ کا بیج کیسا چھوٹا ہوتا ہے لیکن اسکے مقابلہ مین دیکھو پیپل اور بڑ کا درخت کس قدر بڑا اور سایہ دار ہوتا ہے بظاہر کون خیال کر سکتا ہے کہ اس قدر خفیف اور چھوٹے سے بیج سے اس قدر بڑے بڑے درخت پیدا ہو سکتے ہین کہ جن کے سایہ مین صدہا لوگ آرام پا سکین۔ یہ دیودار کا درخت کس قدر لمبا ہوتا ہے، اور اس سے انسان کس قدر کام لیتا ہے! اسکا تخم بھی بہت ہی چھوٹا ہوتا ہے۔

آگ کی چنگاری کی ہستی ہی کیا؟ لیکن ہزارون اماکن اور صدہا سامان کے جلانے اور راکھ سیاہ کرنے کے واسطے وہی کافی ہے پانی کے قطرہ قطرہ سے دریا اور سمندر بن جاتے ہین، بارش کے بھی قطرات اور بوندین ہی ہوتی ہین۔ دیکھو اخیر مین ان ہی منتشر قطرات اور متفرق بوندون سے بڑے بڑے دریا اور بڑی بڑی نہرین بن جاتی ہین۔ انسان کی پیدایش بھی ایک قطرہ یا چند قطرات ہی سے ہوتی ہے وہ ایک قطرہ سے نشو و نما پاتا ہوا کس قدر قامت اختیار کرتا ہے اور اپنے اندر کس قدر جذبات اور کس قدر قوتین رکھتا ہے۔

یہ انواع و اقسام کی کتابین، رسائل، اخبارات و سائر سیاسی و تمدنی و شرعی چند حروف اور چند نقاط ہی کا مجموعہ ہوتے ہین۔ دیکھو ایک ایک حرف کے ملانے اور جوڑنے سے کس طرح یا کس خوبی سے الفاظ، جملے، کلمات، فقرات، سطرین اور صفحات بن جاتے ہین۔

یہ سانس اور دم جس پر انسان کی زندگی کا شروع اور خاتمہ ہے ایک منتشر سلسلہ ہی تو ہوتا ہے۔ اس منتشر سلسلہ کی گنتی بھی کی جا سکتی ہے۔ یہ جزیات ہی تو ہین۔ دیکھو ان ہی جزیات کے ماتحت کس خوبصورتی سے نظام حیات انسانی قائم ہے۔

اس قسم کی متفرق مثالوں سے یہ ثابت ہے کہ تمام کلیات، تمام مجامع، تمام اکابر کا وجود اور ہستی جزئیات اور اصاغر ہی سے ترتیب اور ترکیب پاتی ہے۔ اگر اصاغر، ذرات، اور جزئیات نہ ہوں تو کلیات اور اکابر بھی نہ ہوں دیکھو بادشاہ کوئی کوئی ہی ہوتا ہے لیکن اس کا عملہ اور سپاہ بے شمار ہوتی ہے اور یہ عملہ فعلہ اور سپاہ افراد اور جزئیات ہی سے ترتیب پاتی ہے۔ اور بادشاہ بھی بجائے خود ایک جزو اور ایک فرد ہی ہوتا ہے۔

دنیا میں جزئیات ہی سے زیادہ تر کام لیا جاتا ہے اور کلیات کی بنیاد جزئیات ہی ہیں۔ اجسام ذرات سے ترکیب پاتے ہیں۔ ذرات اور جزئیات ہی سے ہماما شروع ہیں۔ ایک گاؤں یا ایک شہر کب بنتا ہے؟ جب اس میں مختلف قسم کے لوگ آباد اور جمع ہوں۔ جہاں صرف ایک ہی آدمی رہتا ہو اسے گاؤں اور شہر نہیں کہتے۔ جزئیات اصاغر افعال عامہ اور اخلاق عامہ کی نہ صرف چند ترکیبی اور ترتیبی حلقوں ہی میں ضرورت ہوتی ہے، بلکہ تمدنی اور سوشل مراحل میں بھی ضرورت پڑتی ہے جب انسان جزئیات، افعال عامہ اور ترک افعال عامہ سے بے خبر اور لاپروا ہو جاتا ہے تو سلسلۂ تمدن اقتصادیات اور اخلاقیات کی وہ عظمت و شہرت اور احساسِ ضرورت باقی نہیں رہتا جس کی انسانی حیات کے واسطے ایک لابدی ضرورت ہے۔

جیسے اجسام مختلف ذرات سے ترکیب پاتے ہیں ایسے ہی تمدنی، اقتصادی، اخلاقی، سیاسی اور سوشل سلسلے اور اجسام بھی جزئیات خیر و شر سے اچھی یا بری ترتیب اور ترکیب پاتے ہیں۔ بہت سے لوگ کسی معمولی، عامہ یا جزوی فعل یا ترکِ فعل کے وقت یہ کہا کرتے ہیں:

مجھ سے کوئی خون تو نہیں ہو گیا۔

کوئی آدمی تو نہیں مار دیا!

کوئی چوری تو نہیں کی!

کوئی ڈاکہ تو نہیں مارا!

کوئی قانون تو نہیں توڑا!

ایسا کہنے والا یہ خیال خود یہ سمجھے ہوئے ہے کہ جب تک خون نہ کیا جائے، ڈاکہ نہ مارا جائے، اس وقت تک کوئی فعل یا ترکِ فعل کچھ اثر اور نتیجہ نہیں رکھتا، اور نہ کسی کو یہ حق حاصل ہے کہ اس پر اعتراض کرے یا ٹوکے۔

اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے:-

میں بھلا کیا احسان کر سکتا ہوں!

میں کیا بضاعت رکھتا ہوں!

میری کیا طاقت!

کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ!

پیر آپ ہی درماندہ شفاعت کس کی!

دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہوتا ہے کہ معمولی باتوں کا سرزد ہو جانا یا فروگذاشتیں اور معمولی غلطیاں اور معمولی نیکیاں اور معمولی مروتیں کوئی اور کوئی قیمت اور کوئی خوبی نہیں رکھتی ہیں۔ غلطی تو وہ ہو سکتی ہے جو بڑی ہو اور نیکی بھی وہ ہے جو بہت بڑی ہو۔

ایسا سمجھنا اور ایسا قیاس کرنا وہ غلطی اور وہ فروگذاشت ہے جو ہلاکت کرکے ہماری سیرت، اور ہمارے تمدن کے واسطے ایک سخت نقصان اور تکلیف دہ عمل ہے یہی وہ باتیں ہیں جن کی بدولت کوئی قوم دولت اور دولتِ سعادت سے محروم اور بے بہرہ ہو سکتی ہے۔ جس قوم کے افراد ایسے خیالات ہوں وہ قوم ترقی یافتہ اقوام میں جگہ نہیں لے سکتی۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں جس قدر کام ہوتے ہیں وہ سب طاقتوں کی وجہ سے ہوتے ہیں جن کو بڑی بڑی طاقتیں کہا جاتا ہے۔ یہ درست نہیں۔ اس کائنات اور بالخصوص انسانی کائنات میں، طاقتیں بڑے بڑے کام کر رہی ہیں جو چھوٹی چھوٹی ہیں۔ ذرات سے اجسام ترکیب پاتے ہیں۔ اجزا ہی سے کلیات کی نوبت آتی ہے۔ اگر دنیا میں سعادت اور نیکی کا کوئی مجسمہ ہے تو وہ مختلف اور جزوی نیکیوں سے بنا ہے جس طرح ایک بڑا عالی شان محل یا مکان پتھر کے مختلف ٹکڑوں سے۔

ون سے تعمیر ہوتا ہے اسی طرح دنیا میں مختلف نیکیاں مختلف لوگوں ہی کی بدولت
ظہور پذیر ہوتی ہیں اور ان کا اکثر حصہ جزوی رنگ رکھتا ہے۔ یہ "پبلک"
کا مہذب ملکوں اور مہذب قوموں میں بہت کچھ زور اور چرچا ہوتا ہے
افراد ہی جزئیات ہی کا تو مجموعہ ہوتا ہے۔ خواص اور اکابر سے تو "پبلک"
بنتی چھوٹی چھوٹی اور مختصر ہستیوں کا نام ہی پبلک ہے۔

اگر ہم چھوٹی چھوٹی شرارتوں اور چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بچ سکتے
تو ہمارا فرض اولین ہے کہ ہم ان سے محفوظ رہیں کیونکہ ان چھوٹی چھوٹی
بوں ہی سے بڑے بڑے منصوبوں اور گناہوں کی بنیاد پڑتی اور
آتی ہے۔ ایک قاتل یا ایک ڈاکو شروع ہی میں قتل اور غارتگری
بن کرتا۔ بلکہ اسکی برائیوں کا شروع معمولی فروگذاشتوں اور معمولی غلطیوں
سے ہوتا ہے کبھی کبھی ایک ڈاکو اپنی پہل مرغی ہی سے کرتا ہے اور پھر
رفتہ اُس کا ہاتھ بڑے بڑے جرائم پر بھی دراز ہونے لگتا ہے۔

اگر تم بڑے بڑے گناہوں اور غلطیوں سے بچنا چاہتے ہو تو تمھیں
یک معمولی اور چھوٹے چھوٹے گناہوں اور فروگذاشتوں سے بچو ع
چشمہ شاید گرفتن بہ بیل۔ جو شخص شروع میں ایک روپیہ یا ایک
رشوت لینا ایک معمولی بات سمجھتا ہے وہ رفتہ رفتہ بڑی بڑی رقوم
لینے سے بھی شرم نہیں کرتا۔

اطفال کی تعلیم و تربیت کا یہ اہم جزو ہے کہ انھیں شروع ہی میں چھوٹے چھوٹے
سا پر بھی ٹوکا جائے اور چھوٹی عمر ہی سے ان کی نگرانی کیجائے۔ جو بچہ اپنے قمیص یا کرتہ
رکھنے سے کراہیت نہیں کرتا وہ کسی دن دوسرں کے منہ پر تھوکے گا۔

ہندوستان میں بہ مقابلہ دنیا کے دیگر ممالک کے شتم دہی کا
خبط ہے اس کا شروع سب سے اول اپنی ماں کی گود یا اپنے گھر ہی سے
ہے گالی میں یہ طاقت ہے کہ وہ بیچ اور بیچ الفاظ میں مختلف رنگ
پیدا کرتی جاتی ہے یہاں تک کہ رفتہ رفتہ ایسی مشق اور عادت ہو جاتی
لڑکا نہیں سکتی جو لڑکا چاقو سے اپنا ہاتھ زخمی کر لیتا ہے اس کے واسطے
دوسرن کو زخمی کر دینا کیا مشکل ہے۔

اب نیکیوں کا خیال فرمائیے۔ بہت سے لوگ صرف اسواسطے نیکیوں سے
محروم رہتے ہیں کہ ان کے خیال میں نیکی کرنا ان کی طاقت سے باہر ہے
یا وہ نیکی کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ ہذا باطل۔ اگر بڑی بڑی نیکیاں ہیں
تو اُن کے مقابلہ میں چھوٹی چھوٹی نیکیاں بھی ہیں چھوٹی چھوٹی نیکیوں ہی سے
بڑی بڑی نیکیوں کی بنیاد پڑتی ہے۔ اگر ہم بڑی نیکی کرنے کے قابل نہیں یا
ایسی ہمت نہیں رکھتے تو کیا چھوٹی نیکیاں بھی نہیں کر سکتے؟ کوئی شخص ایسا
نہیں جو کچھ نہ کچھ نیکی نہ کر سکے!

کسی بزرگ ہمت سے ایک شخص نے پوچھا "میں نیکی کی ہمت نہیں رکھتا"
بزرگ ہمت نے کہا نیکی کرنے کے لیے کسی بڑے رتبہ اور بڑی ہمت کی
ضرورت نہیں، کوئی شرط اور کوئی قید نہیں، ہر شخص بہ مقدور خود نیکی
کر سکتا ہے نیکی ہر مقدور اور ہر ہمت کے موافق ہوتی ہے۔ راہ میں سے
ایک تنکا اُٹھانا بھی ایک نیکی ہے۔ کسی رہرو کو خوش اخلاقی سے راہ بتانا
بھی ایک نیکی ہے کسی کے ساتھ خوش خلقی سے بات کرنا بھی ایک نیکی ہے۔
اگر کسی نیک کام میں ایک روپیہ دینا نیکی ہے تو اپنی ہمت کے مطابق ایک
پیسہ دینا اس سے بھی زیادہ نیکی ہے ایک دو روٹی میں سے جو اپنے کھانے
کے واسطے ہے نصف روٹی کسی بھوکے کو کھلا دینا صدہا روٹیوں کے کھلانے
سے زیادہ ثواب رکھتی ہے اپنا پیٹ خالی رکھ کر اپنی جیب کاٹ کر دینا!
ابنائے جنس کی مدد کرنا ایک ایسی نیکی ہے جو بہت قیمت رکھتی ہے جو لوگ
لاکھوں روپیہ نہیں دے سکتے جو سرائیں، عبادت خانے، چاہ، مدارس
نہیں بنا سکتے، جو لوگ یونیورسٹیوں میں ہزار ہا روپیہ دینے کا مقدور
نہیں رکھتے اُن کا اپنی ہمت اپنے حوصلہ اور اپنی بضاعت کے مطابق
ایک روپیہ یا ایک پیسہ بھی دینا ایک اجر عظیم رکھتا ہے کسی بیمار سے ہمدردی کرنا
اور حسن سلوک اُس سے پیش آنا امیروں اور مخیروں کی بڑی بڑی داد و دہش
اور جود و کرم سے بھی زیادہ ہے کچھ بھی نہ ہو صرف صادق ہمدردی مخلصانہ

سلوک بھی سو نیکیون کی ایک نیکی ہو۔

اس کائنات مین ابنائے جنس اور دیگر انواع کو بڑی بڑی نیکیون اور بڑے بڑے کارنامون کی تو کبھی کبھی ہی ضرورت پڑتی ہو عام طور پر تو چھوٹی چھوٹی باتون ہی کی ضرورت ہوتی ہو اور ان ہی پر دنیا کی بہبود کا زیادہ تر مدار بھی ہوتا ہو غربا عام طور پر خوش خلقی کے بھوکے ہوتے ہین انھین خطابات اور القاب کی کم ضرورت ہوتی یا کم احساس ہوتا ہو اُن کے ساتھ سلوک سے پیش آنا ایک بڑا اثر اور ایک بڑی قیمت رکھتا ہو۔

اگر ہم اپنی بضاعت کے مطابق چند غریب لڑکون کی ابتدائی تعلیم کا انتظام کر سکتے ہین تو ہمین اعلےٰ تعلیم کی ہمت اور وقت کا انتظار نہین کرنا چاہیے کیونکہ اعلیٰ تعلیم کے واسطے تو خال خال ہی جا سکتے ہین اور ابتدائی تعلیم کی عموماً ضرورت ہے۔ اگر کوئی جج اور کوئی مجسٹریٹ صرف قتل و خون کے مقدمات ہی مین انصاف کرنے کا خواہشمند ہو تو وہ غلطی مین ہو قتل کے مقدمات کبھی کبھی دایر ہوتے ہین معمولی مقدمات کثرت سے ہوتے ہین۔ ان مین انصاف کی کوشش کرنا اور انصاف کرنا ہزارون کے حق مین ایک منصفانہ امداد ہو بعض وقت لوگ یہ خیال کرتے ہین کہ جب تک اُن سے ہر قسم کی نیکی ہو سکے ایک آدھ نیکی سے کیا حاصل ؟ یہ اُن کی غلطی ہو جس قدر نیکی ہو سکتی ہو وہ کی جائے! جو شخص کسی رفیق کی ایک معمولی رفاقت کی قدر نہین کرتا اور اس کی داد نہین دیتا وہ کسی بڑی رفاقت کی بھی قدر و منزلت نہین کر سکتا! ایک چھوٹی سی خوبی بھی قیمت رکھتی ہو! ایک چھوٹا سا احسان بھی شکریہ چاہتا ہو جزئیات پر نظر نہ کرنے کی وجہ سے بعض اوقات وہ باتین کس مپرسی مین رہ جاتی ہین جو کسی وقت بڑے بڑے اہم واقعات بن سکتی ہین جو کاتب کتابت مین حرکات و اعداد کا چھوڑ دینا جائز سمجھتا ہو اور بعض حروف چھوڑ جاتا ہو وہ الفاظ اور فقرات کا خون کرتا ہو اور عبارات کو بے ربط اور مغشوش بناتا ہو۔ اسی طرح جو ہستیاں چھوٹی چھوٹی نیکیون سے منھ پھیرتی ہین وہ بڑی بڑی نیکیون کی راہین بند کرتی ہین۔ جو شخص باوجود ہمت اور باوجود احساس کے کسی بڑی نیکی کے انتظار مین رہتا ہو وہ چھوٹے چھوٹے موقعون کو ایک بے رحمی کے ساتھ جان بوجھ کر رایگان جانے دیتا ہو اور جو وقت اُسے میسّر ہو اُسے کام مین نہین لاتا۔

اس طریقِ عمل سے صدہا نیکیون کا خون ہوتا ہو اور صدہا روشن واقعات تاریکی مین رہ جاتے ہین۔ ایک عام یا کوئی گمنام آدمی کسی غرق ہونے والے کو دریا مین سے نکال لیتا ہو لوگ اُس کی کوئی قدر و منزلت نہین کرتے کوئی نوٹس نہین لیتے۔ ایک غریب جان لڑا کر ایک نیک کام کرتا ہو اور اُس مین وہ کوئی خود غرضی بھی نہین رکھتا لوگ اس طرف توجہ ہی نہین دیتے اور نہ اُس کا اعتراف کیا جاتا ہو۔ لوگ ہمیشہ نسبتی معیار کے ماتحت خوبیون کی قدر کرنے کے عادی ہین۔ اگر ایک امیر ایک مقتدر شخص کوئی تھوڑی سی نیکی اور مروّت بھی کرے تو لوگ اُسکے اعتراف اور اُسکے احترام مین دیر نہین لگاتے۔ مبالغہ سے اُس کی قدر بڑھاتے ہین لیکن اگر کوئی ویسا ہی کام کوئی غریب کرے تو اُس پر توجہ بھی نہین کی جاتی!

ایک غریب کوئی غلطی کرے تو شور پڑ جاتا ہو لیکن اگر کوئی مقتدر شخص ایسا کام کرے تو اُسے ایک تفریح یا ایک قابل معافی غلطی سمجھا جاتا ہو حالانکہ دنیا مین غربا اور مساکین ہی کی بدولت اور اُن ہی کی محنتون اور خوبیون کے ماتحت کام چل رہا ہو چھوٹی چھوٹی ہستیان ہی اس کائنات کی رونق کا موجب ہین! لوگ چاہتے ہین کہ ہمیشہ ان کے سامنے بڑے بڑے واقعات ہی لائے جائین۔ یہ ایک فریب دہ مغالطہ ہو جو قومین ترقی یافتہ ہین جن کا عروج اور جن کی تہذیب چوٹی پر اور نکسالی ہو اُن کی تمام قسم کی ترقیات اور مدارج کی بڑی بھاری وجہ اور مدار چھوٹی چھوٹی باتون پر ہی رہا ہو چھوٹے چھوٹے واقعات ہی سے اُنھین یہ درجہ نصیب ہوا ہو۔ اُن مین سے جب ایک ادنیٰ فرد بھی کوئی خوبی رکھتا اور کوئی ہمت اور نیکی کا کام کرتا ہو تو دوسری صبح یا دوسری شام ہی کو اُس کا اعتراف کیا جاتا ہو۔ ملک بھر کے اخبارات مین تعریفی نوٹ حل چلتے ہین۔ لوگ ایک شوق کے ساتھ اُنھین پڑھتے ہین۔

رف پڑھتے ہی نہین بلکہ مختلف طریقون سے اُنکی ہمت افزائی بھی کرتے
ہن - اگر ملک مین کوئی رسالہ یا کوئی اخبار خوبی کے ساتھ نکلتا ہو اور ملک
وم کی خدمت کرتا ہو تو اُسکی امداد اور ہمت افزائی لازمی سمجھی
اتی ہو -

قوم کے افرادِ صغیرہ شوق اور ہمت دکھاتے ہین اور قوم کے نامور متعدد
رہا ہو - لوگ اُن کی ہمت بڑھاتے اور ہمت افزائی کرتے ہین - جو قومین
بار زدہ ہین یا ادبار مین گھر چکی ہین اُن کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا ہو - افرادِ صغیرہ
ہمتین پست ہو جاتی ہین - اور یہ سمجھتی کہ اُن کی باری ہی نہین آتی
وئی کام کرکے دکھائین اور اپنی لیاقت اور ذہانت کا ثبوت دین اور اگر
ی اُن کی جانب سے ذہانت کا کوئی علمی ثبوت دیا بھی جاتا ہو تو اُس کی
ر نہین کی جاتی بخلاف اسکے خود اپنے ہم جنس ہی دل شکنی پر آمادہ
ہو جاتے ہین - ایسے حاسد یہ نہین چاہتے کہ کوئی دوسری یا عام ہستی بھی
ن کی موجودگی مین کوئی کام کرنے کا حق رکھتی ہو یا دکسی اور کے حصہ مین
ن بھی شہرت آئے - ع

اے بسا کہ شکستہ ما را برہم زدہ بند و بست ما را

دنیا مین وہی قوم ترقی کرتی ہو جس کے افرادِ صغیرہ اور عوام افرادِ
مشترکہ مین عملی حصہ لیتے ہین - اس وقت دنیا کے ہر حصہ مین جس قدر کلین
مشینین ایجادات اور مصنوعات پائی جاتی ہین اُن سب کے موجد مخترع
اور بانی عام لوگ ہی ہوے ہین - ریل تار ہیلو گراف اور گراموفون وغیرہ
وغیرہ اُن ہی افراد کی ذہانت کا نتیجہ ہین جو عوام مین سے تھے - بہت کم
ل ان مین سے بی اے ایم اے یا اعلے تعلیم یافتہ تھے - وہ معمولی تعلیم
یافتہ تھے - اگر یہ لوگ انسانی کائنات کے اجزاے صغیرہ یا ارکانِ عامہ
ہونے کی وجہ سے اپنی خداداد ذہانت سے یون کام نہ لیتے تو دنیا مین یہ
عجوبات اور یہ حکمتین بھی نہ ہوتین -

یہ سُننے مین نہین آیا کہ کبھی کسی امیر بادشاہ اور راجہ نواب نے
کبھی کوئی مشین ایجاد کی ہو یا اور کوئی اختراع کی - ایسے لوگون کی طبیعت اس
قابل ہی نہین ہوتی کہ ایسے کام کر سکین - یہ کام تو وہی لوگ کرتے ہین جو
اصاغر اور عوام الناس مین شمار ہوتے ہین - اور جو انسانی کائنات کے
جزئیات کا شبہ ہین جس طرح یہ ساری کائنات مختلف ذرات سے مرتب اور
مرکب ہو اُسی طرح دنیا کے بڑے بڑے کام بھی جزئیات کی بدولت انصرام
پاتے ہین - فوج اُسی وقت بنتی ہو جب اُس مین صد ہا فرد شامل ہون -
صرف ایک کمان افسر کی شمولیت اور ذات سے فوج نہین بن سکتی -

جس طرح ہم چھوٹی چھوٹی نیکیان کثرت سے کر سکتے ہین اُسی طرح ہم
نہایت خوبی کے ساتھ چھوٹے چھوٹے گناہون سے بھی بچ سکتے ہین اور
اس طرح سے گناہون اور برائیون کا نمبر بہت کچھ کم کر سکتے ہین - ایک غریب شخص روز
دو تین پیسے کسی نیک کام مین دے سکتا ہو اور ایک دو بیمارون کی خبر
بھی لے سکتا ہو - لیکن بڑے سے بڑا آدمی بھی ہر روز ۲۰۰ دو دو سو روپیہ کسی
کام مین نہین دے سکتا -

چھوٹے سے چھوٹا گناہ اور برائی ترک کرنے مین پیش قدمی کرو اور
اسی طرح چھوٹی سے چھوٹی نیکی بھی اگر ہو سکتی ہو تو اُسمین تامل نہ کرو - یہ تمھارا
فرض نہین کہ تم بڑے بڑے کامون کے انتظار مین چھوٹے چھوٹے کام بھی
نہ کرو - جن برائیون کو تم چھوڑ سکتے ہو چھوڑ دو - خواہ وہ کیسی ہی چھوٹی ہون
اور جو نیکی تم کر سکتے ہو کر و چاہے وہ کیسی ہی خفیف ہو - چھوٹی برائیون کو ترک
کرنے اور چھوٹی خوبیان ہاتھ مین لانے ہی سے انسان بڑے بڑے گناہ چھوڑ سکتا
اور بڑے بڑے نیک کام کر سکتا ہو - یاد رکھو جس طرح چھوٹے کلاس کے دوست ہمیشہ
وفادار ثابت ہوتے ہین اور اُن سے بہت کچھ کام نکلتا ہو اسی طرح چھوٹی
چھوٹی باتون ہی سے بڑی بڑی باتون اور بڑے بڑے واقعات کی بنیاد
پڑتی ہو - عام نیکیون اور عام خوبیون کے بانی اور وارث ہمیشہ افرادِ صغیرہ
ہی ہوتے ہین اور افرادِ صغیرہ ہی ہماری دنیا کی خوبی اور ہمارے تمدن
اور دنیا کا بہت کچھ مدار ہو - چھوٹی چھوٹی باتون پر دھیان دو اور اُن کا

خیال رکھو، تاکہ انسانی تمدن اور انسانی اخلاق کی سرسبزی ہو۔ اگر تم چھوٹا کام شروع میں نہیں کروگے تو کوئی بڑا کام کس طرح کرسکوگے؟ بچے بنو تاکہ تم جوان ہو کر بڑے بنو۔

ابجد شروع کرو تاکہ تم خود فقرات اور جملے بنانے لگ جاؤ۔ جب تک الف ب ت نہیں پڑھوگے فقرہ اور جملہ نہیں پڑھ سکتے۔ بڑی باتیں بڑے لوگوں کے واسطے رہنے دو۔ جو تم کرسکتے ہو کرو۔ تم بھی دنیا کی بہتری کا ایک جزو اور اس مشین کا ایک پرزہ ہو۔ کل کی ہستی تم ہی جیسے جزو سے ہے

ترا کہ گفت کہ بلبل بسیر بستان باش
بنوش یک گل و سرجلوۂ خود گلستان باش

سلطان احمد

(خدا کی تعریف)

اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کا گیت جو خدا کی تعریف میں گایا جاسکتا ہے، وہ ایک پاکیزہ اور مصروف زندگی ہے۔ خدا کی سچی محبت کسی خیال کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک مضبوط اور عمدہ اصول ہے جو نہ صرف دل کو اس کی یاد میں مصروف رکھتا ہے بلکہ کیرکٹر اور چال چلن پر بھی اپنا اثر ڈالتا ہے۔ سچی محبت اپنے آپ کو صرف جذبات ہی میں ظاہر نہیں کرتی بلکہ وہ اپنی سچائی کو ایک پاکیزہ اور پارسا زندگی کی صورت میں پیش کرتی ہے۔ وہ تعلقات جو انسانی روح کو خدا سے وابستہ کرتے ہیں قبل الذکر کو نیکی اور تقدس کی طرف لیجاتے ہیں۔ اس لیے اگر ہمیں خدائے بزرگ سے سچی محبت ہے تو ہمارے افعال نیکی کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں گے۔ بلکہ ہمارے خیالات اور ہمارے جذبات بھی خداوند کی مرضی کے مطابق ہونگے۔ اور اگر ایسا ہو تو ہماری زندگی سرتاپا خدا کی تعریف میں مقدس ہوگی۔ مثلاً جس طرح سے کہ ایک بیجان چیز کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے وجود کے مقصد کو پورا کرنے میں خدائے جلیل کی حمد کرتا ہے اور آسمانوں میں بھی تمام سیاروں کا یہی ایک گیت ہے[1]۔ اسی طرح سے اگر انسانی زندگی بھی جبکہ وہ بالکل پاک ہو خدا کی مرضی کے مطابق عمل کرے تو گویا وہ اس کی تعریف میں ایک مجسم گیت ہے۔ لیکن خدا کی محبت زبان کو خاموش نہیں کرسکتی۔ زبان کو خود بخود اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ حضرت داؤد فرماتے ہیں کہ خدا کا شکر کرنا اور اس کی بے ہمتا شان میں بھجن گانا ایسا ہی اچھا ہے جیسا کہ اس کی سچی مہربانی اور برکات کا صبح کے وقت اظہار کرنا۔ اور اس کی محافظت کا رات کو۔

علی الصباح حمد کی آواز خداوند جل و علا کے تخت پر پہنچائی جاتی ہے بلکہ اسکی منظوری حاصل کرتی ہے اور وہ اس بھجن کو بھی پسند فرماتا ہے جو اس وقت گایا جائے جب سورج کی روشنی مدھم پڑ رہی ہو۔ دوپہر کی نماز سے بھی وہ اپنے سائلوں کو پرے نہیں ہٹاتا۔ یعنی وہ صبح اور عصر کی نمازوں کے مانند ظہر کی نماز بھی قبول فرماتا ہے۔ اس لیے آؤ ہر رات کو شکر اور تعریف کا گیت اس کی شان میں گائیں۔

ایکلیزیاسٹس پہلے تو خدا کی ان نعمتوں اور برکتوں کا ذکر کرتا ہے جن سے کہ انسانی زندگی پُر ہے اور پھر خود ہی سوال کرتا ہے اور کہتا ہے کیا خدا کے احسان بے شمار صرف اتنے ہی ہیں، نہیں نہیں وہ بیشمار ہیں۔ اور زبان میں اتنی بھی یارا

---

[1] بعض قدیم حکما کا خیال تھا کہ سیارے جو بڑے سادی کائنات متصل ہو گردش کرتے وقت ایک قسم کا گیت گاتے ہیں۔ اس خیال کی ابتدا پیتھاغورث سے جو موسیقی کا عاشق تھا شروع ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ساتوں سیارے (زحل۔ زہرہ۔ مشتری۔ عطارد۔ مریخ۔ قمر۔ شمس) موسیقی کے سات سُروں کی طرح حرکت کرتے وقت ایک سُریلی آواز پیدا کرتے ہیں جن کو میں سن سکتا ہوں۔ یہی گویا خدا کی حمد ہے جو تمام سیارے آسمانوں میں گاتے ہیں۔ زحل جو زمین سے بہت فاصلہ پر ہے گہری اور بڑی آواز پیدا کرتا ہے اور چاند جو زمین سے نہایت نزدیک ہے پتلی اور تیز کی آواز نکالتا ہے۔ (مترجم)

نہیں کر وہ ٹھیک طور پر بیان کر سکے اور اُن کا شکر ادا کر سکے کیونکہ کاش اگر ہم میں عقل سلیم ہوتی تو اسوقت بھی یہی فرض ہم پر زیادہ ضروری ہوتا کہ ہم جلوت و خلوت غرض ہر جگہ خدا کے مقدس نام کی تسبیح کریں اسی کے نام سے برکت چاہیں، اور اسکے برکات دیکھ کر اُنکی حمد و ثنا کریں۔ کیا ہمیں اُسکا بھجن نہیں گانا چاہیئے۔ اسوقت جبکہ ہم زمین کو کھودیں اُسمیں ہل چلائیں یا جب کبھی ہم دسترخوان پر بیٹھیں یہ سمجھکر کہ خدا بزرگ ہے کیونکہ اُس نے ہمیں اُن آلات سے مہیّا کیا ہے جن کی مدد سے ہم زمین میں کاشت کرتے ہیں، خدا بزرگ ہے، کیونکہ اُس نے ہمیں اپنے برکات کی قدر کرنے اور اسکو استعمال کرنے کی طاقت عنایت کی ہے۔ اس لیے جبکہ ہم تم میں سے اکثر دلں کو دنیا دی مشغولیت نے اندھا کر دیا ہو۔ کیا کوئی شخص ایسا نہیں ہونا چاہیئے جو تمھارے بجائے اس خدمت کو اپنے ذمے لے، اور تمھاری سب کی طرف سے خدا کی شان میں حمد و ثنا کے ترانے گائے۔ اور میں جو کہ لنگڑا اور بوڑھا ہوں اسکے علاوہ اور کیا کر سکتا ہوں کہ خدا کی حمد کیے جاؤں۔ اگر میں ایک بُلبل ہوتا تو یقیناً میں بلبل کی طرح گیت گاتا۔ اور اگر قمری ہوتا تو قمری کیطرح چہچہاتا۔ لیکن اب ایک عقلمند آدمی ہونے کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ میں خدا کی حمد و ثنا کے بھجن گاؤں۔ یہی میرا کام ہے یہی میری زندگی کا مقصد ہے اور اُسے اسی میں پورا کرنا چاہتا ہوں۔ میں حتی الامکان اس کام سے کنارہ کشی نہیں کروں گا۔ اور تم سے بھی میں بنت اس کام کے کرنے کی استدعا کرتا ہوں۔"

شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ ساری تعریف اللہ ہی کو سزاوار ہے ہر ایک سانس جو اندر جاتا ہے زندگی کو بڑھاتا ہے اور جب باہر آتا ہے تو جسم کیلئے فرحت بخش ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے ہر ایک سانس میں دو نعمتیں موجود ہیں اور ہر ایک نعمت کے لیے علٰحدہ شکر واجب ہے ؎

از دست و زبان کہ بر آید　　کز عہدہ شکرش بدر آید

مندرجہ ذیل الفاظ حضرت آدمؑ اور حضرت حوّاؑ کے صبح کے بھجن سے لئے گئے ہیں جس کو ملٹن اپنی کتاب PARADISE LOST کی پانچویں جلد میں لکھتا ہے کہ علی الصباح جبکہ وہ دونوں باغ کی طرف جا رہے تھے، اُن کی نظر پَو پھٹنے اور سورج کے نکلنے پر پڑی تو بیساختہ وہ عاجزی کے ساتھ جھکے اور خدا کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہوئے:۔

"اے نیکی کے مالک! یہ تیرے ہی شاندار کام ہیں۔ اے قادر مطلق یہ ساری کائنات جو انسان کو حیرت میں ڈال دیتی ہے تیری ہی ہے۔ جب تیری کائنات کا یہ حال ہے تو تیری خبر نہیں تو کیسا ہے تیری ذات و صفات ناقابل بیان ہے تو آسمانوں پر ہے اگرچہ تو ہمیں اپنے معمولی معمولی کاموں میں نہیں دکھائی دیتا لیکن یہ تمام چیزیں تیری اُس نیکی اور اُس خدائی طاقت کو ظاہر کرتی ہیں جو احاطۂ خیال سے باہر ہو۔ اے روشنی کے بیٹو تمہیں کچھ کہو۔ اے فرشتو، بولو، کیونکہ تم اُس ذات بے ہمتا کو دیکھتے ہو اور راگنی روحانی گیت گا کر اُس کے تخت کے ارد گرد حلقہ باندھے بشاش کھڑے ہو۔ اے آسمان اور زمین کے رہنے والو آؤ، اور ہمارے ساتھ اُس کی نہ ختم ہونے والی حمد میں شریک ہو جاؤ۔

"اے سب سے روشن ستارے! تو یقیناً صبح کا ہراول ہے کیونکہ تو اپنے چمکدار اور خوبصورت ہالا کی وجہ سے صبح کے سر پر گویا تاج ہے جب صبح نمودار ہو تو تو اپنے حلقہ میں اس لاثانی ذات کی تسبیح و تقدیس کر۔

"اے سورج! اگرچہ تو اس دنیا کے لیے بمنزلہ آنکھ اور روح کے ہے لیکن اُس لاثانی ذات کو اپنے سے بزرگ جان اپنی گردش کے چکر میں ہر وقت جبکہ تو خط استوا پر ہو یا خط جدی پر اُس کی حمد کا نقارہ بجا۔

"اے چاند! تو اگرچہ اب سورج کے قریب ہوتا جاتا ہے لیکن اس کے نکلنے پر ستاروں سمیت نظر سے غائب ہو جائے گا۔ اے پانچ گشت کرنے والے آگ کے پتلو! تم ایک ستانہ ناچ میں لنبیر گاتے حرکت کر رہے ہو تم کو چاہیئے کہ اُس کی حمد کے ترانے گاؤ جس کی قدرت نے تاریکی میں روشنی پیدا کردی ہے۔

۱ اے ہوا! اور اے عناصر! تم قدرت کے سب سے بڑے بچے ہو تم جو چار چار کے اجزا میں ہمیشگی کا چکر کھاتے رہتے ہو اور چیزوں سے مل کر ان کی پرورش کرتے ہو آؤ اور اپنے خالق کی شان میں نئے انداز سے حمد کے گیت گاؤ!

۲ اے بخارات! تم جو کسی پہاڑ یا جھیل سے اُٹھتے ہو اور جب تک کہ سورج کی کرنیں تمھیں سنہری رنگ سے نہ رنگ دیں سیاہ خاکی رہتے ہو، دنیا کے بڑے خالق کی شان میں اُٹھو خواہ بلند ہو کر تم صاف آسمان کو بادلوں سے آراستہ کر دو یا گر کر پیاسی زمین کی پیاس کو بارش کی بوچھار سے بجھا دو، غرض بلند ہو کر یا گر کر جس طرح سے تمھارا جی چاہے اُس کی تعریف کرو۔

۳ اے ہوا تو دنیا کے چاروں کونوں میں آہستگی یا زور سے چلتی رہتی ہو اُس کی تعریف کر۔ اے صنوبر کے درختو! تم دوسرے درختوں کے ساتھ مل کر عبادت کے طور پر حرکت کرو!

۴ اے چشمو! تم سب بہنے کی حالت میں ایک دل خوش کن گیت گاتے ہو، اب سب اکٹھا ہو کر اُس کی تعریف کرو۔

۵ اے تمام زندہ روحو! اُس کی تعریف میں ہم آہنگ ہو جاؤ۔ اے پرندو! تم گاتے گاتے آسمان پر چڑھ جاتے ہو، اپنے پروں اور دلچسپ نغموں میں اُس کی تعریف اوپر لیجاؤ۔ اے آبی باشندو! اور اے زمین میں بسنے والو! میری گواہی دے دینا اگر میں پہاڑیوں، وادیوں، چشموں اور سایہ دار جنگلوں کو جن کو میں نے اپنے گانے کی طاقت سے گویا بنا دیا ہو، مخاطب نہ کروں!

۶ ہمیشہ رہنے والے خدا کی تعریف کرو۔ اے خدا! ہم پر مہربان ہو اور اپنی نیکی میں سے ہمیں حصہ دار بنا۔ اور اگر کبھی رات کچھ شر یا برائی اپنی آغوش میں جمع کر لے تو تو اُسے اُسی طرح سے ہٹا دے جس طرح سے کہ روشنی تاریکی کو ہٹا دیتی ہے۔

۷ اے محبت! مجھے اپنے سنہری پروں پر بٹھا کر اس نیچی دنیا سے اپنی روحانی بلندی پر لیجا تاکہ میں اُن قابل تعریف چیزوں کو دیکھ سکوں جن کو تو اپنے شہنشاہ کی طاقت کے زور میں انجام دے رہی ہے۔ اے محبت! مجھے اس جسمانی منظر کی وسعت سے دور لیجا تاکہ میں محبت کے خدا کی تعریف میں جو آسمانوں کا خدا ہے روحانی گیت گاؤں۔

(ترجمہ) **ضیاء الدین احمد برنی**

معاد

معاد کے متعلق ہمارا یہ عقیدہ ہی کہ معاد جسمانی و روحانی ہوگا انسان حقیقت مین صرف نفس ناطقہ کا نام ہی وہی مکلف ہی وہی عاصی اور مطیع ہی اسی پر ثواب و عذاب ہوتا ہی اور بدن تو بجائے ایک آلے کے کام دیتا ہی جسم خراب ہو جاتا ہی پھر بھی نفس باقی رہتا ہی پس جب خدا قیامت کے دن مخلوقات کو اٹھانا چاہے گا تو ہر ایک روح مع اپنے جسم و نسمہ کے اٹھے گی۔

اس مسئلہ کی حقیقت بخوبی ذہن نشین کرنے کے لیے روح اور نسمہ کی حقیقت کا بیان کرنا ضروری ہی پس پہلے ہم اسی طرف متوجہ ہوتے ہین۔

(۱)

اول روح کیا ہی؟ جوہر ہی یا عرض؟ اس امر کی تنقیح کہ روح کا وجود ہی یا نہین۔ اسکے متعلق ہمکو اولاً اجسام موجودہ فی العالم پر نظر کرنا چاہیے پس جب ہم ان پر غور کرتے ہین تو ابتداءً نظر مین ان کو دو قسم کا پاتے ہین ایک بطور تصور کے کہ جہان وہ ہین وہین ہین اپنی جگہ سے حرکت نہین کر سکتے اس قسم کے اجسام صرف چھوٹے چھوٹے شا باجزاء سے بنے ہوے ہین اور اس کے ہر ایک جزو مین وہی اوصاف ہین جو اسکے کل مین ہین جیسے پتھر اور لوہا۔ اگر ان مین سے کوئی ٹکڑا توڑ ڈالین تو اس مین بھی وہی اوصاف

ہونگے جو کل میں ہیں اور جبکہ وہ بالکل خالص ہو تو اسمیں ایک ہی طرح کے پرت ہونگے۔ دوسری قسم کے اجسام ایسے ہیں کہ ان کا جسم بخلاف ان کی انواع کے ایک معین حد تک بڑا ہوتا ہے اور اسکے اجزاء غیر متشابہ اور مختلف الالوان ہوتے ہیں اور ان میں باریک رگیں اندر سے خالی مثل نلی کے ہوتی ہیں جن میں بہنے والا مادہ پھرا کرتا ہے اور اسی طرح الگ الگ پردے بھی ہوتے ہیں جنکے بیچ میں خالی جگہ ہوتی ہے اور پھر کہیں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔

پہلی قسم کے اجسام کو اجسام غیر عضویہ اور دوسری قسم کے اجسام کو اجسام عضویہ کہتے ہیں۔ اجسام عضویہ میں پرت نہیں ہوتے اور اس کا نمو اسی قسم کی دوسری چیزوں سے ہوتا ہے اور جب وہ جوان ہو جاتا ہے تو اس میں مختلف طرح کا بیج پیدا ہوتا ہے۔

غیر عضویہ جسم دفعتاً جس وقت اسکا مادہ جمع ہو جائے پیدا ہو جاتا ہے اور عضوی رفتہ رفتہ نمو پاتا ہے اور جب اسکے بیج کو بوؤ تو وہی جسم اُس سے پیدا ہوتا ہے جس کا بیج ہے بونے والا جب بیج زمین میں ڈالتا ہے تو جانتا ہے کہ وہ کب پھوٹے گا اور کب اس میں مادہ چوسنے کی طاقت آ جائیگی۔ اسکے پتے اور ٹہنیاں ہوا میں سے غذا بھی لیتی رہتی ہیں جس کے سبب اس کا قد بڑھتا اور رنگ بدلتا جاتا ہے۔ ایک بڑا فرق ان دونوں جسموں میں یہ ہے کہ جسم عضویہ میں غذا ان کے اعضا کے اندر جاتی ہے اور اندر والی غذا سے بیرونی جسم بڑھتا ہے اور جب تک یہ قوت رہتی ہے نمو ہوتا رہتا ہے۔ ایک زمانہ کے بعد اسمیں ضعف آ جاتا ہے۔ غذا کم ہو جاتی ہے اور نمو نہیں ہوتا اور آخرکار مر جاتا ہے۔ عضوی جسم کی حالتیں علانیہ بدلتی رہتی ہیں۔ وہ پیدا ہوتا ہے، پھر بڑھتا ہے، پھر اس کا بڑھنا موقوف ہو جاتا ہے پھر بڑھاپے کے سبب گھٹنے لگتا ہے پھر مر جاتا ہے۔ جسم غیر عضوی اجتماع مادہ سے پیدا ہوتا ہے اور اسطرح بڑھتا ہے کہ اسی قسم کے اجزاء مادی اسکی اوپر کی سطح پر آ کر چڑھتے جاتے ہیں۔ اجسام عضویہ کا نمو اندر سے ہوتا ہے اور جسم غیر عضوی کا حجم اگر کوئی امر مانع نہو تو بے انتہا بڑھ سکتا ہے لیکن جسم عضوی کا حجم ایک مقدار معین سے زیادہ نہیں بڑھ سکتا۔ جسم عضوی اور غیر عضوی میں یہ فرق بھی ہے کہ پہلے جسم میں مختلف قسم کا مادہ ہوتا ہے اور دوسری قسم کے جسم میں صرف ایک قسم کا اگرچہ اور بھی اختلاف ہیں مگر مختصر طور پر ہم خاص اختلافات کو ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

(۱) اجسام عضوی کا وجود تناسل سے ہوتا ہے اور غیر عضوی کا جذب واتحاد سے۔

(۲) بقا اجسام عضوی کا محدود ہے اور غیر عضوی کا محدود نہیں۔

(۳) اجسام عضوی کے اجزا کروی شکل پر ہوتے ہیں اور غیر عضوی کے زاویہ کے طور پر۔

(۴) نمو اجسام عضوی کا منحصر ہے غذا کے اندر جانے پر اور وہ نمو اندر سے باہر کی طرف ہوتا ہے اور غیر عضوی کا اسکے برخلاف ہے اسکا حجم باہر سے اجزا مل جانے سے بڑا ہو جاتا ہے۔

(۵) جسم عضوی کی بناوٹ مختلف اجزا سے ہوتی ہے اور جسم غیر عضوی کی اجزاء متحد الوصف سے۔

(۶) جسم عضوی کی ترکیب اجزاء متضاعفہ متحرکہ سے ہوتی ہے اور غیر عضوی کی بسیط سے۔

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اجسام غیر عضوی میں تمام معدنیات مثل نمک اور پتھر اور مٹی وغیرہ داخل ہیں اور اجسام عضویہ میں نباتات اور حیوانات داخل ہیں۔

گر نباتات اور حیوانات میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔ حیوانات کی بناوٹ میں نباتات کی بناوٹ سے تضاعفات بہت زیادہ ہیں۔ حیوان حرکت کر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ جا سکتا ہے وہ مدرک ہے ذی اختیار ہے کہ جس کام کو چاہے کرے اور جس کو چاہے نہ کرے۔ اس میں حواس مخصوصہ ہیں کہ انکے سبب آواز کو بو کو ذائقے کو چھونے کو جانتا ہے اور غذا اسکے پیٹ میں

باقی ہے اور بالتخصیص اسکے پیٹ میں ایک ایسی ہنڈیا ہے جو غذا کو اسطرح پکا دیتی ہے کہ اعضا کے تغذیہ اور نمو کے لائق ہو جاتی ہے۔

نباتات کی کیفیت دوسری ہے۔ وہ جہاں ہے وہاں سے دوسری جگہ منتقل نہیں ہو سکتی۔ اس میں حرکت کرنے کی قوت نہیں ہے اور نہ اسمیں اختیار ہے۔ وہ اپنی جڑوں کے ذریعہ سے جو زمین میں ہیں اور پتیوں اور ٹہنیوں کے ذریعہ سے جو ہوا میں ہیں غذا کو جذب کرتے ہیں۔ اس میں کوئی ہنڈیا غذا پکانے کی نہیں ہے بلکہ جو غذا اس میں جاتی ہے اسی وقت غذا کے قابل ہوتی ہے۔

نباتات اور حیوانات میں بہت بڑا اختلاف ہے کہ حیوان میں پٹھوں کا بھی ایک سلسلہ ہے اور نباتات میں نہیں ہے۔ یہ اعصاب جیسا کہ ہم میں ایک مرکز سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سبب سے حیوانات میں قابلیت احساس ہوتی ہے۔ یہ بات نباتات میں نہیں پائی جاتی۔ علاوہ اسکے حیوانات میں اور بھی جھلیاں اور پردے اور پٹھے اور عضلے اس قسم کے ہوتے ہیں جو نباتات میں نہیں ہوتے۔ ایک عمدہ فرق دونوں میں یہ ہے کہ حیوانات کی غذا اجسام عضوی سے ہوتی ہے اور نباتات کی اجسام غیر عضوی سے جیسے پانی اور ہوا اور نمک۔ نباتات کے بننے کا مادہ در اصل ایک کثیلا مادہ ہوتا ہے اور تحلیل کیمیاوی سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ مرکب ہے کاربن اور ہیڈروجن اور آکسیجن سے اور یہ تینوں ایک ہوائی سیال جسم ہے اگر کسی جگہ صرف نائٹروجن بھری ہو اور وہاں آدمی جائے تو فوراً مر جاتا ہے۔ مثلاً لوگ کہتے ہیں کہ کسی پرانے کنوئیں میں دفعتاً اترنے سے آدمی مر جاتے ہیں۔ یہ امور جو ہم نے بیان کیے ہیں امور محققہ میں سے ہیں جو علم الحیوانات اور علم کیمیا سے بخوبی ثابت ہیں مگر جو فرق جسم نباتی اور حیوانی میں اوپر بیان ہوا ہے اس پر ہم زیادہ غور کرنا چاہتے ہیں۔

ہم کو بالتخصیص اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ حیوانات میں جو حرکت ارادہ اور اختیار اور ادراک اور خیال اور ایک قوت نتیجہ نکالنے کی ہے اسکا کیا سبب ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ نباتات کے جسم کے مادے میں تین عنصر ہیں کاربن آکسیجن ہیڈروجن اور حیوانات کے جسم کے مادے میں ایک چوتھا عنصر نائٹروجن بھی ہے۔ مگر یہ تمام عنصر ان کے جسم کی بناوٹ کا مادہ ہیں۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ ان افعال کے بھی باعث ہیں جو حیوانات سے بالتخصیص علاقہ رکھتے ہیں۔ اور جن کو ہم زیادہ وضاحت کے ساتھ لکھنا چاہتے ہیں۔ علم کیمیا سے ثابت ہے کہ نائٹروجن میں کچھ کیمیاوی قوت نہیں ہے اور نہ وہ معاون زندگی ہے صرف اتنی بات مسلم ہے کہ جانوروں کے گوشت کے ریشوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ حیوانات کے اعضا میں ایک ایسا عضو ہوتا ہے جو غذا کو اسطرح پکا دیتا ہے کہ وہ اعضا کے تغذیہ اور نمو کے لائق ہو جاتی ہے۔

نباتات میں کوئی ایسا عضو نہیں ہے اور اسکی وجہ ظاہر ہے کہ نباتات اپنی جڑ کے ریشوں سے اور اسکے پتے اور ٹہنیاں ہوا سے وہی مادہ جذب کرتی ہیں جو غذا کے نمو کے لائق ہے اور اس لیے ان میں کسی ایسے عضو کے ہونے کی ضرورت نہیں۔ برخلاف حیوانات کے کہ وہ ایسی غذا کھاتے ہیں جسمیں علاوہ مادہ تغذی و نمو کے اور فضول مادہ بھی شامل ہوتا ہے اسلیے ایک ایسا عضو بنایا گیا جو مادہ تغذی و نمو کو فضول مادہ سے جدا کر دے۔ مگر اسکے جدا ہونے کے بعد حیوان کی وہی حالت ہوتی ہے جو نباتات کی شروع تغذیہ میں تھی۔ اور اس لیے یہ تصور نہیں ہو سکتا کہ حیوان میں اس عضو کا ہونا ان افعال کا باعث ہے جو بالتخصیص حیوانات سے علاقہ رکھتے ہیں۔

حیوانات کے جسم کی بناوٹ میں ایک بہت بڑا جال اعصاب کا ہے جسکا مرجع ایک مرکز عام یعنی دماغ کی طرف ہے اور تمام افعال اسی کیطرف منسوب کیے جاتے ہیں لیکن یہ افعال ان سے بحیثیت ان کے اعضا ہونے کے منسوب نہیں ہو سکتے اور نہ بحیثیت ان کے مادہ ہونے کے کیونکہ تمام جسم حیوانات میں وہی عناصر موجود ہیں مگر مختلف ترکیب پانے سے مختلف مادہ

اور صورت پیدا ہوتی ہے پس صرف بحیثیت مادہ جو اختلاط عناصر سے پیدا ہوتے ہیں محض اعمال سے منسوب نہیں ہو سکتے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ عناصر کاربن آکسیجن ہیڈروجن نائٹروجن کی ترکیب سے کیا حالت پیدا ہو سکتی ہے۔ عناصر آپس میں ایک دوسرے سے ملکر ایک دوسری صورت کا جسم پیدا کر لیتے ہیں۔ مثلاً آکسیجن اور ہیڈروجن مقدار معینہ سے باہم مل جائیں تو ایک دوسری صورت کا جسم رقیق سیال پیدا ہو جاتا ہے جس کو پانی کہتے ہیں مگر اسمیں کوئی ایسی صفت جو مادے کی حیثیت سے بڑھ کر ہو پیدا نہیں ہوتی۔

عناصر کی پانچ ترکیبیں ہیں پہلی ترکیب سے ایک جسم غیر میں یا اسی جسم میں جو ان عناصر سے بنا ہے حرارت پیدا ہو جاتی ہے اور جب تک کہ وہ ترکیب قائم رہے وہ حرارت بھی قایم رہتی ہے۔ دوسری ترکیب سے جسم میں ایک خاص قسم کے مادہ کی یا دوسرے جسم کے جذب کرنے کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ تیسری ترکیب سے ایک ایسا جسم پیدا ہو جاتا ہے جو جوش میں یعنی متحرک ہے یعنی خود اسی کے اجزا حرکت میں رہیں جب تک وہ ترکیب اس میں باقی رہے۔ جیسے کہ تیزابوں کے ساتھ دوسری چیزیں ملانے سے پیدا ہوتی ہے۔ چوتھی ترکیب سے ایک قوت مخفیہ جو اجسام میں ہے ظاہر ہو جاتی ہے اور دیگر اجسام کو جذب کر کے ایک جگہ لے آتی ہے جیسے کہ برقی عمل سے ظہور اور اجتماع برق کا ہوتا ہے۔ پانچویں ترکیب سے یا اُن اجسام کی ترکیب سے جو عناصر سے بنے ہیں ایک جسم ہوائی سیال پیدا ہوتا ہے جو دکھائی بھی دیتا ہے اور کبھی ایسا لطیف ہوتا ہے جو دکھائی بھی نہیں دیتا۔

اکثر اطبا اور حکما کا یہ خیال ہے کہ جسم حیوانی میں جو ترکیب عناصر سے بنا ہے اور جسمیں مختلف قسم کے اعضا ہیں اس ترکیب کے سبب ایک جسم ہوائی پیدا ہوتا ہے جو باعث نتیجہ ہے جو سبب ہے حیوانات میں ارادہ پیدا ہونے کا اور ترکیب اعضا سے حرکت کے ظہور میں آنے کا اور یہی جسم سیال ہوائی باعث ہے انسان کی زندگی کا اور اسی کو بعضوں نے مطلق روح اور بعضوں نے نسمہ سے تعبیر کیا ہے اور نتیجہ اسکا یہ سمجھا ہے کہ جب ترکیب جسم حیوانی کی اس جسم سیال کے قائم رہنے کے قابل نہیں رہتی تو وہ حالت موت سے تعبیر کی جاتی ہے اور اسکا صریح نتیجہ یہ ہے کہ جسم کے معدوم ہونے یا اسکی حالت قابل قایم رکھنے اس جسم سیال کے معدوم ہونے کے ساتھ وہ جسم سیال بھی معدوم ہو جاتا ہے یعنی وہ روح بھی فنا ہو جاتی ہے۔ مگر ہم کو اسمیں کلام ہے کہ تمام آثار جو ترکیب عناصر سے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ سب یکساں ہوں۔ مثلاً مقناطیس کہ اسمیں بسبب ترکیب عناصر کے لوہے کے جذب کی قدرت پیدا ہوئی ہے تو اب یہ نہیں ہو سکتا کہ کبھی وہ اسکو جذب کرے اور کبھی جذب نہ کرے یا جب ہم نے ایسے عناصر کو یا اجسام مرکبہ عناصر کو آپسمیں ترکیب دیا جو برق کے نتیجے ہیں تو یہ نہیں ہو سکتا کہ کبھی برق نتیجے ہو اور کبھی نہو۔ یا اجسام نباتی جبکہ وہ اپنی ٹھیک حالت میں ہیں ان سے یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ مادہ غذائی کو اپنی جڑوں اور ٹہنوں اور پتوں سے جب چاہیں جذب کریں اور جب چاہیں نکریں۔ غرضکہ جو آثار جس جسم میں بوجہ ترکیب عناصر پیدا ہوتے ہیں وہ آثار اس جسم سے کبھی منفک نہیں ہو سکتے اور اس جسم کے اختیار میں یہ بات نہیں ہوتی کہ جب چاہے اُن آثار کو ظاہر ہونے دے اور جب چاہے ان کو ظاہر نہونے دے۔

اس کا ثبوت زیادہ تر تو اس قسم کے نباتات پر غور کرنے سے بخوبی حاصل ہوتا ہے جن کو جاندار نباتات خیال کیا جاتا ہے۔ ایک درخت جو چھوئی موئی یا لجالو کے نام سے مشہور ہے صرف چھونے ہی سے اُسکے پتے سکڑ جاتے ہیں اور ٹہنی گر پڑتی ہے اور تھوڑی دیر کے بعد پھر پتے بدستور رہ جاتے ہیں اور ٹہنی بھی اصلی حالت پر آجاتی ہے۔ امریکہ میں ایک اور درخت پایا گیا ہے جس کو ذنبہ کہتے ہیں اُسکے پھول کی پنکھڑیوں پر جب مکھی یا کوئی بھنگا آکر بیٹھتا ہے تو پنکھڑیاں بند ہو جاتی ہیں اور اس جانور کو پکڑ لیتی ہیں یہاں تک

کر دہ مرجاتا ہے۔ مگر یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ اُس کے خلاف اُن سے ظاہر ہو۔ بعض پانی کی نباتات ایسی معلوم ہوتی ہین جن پر شبہ حرکت ارادی کا پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک قسم کی نباتات تاگے کے مانند ہے۔ وہ ایک دوسرے سے ملنے کو حرکت کرتی ہے تاکہ ان کے ملنے سے ان کی نسل بڑھے مگر یہ کیفیت صرف قوت جاذبہ سے بھی پیدا ہوتی ہے اسپر حرکت ارادی کا اطلاق نہایت مشتبہ ہے خصوصاً جبکہ وہ پانی پر تیرتی ہین پانی مین پیدا ہونے والی ایک اور نباتات ہے جب وہ اس نباتات سے جس سے پیدا ہوتی ہے علٰحدہ ہوتی ہے تو اور نباتات کے پیدا کرنے پر مستعد اور متحرک رہتی ہے اور جب اسمین سے تو وہ حرکت معدوم ہو جاتی رہتی ہے تو اس مین سے اسی قسم کی نباتات پیدا ہوتی ہے۔ مگر نہایت مشتبہ ہے کہ اس حرکت کو حرکت ارادی سمجھا جائے جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا اجتماع اور ترکیب عناصر سے محرک پیدا ہوتا ہے اور جبکہ وہ جسم پانی پر ہو تو اس کی تحریک اسکو ایک مقام سے دوسرے مقام پر لیجا سکتی ہے مگر اس پر حرکت ارادی کا اطلاق یقینی طور پر نہین ہو سکتا۔

حیوان کے بعض افعال ایسے ہین جو صرف ترکیب عناصر کا نتیجہ نہین ہو سکتے۔ مثلاً ارادہ اور اختیار کہ جس کام کو چاہے کرے اور جس کام کو چاہے نہ کرے۔ اگر کسی کام کے کرنے کا ارادہ صرف عناصر کا نتیجہ ہوتا ہے تو اس کا کرنا طبعی امر ہوتا اور اس لیے اس کا نہ کرنا امر خلاف طبع ہوتا جس کا محال ہونا بدیہی ہے علاوہ اسکے حیوانات مین بہت سے ایسے انکشافات ہین جنکا صرف ترکیب عناصر سے ہونا ناممکن ہے۔ مثلاً حیوانات کی آنکھ کا ترکیب عناصر سے اور ترتیب طبقات سے بننا اور اُس مین اُن چیزون کی صورت کا جو اسکے سامنے ہون شعاع کے سبب منتقش ہونا یقینی امر ہے۔ مگر اُس کا اُن اشیاء کو پہچاننا اور دوست دشمن مین تمیز کرنا صرف ترکیب عناصر سے ناممکن ہے۔

بلاشبہ صانع نے ان کامون کے لیے جدا جدا اعضا بنائے ہین جو عناصر کی ترکیب کیمیاوی سے بنے ہین مگر کوئی دلیل نہین کہ صرف وہی علت تمام ان امور کی ہو۔ غرضکہ یہ سب امور جن کو ہم ایک مختصر لفظ تعقل سے تعبیر کرتے ہین صرف کیمیاوی عناصر کا نتیجہ نہین ہے۔ ہم عناصر مین فرداً فرداً کوئی آثار نہین پاتے جس سے یہ امر ثابت ہو کہ عناصر مین تعقل اور تخیل ہے اور جب ان مین یہ صفت حالت انفراد مین نہین ہے تو حالت ترکیب مین بھی وہ صفت ان سے پیدا نہین ہو سکتی کیونکہ اختیار اور عدم اختیار دو مخالف صفتین ہین اور جو صفت اجزا مین نہین ہے وہ ان کے مرکب مین بھی نہین ہو سکتی۔ جب ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہین کہ بہت سے افعال حیوانات کے ہین جو عناصر معلومہ کی ترکیب کا نتیجہ نہین ہین تو ہم کو ضرور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حیوان مین کوئی ایسی شے ہے جو تعقل کا باعث ہے اور اس نتیجے پر ہم لازمی طور پر یقین کرتے ہین۔ اُسی شے کو ہم روح کہتے ہین۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے؟ مگر اس سوال کا جواب فطرت انسانی سے باہر ہے۔ انسان کی فطرت مقدور ہے کہ وہ اشیاء کے وجود کو ثابت کر سکتا ہے خواہ وہ اشیاء محسوس ہون یا غیر محسوس مگر ان کی حقیقت جاننا اسکی فطرت سے خارج ہے۔ مثلاً پانی۔ انسان یہ ثابت کر سکتا ہے کہ پانی موجود ہے مگر اسکی حقیقت نہین بتا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اسکے اجزا کی اگر اسمین ہون تشریح کر سکتا ہے مگر پھر ان اجزا کی حقیقت نہین بیان کر سکتا۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ پانی مین آکسیجن اور ہیڈروجن ہے جب پوچھو کہ آکسیجن اور ہیڈروجن کیا چیز ہے تو اسکی حقیقت نہین بتا سکتا۔ پس جبکہ انسان ان چیزون کی حقیقت نہین جان سکتا جو اس قدر عام ہین تو اگر وہ روح کی ماہیت بھی باوجود اسکے کہ اسکے وجود کو ثابت کر چکا ہے نہین بیان کر سکتا تو کوئی تعجب کی بات نہین ہے۔ جو چیز ہمارے تجربے سے خارج ہے جیسے کہ روح اسکی نسبت بجز اسکے کہ دلیل یا قیاس سے حسب مقتضائے فطرت کوئی بحث چھیڑین اور کچھ نہین کہہ سکتے مگر جب ہم کو اسکا وجود حیوانات مین ثابت ہوا ہے اور وہ ایسا وجود ہے جس سے تمام افعال جو حیوانی افعال ہین اور اعلیٰ ترین افعال جو

مخصوص بالحیوانات ہین اسی کے سبب سے ہین تو ہم کو تسلیم کرنا پڑتا ہی کہ وہ ضرور ایک شئی لطیف اور جوہر قایم بالذات ہو۔ اسی لیے ہم روح[1] کو ایک جسم لطیف جوہر قایم بالذات تسلیم کرتے ہین کیونکہ ہم کو یہ بات ثابت نہین ہوئی ہی کہ کوئی اور جسم بطور جوہر کے موجود ہو اور روح اسکے ساتھ قایم ہو بلکہ ہم کو صرف روح کا وجود ثابت ہوا ہی جو بغیر کسی دوسرے وجود کے ہی اور اس لیے لازم ہی کہ اسکو جوہر تسلیم کیا جاے نہ کہ عرض۔

مذہب اسلام نے روح کا موجود ہونا بیان کیا مگر اسکی حقیقت بیان نہین کی۔ خداے تعالی کے اس قول کی نسبت کہ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي علمائے دو طریقے سے بیان کیا ہی۔ بعض کی راے ہی کہ حقیقت روح سے بحث کرنا جائز نہین رکھا گیا ہی اور بعض کی یہ راے ہی کہ روح قدیم یا حادث یعنی مخلوق ہونے کی نسبت جو مباحثہ تھا اس کا جواب ہی۔ بہر حال اس سے کوئی مطلب سمجھا جاے مگر جو تفصیل ہم نے اوپر بیان کی ہی اس سے ظاہر ہوتا ہی کہ حقیقت روح کا جاننا بلکہ ہر شی کی حقیقت کا جاننا فطرت انسانی سے خارج ہی۔ قرآن مجید تمام اُن چیزون کے حقیقت کے بیان سے جن کا جاننا فطرت انسانی سے خارج ہی انکار کرتا ہی۔ اسی طرح حقیقت روح کو بھی بیان نہین کیا۔ عام چیزون کی نسبت کثرت استعمال و مشاہدے کے باعث لوگون کا خیال کمتر رجوع ہوتا ہی حالانکہ وہ ان تمام چیزون کی حقیقت کچھ نہین جانتے۔ اگر وہ لوگ جنھون نے روح کی نسبت سوال کیا تھا پانی اور مٹی کی نسبت سوال کرتے تو خداے تعالی یہی فرماتا کہ يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْمَاءِ وَالطِّينِ قُلِ الْمَاءُ وَالطِّينُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي غرضکہ ماہیت اشیا کا جاننا فطرت انسانی سے خارج ہی جب ہم روح کو ایک جوہر تسلیم کر چکے ہین تو اسکے مادی یا غیر مادی ہونے پر بحث پیش آتی ہی۔ مگر جب ہم کو اسکی ماہیت کا جاننا ناممکن ہی تو در حقیقت یہ قرار دینا بھی کہ وہ مادی ہی یا غیر مادی ناممکن ہی۔ دنیا مین بہت سی چیزین موجود ہین جو باوجود اسکے کہ وہ محسوس بھی ہوتی ہین انکے مادی غیر مادی ہونے کی نسبت فیصلہ نہین ہو سکتا۔ مثلاً ہم شیشے کے پہیے کے ذریعے الکٹرسٹی یعنی بجلی پیدا کرتے ہین اور وہ محسوس ہوتی ہی اور ٹھوس اجسام مین سرایت کر جاتی ہی۔ انسان کے بدن سے گذر جاتی ہی۔ بعض ترکیبون سے اسکی تیز [illegible] یا انسان کے بدن مین محسوس ہو جاتی ہی۔ بعض ٹھوس اجسام ایسے ہین جن مین نفوذ نہین کر سکتی مگر اسکی ماہیت کا اور نیز اس بات کا کہ وہ مادی ہی یا غیر مادی تصفیہ نہین ہو سکتا۔ ظن نہین کی دلیلین شبہ سے خالی نہین۔ یہی حال روح کے مادی یا غیر مادی قرار دینے کا ہی۔ لیکن اگر وہ کسی قسم کے مادے کی ہو یا ہم اس کو کسی قسم کی مادی تسلیم کر لین تو کوئی نقصان یا مشکل پیش نہین آتی۔ البتہ اسقدر ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ جن اقسام کے مادون سے ہم واقف ہین اس کا مادہ ان اقسام کے مادون سے نہین ہی کیونکہ ان سے منفرداً یا مجموعاً ان افعال کا صادر ہونا ثابت نہین ہوتا ہی جو افعال روح سے صادر ہوتے ہین۔ فاضل اجل شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ نے جو کچھ روح اور نسمہ کی بابت لکھا ہی اس سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہی کہ اخلاط کی ترکیب سے جو بخار پیدا ہوتی ہی اور جسکو نسمہ کہتے ہین روح اُس سے علحدہ ہی۔ غرضکہ جسقدر غور کیا جاے حیوان مین علاوہ عناصر مرکبہ کے اور جو نتیجہ اس ترکیب سے ہوتا ہی ایک اور شئے بھی پائی جاتی ہی جس سے ارادہ تعقل اور ایجاد اور ترقی مراتب تعقل مین پیدا ہوتا ہی اور ایسی شئی کو ہم روح کہتے ہین۔

(۲)

---

[1] شاہ صاحب نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں اس امر پر زور دیا ہی کہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہی کہ بدن میں ایک لطیف بخار ہی جو اخلاط کے خلاصے سے پیدا ہوتی ہی اسی مین حس حرکت [illegible] حرکت کرنے کی وہ سب قوتین ہوتی ہین جو تدبیر غذا کے متعلق ہین اور [illegible] جس کو طبیب بڑا دخل ہی وہ اس بخار کے غلیظ اور رقیق ہونے صاف اور مکدر ہونے کا بڑا اثر بدنی قوتون اور ان افعال پر جو ان قوتون سے پیدا ہوتے ہین پڑتا ہی مگر اس صنوبری اس بخار کے پیدا ہونے پر جسکو اس انضمام سے تعلق ہی کوئی آفت پہنچتی ہی تو وہ بخار بگڑ جاتی ہی اور [illegible]

انسان اور کل حیوانات مین جو روح ہر وہ جنس واحد سے ہر یعنی ایک ہی سی روح ہر۔ انسان مین بسبب ترکیب اخلاط کے ایک قسم کی روح حیوانی پیدا ہوتی ہر جسکو نسمہ سے تعبیر کیا ہر اور روح حقیقی جو امکن غیبیہ ہر اُس سے متعلق ہوتی ہر اسیطرح تمام حیوانات مین بھی ترکیب اخلاط سے روح حیوانی پیدا ہوتی ہر ہم حیوانات مین بھی تعقل اور ارادہ پاتے ہین پس کوئی وجہ نہین ہے کہ ہم ان مین بھی روح کا ہونا تسلیم نہ کرین اور کوئی دلیل ہمارے پاس ایسی نہین ہر جس سے ہم انسان کی روح کو اور جنس سے اور حیوانات کی روح کو اور جنس سے قرار دے سکین۔ اس لیے ہم انسان مین اور حیوانات مین ایک ہی روح ہونا تسلیم کرتے ہین۔

(۳)

کیون تمام حیوانات سے وہی افعال صادر نہین ہوتے جو انسان سے صادر ہوتے ہین؟ اور کس لیے انسان مکلف ہر اور حیوانات غیر مکلف؟

بقیہ حاشیہ صفحہ (۳۶۸) عضو کے تمام مختل اور پریشان ہوجاتے ہین اس بھاپ کی وجود گی سے زندگی باقی رہتی اور اسکے تحلیل ہوجانے سے بیماری واقع ہوجاتی ہر موادی المنظر مین روح اسی بھاپ کا نام ہر لیکن اگر بنظر دقیق دیکھا جاے تو یہ اس روح کا ادنی طبقہ ہر یہ اس روح کی مثال جس کا ہم ذکر کرتے ہین بدن مین اسیطرح ہر جیسے پھولون مین نمی کوئلہ مین آگ۔ پھر غور کیا جاتا ہر تو معلوم ہوتا ہر کہ یہ روح، روح حقیقی کا مرکب ہر اور روح حقیقی کے بدن سے متعلق ہونے کا مادہ ہر ہم بچہ کو دیکھتے ہین کہ وہ جوان ہوتا ہر بوڑھا ہوتا ہر اسکے بدنی اخلاط مین تبدیلی ہوتی رہتی ہر اور جو روح ان اخلاط سے پیدا ہوتی ہر وہ پہلے کی نسبت بدرجہا بڑھتی جاتی ہر کسی حالت مین وہ لڑکا صغیر سن ہوتا ہر پھر بڑا ہوتا ہے کبھی اس کا رنگ سیاہ ہوتا ہے کبھی گورا۔ کبھی وہ جاہل ہوتا ہے پھر عالم ہوجاتا ہے علاوہ برآن اسکے اوصاف مین ہمیشہ تبدیلی ہوتی رہتی ہر لیکن اس کی ذات مین کوئی تغیر نہین ہوتا۔ وہ وہی رہتا ہے جو پہلے تھا اور اگر ان اوصاف کے تبدیل اور عدم تبدیل مین بحث کی جاے اور ہم ان تبدیلات کو فرضی طور پر تسلیم کرتے ہین تو اُس وقت بھی لڑکا وہی رہے گا۔ جو پہلے تھا یا ہم یہ کہین گے کہ ہم ان صفات کو اپنے حال پر باقی رہنے کا یقین نہین کرتے اور لڑکے کے بجنسہٖ باقی رہنے کا یقین کرتے ہین اس لیے لڑکے کی ذات اُن اوصاف کے علاوہ ہر اب ہم کہتے ہین کہ وہ چیز جس کی وجہ سے وہ لڑکا ویسا ہی رہا یا باقی رہا یہ روح بخاری نہین ہو سکتی اور نہ بدن مین وہ چیزین ہو سکتی ہین جو اس کے شخص ہونے کی باعث ہین اور بظاہر نظر مین دیکھی جاتی ہین بلکہ حقیقی روح ایک جداگانہ چیز ہر۔ وہ ایک نورانی نقطہ ہے۔ ان تمام تغیرات سے جنمین سے بعض جوہر مین بعض عرض اُس کا ڈھنگ نرالا ہے۔ وہ بچہ ہونے کی حالت مین بھی ویسا ہر جیسے بڑے ہونے کی حالت مین۔ جیسے وہ سیہ رنگی کی حالت مین ہے ویسے ہی سپید رنگی کی حالت مین ہے۔ ایسے ہی وہ تمام اضداد کی حالت مین یکسان ہے اس کو ابتداءً روح ہوائی سے تعلق ہو ثانیاً بدن سے۔ اس لیے کہ بدن روح ہوائی سے مرکب ہر وہ عالم قدس کا ایک روزن ہے۔ جب روح ہوائی مین قابلیت اور استعداد پیدا ہوجاتی ہر تو اُس روح سماوی کا اس پر نزول ہوتا ہر۔ جن امورات مین کہ پیدا ہوتا ہر وہ زمین کی مختصہ استعدادون کے وجہ سے ہر جیسے کہ دھوپ کپڑے کو سفید کر دیتی ہے اور دھوبی کو سیاہ ہم کو دھوان صحیح سے معلوم ہوگیا ہر کہ موت روح حیوانی کا بدن سے جدا ہونے کا نام ہر موت روح ہوائی سے روح قدسی کے جدا ہونے کا نام نہین جب بضعف امراض سے روح ہوائی تحلیل ہوجاتی ہر تو یہ حکمت الٰہی کا مقتضی ہر کہ روح ہوائی اس قدر باقی رہجاے کہ روح کا تعلق اس سے رہ سکے جیسے کہ ہم ہوا کو چوس لیتے ہین حتی الامکان اس مین تخلل پیدا ہوجاتا ہر پھر ہم اُس کے بعد ہوا نکال نہین سکتے۔ یہانتک کہ اخیر مین شیشہ ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ صرف اس مادہ کی وجہ سے ہر جو خدا نے ہوا کی طبیعت اور سرشت مین رکھا ہر۔ ایسے ہی روح ہوائی ایک راز ہر اندازہ ہے کہ اس سے تمادی نہین ہو سکتا۔ انتہی۔

ماخوذ از ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ۔

جبکہ ہم نے روح کو سبب تعقل وارادہ تسلیم کر لیا ہو تو اس سے ضرور لازم آتا ہے کہ روح فی نفسہٖ مدرک و ذی ارادہ و مصدر افعال ہے۔ مگر یہ بات ثابت نہیں ہوئی کہ جب وہ نسمہ سے مجرد ہو اور نسمہ جسم سے مجرد ہو تب بھی اُس سے افعال صادر ہوتے ہیں۔ مثلاً ہم کسی درخت کے تخم کو خیال کریں کہ اس میں بلا شبہ شاخوں اور پتوں اور پھولوں کا مادہ موجود ہے مگر حالت موجودہ میں اس سے کوئی چیز حاصل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح روح میں تعقل وارادہ موجود ہے لیکن جبتک کہ اسکا تعلق نسمہ سے اور نسمہ کا تعلق بدن سے نہو اس سے وہ افعال صادر نہیں ہو سکتے۔ صدور افعال کے لیے جسم کی ضرورت ہے پس اُس جسم کی جس قسم کی بناوٹ ہوگی اسی قسم کے افعال اس سے صادر ہوں گے۔ اسکی مثال بعینہٖ ایسی ہے جیسے بھاپ اور دُخانی کل کی۔ دُخانی کل کے تمام پرزوں کو حرکت دینے والی صرف ایک چیز ہے یعنی بھاپ مگر جس قسم کے پرزے بنائے گئے ہیں اسی قسم کے افعال ان سے صادر ہوتے ہیں۔ اسیطرح گو انسان اور حیوان میں ایک ہی جنس کی روح ہے مگر ہر ایک سے بمقتضائے اُسکی صورت نوعیہ کے افعال صادر ہوتے ہیں۔ انسان کے اعضاء کی بناوٹ میں بھی ایک دوسرے سے کچھ فرق ہے اور یہی سبب ہے کہ بعض انسانوں سے ایسے افعال صادر ہوتے ہیں جو دوسرے سے ناممکن ہیں۔ ایک کی آواز نہایت دلکش ہے دوسرے کی نہایت معیب ہے وہ اپنی آواز کو معیب کر سکتا ہے نہ یہ اپنی آواز کو دلکش بنا سکتا ہے۔ ایک کے دماغ کی بناوٹ علوم دقیقہ کے ایجاد کرنیکے لائق ہے دوسرے کے دماغ کی بناوٹ عام باتوں کے سمجھنے کے بھی قابل نہیں۔ پس روح افعال بطابق بناوٹ اُس جسم کے صادر ہوتے ہیں جس سے وہ متعلق ہے اور یہی سبب ہے کہ جو کچھ انسان کر سکتا ہے وہ حیوان نہیں کر سکتے۔ بلکہ بہت سے امور ایسے ہیں کہ ایک انسان کر سکتا ہے دوسرا انسان نہیں کر سکتا۔ اور جو حیوان کر سکتا ہے وہ انسان نہیں کر سکتا۔ یہ تفاوت ان آلات کا ہے جن کے وسیلے سے روح کے افعال صادر ہوتے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ حیوانات کی بناوٹ اس قسم کی ہے کہ اس سے نہایت محدود افعال صادر ہو سکتے ہیں اور وہ بھی اکثر ایسے ہیں جو اُنکی زندگی کے لئے ضروری ہیں اور ہر نوع کے ایک ہی قسم کے افعال ہوتے ہیں اور تقریباً وہ سب افعال ایسے ہوتے ہیں کہ بلا تعلیم و اکتساب اُن کو حاصل ہو جاتے ہیں۔ ان سے کوئی ایسے افعال صادر نہیں ہو سکتے جس سے روح کی ترقی و تنزل کو کچھ تعلق ہو۔ اُن سے روح کو اکتساب سعادت یا شقاوت حاصل ہو اور اسی سبب سے وہ مکلف نہیں ہیں۔ برخلاف انسان کے کہ اُس کی بناوٹ ایسی ہے جس سے افعال غیر محدود صادر ہو سکتے ہیں۔ ان میں ترقی ہو سکتی ہے اور ان میں تنزل آجاتا ہے۔ ایک انسان سے کسی قسم کے افعال صادر ہوتے ہیں وہ علوم عقلیہ اور الٰہیہ کا اکتشاف کر سکتا ہے اُسکے اور ایجادات اور علمی اکتشافات کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس سے ایسے افعال صادر ہوتے ہیں جو روح کے لیے باعث اکتساب سعادت یا شقاوت ہوتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ وہ مکلف ہے۔

(باقی آئندہ)

حکیم سید شاہ ولی الدین چشتی

(معاد)

(۴۰)

کیا روح اکتساب سعادت و شقاوت کرتی ہی؟ یہ مسئلہ بلا شبہ نہایت دقیق ہی۔ اس کے ثبوت کے لیے اگرچہ عینی دلیل کا ہونا قانون قدرت کے خلاف ہی مگر ایسے قیاسی دلائل موجود ہین جو اس بات پر یقین دلا سکتے ہین کہ روح سعادت یا شقاوت کا اکتساب کرتی ہے۔ یہ امر تسلیم ہو چکا ہی کہ تعقل اور ارادہ روح کا خاصہ ہی۔ اب ہم دیکھتے ہین کہ انسان ان چیزون کو کتساب کرتا ہی جو اُسمین پہلے نہ تھین۔ وہ جاہل ہوتا ہی پھر علوم کا اکتساب کر کے عالم ہو جاتا ہی۔ وہ خالق اشیا کو جہان تک اُن کا جاننا قانون قدرت کی رو سے ممکن ہی نہین جانتا ہی پھر تجربہ اور تحقیقات سے اُن کا اکتساب کر لیتا ہی۔ جب وہ پیدا ہوا تھا اُس کے خیالات بالکل ساد ے حیوان کی مانند تھے رفتہ رفتہ وہ مختلف باتون کو اکتساب کرتا جاتا ہی جس سوسائٹی مین پرورش پاتا ہی اُسکی تمام عادی و غیر عادی عادتین اور خیالات کو اکتساب کر لیتا ہی۔ بعض دفعہ انسان نہایت نجس اور ناپاک میلے کچیلے سور کی طرح زندگی کے دن کاٹتا ہی اور کبھی نہایت صفائی ستھرائی اور رکھ رکھاؤ سے زندگی بسر کرتا ہی۔ یہ بھی دیکھتے ہین کہ کبھی وہ نہایت سفاکی اور بے رحمی کا خوگر ہو کر مردم آزاری کرتا ہی تمام قوائے بہیمیہ پر ایسا غلبہ کر لیتے ہین کہ وہ ایک حیوان درندہ بصورت انسان نظر آتا ہی۔ کبھی اُسمین ایسی صلاحیت اور نیکی اور رحم و تواضع بردباری اور سب کے ساتھ محبت و ہمدردی پیدا ہوتی ہی کہ ایک فرشتہ بصورت انسان دکھائی دیتا ہی۔ ان تمام فضائل و رذائل کو وہی شے اکتساب کرتی ہی جس کا خاصہ تعقل و ارادہ ہی یعنی ”روح“ کیونکہ انسان کا جسم اور تمام اعضا اندرونی تو برابر تبدیل ہوتے رہتے ہین۔ اس لیے یہ نہین کہا جا سکتا کہ وہ تعقل و ارادہ ان اعضا کا خاصہ تھا۔ یہ ایسی واضح دلیل ہی جس سے ثابت ہوتا ہی کہ روح سعادت و شقاوت کا اکتساب کرتی ہی اور اُسکی حالت بمناسبت اُسکے جس کا اُس نے اکتساب کیا ہی تبدیل ہو جاتی ہی۔

(۵۱)

انسان کے لیے بیشک موت ہی۔ پس حقیقت موت کی کیا ہی؟ روح کے لیے بعد مفارقت بدن بقا ہی۔ امید ہی کہ ہم اور معزز ناظرین ایک دن اسکی اصلی حقیقت سے واقف ہون گے۔ مگر اس زندگی مین جسقدر موت کا حال معلوم ہو سکتا ہی وہ یہ ہی کہ اخلاط کا تغیر یا کسی ایسے عضو مین نقصان پہنچنے کے سبب سے جس سے اُن بخارات کی تولید یا بقا کو زیادہ تعلق ہی جو ترکیب اخلاط سے پیدا ہوتے ہین اور جنکو نسمہ سے تعبیر کیا جاتا ہی ان کی تولید موقوف ہو جاتی ہی اور بعض اعضا مضمحل ہو جاتے ہین۔ اس وقت انسان یا حیوان مر جاتا ہی اور روح جسکو جسم سے تعلق اسی نسمہ کے سبب سے تھا جسم سے علٰحدہ ہو جاتی ہی۔ مگر غور طلب بات یہ ہی کہ جب تک روح کی نسمہ سے مصاحبت رہتی ہی اس سے کچھ تاثر روح مین ہوتا ہی یا نہین اور اگر ہوتا ہی تو بعد مفارقت جسم وہ تاثر اس مین باقی رہتا ہی یا نہین۔ ہم دنیا مین دیکھتے ہین کہ تمام اجسام لطیف جب آپس مین ملتے ہین تو ایک اور قسم کا جسم حاصل کر لیتے ہین۔ اگر کیمیاوی ترکیب پر خیال کیا جائے تو تمام سخت سے سخت اور ثقیل سے ثقیل اجسام کی ترکیب صرف اجسام لطیف ہوائی سے ہی جن کو علم کیمیا مین گیس یا بخارات سے تعبیر کیا جاتا ہی۔ پھر کوئی وجہ نہین پائی جاتی کہ روح پر نسمہ کے ساتھ ملنے سے اثر نہوا اور اُس نے کوئی جسم جدا اُسکے پہلے جسم سے کسی امر مین مختلف ہو حاصل نہ کیا ہو۔ تسلیم کرنے کے بعد کوئی وجہ نہین پائی جاتی کہ بدن سے مفارقت کرنے کے بعد پھر فی الفور روح کا وہ جسم بھی جو اُس نے نسمہ کی مصاحبت سے حاصل کیا تھا تحلیل ہو جائے۔ نتیجہ اس تقریر کا یہ ہی کہ روح نسمہ کی مصاحبت سے ایک اور جسم لطیف حاصل کرتی ہی اور وہ جسم روح اور نسمہ سے ترکیب پایا ہوا ہوتا ہی اور بدن سے مفارقت کرنے کے بعد بھی

وہ جسم علی حالہ باقی رہتا ہو گو بعد کو روح کا کسی وقت نسمہ سے علیحدہ ہو جانا بھی ممکن ہو کیونکہ جن اسباب سے وہ جسم لطیف آپس مین ملکر ایک نیا جسم پیدا کیے تھے مین وہ دیگر اسباب سے تحلیل بھی ہو جاتے مین یعنی ایک دوسرے سے علیحدہ بھی ہو جاتے مین پس یہی حال روح و نسمہ کا ہوتا ہو ہوا مین پھولون کے اجزاے لطیف ملنے سے تمام ہوا مین ایک قسم کی لطیف خوشبو پیدا ہو جاتی ہو اور غلیظ چیزون کے اجزا و اُن مین ملنے سے ایک قسم کی خراب بو پھیلتی ہو اور پھر وہ اجزا و تحلیل ہو جاتے مین اور علی حالہ ہوا صاف رہجاتی ہو۔ اسی طرح وہ اجسام جو ترکیب کیمیاوی سے مرکب مین دیگر اسباب و تاثرات سے تحلیل ہو جاتے مین پس روح و نسمہ مین ترکیب کیمیاوی ہو یا غیر کیمیائی اُس کا تحلیل ہونا ممکن ہو جب روح کو ایک جسم لطیف جوہر مستقل بالذات تسلیم کیا جائے تو اُس کا فنا ہونا محالات سے ہو۔ تمام چیزین جو دنیا مین موجود مین کوئی بھی ان مین سے معدوم نہین ہوتی صرف تبدیل صورت ہوتی ہو پانی آگ سے یا دھوپ کی تیزی سے خشک ہو جاتا ہو مگر معدوم نہین ہوتا صرف صورت تبدیل ہوتی ہو۔ آکسیجن اور ہیڈروجن علحدہ علحدہ ہو جاتی ہین۔ آکسیجن آکسیجن مین اور ہیڈروجن ہیڈروجن مین ملجاتی ہین ایک ذرہ بھی کوئی چیز معدوم نہین ہوتی پس روح کے معدوم ہونے کی کوئی وجہ نہین ہو۔ نہایت مافی الباب یہ ہو کہ جب تمام اشیاء موجودہ مین تبدیل صورت ہوتی رہتی ہو تو روح مین بھی تبدیل صورت ہوتی ہوگی۔ اسکے استنباط پر ہمارے پاس کوئی دلیل نہین ہو مگر اسکے تسلیم کرنے سے کوئی خلل مذہب اسلام مین پیش نہین آتی غرضکہ روح کے وجود کو تسلیم کرنے کے ساتھ ہی اسکے بقا کا تسلیم کرنا بھی لازمی ہو۔

(۹)

اگر ہم روح کے بقا کو تسلیم کرین تو پھر حقیقت بعث و حشر و نشر کی کیا ہو؟ میرے خیال مین جب روح نسمہ سے مل جاتی ہو تو خود ایک جسم پیدا کر لیتی ہو اور جب انسان مرتا ہو اور روح اُس سے علیحدہ ہوتی ہو تو خود ایک جسم رکھتی ہو جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہو پس حشر مین کوئی نئی زندگی نہین ہو بلکہ پہلی ہی زندگی کا تتمہ ہو۔ شاہ ولی اللہ صاحب کا بھی یہی قول ہو جیسا کہ اُنھون نے حجۃ اللہ البالغہ مین کہا ہو کہ جسمون کا اُٹھنا اور روحون کا اُن مین پھر آنا یہ کوئی نئی زندگی نہین ہو بلکہ اُسی پہلی زندگی کا تتمہ ہو۔ مگر اُس جسم کی نسبت جو دنیا مین قبل الموت تھا اسکے دوبارہ اُٹھنے اور اس مین روح آنے کے شاہ ولی اللہ صاحب بھی قائل نہین مین اور صاحب تفسیر کبیر نے سورۂ قیامہ کی تفسیر مین جو تقریر لکھی ہو اس سے بھی اُسکی تائید ہوتی ہو۔

جو اعتراض کیا جاتا ہو کہ انسان تو یہی موجودہ بدن ہو پھر جب انسان مرگیا تو بدن کے اجزا متفرق ہو گئے اور مٹی مٹی مین مل کر مشرق سے مغرب تک اور مغرب سے مشرق تک پھیل گئی اب اُن اجزا کا دوسری مٹی کے اجزا سے ممتاز ہونا ناممکن ہو تو قیامت بھی ناممکن ہوگی تو یہ اعتراض دو طور سے مندفع ہوتا ہو (۱) ہمکو یہ تسلیم نہین ہو کہ انسان اس بدن کا نام ہو بلکہ ہو کہ وہ ایک ایسی چیز ہو جو اُس بدن کی مدبر ہو اور جب بدن خراب ہو جائے تو وہ اپنی حالت پر زندہ رہے (۲) خدا کو اس بات پر قدرت ہو کہ اُس کو کوئی اور بدن عطا کرے چنانچہ اس آیہ مین بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہو کیونکہ خدا نے پہلے تو نفس لوامہ کی قسم کھائی پھر فرمایا کہ کیا انسان یہ خیال کرتا ہو کہ ہم اُسکی ہڈیان نہ اکٹھی کرین گے۔ اُس سے صاف پیدا ہوتا ہو کہ نفس اور بدن دو چیزین مین۔

قرآن مجید سے بھی موجودہ جسم کا دوبارہ اُٹھنا نہین پایا جاتا بلکہ ایک اور ہی جسم ثابت ہوتا ہو مثلاً[۱] نَحْنُ خَلَقْنَاكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُونَ أَفَرَأَيْتُم مَّا تُمْنُونَ أَأَنتُمْ تَخْلُقُونَهُ أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ عَلَىٰ أَن نُّبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ وَنُنشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ

۱؎ ترجمہ ہمنے تم کو پیدا کیا پھر کیون نہین تم مانتے پھر کیا تم دیکھتے ہو کہ جو کچھ

آیۃ ۷۵ سورۂ واقعہ۔

اس آیت میں لفظ امثال کا جمع ہو لفظ مثل بفتح المیم والثاء کی اور تمام آیات ماسبق و مالحق سے جو اس سورۃ میں ہیں صاف ظاہر ہو کہ حالات حشر انھیں مذکور ہیں۔ خدائے تعالی فرماتا ہو کہ ہم نے موت کو تم میں مقدر کیا اور ہم اسبات سے عاجز نہیں ہیں کہ جو اس زندگی میں تمھارے اوصاف ہیں ان کو بدل دیں اور ایسے اوصاف پیدا کریں جنکو تم نہیں جانتے۔ لفظ پیدا کرنے سے صاف پایا جاتا ہو کہ موجودہ اوصاف کے معدوم ہونے کے بعد پیدا کرنا مراد ہو۔ جو لوگ روح کے قائل نہیں تھے وہی حیات بعد الموت کے بھی قائل نہ تھے اور وہی لوگ ان آیتوں میں مخاطب ہیں۔ اسی بدن کو جو انسان اس دنیا میں رکھتا ہو انسان کے اوصاف سمجھتے تھے طویل القامت بادی البشرۃ عریض الاظفار ماشی علی قدمیہ وغیر ذالک۔ اب خدا تعالی نے فرمایا ہو کہ ان اوصاف یعنی اس جسم کے فنا ہونے کے بعد ہم اسبات سے عاجز نہیں ہیں کہ ان اوصاف کو بدل کر تم کو اور اوصاف یعنی دوسری قسم کے جسم میں جسکو تم نہیں جانتے پیدا کریں۔ پس یہ آیت صاف دلیل اسبات کی ہو کہ حیات بعد الموت میں روح کے لیے جو جسم دنیا میں ہو نہ ہوگا بلکہ ایک اور قسم کا جسم ہوگا۔

اب ہم قرآن مجید کی اور آیتوں کو جو اس مضمون سے زیادہ تعلق رکھتی ہیں اس مقام پر لکھتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ جب بامعان نظر دیکھی جائے اور منکرین روح کے عقائد کو بھی مدنظر رکھا جائے تو ان میں اس جسم کا جو دنیا میں ہو دوبارہ اٹھنا ثابت نہیں ہوتا۔ ؏ وَاللّٰهُ أَنْبَتَكُمْ مِّنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا ثُمَّ يُعِيدُكُمْ فِيهَا وَيُخْرِجُكُمْ إِخْرَاجًا (سورۂ نوح آیات ۱۶ و ۱۷)

؏ هُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ حَتَّىٰ إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ كَذَٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (سورۂ اعراف آیت ۵۵)

؏ وَاللّٰهُ الَّذِي أَرْسَلَ الرِّيَاحَ فَتُثِيرُ سَحَابًا فَسُقْنَاهُ إِلَىٰ بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَحْيَيْنَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا كَذَٰلِكَ النُّشُورُ (سورۂ ملائکہ آیت ۱۰)

پہلی آیت میں ظاہر ہو کہ انسان زمین سے مثل نباتات کے نہیں اُگا اور نہ مثل نباتات کے دوبارہ زمین سے نکلے گا۔ پس اس آیت میں تشبیہ صرف معدوم ہونے کے بعد پھر پیدا ہونے کی ہو نہ اسبات کی کہ انسان بعد مرنے کے مثل نباتات کے پھر زمین سے نکلیں گے۔ دوسری آیت میں بھی صرف بعد معدوم ہونے کے پھر موجود ہونے کا بیان ہو اس سے زیادہ اور کسی چیز کا بیان نہیں ہو۔ پھر تیسری آیت میں "نخرج" کا لفظ استعمال نہیں ہوا بلکہ نشر کا لفظ استعمال ہوا ہو اور اس لفظ کے معنی قاموس میں احیا المیت کے ہیں جس سے صاف ظاہر ہوتا ہو کہ صرف مردوں کے پھر موجود ہونے کی تشبیہ ہو نہ اس جسم کے قبروں سے نکلنے کی جو دنیا میں موجود تھا۔ ؏ مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ (سورۂ طٰہٰ آیت ۵۷)

انسانوں کو خدا نے زمین سے نہیں پیدا کیا ماں کے پیٹ سے پیدا کیا ہو پس اُسکا زمین سے پیدا کرنا مجازاً بادنیٰ ملابست بولا گیا ہو اسی طرح اُسکے مقابلہ میں زمین سے دوسری دفعہ نکلنا بھی مجازاً بادنیٰ ملابست بولا ہو پس اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہی جسم جو دنیا میں موجود تھا پھر دوبارہ

بقیہ حاشیہ صفحہ (۳۷۹) بھلا تم دیکھو تو جو تم منی ڈالتے ہو کیا تم اُس کو پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرنے والے ہیں۔ ہم نے مقدر کی ہو تم میں موت اور ہم اسبات سے پیچھے نہیں رہنے کے یعنی عاجز نہیں ہیں کہ ہم بدل دیویں اوصاف تمہارے اور ہم تمکو پیدا کریں اس صفت میں جسکو تم نہیں جانتے۔ انتہی (آیات ۷۰ سورۂ واقعہ)

؏ ترجمہ اور خدا نے اُگایا تمکو زمین سے ایک قسم کا اُگانا پھر تمکو پھیر کر لیجاویگا اُسمیں اور نکالے گا تمکو ایک طرح کا نکالنا (۱۲ سورۂ نوح آیات ۱۶ و ۱۷)

؏ ترجمہ وہ ہو جو بھیجتا ہو ہواؤں کو خوشخبری دینے والیاں اپنی رحمت کے آگے۔ یہاں تک کہ جب اُٹھاتی ہیں بوجھل بادل کو تو ہم اُنکو ہانک لیجاتے ہیں مرے ہوئے شہر کو

زمین سے نکلے گا۔

وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيبٍ يَوْمَ يَسْمَعُونَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوجِ إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَإِلَيْنَا الْمَصِيرُ يَوْمَ تَشَقَّقُ الْأَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيرٌ (سورۃ ق آیات ۴۰ و ۴۴)

اس یوم تشقق الارض سے یوم قیامت مراد ہے نتیجہ یہ ہے کہ قیامت کے دن سب روحیں اکٹھی ہوں گی۔ اس آیت کو ان اجسام سے جو دنیا میں تھے دوبارہ اٹھنے سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے۔

يَقُولُونَ أَإِنَّا لَمَرْدُودُونَ فِي الْحَافِرَةِ أَإِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً قَالُوا تِلْكَ إِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ فَإِذَا هُم بِالسَّاهِرَةِ (سورۃ النازعات آیات ۱۰ و ۱۴)

منکرین حشر کے یہ الفاظ "أَإِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً" اس آیت میں اور مثل اس کے اور آیتوں میں آئے ہیں جیسے "أَإِذَا كُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا" اور "مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ" اور "أَإِذَا كُنَّا عِظَامًا وَرُفَاتًا" أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ" اسی خیال پر مبنی ہیں کہ وہ انسان کو بجز اس جسم موجودہ کے اور کچھ نہیں جانتے تھے یعنی روح کے وجود کے قائل نہ تھے اور اسی سبب سے وہ تعجب کرتے تھے کہ اس جسم کے گل جانے اور معدوم ہو جانے کے بعد وہ پھر کیونکر اٹھے گا اور اسی استبعاد کے سبب وہ اس قسم کے شبہات کرتے تھے۔ روح کی حقیقت وہ نہیں سمجھ سکتے تھے بلکہ اس کی ماہیت مثل دیگر اشیاء کی ماہیت کے انسان کی سمجھ سے خارج تھی۔ اور خدا تعالیٰ طرح طرح سے ان کے استبعاد کو دور کرتا تھا اور حشر کے ہونے پر یقین دلاتا تھا کبھی تمثیل میں اور کبھی اپنے قادر مطلق ہونے میں۔ پس ان الفاظ سے جو منکرین روح استبعاد رکھتے تھے اور ان کے جواب تمثیلی یا اس کے مقابلے میں اظہار قدرت کرنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس جسم کا جو دنیا میں رکھتے تھے اور جس کا گل جانا اور معدوم ہو جانا کہتے تھے اسی جسم کو خدا تعالیٰ پھر اٹھائے گا۔ سورۃ مومن سورۃ صافات اور سورۃ واقعہ میں بالفاظ متحدہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ وہ کہتے تھے أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ۔

بقیہ حاشیہ صفحہ (۳۷۹) پھر اس سے برساتے ہیں پانی پھر ہم اس سے نکالتے ہیں ہر طرح کے میوے اسی طرح ہم نکالیں گے مردوں کو ۱۲۔

ترجمہ۔ اور اللہ وہ ہے جس نے بھیجا ہواؤں کو پھر اٹھاتی ہیں بادلوں کو پھر ہم اس کو ہانک لے جاتے ہیں مرے ہوئے شہر کی طرف پھر اس سے زندہ کرتے ہیں زمین کو اس کے مر جانے کے بعد اسی طرح مردوں کا زندہ ہونا ہے۔ (سورۂ ملائکہ آیت ۱۰) ۱۲

ترجمہ۔ ہم نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور اسی میں پھر لیجاویں گے اور اسی سے تم کو دوسری دفعہ نکالیں گے ۱۲ (سورۂ طٰہٰ آیت ۵۷)

ترجمہ۔ اور سن اے انسان پکارے گا پکارنے والا پاس کے مقام سے۔ ایک دن سنیں گے زور کی آواز۔ یہ ہی دن نکلنے کا (یعنی اپنی اپنی جگہوں سے ارواح کے نکلنے کا معہ ان کے اجسام کے جو مفارقت بدن کے وقت ان کو حاصل ہوئے تھے اور ایک جگہ جمع ہونے کا نہ یہ کہ ان اجسام کا جو دنیا میں موجود تھے دوبارہ پیدا ہو کر نکلنے کا) ترجمہ بیشک ہم زندہ کرتے ہیں اور ہم مارڈالتے ہیں اور ہماری طرف پھر آنا ہے جلدی کرتے ہوئے جس دن کہ پھٹ جاوے گی ان سے زمین پھر اکٹھا کرنا ہم پر آسان ہے۔ (سورۂ ق آیات ۴۰ و ۴۴)

ترجمہ۔ کہتے ہیں کہ کیا ہم الٹے پاؤں پھر جائیں گے اُلٹے قدموں کیا جب ہوں گے ہم ہڈیاں گلی ہوئی کہتے ہیں کہ یہ (لوٹنا) اس وقت پھر آنا ہے نقصان کا اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ ایک سخت آواز ہے پھر یکایک وہ ایک میدان میں ہوں گے جس میں نیند نہ آئی ہو (سورۂ النازعات آیت ۱۰ و ۱۴)۔

ترجمہ۔ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم مر جاویں گے اور ہو جاویں گے مٹی اور ہڈیاں کیا ہم اٹھائے جاویں گے۔

سلہ وَكَانُوا يَقُولُونَ أَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ
أَوَآبَاؤُنَا الْأَوَّلُونَ ‎قُلْ إِنَّ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ لَمَجْمُوعُونَ
إِلَىٰ مِيقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ (سورۂ واقعہ آیت ۴۶ و ۵۰)

اُس آئت میں سوال تھا کہ کیا ہم اور ہمارے باپ دادا اُٹھائے جائینگے؟ اس کا جواب یہ ملا کہ بیشک، اکٹھے کیے جائیں گے۔ اُس سے صاف ظاہر ہو کہ جہاں جہاں قرآن مجید میں بعث کا لفظ آیا ہو اُس سے جمع کرنا مراد ہو نہ اس جسم کو جو ہم دنیا میں رکھتے ہیں بعد معدوم ہو جانے کے پھر پُتلا بنا کر اُٹھانا۔ بعث کا اطلاق لشکر پر اُن معنوں میں آتا ہو جبکہ اُن کو ایک جگہ جمع ہونے کا حکم دیا جاتا ہو۔ اس آئت میں خود خدائے تعالیٰ نے بعث کے معنوں کی تشریح کر دی ہو اور اس لیے اسکے کوئی دوسرے معنی نہیں لیے جا سکتے

سلہ وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ
وَأَنبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ‎ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّهُ
يُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَأَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ‎وَأَنَّ
السَّاعَةَ آتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا وَأَنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ مَن فِي
الْقُبُورِ (سورۂ حج آیات ۵ و ۶ و ۷)

سلہ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَإِذَا هُم مِّنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ
يَنسِلُونَ ‎قَالُوا يَا وَيْلَنَا مَن بَعَثَنَا مِن مَّرْقَدِنَا ۜ
هَٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمَٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُونَ
إِن كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً فَإِذَا هُمْ جَمِيعٌ لَّدَيْنَا
مُحْضَرُونَ (سورۂ یٰسین آیات ۵۱ و ۵۳)

اگرچہ ان آیات میں خدائے تعالیٰ نے ان لوگوں کا قبروں میں سے اُٹھنا اُنکو جو بعث کے سبب نہ یقین کرنے روح کے منکر محض تھے زیادہ تر یقین دلانے کو من فی القبور اور من الاجداث کے بیان فرمایا ہو یعنی جن کو تم قبروں میں گڑا ہوا اور رگا ہوا خاک میں ملا سمجھتے ہو وہی قبروں میں سے اُٹھیں گے، مگر درحقیقت مقصود اور موضوع کلام پاک کا یہ نہیں ہو کہ وہ کہاں سے اُٹھیں گے، کیونکہ بہت سے ایسے ہیں جو قبروں میں نہیں ہیں آگ میں جلائے گئے ہیں، جانور کھا گئے ہیں، بلکہ مقصود مردوں کا یعنی جنکو ہم مرا ہوا سمجھتے ہیں اور جن پر مُردے کا اطلاق ہوتا ہو قیامت میں اُن کا موجود ہونا ہو لیکن اگر ہم کچھ غور کریں اور یہی سمجھیں کہ جو لوگ قبروں میں دفن ہوے ہیں وہی اُٹھیں گے تو بھی ان آیات سے یہ بات کہ اُن کا یہی جسم ہوگا جو دنیا میں رکھتے تھے کسی طرح سے پایا نہیں جاتا قرآن مجید میں دو اور عجیب آئتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہو کہ قیامت کے دن نہ کسی معدوم جسم کا دوبارہ پُتلا بنا کر اُٹھایا جائے گا، نہ کوئی جدید جسم اُن کو دیا جائے گا بلکہ وہی جسم ہوگا جو روح و نسمہ کے اختلاط سے روح نے حاصل کیا تھا اور بعد مفارقت بدن روح نے مع اُس جسم کے مفارقت کی تھی، پس جیسا کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے فرمایا کہ نشاۃ آخرت تکملہ

سلہ ترجمہ — اور وہ کہتے تھے کہ کیا ہم مر جاویں گے اور ہم ہو جائیں گے مٹی اور ہڈیاں کیا ہم اُٹھائے جائیں گے کیا ہمارے باپ دادا بھی (اُٹھائے جائیں گے) کہدے کہ بیشک اگلے اور پچھلے ضرور اکٹھے کئے جاویں گے وقت دن معین میں۔ (سورۂ واقعہ آیات ۴۶ و ۵۰)

سلہ ترجمہ — اور تو دیکھتا ہو کہ زمین خشک ہو گئی پھر جب ہم برساتے ہیں اُس پر پانی تو پھولتی ہے اور بڑھتی ہے اور اُگاتی ہو ہر قسم کی خوش آیند چیزیں۔ یہ اس لیے ہے کہ اللہ وہی برحق ہے اور یہ کہ وہی زندہ کرتا ہو مردوں کو اور یہ کہ وہ ہر شے پر قادر ہے اور یہ کہ قیامت آنے والی ہے اس میں کچھ شک نہیں اور یہ کہ اللہ اُٹھا دے گا اُن کو جو قبروں میں ہیں (سورۂ حج آیات ۵ و ۶ و ۷)

سلہ ترجمہ — اور پھونکا جائے گا صور پس یکایک وہ قبروں میں سے اپنے پروردگار کے پاس دوڑیں گے کہیں گے ہائے خرابی کس نے اٹھایا ہم کو ہمارے مرقد سے یہ وہ ہو جس کا وعدہ کیا تھا خدا نے اور سچ کہا تھا پیغمبروں نے یہ نہیں تھا مگر ایک آواز پھر دفعتًا وہ سب ہمارے پاس حاضر ہونے والے ہیں۔ (سورۂ یٰسین آیات ۵۱ و ۵۳)

یعنی حیات کا ہوگا - یعنی جدید بالکل ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔

[۱] وَقَالُوا أَئِذَا كُنَّا عِظَامًا وَرُفَاتًا أَئِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا قُلْ كُونُوا حِجَارَةً أَوْ حَدِيدًا أَوْ خَلْقًا مِمَّا يَكْبُرُ فِي صُدُورِكُمْ فَسَيَقُولُونَ مَنْ يُعِيدُنَا قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ فَسَيُنْغِضُونَ إِلَيْكَ رُءُوسَهُمْ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هُوَ قُلْ عَسَىٰ أَنْ يَكُونَ قَرِيبًا (سورہ الاسریٰ آیات ۵۲ و ۵۳)

[۲] وَقَالُوا أَئِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ أَئِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ بَلْ هُمْ بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ كَافِرُونَ قُلْ يَتَوَفَّاكُمْ مَلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ (سورہ سجدہ آیات ۹ و ۱۰)

مندرجہ بالا دونوں آیتوں میں باوجودیکہ سوال خلق جدید سے تھا مگر خدا تعالیٰ نے اس کو قابل جواب نہیں سمجھا کیونکہ خود سوال ہی باطل تھا کہ خلق جدید خلق سابق کے اعمال کی جزا و سزا کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ ایک جگہ تو یہ فرمایا کہ تم کو پھر وہی حشر میں لائے گا جس نے تم کو اول مرتبہ پیدا کیا تھا اور لانے کی کچھ تفصیل نہیں بتلائی اور دوسری آیت میں یہ فرمایا کہ ان کی یہ باتیں اس بنا پر ہیں کہ پروردگار کے پاس جاؤ گے منکر ان سے بھی اس جسم کا جو دنیا میں ہے دوبارہ گلا بنکر اٹھنا ثابت نہیں ہوتا۔

[۳] وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ (سورہ یٰسین آیات ۵۸ و ۵۹)

[۴] أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَلَّنْ نَجْمَعَ عِظَامَهُ بَلَىٰ قَادِرِينَ عَلَىٰ أَنْ نُسَوِّيَ بَنَانَهُ (سورہ قیامہ آیات ۳ و ۴)

[۵] قُلِ اللَّهُ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ (سورہ جاثیہ آیت ۲۵)

ان تین آیتوں میں سے پہلی دو آیتیں ایسی ہیں جن پر متکلمین نافین نفس ناطقہ استدلال کر سکتے ہیں جیسا کہ شرح مواقف میں مذہب اول بیان کیا گیا ہے اور کہہ سکتے ہیں کہ جب انھیں گلی ہوئی ہڈیوں کے زندہ کرنے کا بیان ہوا ہے اور انگلیوں کے پوروں تک کا بنا دینا فرمایا ہے تو اس سے اسی جسم کا جو دنیا میں ہے پھر بنکر اٹھنا پایا جاتا ہے مگر یہ خیال دو طرح غلط ہے ایک اس لیے کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ کسی سوال کے جواب میں صرف اظہار قدرت سے اس بات کا ثبوت لازم نہیں آتا کہ یہی جسم جو دنیا میں ہے دوبارہ گلا بنکر اٹھایا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا ہے وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ

---

[۱] ترجمہ - اور کہتے ہیں کہ جب ہم ہڈیاں اور ریزے ہو جاویں گے تو کیا ہم پھر اٹھائے جاویں گے نئے پیدا ہو کر۔ کہہ دے کہ تم پتھر ہو جاؤ یا لوہا یا اس قسم کی جو پیدائش میں جو تمہارے دل کو بڑی مشکل لگتی ہو تب بھی تم کہو گے کہ کون ہم کو لوٹا دے گا۔ کہہ دے وہ جس نے پیدا کیا تم کو پہلی دفعہ پھر جھکا دیں گے اپنے سروں کو تیری طرف اور کہنے لگیں گے وہ کب ہوگا؟ کہہ دے کہ شاید ہووے قریب (سورہ الاسریٰ آیات ۵۲ و ۵۳)

[۲] ترجمہ - اور انھوں نے کہا جب ہم زمین میں گم ہو جائیں گے (یعنی گل گلا کر مٹی ہو کر زمین میں مل جاویں گے) تو کیا ہم ایک نئی پیدائش میں آویں گے بلکہ وہ اپنے پروردگار سے ملنے کے منکر ہیں کہہ دے کہ تم کو ملک الموت مارے گا جو تم پر تعینات ہے پھر اپنے پروردگار کے پاس پھر جاؤ گے (سورہ سجدہ آیات ۹ و ۱۰)

[۳] ترجمہ - اور ہمارے لیے یہ خیال لاتے ہیں کہ کون زندہ کرے گا ہڈیوں کو اور وہ تو گل گئی ہوں گی اور اپنے پیدا ہونے کو بھول جاتے ہیں کہہ دے کہ ان کو زندہ کرے گا وہ جس نے تم کو پیدا کیا پہلی دفعہ اور وہ ہر قسم کی آفرینش کو جانتا ہے (سورہ یٰسین آیات ۵۸ و ۵۹)

[۴] ترجمہ - کیا انسان گمان کرتا ہے کہ ہم ہڈیوں کو اکٹھا نہ کریں گے یہ بات نہیں ہے بلکہ اس پر قادر ہیں کہ انگلیوں کی پوروں کو بھی درست کریں (سورہ قیامہ آیات ۳ و ۴)

[۵] ترجمہ - کہہ دے کہ اللہ تم کو جلاتا ہے پھر تم کو مار ڈالے گا پھر تم کو قیامت تک اکٹھا کرے گا (سورہ جاثیہ آیت ۲۵)

یعنی وہ ہر قسم کے پیدا کرنے کو جانتا ہے کہ گلی ہوئی ہڈیوں کی زندگی کیا چیز ہے اور وہ کیونکر ہوتی ہے۔ پھر اس سے یہ سمجھنا کہ وہ گلی ہوئی ہڈیاں دوبارہ ایسی ہی ہو جائیں گی جیسے کہ اب اس زندگی میں ہیں ایک صریح غلطی ہے ایک آیت کے معنی دوسری آیت سے حل ہوتے ہیں۔ سورہ جاثیہ میں صاف لفظوں میں خدائے تعالیٰ نے فرما دیا ہے کہ اللہ تم کو جلاتا ہے۔ پھر تم کو مارتا ہے پھر تمکو قیامت کے دن اکٹھا کرے گا۔ پس یہ آیت نہایت صاف ہے اور اسی آیت کے سیاق سے تمام آیتوں کے معنی حل ہو جاتے ہیں۔ فقط

(اقتباس) حکیم سید شاہ ولی الدین چشتی

دعا کی عظمت

(۱)

(الف) ایک آنکھ ایسی ہے جو رات کی تاریکی میں بھی جاگتی رہتی ہے اور ایک کان ایسا ہے جو روشنی کی شعاعوں کے غروب ہونے پر بھی سننے کیلئے ہمیشہ کھلا رہتا ہے

(ب) ایک ہاتھ ایسا ہے کہ جب انسان کی طاقت کوئی کام کاج کرنے کے قابل نہیں رہتی تو اسوقت بھی وہ کبھی نہیں رکتا۔ اور ایک محبت ایسی ہے جو اسوقت بھی قائم رہتی ہے جبکہ تمام دنیاوی محبتیں زائل ہو جاتی ہیں۔

(ج) جس آنکھ پر نیند کا غلبہ نہیں ہوتا اُسکے سامنے فرشتوں کی صفیں کھڑی رہتی ہیں۔ اور وہ کان جو ہمیشہ دعاؤں کے سننے کیلئے کھلا رہتا ہے فرشتوں کے گیت سنا کرتا ہے۔ اور وہ ہاتھ جس سے مسکین کو سوال دور رہتی ہے آسمان پر سے ہی دنیا کو سنبھالے ہوئے ہے اور جو محبت کہ لازوال ہے اُسکا تخت آسمان سے کہیں [illegible] ہے۔

(د) لیکن اس آنکھ اس ہاتھ اس محبت اور اس سننے والے کان تک باریابی حاصل کرنیکے کے لیے ایک ایسی قوت موجود ہے جسکو انسان ہر وقت کام میں لا سکتا ہے جبکہ دنیاوی مددیں بے سود ثابت ہو چکی ہوں۔ وہ طاقت **دعا** ہے جسکی پرواز بہت اونچی ہے اور جو انسان کی تسکین اور خوشی پر گذارہ کرتی ہے۔

(۲)

(الف) تھکے ہوئے سورج اور خاموش سمندر آسمان و زمین پر دعا کی عظمت و طاقت کا اظہار کرتے ہیں۔ دعا ہی ایک ایسی چیز ہے جو مایوس کو امید لاتی ہے اسی سے کمزور لوگ طاقت حاصل کرتے ہیں۔ دعا ہی تیز روؤں کو پیچھے چھوڑ جاتی ہے اور طاقتوروں کو جھکا دیتی ہے۔ دعا ہی دل کے قہر کو نقصان پہنچانے سے باز رکھتی ہے اور وہی انسانوں کو دنیا کے شر سے جو رات کو پھیل جاتی ہے بچاتی ہے۔

(ب) دعا کی طاقت کے سامنے تمام طاقتیں ہیچ ہیں۔ اسکی وسعت غیر محدود ہے یہ ہر جگہ موجود ہے اور کائنات کی کل چیزیں اسی کے ماتحت ہیں۔ وہ کسی خاص طریقہ یا خاص جگہ سے تعلق نہیں رکھتی۔ اُس کا کام تو یہ ہے کہ وہ انسان کو تمام بنی نوع انسان کے ساتھ باہم ملا دے۔ اور ایک دل سے دوسرے دل کا رشتۂ تعلق قائم کرادے لیکن ایسا رشتہ جسکی بنیاد محبت اور صفائی قلب پر قائم ہو۔

(ج) اس لیے جن ہونٹوں نے ابتک دعا نہیں مانگی انکو ابھی شروع کر دیں کیونکہ دعا کا مانگنا یا نہ مانگنا، گناہ کا کرنا یا نہ کرنا خود ہماری ہی مرضی پر منحصر ہے ہر ایک سفلی خواہش اور ہر ایک نفسانی ضرورت جسکے پہچاننے یا سمجھنے میں ہم بسا اوقات غلطی کرتے ہیں نہایت ہی ارذل چیز ہے لیکن ایسا کونسا دلیر شخص ہے جو خدا تعالیٰ سے اُس چیز کے حاصل کرنیکی دعا مانگے جو در اصل اچھی نہیں ہے۔

(د) ہماری دعائیں نہ صرف خدا تعالیٰ کو کسی چیز کے دینے کے لیے زیادہ تیار کر دیتی ہیں بلکہ انکا ایک لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم خود اُن برکتوں کے لینے کیلئے زیادہ قابل ہو جاتے ہیں۔ آسمانی خزانے میں دولت لا انتہا ہے اور وہاں ہر کس و ناکس کے آزادانہ طور پر جانے کی اجازت ہے۔ لیکن جو شخص کہ کبھی دعا نہیں مانگتا وہ گویا در اصل اس سنہری کنجی کے لینے سے انکاری ہے۔

(۳)

اتنی ڈھیل نہ چھوڑنا کہ کہیں میٹھی نیند تم پر غلبہ پا کر تمہیں غفلت کے حوالے کر دے تاوقتیکہ تم اچھی طرح اپنے تمام کاموں پر جو تم نے دن میں انجام دیے ہیں تنقیدانہ نظر نہ ڈال لو۔ [illegible] تم اپنے دل سے پوچھو کہ تو دن بھر کیا کرتا رہا ہے اور تو نے ایسا کون سا اچھا کام کیا ہے جو تیری شان کے زیادہ مناسب تھا اور کونسا اچھا کام تجھ سے رہ گیا ہے؟ اور جب تم اس طرح سے تمام دن کا حساب لے چکو تو برائی کے دھبوں کو خدا کے فضل پر بھروسہ کر کے پشیمانی کے آنسوؤں سے دھو ڈالو، اور جو اچھے کام تم نے دن بھر میں کئے ہیں ان پر اظہار خوشی کرو۔

(ترجمہ) ضیاء الدین احمد برنی

مایا کی فلاسفی

مغرب کے بڑے سے بڑے محقق اگر ہندو فلسفہ کے رموز و اسرار کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں تو اسکی وجہ یہ نہ سمجھنی چاہیے کہ اول الذکر کی قابلیت مین کچھ کلام یا آخر الذکر کی فضلیت مین کسیطرح کا شک ہے۔ اس کا باعث اگر کچھ قرار دیا جا سکتا ہی تو یہ کہ دونون قومون کی تہذیب کے بنیادی اصول مین بعد المشرقین ہی۔ دُنیا کے ہر حصے مین ہر زمانہ کے اندر بیشمار مہذب و متمدن اقوام ہو گذری ہین لیکن شاید یہ کہنا بیجا نہو گا کہ ان سب مین صرف ہندوؤن ہی نے حقیقت کا معیار ذہنی قائم کرنے اور معیار ذہنی کے مطابق امور کو حقیقت مین لانے کی کوشش کی ہی۔ ہندوؤن کی تہذیب لازمی طور پر ایک روحانی تہذیب تھی اور اس اعتبار سے ان اقوام کی تہذیب سے جو اس کے مقابلے مین جوان کہلا سکتی ہین بدرجہا آگے بڑھی ہوئی تھی۔ بس یہی وجہ ہی کہ لوگ اسکے اسرار کو سمجھنے سے قاصر و معذور ہین۔

بڑے بڑے راجاؤن کا ذرا سی بات پر راج پاٹ چھوڑ کر فقیر ہو جانا" اعلیٰ قابلیت اور فضل و لیاقت کے آدمیونکا سنیاس اختیار کرکے جنگلون اور بنون مین رہنا" ہزارون کی تعداد رکھنے والی فوج کے مقابلے مین مٹھی بھر جوانون کا محض اپنی آن کو بچانے اور تلوار ہاتھ سے نہ دینے کے لیے لڑ کر کٹ مرنا" سینکڑون عورتون کا بڑے استقلال اور ثابت قدمی سے پروانہ وار آگ کے شعلون مین جل کر بھسم ہو جانا" یہ اور اسی قسم کے بیسیون عجیب و ناقابل فہم ظہورات ہندو تہذیب کی واحد خصوصیات ہین۔

غرض یہ کہ اس تہذیب کا منشا سب سے بڑھکر انسان کو تیاگ اور روحانیت کے لیے مادیت سے دست بردار ہونے کا سبق سکھاتا ہے۔

اُپنشد مین آیا ہے:-

غیر فانیت کام سے، نہ اولاد سے، نہ دولت سے، بلکہ صرف تیاگ سے حاصل ہو سکتی ہے۔

ایک اور موقعہ پر مذکور ہے:-

وہ چیز جو کبھی تبدیل ہونے والی نہین' قابل تبدیل چیزون کے ذریعے حاصل نہین ہو سکتی۔

بس یہی ہندوؤن کے تیاگ کا راز ہی۔ غائیت یا روحانی زندگی کی تکمیل ان دُنیاوی اسباب کے ذریعے سے حاصل نہین ہو سکتی جو لازم طور پر بدلنے والے اور غیر حقیقی ہین۔ ایک انگریزی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:-

ترجمہ۔ صرف ایک باقی رہتا ہی۔ کثیر التعداد چیزین جو نظر آرہی ہین تبدیل ہوتی اور گذر جاتی ہین۔ آسمان کی روشنی ہمیشہ چمکتی ہی۔ زمین کے سائے تیزی سے گذرتے جاتے ہین۔ زندگی بہت سے رنگون والے شیشے کے گنبد کی مانند بقا کی سفید روشنی کو داغدار بناتی ہے

ہان صرف ایک ہی باقی رہتا ہی۔ کثیر التعداد چیزین تبدیل ہوتی اور گذرتی جاتی ہین۔ وہ اس حقیقت کے محض سائے ہین۔ تم اگر حقیقت کے خواہشمند ہو تو ان سایون کی طرف دلبستگی کی نظر سے نہ دیکھو۔ دوسرے لفظون مین دُنیا جو نظر آرہی ہی حقیقت کے نقطۂ نظر سے محض ایک نظری دھوکا یا مایا ہی۔ اسی لیے تیاگ کی ضرورت ہی

ہندوؤن کی تمام مجلسی ساخت کا دار و مدار صرف اسی بات پر ہی کہ انسان ان چیزونکو جو محض نمائشی ہین تیاگ کر اس چیز کے حصول کے لیے جو بقا کی حقیقت رکھتی ہی کوشش کرے۔ اُنھون نے زندگی کو چار منازل پر تقسیم کیا جن مین سے ہر ایک مین یہی راز مخفی ہی۔ طالب علم (ودیارتھی) یا برہمچاری کا کام ریاضت اور حظوظ نفسانی کو ترک کرنا ہی جس وقت طلب علم کا زمانہ گذر چکے تو اسوقت وہ گرہست آشرم مین داخل ہوتا ہی۔ اسوقت اسکا فرض ہے کہ

وہ تحصیل علم و دولت مین اس طرح منہمک رہے گویا کبھی بوڑھا نہوگا اور نہ مریگا اور دھرم پر اس خیال کو مدنظر رکھکر عمل کرے کہ گویا موت نے اسے بالون سے پکڑ رکھا ہے۔

گرہست کا زمانہ صد درجہ کی محنت کا زمانہ قرار دیا گیا ہو جس مین انسان کو کامل ایثار اور بے غرضی سے کام لینا چاہیے۔ گویا ایک طرح پر اس زمانہ مین اسے آنے والے زمانہ بان پرستھ اور سنیاس کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔

چونکہ روحانی تکمیل کو مدعائے زندگی قرار دیا گیا ہے اس لیے ظاہر ہو کہ نفسانی زندگی کو اچھی نظر سے نہین دیکھا گیا۔ اسی اعتبار سے بیوہ عورت کو اس کا عمدہ موقع حاصل ہوتا ہو کہ وہ حظوظ نفسانی کو خیرباد کہکر تجرد کی زندگی بسر کرے، خدا کی یاد مین اپنی ذات کو بھلا دینا اسکا فرض ہو مختصر یہ کہ وہ اپنی زندگی کو پورے طور سے روحانی بنانیکی کوشش کرے۔ اس لحاظ سے دیکھا جاے تو ہندوؤن کا مذہب کبھی عقد بیوگان کی اجازت نہین دیتا بلکہ اسے قطعاً ممنوع قرار دیتا ہے۔ بیوگان کی شادی کے خلاف یہ ایک قسم کا غیر تحریری حکم ہو۔ برہمن کیلئے جو طبعی طور پر تمام ہندوؤن مین اعلی درجہ رکھتا ہو لازم ہو کہ وہ سادہ زندگی بسر کرنے اور اعلی خیالات سوچنے کی ایک شاندار مثال ہو۔ ہر چند کہ علم و اثر اس کے اختیار مین ہین تاہم ضروری ہے کہ وہ دُنیاوی جاہ و حشم کے معاشے مین غریب ہو۔ روحانی پاکیزگی اور نفاست کے لیے ضروری ہو کہ وہ افلاس ہی کی حالت مین قانع رہے۔ جو شخص دولت کا خواہشمند ہو اسکے اندر صداقت کیونکر موجود رہ سکتی ہو؟ اور علم کے لیے تو سب سے بڑھ کر ضروری ہو کہ وہ صداقت کا پرستار ہو۔ اسی ضمن مین ہارورڈ کے پروفیسر جیمز کے مندرجہ ذیل خیالات قابل ملاحظہ معلوم ہوتے ہین:۔

"درحقیقت افلاس ہی جد و جہد کی زندگی ہو۔ وہ افلاس جس مین باجے کی آواز، شاندار وردی، پرجوش انبوہ، خوشنودی یا جھوٹ یا فریب کو دخل نہو جس وقت ہم دیکھتے ہین کہ دولت کمانے کی دھن کسطرح ہماری موجودہ نسلون کی ہڈیون کے عرق تک مین اپنا اثر قائم کر چکی ہو تو یہ سوچکر تعجب ہوتا ہو کہ آیا اس اعتقاد کی از سر نو اشاعت کہ افلاس ایک مستحسن نیز وسیلۂ نجات ہو اس روحانی اصلاح کے لیے ضروری بھی جا سکتی ہو جس کی ہمین بے حد ضرورت ہو۔ حقیقت یہ ہو کہ خصوصیت سے ہم لوگون مین جو انگریزی زبان بولنے والے ہین سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ افلاس کی تعریف مین پھر ایک بار راگ گائے جائین۔ ہم ایک طرح پر افلاس سے خوف کھانے لگ گئے ہین۔ جو شخص اپنی زندگی کو سادگی سے بسر کرنے یا اپنی اندرونی زندگی کو بچانے کے لیے غریب رہنا پسند کرتا ہے ہم اسے نفرت کی نظر سے دیکھتے ہین۔ اگر کوئی شخص عوام مین ملکر روپیہ پیدا کرنیکی جد و جہد مین شریک نہو تو ہم یہ سمجھنے لگتے ہین کہ وہ بے حوصلہ اور بہر قسم کی خواہشات سے عاری ہو۔ ہم اب اس بات کا اندازہ ذہنی طور پر بھی نہین کر سکتے کہ زمانۂ قدیم مین افلاس کا جو معیار مقرر تھا اسکے معنی کیا ہو سکتے ہین، اور نہ ان فوائد کو سمجھ سکتے ہین جن کا اس معیار سے لازمی طور پر تعلق ہو یعنی مادی تعلقات سے آزادی، روحانی پاکیزگی، سفلی باتون کی طرف مردانہ وار عدم توجہی کا اظہار، زندگی کا میلا روپیہ کے بجائے کامون کے ذریعے سے کام کرنا، غیر ذمہ دارانہ طریق پر اپنی زندگی کو جس وقت جی مین آئے خیرباد کہہ دینا، اور وہ تمام اخلاقی آزادیان جو اس سے تعلق رکھتی ہین۔"

لیکن ہر معاملہ کے لازمی طور پر دو رُخ ہوتے ہین اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہو کہ ہم اس دوسرے رُخ کو بھی شروع ہی مین پیش کر دین۔

ہندوؤن مین دو جداگانہ طبقے موجود ہین جو ان کی تہذیب کے دو مختلف پہلوؤن کے نمایندے سمجھے جا سکتے ہین۔ انھین عام طور پر اعلے اور ادنی طبقات کہا جاتا ہو لیکن حقیقت مین ان کے اندر اختلاف

صرف تعلیم کا ہے۔ قدیم موروثی تہذیب دونون مین موجود ہے فرق اگر ہے تو محض اتنا کہ تعلیم یافتہ فرق مین اسکا اثر محلول ہوکر پورے طور سے بس چکا ہے لیکن غیر تعلیم یافتہ لوگون کے کثیر التعداد گروہ مین اسکا اثر صرف خارجی ہے گو اسکا وجود دونون صورتون مین پایا جاتا ہے۔

تہذیب کا خود بخود پیدا ہوتا اسکی جان ہے۔ جو باتین لوگون پر محض رواجاً عائد کی جائین وہ ایسی ہی ہین جیسے اصل پھول کے بجائے کاغذی پھول لگا دیا جائے یعنی محض اس قسم کی جن سے دیکھنے والون کو یقین پیدا ہو سکے۔ اس صداقت کی کیفیت ہندوستان کے اندر ہماری نظرون سے گزرتی ہے۔ ہر چند کہ ہندویت نے صدیون کے عرصے مین اس زبردست آلہ رواج کے ذریعے سے اپنی تہذیب کو عوام کے اندر داخل کرنے کی کوشش کی، اور گو اس تہذیب کا اثر لوگون کی ہڈیون تک مین بس چکا ہے، تاہم اس سے ان کا دلی جوش اب تک متاثر نہین ہوا۔ کثیر التعداد ہندوستانیون مین تہذیب موجود تو ہے لیکن وہ جستی نہین رواجی ہے۔ دوسرے لفظون مین یون کہا جا سکتا ہے کہ وہ خود رو نہین آٹومیٹک ہے۔

اسکی تشریح اسطرح پر ہو سکتی ہے کہ کیا باعث ہے باوجودیکہ ایک ہی خمیر کے سارے آٹے مین موجود ہونے کے اسکا اثر صرف جزوی ہوا ہے؟ جو حصہ اس خمیر سے اثر پذیر ہوا وہی ہے جو تعلیم کی برقی چکی مین سے گذر چکا ہے۔ اس حصہ کی نسبت مختصر الفاظ مین کہا جا سکتا ہے کہ وہ رکاوٹ پیدا کرنیوالے مادہ سے پاک آزاد، وسیع دل اور ترقی یافتہ ہے۔ دوسرا حصہ روایت کی دقیانوسی پن چکی کے نیچے دبا ہوا ہے۔ قرنہا قرن سے عوام کو اس تعلیم سے محروم رکھا گیا ہے جو انکے اندر روشنی کا باب کھول سکتی تھی۔ بس یہی فرق ہے اور اسی نے ہندو قوم کو ایک قوم کی حیثیت مین کسی قابل بننے نہین دیا۔

اس قدر جملہ معترضانہ کے بعد اب ہم پھر نفس مضمون کی طرف رجوع کرتے ہین۔ مایا کے عجیب و غریب مسئلہ کی ابتدا کے متعلق لوگون کے خیالات مختلف ہین کوئی اسے شیطانی تعلیم سے منسوب کرتا ہے، کوئی آب و ہوا کے اثر سے۔ غرض لوگون کے اندر اسی قسم کے متضاد خیالات اس کے متعلق پھیلے ہوئے ہین۔ ممالک غیر کے نکتہ چینون مین سے بعض نے بڑے غور و فکر کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ یہ ہندوؤن کی ہر بات کو اندیشہ کی نظر سے دیکھنے کے مسئلہ کا انتہائی پہلو ہے۔ ایک انگریزی شاعر کہ گیا ہے:-

نجابت کا فخر، طاقت کا غرور، اور دولت اور حسن کا ناز یہ سب باتین یکسان طور پر اس اٹل گھنٹہ کی منتظر ہین۔ فتح اور شان و شوکت کے راستے بھی آخرکار قبرستان ہی کو جاتے ہین۔

ان غیر ملکی نکتہ بینون کا خیال ہے کہ جس بات کو مد نظر رکھکر شاعر نے یہ الفاظ لکھے ہین انھی کو بدرجہ اتم بڑھا کر ان کی فلسفیانہ صورت کا نام "مایا" رکھ لیا گیا ہے۔

بعض یہ کہتے ہین کہ انسان نے زندگی کی عارضی نمائش کو دیکھکر اپنی ذات کو اس کے مطابق بنانے کے لیے اس مسئلہ کو اختراع کیا ہے۔ دوسری طرف بعض کا خیال یہ ہے کہ جس وقت ہندو فلاسفر زندگی کی مختلف حالتون کی غیر یکسانیت کو نظر انداز کرنے سے قاصر رہے تو انھون نے اپنے خیالات مین بہت بڑی رنگ آمیزی کرکے اس مسئلہ کو ایجاد کیا ہے۔ ان لوگون کے نقطہ نظر سے اس مسئلہ کو اختراع کرنے والون کی مایوسی کیلے کی اس مایوسی کے مانند تھی جس سے مجبور ہوکر اسنے لکھا تھا:-

اگر یہ سچ ہے کہ اضافہ تعلیم قدرت پر ایک وسیع قبضہ جو اسکا لازم نتیجہ ہے اور حصول دولت جو اسکے قدم بقدم چلتی ہے عوام کی حاجتمندی و اسکے ضروری لوازم جسمی اور اخلاقی تنزل مین کسی قسم کا اختلاف پیدا نہین

کر سکتے تو مین اسبات کو بڑی خوشی کی نظر سے دیکھونگا کہ کوئی مہربانی مدار تارہ زمین سے ٹکراکر اسکی ہر چیز کی صفائی کر جائے۔

مایا کی ابتدا کے متعلق یہ اور اسی قسم کے اور خیالات جن کا اظہار وقتاً فوقتاً لوگون کی طرف سے ہوتا ہے اس کو ثابت کرتے ہین کہ جس چیز کو دل محسوس کرنے کے قابل نہین ہوتا دماغ اسکی بُری بھلی تشریح کر کے اس سے پیچھا چھڑانے کا کسقدر آرزومند ہوتا ہے۔

لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ مایا کا خیال نہ تو ہندوٗن کی ہر چیز کو اندیشے کی نظر سے دیکھنے کے باعث پیدا ہوا اور نہ ان کے اس چیز سے اپنے آپ کو چھپانے کی فکر سے جس کی تشریح ان کے لیے ناممکن تھی۔ ویدانت مین مایا کا جو ذکر آیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض جہالت کا نام ہے۔ نہ تو اسکا کوئی خاص وجود ہے اور نہ یہ بالکل ہی عدم ہے۔ یہ ایک طاقت ہے جو اپنے وجود کے لیے دُنیا کی نمائش پر منحصر ہے۔ یعنی وہ طاقت جو ان صورتون کے نمودار ہونے کی ذمہ دار ہے جنھین نامعلوم مقام سے تعلق رکھنے والے فن اور مادہ کہتے ہین۔ مایا ہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے ہم آتما کے بجائے برہمانڈ کو دیکھتے ہین ہم اسکے طریق وتوع کو سمجھنے مین اس لیے قاصر ہین کہ ہم خود اسکی پیداوار ہین اور نتیجہ کبھی اپنے باعث سے فوق الاثر نہین ہو سکتا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ مایا کو دور کرنے کے لیے علم برہم گیان اور وجود حقیقی کی واقفیت کی ضرورت ہے۔ اسکے دور ہونیکے معنی یہ ہین کہ انسان روشنی کے اس اعلیٰ ترین درجے کو حاصل کرلے جو اس کے دائرہ مین موجود ہے یعنی یہ کہ وہ اپنی پوری طاقت تک پہنچ جائے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ انسان اس معراج کو حاصل کرے جس مین تلون اپنی جگہ توحد کو دیتا ہے یعنی یہ کہ اس پر حقیقی علم کے دروازے کھل جائین اسکی غلطی کا پردہ آنکھون کے آگے سے اٹھ جائے اور اسکا غم ہمیشہ کیلئے تلف ہو جائے۔

ہم نے اوپر کہا تھا کہ انسان مایا کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس خیال سے کہ ناظرین اتنا پڑھکر گھبرا نہ جائین اور گھبراہٹ مین ادھر سے اپنی توجہ ہٹا لین ہم اسکے ساتھ ہی یہ بھی بیان کر دینا چاہتے ہین کہ انسان اسے سمجھنے مین صرف اسی درجے تک قاصر ہے جیسے کہ وہ تمام بنیادی خیالات کو سمجھنے کے معاملے مین ہوتا ہے۔ اسکی مزید توضیح کے لیے ذیل کی عبارت انگریزی کی کتاب "عجیب و غریب صدی" مین سے مادہ کے گرد ابی مسئلہ کے متعلق ترجمہ کرکے درج کی جاتی ہے:۔

اس مسئلہ کی رو سے ایتھر کو ایک اس قسم کی رقیق چیز تصور کیا جاتا ہے جو نہ تو دباؤ مین آسکتا ہے اور نہ اسمین رگڑ پیدا ہوتی ہے۔ سارے برہمانڈ مین ایک اور صرف وہی ایک چیز ہے۔ وہ چیز جسے مادہ کہتے ہین درحقیقت ایتھر کی حرکت کی ایک صورت ہے۔ سالمات درحقیقت نہایت چھوٹے چھوٹے گرداب یا ایتھر کی تیزی سے گردش کرنے والے اجزا ہین اور یہ اجزا اس قسم کے ہین کہ جب ایک بار اس رگڑ سے خالی رقیق چیز مین ان کے اندر حرکت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ دوامی اور ناقابل انتقال ثابت ہوتے ہین۔ خیال ہے کہ ان گرد والون کی ایک کافی (قریب قریب بے انتہا) تعداد جن مین سے ہر ایک کی جسامت مختلف ہوتی ہے جو مختلف تیزی سے حرکت کرتے ہین اور گیس کے ذرات کے مانند ہر ممکن سمت مین پھیلتے ہین جسامت اور حرکت کی مشابہت کے اعتبار سے مختلف مجموعون کی صورت اختیار کرتے ہین۔ اس اجتماع کے عمل سے عناصر پیدا ہوتے ہین اور جب یہ عناصر کیمیائی ترکیب سے ایک دوسرے سے ملتے ہین تو اس سے مادہ کی مختلف صورتین پیدا ہوتی ہین۔ لیکن ان سالمات اور ان کے مجموعات کی مسلسل حرکات غیر مرئی ایتھر کے اندر حرارت اور بجلی کی خاص جنبشین پیدا کرتی ہین جس کا اثر دوبارہ مادہ پر پڑتا ہے تو ان باہم پیوست شدہ تبدیلیون کا ظہور ہوتا ہے جنھین قوانین وظہورات فطرت خیال کرتے ہین۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا کشش اس ابتدائی حرکت سے پیدا ہوتی ہے جو ایتھر مین لائی جاتی ہے یا نہین۔

بہر نوع لارڈ کیلون جو انگلستان میں اس گردابی حصہ کے سب سے بڑے شارح ہیں انکی اس تھیوری کو زیر نظر رکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ برہانڈ کی ابتدا کی دریافت کے متعلق جسقدر کوششیں کیگئی ہیں ان سب میں یہ نہایت اہم ہے۔ لیکن تمام بنیادی خیالات کی طرح یہ مسئلہ بھی اس قسم کا ہے کہ ذہن انسانی بمشکل اسے قبول کر سکتا ہے۔ دباؤ میں نہ آنے اور نہ رگڑ کھانیوالی رقیق شے جو سارے برہانڈ پر حاوی اور محیط ہے سالماتی گردابی حرکات کے سلسلۂ نامتناہی کی ابتدا، قبول حرکات، اجتماعات کا نہ ختم ہونیوالا سلسلہ، کیمیائی حرکات کی پیچیدگی، ایتھر کی مختلف قسم کی جنبشوں اور کشش کی طاقت کا پیدا ہونا، یہ سب باتیں فہم انسانی میں نہیں آسکتیں۔ اگر آبھی جائیں تو سب سے بڑی ناقابل فہم بات یہ رہ جاتی ہے کہ ایتھر کے ان گردابی حلقوں کے اس طرح آپس میں ٹکراتے رہنے کے نہ ختم ہونے والے سلسلہ میں سے زندگی بیداری، محبت اور ذہانت کیونکر پیدا ہو گئی۔

ممکن ہے کہ ناظرین میں سے بعض یہ اعتراض کریں کہ ایک سائنٹفک طور پر مستند ناقابل فہم مثال پیش کر دینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ کوئی اور ناقابل فہم بات تسلیم کر لی جائے۔ ہم ان کے اس اعتراض کو تسلیم کرتے ہیں سچ پوچھو تو مایا کا مسئلہ بجائے خود ایک مستحکم بنیاد پر قائم ہے۔ ہم نے ڈاکٹر والیس کی کتاب کا مندرجۂ بالا اقتباس محض اس لیے پیش کیا کہ دکھایا جائے گو بعض باتیں ہمارے فہم وقیاس سے بعید ہیں تاہم اس وجہ سے ہم انھیں ناممکن نہیں قرار دے سکتے۔

مایا کے مسئلہ کو مختلف نقاط نظر سے مختلف دلائل کے ذریعہ سے ثابت کیا جاسکتا ہے ذیل میں ایک پہلو کو لیکر اسکے متعلق وہ دلائل جو فروری ۱۹۰۲ء کے رسالہ "پربدھ بھارت" میں پیش کیے گئے تھے درج کیے جاتے ہیں:-

اگر خدا اپنی دُنیا میں نہیں ہے تو ہمیں اسے کسی دوسری جگہ تلاش کرنیکی ضرورت نہیں۔ فی الحقیقت اور کوئی جگہ ہی نہیں جہاں اسے تلاش کیا جائے۔

اس مسئلے سے اس خیال کی تشریح ہوتی ہے کہ خدا کا وجود برہانڈ سے باہر ہے اگر وہ برہانڈ سے باہر ہے تو وہ لامحدود نہیں اس لیے خدا نہیں۔

اگر خدا سیارے کے اندر موجود ہے تو ضروری ہے کہ وہ ذرہ میں بھی ہو اگر نہیں تو اسکی اس صفت میں فرق آتا ہے کہ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ یہاں پر ایک نہایت دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا ذرہ خدا سے کسیقدر کم یا اس سے زیادہ درجہ رکھتا ہے؟ دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ کیا ذرہ ایک غیر ترقی یافتہ خدا ہے یا مرکب یعنی خدا یا کچھ اور چیز؟

اگر ذرہ غیر ترقی یافتہ خدا ہے تو وہ خدا کا جزو ہے کیونکہ وہ سالم خدا نہیں ہو سکتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا ترقی کے مختلف مدارج کے اجزاء سے مرکب ہے اگر اس اصول کو مان لیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ خدا کے وجود میں ترمیم اور اسکی موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔

اگر ذرہ خدا سے مختلف کچھ چیز ہے جس پر خدا کا وجود محیط اور اسکے اندر جان ڈالتا ہے تو اسکے لاانتہا اور ہر جگہ موجود ہونیکی صفت میں فرق آتا ہے ذرہ کا خدا سے مختلف ہونا اسے محدود کرتا ہے۔ خدا چونکہ ذرہ میں موجود نہیں اسلئے وہ ان اجزا میں بھی موجود نہیں جن سے ذرہ مرکب ہے۔ اگر وہ ہوتا تو ذرے سے بھی جدا ہوتا۔

غرض یہ کہ معاملہ کی دونوں صورتیں ناقابل تسلیم ہیں۔ اگر ہم خدا کو ترقی کن یا محدود سمجھیں تو اسکی خدائی صفات میں فرق آتا ہے۔

ایک فرقہ ان سائنس دانوں اور مسئلہ ارتقا کے مویدوں کا پیدا ہو گیا ہے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا وہ نامعلوم کامل وحدانیت ہے جسکے دو پہلو مادی اور روحانی عالم ہیں۔

اگر ہم ان دونوں عالموں کا اس نامعلوم کامل وحدانیت کے ساتھ اس قسم کا تعلق تسلیم کریں جیسا اس میں بتایا گیا ہے تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس میں بھی یقیناً تبدیلی واقع ہوتی ہے اور اس سے خواہ کچھ اور ثابت ہوتا ہو مگر خدا کی صفت "خدائی" ثابت نہیں ہوتی۔

اسکی وجہ یہ ہو کہ سبب کی صورت اختیار کرتے ہوئے اس ذات نامعلوم کو وہ بننا پڑا جو وہ پہلے نہ تھی یعنی اس مین تبدیلی واقع ہوئی۔ تبدیلی ایک نتیجہ ہو جو واقعات کے شروع ہو کر ختم نہ ہونے والے سلسلہ مین ظہور پذیر ہوتا ہو۔ جس نتیجہ نے اس ذات نامعلوم کو سبب بنایا اسکا خود کوئی سبب موجود تھا اور بجائے خود نتیجہ رہ چکا ہوگا۔ علی ہذا القیاس اس سلسلہ کو لا انتہائی تک پہنچایا جا سکتا ہو۔ اس طرح پر اگر اس ذات نامعلوم مین کسی تبدیلی کا وقوعہ تسلیم کر لیا جائے تو وہ ایک اضطراری نتیجہ ثابت ہوتی ہو۔ گویا اسکی حالت متبدل ماننی پڑتی ہو جو واقعات کے شروع ہو کر ختم نہ ہونے والے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

اس صورت مین پھر اس ذریعہ کو جس نے اس ذات نامعلوم مین تبدیلی پیدا کی جس کے باعث آخر الذکر نے نتیجہ کا درجہ حاصل کیا ایک ایسی صفت ماننا پڑتا ہو جو یا تو اس ذات نامعلوم کے اندر موجود تھی یا باہر۔ اگر اندر موجود تھی تو تبدیلی کا باعث اس ذات نامعلوم کی کوئی اندرونی ضرورت ہوگی۔ اگر خارجی تھی تو وہ ذات نامعلوم یقیناً کسی پر انحصار رکھتی ہوگی اور اسپر کسی قسم کا اثر یا دباؤ پڑ سکتا ہوگا۔ لیکن جس مین ضرورت کی وجہ سے یا دباؤ کے باعث کوئی تبدیلی ہو سکتی ہو وہ خدا نہین ہو سکتا۔

پس ہمین دو مین سے ایک بات ماننا پڑتی ہو یعنی یا تو مادیت یا مایا کا مسئلہ جس کا منشا یہ ہو کہ جو کچھ نظر آتا ہو یہ محض نظر کا دھوکا ہو۔ اس مسئلہ کو تسلیم کرنے والے اعتراف کرتے ہین کہ ہم برہمانڈ کی ابتدا کے متعلق کچھ نہین جانتے، کیونکہ ہماری عقل ہمین یہ بتانے سے قاصر ہو کہ کیونکر اس کامل طور پر نامعلوم ذات نے روحانی اور مادی عالم پیدا کر دیے اور خود اس عمل مین تلف نہ ہوئی۔ ہمین دو مین سے ایک کے حق مین فیصلہ دینا ہوگا۔ اگر ہم اول الذکر کے حق مین فیصلہ دین تو بھی ماننا پڑے گا کہ یہ برہمانڈ کا ظہور محض دھوکا ہے۔

ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہین کہ جہلا کے ہاتھون مین پڑنے کی وجہ سے اس مسئلہ نے بہت سی خرابیان پیدا کی ہین جو جہلا کے ہاتھ سے جو کچھ نہ ہو تھوڑا ہے۔

مایا کا مسئلہ ہمین سکھاتا ہو کہ جو کچھ ظہور مین آ رہا ہو اسمین سے کچھ بھی کامل طور سے حقیقی نہین لیکن ساتھ ہی کوئی بھی چیز نسبتاً غیر حقیقی نہین ہو۔ ہر ایک حالت یا ہر ایک چیز محض ظاہری ہو صرف اسکا وجود حقیقی ہو۔ لیکن ظاہرات کا عالم ہی قانون کا عالم ہو جب تک کوئی شخص کامل پاکیزگی، نیکی، ضبط، وخودداری کے ذریعے سے اندرونی روشنی کو جاگر کر دے نہ پہچان لے تب تک وہ طبقۂ ظاہرات سے باہر قدم نہین رکھ سکتا اور نہ کرم کے زبردست اور غلطی نہ کرنے والے قانون سے بچ سکتا ہو۔ پس ظاہر ہو کہ ان حالتون مین صرف جاہل لوگ ہی اپنی کمزوریون کے لیے مایا کی پناہ ڈھونڈ سکتے ہین۔

ہم دکھا چکے ہین کہ تیاگ جو ہندو تہذیب کا اصول ہو براہ راست مایا کے مسئلہ سے تعلق رکھتا ہو۔ اس مضمون کو ختم کرنے سے پیشتر ہم بعض اور اہم نتائج کا جو اس سے پیدا ہوتے ہین ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہین۔

زندگی مین کوئی بات کامل طور پر بری یا صرف جزوی طور پر اچھی نہین ہو کیونکہ تمام چیزون کے عنصر حقیقی کے علاوہ جو لامحدود اور ناقابل بیان ہو اور کچھ کامل طور پر حقیقی نہین ہو۔ ہر ایک ظہور کو اگر اسکی حقیقی قدر کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اسکے ہمیشہ بدلتے رہنے والے نظر فریب لباس سے قطع نظر وہ حقیقت مین وجود لامحدود ہو۔ اس اعتبار سے اس نہ ختم ہونے والے برہمانڈ مین کوئی چیز ایسی نہین جس کا اپنے باعثِ وجود سے برکت حاصل کرنا یقینی نہ ہو۔ لامحدود امید، نہ ختم ہونے والی طاقت، خارج از حدود تکمیل، سب کا قدرتی استحقاق ہو، اور اس استحقاق کو سب تک پہنچانا ہی مسئلہ ارتقا کی جان ہو۔

مایا کا سوال اخلاق کے بنیادی اصول کو قائم کرتا ہو۔ کیونکہ وہ

تفریق اور ظہور پر سے حقیقت کا احساس ہٹا کر اسے اس ناقابل تقسیم ذات پر ڈالتا ہے جو سب کے اندر ایک ہے۔ اخلاق سے عاری ہونے کا امکان اس تفریق کو تسلیم کرنے پر منحصر رکھتا ہے اگر کسی دوسرے شخص کو ضرر پہنچاتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وہ اس طرح اپنے آپ کو تکلیف نہیں پہنچاتا۔ مایا کے مسئلہ کی رو سے یہ تفریق محض ظاہری ہے حقیقی نہیں ظاہری پہلو پر زور دیکر وہ حقیقی سے جُدا ہو جاتا اور اس طرح اپنے آپ کو ضرر پہنچاتا ہے۔

کیا وجہ ہو کہ ایک شخص اپنے ہمسایہ سے اپنے برابر محبت کرے ہاں لیے کہ اسکی اور اُسکی حقیقت دراصل ایک ہی ہے۔

یہ مسئلہ دوسروں کو نجات دلانے کسی قوم کے شاہی اختیارات تسلیم کرنے یا ایک کو دوسرے سے برتر و بہتر سمجھنے کے اُصول کو سختی سے رد کرتا ہے۔ اسکی روشنی میں جو کام کیا جائے وہ صرف ایک ہی معنی رکھتا ہے یعنی یہ کہ انسان خدمت کر رہا ہے اس ذات واحد کی خدمت جو لا انتہا صورتوں میں موجود ہے۔ مایا کو ماننے والا کسی کی شخصی فضیلت، خدائی اوصاف، دوسروں کو حقیر و گنہگار تسلیم کرنا ان باتوں کا مطلق قائل نہیں۔ وہ تو فطرت انسانی کی نیکی پر بے انتہا اعتقاد رکھتا ہے اور کل بنی نوع کے لیے لامحدود خیرات کا معترف ہے۔

تیرتھ رام

ذات کی اصلیت و ماہیت

جملہ اقوام ایک قسم کی سوسائٹی مین منقسم ہین کوئی سوسائٹی بڑے پیمانے کی ہو اور کوئی چھوٹے پیمانے کی سوسائٹیان بہت کم ایسی ہونگی جن پر "ذات" کا لفظ اچھے یا بُرے معنو مین عائد نہ کیا گیا ہو۔ پرتگالی زبان مین یہ لفظ محض "خاندان" کے معنی مین مستعمل تھا۔ موجودہ یوروپین زبانو مین استعمال کیئے جانے سے پہلے اس لفظ سے طبقات کی وہ تقسیم مراد تھی جو ہندو سوسائٹی مین پائی جاتی تھی۔ زبان سنسکرت مین اس لفظ کا مترادف "ورن" یا "برن" ہے۔ برن سے مراد رنگ ہے الفاظ جات کل، پروار، گرن وغیرہ الفاظ کا بھی کم و بیش یہی مطلب ہے چنانچہ اس مضمون مین جہان کہین کوئی ایسا امر نظر آیا جس سے ہندو "ذات" کے کسی حصہ کا خیال پیدا ہو وہان بلا خیال عمر، قوم، مقام یا تمدنی مراسم کے لفظ ذات ہی مستعمل ہوا ہے۔ مثلاً یا اگر یوں کہ لیجئے ہو کہ کاریگرون کے وہ طبقے جنکی نسبت کتبون سے ظاہر ہوتا ہے کہ روم کے زمانہ مین برطانیہ مین موجود تھے عملاً ایک قسم کی ذات ہی تھے کیونکہ تھوڈوسین قانون کے مطابق لڑکا اپنے باپ کا پیشہ اختیار کرنے کے لیئے مجبور تھا اور جس خاندان مین شادی ہوتی تھی اُس خاندان کا پیشہ اختیار کرنا لازمی بات تھی۔ لیکن کاریگرون کے یہ طبقے اِن اختیاری جماعتون کے پیشرو تھے جو حرفت اور تجارت کے باضابطہ انتظام و ترتیب کے لیئے قائم ہوئی تھین۔ بعد کو یہ جماعتین "گلڈ" اور "کرافٹ گلڈ" کے نام سے موسوم ہوئین جنمین کاریگرون کے لڑکون کو بطور شاگرد شریک ہونے مین زیادہ آسانیان اور فوائد تھے۔ لیکن انمین لائق اجنبی بھی داخل کر لیئے جاتے تھے اور اس تمدنی آمیزش کی وجہ سے انمین باہمی مناکحت بھی ہوتی تھی۔ پیشہ ور جماعتون کی ساخت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دراصل اسلیئے قائم کیگئی تھین کہ غیر لوگونکی شرکت کا سدِباب کرین۔

لیکن سکسن زمانہ مین ذات کے ٹھیک معنو مین ذات کی قسم کی کوئی چیز نہ تھی جس کاشتکار کے پاس ایک بیگہ زمین ہو گئی وہی زمیندار ہو جاتا تھا۔ جون جون اسکی ثروت بڑھتی تھی اسکا اقتدار و ذمہ داریان بھی بڑھتی جاتی تھین۔ اہل ثروت کی نوعیت کی

کوئی تعریف یا توضیح نہ تھی۔ جہانتک رسم و دستور سے تعلق ہے اہل ثروت سے مراد وہ شخص تھا جو خواہ ترکہ خواہ جاگیر سے بڑھا ہو۔ چنانچہ ایک سفر اور کامیاب سوداگر "ارل" کے درجہ تک پہنچ سکتا تھا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اس بارے مین جرمنی کی ابتدائی تاریخ تاریخ انگلشیہ کی متضاد تھی۔ جرمنون کی اُن فوجی جماعتون مین جو "ڈیفنڈ مین" کے قدیم طبقہ سے پیدا ہوئین اصلی ذاتین موجود تھین۔ اِن مین خواص جنگجین یا سپاہی ہونے کے لیے یہ ثابت کرنا پڑتا تھا کہ وہ کسی بہادر کی اولاد مین ہے۔ غیر جنگجو آبادی "لورنس مینڈ" کے نام سے موسوم تھی۔ تجارت پیشہ گروہ کی ایک خاص ذات تھی جو "برگراشینڈ" کہلاتی تھی۔ اسمین شک نہین کہ کسی نہ کسی وقت اکثر ممالک مین پیشہ موروثی سمجھا جاتا تھا۔ پرسکاٹ صاحب فرماتے ہین کہ پیرو مین ہر چند عام قاعدہ یہ تھا کہ ہر شخص کو اپنے تئین مختلف فنون سے ماہر کرنا چاہیے لیکن بعض اشخاص کو بڑی احتیاط کے ساتھ صرف ان پیشون کی تعلیم دیجاتی تھی جو زیادہ متمول گروہ کی خدمت کرتے تھے۔ پیرو مین یہ پیشے دیگر پیشون اور عہدون کیطرح ہمیشہ موروثی ہوتے تھے۔ اِس خاص معاملہ مین ذات کی تقسیم ٹھیک ویسی ہی تھی جیسی ہندوستان یا مصر مین پائی جاتی تھی۔ زورٹیا بیان کرتا ہے کہ میکسیکو مین کوئی شخص اسوقت تک تجارت نہین کرسکتا تھا تاوقتیکہ اُسے وراثتاً یہ حق نہ پہنچتا ہو یا پبلک نے اجازت نہ دی ہو۔ فجی کے نجار ان کی ایک جداگانہ ذات ہے اور جزائر ٹونگا مین تمام پیشے سوائے گودنا گودنے والون اور حجامون کے موروثی ہوتے تھے مختلف طبقے یا گروہ "تابولی" "متوعا" "توعا" کے نام مشہور تھے۔ اگر تعلیم عامہ کا کوئی باقاعدہ انتظام نہو تو یہ ایک قدرتی بات ہے کہ باپ اپنے بیٹے کو اپنا پیشہ سکھاتا ہے۔ اس سے باپ کو کم خرچ کرنا پڑتا ہے اور لڑکے کو معاش حاصل کرنے مین آسانی ہوتی ہے اور لڑکا اگر کے باپ کا نام یا شہرت ترکہ مین حاصل کرتا ہے۔ معمولی پیشون مین مستقل فنون کی عزت بہت بڑی تھی اور جو دستور کسی زمانہ مین بالعموم تمام جماعتون مین جاری تھا وہ اِن جماعتون کے گروہون مین اب بھی موجود ہے لیکن جبتک یہ طریقہ قدرتی طور سے قائم ہے اسمین کوئی شک نہین کہ یہ گروہ ایک قسم کی ذاتین ہین۔ کیونکہ ذات کا مقصود یہ ہے کہ نیا پیشہ اختیار کرنا نہ صرف خلاف دستور ہے بلکہ غلط اور قابل تعزیر ہے۔ ذات کا لفظ مذہبی جماعتون پر بھی عائد ہوا ہے۔ ایک خاندان یا ایک فرقہ ایک خاص معبد یا ایک خاص دیوتا کے کل معبدون کی خدمت کے لیے وقف ہوتا ہے۔ اِس قسم سے پُجاری ہوتون یا بارڈون یا بجاٹون کی قسم کا ایک نیم مقدس گروہ قائم ہوا ہے اور شاید یہ چند خاص خاص ممتاز پیشے موروثی ہوتے ہین باقی پیشے آزاد رہتے ہین۔ مثلاً پیرو مین کزکو کے سورج کا پجاری اپنا عہدہ اپنے بیٹے کو دے جاتا تھا۔ اسیطرح پبلک رجسٹرارون، عالمون، اور رگوتیون کا پیشہ موروثی ہوتا تھا۔ بنجمن کانسٹنٹ صاحب بیان فرماتے ہین کہ جو گرِملا اور میکسیکو کیطرح جنوب مین اس قسم کے پیشے موروثی ہوتے تھے، لیکن شمال و مغرب مین عام انتخاب سے پیشے یا عہدے دیے جاتے تھے۔ بہت سے ممالک مین پولیٹیکل وجوہ یا قومی تفریق کے باعث مختلف گروہون مین باہمی مناکحت کی ممانعت تھی۔ روم اور اسپارٹا مین شرفا رذیل فرقون سے شادی نہین کرسکتے تھے۔ گوئٹمالا مین یہ قانون تھا کہ اگر کوئی شریف مرد کسی رذیل عورت سے شادی کرے تو وہ "مزیکول" یعنی نیچ ذات مین شمار کیا جاے۔ ایسے شخص کو وہ ٹیکس دینے اور وہ خدمات انجام دینی پڑتی تھین جو اُس گروہ کے لیے مقرر تھین، اور اُسکی جائداد کا بیشتر حصہ شاہی ضبطی مین آجاتا تھا۔ مالاگیسی کے باشندے چار درجون مین منقسم تھے یعنی (۱) شریف (۲) سپاہی (۳) سوداگر (۴) رذیل۔ انمین باہمی مناکحت کی سخت ممانعت تھی۔ کسی زمانہ مین تمام اقوام غیر ملک والون سے شادی بیاہ کرنے کی مخالف تھین جن کو وہ عموماً دشمنون کے نام سے پکارتے تھے۔ اور جلد اقوام نے اُن تمام اقوام کو ستایا ہے جن پر اُنھون نے قبضہ پایا۔ ایک لحاظ سے غلامی سب سے ارذل ذات ہے کیونکہ بسا اوقات

اپنی اصلی صورتون مین وہ غلامون کو چند خفیف رسمی حقوق دلاتی ہے۔ ایک دوسرے لحاظ سے ایک ملکہ کی بیٹی کے ساتھ ایک معمولی شخص کی شادی ذات کے قواعد کی خلاف ورزی قرار دی جا سکتی ہے۔

ذات کی صورتون کے علاوہ بہت سی متفرق جماعتین ہین جو اس لحاظ سے ایک دوسرے سے مشابہ ہین کہ ان کے ممبر متواتر آپس ہی مین شادی کرتے ہین اور بالعموم ایک خاص پیشہ یا کام کرتے ہین۔ مناکحت کا یہ دستور ابتدائی معاشرتی نظام کی خصوصیات مین داخل تھا، اور اسوجہ سے یورپ اور ایشیا کی رسمی سوسائٹیون کے موجودہ نمونون مین کوئی اعلیٰ قسم کی تہذیب نہین پائی جاتی ہے۔

منجملہ ایسی بہت سی سوسائٹیون کے مندرجہ ذیل سوسائٹیان قابل بیان ہین:- "بونٹی" باغیون کی اولاد جو جزیرہ پٹکرن مین اب بھی مقیم ہے۔ ہماتون کی ایک جماعت جو کوہ ننگر پر سوراباجا کے متصل رہتی ہے۔ اسکی تعداد بارہ سو ہے جو تقریباً چالیس مواضعات مین تقسیم ہے اور اب بھی قدیم ہندو مذہب کی پیروی کرتی ہے۔ برطانیہ اعظم کے مختلف ماہی گیر مواضعات اور فرانس مین بھی اسی قسم کی جماعتین پائی جاتی ہین۔ جہانتک باہمی مناکحت سے تعلق ہے باشندگان آئسلینڈ اور مرفہ الحال یہودی ذات کے لقب سے موسوم کئے جا سکتے ہین۔ اِس سے یہ نہین سمجھنا چاہیئے کہ اِس قسم کی مناکحت تمدنی ترقی کی ایک خاص حد کا عام خاصہ ہے۔ "ایکسوگیمی" یعنی اس قسم کی مناکحت کا دستور جسکی رو سے ایک اجنبی کے ساتھ قطعاً یا چند خاص صورتون مین شادی ہو سکتی ہے حال کے گروہون مین بالخصوص ایشیا مین بہت وسعت کے ساتھ اَب بھی مانا جاتا ہے اور ان دونون صورتون کے قبل وہ ابتدائی حالت تھی جسمین اجناس کے تعلقات خلط ملط تھے۔ کوہ سینٹ الیاس سے دریائے ناتس تک سواحل اور جزائر مین تھلنکیٹون اور کولسیچیون کی ایک قوم آباد ہے جسمین باقاعدہ غلامی کا طریقہ جاری ہے اور جن کا سردار بذریعہ انتخاب مقرر ہوتا ہے۔ اس عجیب و غریب قوم کی دو ذاتین ہین جو گرگ اور زاغ زو دلف ایغل رون کے نام سے مشہور ہین۔ انکی شناخت یہ ہے کہ ان کے مکانات، کشتیون، کپڑون، ڈھال وغیرہ پر یہ علامتین تحریر یا منقوش ہوتی ہین۔ ذات گرگ کئی شکمی ذاتون یعنی ریچھ، عقاب، ماہی آدم، شارک اور الکا مین منقسم ہے۔ زاغ کی ذات مین مینڈک، ہنس، دریائی شیر، اُلو اور سالمن مچھلی شامل ہین۔ ایک ذات اپنی ذات والے سے شادی نہین کر سکتی چنانچہ یہ لازمی بات ہے کہ گرگ زاغ سے شادی کرے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ آج زاغ ذات کی لڑکی سے گرگ ذات کے لڑکے کی شادی قرار پائی ہے اور کل داماد اپنے خسر سے کسی موروثی جھگڑے پر جھوڈسل کر رہا ہے۔

ہندوستان مین مسئلہ ذات تاریخی دلچسپی سے بڑا ہوا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ اِس سے گورنمنٹ اور مصلحون کے راستہ مین دشواریان پیدا ہوتی ہین۔ لیکن رابرٹسن صاحب اور ڈوبوائے صاحب اور ان کے دیگر ہمخیال صاحبان ذات کے سلسلہ کو تمدنی امن کا بہت بڑا محافظ سمجھتے ہین اور اسوجہ سے ذات بعض اُن علوم و فنون اور پیشونکی ترقی کے لیے ازحد ضروری ہے جو درحقیقت ہندوؤن نے کی ہے۔ مگر بعض اہل الرائے (مثلاً جیمس مِل صاحب) اسکو بُرا قرار دیتے ہین۔ اِن کی رائے مین سلسلہ ذات بہت بڑی پولٹیکل غلطی ہے جو آزادانہ مقابلہ اور منفردہ راحت کی دشمن ہے۔

مسٹر کولبرگ جو معاملاتِ ہند پر ایک مستند شخص سمجھے جاتے ہین، اس خیال کی تردید کرتے ہین۔ ۱۹۰۷ء مین آپ نے یہ ظاہر کرنے کے بعد کہ جو شخص اپنے پیشہ سے معیشت حاصل نہین کر سکتا، وہ ایک کمتر یا افضل پیشہ اختیار کر سکتا ہے، تحریر فرماتے ہین:- "روزمرہ یہ امر مشاہدہ مین آتا ہے کہ برہمن تک شودرون کا ذلیل پیشہ کرتے ہین۔ ہم سب واقف ہین کہ تمام قومین کلبون، سوسائٹیون یا گروہون مین منقسم ہین، جنمین اُسی ذات کے مختلف لوگ ایک محدود دائرہ

میں رہتے ہیں۔ اور یہ کلب یا الگ مختص قواعد یا دستورات یا ضمنی قوانین کی پابندی کرتے ہیں چند مستثنیات کے علاوہ تمام پیشے ہر قسم کے آدمیوں کے لیئے کھلے ہوئے ہیں اور مذہبی جوہ سے جو رکاوٹیں پائی جاتی ہیں، وہ اُن رکاوٹوں سے زیادہ سخت نہیں ہیں جو برطانیہ عظمیٰ میں قوانین میونسپل اور کارپوریشن کے اثر سے پیدا ہوتی ہیں۔ بنگال میں جو لوگ کسی خاص پیشہ میں داخل ہونے کے لیئے درحقیقت تیار ہیں وہ ہر چیز کی ساخت کی حدود توسیع کے لیئے کافی ہے۔ اس امر کی الفنسٹن صاحب بھی تائید کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں: "اگرچہ مجھے ہندوستان کا ایک طولانی اور بسیط تجربہ ہے لیکن میں نے کبھی نہیں سُنا کہ کوئی شخص اپنے پیشہ کے باعث ذات سے گرا دیا گیا ہو۔ اس امر کی توضیح برٹش فوج کے تجربہ سے ہوتی ہے جسمیں تمام ذاتوں کے لوگ بھرتی ہیں۔ موجودہ ذات کی نسبت عام خیال یہ ہے کہ اسمیں شادی بیاہ، پیشہ اور تمدنی مراسم خصوصاً اکل و شرب کے متعلق چند قیود اور رکاوٹیں ہیں۔ لیکن یہ امر کہ کہاں تک باہمی مناکحت کی اجازت ہے؛ اور اس شادی کا جسکی اجازت ہے لیکن بیقاعدہ سمجھی جاتی ہے کیا اثر پڑتا ہے؛ اور ممنوعہ شادی کی کیا سزائیں ہیں؛ آیا جو قواعد حرفت و تجارت کے محافظ ہیں وہ اپنے اثر میں ایک قسم کے اتحاد کیلئے ہیں یا کسی اور غرض سے؛ کن وجوہ سے ذات جاتی رہتی ہے؛ اور کن صورتوں میں پھر حاصل ہو سکتی ہے؛ یہ سب ایسے سوالات ہیں جنکی نسبت بہت کم صاف اور اصل تحقیقات حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ امر قابل بیان ہے کہ ویدوں میں چند برہمی عقائد اور اخلاق کی وسیع عمارت کھڑی ہے۔ ذات کے آئندہ قواعد کی بابت کچھ ذکر نہیں۔ ایک فقرہ جو اس باب میں وارد ہوا ہے پرس سکت، وجن وسرین اکنڈا رگوید سنتھیا میں درج ہے: "جب اُنھوں نے آدمی کو تقسیم کیا تو کتنے حصے بنائے؟ اُس کا منہ کیا تھا؟ اُس کے بازو کیا تھے؟ رانوں اور پیروں کو کیا کہتے ہیں؟ برہمن اُسکا منہ تھا۔ راجہ اُس کے بازو سے بنائے گئے ویش اُسکی ران سے اور شودر اُس کے پیروں سے پیدا ہوا۔"

ہگ صاحب اس بیان سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ "برہمن معلم تھے اور چھتری سپاہی تھے۔ لیکن یہ بات ویدوں کے بھجنوں کی صاف طور و سیدھی سادی زبان اور نیز اس امر کے خلاف ہے کہ تخلیق عالم کے حالات میں آدمیوں کے گروہوں کے علاوہ بہت سی چیزوں کی پیدائش اسی خیالی طریقے سے جسم الٰہی کے حصوں سے منسوب کی جاتی ہے۔ یہ امر پُرانوں اور منوجی کے "دھرم شاستر" ہی میں پایا جاتا ہے جو براہ راست الہامی ہونے کا ادعا نہیں کرتے، جہاں وہ ویدوں کے الفاظ کے مخالف ہے، اور جس کی عبارت سے وہ کل باتیں جو ذات میں قابل اعتراض ہیں، درج ہیں۔ لیکن خود وشنو پران میں ذات کی روایت میں چار گروہوں کا ذکر ہے جو ابتدا میں مذہبی عقیدے کی رو سے قائم ہوئے تھے "جبتک کل انسانی نسل قعر گناہ میں نہیں گری تھی اُسوقت تک گروہوں کے جداگانہ تمدنی فرائض مقرر نہیں کیئے گئے تھے۔ اس بھجن میں برہماجی کے اوصاف بیان ہوئے ہیں اور لکھا ہے کہ ست (حق) اُن کے منہ سے پیدا ہوا۔ رآج اُن کے سینے سے تم (تاریکی) ان کی رانوں سے اور "باقی" کو اُنھوں نے اپنے پیروں سے پیدا کیا۔ ان میں سے ہر ایک گن (وصف) کے لئے ایک ہزار جوڑے مذکر اور مؤنث پیدا کیئے گئے، جن کو مختلف وگ معراج پر اپہنچتی اندر زمار وت اور گندھرپ سپرد کیے گئے۔ گن سے متعلق یگ یعنی قرن ہیں۔ اول کرت ہے جس سے راستی اور پاکیزگی کا انہاک زمانہ مراد ہے۔ دوم ترتیا یعنی دانشمندی کا زمانہ۔ سوم دواپر یعنی تاریکی کا زمانہ۔ نبتن صاحب کا خیال ہے کہ "اس روایت میں کہ ترتیا یگ (جگ) کے خاتمہ عظم پرو نے ذاتیں قائم کیں تاریخی عنصر نہیں پایا جاتا ہے۔ یگ مشکل تاریخی قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ لیکن اسمیں شک نہیں کہ یہ پرانوں میں صاف لکھا ہے کہ ذاتیں ترتیا جگ میں قائم ہوئیں۔ اول جگ کے کامل لوگ جنمیں بعض خاموش، بعض غصہ ور، بعض چست و چالاک اور بعض متحمل اور پریشان تھے ترتیا جگ میں برہمنوں وغیرہ کی طرح

اپنی سابقہ پیدائش کے نیک و بد اعمال کے مطابق پھر پیدا ہوئے۔ اِسی بھجن مین سمجھایا گیا ہو کہ اُسوقت انتظام اچھا نہ تھا۔ لہٰذا دوسرا انتظام کیا گیا جسکی رو سے زور، مجرمون کا انصاف، اور جنگ کی خدمات چھتریون کے سپرد کیگئین۔ رسوم کی بجاآوری، متبرک کتب کا مطالعہ، اور قبول نذر کا کام برہمنون کے سپرد کیا گیا۔ تجارت، مویشی، اور زراعت کے کام ویشیون کے سپرد کیے گئے۔ کاریگری کا کام اور ادنیٰ خدمات شودرون کے حوالے کی گئین۔

رامائن کے اشلوکون سے یہ خیال پیدا ہوتا ہو کہ چار بڑے جگون مین ذاتین علی الترتیب دھرم کی حالت کو پہنچتی ہین۔ مثلاً جو زمانہ ویشیون کی نجات کے لیے موزون ہو اُسمین ایک شودر ہزار نفس کشی سے بھی پاکباز (دھرم والا) نہین ہو سکتا۔

برہما سے چارگانہ پیدائش کے قصے کے بالکل خلاف، یہ روایت ہو کہ ذاتین خود منوجی سے پیدا ہوئین جو برہما سے بہت سے دیوتاؤن اور اوتارون کی کئی پشتون کے بعد پیدا ہوے تھے۔

شانتی پران مین بھی یہی بیان ہو کہ دُنیا مین شروع شروع مین سب برہمن تھے۔ صرف انسان کے اعمال بد سے ذاتون مین تقسیم کر دیئے گئے۔ چند نیک اور بد اعمال کی فراولت کا نام ذات ہو۔ منی (یعنی وہ لوگ جو بلا امتیاز پیدا ہوئے ہین) اکثر ترقی کرکے برہمن ہو جاتے ہین، اور برہمنون کی اولاد کمتر د. برہمن ہو جاتی ہو۔ اِس کے متعلق ایک قول یہ بھی ہو کہ "اگر تم انسان کو محض اسکے اعمال کی وجہ سے برہمن تصور کرتے ہو تو اصل و نسل بیکار رہی تاوقتیکہ اُس کے عمل سے ظاہر نہو کہ وہ برہمن تھے" لیکن ذات کا یہ تغیر صرف دوسرے جنم سے ہوتا ہو نہ کہ اُس زندگی مین جو وہ نیک اعمالی مین بسر کر رہا ہو۔ ذات کی اصلیت کے متعلق ایک دوسرا شاعرانہ خیال ہری نبس مین ظاہر کیا گیا ہو:- "برہمن ایک ناقابلِ زوال عنصر (اکشر) سے پیدا کیے گئے۔ چھتری ایک قابلِ زوال عنصر (کشر) سے پیدا کیے گئے۔ ویش انقلاب سے، اور شودر دھوئین سے۔"

مندرجۂ بالا تمام باتون کا مطلب یہ ہو کہ ذات کی اصلیت و ماہیت کے بارے مین بہت متضاد بیانات ہین اور ان مین سے اکثر صاف طور سے سمجھ مین نہین آتے۔ تخلیق عالم کے قصے مین ذات بہت دن بعد کی ایک داستان ہو۔ کوئی کہتا ہو کہ وہ مختلف دیوتاؤن کے مختلف اعضاء سے پیدا ہوئی ہو۔ کوئی کہتا ہو کہ منوجی سے، کوئی کہتا ہو اصل سے۔ کوئی کہتا ہو نیستی سے ہست مین لائی گئی۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہو کہ ذات بھی انسان کی پیدائش کے ساتھ وجود مین آئی، جو کرت جگ مین بحالتِ کمال موجود تھی، لیکن بعد کو زوال مین آگئی۔ یہ بھی بیان ہوا ہو کہ پہلے صرف برہمن تھے، دوسرے لوگ بعد کو ہوئے۔ پس صاف ظاہر ہے کہ جب وید مدوّن ہوئے تھے تو بہت سے آدمی جو برہمن نہ تھے پجاریون کے طور پر کام کرتے تھے، اور ریاضت کیش عابد اپنی تپسیا کے ذریعہ سے ادنیٰ درجے سے برہمنون کے درجہ کو پہنچ جاتے تھے۔ ابتداءً جماعت کے تمام گروہ اپنی عبادت اور ریاضت سے خدا تک پہنچ سکتے تھے۔

جون جون برہمنون کے ملکی اختیارات بڑھے، اُنھون نے مذہب کو ایک جُداگانہ اور مقدس کام بنا دیا۔ ہم ان کو وراثتِ تخت کے مسائل حل کرتے اور اپنے فیصلون کا نفاذ کراتے دیکھتے ہین۔ قدیم لٹریچر مین بہت سی مثالین پائی جاتی ہین جن سے ظاہر ہوتا ہو کہ برہمن چھتریون سے تعلیم پاتے تھے۔ لیکن پرانون اور منو شاستر مین اُن چھتریون کے لیے جو برہمنون کی اطاعت نکرین موت کی سزا لکھی ہو۔ چنانچہ بسا اوقات جو ذات کے چھتری تھے برہمنون کی اطاعت و تنظیم کے صلے مین در اصل برہمن کر دیئے گئے۔ یہ یقینی امر ہو کہ بہت سی قدیم روایات برہمنون نے اس لیے گڑھی ہین کہ اصالت اور حصول نجات کے معاملہ مین چھتریون پر اُن کی فضیلت قائم رہے۔ بس ہم اُن قیاسات کا اندازہ کر سکتے ہین جو برہمنون کی ذات کی اصلیت

کے بارے مین قائم کیے گئے اور منو شاستر مین درج ہین۔ جیمس مل صاحب جو سائنس کی قدیم حالت کے اثر کو ہمیشہ کم وقعتی کی نگاہ سے دیکھا کیے، لکھتے ہین:- "ذاتون کی تقسیم کسی الہامی شخص، یا واضع قانون، یا مصلح قوم کا کام تھا، جو اُن فوائد سے آگاہ تھا جو محنت کی باقاعدہ تقسیم سے مرتب ہوتے ہین"۔ ذاتون کی محکومی کو وہ اُس راسخ الاعتقادانہ تخویف اور قوت پر منسوب کرتے ہین "جو مذہبی گروہ کی قدرت اور عظمت قائم رکھنے کیلئے اکثر کام مین لائی گئی۔ بلائے آسمانی کے بعد لوگ جنگ کی خونریزیون سے بالطبع ڈرتے تھے۔ چنانچہ برہمنون کے بعد فوجی گروہ نے جگہ پائی"۔

ہیرن اور کلیپرتھ وغیرہ صاحبان کی رائے ہے کہ ذات کی تقسیم نسل کے اصلی اختلاف پر مبنی ہے "اور اعلیٰ درجہ کے لوگ نہایت خوبصورت ہوتے ہین۔ برہمنون کا صاف نقشہ اور سڈول چہرہ شودرون سے اُسی طرح ممیز کیا جا سکتا ہے جسطرح اسپین کے سر بولی اہل یورپ سے ممیز ہو سکتے ہین۔ برہمنون اور دیگر ہمجنس اقوام کی اونچی پیشانی، قوی جسم، ہلکا مسی رنگ نیچ ذاتون کی قدرے پست اور چوڑی کھوپڑیون، پیچیدہ بدن اور سیاہ تانبے کے رنگ سے بالکل جداگانہ ہوتا ہے"۔ یہ بیان ظفرمندی کی اُس روایت سے منطبق ہے، جو اونچی ذات والون نے نیچ ذات والون پر حاصل کی۔ اسمین شک نہین ہے کہ ہلکے رنگ کی تین ذاتون (رنگی دار رنگ) مین سفید رنگ کے برہمنون، سُرخ چہرے والے چھتریون اور زرد چہرے والے ویشون کا قدیم برہمنون اور برہمنون مین آریون کے طور پر ذکر ہوا ہے "سنسکرت دان فاتح سیاہ رنگ کے تورانی اصلی باشندون داسون سے بالکل الگ تھلگ تھے۔ اصل مین آریہ جس کے معنی نجیب شریف کے ہین سنسکرت مادہ "آر" سے نکلا ہے جس کا مطلب خانہ دار (گرہست) ہے اور سب سے بڑی قوم یعنی ویشون کا اصلی نام یہی تھا۔ راتھ صاحب اپنی تصنیف "برہما اور برہمن" مین فرماتے ہین کہ "ویدک لوگ اپنے وطن پنجاب سے آئے اور اصل باشندون کو پہاڑون پر بھگا کر اُس ملک پر قبضہ کر لیا جو گنگا جمنا اور کوہستان وندھیا کے مابین واقع تھا۔ اس ابتری اور پیچیدگی کی حالت مین اُن لوگون کے ہاتھ مین قدرتی طور پر قوت آگئی جن کو کوئی صریح اختیار نہ تھا یعنی مختلف راجاؤن کے خانگی پجاری مالک ہو بیٹھے۔ اُنھون نے شودرون کو بطور مفتوح قوم کے تصور کیا جو شاید اُس آرین خاندان کی ایک شاخ تھے جو اُن سے بھی پہلے ترکِ وطن کر کے ہندوستان کو آیا تھا۔ آخرالذکر قیاس اس امر کے خلاف ہے کہ شودرون کو وید کی تین بڑی قربانیون مین شرکت کی اجازت نہ تھی۔ بھگت پران مین صاف طور پر اُنھین اجازت ہے کہ وہ منترون کے بغیر قربانی کر سکتے ہین۔ اسمین شودرون کے فرائض لکھے ہین جن کا تعلق برہمنون اور گائون سے ہے۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر وہ غیر خون والے کی قوم کے ہوتے تو اُن کو یہ اجازت نہ ملتی"۔

مگر جب تک یہ فرض نہ کر لیا جائے کہ فاتح قوم مین پیشتر سے بڑائی چھوٹائی کے درجے قائم تھے یہ بات سمجھ مین نہین آتی کہ جنگجو فرقے نے جسکو فتوحات کا مالک کہنا چاہیئے، برہمنون کے درجے سے کمتر درجہ کیونکر قبول کیا۔ شودرون کی حالت و حیثیت سے یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ مفتوح تھے۔ لیکن اس تفریق کے قوی تاریخی وجوہ ہین کہ برہمن اور شودر مختلف اقوام سے تعلق رکھتے تھے یا دونون مین سے کوئی ایک قوم پر محدود تھے۔ میئرس صاحب نے اس تفریق مین خفیف تبدیلی پیدا کی ہے۔ وہ فرض کرتے ہین کہ "بجائے ایک فتحمندی کے متواتر دو تارک الوطنیان ہوئین۔ اوّل تارک الوطنون کو دوسرے تارک الوطنون نے زیر کیا۔ اور اس کے بعد وہ اپنے فاتحون اور اصلی باشندون کے درمیان ایک متوسط درجہ مین قائم ہوئے یا اگر اصلی باشندے نہ تھے تو دو تارک الوطن قومون کے میل سے ایک درمیانی درجہ قائم ہو گیا"۔ اِسیطرح مسٹر نال بوائز و ہیلر کی رائے ہے کہ شاید شودر اُس قوم کے اصلی فاتح تھے جو اب پاریا کے نام سے مشہور ہے"۔ اِن سب بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذات کا موجودہ نظام کس طور سے ایک زمین سے

دوسری زمین کو اور ایک وطن سے نو آبادیون کو منتقل ہوا اور اسکی کئی صورتوں میں تبدیلیان واقع ہوئین۔ حالانکہ جنگلی فتحمندی سے اکثر غلامی رائج ہوجاتی ہی لیکن اس سے یہ نتیجہ نہین نکلتا کہ پجاریون کا رتبہ بلند ہوجائے۔ بجز بڑے تاریخی واقعات یا بڑے قومی حالات یا نظام تمدن کے کسی کارساز کی موجودگی تسلیم کرنا اصول سائنس کے خلاف ہے۔

نجمن کا نسنٹ صاحب کا قول ہی کہ "ذات کا نظام دو چیزون پر مبنی ہی ایک یہ مذہبی خیال کہ بعض لوگون پر وہ داغ لگا ہوا ہی جو مٹ نہین سکتا اور دوسرا وہ تمدنی خیال کہ بعض کام صرف بعض فرقے ہی کرسکتے ہین۔ شرع موسوی مین جسمانی طہارت کے خیال کو بڑی وقعت دیگئی ہی چنانچہ لیسنس کے ناگی قواعد جو چار درجون مین منقسم تھے برہمنون کی فضول امتناعون سے بالکل متشابہ ہین۔ چونکہ تجارت وصنعت پیشہ لوگونکے روزانہ اختلاطات ایسے بیشمار مواقع پیدا ہوتے ہین جبکہ اصلی یا فرضی نجاست کا دھبہ لگنا ممکن ہی اسلیئے مذہبی گروہ کی قوت خواہ مخواہ نہایت وسیع ہوجاتی ہی کیونکہ وہی لوگ طہارت کے قواعد اور ان کے انحراف کی سزائین تجویز اور نافذ کرتے ہین۔

مکلیوڈ صاحب نے بھی دو مفید باتین بیان کی ہین جو ذات مین داخل ہوتی ہین۔ "اول دنیا مین جو جگہ متعین کیگئی ہی وہ خدا کے حکم سے ملی ہی دوم دنیا مین آرام اور باہمی راحت حاصل کرنے کے لیے ہمدردانہ حرکت اور بردباری کی اشد ضرورت ہی" اسمین شک نہین کہ ہندو بالطبع نہایت ہی مذہبی ہین اور اسوجہ سے وہ بالطبع پروہتی کیلیے تیار رہتی ہین۔ ان کو اپنے قومی بھجنون سے سرگرمانہ گرویدگی تھی جنھین بعض کی وجہ سے ان کو فتحمندیان حاصل ہوئین۔ بعض بھجن قدرتی سود مند موثرات سے متعلق تھے۔ صرف پجاری ان بھجنوں کو پڑھ سکتے ہین اور یہ یقین کیا جاتا تھا کہ تلفظ کی ذراسی بھی غلطی دیوتاؤن کی ناراضگی کا باعث ہوتی ہی لیکن روحانی حکومت کی شرائط خواہ کیسی ہی آسان اور مفید ہون مگر برہمنون نے محض قدرتی ذریعہ سے فضیلت حاصل نہین کی بلکہ سخت مجادلہ و مقاتلہ کو کام مین لاکر عروج پایا۔ بیان کیا جاتا ہی کہ پرسرام نے جو برہمنون کے بڑے نامی سورما تھے تین مرتبہ چھتریون سے سات گنی ذات کو دنیا سے نیست و نابود کیا اور سمنتا کی پانچ بڑی جھیلون کو ان کے خون سے بھر دیا۔

مسٹر وھیلر کا خیال ہی کہ برہمنون نے پولٹیکل عظمت قائم کرنے کیلیے جنگی دعوتون مین غلہ اور گھی کے بجائے خونی قربانی اور سوم شراب کی نذر اختیار کی تھی۔ پس تاریخ ہند کے اس برہمنی دور تک جو چھٹی صدی قبل ولادت مسیح شاکیہ منی گوتم بدھ کی آمد پر ختم ہوتا ہی منو جی کا قائم کردہ معیار ذات کوئی امر واقع نہین مانا جاتا تھا۔ وہ معیار حسب ذیل تھا۔ "برہما جی نے برہمنون کے یہ فرائض مقرر کیے، وید پڑھنا اور وید پڑھانا، جگ کرنا اور جگ کرانا، دان لینا اور دان دینا۔ چھتریون کے فرائض یہ ہین کہ رعایا کی محافظت کرنا، دان دینا، جگ کرنا، وید پڑھنا اور حظوظ نفسانی سے بچنا۔ ویش کے فرائض یہ ہین مویشی کی حفاظت کرنا، دان دینا، جگ کرنا، وید پڑھنا، تجارت کرنا، سود پر روپیہ چلانا، زمین کی کاشت کرنا۔ یہ تینون ذاتین دو جنمی اجنیوپ پہنتی ہین۔ شودر کا محض یہ کام ہی کہ وہ بلا اکراہ مندرجہ بالا ذاتون کی خدمت کرے۔"

اس استحقاق کی وجہ سے کہ برہمن سب سے پہلے پیدا ہوا اس کا حق تمام کائنات پر ہی اپنے شکار کے سوا وہ کسی اور کا گوشت نہین کھاسکتا۔ اسکی پوشاک بھی جدا گانہ ہی۔ تکلیف و مصیبت کے وقت اس کا فرض ہی کہ فوجی اور تجارت پیشہ لوگونکی مدد کرے۔ وہ شودر کا مال و متاع اور جو کچھ اس نے محنت و مشقت یا ایک حصہ مقررہ کے علاوہ ترکہ مین حاصل کیا ہی غصب کرسکتا ہی۔ شودر کا کام دو جنمون کی خدمت کرنا ہی اور اگرچہ آزاد بھی کردیا جائے لیکن وہ پھر بھی شودر رہیگا۔ وہ وید نہین پڑھ سکتا اور جگ یا قربانیون مین تبرک و ویدون سے کام لے سکتا ہے۔

جو شودر مصیبت مین ہو وہ کاریگر ہو سکتا ہے اور انھین حالتون مین ویش بھی خدمت کا کام کر سکتا ہے۔ برہمن خواہ کیسا ہی جرم کرے مگر اُسکی جان مادیا اُس کے جسم پر ہاتھ نہین اُٹھایا جا سکتا بلکہ جو شخص گھاس کے ایک دانہ سے برہمن کو مارتا ہے وہ ۲۱ جنم تک چوپایہ رہتا ہے۔ ریاستی کامون مین برہمن جملہ شیرون کا افسر سمجھا جاتا تھا۔ وہ راجہ کا پروہت ہوتا تھا۔ ٹیکس سے مستثنیٰ تھا۔ رسوم عامہ ادا کرتا تھا۔ دھرم شاستر کا مفسر تھا اور اس کے ساتھ ہی جسمانی و روحانی حکیم تھا۔ کم متبرک لوگونکی بہ نسبت اُسکے خراب (ناپاک) ہونے کا زیادہ احتمال ہے اور اسوجہ سے اُسکو زیادہ طہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر چھتری برہمن کو بُرا کہے تو اُسکی سزا ایکسو پن (ایک سکہ) ہے اگر ویش بُرا بھلا کہے تو اُسکی سزا دو سو پن اور اگر ایک شودر برہمن کو بُرا بھلا کہے تو اُسکی سزا تازیانہ ہے۔ اگر برہمن انھین سے کسی کو بُرا بھلا کہے تو اُسکو پچاس پچیس اور بارہ پن علی الترتیب دینا پڑتا ہے۔ حلف دیتے وقت برہمن کو صرف اسکی سچائی کی قسم دی جاتی ہے چھتری کو اس کے ہتھیار گھوڑا اور ہاتھی کی۔ ویش کو گائے غلہ یا اسباب کی اور شودر کو خراب سے خراب قسمین دی جاتی ہین۔ ہندو طبائع قسمون سے مالامال ہین حلف کے موقع مین کبھی تو دھرم کی قسم دی جاتی ہے کبھی برہمن کے پیر کی کبھی کسی دیوتا یا دریا کی اور کبھی پیپل یا تبرک۔ ذاتون کی پہچان شادی کے طریقون سے بھی ہوتی ہے جو باتین برہمنون سے مخصوص ہین وہ یہ ہین:۔

بر اور کنیا کو کپڑا اور زیور دیکر بر کو بلا کر کنیا سپرد کرے۔ یہ برہم داہ (بیاہ) کہلاتا ہے۔

یگیہ مین رتوج کو النکار سمیت کنیا دے وہ دیو وداہ کہلاتا ہے۔

ایک یا دو گئو اور بیل بر سے لیکر کنیا دے وہ آرش وداہ کہلاتا ہے۔

کنیا اور کنیا کی ذات والون کو دولت دیکر کنیا لینا آسر وداہ کہلاتا ہے۔

مار پیٹ کر کے روتی پکارتی ہوئی کنیا کو گھر سے لے آنا راکشش وداہ کہلاتا ہے۔

چھتری کی کنیا تیر کو گرہن کرے اور ویش کی کنیا آنکس یا تازیانے کو اور شودر کی کنیا کپڑے کے کونے کو پکڑے جبکہ اُس کا وداہ بڑی ذات کے پُرش سے ہوتا ہو۔

منوجی کا مقرر کیا ہوا قاعدہ ہندوستان کی موجودہ ذاتون پر بہت کم عائد ہوتا ہے چنانچہ (۱) منوجی نے کاریگرون کی کسی ذات کا ذکر نہین کیا ہے (۲) دوسری ذات کے ساتھ کھانا کھانا یا دوسری ذات کا پکایا ہوا کھانا پورے طور سے جائز تھا لیکن نئی زمانہ اگر ایسا کیا جائے تو ذات جاتی رہیگی۔

بودھ مذہب کی تلقین سے اس نظام مین بہت بڑی اصلاح پیدا ہوئی ہے جسطرح چارون دریا جو گنگا مین گرتے ہین اس متبرک دریا کے پانی مین مل کر ان کا کوئی نام نہین رہتا اُسی طرح جو لوگ بدھ کا مذہب رکھتے ہین وہ برہمن چھتری ویش اور شودر کے نام سے کوئی سروکار نہین رکھتے"

مہاتما بدھ کے بعد شودرونکی نسل نے ہندوستان کے بہت سے حصو نمین حکومت کی ہے اور سلطنت مغلیہ کے زمانہ مین کائستھ جو شودرون کی ایک ذات ہے[1] تمام پبلک دفاتر کا اجارہ لیے ہوئے تھی۔ لیکن بدھ نے ذات کو خارج کرنا نہین چاہا۔ مثلاً بیان ہے کہ ایک برہمن پنڈت جسنے بودھ مت اختیار کر لیا تھا اگر راجہ اُسکو چھو لیتا تھا تو اُسکو سر سے پانون تک غسل کرنا لازمی ہوتا تھا۔ اسکندر اعظم نے پنجاب مین کوئی ذات نہین پائی لیکن میگاستھنیز نے کاشتکارون اور سوداگرون فوجی اقوام اور صوفیون کا حال قلمبند کیا ہے جن کو اُسنے گنگا کے ملک مین پایا۔ اس کے لفظ "صوفی" کے استعمال سے گمان غالب ہے کہ میگاستھنیز نے برہمنون کو گوشہ نشینون یا فقیرون سے خلط ملط کر دیا اور اسی سے اُس کے اس بیان کی توضیح ہوتی ہے کہ ہر ہندو برہمن ہو سکتا تھا۔

[1] پدم پُران وغیرہ کی رو سے کائستھ شودر نہین ہین (مترجم)

میگاستھینز نے کچھ زمانہ سینڈروکوٹس بمقام سلیوکس نکٹر کے دربار مین گزارا تھا۔ بعد کے یونانی مورخ اس کے بیان کی پیروی کرتے ہین اور برہمنون کی سات ذاتین گناتے ہین یعنی (۱) صوفی (۲) کاشتکار (۳) چرواہے (۴) کاریگر (۵) سپاہی (۶) محتسب (انسپکٹر) (۷) مشیر۔ جب برہمن از سر نو برسر اختیار ہوئے تو معلوم ہوا کہ دوسری اور تیسری ذات غائب تھی اور اب برہمن شودر اور کئی مخلوط اقوام جو ابتدائی بارہ فرقون سے پیدا ہوئی تھین میدان پر قابض تھین۔ خود منوجی نے ان رذیل ذاتون کی فہرست لکھی ہے اور آئین اکبری مین بھی صاف بیان ہے کہ اُس زمانے مین چھتری کے نام سے پانچسو فرقے یا قبیلے تھے اور اصلی ذات مفقود تھی۔ ان ملکی فرقون مین بہت سے دراصل تجارتی گروہ تھے جنمین سے بہت سے گانون مین رہتے تھے اور ایک اونچی ذات سے اپنا سلسلۂ قرابت بتاتے تھے۔ مثلاً بنگال مین ویدیا بیدون کا ایک فرقہ ہے جسکی ابتدا منوجی نے اسطرح بیان کی ہے کہ ان کا باپ برہمن اور مان ویش تھی۔ سیجرنگل صاحب لکھتے ہین کہ صرف میسور مین ۱۱۰ ذاتین ہین۔ جیسا کہ کوبرگ صاحب فرماتے ہین برہمن اور شودر تمام پیشے کرتے ہین لیکن برہمن (جو اپنی مذہبی کتب سے بیحد ناواقف ہین) اب بھی ویدک علم کا گویا ٹھیکہ لیے ہوئے ہین حالانکہ ان کو پرانون اور منوشاستر مین بہت معمولی دخل ہے۔ اگرچہ برہمن اور ذاتون کو مذہبی کامون سے خارج کرنے مین کامیاب ہو گئے لیکن اُن کا صرف ایک مختصر حصہ مذہبی فرائض کے ادا کرنے مین تعلیم حاصل کرنے مین حتی کہ دان لینے مین مصروف ہے۔ بہت سے برہمن افواج مین سپاہی ہین بہت سے پانی پلاتے ہین بہت سے خانگی ملازم ہین۔ دوسری ذاتون کی طرح انکی بھی کئی ذاتین ہین جو قربی تعلق اور باہمی مناکحت کی مانع ہین۔ اصل برہمنون کا اب پتہ نہین ہے بجائے ایک ایسے پجاری کے "جس کے سر اور ڈاڑھی کے بال کترے ہوئے ہون جس کے جذبات مغلوب ہون جسکی قبا سفید ہو جس کا بدن صاف ہو جس کے کانون مین سونے کی بالیان ہون" ایک ذلیل خود غرض میلا کچیلا شخص جسکی باقی ماندہ قوت بے ایمانی سے زبردستی روپیہ وصول کرنے مین مصروف ہو نظر آتا ہے۔ لیکن ذات کا جو اثر ہندو طبائع پر پڑا ہوا ہے وہ اب بھی ہویدا ہے۔

اب بھی عام طور پر عمدہ شادی وہی سمجھی جاتی ہے جسمین جانبین ایک ہی ذات کے ہون لیکن ان مین آپس مین کوئی خاندانی تعلق نہو۔ اسمین شک نہین کہ تین اونچی ذاتین اپنے سے نیچی ذات مین ہمیشہ شادی بیاہ کر سکتی تھین اور ان سے جو اولاد پیدا ہوتی تھی کمتر درجہ مین داخل ہوتی تھی۔ یا بعض اوقات ایک نئے درجہ مین داخل ہوتی تھی۔ شودر کے لیے یہ ضروری بات نہ تھی کہ وہ اپنی ہی ذات یا گروہ مین شادی کرے۔ سنہ ۱۸۶۸ء مین پریوی کونسل کی جوڈیشل کمیٹی نے ایک فیصلہ کیا ہے جسمین ملاوار قوم شودرون کی ایک نکمی ذات کے زمیندار کی شادی شودرون کے دلالہ قوم کی عورت سے جائز رکھی ہے۔ یہ بھی ایک عام بات ہے کہ ایک عورت اپنی ذات سے نیچے والے سے شادی نہین کر سکتی لیکن مرد چاہے تو ذلیل سے ذلیل ذات کی عورت سے شادی کر سکتا ہے کیونکہ منوجی کے دھرم شاستر مین لکھا ہے کہ برہمن اور شودر سے جو اولاد پیدا ہو وہ ساتوین نسل مین اعلیٰ ترین ذات مین شمار ہو سکتی ہے۔ مرد اور عورت مین ایک کی ذات جاتے رہنے سے دونون کے تعلقات شکست ہو جاتے ہین۔ اگر ذات سے خارج شدہ عورت بے اولاد ہو تو وہ مردہ تصور کی جاتی ہے اور اُس کے لیے تجہیز و تکفین کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ اگر اس کے لڑکا موجود ہے تو اُسکا فرض ہے کہ اُسے گزارا دے۔ یہ امر قابل بیان ہے کہ ایک کسبی کی ذات مین فرق نہین آتا بشرطیکہ اُس کا تعلق اُسی کے ہم قوم شخص سے ہو۔ اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ خواہ ذات سے کیسا ہی کام نکلے وہ عوام کے اخلاق کی محافظ اور قابل اعتبار محافظ نہین ہے۔ شادی کی امتناعات سابق مین بہت سخت

نہین مگر اب انمین آسانیان ہو گئی ہین ۱۸۵۶ء کے ایک قانون سے بیوہ عورتین دوسری شادی کر سکتی ہین بشرطیکہ وہ متوفی شوہر کی جائداد سے دست بردار ہون لیکن اس صورت مین کہ متوفی شوہر نے عقد ثانی کی اجازت دیدی ہو، وہ جائداد پر بھی قابض رہ سکتی ہین۔ بہت سی صورتون مین شودر اُن قیود سے بری ہین جو اونچی ذات والون کے لیے مقرر ہین مثلاً شودر اپنی لڑکی یا بہن کے بیٹے کو متبنٰی کر سکتا ہو، حالانکہ یہ اُس عام قاعدے کے خلاف ہو کہ متبنٰی کرنیوالا وہ شخص ہونا چاہیے جو متبنٰی کی مان سے شادی کر سکتا ہو۔ شودرون مین یہ بھی قید نہین کہ جسکو گود بٹھایا جائے وہ اُسی ذات گوتر یا خاندان کا ہو جس ذات کا گود بٹھانے والا ہو۔ اصل مین شودر کسی شادی شدہ کو گود نہین بٹھا سکتا۔ بلحاظ وراثت کے شودر دوسری ذاتون کے مقابلے مین کامیاب نہین ہو "مختلف قبیلون مین برہمن کے بیٹون کے چار مین دو اور ایک حصہ ہو، چھتری کے بیٹون کے تین دو اور ایک حصہ، ویشون کی اولاد کے دو حصے یا ایک حصہ ہو"۔ اس سے مراد یہ ہو کہ برہمن شاستر کے مطابق چار مختلف ذات والون سے شادی کر سکتا ہو، چھتری تین مختلف ذات والون سے اور ویش دو مختلف ذات والون سے۔ لیکن ان سے کمتر ذات کے لوگون کے بیٹے اُس جائداد سے محروم رہتے ہین جو ان کے باپ کو ترکہ مین ملی ہو۔ شودر کا بیٹا اُس زمین سے بھی محروم ہو جو خریداری سے حاصل کیگئی ہو۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ۱۸۵۰ء کے قانون سے ذات ٹوٹنے، ورثہ حاصل کرنے یا متبنٰی ہونے کے حق مین کوئی اثر نہین پڑتا۔ اُن وراثت کی حالتون مین جبکہ متوفی لاوارث مرے ہون اور کوئی گرو یا شاگرد یا ہم سبق نہو (جن کو شاستر نے رشتہ دارون کے بعد وارث قرار دیا ہو) تو ایک پجاری یا کوئی برہمن جائداد کا وارث ہو سکتا ہو۔ اگر ایک شودر برہمن کا اکلوتا بیٹا ہو تو بیشتر ترکہ کا دو تہائی حصہ لے گا۔ یا اگر وہ کسی دو جنمے باپ کا اکلوتا بیٹا ہو تو بیشتر انصف جائداد پائے گا

گمان غالب ہو کہ ہم ذات بیٹون مین مساوی تقسیم کا قاعدہ شروع شروع مین برہمنون مین جاری نہ تھا بلکہ خدا کے فرزند اکبر ہونے کے لحاظ سے اپنی ذات کے سب سے بڑے بیٹے کو وارث قرار دینے کے دستور پر چلتے تھے۔ برعکس اسکے ۱۸۶۹ء مین جوڈیشل کمیٹی نے صدر عدالت کے پنڈتون کی مجموعی رائے کے خلاف یہ قرار دیا کہ جائز اولاد نہونے کی حالت مین شودر کی ناجائز اولاد اپنے باپ کی وارث ہو گی، اور اگر جائز اولاد بھی ہو تو وہ اسکی جائداد سے صرف گزارہ پائیگی۔ اس سے پہلے ۱۸۵۹ء مین سر اڈورڈ رائن نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ راجپوت کے ناجائز بچے یا کسی اعلیٰ ذات کے کسی دوسرے ممبر کو وصیت کی حالت مین بھی وراثت کا کوئی حق نہین اور وہ صرف گزارے کے مستحق ہین بشرطیکہ بچے تربیت پذیر و قابلِ تعلیم ہون۔

ایران کے بارے مین زند اوستا مین بیان ہو کہ وہان کے قدیم باشندے چار طبقون مین منقسم تھے: پجاری، سپاہی، کاشتکار اور کاریگر۔ ایک ہفت گانہ تقسیم کا بھی ذکر ہو۔ یہ تقسیم زرتشت کی ایجاد نہ تھی، بلکہ جمشید کے زمانہ ست جگ سے روایتاً چلی آتی ہو۔ مجی (مغان) پجاریون کی ذات شاگرد (ہیربد) اُستاد (موبد) اور اُستاد کامل (دستور موبد) تین حرفون مین تقسیم تھی صرف آخر الذکر اورمزد کے احکام پڑھنے کے مستحق تھے۔ یہی لوگ آیندہ کی پیشنگوئی کرتے تھے، اور متبرک زنار زم اور خوشہ کاہ رکھتے ہین۔ زندمین خوشہ گلو کو "برسم" کہتے ہین۔ بیان کیا جاتا ہو کہ اس لفظ کو برہم سے تعلق ہو جسکی علامت کشا گھاس کا ایک خوشہ ہو۔ ایرانی اور ہندو مذاہب مین ایک مزید تعلق اس رسم سے ہو جسکو سنسکرت مین "ہوم" اور ایران مین "ہوما" کہتے ہین۔

ہاگ صاحب نے اپنی تصنیف "اوریجن آف برہمنزم" مین لکھا ہو کہ زند اوستا مین پیروان اہورمزد کی تقسیم اتھرد، رتھیشتو، واستر من دعن ہندوون کی اعلیٰ ذاتون سے منطبق ہو۔ وہ یہ بھی لکھتے ہین کہ صرف

انھرو پجاریون کی اولادین پجاری ہو سکتی ہین۔ یہ قاعدہ پارسیون مین اب بھی جاری ہے۔

بائبل مین دانیال نبی کی کتاب یہ خیال رجوع کراتی ہو کہ مجوسی ایک جماعت تھی جو منتخب کیجاتی تھی، اور باقی ذاتو نمین موروثی کام یا مذہبی کٹر پن کی کوئی علامت نہین ہو۔ دبستان مین ایک فاتح اعظم مہ آباد کی نسبت روایت ہو کہ اس نے حبشیون کو معمولی چار ذاتون مین تقسیم کیا تھا۔ اشترابو بھی ایبریون مین بعینہٖ اسی قسم کی ایک تقسیم کا ذکر کرتا ہو جسکی نسبت وہ لکھتا ہو کہ لوگ پجاریون، سپاہیون، کاشتکارون، اور خدمتگارون مین منقسم ہین۔

کسی زمانہ مین یہ ایک عام رائے تھی کہ مصر مین کم از کم دو بڑی ذاتین (پجاری اور سپاہی) تھین جن کے کام باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتے تھے، چھوٹے پیشے بڑی ذاتون مین داخل ہوتے تھے اور وہ بھی موروثی ہوتے تھے۔ بعد کو بعض صاحبان نے اسکی تردید کی ہو اور لکھا ہو کہ مصری سوسائٹی کی تقسیم محض ویسی ہی تھی جیسی تمدنی ترقی کے بعض درجون مین شریف اور ذلیل پیشون مین بالعموم پائی جاتی ہو مختلف مصری خاندانوں کی یادگاری تصاویر مین رنگ نقشہ وغیرہ مین کوئی فرق نہین پایا جاتا، بیشمار قبرون اور لوحون سے متوفیون کے نام اور پیشے ظاہر ہوتے ہین۔

(ترجمہ از انسائکلوپیڈیا برٹانکہ)

ہادیانِ چین

اور اُن کی حکیمانہ و اخلاقی تعلیمات

تمام باشندگانِ چین (مسلمانوں کو چھوڑ کر) تقریباً تین مذاہب کے پیرو ہیں (۱) مذہب کنفیوشش (۲) مذہب لاؤ ٹزی (۳) مذہب بودھ۔ ان تینوں مذاہب کی اصل جداگانہ ہے، عقائد اور مذہبی رسومات مختلف ہیں، اور ہر ایک کے فلسفیانہ نقطۂ خیال میں بُعدِ عظیم ہے، لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ تینوں خاص کے بانی ہم عصر ہیں، کنفیوشش، لاؤ ٹزی اور بُدھ تینوں نے اپنے اپنے مذہب کی اشاعت چھٹی صدی قبل از مسیح یا اس سے قریب زمانہ میں کی۔ طرفہ یہ کہ تینوں معاصر ملل ایک ہی ملک میں مروّج ہیں، اور سب سے بڑھ کر حیرتناک امر یہ ہے کہ ان تینوں مذاہب کے پیرووں میں ہمیشہ نہایت یگانگت، مساوات اور رواداری کا برتاؤ قائم رہا ہے جسکی نظیر دیگر ممالک کی تاریخ میں مشکل سے دستیاب ہو سکتی ہے۔ اہل چین، باوجود تین (بلکہ اس سے بھی زائد) مذاہب کے پابند ہونے کے ایک قوم کہلاتے ہیں، اور فی الحقیقت ایک قوم ہیں۔ مذہبی تعصب، تنفر، اور ناروا داری سے انکے دل پاک و صاف ہیں، اور کسی ایک مذہب کی پابندی انکی دوسرے مذاہب سے بے اعتنائی یا نفرت کا باعث نہیں ہوتی۔ آپس میں اس درجہ میل جول ہے کہ مشہور ہے کہ ایک چینی مختلف لحاظ سے تینوں مذاہب کا پیرو ہو سکتا ہے۔ع۵

ہر چند کہ محققین مذاہب و ملل اس مسئلہ کے جواب میں کہ مذہب و اخلاق کا کیا تعلق ہے، آیا وہ ہمیشہ یکجا پائے گئے ہیں، اور ایک کا وجود بغیر دوسرے کے یا دوسرے کا بغیر پہلے کے ممکن ہے یا نہیں، نہ ہم آہنگ ہیں اور نہ آیندہ کبھی ہونے کی امید ہے، لیکن اسپر سب اتفاق رائے رکھتے ہیں کہ دنیا کے تمام بڑے مذاہب میں، جو اسوقت موجود ہیں یا جو تاریخی شہرت رکھتے ہیں، تعلیم اخلاق مذہب سے وابستہ پائی جاتی ہے۔ چاہے ان میں اعتقادات اور رسوم مذہبی کا کیسا ہی اختلاف کیوں نہو، بہرحال اخلاق کی تعلیم جزو مشترک پائی جائے گی۔ عیب جوئی اور نکتہ چینی کسے نہیں آتی اور وہ کون شے ہے جسکی مخالفت میں آج تک کسی نے زبان نہ کھولی ہو؟ جس آدمی کا مرکوز خاطر صرف تلاش معائب و نقائص ہو، یہ یقینی امر ہے کہ اُسے اپنے سوا کسی میں کوئی بھلائی نظر نہ آئیگی، اور نہ دنیا کی کسی چیز سے وہ متمتع اور منتفع ہو سکے گا۔ مبارک ہیں

ع۵ چینیوں کے اس اتحاد و یکرنگی کا حال دیکھنا ہو تو ڈاکٹر جوزف ایڈکنس کی کتاب "چین کے مذہب کی حالت" یا سر الفریڈ لائل کی کتاب "ایشیاٹک اسٹڈیز" ملاحظہ ہو۔

وہ لوگ جو بہرحال جویائے محاسن ہیں اور بحیثیت نفع رسانی خلائق کو مدنظر رکھتے ہیں آدمی چاہے جس مذہب وملت کا پابند ہو اور اُسکے خیال میں کوئی ایک مذہب سچا ہو، لیکن جب فراخدلی اور بے تعصبی سے دوسرے مذاہب کا مطالعہ کریگا اُسے بکثرت ہر جگہ ایسی باتیں دستیاب ہونگی جنکا تعلق کسی ملک، زمانہ اور قوم سے نہیں ہے، بلکہ جن کی عام سچائی قید تخصیص سے آزاد ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مذاہب عالم کا مطالعہ اس نقطۂ خیال سے نہ کیا جائے کہ اُن میں وہ کون سی باتیں ہیں جو بہرحال غیرفانی حصہ سمجھی جاسکتی ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے، اور اسکی سچائی سے کسے انکار ہوسکتا ہے؟ کہ کسی مذہب کی اخلاقی تعلیم سے آگاہ ہونا یا اُسکی حکیمانہ پندو نصائح سے متاثر ہونا کسی کے دین اور ایمان میں خلل انداز نہیں ہوسکتا۔ بلاشبہ یہ مذاہب کی مستقل عظمت ہے کہ وہ انسان کو اُنکے فرائض زندگانی سے جن کا دوسرا نام اخلاق ہے، مختلف طریقوں سے مطلع اور متنبہ کرتے ہیں۔ اس کلیہ سے کوئی مذہب مستثنیٰ نہیں۔ چنانچہ چین کے مذکورۂ بالا تینوں مذاہب باحسن الوجوہ اخلاق حمیدہ اور اعمال پسندیدہ کی رہبری کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک مذہب بودھ تو ہماری پاک سرزمین کا مولود ہے۔ اُسکا مخلصِ مہاتما شاکیہ منی گوتم بدھ مادر ہند ہی کا سپوت تھا۔ باقی دونوں مذہبوں کے بانی کنفیوشش اور لاؤزی چین ہی کے رہنے والے تھے۔ بہ نسبت بدھ کے یہاں کے لوگ ان دنیا کے دو بڑے معلموں کے حالات اور اخلاقی تعلیمات سے بہت کم واقف ہیں۔ لہٰذا ذیل میں ان مذاہب کا تذکرہ ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ نہایت ضروری ابتدائی حالات کے بعد ان میں سے ہر ایک کی اخلاقی تعلیمات کو مقصود اصلی سمجھا گیا ہے۔ نکتہ چینی اور عیب جوئی سے کہیں کام نہیں لیا گیا۔ امید ہے کہ یہ تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

(۱) مذہب کنفیوشش

کنفیوشس مسیح کی پیدایش سے تقریباً ۵۵۰ سال پہلے پیدا ہوا۔ اسکے زمانہ میں چین کی حالت نہایت ابتر تھی، جابجا چھوٹی بڑی خودمختار ریاستیں اجبار و شان کی قائم تھیں جن میں آئے دن معرکۂ جدال و قتال گرم رہتا تھا، قدیم تہذیب و تمدن کو ظالم حاکموں اور فرماں رواؤں کے ظلم و تعدی سے بہت کچھ صدمہ پہنچ رہا تھا، انصاف معدوم تھا، عوام الناس کے حقوق پامال کیے جاتے تھے اور سیاسی و مدنی حقوق کا کوئی خبرگیر اور محافظ نہ تھا۔ کنفیوشش نے ایسی خراب و خستہ حالات دیکھ کر اپنی زندگی کا یہ نصب العین قرار دے لیا کہ اہل ملک کو قعرِ مذلت سے نکال کر اُنکی اخلاقی، سیاسی، اور مدنی حالت درست کرے۔ اُس نے اپنی ساری زندگی ہم وطنوں کے اخلاق و اطوار سدھارنے کی کوشش میں صرف کی۔ لیکن اپنی محنتوں کا ثمرہ اپنی زندگی میں اسے دیکھنا میسر نہ ہوا۔ بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ اُسکی عمر بھر کی تندہی اور دردمندی بالکل ضائع گئی، اس لیے کہ جتنا قوم نے اُسکی پندو نصیحت پر توجہ نہ کی۔ وہ ایک امیر کے دربار سے دوسرے کے دربار میں جاتا تھا، اور جاتا اسی لیے تھا کہ کہیں تو اُسکی شنوائی ہو۔ اُس نے بہت سی ملازمتیں کیں، کہیں وزیر رہا، کہیں مشیر، کہیں منصف، کہیں منتی، لیکن کہیں اُسکی قدردانی نہیں ہوئی۔ اُسے اپنی قابلیت اور سعی پر بڑا بھروسا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر مجھے موقع دیا جائے تو زیادہ سے زیادہ حکومت کی بارہ ماہ میں نمایاں اصلاح کرسکتا ہوں، اور تین سال کے اندر ایسا انتظام کرکے دکھاسکتا ہوں کہ ہر قسم کے جرائم مسدود ہوجائیں۔ اُسکی یہ آرزو کبھی پوری نہ ہوئی اور اُسکے بدقسمت ملک نے اُسے کبھی اتنا موقع نہ دیا۔ کنفیوشش نقارخانہ کی طوطی کی طرح تھا جسکی آواز کوئی نہ سنتا تھا۔ ہاں چند رفقا اور تلامذہ اسکا اخیر دم تک ساتھ دیتے رہے۔ ۴۷۸ قبل از ولادت مسیح اُس نے نہایت غلامی و محن کی حالت میں انتقال کیا۔

کنفیوشس کی تعلیم کو حکمت عملی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، جس کا منشا اہل ملک کے اخلاق اور افعال کی اصلاح تھی۔ وہ واجب الوجود اور عالم روحانی کا قائل تھا لیکن بجائے تعلیم آخرت کے اُس نے صرف دنیاوی اصلاح کی جانب اس وجہ سے توجہ کی کہ اُسکے اہل وطن سیاسی، مدنی، اور اخلاقی حالت میں بہت زوال کر رہے تھے۔ گو اُس نے مردہ آباو اجداد کی پرستش اور دیگر مراسم مروجہ کو اپنی تعلیم میں مطلقاً برقرار رکھا مگر اُسکی تعلیم کا منشا سے مقاصد

اس دنیا میں اعلیٰ اخلاقی زندگی بسر کرنے کے طریقوں سے آگاہ کرنا تھا۔

کنفیوشس کی ادبی خدمات تو صرف یہ تھیں کہ اُس نے تواریخ، نظم اور اخلاق کی قدیم کتابیں بڑی تلاش اور جستجو سے بہم پہنچائیں اور انھیں خود ایڈٹ کیا۔ ان قدیم کتب کے اسماء یہ ہیں: ۔

(۱) یی کنگ (یی ی ک ن گ)۔ "مقدس کتاب تغیرات"

(۲) شُو کِنگ (ش ُو ک ِ ن گ)۔ "کتاب تاریخ"

(۳) شی کِنگ (ش ی ک ِ ن گ)۔ "کتاب اشعار"

(۴) لی کی (ل ی ک ی)۔ "کتاب مراسم"

شو کنگ میں جو عہد مابعد کے واقعات موجود نہ تھے انھیں اس نے خود تحریر کیا اور اس اپنی تصنیف کا نام "سوانح بہار و خریف" رکھا۔ اخلاقی تعلیم زبانی دیتا تھا۔ اُنکے شاگردوں نے انکے اقوال و نصائح کو تین مختصر جلدوں میں فراہم کر لیا جو کنفیوشسی مذہب کی چار کتب مقدسہ میں شامل ہیں۔ ان چاروں کے نام یہ ہیں: ۔

(۱) تا ہیو (ٹ ا ۔ ہ ِ ی ُ و) "علم بکراں"

(۲) چُنگ ینگ (چ ُ ن گ ۔ ی ن گ) "حکمت اوسط"

(۳) لن یو (ل َ ن ی ُ و) "متفرقات"

(۴) منگ تزی (م َ ن گ ۔ ٹ ِ زی) "تصانیف منشس"

کنفیوشس نے اپنی تعلیم میں اسلاف کی تعظیم و توقیر اور والدین کی اطاعت اور خدمت گزاری پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ ایک پورا صحیفہ جسکا نام ہسیاو کنگ (ہ ِ س َ او ۔ ک ِ ن گ) یعنی "کتاب متعلق فرماں برداری والدین" ہے اسی مبحث کے لیے مخصوص ہے۔ حسب ذیل اقتباسات اسی کتاب سے لیے گئے ہیں

۱۔ ہمارے اجساد ہمیں اپنے والدین سے وراثت میں ملتے ہیں، لہٰذا ہمیں اپنے والدین کو صدمہ پہنچانے یا مضرت دینے کا کبھی تصور نہ کرنا چاہیے۔ یہ اطاعت والدین کا پہلا سبق ہے۔ پھر جب بچے ان کے ساتھ اپنے اخلاق درست کر لیے اور آنیوالی نسلوں کے لیے نام نیک چھوڑتا، تو گویا بیٹے حقوق والدین کی آخری منزل طے کر لی۔ اسکی ابتدا اور ... کی فرماں برداری سے ہے۔ انتہا بادشاہ کی اطاعت سے اور اسکی تکمیل نیک عادات کی عادت سے۔ (الف)

۲۔ والدین کے ساتھ عام برتاؤ میں اولاد کو صد درجے کے ادب اور لحاظ کا اظہار کرنا چاہیے جب اُنکی خدمت کرے تو یہ پیش نظر رہے کہ انھیں صد درجے کا آرام پہنچے یا اُن کی بیماری سے دل مضطرب اور بیقرار ہو جائے۔ جب وہ مرجائیں اُنکے غم میں بیحد اندوہ ہونا چاہیے اُنکے نام کی قربانی کیجائے تو نہایت عقیدت مندی کا اظہار کیا جائے۔ (ب)

کنفیوشس نے جہاں اطاعت والدین پر اس قدر زور دیا ہے، والدین کو اولاد کی تعلیم و تربیت کے حقوق کی ادائیگی کی بھی شدید تاکید کی ہے۔ ایک مرتبہ جب ایک باپ نے اپنے بیٹے کی نالائقی کی شکایت کی تو کنفیوشس نے باپ و بیٹے دونوں کو قید میں ڈالدیا۔ جب باپ کی طرف سے اپیل دائر ہوئی تو کنفیوشس نے یہ فیصلہ صادر کیا:

کیا مجھے ایک ایسے شخص کو اپنے باپ کے ساتھ نافرمانی سے پیش آنے کی سزا دینی چاہیے، جسے اُسکے باپ نے ایسی تربیت ہی نہ دی ہو کہ اس باپ کی اطاعت اسکے جان گزیں ہو جائے! انسان فطری طور پر جرائم پیشہ نہیں ہے! ایسے باپ خاندان کے اندر اور حکومت ملک میں اُن خطاؤں کے ذمہ دار ہیں جو انکے مقابلہ میں بیٹے یا اہل ملک سے سرزد ہوں۔ اگر بادشاہ اشاعت قانون میں بے پرواہ ہے اور رعایا کو احکام قانون کی خلاف ورزی کی سزا دیتا ہے تو وہ دھوکہ باز ہے! اگر وہ خراج رعایا کو بغیر اطلاع دیئے وصول کرتا ہے، تو وہ ظالم ہے، اگر وہ لوگوں کو بغیر تعلیم و تربیت دیئے قتل کرتا ہے تو وہ ستم پیشہ ہے۔

یہ بھی صاف طور سے بتلا دیا ہے کہ تمام حالتوں میں اولاد کے اوپر اطاعت والدین فرض نہیں!

جب کوئی معاملہ باپ کی بدکرداری کا پیش آئے تو بیٹے کو مخالفت کرنی اور خواہی کا حق ہے یا اسی طرح وزیر کو اپنے بادشاہ سے۔ چونکہ لڑکا باپ کی بد اطواری کی وجہ سے ... ہے، اس لیے محض باپ کے احکام کی اطاعت کو کس طرح فرماں برداری والدین کہہ کر قبول میں شمار کر سکتے ہیں؟

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرائض اور حقوق کی بنا بہر حال دو ست گرداری پر رکھی گئی تھی۔

چاہے وہ ماں باپ کا معاملہ ہو یا حاکم و محکوم کا۔

کنفیوشس انسان کی فطری نیکی پر بڑا بھروسہ رکھتا تھا، اور نمونۂ اور مثال پر بہت زور دیتا تھا۔ اسکا قول تھا کہ جس طرح سونے کی خاصیت سختی، اور آگ کی گرمی ہو اُسی طرح انسان کی فطری خاصیت نیکی، راست بازی، عقل اور دیانت ہو۔ گرد و پیش اُسے بدکردار لوگ نظر آتے تھے مگر وہ ہمیشہ یہی کہتا رہا کہ طبعاً انسان درحقیقت نیک ہی تھا ہو۔

انسانی فطرت اور اُسکی استعداد و قدرت کی بابت جو خیالات کنفیوشس نے ظاہر کیے ہیں وہ تحیر خیز ہیں۔ اُسکی تعلیم ہو کہ

انسان اپنی قسمت کا آپ مالک ہو؛ یہی نہیں بلکہ وہ ارض و سما کے برابر ہو اور قدرت پر عمل کر سکتا ہو۔ کامل خلوص سے وہ اپنی فطرت اور سرشت کی بدرجۂ اتم تکمیل کر سکتا ہو جب ایسا کرلے تو وہ دوسروں کی جبیعت کی بھی اسی طرح اصلاح کر سکتا ہے۔ انسانی طبائع کی درستی کے بعد وہ حیوانات اور تمام اشیا کو مکمل کر سکتا ہے۔ حیوانات اور دیگر اشیاء کی تکمیل طبائع کے بعد وہ زمین و آسمان کی قوتوں سے تغیر و تبدل اور تربیت میں کامیاب ہو سکتا ہو۔ اس کے بعد وہ ارض و سما کا شریک ثالث ہو سکتا ہو۔ تب وہ ارض و سما کے برابر ہو جاتا ہے۔ اور جب ایسا ہو جائے تو امن و امان اور عیش و راحت کا راج ہو جائے، اور تمام چیزیں مکمل ہو جائیں۔ یہ ہے انسان کا منصب عالم میں۔ انسان کامل کی جبیعت بھی کامل ہوتی ہے۔ تمام انسان فطری صالح ہیں؛ اور انکے اندر وہ اوصاف مستتر ہیں جن سے وہ اپنی طبائع کو کامل بنا سکتے ہیں۔ جو چیز انسان کے اندر مضمر ہو وہ نیکی ہے اور جب وہ درجۂ کمال کو پہنچ جاتی ہے تو وہ اسکی فطرت ہو جاتی ہے[عہ]۔

اس سے کون انکار کر سکتا ہو کہ یہ خیال کہ انسان اپنی سرشت سے حقیقتاً نیک ہو اس خیال سے بدرجہا افضل ہو کہ وہ فطری بد ہو۔

ایک مرتبہ کنفیوشس سے کسی نے دریافت کیا کہ وہ کون سا لفظ ہو جس میں تمام اعمالِ زندگی کی نیکی کا راز مخفی ہو۔ کنفیوشس نے جواب دیا "کیا وہ لفظ مساوات نہیں ہے۔ آنچہ بر خود نہ پسندی بر دیگراں مپسند" اسی مقولہ کو کسی دوسرے

عہ وہ منہدہ محمد صاحب کی کتاب "کنفیوشزم" ص

موقع پر اس طرح وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے:

اعلیٰ انسان میں یہ چار خوبیاں ہوتی ہیں، جن میں اپنے میں کسی طرح جمع نہیں کر سکا، ہوتی ہیں یا نہیں اپنے باپ کی ایسی خدمت کرنا جیسی میں اپنے بیٹے سے اپنے لیے چاہتا ہوں؛ اپنے بادشاہ کی ایسی خدمت کرنا جیسی میں اپنے ماتحت وزیر سے چاہتا ہوں؛ اپنے بڑے بھائی کی ایسی خدمت کرنا جیسی میں اپنے لیے اپنے چھوٹے بھائی سے چاہتا ہوں؛ اور دوستوں کے ساتھ ایسا سلوک پہلے آپ کرنا جیسا میں اپنے دوستوں سے اپنے واسطے توقع رکھتا ہوں۔

(چنگ یُنگ ب ت ۴)

مذہب کنفیوشس کی رو سے نیکی کی پانچ قسمیں ہیں (۱) کرم (۲) صدق (۳) علم (۴) وفا شعاری و تدین (۵) شائستگی اطوار (یا حسن معاشرت) ان میں سے پہلی نیکی تمام نیکیوں کی جڑ ہو۔ بلکہ منشس نے جو کنفیوشس کا سب سے بڑا شاگرد ہو یہاں تک لکھا ہو کہ "کرم ہی انسان ہو" کو انگ زِیزی نے جو لاؤزی کا شاگرد رشید ہو یہ لکھا ہو کہ کنفیوشس نے کرم کی تعریف اس طرح کی تھی کہ "کرم یہ ہو کہ انسان نہایت خلوصِ باطن کے ساتھ تمام موجودات سے گہری ہمدردی رکھتا ہو، تمام آدمیوں سے محبت کرتا ہو اور خود غرضانہ خیالات اُسکے دل میں جگہ نہ پاتے ہوں" الغرض کرم سے کنفیوشس کی مراد محض "خیرات" نہیں ہو بلکہ وہ نیکی ہو جو تمام تعلقاتِ زندگانی پر حاوی ہو۔ وہ ایک دوسرے موقع پر کہتا ہے:-

نیکوکار کا کرم محض اپنے اعزا و اقربا تک محدود نہیں بلکہ اُسکے دائرہ میں حاکم و محکوم کے تعلقات بھی شامل ہیں۔ نیز اُسی کا قول ہو کہ "کرم تمام بنی نوع سے محبت کا نام ہے"

دیانت کو کنفیوشس انسانی عادات کا سنگ بنیاد قرار دیتا ہو۔ وہ کہتا ہے

۱۔ دیانت کو اصل الاصول سمجھو (۲) میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح کوئی بغیر دیانت کے زندگی بسر کر سکتا ہے۔

کسی دوسرے موقع پر کنفیوشس نے انسانی نیکیوں کا یہ لب لباب نکالا ہے:-

وہ شخص جو یہ پانچ چیزیں کر سکتا ہو نیک انسان ہو؛ اپنی اور دوسروں کی عزت کرنا۔ سخاوت، وفاداری، خلوص، نیک کاموں میں چستی اور تمام انسانوں سے محبت کرنا۔

عدل و انصاف اور رواداری کی تعلیم اس طرح دی ہے:-

۱- افضل انسان زندگی کے تمام حالات میں تعصب اور فساد سے مبرا رہتا ہے۔ صرف انصاف اسکا رہنما ہوتا ہے۔ اور اسکی تمام قوتیں عدل و انصاف اور بہی خواہی بنی نوع پر صرف ہوتی ہیں۔

۲- افضل انسان وہ ہے جو سب کے ساتھ مساوی بہی خواہی کا برتاؤ کرے، جو خود غرضی اور جانب داری سے پاک و صاف ہو۔

۳- بد وہ آدمی ہے جو صرف خود غرضی کے خیالات کو اپنے دل میں جگہ دے اور دوسروں کے ساتھ نیکی کرنے کا خیال اپنے دل میں نہ رکھتا ہو۔

برتر انسان یا انسان کامل کون ہے؟ اسکے جواب میں اس حکیم کے خیالات حسب ذیل ہیں :-

۱- برتر انسان وہ ہے، جس کی روح میں ہمواری و مساوات کے صفات ہوں۔ رذیل کا دل ہمیشہ پریشان اور متفکر رہتا ہے۔

۲- برتر انسان ہمیشہ ذہن اور قوت عمل میں ترقی کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ نالائق آدمی روز بروز جہالت اور بدکاری کی راہ میں بڑھتا ہے۔

۳- افضل انسان کے دل میں عدل و انصاف کا خیال رہتا ہے بکمینہ کے دل پر طمع غالب رہتی ہے۔

۴- اعلیٰ انسان عدل و مساوات کو تمام چیزوں سے بالا جانتا ہے۔

۵- برتر انسان اپنی لیاقت سے زیادہ نفع کا خواہاں نہیں۔ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ اسکی قابلیت اسکے نفع سے بڑھی ہوئی ہو۔

۶- افضل انسان منہ سے الفاظ نکالنے سے پہلے یہ سوچ لیتا ہے کہ آیا یہ الفاظ منہ سے نکالنے کے قابل بھی ہیں یا نہیں۔ وہ پہلے سوچ لیتا ہے کہ آیا یہ کام مفید ہے یا مضر، تب وہ اس کام پر ہاتھ ڈالتا ہے۔ وہ ایسا نیک اور راست باز ہوتا ہے کہ لوگ اسکی عزت کرتے ہیں۔ جس کام کو وہ ہاتھ لگاتا ہے اور پورا کرتا ہے، وہ ایسا ہوتا ہے کہ دوسرے اسے تقلید کے موزوں سمجھتے ہیں۔ اسکے چال چلن کو دیکھکر لوگ سدھرتے ہیں۔ اسکے تمام حرکات و سکنات ٹھیک قوانین کے موافق ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ لوگ اسکی عزت کرتے ہیں اسے محبوب رکھتے ہیں، اسکی پیروی کرتے ہیں اور اس جیسے ہوجاتے ہیں۔

۷- افضل انسان یہ نہیں چاہتا کہ سارا نفع اپنی ہی ذات کے لیے ہو بلکہ وہ دوسروں کو بھی متمتع اور مستفیض ہونے کا موقع دیتا ہے۔

۸- برتر انسان سب کا منظور نظر اور محبوب دلی ہے، وہ آسمان کی طرح وسیع، سرچشمہ آب کی طرح عمیق اور متحرک ہے۔ وہ مثل بحر ہے، جہاں جہاز پہنچ سکتے ہیں، جہاں انسانی قوت کی رسائی ہے، جہاں آسمان کا سایہ اور زمین کا فرش ہے، جہاں آفتاب و ماہتاب درخشاں ہیں، جہاں کہر اور شبنم پڑتی ہے۔ تمام ذی روح اور تمام متنفس اسکی عزت کرتے ہیں اور اس سے محبت رکھتے ہیں[1]۔ (لی-کی ب)

۹- افضل انسان جب لوگوں کی زبانی اپنی تعریف سنتا ہے تو صرف اس سے وہ خوش نہیں ہوتا۔ جب وہ ایسے شخصوں کا حال دریافت کرتا ہے جو سردی سے تکلیف اٹھا رہے ہوں تو وہ انہیں لباس دیتا ہے بھوکوں کو پیٹ بھر کے کھانا کھلاتا ہے۔ (لی-کی ب)

۱۰- برتر انسان خفیہ طور سے اپنے باطن کا معائنہ کرتا ہے کہ مبادا کوئی بدی وہاں جاگزیں ہو۔ یا کوئی سرچشمہ بے اطمینانی کا ہو۔

۱۱- برتر انسان بننے کی یہ ترکیب ہے کہ اپنے دلی جذبات کو نیکی اور راستی کی جانب مائل کیا جائے، مطالعہ کتب سے محبت کیجائے، مطالعہ کتب علم اور نیکی کا سرچشمہ ہے جسکی ثانی کوئی دوسری چیز نہیں۔ جب صدق و خلوص کے ساتھ عمل کیا جائے اور دل خود فریبی سے منزہ ہو تو قلب درست ہوجاتا ہے۔

۱۲- برتر انسان کے الفاظ اور اعمال میں مطابقت ہوتی ہے۔ کیا برتر انسان کی یہ صفت نہیں کہ وہ نہایت با اخلاص ہوتا ہے؟ (لی-کی ب)

۱۳- جب برتر انسان اپنے درجے کے موافق لباس زیب تن کرتا ہے تو اسکی آرائش افضل انسان کے اطوار و طرق سے کرتا ہے۔ اطوار و طرق کی زیبائش بڑے آدمیوں کے کلام سے کرتا ہے۔ زبان کی آرائش برتر انسان کے نیک اعمال سے کرتا ہے۔ اسلئے وہ اس سے شرمسار ہوتا ہے کہ لباس تو برتر لوگوں کا پہنے اور ان کے سے طور طریق نہ رکھے۔

[1] کہا جاتا ہے کہ یہ عبارت چین کی کتب مقدسہ میں نہایت صحیح و بلیغ ہے۔

یا ان کے علاوہ دوسری ہو مگر ان میں گفتگو ویسی نہ ہو۔ یا نیکیاں تو ہوں لیکن وہ محض ظاہر ہوں (ل۔ کی)

مندرجۂ ذیل نصائح کا منشا بھی تزکیۂ نفس اور تہذیبِ نفس ہی ہے:۔

جب تم کسی عقل مند کو دیکھو تو اپنے دل میں غور کرو کہ تم میں بھی اس کی خوبیاں ہیں یا نہیں۔
جب کسی بدکار کو دیکھو تو اپنے اوپر نظر غائر ڈالو اور اپنے حال کی جانچ پڑتال کرو۔

کاش خود ضبطی کی عادت ڈالو اور دوسروں کا اپنے سے مقابلہ اور ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کرو، جیسا تم چاہتے ہو کہ وہ تمہارے ساتھ کریں۔ یہ انسانیت کی تعلیم ہے، اور اس سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔

دوسری نصیحت کا جزوِ اخیر اُسی حکمت کا اعادہ ہے جسے اُس نے لفظ "مساوات" میں مضمر بتایا تھا۔ نیک و بد کی صحبت سے پند آموز ہونے کا کیسا اچھا طریقہ بتایا ہے:
اگر ہم سفر کرنیوالے تین آدمی ہیں تو مجھے بہرحال دو استاد (اپنے ساتھیوں میں) مل جائینگے نیک آدمی کو میں تقلید کی نیت سے منتخب کرونگا اور بدکار کو دیکھ کر اپنی ذات کی اصلاح کروں گا۔

کنفیوشس دنیا کے اُن چند لوگوں میں سے تھا جن کے قول اور فعل میں مخالفت نہیں ہونے پاتی۔ وہ منکسر المزاجی میں مشہور خلائق تھا۔ تعصب اور ہٹ دھرمی، خودغرضی اور خودفریبی کا جن سے بچنے کی وہ دوسروں کو نصیحت کرتا تھا، اُسکے عادات میں نام و نشان نہ تھا۔ لیکن پاک بازی اور نیکدلی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنی طرف سے مطمئن نہ رہے۔ کنفیوشس ایسا پاک نفس اور صاف باطن تھا لیکن اپنی بابت جو رائے رکھتا تھا، اُسے دیکھ کر ہر شخص پتہ لگا سکتا ہے کہ محاسبۂ قلب میں جیسی تاکید دوسروں کو کی ہے اُسے اپنے اوپر بھی ویسا ہی اہم فرض سمجھتا تھا:۔

میں ایسا نیک نہیں ہوں کہ خواہشات پر غالب آ جاؤں، نہ اتنا عقل مند ہوں کہ اپنے آپ کو چند مصائب و آلام سے پاک کروں، نہ اتنا بہادر ہوں کہ خوف و دہشت سے میرا دل کبھی ہراساں نہ ہو۔ (لُن یُو باب ۱۴ آیت ۲۸)

ایک اور موقع پر کہتا ہے:

اگر میں ایک ایسے شخص کا تصور کروں جس کی ذات میں "اتقا" اور "انسانیت" جمع ہوں تو بھلا میں اپنا موازنہ اُس سے کرنے کی جرأت کیسے کر سکتا ہوں؟ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ ان نیکیوں پر بغیر تھکے عمل کرنے اور بغیر مایوس ہوئے دوسروں کو تعلیم دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

جھوٹی باتیں بنانیوالوں اور چکنی چپڑی باتوں سے لوگوں کو دھوکا دینے والوں کو اس طرح متنبہ کیا ہے:۔

نامعقولی اور معصیت میں مبتلا ہوگا وہ آدمی، جس کے دل جھلانے والے اقوال کا اپنے افعال مطابقت سے نہ ہو۔ (ل۔ کی ۲۳)

ہمدردی بنی نوع، جو اُسکی تعلیم کا جزوِ اعظم ہے، اور جسکی بابت اوپر کی فصل میں بھی جابجا ذکر آیا ہے اُسکی بابت ذیل کا فقرہ کیسا دلپذیر ہے:۔
جہاں گہری ہمدردی کا مادہ ہے وہاں انسانیت کا اظہار دوسروں کے ساتھ محبت کرنے سے ہوتا ہے۔ (ل۔ کی ۲۹)

شاید ہی کوئی شخص، جو فلسفۂ اخلاق سے واقف ہو، کنفیوشس کے اس بیطیر قول سے اختلاف کرنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ "نیکی کی محبت ایسی ہونی چاہیے جیسی حُسن کی محبت ہوتی ہے"۔

اس سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں کہ جس طرح حُسن کی محبت صرف حُسن کے واسطے ہوتی ہے، اُسی طرح نیکی کی محبت محض نیکی کے واسطے ہو۔ یعنی کسی معاوضہ یا منفعت کی توقع امورِ خیر میں نہیں کرنا چاہیے ورنہ بجائے توقعِ نفع نیکی حقیقی نہ ہوگی۔ دوسرے جس طرح حُسن کی محبت کا تعلق دل سے ہوتا ہے، اور دل حُسن سے بغیر متاثر ہوئے نہیں رہ سکتا اُسی طرح نیکی کا تعلق دل سے ہونا چاہیے اور انسان کے دل میں ایسی صلاحیت موجود ہونا چاہیے کہ امورِ خیر سے بغیر متاثر ہوئے نہ رہ سکے۔ سبحان اللہ کیا پاک تعلیم ہے جسے ہر ذی ہوش کو اپنے دل میں جگہ دینا چاہیے۔

ایک جگہ تربیتِ حُسنِ معاشرت کے بعد وہ کہتا ہے:۔

تربیتِ نفس والا اپنے گرد و پیش کے لوگوں پر، تر ذاتی ہے اور رفتہ رفتہ تمام ملک پر۔

> ہر شخص کو اپنے اعتقادات کو ٹھوس رکھنا چاہیے اور اپنے اطوار کی حفاظت کرنا چاہیے۔ اخلاق رذیلہ کو اپنے دل سے نکال کر پھینک دینا چاہیے اور نیکی کو اپنا لباس، کرم کو اپنا راستہ، شائستگی و حُسنِ لیاقت کو اپنا لباس، عقل کو اپنا چراغ اور دیانت کو اپنا جادۂ قرار دینا چاہیے۔ متانت، ادب، اور وقار ہی تربیت یافتہ آدمی کی خصلتیں ہیں۔ متانت لے عوام الناس سے ممتاز کرتی ہے، سرزد ہو کر وہ محبوب خلائق ہوتا ہے یا منطبع ہو کر وہ مطاع عالم ہوتا ہے یا وفا ہو کر وہ ستودہ ہوتا ہے۔

نیز اُسی کا قول ہے کہ "خوش خلقی لیاقت کے قریب ہے، کفایت شعاری انسانیت کے قریب ہے اور ایمان داری سچائی کے قریب ہے"۔ ہر حالت میں سچائی پر قائم رہنے کی ان الفاظ میں اُس نے تاکید کی ہے کہ "تم شمال یا جنوب کے وحشیوں کے ملک میں بھی رہتے ہو تو بھی تمہارے اطوار خطا و قصور سے پاک ہونے چاہییں"۔ وہ لوگ اس نصیحت کو بالخصوص سُن رکھیں جو اپنے جرائم کو جھوٹی سچی مجبوریوں کا نام لے کر چھپانا چاہتے ہیں۔

اسی طرح بادشاہوں کو ذیل کی نصیحت کس قدر بامحل ہے:۔

> بادشاہ کو اپنے وزراء کے انتخاب میں اپنے وجدان کے موافق سارے الناس کے نفع کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اُسے اپنے فرائض کی تکمیل کا خیال رکھنا چاہیے۔ اور اُن فرائض کے قانون کو انسانی نیکی میں، جو تمام انسانوں کی محبت کا سرچشمہ ہے، تلاش کرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ بادشاہ کے لیے بھی سوائے اس کے چارہ نہیں ہے کہ اپنی ذات کی اصلاح کرے اور تکمیل فرائض میں ہمیشہ سرگرم رہے۔

کنفیوشس بعض مصلحین کی طرح دولت کو نظرِ حقارت سے نہیں دیکھتا تھا بلکہ وہ اس کی قوت سے بخوبی واقف تھا، لیکن وہ اس کی بُرائیوں سے بھی ویسا ہی آگاہ تھا۔ چنانچہ سند رجہ ذیل نصیحت ہمارے زمانہ میں جبکہ حصولِ دولت کا سودا عالمگیر ہے خصوصیت کے ساتھ نفع بخش ثابت ہوگی:۔

> دولت اور عزت انسان کے مطلوب ہیں۔ اگر جائز طریقوں سے وہ میسر نہ ہوں تو اُنکے حصول کی خواہش دل سے نکال دینا چاہیے۔ غریبی اور بے توقیری وہ چیزیں ہیں جو انسان کو مرغوب نہیں۔ اگر انسان درست کرداری کے ذریعے ان سے پیچھا چھڑا نہ سکے تو اُنکو حاصل نہیں کر سکتا تو اُنکو مردانگی سے برداشت کرنا چاہیے۔

ایک مرتبہ کسی نے کنفیوشس سے دریافت کیا کہ عوام کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے؟ اُس نے جواب دیا "اُنھیں فارغ البال اور متمول بنانا چاہیے"۔ دوبارہ پوچھا گیا کہ اس سے زیادہ کیا کیا جائے؟ تو اُسنے کہا "اُنھیں تعلیم دینا چاہیے"۔

کنفیوشس نے علم کی جو تعریف کی ہے اور اُسکی تحصیل کا جو طریق بتایا ہے وہ اس قابل ہے کہ دنیا کے تمام طالب علم اپنے لوحِ دل پر اُسے نقش کر رکھیں:

> جب تم کسی چیز کو جانتے ہو تو یہ کہنا کہ تم اُسے جانتے ہو، اور جب نہیں جانتے تو یہ تسلیم کرنا کہ تم اُسے نہیں جانتے، یہی علم ہے۔
>
> مطالعہ بغیر غور و خوض کے تضیعِ محنت ہے، ذاتی غور و خوض کے بغیر مطالعہ خطرناک ہے۔

کنفیوشس سے ایک مرتبہ دریافت کیا گیا کہ موت کیا چیز ہے؟ اُس نے جو عاقلانہ جواب اس سوال کا دیا ہے وہ اس قابل ہے کہ ہر شخص اُسے اخیر فیصلہ مان کر شاعرانہ قیاسات سے باز آجائے:۔

> جب انسان کو یہی نہیں معلوم کہ زندگی کیا چیز ہے تو موت کا اُسے کیا حال کھل سکتا ہے۔

کنفیوشس نے اعتدال پر بہت زور دیا ہے اور "خیر الامور اوسطہا" کی جابجا تعلیم دی ہے۔ اخلاقی جرأت، جس کا وجود معدودے چند لوگوں میں پایا جاتا ہے، اُسکا سبق بھی جابجا سکھایا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

> دریا میں بلا کرایہ کے دندوں اور خونخوار جانوروں کا مقابلہ کرنا ایک قسم کی بہادری ہے، زمین پر شکار کرنا۔ شیر اور گینڈے کو مارنا شکاری کی بہادری ہے، میدانِ جنگ میں تیر و تفنگ کا مقابلہ کرنا اور موت کو حیات تصور کرنا سپاہی کی بہادری ہے، لیکن یہ معلوم کرنا کہ غریبی آسمانی حکم ہے، اور انسانی معاملاتِ زندگی مدوجزر کے ماتحت ہیں اور مصائب سے کسی طرح خائف نہ ہونا عقل مند کی بہادری ہے۔

عادات کس طرح سنورتی ہیں:۔

> علم کا شوق علم کی نزدیکی ہے، استقلال نیکی کا قرب ہے، نجات اور شرمساری صداقت کے کی جاگی ہے۔ جو شخص ان تینوں باتوں سے آگاہ ہے وہ یہی جانتا ہے کہ عادات

کس طرح سنورتی ہیں۔ (لی۔کی)

ذیل میں چین کی کتبِ مقدسہ سے چین کے حکمائے متقدمین کے چند پند و نصائح کی گل چینی کرکے ناظرین کی خدمت میں ایک گلدستہ پیش کیا جاتا ہے، جس کے ہر پھول کی رنگت و بو شامِ دماغ کو معطر اور چشمِ بصارت کو منور کرتی ہے چونکہ ان کتابوں کا مدیر کنفیوشس ہے اس لیے ممکن ہے کہ بعض خیالات جو دیگر حکمائے متقدمین کی طرف منسوب کیے ہیں خود اُسی کے خیالات کا پرتو ہوں۔

(ا) شاہنشاہ گُوو، جس کا عہدِ سلطنت مسیح کی ولادت سے ۲۴۳۵ سال پیشتر تھا، کہتا تھا کہ

تمام انسانوں کی محبت سے بڑھ کر کوئی دوسری نیکی نہیں ہے اور مہاتِ سلطنت میں اس سے بڑھ کر اور کوئی کام اہم نہیں ہے کہ تمام آدمیوں کو نفع پہنچایا جائے۔

اس قول کی بزرگی اور قدامت ہمیں حیرت میں ڈالتی ہے۔

(ب) ایک مرتبہ شہنشاہ شُن نے (جس کا عہدِ سلطنت مسیح کی ولادت سے دو ہزار سال سے بھی پیشتر تھا) اپنے وزیر سے دریافت کیا کہ وُہ اخلاقِ حمیدہ کون سے ہیں۔ اُس وزیر نے جواب دیا:۔

(۱) خوش خلقی خودداری کے ساتھ (۲) نرمی استقلال کے ساتھ (۳) صاف گوئی ادب و تعظیم کے ساتھ (۴) امورِ سلطنت میں چستی توقیر کے ساتھ (۵) انکسار تہوّر کے ساتھ (۶) راست بازی مہربانی کے ساتھ (۷) اطمینان عاقبت بینی اور دقیقہ شناسی کے ساتھ (۸) بہت خلوصِ باطن کے ساتھ (۹) شجاعت اتقا کے ساتھ۔ (شوکنگ)

(ج) متقدمین میں سے ایک حکیم نے جسکا نام یُوئے ہے ایک بادشاہ کو مہاتِ سلطنت کی بابت اس طرح نصیحت کی ہے:۔

ہوشیار رہ۔ قوانین اور آئین کی بجا آوری میں تساہل نہ کر۔ آرام طلبی میں جادۂ اعتدال سے مت ہٹ۔ لائق لوگوں کو ملازم رکھنے میں اپنے اور اُنکے درمیان کسی واسطے سے کام نہ لے۔ بُرائی کو بلا تامل اپنے سے جدا کردے۔ ایسی تدابیر پر عمل نہ کر جنکی خوبی کی نسبت تجھے خود شبہ ہو۔ مطالعہ کیا کرتا کہ تیری اغراض عقل و حکمت کے مطابق رہیں۔ لوگوں کی مدح و ثنا کی طمع میں راست بازی کے خلاف کوئی کام نہ کر۔ لوگوں کے مقاصد کی مخالفت ذاتی منفعت کے خیال سے ہرگز نہ کر۔ (شوکنگ جلد اول)

(د) ایک وزیر نے جس کا زمانۂ حیات مسیح کی پیدائش سے اٹھارہ صدی پیشتر تھا، حسبِ ذیل تحیر خیز خیالات کا اظہار کیا ہے:۔

۱۔ نیکی کا کوئی یکساں معیار نہیں ہے۔ نیکی کی نسبت اعلیٰ خیال ہی اپنی آپ مثال ہے۔ نیکی کی کوئی مستقل اور یکساں صفت نہیں ہے جس کی بابت اعلیٰ خیال کیا جائے وہ صفت اُس جگہ پائی جاتی ہے جہاں وجدان علم سے موافقت و مطابقت ہو (ایضاً)

۲۔ کبھی بجز خلوصِ قلب کے مت رہو۔ اگر تم نہایت سختی سے اپنے چھوٹے چھوٹے کاموں کی حفاظت نہیں کرتے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ بڑے بڑے کاموں میں تمہاری نیکی کو صدمہ پہنچے گا۔ (ایضاً)

۳۔ کم عقل کا خیال ہوتا ہے کہ نیکی کے چھوٹے چھوٹے کام غیر مفید ہیں اور ایسے وہ اُنھیں نہیں کرتا۔ نیز وہ خیال کرتا ہے کہ بدی کے چھوٹے چھوٹے کام بے ضرر ہیں اس لیے اُن سے پرہیز نہیں کرتا۔ (یی کنگ)

۴۔ قابلیت کم عہدہ بڑا، عقل تھوڑی تدبیریں لمبی چوڑی، قوت کم اور بوجھ بھاری، جہاں کہیں یہ اسباب جمع ہو جائیں شاذ ہی ایسا ہوگا کہ انکا انجام بد نہو (ایضاً)

۵۔ تکبر کو بڑھنے دینا نہ چاہیے۔ خواہشاتِ نفسانی کو پورا نہ کرنا چاہیے۔ اپنی ہی مرضی کی ہمیشہ تقلید نہ کرنی چاہیے۔ آرام و راحت میں کثرت سے کام نہ لینا چاہیے (لی کی)

مندرجۂ بالا حصۂ مضمون کے مطالعہ سے ثابت ہوگیا ہوگا کہ کنفیوشس کی تعلیمات میں پند و حکمت کے کیسے کیسے جواہر آبدار موجود ہیں۔ اُسکی تعلیمات سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ ایک عالمگیر اتحاد اور یکجہتی کا خواستگار اور ساعی تھا جس کی رو سے اُن لوگوں کی عزت کیجائے جو اُسکے واقعی مستحق ہوں۔ راحت، غصہ، رنج اور خوشی کے جذبات کو اُنکے جائز حدود کے اندر رکھا جائے۔ انانیت کو مغلوب اور خواہشاتِ نفسانی کو مطیع کیا جائے متانت، صدق، خلوصِ باطن، لطف و مدارات، خوش خلقی اور خوش لیاقتی کی صفات اپنے اندر پیدا کیجائیں اور تقویٰ کے ساتھ حسنِ معاشرت کو لازمی سمجھا جائے ایسلئے کہ نفی کسی ایک کی عدم موجودگی انسان کو "انسانِ کامل" کے پایہ سے گرا دیتی ہے۔

(۲) مذہب لاؤزی
(تاؤ مذہب)

لاؤزی اپنی عمر کے اخیر حصہ میں کنفیوشس کا ہمعصر تھا۔ اُسکا سال پیدائش ۶۰۴ قبل مسیح ہے، یعنی کنفیوشس سے پچاس سال وہ بڑا تھا۔ سال وفات تحقیق نہیں، اتنا ثابت ہے کہ اُس نے بہت بڑی عمر پائی۔ چنانچہ جب لاؤزی کی کنفیوشس سے پہلی ملاقات ہوئی تو اُسوقت کنفیوشس کی اکاوَن سال کی عمر تھی۔ اُسوقت بھی لاؤزی ایک ریاست میں عہدہ دار تھا جس سے بعد میں دست کش ہو کر ایک عرصہ تک سیر و سیاحت کرتا رہا اور پھر گوشہ نشین رہا۔ لاؤزی بہت ذہین اور طباع شخص تھا۔ کنفیوشس کے برخلاف اُسے رسم و رواج کی پابندی اور شائستگی اطوار کے بجائے سادگی پسند تھی۔ نیز لاؤزی ابنائے وطن کی اصلاح کی جانب سے مایوس تھا اور کنفیوشس کی کوششوں کا اُسے کوئی نتیجہ نکلتا معلوم نہ ہوتا تھا۔ شاہنشاہ چاؤ کے دربار میں جب کنفیوشس سے اُسکی ملاقات ہوئی تو معمر اور تجربہ کار لاؤزی نے کنفیوشس کی زبانی اُسکی ناکامیوں کا حال سُنکر مایوسی ظاہر کی اور مدد خواہی کا جواب نفی میں دیا۔

گو لاؤزی کنفیوشس کی طرح انسان کی فطری نیکی کا قائل تھا اور بعض دیگر تعلیمات بھی اول الذکر کے خیالات سے ملتی تھیں، اُسکی اور کنفیوشس کی تعلیمات میں بہت بڑا اصولی اختلاف ہے۔ لاؤزی رسوم اور ظاہری پابندیوں کا حامی نہ تھا بلکہ اُنکا مخالف تھا۔ اُسکی تعلیمات میں روحانیت اور فلسفہ کو زیادہ دخل ہے۔ اُسکے مذہب کا منشا تزکیۂ باطن اور تربیت نفس تھا۔ کنفیوشس یہ چاہتا تھا کہ لوگ اپنے آباؤ اجداد کے مراسم و اطوار کا تحفظ اور اُنکی پیروی کریں۔ لاؤزی یہ کہتا تھا کہ لوگ اُس ابتدائی حالت کی طرف رجوع ہوں جب انسان قیود و رسوم سے آزاد تھا۔ ہرچند کہ لاؤزی خیالات یاس رکھتا تھا کنفیوشس کی طرح وہ بھی [illegible] تھا اور اُسکا مطمحِ نظر بھی لوگوں کی اخلاقی، سیاسی اور مدنی حالت سدھارنا تھا۔ پابند و حامی تکلفات ظاہری کو مخاطب کرکے وہ کہتا ہے:-

اپنی عقل و دانش کو چھوڑ دو، اپنی خیر سگالی و رحمدلی ازخود کو دور پھینکدو، پھر دیکھو لوگ سو گنا اچھے ہو جائیں گے، اپنی ہمدردی کو اخلاقِ حق میں بدل دو، اپنی منفعت پسندی کو پس پشت ڈالدو، تب لوگ مطیع والدین اور بچے خادم و مطیع ہوں گے، اپنی ہوشیاری کو برطرف کردو اور طلب منفعت کا خیال دل سے نکالدو...... اور اپنی فطری سادہ حالت میں ظاہر ہو، صفت وحدت کی حفاظت کرو، خود غرضی کو دباؤ اور اپنی خواہشوں کو مغلوب کرو۔ (تاؤ تہ کنگ، باب ۱۹)

تین روحانی اوصاف کا وہ اس طرح تذکرہ کرتا ہے:-

میرے پاس تین قیمتی چیزیں ہیں جنکو میں ہمیشہ عزیز رکھتا ہوں اور جنکی ہمیشہ حفاظت کرتا ہوں۔ اوّل رحم، دوسرے کفایت شعاری، تیسرے انکسار۔ رحمدل ہو کر میں بہادر ہو سکتا ہوں، کفایت شعار ہو کر میں سخی ہو سکتا ہوں، منکسر ہو کر میں بزرگ خلائق ہو سکتا ہوں۔ اس زمانہ میں لوگ رحمدلی کو چھوڑ دیتے ہیں اور صرف بہادر بننے کی کوشش کرتے ہیں، کفایت شعاری کو چھوڑ دیتے ہیں اور سخی بننے کا خیال رکھتے ہیں، اور آخری جگہ چھوڑ کر اول جگہ تلاش کرتے ہیں۔ یہی اُنکی موت ہے۔ رحمدل وہ ہے جو جنگ میں فتحمند اور مدافعت میں مستحکم ہوتا ہے۔ جسکا خدا حامی ہے اُسے آغوش رحمدلی میں جگہ دیتا ہے۔

لاؤزی کے بعض سیاسی اصول اُسکی نہایت روشن دماغی کا پتہ دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ خیال کہ "سب کچھ سائرالناس کے لیے اور سب کچھ سائرالناس کی صلاح اور منظوری سے" جو آجکل زمانہ جمہوریت کا مسلمہ خیال سمجھا جاتا ہے، اُسکی سیاسی تعلیم کا ایک جزو ہے۔ نیز اُسکے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسکی بے نظیر ذہانت یہ معلوم کر چکی تھی کہ "قوم جاندار چیز کی طرح نشوونما پاتی ہے اور بیجان چیز کی طرح مصنوعی نہیں ہے" وہ قتال و جدال بلکہ سزائے موت تک کا مخالف تھا۔ اُسکا قول تھا کہ اگر حکومت کا انتظام معقول ہو تو سزائے موت کا کیا ذکر کسی قسم کی سزا کی ضرورت پیش نہ آئے۔

اگر لوگوں کو سادگی اور صفائے قلب کی تعلیم دیجائے تو باہمی فساد [illegible] ہو جائے۔ دولت، منصب اور علم کی طلب ہے جو لوگوں کے دلوں کو پریشان کرتی ہے، اُن کے جذبات کو مشتعل کرتی ہے، دولت کو اُنکے لیے معمولی چیز بنا دیتی ہے...... جو لوگ عیش و عشرت کے پیچھے پڑے ہیں یا جنکا مقصود حیات خود غرضانہ دنیاداری ہیں وہ حقیقت پر [illegible]

ہو جاتے ہیں، جب کسی نہ کسی وجہ سے انکے مقاصد حاصل نہیں ہوتے اور انکی طاقتیں تدابیر خاک میں مل جاتی ہیں۔ جب کوئی قوم اس خطرناک منزل پر آجاتی ہے تو کسی قسم کی سزا انھیں سازشوں سے باز رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

جب لوگ موت سے نہ ڈریں تو انکو موت سے انھیں کیسے مغلوب کیا جا سکتا ہے؟ اگر کوئی شخص موت کا مستحق ہے تو وہ بڑا مارنیوالا تو موجود ہے جس کے ہاتھ میں حیات اور زندگی کی باگ ہے......

لہذا جو شخص قاتل کا کام کرے وہ صانع عالم کے ہاتھوں سے اسکا کام چھینتا چاہتا ہے، اور جو صانع عالم کا اختیار چھیننے کا خیال رکھتا ہے وہ خود اپنے ہاتھ کاٹتا ہے۔ عہ

اخوت اور رواداری کا سبق اس طرح دیتا ہے:-

اپنے بھائیوں کی عیب جوئی نہ کرو۔ اپنا حال جان لینے پر قناعت کرو۔ خود پاک اور باعصمت رہو لیکن دوسروں کو تنبیہ نہ کرو۔ اپنے آپ راست باز رہو لیکن دوسروں کو ایسے ایذا نہ دو۔ بد قسمت کو بد معاشی کی تہمت نہ لگاؤ۔ ایک شخص مر جاتا ہو اور دوسرا زندہ رہے تو یہ مت سمجھو کہ ان میں سے ایک پر خدا کا غضب نازل ہوا۔ جو واقعی نیک ہے وہ تمام انسانوں سے محبت کرتا ہے اور کسی کی تردید نہیں کرتا، وہ سب کی عزت کرتا ہے اور کسی کی مخالفت نہیں کرتا۔ وہ نیک لوگوں کے ساتھ رہتا ہے اور انکی صحبت سے مستفید ہوتا ہے، لیکن بد آدمیوں کی اصلاح اُسکا کام ہوتا ہے اور لوگوں کو تاؤ (خدا) کی جانب متوجہ کرنا اُسکی زندگی کا مقصود۔

لاؤزی خود ضبطی، ترکِ انانیت اور محاسبۂ باطن پر بہت زور دیتا تھا:-

۱۔ جو شخص خود بیں ہے وہ کبھی فراغ نہیں پا سکتا۔ جو خود پسند ہے وہ معزز نہیں ہو سکتا۔ جو خود ستا ہے وہ لائق نہیں ہو سکتا۔ جو تعلّی پسند ہے وہ عالی مرتبت نہیں ہو سکتا

۲۔ ترکِ نفس پروری کا ایک فعل خود رائی کے ایک لاکھ کاموں سے افضل ہے۔

نیک آدمی کی مندرجہ ذیل تصویر کیسی من موہنی اور مقبول صورت ہے:-

وہ کج راہ پر کبھی نہ چلیگا۔ وہ کبھی اپنے نفس کو دھوکے میں نہ ڈالیگا۔ وہ نیکی کا ذخیرہ فراہم کریگا اور نیک کام جمع کریگا۔ وہ تمام مخلوقات کے ساتھ رحم سے پیش آئیگا وہ اپنے چھوٹے بھائیوں پر شفقت کرے گا اور بڑوں کی اطاعت فرزندانہ کریگا۔ وہ یتیموں پر رحم کھائے گا اور بیواؤں کی غم گساری کرے گا۔ وہ اپنی اصلاح کریگا اور اس طرح دوسروں کی اصلاح کریگا۔ کیڑوں، گھاس اور درختوں اور کسی چیز کو اُسکے ہاتھ سے آزار نہ پہنچیگا۔ اُسے دوسروں کی بد خصلتوں پر نظرِ افسوس و ترحم ڈالنا چاہیے۔ لوگوں کی نیک عادتوں سے اُسے خوش ہونا چاہیے۔ ان کی مصائب آلام میں دستگیری کرنا چاہیے۔ انھیں خطرہ سے نجات دلانا چاہیے۔ انکے منافع کو اپنا نفع سمجھنا چاہیے، اور انکے نقصان کو اپنا نقصان۔ انکے معائب کو شائع نہ کرنا چاہیے اور نہ اپنی خوبیاں اُچھالنا چاہییں۔ بدی کا خاتمہ کر دینا چاہیے اور نیکی کا اظہار کرنا چاہیے۔ دوسروں کو اپنی ذات سے نفع کثیر پہنچانا چاہیے، اور اپنی ذات کے لیے تھوڑے پر قناعت کرنا چاہیے تحقیر و توہین کو بلا خیال انتقام قبول کرنا چاہیے اور عزت کو بلا اندیشۂ خوف۔ بھلائی کرنا چاہیے بلا امید معاوضہ، اور دوسروں کو دینا چاہیے بلا شائبۂ تأسف۔ یہ ہے وہ جسے "مرد صالح" کہتے ہیں۔ (تعائی شنگ یعنی رسالۂ اعمال و مکافات)

دنیا کی کسی دوسری مذہبی کتاب میں اتنی جگہ میں شاید اس سے بڑھ کر اخلاقی تعلیم نہ پائی جائے گی۔

مسیح کا قول ہے کہ "بدی کے بدلے نیکی کرو" اسی تعلیم کو مسیح سے چھ سو سال پہلے لاؤزی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

جو میرے ساتھ نیکی کرتا ہے میں اُسکے ساتھ نیکی کرتا ہوں، اور جو میرے ساتھ نیکی نہیں کرتا، اُسکے ساتھ بھی میں نیکی کرتا ہوں (تاؤ تہ کنگ)

نصائح کے یہ گہر آبدار بھی لاؤزی کے بحرِ دماغ کے آغوش پروردہ ہیں:-

۱۔ دوسروں کو جاننا عقلمندی ہے، لیکن جو اپنے آپ کو جان لے وہ روشن دماغ ہے۔ جو دوسروں پر ظفر یاب ہوتا ہے وہ قوی ہے، لیکن جو اپنے اوپر فتح پائے وہ بہادروں کا بہادر ہے۔ جس کے پہلو میں قانع دل ہے وہ متمول ہے۔ جو مستعدی سے کام کرے نائل المرام ہوتا ہے۔ جو اپنی فطرت کے خلاف نہیں کرتا وہ بہت وقت تک زندہ رہتا ہے، لیکن جو مر جاتا ہے اور زندہ رہتا ہے وہ ابدی خوشیوں سے محظوظ ہوتا ہے۔ (ایضاً)

عہ ڈاکٹر ڈگلس صاحب کی کتاب کنفیوشزم اور تاؤ ازم صفحہ ۱۹۲

۲۔ جو شخص جلدی سے وعدہ کر بیٹھتا ہے وہ اُسے پورا کرنے میں بہت کم کامیاب ہوتا ہے۔ جو شخص آسان چیزوں کا متلاشی ہے اُسے تمام چیزیں مشکل معلوم ہوں گی (ایضاً ب ۶۳)

۳۔ انتظام بے انتظامی سے پہلے ہونا چاہیے، اور تیاری ضرورت کی دہائی سے پیشتر (ایضاً ب ۶۴)

یہ اخلاقی تعلیمات "مجلد الطہارت" سے جو تاؤ مذہب کی کتب مقدسہ میں سے ہے، مقتبس ہیں:۔

انسانی روح کا میل جانب طہارت ہے، لیکن اُس کا دل اس میں خلل انداز ہوتا ہے۔ انسان کا باطن خوشی پسند ہے، لیکن خواہشات مخل ہوتی ہیں۔ اگر انسان اپنے دل سے خواہشیں نکال کر پھینک دے تو اس کے قلب کو خود بخود سکون حاصل ہو جائے۔ دل بے لوث ہونا چاہیے پھر روح خود منزّہ ہو جائے گی۔ (کھنگ کانگ کنگ ب ۳)

لاؤزی جن متقدمین کی فطری سادگی کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا تھا وہ عہد قدیم کے پاکباز لوگ، زندگی کی محبت اور موت کی نفرت سے ناآشنا تھے۔ نہ اُن کا دنیا میں آنا اُن کی مسرت کا باعث ہوتا تھا اور نہ یہاں سے چلا جانا اُن کے دل کو مشوش کرتا تھا۔ سکون روح کے ساتھ وہ یہاں آتے تھے اور یہاں سے جاتے تھے (مقالات چوانگ زی ب ۴)

ایسے لوگ کہاں جاتے تھے؟ تاؤ میں جو غیر محدود ہے۔ یعنی محدود غیر محدود میں واصل ہوتا ہے، اور فنا کے بعد بقا میں شامل ہوتا ہے۔ یہ تعلیم بودھ مذہب کے مسئلہ نروان سے مشابہ ہے۔

تاؤ کیا ہے؟:-

تاؤ خلا ہے۔ فعل و عمل میں آہستہ ہے۔ عمق میں وہ تمام اشیا کے مستقبل پر حاوی ہے۔ وہ نوک دار زاویوں کو ہموار کرتا ہے۔ وہ بدنظمی کو دور کرتا ہے۔ وہ چکا چوند کو ناپسند کرتا ہے۔

تاؤ کی صفات کا خلاصہ یہ ہے:-

مثل پیار کرنے والے باپ کے وہ تمام مخلوقات پر نظر شفقت رکھتا ہے۔ تمام مخلوقات اُس کے دروازہ سے عالم حیات میں آتی ہیں، اور ہستی کے تمام وکمال تغیرات وتبدلات میں وہ دوام اُن کے راست و چپ رہتا ہے۔ اور محبت سے نشوونما دیتا ہے۔ سب کو زندگی عطا فرماتا ہے اور کسی چیز کے دینے سے انکار نہیں کرتا۔ گو سب کے سامنے، سب کے اوپر، اور سب کے اندر ہے، وہ دخل نہیں دیتا۔ گو تمام اشیا اُس کے تابع ہیں وہ اپنے آپ کو اُن کا آقا نہیں سمجھتا۔ وہ انسان کے ساتھ سعی نہیں کرتا۔ وہ ہر فرد واحد کی زندگی کے اندر رہتا ہے۔ اُس کا نفوذ ایسی اشیا میں ہے جن کے اندر کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ وہ پیدا کرتا ہے، نشوونما دیتا ہے، بڑھاتا ہے، کھلاتا ہے، پورا کرتا ہے، پکاتا ہے، قوت بخشتا ہے، اور تمام چیزوں کو ڈھکتا ہے۔ وہ نیک آدمی کی شوکت اور بد آدمی کی اُمید ہے۔ وہ اُن لوگوں کو جو دوسروں کی حاجت روائی کرتے ہیں دوگنا دیتا ہے۔ وہ سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں۔ وہ ممکن سے ممکن چھوٹی مقدار ہے اور پھر بھی کل ہے۔ وہ عالم کی وحدت ہے اور امداد کرتا ہے، قوت بخشتا ہے اور تمام کائنات کو نشوونما دیتا ہے۔

مذہب تاؤ کی کتب مقدسہ میں دو چھوٹی سی کتابیں ہیں جن میں سے ایک کا نام کن ینگ پین یعنی کتابِ جزا و سزا ہے۔ ذیل کے گہر ہائے آبدار اُسی سے ہاتھ لگے ہیں:-

(۱) جانوروں کے ساتھ رحم سے پیش آؤ (۲) راست بازی اور اطاعتِ والدین کی عادت ڈالو۔ اپنے چھوٹے بھائیوں سے محبت اور بڑے بھائیوں کا ادب کرو۔ (۳) اپنا تزکیۂ باطن کر اور دوسروں کو نیک بنا (۴) بیواؤں اور یتیموں پر رحم کھا۔ (۵) دوسروں کی ناگہانی بدبختی کو دیکھ کر متألم ہو (۶) دوسروں کی خوش حالی سے مسرور ہو (۷) مدد خواہوں کی مدد کر (۸) بنی آدم کو مصائب سے نجات دو (۹) دوسروں کے عیوب فاش نہ کر (۱۰) اپنی فضیلت کا اظہار نہ کر (۱۱) بدی کو روک اور نیکی کو ترقی دے (۱۲) بہت ترک کر اور کم لے (۱۳) نیکی کر اور معاوضہ کی توقع نہ رکھ (۱۴) نیکی کو بدی اور بدی کو نیکی مت سمجھ (۱۵) خطا کو جرم خیال نہ کر (۱۶) جب اپنی کوئی خطا تمہیں معلوم ہو جائے تو اُس کی اصلاح کر دو (۱۷) جس بات کو حق جانتے ہو اُسے ضرور کرو (۱۸) بے جا نفع دوسروں کو نقصان دے کر حاصل مت کر (۱۹) دوسروں کا دل مت دکھاؤ (۲۰) دوسروں کے محاسن پر پردہ نہ ڈالو (۲۱) عیش و عشرت کے بندے نہ بنو

(۲۲) کبھی ایسی بات نہ کہو جو تمہارے دلی منشا کے خلاف ہو۔

دوسری کتاب کا نام "ین چہ وان" یعنے کتاب رازنجات ہے۔ یہ بہت چھوٹی کتاب ہے کہ کُل الفاظ کی تعداد صرف ۱۴۱ ۵ ہے۔ لیکن پندو حکمت کے جواہر سے یہ بھی مالامال ہے۔ مندرجۂ بالا نصائح کے اعادہ کے علاوہ چند پند سود مند اس میں ایسی ہیں جنھیں بغیر لکھے ہم نہیں رہ سکتے:۔

صحیح اوزان اور پیمانے استعمال کرو اور لوگوں سے زیادہ دام نہ لو۔ بیماروں کی تیمارداری کرو اور پیاسے کو پانی پلاؤ۔ اپنے ہمسایہ کی برائیوں کو پوشیدہ رکھو اپنے تمام افعال میں خدا کے قوانین کی پابندی کرو اور تمام اقوال میں صداقت باطنی کا اظہار کرو۔ تمام سلف صالحین کو اپنے پیش نظر رکھ کر اپنے ضمیر کا محاسبہ کرو۔ وہ کون سی نجات ہیں جو ایسے شخص کو میسّر نہیں ہو سکتیں جو خفیہ طور پر کارہائے خیر کرتا ہے؟

سیّد حسن برنی (علیگ)

مذہب و سائنس

۱۔ سائنس کی بنیاد

خدا کی عالیشان حکمت کو حل کرنے مین سائنس نے کہانتک ترقی کی ہی؟

منطق کا یہ ایک نہایت ضروری اصول ہی کہ قدرت اپنے تمام امور مین ایک ہی سیدھے راستہ پر چلتی ہی۔ جان اسٹوارٹ مل صاحب اپنی کتاب سسٹم آف لاجک کے صفحہ ۲۰۲ مین تحریر فرماتے ہین کہ:۔

> قدرت کا غیر مبدل روش پر چلنا ہی کل نتائج استقرائیہ کے لیے آخری مقدمۂ کبری ہی۔

اس کا یہ مطلب ہی کہ تمام استدلال اسی اصول پر دلالت کرتے ہین کہ قدرت کے قوانین غیر مبدل ہین۔ جس صورت مین وہ ازل سے چلے آتے ہین، ابد تک ویسے ہی رہین گے۔ اگر دو اور دو کو جمع کیا جائے تو اس کا حاصل ضرور چار ہوگا۔ کشش اجسام یا کشش ثقل بدستور ہمیشہ قائم رہے گی۔ ایک قسم کا سبب ایک ہی قسم کا نتیجہ پیدا کریگا۔ تمام قوانین قدرت ایک دوسرے کے معاون و موافق ہین۔ کوئی قانون کسی دوسرے قانون کا نقیض و مخالف نہین۔

قوانین قدرت کے غیر مبدل ہونے کا یہ اصول کسی اور دلیل یا ثبوت کا محتاج نہین۔ اسمین اُس رفعت و جلال کی جھلک نظر آتی ہی جو ایک حکیم و منصف ہستی کے شایانِ شان ہی۔ اگرچہ یہ بیان کہ قوانین قدرت ایک دوسرے سے ارتباط و مطابقت رکھتے ہین، کسی قدر صراحت کا محتاج ہی، لیکن اسمین شک نہین کہ موثر اور دلنشین ضرور ہی۔

اب ہم یہ دریافت کیا چاہتے ہین کہ قدرت کے اس ربط و نسبت کے دلائل کیا ہین؟ اور وہ کیا چیز ہی جس کو ہم اس عظیم الشان موافقت و یگانگت کی کُنجی کہ سکتے ہین۔

سوال لازم آتا ہی کہ قدرت کا وہ کونسا سیدھا راستہ، عمل یا قانون ہی جس پر اُس کے تمام شعبون کا اتحاد و ارتباط مبنی ہی؟ اور یہ کہ اس کا اصل اصول کیا ہی؟

علم منطق کے ماہرین اس اصل اصول کو اپنی اصطلاح مین ایک غیر مبدل سلسلہ کے نام سے موسوم کرتے ہین۔ مسٹر مل اپنی اُسی متذکرہ کتاب کے صفحہ ۲۱۲ مین لکھتے ہین:۔

> یہ غیر مبدل سلسلہ، از روے مشاہدہ، قدرت کے ہر موجودہ و مستقبل واقعہ کے درمیان پایا جاتا ہی۔۔۔۔۔ ماقبل کے واقعہ کو ہم اصطلاح مین سبب یا علت اور اُس کے نتیجہ کو معلول کہین گے

ماہرین علم منطق کے نزدیک قدرت کے ارتباط و مطابقت کی [illegible] یہی علت و معلول کا سلسلہ ہی۔ اس سلسلہ سے یہ مراد ہی کہ [illegible]درت کے تمام کامون مین ایک تسلسل پایا جاتا ہی، یعنی سبب سے [illegible] پیدا ہوتا ہی، اور وہ نتیجہ بالکل اپنے سبب کے مطابق ہوتا ہی۔ اُس کی مثال یہ ہی کہ سیب پھول کا نتیجہ ہی، پھول درخت سے نکلا، اور درخت بیج سے پیدا ہوا۔ یہ ایسی صاف بات ہی کہ کوئی شخص اس سے ناواقف نہوگا۔ یہ ایک عام اصول ہی کہ ٹھیک اسباب ہی کے مطابق اُن کے نتائج و مشاہدات بھی ہوتے ہین۔

آؤ اب ہم اس اصول کا، انسان کے معمولی کاروبار سے شروع کر کے مختلف صیغون کے مشاہدات و تجربات مین سراغ لگائین۔

(۱)۔ روزمرہ کے تجربات

جب کوئی شخص دیاسلائی کو ڈبیہ پر رگڑتا ہی، یہ خیال بناتا ہی، پانی اُبالنے کے لیے برتن کو چولھے پر رکھتا ہی، یا دیوار کی مرمت کرتا ہی، تو وہ نتائج کو مدنظر رکھتا ہی۔ مین اپنے دل مین کہتا ہون

کر کیا مین اپنا کوٹ بدل لون؟ کیا چاے کا ایک اور پیالہ پیون؟ یا پاپیادہ چلون کہ گھوڑے پر سوار ہون؟ تو ہر سوال کا جواب ٹھیک اُسی تخمینہ کے مطابق ہوگا، جو نتیجہ کی نسبت مین اپنے دل مین قائم کر چکا ہون۔ جب ہم زمین مین تخم بوتے ہین، کوئی گلاب کی قلم یا باغ لگاتے ہین، تو ہمارے دل مین اس بات کی امید ہوتی ہے، کہ ہم اس کا پھل پائین گے۔ بعینہ اسی قسم کی امیدین ہمارے دل مین اس وقت بھی ہوتی ہین جبکہ ہم کسی کتاب کا مطالعہ کرتے، مکان کی چھت کو درست کرتے، یا سڑک بناتے ہین۔

"افسوس"، کس چیز کا نام ہے؟ بالعموم یہ نتائج کے متعلق ہماری غفلت یا ہمارے غلط اندازہ کی یاددہانی ہے۔ حالانکہ پچھتانا اور اصلاح کا خیال اس امر کی بدیہی دلیل ہے کہ ہم نتائج سے باخبر ہوگئے ہین۔ ہماری دلچسپی و حیرت، ہمارے تفکرات و خطرات، ہماری امیدون و آرزوون، سب کا انحصار نتائج پر ہوتا ہے۔ جب نتائج کی نسبت ہمارے دل مین شبہات پیدا ہوجاتے ہین، تو ہم کسی سے مشورہ و نصیحت کے طالب ہوتے ہین۔ نصیحتین اور تمثیلین نتائج کی وضاحت کے لیے نہایت ضروری ہین۔ ہماری محنت و آرام، کھانا اور پینا، تجویز و تدبیر، جمع و خرچ یہ سب نتائج کے لیے ہین۔ ہماری نفس پرستی یا ایثار نفسی نتائج سے کبھی خالی نہین ہوتی ہے۔ سسرو نے دس لاکھ انسانون کو محض اپنی عارضی خوشی کے لیے جلا کر خاک کر ڈالا، سینٹ سیمن اشالمیس نے ابدی فائدہ کی غرض سے اپنے آپ کو طرح طرح کی اذیتین پہونچائین۔

وہ دل نہایت روشن دل ہے، جو ہر بات کے نتیجہ کی نسبت نہایت کمل و صحیح اندازہ کرسکتا ہے۔ برخلاف اس کے وہ پرلے درجے کے بیوقوف اور کوتاہ عقل ہین جو نتائج سے غافل اور بے خبر ہین۔ ہم جو کچھ علم منشیات و مسکرات، مقویات، تریاق، حفظان صحت، جراحی، کیمیا، زراعت، جرثقیل، تجارت، پیداوار کے متعلق رکھتے ہین، وہ سب تجربہ و مشاہدہ کے وسیلہ سے حاصل ہوا ہے۔ بہترین اُسترا، بل، اسکول، طریق حفظ صحت، اعلیٰ ترین تدبیر ترقی تمدن و اخلاق وہی ہے جس سے بہترین نتائج پیدا ہون۔ تجارت کے اعلیٰ سے اعلیٰ اقوال صرف مشاہدہ اور تجربہ ہی کے ذریعہ سے مستنبط ہوئے۔ نظام تمدن و معاشرت کے اصول ملکیت، اراضی محاصل، مال و تجارت کے مختلف امور انتظامیہ کے عیوب و نقائص یا فضائل کو ممتاز طور پر ظاہر کرتے ہین۔ جہانبانی کے آئین بتاتے ہین کہ رعایا کے لیے کونسا قانون بہتر اور کونسا رواج مناسب ہوگا یہی حالت انسان کے تمام کاروبار اور روزمرہ کے تجربات و مشاہدات مین پائی جاتی ہے۔ علم ہمیشہ اسی کھوج مین لگا رہتا ہے کہ عمدہ نتائج پیدا کرنے والے امور کو، ان امور سے جدا کرے جو بُرے نتائج پیدا کرنے والے ہین۔

(۲)۔ تدلیل و استدلال

ہم پیشتر بیان کر چکے ہین کہ علم منطق کا دارومدار اس اصول پر ہے کہ نتائج ہمیشہ اسباب کے مطابق ہوتے ہین۔ روزمرہ کے نہایت سادہ نتائج اور نہایت باریک نکات کا انحصار بھی اسی اصول پر ہے۔

استدلال دو قسم کا ہے۔

اول لمّی؛ وہ برہان جس مین علت سے معلول پر دلیل لائین۔

دوم انّی؛ جس مین معلول سے علت پر دلیل لائین۔

قضیۂ منطقی، منطق کی وہ شکل ہے جسکی امداد سے ہم حالات و واقعات مستقبل کو سامنے رکھ کر کوئی خاص نتیجہ اخذ کرین۔ نتیجہ صریحی انجام، خاتمہ، ماحصل، تخمینہ، اندازہ، یہ اسباب و علل کے نتائج کی مختلف شکلین ہین۔

استدلال استقرائی کے ذریعے ہم حالات پیشین سے نتیجہ تک پہونچ سکتے ہین؛ اور استدلال استخراجی کی رو سے ایک عام اصول سے جو تجربی و حسی مقدمات کی بنا پر قائم ہو، ایک نتیجہ اخذ کر سکتے ہین۔ جب پیشتر کے حالات یا تجربات معلوم نہین ہوتے تو ہم تخیل و تشبیہ سے کام لیتے ہین، اور سمجھتے ہین کہ ہمارے مفید مطلب اسباب کا مشاہدہ ہوگا۔ مثلاً اگر ریاستہاے متحدہ (امریکہ) کے باشندگان کوئی نوآبادی قائم کیا چاہتے ہین، جسکا انھین پہلے کچھ تجربہ نہین، تو آبادی قائم کرنے سے پہلے یہ لازم ہوگا کہ وہ انگلستان، ہسپانیہ، فرانس، اور دیگر ممالک کے استعماری نتائج (Colonial Policy) پر غور کرین۔

ہم تحلیل کیمیاوی مین کُل کو جاننے کے لیے تمام اجزا کی جانچ کرتے ہین۔ اگر پانی مین کوئی مضر جزو شامل ہے، تو اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہین کہ پانی خراب ہے۔ اگر پانی مین کوئی ایسا جزو شامل نہین ہے جو مضر یا ناقص ہو، تو ہم پانی کو خالص اور عمدہ سمجھتے ہین۔

کان یا آنکھ کی مدد سے کسی چیز پر استدلال کرنے کے لیے بھی ہمین تجربہ اور مشاہدہ سے کام لینا پڑتا ہے۔ فرض کرو، گاڑی مین میرے سامنے والی نشست پر چند اجنبی مسافر بیٹھے ہین۔ از روے تجربہ مین جانتا ہون کہ یہ سب کے سب آدمی ہین۔ ان مین سے ایک کو مین دیکھتا ہون کہ ضعیف ہے، کیونکہ بڑھاپے کی وجہ سے اُس کے بال سفید ہو گئے ہین، اور چہرہ پر جھریان پڑ گئی ہین، ایک اور شخص کے ہاتھون پر محنت و مشقت کے آثار نمایان دیکھ کر مین یہ نتیجہ نکالتا ہون کہ وہ مزدور ہے۔ ایک اور شخص ہے جو عینک لگائے ہوئے ہے، جس سے اسکی بینائی کی کمزوری ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح تجربہ مجھے بتا رہا ہے کہ فلان شخص شرابی ہے، فلان مصیبت زدہ؛ اس ساتھ والے آدمی کی آواز سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تربیت یافتہ و مہذب ہے، اور اُس دوسرے کی آواز سے اس کا جاہل اور غیر مہذب ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

اگر مین ملک کے کسی ایسے حصے مین جا نکلون، جہان کے حالات سے مین واقف نہین، تو وہان کے اِرد گِرد کے مناظر سے مجھے وہان کے لوگون کے طریق بود و باش اور طرز معاشرت وغیرہ کا حال بخوبی معلوم ہو جائے گا۔ ایک مقام پر کھیت اور عمارات کی حالت سے کسان کے محنتی اور جفاکش ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ دوسرے مقام پر کچھ اور ہی کیفیت نظر آئے گی۔ کسان کے گھوڑے کی حالت سے مین کسان کے چال چلن کا بخوبی اندازہ لگا لون گا۔ دیگر علامات سے مجھ پر یہ بھی ظاہر ہو جائے گا، کہ یہان کفایت شعاری سے کام ہو رہا ہے، وہان غربت و افلاس کا سکہ جما ہوا ہے؛ یہان خودداری، اور وہان غلاظت و بےسلیقگی ہے۔

واقعات، اقوال، خیالات، اصولات وغیرہ کے اسباب اور نتائج ایسے ہی بدیہی اور صریح ہین جسطرح عام محسوسات کے۔ کسی کَل (مشین)، گائے، یا اور جانور کی قیمت کا اندازہ ہم اُن کے پھل یا پیداوار سے کرتے ہین۔ ایک تصویر، منظر، کھیل، تماشا، شعر، گیت، کتاب، یا خیال کی اچھائی اور بُرائی کا اندازہ ہم اُس کی خوشنمائی اور خوش اسلوبی اور عمدگی سے کرتے ہین۔ کسی عقیدہ، تدبیر، پالیسی (حکمت عملی)، رواج، فلسفہ وغیرہ کی خوبی کا اندازہ بغیر اُن کے موجودہ یا آیندہ نتائج کے ناممکن ہے۔

کسی قوم کی بُرائیون یا خصلتون کا اندازہ کرنے کے لیے ہمین اُس قوم کی تاریخ یا گذشتہ واقعات کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ آیندہ واقعات کا اندازہ بھی واقعات ماقبل پر مبنی ہے۔ اگر ہم یہ دریافت کیا چاہین کہ آیندہ کیا ہوگا، تو بیشتر ہمین زمانۂ ماضی پر بھی نظر ڈالنی ہوگی۔ ہم عمدہ تجاویز اور مضر جرائم دونون کی تلاش مین یکسان رہتے ہین، تاکہ ایک کو ترقی کر

پھیلا سکیں، اور دوسرے کو تباہ و برباد کرنے میں کامیاب ہوں۔

فرض کرو، تمھارے پاس ایک بیج ہے، لیکن تم یہ نہیں جانتے ہو کہ یہ بیج کس درخت یا پودے کا ہے۔ اسکی واقفیت کے لیے تم اُسے زمین میں بو کر دیکھو گے۔ کسی جرم کے مشکلات کو حل کرنے کے لیے اُس واقعہ کے حالات پیشین کا دریافت کرنا ضروری ہے۔ نہایت مختصر امور پر استدلال کرتے وقت بھی اسی اصول کو مد نظر رکھنا پڑیگا۔ کسان ہو یا سیاح، مدبر ہو یا مزدور، فلاسفر ہو یا سراغرساں سب کے سب ایک ہی اصول پر چلتے ہیں، یعنی نتائج سے واقعات ماقبل کا سراغ لگانا یا گزشتہ حالات سے نتائج اخذ کرنا۔ حقیقی امر یہ ہے کہ ہم ہرگز یہ نہیں کہہ سکتے کہ سبب کچھ اور ہے اور نتیجہ کچھ اور یعنی یہ بالکل ناممکن ہے کہ سیب کے درخت میں آڑو پیدا ہوں، یا شاہ بلوط کے درخت میں آلو لگیں۔

(۳)۔ فلسفۂ اخلاق

اخلاق کے اُن شعبوں کی تہ میں، جو ایک دوسرے کے نقیض ہیں، ایک خاص مطابقت پائی جاتی ہے، جس کا یہ منشاء ہے کہ افعال انسانی کو اُن کے نتائج سے اندازہ کرنا چاہیے۔ ارسطو "اعتدال" پر زور دیتا ہے، کہ میانہ روی سے بہترین نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ فرقۂ کلابیہ (سینک) کے پیرو یہ خیال کرتے ہیں کہ گوشہ نشینی کی سادہ زندگی بسر کرنے سے ہراس و بیم اور حسرت و یاس پاس نہیں آنے پاتے ہیڈونسٹ اور نیز اپی کیورین (لذتیہ) بھی اُن کاموں کو برتر قرار دیتے ہیں، جن سے فرحت حاصل ہو۔ رواقیہ (اسٹوئک) کے نزدیک سب سے بڑی شجاعت و دلیری یہ ہے کہ غصہ، رنج، اور خوف کے جذبات کو ضبط کیا جائے۔ یوٹلی ٹیرین کی دانست میں سب سے اچھے کام وہ ہیں جن کے ذریعے سے عوام کی بے انتہا بھلائی متصور ہو۔ منڈیول اور ہوبس کی راے میں "خود غرضی" بہت عمدہ شی ہے، کیونکہ کسی ایک شخص کے حق میں اُس سے بہت عمدہ نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے فلسفہ دان اس امر پر متفق الراے ہیں کہ اخلاق انسانی نسلی تجارب کا نتیجہ ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ انسان اپنے تجربہ اور مشاہدہ سے معلوم کر چکا ہے کہ جماعت (سوسائیٹی) کے لیے کون سی چیز مفید ہے۔ الٰہیات بتاتے ہیں کہ انسان کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ الٰہی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کرے، کیونکہ اطاعت و فرمان برداری سے ابدی راحت اور سرکشی و غرور سے دائمی عذاب حاصل ہوتا ہے۔

علم اخلاق کا کوئی بھی مسئلہ ایسا نہیں جو افعال انسانی کے نتائج و مشاہدات پر مبنی نہو۔ وہ کونسا معیار ہے جسکی رو سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دروغ کے مقابلہ میں راستی بہترین صفت ہے؟ جب ہم سچ بولتے ہیں تو ہمیں ایک قسم کی راحت محسوس ہوتی ہے، حالانکہ جب جھوٹ کہا جاتا ہے تو یہ بات نہیں ہوتی۔ یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ باہمی ربط و ضبط کے لیے راستی نہایت ضروری شی ہے جب ہم کسی کو دروغ گوئی کا غلام پاتے ہیں، تو ہمارا دل اُس سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ کیوں؟ اسلیے کہ یہ بُری عادت ابتری، بے یقینی، دشمنی اور دیگر بُرے نتائج کا پیش خیمہ ہے۔ اسی طرح ہمارا تجربہ وفاداری و بیوفائی اور نمک حلالی و دغابازی، رحمدلی و بے رحمی اور دیانتداری و بددیانتی کے اثر سے بخوبی آگاہ ہے۔

ہم خوب جانتے ہیں کہ فلاں فعل بُرا ہے اور فلاں اچھا۔ ہمیں اس بات کا بھی علم ہے کہ غذا کے لیے روٹی مفید ہے اور گھاس مُضر۔ اس بات کو بھی ہم مانتے ہیں کہ غلاظت کے مقابلہ میں صفائی بدرجہا اچھی ہے۔ یہ اصول بھی عام ہے کہ انسان کو ہمیشہ آگے بڑھنا چاہیے، نہ کہ پیچھے ہٹنا، اور اسی طرح خوشی کو رنج کے مقابلہ میں زیادہ مسرت انگیز سمجھا جاتا ہے۔

جس طرح کسی کَل (مشین) کی قدر و قیمت کا اندازہ اُس کے

پرزون کی عمدگی اور تیز رفتاری سے کیا جاتا ہی یا جس طرح درخت اپنے پھلون سے پہچانا جاتا ہو، ٹھیک اُسی طرح ہمارے افعال کی خوبی یا عیب کا اظہار بھی نتایج سے ہوتا ہو۔

(۴)۔ علم ہندسہ

علم ریاضی مین ۲ + ۲ جزو ہین، جن کا حاصل جمع ۴ ہی؛ اسی طرح ۹ - ۷ جزو ہین، جن کا حاصل تفریق ۲ ہی۔ ریاضی کے سادہ سے سادہ سوال سے لیکر طبعی ریاضی یا اصول ارتعام کے نہایت پیچیدہ و مشکل مسائل تک غور کر جاؤ، ہر جگہ یہی اصول کام کرتا ہوا نظر آئے گا کہ علت و معلول کا باہمی تعلق صحیح و درست ہو۔

ریاضی کے ہر قسم کے سوالات کو حل کرنے کے لیے اس بات کی سخت ضرورت ہی کہ جمع، ضرب، تفریق اور اُن کے حاصل کے درمیان پورا اور درست فرق ہو۔ اس علم کے تمام اہم قاعدون اور اصولون کی بھی یہی حالت ہی۔

(۵)۔ طبعیات

اگر علم سائنس اور علم فلسفہ صحیح ہین، تو اس دنیا مین جسمین ہمارا قیام ہی، کوئی ایسی جگہ اور کوئی ایسی چیز نہین ہی، جسمین دائمی حرکت نہ پائی جاتی ہو۔ سنگ خارا کے پہاڑ مین جو ازلی حرکت موجود ہی، ویسی ہی دائمی حرکت جسم انسانی کے ہر رگ و پے مین پنہان ہی۔ کہین یہ حرکت ظاہر ہی اور کہین پوشیدہ، اور کسی مقام پر ایسی سختی سی محسوس ہوتی ہی کہ اسکا نتیجہ ہر طرف تباہی اور بربادی ہوتا ہی، اور کہین اسکا اثر شفقت آمیز ہوتا ہی۔

زمین اپنے دائمی دورہ مین آفتاب کے گرد اٹھارہ میل فی سکنڈ یا ایک ہزار اسّی میل فی منٹ کے حساب سے گردش کرتی ہی۔ یہ رفتار بہت تیز ہی۔ یون سمجھو کہ اگر انسان کے پر لگ جائین تو وہ نیویارک سے پاکرس تک ایک سکنڈ مین، البنی تک دس سکنڈ مین، بفیلو تک تیس سکنڈ مین، شکاگو تک ایک منٹ مین، اور سان فرانسسکو تک تین منٹ مین پہونچ سکتا ہو۔ یعنی اس حساب کے مطابق انسان ایک بہت تیز رفتار اکسپرس ٹرین سے ایک ہزار گنا زیادہ اور بندوق کی گولی سے پچاس گنا زیادہ تیزی کے ساتھ سان فرانسسکو مین داخل ہو سکتا ہو۔ کبھی کبھی ہم اپنے چھوٹے چھوٹے منصوبون یا ایجاد و اختراع کے نتایج سے ششدر رہ جاتے ہین، مگر یہ کبھی خیال نہین کیا کہ یہ عالی شان کرۂ ارض اپنی اس حیرتناک رفتار مین ہمین کوئی صدمہ یا ضرر پہونچا سکتا ہی۔ حقیقت یہ ہی کہ زمین کی رفتار ایسی پوشیدہ اور غیر محسوس ہی کہ اگر ہیئت دان اس راز کا انکشاف نہ کرتے تو ہمین ہرگز اسکی حرکت کا احساس نہوتا۔ یہ بات ثابت ہو چکی ہی کہ ہیئت دان اپنے تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر متفق الراے ہین کہ (۱) اجسام فلکی کی حرکات مین باقاعدگی اور پابندی پائی جاتی ہی اُن کی پیشین گوئیان ان حرکات کے باب مین اعتبار کے قابل ہین، اور (۲) قدرت اپنے جلیل القدر مظاہر مین ترتیب و تناسب کی تابع ہی۔ اس باقاعدگی و ترتیب کی کنجی کیا ہی؟ نیوٹن صاحب اپنے "اصول حرکت" کی تیسری دفعہ مین عالمگیر حرکت کی نسبت، جسکو علم طبعیات کا نہایت ضروری اصول مانا گیا ہی، تحریر فرماتے ہین کہ ہر عمل کے لیے ایک عمل معکوس ہی! ڈگبی صاحب کہتے ہین کہ اگر آگ اپنی تپش سے پانی کو گرم کرتی ہی، تو پانی بھی آگ کے جوش کو سرد کر دیتا ہی۔

جب سپاہی اپنے تھیلے کو اُٹھاتا ہی، تو تھیلے کے وزن کے برابر ہی اُسے اپنی قوت صرف کرنی پڑتی ہی۔ اگر دستانہ پہن کر دیوار مین مُکا مارین تو دیوار بھی اسکا جواب دستانہ پہن کر دیگی، لیکن اگر تم بغیر دستانہ کے (ننگے ہاتھ) دیوار پر گھونسا مارو، تو تم جان لوگے، کہ قدرت نے بے جان اشیا کو بھی اپنے بچاؤ کی، بلکہ اظہار ناراضی کی بھی، قوت عطا کی ہی۔ اگر کوئی شخص کسی حادثہ سے اتفاقاً سنگین دیوار پر

گر پڑے تو اُس وقت بھی دیوار برابر کی قوت سے اسکا جواب دیگی گویا قوانین قدرت ایسے مکمل ہین جس پر یہ کہاوت صادق آتی ہو کہ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔

ہربرٹ اسپنسر کا قول ہو کہ:۔

اِس مسلمہ مسئلہ کہ عمل اور ردِ عمل معکوس باہم برابر طاقتین ہین، کی عدم موجودگی مین علم ہیئت کے ذریعہ سے کبھی قابل وثوق پیشین گوئیان نہین کی جاسکتین۔

جس طرح علم ہیئت کے وسیلہ سے نہایت دور دراز حصص مین اور نیز نہایت ہولناک مظاہر قدرت مین کہ جہانتک انسانی خیال کی رسائی ہوسکتی ہو، عمل اور ردِ عمل معکوس کے درمیانی واسطے دریافت ہوتے ہین، اسیطرح کیمسٹری (کیمیا) کائنات کے اُن نفیس ترین اجزا کا جن کا انسان کو علم ہوچکا ہو، باہمی ٹھیک ترتیب و تناسب کا پتہ لگاتی ہو۔ اس کی مثال یہ ہو کہ کیمیا ساز کیمیائی عمل کو ہمیشہ ایک مساوات سے لکھتے ہین، یعنی وہ کیمیائی نسخہ کو مرتب کرتے ہوئے ہمیشہ دو مختلف چیزون کو اس تناسب سے جمع کرتے ہین کہ مطلوبہ نتیجہ ان سے حاصل ہوجاتا ہو۔

فعل معکوس فعل اصلی کا، اثر سبب کا، اور حاصل مطلب اقدامِ ماقبل کا نتیجہ ہو۔ اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہین کہ عمل معکوس اثر، حاصل مطلب سب ایک ہی اصول کی مختلف صورتین ہین جسکو عام طور سے قانون علت و معلول کہا جاتا ہو۔ لیکن میرے خیال مین اگر اس اصول کو ”قانونِ موازنہ“ نام دیا جاتا تو زیادہ موزون ہوتا کیونکہ اس اصول کا اصل مطلب یہی ہو کہ سبب و نتیجہ اور علت و معلول باہم مساوی اور ایک دوسرے کا بدل ہوتے ہین۔ یون بھی کہہ سکتے ہین کہ سبب اور نتیجہ ایک ہی ترازو کے دو پلڑے ہین، جو لازمی طور پر ایک دوسرے کے برابر ہی ہون گے۔ رہے نتائج سو وہ بھی اسباب کے مطابق اور تابع ہوتے ہین۔

ہم پیشتر ذکر کرچکے ہین کہ ہر جگہ اور ہر مقام مین عالمگیر حرکت موجود ہو۔ یہ ازلی حرکت، جو کل کائنات عالم مین جلوہ گر ہو، اسباب اور نتائج کے باہم مساوی، ایک دوسرے کا عوض، یا بدل ہونے کے باعث باقاعدہ اور باترتیب ہوتی ہو۔ اگر کائنات عالم پر غور کی نظر ڈالوگے، تو تمھین معلوم ہوجائے گا کہ حرکت معکوس ہمیشہ اصلی حرکت کے مطابق نتیجہ ہمیشہ سبب کے مطابق، اور معلول ہمیشہ علت کے مطابق ہوتا ہو۔ اس مطابقت و موافقت سے عالم کی باقاعدگی تناسب، اور ترتیب بخوبی ظاہر ہوتی ہو۔

(۶)۔ صداقت کی ہم آہنگی

سچائی، خواہ وہ کیسی معمولی کیون نہو، دوسری سچائیون کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہو۔ نظام عالم کے متعلق کوئی بھی ایسا حقیقی یا مسلمہ امر نہین، جو قدرت کے باقی تمام اصولون سے پوری پوری مطابقت نہ رکھتا ہو، یا اپنے تعلقات کی وجہ سے خود ان اصولون پر مشتمل نہو۔

علم سائنس اس امر کو تسلیم کرتا ہو کہ گردش سیارگان کے متعلق جو کیپلر کے تین اصول ہین، وہ بالکل نیوٹن کے ”اصول حرکت“ کے مشابہ ہین، یعنی گردش سیارگان اُنھین قوانین پر مبنی ہو جن پر تمام کائنات کی حرکت کا دارومدار ہو۔ اسمین بھی کسی کو کلام نہین ہوسکتا کہ نیوٹن کے ”اصول حرکت“ کے تینون قاعدے صرف ایک اہم اصول کے ماتحت ہین۔

اسکا پہلا اصول یہ ہو کہ

ایک جسم کی حرکت مین کچھ تیزی یا تبدیلی پیدا نہین ہوسکتی تاوقتیکہ اسے قوت ایسا کرنے پر مجبور نہ کرے۔

اس کا یہ مطلب ہو کہ حرکت مین صرف اُسی وقت تبدیلی پیدا ہوسکتی ہو جبکہ اسکا کوئی سبب موجود ہو۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ

حرکت کی رفتار کا تغیر اُس قوت کے مطابق ہوتا ہے جو اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے کے لیے صرف کی جائے۔ یہ تغیر ٹھیک اُسی سمت کو واقع ہوگا جس طرف قوت کا عمل ہوا ہے۔

اس سے یہ مراد ہے کہ کسی قوت کے عمل میں لانے کا نتیجہ عین اپنی علت کے مطابق ہوگا۔

تیسرا اصول یہ ہے کہ

ہر فعل یا ہر حرکت کے لیے ایک حرکت معکوس ہوتی ہے۔

اسکا مقصد بھی یہی ہے کہ ہر فعل کا نتیجہ اپنے سبب یا علت کے مطابق ہوتا ہے۔

نیوٹن کے یہ ہر سہ قواعد حرکت اسکی اصطلاح مین اس اصول کے تابع ہین کہ نتائج ہمیشہ اسباب کے مطابق ہوتے ہین۔

(۷) - مسئلہ ارتقا

ڈاروِن صاحب کی رائے کے مطابق مسئلہ ارتقا کا تعلق زیادہ تر انتخاب طبعی (NATURAL SELECTION) کے ساتھ ہے۔

اسکی لغوی تعریف یہ ہوگی:-

اس مسئلہ سے یہ مراد ہے کہ جو حیوانات یا نباتات اپنے اِردگرد کے حالات کے ساتھ سب سے زیادہ مناسبت رکھتے ہین وہ زندگی کی جد و جہد مین اُن حیوانات وغیرہ سے سبقت لیجاتے ہین جن کے تعلقات خارجی اسباب سے نسبۃً کم ہوتے ہین۔

مسئلہ ارتقا کے لحاظ سے اِن خارجی اسباب کی لغوی تشریح حسب ذیل ہوگی:-

اُن وسائل و اثرات کا مجموعہ جو ایک جاندار شے پر باہر سے اثر ڈالتے ہین۔

یعنی وہ خارجی اسباب کا ایک مجموعہ ہے جو باہر سے ذی روح اشیاء پر اثر ڈالتا ہے۔

ذی روح اشیا دو قسم کے اثر کا حاصل ہین۔ یعنی ایک مجموعہ اُن خارجی اسباب کا ہے جو اُس پر باہر سے اثر ڈالتے ہین، اور دوسرا مجموعہ فطرت کا ہے، جو قدرت نے وراثت کے طور پر عطا کی ہے۔ اسی کو دیگر الفاظ مین یون کہہ سکتے ہین کہ ذی روح اشیاء حالات پیشین یا واقعاتِ ماقبل کا کامل نتیجہ ہین۔ ذی روح اشیاء زندگی کی جد و جہد مین خواہ کسی حالت مین دوسرون سے سبقت لیجائین مگر ان کا سبقت لیجانا اُنھین اسباب کا نتیجہ ہوگا جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ حیوانات کی ہلاکت و موت بھی ایک یا زیادہ اسباب کا نتیجہ ہوتی ہے۔

دُنیا کی تمام چیزین، چھوٹی ہون یا بڑی، مثلاً بیج، مچھلی فرد واحد، گورنمنٹ، نسل، تہذیب سب کی سب اُن واقعات ماقبل کا نتیجہ ہین جو اُن کے پیدا ہونے یا اُن پر اثر ڈالنے کا باعث ہوئے ہین۔ دراصل مسئلہ ارتقا کا دار و مدار صرف اسی ایک اصول پر ہے کہ نتائج اسباب کے تابع ہوتے ہین۔

(۸) - دیگر اہم و جدید مسائل

سوال لازم آتا ہے کہ مادہ کے غیر فانی ہونے، اور قوت کے ہر وقت موجود ہونے کے جدید مسائل کا اس اصول سے کیا تعلق ہے کہ نتائج اسباب کے تابع ہوتے ہین؟ جدید مسائل سے یہ مراد نہین ہے کہ وہ زمانۂ حال کے ایجاد ہین، بلکہ اس لیے کہ اِس زمانے مین انھین عام قبولیت حاصل ہوئی ہے۔

قوت کے غیر فانی ہونے کا اصول ان الفاظ مین ادا کیا جا سکتا ہے کہ، جب قوت کی ایک شکل غائب ہو جاتی ہے، تو وہ قوت بالکل اُسی مقدار مین کسی دوسری شکل مین ظاہر ہو جاتی ہے۔ مادہ کے غیر فانی ہونے کو بھی ہم انھین الفاظ مین ادا کر سکتے ہین یعنی جب

مادہ کی ایک شکل غائب ہوجاتی ہے تو وہ ٹھیک اُسی مقدار مین دوسری شکل مین نمودار ہوجاتا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قوت کے ہر حالت مین موجود رہنے، اور مادہ کے غیر فانی ہونے کے مسئلے حقیقت مین دو مختلف مسائل نہین ہین بلکہ ایک ہی ہین۔

قوت اور مادہ غیر فانی ہین! اس جملے سے یہ مراد ہے کہ مادہ اور قوت خواہ لاکھ صورت و شکل بدلین، مگر اُن مین کسی قسم کی کمی واقع نہین ہوتی۔ دوسرے الفاظ مین اس کو یون کہہ سکتے ہین کہ ہیئت کی تبدیلی سے جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے، وہ مادہ یا قوت کی پہلی حالت یا صورت کے مساوی ہوتا ہے۔ حاصل مطلب یہ کہ نتائج اسباب کے مطابق ہوتے ہین۔

حرکت کے مسلسل موجود ہونے سے یہ مراد ہے کہ قدرت ہر وقت قلب ہیئت و تبدیل صورت مین مصروف ہے، اور اُسمین کسی طرح کی رکاوٹ یا خلل واقع نہین ہوتا۔ علت اور معلول کا باہمی رشتہ کبھی نہین ٹوٹے گا، اور نہ کوئی ایسا وقت آئے گا جبکہ سبب نتیجہ پیدا نہ کرسکے۔

(۹) - کیا قدرت معاوضہ دیتی ہے؟

کیا یہ درست ہے کہ مسلسل حرکت یا تبدیل صورت کے پردے مین جو نتائج یا واقعات ظاہر ہوتے رہتے ہین، وہ بطور معاوضہ ہوتے ہین؟ بے شک! ایک ہی قسم کے سبب سے جو ایک ہی قسم کا مساوی نتیجہ پیدا ہوتا ہے، وہ ہمارے اُس کام کا جسکو ہم کرتے ہین، پورا معاوضہ ہوتا ہے۔ حرارت اُس ایندھن کا معاوضہ ہے جس سے وہ پیدا ہوتی ہے۔ بجلی اُس قوت کا معاوضہ ہے جو تبدیل صورت کے بعد اُسمین آموجود ہوتی ہے۔ پانی کا چھوٹے سے چھوٹا قطرہ ہیڈروجن کے دو اور آکسیجن کے ایک جزو لایتجزیٰ کا معاوضہ (یا مجموعہ) ہے۔ مادہ یا قوت کی ایک خاص مقدار ایک جگہ سے غائب ہوکر ٹھیک اُسی وزن و مقدار مین دوسری صورت مین موجود ہوجاتی ہے۔ جو چیز، بادی النظر مین، ہمارے سامنے سے غائب ہوجاتی ہے، اور وہ چیز جو غائب ہوجانے والی کی جگہ اختیار کرتی ہے، پہلی شے کا معاوضہ ہوتی ہے۔ ایندھن سے گرمی پیدا ہوتی ہے، لہذا گرمی ایندھن کا معاوضہ ہے۔ ہر حالت مین حساب برابر ہے۔ قدرت کے محکمہ مین نفع و نقصان کا حساب نہین۔ اُدھار اور قرض سے اُسے سخت نفرت ہے۔ وہ معاوضہ دینے مین تساہلی سے کام نہین لیتی۔

یہ خیال کرلینا کہ کوئی شے بغیر ٹھیک سبب یا معاوضہ کے طبعی دنیا مین وجود پذیر ہوسکتی ہے، سائنس اور عقل دونون کے لحاظ سے قابل نفرت ہے۔ واشنگٹن کا پٹینٹ آفس ایسے ایجادات کو پٹینٹ کرنے سے صاف انکار کردیتا ہے جو ازلی حرکت پیدا کرنے کے لیے کیے گئے ہون، کیونکہ سبب کے بغیر نتیجہ اور طاقت بغیر قیمت کے ناممکن ہے۔

(۱۰) - اہم اصول

قوانین قدرت کے باہمی ارتباط و تناسب کے اصول کی جانچ کرتے ہوئے ہم نے اس امر کا مشاہدہ کرلیا ہے کہ نتائج ہمیشہ اسباب کے مطابق ہوتے ہین۔ منطق و استدلال کا اصل اصول یہی ہے۔ ہم یہ بھی دریافت کرچکے ہین کہ اخلاق، ریاضیات، طبعیات، اور نیز مسئلہ ارتقا کی تہ مین بھی یہی اصول کام کررہا ہے۔ یہ بھی ثابت ہوچکا ہے کہ روزمرہ کے انسانی کاروبار سے لیکر علم کے اعلیٰ درجون تک یہی اصول صداقت و راستی کا معیار ہے۔ یہ بھی ہم پر ظاہر ہوگیا کہ یہی اصول، مادہ اور قوت کے غیر فانی ہونے کے مسئلہ کا مبدا ہے کہ نتائج اسباب کے مطابق ہوتے ہین۔ اس کا یہ منشا ہے کہ نتائج ہمیشہ اسباب کا معاوضہ یا قیمت ہوتے ہین۔ یہ بھی روشن ہوگیا کہ حرکت کے دائمی ہونے کا مسئلہ بھی اسی اصول کی ایک صورت ہے، کیونکہ علت اور نتیجہ کا

تبدیل نہونے والا باہمی تعلق کبھی شکست نہیں ہوتا۔

اب ان مشاہدات کا نتیجہ صاف صاف نظر آرہا ہے کہ نظام عالم کا سلسلا ایک قانون کے ماتحت چل رہا ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ نتائج اسباب کے مطابق دائمی اور صلہ بخش ہوتے ہیں۔ میرا اعتقاد ہے کہ یہ قدرت کا نہایت اہم اعلی، اور واحد اصول ہے، جو قدرت کے تمام دیگر قوانین و مظاہر کا مرجع و مرکز ہے۔

(باقی آیندہ)

مذہب و سائنس

مذہب کی بُنیاد

مذہب کا خیال بہت قدیم اور عالمگیر ہے۔ مسٹر ایڈورڈ بی ٹیلر بھی جو ازمنۂ قدیم کے مذاہب و اعتقادات کے مستند محقق ہیں اس کی تائید کرتے ہیں۔ چنانچہ اس خیال کی تحقیقات کرتے ہوے کہ دنیا میں ایسی ادنیٰ قومیں بھی موجود ہوں گی جو مذہب سے نا آشنا ہوں، محقق موصوف تحریر فرماتے ہیں:-

...... یہ امر ان قوم کی حالت سے بہت کچھ مشابہ ہے جن کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ اُن کی کوئی زبان ہی نہیں یا جن کو آگ کے استعمال سے ناواقف سمجھا جاتا ہے مگر چہ ایسا ہونا ممکنات سے ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسی اقوام دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ اسی طرح یہ خیال بھی کہ زمانۂ قدیم میں چند ادنیٰ درجہ کی لامذہب اقوام موجود تھیں اگرچہ قیاساً ممکن ہے اور شاید واقع میں صحیح ہو لیکن اس بارے میں کافی ثبوت نہیں ملتے یعنی وہ ثبوت جو اس قسم کی عجیب روایات پر یقین کرنے کے لیے ہم طلب کرنے کے مستحق ہیں۔

دنیا کے تمام مذاہب میں جو اعتقادی ہم آہنگی پائی جاتی ہے اُس کے متعلق ٹیلر صاحب فرماتے ہیں:-

ایسا مذہب ایک بھی نہیں ہے جو اپنے اعتقادات کے لحاظ سے دیگر مذاہب سے بالکل مختلف ہو۔ چنانچہ مسیحیت کے موجودہ اصول و خیالات اُن ذہنی و عقلی نشانات سے وابستہ ہیں جن کا سلسلہ مسیحیت سے بہت پہلے انسانی تہذیب و شائستگی کی بُنیاد تک بلکہ شاید انسانی ہستی کے آغاز تک چلا جاتا ہے۔

مسٹر ہربرٹ اسپنسر تحریر فرماتے ہیں:-

مذہب کے بارے میں ہمیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ باوجود اپنی بہت سی غلطیوں اور خرابیوں کے اُس نے ایک برتر سچائی کا اظہار اور اُس کی اشاعت کی ہے۔ اس اعلیٰ سچائی کو پہچاننا اگو نامکمل اور ناقص طور پر ہی سہی ابتدائے عالم ہی سے مذہب کا ایک ضروری مقصد رہا ہے۔ اور مذہب نے اپنے مختلف نقائص کی وجہ سے جو کسی وقت بیشمار تھے لیکن رفتہ رفتہ کم ہوتے گئے ہیں اُس برتر سچائی کا مکمل و صحیح اندازہ کرنے میں بے حد زکیں اُٹھائی ہیں حتیٰ کہ مذہب مشکل سے اُس کے ایک حصہ کو پہچان سکا ہے۔ "غیبی" ہمیشہ مذہب کا حقیقی مذہبی عنصر رہا ہے اور غیر مذہبی عنصر وہ ہے جو بلحاظ عقائد "نام نہاد" [?] "نا پائدار" اور بلحاظ افعال و اعمال "پُرعیب" ثابت ہوا ہے اور مذہب نے ہمیشہ اس عنصر سے پاک ہونے کی کوشش کی ہے۔

دنیا کے نظام کو حل کرنے میں مذہب نے کس قدر کامیابی حاصل کی ہے؟ وہ بیج کہاں ہے جو اس عالمگیر اور ترقی پذیر درخت کے پھلنے پھولنے اور بڑھنے کا

باعث ہوا ہے؟ اُس برتر سچائی کا مسکن کہاں ہے جس کی طرف اسپنسر نے اشارہ کیا ہے؟ اور مذاہب کے اعتقادات کی وہ "ہم آہنگی" کہاں نظر آسکتی ہے جس کو ٹیلر نے بیان کیا ہے؟

ان سوالات کا جواب دینے سے قبل اس امر پر غور کرنا چاہیے کہ کیا مذہب سے کوئی خاص مذہب مراد ہے؟ نہیں! بلکہ مذہب سے وہی مذہب مراد ہے جس کا اطلاق اُس لفظ "مذہب" پر ہے جو ساری دنیا میں مشترک ہے یعنی وہ فطرت جو بنی نوع انسان کو مشترکہ طور پر قدرت کی طرف سے بخشی گئی ہے۔

یہ ناممکن ہے کہ مذہب کی نسبت ساری دنیا کا خیال یکساں ہو۔ اسلاف نے اس بحث پر بہت کچھ خامہ فرسائی کی ہے۔ کسی نے مذہب سے نفرت ظاہر کی، اور کسی نے اس کو صداقت و راستی پر مبنی قرار دیا، کسی نے مذہب کے خیال کو اچھا کہا، اور کسی نے بُرا۔ ہماری یہ آرزو بھی نہیں بر آسکتی کہ ہم دنیا کے تمام مذاہب کے درمیان کوئی خاص تعلق یا ہم آہنگی پا سکیں۔ ممکن ہے کہ کوئی فرقہ یا گروہ جو مذہب کا پابند ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، حقیقت میں اُس کے اصول بے دینی پر مبنی ہوں!

خاص مذاہب یا خاص فرقوں کو جانے دیجئے، ہمیں مذہب کے "معانی" اُن عام اصولوں میں تلاش کرنا چاہئیں، جن کے آگے دنیا والوں کی ایک بڑی تعداد نے مختلف زمانوں میں سرِ تسلیم خم کیا ہے۔ یا اُن معانی کو خیالِ مذہب کے مستقل مظاہر اور اُن اعتقادات میں ڈھونڈھنا چاہیے جو کرۂ زمین کے نہایت قدیم باشندگان میں کسی تعلیم و ہدایت کے بغیر یعنی خود بخود پیدا ہوئے اور اب تک زمانۂ موجودہ کے مہذب و شائستہ گروہوں میں زیادہ پختہ اور مکمل صورت میں پائے جاتے ہیں، اور سب کے آخر میں ہمیں ان کو موجودہ بڑے بڑے مذاہب کے متفقہ و مشترکہ عقائد میں دیکھنا چاہیے، کیونکہ موجودہ مذاہب میں قدرتی طور پر صرف وہی مذہبی عقائد موجود رہ سکیں گے جو دیگر اعتقادات کے مقابلہ میں موجود رہنے کے زیادہ قابل ثابت ہوئے ہیں

(۱) معاد اور سزا و جزائے روح

حکیم سقراط کا قول ہے کہ "مجھے کامل یقین ہے کہ مرنے کے بعد انسان پر ضرور کوئی نہ کوئی حالت گذرتی ہے، اور یہ حالت بمقابلہ بدوں کی حالت کے نیک لوگوں کے لئے بدرجہا بہتر ہوگی"

مرنے کے بعد سزا و جزا کا خیال بہت قدیم خیال ہے۔ انسان اپنے اعمال کی سزا و جزا یا موت کے بعد کسی خوفناک شئے سے بے حد متاثر ہوا ہے، وہ اس سے بچنے کی ہمیشہ ایسی ہی کوشش کرتا رہا ہے، جیسی کہ خونخوار جنگلی حیوانات طوفان یا آگ سے محفوظ رہنے کے لیے کرتے ہیں۔ "اس کامل یقین" کی وجہ موجب کیا ہے؟ علم ہمیشہ محسوسات و مشاہدات سے پیدا ہوتا اور جاری رہتا ہے۔ دنیا کے قدیم باشندوں نے بھی مشاہدات ہی کے ذریعے سے علم حاصل کیا۔ مشاہدات ہی کے ذریعہ سے اُنھوں نے یہ دریافت کیا کہ پانی سے پیاس بجھتی ہے؛ فلاں فلاں حالتوں میں شکار رہتا ہے؛ غار پناہ دیتا ہے؛ دو چیزوں کے رگڑنے سے آگ پیدا ہوتی ہے؛ آفتاب روشنی اور گرمی کا سرچشمہ ہے؛ بعض پودے زہر آلود ہیں؛ جاڑے کی شدت پژمردہ کر دیتی ہے؛ بجلی ہلاک کرتی ہے!

شیر خوار بچہ بھی جب اپنا پہلا سبق سیکھتا ہے تو وہ محسوسات کا ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ماں خوراک، حفاظت، اور مہربانی کا منبع ہے۔ تھوڑے دن بعد اُسے معلوم ہوتا ہے کہ کوشش کرنے سے وہ چل پھر سکتا ہے۔ پھر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض اشیا ضرر رساں اور بعض فائدہ مند ہیں؛ بعض تلخ اور بعض شیریں؛ یہ گرم اور وہ سرد، بعض ہلکی اور بعض وزنی۔ پھر یہ دریافت ہوتا ہے کہ بعض کاموں کا نتیجہ اچھا ہے، اور دوبارہ اُن کے کرنے میں کوئی ہرج نہیں؛ فلاں کام نقصان دہ ہے، اس لیے اُس سے پرہیز لازم ہے۔ فائدہ بخش کاموں کو وہ اچھا سمجھتا ہے، اور نقصان رساں کاموں کو بُرا۔ زبان سے پہلا لفظ نکالنے سے پہلے اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ فلاں اسباب سے فلاں نتائج پیدا ہوتے

ہین؛ یعنی نتائج ہمیشہ اسباب کے مطابق ہوتے ہین!

یقیناً سب سے پہلا مذہبی خیال سزا و جزا کا خیال تھا جو انسان کے دل مین پیدا ہوا، اور کچھ شک نہین کہ اس خیال کی بنیاد سلسلۂ علل و نتائج پر رکھی گئی تھی، اور اب تک اسی پر قائم ہی۔ یہ ایک ایسا مناسب اصول ہی جو ہر کو مہ پر روز روشن کی طرح ظاہر ہی۔ دنیا کے قدیم باشندون نے سب سے پہلے یہی معلوم کیا کہ فلان کام کا نتیجہ اچھا ہی اور فلان کام کا برا۔ اس علم اور یقین کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ اُنھون نے علت و معلول مین ایک خاص تعلق دریافت کر لیا۔

علت و معلول یعنی سزا و جزا کا خیال یا احساس انسان کی سرشت مین داخل ہی جب اُس نے اپنے اُن تعلقات کو معلوم کر لیا جو بیرونی دنیا اور سلسلۂ قدرت سے ہین؛ اور اِن تعلقات کی بنا پر اُس نے ایک "برتر ہستی" کا اعتراف کیا، تو یہ فطرتی احساس خود بخود پیدا ہو گیا۔ قدرت کے انسانی تعلقات دو ضروری احکام کے پابند ہین، اور اُس نے زبان حال سے قدیم انسان کو یہی پکار کر کہا کہ "یہ کر" اور "وہ نہ کر"۔ بالاتر قوتون کی موجودگی مین، جن مین سے بعض خوفناک اور بعض مہربان ہین، انسان کو اُس کی تابعداری کے مادہ نے اِس بات کو یقین کرنے پر مجبور کیا کہ اُس پر ایک صاحب اختیار و طاقت حکمران ہی، جو زبردست ہی؛ وہ گناہون کی سزا اور نیکیون کا اجر دیتی ہی؛ نیک و بد افعال کا ثمرہ بخشتی ہی۔ جیسے جیسے اسکے فہم و ادراک مین ترقی ہوتی گئی، اُس کی ذمے داری کا دائرہ زیادہ وسیع ہوتا گیا؛ حتی کہ اُس کا خیال اِس دنیوی زندگی سے گذر کر حیات بعد الممات کی طرف رجوع ہونے لگا۔ یہ امر اُس کے دلنشین ہو گیا کہ وہ آئندہ زندگی بہ نسبت بُرے آدمیون کے اچھون کے لیے بہتر ہو گی۔

برٹن کا خیال ہی کہ "انسان کے افعال محض فوری فائدہ کے خیال سے نہین ہوتے، بلکہ جو فرائض اُس کے ذمے عائد کیے گئے ہین اُن کی تمامتر بہت ارفع و اعلی ہی، اور کوئی "برتر ہستی" اُن کی مقرر کرنے والی ہو"، اِس نظریہ کو قدیم ادنی اقوام نے بہت کم سمجھا، لیکن زمانۂ ابعد کے مذاہب نے رفتہ رفتہ اُس کو مکمل طور پر تسلیم کیا۔ دنیا مین اب کوئی بھی ایسا مذہب نہین ہی جو اپنے پیرو ان کو کسی نہ کسی بالاتر قوت یا قوتون کی کامل اطاعت و ذمہ داری کی تاکید و تلقین نہ کرتا ہو۔

جملہ مذاہب کا سنگ بنیاد یہ عقیدہ ہی کہ انسان کے اعمال و افعال میزان عدل مین تولے جائین گے۔ اس عقیدہ کا اثر نہ صرف موجودہ زندگی مین محسوس ہوتا ہی، بلکہ آئندہ زندگی مین بھی جاری رہتا ہی۔ یہی عقیدہ پرستش و رضا جوئی کا باعث ہی اور یہی تمام مذہبی مسائل سزا و جزا، آخرت، نجات، ابدی عذاب، اور بہشت و دوزخ کی بنیاد ہی۔

(۲) بقائے روح کا اعتقاد

مسٹر ایڈورڈ ٹیلر فرماتے ہین کہ "مذہب کی ادنی تعریف روحانی ہستیون کا اعتقاد ہی، جو اُن تمام ادنی اقوام مین بھی پایا جاتا ہی جن سے ہم نے گہرے تعلقات پیدا کیے ہین۔" "اگر روحانی ہستیون کے اس اعتقاد کو کمال تک پہنچایا جائے اور اُس کے معانی کو زیادہ وسعت دی جائے تو ہمارا صاحب کے قول کے مطابق اُس کی تشریح" روحانیات کو ماننا اور حیات بعد الممات کا اعتقاد" رکھنا ہو گی۔

بقول مسٹر ہربرٹ فلسفہ مذہب کا سنگ بنیاد یہی اعتقاد ہی جس پر وحشی سے لیکر ترقی یافتہ انسان تک سب یقین رکھتے ہین؛ اور یہی اعتقاد ایک قدیم و عالمگیر فلاسفی قرار دیا گیا ہی۔

گرانٹ آلین کے خیال کے مطابق ایک یا متعدد معبودون پر یقین رکھنے بلکہ نذر و نیاز کے ذریعہ سے خبیث ارواح اور دیوتاؤن کی پرستش و رضا جوئی حاصل کرنے کی رسم سے بھی زیادہ اور ضروری ایک اور عنصر ہی، جو مذہب اپنے دیگر عناصر کے ساتھ اپنے اندر رکھتا ہی۔ وہ عنصر "حیات بعد الممات" کا خیال ہی۔ آئندہ زندگی کے یقین ہی پر مذہب کی بنیاد قائم ہے۔

برنٹن لکھتا ہو:- "مین تحقیق کئی ایسے ادنیٰ اور بودے مذاہب کا پتہ دے سکتا ہون جن کا کوئی معبد یا قربان گاہ نہین یا جو مذہبی رسوم اور عبادت سے محض معرا ہین۔ لیکن کسی ایسے مذہب کا پتہ دینا میرے لیے امکان سے باہر ہے، جو روحانی قوتون اور انسان کے باہمی میل جول اور بات چیت پر اعتقاد رکھنے کی تعلیم نہ دیتا ہو"

ڈی اکیلا لکھتا ہو:- "گزشتہ بیس سال کی دریافتون نے جو بالخصوص فرانس و بلجیم کے غارون مین کی گئی ہین یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچا دیا ہو کہ نہایت ہی قدیم زمانہ کے انسان بھی جنازہ کی رسم ادا کرتے تھے! "آئندہ زندگی" کے قائل تھے! اور دیویون اور بتون کی پرستش بھی کرتے تھے!"

ہکسلے لکھتا ہو:- "بہت سی ایسی وحشی اقوام موجود ہین جو مطلق خدا کی ہستی سے بیخبر ہین، لیکن کوئی قوم ایسی نہین جو خبیث ارواح کی قائل نہ ہو"

ہربرٹ اسپنسر کے قول کے مطابق "فناے جسم کے بعد بقاے روح کا خیال سب سے پہلے ان لاانتہا اور پیچیدہ قیاسات کے جواس سے پیدا ہوتے ہین ..... دنیا کے تمام حصون مین ..... اور ہر جگہ برابر پایا جاتا ہو۔ یہ خیال ان اقوام مین بھی جو صورت و شکل مین ایک دوسرے سے متغائر ہین اعتقاد صفائی کے ساتھ پایا جاتا ہو کہ ماہرین فن کو مجبوراً یہ رائے قائم کرنا پڑتی ہو کہ یہ قومین بجز بری کی موجودہ تقسیم سے بہت پہلے ہر چہار اطراف عالم مین پھیل گئی تھین۔ حقیقت یہ ہو کہ یہ عقیدہ ہر نوع کے انسان مین موجود ہو اور ہم اس اعتقاد کو غیر مہذب، نیم مہذب اور مہذب غرض جملہ اقوام مین یکسان پاتے ہین"

کوئی مذہب بقاے روح کے اعتقاد سے معرا نہین۔ البتہ قدیم عبرانیون کا ضرور یہ عقیدہ تھا کہ فناے جسم کے بعد روح ایک ایسی مہمل ذہنی حالت مین چلی جاتی ہو جس کو کسی صورت مین "زندگی" کے نام سے منسوب نہین کیا جا سکتا۔ مگر زمانہ حال کے عبرانیون نے قدیم یہودیون کی مادیت یعنی انکار روح کی تردید کر دی ہو۔ چھ سو برس سے زائد مدت تک یہودیون کا ایک فرقہ حشر و نشر کا معتقد رہا ہو!

اہالیان چین نے بھی کنفیوشس کی تعلیم کو غلط قرار دیکر ایک حد تک اسکو رد کر دیا ہو۔ کیونکہ کنفیوشس کا عقیدہ روحانیت سے معرا و مبرا تھا، اور چینی مذاہب سراسر روحانیت سے پر ہین۔ کیا یہ تعجب کی بات نہین ہو کہ چینیون کا ایسا واجب التعظیم فلاسفر کنفیوشس اور نہ عہد عتیق کے اور مصنف ہی اپنے پیرون کو "آئندہ زندگی" پر یقین رکھنے سے مستقل طور پر باز رکھ سکے۔

عالمگیر اور پائدار مذہب اسی کو کہا جا سکتا ہو جو انسان کی حیات بعد الممات پر کوئی حد قائم نہ کرے بعض ایسے معلم بھی گذرے ہین جن کا یہ دعوی ہو کہ صرف مستورات یا ستایل لوگ یا بزرگ و برتر اشخاص ہی اس طبعی موت کے بعد زندہ رہین گے۔ اور بعض معلمون نے تو یہ فتوی بھی دیدیا ہو۔ حیات بعد الممات کوئی چیز ہی نہین لیکن ظاہر ہو کہ ان تعلیمات نے کوئی خاص یا مستقل اثر انسان کے دل پر نہین کیا۔ نتیجہ یہ ہو کہ دنیا کے تمام موجودہ مذاہب فناے جسم کے بعد بقاے روح کے قائل ہین یعنی وہ یہ قرار دیتے ہین کہ انسان کا سلسلہ حیات فناے جسم کے ساتھ منقطع نہین ہو جاتا بلکہ یہ سلسلہ آیندہ بھی برابر جاری رہتا ہو۔

(۳) ایک صاحب اختیار اور اعلی طاقت کا اعتقاد

جہانتک ہمارا علم رہبری کرتا ہو ہم کہ سکتے ہین کہ انسانی ہستی سے بالاتر طاقتون اور قوتون کا اعتقاد ساری دنیا مین پھیلا ہوا ہو۔ ہر مذہب و مشرب کا آدمی ان طاقتون کا قائل ہو۔ حتی کہ دہریے اور ناستک بھی ان طاقتون کے مقر ہین۔ وہ تسلیم کرتے ہین کہ کوئی ایسی اعلی اور زبردست طاقت موجود ہو، جسکو ہم نہین جان سکتے۔

مشہور ہو کہ بودھ مذہب خدا کا قائل نہین، اور اس بنیاد پر دعوی کیا جاتا ہو کہ مذہب کے لئے خدا کا یقین لازمی نہین ہو۔ بلکہ ہو کہ دہ کسی اعلی

وبرتر ہستی (خدا) کا قائل نہو۔ لیکن یہ بات بالکل غلط ہو کر وہ کسی اعلیٰ منصف طاقت کو تسلیم نہین کرتا۔ بودھ مذہب سے زیادہ کسی اور مذہب مین سزا و جزا کے ابدی اثرات تسلیم نہین کئے گئے جیسا کہ "کرم" کی تعلیم سے ظاہر ہو۔ قدیم انسانون کا خیال کسی صاحب اختیار ہستی کی نسبت بہت ہی دُھندلا اور نامکمل تھا۔ وہ اس ہستی کو نصرف پہاڑون، چٹانون سورج، چاند، ستارون اور اپنے بزرگون مین پرتو فگن پاتے تھے بلکہ حیوانات مچھلیون اور رینگنے والے جانورون مین بھی اس کا ظہور پاتے تھے، بہرکیف خواہ وہ کسی صورت مین اس برتر ہستی کو تسلیم کرتے ہون، مگر اسمین کلام نہین کہ وہ قوت ان کے لیے ایک منصف اور صاحب اختیار ہستی تھی، جس کے آگے ان کا سر طاعت خم ہوتا تھا۔

رفتہ رفتہ یعنی انسانی تہذیب و ترقی کے ساتھ ساتھ اس عظیم الشان طاقت کے متعلق علم بھی وسیع ہوتا گیا۔ پُرانے اور ادنیٰ خیالات کی جگہ نئے اور اعلیٰ خیالات پیدا ہونے لگے۔ توہم پرستی کی جگہ بُت پرستی نے لے لی۔ پھر بہت سے معبودون کی پرستش شروع ہوئی، جو آخرکار ایک معبود کی عبادت مین تبدیل ہوگئی۔

قدیم انسان کے تنگ و محدود عقائد کے مقابلہ مین ترقی یافتہ قومون نے اُس سب سے بڑے حاکم اور منتظم حقیقی کی طرف نہایت اعلیٰ اور شاندار صفات منسوب کی ہین۔ قدیم آریا اپنے بڑے دیوتا "درن" مین، ہندو اپنے پرمیشور "برہما" مین عبرانی اور مسیحی اپنے قادر مطلق "یہوداہ" مین، اہل ڈنمارک اپنے مطلق باپ "اودن" مین، یونانی اپنے سب سے بڑے دیوتا "زیوس" مین، رومی اپنے خدائے عظیم "مشتری" مین، اور مسلمان اپنے وحدہ لاشریک "اللہ" مین شان الوہیت و معبودیت تسلیم کرتے ہین۔ اُس برتر و اعلیٰ ہستی کی قدرت و فضل کے اظہار کے لئے نہایت موزون و مناسب الفاظ اختیار کئے گئے، مثلاً پروردگار عالم، الٰہی، حی القیوم، قادر مطلق، حاضر و ناظر، زمین و آسمان کا مالک، حاکمون کا حاکم وغیرہ۔ یہ وہ الفاظ ہین جو بالعموم خدا کی طرف منسوب کیے جاتے ہین۔ بہرحال خدا سے مراد وہی خدا ہو، جو نیکون کو جزا اور بدون کو سزا دیتا ہو، جو ہمین ہمارے اعمال و افعال کا بدلہ دینے والا، اور ایک صاحب اختیار اور منصف حقیقی ہے۔

(باقی)

العصر

فلسفہ

اُردو رسالوں مین اِس سے پہلے اس مبحث پر جس قدر مضامین راقم کی نظر سے گذرے وہ کچھ ایسے تھے کہ اُن سے فلسفہ کے مفہوم اور ماہیت پر گہری روشنی نہیں پڑتی۔ اس لیے ارادہ ہے کہ اس کی ابتدا اور نوعیت' اور حقیقی معانی پر شرح و بسط سے بحث کرکے اُسے بالکل صاف کردیا جائے' تاکہ جو لوگ بڑی بڑی کتابیں پڑھنے کی ہمت نہین رکھتے یا اُنھیں فرصت نہین ہے' وہ فلسفہ کے معانی اور مفہوم پر بآسانی عبور حاصل کرکے مستفید ہوں۔

فلسفہ یونانی الاصل ہے' جو عربی میں داخل ہوکر پہلے فارسی اور پھر اُردو مین بھی آ دھمکا۔ اسکے مترادف علم حکمت' علم موجودات حقائق الاشیا' گیان گیانات' جوگ وغیرہ وغیرہ مین۔ فلسفہ کا یونانی ماخذ "فلوس" (PHILOS) اور "سوفیہ" (SOPHIA) ہے' جس کے لغوی معنی "شیدائے حکمت" مین "فلوس" بمعنی شائق' اور "سوفیہ" بمعنی دانائی یا حکمت۔ لفظ "فلوسوفیہ" (Philosophia) کو پہلے پہل مشہور یونانی حکیم فیثاغورس نے استعمال کیا تھا۔ دیوجانس لارشیس دہی زبان مین اس اصطلاح کا اپنے کو مخترع قرار دیتا ہے۔ مشہور یونانی مورخ ہیرواطوس اور زیک اور یونانی مورخ طسی ودلس ([illegible] ق م) نے لفظ "فلوسوفین" (Philosophein) استعمال کیا ہے جس کے معنی "تجسس علم" یا "تلاش حق" ہیں۔ مگر شیدائے حکمت "فلوسوفوس" (Philosophos) سے در اصل جو مراد ہے اُس کا امتیاز پہلی مرتبہ افلاطون کی کتابون مین ملتا ہے۔ اس خیال کی رو سے "فلاسفر" وہ آدمی ہے جو حقائق الاشیا' یا ہیولائے اول کی ماہیت معلوم کرنے کی جستجو کرتا ہے۔ اسکی ضد وہ آدمی ہے جو محض موجودات کی علت صوری یا ظاہری صورت کی دیکھ بھال میں مصروف رہتا ہے۔ حکیم سے مراد بقول افلاطون وہ شخص ہے جو ازلی و ابدی اور غیر متغیر ہستی کی حقیقت سمجھنے کی قابلیت رکھتا ہے' اور واجب الوجود کی فطرت جاننے کے درپے رہتا ہے۔ مگر افلاطون دینی اور اخلاقی معنی مین لفظ فلسفہ استعمال کرتا ہے۔ اسلیے اُس سے فلسفہ کی تشریح پیدا ہوتی ہے

حقائق الاشیا کی ماہیت سمجھنے کی سعی کا نام حکمت ہے۔ مگر ہم موجودات کی اصل اصل کس طرح جان سکتے ہیں، اور واجب الوجود کی اصلیت جاننے کے لیے کن طریقوں سے کام لینا چاہیے۔ اس کی بابت افلاطون خاموش ہے۔ اُس نے منطق، اخلاقیات، طبیعیات، نفسانیات، نظریۂ علم، مابعد الطبیعیات وغیرہ کو نیم مذہبی ترکیب مین خلط ملط کر دیا ہے مگر ارسطو نے جو زمانۂ سلف کا سب سے بڑا ماہر فن مولا الحکیم یعنی قاموس متحرک تھا ماہیت اشیا کی تحقیقات کے طریقے وضع کیے، اور ایسے طور پر تفریق کی کہ زمانۂ حال تک تسلیم ہوتی رہی۔ ارسطو کے بیان کے مطابق قدیم زمانہ کے فلاسفر علم موجودات (Cosmology) کے شائق تھے۔ اُن کی یہ کوشش تھی کہ مظاہر کے پس پشت موجود فی الذات کی حقیقت کو جانین۔ سقراط اور افلاطون اس مسئلہ کا حل انسان کی اخلاقی اور ذہنی حالت سے بہم پہنچانے کی کوشش کرتے تھے جس کی وجہ سے اول الذکر نیچرل علم اور آخر الذکر منطق اور اخلاقیات مین تفریق نہین کرتا، مگر ارسطو نے اپنے اُستادون کے طریقہ سے انحراف اختیار کر کے منطق نفسانیات، اخلاقیات، اور حسنات کو مختلف علوم قرار دیا۔ ہستی کی علت آخری ان سوالات کا الساق قرار پایا۔ اُس کے خیال کی رو سے ریاضی اور طبعی مسائل کی تحقیقات فلسفہ کے زیر اثر ہے۔ اس عالم اور اس کے خالق کے تعلقات فیمابین کی بحث بھی اُسی کے سپرد ہوئی اور اُس کا نام علم موجودات معقولیہ قرار پایا۔ مگر بعد ازان اُسے مابعد الطبیعیات کے احاطہ مین مقید کر دیا گیا پھر خاص علوم مین قطع و برید ہوئی اور "فلسفہ" اصول اولیہ کے نام سے مشہور ہوا، اور علم ہستی (Ontology) کی صورت مین منتقل ہو گیا اس کی تین شاخین نفسانیات، علم موجودات الطبیعیات، اور الٰہیات فطرت ہیں جن کا بڑا موضوع روح، دنیا اور خدا[۱۲] ہے۔

[۱۲] انسائیکلوپیڈیا بریٹانکا گیارھوان ایڈیشن جلد ۲۱ صفحہ ۴۲۰

فیثاغورس نے فلسفہ کی تشریح یون کی ہے: "موجودات باعتبار موجودات کے علم کا نام حکمت ہے۔ چاہیے یہ مسائل انسان کی ہستی سے تعلق رکھتے ہون یا خدا سے، ان کا علم حاصل کرنا فلسفہ کا کام ہے"۔ افلاطون کہتا ہے کہ "خدا اور انسان کی درمیانی مشابہت کو جہان تک ہو سکے جاننے کی کوشش فلسفہ کا کام ہے"۔ ارسطو کی رائے یہ ہے کہ "فنون کا فن اور علوم کا علم حکمت[۱۳] ہے"۔

سر ولیم ہملٹن، اسکاٹ لینڈ کے مشہور فلاسفر کی رائے یہ ہے کہ زمانۂ قدیم اور جدید مین فلسفہ کی تشریح کی بہت کوشش کی گئی ہے۔ مگر تمام تشریحین غیر معین اور بہت مبہم ہین۔ اصل یہ ہے کہ فلسفہ کی تشریح قریب ناممکن ہے۔ اس وجہ سے یہان پر اُس نہایت پرانی اصطلاح کی جامع و مانع تشریح پیش کرنا دشوار ہے یہان صرف بڑے بڑے علماء کے خیالات پیش کیے جاتے ہین جن سے فلسفہ کی اصلیت اور معانی کا کچھ اندازہ ہو جائے گا۔

قدیم فلاسفرون کے سوانحی حالات کی کتاب مین دیوجانس لارشس لکھتا ہے کہ "بعض کہتے ہین کہ فلسفی تحقیقات کی اختراع باربری[۱۴] قومون مین ہوئی تھی۔ ایرانیون میں مجوسی (آتش پرست پروہت) تھے، اور بابل اور اسیریہ مین کلدانی تھے (جو اجرام فلکی کی پوجا کرتے تھے اور نجوم کے ماہر تھے)۔ ہندوستان مین سنیاسی اور جنگلون مین رہنے والے رشی تھے۔ کیلٹ اور گال قوم مین ڈرووڈ لوگ تھے۔ فنشیا مین اوکس، اور تھریشیا مین زمول کس اور لیبیا مین اطلس تھا۔

[۱۳] ماخوذ از مابعد الطبیعیات حصۂ دوم لکچر ۱ مصنفہ سر ولیم ہملٹن۔

[۱۴] اس لفظ سے مراد شمالی افریقہ کے لوگ ہین۔ یونانی اپنے آپ کو سب سے افضل و برتر سمجھتے تھے۔ اس لیے باقی تمام اقوام کو باربرس کہتے تھے۔ جس کے معنے وہ آدمی جس کی بولی سمجھ مین نہ آئے۔ لاطینی اور انگریزی مین اس سے مراد جنگلی اور غیر مہذب ہے۔

اِل ہم کے خیال کے رو سے تیلس کا بیٹا و لکن فلسفہ کا موجد تھا کیونکہ اس دیوتا کے پجاری وغیرہ "فلاسفر کہلاتے تھے۔" آگے جاکر وہی مصنف کہتا ہے کہ "فلسفہ کے تین حصے ہین۔ طبعیات، اخلاقیات، اور منطق یا علم مناظرہ۔ فلسفۂ فطرت دنیا اور محسوسات ما فیہا سے بحث کرتا ہے اور فلسفۂ اخلاق انسان کی زندگی اور اُسکے تعلقات سے سروکار رکھتا ہے علم مناظرہ فلسفۂ فطرت اور فلسفۂ اخلاق کے مسائل کی صحت ثابت کرنے کے دلائل اور طریقے بیان کرتا ہے۔ فلسفۂ فطرت کا ارفلاس کے زمانہ تک زور رہا فلسفۂ اخلاق سقراط کے زمانہ مین زور ون پر تھا اور زینو کے بعد ایاطلی فرقہ کے حکما پیدا ہوے جو مناظرہ کے اُستاد سمجھے جاتے تھے۔ اسلاف نے علوم کے ہر شعبہ مین اتنی ترقی نہین کی تھی اور نہ وہ ہندی کی چندی کرنے کے طریقون سے واقف تھے جیسا اس زمانہ کے عالم ہین۔ اس وجہ سے وہ تشریح کرنے کے طریقے سے بخوبی واقف ہی نہ تھے۔ ارسطو نے اوّل مرتبہ منطقیانہ تشریحات کو رائج کیا تھا۔ اس لیے اب اس زمانہ کے مشہور عالمون اور فلاسفرون کی آرا نقل کرنا مناسب ہے۔ جارج ایچ لُوئیس مشہور مصنف تھا۔ اُس نے تاریخ فلسفہ لکھ کر اچھا نام پیدا کیا ہے۔ وہ فلسفہ کی بابت لکھتا ہے کہ "جو تصورات سائنس اور الٰہیات بہم پہنچاتی ہے ان کے انضباط اور تنظیم کے عمل کا نام فلسفہ ہے جیسے جزئیات کے وسیلے سے حاصل کی ہوئی کلیات کو منضبط کرنے کے عمل کا نام سائنس ہے اسی طرح کلیات کی کلیات کے انضباط کا نام فلسفہ ہے۔ دوسرے لفظون مین اس کے معنی یہ ہین کہ سائنس تو علم بہم پہنچاتا ہے اور فلسفہ اُس کے اصول مرتب کرتا ہے ہر علم کا جداگانہ کام ہے ریاضیات فقط مقدار سے بحث کرتی ہے۔ طبعیات اور کیمیات کا تعلق بے جان مادہ کے تغیرات سے ہے جاندار اشیا کے تبدلات کی خورد بینی تحقیقات علم الحیوٰۃ (بیالوجی) کا فرض ہے۔ اور سوشیالوجی علم المعاشرت کی ڈیوٹی یہ ہے کہ وہ بنی آدم کے تعلقات باہمدگر اور نیز اُن کے تعلقات ماضی و مستقبل کی تحقیقات کرے۔ مگر فلسفہ کا کوئی خاص شعبۂ علم نہین ہے۔ بلکہ تمام عالم تخیل اُس کے زیر نگین ہے۔ دیگر علوم کا فلسفہ سے وہی علاقہ ہے جو جغرافیہ کا ٹاپوگرافی (تذکرۂ طول البلد) سے ہے تمام علوم اس کے نوکر ہین، اور اس کی خدمات انجام دیتے ہین بلکہ اُس کی غذا اور زیست کا کام دیتے ہین۔ فلسفہ علوم کی کمائی کو ضابطہ مین ڈھالتا اور ان کے حقائق کو اصول کے قالب مین ترتیب دیتا ہے۔ تھیالوجی تصورات دینیہ اور سائنس نظام عالم کے خیالات بہم پہنچاتا ہے۔ مگر فلسفہ ان دونون کے تصورات کو ایک دوسرے سے جدا کرتا اور ایک اصول بہم پہنچاتا ہے جس سے دنیا کی ابتدا اور انسان کی ہستی کے مقصد کی تشریح و توضیح ہوتی ہے۔

ٹامس ہابس کی رائے مین فلسفہ "تعلقات علتی کے علم کا نام ہے۔ دے کارٹ کے نزدیک "ممکن الادراک اشیا کے کامل علم کا نام فلسفہ ہے" اور اس مقصد سے اُس نے ایک سب سے اعلیٰ اور آخری اصول معلوم کرنے کی ضرورت ظاہر کی جس سے علم کا ہر جز معقولیات سے استخراج ہو سکے۔ جرمن فلاسفر ولف کے خیال مین فلسفہ "ممکنات کے علم" کا نام ہے۔ کانٹ نے فلسفہ کی تشریح یہ کی ہے کہ تصورات سے استدلال کرکے جو علم حاصل کیا جائے فکٹ کے نزدیک فلسفہ "علم العلم" ہے۔ ہیگل نے فلسفہ کی تشریح کرتے ہوئے اُسے قادر علی الاطلاق کا علم" قرار دیا ہے۔ ہربارٹ کہتا ہے کہ "تصورات کی ترتیب اور تشریح کا نام فلسفہ ہے۔ پاؤل زن لکھتا ہے کہ "سائنسی علوم کا لب لباب فلسفہ ہے۔ بینگ اور بیبس کے خیال مین تجربات معنوی کے سائنس کا نام فلسفہ ہے۔ وونٹ کہتا ہے کہ "خاص علوم کے وسیلے سے جو ہر قسم کے معلومات

لہ امقدر ملاحظہ ہو ۔

حاصل کیے جاتے ہین۔ انھین ایک اصول اعظم کے تابع کرنے کے عمل کا نام فلسفہ ہے۔ جرمن فلاسفر یورِیب دیگ نے جو تشریح کی ہے وہ آجکل کے خیال کی مظہر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فلسفہ اصولیات کا علم ہے۔ جرمن پروفیسر ویبر لکھتا ہے کہ کائنات کے جامع خیال کی جستجو اور تجسس یعنی موجودات کی جامع ومانع توضیح کی کوشش کا نام فلسفہ ہے۔ یہ علوم کا فقط خلاصہ ہی نہین۔ بلکہ ان کا اختتام اور تکمیل بھی ہے۔ یہ علم اعظم اور خصوصیت فن ہے جو سائنس خاص سے تفرق ہے ...... علوم بغیر فلسفہ جسم بغیر روح کے ہے۔" پروفیسر چارلس ڈبرے لکھتے ہیں کہ "لفظ فلسفہ کا اطلاق محسوسات کے اصول اعلےٰ کے علم پر ہوتا ہے۔" آنریبل پروفیسر برٹ ہنڈ لکھتے ہین کہ "فلسفہ کا مقصد اولی علم ہے" اور یہ وہ علم ہے جس سے علوم اتحاد ویگانگت قبول کر کے ایک ضابطہ کی صورت مین حیات ہوتے ہین۔" دنیا کی حقیقی ماہیت کی باقاعدہ تحقیقات کا نام فلسفہ ہے۔" ہربرٹ اسپنسر کی رائے نہایت وقعت کے قابل ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "کلیات کے اعلیٰ ترین علم کا نام فلسفہ ہے..... فلسفہ کامل منضبط علم کا نام ہے۔" پروفیسر ولیم جیمز جو اس زمانہ کے نہایت مشہور فلاسفر سمجھے جاتے ہین لکھتے ہین کہ لفظ فلسفہ زیادہ تر عالم گیر وسعت کے خیالات پر عائد ہوتا ہے موجودات کے پس پشت کیا اصول ہین جس سے ان کی تشریح کی جاتی ہے؟ انسان، حیوان، اور پتھر کے عناصر مشترکہ کیا ہین؟ کائنات کے اندر انقلابات کیسے ہوتے ہین! اور ان کا کیا حشر ہوگا؟ ہمین اشیاء کا علم کس طرح ہوتا ہے؟ اور انسان کے کردار کے بڑے بڑے اصول کیا ہین؟ یہ سب فلسفہ کے خاص مسائل سمجھے جاتے ہین۔" موجودات کا علم علل آخری کے وسیلہ سے جہان تک عقل کی دسترس ہے حاصل کرنے کا نام فلسفہ ہے۔" اب سب کے اخیر مین فرانس کے مشہور فلاسفر وکٹر کوزان، کے خیالات کا اقتباس بھی ضروری ہے جس سے ہمارا مفہوم بخوبی ظاہر ہو جائیگا۔ "فلسفہ قوت متفکرہ کی کامل نمود ہے فلسفہ تصورات کی پوجا ہے۔ یہ تخیل کے ہر غیر خارجی عنصر اور صورت کی آخری فتح ہے۔ اور یہ ذہانت اور آزادی کی اعلےٰ ترین صورت ہے۔ فلسفہ تخیل کی سب سے بڑی ترقی اور سب سے بڑا استحقاق ہے۔ فلسفہ نور الانوار اور تمام سندون مین سب سے بڑی سند ہے۔ الغرض فلسفہ موجودات کے ادراک اور توضیح کے عمل کا نام ہے۔" پھر فٹ نوٹ (ذیلی حاشیہ) مین موسیو کوزان کہتا ہے کہ "کوئی ایسا فلاسفر نہین ہے جس نے فلسفہ کی یہ تشریح نہ کی ہو کہ وہ سب سے بڑی سند اور نورون کا نور ہے۔ افلاطون اسے شاہی علم قرار دیتا ہے۔ ارسطو کہتا ہے کہ فلاسفر سے وہ آدمی مراد ہے جو سب باتون سے واقف ہو اور سب مشکل مسائل کو سمجھتا ہو۔ علوم فلسفہ سے زیادہ ضروری تو ہین مگر اسکے برابر عمدہ نہین ہین۔ فلسفہ جملہ علوم کا سرتاج ہے، سب پر حکمران ہے" اور ہر واقعہ کی علت کی بحث کرتا ہے۔ فلسفہ سب علوم سے بڑھ کر آزاد ہے یعنی کسی کا محتاج نہین ہے۔ یہ اپنا مقصد آپ ہی ہے۔"

امید ہے کہ ان مختلف فلسفی اقتباسات سے ظاہر ہو گیا ہوگا کہ فلسفہ کیا ہے؟ اور اسکی ماہیت اور حقیقت کیا ہے؟ فلسفہ کی ایسی جامع تشریح پیش کرنا جیسے اقلیدس یا ریاضیات کے کسی مسئلہ کی ہو سکتی ہے بہت مشکل ہے۔ ہر فلاسفر اپنے اپنے خیال کے مطابق اسکا مفہوم ادا کرتا ہے۔ عامیانہ معنے مین فلسفہ

۵۱ یہ تمام تشریحات کولپ کی "تمہید فلسفہ" (صفحہ ۱۰۹-۱۱۰-۱۱۱) سے ماخوذ ہین

۵۲ "تاریخ فلسفہ" صفحہ ۱-۲۔ ۵۳ "مسائل فلسفہ" صفحہ ۱۳۹

۵۴ "تاریخ فلسفہ" پروفیسر ویب صفحہ ۱

۵۵ "فرسٹ پرنسپلز" صفحہ ۱۰۲-۱۰۳

۵۶ "مسائل فلسفہ"

۵۷ "ہسٹری آف ماڈرن فلاسفی" صفحہ ۲۳-۲۴-۲۵ پہلی جلد

مراد دنیاوی معاملات کی معقول واقفیت ہے۔ نظر غائر سے کسی عالمہ کو دیکھنا بھی اسی کے تحت میں آتا ہے۔ فلسفہ لغوی طور پر یونان میں شروع ہوا جو ابتدا میں وہاں پر مشاہدۂ فطرت، تغیرات موجودات، اور انکی علت غائی کی تحقیقات سے وابستہ تھا۔ کچھ عرصہ تک طبیعیات اور طبعی مظاہر کی تفتیش اسکا بڑا مقصد رہا۔ پھر انسان اور اسکے تعلقات زمانی اور مکانی اور روزانہ زندگی کے کاروبار فلسفیانہ تجسس کا اہم مبحث بنے ارسطو نے اسکی کھال اُتاری اور اسکے اجزا الگ الگ کرکے مظاہر قدرت کو مظاہر فطرت انسانی سے بالکل جدا قرار دیا اور ان ہر دو قسم کے مظاہر کی علت العلل، کائنات کے پس پشت ہستی یعنی ارض و سما کے خالق اور یہ کہ اسکے تعلقات انسان اور دنیا کے ساتھ کیا ہیں؟ اُن کی تحقیقات مابعد الطبیعیات کے سپرد کی۔ بعد کے زمانوں میں جو علمی ترقیاں ہوئیں وہ اسی قاعدہ کی پابندی کے ساتھ ہوتی رہیں۔ زمانۂ حال کے محققوں نے قدما کے راستہ پر چلنے سے انکار کیا اور فلسفہ اور سائنس کا دائرۂ عمل الگ الگ کردیا۔ لیکن جب اس لفظ سے مراد انسان کی عقلی قوت کا اپنے اردگرد اور اوپر نیچے کے واقعات اور اسباب کی طرف خصوصیت سے رجوع ہونا لیا جائے تو فلسفہ کی ابتدا اس وقت ہوتی ہے جب انسان کے اندر سوچنے کی طاقت پیدا ہوئی۔ جب یہ کیفیت ہے تو انسان کی توجہ سب سے پہلے قدرتی واقعات کی طرف مائل ہوتی ہے۔ پھر اُن کے اسباب کی تحقیقات کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ فلان قدرتی واقعے کس وجہ سے ہوئے؟ دونون کے درمیان کیا رابطہ ہے؟ پھر ان دیدنی مظاہر قدرت کے سلسلہ کا غیر دیدنی اسباب سے کیا علاقہ ہے؟ پھر ان سب کا آخری سبب کیا ہے؟ اور عالم کے اندر جو مختلف انقلابات دیکھے جاتے ہیں یہ کیون ہوتے ہیں؟ اور ان کا محرک اصلی کون قوت یا ہستی ہے؟ اسکے ساتھ میرا کیا واسطہ ہے؟ موجودات اور میرے درمیان کیا نسبت ہے؟ پھر ہم دونوں کا وجود مطلق کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ اور ان تینوں کے باہم دگر کیا تعلقات ہیں؟ رفتہ رفتہ یہ سب سوالات فلسفہ کے موضوع قرار پائے۔ اسلیے تمام اسباب پر نظر ڈال کر فلسفہ کی مختصر تعریف یہ ہوسکتی ہے کہ "وجود مطلق اور اسکے تعلقاتِ عالم و انسان اور پھر ان تینون کے تعلقات باہمدگر کی تحقیقات، اور عالمِ اسباب کے مظاہر مرئی اور ان کے غیر مرئی محرکات کا علم حاصل کرنے کا نام حکمت یا فلسفہ ہے۔ اسکے ساتھ ہی اس علم کا طریقۂ تحقیقات اور عقل انسانی کی قوت مدرکہ اور ہمارے حاصل کردہ علم کی صحت اور کمالیت کا مسئلہ بھی اُسی سے وابستہ ہے جو فلسفہ میں شامل ہے۔"

فلسفہ کے مسائل کیا ہیں اور انھین وہ کس طریقہ سے حل کرنے کی کوشش کرتا ہے؟ یہ بھی دلچسپ بحث ہے جس پر اس اہم بحث کو الوداع کہنے سے پیشتر بحث کرنا مناسب ہے۔ فلسفہ بعض خاص آدمیون کا خواب نہیں ہے بلکہ فطرت انسانی کی ابتدائی ضرورت کی لازمی نمو ہے۔ تخیل انسان اور حیوان کے درمیان سب سے بڑا مابہ الامتیاز ہے۔ فلسفہ کا مبدا انسان کی قوت متفکرہ ہے۔ دوسرے لفظون میں اسکے یہ معنی ہین کہ فلسفہ کے مسائل وہ تصورات ہین۔ جو انسان کی زندگی پر حکمران ہین۔ بقول کوزان "فلسفہ عقل کا بیٹا ہے" فطرت انسانی کی ضروریات یعنی بڑے بڑے تصورات (۱) سودمندی اور استفادہ کا خیال جو ریاضیات طبیعیات، صنعت و تجارت اور اقتصادات کے متعلق کوششون سے ظاہر ہے۔ (۲) عدل کا خیال جس کے سبب حکومت وجود مین آتی ہے تاکہ خود غرضون کو راہ انصاف پر چلنے کو مجبور کرے۔ اسی سے علم اخلاق پیدا ہوا ہے۔ (۳) حُسن کا خیال، انسان خوبصورت

چیزون کا طبعاً شیدا ہے۔ اس سے علم حُسن وجود مین آیا۔ (۴) خدا کا عقیدہ جو ہر ایک دل مین فطرتی ہے۔ یہ الٰہیات کا بانی ہوا ہے۔ اور (۵) ان خیالات مین سب سے اعلےٰ و بالا سچائی (سچ) کا خیال ہے جسے دوسرے لفظون مین ہستی و نیستی کا مسئلہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ انسان سوچتا ہے کہ حق کیا ہے؟ وہ کونسی چیز ہے جسے زوال نہین اور جو ہمیشہ جون کی تون رہے گی؟ اس سے مابعد الطبیعیات کی عقل کو حیران کرنے والی اشیا معرض ہستی مین آئی ہین یا ان تصورات کو فلسفی طریقہ مین یون کہنا مناسب ہوگا کہ (۱) سب سے مقدم نظریۂ عالم کا جامع تصور ہے۔ اسکے لیے ضروری ہے کہ علوم موجودہ کے جتنے مختلف پہلو ہین اُن سب کو مدِ نظر رکھا جائے۔ یعنی عالم کی بابت کتنے قسم کے خیالات ہین؟ کن کن علوم کے سربراہون نے انھین قائم کیا ہے؟ اگرچہ اس سے اُن خیالات کی صحت کا مسئلہ بھی پیدا ہوتا ہے، لیکن اصل یہ ہے کہ عالم کی بابت وسیع سے وسیع خیال قائم کیا جائے۔ اسکے علمی اور عملی دو پہلو ہین۔ کیونکہ تصورِ عالم ہماری زندگی پر ایک حد تک حکمران ہے۔ (۲) فلسفہ سائنس کے مقدمات کی حقیقت کا بھی کھوج لگاتا ہے۔ اس سے ظرف، زمان، سببیت وغیرہ کے تصورات اور نیز سائنس کی تحقیقات کا طریقہ اور اسکی مختلف صورتون پر بھی بحث لازم آتی ہے۔ فلسفہ تمام علوم کے واقعات جیسے کیمیات، علم الحیوٰۃ، تشریحات، افعال الاعضا، جغرافیات، ارضیات، فلکیات، الطبیعیات، اقتصادات، ملکیات، (پالیٹکس)، علم المعاشرت، دینیات، تاریخ، لسانیات وغیرہ پر آزادانہ نظرِ ثانی کرکے انکی صحت اور معقولیت کی بابت اپنا فیصلہ صادر کرے۔ (۳) طبقہ مین فلسفہ کا یہ کام ہے کہ خاص اور نئے علوم اور خاص تحقیقی علم کے لیے راستہ تیار کرے۔ مابعد الطبیعیات ظاہر کرتا ہے کہ ہمارے علوم کے تسلسل مین بہت جگہ رخنے ہین جنھین موقوف کرنا ضروری ہے۔ فلسفہ تاریخ مین اس قسم کی کوتاہیان نہین ہین بلکہ سائنس کے کئی شعبون مین ابھی تحقیقات کی بڑی گنجائش ہے اس وجہ سے فلسفہ کی تنقید سے یہ خامیان دور ہوکر علوم کا سلسلہ برابر قائم رہیگا۔

اس حصۂ مضمون پر قدرے وضاحت سے بحث کرنے کی ضرورت ہے فلسفہ کے پُرانے مسائل کی تفصیل یہ ہے۔ (۱) حقائق کی تحقیقات محسوسات یا عالم پر گہری نظر۔ (۲) اس سے کاسمولاجی (موجودات اور آفرینش) بیالوجی (علم الحیوٰۃ) یعنی جانداران کی نسبت تحقیقات سائیکالوجی (علم النفس) یعنی انسان کی ذہنی اور اخلاقی کیفیتون کی غور پرداخت اور تھیالوجی (الٰہیات) یعنی خدا کو دنیا کا سبب اولین قرار دے کر اسکی نسبت سوچ بچار کے مطالعہ اور تجسس کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ (۲) حقائق کے علاوہ ذہنی یا تخیلات کی تحقیقات بھی لازم آتی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ان اصولون پر غور کرنا ضروری ہے جن کی پابندی سے انسان کسی مسئلہ پر استدلال کرتا ہے۔ اس سے منطق اور علم الحسنات (ایس تھیٹکس) جس سے پسندیدہ چیزون کے حصول کے آدرش ابھار پاتے ہین، اور اخلاقیات کی تحقیقات جس سے اخلاقی قواعد کے مطابق ہماری کردار ہدایت پاتی ہے ضرور ٹھہرتی ہے۔ (۳) حقائق اور تخیلات کے درمیان ایک اور علم حائل ہے جو ایپسٹمالوجی کہلاتا ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ ہمارے خیالات کس حد تک حقائق کی اصلیت سے مطابقت کھاتے ہین۔ اس سے ظاہر ہوا کہ فلسفہ کے دو بڑے عالم ہین جنکی موجودات سے اسکا سروکار ہے۔ اول عالم محسوسات جو عالم اور انسان پر حاوی ہے۔ خدا کا اُن دونون سے کیا تعلق ہے؟ اسکے بعد علم اور حقیقت (معلومہ) کے تعلق درمیانی کا علم ([illegible]) ہے (دوم) عالم خیال۔ جس مین (آ) تخیل۔ (ب) اظہار منتہائے کمال اور (ج) کردار انسان ہے۔

چونکہ انسان ہی ان تمام مسائل کے حل کرنے کے درپے رہتا ہے اس وجہ سے اسی سے شروع کرنا چاہیے یعنی سب سے پہلے یہ مسئلہ ہے کہ انسان کو موجودات کا علم کیسے حاصل ہوتا ہے؟ اس وجہ سے تعلم و تحسیس اور تعقیل سے بحث لازم آتی ہے۔ بعد ازاں ان تینوں عمل کے قواعد پر غور کرنا مناسب ہے۔ علم کی قدر و قیمت پر بحث کرنے کے بعد ہم عالم انسان و خدا کی ہستی پر غور کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اس لیے فلسفہ کے مسائل چار گروہوں میں منقسم ہونے چاہئیں۔

اول۔ ذات یا من (Ego) کی مختلف حالتوں کی تحقیقات ہے۔ اس سے سائیکالوجی کی ضرورت ہے۔ اور یہ تین بڑی کیفیتیں ہیں۔ (ا) شعور ادراکیہ۔ (ب) شعور جذباتیہ۔ (ج) شعور فعلیہ۔

دوم۔ اصولیات یا علوم قانونیہ۔ (ا) قانون تخیل، منطق (ب) علم حسنات۔ (ج) کردار اور ارادت (اخلاقیات)

سوم۔ عمل ادراکیہ کا معلومات سے کیا تعلق ہے؟ یہ ایپسٹمالوجی یعنی عالم اور معلوم کے متعلق باہم گر کا مسئلہ ہے۔

چہارم۔ فلسفیانہ تحقیقات یا مابعد الطبیعیات۔ اسکے تحت میں تین وجودوں کی ماہیت کے متعلق مسائل آئے ہیں۔ (۱) دنیا۔ (۲) انسان۔ (۳) خدا۔

قصہ کوتاہ سائیکالوجی، منطق، حسنات، اخلاقیات، ایپسٹمالوجی، مابعد الطبیعیات، کاسمولوجی، فلسفہ ذہن، اور الٰہیات کے مسائل فلسفہ کے دائرہ عمل میں آتے ہیں۔ ان کی جداگانہ صورتوں کو ہوا دینے اور اتحاد و انضباط کے شکنجے میں کس دینے والا یہی فلسفہ ہے۔

فلسفہ کی ابتدا کی بابت افلاطون اور ارسطو کا یہ خیال ہے کہ تعجب یا حیرت سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔ جب کوئی امر پیش آتا ہے جبتک اس کی توجیہ نہو جائے ذہن پریشان رہتا ہے اور ان اسباب اور اصولیات کی تفتیش کرنے میں مصروف رہتا ہے جو ایک واقعہ کے محرک اور موجب ہوتے ہیں۔ غور و فکر اور تحقیقات حکمت کی ہستی کے بڑے رکن ہیں۔ اور انسان کی قوت مدرکہ اور طاقت متفکرہ پر اس کا دارومدار ہے۔ منطقیانہ قاعدہ سے استدلال کرنا جس میں طریقہ استقرا اور استخراج دونوں شامل ہیں فلسفہ کا دستور العمل ہے جس سے وہ نہایت مشکل مسائل کی بحث کر کے معقول حل بہم پہنچاتا ہے۔

سردست اس مقام پر اسی بحث سے رخصت لی جاتی ہے۔ بشرط فرصت آئندہ فلسفہ کے عظیم مسائل پر بحث ہوگی۔ اس مضمون کا مقصد شائقین کو پیچیدہ بحثوں کے لیے تیار کرنا ہے اسی وجہ سے قدرے تفصیل سے کام لیا گیا۔ کہ آئندہ کے لیے راستہ صاف ہو جائے۔

جے۔ آر۔ راے

العصر (۱)

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو — کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معما را

عصر، زمانہ، دور، دوران، گردون، دہر، وقت، روزگار، وغیرہ ایک ہی قسم کے الفاظ ہین اور عموماً ایک ہی معنی مین استعمال ہوتے ہین عصر یا زمانہ کی بابت مختلف رنگ مین بحث کی جاتی ہے۔ مذہب اور دین بھی اس بحث مین حصہ لیتا ہے اور فلسفہ بھی اس کو چھیڑتا ہے ریاضی بھی اس سے ایک حد تک مانوس ہے۔ ان تمام بحثون مین اگر بعض امور مین اتفاق ہے تو بعض مین اختلاف بھی ہے۔ لبعض وقت بحث کی نوبت یہان تک پہنچ جاتی ہین کہ

(الف) ایک فریق اس کا اعتراف کرتا ہے

(ب) اور دوسرا اختلاف۔

شروع ہی مین یہ بحث کی جاتی ہے کہ زمانہ کا وجود خارج مین پایا جاتا ہو یا نہین؟ اور یہ کہ زمانہ درحقیقت ہے کیا؟

جو لوگ زمانہ کی ہستی کے منکر ہین وہ یہ کہتے ہین (۱) کہ اگر زمانہ موجود ہے تو تین حال سے خالی نہین

(الف) ماضی

(ب) حال

(ج) مستقبل

(۲) ظاہر ہے کہ ماضی اور مستقبل موجود نہین۔ اس حالت مین لامحالہ زمانۂ حال موجود ہونا چاہئے۔ اگر زمانہ حال بھی موجود نہین تو پھر سرے سے زمانہ کا وجود ہی کالعدم ہوگا کیونکہ ماضی اس کا نام ہے جو گزر چکا ہو اور مستقبل وہ ہے جو آئندہ آنے والا ہے۔

اگر حال کی ہستی ہی نہین ہے تو پھر زمانہ کی ہستی بھی نہین ہے اور دوسری طرف ہم زمانہ کو موجود مان چکے ہین۔

(۳) لامحالہ زمانہ حال موجود ہوگا اور یہ محال ہے کیونکہ اگر موجود ہے تو منقسم ہوگا یا غیر منقسم۔ پہلی صورت باطل ہے کیونکہ عند الانقسام وہ قار[1] ہوگا یا غیر قار اور یہ امر بالبداہت ثابت ہے کہ قار نہین ہے۔ اگر غیر قار ہے تو موجود یعنی زمانہ حال کے بعض اجزا گزر چکے ہون گے۔ اس صورت مین وہ حاضر یا موجود نہین رہے گا۔

(۴) اگر منقسم نہین ہے تو جزو ثانی کی بابت بحث باقی رہے گی اس صورت مین زمانہ کی ترکیب آنات[2] متتالیہ سے ہوگی۔

آنات حرکت پر مترتب ہین اور حرکت مسافت پر۔ اس صورت مین جسم کا ترکب اجزاے غیر متجزیہ سے لازم آئے گا اور وہ باطل ہے۔ ثابت ہوا کہ زمانہ کا موجود فی الخارج ہونا باطل ہے۔

جب یہ بحث کی جاتی ہے کہ زمانہ ہے کیا تو کوئی کہتا ہے کہ وہ فلک اعظم ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اسکی حرکت کا نام ہے۔ کوئی اس امر کا قائل ہے کہ اس سے مراد نفس حرکت ہے۔ کسی کا خیال ہے کہ جوہر مجرد واجب لذاتیہ ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ زمانہ کم متصل غیر قار مقدار الحرکت کا نام ہے۔

---

[1] قار سے مراد قرار گیرندہ ہے یعنی بصورت تقسیم کے ایک وجود کی نسبت یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ بہ حد ذاتیہ مستقر ہے۔

[2] آنات سے مراد اوقات اور متتالیہ سے مراد متواتر یا پے در پے رونما ہوکے ہین۔

یہ اصطلاحی اور موجز الفاظ ہین۔ علمی مباحث مین ایسے الفاظ لا نا لابدی ہے کیونکہ اصطلاحات اور بحث علمی مین ایجازی تراکیب سے کام لینا ہی ایک صنعت ہے۔

اس تعریف کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ ہم دو ایسی حرکتین فرض کرتے ہین جو سرعت اور لطومہ مین مختلف ہین اور ایک ہی ساتھ شروع ہوتی ہین اور ایک ہی ساتھ ختم بھی ہو جاتی ہین۔ یا یہ کہ شروع کے ساتھ ہی خاتمہ بھی ہو جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ حرکت سریعہ نے بمقابلہ حرکت بطی کے زیادہ مسافت طے کی ہوگی اور اس صورت مین لامحالہ دونون حرکتون کی ابتدا اور انتہا کے درمیان کوئی ایسی چیز ہوگی جس سے دونون حرکتون کا اندازہ ہو سکے اور وہ دونون مین برابر ہوگی۔ ان حالات مین وہ چیز نفس مساوات تو نہین ہے کیونکہ دونون مختلف ہین اور نہ دونون متحرک کیونکہ یہی آپس مین مختلف ہین۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ ما بہ الاشتراک ما بہ الاختلاف کے علاوہ کوئی چیز ہے کہ علاوہ متحرک حرکت مسافت کے ایک دوسری چیز ہے اور اس کا نام زمانہ ہے یا اُسے دوسرے الفاظ مین زمانہ کہتے ہین۔

ان دونون اہم سوالات یا دونون بحثون کی بابت جن دلائل اور جن براہین کا ذخیرہ مہیا کیا گیا ہے وہ ظاہر ہین۔ اگرچہ الفاظ کے مفاہیم کے اغلاق کی وجہ سے بہت ہی دقیع ثابت ہو لیکن اس کا بہت سا حصہ محض الفاظ کی بھرتی ہی ہوگی جو موصل علی المقصود بہت مشکل سے ہو سکتے ہین اور علمی رنگ مین باعتبار فلسفی عظمت کے اُن سے ایسا فائدہ متصور نہین جسکا خصوصیت کے ساتھ اعتراف کیا جا سکے۔

اس قسم کی مغلق اور پیچیدہ بحثین اُس حالت مین پیدا ہوئی یا پیدا ہوتی ہین کہ دہر یا زمانہ یا گردون کی تعریف ایسے الفاظ مین کی جاتی ہے جو بجائے خود مشکل ہین ڈالنے والے ہین۔ فلسفۂ عامہ جو کامن سنس اور طبعی اجتہادات کے ماتحت ہے ایسی بحثون سے گریز کرتا ہے۔ اس مین وہ راہین تلاش کی جاتی ہین

علمی رنگ مین مفید ہون۔

طبعی اجتہاد کے ماتحت ہون۔

زیادہ تر طبعی استدلال کا پہلو رکھتی ہون۔

طبعی اجتہاد یا طبعی استدلال ہمیشہ دقتون اور مشکلات سے ایک بڑی حد تک محفوظ ہوتا ہے اور اُس مین اُس سیر کی جھلک اور اُس سہولت کی لچک پائی جاتی ہے جو قانون وہبی کے ماتحت ہوتی ہے یا اُسکا ظر... بہت سے فلسفی مسائل دراصل مغلق اور پیچیدہ نہین ہین لیکن انھین دیدہ دانستہ پیچیدہ اور مغلق بنایا گیا ہے۔

العصر یا زمانہ کی بحث جو اسقدر پیچیدہ ہو گئی ہے اور دہر کے جھگڑے جو اس قدر مغلق ہوتے جاتے ہین اُس کی یہ وجہ نہین کہ دراصل زمانہ یا العصر یا دہر بجائے خود بھی ان دقتون کا موجب ہو رہا ہے بلکہ یہ کہ ہم خود ہی یہ مشکلات پیدا کر رہے ہین۔ حکیم سنیکا نے سچ کہا ہے کہ فلسفہ محض الفاظ ہی مین محدود نہین رہ سکتا۔ اس کے اور پہلو بھی قابل بحث ہین۔ اگر سادہ طور پر زمانہ یا روزگار کی تعریف یا بحث کی جائے تو سننے والون کے دلون مین وہ الجھنین نہین پیدا ہو سکتین جو اس وقت مغلق بحثون سے پیدا ہوتی ہین۔ ہر شخص اپنے اپنے رنگ مین زمانہ اور وقت کی بابت غور اور خوض کر رہا ہے۔ اگر کسی سے سادہ طور پر پوچھا جائے کہ تم زمانہ سے کیا مراد لیتے ہو تو یقیناً اس کا جواب اگر اوروں کے لئے تسکین طمانیت بخش نہین ہوگا تو خود اُس کے واسطے تو ایک حد تک تسلی بخش ہوگا۔ نہ تو اُس سادہ جواب مین تکرار اور غیر قار کی بحث ہوگی اور نہ آنات اور متتالیہ کی بھرمار۔ سیدھے سادھے الفاظ مین وہ سب کہدیا جائیگا۔

کچھ شک نہین کہ علمی بحثین عام اطلاقات سے جدا اور نرالی ہو... ہین لیکن نہ اسقدر کہ اُن سے حقیقت ہی گم ہو جائے۔ ہم اپنی زندگی... شات حالتین یا سات کیفیتین پاتے ہین :-

(الف) اپنی ذات یا اپنی حالت۔

(ب) دوسرون کی ذات یا دوسرون کی حالت۔

(ج) اپنا احساس۔

(ہ) دو مردن کا احساس۔

(ر) وہ حالت یا وہ سمان جس مین یہ سب حالتین یا کیفیتین منقسم ہوتی یا پائی جاتی ہین۔

(و) وہ حالت یا وہ کیفیت جو ان سب سے الگ ہے۔

(ز) وہ حالت یا وہ کیفیت جو ان سب پر حاوی ہے۔

یہ سات کیفیتین یا سات حالتین کل موجودات پر محیط ہین یا سب موجودات ان کے تحت مین ہے۔ زندگی، وجود، عدم، وقت، روزگار، عصر، دہر وغیرہ ان ہی سات حالتون یا سات کیفیتون مین متدائر ہین۔ چاہے ان مین سے کوئی حالت یا کوئی کیفیت ہمارے احاطہ ادراک اور دائرۂ احساس سے باہر ہو اور چاہے اندر، چاہے ہماری وہان تک رسائی ہو یا نہ ہو، ہم اُس سے آشنا ہون یا نہون ان کی ہستی اور اُن کے وجود سے ہم کسی صورت مین انکار نہین کرسکتے اور نہ ہمارا انکار اُنکی ہستی کے مقابلہ مین کوئی قیمت یا کوئی وقعت اور صداقت رکھتا ہے۔

ہم اور دیگر موجودات جس کو ہم نباتات، جمادات، اور حیوانات سے تعبیر کرتے ہین وہ ایک ایسے۔۔مین رہتی ہے جسے ہم رات اور دن سے تعبیر کرتے ہین یا ایک ایسے فرضی خلا یا واقعی خلا سے جو کل موجودات کے واسطے بمنزلہ ایک عالیشان شامیانہ کے ہے عامیانہ یا عرفی اصطلاح یا الفاظ مین اس شامیانہ کا دوسرا نام زمین و آسمان یا وہ موجودات اور کیفیات ہین جو اس شامیانہ کے اندر یا باہر تحت فوق پائی جاتی ہین، اس عالیشان شامیانہ کا تحت اور فوق کیسی ہی گہرائی اور بلندی رکھتا ہو لیکن ہم اس کے اندر یا انکے فرضی اور واقعی خلا مین رہتے اور زندگی کے دن پورے کرتے ہین اگر ہم چاہین کہ اس خوشنما آرام دہ شامیانہ سے نکل کر کہین اور بسیرا کرین تو زندگی کی قید مین یہ ناممکن ہے۔ جہان جائین گے وہین نیلیانہ ہمارے سر پر ہوگا۔ اور پاؤن کے نیچے وہی نہ بدلنے والا فرش جسے ہم زمین سے تعبیر کرتے ہین۔

باوجودیکہ ہم اس شامیانہ مین رہتے اور زندگی کے دن پورے کرتے ہین پھر بھی اُسے جدا اور اپنے تئین جُدا سمجھتے ہین اور یہ خیال کرتے ہین کہ اسکی ہستی اور ہماری ہستی مین ایسا ہی فرق ہے جیسے زمین اور آسمان مین ہے۔ اور اُس مین اور ہم مین کوئی نسبت نہین جب ہم اس دار القرار یا دار الاقامت کی اپنے روزمرّہ الفاظ مین تعبیر کرتے ہین تو یون کہتے ہین:۔

جس زمانہ مین ہم رہتے ہین۔

جس بحر عصر مین ہماری زندگی کی ناؤ چل رہی ہے

جو زمانہ ہمارا ہمعصر ہے۔

جو زمانہ ہم نے پایا ہے۔

جو زمانہ ہم نے دیکھا ہے۔

جو وقت ہمارے حصہ مین آیا ہے۔

جس دہر مین ہم وجود پذیر ہوئے ہین۔

ایسے تمام اطلاقات سے یہ سمجھا جاتا یا سمجھا جاسکتا ہے کہ عصر، زمانہ، دہر، روزگار، گردون، وقت، دور و دوران، ہمارے خیال یا باعتبارات ہماری تعبیرات کے ایک جداگانہ منزل یا مکان کی حیثیت اور کیفیت رکھتا ہے اور ایک ایسی حالت اور ایسی کیفیت جو ہمارے لئے بمنزلہ ایک منزل، مکان، دائرہ اور احاطہ کے ہے، ایسا دائرہ، ایسا احاطہ، ایسی منزل، جو ہماری آسائش، سہولت طمانیت، اور بہبود کی ضامن اور ہماری تکلیف رنج و درد کی ہی موجب ہے یا یہ کہ اس مین رہ کر ہمین ہر ایک قسم کی خوشی اور تکلیف سے آشنا ہونا پڑتا ہے جس مین کچھ احساس کچھ ادراک اور بعض جذبات بھی پائے جاتے ہین، ان ہی خیالات کا اثر ہے کہ ہم کبھی کبھی یہ بھی

کرتے رہتے ہیں ۔

زمانہ بھی ایک طاقت ہے ۔

زمانہ بھی ایک زبردست کشش رکھتا ہے ۔

زمانہ گردش کرتا ہے ۔

زمانہ کی گردش سے خدا کی پناہ ! ۔

زمانہ کسی کا دوست نہیں ۔

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز ۔

زمانہ کی مخالفت اور موافقت کا کوئی امتیاز نہیں ۔

زمانہ کا کیا بھروسہ ۔

زمانہ کی زد کے آگے کون ٹھہر سکتا ہے ۔

زمانہ بدل گیا ۔

اس قسم کے تمام جملوں اور اطلاقات سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ زمانہ ایک قسم کی زندگی رکھتا ہے ۔ زمانہ صاحب ارادہ ہے ۔ زمانہ تصرف کرتا ہے ۔ زمانہ کی زندگی ایک زبردست زندگی ہے ۔ زمانہ کو فنا بھی ہے زمانہ بدلتا بھی ہے ۔ زمانہ بدلا بھی لیتا ہے ۔ اندریں حالات ثابت ہو کہ زمانہ ایک زندہ طاقت اور زبردست متصرف ہے اور اس میں بھی ویسے ہی احساسات اور تصرفات ہیں جیسے اور زندہ مخلوق اور صاحب ارادہ ہستیوں میں ہوتے ہیں ۔

ان تاویلات کے اعتبارت زمانہ گویا ایک ایسی جامع طاقت ہے جو کل دیگر موجودات پر ایک ترتیب اور ایک ضابطہ کے ساتھ حکومت کر رہی ہے اور کوئی موجودات سوائے اس اعلےٰ ذات کے جو زمانہ کی بڑی طاقت یا مجموعیت پر حاوی ہے اس کی زد اور اس کے ضابطے سے باہر اور آزاد نہیں ۔

اب اصلی سوال یہ ہوگا کہ "زمانہ کیا ہے ؟ زمانہ کا وجود خارج میں پایا جاتا ہے یا نہیں ؟"

پہلے سوال کا جواب سادہ الفاظ میں یہ ہے کہ جس احاطہ یا جس شامیانہ میں ہم رہتے ہیں یا جس میں کل موجودات اپنے اپنے رنگ میں بود و باش رکھتی ہیں جسے عام الفاظ میں ہم دنیا، ایام زندگی، رات دن، وقت، اور دہر یا روزگار کہتے ہیں، یا دور اور دوران سے تعبیر کرتے ہیں وہ زمانہ ہے یا زمانہ کا مفہوم رکھتا ہے صبح سے لیکر شام تک اور شام سے تا صبح جو کیفیت ہمارے ارد گرد یا ہمارے تحت و فوق پر محتوی رہتی ہے اور جس کا ہم مختلف رنگوں اور مختلف کیفیات میں احساس اور ادراک کرتے ہیں وہ زمانہ ہے ۔

جو طاقت ہماری زندگیوں کے واسطے ایک آنے والی یا گزرنے والی کیفیت یا موثر اور متصرف طاقت کی صورت میں عمل کر رہی ہے، وہ ایک عصر، دہر اور زمانہ ہے ۔ آفتاب، ماہتاب، سیارے اور ستارے اور دیگر اجزاے سماوی اور کیفیات وحقائق ارضی زمانہ کے اجزا اور زمانہ کی مختلف طاقتیں اور کیفیتیں ہیں، ظلمت، روشنی برق، کشش، شعاع، تموج، ہر چہار یا زائد از ہر چہار عناصر وغیرہ زمانہ کی ایسی چیزیں ہیں جن کے بغیر زمانہ کا وجود ہی باقی نہیں رہتا یا نہیں رہ سکتا یا یوں کہا جائے کہ در اصل زمانہ ان ہی اجزا، ان ہی ارکان ان ہی موثرات، اور ان ہی متصرفات کا نام ہے اور یہی قانون قدرت اور سامان قدرت جس میں ہم خود بھی شامل ہیں زمانہ دہر اور عصر ہے ۔

علم ہیئت فن ریاضی علم جیالوجی وغیرہ زمانہ کی ایک صحیح تفسیر یا صحیح عکس اور صحیح نمونہ ہیں ۔ ان تمام علوم اور فنون کے پڑھنے اور جاننے سے آپ معلوم کر سکتے ہیں کہ اگرچہ اجزائے نفیسہ جو ان علوم اور ان فنون میں زیر بحث یا جزو اعظم نہ ہوں تو زمانہ کی کمیت کیفیت اور حقیقت میں بہت کچھ کمی ہو جائے گی ۔ فرض کرو کہ آفتاب نہو، یا ماہتاب نہو دیگر اجزا سماوی اور ارضی نہ ہوں، ہوا نہو ۔ پانی نہ ہو ۔ آگ ۔ نہ مٹی کا نہو

نظام شمسی نظام ارضی بالکل بند ہوجائے اور ان دونون کے موثرات اور تصرفات مین فرق آجائے یا یہ کہ اُن کا کوئی حصہ یا نشان ہی باقی نہ رہے تو اُس حالت مین ہم یا ہماری ہستی جو زمانہ شناس اور دہر پرست اور عصر بین ہے کہان ہوگی اور اسکی کیفیت کا کن الفاظ مین بیان ہوسکے گا اور جس شامیانہ مین اور جس فرش زمین پر ہم بود و باش رکھتے ہین جو ہمارا مسکن اور ہماری زندگیون کا محور ہے اور جس کا ہم مختلف رنگون مین احساس اور ادراک کرتے اور اُس سے کام لے رہے ہین اُسکی ہستی اور اس کے وجود کی کیا کیفیت ہوگی۔ کیا اِن حالات مین ہم یہ کہہ سکین گے کہ کوئی زمانہ، روزگار، دور، دوران، وقت عصر اور دہر بھی ہے، اور اس کا بھی کوئی وجود اور ہستی ہے اور ساتھ ہی اس کے ہم اپنی نسبت بھی یہ فیصلہ کرسکین گے کہ ہم بھی کوئی وجود کوئی شے، کوئی عادت کوئی ذات ہین؟

اس سے معلوم ہوا کہ عصر، زمانہ، روزگار، وقت، گردون، دہر، دور، دوران، اسی واسطے کہتے ہین کہ اس کے اجزائے کثیرہ مین ایک قسم کی گردش اور دَور ساری ہوتا ہے۔ سیارون مین بھی ایک قسم کی حرکت اور زمین بھی متحرک، تحت بھی حرکت، فوق بھی حرکت، یمین بھی حرکت، یسار بھی حرکت۔ شاعرون نے جو گردش کا رونا رویا اور اُسے کوسا ہے وہ کیون؟ صرف اس واسطے کہ اس کے اجزائے کثیرہ مین ایک قسم کی گردش اور تموج ہے۔ یہ جاڑا اور گرمی برودت اور حرارت کیون ہے؟ یہی کہا جائے گا کہ صرف ان ہی موثرات اور تصرفات عظیمہ کی وجہ سے اگر یہ موثرات اور تصرفات نہ ہون تو یہ کیفیات اور موسم وغیرہ بھی نہ ہون۔ بعض سائنس دانون کی رائے مین حرارت کا مخزن یا مصدر آفتاب ہے۔ سر ولیم ٹامسن صاحب نے ۱۸۶۲ء مین اسی تھیوری پر زور دیا تھا اور اکثر سائنس دانون نے یہ معلوم کرلیا ہے کہ مختلف ذرات اِدھر اُدھر حرکت کرتے رہتے ہین اور انکی حرکت مختلف پیمانہ اور مختلف رفتار کی ہوتی ہے اور وہ آپس مین ٹکراتے بھی رہتے ہین۔ مثلاً انکی رائے مین ہیڈروجن گیس کے ذرات ہماری ہوا کے معمولی دباؤ اور ٹیمپریچر مین فی سیکنڈ ۶۲۲۵ حرکت کرتے ہین اور ایک ذرہ اتنے ذرات سے ٹکراتا ہے کہ اُسے ایک سیکنڈ مین پلٹا کھانے سے ایک ارب ستر کروڑ میل فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ سر ولیم ٹامسن صاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر ہیڈروجن کے ذرون کو برابر ایک قطار مین رکھا جائے تو ایک انچہ کے فاصلہ مین ۵ کروڑ ذرات سما جائین گے۔

سائنس کے ان تمام زندہ تجربات سے ظاہر ہے کہ کل کائنات اور موجودات کے سوائے جو ان اجزائے زمانہ سے جدا ہین یہ اجزائے کثیرہ ایک خاص موجودات کے رنگ مین اُن تمام واقعات کیفیات وقت دہر اور دور وعصر کا باعث یا محرک ہین جو ہمارے ارد گرد پایا جاتا ہے اور اگرچہ ہم بھی اس مین شامل یا اُسکا جزو ہین اور اس سے ہماری ہستی بھی وابستہ ہے اور اس کے موثرات اور تصرفات و ضابطہ کے ماتحت ہین اور اُس وقت تک ہم اس ضابطہ سے الگ اور آزاد نہین ہوسکتے جب تک کہ ہم اس دنیا مین ہین لیکن بر این ہمہ بہیئت مجموعی اُسکی گرفت و تصرف ہم سے کہین اعلےٰ ہو۔ اسکی رفتار ہماری رفتار سے کہین ارفع واقعہ ہوئی ہے۔ ہم سوائے اس کے اسکی نسبت کچھ نہین جان سکتے ہین کہ وہ لگاتار گردشون تصرفات موثرات اور تغیرات کا ایک مجموعہ کبیر ہے اور اس کی گردشون اور تغیرات کی وجہ ہی سے اُسے دور، دوران، العصر، دہر اور زمانہ کہا جاتا ہے اور اسکی صحیح تعریف یہی ہے کہ وہ ایک مجموعۂ ادوار اور سلسلہ تغیرات ہے اور اس مجموعۂ کبیر مین ہم خود بھی شامل ہین اور شامل ہی نہین بلکہ اس کا ایک جزو اعظم اور ناطق عنصر مدرک حصہ اور بصر نوع تھیں ان اعتبارات سے وہ تمام سلسلہ اور انواع جو ان مختلف قسم کی

گردشوں تصرفات، موثرات، محرکات اور تغیرات کا موجب ہیں، دہر عصر یا زمانہ ہے۔ یا یہ کہ ان تمام تصرفات سے جو کچھ کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ العصر اور زمانہ ہے جس کا ہم بھی ایک جزو ہیں۔

اب ہمیں سوچنا چاہئے کہ ان تصرفات گردشوں ادوار تغیرات و موثرات سے عملی رنگ میں نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ اور کون سی خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے؟ رات دن ظلمت اور روشنی کا جھگڑا چھوڑ کر صحیح نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان سب تصرفات ادوار گردشوں و تغیرات صغیرہ و کبیرہ کی وجہ سے وقتاً فوقتاً وقت کے لباس اور روپ میں مختلف صورتیں اور کیفیات پیدا ہو ہو کر ہمارے احساس اور ادراک میں آتی ہیں۔ ہماری زندگی کا ہر سانحہ اور ہر واقعہ کسی نہ کسی وقت سے وابستہ اور منضم ہے۔ وہ کبھی رات کے لباس میں ظلمت افزا ہوتا ہے اور کبھی دن کے روپ میں جلوہ کناں۔ اگرچہ بظاہر وہ ہم سے الگ ہے اور بہت دور فاصلہ پر نظر آتا ہے لیکن در اصل ہم اس میں ہیں اور وہ ہم میں ہے۔ گو ہم ایک دوسرے سے جدا جدا ہیں لیکن در اصل ایک ہی تنہ کی سرسبز شاخیں ہیں۔ نام جدا جدا ہیں اور ہیں ایک ہی روپ۔ ہمارا ظہور بھی اس کا ظہور ہے اور اسکا ظہور ہمارا۔

عاشق و رندم و میخوارہ بآواز بلند این ہمہ منصب از آن شوخ پری وش دارم

دنیا تعبیرات کا مخزن ہے۔ اعتبارات پر بہت کچھ مدار ہے۔ ایک طرف ہم ایک مجموعہ ہیں اور دوسری طرف انواع اور اجزا۔ ہم ایک بھی ہیں اور لاکھوں کروڑوں بھی۔ کثرت وحدت کا ثبوت دیتی ہے اور وحدت کثرت کا۔ ہم ہی مجموعہ ہیں اور ہم ہی فرد۔ مجموعہ فرد کا شاہد ہے اور فرد مجموعہ کا۔ دونوں میں ایک نسبت ہے اور یہ نسبت وحدت کاملہ سے نسبت رکھتی ہے ؎

ہمہ کس طالب یار اند چہ ہشیار و چہ مست
ہمہ جا خانۂ عشق است چہ مسجد چہ کنشت

دہر، زمانہ، العصر، دور، دوران، روزگار، گردوں، ہوئے حساب رات اور دن کے لباس میں سفر کرتا ہے اور رات اور دن کو ہم وقت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اگرچہ مختلف دنیا کے حصوں میں رات دن یا وقت میں گونہ امتیاز اور فرق بھی ہوتا ہے اور ایک حد تک موسمی کمی و بیشی ہے لیکن پھر بھی یہ کہا جائے گا کہ جو وقت دنیا کے مختلف حصوں میں سے گزرتا اور متصرف ہوتا ہے وہ ہمیشہ ایک طرف سے آتا اور دوسری طرف سے نکل جاتا ہے۔ اگرچہ قدرتاً اسکا پیمانہ کچھ ہی ہو لیکن خود ہم نے جو اس کا پیمانہ امتیازی مقرر کر رکھا ہے وہ ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیتا ہے کہ اسقدر وقت یا زمانہ گزر گیا اور اسقدر باقی ہے۔ اگرچہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وقت یا جو زمانہ آگے آنے والا ہے وہ کیسا ہوگا؟ اور اسکی رفتار کی افتاد کیا ہوگی؟ لیکن یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر کوئی زمانہ یا وقت آنے والا ہے تو اسکی ہستی ضرور ہوگی کیونکہ ہر ایک حصہ وقت یا جزو زمان کی کچھ ہستی اور مقدار ہوتی ہے چونکہ ہم بھی زمانہ یا دہر اور وقت کا ایک جزو اعظم ہیں اسواسطے ہم خود ہی اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ

ہماری کوئی یا کچھ ہستی ہے یا نہیں؟۔
ہم کوئی یا کچھ ہستی رکھتے ہیں یا نہیں؟۔

اگر ہم اپنی ہستی کا ایک حد تک احساس اور ادراک کرتے اور کر سکتے ہیں تو یہ ثابت ہے کہ دوسرے اجزا کا بھی احساس اور ادراک کیا جا سکتا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ ہر ہستی اپنے اپنے رنگ میں علی قدر مراتب اپنا احساس کرتی ہے اور ہر ہستی ایک قسم کی زندگی رکھتی ہے۔ یہ جدا بات ہے کہ اس کے احساسی طریقہ کا ہمیں علم ہو یا نہ ہو۔ وہ ہماری حدود علم اور ادراک کے اندر ہو یا باہر۔

اور یہ بھی ہم نہیں کہہ سکتے کہ موجودات کے دوسرے اجزائے صغیرہ و کبیرہ باستثنائے چند ہمارا احساس کرتے ہیں یا نہیں۔ اور اگر

کرتے ہین تو کس طرح؟ اور کس مقدار سے؟ اگرچہ وہ بھی ہماری طرح ہی اجزائے مجموعۂ کبیر ہین اور اس دور یا زمانہ مین اُن کی ہستیان بھی پائی جاتی ہین مگر جس طرح ہم ایک حد تک ہی چل سکتے ہین اسی طرح ان کی رفتار بھی ہو گی۔

اگر ہم کماحقہ ادراک کی کوشش بھی کرین تو اُس مین گو کہ ایک بڑی حد تک ہمین کامیابی بھی ہوتی ہے مگر جب ہم ایک بڑی کامیابی کے حدود مین بھی نیچے جاتے ہین تو ہمین افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہو کہ ہماری دوڑ ہمین بہت دور فاصلہ پر بھی لے جانے کے باوجود ناکافی ثابت ہوتی ہے اور ہنوز روز اوّل ہی نظر آتا ہے ؂۔

نشانِ یار سفر کردہ از کہ پرسم باز
کہ ہرچہ گفت برید صبا پریشان گفت

سُلطان احمد

العصر (۲)

(سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو العصر جلد ۲ نمبر ۲)

یہ سوال بھی قابل بحث ہے کہ

(الف) وقت یا عصر زمانہ اور عہد اپنا احساس خود کراتا ہی

(ب) یا ہم اُسکا احساس کرتے ہین۔

چونکہ ہم بھی جزو دہر یا حصۂ زمانہ ہین اس واسطے دہر یا زمانہ بھی ہمین اپنا احساس کراتا ہی اور ہم خود بھی محسوس کرتے ہین۔ دہر وقت اور زمانہ یا العصر کے موجبات اگر ادوار اور گردشین نہون تو وقت پیدا ہی نہو (وہ کیفیت جسے ہم اپنی اصطلاح مین وقت سے تعبیر کرتے ہین) اگر وقت نہ ہو تو ہم احساس کیا کرسکتے ہین کیونکہ احساس کے واسطے ضروری ہی کہ ایک وجود ہو خواہ وہ وجود کوئی سی بھی نوعیت رکھتا ہو اور اگر خود ہماری ذات مین بھی ایسے احساس کا مادہ نہو تو پھر بھی احساس وجود پذیر نہو۔ نتیجہ یہ نکلا کہ زمانہ فی الخارج موجود ہے۔ اور ہم اُس کا احساس کرتے ہین اور وہ بھی اپنا احساس خود کراتا ہی اور ہم ایک بصیرت کے ساتھ اس واسطے اُس کا احساس کرتے ہین کہ ہم بھی اس مین شامل ہین یا اُس کا ایک جزو ہین یا یہ کہ ہم خود بھی دہر یا زمانہ ہین۔

زمانہ کو اپنے اجزاے مدورہ کی وجہ سے ایک مستقر بھی حاصل ہے جس مین ہمارا مستقر بھی شامل ہی۔ زمانہ کے ہر قسم کے اجزا کا کوئی نہ کوئی مستقر ہوتا ہی اور پھر اُن سب قسم کے مستقرون کا ایک مجموعی مستقر بھی ہوتا ہی جسے مختلف اعتبارات مین دہر العصر اور زمانہ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہی۔ باوجود اس مستقر مجموعی اور نوعی ہونے کے زمانہ متغیر بھی ہی اور ان تغیرات سے اُس کے ماتحتی یا صغیرہ اجزا جنھین کائنات اور موجودات کے نام سے تعبیر کرتے ہین بہ تسلسل متاثر ہوتے رہتے ہین اور ان ہی ماتحتی اجزاے صغیرہ مین ایک گروہ ناطقیہ موسوم بہ انسان اور دوسرا گروہ زندہ موسوم بہ دیگر حیوانات اور تیسرا گروہ جامدیہ موسوم بہ نباتات۔ جمادات وغیرہ بھی داخل ہی اور یہی مجموعہ زمانہ یا دہر ہی گروہ جامدیہ بھی ایک قسم کی زندگی رکھتا ہی جو ہماری زندگیون سے کچھ اور کیفیت رکھتی ہے اور اس سلسلہ کو بھی ان تمام اجزاے صغیرہ یا موجودات

ہر سہ قسم مجموعی یا نوعی کے تغیرات کا احساس اور علم ہوتا رہتا ہی یا یہ کہ ایسے موجودات اُن سے متاثر ہوتے رہتے ہین۔ اُس وقت تک جب تک وہ اس چکر یا اس چکر مین موجود ہی۔ جب وہ اس حیز عظیم مین سے نکل جائے گی تو اُس کے واسطے موجودہ صورت مین زمانہ کا وجود یا زمانہ کا حیز باقی نہین رہے گا۔ اگرچہ کسی اور رنگ مین باقی رہے۔ مثلاً اگر نباتات کی موجودات طبقہ دنیا سے بالکل اُٹھ جائے تو یہ کہا جائیگا کہ اُس کے مقابلہ مین دہر کا وجود باقی نہین رہا یا ایسی موجودات زمانہ مین باقی نہین رہی۔ اسی طرح یہ بھی کہا جائیگا کہ اگر زمانہ کے اجزائے گردشیہ باقی نہ رہین تو خود زمانہ بھی باقی نہ رہے گا۔ یہ جدا بات ہی کہ اس فنا کے بعد کوئی اور صورت یا کسی اور قسم کا زمانہ وجود پذیر ہو کر عامل ہو۔

جب تک کہ زمانہ کی مجموعی حرکت یا دور دوُرنہ ہو تب تک زمانہ کی ہستی اور وجود تسلیم کیا جائے گا۔ البتہ جب اُس کا کوئی جزو بھی باقی نہ رہے اُس وقت یہ کہا جائے گا کہ زمانہ باقی نہین رہا۔ جو لوگ وجود زمانہ سے منکر ہین یا یہ کہتے ہین کہ اس کا وجود فی الخارج نہین ہے وہ یہ سوچین کہ دراصل زمانہ ہم سے یا اس کائنات اور موجودات سے کوئی جدا شے نہین ہی۔ ہم ہی زمانہ ہین اور دیگر موجودات بھی زمانہ ہی۔ نوعی رنگ مین ہمارا نام کچھ اور ہے اور مجموعی رنگ مین ہمین زمانہ یا دہر سے تعبیر کیا جاتا ہی یا یہ کہ موجودات کی مجموعی اور نوعی گردشون اور تفرقات کا نام دہر یا زمانہ ہے۔

جب یہ کہا جاتا ہی کہ زمانہ بدل گیا تو اُسکا مفہوم یہ ہوتا ہی کہ ہم خود بدل گئے اور اسی طرح دیگر موجودات بھی بدل گئی۔ جس طرح زمین کی حرکت کا ہم سوائے علمی استدلال کے احساس نہین کر سکتے اسی طرح ہمین زمانہ کی مجموعی گردشون اور حرکات کا علم نہین ہوتا۔ ہان نوعی رنگ مین ایک حد تک ہم ایسی گردشون اور ادوار کا احساس کرتے یا کر سکتے ہین۔

ہم وقت اور دور کے قائل ہین اور اپنے رنگ مین ایک بڑی حد تک اُسکا اعتراف بھی کرتے اور اُسپر بہت کچھ انحصار بھی رکھتے ہین اور اپنی ضروریات کے اعتبار سے اُس کی تقسیم بھی کر رکھی ہی۔ ہمارے خیال اور ہمارے عمل کے مطابق وقت یا دور کے تین حصے ہو سکتے ہین:

(الف) ماضی جو گذر جائے۔

(ب) حال جو موجود ہے۔

(ج) مستقبل جو آگے آتا ہے۔

دن چڑھتا اور رات پڑتی ہی۔ جو عرصہ گذرتا جاتا یا گذر چکا ہے وہ ماضی ہی۔ جو گذر رہا ہی وہ حال ہی۔ جو حصہ حال کا گذرتا جاتا ہی وہ ساتھ کے ساتھ ہی ماضی کا روپ اختیار کرتا جاتا ہی۔ جو زمانہ ابھی آیا نہین وہ مستقبل ہی۔ ان حالات مین یہ کہا جائیگا کہ زمانہ کا صرف وہی حصہ باقی یا موجود ہوتا ہی جسے حال سے تعبیر کرتے ہین۔ جو گذر جاتا ہی وہ بھی معدوم ہو جاتا ہی اور جو آنے والا ہی وہ بھی موجود نہین ہوتا۔ اور حال کی حالت اور قیام بھی ایک صورت مین خیال ہی خیال ہی کیونکہ جون ہی کوئی جزو اُس کا گذرتا ہی وہ ماضی ہوتا جاتا ہی۔ گزرنے والے حصہ اور موجودہ حصہ مین تمیز کرنا بہت ہی مشکل ہی۔ یہ گتھی یون سُلجھائی جا سکتی ہی کہ وقت اور دور اُن اجزائے گردشیہ کا ایک نتیجہ ہی جو قانون قدرت کے ماتحت ایک ضابطہ سے عمل پذیر ہین اور ان ہی اجزائے گردشیہ اور عناصر مذورہ کا نام دوسرے الفاظ مین زمانہ اور العصر ہے۔ جب تک وہ اجزائے گردشیہ موجود ہین جب تک اُن کی نفی نہین ہوتی تب تک زمانہ موجود رہتا ہی۔ جو وقت ادوار کے ماتحت گذر گیا اور جو وقت گزر رہا ہی وہ اپنی باری کا کام کر چکا یا کر رہا ہی لیکن وہ طاقت باقی ہی جس سے وہ پیدا ہوا تھا۔ جو وقت

یا جو دور ابھی آنے والا ہے اُس کے موجبات اور سامان بھی موجود ہیں۔ پس ہر ایک حالت میں زمانہ موجود رہتا ہے تاوقتیکہ اُنکی ساری طاقت اور سارے عناصر خرچ نہ ہولیں۔

جو جزو برق اور جو روشنی اپنے مستقر سے خارج ہوتی ہے وہ اگرچہ اپنے مستقر سے جدا ہو کر خارج ہو جاتی ہے لیکن اُس کا مخزن اور مستقر باقی اور قائم رہتا ہے۔ جو روشنی اور جو شعاعیں لیمپ سے نکلتی ہیں وہ اگرچہ ادھر اُدھر پھیلتی اور منتشر ہو جاتی ہیں لیکن جب تک کہ گیس برق اور تیل باقی ہے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مولد روشنی نہیں ہے یا روشنی نہیں ہو سکتی۔ یہی کیفیت زمانہ کی بھی ہے۔ زمانہ کے اجزائے گردشیہ اور افراد دوریہ جب تک باقی ہیں تب تک زمانہ باقی ہے اور کہا جائے گا کہ مختلف رنگوں میں اُس کی ہستی موجود ہے اور اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جن اجزاے کثیرہ اور عناصر بدورہ سے زمانہ مرکب ہے وہ اُس عرصہ تک باقی رہیں گے جس کا ہمیں علم نہیں دیا گیا۔ یہ خدشہ کہ بصورت زمانہ کے موجود ماننے سے اُس کا منقسم ہونا لازم آتا ہے اور اُس کا منقسم ہونا اُس کے تکرار ہونے کا مستلزم ہے اور یہ باطل ہے بالکل درست و صحیح نہیں۔ یہ خدشہ اُس صورت میں عائد ہو سکتا ہے جب ہم زمانہ کا وجود بغیر اجزائے گردشیہ کے تسلیم کریں ہم تو یہ کہتے ہیں کہ سوائے ان ہر ایک قسم کے اجزائے گردشیہ کے زمانہ اور کوئی شے نہیں ہے۔ کیونکہ یہ تمام اجزائے گردشیہ پہلے ہی سے تقسیم شدہ ہیں اور اُن کی مختلف کیفیتیں ایک مجموعہ میں شامل ہو کر ایک جداگانہ ستر رکھتی ہیں۔ ان حالات میں اس امر کے ماننے سے کوئی استحالہ لازم نہیں آتا کہ زمانہ اپنے ہی مجموعہ کے اندر نوعیتوں کے اعتبارات سے تقسیم شدہ بھی ہے۔

یہ خدشہ کہ زمانہ کی ترکیب آنات متتالیہ سے ماننی پڑے گی درست نہیں کیونکہ جب ہم زمانہ کی تعریف اُن الفاظ میں نہیں کرتے جو ان تمام خدشات کا موجب ہو سکتے ہیں تو پھر ایسے خدشات کس طرح عائد ہو سکتے ہیں۔ یہ کہنا کہ اس صورت میں حرکت اور مسافت کا سوال عائد ہوتا ہے بجائے خود باطل ہے کیونکہ ہم نے اجزاے زمانہ کی خصوصیت ہی حرکت قرار دی ہے اور ہماری رائے میں دوسرے الفاظ میں حرکت نام ہی زمانہ کا ہے۔ اگر حرکت نہ ہو تو زمانہ بھی نہ ہو۔ وقت اور دور کیا ہے ایک حرکت ہی تو ہے۔ اجزاے غیر متجزیہ کا خدشہ بھی عائد نہیں ہو سکتا کیونکہ جب ہم زمانہ کے اصلی اجزا کی ترکیب ہی مختلف ذرات سے ثابت کرتے ہیں اور تمام ذرات کی حرکت ثابت ہے اور دوسری طرف اُن کا تجزیہ بھی تو پھر یہ کس طرح کہا جائے گا کہ یہ خدشہ یا یہ اعتراض کوئی صداقت رکھتا ہے۔

اجزاے گردشیہ کی حرکت اور دور مسلسل اور لگاتار ہے۔ یہ حرکت اور یہ دور کبھی بند ہونے میں نہیں آتا۔ اس دور کی رفتار کا باقی رہنا ہی زمانہ کی ہستی کا ثبوت ہے۔ جس وقت یہ دور اور یہ حرکت باقی نہیں رہے گی اُس وقت نہ تو زمانہ ہوگا اور نہ زمانیات نہ دہر اور نہ امتیازات دہر سے

گوہر مخزن اسرار ہمانست کہ بود — حقہ مہر بداں مہر و نشانست کہ بود

زمین کی گردش اور چاند کی گردش اور وہ تمام دورے جو ایک دوسرے کے بعد گزرتے جاتے ہیں ایک نسبتی وقفہ پیدا کرتے ہیں اور اُن تمام وقفوں میں اگرچہ ایک نسبت وحدت موجود ہوتی ہے لیکن پھر بھی وہ ایک بڑی حد تک امتیازی اشکال سے متشکل ہوتے ہیں۔ اسی طرح جب آفتاب زمین اور دیگر سیاروں کو اپنے ساتھ اُس مقام کی طرف لے جاتا ہے جدھر اُس کی کشش طبعی ہوتی ہے تو اُس کی رفتار میں بھی جو وقفے پیدا ہوتے اور جو مسافتیں یکے بعد دیگرے طے ہوتی ہیں اُن میں جو امتیاز اور جو فاصلہ ہوتا ہے

وہی دوسرے الفاظ مین زمانہ ہے۔
فرض کرو کہ ان گردشی اجسام کی گردشون مین کوئی امتیاز اور کوئی وقفہ نہ ہو تو اُس صورت مین رات اور دن مین کیا تمیز ہو سکے گی۔ اور ان امتیازات کے مقابلہ مین کیا کوئی دور وجود پذیر ہوگا۔ ہرگز نہین۔ اس سے ثابت ہو کہ زمانہ صرف مختلف اجسام کی گردشون یا کیفیات کا نام ہو۔ یا دوسرے الفاظ مین یون کہنا چاہیے کہ زمانہ صرف ایسی گردشون کی امتیازی حالتون یا کیفیتون کا نام ہے یا زمانہ صرف اُن حرکات تبدلات اور تغیرات کا نام ہو جو اجسام سماوی اجسام ارضی اور مختلف نوعون کے ماتحت سرزد اور واقع ہوتے رہتے ہین اور جن کا وقوع ایسا مسلسل اور ایسا لگاتار ہوتا ہو جو ہر شخص کے احساس اور ادراک مین بآسانی آسکتا ہو۔

زمانہ کی موجودگی جب ہم موجود ہین تو یہ کہا جائے گا کہ ہماری موجودگی زمانہ کی موجودگی کو مستلزم ہو اور جب زمانہ موجود ہے تو اُسکی موجودگی اجزاے زمانہ اور زمانیات کی موجودگی کی مستلزم ہو اور جب زمانیات اور ایسے اجزا موجود ہین تو اُن کی ہستی بجاے خود ثابت ہی جو مستلزم ہو۔ گردش اور دور کو جب گردش و دور موجود ہو تو اُن کی موجودگی مستلزم ہو حرکت کو جب حرکت ثابت ہو تو وقت کا وجود لازمی ہو جب وقت موجود ہو تو بلحاظ ضروریات و تصرفات انسانی اُسکی تقسیم اور تفریق لازمی ہو۔ جب وقت کی تقسیم اور تفریق کی جا سکتی ہو تو زمانہ کے اجزاے کبیرہ اور صغیرہ کی تفریق سے انکار نہین کیا جا سکتا۔ اس سے ثابت ہو کہ ہم زمانہ سے کام لے رہے ہین یا زمانہ ہمین مختلف رنگون مین کام دے رہا ہو۔ وہ موثر ہے اور ہم متاثر ہین۔ ہم موثر ہین اور وہ متاثر۔ ان حالات مین ہم اور وہ ایک طاقت ہین اور ہم بہیئت مجموعی اور نیز نوعی حیثیت سے مختلف جذبات اور ایک قسم کا مادہ تصرفات رکھتے ہین جب بہیئت مجموعی زمانہ ایک اثر اور ایک جذبہ رکھتا ہو تو اُس مین ایک جامع متصرفانہ مادہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا جو سب دیگر تصرفات اور تاثرات و جذبات سے فائق اور اعلیٰ ہو۔ انھین وجوہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ

زمانہ کے تغیرات سے ڈرو۔
زمانہ کی چال پر چلو۔
زمانہ سے موافقت رکھو۔
زمانہ بڑا مدبر اور منتظم ہے۔
زمانہ ایک طاقت ہے۔

یہی امور اور یہی خیالات ہین جو زمانہ کا وجود عملی رنگ مین ثابت کرتے ہین اور یہی دلائل ہین جو زمانہ کی ہستی فلسفی تمدنی سیاسی اور اخلاقی رنگ مین ایک لابدی ہستی قرار دیتے ہین اور انھین وجوہ سے یہ کہا جاتا ہو کہ زمانہ اپنے تئین بمنت خیین منوا تا بلکہ بزور زبان حال سے یہ اعلان کرتا ہے کہ
"جو شخص اُس کا ساتھ دیتا ہو وہ اُسکی تائید مین ہو جاتا ہو۔
"جو شخص اُس کا ساتھ نہین دیتا۔ وہ اُسکی تائید نہین کرتا۔"

تصرفات و جذبات زمانہ چونکہ مجموعی اور نوعی حیثیت سے زمانہ کی ذات یا ہستی کے ساتھ موجودات کو انواع و اقسام کی وابستگیان اور روابط حاصل ہین اس واسطے مختلف طریقون سے زمانہ کے تصرفات تاثرات اور جذبات کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ دنیا کا کوئی طبقہ بھی ایسا نہین ہو جو ان اعترافی خیالات سے خالی ہو۔ فلاسفرون حکیمون سائنس دانون اہل سیاست کے گروہون مین بھی یہ خیالات متموّج ہین اور اُن حصون مین بھی جہان وحشت اور جہالت کی حکومت ہو شام اور عرب جو انبیا علیہم السلام کی مقدس بستی تھی ہندوستان جو رشیون اور اوتارون کی دھرتی

تھی یونان جو اصنام او رحکیمون کا سرکل تھا روم جو عیش پرستی اور اعلیٰ مقاصد کا مرجع تھا مصر جو عجائبات کا مخزن تھا یورپ جو آجکل تمدنی ترقیات اور سیاسی معارج کا مامن ہے زمانہ کی وابستگیون اور دہر کی شگفتگیون سے خالی او ر الگ نہ رہا - نہ تو مذاہب ان وابستگیون پر غالب آسکے اور نہ فلسفہ اور سیاست ان سے بازی لے جاسکے اگر کسی نوع نے کچھ حاصل کیا تو انھین سے - اگر کوئی نوع غالب آئی تو انھین کی بدولت - اگر کسی نے شکست کھائی تو انھین کی وجہ سے - باوجود انواع و اقسام کی کامیابیون اور فتوحات کے وہ طاقتین جو او لیات زمانہ کہلاتی تھین وہ نوعین جو زمانہ کا جزو اعظم شمار ہوتی تھین اخیر پر زمانہ کی مجموعی طاقت یا دور اعظم کی نذر ہو کر نیست و نابود ہو گئین - اگرچہ اُن کی جگہ اور زمانیات اور ہستیان موجود ہو گئین لیکن اُن کی ہستی کا کوئی نام و نشان باقی نہ رہا کسی نے یہ بھی نہ جانا کہ منزل مقصود کیا تھی اور اُن کا حشر کس منزل پر ہوا ہر شخص اور ہر ہستی کسی نہ کسی نقش قدم پر سالک ہوئی اور ساتھ کے ساتھ اپنا نقش قدم مٹاتی گئی ؎

کس ندانست کہ منزلگہ مقصود کجاست　　این قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

زمانہ کی مجموعی طاقت اور نوعی طاقت ہر ہستی اور ہر شخصیت ہر نوع پر حتوی اور متصرف ہے باوجود اس کے کہ اجزائے زمانہ اور نوعین ایسے تاثرات او تصرفات سے بچتی ہین پھر بھی کوئی ہستی اور کوئی نوعیت متاثر ہوے بغیر نہین رہین -

اجرام سماوی اجرام ارضی اور دیگر مختلف نوعی اجرام کے تاثیرات تصرفات اور جذبات کل کائنات کو بہ اشکال مختلف محتوی ہین - کوئی کسی رنگ مین اور کوئی کسی رنگ مین - ستارون کی گردشین ثوابت کے تاثرات و تصرفات زمین کی گردش دیگر مخلوقات انسانی حیوانی نباتاتی اور جماداتی کے عملیات مجموعی اور نوعی رنگ مین ایک دوسرے پر متصرف و موثر ہین اور کوئی حصہ کائنات ان تصرفات اور تاثرات سے بچا ہوا اور محفوظ نہین ہے - بجاے خود ہر جزو زمانہ ایک مستقل دور یا مستقل زمانہ ہے - یہ سب ادوار مل ملا کر ایک مجموعی زمانہ کے نام سے تعبیر ہوتے ہین - مجموعی اور نوعی یا جزوی تاثرات تصرفات اور گردشون سے طبائع اشیاء مین بھی ایک دور اور ایک گردش پیدا ہوتی اور مختلف تغیرات اور تبدلات کی محرک ہوتی ہے - اس تحرک اور تبدل و تغیر سے جمود سیال اور سیال جمود کی ہستی قبول کرتا ہے - یہ کائنات اور جزو کائنات کی حالتین اور کیفیتین رفتہ رفتہ متاثر ہو کر نابود ہوتی اور نئی اشکال قبول کرتی جاتی ہین - سمندر دریا بحور طیور بخارات ہوائین عناصر ہر ایک قسم کی موجودات زمانہ کے اجزا ہین اُن کی بدولت انقطاعِ دنیا مین مختلف قسم کے تغیرات اور تبدلات ظہور پذیر ہو کر مختلف دلچسپیان و کیفیات ظہور مین آتی ہین - ایک قوم دوسری قوم اور ایک ملک دوسرے ملک کے مقابلہ مین زندگی کی رفتار مین جد و جہد کرتا ہوا تخیلات مین دوڑ دھوپ کر کے ترقی اور عروج کے میدان مین آتا ہے اور مختلف قسم کے تغیرات اور تبدلات سے آشنا ہو کر زندگی کی رفتار اور تخیلات مین ایک معتد بہ تغیر اور تبدل کا باعث ہوتا ہے -

مختلف تغیرات اور تبدلات سے ایک تیسری صورت یا تیسری کیفیت پیدا ہوتی اور ایک جدید منزل کی راہ کھلتی ہے اور رفتہ رفتہ وہی تیسری صورت ایک کلیہ یا ایک مسئلہ بن جاتی ہے اور اُس صورت مین یہ کہا جاتا ہے کہ زمانہ کی تاثیر اور زمانہ کے تصرفات اور جذبات کیسے جامع اور زور آور

ہین اور اجزاے صغیرہ و کبیرہ کس وسعت سے موثر و متاثر ہوتے ہین اسی طرح آب و ہوا ظلمت و روشنی وغیرہ آثار کا اثر اور تصرف موجودات پر مختلف رنگون مین ہوتا رہتا ہی اور اُس سے موجودات مین تغیرات اور تبدلات پیدا ہوکر ایک حالت یا ایک کیفیت دوسری حالت اور دوسری کیفیت سے تبدیل پذیر ہوتی ہے۔ جب موجودات یا زمانہ کے اجزاے صغیرہ اور کبیرہ ایسے تاثرات و تصرفات کی مخالفت کرتے ہین تو تقویم زندگی یا تقویم کائنات پارہ پارہ ہو جاتی ہی اور یہ کہا جاتا ہی کہ چونکہ زمانہ سے سازش نہین کی گئی اسی واسطے خرابیون نے منہ دکھایا ہی۔

سازش زمانہ کا مفہوم جب کبھی یہ کہا جاتا ہی کہ زمانہ سے موافقت کرو بمصداق ز مانہ باتو نسازد تو بازمانہ بساز تو اُس کا مفہوم یہ سمجھا جاتا ہی کہ شاید زمانہ یا زمانہ کی طاقت اس دائرہ دنیا یا احاطہ موجودات سے باہر ہی یہ درست نہین۔ زمانہ ہم سے دور یا غیر نہین ہے۔ زمانہ کی ناموافقت بہت کچھ یہی ہے کہ ہم اپنے ماحول سے موافقت نہین کرتے یا ماحول کے نئے کوائف سے ناآشنا ہوتے ہین اور دوسری طرف اپنی نوع کے مجموعی قانون کے خلاف چلتے ہین۔ یہ مجموعی قانون کبھی تمدن ہوتا ہی اور کبھی سوسائٹی کا ضابطہ اور کبھی مذہب اور کبھی ضابطہ سیاست اور ضابطہ اخلاق جب ہم زمانہ سے سازباز نہین رکھتے تو دوسرے الفاظ مین یہ کہنا چاہیے کہ ہم اپنے آپ ہی سے سازباز نہین رکھتے۔ اپنے ہی قوانین مسلک کو توڑتے اور اُن سے انحراف کرتے ہین۔ اور جب انحراف کیا تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خرابیان پیدا ہوتی ہین اور اپنی خوش فہمی سے زمانہ کو بدنام کیا جاتا ہی اور یہ کہا جاتا ہی کہ زمانہ کے زیر دست ہاتھون سے یہ حالت ہوتی ہی اور زمانہ کے دست برد سے کوئی نہین نکل سکتا۔

زمانہ کا ایک دوسرا مفہوم کبھی زمانہ سے نہ صرف ادوار سماوی اور گردشہاے ارضی مراد ہوتی ہین بلکہ ان ادوار اور ان گردشون کے سواے جو ادوار اور جو گردشین خود مجموعی موجودات اور نوعی موجودات کے تصرفات سے وجود پذیر ہوتی ہین مراد لی جاتی ہین اور اس حالت مین یہ مفہوم لیا جاے گا کہ خود بعض حصص موجودات مثلاً انسانی جماعتین یا کوئی دوسری نوعی موجودات جزو اعظم زمانہ ہی یا زمانہ کی قائم مقام جیسے کسی سوسائیٹی کی حکومت کسی جماعت اور اُنکے طور و طریق طرز و روش پر ایک واحد فرد یا چند افراد کا نہ چلنا اور اس وجہ سے اُس سوسائیٹی اُس حکومت اُس جماعت سے پیچھے رہ جانا یا اُس کا مخالف خیال کیا جانا یہی زمانہ کی مخالفت ہی اور اس وجہ سے مشکلات مین پڑنا اور ایسے حالات یہ کہنا کہ یہ نتیجہ زمانہ کی مخالفت کا ہی۔ یہ اثر زمانہ کی ناسازش کا ہی۔ یہ مطلب رکھتا ہے کہ اپنی ہی مخالفت زمانہ کی مخالفت ہے۔

جب یہ کہا جاتا ہی کہ "زمانہ باتو نسازد تو بازمانہ بساز" تو اُس وقت اس فقرہ کا یہی مفہوم ہوتا ہی کہ جس طرف موجودات اور باتمیز یا باشعور نوعون کی رہ جاتی ہے کہ اُدھر ہی جانا لازمی ہے کیونکہ وہی زمانہ کی رفتار ہے۔ اگر موجودات کا اکثر حصہ یا ساری موجودات اور ساری جماعت ایک فرد یا چند افراد سے سازش اور اتفاق نہین کرتی تو اُس ایک فرد یا اُن چند افراد کا یہ فرض ہے کہ اُن متفقہ افراد یا جماعت سے ملت اور سازش کرین۔ بے شک بعض اوقات ایک کثیر گروہ کی تحقیقات اور رفتار مین نقص اور لغزش بھی ہوتی ہی۔ لیکن جب ہوا کا رخ ہی ایسا ہو تو لازمی ہی کہ ہم مزید بصیرت کے ساتھ وہی رخ لین اور ہماری مزید بصیرت کسی وقت ایسے نقصان اور ایسی لغزش کی اصلاح مین بھی من جہت مفید ہو سکتی ہی۔ اس سے یہ نہ سمجھا جاے کہ غلطی اور

لغزش کی صورت مین بھی ایسی روش اختیار کرنا لازمی ہو۔ یہ مطلب نہین بلکہ یہ کہ عموماً جب موجودات کے افراد کا حصہ کثیر یا کل جماعتین ایک عرصہ کے بعد کوئی تبدیلی اختیار کرتی ہین تو اُس مین بہت کم غلطیان ہوا کرتی ہین مثلاً ایک جنگ جو قوم مین بجائے دقیانوسی پُرانی بندوقون کے جدید ساختون کی بندوقین رواج پا جائین تو دوسری بالمقابل فوج کا یہ فرض ہو کہ وہ بھی اپنے تئین اس قسم کے آلات سے مسلح کرنے کی کوشش کرے کیونکہ وہ اُسی حالت مین اُس قوم کے مقابلہ مین آسکتی ہو جب اُسی قسم کے آلات سے مسلح اور آراستہ ہو۔ اسی طرح اگر ایک قوم تعلیمی آلات سے کام لے رہی ہو تو دوسری ہمسایہ قوم کا بھی یہ فرض ہو کہ وہ بھی اُس راستہ پر چلے کیونکہ آلات جہالت تعلیمی آلات کے مقابلہ مین محض کند ثابت ہون گے۔ اگرچہ یہ وسائل اور جدید آلات سے کام نہ لیا جائے تو رفتہ رفتہ کام لینے کا مادہ ہی سلب ہو جائے گا اور پیچھے رہنے والی قومین یا جماعتین آگے جانے والی قومون یا جماعتون کا کسی صورت مین بھی مقابلہ نہین کرسکین گی۔ اگرچہ ایسے تغیرات کا احساس رفتہ رفتہ ہی ہوتا ہو مگر ہوتا ضرور ہو۔ ایسے احساس کے وقت لوگ یہ کہنے کے عادی ہین کہ زمانہ بدل گیا۔ زمانہ مین فتنہ آگیا۔ زمانہ موافق نہین رہا۔

ان کلمات کے ساتھ ہی یہ بھی پوچھنا چاہیے کہ زمانہ نے کیا بدلنا تھا خود اپنے ہی حالات اپنے ہی ابنائے جنس اور دیگر نوعی موجودات مین رفتہ رفتہ تبدیلی ہوتی جاتی ہے۔ زمانہ نے ایسے اجزا کو اُفراد و مواد کو مختلف رنگون مین جگایا اور ہلایا مگر وہ خواب غفلت ہی مین رہے۔ بعض جماعتین جاگ کر آگے نکل گئین اور وہ نیند ہی مین رہ بمصداق لکل است اجل۔ ہر ایک گروہ کی کوئی نہ کوئی عمر ہوتی ہو۔ ہر گروہ کی باری آتی ہے۔ موسم کے بدلنے پر پھر ہمین موسم کا ساتھ دینا لازمی ہو ورنہ موسم کے تغیرات ہمین بہ مختلف الحیل یا تو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش مین کامیاب ہون گے اور یا ہماری بربادی کے سامان مہیا کرکے رہین گے۔

زمانہ کا ہاتھ ایک بہت بڑا بلند اور مضبوط ہاتھ ہے۔ وہ کسی کے روکنے سے رُک نہین سکتا اور نہ اُس کی گرفت کم ہوتی ہے۔ وہ یا تو اپنے ساتھ کرلیتا ہے اور یا ایک ہی زد سے جو سب سے اخیر ہوتی ہے اُس منزل پر پہنچا دیتا ہے جو نیستی کی منزل ہے۔

سلطان احمد

العصر (۳)

زمانہ کی میعاد

زمانہ کی میعاد کا ایک ایسا سوال ہے جس پر بہت کچھ بحث کی جا سکتی ہے جو لوگ زمانہ سے مراد ہیئت مجموعی یہ عالم مراد لیتے ہین اُن کی بھی مختلف رائین ہین۔

(الف) بعض کے خیال مین اس کا خاتمہ ہی نہین۔ یون ہی چلا جائے گا۔

(ب) بعض کے خیال مین اس کا جیسے شروع ہے ویسے ہی خاتمہ بھی ہے۔

جو لوگ شق اول کے حامی ہین وہ باوجود لامتناہی ماننے کے بھی یہ تسلیم کرتے یا تسلیم کرنے پر مجبور کیے جا سکتے ہین کہ جسقدر اجزائے صغیرہ اور کبیرہ گھٹتے جاتے ہین وہ معدوم ہوتے جاتے ہین اور اُن کا کوئی نشان باقی نہین رہتا ہے اور جب کل عناصر اور اجزائے عناصر کا خاتمہ ہو گیا تو ان کے اثر اور کیفیت کا خاتمہ ہو گیا۔ اگر بعض اجزا ختم ہو سکتے ہین اور اُنھین ہم کسی نہ کسی رنگ مین معدوم مانتے ہین تو کوئی وجہ نہین کہ کل کی فنا اور عدم کے قائل نہ ہون۔ مثلاً آفتاب کی حدت روز بروز کم ہوتی جاتی ہے اور جو اجزا اُس کے ختم ہوتے جاتے ہین اُن کی باری پھر کبھی نہین آئے گی۔ رفتہ رفتہ جب کل طاقت اور حدت ختم ہو جائے گی تو آفتاب کا زمانہ یا دور بھی ختم ہو کر رہے گا اور اس صورت مین کہا جائیگا کہ زمانہ کا ایک جزو کبیر یا صغیر ختم ہو گیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس جزو کے خاتمہ پر کوئی اور صورت یا نقش پیدا ہو جو موجودہ صورت یا موجودہ کیفیت کے قریب قریب ہو یا کوئی اور ہی صورت اور سمان کسی اور رنگ مین وجود پذیر ہو۔ کیونکہ ہم اسوقت جس زمانہ کی اپنے ماحول کے مطابق بحث کرتے ہین وہ صورت اور وہ کیفیت وہی ہے جو ہمسے متقارب اور متناسب ہے یا جس ماحول مین ہم رہتے اور بود و باش رکھتے ہین۔

امتداد زمانہ کی نسبت نہین کہا جا سکتا کہ وہ کب تک اسی روش اور اسی رفتار سے چلا جائے گا اور جو حصہ اُس کا بصورت مستقبل ہے وہ کہان تک لمبا اور عریض ہے اور اُس کے اجزا کے گزرنے کی میعاد اور مدت کس قدر ہے۔ جن لوگون اور جن موجودات نے اپنے زمانہ کا شروع دیکھا تھا اگر وہ اُسکے امتداد کا خیال کرتے تو یقیناً ہماری طرح وہ بھی اُسکا احساس نہ کر سکتے اور نہ یہ جان سکتے کہ زمانہ کی انتہا ہین کہا تک

جا ئینگی اور اُن کا خاتمہ کہان جا کر ہوتا ہے یہی مرحلہ ہر ضمنی نوع کے لیے بھی پیش ہے۔ ہم بھی نہین جان سکتے کہ یہ استداد کسقدر میعاد اور عرصہ رکھتا ہے۔ لیکن ہم یہ قیاس کر سکتے ہین کہ اس استداد کا کبھی نہ کبھی خاتمہ یا اخیر اور تغیر بھی ہے۔ کیونکہ ہم یہی دیکھتے ہین کہ زمانہ کے اجزا کا ہمیشہ ایک شروع اور ایک خاتمہ بھی ہوتا ہے۔ اگرچہ اُس خاتمہ کے بعد ایک اور سلسلہ بھی شروع ہوجاتا ہے لیکن پہلے اجزا کا خاتمہ اور اخیر ضرور ہوتا ہے۔ یہ روش ثابت کرتی ہے کہ جو حرکت شروع ہے اُسکا کبھی نہ کبھی اور کہین نہ کہین خاتمہ بھی ضرور ہوگا۔ زمانہ بھی برنگ مجموعی اور من حیث نوعی ایک حرکت ہے اور ہر حرکت کا کوئی نہ کوئی شروع اور خاتمہ ہوتا ہے۔ اِس جہت سے زمانہ کا بہت کچھ خاتمہ ہوچکا ہے اور جو باقی ہے وہ کسی نہ کسی وقت اپنے پہلے اجزائے منقضیہ کیطرح ختم ہونے والا ہے۔ یہ کہنا کہ ہم جب زمانہ کے شروع سے یقینی واقف نہین ہین تو یہ کسطرح یقین کر سکتے ہین کہ کبھی اُس کا خاتمہ بھی ہونیوالا ہے درست نہین کیونکہ جب ہم زمانہ کے اجزائے صغیرہ اور کبیرہ مین شروع اور خاتمہ پاتے ہین تو اُس کے ایک دوسرے حصے کے شروع اور خاتمہ پر استدلال خلاف عقل اور خلاف فراست نہین ہوسکتا۔

زمانہ کے اجزائے صغیرہ جن مین ہم خود بھی شامل ہین اجب اپنے مجموعہ اور کل سے جدا ہوکر گزرتے جاتے ہین تو ہم اِس سے یہ قیاس کر سکتے ہین کہ جو باقی اجزا اُسکے رہتے ہین وہ بھی گزرنے والے ہین۔ یہ سوال کہ جو حصص زمانہ گزرتے جاتے ہین اُن کا حشر کیا ہوتا ہے؟ آیا وہ بالکل ہی معدوم ہوجاتے ہین یا وہ کسی اور رنگ مین ہستی قبول کرتے ہین؟ ایک ایسی بحث ہے جسکے کئی پہلو ہین۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ کوئی ہستی اور کوئی چیز معدوم ہوکر معدوم اور فنا نہین ہوتی تو یہ کہا جائے گا کہ وہ کسی اور رنگ مین متبدل ہوکر وجود پذیر ہوتی ہے یا علمی رنگ مین باایں ہمہ اُسکا کوئی وجود نہین ہوتا اور اگر یہ مان لیا جائے کہ جو اجزا معدوم ہوجاتے ہین وہ محض عدم ہوکر رہجاتے ہین تو اس صورت مین یہ بحث ختم ہوجاتی ہے۔ افسوس ہے کہ اِس بحث پر اب تک علمی رنگ مین روشنی نہین ڈالی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ کسی آئندہ زمانہ مین علمی رنگ مین یہ بحث زیادہ تر وضیح ہوسکے۔ اب تک یہی قیاس کیا جاتا ہے کہ جو وقت گزرجاتا ہے وہ معدوم ہوجاتا ہے اور اُس کا کوئی نشان سوائے تاریخی یادداشتون کے باقی نہین رہتا۔

زمانہ مادّی ہے یا مجرّد

زمانہ کی تقسیم حسب ذیل ہوسکتی ہے۔

(الف) زمانہ مادی بلحاظ اجسام۔

(ب) زمانہ مجرد باعتبار آثار

(ج) زمانہ مجرد باعتبار تخیلات

(د) زمانہ مجرد باعتبار اجسام۔

(ہ) زمانہ مجرد باعتبار تصرفات۔

چونکہ ہمنے زمانہ کو موجودات سے کوئی علیحدہ طاقت یا وجود نہین مانا ہے اس واسطے ہم ایک صورت مین تو یہ کہین گے کہ زمانہ مادی ہے کیونکہ موجودات کا بہت سا حصہ مادی ہے اور دوسری طرف ہم باعتبار ان اثرات کے جو ان مادیات سے ظاہر اور مترتب ہوتے رہتے ہین یہ استدلال اور قیاس کرنے کے مجاز ہین کہ زمانہ مجردات کی صورت بھی رکھتا ہے کیونکہ زمانہ کے ایسے آثار مترتبہ کا بہت سا حصہ خیالی اور ذہنی ہی ہوتا ہے تمام مادی تصرفات کا اثر اور نتیجہ اکثر صورتون مین محض خیالی یا روحانی اور ذہنی ہوتا ہے ہم پر مجموعی زمانہ یا نوعی اور جزوی زمانہ کا جو کچھ اثر اور تصرف ہوتا ہے وہ اکثر ہمارے قلوب ضمائر اور دماغون پر موثر ہوتا ہے۔ اِس حیثیت سے زمانہ مجردات کی صورت بھی رکھتا ہے اور اِس جہت سے ایسا ہے اور تصرف زا انیات پر زور کرتا ہے مادی بھی ہے۔ کوئی ایسی مادی کیفیت نہین ہے جو اپنی ذات مین مجرداتی جزو نہ رکھتی ہو۔

ہم جو زمانہ کا ایک جزو اعظم ہین اور دیگر سب اجزائے ہماری ذات

اور رسائی ایک اعلیٰ پیمانہ پر ہر دو ہی قسم کا وجود رکھتے ہیں یعنی ایک طرف مادی اور دوسری جانب روحانی۔ ہماری روحانی اور مجردانہ زندگی کے سامان اور تصرفات مادی زندگی سے کسی صورت میں کم نہیں ہیں۔ اور حقیقت تو یہ ہو کہ ہماری روحانی زندگی بمقابلہ مادی زندگی اور مادی تصرفات کے زیادہ تر با اثر اور قیمتی اور وسیع الظرف ہو۔ ہماری اکثر ترقیات کا مدار ہماری روحانی زندگی ہی پر ہو۔ ہمارے ہاتھ پاؤں آنکھ ناک وغیرہ اعضائے شریفہ ہماری روحانی مشین ہی کے سہارے چلتے ہیں اور ہماری روحانی مشین ہی انکی اکثر ترقیات اور کامیابی کا موجب ہو۔ ہمارا ہاتھ اسوقت گرفت کرتا ہو جب اسے اندرونی حکم ہوتا ہے۔ اگر اندرونی حکم نہ ہو تو ہاتھ کوئی کام نہیں کر سکتا۔ عقل اور فراست کیا ہو؟ ایک روحانی اور مجرداتی آلہ۔

زمانہ کی معدومیت اور اسکا عود

جب یہ کہا جاتا ہو کہ وقت گزر گیا یا گزر رہا ہو تو اُسکا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اب اُسکے بعد کوئی اور وقت یا زمانہ آئے گا ہی نہیں۔ اگرچہ یہ کہا جائے گا کہ جو ہمارا وقت اور زمانہ ہو یا جو ہمارے زمانہ کا طرز اور روش ہو وہ پھر نہ ہو۔

لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی دوسرے رنگ میں بھی کوئی زمانہ نہ آئے۔ جن اجزا سے زمانہ ایک خاص وقت میں مرکب ہوتا ہو اور جو گردشیں اور جو واقعات و کوائف اُس میں پائے جاتے ہیں وہ توفی الواقعہ باقی نہیں رہتے۔ لیکن ایک نئی صورت میں اُس کے بعد ایک اور زمانہ آجاتا ہو جو اپنے اجزا اور تصرفات اور واقعات کے اعتبار سے گزشتہ زمانہ سے متضاد ہوتا ہو۔ اُسکی گردشیں اور اُسکے ادوار کوئی اور ہی صورت اور شکل رکھتے ہیں۔ اُسکی گردشوں اُس کے تاثرات واقعات اور اُس کے تصرفات کسی اور ہی رنگ میں متاثر اور عائد ہوتے ہیں۔ زمانہ بھی بحیثیت مجموعی اور من حیث نوعی اپنے وسائل کی بدولت ایک طاقت رکھتا ہو، جسے روح کہنا چاہیے اور روح بھی ایسی جو موت یا فنا کے بعد بھی باقی رہتی ہو۔ جب روح باقی رہتی ہو تو اُس کے واسطے حشر ثانی لازمی ہو۔ چونکہ روح مجردات سے ہو اسواسطے وہ حدود قلت سے بالاتر ہو اور ساتھ ہی لاتبدیل بھی ہو۔ روح کی طاقت جسم یا جسمانیات سے کہیں زیادہ ہو۔ روح میں قدرت نے ایک ایسی طاقت بخش رکھی ہو جو جسم کے فنا ہونے پر بھی خود کو قائم رکھ سکتی ہو۔ مادہ قائم رہنے کی صورت میں کسی دوسرے رنگ میں اُسکا مکرر ظہور ہو سکتا ہو۔ مذہبی فلسفہ میں انہی وجوہ پر حشر ثانی کا اعتراف کیا گیا ہو۔ مذہبی فلسفہ ہی میں نہیں بلکہ فلسفہ عامہ میں بھی اس حشر ثانی کی تائید کی گئی ہو۔ سقراط نے اپنے مرنے سے پہلے نہ صرف اس امر کا اعتراف ہی کیا بلکہ تلقین بھی کی تھی کہ مرنے کے بعد روحیں "ہادیس" میں جائیں گی اور ایک دوسرے سے ملاقی بھی ہونگی۔ ایسطرح اور فلاسفروں نے بھی اسکی تائید کی ہو۔

زمانہ کو بعض حکمائے دہر نے عقل اعظم یا روح اعظم سے بھی تعبیر کیا ہو۔ اُن کے مذہب کے بموجب بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ بحیثیت ایک روح یا قوت عظیمہ کے زمانہ بھی بعد از فنا دوسری زندگی حاصل کرے گا اور اُسکی زندگی ثانی کا طرز اور روش کچھ اور ہی رنگ رکھے گی۔

ہر چیز جو موجودات میں پائی جاتی ہو وہ کسی نہ کسی قسم کی زندگی رکھتی ہو اور اُسکی کوئی نہ کوئی حد ہوتی ہو اور ہر زندگی میں ایک خاص قسم کی قوت اور روح ہوتی ہو اور چونکہ ایسی ہر قوت یا ہر روح عارضی فنا یا عارضی عدم کے بعد مستقل طور پر وجود ثانی قبول کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ ع

یارب مٹے نہ دل سے کبھی داغ آرزو
ٹھنڈا نہ ہو چراغ شب انتظار کا

مشیت اعلیٰ اور زمانہ

برہمن کعبہ نشین شیخ حرم بندۂ بت
مصلحت ہو جو مشیت ہو الٰہی تیری

یہ کہنا کہ زمانہ یا زمانہ کے اجزائے صغیرہ اور کبیرہ یا موجودات اور کائنات کا چرخہ بغیر کسی چلانے والے کے چل رہا ہے ایک خیال باطل اور سودائے خام ہے۔ سب موجودات اور سب اجزائے زمانہ ایک ترتیب اور ترکیب رکھتے ہیں جو مستلزم ہے اس کی کہ کوئی مرتب اور مرکب بھی ہو۔ جو مرتب و مرکب اعلیٰ ہے وہی ایک اعلیٰ مشیت ہے۔ وہ باقی ہے اور دائم ہے اور اُس کے سوائے سب حادث اور فانی ہیں جب اُسے فنا نہیں تو اُس کی قدرت بھی فانی نہیں۔ جیسے پہلے تھی ویسی ہی اخیر پر بھی ہوگی۔ تمام واقعات و ادوار اور گردشوں کی چابی اُسی کے زبردست ہاتھ میں ہے۔ کوئی ہستی اور کوئی چیز اُس کے یدِ قدرت سے باہر نہیں خیال کی جا سکتی۔ ذات صوری کو فنا اور زوال نہیں، جو مستلزم اس امر کا ہے کہ اُسکی قدرت و ارادہ مشیت کو بھی فنا و زوال نہیں اُسکی مرضی اور اُسکا ارادہ جیسے ازلی ہے ویسے ہی ابدی بھی ہے۔ یہ ازلیت اور ابدیت متقاضی اس امر کی ہے کہ جو کچھ گزر گیا اور گزر رہا ہے یہ پھر کسی اور عالم میں منتقل ہو کیونکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ موجودہ دور یا موجودہ زمانہ میں بھی جو کچھ گزر جاتا ہے اُس کے بجائے ایک اور دور یا زمانہ آ جاتا ہے۔ ایک خاتمہ دوسرے دور کا شروع ہوتا ہے جبکہ تمام ادوار اور چکر ختم ہو جائیں گے تو ایک اور دور اور چکر شروع ہوگا جسطرح ہم آنیوالے دور کی بابت نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیسا ہوگا ایسے ہی یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ حشر ثانی یا زندگی ثانی کیسی ہوگی، البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ موجودہ رنگ میں نہیں ہوگی نہ اس قسم کی دُنیا ہوگی اور نہ موجودات نہ آفتاب اور ماہتاب نہ سیارے نہ ستارے بلکہ اور ہی نقشہ ہوگا جن کی نسبت ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کیسا اور کس قسم کا ہوگا۔ ہم ایک اعلیٰ طاقت اعلیٰ مشیت کو کسی نہ کسی رنگ میں مانتے ہیں، اور یہ بھی مانتے ہیں کہ وہ طاقت اور وہ مشیت موجودات کے افعال اور اعمال و تصرفات سے اعلیٰ اور قوی ہو لہذا جس ترتیب سے ہم موجود ہیں وہ ترتیب ایک بڑی حد تک ہماری عقل و فراست کا نتیجہ اور اثر نہیں ہے۔ اس صورت میں یہ خدشہ پیش آنا کہ اس

موجودات اور زمانہ کی کُلّی فنا کے بعد جو تدریج ہو رہی ہے حشر ثانی یا دورِ ثانی نہیں ہوگا ایک فریب دہ حجت ہے جب ایک طرف وہ اعلیٰ مشیت باقی اور حی و قائم ہے، اور دوسری طرف اُسکا ارادہ اور تیسرے یہ مشاہدہ کہ ایک جزوی خاتمہ کے بعد ایک اور سمان یا زمانہ وجود پذیر ہوتا ہے تو پھر ہم یہ کسطرح کہہ سکتے ہیں کہ فنا کلی کے بعد پھر کوئی دورِ ثانی شروع نہیں ہوگا یا نہیں ہو سکتا۔ یہ کہنا کہ باوجود فنا کے بھی یہی دور اور یہی سلسلہ شروع رہیگا درست نہیں، کیونکہ اسکا فانی ہونا ثابت ہو چکا ہے۔ جب کل کے بعض اجزا فنا پذیر ہیں تو کل بھی فنا پذیر ہوگا اور کلی فنا پر ایک اور ہی رنگ میں موجودات وجود پذیر ہوگی۔ سائنس والے تسلیم کرتے ہیں کہ کوئی چیز فنا نہیں ہوتی۔ اسکا یہی مطلب ہے کہ عارضی یا فناء اولیہ کے بعد دوسری زندگی نصیب ہوتی ہے۔ چاہے وہ کسی رنگ یا کسی روپ میں ہو سائنس والے ہی نہیں فلاسفر اور تقریباً جملہ مذاہب بھی اسکی تائید میں ہیں۔ عارضی فنا حشر اصغر ہے جو اجزائے مختلفہ کی صورت میں صورت پذیر ہوتا ہے جب کلی فنا کے بعد حشر ثانی ہوگا تو اُسے حشر اکبر کہا جائے گا۔ جب ہم حشر اصغر کے مقرب ہیں تو حشر اکبر کا اعتراف لازمی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مادہ کی تکسیر صغیر ہو کر ایک دوسری صورت کسی دوسرے رنگ میں ہمارے سامنے لائی جاتی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ بصورت تکسیر کبیر کوئی دوسری صورت وجود پذیر نہ ہو۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ نیست سے ہست و بود نہیں ہو سکتی تو اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہونا چاہیئے کہ ہست سے نیست نہیں ہوتا۔ کیونکہ جیسے نیست بذاتہٖ ثابت ہے، ویسے ہی ہست بھی ایک مثبتہ کیفیت ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہست و بود سے صورت نیست صورت پذیر ہوتی ہے گو وہ کسی اور رنگ میں بدل جائے مگر موجودہ نقش ہست قائم نہیں رہتا۔ جب موجودہ نقش ہست قائم نہ رہ کر ایک دوسرا نقش قائم ہو سکتا ہے تو یہ کہنا پڑیگا کہ نیست سے ہست کا نقش مرتسم ہو سکتا ہے اور یہ دونوں صورتیں حشر

عنصر اور حشر اکبر کی ہین نقیض سے نقیض پیدا ہوتی ہو۔ زندگی سے موت اور موت سے زندگی۔ جب دوسری مرتبہ زندگی ملے گی تو پھر فنا نہین ہوگی کیونکہ موت کے بعد موت اور عدم کے بعد عدم نہین ہوتا۔ اور زندگی ثانی چونکہ ایک نئی قسم کی زندگی ہوگی اسواسطے لازمی ہو کہ وہ دائرۂ فنا سے دور تر ہو۔ مشیت زندہ ہو۔ ضروری ہو کہ کسی وقت اُسکے آثار بھی یہ کیفیت حاصل کرین۔ ہماری موجودہ زندگی درحصل زندگی نہین ہو بلکہ موت اور دوسری زندگی کا پیش خیمہ۔ موجودات کی زندگی ایک سفر ہو۔ اس سفر کے بعد اُسے وہ زندگی ملے گی جو اس زندگی سے ممتاز ہوگی۔ اگرچہ بعض کا یہ خیال نہو۔

زندگی ثانی کی ضرورت

یہ ایک بڑا اہم سوال ہو کہ زندگی ثانی کی کیا ضرورت ہو اور کیون اسکا اعتراف کیا جائے؟

مذاہب کے اعتبار سے تو یہ سوال چندان پیچیدہ نہین کیونکہ تمدن مین وہ مذہب بھی زندگی ثانی کے منکر نہین ہین۔ ہر مذہب اپنے اپنے رنگ مین اسکا ایک بڑی حد تک اعتراف کرتا ہو۔ فلاسفرون اور حکیمون سے بھی اکثر فلاسفر ایسا ہین اور دلائل کے ساتھ اس تھیوری اور اس مذہب کے معترف اور موید ہین۔

زندگی ثانی اُس قسمت اور اُس حیثیت سے ہونی چاہیئے جو اس موجودات مین ہر خلقت کو حاصل ہو۔ ہم دیکھتے ہین کہ اس موجودات کی زندگیان ایک ہی قسم کی نہین ہین۔ نباتات جمادات کی زندگی حیوانات انسانون کی زندگیون سے بہت کچھ فرق اور امتیاز رکھتی ہو۔ اس امتیاز کے ساتھ ہی اُن کی تربیت اور عظمت مین بھی فرق ہو۔ کل موجودات مین سے انسان اور انسانی زندگیان ممتاز اور اشرف ہین۔ قدرت نے جو کچھ انسان کو عطا کیا اور بخشا ہو یہ کسی دوسری خلقت کے حصہ بخرہ مین نہین آیا ہو۔ ایک صورت مین انسان دیگر کل موجودات کا ایک مجموعی نمونہ ہو۔ ایسی معجون مرکب جس مین ہر قسم کا عنصر اور جزو پایا جاتا ہو۔ انسان کی زہنی طاقتین اور دماغی کمالات ضمیری عجائبات اس قسم کے نہین ہین کہ انھین معمولی سمجھا جائے۔ انسان ترقی کرتے کرتے ہین انتہائے مطالب اور ممتاز مقاصد تک پہنچتا ہو۔ وہ کسی دوسرے حصہ موجودات کے حصہ مین نہین آئے ہین۔ ہر چند کہ دوسرے حصہ موجودات مین بھی بہت سی خلقتین ممتاز اور اشرف ہین لیکن انسان کے مقابلہ مین اخیر تک کامیاب نہین ہوئی ہین اور نہ ہو سکتی ہین۔ کیا قدرت نے یہ کمالات انسان کو صرف اسواسطے عطا کیے تھے کہ چند روز کے بعد فنا ہو جائین اور اُنکی رفتار مرنے کے بعد رُک جائے؟ ایسا کہنا اور ایسا اعتراف قدرت اور انسان دونون کی تحقیر کرنا اور اسکے فضل و شرف کو ایک شرمناک بٹہ لگاتا ہو۔ انسان کو جو قوتین عطا کی گئی ہین وہ کبھی ختم نہین ہین اسلیے وہ زندگی مین ترقی کرتی ہین ایسے ہی مرنے کے بعد بھی لازمی ہو کہ وہ لگاتار ترقی کرتی جائین اور اُنکی رفتار اُس منزل پر جاکر رُکے جو اُس کے واسطے ایک آخری منزل ہو۔

صانع اور مصنوع مین ایک لاینفک نسبت کا ہونا لازمی ہو۔ انسان اور خدا مین کئی ایک نسبتین ہین۔ اگر خدا دائمی زندگی رکھتا ہو تو انسان اس عالم صغیر مین ایک عارضی زندگی رکھتا ہو۔ اگر خدا ایک کامل صانع ہو تو انسان ایک ناقص صانع ہو۔ اگر خدا کل موجودات سے اشرف اور افضل ہو تو انسان اس موجودات مین سے یقیناً اشرف اور افضل ہو۔ اگر خدا کامل ارادہ رکھتا ہو تو انسان بھی ناقص ارادون کا بانی ہے۔ یہ یا اسی قسم کی اور تمام نسبتین انسان ہی کی ذات مین ایک حد تک پائی جاتی ہین کوئی دوسری موجودات ان سے انسان کی طرح موصوف نہین ہو۔ یہ دلیل اس بات کی ہو۔ انسان کی پوزیشن اور درجہ شرف و فضل تمام دیگر موجودات سے ممتاز اور اعلیٰ ہو۔ اور اس بارے مین کوئی موجودات اُسکا مقابلہ نہین کر سکتی ہے۔

جب انسان یہ درجہ اور یہ فضل و شرف رکھتا ہو تو اُس کے مرنے کے بعد محض نیست و نابود ہو جانا عقل سلیم قبول نہین کرتی۔ یہ تماشا ایسی

نہین کہ محض نیست و نابود ہوکر رہجائے اور اُسکی تمام صفتین اور کمالات گاڑ دیئے جائین۔ خدا کے بعد بھی خلقت ہو۔ اس کا محض نیست و نابود ہوجانا خدا کی عظمت و حکمت کے خلاف ہے۔ بے شک بمصداق "کل من علیہا فان" ہر خلقت فانی ہے اور انسان بھی فانی ہے لیکن اس فنا کا یہ اثر نہین کہ مرکر پھر جینا نہ ہو۔ چونکہ صانع اور مصنوع مین ایک نسبت ہے اور بالخصوص انسان اور خدا مین تو ایک بڑی حد تک نسبت پائی جاتی ہے اسواسطے سب سے بڑھکر دوسری زندگی یا دائمی زندگی کا مستحق انسان ہی ہے تاکہ اس شرف سے یہ کہنے کا موقع ملے کہ انسان کا رتبہ اس درجہ تک ہے۔ یہ بحث کہ زندگی ثانی ناممکن ہے مذہبی خیال سے تو کوئی وقعت نہین رکھتی کیونکہ کوئی مذہب بھی اس نقطہ خیال سے نہین ہٹتا ہے جب خدا کو قادر مطلق مانتے ہین تو وہ ہر صورت مین زندگی جدید یا زندگی ثانی بخش سکتا ہے کیونکہ وہ ہمارے مقابلہ مین ہر وقت قادر مطلق اور حی و قائم ہے۔ اُسکی قدرت کا محدود کردینا اور انسانی شرائط سے اُس کا مشروط کرنا درست نہین ہے اگر سائنس اسکی مخالفت کرتا ہے تو وہ مخالفت اس وجہ سے بھی کہ ابھی ہماری سائنس کمل ہی نہین ہوئی ہے قابل وقعت نہین ہے اور جبکہ خود سائنس بھی اس عقیدت کا موید اور مثبت ہے کہ فنا دائمی کسی ہستی کو نہین ہوتی ہے تو کس صورت مین ہم اس زندگی ثانی سے انکار کرسکتے ہین۔ مذاہب حشر ثانی اور زندگی ثانی کی کسی اور نام پر تعبیر کرتے ہین اور سائنس کسی اور جہت پر ہم کہتے ہین کہ دوسری زندگی یا حشر ثانی بھی خدا ہی کی قدرت کاملہ کے ماتحت ہوگا اور ایک جدید رنگ مین موجودات وجود پذیر ہوگی بالخصوص حضرت انسان جو اپنے فضل و شرف کے مرنے کے بعد ضائع نہین ہوسکتا۔ یہ سوال کہ کیسی جدید موجودات کب اور کہان ظہور پذیر ہوگی ایک ایسا سوال ہے جس کا قطعی طور پر حل کرنا موجودہ انسانی طاقت اور حرکات سے باہر ہے اور کچھ ضرورت بھی نہین کہ اس پر مستقل کوشش کی جائے بلکہ مذاہب مین اس سوال پر بہت کچھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ وہ خوب ہے۔ اگر اس سے ہی طمانیت نہین ہوسکتی تو پھر مزید بحث کی ضرورت نہین ہے۔ کسی وقت خود بخود ہی یہ سوال حل ہوکر رہیگا۔ ہان اتنا کہا جائے گا کہ فلسفہ مذاہب مین جو کچھ بیان کیا گیا ہے اگرچہ اسکے بعض حصے قابل بحث ہون لیکن اگر اُن کی تطبیق فلاسفرون کے اقوال سے کیجائے تو ماننا پڑیگا کہ فلسفہ مذاہب کی تائید مین مشاہیر حکماء دہر کے اقوال بھی ہین۔ فلسفہ مذاہب کو محض اسواسطے نظر انداز کردینا کہ وہ مذہبی دُنیا سے تعلق رکھتا ہے ایک فریبوہ روش ہے۔ مذہبی فلسفہ بہت کچھ قابل احترام ہے اور اس فلسفہ کے مشاہیر کی متبرک اور مقدس زندگیان بہت کچھ وقعت اور عظمت رکھتی ہین اور دیگر فلسفہ کے مقابلے مین یہ فلسفہ ایک اعلیٰ طاقت سے وابستہ ہے اور اُس مین ایسی صداقت ہے جو دُنیا کی تمام دیگر صداقتون سے ممتاز اور اشرف ہے اور اسکی طاقت اور جذبات سے کوئی دوسرا فلسفہ بڑھکر نہین کہا سکتا۔

ماحصل

یہ تمام ساعات تمام آفاق تمام اقران تمام اوقات تمام عہود تمام لیل و نہار تمام طلوع و غروب تمام نزول و صعود تمام اجرام سماوی و ارضی تمام ادوار تمام گردشین تمام واقعات تمام سانحات تمام حقائق تمام کیفیات تمام عدم و وجود تمام حیات و ممات تمام گفت و شنود تمام تاثرات تمام تصرفات تمام جذبات تمام خیالات تمام اجتہادات تمام قیاسات تمام اختراعات تمام مصنوعات تمام حرکات تمام سکنات تمام لوازمات تمام عارضات تمام جواہر تمام مخفیات تمام طبعیات تمام حیات تمام ادراکات تمام احساسات تمام طیور و حوش تمام عقلا و وحوش تمام حیوانات تمام نباتات تمام جمادات تمام آثار تمام عناصر تمام شروع تمام خواتم تمام ظواہر تمام بواطن تمام ترقیات تمام تنزلات تمام تبدلات تمام تغیرات تمام یمین و یسار تمام ماثور تمام ایثار تمام فوق تمام تحت تمام انسان اور انسانی ذریات تمام حیوانی ذریات تمام احول تمام موجودات تمام مناظر تمام معقولات تمام منقولات تمام مشروعات تمام مسموعات تمام مشمومات تمام طعومات تمام ماکولات تمام محسوسات تمام جسمانیات تمام روحانیات تمام

تصورات تمام تصدیقات تمام وینیات تمام کون وفساد وہ یہ ہم اور تم وغیرہ وغیرہ سب کے سب اپنے اپنے رنگ مین زمانہ اور اجزائے زمانہ ہین زمانہ ہم سے علیحدہ نہین اور ہم زمانہ سے جُدا نہین اُسکی موجودگی ہماری موجودگی اُسکا گزرنا ہمارا گزرنا اُسکا بدلنا ہمارا بدلنا اور ہمارا بدلنا اُسکا بدلنا ہے اور یہ سب کچھ اُس اعلیٰ طاقت کے مضبوط اور قادر ہاتھون مین ہی جو اس دُنیا اور تمام سامان دُنیا کا خالق وصانع ہو۔ اگرچہ بعض جلد باز روحین اس ذات سے انکار کرتی اور اُسپر مصر ہوتی ہین لیکن آخر مین اُنکا دل بھی شاہد ہوتا ہو کہ اُنکا اجتہاد اور خیال درست نہ تھا۔

ہم موجودات مین سے صرف کسی ایک ہستی ایک کیفیت، ایک چیز ایک معترف کو زمانہ نہین کہہ سکتے۔ سب موجودات مل ملا کر زمانہ کا مفہوم پیدا کرتی ہو۔ جب ہم کہتے ہین کہ

زمانہ بدل گیا یا

وہ زمانہ نہین رہا

تو دوسرے الفاظ مین مفہوم یہ ہوتا ہو کہ جو واقعات جو کیفیات جو حادثات جو سانحات جو عوارض جو لوازم جو مساعات جو اوقات جو محسوسات جو مدرکات جو تصرفات جو تاثرات جو جذبات جو محرکات جو موجودات اور جو کائنات ایک وقت مین بقید ہستی تھی وہ موجود نہین رہی، اُنکی جگہ اور ہستیون کے حصہ مین آچکی ہی۔ میری رائے مین یہ کہنا صحیح اور درست نہین کہ علاوہ متحرک حرکت اور مسافت کے ایک دوسری کیفیت زمانہ ہو۔ یہ سب اجزائے زمانہ ہین۔ بعض صغیرہ بعض کبیرہ بعض ساکن بعض متحرک بعض قار بعض غیر قار بعض سماوی بعض ارضی بعض جسمانی بعض روحانی بعض مرئی بعض غیر مرئی بعض ظاہری بعض باطنی بعض منقسم بعض غیر منقسم بعض ارادی بعض غیر ارادی بعض حیوانی بعض انسانی بعض نباتاتی بعض جماداتی وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب اجزا منفردۃً و نیز مجموعتاً زمانہ یا مجموعہ زمانہ ہین کسی خاص صورت حقیقت اور کیفیت کو زمانہ کہنا زمانہ کی وسعت کو کم کرتا اور اسکے اصل مفہوم کی کچھ اور تعبیر کرنا ہو وہ ارادہ جو سب ارادون وہ تدبیر جو سب تدبیرون وہ قدرت جو سب قدرتون وہ ہاتھ جو سب ہاتھون وہ تصرف جو سب تصرفات وہ جذبہ جو سب جذبات وہ حکمت جو سب حکمتون سے اعلیٰ اور افضل ہو جو خالق اور صانع کے مقدس نام سے موسوم ہوتی اور تعبیر پاتی ہو اس سب کارخانہ کی منفردۃً اور مجموعتاً چلانے والی ہو اور اُسکی حکمت بالغہ ہر رنگ مین کام کر رہی ہو وہی لائق پرستش و شکریہ ہے۔

تعظیم تو بر جان و خرد واجب و لازم
انعام تو بر کون و مکان فائض و شامل

سلطان احمد

اثبات واجب الوجود

خدا کی ہستی قدیم الایام سے ہر ملک، ہر صدی، اور ہر قوم مین مسلم چلی آتی ہے۔ مہذب اور غیر مہذب، جاہل اور شائستہ سب اقوام کم وبیش ایک ایسے وجود کی قائل چلی آتی ہین جو عالم و مافی العالم کا خالق، بانی، اور محرک کہا جاتا ہے۔ جن وحشی قومون کے درمیان ایک سے زائد معبود مانے جاتے ہین وہ بھی ایک دیوتا کو سب سے بڑا اور سب چیزون کا خالق مانتی ہین۔ ہمارا ارادہ ہے کہ اس مضمون مین واجب الوجود کی نسبت خیالات سے بحث کی جائے اور بتایا جائے کہ علمائے مغرب خدا کی ہستی کو کس طرح ثابت کرتے ہین اسکے ساتھ ہی اس امر پر بھی بحث ہوگی کہ یہ غلط فہمی جو پیدا ہوگئی ہے کہ سائنس کی ترقی سے اہل یورپ اور امریکہ خدا سے منکر ہوگئے ہین اس مین کتنی حقیقت اور کتنا مبالغہ ہے۔ بعد ازان ہم یہ دکھائینگے کہ ہندو دھرما تما و دوان اور مسلمان علما خدا کی ہستی کو کس طرح ثابت کرتے ہین۔ ضمناً بعض یونانی حکما کے خیالات اور استدلال کا بھی ذکر ہوگا۔

خدا کی ہستی کی نسبت علمائے مغرب کے دلائل

خدا کی ہستی کو سبھی مانتے ہین بلکہ یون کہنا بجا ہوگا کہ تمام مذاہب (بعض شاذ مستثنیات کے) عالم کے خالق اور موجودات کے مالک کے وجود کو مانتے ہین۔ ہر ایک آستک مذہب کا سب سے مقدم اصول خدا کی ہستی ہے۔ بودھ اور جین مت ہی تمام دنیا مین صرف دو ایسے مذہب ہین جو کھلم کھلا خدا کی ہستی کے منکر ہین۔ خدا کی ہستی کے قائل ہونے کے ساتھ ہی ہر بڑے مذہب کے مقلدون نے اسکی ذات، صفات، حکمت، و دانائی کو جو کائنات مین نمایان ہے دیکھکر چند اصول اور مسلمات وضع کئے ہین جو اس مذہب کے الہیات کی جان ہین۔ منکر تو ہر ملک اور قوم اور ہر زمانہ مین پیدا ہوتے رہے ہین جو بات بات مین شک لاتے اور مذہب کے مسلمات کو بچپن کا کھیل قرار دیکر اس سے صاف انکار کرتے چلے آئے ہین۔ مگر ایسے آدمیون کا شمار بہت قلیل اور بالکل محدود ہوتا ہے۔ تاہم علمائے دین اور اہل مذہب انکی دلائل در بارہ انکار خدا کی تردید اور اپنے معبود اولی کے وجود کو معقول اور قابل تسلیم قرار دینے کے لئے دنیوی علوم سے کام لیتے اور انکی بنا پر استدلال کرتے ہین۔ اسی طرح مغرب کے عالمان دین نے بھی خدا کی ہستی کے ثبوت بہم پہنچائے ہین۔ یہ گذارش کر دینا بھی مناسب ہے کہ مغرب کے عالمون مین بھی ایک سے زیادہ فریق ہین سب سے اول تو مسیحی مذہب کے عالم؛ دوسرے گروہ مین وہ لوگ شامل ہین جو مسیحی مذہب کو تمام وکمال تو قبول نہین کرتے مگر خدا اور مذہب کے قائل ہین؛ تیسرا گروہ ایسے عالمون کا ہے جو اول الذکر دو گروہون کے عقائد در بارہ خدا کو معقولیات کے پہلو سے ماننے کو تیار نہین ہے جو AGNOSTIC یعنی لاادری کہلاتا ہے۔ اس گروہ کے لیڈرون مین سب سے اول ہربرٹ اسپنسر اور ہکسلے دوسرے درجہ پر آتا ہے۔

خدا کی ہستی کے دلائل

سب سے پہلے ہم مغرب کے عالمان دین کی بڑی بڑی دلائل کا ذکر کرنا چاہتے ہین جو وہ خدا کی ہستی کے ثبوت مین پیش کرتے ہین۔ واضح ہو کہ اثبات واجب الوجود پر بڑے بڑے عالمون نے معرکۃ الآرا کتابین تصنیف کی ہین جنکا ذکر اس مختصر مضمون مین قریب قریب ناممکن ہے۔ اس لئے معذرت کے ساتھ اختصار پر اکتفا کرنا پڑتی ہے۔ اگر اہل نظر اور علما کی اس بحث سے تشفی نہو تو وہ

ازراہ نوازش راقم کو معاف فرمائیں کیونکہ ایسے رسالہ میں اس سے زیادہ بحث محال ہے۔

خدا کی ہستی کے ثبوت میں مغربی علما اور حامیان دین حسب ذیل دلائل پیش کرتے ہیں، جو مذہب فطری کے اصول وارکان ہیں (۱) تاریخی دلیل شاید اسے دلیل تواتر کہنا بجا ہوگا۔ روما کے مشہور فلاسفر سسرو اور سینیکا اسے Econsensu Gentium کے نام سے پکارتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اس کا یہ مفہوم ہے کہ تمام بنی آدم خدا یا واجب الوجود کے قائل چلے آتے ہیں۔ یعنی بنی نوع انسان کے متفقہ ایمان کی دلیل (۲) علت العلل یا علت اولی استدلال (۳) حسن نظام عالم (۴) علت غائی اور تجویز (۵) شعور اخلاقی (۶) حاسّہ روحانی اور ذکاوت فطری۔

علاوہ ازین اور بھی کئی دلائل پیش کی جاتی ہیں۔ مگر یہ سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ قدیم اور جدید فلاسفر ان میں سے کئی کئی دلائل کو خدا کی ہستی ثابت کرنے کے لئے پیش کرتے ہیں لیکن ہمارے موجودہ مطلب کے لئے یہی کافی ہیں۔ اب مناسب ہے کہ ان دلائل پر قدرے تفصیل سے بحث کی جائے اور ان کا مفہوم واضح کیا جائے۔

(۱) بنی آدم کا ایمان خدا

تمام بنی آدم جہانتک معتبر تاریخ پتہ دیتی ہے، ایک مافوق العادت اور قادر مطلق ہستی کے قائل چلے آتے ہین۔ کوئی زمانہ کوئی قوم اور کوئی ملک اس عام ایمان سے کبھی بیگانہ اور محروم نہین رہا۔ اس کے متعلق دو باتین ذہن نشین کر لینا مناسب ہے (۱) پرانے زمانہ کے مذاہب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک خدا کے قائل تھے، اور یہ کہ وہ اسے مادی دنیا سے اعلے وبالا سمجھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اسے ماورلے الدہر اور محیط عالم بھی خیال کرتے تھے خدا کی ذات کا یہ تصور مذہب کا ایک ابتدائی اور بنیادی اصول تھا۔ (۲) موجودہ عقاید اور وحشی اقوام کے دینی خیالات کی جتنی چھان بین کی جائے اتنا ہی یہ امر زیادہ واضح ہوتا ہے، بلکہ اسے بہت تقویت پہنچتی ہے کہ ایک ماوراء الدہر وجود ہے جس سے تمام موجودات کی خلقت اور صنعت منسوب کی جاتی ہے۔

ویدون کا مذہب بہت پرانا سمجھا جاتا ہے، اور اس سے دوسرے درجہ پر زرتشتی مذہب ہے اور ان دونون کے مطالعہ سے عالمون نے یہ تسلیم کیا ہے کہ ان مین ایک وجود اوّلی اور قادر مطلق کی صاف تعلیم دی گئی ہے جو موجودات کا صانع اور کائنات کا خالق ہے۔ عالم وما فی العالم ایک مافوق العادت الہٰی وجود کی قدرت اور حکمت سے وجود پذیر پائی جاتی ہین۔ نہ صرف یہی مانا جاتا ہے بلکہ یہ بھی کہ وہ موجودات کا مبدا حقیقی ہے۔ گو عالم کی آفرینش کا خیال ایسا واضح اور صاف نہین ہے تاہم سارے بیان پر غور کرنے کے بعد سب چیزون کو معرض ہستی مین لانیوالا اور مسب الاسباب خدا ثابت ہوتا ہے۔

زرتشتی مذہب کی روسے اہرمزد موجودات کا خالق بیان کیا گیا ہے وہ رب العالمین سمجھا جاتا ہے، اور اس کے مقابلہ مین اہرمن ہے جو ہر وقت اس سے بر سر پرخاش رہتا ہے، اور خداوند ظلمات کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن دونون اصولون کے پس پشت ایک قادر مطلق غیر محدود وجود ہے جس کے اشارہ سے اہرمزد اور اہرمن پیدا ہوئے تھے۔

اب ان دونون مذہبون کو چھوڑ کر اگر قدیم مصر، بابل، نینوا وغیرہ کے لوگون کے عقاید اور علم الاصنام پر غور کیا جائے تو گو ہم وہان پر ایک دو نہین درجنون مختلف دیوتاؤن سے دوچار ہوتے ہین جنکی پرستش مین ایک قسم کی زبردست رقابت نظر آتی ہے مگر تو بھی دھندلا سا اشارہ اس مضمون کا ملتا ہے کہ وہ ایک ایسے دیوتا کے قائل تھے جسنے زمین و آسمان کو ہستی بخشی اور وہ کائنات کی پس پشت

قرار دیا جاسکتا ہے۔

یونان کے لٹریچر سے ظاہر ہے کہ شاعرون نے بہت سے دیوتاؤن کا ذکر کیا ہے۔ بعد کے زمانہ کے شعرانے ایسے وجود فرض کئے جو دیوتاؤن سے کسی طرح کم نہ تھے۔ مگر ان دیوتاؤن اور وجود کی نوعیت پر غور کرنے کے بعد یہ ظاہر ہے کہ وہ ایک وجود نادیدنی کے قائل تھے جو سب موجودات پر حاوی ہے۔ افلاطون کہتا ہے "آسمان اور زمین اسی کے وسیلہ سے معلق ہین"۔ گورمیون کے ہان بہت سے دیوی دیوتا مانے جاتے تھے مگر جوپی ٹر سب سے بڑا، حاضر و ناظر اور قادر مطلق دیوتا تھا۔ باقی دیوتا اس کے مظاہر اور نشان تھے قدیم زمانہ کے ملک خالدیہ مین گو سینکڑون دیوی دیوتا تھے، مگر رانسن کہتا ہے کہ ترا سب دیوتاؤن کا مصدر اور سرچشمۂ خدائی تھا۔ چین کا بڑا گرو کنفوشس تھا۔ اس کی بابت بیان کیا جاتا ہے کہ اُسنے خدا کی بابت کچھ نہین کہا مگر یہ ظاہر ہے کہ وہ موجودات اور مظاہرات کے پس پشت ایک ناقابل فہم اور غیر مرئی قوت کا قایل تھا اور اسی سے دعا کرتا تھا۔ وہ اُسے آسمان یا آکاش کے نام سے پکارا کرتا تھا۔ مگر اس وجود کی اصلیت کی بابت اس کا کوئی خاص خیال نہ تھا۔ بلکہ شی کنگ ، (مجموعہ کلیات) مین وہ ایک صاحب شخصیت اور ذی ارادہ خدا کو مخاطب کرتا ہے۔ چین کا دوسرا گرو تاؤ بھی خدا کا قائل تھا۔ پرانے زمانہ کی کسی مہذب قوم کو لے لو۔ کم و بیش خدا کا خیال اس کے ہان موجود تھا۔ بعض کے ہان صاف خیال تھا، اور بعض کے ہان صرف دھندلا سا۔ آریہ، اور تورانی، اور سامی اقوام کے عقائد مضائے واحد، قادر علے الاطلاق، خالق ارض و سما مالک ہر دو جہان کی ہستی پر شاہد ہین۔

موجودہ جاہل اقوام جو امر پرانے زمانہ کی مہذب اقوام کے عقیدہ پر صادق آتا ہے وہ موجودہ زمانہ کی جاہل اور وحشی قومون پر بھی عاید ہوتا ہے۔ افریقہ، امریکہ، اوشنیا وغیرہ مین جو وحشی اور ابتدائی قومین آباد ہین وہ کم و بیش ایک وجود مطلق کو مانتی ہین۔ گو اُن کا یہ عقیدہ بہت واضح نہین ہے اس لئے کہ عقلی طاقتین ابتدائی مرحلۂ نمو مین ہین علاوہ ازین وہ بہت سے دیوتاؤن کو بھی پوجتی ہین۔ باوجود اس کے وہ ایک سب سے بڑے دیوتا کو مانتی ہین۔ گو سر جان لبک (لارڈ اوبری مرحوم) اور سان ہلیئر فرنچ محقق کا یہ خیال ہے کہ کئی جاہل قبائل خدا کے اعتقاد سے بیگانہ ہین مگر فرانس کا ایک اور بہت ہی مشہور محقق مونسیور کاترفاژ بیان کرتا ہے کہ "میری تحقیقات اور تجسس کا نتیجہ سر جان لبک اور سان ہلیئر کے نتائج کی نقیض ہے۔ تمام بنی آدم کے حالات دریافت کئے اور ایمان خدا کا عدم وجود ادنی ترین اور اعلے ترین قومون کے درمیان تلاش کیا مگر سوائے بعض افراد یا فرقہ کے کہین نہ ملا ایسا شخص خود اگناسٹک یعنی لاادری فرقہ کا ہے۔

(۲) علت العلل

دلیل تواتر پر قدرے طوالت کے ساتھ بحث کرنے کے بعد اب ہم دوسری دلیل کا ذکر کرنا چاہتے ہین جو علت العلل کہلاتی ہے۔ انگریزی اصطلاح مین اس کا نام AETIOLOGICAL ARGUMENT ہے۔ یعنی اسباب و نتائج کے سلسلہ پر غور اور اسکی ابتدا کا کھوج کرتے ہوئے ہم ایک علت آخری سے دوچار ہوتے ہین جو تمام مظاہر و موجودات عالم کا سبب آخری اور مبدا ثابت ہوتی ہے۔ اسباب و نتائج کے سلسلہ کی تمام کڑیان اس پر ختم ہوجاتی ہین یہ یون سمجھنا چاہئے کہ اس سلسلہ کی اول کڑی وہی ہے باقی کڑیان اسکی شاخین ہین۔

تواتر سے غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہین کہ ہر زمانہ، ہر قوم، ہر ملک کے مہذب اور غیر مہذب، جاہل اور عالم کا ایمان

ایک ہستی اولی پر زمانہ مقدم التاریخ سے چلا آتا ہے جو عالم وما فی العالم کا خالق اور مبدا ازادلی ہے۔ تمام چیزین اپنی ہستی کے لئے اسکی قدرت وحکمت کی محتاج ہین وہ اس عالم کا حاکم اور مالک ہے۔ اب اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ موجودات کو دیکھنے اور عالم کی کیفیت مشاہدہ کرنے سے اس عقیدہ کی تائید ہوتی ہے یا نہین؟ اسکے متعلق حسب ذیل امور قابل غور ہین۔

عالم کے اندر مادیات کی یکسانیت ویکرنگی زمانہ حال کے سائنسی اکتشافات اور تحقیقات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عالم مادیات مین فطری اور جبلی یکسانیت اور یکرنگی پائی جاتی ہے۔ جتنی قوین عالم کے اندر کام کرتی معلوم ہوتی ہین وہ سب کی سب ایک قوت اولی (PRIMAL FORCE) کی مختلف شکلین ہین۔ جتنی اشیاء کائنات مین ہین وہ سب کی سب ایک اصل اور ایک مبدا عالم کی گوناگون صورتین ہین۔ مادیات مین اصول تثنیہ (DUALITY) نہین، اور نہ مبدا کی کثرت (PLURALITY) ہے۔ بلکہ وحدت (MONISM) ظاہر ہے۔ گو عالم کے اندر خامیان اور کوتاہیان پائی جاتی ہین، مگر وہ بھی ابتدائی علت غائی کے اجزا ہین۔ اور ایک نامعلوم مقصد پورا کرنے کو روا رکھی گئی ہین۔ مفردات مادہ کو لو، یا حاضرہ ناظرقوا کی تبدیل ہیئت کو لو یکسانیت اور وحدت ہر جگہ موجود ہے۔

کرۂ ارض کی ابتدا حقایق الاشیاء اور موجودات سے قطع نظر کرۂ ارض کی ابتدا پر غور کرو۔ سائنس والون کو اسکی ابتدا کا اب بہت معقول علم حاصل ہو گیا ہے۔ اسکی عمر کا تخمینہ بھی ہو گیا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسے کس نے بنایا؟ کون اسے نیستی سے ہستی مین لایا؟ اسباب و واقعات پر غور کرکے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسے ضرور کسی ذی العقل اور صاحب قدرت ہستی نے تحریک دی۔ آپ سے آپ پیدا ہونیوالی قوت عالم مین نہیں پائی جاتی۔ پروفیسر جونکر اپنی شہرۂ آفاق کتاب "پرنسپلز آف سائنس" مین لکھتے ہین: "مسئلہ حرارت سے ہم ایک معمہ سے دوچار ہوتے ہین۔ یا تو آفرینش عالم ایک زمانۂ مقررہ کے اندر واقع ہوئی یا یہ ماننا پڑے گا کہ ابتدا مین قوانین کے عمل مین کوئی ناقابل تشریح انقلاب واقع ہوا" (صفحہ ۴۳۹)۔ اور بہت سے سائنس دان بھی اس امر پر متفق ہین۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسکی علت فاعلی کیا تھی؟ اگر فلکی نظریہ سحاب کو مان لیا جائے اور یہ بھی باور کر لیا جائے کہ سحاب آسمانی مین فعل ارتقا پیدا ہونے سے عالم وجود مین آئے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس نے اسے ابتدا مین حرکت دی؟ زیادہ ادق مسائل کو چھیڑے بغیر ہم یہ مان لیتے ہین کہ کوئی ذی ادراک ہستی تھی جسے قائم بالذات انقلابات سے بالاتر موجودات کا مبدا اولے مانا جاتا ہے۔

زندگی کی ابتدا عالم کا کوئی حصہ زندگی سے خالی نہین عالم نباتات اور اقلیم حیوانات اس سے لبریز ہین۔ مگر زندگی کیا ہے؟ یہ سوال بڑا مشکل ہے۔ زندگی کی مختصر تشریح یہ ہے "اندرونی تعلقات کا خارجی تعلقات سے متواتر ربط ضبط اور موافقت واتحاد رکھنے کے مسلسل عمل کا نام ہے" (فورسٹ پرنسپلز صفحہ ۱۶۱ و ۲۳)۔ یہ معما اب تک حل نہین ہوا کہ بے جان مادہ کا جان سے کیا تعلق ہے، اور دونون کے درمیان جو مغائرت ہے اُسے کس طرح رفع کیا جائے اور اسکی تشریح کس اصول سے ممکن العمل ہے؟ عالمان افعال الاعضاء (PHYSIOLOGY) پروٹوپلازم (PROTOPLASM) کی طرف اشارہ کرتے ہین جو زندگی کا اصول مادی قرار دیا جاتا ہے۔ پروفیسر آل مین نے کچھ عرصہ ہوا برٹش ایسوسی ایشن مین ایڈریس دیتے ہوے فرمایا تھا کہ "ہر جاندار کی ذی جان ساختون کا جزو لاینفک پروٹوپلازم ہے"۔

ہکسلے نے انسائکلوپیڈیا بریٹانکہ مین "بیالوجی" کے عنوان پر مضمون لکھتے ہوئے کہا تھا "جاندار مادہ کی ابتدا کن اسباب سے ہوئی ہم کچھ نہین جانتے"

ڈاکٹر سر ایڈورڈ شیفر نے ۱۹۱۲ء مین ابرڈین کی برٹش ایسوسی ایشن کے سالانہ جلسہ مین زندگی کی ابتدا سے بحث کی اور اسے کیمیائی طریقہ سے پیدا کرنے کی توقع ظاہر کی تھی۔ مگر یہ انکی شخصی راے ہے۔ اس کے متعلق یورپ اور امریکہ کے اخبارات مین بڑی لے دے ہوئی عالمون نے اتفاق سے بیان کیا کہ زندگی پیدا کرنا سائنس کے امکان سے بعید ہے۔ مسئلہ ارتقا والے کہین گے کہ بے جان مادہ سے عمل ارتقا کے وسیلہ سے جاندار عنصر پیدا ہوا مگر یہ صرف گمان ہی گمان ہے۔

(۲) من کی ابتدا — زندگی کی ابتدا کی طرح عقل و ذہانت کی ابتدا کا معمہ بھی لاینحل اور ادق ہے۔ من اور شعور کیسے وجود مین آیا؟ اسکی علت فاعلی کیا ہے؟ اگر ہیکل کی طرح اسے مادہ کی لطیف صورت اور اسکی غیر مرئی حرکات کا نتیجہ تخیل مان لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہون گے کہ تمام فلسفہ اور بالخصوص فلسفۂ ذہنی کے جملہ اصول الٹ پلٹ ہو جائین گے اور فلاسفرون کے صدیون کے غور و فکر کے نتائج دریا برد کرنے پڑین گے۔ یہ قرین قیاس نہین ہے کہ محض خیال کے لئے ایک ہستی نے دنیا کو بنا دیا جو خود تخیل کی قوت سے بے بہرہ تھی۔ بقول لوٹس جاشہ عقلی کی یکسانیت اور اتحاد جس کے بغیر ہم اپنی ذہنی اور معنوی کیفیتون سے واقف نہین ہو سکتے اور نہ شعور ذاتی ذات کے مشاہدہ کا حصہ بن سکتی ہے ہمین مجبور کرتا ہے کہ ایک مافوق الحواس ہستی کے وجود پر ایمان لائین جو شہودات کا موضوع فطری بنتا ہے۔

قصہ کوتاہ عالم نہ صرف قائم ہے بلکہ قائم رکھا اور سنبھالا جاتا ہے۔ اس کے اجزا کے بے حد پیچیدہ اور الجھے ہوئے تعلقات ایک دوسرے سے اس طور پر متعلق ہین کہ نظام عالم مستقل اور غیر مبدل صورت مین قایم چلا آتا ہے۔ موجودات عالم توازن و مساوات آخری کی طرف مائل رہتی ہین۔ اب اگر کوئی قوت اولی اسکی ترمیم و ہدایت نہ کرے تو چارون طرف حرکت کی جگہ سکون نظر آئے اور یہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔

مل اور دیگر حکما کہتے ہین کہ علل فاعلی کا پورا علم ہماری عقل و قوائے ذہنی کی بساط سے باہر ہے۔ انکی ماہیت کا صحیح اندازہ ہم اپنے موجودہ علم سے نہین کر سکتے بلکہ ہماری عقل کی پرواز طبعی اسباب ہی تک محدود رہتی ہے۔ فاعلیت (EFFICIENCY) سے قطع نظر ہمین سبب ہی تک محدود رہنا پڑتا ہے۔

ان مسائل پر غور کرنے کے بعد ہمین ایک فاعل حقیقی عالم کے خالق اور موجودات کے مالک کی ہستی کی طرف رجوع ہو کر پروفیسر آل مین کے ساتھ ہمنوا ہونا پڑتا ہے کہ "تخیل اور مادہ کی مظاہر فطری کے درمیان نہ صرف کوئی مشابہت ہی نہین ہے بلکہ دونون کے درمیان کسی قسم کی بھی نسبت اور مشابہت نہین پائی جاتی"

(۳) حسن نظام عالم

یہ مضمون بڑا ادق اور طویل ہے جسکے گو پچھلی دو دلیلون پر بہت اختصار سے بحث کی تاہم بہت سی جگہ پر ہو گئی۔ اس لئے اب ہم اور بھی اختصار سے کام لینے کی کوشش کرین گے۔

موجودات قدرت پر نظر غائر ڈالنے کے بعد جو امر ہمارے ذہن پر گہرا اثر ڈالتا ہے وہ نظام عالم کی ترتیب اور قرینہ ہے۔ اصطلاح مین یہ دلیل (COSMOLOGICAL ARGUMENT) کہلاتی ہے۔ آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھو تو ہر جگہ نشان اور قاعدہ دکھلائی دیتا ہے۔ اگر نیچے زمین کے تختے پر نظر دوڑاؤ تو بھی حسن و خوبی ہر جگہ عیان ہے کہ دل اسے دیکھکر عش عش کرتا ہے۔ پھر دنیا کی چیزون کو لو۔ ایک ایک شے کی ساخت پر غور کرو کیسی باقاعدہ اور مزین ہے پھر تغیرات کو

کو دیکھو۔ سب اشیا ان کے تابع ہین اور نیک فرمانبردار لڑکون کی طرح ان نامعلوم غیر دیدنی اصولون کے مطابق عمل کرتی ہین۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی دیکھنے مین آتی ہے کہ موجودات مین باہم کہین تنازع اور جھگڑا نہین پایا جاتا۔ قانون اولے سے اترکر درجہ دوم کے قوانین مین جو ہر جگہ اپنے کام مین مصروف رہتے ہین۔

جو اتحاد و موافقت عالم مادیات مین پائی جاتی ہے اس کے مترادف علت غائی (ADOPTATION) عالم حیات مین نظر آتی ہے عالم نباتات اور اقلیم حیوانات دونون اس سے بہرہ یاب ہین۔ اس سے یہ مفہوم ہے کہ عضو ایک خاص کام انجام دینے کو بنایا گیا ہے۔ کسی جانور کے جسم کو لو یا کسی پودہ کی ترکیب پر غور کرو اس سے یہ صاف عیان ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص غرض کے لئے بنا ہے۔ اسکی تشریح کی چندان ضرورت نہین۔

مگر جب عالم مرئیات مین ترتیب، قانون، موافقت، ترقی، مقصد آخری اور علت غائی پاتے ہین تو فوراً اس سوال سے دوچار ہوتے ہین کہ کیا یہ سب آپ سے آپ معرض ہستی مین آئے؟ کیا ان کا محرک اصلی کوئی نہین ہے؟ بنئے کی دوکان پر ہر چیز قرینہ اور ترتیب سے موجود رہتی ہے۔ مگر بندر کے گھر مین یہ ترتیب اور سلیقہ عنقا ہے جس سے یہ ثابت ہے کہ ترتیب عقل کا خاصۂ فطری ہے عقل شخصیت پر دال ہے اور شخصیت کے لئے ارادت لازمی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نظام عالم ایک ذی عقل صاحب ارادت وجود مطلق کی ہستی کی طرف اشارہ کرتا ہے جسنے ایسے طور پر قاعدے وضع کئے کہ موجودات انکے مطابق اپنی حیات مستعار کے ایام مقررہ بسر کرتی ہین۔

(۴) علت غائی اور تجویز

چوتھی دلیل علت غائی اور تجویز سے ہے جسے اصطلاح مین TELEOLOGICAL ARGUMENT کہتے ہین۔ ڈاکٹر پیلے اسے ڈیزائن (DESIGN) کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ عالم اسباب کی تمام موجودات اور قدرت کے تمام ظہورات وغیرہ بلا وجہ واقع نہین ہوتے۔ انکا ایک خاص مقصد ہے اور اسے پورا کرنے کو وہ معرض ہستی مین آتے ہین۔ یہ علت غائی تمام عالم مین پائی جاتی ہے۔ کوئی حادثہ بلا وجہ نہین ہوتا۔ اسکی تہ مین ایک غایت پنہان ہے جو ذرہ ذرہ مین پائی جاتی ہے اور اس سے خدا کی ہستی کا ثبوت ملتا ہے۔ فرض کرو ایک سیاح ہمالیہ کے جنگلان مین ہفتون تک کسی آدم زاد یا انسانی بستی سے دوچار نہو اور پھر یکایک کسی پہاڑی کے دامن مین اسے کوئی غار یا چٹان مین کاٹا ہوا مکان نظر آئے اور وہ اسے اندر باہر سے خوب دیکھے تو فوراً اسے گمان گذریگا کہ یہ انسان کی صنعت ہے۔ اگر آگ وغیرہ اور گھر کا مختصر سامان بھی ہو تو اسے وہان پر انسان کی ہستی کا فوراً یقین ہوجائے گا وجہ کیا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ انسان کی حکمت اور قدرت کے تمام نشانات وہان پر موجود ہین۔ پھر وہ کیون اس کے وجود سے منکر ہو سکتا ہے۔ یا اگر کسی تباہ جہاز کے پسماندہ تختے پر بہتے بہتے کسی ویران اور غیر آباد جزیرہ مین جانکلین اور وہان پر انسانی بستی کا کھوج لگاتے ہوئے وہ کسی مکان کو دیکھین تو فوراً کہین گے یہ انسان کی کاریگری ہے۔ اسی طرح عالم موجودات کی ساخت اور ماہیت پر نگاہ ڈالنے سے وہ اس کے بنانے والے صاحب قدرت و حکمت خالق کا ثبوت ملتا ہے۔ تقریباً ایک صدی ہوئی کہ ڈاکٹر ولیم پیلے نے انسان اور حیوان کے اعضا کی ساخت اور ترکیب بغور دیکھکر یہ استدلال قایم کیا تھا کہ یہ اپنی ساخت مین کامل اور اپنے مقررہ فرائض کی انجام دہی مین وفادار اور ایک خاص اعلے مقصد سے بنے ہین۔ یہ محض اتفاق سے نہین بلکہ انسان اور حیوان کے پیدا کرنے والے کی علت غائی ہے۔ قدرت کے اندھ وسائل اور مقاصد

ہین جو ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہین اور یہ سب خدا کی ہستی پر شاہد ہین۔

(۵) شعور اخلاقی

پہلی چار دلیلون کا تعلق عالم اسباب سے ہے اسکی حالت اور ماہیت پر غور کرکے یہ نتائج اخذ کئے جاتے ہین اور وہ سب خدا کی ہستی پر دال ہین۔ اب انسان کی حالت ملاحظہ ہو یہ دلیل MORAL ARGUMENT کہلاتی ہے۔ ہماری اخلاقی فطرت خدا کی ہستی پر گواہی دیتی ہے ہم جب کوئی کام کرتے ہین تو اندر ایک قسم کی کشاکش ہونے لگتی ہے۔ ہم اپنے جنون کے افعال کی کبھی تعریف کرتے ہین، اور کبھی انھین قابل الزام ٹھہراتے ہین۔ یہ نیک و بد کی تمیز، نور ایمان، ضمیر ہے، جو ہمارے فعل کے حسن و خوبی قباحت و مذمت کی نسبت فیصلہ صادر کرتا ہے۔ علاوہ ازین ایک فطری احساس اسبات کا ہے کہ نیک اور مستحسن کام کرنا ہی انسانی فرض اولے ہے نیکی و بدی کا ایک معیار ہے، جسے مد نظر رکھنا پڑتا ہے۔ بلکہ قدرتاً ہم اپنے اعمال کا اس سے اندازہ کرتے ہین۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ حاسۂ اخلاقی کہان سے پیدا ہوا؟ اس کے ساتھ پھر حق اعلیٰ کا سوال وابستہ ہے۔ مجھے اسکی فرمانبرداری کرنا واجب ہے جو راستی و نیکی کا مصدر ہے۔ میری اخلاقی فطرت بھی اپنے اصلی مبدا کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ سلسلۂ لازم و ملزوم سے نیکی کا احساس ہمین ایک منبع ابدی سے منسوب کرنا پڑتا ہے

(۶) حاسۂ روحانی و ذکاوت طبعی

سب سے اخیر مین سب سے زبردست دلیل دی جاتی ہے جو وہبی یا ذکاوت طبعی یا حاسۂ روحانی کے نام سے مشہور ہے۔ ذکاوت فطری یا وہبی وہ خداداد قوت ہے، جس کے بغیر ہم کسی شے کی حقیقت کو نہین پہچان سکتے جب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ خدا کی ہستی کا علم ہماری فطرت مین ودیعت ہوا ہے تو اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ وہ اکتسابی علم نہین جو مشاہدہ اور تجربہ سے حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ فطرۃً ہماری روحانی فطرت مین موجود و مرکوز ہے۔ ہم بلا استدلال اس سے آگاہ ہین۔ کئی عالم اس باطنی شہادت کو کافی سے زیادہ قاطع و ساطع سمجھتے ہین باقی دلائل اس کے سامنے ہیچ ہین۔ ہر انسان کا دل خدا کی ہستی کا قائل اور اسکی موجودگی پر شہادت دیتا ہے اگر یہ باطنی گواہی نہو تو باقی تکلم استدلال او فلسفہ محض بیکار ہے۔ اس خداداد اعلے طاقت کے لئے ہمارا اکتسابی علم بھی زنزل ہے۔ ہمین اسکی معقولیت اور صحت کا یقین بھی اسی سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ طاقت ذکاوت طبعی یا ہدایت کے نام سے موسوم ہوتی ہے۔ اسی لئے یہ قوت ہر قسم کے علم کی صحت اور ثبوت کی اصل اور بنیاد مانی جاتی ہے۔ اس کے بغیر عقلی اور اخلاقی زندگی محال ہے۔ اس قوت کی شہادت یہ ہے کہ خدا کا عقیدہ ہر انسان کے دل مین جبلی او فطری ہے۔ دل مین اس کا احساس ہے

آیندہ ہم ہندو مسلمانون کا طریقہ استدلال دربارہ اثبات واجب الوجود پیش کرین گے اور پھر جدید سائنس کی روشنی مین خدا کی ہستی پر بحث کرکے بہت سی غلط فہمیون کو دور کرین گے جو نادانون کے دلون مین پیدا ہو رہی ہین کہ سائنس دان خدا کے منکر ہین۔

جے۔ آر۔ راے (اخرلسٹ۔ لاہو)

العصر

سائنس

سائنس سے کیا فائدہ! یہ امر مسلم ہے کہ ہمارا دینی اور دنیوی فائدہ تین قسم کی ترقیون پر منحصر ہے۔ دماغی، اخلاقی، اور جسمانی۔ یہ دونون ایک دوسرے کے ساتھ کسی حد تک لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہین۔ اگر کسی نے دماغی کو لیا اور جسمانی حفاظت کو چھوڑ دیا، یا جسمانی کو لیا، اور اخلاقی کی زیادہ پروا نہ کی تو اسکی زندگی کا مقصد اصلی کبھی پورا نہین ہو سکتا! اور بحیثیت ایک اشرف المخلوقات ہونے کے اپنے فرایض کو اُسنے ادھورا اور ناکمل چھوڑ دیا۔ تاریخ اور سوانحات ہمین بتاتے ہین کہ جتنی پاکیزہ اور بابرکت ہستیان یا جتنے جلیل القدر اور عالی ہمت لوگ گزرے ہین، جن کے وجود نے اور جن کے کارنامون نے مخلوق عالم کو فائدہ پہنچایا ہے انمین یہ تینون صفات ایک حد تک قدرتی طور سے موجود تھے اور ان کی ترقی اور حصول پر انہون نے اپنے تمام کامون کا انحصار سمجھا ہے اور ایک حد تک یعنی جہانتک ان کے ذرائع، گرد و پیش کے اسباب، اور اتفاقات نے اجازت دی ہے، وہ پورے طور سے بہرہ مند ہوئے ہین، اور اسی لئے اپنی کوششون مین بھی کامیاب رہے ہین۔

اب ہم ترقی کے ان تینون ذرائع کو یکے بعد دیگرے لیکر بتائین گے کہ سائنس کی تعلیم ہمین انکے اکتساب مین کہان تک مدد دے سکتی ہے۔

دماغی ترقی دماغی ترقی کے لئے واقفیت مفید کا اچھی طرح ذخیرہ ہو تاکہ بلند پروازی، خوش نظری، باریک بینی، اور شستگی ہمارے خیالات مین پیدا ہو؛ اور غور و فکر مین ایسی جلا ہو جائے کہ درست طریقون سے سوچنے سمجھنے اور ان سے صحیح نتائج نکالنے کا مادہ ہم مین پیدا ہو جائے، اور قوت ممیزہ اور قوت فیصلہ مین کسی قسم کی کمزوری باقی نہ رہے۔ سچی تعلیم سے یہی مقاصد منظور ہین اور اگر یہ نہین حاصل ہوے تو وہ تعلیم بالکل فضول اور ناکارہ سمجھی جائے گی۔ لٹریچر، تواریخ، ریاضی، اور فلسفہ وغیرہ کی طرف ہم اسی لئے متوجہ ہوتے ہین کہ ہمین ان دماغی ترقیون کے حصول مین مدد دین۔

پروفیسر ہکسلے اور دیگر عالمان سائنس کو یقین کلی ہے کہ یہ سب باتین محض سائنس ہی کی تعلیم سے ہمین حاصل ہو سکتی ہین اور اگر ہم سوائے سائنس کے اور کسی مذکورہ بالا علم کی طرف توجہ بھی نہ کرین تب بھی ہم اُن کل صفات سے بہرہ مند ہو سکتے ہین؛ بلکہ سائنس علاوہ ان کے اور ایسے صفات کا

پیدا کرنے والا ہے جو سوائے اُس کے اور کسی علم سے حاصل نہیں ہو سکتے۔

لٹریچر اور سائنس کا مقابلہ لٹریچر سے میرا مطلب شاعری ہے اور وہ حصہ نثر کا ہے جو ناول، ڈراما، قصہ کہانی وغیرہ کے پیرایے مین ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ جس طرح تہذیب و تمدن بڑھتا جاتا ہے، یعنی جسقدر زیادہ سائنس اور سائنٹیفک خیالات کی حکمرانی دنیا پر ہوتی جاتی ہے اُسی طرح شاعری مین کمزوری اور تنزل ہوتا جاتا ہے۔ یہی حالت آجکل ممالک یورپ کی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ تخیلات اور توہمات کسی طرح عقل و بینش پر غلبہ نہیں پا سکتے، اور اگر بقاے انوق کا مسئلہ اس کارگاہ عالم مین ٹھیک ہے جیسا کہ وہ برابر ٹھیک چلا آرہا ہے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ایک نہ ایک دن یہ قانون قدرت سائنس اور شاعری پر صادق نہ آتا۔ اس لئے ہم اندیشہ کرتے ہین کہ تنازع البقا سے مغلوب ہو کر ایک نہ ایک دن وہ بالکل ہی نیست و نابود نہ ہو جائے۔

اس مین شک نہین کہ شاعری نے نازک خیالیون اور بلند پروازیون مین بہت وسعت پیدا کر دی ہے، اور اس مین بھی شک نہین کہ لبا اوقات اس نے قومی جوش اور ہمدردیون کو ہیجان مین لاکر چند کارنمایان بھی کئے ہین۔ لیکن یہ سب فرعی باتین تھین حقیقت مین اسکی ترقی تمدن اور تہذیب کا کبھی باعث نہین ہوئی ہے اور نہ اسنے صداقت اور اصلیت کو اپنا شعار گردانا ہے۔ اور یہی حال ڈرامے اور بقیہ تمام لٹریچر کا بھی ہے۔ یہ اپنے دلکش حالات و واقعات سے ہمارے تجربے اور زندگی کے معلومات مین گو ایک گونہ زیادتی کرین، اور ہمارے تخیل کو بھی بہت خوشی اور مسرت بخشین لیکن لبا اوقات توہمات اور بطالت کے دریا مین ہمین لیجا کر ڈال دیتے ہین اور بہت سی بے اصل باتون پر خیالات قایم کر کے باطل پرست اور فضول پسند بنا دیتے ہین اور اسکی وجہ یہ ہے کہ ہمارے دماغ اُس راہ راست سے دور بھٹک جاتے ہین جس پر سچائی اور اسباب و علل کے راہنما کھڑے ہین اور تماشا گاہِ قدرت کے فلسفے سے بے خبر اور جاہل رہ کر ہم سے اصلیت اور حقیقت کی جستجو اور اسکی پسند کا مادہ بالکل سلب ہو جاتا ہے۔

سائنس کا مقابلہ لٹریچر سے صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک ہمارے تخیل کو خوش کر کے اسکو عارضی تندرستی بخشتا ہے اور دوسرا وہ ہے جسکی تندرستی دائمی ہے اور اس کا علم ضروری اور ناگزیر ہے۔ میرا مطلب اس سے یہ نہین کہ لٹریچر کو سائنس کے مقابلہ مین آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھنا چاہیے میرے نزدیک ضروری اور غیر ضروری کا فرق مدنظر رہنا چاہیے اور سائنس کی دوسرے علوم کے مقابلہ مین وہ حیثیت ہونا چاہیے جو ہمارے لباس کی ضروریات یعنی کرتے اور پایجامے کو اسکی غیر ضروری چیزون یعنی عبا اور قبا سے ہے جو صرف زیب و زینت اور خوشی کے لئے پہنے جاتے ہین اور نہ زیادہ ضرورت ہین۔ اُس شخص کو آپ کیا کہیے گا جو پایجامے اور کرتے کو فضول سمجھکر صرف زرین عبا و قبا سے ملبوس ہو جائے؟

تاریخ اور سائنس کا مقابلہ ہماری واقفیت اور معلومات دو قسم کی ہونی چاہیے اول اُن اشیاء کا علم جنکو ہم روزد یکھتے، چھوتے، اور سونگھتے، اور اُن سے لطف اُٹھاتے ہین؛ ان کی تعریف کرتے ہین؛ اُن کے اثر سے اثر پذیر ہوتے ہین، اور بالکل انھین مین اپنے کو گھرا ہوا پاتے ہین۔ یہ کل ہماری زندگی کے ساتھی ہین اور اس کا ایک جزو خاص بن گئی ہین۔ ہماری ہستی کے لئے انکا ہونا ایک امر ناگزیر ہے اور ہماری ذات کو بلا انکی مدد اور واقفیت کے کسی صورت سے مفر نہین ہو سکتا۔ اب دوسری قسم مین وہ باتین ہین، وہ لوگ ہین، وہ واقعات ہین جو زمانہ ماضی مین گذر چکے ہین۔ انکا نتیجہ ہمارا موجودہ تمدن اور طرز معاشرت ہے۔ اور وہ تمام قوانین و آئین ہین جن پر آجکل سوسائٹیون کا دار و مدار ہے۔ اس حد تک ضرور وہ ہمارے لئے کار آمد ہین لیکن ان واقعات کے تفصیلی حالات جو تواریخ اور سوانح کے نام سے عام طور سے یاد کئے جاتے ہین کسی طرح ہمارے لئے ایسے مفید نہین ہو سکتے جیسا قسم اول کی اشیاء کا علم ہو سکتا ہے اور نہ ہم اس طرح سے براہ راست اثر پذیر ہو سکتے ہین۔

ہمارا فرض اوّل یہ ہے کہ پہلے اپنی ذات سے متعلق باتون کا علم حاصل کرین اور بعد ازان دوسرے درجہ پر سوانح اور تواریخ کو دیکھین تو زیادہ حرج نہین۔ اس لئے یہان بھی سائنس اور تواریخ کا مقابلہ کرتے ہوئے بلحاظ ضرورتِ اوّل و دوم کا حکم دونون پر عاید ہوتا ہے۔

سائنس اور فلسفہ ان دونون مین بہت ہی کم فرق ہے۔ لفظ فلسفہ کے جو معنی عام طور سے سمجھے جاتے ہین اُنسے عموماً کتابی فلسفے کے اصول و فروع مراد لئے جاتے ہین۔ سائنس بھی تمام فلسفہ ہے۔ وہ فلسفۂ قدرت ہے، وہ کارگاہِ ہستی کی ایک جیتی جاگتی فلاسفی ہے، کیونکہ وہ صرف لکھے ہوئے کتابی اصولون ہی کے بحث و مباحثات سے تعلق نہین رکھتا اور نہ محض مسائل کے قیاسات اور خیالات کی وسعت پر اکتفا کرتا ہے۔ بلکہ ان سب کے ساتھ مشاہدے، تجربے، عمل، اور یقین کی مضبوط رسیون سے اپنے علم کو استوار کرتا ہے۔ اور اُسکی روشنی مین سچائی اور صداقت کو ڈھونڈھ کر نکالنا چاہتا ہے۔

اخلاقی ترقی اس مین شک نہین کہ مذہبی اثر اخلاقی درستی کے لئے ایک جزوِ اعظم ہے، تعجب ہے کہ بعض لوگ سائنس کو مذہب کا دشمن سمجھتے ہین اور ہیئت دان یا طبعیات وغیرہ کے جاننے والون کا شمار بدعقیدہ لوگون اور مرتدون مین کیا جاتا ہے۔ اس خیال کی بنیاد بالکل بے دلیل ہے اور اس کے پیرو محض اپنی تنگ خیالی اور ذاتی تعصبات کو راہ دے کر ایسے گمان قائم کر لیتے ہین۔ وہ کہتے ہین کہ سائنس دان "آزاد خیال" ہین اور قدرت کی ہر بات مین دلیل اور وجوہ نکالنا چاہتے ہین۔ اور اپنی عقل کو بڑا رہنما سمجھتے ہین" تاکہ خدا کی کائنات کو سمجھ جائین۔ حالانکہ اُسنے اسے اپنے بندون پر راز سربستہ کر کے اتارا ہے اور اس لئے اسکے کامون مین اپنی عقل کو دخل دینا کفر سے بھی بدتر ہے۔ مین اس "آزاد خیالی" کے الزام کو قبول کرتا ہون اور مانتا ہون کہ بے شک سائنس دان اس حد تک ضرور آزاد خیال ہین کہ وہ کارگاہِ ہستی کے کسی کرشمے کو فوق العادت یا راز سربستہ نہین سمجھتے۔ ان کا اس مسئلے پر بالکل اعتقاد نہین کہ خدا کی کائنات سمجھنے ہی کے قابل نہین ہے۔ بلکہ جو کچھ معلوم نہین ہو سکا ہے اسکو وہ اپنی کم مائیگی پر محمول کر کے پورا بھروسہ رکھتے ہین کہ علوم مین جس طرح ترقی ہوتی جائے گی اور جس طرح ذرائع وسیع ہوتے جائینگے اسی طرح وہ باتین بھی جو ابھی بالکل راز بستہ ہین کھلتی اور سلجھتی جائین گی۔ وہ اس امر سے بالکل انکار کرتے ہین کہ خدا کی مخلوق سمجھنے کے قابل نہین ہے۔ بلکہ اس خیال ہی کو وہ بنی آدم کے لئے قابل ملامت اور لایق مذمت سمجھتے ہین کیونکہ قادر مطلق نے جتنی چیزین ہمارے گرد و پیش بنائی ہین اُن مین اُسکی قدرت کے صدہا کرشمے جلوہ گر ہین۔ اسی لئے اُسنے عقل دی تاکہ اُنکے سمجھنے کی کوشش کرے۔ آنکھین اور کان دیکھنے اور سننے کے لئے عطا فرمائے۔ اب اگر اپنی تنگ خیالی کو راہ دے کر ہم اسکی گوناگون صناعیون کی طرف سے آنکھین پھیر لین اور اس کے چمنستانِ قدرت کے صدہا راگون کے سننے سے کان بند کر لین اور عقل کو معذور جانکر اُنکے سمجھنے بوجھنے کی کوشش نہ کرین تو فی الواقع یہ ایسا کفرانِ نعمت ہے جسکی مثال ملنا مشکل ہے۔ فرض کرو کہ ایک بے مثل صناع نے ایک نہایت ہی لاجواب عمارت بنا کر کھڑی کر دی ہے اور دیکھنے والا صرف باہر سے اُسکا نظارہ کر لیتا ہے مگر اُسکی اندرونی خوبیون سے بالکل بے خبر ہے۔ نہین جانتا کہ کیا کیا عجائب و غرایب صفتین اس کے اندر مخفی ہین اور کیا کیا دل آویز خوبیان اس مین موجود ہین۔ پھر بھلا وہ اپنے اس سرسری مشاہدے سے اس عالی قدر صناع کی دستکاریون کی کیا قدر کر سکے گا اور اس کے بے مثل تماشا گاہِ قدرت کی کیا داد دے سکے گا؟ مگر سائنس دان اسکو اپنا فرض سمجھکر ان باتون کو پورے طور سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسکی آنکھون کے سامنے ہر شجر، حجر، پھول، پتے، ذرے ذرے مین، اور کیڑے مکوڑون تک مین خدا کی حکمتون کے دفتر کے دفتر لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہین۔ سعدی صاحب فرما گئے ہین ؎

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

اُن سے نیچر کی تمام چیزین باقاعدہ، بااصول، اور باترتیب معلوم ہوتی ہین۔ وہ خدا کی چھوٹی سی چھوٹی مخلوق مین بھی وہی تناسب، وہی ترتیب اور وہی تسلسل پاکر حیران رہ جاتا ہے اور قوانین قدرت کے بے شمار مصالح مین ایسی تکمیل اور موزونیت پاتا ہے کہ خدا کی عظمت اور قدرت کا نقش کبھی اُس کے دل سے دور نہین ہو سکتا۔ مذہب بھی ہمین راستی سکھاتا ہے اور سائنس بھی ہمین صداقت اور سچائی کی راہ کی طرف لے جاتا ہے۔ پروفیسر کیسلے کا قول ہے کہ

علم کیمسٹری کا یہ بڑا قانون ہے کہ جب چند اجزا ایک دوسرے پر عمل کر کے نئے مرکبات ظہور مین لاتے ہین تو اُنکی ترتیب مین نہ کوئی ذرہ ضائع ہوتا ہے نہ زائد ہوتا ہے بلکہ ہمارے گرد و پیش زمین پر جسقدر کیمیائی انقلابات ہو رہے ہین ان مین وہی اجزا صدہا مختلف صورتین قبول کر رہے ہین مگر کبھی کسی حالت مین ایک ایٹم بھی کسی کا ضائع نہین ہونے پاتا اور نہ بڑھنے پاتا ہے۔ ایک تناور درخت جو سوکھ کر گر پڑا ہے اور بادی النظر مین بالکل برباد ہو گیا ہے، کبھی برباد نہین ہوا بلکہ اُس کے مرکبات اپنی ابتدائی اور اجزائی حالت مین آ گئے ہین، اور زمین مین ایک ایک ایٹم انکا محفوظ ہے۔ جب چھوٹا سا پودا اُگے گا تو زمین اُسکی پرورش کے لئے انھین اجزا کے مرکبات کو پھر واپس کر دے گی۔ علی ہذا جسم انسانی کا بھی مرنے کے بعد کبھی کوئی جزو یعنی ایٹم برباد نہین جاتا بلکہ وہ ہوا مین یا زمین مین محفوظ رہتا ہے اور نئے نئے مرکبات ظہور مین لاتا ہے جو بہت ممکن ہے کہ پھر دوبارہ کسی دوسرے جسم انسانی کی پرورش کا باعث ہو کر اس کے جزو ہو جائین۔

خدا کی حکمت کاملہ کا یہ قانون قدرت ایسا بدیہی ثبوت ہے اور اسکا اثر دلون پر اس قدر گہرا پڑتا ہے کہ واعظون کے وعظ کی کوئی حقیقت نہین۔ غرضکہ اسی طرح ہم جتنی چیزون پر نظر ڈالتے ہین وہ سبھی اُنکی قدرت کا زبان حال سے وعظ کہتی ہوئی معلوم ہوتی اور گویا زبان حال سے یہ کہتی ہین :-

اپنے قادر مطلق کی بے شمار حکمتون کو معلوم کرنا چاہتے ہو تو ہم سے آکر سبق حاصل کرو۔ موجودات کے ہر جزو اور حصے مین ترتیب و اصول کو دیکھو اور ان کی حقیقت کے اسباب و علل کو دریافت کرتے جاؤ کیونکہ جتنا تم اس کے رازہائے سربستہ کو وا کرتے جاؤ گے اُتنا ہی تمھین اس کی بے شمار حکمتون سے خبر ہوتی جائے گی۔ اور یہی اُسکی عبادت کا خاص منشا اور مقصد ہے۔ سائنس کی تعلیم انسان کی اخلاقی درستی کے لئے بھی نہایت موزون ہے۔ وہ اسکو صداقت شعار، راستی پرست، اور پاکباز بنا دیتی ہے۔ لارڈ روزبری نے اپنے ایک مضمون مین لکھا ہے کہ ہماری قوم کی اخلاقی اصلاح کے لئے بہت بڑی ضرورت ہے کہ ہمارے دلون مین سائنس کی تعلیم کا ایک شوق پیدا کیا جائے، کیونکہ اکثر لوگ جنھین مین دیکھتا ہون کہ بے کاری کے اوقات مے خانون، کلبون یا تھیٹرون مین گزارتے ہین اور ہزارون گناہون کے مرتکب ہوتے ہین، اگر موجودات نیچر کی دلفریبیون سے آگاہ ہوتے تو اپنے مشاغل کو ایسا گندہ اور فضول نہ بناتے، اور اوقات کی ایسی بے قدری نہ کرتے۔ بلکہ بے کاری کے وقت اُنکے خالی دماغون کو متوجہ کر لینے کے لئے جس طرف نظر اٹھا کر دیکھتے کوئی نہ کوئی شے موجود ہوتی۔ یا تو انکے اوقات کسی باغ کے خاموش گوشے مین کٹتے جہان کسی چشمے کے کنارے شیشہ اور چاقو ہاتھ مین لئے ہوئے بڑے شوق سے وہ کسی پھول یا پودے کے نادر نمونے کو ڈھونڈھتے پھرتے اور کسی پتی یا پھل کے عجیب و غریب ساخت پر گھنٹون بیٹھے ہوئے غور کیا کرتے، یا کسی سبزہ زار میدان مین سایہ دار درخت کے نیچے لیٹے ہوئے اپنے سائنٹفک خیالات کے مزے لیتے ہوتے، ہر نئے پھول کو انکی متجسس آنکھین بڑے شوق سے دیکھتین

اور اپنے مشاہدات سے وہ نئی نئی باتین اخذ کرتے اسطرح کہ یہ نباتات کے کس خاندان کا ہے؟ یہ کس فائدے کا ہے؟ اسکا کیا نام ہے؟ اس کے مختلف حصون کا ایک دوسرے سے کیا تعلق ہے؟ غرض اس قسم کے سینکڑون سوال صرف ایک پھول پیدا کرتا! یا اگر کسی پتھر کا کوئی عجیب ٹکڑا ہاتھ آگیا ہے تو اُسی جگہ بیٹھ گئے ہین اور سوچ رہے کہ یہ کس معدن سے نکلا ہوگا؟ اس کے اجزا کیا ہونگے؟ اسکی ظاہری علامات زمین کی کن حالتون پر دلالت کرتی ہین؟ یا اگر حیوانات سے شوق ہے تو وہ چھوٹے چھوٹے کیڑون کو اپنی خوردبین کے ذریعے سے دیکھ رہا ہے۔ ان کے اعضا کے افعال کے سمجھنے مین سرگردان ہے؛ اور یہ جاننا چاہتا ہے کہ اس مین دل و دماغ، ہاضمہ دوران خون سانس وغیرہ کے افعال کیونکر جاری ہین؟ اور انکا حیوانات کے کس خاندان یا کس قوم سے سلسلہ ملتا ہے؟ یا اگر کوئی ہڈی یا کھوپڑی پڑی ہوئی ملگئی ہے تو اسپر غور کر رہا ہے کہ یہ کس جانور کی ہوگی؟ وہ جانور حیوانات کے کس گروہ سے ہوگا؟ چرند، پرند، چوپایہ، انسان، یا کیا ہوگا! یا چھوٹی چھوٹی چیونٹیون اور شہد کی مکھیون کو جمع کرکے پرورش کر رہا ہے اور انکی حیرت انگیز عادات و خواص کو دن رات نہایت دلچسپی کے ساتھ دیکھکر نئی نئی باتین نکال رہا ہے۔ یا اپنی لیبوریٹری (کیمسٹری کے عملی امتحانات کرنے کی جگہ) مین بیٹھا ہوا مرکبات اور مفردات کی تحقیقات مین مشغول ہے۔ یا گرم موسم کی تبدیلی ہوئی ہے تو وہ اپنا تھرمامیٹر اور بیرامیٹر لئے ہوئے اس کے اسباب و علتون کے سمجھنے مین محو ہے اور اگر کوئی فوق العادت انقلاب واقع ہوا ہے تو جب تک وہ اسکی سمجھ مین نہ آجائے گا اُسے ایک سخت بے چینی دامنگیر ہوگی۔ رصدگاہ پر بیٹھا ہوا وہ سائنس کا فدائی اجرام فلکی کی نقل و حرکت کو دیکھ رہا ہے۔ رات رات بھر اُسے دوربین آنکھون سے لگائے گذر جاتا ہے۔ وہ اپنے عیش و آرام سبکو بالائے طاق رکھکر افلاک کے عجائبات پر غور کرتے اُسے مہینے اور سال گذر جاتے ہین اور جب کوئی تحقیقات کر لیتا ہے تو پھر اسکی مسرتون کا ٹھکانا نہین جسطرح بچے خوش ہوتے ہین، وہ اپنی فتحمندی پر پھولا نہین سماتا۔ اسکو کہتے ہین سچی بہادری، ایثار نفس، اور سچا استقلال۔ اسی کا نام ہے سچی خوشی اور اصلی عظمت و عزت۔ اگر وہ کسی غیر ملک مین جا کر اُترا ہے تو اسکی دلچسپیان بے شمار ہون گی۔ اس جگہ کے ہرنئے پودے ہرنئے جانور، اور وہان کی مٹی تک اسکی دلفریبی کے سامان پیدا کردے گی۔ وہ نئے حالات جمع کرکے علوم کے خزانہ مین زیادتی کرے گا اور وہان کے جمادات، حیوانات، اور نباتات کے علم سے اپنے ملک کو صدہا فائدے پہنچائیگا۔

سائنس کے سوا اور کسی دوسرے علم سے ہمین ایسی سچی اور دائمی خوشی کی امید نہ رکھنا چاہئے۔ اس کے مقابلے مین ہمین کوئی دوسرا علم ایسی وطن دوستی، استقلال، بے غرضی، اور بے تعصبی کا سبق نہین پڑھا سکتا۔

سائنس دان ایک سچا ہیرو ہے۔ جسکی تمام عمر نیک مشاغل مین بسر ہوگئی ہے۔ اپنے ابنائے جنس کی بے غرضانہ خدمت کے لئے اُسنے اپنی مدت العمر وقف کر دی ہے اور زندگی کا یہ منشا کہ "اطلبوا العلم من المهد الی اللحد" (یعنی بچپن سے مرتے دم تک حصول علم مین رہو) ایک بڑے فائدہ بخش طریق کے ساتھ پورا ہوا ہے۔

جسمانی ترقی ہماری صحت جسمانی کا دارومدار دو خاص باتون پر موقوف ہے۔ اول ہماری اخلاقی درستی پر؛ دوم قوانین صحت کی واقفیت اور انکی پابندی پر۔ ان دونون کا عمل بے کم و کاست ہر وقت اور ہر زمانے مین ہوتا رہتا ہے۔ کیونکہ حالت صحت مین اگر ان قوانین صحت پر ہمین وقوف نہین بھی ہے تب بھی ایک قدرتی خیال انکی پابندی کی طرف لگا رہتا ہے۔ مگر جہان انسان اپنی نادانی کی وجہ سے انسے بے خبر ہو کر حد سے متجاوز ہو جاتا ہے تو بس طرح طرح کی مصیبتون مین اپنے کو مبتلا پاتا ہے۔

ایسی بہت سی مثالیں ملینگی کہ ذرا سی اخلاقی لغزش نے کل زندگی بیکار کردی اور ایسے مہلک امراض نے گھیر لیا جن سے چھٹکارا پانا دشوار ہوگیا اسی طرح قوانین صحت کے نہ جاننے سے جو غلطیان و نادانیان ہوتی رہتی ہین انکی ہمیشہ یقینی سزائین ملتی رہتی ہین اور کتنے ایسے لوگ ہین جو حفظ صحت سے ناواقفیت کی وجہ سے قبل از وقت لقمۂ اجل ہوگئے ہین۔ اگر وہ اپنے اعضا کے افعال و خواص اور مختلف اشیا اور عادات کی مضرت رسان تاثیرون سے واقف ہوتے تو یقیناً ان کی زندگی زیادہ آرام، زیادہ چین، اور زیادہ خوشی کے ساتھ بسر ہوتی ہے۔ سائنس کی وہ شاخ جو اعضا کے افعال و خواص، بیماریون کی شناخت اور حفظان صحت کے طریقون کا ذکر کرتی ہے، اسکا علم کم و بیش ہر شخص پر فرض ہے جس طرح مغربی تہذیب و تمدن بڑھتا جاتا ہے اسیطرح لوگون کو اپنے حالات سے زیادہ خبر ہوتی جاتی ہے اور وہ صحت جسمانی کے اصولون کو سمجھتے اور عمل کرتے جاتے ہین اسلئے اُن کی دماغی حالتون، خانگی اور ملکی مسرتون مین نمایان ترقی ہوتی جاتی ہے۔ صدہا بیماریان اور عوارض اب یورپ سے ناپید ہوگئے اور لوگون کی جانین اور انکی زندگی کو زیادہ قایم رکھنے کی ہزارون تدبیرین عمل مین لائی جاتی ہین جن کے نتائج بخوبی اپنا عمدہ اثر پیدا کرتے ہین۔ یہ تمام باتین سائنس کی بدولت ہین اور اُسی کے بابرکت نتائج ہین۔ سائنس کی تعلیم پر تمام موجودہ تہذیب و تمدن کا دار و مدار ہے کیونکہ تجارت، صنعت و حرفت، دولت، فارغ البالی، فلاح اور قومی عروج سب اسکی ذات سے وابستہ ہین۔ مین اسکو بالتفصیل بیان کرنا چاہتا ہون۔

علم کیمسٹری صنعت و حرفت مین بلا اس کے جانے ہوئے عمدہ ترقی نہین ہوسکتی ایک مشہور شخص کا قول ہے کہ ملکون کی دولت کا اندازہ صرف یہی دیکھکر ہوسکتا ہے کہ ان مین گندھک کا تیزاب کس قدر بنتا ہے اور اُس کا کس قدر خرچ ہے کیونکہ قریب قریب ہر صنعت و حرفت مین اسکی ضرورت ہے۔

علم طبعیات ریلوے، تار، کلین، انجن، چکیان، جہاز وغیرہ سب اُسی کے اصولون پر چل رہے ہین۔ ظاہر ہے کہ جو قوم اس سے بے خبر ہوگی وہ کس قدر پست حالت مین ہوگی کیونکہ بلا انکی مدد کے نہ دولت مین، نہ تجارت مین، نہ خوشحالی مین کوئی ترقی ہوسکتی ہے۔

علم نباتات زراعت اور باغبانی کے لئے اس کی سخت ضرورت ہے۔ مزید بران ادویات کی شناخت اور انکی تجارت سے منفعت حاصل کرنے کے لئے اس کا علم ضروری ہے۔

علم الارض معدنیات و جمادات مختلف پتھرون کی شناخت، مختلف معدنون کا پتہ لگانا، ہیرے اور دیگر جواہرات کے معدن کی جستجو کرنا اور سب سے زیادہ کوئلے، لوہے، چاندی، اور دیگر معدنیات سے فائدہ اُٹھانا اور اپنے ملک سے اُنکو ڈھونڈھ نکالنا، یہ تمام باتین ملکی دولتمندی اور خوشحالی کو بہت بڑھانے والی اور اُس کی ترقیون کے لئے جزو اعظم ہین۔ اسی طرح تمام نام سائنس کی ہر ایک شاخ کے صدہا ملکی اور ذاتی فوائد بیان ہوسکتے ہین جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسکے علم حاصل کرنے کو اب ایک امر ناگزیر سمجھنا چاہئے کیونکہ اُسی پر کل تمدن اور انسانی بہبودی کا دار و مدار ہے۔

سائنس کو کس طرح سیکھنا چاہئے ہندوستان مین سائنس کی بے قدری اور اس کے حصول کے ذرائع نہایت محدود اور ناکافی ہونے پر جب ہم خیال کرتے ہین تو سخت مایوسی پیدا ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی جب ہندوستانیون کی بدشوقی پر خیال کیا جاتا ہے اور انکو دوسری قومون کے مقابلے مین نہایت ہی پست حالت مین پاتے ہین تو ہماری مایوسی پر رنج و افسوس کا اضافہ ہوجاتا ہے۔ اہل ہند کو تعلیم سائنس کی اشد ضرورت ہے۔ نہ صرف اس لئے کہ وہ اس کے ذریعے سے اپنی قومی تہذیب اور فلاح مین ترقی کرین گے بلکہ اسلئے

بھی کہ وہ بلا اُن علوم مغربی کے سیکھنے کے اپنے دماغون سے کسی طرح اُس کثافت کو دور نہین کر سکتے جسمین چند گذشتہ صدیون نے تعصب، توہمات اور باطل پرستیون کا خمیر ملا دیا ہے۔ انکے دلون مین قوانین قدرت کے مظاہر سے، ان کے اسباب و علل سے، اور ہر ایسے صحیح غور سے جسمین عقلی دلائل کا تسلسل ہو، ایسی بد اعتقادی اور اجنبیت ظاہر ہوتی ہے کہ ایک زمانہ چاہئے جب جاکر کوئی سخت اصلاح انکے دلون مین علوم کے انس پیدا کرنے کے قابل ہو سکے گی۔ مین دیکھتا ہون کہ کتنی ایسی جدت پسند طبیعتین اور عالی قابلیتین فضول اور غیر ضروری مشاغل سے شوق کرکے اپنے جوہر ذاتی کو ہاتھ سے کھو بیٹھتی ہین جس سے انکی ذات سے کوئی مفید نتیجہ نہین حاصل ہوتا۔ کتنے ایسے لوگ ہونگے جن کے دماغ نہایت سائنٹفک واقع ہوئے تھے لیکن اپنی اس خداداد قابلیت کو کبھی انھون نے سیدھے راستے پر نہین لگایا اس لئے انکے شوق مردہ ہو گئے اور اگر کچھ شمہ باقی بھی رہا تو اسکو طرز تعلیم کے غیر موزون اور نامناسب ہونے نے بالکل ہی مٹا دیا۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ ہماری موجودہ تعلیم کو ان تمام خرابیون کا ملزم گرداننا چاہئے۔ یورپ و امریکا مین علوم و فنون کی اس لئے روز افزون ترقی ہے کہ وہان سائنس کی تعلیم ایک نہایت ضروری مضمون سمجھکر نصاب مین داخل کی گئی ہے اور قومی و ملکی ہمدردی ہمیشہ اسکی ترقیون کی حامی و مددگار رہتی ہین۔ مگر ہندوستان کی حالت بالکل ہی جدا ہے۔ یہان کے کل کالجون مین نہ تو کافی سرمایہ ہے کہ یورپ سے لایق پروفیسر بلا سکین اور پورے طور سے اس کے لوازمات بہم کر سکین اور نہ یہان ملکی اور قومی ہمدردی ہے کہ سائنس کی تعلیم عام کرنے کی کوشش کیجائے اور اسکے بڑھانے اور سکھانے مین آسانیان پیدا کی جائین۔ سائنس کی تعلیم بلا مشاہدے اور تجربے کے کسی طرح نہین ہو سکتی۔ کتابی باتین جب تک عملی طور پر نہ دیکھی جائینگی تب تک نہ وہ باتین ذہن مین قائم رہین گی، نہ اُن سے کوئی دلچسپی پیدا ہوگی۔ اصولی اور تجربی حالات کی عمل اور بدیہات سے تشفی ہونی چاہئے ورنہ سائنس کی تعلیم سے نصف بھی فائدہ نہین حاصل ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ ہمارے ملک مین ایسے کالج کسقدر کم ہین اور جو ہین انکی کم مائیگی قابل اعتراض ہے۔

سائنس کی تعلیم کب حاصل کرنا چاہئے

سب سے عمدہ زمانہ آغاز عمر ہے کہ بچپن ہی سے دماغ انکی پرورش پر لگائے جائین اور ہم اپنے بچون کو سائنس کی آسان آسان باتین اس دلچسپی کے ساتھ بتائین کہ کبھی وہ ان کے دل سے محو نہ ہون اور انکا شوق بڑھتا رہے۔ اس کے لئے یا تو اسکول چاہئین یا مائین تعلیم یافتہ ہون لیکن ابھی ان دونون باتون کی عملی حیثیت سے کوئی قوی امید نہین ہو سکتی۔ اس لئے بہتر ہے کہ ہم اسکو کسی آیندہ زمانے کے لئے چھوڑ دین۔ موجودہ تعلیم یافتہ نوجوانون کو علم سائنس کی ضرورت بالکل مدنظر رکھنا چاہئے اور زمانہ کی روش کو دیکھکر کہ ہر طرف سائنس کی پکار ہے اپنے اوقات عزیز کو بھی سائنس کے مقابلے مین دیگر علوم کی تحصیل مین رائگان نہ کرنا چاہئے۔ مگر جو حضرات اب زندگی کے جھگڑون مین ایسے پھنس گئے ہین کہ باضابطہ علم حاصل نہین کر سکتے انکے لئے مین آخر مین صرف اسیقدر عرض کرنا مناسب سمجھتا ہون کہ اگر وہ خاص طور پر اسے حاصل کرنے سے معذور ہین تو اپنے اوقات غیر ضروری مین ہر قسم کی کتب بینی پر نیچر کی واقفیت کو ترجیح و فوقیت دین۔

لطافت حسین خان

العصر

انتہائے سائنس

گذشتہ صدی عیسوی کی ابتدا سے سائنس نے اس قدر حیرت انگیز ترقی کی ہو اور حقائق قدرت اس برق رفتاری سے سائنس کی جادو نما تحقیق کے سامنے حضرت انسان کو منکشف ہو رہے ہین کہ بادی النظر مین خیال پیدا ہوتا ہو کہ سائنس اپنے معراج کمال کی انتہائی منازل کو عنقریب پہنچ جائیگی۔ ہمارا مقصد اس مضمون کی اشاعت سے اس غلط فہمی کا ازالہ کرنا ہو۔ سائنس نے فی الواقع انسانی علم کو بے انتہا وسعت دی ہو لیکن بعض مسائل ابھی تک بالکل سائنس کی دسترس سے باہر ہین اور جب تک سائنس ان مسائل کو طے نکرے ہم ہرگز سائنس کو مکمل مجموعۂ معلومات کہنے کے مستحق نہین ہین۔ جو لوگ جانتے ہین کہ سائنس نے کن کن مسائل پر روشنی ڈالی ہو انکو خوب معلوم ہو کہ ابھی بہت سے مسائل سائنس کے حدود مین بھی نہین آئے۔ آپ ترکیب مادہ ہی کو بغور سوچئے۔ بیشمار کتب یوروپی زبانون مین اس مبحث پر شائع ہو چکی ہین لیکن سب کا ماحصل یہ ہو کہ مادہ کے متعلق کسی اصلی بات کا پتہ نہین لگایا جا سکتا۔ مادہ کی ترکیب صرف دو طور پر بیان کی جا سکتی ہو۔ چونکہ اس مضمون پر حال ہی مین جدید انکشافات نے بہت سی نئی روشنی ڈالی ہے ہم چاہتے ہین کہ ناظرین کو اس اجمال کی تفصیل سے آگاہ کر دین۔

قاعدہ کی بات ہو کہ انسان ان باتون کے متعلق جو اسکے روزمرہ کے مشاہدہ مین آتی ہین اور جن سے اکثر اُسے واسطہ پڑتا ہو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ تحقیق اور تفتیش کرتا ہو۔ مختلف اشیا کو اپنے گرد و پیش دیکھکر شروع ہی شروع مین انسان کو جستجو پیدا ہوئی کہ مادہ کی خواصیات خاصہ کی کسی معقول پیرایہ مین تشریح ہو سکے۔ سب سے اول یہ خیال پیدا ہوا کہ مادی اشیاء نہایت ہی چھوٹے ذرات سے مرکب ہین۔ اس خیال کا موجد دیا قطریس تھا جو آج سے ڈھائی ہزار برس قبل انہی سخت ذرات کی توصیف بیان کر چکا ہو۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ذرے اور چھوٹے ذرات مین منقسم نہین ہو سکتے اس لئے ذرات دیا قطریس کو بعد ازان اجزاے لا یتجزی کہا گیا۔ نمک پانی مین ڈالیے دونو اشیا مل کر ایک جسم ہو جاتے ہین اور حجم مین بالکل

اضافہ نہین ہوتا سخت سے سخت جسم مین بھی نوکدار میخ ٹھونکی جا سکتی ہو۔ اس قسم کے مختلف مشاہدات اور تجارب سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہو کہ ذرات کے درمیان خالی جگہین بھی ہوتی ہین۔ فلارنس کے فلسفیون نے زمانہ قدیم مین اس امر کے متعلق اپنا اطمینان اسطرح کیا تھا کہ انھون نے سونے کا ایک مجوف کرہ بنایا اور اس مین پانی بند کرکے کرہ کی جسامت کو نہایت زبردست دباؤ سے کم کرنا چاہا۔ فی الاصل ان فلسفیون کا منشا اس بات کی تحقیق کرنا تھا کہ پانی دباؤ سے حجم مین کم ہو سکتا ہو یا نہین؟ لیکن تجربہ کا طریقہ غلط ہونے کی وجہ سے انھین یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ سونا جس کو سب اشیاء سے زیادہ ٹھوس اور سخت سمجھا جاتا تھا وہ بھی مسامدار ہو۔ لیکن اس کے ذرات کے درمیان خالی جگہین ہین۔ گیسون کی حالت مین یہ تجربہ نہایت آسان ہو۔ اگر ایک بند منھ والے بہت بڑے برتن مین جس مین سے آلۂ اخراج الہوا سے ہوا خارج کر دیگئی ہو کوئی گیس مثلاً ہائیڈروجن یا کلورین تھوڑی سی مقدار مین بھی داخل کر دی جائے تو وہ قلیل مقدار گیس کی برتن کے سب حصون مین یکسان پھیل جاتی ہو۔ اگر اجسام ذرات سے مرکب ہین اور انکے ذرات کے درمیان کوئی خالی جگہ نہین تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہو کہ قلیل مقدار گیس ایک بہت بڑی جگہ مین پھیل جائے۔

حاصل کلام۔ دیما قریطس سے لیکر انیسوین صدی عیسوی تک یہ مسئلہ سالمات یعنی ایٹامک تھیوری سائنس مین ایک مسئلہ تھیوری رہی تھی۔ بیسوین صدی کے شروع مین ریڈیم کی دریافت کے بعد اور برقی رو (Electric Current) کے خواص کے مطالعہ سے جبکہ برقی رو انابیب[1] خلائی مین گذاری جاتی ہو بہت سی ایسی باتین ثابت ہوئین جنکی تسلی وہ تشریح مسئلہ سالمات کی بنا پر کرنی ناممکن تھی اب سائنس دان اس امر پر مجبور ہین کہ ذرات کو غیر منقسم نہ مانین بلکہ تازہ ترین قیاس جو کہ نظریہ برقیہ (Electron Theory) کی شکل مین ظاہر ہوا ہو یہ ہو کہ مادی ذرات (Atoms) برق سالبہ یعنی Negative Electricity کے نہایت ہی چھوٹے اور ننھے ننھے ذرات سے مرکب ہین۔ اگر مین آپ کو بتاؤن کہ ایک پانی کے قطرے مین اربہا مادی ذرات ہوتے ہین اور ایک مادی ذرہ بھی ہزارہا برقی ذرات سے مرکب ہوتا ہو اور پھر آپ کو یہ بھی بتاؤن کہ موجودہ سائنس نے اس قدر حیرت انگیز ترقی کی ہو کہ ہر ایک برقی ذرہ اور مادی ذرہ کا حجم اور وزن ہم کو معلوم ہو تو آپ ضرور شروع مین میری بات کا یقین نہ کرینگے لیکن اگر مین آپ کو ایک مثال سے ان ذرات کا صحیح اندازہ کرا دون تو شاید آپ کا تعجب اور بھی زیادہ ہو جائیگا۔ لارڈ کیلون ایک نہایت قابل اور زبردست سائنس دان ہو گزرا ہو۔ اُسنے ایک دفعہ تقریر کرتے ہوئے سامعین کو مادی ذرات کا حجم اور وزن سمجھانے کیلئے یہ مثال دی تھی۔ فرض کرو کہ پانی کا ایک قطرہ زمین کے برابر بڑا کیا جاتا ہو[2]۔ اور اس قطرہ کے ذرات اس تناسب سے حجم مین بڑھتے ہین تو اس زمین کے برابر بڑے قطرے پانی مین ذرات یعنی مالیکیول Molecules ٹینس بال کے برابر دکھائی دینگے۔

یہان یہ سوال پیدا ہوتا ہو کہ اگر سائنس نے یہان تک ترقی کی ہو کہ مادے کے چھوٹے سے چھوٹے ذرات تک کی ترکیب کا مطالعہ صحیح طور پر کر لیا ہو تو پھر مادہ فی الاصل کن اشیاء کا مرکب ہو۔ مانا کہ مادی ذرات برقی ذرات (Electrons) کا مجموعہ ہین لیکن یہ نہین معلوم کہ برقی ذرات یا وہ نامعلوم الہیئت طاقت جسے ہم لوگ عرف عام مین بجلی کے نام سے تعبیر کرتے ہین کیا ہو۔ بعض سائنس دان اس سے بھی آگے ایک قدم بڑھتے ہین۔ ان کا دعوی ہو کہ بجلی اس ایتھر سے پیدا ہوتی ہو جو فضائے بسیط مین پھیلا ہوا ہو۔ یہ تشریح اصلی مسئلہ پر بہت کم روشنی

[1] Vacuum Tubes جن کو بعض اوقات Giesslar's Tubes بھی کہا جاتا ہو۔

[2] یاد رہے کہ زمین کا قطر تقریباً آٹھ ہزار میل ہوتا ہو اور پانی کے قطرہ کا قطر زیادہ سے زیادہ انچ کا بارھوان حصہ ہو سکتا ہو۔

ڈال سکتی ہو اسواسطے کہ خود ایتھر کے متعلق ہماری معلومات نفی کے برابر ہین ہم اسے تول سکتے ہین نہ چھو سکتے ہین نہ سونگھ سکتے ہین کسی حس سے اسکا پتہ نہین لگا سکتے اور نہ ہی کوئی اور سیدھا ذریعہ اس کے خواص کو مطالعہ کرنے کا ہمین معلوم ہو۔ ہم چونکہ یہ بات مانتے ہین کہ نور (Light) ایک طرح کا تموج ہو اور تموج کے لیے ضرور کوئی ایسی چیز ہونی چاہیے جس مین تموج پیدا ہو سکے اس لیے اس شرط کو مان کر ہمنے نوری تموج کے میڈیم کو ایتھر کے نام سے ملقب کیا ہو۔ اب صرف یہ کہنے سے کہ بجلی ایتھر مین ایک طرح کی مڑوڑ (Strain) پیدا ہونے سے حاصل ہوتی ہو بجلی یا مادہ کے متعلق ہماری معلومات مین ایک ماشہ بھر بھی اضافہ نہین ہوا۔ ہان ایک لمحہ کے لیے اگر یہ بھی مانا جائے کہ بجلی ایتھر پر مخصوص طریقون سے عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہو تو بھی سوال یہ باقی رہتا ہو کہ ایتھر کیا ہو؟ کیسے حاصل ہوتا ہو؟ اور کس چیز سے بنا ہو؟۔

اس لمبی بحث سے ہمین چند ایک مفید مطلب نتائج حاصل ہوتے ہین۔ سائنس دان کا کام صرف یہ ہو کہ اشیاء اور حوادثات کو ایک خاص حد تک لفظون مین بیان کرے۔ وہ ہرگز اصلی اور حقیقی اسباب کی تحقیق نہین کر سکتا۔ اس کا دریافت کردہ سلسلہ علت معلول کبھی ختم نہین ہو سکتا پس ہماری رسائی صرف ثانوی اسباب یعنی Secondary Causes تک ہو سکتی ہو اصلی اسباب Primary Causes ہماری عقل و فہم سے بالاتر ہین۔ ہم چیزون کے متعلق کیون کا جواب دینے کی طاقت نہین رکھتے ہم یہ نہین بتا سکتے کہ مادہ مین یہ خواص کیون ہین؟ ہم صرف اتنا بتا سکتے ہین کہ یہ خواص اس طرح پر ہین زیادہ سے زیادہ ہم ایک نظریہ (Theory) قائم کرتے ہین اور کہتے ہین کہ چونکہ یہ خواص اس نظریہ کی رو سے صحیح طور پر سمجھ مین آسکتے ہین اس لیے یہ نظریہ صحیح ہو۔ باوجود اپنی تمام کوششون کے سائنس دان نہین جانتے کہ مادہ کا ایک ذرہ کس طرح بنا ہو؟ اور یہ مشکل ایسی ہو کہ باوجود اتنی ترقی کے سائنس دان اعتراف کرتے ہین کہ سردست یہ خیال بھی ان کے دماغ مین نہین آسکتا کہ مادہ کا ایک ذرہ کیسے بنا ہو چہ جائیکہ یہ دعویٰ ہو کہ ہم مادہ کا ذرہ بنا سکین جب یہ حالت ہو تو آفرینش عالم کے متعلق ہزار قیاس دوڑائے جائین سب کے سب محدود و غیر مکتفی ثابت ہون گے۔ ڈارون کا مسئلہ ارتقا بتاتا ہو کہ دنیا کی ترقی کس طرح ہوئی ہو۔ کس طرح چند سادہ قسم کے حیوانات سے ترقی کرتے کرتے موجودہ زمانے کے بیشمار مختلف الانواع چرند پرند وغیرہ مخلوقات پیدا ہوئے ہین۔ لیکن یہ بتانا صلب ترین اور ناممکن ہو کہ کس طرح سب سے اول "چند سادہ قسم کے حیوانات" پیدا ہوے۔

اس مقام پر پہنچ کر یہ بتا دینا لطف سے خالی نہ ہوگا کہ گذشتہ سال انگلستان کے سائنس دانون مین اس امر کی بل چل تھی کہ ایک صاحب مسئلہ حیات پر روشنی ڈالنے والے تھے۔ جس طرح مین نے مادہ کے متعلق بتایا ہو کہ وہ برقی ذرات وغیرہ نامعلوم الہیئت اجزاء سے مرکب ہے اسی طرح سائنس نے زندگی کے مسئلہ کے متعلق بھی بہت کچھ اختصار کی کوشش کی ہو مثلاً کثلۃ الاولیٰ (Protoplasm) اور سیلون (Cells) کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہو لیکن بحیثیت مسئلہ حیات اور روح کے اصلی حل کے متعلق ہنوز روز اول کا معاملہ ہے اور نہ ہی سائنس کو امید ہو کہ صدیون کے بعد بھی ایک ادنیٰ سے ادنیٰ کیڑا پیدا کر سکے۔

یہی مسئلہ ارتقا نظام عالم کے مختلف افراد کی خلقت کے متعلق بھی بحث کرتا ہو۔ کہا جاتا ہو کہ اجرام سماوی مثلاً ستارے سیارے آفتاب وغیرہ اجسام شروع مین گیسی (Gaseous) یا بخارون کی حالت مین تھے۔ صدیون کے انجماد سے موجودہ حالت پر آئے ہین ہمارے نظام شمسی کے متعلق یہ قیاس ہو کہ تمام سیارے فی الاصل

---

[۱] انگریزی اصطلاح مین ایسے جسم کو Medium کہتے ہین اردو مین ہمین کوئی اصطلاح اسکے مترادف نہین ملتی۔

آفتاب کے حصے تھے جو کسی وجہ سے علیحدہ ہو گئے اور جسطرح کہ لوہے کا ایک گرم گیند ہوا میں پڑے رہنے سے ٹھنڈا ہو جاتا ہو اُسی طرح یہ سیال کرے ٹھنڈے ہو کر منجمد ہو گئے ہیں۔ لیکن چونکہ آفتاب بہت بڑا ہو اسلیئے ابھی تک اس کی حرارت بغیر کسی قسم کی نمایان تبدیلی کے اسی درجۂ حرارت پر قائم ہو۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ آفتاب مین کونسی ایسی چیز ہو جس کی بدولت یہ آگ سے زیادہ گرم رہتا ہو پیشتر اس کے کہ مین حرارتِ شمسی کے مسئلۂ بقا پر چند خیالات ظاہر کرون مناسب معلوم ہوتا ہو کہ یہان حرارت شمسی کے متعلق چند اعداد بتا دون۔

مختلف دلائل سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہو کہ آفتاب ٹھوس نہین ہو بلکہ اس کا اندرونی حصہ مائع اور سیال ہو اور بیرونی حصہ پر جلتی ہوئی گیسون اور معدنی انجرون کے بادل ہین جو سورج کے گرد بمنزلہ زمین کے کرۂ ہوائی کے ہین۔ بہت سے تجارب کی بناء پر یہ اندازہ کیا گیا ہو کہ سورج کی گرمی ۶۰۰۰ سنٹی گریڈ درجۂ حرارت کی ہو جس سے مراد یہ ہو کہ اگر برف اور بھاپ کی گرمی کے درمیان ۱۰۰ درجے سنٹی گریڈ کا فرق سمجھا جائے تو آفتاب کی گرمی اتنی تیز ہو کہ اُسے ۶۰۰۰ سے تعبیر کرین گے۔ اگر آپ کو مختلف معدنی اور غیر معدنی اجسام کے پگھلنے اور کھولنے کے درجہاے حرارت کا اندازہ معلوم ہو تو آپ دیکھین گے کہ سورج کی گرمی مین سب ٹھوس جسم مائع اور ہوائی حالت مین ہین۔ سورج کی گرمی کا اندازہ ایک اور طریقہ سے بھی ہو سکتا ہو مختلف آلات کی مدد سے (جن کو مقیاس حرارت الشمس کہتے ہین) اس بات کا اندازہ لگانا کہ ایک مربع فٹ سطح زمین پر فی منٹ کس قدر حرارت پڑتی ہو چندان مشکل نہین ہو۔ لیکن ایک بڑی مشکل یہ ہو کہ ہمارے اور سورج کی گرمی کے درمیان ہوا کی ایک کثیف تہ ہو جو اس گرمی کا بہت بڑا حصہ یا تو جذب کر لیتی ہو یا فضائے بسیط مین منعکس کر دیتی ہو۔ بہرکیف یہ مشکل بھی حل ہو سکتی ہو اور پھر ہم صحیح طور پر اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہین کہ ۹ کروڑ ۲۴ لاکھ میل کی مسافت کے بعد ایک مربع فٹ پر کس قدر گرمی کی بارش ہوتی ہو۔ اب خیال فرمایئے کہ کرۂ زمین کی سطح کے ہر ایک مربع فٹ پر یکسان مقدار مین گرمی کی بارش ہوتی ہو اور پھر خیال فرمایئے کہ سورج زمین کا خاص طور پر لحاظ نہین کرتا کہ زمین کی جانب زیادہ گرمی بھیجے اور باقی اطراف مین کم بلکہ امر واقع یہ ہو کہ گرمی کی بارش سورج کی سطح سے تمام اطراف و جوانب مین یکسان ہو رہی ہو گویا سورج کو مرکز مان کر ایک وسیع دائرہ کے اوپر جسکا نصف قطر ۹ کروڑ ۲۴ لاکھ میل ہو ہر منٹ مین اسی حساب سے گرمی پڑتی ہو جس حساب سے کہ سطح زمین کے ایک مربع فٹ پر پڑتی ہو۔ اس سے پوری مقدار گرمی کی جو سورج کی سطح سے باہر کی طرف آتی ہو معلوم ہو جاتی ہو۔ اب اگر اس مقدار کو سورج کی سطح سے تقسیم کر دیا جائے تو فی مربع فٹ سورج کی سطح سے جتنی گرمی فی منٹ نکلتی ہو اُس کا اندازہ ہو سکتا ہو۔

صحیح تجربون سے نتیجہ نکالا گیا ہو کہ فی منٹ سطح زمین کے فاصلے پر تین کیلوری[1] گرمی پڑتی ہو جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہو اس دائرہ کا رقبہ جس پر اسی حساب سے گرمی پڑتی ہو (۲۲/۷ × ۹۲۴۰۰۰۰۰)۲ مربع میل ہو اور سورج کی سطح کا رقبہ (۲۲/۷ × ۴۳۳۰۰۰)۲ مربع میل ہو گویا کہ فی مربع فٹ سورج کی سطح فی منٹ ۳ × (۹۲۴۰۰۰۰۰/۴۳۳۰۰۰)۲ = ۴۶۰۰۰ × ۲۰۰۲ کیلوری نکلتی ہو۔ لارڈ کیلون نے اندازہ کیا ہو کہ اگر سوا مربع گز سطح سورج پر ایک برتن رکھا جائے اور اُس مین پانی کھولنے کے لیے ڈالا جائے تو فی منٹ جس قدر بھاپ اس برتن مین پیدا ہوگی اُس سے ۱۰۰ ہزار گھوڑون کی طاقت کے برابر کام لیا جا سکتا ہو۔ اب اگر اسی حساب سے تمام سطح

[1] ایک سیر پانی کو ایک درجۂ حرارت گرم کرنے کے لیے جتنی حرارت درکار ہوتی ہو اس مقدار کو کیلوری کہتے ہین۔ انگریزی زبان مین ایک اور کیلوری بھی مروج ہے جسے چھوٹی کیلوری کہتے ہین اور وہ بڑی کیلوری کا ہزاروان حصہ ہوتی ہو۔ ایک سیر پانی کو درجۂ حرارت سے جاپہنچ درجۂ حرارت تک گرم کرنے کے لیے سو کیلوری کی ضرورت ہوگی۔

سورج کی گرمی کی طاقت کا اندازہ لگایا جائے تو عقل کو سخت حیرت ہوتی ہے۔ بعض سائنس دانوں نے حساب لگایا ہے کہ اگر سورج محض کوئلہ بنا ہوا ہو اور یہ کوئلہ آکسیجن گیس کی مدد سے پورے طور پر جلایا جائے تب بھی جس حساب سے سورج میں سے گرمی خارج ہو رہی ہے اس حساب سے یہ کوئلہ کی آگ بہت تھوڑے عرصے میں جو چند ہزار سالوں سے زیادہ نہ ہوگا ختم ہو جائے گی۔ سائنس کے ذریعہ سے ہم کو معلوم ہے کہ سورج کی گرمی اسی طرح لاکھوں برس سے اسی حساب سے خارج ہو رہی ہے لہذا یہاں وہ نہایت اہم اور مہتم بالشان مسائل حل طلب پیدا ہوتے ہیں (۱) سورج کی گرمی کے ذخیرے کی بقا کن وجوہات پر مبنی ہے (۲) فی الاصل شروع میں یہ ختم ہونیوالا گرمی کا ذخیرہ کس طرح پیدا ہوا تھا۔ سائنس کی ترقی ملاحظہ ہو کہ ایسے ادق مسائل کا جواب بہم پہنچاتی ہے۔ وہ مسائل جو کہ قطعاً انسانی دسترس سے باہر ہیں۔ کہاں سورج اور کہاں چھوٹا سا انسان! لیکن خداداد دماغ کے کارنامے دیکھئے یوروپ والوں نے ایک بہت بڑی حد تک ان سوالات کا جواب بھی خاطر خواہ طور پر دیدیا ہے۔ اس تحقیقات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا ایک چھوٹے سے مضمون میں ممکن نہیں ہے۔ ہم یہاں صرف اشارات کے طور پر اس تحقیقات کے نتائج بیان کرتے ہیں۔

کسی زمانے میں پہلے یہ نظریہ قائم ہوا تھا کہ بیرونی اجسام کے گرنے سے اور ان کی رگڑ سے سورج کی گرمی بڑھتی رہتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا شہاب ثاقب جب زمین کے کرۂ ہوائی میں پہنچتے ہیں تو ہوا کی رگڑ سے جل اٹھتے ہیں اور ریزہ ریزہ ہو کر فنا ہو جاتے ہیں۔ اگر اسی طرح بیرونی اجسام کافی مقدار میں سورج کی سطح پر گرتے ہوں تو سورج کی گرمی کے نقصان کی تلافی ہو سکتی ہے لیکن مشاہدات سے ثابت ہوتا ہے کہ نظام شمسی میں اسقدر وافر مقدار میں ایسے مادی اجسام نہیں ہیں جو سورج کی گرمی کو اپنے صدموں سے قائم رکھ سکیں کیونکہ حرارت شمسی کے سالانہ خرچ پورا کرنے کے لیے اتنے مادی اجسام کافی تیزی کے ساتھ سورج کی طرف گرنے چاہئیں کہ ان کی مجموعی مقدار چاند کے برابر ہو جائے۔

اس کے علاوہ اور بہت سی تشریحات شمسی حرارت کے بقا کے متعلق پیش کیگئی ہیں لیکن وہ سب کی سب فی زمانناً متروک ہیں۔ لہذا ہم ان سے قطع نظر کرکے موجودہ زمانہ کے آخری اور اغلب قیاس کو جسے سب سائنس دان تسلیم کرتے ہیں بیان کرتے ہیں ایک جرمن سائنس دان ہیلم ہولٹز کے دماغ میں کیا ہی عمدہ خیال آیا۔ زمین کی کشش کی وجہ سے تمام چیزیں جو زمین کی سطح پر ہیں زمین کے مرکز کی طرف اس رفتار سے گرتی ہیں کہ ہر ثانیہ میں انکی رفتار میں ۳۲ فٹ کا اضافہ ہو جاتا ہے گویا ایک غیر متحرک جسم پہلے ثانیہ میں ۳۲ فٹ گرے گا۔ اسی طرح سورج کی کشش سے تمام جسم سورج کی سطح پر اس سے ۲۸ گنا زیادہ رفتار سے یعنی پہلے ثانیہ میں ۹۰۰ فٹ گریں گے۔ اس مقام پر ایک اور مسئلہ کا مختصر سا ذکر لازم آتا ہے۔ مالیکیولر تھیوری (نظریۂ اتصالی) کے مطابق اجسام کے ذرے ہمیشہ متحرک ہوتے ہیں اور ان کی حرکت کا نام حرارت ہے گویا جتنی تیزی کیساتھ جسم کے ذرے ہلتے ہوں اسی قدر زیادہ بڑھا ہوا اس جسم کا درجۂ حرارت ہوتا ہے۔ اب خیال فرمائیے۔ گرمی کے اخراج یعنی شمسی حرارت کے سالانہ خرچ سے، سورج کے مادہ کے ذرات کم تیزی سے حرکت کرتے ہیں لیکن سورج کی کشش کی وجہ سے یہ کمی پوری ہوتی ہے۔ یہ اجمال بہت لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئیگا۔ اس کی توضیح اسطرح بھی ہو سکتی ہے کہ اگر ایک جسم ایک خاص فاصلے سے نیچے گرے تو اسکے صدمہ سے جو اسکی حرکت کے رکنے سے پیدا ہوتا ہے خاص مقدار گرمی کی پیدا ہوتی ہے۔ سورج چونکہ مائع اور ہوائی گرم اجسام سے بنا ہے اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر ہر سال ٹھنڈا ہونے سے حجم میں جو کمی واقع ہوتی ہے اس سے سورج کا قطر صرف سوا دو سو فٹ گھٹتا ہو تو جو اجسام بیرونی سطح پر واقع ہیں انکے مرکز کی طرف گرنے سے اتنی گرمی پیدا ہو سکتی ہے کہ سالانہ خرچ کو پورا کر سکے۔ یہ سوا دو سو فٹ سالانہ قطر کی کمی اتنی قلیل مقدار ہے کہ

سورج جیسے بڑے جسم مین صدیون کے بعد بھی اس گھٹاؤ کا اثر ہمکو ہماری زبردست سے زبردست دوربینون کے ذریعہ سے بھی معلوم نہین ہو سکتا۔ اس لیے اس قیاس کی براہ راست تصدیق ہونا مشکل ہو لیکن چونکہ جو دلائل اس قیاس کے ثبوت مین پیش کی گئی ہین سب نقص سے مبرا ہین اس لیے کسی اور بہتر قیاس کے ہونے کی حالت مین اسے عام طور پر علمی دُنیا مین صحیح مانا جاتا ہو۔

اب ہمنے یہ تو ثابت کر دکھایا ہو کہ سورج کی گرمی باوجود اس قدر اصراف کے بھی کم ہونے سے محفوظ ہو۔ لیکن دوسرا سوال باقی رہجاتا ہو کہ شروع مین یہ گرمی کیسے پیدا ہوئی؟ اسکے متعلق زیادہ رائے زنی ابھی تک نہین ہوئی لیکن قیاس کیا جاتا ہو کہ اگر کرۂ زمین سے نصف قطر کے زمین کے مانند دو ٹھوس کرے ۱۹ کروڑ میل کے فاصلے پر واقع ہون اور بغیر کسی قسم کی مزاحمت کے وہ ایک دوسرے کے مرکز کیطرف کھنچ آئین تو شروع مین اِن کی حرکت بہت سست ہوگی لیکن چھ ماہ کے بعد وہ اسقدر زور کے ساتھ ایک دوسرے سے ٹکرائین گے کہ حرارت جو اس خوفناک صدمہ سے پیدا ہوگی سورج کی حرارت کے برابر ہوگی اور جو جسم صدمہ کے بعد اِن دونون کے اجتماع سے پیدا ہوگا وہ حرارت کی شدت سے سورج کے برابر ہوگا اور اس کی گرمی کئی کروڑ سال کے لیے سورج کی طرح کافی ہوگی اسطرح بعض سائنس دانون کا خیال ہو کہ ہمارے سورج کی بھی ابتدا ہوئی ہوگی کیونکہ اُنکے مشاہدات ثابت کرتے ہین کہ ستارون کی دُنیا مین نئے نئے سورج پیدا ہو رہے ہین جن کے یک لخت ظہور کی وجہ اسی طرح بیان کی جا سکتی ہو۔

یہ ہین حضرت انسان کے مزاج کی جولانیان لیکن سائنس ترقی کے باوجود یہ نہین بتا سکتی کہ وہ دو ٹکڑے جن سے سورج پیدا ہو سکتا ہو اُن مین کا ایک ذرہ بھی کسطرح پیدا ہوا؟ سائنس روح اور مادہ اور خلق عالم کے متعلق آج اسی طرح عاجز ہو جس طرح صدیون پہلے عاجز تھی کیونکہ جو آگے سائنس آج اتنی ہی دور ہو جتنی ہمیشہ رہی ہو گویا سائنس اِن انتہائی مسائل پر کبھی روشنی نہین ڈال سکی اور ہمارا یہ خیال ہو کہ کبھی بھی اِنپر روشنی نہین ڈال سکے گی اور اسی طرح ابد الاباد تک غیر مکمل رہیگی۔ البتہ سطحی معلومات ہم پہنچاتی رہیگی۔ ہمارے بعض ناظرین شاید اس مضمون کے مطالعہ سے ہماری اِن یاس آمیز توقعات سے اختلاف کرین۔

فیروزالدین مراد

علم النجابت[1]

چارلس ڈارون نے اپنی عمر بھر کی تحقیقات سے انسان کے جسمانی قویٰ کے نمو اور ارتقا کے تمام قوانین کو واضح کر دیا ہو اور اپنی وسیع اور کہنہ سال تحقیقات کے جملہ نتائج کو دو کتابون مین ظاہر کیا ہو انمین ایک تو "آغاز الانواع" ہو اور دوسری "انسان کی ابتدا کس طرح ہوئی"

---

[1] یہ لفظ یوجنکس (Eugenics) کا ترجمہ ہو۔ یوجنکس یونانی زبان کی اصطلاح ہو جو یوجنز سے نکلی ہو جس کے معنی "شریف زادہ اور نہایت معاشرتہ" مین۔ ڈاکٹر فرنسیس گالٹن نے ۱۸۸۳ء مین پہلے پہل اس کو استعمال کیا۔ اس کے ذریعہ سے اُنھون نے علم المعاشرت کے ایک جدید شعبہ کی بنیاد ڈالی اور اس کو ایک جداگانہ شعبہ علم سے موسوم کیا۔ اِس کا مقصد اُن اسباب و اثرات کی تحقیقات کرنا ہو جن کے طفیل سے بنی آدم کی جبلی خوبیون کی نشو و نما حد کمال تک ہو سکتی ہو۔ یا بالفاظ دیگر یون کہیے کہ نسل انسانی کی اعلیٰ درجہ کی اخلاقی، جسمانی اور ذہنی تربیت و ترقی اس نو ایجاد علم کا مقصود اولی ہو۔ اگرچہ علم النجابت کے حامیون مین کلی اتفاق نہین ہو کہ اس کے بنیادی اُصول کیا ہون۔ مگر عام طور پر قانون توارث اور حسبی اثر اسکی اصل ہین۔

جسین انسان کے پیٹ مین پڑنے اور مضغہ کے پرورش پانے اور پھر عالم موجودات مین ظہور پذیر ہوکر رفتہ رفتہ بڑھنے کا ذکر پایا جاتا ہے۔ اِن دونون کتابون کی اشاعت سے انسان کے علوم کی تاریخ مین ایک جدید دور کا آغاز ہوا اور بالکل نئے خیالات معرض وجود مین آئے۔ ارتقا کے دو مشہور اور معرکۃ الآرا اصولون کی اختراع بھی ڈارون کے نام سے ہمیشہ وابستہ رہیگی۔ ایک مشہور قانون نیچرل سیلکشن یعنی انتخاب طبعی یا فطری ہے جسکا مطلب یہ ہے کہ قدرت نے جن جانداروں کو زیست کے واسطے منتخب کیا ہے انھین اُسنے سامان بھی ویسے ہی دیے ہین اور جنھین وہ زندہ اور قائم نہین رکھنا چاہتی انھین اُسنے محروم کردیا ہے اور وہ تھوڑے ہی عرصے مین نابود ہوجاتے ہین۔ مگر وہ کسطرح ہلاک ہوجاتے ہین یہ عمل کیفیات یعنی اردگرد کے حالات اور اسباب کے ذریعے سے ہوتا رہتا ہے، اور یہ قانون نباتات اور جانداروں پر یکسان عائد ہوتا ہے کشاکش حیات یا جہد الحیوۃ کی طبعی صلاحیت جن جانداروں مین موجود نہین ہے وہ اسکا شکار ہوجاتے ہین دوسرا قاعدہ انتخاب زناشوئی (Sexual Selection) ہے یعنی جاندار اپنے حسب منشا اپنے واسطے نر اور مادہ منتخب کرتے ہین اور اس سے نوع یعنی اولاد کی جسمانی خوبیون مین تغیر اور ترقی ہوتی ہے انھین دونون اصولون کی بدولت بن مانس اپنی حالت بدلتے بدلتے آخرکار انسان بنگیا، جو اشرف المخلوقات اور خداوند خلقت کہلاتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ان ہر دو قدرتی اصولون کے عمل مین رخنہ اندازی کرنا مناسب ہوگا؟ اسکا جواب ہم پہنچانے سے پیشتر اسلاف کی تاریخ پر غور کرنا واجب معلوم ہوتا ہے انھون نے اس مسئلہ کو کس طرح حل کیا تھا اور اُن کے ہان افراد قوم کی جسمانی اور ذہنی تربیت اور ترقی کے لیے کیا انتظام تھا۔ تاریخ کے ابتدائی زمانہ مین ملک اسپارٹہ نے اپنی تمدنی ترقی اور ملک گیری کے لیے خاص شہرت حاصل کر رکھی تھی۔ اہل اسپارٹہ کا طرز معاشرت اور ملکی انتظام نہایت اعلی سمجھا گیا تھا۔ وہان لائکرگس نامے ایک نہایت مقتدر مقنن اور نہایت مشہور مدبر تھا۔ وہ سیاسیات کا ماہر اور موجد خیال کیا جاتا ہے۔ اس نے تربیت جسمانی کا ایک طریقہ وضع کیا تھا جسکی رُو سے ماں باپ اپنے کمزور اور ناتوان بچون کو جنگلون اور پہاڑون مین پھینکنے پر مجبور تھے تاکہ وہ بھوک پیاس سردی اور گرمی کی شدت سے ہلاک ہوجائین۔ اصلی مقصود یہ تھا کہ قوم کے درمیان دائم المریض اور نا تندرست افراد نہ رہنے پائین جو اُنکی قومی ملکی اور عام حالت کے زوال کے موجب ہوسکتے ہین۔ لائکرگس کے قانون کے مطابق پیدا ہوتے ہی بچہ شہر یونکی ذیل مین تصور ہوتا تھا۔ سرکار کی طرف سے اسکی نگرانی اور پرورش ہوتی جب جوان ہوجاتا تو اسکی جسمانی قابلیت اور طاقت کا امتحان ہوتا۔ اس غرض سے اسے ارتمس دیوی کے مندر مین لیجاتے اور کوڑے مار مار کر اسکی پیٹھ ہو جیر دیتے بیہوش ہوجانے مگر اُف تک نہ کرتے اور اس آزمائش مین پورے اُترنے والے "مشاہیر کے زمرہ" مین شامل ہوجاتے۔ اسکی روزانہ زندگی سخت قواعد کے تابع رہتی اور جب پورا جوان ہوجاتا اور شادی کرلیتا تو اسے خاص قانون کی پابندی کرنی پڑتی۔ لائکرگس نے سب سے زیادہ زور تربیت جسمانی پر دیا تھا اور اسکا انجام یہ ہوا کہ وہان نہایت قوی ہیکل اور توانا آدمیون کی قوم پیدا ہوگئی۔ مگر انکی عقلی اور اخلاقی تربیت کا کوئی خاص انتظام نہ تھا جسکی وجہ سے وہ نرے جفاکش دلاور سپاہی رہے اور ملک گیری مین نام پیدا کیا مگر اپنے ہمسائے یونانیون کیطرح علوم و فنون اور تمدنی لوازم کی ترقیون مین غیرفانی شہرت حاصل نہین کی اور نہ اپنا اثر اپنے اردگرد کی قومون پر ڈالا۔ مگر جیسا زرق سیس (Xerxes) نے یونان پر بیشمار فوج کے ساتھ حملہ کیا تو لیونیداس شاہ اسپارٹہ نے درہ طرا پلی مین صرف تین سو سپاہیون کے ساتھ اس بیقیاس لشکر کا مقابلہ کیا اور اسے ایک قدم آگے نہ بڑھنے دیا۔ ہان جب ایک بے ایمان غدار ملک کی غداری سے ایرانی لشکر دوسرے راستے سے گزرا اور اس جوان

مرد بھی بجز دستہ کے عقب پر جا پڑا تو ملک یونان کے ایک حصہ پر اُسکا تسلط ہو گیا۔

طب کے وسیلے سے بنی آدم کو بیحد فائدہ پہنچا ہے۔ سیکڑون امراض کی اصلیت ظاہر ہو چکی ہے اور انکے مختلف علاج بھی معلوم ہو گئے ہین۔ اسکے وسیلے سے انسان کو بہت آرام و آسائش پہنچ رہی ہے مگر یوجنکس یعنی علم النجابت کے وسیلے سے اس سے بھی زیادہ فیض پہنچنے والا ہے جن بیماریون سے بنی آدم کو تکلیف پہنچتی ہے اسکے ذریعے سے انکا استیصال ہو جائیگا۔ اہل اسپارٹہ نے تربیت جسمانی کے وسیلہ سے اس گتھی کو سلجھایا تھا۔ مگر اس کا ایک بڑا نقص یہ تھا کہ اسکے رُو سے جن کمزور بچون کو جنگل مین پھینک دیا جاتا تھا انمین کئی ایسے بھی ضرور ہونگے جو اگر زندہ رہتے تو انکی غیر معمولی لیاقت اور دانائی نہ صرف اپنی قوم ہی کے لیے مفید ہوتی بلکہ بنی آدم بھی مستقل فائدہ حاصل کرتے کیونکہ غیر معمولی ذہانت والے ہمیشہ توانا اور قوی ہیکل آدمی نہین ہوتے۔

اب علم النجابت کے مسائل کی طرف رجوع ہونا چاہیے۔ کس وسیلے سے انسان کی عقلی اور جسمانی قوتون مین ترقی ہو سکتی ہے؟ مرد و عورت کے تعلقات کیسے ہونے چاہئین؟ کیا مختلف نسلون کے مرد و عورت کی شادی اس مقصد مین معاون ثابت ہو سکتی ہے؟ تمدنی معاملات مین حکومت کو کس حد تک دست انداز ہونا چاہیے؟ اور اس مقصود کی کامیابی کا معیار کیا ہے جس سے معلوم ہو کہ اس وسیلے سے ایک جماعت کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچا ہے؟ ان سوالات پر یکے بعد دیگرے بحث کی جائے گی۔

شادی | شادی کا دستور نہایت پرانا اور واجب الاحترام ہے۔ اسے کچھ ایسے ادب کی نظر سے دیکھا جاتا ہے کہ بڑے سے بڑا رند بھی اسے ناپاک کرنے کی جرأت نہین کر سکتا۔ گھر کے اندر جو راحت و آرام انسان کو حاصل ہوتا ہے وہ روئے زمین پر کسی دوسری جگہ یا کسی دوسری حالت مین ہرگز حاصل نہین ہو سکتا۔ گھر اسکے خیالات کا مرجع اور اُسکے جذبات کا مرکز ہے۔ دُنیا کے دکھون اور تکلیفون سے بچنے کی پناہ یہی گھر ہے۔ یہان اسے کیسے کیسے تجربے حاصل ہوتے ہین جن سے وہ کسی، اور جگہ دوچار نہین ہوتا ہے۔ ہر زمانے کے شاعر اور فلاسفر گھر کی خوشیون کا چرچا کرتے رہے ہین۔ جا بجا میان بیوی اور مان باپ اور اولاد کے نازک و خوشگوار تعلقات کی تعریف کیگئی ہے، اور یہ مضمون ہمیشہ تازہ اور پُرلطف رہتا ہے۔ مگر زمانۂ حال کے تمدن کی ضروریات اور نمود و نمائش کی وجہ سے رہنے سہنے کے اخراجات کچھ ایسے بڑھ گئے ہین کہ شادی صرف امیرون کیلئے مخصوص ہو رہی ہے۔ معمولی لوگون مین یہ مقدرت کہان کہ وہ اس سے حظ اور خوشی حاصل کرین اور آرام و آسائش کی زندگی گزارین۔ نر و مادہ کے درمیان جو کشش باہمی موجود ہے وہ قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی ہے اور یہ کشش نسل بڑھانے اور قائم رکھنے کی موجب ہوتی ہے۔ اگر یہ نہو تو تمام جاندار حیوان اور انسان نابود ہو جائین۔ زناشوئی کے جذبات قدرت کے عطیہ ہین جنھین اگر ناجائز طریقے سے پورا کیا جائے تو انسان کو اسکا خمیازہ اُٹھانا پڑتا ہے اور قدرت کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

نہایت ابتدائی زمانے مین جب بنی آدم تمدن کے نہایت ابتدائی مراحل مین تھے تو عورت کو زبردستی پکڑ کر بیوی بنا لیا جاتا تھا۔ یہ کام صرف شہزور اور بہادر آدمی انجام دے سکتا تھا اور وہی اس سے مستفید ہوتا تھا۔ مگر جب اسنے شائستگی مین ترقی کر لی تو اسکے خیالات مین تبدیلی واقع ہوئی۔ تمدنی طریق مین بھی نمایان انقلاب ہوا۔ عورت کو پکڑنے کے بجائے انتخاب اور باہمی رضامندی سے باقاعدہ بیاہ ہونے لگا اور یہ ایک دستور قرار پا گیا۔ مان باپ کو اپنے لڑکے لڑکیون کے بیاہنے کا خاص اختیار مل گیا۔ اور انکی رضامندی اس معاملے مین ضروری قرار پائی۔ پروہت نے اپنی پروہتی کا اسمین بھی دخل دیا اور اسے ایک مقدس رسم مین منتقل کر دیا۔ اسنے یہان تک اقتدار حاصل کر لیا کہ جسمین وہ شریک نہوتا وہ کام واجب اور درست نہ سمجھا جاتا۔ مسلمانون اور مسیحیون مین قانون کے وسیلے سے شادی فسخ ہو سکتی ہے

اور میان بیوی کے تعلقات منقطع ہو سکتے ہین مگر ہندوؤن مین یہ نہین ہو۔لیکن علمی ترقی کے ساتھ ساتھ شادی کو اسکی مذہبی اہمیت سے خارج کرنے اور اسے بالکل ایک معاہدہ بنانے کا خیال پیدا ہو گیا ہو۔لیکن وہ زمانہ دور ہو جب مرد وعورت تھوڑے عرصے کیلئے ایک دوسرے سے تعلق پیدا کیا کرینگے۔لیکن جب کبھی ایسا دستور رائج ہوگا اسوقت نظام تمدن مین عظیم تغیر واقع ہوگا۔اسکی موجودہ صورت بالکل قائم نرہیگی۔گھر گھر نرہیگا بلکہ ایک قسم کا کلب ہوگا۔تعلقات زناشوئی بالکل کمزور ہونگے۔ماں باپ اور اولاد کے تعلق ہی برائے نام ہونگے۔مرد کے بجائے عورت کا درجہ ترقی پکڑیگا۔جسطرح اب عورت مرد سے ڈرتی رہتی ہو اُسوقت مرد خوف کھایا کریگا۔عورت کا جب جی چاہیگا کسی اور مرد سے تعلق پیدا کرلیگی اور مرد کو دوسری جگہ جانا پڑیگا۔زندگی کا کاروبار مرد کریگا۔عورت گھر کی ملکہ ہوگی اور وہ جیسا چاہیگی حکومت کرے گی۔جو عورتیں ماں بننے کے ناقابل ہونگی وہ اپنی اور مرد کی خوشنودی طبع کے واسطے زندگی بسر کرینگی۔افلاس عورتوں کو اُس رشتے سے باز نہ رکھے گا۔ویلز کہتا ہو "بچے جننا حکومت کی خدمت کرنا" اور زندہ رہنے کا جائز استحقاق ثابت کرنا ہو۔جو عورت ماں ہو یا جو ماں بننے والی ہو، وہ مشاہرہ، عزت، آزادی اور پرورش کی ویسی ہی مستحق ہو جیسا پولیس کا کانسٹبل" مگر ایسا خیال ہو جو صدیوں کے بعد پورا ہوگا۔

مختلف نسل کے لوگون کا ناطہ رشتہ - کیا دو مختلف نسلوں کے مرد وعورت کی شادی مصلحت آمیز ہو؟ اسکی بابت عالموں کے خیالات مختلف ہین۔ایک جاپانی مدبر نے چند برس ہوے ہربرٹ اسپنسر سے یہ مشورہ طلب کیا تھا کہ ہم جاپانیوں کی نسل بڑھانے کے لیے یوروپین قوموں سے شادیاں کرینگے خواہشمند ہین۔آپ کی کیا راے ہو؟ اسپنسر نے اس تجویز سے اختلاف کیا تھا۔یوروپ والے غیر نسلوں سے شادیاں کرنے کو تیار نہین ہین اور اسکی وجہ محض قومی گھمنڈ ہو۔وہ خود کو دوسرون سے برتر سمجھتے ہین اور اسلئے انسے شادی کرنے کے خلاف ہین۔آریہ قوم مین بھی یہ گھمنڈ تھا جب وہ وسط ایشیا سے نقل مکان کرکے جنوبی ملکون کو آئے اصل باشندون سے انہین نفرت تھی اور آج کے دن تک یہی بات پائی جاتی ہو۔مگر تاریخ سے یہ ظاہر نہین ہوتا کہ دو مختلف نسل کے مرد و عورت کی شادی سے بُرے نتائج نکلتے ہین۔انگریز تمدنی ترقیون مین سب قومون سے بڑھے ہوے ہین حالانکہ وہ کئی مختلف نسلون کا مجموعہ ہین صدیون کے اختلاط سے یہ قوم وجود مین آئی ہو لیکن نتائج خلاف توقع نہین نکلے۔اونچی ذاتون کے ہندوستانیون اور انگریزون کی رشتہ داریون سے کوئی برا نتیجہ برآمد نہین ہوا ہو۔مہذب آدمیون کو خواہ وہ کسی ملک و نسل کے ہون ایک نمونہ اور ایک ڈھنگ کا ہونا چاہیے مناسب نہین ہو کہ آرین، منگولین، ٹیوٹانی اور سمیاتیکی نسلین ایک دوسرے سے جُدا جُدا رہین مگر بعض قومین اپنے کو دوسرون سے افضل تر اور انکی حکمران سمجھتی ہین اسلئے وہ سب سے الگ رہنا پسند کرتی ہین لیکن جب ملک گیری کا خیال بالکل کمزور ہو جائیگا اور لشکر کشیان بند تو البتہ شاہ پرستی اور حکومت کے گھمنڈ کا خیال بھی مٹ جائیگا۔اسوقت ایسے لوگون کی ایک عظیم قوم ہوگی جو معمولی نسلی تعلقات سے پاک اور نہایت شاندار ہوگی۔وہ گھمنڈ اور غرور سے بیگانہ ہوگی۔خون کے رشتہ کی اتنی قدر دان نہین ہوگی جتنی فوائد کے اشتراک کی۔ویلز مشہور ناول نویس اس حالت کو کمالی تمدنی حالت قرار دیتا ہو۔

قرابت کی شادیان اگر اولاد مین کوئی خاص قسم کی خصوصیات پیدا کرنا چاہو، تو بہت قریبی رشتہ کے لڑکے لڑکی کی شادی کرنا چاہیے۔لیکن اگر اس اُصول کے عملدرآمد مین حد اعتدال سے تجاوز کیا جائے تو نسل بگڑ جاتی ہو۔بلکہ اسکے غائب ہو جانیکا اندیشہ ہو۔مسلمانون مین چچیرے بھائی بہنون کی شادی جائز ہو۔مگر اس سے جو نتیجہ نکلا ہو وہ بہت حوصلہ افزا نہین ہو۔قوی ہیکل اور قدر آور افغانون کی اولاد صدیون

بعد بونون مین تبدیل ہوگئی ہو۔ گو اس امر کو بھی مد نظر رکھنا چاہئیے کہ ہندوستان کی آب و ہوا کا جسم پر مضر اثر ہوتا ہو لیکن مسلمانون کے علاوہ اور قومین بھی تو ہین جن کی قوت جسمانی اور دماغی بدن کی تون سے آب و ہوا کے ناگوار اثر سے ان مین کوئی انقلاب واقع نہین ہوا ایسے چند اور بھی اسباب ہین جنھون نے افغانون کی نسل کو بگاڑ دیا ہو اور انمین سب سے بڑا چچیرے بھائی بہنونکی آپس کی شادی ہو۔ خالہ ماموں، پھوپی کی بیٹی سے بھی شادی روا سمجھی جاتی ہو اور اسکا فزیالوجیکل اثر نسلی زوال ہو۔

تمدنی معاملات مین حکومت کی دست اندازی جون جون تہذیب ترقی کرتی ہو انسان کی آزادی پر نئی پابندیان عائد ہوتی جاتی ہین جس سے مقصود فلاح عامہ ہو۔ مہذب حکومت کے زیر اثر رہنے والے آدمی بخوشی اپنی کو ازادی اسکے سپرد کر دیتے ہین اور اسکے قوانین و احکام کی بلاچون وچرا متابعت کرتے ہین۔ مگر تمدنی معاملات مین ریاست کی دست اندازی مناسب نہین تاکہ افراد بطور خود اپنی آنیوالی نسل مین جیسی خصوصیات چاہین اپنے حسب منشا پیدا کرلین مگر حفظان صحت کے قواعد پر عمل پیرا ہونا تمام وفادار شہریونکا فرض ہو جو حکومت انکے فائدے کیلئے وضع کرتی ہو اور جب موجودہ نظام تمدن برہم ہو جائیگا تو حکومت کو نئے قواعد وضع کرکے حق ملکیت وورثہ، مان باپ کی آمدنی مین اولاد کے حصے کے متعلق نافذ کرنے پڑینگے۔ حکومت کیلئے مناسب ہوگا اگر وہ شادی کی نسبت خاص قواعد جاری کردے تاکہ مرد و عورت قومی بہتری کی خاطر خاص مقصد سے شادی کرین۔ مگر گھر کے انتظام اور تعلقات زناشوئی مین حکومت کو کوئی دخل نہین دینا چاہیئے۔ سر دست یہ کہنا دشوار ہو کہ آئندہ زمانہ مین نظام مجلس کیا ہوگا۔ مگر رخ زمانہ سے اسکی نسبت کچھ خیال ہو سکتا ہو

مرد و عورت کے تعلقات آنے والے زمانے کے نظام تمدن مین مرد غالبًا زیادہ محنت اور مشقت کے کام کرینگے جیسے انتظام ملک، انجنیری، ریل کا انتظام، سپاہ، بحر و بر وغیرہ۔ معلمی اور ڈاکٹری، فنون لطیفہ، پوشاک تیار کرنا اور اسی قسم کے ہلکے کام عورتونکے سپرد ہونگے۔ زندگی کے تمام کاروبار مردون اور عورتون مین مساوی منقسم ہونگے گو اس سے یہ مراد نہین ہو کہ کوئی خاص کام مردون یا عورتون کے لیے مخصوص ہوگا۔ اس کا یہ انجام ہوگا کہ سوسائٹی کے تمام کام باحسن الوجوہ انجام پذیر ہونگے۔ انتظام بہت عمدہ ہوگا کیونکہ مرد و عورت آپس مین ایسے کام بانٹ لین گے جن کے انجام دینے کی ان مین طبعی قابلیت اور میلان ہوگا۔

آنے والے زمانے کے آدمی دور افتادہ مستقبل مین کیسے آدمی ہونگے؟ انکی عقلی اور جسمانی حالت کیسی ہوگی؟ اسپر غور کرتے وقت دماغ چکر مین آجاتا ہو وہ شہزوری مین اسفندیار، اور وجاہت مین یوسف اور عقل مین خدا کی مانند ہونگے۔ اس سے کسی کو انکار نہین ہو سکتا۔ وہ پانی پر چلے گا۔ ہوا مین اڑیگا۔ مشکل اور مریخ کے لوگون سے نامہ و پیام جاری کریگا۔ عالم ایتھر کی سیر کرے گا۔ کائنات کے اسرار مخفی کو افشا کرے گا۔ اور آب حیات ڈھونڈھ نکالے گا۔ سنگ پارس بھی بنالے گا۔ الغرض ایسے ایسے کام کریگا جو اسوقت وہم و گمان سے بعید معلوم ہوتے ہین۔ اسوقت علم کے حدود نہایت وسیع ہونگے۔ "نیٹشے سچ کہتا ہو۔ عورت کا جس بات سے بھلا ہو۔ ہو اُس سے مرد کا بھی بھلا ہوگا۔ وہ دونون ایک ساتھ آسمان شہرت پر چڑھین گے یا قعر ضلالت مین گرین گے"۔ اُس زمانے کے انقلاب مین عورت کو بڑا دخل ہوگا۔ اسکے توسط سے بڑے بڑے کام ہون گے وہ حسن مین ماہتاب سے بھی بڑھ جائیگی۔ وہ اپنے شوہر کے لیئے دیوی اور آنے والی پود کی مان، اور عیش پسند لوگون کے لیے پری ہوگی وہ اپنی موجودگی سے زندگی کے تاریک حصون کو روشن اور زرحصون کو رحمتون مین منتقل کرے گی۔ وہ "زندگی کا تاج" اور "دنیا کا نور" ہوگی۔

کامیابی کا معیار اہل استفادہ کہتے ہین کہ زندگی کا مقصد سب سے زیادہ

فیض پہنچاتا اور حاصل کرتا ہو مگر قدرت اسکی قائل نہین ہو۔ وہ کیفیات اور گرد و پیش کے حالات کے مطابق انواع تیار کر لیتی ہو۔ وہ ایک خاص نمونہ قائم رکھنے کے لیے سیکڑون جانون کو قربان کر دیتی ہو جیسے روزمرہ کمزور بچون کے مرنے سے ظاہر ہوتا ہو۔ مگر جنھین وہ زندہ رکھنا چاہتی ہو انھین لئے جہد الحیاۃ کیلئے ویسے ہی سامان بھی عطا کر رکھے ہین، اور اسی طرح وہ ترقی کرتے ہین۔ موجودات ایک منزل کی طرف بڑھ رہے ہین جہان وہ سب ایک نئی صورت اور ڈھنگ مین ظاہر ہونگے، اور وہ کائنات اس سے بہت مختلف ہو گی۔

شمس الہدیٰ

نظامِ شمسی

کائنات کے اندر جتنی عجیب وغریب اشیا ہین ان مین شاید تمامی درخشان کرہ سب سے زیادہ عجیب ہے جسمین بعض وقت گول چکردار بادل دکھائی دیتے ہین جو "چکردار سحاب" کے نام سے مشہور ہین جب انسان انکے ہولناک حجم اور انکی ماہیت پر غور کرتا ہو تو عقل چکر مین آجاتی ہو۔ علما کہتے ہین کہ اجرام فلکی شروع مین اسی درخشان بادل سے ماخوذ ہوئے تھے اور

افلاک کی ابتدا درخشان سحاب ہے

آئندہ زمانے کے سورجون اور عالمون کی ہستی بھی اسی نورانی مادہ مین مضمر ہو۔ یہ خیال بظاہر بہت عجیب معلوم ہوتا ہو لیکن جب اصلیت پر نگاہ ڈالی جائے تو اسکی معقولیت عیان ہو جاتی ہو جب ریاضیات اور طبیعیات کے اصول سے کام لیکر مشاہدہ فلکی کرتے ہین تو یہ امر بہت معقول معلوم ہونے لگتا ہو کہ اس سحاب مین نظام ہائے شمسی اور عالم ستارگان پنہان ہین۔ مسٹر ولیم سدرلینڈ نے حال ہی مین مشاہدونکی بنا پر استدلال کرکے یہ ظاہر کر دیا ہو کہ شروع مین ہمارے نظام شمسی کا مادہ بھی ایک اسی قسم کا سحاب تھا جسکے دو بازو تھے۔ وہ اندرونی حرکت کے سبب سے رفتہ رفتہ سرد ہو گئے اور اسکے جسم سے الگ ہو کر خلا مین ادھر ادھر پھیل گئے جیسے بدھ جو نظام شمسی مین سب سے چھوٹا ہو اور جسکی کثافت آٹھ نیلم ٹن اور برہسپت جو عظیم ترین ہو اسکی کثافت اس سے بھی کہین زیادہ ہو اور آفتاب جو مرکز مین ان کو سنبھالے ہوے ہو ان سب سے لاکھون گنا زیادہ کثیف ہو اور یہ سب اجرام اسی عظیم الوسعت سحاب سے بنے ہین۔ یہ خیال مسئلہ سحاب کی تازہ ترین صورت ہو۔ اس سے فرانسیسی فلکی لاپلیس کے نظریہ کی تردید ہوتی ہو جسنے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ آفتاب اور اسکے توابعین گول قرص ایسی شکل کے سحاب سے پیدا ہوئے تھے، جو سورج کے کرہ کے ارگرد پھیلا ہوا تھا مگر رفتہ رفتہ سرد ہو کر سکڑتا گیا اور اس سے اجرام فلکی بنتے چلے گئے۔ اور کئی قسم کے خیالات بھی اجرام فلکی کی ابتدا کی نسبت مشہور ہین جو "ارتقائے سیارگان" مین مذکور ہو۔ مگر یہان پر انکے تذکرہ کی چندان ضرورت نہین ہو البتہ سیارون کا ذکر بہت ضروری ہو۔

نظام شمسی ' سورج کے قریب مختلف فاصلون پر چار سیارے ہین۔ منگل (مریخ) یہ چار گروہ ان چارون مین آفتاب سے بہت دور ہو، یعنی چودہ کروڑ دس لاکھ میل اور بدھ قریب ترین ہو یعنی تین کروڑ ساٹھ لاکھ میل پر واقع ہو گویہ چارون سیارے جسامت مین ایک دوسرے سے بہت مختلف ہین مگر یہ ایک جداگانہ طبقہ سے متعلق اور ایک دوسرے سے مشابہ ہین۔ یہ ارکین نظام شمسی کا اول گروہ ہو۔ دوسرا طبقہ اس سے چونتیس کروڑ میل پر واقع ہو اور یہ فاصلہ بہت وسیع ہو۔ اس دوسرے طبقے مین چار سیارے ہین برہسپت، سنیچر، یورے نس اور نپ چون۔ برہسپت کرہ ارض سے تیرہ سو گنا بڑا ہو۔ باقی سیارے اس سے بہت چھوٹے ہین مگر سب کے سب بہت دور دور ہین یعنی آفتاب سے تین ارب میل کے درمیان گردش کرتے ہین۔ گویہ سیارے اس دنیا کے پیمانہ کے مطابق ایسے ہولناک فاصلہ پر

واقع ہین لیکن اگر ان کے ناپنے کے لیے آسمانی پیمانہ سے کام لیا جائے تو یہ فاصلہ ایسا ہو جیسا دس پندرہ گھنٹے کا تیز رو ریل گاڑی کا سفر، کیونکہ دوسرا نظام شمسی (الفا سنٹاور) ہمارے آفتاب سے دو پدم ساٹھ کھرب میل کے فاصلے پر واقع ہو اور اس سے ادھر اور کوئی آفتاب نہین ہو بہ نسبت چون سے پندرہ سو گنا بڑا ہو، اور سنیچر سے صرف دو چند یون کہنا بجا ہوگا کہ برہسپت (مشتری) سورج کو چھوڑ کر باقی تمام اراکین نظام شمسی سے چھ سو گنا بڑا ہو اور آفتاب ان سب سے سیکڑون گنا بڑھکر ہے۔

ان دونون قسم کے سیارون مین جنکا ذکر ہوا ہو، نہ صرف جسامت ہی کا فرق ہو بلکہ انکی طبعی حالت بھی بہت مختلف ہو یعنی چھوٹے سیارے بہت وزنی اور ٹھوس ہین اور بڑے سیارے اپنے حجم کے مقابلے مین ہلکے ہین۔ یا یون کہیے کہ سیارگان صغیر کثافت مین بڑے بڑے سیارون سے بڑھکر ہین۔ مثلاً اگر کوئی ایسا عظیم الحجم تالاب ہو جسکا طول و عرض لاکھون میل کا ہو اور اُسمین سنیچر کو ڈالا جائے تو وہ تیرتا رہیگا اور مشتری آہستہ آہستہ ڈوب جائے گا۔

ان دونون طبقون کے درمیان جو فاصلہ ہو اسمین چھ سو کے قریب اور چھوٹے چھوٹے سیارے ہین۔ انمین جو سب سے بڑا ہو اسکا قطر پانچ سو میل اور خوردترین کا دس میل ہو۔ یہ اسٹرائڈ (Asteriods) کہلاتے ہین۔ یہ متعلقین آفتاب کا تیسرا گروہ ہو جو کئی باتون مین دوسرے طبقون سے مختلف ہو۔ یہ ننھے ننھے سیارے ایک دوسرے کے مرجع آپ ہی بنے ہوے ہین۔ چوتھا طبقہ متعلقین شمسی کا دُمدار ستارے ہین جنکی سفید سفید چوٹیان گاہے بگاہے ہزارون لاکھون میلون تک پھیلی ہوئی نظر آیا کرتی ہین۔

آفتاب عالم تاب آفتاب کا درجہ نظام شمسی مین وہی ہو جو ایک خاندان مین باپ کا ہو جیسے باپ کے بغیر اولاد ناممکن ہو اسیطرح اراکین نظام شمسی کا وجود و قیام سورج کے بغیر محال ہو۔ اسکا حجم دیگر سیارون کے مجموعی حجم سے آٹھ سو گنا زیادہ ہو، اور کرۂ ارض سے تین لاکھ تیس ہزار گنا بھاری ہو۔ اسکی جسامت سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ نظام شمسی کے ارتقا مین آفتاب نے ایک نہایت شاندار اور ضروری حصہ لیا ہو۔ عالمون کا یہ خیال ہو کہ سورج کا انقباض ہنوز جاری ہو اور ابتک بالکل دخانی حالت مین ہو اور اسکی جو قوت انتشار حرارت سے ضائع ہوتی ہو اسکی کمی اسکے عمل انقباض سے پوری ہوتی رہتی ہو۔ اسکی موجودہ کثافت پانی سے ڈیڑھ گنا ہو۔ عالم کہتے ہین کہ انتشار حرارت کا خسارہ عمل انقباض سے اسی صورت مین پورا ہو سکتا ہو کہ ڈھائی سو فٹ قطر ہر سال سکڑتا رہے۔ چونکہ آفتاب کا قطر آٹھ لاکھ ساٹھ ہزار میل ہو، اسلیے اسکے انقباض کا اثر دس ہزار سال تک ہمارے آلات پر ظاہر نہین ہو سکتا۔

یہان پر یہ سوال پیدا ہوتا ہو کہ اگر اسی طرح آفتاب سکڑتا چلا جائے تو کتنے ہزار سال بعد اسکا منبع حرارت ختم ہو جائیگا۔ اگر حرارت موجودہ شرح سے خارج ہوتی رہی ہو تو حساب سے یہ ظاہر ہوگا کہ ڈھائی کروڑ سال سے یہ عمل جاری ہو اور اگر آئندہ بھی اسکا سلسلہ اسی طرح جاری رہے تو پچاس اور ستر لاکھ سال کے مابین اسکا قطر سکڑ کر نصف رہ جائیگا۔ انقباض کے ساتھ اسکی کثافت اب سے آٹھ گنا ہوگی اور درجہ حرارت اتنا بڑھ جائیگا کہ اراکین نظام شمسی تک اتنی حرارت نہین پہنچے گی کہ وہ آبادی کے قابل ہون۔ عالمان ارضیات کا یہ خیال ہو کہ کرۂ ارض دس کروڑ سال سے جاندارون کی زندگی کی پرورش اور قیام کے قابل چلی آئی ہو۔ اس تضاد کے رفع کے لیے فلکیون نے خیال قائم کیا ہو کہ سورج کی حرارت اگلے زمانون مین اسی شرح سے خارج نہ ہوتی تھی جس سے آج کل ہو رہی ہو۔ حال ہی مین عالمون نے سورج کی معزول قوت کی بہم رسانی کی بابت یہ قیاس لگایا ہو کہ اس کے اندر ریڈیم ہو جسکی بدولت اسکا وجود لاکھون اور کروڑون برس تک قائم رہے گا۔

تھوڑے عرصے سے بعض عالمون نے یہ اندازہ لگایا ہی کہ سورج کی حرارت زمین پر یکسان نہین پہنچتی بلکہ اسمین بھی کمی بیشی ہوتی رہتی ہی، اور یہ تفاوت دس فیصدی ہوتی ہی- یہی حال باقی اراکین شمسی کا بھی ہی یعنے سورج کی گرمی ان کے ہان بھی اسی حساب سے نہین پہنچتی- اسکی ایک وجہ وہ داغ ہین جو کبھی کبھی سطح آفتاب پر ظاہر ہوتے رہتے ہین اور کبھی کبھی عجیب قسم کی گیسین پھوٹ نکلتی ہین جیسے آتش فشان پہاڑ سے آگ اور دھوان نکلتا ہی- اس سے سورج تغیر پذیر ستارہ معلوم ہوتا ہی مگر یہ تبدیلیان آسانی سے نہین پہچانی جاتی ہین یہ تبدیلیان آئندہ بھی ہوتی رہین گی لیکن وہ کیسی ہونگی؟ اسکا جواب دینا محال ہی لیکن عالمون نے حال مین یہ دیکھا ہی کہ تارہ مائرہ سیٹی (Miraceti) کے تبدلات سورج کے نسبت ہزارون گنا زیادہ وسیع دیکھے گئے ہین اور وہ اپنی نوعیت مین شمسی انقلابات کے بہت مشابہ پائے گئے ہین-

سیارۂ عطارد | عطارد (بدھ) سب سیارون مین چھوٹا ہی- بظاہر وہ آفتاب کے بچے بچون مین سب سے چھوٹا معلوم ہوتا ہی- مگر اسکو سن رسیدہ بوڑھا کہنا چاہیئے- اسکی حرکت کی تیزی کا سبب اسکی قربت آفتابی ہی- اسکا دائرہ گردش بے ٹھکانے ہی- اسلیئے چھ ہفتون کے اندر اسکی رفتار تئیس اور پینتیس میل فی سکنڈ کے درمیان رہتی ہی اور اس اثنا مین جو حرارت اور گرمی آفتاب سے نکل کر اسکے ہان جاتی ہی وہ کبھی دوچند اور کبھی نصف ہوجاتی ہی- بدھ کرۂ ہوا سے محروم ہی اسلیئے وہان پانی کا وجود عنقا سمجھا جاتا ہی- اسکی کثافت سیسہ اور پارہ کے برابر سمجھی جاتی ہی یہ اپنے محور پر ایسی تیزی سے نہین گھوم سکتا جس سے دن اور رات پیدا ہوتے ہین چونکہ سورج کے بہت قریب ہی اسلیئے اسکی سطح سخت اور خشک ہوگئی ہی- ان باتون سے فلکیون نے یہ نتیجہ نکالا ہی کہ بدھ ارتقا کے آخری مرحلہ مین ہی- مگر اس سے یہ نہین معلوم ہو سکتا کہ بدھ آفتابی خاندان مین پلوٹا ہی- بلکہ اسکا اصل سبب یہ ہی کہ اسکا حجم بہت چھوٹا ہی اسلیئے بہت جلد سحابی بخارات اڑ گئے اور یہ ٹھوس ہوگیا- اسکا قطر تین ہزار میل اور اسکا سال اٹھاسی دن کا ہوتا ہی-

زہرہ کی سرگذشت | زہرہ (شکر) آفتاب اور چاند کے سوا سب سے زیادہ درخشان ہی صبح یا شام کو نظر آتا ہی- کرۂ ارض سے دوسرے درجے پر اگر کوئی سیارہ جانداروں کے رہنے کے لیے موزون ہی تو وہ شکر ہی اسکا قطر سات ہزار سات سو میل ہی- گویا یہ کرۂ ارض کا توام بھائی ہی- اسکی کثافت زمین سے کچھ کم ہی یعنی اگر ہم مین سے کوئی آدمی سطح زہرہ پر جا سکے تو اسکا وزن یہان سے قدرے زیادہ ہوگا- یہ سیارہ سورج سے پونے سات کروڑ میل ہی- وہان پر سورج کی حرارت اور روشنی زمین کی بہ نسبت دوچند پہنچتی ہی- چونکہ اسکا دائرۂ گردش سب سیارون سے زیادہ مدور ہی اسلیئے سالانہ تبدیلیان بہت کم ہوتی ہین- علاوہ ازین اسکا کرۂ ہوا بہت وسیع ہی جسکی بدولت وہ آفتاب کی تیزی سے بچ سکتا ہی- اسکی سطح دور بین سے دکھائی نہین دیتی اسلیئے اس کے جغرافیے سے ہم ناواقف ہین- پروفیسر پرسی ول لوئل کا یہ خیال ہی کہ یہ سیارہ اپنی محوری قوت سے اتنا محروم ہوگیا ہی کہ وہ آفتاب کے گرد صرف ایک مرتبہ چکر لگاتا ہی جسکی وجہ سے اسکے ایک حصہ پر دائمی رات اور دوسرے پر استمراری دن رہتا ہی- مگر اور عالم اس خیال کو تسلیم نہین کرتے- بیلپسکی روسی فلکی نے اپنے مشاہدون سے یہ امر ظاہر کیا ہی کہ شکر کا دن ساڑھے چونتیس گھنٹے کا ہوتا ہی- اس سے یہ نتیجہ اخذ ہو سکتا ہی کہ وہان ہم سے زیادہ ذہین ہستیان رہ سکتی ہین جب شکر زمین اور آفتاب کے درمیان سے گزرتا ہی تو اسکا فاصلہ ہم سے صرف دو کروڑ ساٹھ لاکھ میل ہوتا ہی- اس سے نزدیک تر کوئی سیارہ نہین آتا ہی- اس سے بعض دل چلے عالمون کے دل مین یہ خیال پیدا ہوگیا ہی کہ ایتھر تار برقی کے ذریعے سے شکر کے باشندون سے نامہ و پیام کا سلسلہ قائم کرنا چاہیئے- مگر سائنس ایسی باتون کا قائل نہین ہی-

مریخ کا قصہ | مریخ (منگل) اول طبقہ مین سب سے دور اُفتادہ اور بُدھ کے سوا سب سے چھوٹا ہے۔ اسکا قطر بیالیس سو میل ہے اور اسکی مساحت کرۂ ارض کے ۰،۲۸ کے برابر ہے۔ اسکی کثافت زمین کی کثافت کے ۰،۷۲ مساوی ہے یعنی پانی سے چار گنا زیادہ اور کشش کا تناسب ۱۳۰ اور ۱۰۰ کا ہے جسکے معنی یہ ہین کہ اگر کوئی جانور سطح مریخ پر چلا جائے تو اسکا وزن دو تہائی کم ہو جائیگا۔ اس امر کو مدنظر رکھکر یہ خیال کیا گیا ہے کہ منگل مین انسان کا قد بارہ تیرہ فٹ ہوتا ہے مگر اس سے اسکی چستی و چالاکی مین کوئی فرق واقع نہین ہوتا۔ اسی بنا پر یہ گمان کیا گیا ہے کہ منگل مین دیو رہتے ہین جنھون نے عظیم الشان نہرین تیار کی ہین۔ مگر دور بین بیشہ فلکی ایسی قیاسی باتون کو چندان اہمیت نہین دیتے۔ اصل یہ ہے کہ منگل کی حالت جانداروں کے قیام و وجود کے متناقض ہے۔ منگل مین کرۂ ارض سے آدھی شمسی روشنی اور گرمی جاتی ہے۔ اسپکٹرو اسکوپ اور دوربین سے ظاہر ہوتا ہے کہ مریخ کی ہوا بہت لطیف ہے اور وہان کی سردی و گرمی کا درجہ صفر سے بھی نیچے ہوگا۔

عالم یہ تسلیم کرتے ہین کہ منگل کے ڈھانچے مین کوئی ایسی خاص چیز ہے جس سے مظاہر طبعی یعنی فطری انقلابات وقوع مین آتے رہتے ہین۔ ایک تو یہ امر خاص توجہ کے قابل ہے کہ وہان قطبین مین برف پڑتی ہے جو موسم گرما مین گھل جاتی ہے جیسا کہ ہمارے ہان شمالی اور جنوبی قطبون مین دیکھا جاتا ہے۔ وہان برف ضرور جمتی ہے اگر یہ نہو تو کہرہ ہوگا۔ دوم سطح مریخ پر زمین کے ایسے قطعات نظر آتے ہین جیسے ہمارے ہان ہین جنکے رنگ مختلف ہوتے بعض نیلگون جس سے سمندرون اور جھیلون کا گمان ہوتا ہے اور بعض زرد گویا یہ بنجر خطے اور ممالک ہین اور وہان روئیدگی بھی دکھائی دیتی ہے۔ نہرون کا جال انہی لال پیلے خطون مین نظر آتا ہے۔ لوئل اور اسکے ہم خیال کہتے ہین کہ بحیرے تو خشک ہو چکے ہین مگر اتنی رطوبت باقی ہے جس سے قطبون مین یخ پیدا ہوتی ہے، اور سبزی کے قیام کی موجب ہوتی ہے جس سے جانورون کی زندگی قائم ہے بشرطیکہ وہ وہان پر ہون۔ لِس نظریہ کے رو سے جب برف پگھلتی ہے تو پہلے پانی ایک حصہ مین اور پھر دوسرے مین جمع ہوتا ہے۔ اور پھر "نہرون" کے وسیلے "مریخی باشندے" "شہرون" اور "کھیتون" مین لیجاتے اور سیراب کرتے ہین۔ یہ کھیت سیاہ دھاریون کی صورت مین دوربین مین نظر آتے ہین۔ جسکی بنا پر اہل مریخ کرۂ ارض کے باشندون سے زیادہ ذہین اور عقلمند سمجھے جاتے ہین۔ نہرون کی بناوٹ سے انکی عجیب و غریب انجینیرانہ عقلمندی اور قوائے طبعی سے کام لینے کی بے مثال دانائی اور علم عیان ہوتا ہے۔ مگر یہ محض قیاس ہے۔ مریخی سال ۶۸۷ دن کا ہوتا ہے اور موسمی تبدیلیان ہمارے ہان کے موسمی تبدلات سے مشابہ ہوتی ہین۔ اسکا دن چوبیس گھنٹے ۳۷ منٹ کا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مریخ کی سطح بہت اچھی طرح نظر آتی ہے۔

سیارگان صغیرہ | آفتاب کے لواحقین کے گروہون مین ایک طبقہ سیارگان صغیرہ کا ہے جو تیسرے طبقہ مین ہین۔ انکا شمار کئی سو ہے اور ہر سال تین اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ انمین بڑے بڑے چار ہین۔ سیرس اسکا قطر ۴۸۰ میل ہے۔ پلاس اسکا قطر ۳۰۴ میل، وسٹا کا قطر ۲۳۹ میل اور جونو کا ۱۲۰ میل ہے اور باقی کا قطر بیس میل بھی نہین۔ گویا وسیع خلا مین یہ ننھے ننھے مونگے کے جزیرے ہین۔ انکی شکل و صورت بیقاعدہ ہے۔ جرمن عالم آل برکی رائے مین یہ سیارے کسی بڑے سیارے کے پھٹنے سے پیدا ہوئے تھے۔ ان کے گرد کے دوائر بہت غیر معین ہین۔ یہ سب کے سب مریخ کے دائرہ گردش کی حد سے لیکر مشتری کے گھومنے کے خط کے مابین واقع ہین۔ خیال کیا جاتا ہے کہ مشتری کے چاند بھی انہی صغیر سیارون مین سے ہین جو اسکی کشش سے کھچ کر اسکے قریب چلے گئے اور گھومنا شروع کر دیا۔ اسی طبقہ مین اروس نام چھوٹا سیارہ ہے جو گردش کرتا ہوا زمین کے پاس ایک کروڑ چالیس لاکھ میل پر پہنچ جاتا ہے۔

مشتری کا حال | مشتری (برہسپت) سیارگان نظام شمسی مین عظیم ترین ہے

سورج سے اسکا فاصلہ ۴۸ کروڑ تینتیس لاکھ میل ہے۔ زمین سے یہ تیرہ سو گنا بڑا ہے مگر اسکی کثافت زمین کا چوتھا حصہ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسکا وزن زمین سے صرف ۳۱۶ گنا ہے۔ اسکی حرکت محوری بہت تیز ہے یعنی دس گھنٹے مین گھومتا ہے۔ قطبون کے پاس چپٹا اور خط استوا کے قریب باہر کو ابھرا ہوا ہے۔ اسکی گردش محوری اسکے مختلف حصون مین مختلف ہوتی ہے۔ سورج کی بھی یہی کیفیت ہے جو اس امر پر دال ہے کہ وہ ہلکا ہے گیسون کی نہایت کثرت ہے جسکی وجہ سے گردش کی تیزی سے اسکی سطح پر پٹکے یا چھلّے نمودار ہو جاتے ہین۔ مگر قطبون کے پاس دھاریان ظاہر نہین ہوتی ہین۔ عالم خیال کرتے ہین کہ مشتری ہنوز ارتقا کے تمام مراحل طے کرنے مین کامیاب نہین ہوا ہے۔ چھتیس سال کا عرصہ گزرا کہ مشتری کے جنوبی پٹکے کے پاس ایک سُرخ داغ نمودار ہوا تھا جسکا طول تیس ہزار میل تھا۔ فلکیون نے اسکی ہرچند تحقیقات کی مگر اسکی نوعیت معلوم نہو سکی اور آج کے دن تک وہ ایک راز سربستہ ہے۔ عظیم داغ مختلف قسم کی تبدیلیون سے بھی دوچار ہو چکا ہے۔

مشتری کے حصہ مین آفتابی حرارت اور روشنی کرۂ ارض کے مقابلے مین صرف پچیسوان حصہ آتی ہے اگر کچھ عرصہ کے بعد وہ سخت ہو جائے تو وہان کسی جاندار کا زندہ رہنا محالات سے ہوگا کیونکہ سردی کی کثرت سے وہ اینٹھ کر مر جائیگا۔ مشتری کے چار بڑے اور چار چھوٹے چاند ہین۔

عجیب و غریب سیارہ زحل | مشتری سے دوسرے درجہ پر جسامت مین زحل (سیٹرن) ہے جو سب سیارون مین عجیب و غریب ہے۔ اسکے کرہ کے اردگرد کئی درخشان حلقے اور چھلّے ہین جو مسلسل ایک دوسرے کے اندر واقع ہین۔ اسکا قطر ۷۵ ہزار میل ہے۔ اگر درخشان چھلّون کو بھی کرہ کے ساتھ شامل کر لیا جائے تو قطر کا کل طول ایک لاکھ اڑسٹھ ہزار میل ہو جاتا ہے۔ اندرونی چھلا زحل کے استوا کے پاس دس ہزار میل پہنچتا ہے اور اسکا بیرونی کنارا ساڑھے سولہ ہزار میل چوڑے چھلے مین ملجاتا ہے۔ گو یہ حلقے دوربین مین سخت نظر آتے ہین، مگر دراصل گیس کے بنے ہوئے ہین جو کرۂ زحل کے اردگرد گردش کرتے رہتے ہین۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب زحل کے مرکز کا سحاب سکڑ گیا تو یہ حلقے اس سے باہر رہ گئے۔ اسکے کرہ پر بھی ویسے ہی پٹکے نظر آتے ہین جیسے مشتری کے قرص پر دکھائی دیتے ہین۔ زحل کی کثافت پانی کی کثافت سے ۱/۳ حصہ کم ہے۔ زحل کے اردگرد دس چاند گردش کرتے ہین۔ انکا حجم ایک دوسرے سے مختلف ہے اور یہ مختلف فاصلون پر واقع ہین۔ اسکا فاصلہ آفتاب سے اٹھاسی کروڑ ساٹھ لاکھ میل ہے۔

یورے نس اور نپ چون | یورے نس اور نپ چون نظام شمسی کے بچھڑے ہوئے بھائی ہین۔ تھوڑے ہی عرصے سے انکے وجود کا پتہ عالمون کو لگا ہے اول الذکر کا فاصلہ سورج سے ایک ارب ۸۰ کروڑ بیس لاکھ میل اور دوسرے کا دو ارب ۷۹ کروڑ بیس لاکھ میل ہے۔ یہ دونون سیارے اُس عظیم الجثہ سحاب کے بیرونی حصون سے بنے ہین جس سے نظام شمسی کے باقی ارکین وجود مین آئے تھے۔ اسکی کثافت پانی سے بھی کم ہے۔ یورے نس کا قطر تیس ہزار اور نپ چون کا بتیس ہزار میل ہے۔ اول الذکر کے چار اور موخر الذکر کا صرف ایک چاند ہے۔ نپ چون کے وجود کا پتہ اسکے اُس اثر سے چلا تھا جو یورے نس کی حرکت پر نمایان ہوتا تھا۔ انکے چاندون کی گردش سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انکی حرکت محوری اسی سمت مین نہین ہوتی ہے جسمین باقی سیارونکی ہوتی ہے۔ نپ چون کی گردش مشرق سے مغرب کی جانب اور یورے نس کی قائم الزوایہ کے رُخ پر ہوتی ہے۔

یہ ہے مختصر داستان متعلقین آفتاب کی مفصل کیفیت تو بڑی بڑی علمی کتابون ہی مین ملسکتی ہے لیکن ناظرین العصر کی معلومات مین اس سے خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا ہے اور فلکیات کی کل باتون کا لطف اس خلاصہ سے حاصل کر سکتے ہین۔

جے۔ آر۔ رائے

نُور یا روشنی

نور کی اہمیت اور ضرورت

اُن ضروریات میں سے جو انسانی زندگی کے لیے لابدی بلکہ اجزاء لاتجزی ہیں نُور یا روشنی بھی ایک ہے۔ اگر سچ پوچھو تو انسانی زندگی کے تمام حظوظ اور دیگر اقسام کے کاروبار نُور کے بغیر بیکار ہیں۔ زندگی کے اگر تمام کاروبار پر اور جو تعلق اُن سے انسان کو ہے اُسپر غور کیا جائے تو یہ بات بالکل حق ثابت ہوتی ہے کہ "آنکھ گئی تو جہان گیا"۔ دوسرے الفاظ میں بدن کا چراغ (یا نور) آنکھ ہے اگر انسان کے جسم سے یہ نُور جاتا رہا تو اُسکا تعلق بیرونی دُنیا سے ایک گونہ بالکل قطع ہوگیا۔ انسان نُور کے بغیر کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ ذرا رات کے وقت ہی پر غور کیجیے۔ انسان کے جسم میں تندرستی، خوبصورتی، طاقت، لیاقت، علمیت سب کچھ موجود ہوتا ہے۔ گھر میں تمام اسباب، راحت و انبساط کافی بلکہ بافراط مہیا ہوتا ہے۔ اپنے عزیز و اقارب اپنے گرد و پیش بیٹھے ہوتے ہیں۔ مگر "دمڑی کے لعل"

بغیر ساری چیزیں بے مصرف ہوتی ہیں۔ اُسوقت یہ انسان ضعیف البنیان باوجود اپنی کامل صحت اور طاقت و خوب صورتی کے، شش بُت کے ایک جگہ مقید بیچارہ بنا ہوا وہ اُسوقت نور کا کیسا محتاج نظر آتا ہے۔ ہر شئے کی قدر و قیمت اُسکی ضد کی موجودگی سے پہچانی جاتی ہے، اسی طرح نُور کی اہمیت و ضرورت تاریکی سے امتیاز ہوتی ہے۔ نور کے بغیر انسان تمام بہجت افزا و مسرت بخش اشیاء سے کچھ بھی فائدہ اور حظ اٹھا نہیں سکتا۔ پیاروں کے خوب صورت چہرے آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہیں اور دل انکی نادید سے بیقرار ہوتا ہے۔ غرضیکہ انسان کا کوئی کام ہو، سب کے سب نور کے بغیر بے لطف ہوتے ہیں۔ نُور انسان کے لیے نہایت ہی ضروری مفید اور دلکش ہے۔

نُور جس طرح انسان کے لیے لابدی اور فیض رساں ہے اُسی طرح حیوانات نباتات اور جمادات کے لیے بھی لازمی ہے۔ اُنکی زندگی اور روئیدگی اور بالیدگی سب کا انحصار نور ہی پر ہے۔ عالم کی پیدایش، پرورش، اور نشو و نما اور تمام خوبصورتیاں نور ہی سے ہیں۔ اسی لیے توریت شریف میں حضرت موسیٰ نے بتایا ہے کہ خدا ے تعالیٰ نے آفرینش عالم کی ابتدا میں سب سے اول نور پیدا کیا۔ اور اسی نہج سے سائنس نے بھی بتایا ہے کہ موجودہ صورت میں منجمد ہونے سے پیشتر آفتاب اور سیارے روشن ہیولے کی صورت میں موجود تھے۔ یہی ہیولے وہ نُور یا اُجالا ہے جس کو خداوند عالم نے سب سے پہلے خلق کیا۔ نُور ہر شئے کے اندر مخفی و مستتر تھا جسکو خالق نے ظاہر کیا۔ اور اب بھی ہر شئے میں موجود ہے جو رگڑ یا کسی اور کیمیاوی ترکیب سے پردۂ کتم سے منصۂ ظہور پر آجاتا ہے۔ اگر نُور کو کُل اشیا کا ست یا روح کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

نُور کی اہمیت اور قدر و منزلت اس طرح پر بھی ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نسبت ہر مذہب اور ملت میں یہ بیان ہُوا ہے کہ وہ نُور ہے اور نُور میں رہتا ہے۔ وہ اور اُسکے فرشتے سب نوری ہیں۔ وہی ذات الٰہی نُور اور نُور کا مخرج ہے ستارے نور اُسی سے ضیا پاتے ہیں۔ اُس میں تاریکی کا سایہ تک نہیں ہے۔ اگر اس پہلو سے غور کیا جائے تو نُور ازلی اور ابدی ہے۔ جب سے خدا ہے تب سے نُور ہے۔ اگر نُور نہوتا تو اس عالم کا ظہور بھی نہ ہوتا۔

نُور اگرچہ ایک ہے تو بھی اپنے طبعی اخلاقی اور روحانی معنی کے لحاظ سے مختلف اقسام کے کہلاتے ہیں۔ ہمارا مقصد اس جگہ نُورِ طبعی پر غور کرنے کا ہے۔

نور کی بابت قیاسات

نُور کی تحقیقات میں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نُور کیا ہے؟ نُور کے بیان میں متفرق قیاسات ہیں۔ مگر سب سے زیادہ مشہور اور مروج دو قیاس ہیں۔ پہلا قیاس یہ ہے کہ روشن اجسام ہر سمت میں ایک مادہ اپنے اندر سے نکالتے رہتے ہیں اُس میں غایت درجے کے لطیف ذرات مشتمل ہیں۔ یہ ذرات غایت ہی سرعت کے ساتھ سیدھی سطروں میں برابر چلتے رہتے ہیں اور آنکھوں کے اندر جاکر "ریٹینا" پر اپنا اثر کرتے ہیں اور اُس اثر سے ہم میں وہ احساس پیدا ہوتا ہے جس سے نظر بنتی ہے۔ اِس قیاس کو قیاس شعاع نُور کہتے ہیں۔ اس قیاس سے یہ بتایا جاتا ہے کہ روشنی کے ذرات منور اجسام سے ایسے طور پر متواتر اور نہایت عجلت کے ساتھ ناشکستہ سلسلے میں لگاتار نکلتے رہتے ہیں۔ اس قیاس کا رواج سر آئزک نیوٹن صاحب کی زبردست تائیدگی وجہ سے مدت دراز تک سائنٹفک عالم میں جاری رہا اور اب بھی ایک بڑا زبردست فرقہ سائنس دانوں کا ایسا موجود ہے جو اس قیاس کا بڑا حامی ہے۔ دوسرا قیاس یہ ہے کہ تمام اجسام اور خلاء سماوی نہایت ہی درجہ کے لطیف اور لچکدار مادہ سے مملو ہیں جسکو روشن ایتھر کہتے ہیں۔ اور اجسام اس لیے منور ہوتے ہیں کہ اُنکے ذرات خلا میں انتہائی درجہ کی سُرعت اور تیزی کے ساتھ تھرتھراتے رہتے ہیں، اور جب وہ ایتھر میں مل جاتے ہیں، تو دائرہ نما لہروں کی شکل میں ہر سمت پھیلتے رہتے ہیں اور یہ تھرتھراہٹ ہیتیا پر پڑ کر احساس نظر پیدا کرتی ہے۔ اِس قیاس کو قیاس تموّج نُور کہتے ہیں۔ یہ تھرتھراہٹ خط مستقیم میں رواں نہیں ہوتی بلکہ ایسے طور پر چلتی ہے کہ قائمہ زاویے پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ یہ تھرتھراہٹ اُس روانی کے مشابہ ہے جو اُس وقت رسّی میں ہوتی ہے جب رسّی کو ایک سرے سے پکڑ کر آہستہ آہستہ گردش دی جاتی ہے۔ اس قیاسی تموّج میں ذرات کی کسی حرکت کا

تعو رشتش نہیں ہے بلکہ ذرات کی بے قراری کی ایک حالت ہوتی ہے جو جسم منورسے ظہور میں آتی ہے۔ اسکی مثال عین پانی کی لہروں کی سی ہے۔ قیاس تموج نور کا سب سے پہلا محقق ہوجنس ہے اور اُسکے بعد یولر نے اس قیاس کی بڑی حمایت کی اور اسکو رواج دیا۔ اسکے بعد ڈاکٹر ینگ اور فرنزل اسکے بڑے حامی گزرے ہیں۔ قیاس تموج سے نہ صرف ظہوراتِ نورانی کی توضیح ہوجاتی ہے بلکہ اس سے وہ علاقہ بھی منکشف ہوجاتا ہے جو روشنی اور حرارت کے ظہورات کے درمیان نہایت قرب میں واقع ہے، اور اس سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ ظہوراتِ نور اور ظہوراتِ صدا میں کیسی پوری مشابہت موجود ہے۔

نور کے مخارج نُور کے سلسلۂ بیان میں دوسری بات اُسکے مخارج کا بیان ہے۔ اگرچہ نُور دُنیا میں کثرت سے موجود ہے، خواہ ظاہر ہو یا باطن، تاہم نور کا اصل منبع سائنس دانوں کی نظر تحقیقات سے مخفی ہے۔ ظاہر طور پر جہاں تک علم مشاہدہ اور سائنسی تجربات و مشاہدات کی رسائی ہوئی ہے وہاں تک یہی نتیجہ نکالا اور بتایا گیا ہے کہ نور یا روشنی سورج، ستاروں، حرارت، کیمیاوی ترکیب، بجلی، شہابوں اور اُن اشیاء سے نکلتی ہے جن میں فاسفورس ہوتا ہے۔ لیکن اگر پوچھا جائے کہ انکے اندر نُور کہاں سے آیا جو بروقت کسی نہ کسی ترکیب یا ذریعہ سے ظاہر ہوجاتا ہے؟ تو سائنس اسکا جواب دینے سے عاری ہے۔ البتہ موسیٰ نے پیدائش کی کتاب کے شروع میں اشارۃً ظاہر کردیا ہے۔ وہ بیان قرین عقل اور قابل تسلیم بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ حرارت و روشنی کا نہایت ہی قریبا اور لابدی تعلق ہے۔ جہاں حرارت ہے وہاں نور۔ یہ بات اور ہے کہ کیا نور ہمیشہ ظاہر ہی رہتا ہے یا باطن، مگر تجربہ اور مشاہدہ یہ ضرور بتاتا ہے کہ حرارت میں نُور ہے۔ خدائے تعالیٰ نے عین ابتداے پیدائش عالم میں سب سے پہلے مادہ کے اندر حرارت ڈالی۔ اور اس حرارت کے ساتھ ہی جو "خدا کی روح" کے "پانیوں پر جنبش کرنے" سے خارج ہوکر مادہ کے اندر گئی نور بھی اُسکے ساتھ ہی مادہ کے اندر پہنچا، اور جب خدا نے فرمایا کہ "اُجالا ہو" تو فوراً ہی مادہ زور کے ساتھ متحرک ہوا۔ اور اس حرکت سے آپس میں رگڑ اور نور کا ظہور ہُوا۔ نُور کا یہ ظہور سب سے پہلے نبولے کی صورت میں ہُوا۔ ڈاکٹر کینس نُور کی پیدائش کا بیان یوں کرتے ہیں اور موسیٰ کی رؤیا میں نُور کے ظہور کا نظارہ اس طرح پر دِکھاتے ہیں کہ جب موسیٰ کوہ طور پر حق تعالیٰ کے روبرو عالم رویا میں اس دُنیا کی پیدائش کا سارا واقعہ مسلسل طور پر دیکھ رہا تھا تو اُس نے "اپنی آنکھیں اوپر اُٹھا کر اُن بادلوں کو دیکھا جو اُسکے گرداگرد گھوم رہے تھے (وہ کیا دیکھتا ہے کہ) فوراً ایک کالا بادل اُسکے سر پر چھایا ہُوا ہے۔ اور جبکہ وہ اس نظارہ کو تعجب کی نگاہوں سے دیکھتا اور غور کر رہا تھا کہ اسکے کیا معنی ہیں تو اُس نے خدا کی وہی آواز سُنی کہ" اُجالا ہوجا" اور فوراً ہی سارا خلا ہر قسم کی شکلوں کے نورانی نبولوں سے معمور ہوگیا۔ وہ حیرت کی نگاہوں سے تاکتا ہے۔ اور وہ دیکھ ہی رہا تھا کہ یہ نبولے منجمد ہوگئے اور آسمان کے کُل سائنبان میں سُورج (الصیغۂ جمع) اور ستارے جگمگا اُٹھے" (موہرا ینڈ جیالوجی صفحہ ۱۹) اور پھر لکھتے ہیں (صفحہ ۲۰) "اگرچہ فی الحال ہم نہیں بتا سکتے کہ کن قوانین سے نبولے بنے اور انکو یہ روشن نمایشیں عطا ہوئیں تاہم یہ ایک بدیہی امر ہے کہ نور بلا کسی معلومہ مرکزی منبع اشاع کے موجود تھا۔ پس موسیٰ کا بیان بالکل درست ہے کہ آفتاب سے پیشتر روشنی موجود تھی"۔ موسیٰ کے بیان اور سائنس کے ساتھ اسکا مقابلہ کرنے سے بخوبی پتہ لگتا ہے کہ اصل منبع اور مخرج نور کا وہی قادر متعال بے چون و بے مثال ہے۔ پانی پر اُسکی روح کے جنبش کرنے سے مادہ میں حرارت و نور داخل ہوے۔ اُسکے فرمانے سے مادہ بڑے زور کے ساتھ متحرک ہُوا۔ اور قسم قسم کی شکلوں کے روشن اور گرم نبولے (سحاب) متشکل ہوگئے اور نور فضا میں پھیل گیا۔ پھر یہ نبولے رفتہ رفتہ منجمد ہوتے گئے اور انھوں نے سورجوں اور ستاروں کی شکلیں اختیار کرلیں جو نُور کے مخارج ثانی ہیں۔

سُورج ایک منجمد نبولا ہے جو بذاتہ روشن ہے اور چاند کی طرح کسی غیر فلکی جرم سے روشنی حاصل نہیں کرتا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ سائنس کی تحقیقات کے مطابق اُس میں اُن بے شمار جلتے ہوے شہابوں

سے بھور روشنی پیدا ہوتی ہے جو حرکت کرتے ہوئے سورج کے اندر پڑتے ہیں۔ "کیونکہ کم لاتعداد شہابی گولے جب مدار آفتاب میں آجاتے ہیں تو وہ ہر ایک ممکن زاویہ پر آکر ایک دوسرے کا تقاطع کرتے ہیں۔ اور چونکہ ان میں سے بعض شہاب آگے جاتے اور بعض پیچھے ہٹتے ہیں اس لیے وہ بالضرور آپس میں لگا تار ٹکراتے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دونوں اجسام ناگہاں ٹھہر جاتے ہیں۔ اور اُن سے غایت درجہ کی حرارت اور روشنی پیدا ہوتی ہے اور وہ آفتابی گولے میں آگرتے ہیں اور اس طرح اُس میں متواتر نئی نئی حرارت اور روشنی پہنچاتے ہیں" (ایضاً ۴۰ صفحہ) یہ سورج کی روشنی کا حال ہے۔

حرارت سے جو روشنی پیدا ہوتی ہے وہ اُس وقت نظر آتی ہے جب اشیا (ڈیٹ صاحب کے بیان کے مطابق) ۵۰۰ سے ۶۰۰ درجے تک گرم ہوتی ہیں اور اس درجے سے آگے جوں جوں حرارت کی مقدار بڑھتی جاتی ہے روشنی بھی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔

فاسفورس ایک ایسی شئے ہے جو اکثر اقسام کی چیزوں میں موجود ہے اور جب وہ چیزیں کسی خاص حالت میں رکھی جاتی ہیں تو خود بخود روشن ہو جاتی ہیں۔ اور بعض نباتات اور حیوانات میں بھی یہ خاصہ پایا جاتا ہے مثلاً یہ نور شب چراغ (جگنو) میں بہت تیز ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روشنی اُنکی مرضی کے مطابق ظاہر اور پوشیدہ ہو سکتی ہے۔ سمندروں میں بھی بہت سی ایسی مچھلیاں پائی جاتی ہیں جو راس السرطان اور جدی میں ہیں اُنکے بدن سے روشنی برابر نکلتی اور سمندر کو روشن کرتی رہتی ہے۔ اسی طرح اور بہت سی اشیا ہیں جن سے روشنی نکلتی ہے اور انسان و حیوان اُن سے اکتساب نُور کرتے ہیں۔ اور وہ نور میں اپنے سارے کام کرتے اور خوش ہوتے ہیں۔ یہاں تو انسان مخارج ثانی سے نور حاصل کرتا ہے مگر موت کے بعد جب آرام اور خوشی کی حالت میں جائیگا تو اصل منبع سے نُور اور خوشی حاصل کریگا۔

نور کی تیز رفتاری | یوں تو نور کا ہر ایک پہلو قابل ذکر اور اُسکا بیان نہایت مفید اور دلکش ہے مگر ہم طوالت کے خوف سے صرف نُور کی تیز رفتاری کا ذکر کرینگے جو نہایت دلچسپ اور حیرت میں ڈالنے والا مگر سریع الفہم ہے۔ روشنی اس قدر سرعت اور تیزی کے ساتھ چلتی ہے کہ عام مشاہدہ کے مطابق سطح زمین پر کسی نورانی ظہور اور آنکھ کے احساس کے درمیان کوئی قابل قدر فاصلہ نہیں ہوتا۔ یہ سرعت رفتاری سب سے پہلے علم نجوم کے مشاہدات کے ذریعہ سے معلوم کی گئی ہے۔ سب سے پہلے رومر نام ایک ڈنمارک کے منجم نے ۱۶۷۵ء میں جوپیٹر کے پہلے خادم ستارہ کے گہن کے مشاہدہ سے روشنی کی تیز رفتاری دریافت کی تھی۔ نتیجہ اُسکے تجربہ اور مشاہدہ کا یہ ہے کہ روشنی ایک سکنڈ میں ۱۹۰۰۰۰ میل کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ ایک اور بیان کے مطابق روشنی ایک سکنڈ میں ۱۸۶۰۰۰ میل مسافت میں دوڑ جاتی ہے۔

نور کی ترکیب | ایک عجیب بات یہ ہے کہ روشنی کے اندر سات رنگ پائے جاتے ہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ نُور سات رنگوں سے بنا ہے۔ سُرخ۔ نارنجی۔ زرد۔ سبز۔ نیلا۔ زعفرانی۔ بنفشی۔ ان میں سے سرخ بہت ہی مدھم ہے اور بنفشی نہایت ہی انتشار پذیر ہے۔ یہ سر آئزک نیوٹن کے تجربہ کا نتیجہ ہے۔ مگر ڈاکٹر ینگ اور فرینل نے یہ ثابت کیا ہے کہ ہر ایک رنگ مسلسل تموج یا لہروں سے پیدا ہوتا ہے۔ اور اُن موجوں یا لہروں کی لمبائی کا بھی اندازہ لگایا گیا ہے۔ چنانچہ ایک انچ سُرخ روشنی میں ۴۰۹۴۰ لہریں ہوتی ہیں۔ اور چونکہ روشنی تقریباً ۱۸۶۰۰۰ میل ایک سکنڈ میں طے کرتی ہے لہذا جب ہم سُرخ گلاب کے پھول کیجانب دیکھیں گے تو ہماری آنکھ کا بینیا ایک سکنڈ میں ۳۱۴۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰ بار تھرائیگا۔ بنفشی کرنوں میں یہ لہریں بہت چھوٹی ہوتی ہیں۔ یعنی ایک انچ روشنی میں ۶۰۰۴۰ لہریں۔ پس جب ہم بنفشی رنگ کے گچھے کی جانب دیکھتے ہیں تو ہماری آنکھ کی بینیا کی تھرتھراہٹ ۷۵۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰ دفعہ ہوتی ہے۔

نُور کے بیان سے ناظرین پر واضح ہو گیا ہوگا کہ نور انسان کے لیے کس قدر ضروری چیز ہے کہ بغیر اُسکے انسان کسی قسم کا فائدہ یا حظ کسی شئے سے کبھی نہیں اُٹھا سکتا۔ اور یہ بات بھی روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ

خدا نے نور کی ترکیب میں کیسی اعلیٰ اور کامل دانائی اور حکمت رکھی ہے کہ اُس سے دل اور دماغ کو تازگی اور روح کو فرحت ملتی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ نور کا منبع اور مخرج خود وہی خدائے ذوالجلال ہے سورجوں اور ستاروں وغیرہ کے انوار اور لوامع اُسی پروردگار کے ذاتی انوار کے پرتو ہیں۔ یہ نُور ہی ہے جو ہمکو اُس لایزال نُور کا اندرونی احساس دلاتا ہے اور اُس نور کی تحصیل کا ذوق و شوق ہم میں پیدا کرتا ہے اے خدا! تو جو نُور ہے اور نُور میں رہتا ہے، جس طرح تو نے ہمیں اس دُنیا دی نُور سے منور کیا اُسی طرح اپنی تجلی کے نُور سے ہمارے باطن کو منور کر اور ہماری موت کے بعد اپنے چہرے کے ذاتی نُور کی تجلی سے سرفراز فرما! - آمین ثم آمین۔

پی۔ کیول سنگھ

مسئلۂ انتشارِ قوت اور عالم کی بربادی

مسئلۂ انتشارِ قوت (Dissipation of Energy) طبعیات میں ایک نہایت عجیب غریب اور نہایت مشہور مسئلہ ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اجسام کی قوت عمل طبعی سے رفتہ رفتہ خارج ہو رہی ہے، اور آخرکار وہ اخراجِ قوت سے مُردہ اور بے کار ہو جائیں گے یہ عالم گیر عمل ہے۔

لارڈ کیلون کی رائے لارڈ کیلون اسکے مخترع تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ "عالم محسوسات کے اندر، عام طور پر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ قوتِ کینکہ اجسام کے اندر سے نکل نکل کر خارج ہو رہی ہے۔ جو بے جان مادی عمل جاری ہیں انکے وسیلے سے اس اخراجِ قوت کی تلافی نہیں ہوتی۔ ذرّوں کے اجتماع اور ارتباط سے بھی (قوت ضائع ہونے کا) یہ خسارہ پورا نہیں ہوتا۔ چاہے یہ عملِ اجتماع نباتی زندگی سے بہرہ یاب ہو یا کسی جان دار کی مرضی کے تابع ہو" جس کے معنی یہ ہیں کہ خواہ نباتات کے اندر قدرتی عمل جاری ہو یا خوراک وغیرہ کے وسیلہ سے ہم کام کرنے کی قوت اپنے اندر پیدا کریں مگر عمل انتشار سے جو قوت برباد ہو جاتی ہے وہ پوری نہیں ہو سکتی۔ آخرکار ہم مر جاتے ہیں۔ انجن رات دن چلتا رہتا ہے اور کچھ مدت کے بعد اتنا فرسودہ اور بے کار ہو جاتا ہے کہ مرمت سے بھی کام نہیں دیتا۔ نباتات بھی کچھ عرصہ کے بعد مرجھا جاتی اور سوکھ جاتی ہیں۔

ایک وہ زمانہ تھا کہ کرۂ ارض انسان کے رہنے کے قابل نہ تھی۔ ایک زمانہ آیندہ ایسا آئیگا کہ وہ جان داروں کی بود و باش کے قابل نہ رہیگی تاوقتیکہ انسان کا موجودہ ڈھچر اور قوائے جسمانی، دماغی، اور روحانی بدل نہ جائیں یا قوانین میں تغیر عظیم واقع نہ ہو۔ جو اس وقت عالم کے اندر موجود ہیں۔

ہربرٹ اسپنسر کی رائے عالم کی آخری حالت کی بابت ہربرٹ اسپنسر کہتا ہے "جو عمل ہر جگہ ہو رہے ہیں انکا یہ انجام ہوگا کہ پھر جگہ شہر خموشاں کی سی خاموشی چھا جائے گی۔ سب کام معطل ہو جائیں گے۔ ہم سب ہلاکت کے اُس گڑھے میں جا گریں گے جو منہ کھولے ہڑپ کرنے کو تیار ہے" (فرسٹ پرنسپلز صفحہ ۵۰۹)

مشہور عالم فلکیات رچرڈ پراکٹر لکھتا ہے: "سورج سے دس لاکھ لاکھ میل حرارت خارج ہوتی ہے جس کا صرف ۲۲۷ واں حصہ سیاروں کے حصے میں آتا ہے باقی خلا میں جا کر غائب ہو جاتا ہے۔"

سر آلیور لاج کی رائے آپ طبعیات کے نہایت ہی مشہور عالم، مانچسٹر یونیورسٹی کے پرنسپل، کئی کتابوں کے مصنف، خدا کے قائل، دین دار اور نیک آدمی ہیں۔ آپ کو ڈاکٹر والس کی طرح روحانیات سے دلچسپی ہے۔ آپ کی رائے ناطق سمجھی جاتی ہے۔ آپ انتشار قوت کی بابت لکھتے ہیں: "وہ قوت جسے قابو کر کے ہم ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل کر سکتے ہیں اور اس سے خاص کام لے سکتے ہیں، وہ کارآمد قوت کہلاتی ہے کیونکہ اس سے اپنے حسب منشا کام لیا جا سکتا ہے، گو انتقال سے قوت کی مقدار کم نہیں ہوتی مگر بار بار منتقل ہونے سے اُسکے کارآمد ہونے میں فرق واقع ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس عمل میں اُسکا کچھ حصہ زائل ہو جاتا ہے۔ اور ذراتی حرکت (حرارت) بنجاتی ہے اور اس طرح وہ ہمارے قبضۂ اختیار سے باہر ہو جانے سے کارآمد ثابت نہیں ہو سکتی۔ یہ بظاہر ناگزیر عمل ہے جو آپ سے آپ ہوتا رہتا ہے۔ اسی کا نام انتشار قوت ہے۔ تمام بے جان عملوں سے انتشار واقع ہو جاتا ہے اور یہ عمل سب جگہ اور چیزوں میں کم و بیش پایا جاتا ہے۔ جاندار ہستیاں اسکے عمل کی ہدایت کر سکتی ہیں۔"

پروفیسر جان نیٹ و اسٹوارٹ کی رائے مشہور و معروف عالمان طبعیات پروفیسر جی پی نیٹ اور بالفور اسٹوارٹ نے اپنی مشہور کتاب "دی ان سین یونیورس" (The Unseen Universe) میں حرارت کے اخراج سے عالموں کی بربادی کی بابت حسب ذیل تحریر کیا ہے: "حرارت کا میلان عام مساوات ہے۔ سچ پوچھو تو حرارت اس عالم کے اندر مساوات

کا درجہ قائم کرنے والی اور عدم مساوات کی دشمن ہے۔ اس سے اس عالم کا بلاشبہہ خاتمہ ہو جائیگا۔ اس عالم کو ایک عظیم الشان انجن یا اُس سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جابجا ہمنے انجنوں کی مثالوں سے کام لیا ہے۔ ہماری دنیا بلکہ تمام نظام شمسی کی حرارت کا سرچشمہ آفتاب ہے جس طرح آسمان کے دیگر ستارے دیگر نظامہائے شمسی کی گرمی کا مصدر ہیں۔ جو قوت ہماری ہستی کے لیے لازمی و لابدی ہے وہ اُس حرارت سے حاصل ہوتی ہے جو سورج سے خارج ہوکر آتی ہے۔ اور وہ قوت اس گرمی کا ایک نہایت ادنیٰ جزو ہے۔ گو سورج ہمیں قوت بہم پہنچاتا ہے مگر وہ خود سرد ہوتا جاتا ہے۔ آخرکار ایک ایسا وقت آئیگا جب کہ اخراجِ حرارت سے جو خلا میں ہوتی رہتی ہے سورج زندگی کو سہارا دینے والی اُس قوت سے محروم ہو جائیگا جو اس وقت اُسکے پاس موجود ہے۔ یہ بھی خیال کرنا چاہیے کہ سورج کے سرد ہونے کے ساتھ ایتھر کی رگڑ سے ہمارا کرۂ ارض اور دیگر سیارے گھومتے گھومتے آفتاب کی طرف کھنچ جائینگے اور آخرکار اُسکی سطح پہ جاکر برباد ہو جائیں گے۔ اس سے قدرۃً ایک قسم کا تصادم ہوگا جس سے حرارت اور قوت پیدا ہوگی اور کچھ عرصہ کے لیے سورج کی قوت بحال ہو جائے گی مگر بالآخر یہ بھی ختم ہو جائے گی اور آفتاب حرارت و روشنی سے بالکل محروم ہو جائے گا۔ تاوقتیکہ اپنے کسی ہمسایہ سے ایتھر کی رگڑ سے ٹکراکر اسکی ہستی تحس نحس نہ ہو جائے۔

اس بحث پر زیادہ بحث کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ مگر زندگی جہاں تک اس کا تعلق طبعی حالات اور قوا سے ہے قوت کی تسنیخ اور نئی صورتیں اختیار کرنے پر موقوف ہے۔ یہ امر بھی یقینی ہے کہ زمانہ بزمانہ اس قسم کے تغیرات کا امکان کم ہوتا جاتا ہے اور جو کچھ ہمیں عالم کے قوانین اور قوا کے عمل کی کیفیت معلوم ہے، اسکی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عالم کی آخری صورت یہ ہوگی کہ قوتِ بارزکے زائل ہونے اور قوت مخفی کے غلابے کار ہوجانے سے تمام مادہ ایک ہولناک انبار بن جائیگا اور اس مجموعہ کا درجۂ حرارت و برودت مساوی ہوگا۔

مگر نظام شمسی کی قوت مخفی اتنی وسیع ہے جسے ہم اپنی لاچاری کی وجہ سے غیر متناہی قرار دیتے ہیں کہ وہ بے انتہا صدیوں تک زندگی کی طبعی ضروریات کو پورا کرتی رہے گی۔ اگر سیرئیس (Sirius) اور آفتاب آپس میں ٹکرا جائیں تو اس سے تیس گنا زیادہ حرارت پیدا ہوگی اگر قوانین قدرت موجودہ صورت میں جاری رہے تو بے شمار زمانوں کے بعد مردہ آفتابوں کے ہمارے آفتاب سے ٹکرانے کا سخت احتمال ہے ان کے جسموں کا بڑا حصہ باریک خاک میں تبدیل ہو جائے گا اور اسکے وسیلہ سے بڑے بڑے سیارے اور آفتاب نئے سرے سے بنیں گے۔ الغرض موجودہ نظام شمسی سے زیادہ شاندار اور وسیع نظام شمسی قائم ہو جائے گا۔ مگر شمار میں اراکین شمسی کم ہوں گے۔ اس طرح کچھ مدت کے بعد قوت ختم ہو جائے گی۔ اسکے ساتھ حرکت بھی بند ہو جائیگی اور عالم کے چاروں طرف دائمی سکون اور خاموشی ہوگی۔ جیسے سیاروں کی آئندہ حالت ہوگی ویسے ہی وہ کچھ زمانہ پیشتر بھی تھے۔ انکا ہیولیٰ سفید خاک ایسا تھا جو گردش کر رہا تھا مگر اسکے اندر قوت مخفی تھی۔ خلا میں مادہ سفید بادلوں کی طرح گردش کر رہا تھا آخرکار اُس میں انقلاب پیدا ہوا اور سرد ہوکر کرے اور سیارے بنتے گئے۔ موجودہ عالم کی ابتدا ہوئی تھی تو انتہا بھی ہوگی اسے ہمیشگی اور استمرار نصیب نہیں۔ اسے فنا سے بالا سمجھنا غلطی ہے۔ آدر ا

سادگی

مجھے بارہا اس خیال سے سخت تعجب ہوا ہے کہ "سادگی" کا حاصل کرنا اور اسکی صحیح تعریف کرنا کتنا مشکل ہے۔ بادی النظر میں اسکے دو سبب ہیں۔ پہلا یہ کہ جو معنی ہم لفظ "سادہ" کے لیتے ہیں وہ محدود ہیں۔ کیونکہ یہ زیادہ تر ایک ایسے اثبات کے لیے استعمال ہوتا ہے جو نفی کے معنی دیتا ہے۔ گویہ بات تعجب انگیز

معلوم ہو مگر ہمارے قبول کردہ استعمال میں ایسا ہی ہے۔ ہم عام طور پر "سادہ طریقہ" اور "ایک سیدھی سادی بات" کے الفاظ کا استعمال کیا کرتے ہیں اور ان الفاظ سے ہمارا یہ مفہوم ہوتا ہے ایک ایسا "طریقہ" یا "بات" جس کے کرنے کے لیے ہمکو زیادہ ہوشیاری اور تیز فہمی سے کام نہ لینا پڑے۔ پھر ہم کہا کرتے ہیں "سیدھا سادہ آدمی" جس کا مطلب ایک ایسے شخص سے ہوتا ہے جو چالاک اور ہوشیار نہ ہو۔ بعض اوقات ہم اس سے بھی بڑھکر کہا کرتے ہیں کہ "اوہ! یہ تو مجسم سادگی ہے۔" جسکا مطلب اس سے بہت زیادہ ہوتا ہی جس قدر سمجھا جاتا ہے۔ اسکے اصلی معنی سے نہ کہنے والا آگاہ ہوتا ہے نہ سننے والا یہ لوگ قابل افسوس ہیں۔ استعمال اور عادت نے خیال کی حدبندی کردی ہے۔ سادگی کے معنی میں ذیل کی باتیں شامل کرلینا مناسب ہوگا:—

(۱) لطافتِ مزاج بے ریاکاری۔

(۲) فطرت کامل جو تبدیلی اور شکست سے مبرا ہو۔

(۳) آزاد معصومیت جو سب کے ساتھ یکساں ہو۔

(۴) عادات کی صفائی جو اندرونہ کا سچا انعکاس ہو نہ کہ رسوم کی مصنوعی نمود یہ خیال کہ "یہ باتیں خیال ہی خیال ہیں" قابلِ اعتراض ہے۔ "سادگی" کی تعریف کیوں کرتے ہو؟ درخت سے گھاس کیوں مراد نہیں لیتے حالانکہ اسکے بھی تنہ اور پتے ہوتے ہیں؟۔

پس یہ محدود نفی کا پہلو ہے جو ایک اثباتی لفظ کے کہنے اور سننے والے کو پیش آتا ہے۔ "جو کچھ ہے" یہ "جو کچھ نہیں ہے" کے بعد آتا ہے۔ علاوہ ازیں ایک دوسرا پہلو ہے جو اسکے اثباتی معنوں کی اہمیت سے انکار کرتا ہے اور یہی ہمارا نہایت اہم اور دوسرا سبب ہے۔

ہماری سویلزیشن (تہذیب) خاص طور پر ہمکو ہر صاف اور سادہ چیز کے لیے اندھا بنا دینے کی ذمہ دار ہے۔ سادگی پیچیدگی پر حکومت کرتی ہے، اور تکلف (Complexity) ترقی پر۔

دن، رات، بہار، موسم گرما، خزاں اور موسم سرما ایک دوسرے کے بعد واقع ہوتے ہیں صرف زمین کی ایک سادہ حرکت سے انسان کا عجیب و غریب ڈھانچ قائم ہے صرف سادہ طور پر سانس لینے اور نکالنے سے۔ بلاشک "سادگی" نہایت تحیر انگیز ہے! اس سرزمین کی ہر چیز کو آزماؤ مگر کوئی بھی سادگی کے احاطے سے باہر نہ پائی جائے گی۔

اب تھوڑی دیر کے لیے اس "خالق اصغر" یعنی انسان عظیم کا خیال کرو اسکا سب سے بڑا کام سویلائیزیشن ہے۔ اسپر کون حکومت کرتا ہے؟ مذہب، فلسفہ، علم، سیاست، سائنس، جنگ، صلح، صناعی، تجارت، زر، آزادی، دستکاری، انصاف اور سخاوت وغیرہ وغیرہ۔ جو الفاظ ملتے جائیں سب ان کے ساتھ ملاتے جاؤ یہاں تک کہ کوئی نام باقی نہ رہے۔ لیکن "اس پر کون حکومت کرتا ہے؟" یہ سوال پھر بھی حل طلب رہ جاتا ہے جب تک ہم یہ نہ کہیں کہ "انسان سویلزیشن پر حکومت کرتا ہے اور سویلزیشن انسان پر"۔ اسکا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ ہر نسل اور ہر صدی اپنے "مہذب ترین" ہونے کا دعوی کرتی ہے اور اپنے سے کچھ ہی پہلے زمانہ کو "زمانۂ تاریک" (Dark Age) کا خطاب عطا فرماتی ہے۔ سنہ عیسوی کی ابتدا ہوئی اور اس سے پہلے زمانہ کو یوں ہی کے ساتھ "تاریک" کہا گیا۔ تہذیب نے ایک دوسرا نام وضع کیا اور گذشتہ چودہویں صدی کو "زمانۂ وسطیٰ" کہکر پکارا گیا۔ ہم بیسویں صدی کے اشخاص بھی ان ہی خطابات میں حصہ لیں گے اور تیسویں یا چالیسویں صدی کے لوگ ہماری پہچان کے لیے کوئی نیا نشان ایجاد کریں گے۔ چھوٹے چھوٹے زمانوں پر "ادوالیشن" کا لیبل لگایا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ بڑھتے بڑھتے ایک تازہ نام حاصل کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ "انسان عظیم" درحقیقت انسان عظیم ہے!

یہ ہے انسان کی ساختہ سویلزیشن کا خاکہ۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے اسکی پیدائش کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمکو معلوم ہو جائے گا کہ کس طرح زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ "سادگی" سے نظر پوشی کی گئی ہے۔ بے شک تخیل پر بھی کچھ الزام رکھا جاتا ہے مگر نتیجہ کوشش عام طور پر قبول شدہ ہے۔ ہر شخص کو قریب قریب معلوم ہے کہ انسان پیشتر کس طرح پھلوں، گوشت اور چشموں کے پانی پر گزارا

کیا کرتا تھا۔ حضرت انسان غاروں یا درختوں کے سایہ میں رہا کرتے تھے۔ ہر طرف نیچر کی حکومت تھی۔ یہ میدانی زندگی صحت بخش، طاقت ور، اور بے لوث تھی۔ فکر، رنج، گناہ اور خجالت کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ نہ بیماریاں ہوتی تھیں، نہ قحط پڑتے تھے، نہ بغاوتیں ہوتی تھیں نہ آزادی کے لیے کوششیں۔ صرف آزادی اور سادگی ہر طرف بے کھٹکے اور بے پوچھے گچھے حکومت کرتی تھیں۔ خیالات سادہ تھے مگر وسیع اور متفق۔ خیالات نہ تو ہزاروں جانب منقسم تھے اور نہ فضولیات میں اُلجھے ہوئے۔ اس کے بعد آگ نے رواج پایا جس نے ہمارے تعلقات کو نیچر سے کامل طور پر جُدا کر دیا۔ اُس چور کو جس نے آسمان سے آگ چُرائی تھی، دیوتاؤں نے کافی سزا دی۔ یہ سزا انسان کو دی گئی اور نظیر سابقہ قائم ہو گئی۔ ہم اب بھی دیوتاؤں کے انصاف کو بُرا کہتے ہیں۔ اسی آگ کے معلوم ہونے کے دن سے سویلزیشن کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ کیونکہ اسی وقت سے ضروریات کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا اور انکے پورا کرنے کے ذرائع بہت کم دستیاب ہوتے گئے۔ گھڑی نے تختہ ساعت نما کو شکست دی اور تب ہی سے زمانہ موجودہ ماڈرن ازم (Modernism) کا آغاز ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ضروریات بے حد بڑھ گئیں اور برکاتِ اولیں غائب ہو گئیں۔ مجوسیوں کا یہ کہنا بجا تھا کہ "شیطان سویلزیشن کا باپ ہے۔ اس نے خوشی، صفائی اور معصومیت یا بالفاظ دیگر "سادگی" کے چلے جانے کے بعد اچھائی اور بُرائی دونوں نازل کیں"۔

"انسان مظہرِ خالق ہے" یہ اب ہماری پیدائش اور خلقت کا ایک متروک الاستعمال مقولہ رہ گیا ہے۔ جو مقولہ موجودہ "تہذیب" صدیوں پر صادق آتا ہے وہ یہ ہے کہ "انسان اچھائی اور بُرائی کا غیر منفک مجموعہ ہے"۔ شیطان کے الہام کا کیا ہی عمدہ نتیجہ ہے! اسی سے تمام شکست کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ ہماری تمام خلقت مخلوط (Complex) ہو گئی ہے۔ ہمارا دماغ ایک گہرے اختلاط میں کام کرتا ہے اور کبھی کبھی اس خلط کو اور بھی زیادہ مخلوط کر دیتا ہے۔ ہم اخلاق کے قواعد بناتے ہیں یہ فرض کر کے کہ علم الاخلاق ایک نہایت پیچیدہ چیز ہے ورنہ قواعد کی کیا ضرورت۔ لیکن ہم خود نہیں جانتے کہ جبکا ہم اعلان کرتے ہیں وہ بھی اصل چیز ہے۔ "جان کے بدلے جان" ہم کہا کرتے ہیں لیکن کبھی ان الفاظ کا میدانِ جنگ میں بھی خیال رکھا جاتا ہے؟ اگر تم بحق شاہنشاہ کے ساتھ "قتل قتل قتل قتل۔ قتل قتل" کی ہم نوائی کرو تو یقیناً اخبارات میں تمہاری بے حد تعریف کی جائے گی۔ تمہارا قاتلانہ اور لغتی فن سپاہ گری تاریخوں میں تحریر کیا جائے گا اور اسکے معاوضہ میں تمہارے نام کے ساتھ چند الفاظ بڑھا دیے جائیں گے۔ "ہر ایک سے محبت کرو یہاں تک کہ اپنے دشمنوں سے بھی" یہ ہمارے کرہ کی ایک سادہ ترین آواز نے اعلان کیا تھا۔ "بے شک لیکن بلحاظ تفریق رنگ کے" اسپر سیاسی با اخلاق شخص ایزاد کرتا ہے اور پھر بھی ہزاروں جبر، وعدوں اور دروغ گوئیوں سے واسطہ پڑتا ہے۔

اسی طرح تمام انسانی شاخوں میں کوئی ایسا قاعدہ کبھی نہیں بنایا گیا جسکے ساتھ اُسکا "باطل ساز" استثنا نہ لگا ہو۔

ہم نے اپنے واسطے ایک نئی بادشاہت قائم کی ہے جسکا اصول فرمانروائی سادگی نہیں بلکہ تکلف ہے۔ اچھائی، سادگی، اور صفائی سے یکساں جدائی ہمارا کام رہ گیا ہے۔ ہمارے مقاصد بھی ایسے ہی ہیں یعنی کسی چیز کو جس حالت میں پائیں اُسے اُسکے برخلاف بنا دیں۔ بعض اوقات میں گھنٹوں اس بات پر غور کیا کرتا ہوں کہ کیا دنیا میں کوئی انسان کی ایجاد کردہ ایسی سائنس بھی ہے جسکی بنیاد سادگی پر رکھی گئی ہو؟

میں پہلے مذہب کو لیتا ہوں، جو دنیا میں ہمارا مقصد خاص ہے۔ اسکی بنیاد خلاقِ عالم کے سادہ ایمان پر ہے۔ لیکن بعض آدمی ہمکو بے حد پیچیدہ مباحث میں ڈالتے ہیں جن سے ہماری عقل گم ہو جاتی ہے اور ہم تعجب کرنے لگتے ہیں کہ آیا ہم زیادہ عقلمند ہیں یا زیادہ بے وقوف۔ بعض آدمی ریاضت کی تعلیم دیتے ہیں جسکو عقل سلیم قبول نہیں کرتی۔ تیسرا گروہ تارک الدنیا ہونے کی

صلاح دیتا ہے۔ دوسرے یہ بتاتے ہیں کہ "جو یہاں ہے سو وہاں ہے" ایک گروہ کہتا ہے کہ جب تم دنیا میں تناسخ کے پھیرے سے نکل جاوگے تو کچھ حاصل ہوگا۔ اور جب اس "کچھ" کی تشریح پوچھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ "کچھ نہیں" سے بھی بدتر ہے۔ اسی کے ساتھ عظیم الشان مہذب اور نیشنلک پرستش No-ism کی ہے۔ یہ لوگ ہر چیز سے انکار کرتے ہیں۔ انسان ان رسومات، عقائد، رواجات، اقوال اور انکارات وغیرہ کے اغلاط کے سامنے حواس باختہ ہوجاتا ہے۔ "سادہ غیبی آواز" پر لوگ کم توجہ کرتے ہیں۔ خداوند تعالیٰ مثل ایک شفیق باپ کے اپنے بچوں سے کہتا ہے "میری طرف آؤ" لیکن جب ہم اُسکی طرف جاتے ہیں تو اس طرح جاتے ہیں جیسے کوئی سراغرساں کسی کے اسرار دریافت کرنے جاتا ہے یا جس طرح کوئی ترجمان جو اپنے کو بہ نسبت اُس شخص کے جسکی وہ ترجمانی کرتا ہے زیادہ ظاہر کیا کرتا ہے۔ اسکے بعد ہم ان اسرار کو امتحانی نلی میں ڈالتے ہیں۔ گرمی پہنچاتے ہیں۔ رنگ دیکھتے ہیں، نتیجہ نکالتے ہیں اور آخرکار اپنی حماقت کا اظہار کرتے ہیں۔

غریب "مہذب آدمی" اپنے ایک انچ بھر کے دماغ سے ہر چیز کا امتحان کرنا چاہتا ہے جسکے لیے وہ ہرگز قابل نہیں ہے۔

اب میں اپنے مشاغل تفریح کو لیتا ہوں۔ یہ بھی قابلِ اطمینان نہیں۔ ہر بچہ روتا اور چلاتا ہوا پیدا ہوتا ہے۔ بس یہی کافی ہے۔ اسکے بعد ہم رونے سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ زندگی بھر ہمارا یہی مشغلہ رہتا ہے کہ کوئی ایسی چیز ایجاد کریں جو کبھی کسی نے نہ بنائی ہو۔ ہماری پیدائش کے ساتھ ہی ہنسنا اور مسکرانا بھی آتا ہے جو ہمارے قلبی انبساط کا بیرونی انعکاس ہوتا ہے۔ نیچر نے یہی چیزیں ہماری تفریح کے لیے دی ہیں۔ انکی اشکال مختلف ہوتی ہیں لیکن انکا رجحان یکساں رہتا ہے۔ زمانۂ خوشی پانچ سال تک رہتا ہے۔ اسکے بعد ہر چیز اچھی معلوم ہونے لگتی ہے۔ خاک، گھاس، درخت، پتے، پھول اور عالم کا ہر نظارہ اور آواز ایسی معلوم ہوتی ہے گویا یہ چیزیں خاص ہمارے ہی لیے بنائی گئی ہیں۔ ہم ایسا کہنے میں انکے ساتھ کافی انصاف کرتے ہیں۔ تم نے اکثر بچوں کو سڑک کے کنارے خاک میں لوٹتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ وہ اس میں بہت زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ اتنا زیادہ جتنا کہ تم اپنے تازہ خرید ریشمی لباس میں بھی نہیں ہوئے۔ تمھاری تہذیب انھیں "گندہ" کہتی ہے مگر ابھی فیصلہ باقی رہتا ہے کہ آیا تم زیادہ ناپاک ہو یا وہ۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے بچہ انسانی تہذیب میں گرفتار ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے گزشتہ مشاغل تفریح کو طفل مزاجی پر محمول کرنے لگتا ہے۔ صاف اور سادہ خوشی جو ہمارے اردگرد کی چیزوں سے دل میں پیدا ہوتی تھی کم ہونے لگتی ہے اور مثل تھیٹر، راگ، رقص، دعوت، دوڑ، شطرنج اور دوسرے تہذیبی ناقابل بیان تکلفانہ مشاغل تفریح میں خوشی پانے لگتے ہیں۔ جب تک ہماری رگوں میں سرخ خون دوڑتا رہتا ہے ہم ایک لحظہ کے لیے بھی انکا پیچھا کرنے سے باز نہیں رہتے۔ ضعیفی آجاتی ہے، گرمی نکل جاتی ہے اور ہم تمام عمر کے گناہوں کا کفارہ چند مختصر دعاؤں سے کر کے گوشۂ تنہائی میں جا بیٹھتے ہیں اس امید میں کہ ہمیں دوسرے عالم میں بھی ویسی خوشیاں نصیب ہوں جیسی ہم نے یہاں دیکھی ہیں۔

سب کے سب اندھے راحت طلب ہیں! کیا ہم کبھی اپنی بنائی ہوئی چیزوں کے انجام پر بھی نظر ڈالتے ہیں جو صرف اس وجہ سے دل خوش کن ہیں کہ وہ ہمارے جسم کی بعض حس کو گدگداتی ہیں۔ یہ لوگ چندھیانے لگتے ہیں، متعجب ہوتے ہیں، گھبرا جاتے ہیں، پژمردہ ہوجاتے ہیں، اُکتا جاتے ہیں، مگر انھیں کبھی سچا اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ نہ کبھی انکی سچی خوشی کی رگ حرکت میں آتی ہے۔ نہ وہ ہم کو بچا سکتے ہیں نہ ہمارے اخلاق درست کر سکتے ہیں۔

"اُٹھتی ہوئی لہروں کی طرف بڑھنا کبھی آرام دہ نہیں ہوسکتا۔" دماغ پر خواہ مخواہ اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ یہ اُن تمام قدرتی مناظر کے لیے بیکار ہوجاتا ہے جو درحقیقت خوب صورت ہیں، سادہ ہیں، اور خصوصاً ہمارے خوش کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ کس نے ہماری آنکھیں صبح، طلوع آفتاب، دوپہر کی خاموشی، خاموش دریا کے کناروں، میدانوں، درختوں اور انکے کھیتوں، بادِ نسیم، شفق، اور شب ماہ کے نظاروں کی طرف سے بند کردی ہیں؟ سوسائٹی

اور اُسکے موجد نے۔ یہ جواب ہے۔ ہم ان بڑے نظاروں کے وقت سوتے رہتے ہیں اور باقی کو "غیر دلچسپ" کہہ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ ہمارا ہندوستان کبھی ورڈسورتھ کی قدر و منزلت نہیں جان سکتا۔ باوجود اس امر کے کہ ہمارے پاس خوبصورت سے خوبصورت سینریوں اور عمدہ سے عمدہ مناظر کی کمی نہیں، پھر بھی ہمارے خیالات شاذ و نادر اپنی اندرونی جگہ کو چھوڑ کر ان قدرتی مناظر کے دیکھنے کی تکلیف گوارا کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو گاڑیاں اور گھوڑے رکھتے ہیں نشست گاہوں اور پارکوں میں جا کر اپنی ضرورت فیشن پوری کر لیتے ہیں۔ اس سے اُنکا یہ مطلب ہوتا ہے کہ خود عورتوں اور مردوں کو دیکھیں اور دکھائیں۔ اُنکے پاس درختوں یا گھاس کے پیچھے غروب ہوتے ہوئے آفتاب کا دل فریب نظارہ دیکھنے کے لیے بہت تھوڑا وقت ہوتا ہے۔ اُنکو بزرگ جو قسمت یا ذمت کے ذرا ہیٹے ہیں، خوشی کا دروازہ بالکل بند ہوتا ہے۔ انکے پاس ایسی چیزوں کا خیال کرنے کے لیے وقت کم اور قابلیت معدوم ہوتی ہے۔ انکے لیے آفتاب کا طلوع ہونا گویا روزانہ کام کے لیے بلاوا ہے اور شام دن بھر کی مزدوری کے بعد آرام کرنے کے لیے۔ اگر کچھ وقت ملتا بھی ہے تو وہ حقہ وغیرہ پینے اور فضول گفتگو میں ضائع کر دیتے ہیں۔ بعض وقت میں خیال کیا کرتا ہوں کہ آیا ان لوگوں کے دماغ بھی ہے۔ اوقات فرصت بھی ان لوگوں کے لیے راحت و انبساط ہیں جو ذرا سا بھی دماغ رکھتے ہیں۔ اب طالب علموں کو لو۔ ان پر کم از کم نیچر کے کچھ حقوق ہیں کیونکہ وہ اس کی بابت انگریزی کتب کا مطالعہ کرتے وقت کچھ سنتے اور پڑھتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ طلبا نیچر سے عجیب بے پروائی اور بے خبری کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک انٹرنس کے طالب علم سے پوچھو کہ "قدرتی سینری سے کیا مطلب ہے؟" اُسنے سینری یا سین کا نام تو تھیوالفریڈ کمپنی یا کسی اور تھیٹر میں سنا ہوگا مگر "قدرتی سینری" اُسکے لیے ایک بالکل عجیب بات ہے۔ لفظی معنی تو وہ جانتا ہے لیکن ہزار طالب علموں میں سے ایک بھی اُسکو ادراک نہیں کرتا۔ اُس سے حظ اُٹھانا تو ایک بڑی بات ہے۔ یہی حالت اُن لوگوں کی ہوتی ہے جو ورڈسورتھ، کولرج، شیلی، کیٹس، براؤننگ اور ٹینی سن کی کتب کا سرسری مطالعہ کرتے ہیں۔ مطلب سمجھ لیا جاتا ہے اور اسکی ایک تصویر دماغ میں اُتار لی جاتی ہے مگر اسکی اصلی تعریف کرنا ایک ہندوستانی طالب علم کے لیے ناممکن ہوتا ہے۔ آنکھیں ہیں لیکن دیکھتی نہیں، کان ہیں مگر سنتے نہیں۔ اُنکی ذہانت عجب طور سے اغلاط کے چکر میں گردش کرتی رہتی ہے۔ مثال کے لیے میں اپنے ایک ہم جماعت کا قصہ بیان کرتا ہوں۔ کالرج کی کتاب پڑھتے وقت جب ہم اُن چند اشعار پر پہنچے جو سر پیٹرک اسپنس (Sir Patrick Spens) کی زبان سے بیان کیے گئے ہیں:۔

"کل میں نے نئے چاند کو دیکھا جو پرانے چاند کے ساتھ ہم آغوش تھا" تو اسکا مطلب میرے دوست کی سمجھ میں نہیں آیا۔ میرے لیے ہر چاند کی پہلی تاریخ کو یہ ایک عام نظارہ تھا۔ میرے دوست نے جب پروفیسر سے اسکا مطلب دریافت کیا تو اُس نے جواب دیا "یہ کسی شام کو دیکھ لینا"۔ ایسی ایسی عام چیزوں کے مشاہدہ کی کمی ہندوستانی طلبا میں عام ہے۔ وہ اپنے مطالعہ، کھیل اور ہنسی مذاق میں اتنے مستغرق رہتے ہیں کہ انکو اس قسم کی "بیہودگیوں" کے لیے وقت بھی نہیں ملتا۔ سادہ اور عمدہ ترین قسم کی خوشیاں اُن میں معدوم ہیں۔ تنہائی سے وہ نفرت کرتے ہیں۔ میدان اور دوسرے غیر آباد مقام اُنکے لیے ناقابل برداشت اور بالکل غیر دلخوش کُن ہیں۔ ان میں سے ایک بھی گنجان درختوں کے نقاب میں سے طلوع ہوتے ہوئے رُخِ آفتاب کا نظارہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا، اور نہ کوئی غروب آفتاب کی خوش نظارگی کا مشاہدہ کرتا ہے۔ پارک در حقیقت نصف النہار اور چاندنی رات میں نصف شب کے وقت نہایت خوش نما معلوم ہوتے ہیں۔ شہر کے بکثرت آباد حصص بھی رات میں دو تین بجے کے وقت جبکہ ماہتاب کی روشنی پھیکی پڑنی شروع ہو جاتی ہے، قابل دید ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ میرے بیان کرنے پر کہ مختلف پرندوں کے پروں کے نشانات ایک علیحدہ رہتے ہیں بے حد خوش نما نظر آتے ہیں، احباب نے تحقیر آمیز قہقہہ لگایا تھا۔ ایک دوسری مرتبہ میرے دوست مجھ پر افسوس کرنے لگے جب میں نے بیان کیا کہ رات کو میں

اور اُس میدان میں اس لیے ٹھہر گیا تھا کہ اپنے چاروں طرف گیدڑوں کا شور و غل سنوں۔ تنہا ایک وسیع تاریک میدان میں جانا جس پر ناہ تمبر کی لانبی لانبی گھاس بچھی ہو، اور وہاں شکار کی تلاش میں کسی درندہ کا دہاڑنا جس سے تمام میدان گونج اُٹھے، اسکے بعد ایک گہری خاموشی کا ہر طرف چھا جانا اور کسی ایسی ہی مہیب آواز کے خوف سے گھر کو واپس چلا آنا، ایک طلسمی راحت و انبساط رکھتا ہے۔ دن کے وقت بھی ایسے مقامات میں جانے سے مجھکو خوف ہے کہ لوگ نظر حقارت سے دیکھیں گے، لیکن میرے نزدیک یہ خطرات اور ہیبت ناک آوازیں بہ نسبت کسی قومی رفارمر کی آوازوں، یا کسی نئی راہ کے لیے پولیٹیکل چیخ پکار کرنے والوں سے زیادہ بے لوث اور پاک و صاف ہیں۔

اسی طرح اور روزانہ امور میں بھی سادگی صرف اپنے فقدان کی وجہ سے سرفراز ہے۔ ہر امر پر جدا گانہ بالتفصیل بحث کرنا طول اور مشکل ہے۔ اس لیے یہ بہتر ہے کہ ان سب پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔

لباس میں جتنے زیادہ اور پُر تکلف کپڑے، تم استعمال کرو اُتنے ہی زیادہ اپ ٹو ڈیٹ خیال کیے جاؤگے۔ محض فیشن تمھارے واسطے کافی نہیں یعنی بغیر "تکلف" اور "فیشن" کے مجموعہ کے کام نہیں چل سکتا۔

کھانے کا طریقہ اتنا قدیم، صنعتی اور تکلفانہ ہے کہ لفظ صفت "سادہ" اس کے کسی حصہ کے لیے استعمال کیا جانا موجبِ شرمندگی ہے۔ جسنے کھانا پکانے کی ایک خود نما فلاسفی بنالی ہے۔

گفتگو کرنا زمانۂ موجودہ کا ایک مشکل ترین ہنر ہے۔ اگر تم کم گفتگو کرو، تو ڈرپوک، عجیب اور ناقابل شمار کیے جاتے ہو۔ اگر زیادہ گفتگو کرتے ہو تو "باتوں کی مشین" "بے لطف"، اور "کتابی" کے خطابات کی عزت حاصل کرتے ہو۔ سادہ گفتگو معیوب سمجھی جاتی ہے۔ جتنا زیادہ تم تخیل کی مدد سے اپنی گفتگو میں نمک مرچ ملا سکو اور جتنے دروغ آمیز فقرے تم شامل کر سکو، اُتنے ہی زیادہ پختہ کار اور خوش مزاج مانے جاؤگے۔

سادے اور سیدھے راستے اب پُر خطر ہیں۔ اس طرح رہو کہ ہر آدمی تمھاری نسبت یہی ایک رائے قائم کر سکے لیکن ان میں ایک بھی درست نہ ہو اسی طرح اگر ہماری عادات سادہ ہیں تو وہ محض مخلوط سمجھے جانیکے قابل ہیں۔ ہمنے "سادگی" کو اپنے پاس سے اتنا دُور پھینکدیا ہے جتنا ممکن تھا۔ لیکن ہمیں یہاں بھی اطمینان نہیں۔ بعض اوقات ہم اس سے بڑے معنی نکالتے ہیں۔ چنانچہ سب لوگ جانتے ہیں کہ "سادہ لوح" کے کیا معنی ہیں۔

سویلزیشن نے سادگی کو یہ جگہ دی ہے۔ میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ یہ کیونکر واقع ہوا۔ جوں جوں دنیا یا انسان ترقی کرتا جاتا ہے سادگی تکلف میں مخلوط ہوتی جاتی ہے۔ کچھ بھی ہو مگر میں تو یہی کہوں گا کہ یہ ناروا اور نادرست ہے۔ ہمارے دماغوں کی کشادگی مفقود ہو گئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ روزمرہ کی باتیں دماغ پر اپنا اثر نہیں چھوڑتیں۔ میں آج کل کے آدمیوں کو خیال کرتا ہوں گویا وہ دو بڑے پلاتوں کے سامنے کھڑے ہیں اور محنت سے بنائی ہوئی مہذب ضروریاتِ زندگی کا پلہ برابر کرنا چاہتے ہیں جس کا برابر اور کم کرنا اُن کی طاقت سے باہر ہے۔ وہ اوزان جانتے ہیں جن کو کبھی ادھر کبھی اُدھر رکھتے ہیں، ڈنڈی کو دیکھتے ہیں، مگر اطمینان نہیں ہوتا۔ بے فائدہ چاروں طرف نظر ڈالتے ہیں، خود کو ترازو کے پلڑے میں ڈال دیتے ہیں، پھر بھی وزن برابر نہیں ہوتا۔ اگر میں کسی ایسے کام پر مقرر کیا جاتا تو میں بجائے بتوں کے پودے، گھاس، پتے، پانی اور دوسری بہت سی سادہ چیزیں ڈالتا اور مشہور شہنشاہِ روم کے ایک باغ کی ناچیز پیداوار کو بادشاہی پر ترجیح دیتا۔

دنیا میں تم سادگی کے ساتھ رہو تو آدھی دنیا پر غالب جاؤگے۔ سادہ عادات، سادہ خیالات، سادہ مشاغل تفریح، سادہ تلذذات سادہ ضروریات، سادہ اعتقاد رکھو۔ دنیا مع اپنے تزئین تکلف کے تم پر کچھ اثر نہ ڈال سکے گی۔ ایک مرتبہ اور یاد رکھو کہ "سادگی فخر پر حکومت کرتی ہے اور تکلف ترقی پر"۔ اب اس بات کا فیصلہ تمھارے اوپر ہے کہ تم کس کے مقلد بنا پسند کرتے ہو۔ مترجمہ محمد ابراہیم خاں تجلی

العصر

زمین کی حرکتِ محوری کے بعض اہم نتائج

سائنس نے مدت ہائے دراز تک "قدرت" کے حضور مین جبین نیاز رگڑنے کے بعد آخر یہ حق حاصل کر لیا کہ اب اس کے نام لیوا "قدرت" کے عالیشان مظاہر کے قدیم اور سربستہ راز ایک محو حیرت عالم کے سامنے وثوق کے ساتھ بیان کر سکتے ہین۔ سائنس کی دوربینی واقعات ماضی کے علل اور اسباب کی گتھی سلجھانے مین جس حد تک کامیاب ہو چکی ہو ہم اُمید کرتے ہین کہ ہمارے ناظرین اُس کا کسی قدر اندازہ موجودہ مضمون کے مطالعے فرما سکین گے ؎

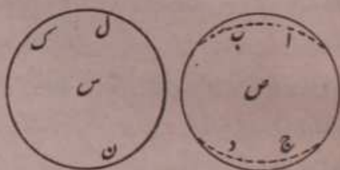
خدا وے وہ دوربینی اور اس چشم تصور کو
کہ لاکھون کام اسکے دور کے پردہ مین نکلے

زمین کی محوری حرکت کے متعلق ہم اپنے گذشتہ دو مضامین مین شرح و بسط کے ساتھ بحث کر چکے ہین۔ پہلے مضمون مین ہم نے یہ دکھانے کی کوشش کی تھی کہ زمین کی حرکت اور دیگر تمام اجرام فلکی کی حرکت فقط ایک عالمگیر قانون کے تابع ہو اور دوسرے مضمون مین ہم نے زمین کی محوری حرکت کے ثابت ہونے کو تین مختلف دلائل سے ثابت کیا تھا۔ موجودہ مضمون اس سلسلہ کا آخری اور سب سے ضروری حصہ ہے پہلے دو مضمون ایک حد تک اس کا دیباچہ تھے۔

اگر ہم زمین کی محوری حرکت کے جملہ نتائج محض ایک فہرست کی شکل مین یہان درج کر دین تو شاید بعض سطحی نگاہ والے اس طرز عمل سے بہت محظوظ ہون گے لیکن علمی نقطۂ خیال سے یہ کوئی احسن طریقہ نہ ہوگا۔ سائنس سے واقفیت پیدا کرنا صرف معلومات مین اضافہ کرنے کا نام نہین ہے بلکہ اصلی اور حقیقی مقصد سائنس کی تعلیم کا دلون مین ایک علمی صلاحیت پیدا کرنا ہو۔ سائنس کا اولین خاصہ یہ ہے کہ اس مین کوئی بات تحکم سے نہین قبول کرائی جاتی بلکہ ہر بیان کے لیے ایسی معقول و قابل پذیرائی دلائل پیش کی جاتی ہین جن کے حسن و قبح پر بحث کرنا ہر سمجھ دار کا فرض ہونا چاہیے۔ علمی تحقیقات کا کوئی شعبہ کسی خاص جماعت کے لیے مختص نہین ہو بلکہ جو کوئی اپنے آپ کو انہی حالات مین رکھ سکے جن مین دوسرے سائنس دانون نے اپنے تئین رکھا ہو اس پر وہی حقائق منکشف ہو سکتے ہین جو دوسرون پر منکشف ہو چکے ہین۔ اگر ایک خاص تجربہ یا مشاہدہ

ایک آدمی کر سکتا ہو تو ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی بھی اس کے کرنے پر قادر ہو سکتا ہو۔ سائنس میں استثنائی حالتیں شاذ کا حکم رکھتی ہیں۔

مختلف دلائل اور مشاہدات کی بنا پر یہ بات یقینی طور پر مانی جاتی ہو کہ مرکز سے زمین کی سطح کا فاصلہ مختلف مقامات پر مختلف ہو۔ ہمارا اشارہ یہاں سمندر اور پہاڑوں کے نشیب و فراز کی طرف نہیں بلکہ اس قسم کے اختلاف کی طرف ہو جسکی بدولت زمین کا نصف قطر خط استوا سے شروع ہو کر قطبین کی طرف کم ہوتا جاتا ہے[1]۔ دوسرے الفاظ میں اس اختلاف کو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ زمین کی شکل ایک کرہ (Sphere) کی سی نہیں ہو جسکی سطح کا فاصلہ مرکز سے ہر جگہ برابر ہوتا ہو بلکہ اسکی شکل "شبہ کرہ" یعنی سفیرائڈ (Spheroid) کی سی ہو جو کرہ کو کسی قطر کے سروں پر نیچے کی طرف دبا دینے سے پیدا ہوتی ہو۔ زمین قطبین پر چپٹی ہو اور خط استوا پر سے ابھری ہوئی ہو۔ قطبین کا فاصلہ مرکز سے بہ نسبت خط استوا کے تقریباً ۱۴ میل کم ہو۔ استوائی قطر ۷۹۲۰ میل لمبا ہو اور قطبی قطر اس سے ۲۰ میل کم یعنی ۷۹۰۰ میل ہے۔ اگر آپ ایک دائرہ کو ایک قطر کے گرد گھمائیں تو آپکو



آنکھ کی کمزوری کی وجہ سے ایک کرہ دکھائی دیگی۔ اگر دائرہ کو اب اور ج د کیطرح ذرا سیدھا کر دیں اور پھر گھمائیں تو شبہ کرہ کی سی شکل دکھائی دے گی۔ یہ ثابت کرنا کہ فی الاصل قطبی اور استوائی قطر میں ۲۰ میل کا فرق ہو ہمارے بحث سے خارج ہو لیکن ہم یہاں چند امور کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں جن سے اس امر کا پتہ چلتا ہو کہ قطبی قطر استوائی قطر سے کم لمبا ہو یا یہ کہ زمین سنگترے کیطرح وسط میں ابھری ہوئی ہو اور شمالی جنوبی سروں پر چپٹی ہو۔ قانون تجاذب مادی کے مطابق زمین کی کشش کسی مقام پر اس تناسب سے کم ہوتی ہو جس تناسب سے اس مقام کے مرکزی بعد کا فاصلہ بڑھتا ہو۔ لہذا اگر اس کشش کا اندازہ سطح زمین کے اوپر جگہ بہ جگہ استوا سے لیکر قطبین تک کیا جائے تو زمین کی شکل کے متعلق مفید مطلب معلومات ہم پہنچ سکتے ہیں۔ اس کشش کا اندازہ ہم تین طریقوں سے کر سکتے ہیں

(۱) زمین کی کشش ایک گرنے والے جسم میں تقریباً ۳۲ فٹ یا ۹۸۱ سنٹی میٹر[2] فی ثانیہ فی ثانیہ کا اسراع[3] پیدا کرتی ہو۔ اس اسراع کا معیار کئی طریقوں سے ہو سکتا ہو۔ متعدد مقامات پر تجربات کا نتیجہ یہ ہو کہ اسراع کی مقدار سب جگہ یکساں نہیں ہو بلکہ خط استوا پر ۹۷۸ اور قطبین کے قریب ۹۸۳ سنٹی میٹر فی ثانیہ فی ثانیہ ہے۔

(۲) اسراع کا اندازہ پنڈولم (Pendulum)[4] کے ذریعے سے بھی ہو سکتا ہو۔ اگر ایک پنڈولم کی لمبائی میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے تو اسکے ادھر سے ادھر تک ایک دفعہ حرکت کرنے کا وقت اسی تناسب سے گھٹتا بڑھتا ہو جس تناسب سے زمین کی کشش کے اسراع کا وقت بڑھتا گھٹتا ہو۔ اگر کسی مقام پر ایک خاص لمبائی کے پنڈولم کا نوبتی وقت (Period of Vibration یا Periodic Time)

[1] ہم کسی دوسری جگہ ذکر کر آئے ہیں کہ زمین کے محور کے شمالی اور جنوبی سروں کو قطبین کہتے ہیں اور ان کے عین وسط میں زمین کے گرد ایک محیط خط کا نام خط استوا ہے۔

[2] فرانس اور یورپ میں لمبائی کا پیمانہ میٹر (Metre) ہے۔ ایک میٹر میں سو سنٹی میٹر (Centimetre) ہوتے ہیں۔ ایک انچ ۲½ سنٹی میٹر یا زیادہ صحیح طور پر ۲.۵۴ سنٹی میٹر کے برابر ہوتا ہے۔ [3] اسراع کے متعلق "حرکت کا پہلا قانون" دیکھئے جو العصر بابت ماہ جون ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا ہے۔ [4] اگر ایک بھاری جسم کو ایک تار دھاگے کے کنارے پر باندھ کر کسی مضبوط جگہ لٹکا دیں تو رسی اور بھاری جسم کے مجموعہ کو پنڈولم کہتے ہیں۔ پنڈولم کی لمبائی بھاری جسم کے مرکز ثقل سے لیکر اس نقطہ تک ہوتی ہے جہاں رسی باندھی ہوتی ہے۔

فرض کیجیے کہ دو ثانیہ ہو تو کسی دوسرے مقام پر جہان زمینی کشش کا اسراع کم ہو وہان نوبتی وقت دو ثانیہ سے زائد ہوگا جس کا اندازہ دو نوبتی مقامات پر سو یا ہزار نوبتی حرکتون کا وقت معلوم کرنیسے نہایت درستی کے ساتھ ہوسکتا ہے[1] سطح زمین کے اوپر استواء سے قطبین کے قریب تک پنڈولم کے ساتھ زمین کی پیمائش اب کی جا چکی ہو اور تمام تحقیقات کا نتیجہ یہ ہو کہ تدریجی طور پر ع کی مقدار استواء سے قطبین تک بڑھتی چلی جاتی ہو۔ اب جیسا کہ ہم شق اول مین ذکر کر چکے ہین اس کا سبب مرکز سے سطح زمین کے بعد کا اختلاف ہو۔ عملی طور پر پنڈولم پر مرکز کے قرب و بعد کا اثر بڑی گھڑیون کی حالت مین خوب نمایان ہوتا ہو۔ اگر ایک گھڑی استواء پر ٹھیک وقت دیتی ہو تو قطبین کی طرف لیجانیسے وہ تیز ہوجائیگی یعنی اس گھڑی کے مطابق ایک ثانیہ دو دفعہ ٹک ٹک کی میعاد کم ہوجائیگی اور اس لیے ایک دن رات مین اس گھڑی کے مطابق ۸۶۴۰۰ ثانیہ سے زیادہ دفعہ ٹک ٹک ہو گی۔ اسطرح جو گھڑی استوا شمال یا جنوب مین صحیح وقت دیتی ہو وہ استوا کی طرف لیجانیسے سست ہو جاتی ہو۔

(۳) مختلف اجسام مین مادہ کی مقدار ایک چیز ہو اور ان کا وزن دوسری چیز۔ مادہ کی مقدار مین سطح زمین سے مرکز کے قریب یا بعید ہونیکا کوئی اثر نہین پڑتا لیکن بوجھ پر اثر پڑتا ہی۔ بوجھ فی الاصل اس طاقت کا نام ہے جس طاقت سے زمین اس جسم کو اپنی طرف کھینچتی ہو۔ ہم دیکھ چکے ہین کہ زمین کی کشش پر فاصلہ کا اثر ہوتا ہو اس لیے اگر ہم ایک ہی بوجھ کو ایک سپرنگ بیلنس (Spring Balance) کے کانٹے سے لٹکا کر استواء سے قطبین کی طرف لیجائین تو چونکہ زمین کی کشش بڑھتی جائیگی اس لیے اس جسم کا وزن بھی بڑھتا جائیگا۔ بوجھ کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لیے آپ فرض کیجیے کہ وہ جسم چاند کی سطح پر واقع ہو چونکہ چاند زمین سے بہت چھوٹا ہو اس لیے اس کی کشش بھی زمین سے بہت کم ہو۔ نتیجہ یہ ہو کہ چاند کی سطح پر چیزون کا بوجھ زمین کی نسبت کئی درجہ کم ہو حالانکہ مقدار مادہ دونون جگہ ایک ہو۔ زمین اور چاند کے درمیان فضا مین ایک ایسا مقام ہو جہان چاند کی کشش زمین کی کشش کے برابر ہو۔ اس مقام پر زمین کے بھاری سے بھاری جسم کا بوجھ کچھ نہین ہوگا۔ اگر ایک بچہ وہان پہنچ سکے تو وہ بھی اسے بآسانی اٹھا سکے گا۔ برعکس اس کے آفتاب کی سطح پر چیزون کا بوجھ اس کی کشش کی افزونی کی بدولت اس قدر زیادہ ہو کہ وہان ہماری طاقت کے انسانون سے بوجھ کے مارے اپنے اعضا بھی نہین ہلائے جا سکین گے۔

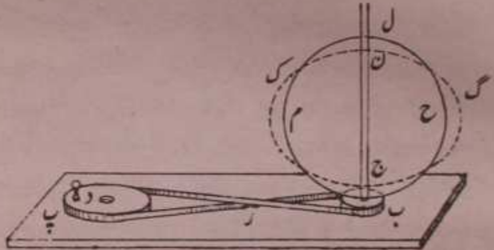
اس استدلال سے یہ امر بوضاحت ثابت ہوتا ہو کہ زمین کا استوائی محیط قطبی محیط کی بہ نسبت بڑا ہو یعنی زمین کی شکل سنگترے کی طرح ایک اپلیٹ سفرائیڈ[2] کی سی ہو۔ زمین کی اس مخصوص شکل اور محوری حرکت کے درمیان کسی قسم کا واسطہ دریافت کرنے کے لیے دو آسان تجربے بہت مدد دینگے۔ اگر آپ ربڑ کے ایک باریک مجوف کرہ مثلاً ایک فٹ بال مین کوئی سیال مادہ مثلاً پانی بھر کر اسکے منھ کو لمبی رستی سے باندھ کر ہاتھ سے گھمائین تو وہ کرہ لیمون کی طرح لمبوترا سا ہو جائیگا جسے اصطلاح مین پرولیٹ سفرائیڈ[3] کہتے ہین۔ بالفاظ دیگر اگر ایک نرم کرہ کا گردشی مرکز اس کے باہر واقع ہو تو وہ کرہ ایک ایسا شبہ کرہ بن جاتا ہو جس کی لمبائی لیمون کی طرح اس کی چوڑائی سے زیادہ ہوتی ہو۔ برعکس اسکے اگر گردشی مرکز اس جسم کے مرکز ثقل سے علیحدہ نہ ہو تو وہ جسم گردش کرتے ہوئے سنگترہ کی طرح طول مین چپٹا ہو جاتا ہو۔ تیل کے چند قطرے پانی مین ڈال کر انھین گردش دیجیے۔ آپ دیکھین گے کہ وہ جس محور کے گرد گھوم رہے ہونگے اس کی سمت مین سکڑ جائین گے اور اس کے

---

[1] پنڈولم کی حرکت کے کل قوانین الجبری طریقہ تحریر کے مطابق اسطرح ظاہر کیے جا سکتے ہین۔ اگر نوبتی وقت ت ثانیہ ہو لمبائی ل انچ ہو اور زمینی کشش کا اسراع ع انچ فی ثانیہ ہو تو نتیجہ $ت = \pi \sqrt{\frac{ل}{ع}}$ ہوگا۔ اس مساوات مین π ایک یونانی لفظ پائی ہو جو کسی دائرہ کے محیط اور قطر کی نسبت کے لیے اشارہ ہو۔ π کی مقدار بالکل صحیح طور پر معلوم کرلینا ناممکنات میں سے ہو لیکن تخمیناً یہ ۲۲/۷ یا زیادہ صحیح طور پر ۳٫۱۴۱۶ کے برابر ہے۔

[2] ایک ایسا شبہ کرہ جو لمبائی مین چوڑائی سے کم ہو۔ [3] ایک ایسا شبہ کرہ جس کی لمبائی چوڑائی سے زیادہ ہو۔

مقابل کی سمت مین زیادہ لمبے ہو جائین گے۔ تجربۃً ہم ایک سیدھے سادے آلہ کے ساتھ محوری حرکت اور قطبی کھنچاؤ کے تعلق کا مطالعہ اسطرح کر سکتے ہین کہ ایک رسی ر کے ذریعے سے ایک چھوٹا سا پہیہ ب ایک بڑے پہیہ پ کے دستے د کو پکڑ کر ہلانے سے نہایت تیزی کے ساتھ گھمایا جا سکتا ہے۔



ایک عمودی محور ل ن ج کے گرد تارون کا بنا ہوا ایک کرہ ل م ح ہے۔ اب اگر بڑے پہیہ کے ہلانے سے اس نرم کرہ کو گردش دیجائے تو کرہ کی شکل چپٹی یعنی شکل گ ن ک کیطرح ہوجاتی ہے۔ جتنا تیز اس کرہ کو گھمایا جائیگا اُتنا ہی زیادہ یہ کرہ چپٹا ہوتا جائیگا۔ لیکن یاد رہے کہ ہر ایک جسم ایک خاص مقدار سے زیادہ تیز حرکت کے ساتھ نہین گھمایا جا سکتا اگر ایسا کیا جائے تو وہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر کمہار اپنے مٹی کے چاک کو زیادہ تیزی سے گھمائے تو چاک ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ ان تجارب کی بناء پر یعنی زمین کے چپٹا ہونے اور تیز زمین کی حرکت محوری سے ہم ایک نئے نتیجے پر پہنچتے ہین کہ قدیم زمانے مین زمین نرم تھی یعنی زمانۂ حال کیطرح ٹھوس اور سخت نہین تھی لیکن پیشتر اسکے کہ ہم گذشتہ زمانے مین زمین کے نرم ہونے کو دلائل سے ثابت کرین یہ دیکھنا چاہیے کہ موجودہ زمانے مین زمین کی محوری حرکت کا اثر سطح زمین کے اوپر کیا ہو رہا ہے۔

مذکورۂ بالا تجربہ مین آپ نے دیکھا ہے کہ کرہ ل م ح کی شکل محوری گردش کی وجہ سے گ ن ک کی سی ہو گئی ہے۔ اب فرض کیجیے کہ یہ کرہ چھوٹے پیمانہ پر زمین کے بالکل مشابہ ہے یعنی اسکی سطح پر کسی طرح سے پانی کی ایک گہری تہہ ہے۔ حرکت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پانی قطبین سے دوڑ کر استوار کے قریب زیادہ مقدار مین جمع ہو جائیگا پہلے تمام کرہ کے گرد پانی کی یکسان گہری تہہ تھی مگر اب قطبین کے اوپر کم پانی رہ گیا ہے اور پانی کا زیادہ حصہ شمال او جنوب کی سمت سے حرکت کی بدولت استوائی محیط پر جمع ہو گیا ہے۔ پانی کی حرکت زیادہ تیز ہوتی ہے لیکن اگر اس کرہ کے اوپر خاک مٹی بھی رکھی ہو تو وہ آہستہ آہستہ قطبین سے استوار کی طرف منتقل ہو جائیگی گویا کہ محوری حرکت کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ پانی اور مٹی قطبین سے استوار کی طرف منتقل ہو گئے ہین۔ بعینہٖ یہی حال ہماری زمین کا ہے۔ اگر اس وقت کسی وجہ سے زمین کی محوری حرکت یک لخت بند ہو جائے تو ایک تحریک معکوس فوراً شروع ہو جائے گی۔ جس طرح پانی اور مٹی کے انبار قطبین سے استوار کی طرف منتقل ہوے تھے اسی طرح استوار سے قطبین کی طرف منتقل ہو جائین۔ کرہ زمین کے شمالی اور جنوبی حصو مین پانی کا ایک عظیم الشان سیلاب آئے۔ جنوبی امریکہ، سائبیریا اور یورپ، پانی کے نیچے غرق ہو جائین اور استوائی حصون مین سمندر کا بہت سا حصہ خشک زمین بن جائے۔ وسط امریکہ اور لنکا سمندر کی سطح سے، میل اونچی سطح مرتفع کی طرح اوپر نکل آئین اور خلیج بنگال کا بہت سا حصہ بالکل خشک ہو جائے۔ لیکن اس انتہائی امثال کو چھوڑ کر ہم یہان محوری حرکت کی ذرا سی کمی بیشی کے نتائج پر غور کرتے ہین۔ ہم نے اپنے ایک مضمون مین یہ ثابت کیا ہے کہ زمین کی حرکت فی الواقع سُست ہو رہی ہے گویا پہلے زمانون مین دن رات چوبیس گھنٹہ لمبا

ہونے کے بجائے ۲۴ گھنٹہ بلکہ اس سے بھی کم لمبے ہونگے اور آیندہ زمانون مین ۲۵ گھنٹہ بلکہ اس سے بھی زیادہ لمبے ہونگے۔

آپ نے کبھی اس بات پر بھی غور کیا کہ مختلف پہاڑون مین کیا فرق ہو؟ زمین کی سطح پر کی جھریون کا نام پہاڑ ہو لیکن ان جھریون کا آغاز کیسے ہوا۔ دو وجوہ بیان کی جاتی ہین۔ پہلی وجہ کا بیان زمین کی اندرونی حرارت کے ذکر مین آجائیگا۔ لیکن اگر محوری حرکت کے سست ہونے کو مد نظر رکھا جائے تو دوسری وجہ سمجھ مین آسکتی ہو۔ عالمان ارضیات کا قیاس ہو کہ بندھیاچل پہاڑ کوہ ہمالیہ کے سلسلے سے زیادہ پرانا ہو۔ اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے کیونکہ ان پہاڑون کی ساخت دو جداگانہ طریقون سے ہوئی ہو جن مین سے ایک کا عمل دوسرے سے بہت پیچھے شروع ہوا ہو۔ اندازہ لگایا گیا ہو کہ آج سے تیس کروڑ برس پہلے زمین کی ایک گردش ۲۴ کے بجائے ۲۳ گھنٹہ مین ختم ہوتی تھی۔ آپ اوپر کے تجربون مین دیکھ چکے ہین کہ گردش کی تیزی کے ساتھ قطبی اور استوائی قطر کا فرق بڑھتا جاتا ہو جس کا مطلب زمین کی حالت مین یہ ہو کہ استوا کے گرد پانی کی تہ قطبین کی نسبت گہری ہوتی جاتی ہو جب زمین کی گردش ۲۳ گھنٹہ مین ہوتی تھی تو پانی کی سطح استوا کے گرد اتنی اونچی تھی کہ بندھیاچل کا بہت سا حصہ پانی کے نیچے غرق تھا۔ آج سے تیس کروڑ برس پہلے کوئی بندھیاچل نہین تھا، اس لیے بندھیاچل کی عمر زیادہ سے زیادہ تیس کروڑ برس ہو اور ہمالیہ وغیرہ کی اس سے بھی کم ہو۔ زمین کی محوری حرکت مین نہ صرف ایک گھنٹہ کی کمی سے بلکہ ایک منٹ اور اس سے بھی کم مقدار کی کمی سے ایسے حیرت انگیز نتائج مرتب ہوتے ہین کہ عقل دنگ رہ جاتی ہو۔ آج سے تقریباً سو صدی پہلے زمین کی ایک گردش ۲۳ گھنٹہ ۵۹ منٹ مین ختم ہوتی تھی۔ اُس وقت کلکتہ سطح سمندر کے نیچے تھا اور اس سے پہلے جبکہ ایک گردش ۲۳ گھنٹہ ۵۸ منٹ مین ختم ہوتی تھی الہ آباد ساحل سمندر پر واقع تھا۔

دُنیا مین ہم دو قسم کی تبدیلیان دیکھتے ہین۔ ایک تو نوبتی جو ایک عرصہ تک ایک سمت مین بڑھ کر پھر اُتنے ہی عرصہ تک گھٹتی ہین اور جب پہلے کی سی حالت دوبارہ ہوتی ہو تو پھر ایک نیا دور شروع ہوتا ہو۔ موسمون کی تبدیلی ایک نوبتی تبدیلی ہے۔ اسی طرح زمین کے محور کی سمت بدلتی رہتی ہو لیکن یہ تبدیلی ہمیشہ ایک ہی سمت مین نہین ہوتی بلکہ ۲۶ ہزار برس کے بعد زمین کے محور کی سمت پھر وہی ہو جاتی ہو اور ایک نیا دور شروع ہوتا ہو۔ دوسری قسم کی تبدیلیان وہ ہین جو ہمیشہ بغیر کسی قسم کے انقطاع کے قدیم سے لیکر آج تک ایک ہی سمت مین بڑھتی یا گھٹتی چلی آئی ہین اور جو آئندہ بھی اسی نہج پر جاری رہین گی۔ ایسی تبدیلیون کے نتائج نہایت ہی اعلیٰ درجے کے مہتم بالشان ہوتے ہین۔ ان کی دو مثالین ہمارے مضمون کی جان ہین جنمین سے ایک محوری حرکت کا سست ہونا ہو۔ جہانتک آپ کا خیال زمانہ ماضی مین پیچھے کی طرف جا سکتا ہو، اسے دوڑایئے اور چشم تصور سے دیکھیے کہ نہ صرف زمین کی ایک گردش آج سے ۳۰ کروڑ برس پہلے ۲۳ گھنٹہ مین ختم ہوتی تھی بلکہ اس سے بہت پہلے ایک زمانہ ہوگا جب کہ زمین نہایت تیزی کے ساتھ پانچ چار گھنٹون مین ایک گردش ختم کرتی ہوگی۔ لیکن زمین اتنی تیزی کے ساتھ گھوم رہی ہو تو ہمین ایک دوسرے امر کی طرف متوجہ ہونا لازم ہو۔ زمین بے انتہا تیزی کے ساتھ نہین گھوم سکتی تھی اس لیے کہ اگر ایک مخصوص حد سے تجاوز کرتی تو یہ ریزہ ریزہ ہو جاتی یا کم از کم دو برابر حصون مین منقسم ہو جاتی لہذا ہم اپنے چشم تصور کی حد نگاہ وہ قدیم زمانہ[1] مقرر کرتے ہین جب کہ

---

[1] زمانہ ماضی کا ذکر کرتے ہوے ہم اس مضمون مین کروڑون برس کا ذکر اس طرح کرتے رہے ہین جس طرح روزمرہ کی زندگی مین دنون اور مہینون کا شمار ہوتا ہو۔ لیکن غور طلب بات یہ ہو کہ انسان جس کی عمر ساٹھ برس سے زائد نہین ہوتی اتنے لمبے عرصے کا اندازہ آسانی سے نہین لگا سکتا بلکہ شروع مین سرے سے ان کا انکار کر دیتا ہو۔ میزان ہستی مین ادنیٰ ترین جانور جن کی حیات ستمار گھنٹون اور دنون سے تجاوز نہین ہوتی ان کے لیے انسانی زندگی اسی تناسب سے بڑی ہو جس تناسب سے ارضیات کے طبقات انسان کے لیے بڑے ہین جس وقت یہ کہا جاتا ہو کہ زمین کا بعد سورج سے ۹ کروڑ میل ہو تو انسانی عقل [illegible]

زمین اپنی انتہائی تیزی کے ساتھ گھوم رہی ہوگی۔ اسوقت سطح زمین کی حالت کیا تھی؟ چاند کہان تھا؟ ان سوالات کا جواب ہم تھوڑی کے بعد دین گے۔ سردست ہم زمین کی اندرونی حرارت کے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرین گے۔

ہم ذکر کر رہے تھے کہ ان تبدیلیون مین سے جن مین واقعات ہمیشہ ایک ہی طرح پر ہوتے چلے جاتے ہین دو ہمارے مضمون کی جان ہین۔ محوری حرکت کے سست ہونے کا ذکر ہم ابھی کر چکے ہین۔ دوسری تبدیلی گرم اجسام کے ٹھنڈا ہونے کے متعلق ہے یعنی زمین کی ذاتی حرارت کا تدریجی لیکن غیر متناہی نقصان۔ آپ لوہے کا ایک گرم گولہ ہوا مین رکھین۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کا درجۂ حرارت اردگرد کی ہوا کے برابر ہو جاتا ہے تو گویا اسکی گرمی گرد و پیش کی چیزون مین منتقل ہو گئی ہے۔ حرارت کے اس طریقۂ انتقال کو اصطلاح مین شعاع کہتے ہین جس سے مراد یہ ہے کہ گرمی کی شعاعین گرم بدن سے نکلتے رہنے کی وجہ سے گرم بدن کی گرمی ضائع ہو جاتی ہے۔ اگر آپ لوہے کے گرم گولے کے گرد فلالین کا ٹکڑا یا کوئی اور چیز لپیٹ دین جیسا عام طور پر چاء کی کیتلی پر لپیٹ دیا جاتا ہے تو اس کا درجہ حرارت آہستہ آہستہ کم ہوگا۔ لیکن قابل غور صرف یہ بات ہے کہ نقصان آہستہ ہو یا جلدی آخر شعاع کا اثر ظاہر ہو کے رہتا ہے۔ بے شمار مشاہدات کی بنا پر یہ امر اب مسلمہ ہے کہ زمین بھی آہستہ آہستہ شعاع کے عمل سے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ میرا مطلب اس گرمی کی طرف نہین ہے جو ہمین سورج ہر لحظہ پہنچاتا رہتا ہے بلکہ ہم یہان زمین کی ذاتی گرمی کا ذکر کر رہے ہین۔ یہ سچ ہے کہ اگر آج سورج کی گرمی ہم سے چھین لیجائے تو سطح زمین کا درجہ حرارت وہی ہوگا جو فضائے بسیط کا ہے یعنی پانی کے درجۂ انجماد سے تقریباً تین سو درجہ نیچے۔ لیکن سطح زمین کے نیچے زمین کا درجہ حرارت جون جون دور چلے جائین بڑھتا چلا جاتا ہے۔ بعض مقامات پر سوا سو فٹ کی گہرائی کے لیے ایک درجۂ فارن ہیٹ کی زیادتی ہوتی ہے لیکن بعض مقامات ایسے بھی ہین جہان ایک درجۂ فارن ہیٹ کی زیادتی صرف ۳۰ یا ۴۰ فٹ کی گہرائی تک ہو جاتی ہے۔ زمین کی اندرونی حرارت کے متعلق سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ فی الحال جن جن مقامات پر جو مشاہدات زمینی حرارت کے متعلق کیے گئے ہین وہان زیادہ سے زیادہ گہرائی تک حرارت کی زیادتی کا پتہ چلتا ہے۔ سطح کے نزدیک سورج کی گرمی زمین کی ذاتی گرمی کے اثر کو ایک حد تک چھپا دیتی ہے کیونکہ دن کے وقت گرمی کی ایک لہر سطح سے نیچے کی طرف جاتی ہے اور رات کو اس گرمی کا بہت سا حصہ شعاع کے عمل سے زائل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح روزانہ لہر کے علاوہ گرمی کی ایک سالانہ لہر زمین کے اندر سرایت کرتی ہے کیونکہ موسم گرما مین دن رات سے بڑے ہوتے ہین اور سردیون مین اس کے برعکس۔ گرمی کی روزانہ لہر کا اثر ۳ یا ۴ فٹ سے زیادہ گہرائی تک نہین ہوتا اسی طرح سالانہ لہر کا اثر تقریباً ۵۰ فٹ تک ہوتا ہے چنانچہ مقیاس الحرارت

(حاشیہ بقیہ صفحہ گذشتہ) اندازہ سے عاجز رہ جاتی ہے لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت ہم دیکھتے ہین کہ نظام شمسی سے قریب ترین ستارہ کا فاصلہ اتنا زیادہ ہے کہ نور کی لہرین باوجود اتنی تیز رفتاری کے (نور کی رفتار فی ثانیہ تقریباً ایک لاکھ پچاس ہزار میل ہے) اس ستارے سے ہمارے پاس تین چار سال مین پہنچتی ہے تو یہ فاصلہ جس کے ظاہر کرنے سے ہماری گنتی بالکل قاصر ہے براہ راست کسی طرح ذہن نشین نہین ہو سکتا۔ لیکن اگر آپ ایک ایسے انسان کا تصور کرین جس کا قد معمولی انسانون کے قد سے اتنا ہی بڑا ہو جتنا ہمارا قد ان چھوٹے چھوٹے کیڑون سے بڑا ہے جن کے باعث مختلف بیماریان شروع ہوتی ہین اور جو ہمین بشکل خوردبین کی مدد سے دکھائی دیکتے ہین تو اس انسان کے لیے یہ فاصلہ چندان تعجب کا موجب نہ ہوگا۔ نظام شمسی کے مختلف افراد کا دورہ اس کے لیے گھنٹون اور دنون کی سیر و سیاحت سے زیادہ وقعت نہ رکھے گا۔ ہمارا مطلب اس مثال کے بیان سے صرف یہ ہے کہ جب قدیم زمانے کے بہت ہی پہلے کے طبقات کا ذکر کیا جائے تو اُسے اپنی عمر سے مقابلہ کر کے ناممکن خیال نہین کرنا چاہیے۔ ایک اور بات جس کی طرف ناظرین کی توجہ دلانا یہان ضروری معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جب اتنی طویل مدت کا ذکر ہوتا ہے جسکی اکائی کروڑون برس ہو تو اس مین اندازہ ہمیشہ تخمینہ کے طور پر لگایا جاتا ہے۔

کے ذریعے سے دیکھا جاتا ہے کہ ۳۰-۴۰ فٹ تک زمین کے درجۂ حرارت مین روزانہ تبدیلی ہوتی ہے اور ۵۰-۶۰ فٹ تک سالانہ تبدیلی ہوتی ہے لیکن ۶۰ فٹ کے فاصلے سے پرے زمین کا درجۂ حرارت بالکل یکسان ہوتا ہے۔ ہم ان اُمور کا یہان اس لیے ذکر کرتے ہین کہ ان کے مقابلے سے زمین کے اندر سے باہر آنے والی گرمی کی لہرون کے متعلق کچھ رائے زنی کی جاسکے۔ سورج کی سخت سے سخت گرمی کو روکنے کے لیے زمین کی ایک چھوٹی سی تہ کافی ہے۔ سطح زمین کی اندرونی حرارت نہایت قلیل مقدار مین سطح پر پہنچتی ہے اور شعاع کے عمل سے فضائے بسیط مین ضائع ہو جاتی ہے۔ لارڈ کیلون نے زمین کے موجودہ نقصان حرارت کے معیار سے زمین کی عمر کا اندازہ لگایا ہے۔ اس کا طریق عمل گہرائی کے ساتھ درجۂ حرارت کی زیادتی کو معلوم کرنے پر مبنی تھا۔ اگر ایک پتھر کی سل جسکی موٹائی اور رقبہ ہمین معلوم ہو کھولتے ہوئے پانی کے برتن کے منھ پر رکھ دیجائے تو بیرونی ہوا کا درجۂ حرارت جاننے کے بعد ہم حرارت کی کل مقدار جو فی ثانیہ اس سل مین سے باہر کی طرف گذرتی ہے معلوم کر لین گے۔ اسی طرح سطح زمین سے حرارت کے مجموعی سالانہ نقصان کا اندازہ اندر اور باہر کے درجۂ حرارت کی تدریجی تبدیلی معلوم کرنے کے بعد لگایا گیا ہے اور اس اندازہ کی بناء پر اور دیگر معلومات کی مدد سے لارڈ کیلون نے یہ بات ثابت کی ہے کہ زمین کی عمر ۲۰ کروڑ سال سے زائد نہین ہے۔ زمین کی عمر سے مُراد اُس زمانہ کا بعد ہے جبکہ زمین کی سطح پر ایک ٹھوس تہ بننی شروع ہو گئی تھی۔ عالمان ارضیات کا اندازہ زمین کی عمر کے متعلق لارڈ کیلون کے اندازہ سے بہت بڑا ہے لیکن اس موضوع پر مفصل بحث کرنا ہمارے مضمون سے خارج ہے۔

یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ انسان نے زمین کے اندر کی حالت کا وسیع مطالعہ نہین کیا۔ زیادہ سے زیادہ تین میل کی گہرائی تک ہماری رسائی ہوئی ہے اور یہ گہرائی ۴۰۰۰ میل کے مقابلے مین صفر کا حکم رکھتی ہے۔ لیکن اس اعتراض کا جواب قدرت خود دیتی ہے۔ زمین کے اندر سے آتش فشان مادہ کا اخراج خود اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ زمین کی اندرونی حرارت کا درجا سقدر بڑھا ہوا ہے کہ وہان سطح زمین پر کی متمرد ٹھوس چیزین بھی مائع اور سیال حالت مین ہین۔ سطح زمین کے تزلزل کا باعث زمین کی اندرونی حرارت ہے اور جون جون اندر کی گرمی کم ہوتی جاتی ہے زمین کی آتش فشانی بھی کم ہوتی جاتی ہے[۱]۔ ۲۶-۲۷ اگست ۱۸۸۳ء کو کراکٹو مین ایک غضبناک آتش فشانی ہوئی تھی جس سے ۳۶ ہزار نفوس سمندر مین بہ گئے تھے اور کئی دن تک سمندر مین اور کرۂ ہوائی مین تلاطم رہا تھا چھوٹے چھوٹے زلزلے آئے دن آتے رہتے ہین۔ اِن سب باتون سے ہم صرف ایک ہی نتیجہ نکال سکتے ہین یعنی یہ کہ زمین کے اندر شدت کی گرمی ہے۔

اَب آپ عمل شعاع کے غیر متناہی نتائج پر غور کرین۔ یہ ہو نہین سکتا کہ زمین کے ٹھنڈا ہونے کے متعلق وہ قوانین صحیح نہون جو باقی تمام ٹھنڈا ہونیوالے اجسام پر صادق آتے ہین۔ ہم مانتے ہین کہ فی زمانتا زمین کی اندرونی حرارت کا درجہ نہایت آہستہ آہستہ کم ہو رہا ہے یعنی اتنا آہستہ کہ ہم ایک دو صدیون مین اس کا صحیح اندازہ بھی نہین لگا سکتے لیکن اس یقینی امر سے انکار بھی نہین ہو سکتا کہ سطح زمین سے متواتر زمین کی اندرونی حرارت ضائع ہو رہی ہے۔ اگر آپ یہ امر مدِ نظر رکھین کہ سخت سے سخت گرم آگ کی بھٹی کی حرارت ایک دو فٹ موٹی دیوار روک لیتی ہے تو آپ کو زمین کی اندرونی حرارت اور اس کے نہایت آہستہ تدریجی نقصان کا اندازہ اس بات سے

---

[۱] خیال کیا جاتا ہے کہ کسی زمانہ مین چاند کی سطح پر حد درجہ کی شدید آتش فشانی ہوتی تھی اور اس قیاس کے ثبوت مین سطح چاند پر آتش فشان پہاڑون کے بڑے بڑے منھ (کریٹر Crater) پیش کیے جاتے ہین لیکن چاند کی حرارت بوجہ زمین سے چھوٹا ہونے کے بہت جلدی ضائع ہو گئی ہے اور اب آتش فشانی بھی بند ہے۔ زمین کی اندرونی حرارت کے کم ہونے کا ایک اور نتیجہ یہ ہے کہ زمین کا اندرونی جرم کم ہوتا ہے (ایک علم قانون ہے کہ اجسام ٹھنڈا ہونے سے سکڑتے ہین) اور بیرونی سطح مین جھریان پڑ جاتی ہین کیونکہ اسطرح کم جرم پر سطح رہجاتی ہے۔ بہت پہاڑون کی جھری دار بناوٹ اس قیاس کی مصدق ہے۔

ہوجائیگا کہ زمین کی اندرونی حرارت کے روکنے کے لیے اس طبقہ مین ایک بہت موٹی ٹھوس تہ مٹی اور چٹانون کی ہو۔ بہرکیف حرارت ضائع ہورہی ہو خواہ ہم اسکا صحیح اندازہ نہ لگا سکین لیکن یہ یقینی ہو کہ آج حرارت کی مقدار کل سے کم ہو اور کل پرسون سے کم تھی۔ فرض کیجیے کہ فی سال حرارت کا نقصان صرف اسقدر ہوتا ہو کہ زمین کا اندرونی درجۂ حرارت ایک سال مین ایک سنٹی گریڈ کا دس ہزاروان حصہ کم ہوجاتا ہو۔ اگرچہ ایسا خفیف ذرق ہمارے نازک سے نازک آلات کا منھ موڑ دیگا لیکن جب نقصان ہزارون لاکھون برس اسی نہج پر ہوتا رہتا ہو تو اسکا اثر محسوس ہونے لگتا ہو۔ آج سے دس ہزار برس قبل زمین کا درجۂ حرارت ایک درجہ سنٹی گریڈ زیادہ ہوگا اور ایک کروڑ برس پہلے اسی حساب سے آج سے ہزار درجہ سنٹی گریڈ زیادہ ہوگا۔ اگر خیال کو وسعت دیجائے تو قدیم زمانہ مین زمین کا درجۂ حرارت اسقدر زیادہ تھا کہ اس کی سطح پر کی چیزین بھی سب پگھلی ہوئی حالت مین تھین اُسوقت سمندر کا نام و نشان بھی نہ تھا کیونکہ تمام پانی بخارات کی شکل مین تھا۔ پھر ہم اُن طبقات کا خیال کر سکتے ہین جب کہ زمین کے جسم کی تمام اشیا مائع اور سیال ہونے کے بجائے درجۂ حرارت کی زیادتی کی وجہ سے بخارات اور گیس کی حالت مین تھین۔ لیکن یہان ہمارے خیال کی وسعت کو روکنے والی ایک دوسری دلیل موجود ہو۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہین کہ جون جون ہم وقت کے سمندر مین پیچھے ہٹتے جاتے ہین زمین کی محوری حرکت تیز ہوتی جاتی ہو اور ہم یہ بھی دیکھ چکے ہین کہ اگر اس کی رفتار ایک خاص مقدار سے متجاوز ہو جائے تو زمین کی کشش اپنے اجزا کو ایک دوسرے کے ساتھ پیوستگی کی حالت مین نہین رکھ سکتی۔ لہذا ان دونون استدلالات کی تطبیق سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہین کہ جب زمین کی محوری حرکت اتنی تیز تھی کہ دن رات صرف ۳ یا ۴ گھنٹہ کے تھے تو زمین ایک سیال کرہ تھی جس کی سطح پر اُبلتے ہوئے اور پگھلے ہوئے معدنیات و چٹانین تھین۔

ہمین اس سوال کا حل مل گیا کہ زمین کا قطبی قطر استوائی قطر سے کیون چھوٹا ہو۔ اگر زمین کسی قدیم زمانہ مین سیال نہ ہوتی بلکہ ہمیشہ سے آج کیطرح ٹھوس ہوتی تو اسکی شکل کروی ہوتی۔ نظام شمسی مین زمین کی شکل کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہت مشتری (Jupiter) کو ہو جو زمین سے تیرہ سو گنا بڑا ہو لیکن تعجب کی بات ہو کہ اسکی محوری گردش صرف دس گھنٹہ مین پوری ہوتی ہو۔ اگر بڑی دوربین مین دیکھا جائے تو مشتری صاف طور پر ایک شبہ کرہ کے مشابہ معلوم ہوتا ہو کیونکہ اسکے قطبی اور استوائی قطرون مین بہت نمایان فرق ہو۔ مشتری کی سطح ابھی ٹھوس نہین بلکہ سیال ہو اور یہ ایک مزید تصدیق اس امر کی ہو کہ زمین بھی کسی زمانے مین مشتری کی موجودہ حالت مین تھی۔ چونکہ مشتری بہت بڑا ہو اس لیے اسکی اندرونی حرارت ابھی ضائع نہین ہوئی۔ گویا ہم زمین کی گذشتہ تاریخ مشتری کی سطح کے مطالعہ سے معلوم کر سکتے ہین۔

اس سے پہلے مضمون مین زمین کی حرکت کے سست ہونے کے اسباب بیان کرتے ہوئے ہم نے مد و جزر پر تفصیلی بحث کی تھی۔ ہم نے بتایا تھا کہ نظام ارض و قمر مین مد و جزر کی کیا اہمیت ہو۔ مد و جزر کے وسیع علمی مطالعہ سے ایک حیرت انگیز نتیجہ یہ نکلتا ہو کہ زمین کے دن، رات اور مہینے بڑھ رہے ہین۔ ہم اس موضوع پر مفصل بحث نہین کر سکتے لیکن جن حضرات کو مزید معلومات بہم پہنچانے کی خواہش ہو اُن کے لیے سر رابرٹ بال کی چھوٹی سی کتاب ٹائم اینڈ ٹائیڈ (TIME & TIDE) بہتر معاون ہوگی۔ یہ کتاب اس قابل ہو کہ اس کا ترجمہ اُردو زبان مین کیا جائے لیکن اگر ترجمہ نہ ہو سکے تو کم از کم اس کے اوپر ایک بسیط تبصرہ لکھنے کی اشد ضرورت ہو۔ ہم نے مذکورہ بالا مضمون مین صرف دن رات بڑھنے کے متعلق بحث کی تھی اور مہینے کے بڑھنے کی بحث کو پس انداز کر دیا تھا۔ ہم اس مضمون مین بھی اس سے زیادہ اور کچھ لکھنا نہین چاہتے کہ اس طویل بحث کے لیے ایک جداگانہ مفصل مضمون درکار ہو اور اس لیے اب ہم زمین کی محوری حرکت کے رفتہ رفتہ کم ہونے کے نتائج پر غور کرتے ہین۔

اگر دن رات کے ساتھ مہینہ بھی بڑھ رہا ہو تو اس سے چاند کے بُعد کے متعلق یہ حیرت انگیز نتیجہ نکلتا ہو کہ چاند رفتہ رفتہ زمین سے دور ہٹ رہا ہو یعنی اگر موجودہ زمانہ مین چاند کا فاصلہ ۲ لاکھ ۴۰ ہزار میل ہو تو کسی گزشتہ زمانہ مین دو لاکھ ہوگا۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ وہی مد و جزر کی طاقت جو زمین کی محوری حرکت سست کر رہی ہو چاند کی حرکت بھی سُست کر رہی ہو۔ چاند زمین کے گرد گھومتا ہو۔ اگر زمین اسے اپنی طرف نہ کھینچتی تو حرکت کے پہلے قانون کے مطابق یہ ایک خط مستقیم مین حرکت کرتا چلا جاتا[1] لیکن ہر لحظہ زمین کی کشش اسے اپنے مرکز کی طرف کھینچ رہی ہو اور اس لیے چاند ایک بین بین راستے پر چل رہا ہو۔ اگر یہ اس راستے سے ہٹ کر زمین کے نزدیک آجائے تو اسکی دوری حرکت کی استقامت کے لیے لازمی ہو کہ اسکی رفتار تیز ہو جائے کیونکہ جتنا تیز یہ چلے گا اتنی ہی کم زمین کی کشش اس پر غالب آئیگی۔ جون جون چاند زمین سے دور ہوتا جاتا ہو مہینے کی لمبائی دو وجوہ سے بڑھتی ہو۔ ایک تو راستے کی زیادتی اور دوسرے رفتار کی سُستی۔ مختصر نتیجہ یہ ہو کہ ہر بُعد کے لیے چاند ایک خاص رفتار کے ساتھ زمین کے گرد گھومتا ہو جب چاند زمین سے صرف اسّی ہزار میل کے فاصلے پر ہوگا تو اُسوقت سمندر کا مد و جزر نہایت شدت سے ہوتا ہوگا۔ چڑھاؤ کے وقت سمندر کی سطح ۶۰۰ فٹ اونچی ہوتی ہوگی حالانکہ زمانۂ موجودہ مین اسکی بلندی ۲۰-۳۰ فٹ سے زیادہ نہ ہے۔ جزائر انگلستان سمندر سے صرف ۵۰۰ فٹ بلند ہین۔ اس حالت مین یہ تمام خطۂ زمین پانی مین غرق رہتا ہوگا۔ اور پھر یہ خیال کیجیے کہ اس زمانے مین دن رات بھی چھوٹے تھے یعنی پانی کا اُتار چڑھاؤ اور بھی جلدی جلدی ہوتا ہوگا۔ اِن تمام مقدمات کا موازنہ کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہو کہ اُسوقت مد و جزر کا اثر زمین کی محوری حرکت کے سُست کرنے مین اب سے بہت زیادہ ہوگا۔

اب اگر اس دور بینی کو اور بھی زیادہ وسعت دین تو اُس زمانہ مین جبکہ دن رات صرف ۳-۴ گھنٹہ کا ہوگا چاند زمین کے بہت ہی قریب ہوگا اور مہینہ تقریباً دن کے برابر ہوگا۔ جون جون ہم زمانۂ قدیم مین اور دور چلے جاتے ہین تو مہینہ چھوٹا ہو جاتا ہو حتی کہ وہ صرف تین گھنٹہ کا رہ جاتا ہو یعنی چاند زمین کے گرد اتنی حرکت کرتا ہو کہ گردش ۳ گھنٹہ مین پوری ہو جاتی ہو اگر صحیح طور پر اندازہ لگایا جا سکتا ہو کہ ایسی حالت مین چاند کی رفتار کیا ہوگی آخر مین ہم اس حیرت انگیز نتیجہ پر پہنچتے ہین کہ چاند بالکل زمین کے ساتھ لگا ہوا تھا اور دونون ایک ہی رفتار کے ساتھ حرکت کرتے تھے یعنی چاند فی الاصل زمین کا ایک حصہ تھا اور جب کہ زمین کی محوری حرکت اتنی تیز تھی کہ دن رات تین گھنٹہ کے ہوتے تھے تو زمین کا ایک حصہ کسی حادثہ کی وجہ سے زمین سے علیحدہ ہو گیا اور ہمارا چاند کہلایا۔

شروع مین جب چاند زمین سے علیحدہ ہوا تو چاند اور زمین دونون سیال اور آگ سے زیادہ گرم تھے۔ چاند کی علیحدگی کے ابتدائی الظہور مد و جزر کا وہ لمبا سلسلہ شروع ہوا جس سے رفتہ رفتہ چاند زمین سے دور اور دن رات لمبے ہوتے گئے۔ جب چاند زمین سے بالکل قریب تھا اور زمین کی تمام سطح سیال مادون کی تلاطم گاہ بنی ہوئی تھی اُسوقت مد و جزر نہایت شدید ہوتے ہونگے اور ان کا اثر بھی اسی تناسب سے زیادہ ہوتا ہوگا۔ مد و جزر کا اثر چاند پر یہ ہوا کہ چاند کی محوری گردش کا نوبتی وقت یعنی چاند کا دن چاند کی دوری گردش کے نوبتی وقت کے برابر ہو گیا ہو اور اب ہم صرف چاند کا ایک رُخ دیکھتے ہین لیکن چاند متواتر اپنی کشش سے زمین کی محوری حرکت سُست کر رہا ہو۔ اور اگر ہم گزشتہ سے آئندہ کروڑون برس گزرنے کے بعد کا منظر اپنی آنکھون کے سامنے لا سکین تو ہم زمین کا دن اور مہینہ برابر یکسان مدت کا پائین گے۔ جب یہ دن آئیگا ہمارا دن ۱۴۰۰ گھنٹہ یعنی اسوقت کے ۵۵ دن کے برابر لمبا ہوگا اور مہینہ بھی اسی تناسب سے لمبا ہوگا۔ اُسوقت چاند کیطرح زمین بھی چاند کی طرف ہمیشہ ایک ہی رُخ کرے گی اور دونون

[1] اگر چاند کی خط مستقیمی حرکت بند ہو جائے تو یہ فوراً زمین کی طرف گرنا شروع ہو جائے اور اپنے موجودہ فاصلہ سے ۴-۵ دن مین زمین سے آ ٹکرائے۔

اسطرح حرکت کرینگے جسطرح دو جسم ایک لکڑی کے دونون سرون پر باندھکر گھمائے جاتے ہین۔ لیکن یہ بھی آخری منزل نہ ہوگی۔

ہم ذکر کر چکے ہین کہ سورج کی کشش سے بھی مدو جزر پیدا ہوتے ہین لیکن ان کی مقدار چاند کے مدو جزر سے نصف کے قریب کم ہوتی ہی۔ لیکن یہ شمسی مدو جزر خواہ کتنے ہی کم ہون ان کا اثر ہمیشہ ایک ہی سمت مین عمل کرتا ہی پس نتیجہ یہ ہوگا کہ دن بڑھتے بڑھتے سال کے برابر ہوتا جائیگا یعنی دن مہینے سے لمبا ہو جائیگا بالفاظ دیگر چاند ایک دن رات مین ایک سے زیادہ دفعہ طلوع کیا کریگا اور ایک ہی دن رات مین ہلال سے بدر بنکر پھر ہلال کی شکل مین نمودار ہوگا۔ یہ آخری حالت نہایت خطرناک ہوگی۔ چاند رفتہ رفتہ جس طرح زمین سے دور ہٹتا گیا تھا اسی طرح زمین کیطرف چکر کاٹتا ہوا آئے گا (دیکھو شکل[1]) اور بالآخر نہایت زور کے ساتھ زمین کے اوپر گر پڑیگا اور اگر اس سے پہلے کسی اور طریقہ سے زمین کا خاتمہ نہو چکا



ہو تو شاید دُنیا کی موت اسی طریقے سے ہو گویا زمین کا بچہ جس سے اب زمین متمتع ہو رہی ہی انجام کار زمین کی تباہی کا باعث ہوگا۔

جو مختصر سا خاکہ ہم نے زمین کی گذشتہ اور آئندہ تاریخ کا ناظرین کے سامنے پیش کیا ہی وہ اس قدر نادر و عجیب ہی کہ طبیعت اس کے ماننے سے گریزان ہوتی ہی لیکن نظام شمسی ہی مین یہ آخری نظارہ مریخ (Mars) کیحالت مین ہمارے پیش نظر ہی۔ مریخ کے پانچ چاند دریافت ہو چکے مین لیکن اس کا ایک چاند اس قدر عجیب و غریب حرکتین کرتا ہی کہ اگر مذکورۂ بالا نتائج ہمارے پیش نظر نہ ہون تو شاید ہم انکی تشریح نہ کر سکتے۔ مریخ کی محوری گردش تقریباً ۲۴ گھنٹہ مین ختم ہوتی ہے لیکن یہ چاند ایک دن رات مین مریخ کے گرد تین گردشین ختم کرتا ہی گویا مریخ کا مہینہ صرف $\frac{1}{2}$ ۷ گھنٹہ کا ہی۔ چاند کا فاصلہ آہستہ آہستہ مریخ کی سطح سے کم ہو رہا ہی اور اب صرف ۴ ہزار میل باقی رہ گیا ہی۔ مریخ کا یہ چاند ہمارے چاند کے مقابلہ مین بالکل چھوٹا سا جسم ہی۔ اسکا قطر ۲۰-۳۰ میل ہی اور اس کا وزن صرف ۴۰ بلین ٹن ہی لیکن جب یہ مریخ کی سطح سے ٹکرائے گا تو اس کی رفتار ۲ ہزار میل فی گھنٹہ ہوگی۔ اور جو عظیم الشان نتائج اس تصادم کا نتیجہ ہونگے وہ تشریح کے محتاج نہین ہین۔ فی الحال اس حادثہ کے وقت کی تعین نہین کی گئی۔

جو نظریہ ہم نے نظام ارض و قمر کی مثال لیکر یہان بیان کیا ہے وہ تمام کائنات کے متعلق صحیح ہی۔ اس کا مختصر اصطلاحی نام ارتقاے مدو جزری (Tidal Evolution) ہے۔

زمین کی محوری حرکت کے بعض اہم نتائج ایسے ہین جن کا ذکر ہم اس مضمون مین نہین کر سکتے۔ مثلاً خط استوائی کے گرد مادہ کی زائد مقدار جو تقدیم و ترجیح محور الارض (Precession & Notation of the Earth's axis) کی ذمہ دار ہے۔ چاند اور سورج کی کشش زمین کی اس بے قاعدہ مقدار مادہ کو کھینچ کر زمین کے محور کی سمت بدلتی ہی۔

زمین کی محوری حرکت کے بعض اہم نتائج جن پر ہم نے اس مضمون مین بحث کی ہی مختصر الفاظ مین یہ ہین:- محوری حرکت کا یہ نتیجہ ہی کہ فی الحال دن اور مہینہ دونون بڑھ رہے ہین۔ چاند زمین سے دور ہٹ رہا ہی اور زمین کا استوائی قطر قطبی قطر سے ۲۷ میل زیادہ لمبا ہی جب یہ محوری حرکت ایک منٹ فی دن بھی سست ہو جائے گی تو شمالی اور جنوبی حصہ زمین مین بہت سی خشک زمین پانی کے نیچے آجائیگی اور منطقہ حارہ مین خشکی کا حصہ بڑھ جائے گا۔ ہم زمین کی اندرونی حرارت کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکالتے ہین کہ کسی زمانے مین زمین سیال مادہ کا ایک کرہ تھی اور اسی زمانے مین چاند زمین کے ساتھ لگا ہوا تھا۔

فیروز الدین مُراد

---

[1] شکل ذیل مین دکھایا گیا ہو کہ کس طرح چاند زمین سے دور ہٹ کر پھر نزدیک آتا جائےگا۔ ایسی حرکت کو حرکت مغزلی یعنی اسپارل موشن Spiral Motion کہتے ہین۔

العصر

کیا زمین کی حرکت سُست ہو رہی ہی؟

جدید علمی تحقیقات کے حیرت انگیز انکشافات مین سے ایک وہ ہی جس سے ہمارے عنوان کے سوال کا جواب اثبات مین ملتا ہی۔ علمی دُنیا مین یہ بات عام طور پر مانی جاتی ہی کہ ہمارے دن رات آہستہ آہستہ لیکن متواتر لمبے ہوتے ہین یا بالفاظ دیگر یون کہیے کہ آج کا دن گذشتہ دن سے کسی قدر زیادہ لمبا ہی اور آئندہ سے کسی قدر کم۔ اسکا امکان اُسی وقت ہو سکتا ہی جب زمین کی محوری حرکت جس کے باعث دن رات کی گردش ہوتی ہی سُست ہو رہی ہو اور ایک گردش کی تکمیل مین دن بدن زیادہ وقفہ درکار ہوتا ہو۔ ایک شبانہ روز کی لمبائی کلیتہً زمین کی محوری حرکت پر منحصر ہی اور جہان تک سائنس نے آج تک ترقی کی ہی زمین کی محوری حرکت کا اسکی سالانہ حرکت کے ساتھ کوئی تعلق نہین ہی۔ سال مین ایک دفعہ کرۂ زمین سورج کے گرد پورا چکر کاٹتا ہی اور یہی سالانہ گردش موسمون کی تبدیلی وغیرہ کی ذمہ دار ہی۔ سردست ہمارا شمسی سال تین سو پینسٹھ دن سے کچھ زیادہ بڑا ہوتا ہی لیکن جب تک زمین اور سورج کے مُجلد اور ان دونون کی علیحدہ علیحدہ مقدار مادہ مین کسی قسم کی تبدیلی واقع نہ ہو سال کی میعاد ایک معین میعاد ہی جسے دن رات کی لمبائی سے براہ راست کچھ تعلق نہین۔ اگر ہماری زمین اپنے محور کے گرد ۱۲ گھنٹہ مین ایک چکر کاٹتی تو ہمارا سال ہمارے جدید دن رات کی میعاد کے مطابق سات سو ساڑھے تیس دن سے کچھ زیادہ بڑا ہوتا۔ لہذا زمین کی محوری حرکت کے سُست ہونے کے دو نتائج ہین۔ ایک طرف تو دن رات بڑے ہو رہے ہین اور دوسری طرف سال چھوٹا ہو رہا ہی۔ سال کے چھوٹا ہونے سے مراد یہ ہی کہ آئندہ سال مین موجودہ سال کی نسبت سورج کا طلوع و غروب کم دفعہ ہوگا۔ وگرنہ فی الاصل جیسا ہم ابھی ذکر کر چکے ہین سال کی اصلی میعاد کا زمین کی محوری حرکت سے کوئی تعلق نہین۔ اور اس لیے جس وقفہ کا نام بنظر سہولت ہم نے ایک سال رکھا ہی اس مین بذاتہ کوئی کمی بیشی نہ ہوگی۔ فرق صرف تناسب مین ہوگا۔ اگر اکائی بڑھ جائے تو باقی اعداد اسی تناسب سے گھٹ جائینگے۔ جو فاصلہ انچون مین ۳۶ عدد کہلاتا ہی وہی فاصلہ فٹون مین ۳ کہلاتا ہی۔ فاصلہ تو وہی ہی لیکن اکائی یونٹ (Unit) کی تبدیلی سے اس کے معیار مین تبدیلی ہوتی ہی اسطرح

موجودہ حالات میں ہم موجودہ دن رات کے وقفہ کو اکائی مان کر سال کے وقفہ کو ایک خاص عدد سے تعبیر کرتے ہیں گویا اس خاص عدد اور موجودہ دن رات کے وقفہ کا حاصل ضرب سال کا وقفہ ہے۔ اب اگر حاصل ضرب میں کمی بیشی نہ ہو اور ضرب شدہ اعداد میں سے ایک بڑھ جائے تو دوسرا لامحالہ کم ہوگا۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ اگر دن رات کا وقفہ بڑھ رہا ہے تو سال کے وقفہ کا معیار (دن رات کے بڑھتے ہوئے وقفہ کو اکائی مان کر) گھٹ رہا ہے۔

اس امر کا ثبوت کہ زمین کی حرکت فی الواقع سست ہو رہی ہے تین مختلف طریقوں سے دیا جا سکتا ہے جن میں سے ہر ثبوت اس بات کا مستحق ہے کہ اس پر شرح و بسط کے ساتھ بحث کی جائے۔ دلائل کی پختگی اور استدلال کی نفاست کے لحاظ سے یہ بحث ہمیں بہت سے مفید مطلب سبق سکھا سکتی ہے مگر ہم بہ نظر اختصار ان تینوں ثبوتوں کو موجودہ مضمون میں محدود کرنے کی کوشش کریں گے۔

زمین ایک گول کرہ ہے جو فضائے بسیط میں معلق ہے اور اپنے محور کے گرد تقریباً ۲۴ گھنٹہ میں ایک دفعہ گھومتی ہے۔ زمین کا محور زمین کے مرکز میں سے ہو کر گذرتا ہے۔ اس کے انتہائی سروں کو قطبین یعنی قطب شمالی اور قطب جنوبی کہتے ہیں۔ محور محض ایک سمت کا نام ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہے تو محور سے مراد کوئی ٹھوس مضبوط سلاخ نہیں ہوتی بلکہ اس خط مستقیم کی طرف اشارہ ہوتا ہے جو زمین کے مرکز سے گذرتا ہوا شمالی جنوبی سمت میں واقع ہے۔ آپ نے بازاروں میں شعبدہ بازوں کو دیکھا ہوگا جو ایک تھالی کو چھڑی کے اوپر تول کر زور کی گردش کے بعد ہوا میں اچھال دیتے ہیں جہاں تھوڑی دیر کے لیے ہوا میں معلق رہ کر تھالی ایک محور کے گرد گھومتی رہتی ہے جس کی سمت حرکت دہندہ چھڑی کی لمبائی ہوتی ہے۔ اسی طرح افریقہ کے حبشی چابک کی ضربوں سے لٹو ہوا میں گھماتے ہیں۔ جتنی دیر لٹو کی حرکت کافی تیز رہتی ہے لٹو ایک محور کے گرد ہوا میں گھومتا رہتا ہے۔ کرۂ زمین کی محوری حرکت کی مثال ایک اور طریقہ سے بھی دی جا سکتی ہے۔ کمہار کا بھاری چاک جب وہ اسے لکڑی کے ساتھ تیز حرکت دینے کے بعد چھوڑ دیتا ہے ایک حد تک زمین کے مشابہ ہوتا ہے۔ دونوں کی حرکت میں فرق صرف یہ ہے کہ چاک ہوا کی مزاحمت کی وجہ سے تھوڑی دیر گھومنے کے بعد ساکن ہو جاتا ہے لیکن زمین کے اردگرد ہوا کے بجائے ایک ایسا رقیق جسم (ایتھر) ہے کہ قرنوں میں بھی اسکی رگڑ اور مزاحمت کا اثر محسوس نہیں ہوتا۔ زیادہ تر فرق شکل میں ہے۔ اگر ہم چاک کے بجائے ایک مدور کرہ فرض کریں جسے پہیہ کی طرح گھما کر چھوڑ دیا جائے تو وہ بجنسہٖ زمین کے مشابہ ہوگا لیکن زمین کی حرکت اس کے مقابلے میں نہایت سست ہوگی اس لیے کہ دونوں کے حجم میں بہت بڑا فرق ہے۔ زمین کا قطر تقریباً آٹھ ہزار میل ہے حالانکہ ہمارے مثالی کرہ کا حجم گز بھر سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اب اگر آپ نے یہ فرق صحیح طور پر سمجھ لیا ہے تو زمین کی حرکت کے کم ہونے کا پہلا ثبوت بآسانی ذہن نشین ہو سکتا ہے۔ فرض کیجیے کہ کمہار چاک کو یکساں طاقت کے ساتھ گھما رہا ہے یعنی ہوا کی مزاحمت سے چاک کی رفتار میں جو کمی[1] تعویق پیدا ہوتی ہے اس کی تلافی کرتا جاتا ہے یہ بھی فرض کر لیجیے کہ کمہار اپنی طاقت اس یکساں تناسب کے ساتھ دیر تک صرف کر سکتا ہے۔ اب اگر آپ چاک کے اوپر آہستہ آہستہ خاک پھینکتے جائیں تو اس کو چونکہ اپنی گردش میں مادہ کی زیادہ مقدار اٹھانا پڑتی ہے اس کی رفتار سست ہو جائے گی تاوقتیکہ کمہار جوں جوں چاک پر مادہ کی مقدار زیادہ ہوتی جاتی ہے زیادہ طاقت نہ صرف کرے۔ بعینہٖ یہی حالت کرۂ زمین کی گردش کی ہے۔ سماوی خاک اور ٹوٹنے والے ستاروں کے ریزے ہر لحظہ زمین کی سطح پر گر رہے ہیں

---

[1] زمین کی حرکت کے متعلق مفصل معلومات ہمنے اپنے سابقہ مضمون حرکت کا پہلا قانون میں حرکت کے پہلے قانون کی تشریح کرتے ہوئے بہم پہنچائے ہیں۔ ان اصطلاحات اور مطلب کی تفہیم کے لیے اس مضمون کا مطالعہ لابدی ہے۔

اور جون جون زمین اپنی سالانہ گردش کرتی ہوئی نئے نئے مقامات پر سے گذرتی ہو آسمانی خاک کی نہ ختم ہونیوالی بارش اس کے حجم اور وزن کو بڑھاتی رہتی ہو۔ اندازہ لگایا گیا ہو کہ ہر سال باہر سے زمین پر ایک کروڑ ٹن یعنی تقریباً ۲۸ کروڑ من خاک پڑتی ہو۔ گویا ہر سال زمین کا وزن ۲۸ کروڑ من بڑھ رہا ہے جیسا ہم نے اوپر ذکر کیا اگر ہم چاہتے ہین کہ ہمارے شالی چاک کی رفتار یکسان رہے تو جون جون اسکا وزن زیادہ ہو کمہار کو زیادہ طاقت لگانی چاہیئے لیکن اگر کمہار صرف ہوا کی مزاحمت اور دھوے کی رگڑ وغیرہ کی تلافی پورا کرنے کے لیے کافی طاقت صرف کرے تو لحظہ بلحظہ چاک کی رفتار سست ہوتی جائیگی۔ زمین کی حالت مین کوئی بیرونی طاقت اسکی حرکت کے قیام کے لیے درکار نہین ہو لیکن جو زائد مادہ اس کے بوجھ مین اضافہ کر رہا ہو اسکی وجہ سے حرکت مین جو کمی واقع ہو رہی ہو اسکی تلافی بھی کوئی طاقت نہین کر رہی۔ نتیجہ یہ ہو کہ زمین کی حرکت سست ہو رہی ہو یہان اس امر کا ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہو کہ چونکہ زمین کا مجموعی وزن ارہا کروڑ من[1] ہو اور اس عظیم الشان بوجھ کے مقابلے مین ۲۸ کروڑ من کی زیادتی بالکل ہیچ لہذا کسی قلیل عرصہ مین محض اسی سبب سے زمین کی گردش مین بہت تھوڑی کمی واقع ہونے کا امکان ہو۔ اتنی تھوڑی کمی کہ اس کا اندازہ لگانا بھی انسانی طاقت سے باہر ہو لیکن اس مقام پر ایک نہایت غور طلب مسئلہ یہ ہو کہ اگر یہی حالت مدت دراز تک رہے تو فی سال ۲۸ کروڑ من کا اضافہ آخر الامر اپنا اثر دکھائے بغیر نہین رہیگا۔ اس وقت تک زمین کی حرکت مین ضرور ایک نمایان تبدیلی ہوگئی ہوگی۔

دوسرا سبب ایسا ہو کہ اس کا اثر پہلے سبب کے اثر سے کہین زیادہ ہو اور ان دونون اسباب کے مجموعی اثر کی نظری بحث کے بعد ہم تیسرے ثبوت کا یعنی حرکت کی کمی کی عملی تصدیق کا ذکر کرینگے جس سے یہ امر بوضاحت ثابت ہو جاتا ہو کہ پہلے دو اسباب مین جو دلائل اور طریقۂ استدلال اختیار کیا گیا ہو وہ بالکل صحیح اور درست ہو۔

چاند کی کشش سے سمندر کا پانی مد و جزر کی شکل مین کھینچا جاتا ہو۔ پانی کا مد و جزر جو سطح زمین کے اوپر ہوتا ہو زمین کی محوری حرکت کو روکتا ہو یون سمجھیے کہ جس طرح چلتی گاڑی کو بریک باندھنے سے روک کیا جاتا ہو اسی طرح جوار بھاٹا کا عمل زمین کی محوری حرکت کے لئے ایک کمزور بریک کا حکم رکھتا ہو جس کا تدریجی قلیل اثر اگر سالون مین نہین تو ہزار ہا صدیون مین ضرور نمایان طور پر ظاہر ہو جاتا ہو۔ اس اجمال کی تفصیل ہم کسی دوسرے مضمون کے لیے اٹھا رکھتے ہین۔ یہان مختصراً مد و جزر کے متعلق چند ایک امور بطور اشارات تحریر کرتے ہین۔

سب سے پہلے اس امر کو ثابت کرنے کی ضرورت ہو کہ مد و جزر کا چاند کے ساتھ کیا تعلق ہو اور یہ تعلق کیسے دریافت ہوا جن لوگون کو ساحل سمندر پر جانے یا بحری سفر کا اتفاق نہین ہوا ان کے لیے مد و جزر ایک نئی چیز ہوگی لیکن سمندر کے قریب رہنے والون کے لیے مد و جزر ویسی ہی معمولی چیز ہو جیسے خشکی پر رہنے والون کے لیے چاند کا گھٹنا بڑھنا۔ غالباً سب سے پہلے یہ امر مشاہدہ مین آیا ہوگا کہ نئے چاند اور بدر کے موقع پر مد و جزر نہایت شدت کے ساتھ ہوتا ہے اور پہلے ربع اور تیسرے ربع کے موقع پر نہایت کمزور ہوتا ہو لیکن اس سے زیادہ مضبوط تعلق یہ معلوم ہوا ہوگا کہ ایک شبانہ روز کے دو متواتر جوار بھاٹون کا درمیانی وقفہ بجاے ۱۲ گھنٹہ کے ایک شمسی دن رات ہونے کے ۲۴ گھنٹہ اکاون منٹ کا ایک قمری دن ہوتا ہو۔ چاند بوجہ اپنی ماہواری گردش کے ایک دن رات مین سورج

---

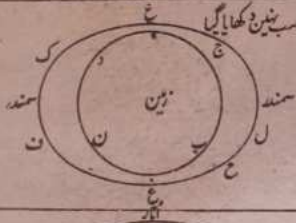
[1] ہم نے اپنے ایک سابقہ مضمون "کرۂ ہوائی کے متعلق دلچسپ معلومات" مین کرۂ ہوائی کا مجموعی وزن دریافت کرنے کے لیے زمین کا وزن مختصراً یون دریافت کیا تھا۔ زمین کا نصف قطر تقریباً ۴۰۰۰ میل ہو لہذا اسکا حجم $\frac{4}{3} \times \frac{22}{7} \times (4000)^3$ مکعب میل ہو چونکہ زمین کی کثافت اضافی بمقابلہ پانی کے ۵½ ہو اس لیے زمین کا وزن [illegible] مکعب میل پانی کے وزن کے برابر ہو ایک مکعب فٹ پانی کا وزن [illegible] [illegible]

سے اکاون منٹ پیچھے رہ جاتا ہی اور مد و جزر بھی اسی مقدار وقت کے ساتھ لگاتار شمسی دن سے پیچھے ہٹتا جاتا ہی۔ سمندر کے پانی مین مد و جزر کے متعلق ایک دلچسپ لیکن شروع مین پریشان کرنیوالی بات یہ بھی ہی کہ ہر بندرگاہ مین ایک قمری دن مین ایک دفعہ پانی اُترنے چڑھنے کے بجائے دو دفعہ اُترتا چڑھتا ہی گویا ۲۴ گھنٹہ ۵۱ منٹ مین دو دفعہ سمندر مین پانی کی سطح معمول سے زیادہ اونچی اور دو دفعہ معمول سے زیادہ نیچی ہوتی ہی۔ اگر ہم سہولت کے خیال سے یہ مان لین کہ تمام کرۂ زمین کے گرد یکسان گہرائی کی پانی کی ایک تہ ہی تو یہ بات بادی النظر مین زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہی کہ اگر چاند کی کشش سے (دیکھو شکل نمبر ۱) سمندر کے اس حصہ ل ح کا پانی جو چاند کے قریب ہی چاند کی طرف کھینچا جاتا ہی تو دوسرے حصہ ک ت مین چاہیے کہ پانی کم رہجانے کی وجہ سے پانی کا غیر معمولی اُتار ہوتا اور اس طرح سے ہر قمری دن مین صرف ایک دفعہ کسی مقام پر پانی کا چڑھاؤ ہوتا اور ایک دفعہ اُتار لیکن جیسا کہ شکل اول مین دکھایا گیا ہی حالات واقعی اس نقطۂ خیال سے ایک معمہ کی سی صورت پیش کرتے ہین۔ اگر بامعان نظر غور کی جائے تو چاند کے نیچے سطح زمین پر دو بالمقابل مقامات پر پانی کا چڑھاؤ ہوتا اور چاند کی سمت سے زاویہ قائمہ بناتے ہوئے دو مقامات پر پانی کا اُتار ہونا فوراً ایک معقول پیرایہ سے سمجھا جا سکتا ہی۔ جس طرح سمندر کے حصہ ل ح کا پانی زمین کی نسبت چاند سے زیادہ قریب ہونے کی بدولت زمین سے زیادہ چاند کی طرف کھنچ جاتا ہی اور وہان چڑھاؤ کی حالت ہوتی ہے اسی طرح زمین کا قریب حصہ ب ج بعید حصہ د ن کی نسبت چاند سے آٹھ ہزار میل کے قرب کی وجہ سے سمندر کے پانی ک ت سے پرے ہٹ جاتا ہی اور وہان بھی پانی کا چڑھاؤ ہوتا ہی اور اس لیے سمندر کے ان دو حصون مین جو ع غ کی جگہ مین اُتار کی حالت ہوتی ہی۔ اس تشریح سے ہر قمری دن مین دو دفعہ اُتار چڑھاؤ ہونا بآسانی سمجھ مین آسکتا ہی۔ اب صرف یہ امر محتاج تشریح ہی کہ کیون نئے چاند اور بدر کی حالت مین اُتار چڑھاؤ معمول سے زیادہ ہوتا ہی اور کیون پہلے اور تیسرے ربع پر معمول سے کم جیسا کہ ہم کسی دوسری جگہ زمین کی سالانہ گردش کا ذکر کرتے ہوئے بیان کر آئے ہین کہ زمین سورج سے بہت چھوٹی ہی اور اسی وجہ سے سورج کی کشش اس پر غالب ہی کہ یہ سورج کے گرد گھومتی ہی۔ لیکن گو سورج بہت بڑا ہی تاہم بوجہ اپنے بُعد کے اس کی جوار بھاٹا پیدا کرنے کی طاقت چاند کی نسبت نصف سے بھی کم ہے۔

شکل اول کی تشریح کو مدنظر رکھکر شکل دوم اور سوم سے بخوبی واضح ہوتا ہی کہ کیون نئے اور پورے چاند کی تاریخون پر اُتار چڑھاؤ معمول سے زیادہ ہوتا ہی۔ ان دونون حالتون مین چاند اور سورج کی کشش مل کر کام کرتی ہی اور نتیجہ اسی تناسب سے بڑا ہوتا ہی۔ پہلے اور تیسرے ربع کی حالت شکل چہارم سے واضح ہوتی ہی۔ اس حالت مین سورج کی کشش چاند کی کشش کے خلاف عمل کرتی ہی۔ جن مقامات پر چاند کی کشش محض سے اُتار ہونا چاہیے وہان سورج کی کشش سے چڑھاؤ ہوتا ہی اور برعکس اس کے جہان چاند کی کشش سے چڑھاؤ ہوتا ہی وہان سورج کی کشش سے اُتار ہوتا ہی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ اُتار چڑھاؤ معمول سے کم ہوتے ہین اس لیے کہ سورج کی کشش چاند کے اثر کو نصف سے کچھ کم زائل کر دیتی ہی۔

ہم یہان مد و جزر کے وسیع نظریہ کے متعلق کچھ نہین لکھنا چاہتے ہمین یہان صرف یہ دکھانا مقصود ہی کہ پانی کے اُتار چڑھاؤ کا اثر زمین کی حرکت کو کم کرتا ہی بعینہٖ اُسی طرح جس طرح کہ ایک کمزور بریک کسی تیزی سے حرکت کرنے والے جسم کی حرکت کو کم کرتی ہی۔ اوّل چار شکلون سے یہ غلط نتیجہ نکالا جا سکتا ہی کہ ہر مقام پر پانی کا زیادہ سے زیادہ چڑھاؤ دن مین ایک دفعہ اُس وقت ہوتا ہی جب کہ چاند اس مقام کے اوپر سب سے زیادہ بلندی پر ہو اور دوسری دفعہ اس سے بارہ گھنٹہ اور ۲۵ منٹ بعد لیکن واقعی مشاہدات اس سادہ حالت کے بالکل خلاف ہین۔ مختلف بندرگاہون مین پانی کے چڑھاؤ کا وقت، چاند کے سب سے زیادہ

نوٹ - ان اشکال مین زمین سورج اور چاند کے حجم اور فاصلہ کا اصلی تناسب نہین دکھایا گیا



چاند کی کشش



شکل اول

شکل دوم





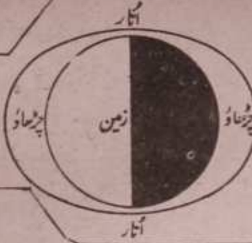
سورج اور چاند کی متحدہ کشش



شکل سوم



سورج کی کشش



چاند کی کشش



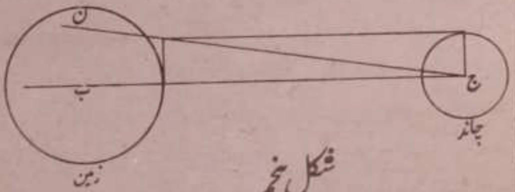
شکل چہارم



چاند کی کشش







شکل پنجم

بلندی پر ہونے کے وقت کے بعد (مختلف وقفون کے بعد) ہوتا ہو بعض مین ایک گھنٹہ کا فرق ہو بعض مین پانچ گھنٹہ کا وغیرہ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ چاند کے پیچھے پیچھے سمندر کا پانی دوڑتا پھرتا ہو اور چونکہ پانی کی یہ حرکت زمین کی محوری حرکت کے خلاف ہوتی ہو اس لیے چاند کی کشش سے زمین کی حرکت ضائع ہوتی رہتی ہو۔

سمندر کے پانی کا چاند کی کشش کی سمت سے پیچھے رہنے کا باعث زمین کے خلاف پانی کی رگڑ ہے اور کچھ حد تک پانی کی اندرونی رگڑ بھی۔ ہم اس نتیجہ کو شکل پنجم کی مدد سے بآسانی سمجھ سکتے ہین۔ اگر کسی قسم کی رگڑ نہ ہوتی تو چاند کی کشش کا اثر زمین کے مرکز ب کی سمت مین ظاہر ہوتا۔ لیکن رگڑ کی وجہ سے کشش کا اثر اس کے بجائے سمت ج ن مین ہوتا ہو جو زمین کے مرکز مین سے نہین گذرتی۔ سمت ج ن مین عمل کرنے والی طاقت دو سمتون مین تقسیم کیجا سکتی ہو۔ ایک جز عمودی سمت مین اور ایک اُفقی مین۔ ان مین سے ایک جز زمین کی حرکت کم کرتا ہو اور دوسرا چونکہ زمین کے مرکز مین سے گذرتا ہو لہذا اس کا اثر زمین کی حرکت پر کچھ نہین ہوتا۔

طوالت کے خوف سے ہم اس دلچسپ بحث کو نہین چھوڑ دیتے ہین لیکن اس بات کا ایک عملی ثبوت کہ مدوجزر کی رگڑ فی الواقع کسی جسم کی حرکت روکنے لے لیے کافی ہو سکتی ہے، ہمین چاند کی حالت مین ملتا ہو چونکہ زمین چاند سے بہت بڑی ہو اس لیے جب چاند زمانہ سابقہ مین سیال حالت مین تھا تو زمین کی کشش سے چاند کی سطح پر نہایت شدت کے ساتھ مدجزر چڑھاؤ ہوتا تھا۔ آپ نے بارہا سُنا ہوگا کہ چاند ہمیشہ اپنا ایک ہی رُخ زمین کو دکھاتا ہو۔ کسی انسانی آنکھ نے چاند کا دوسرا رُخ نہین دیکھا۔ صرف کبھی کبھی اس رُخ کے چھوٹے سے حصہ کی ایک جھلک نظر آتی ہو۔ دوسرے لفظون مین نتیجہ یہ نکلتا ہو کہ چاند اپنے محور کے گرد اسی عرصہ مین ایک کامل گردش پوری کرتا ہو جتنے عرصے مین وہ زمین کے گرد ایک دفعہ گھومتا ہو۔ گویا چاند کا دن اور مہینہ ایک برابر ہین۔ یہ کیون ہے؟ محض اس لئے کہ زمین کی کشش سے چاند کی سطح پر جو مدوجزر ہوتے تھے ان کی بدولت چاند کی محوری حرکت بمقابلہ زمین کے بند ہو گئی۔ یہی حالت زمین کی حرکت کی آج سے بہت عرصے کے بعد ہو گی تب ہمارا دن اور قمری مہینے برابر ہونگے اور چاند والے زمین کا صرف ایک ہی رُخ دیکھ سکین گے۔

ہم نے اس مضمون کے شروع مین کہا تھا کہ علاوہ ان دو نظری دلائل کے جو ہم ابھی ختم کر چکے ہین زمین کی رفتار کے کم ہونے کی ایک عملی تصدیق بھی موجود ہو۔ زمانۂ حال اور ماضی کے مشاہدات فلکی کا موازنہ کرنے سے ہم دن رات کی لمبائی معلوم کر سکتے ہین۔ لارڈ کیلون نے اس حصۂ مضمون کو نہایت عمدگی کے ساتھ ادا کیا ہو۔ ہم یہان اس کی مثال پر اکتفا کرین گے۔ ۱۹۔ مارچ سنہ ۷۲۱ قبل از مسیح یعنی آج سے ۲۶۴۳ سال پہلے قدیم بابل (Babylon) مین چاند گرہن ہوا تھا۔ بابل کا ایک ہیئت دان اپنی تحریر چھوڑ مرا ہو کہ اس نے گرہن کو شروع ہوتے پہلی دفعہ جس وقت دیکھا اس وقت چاند کے طلوع کے بعد کامل ایک گھنٹہ گذر چکا تھا۔ ہم شکل سوم اور چہارم کے متعلق ایک نوٹ مین بتا چکے ہین کہ چاند گرہن ہمیشہ بدر کی حالت مین ہوتا ہو۔ علاوہ ازین چاند اور سورج کے طلوع و غروب کا وقت زمین کی محوری گردش پر منحصر ہو۔

چاند گرہن کے متعلق یہ ایک دلچسپ معلومات ہو کہ ہر ۱۹ سال اور ۱۱ دن (۶۵۸۵ دن) یا زیادہ صحیح طور پر ہر ۶۵۸۵ دن اور ۸ گھنٹہ کے وقفہ کے بعد چاند گرہنون کا ایک جدید دور شروع ہوتا ہو۔ مثلاً اگر آج سے ۱۹ سال اور ۱۱ دن تک کے تمام چاند گرہنون کا وقت اور کیفیت درج کر لیجائے تو آج سے پہلے اور بعد کے کل چاند گرہن اُسی وقت اور کیفیت کے مطابق ہونگے۔ اسی قاعدہ کی مدد سے قدیم ہیئت دان پہلے سے چاند گرہن کے اوقات دُنیا کے سامنے شائع کر دیتے تھے حالانکہ اُن

زمانہ مین چاند کی حرکت کا مطالعہ کامل طور پر نہین کیا گیا تھا۔ اب ہم اگر یہ مان لین کہ زمین اس تمام عرصہ مین یکسان رفتار کے ساتھ حرکت کرتی رہی ہو تو ہم اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہین کہ بابل مین چاند گرہن ۷۲۱ ق م کو ۱۹ صدی پہلے کس وقت شروع ہوا ہوگا۔ اس اندازہ سے معلوم ہوتا ہو کہ چاند گرہن کے شروع ہونے مین تقریباً ۵ گھنٹہ کی غلطی ہو یعنی اگر زمین کی رفتار کو یکسان مانا جائے تو ہیئت دان کی تحریر مین پانچ گھنٹہ کی غلطی پائی جائیگی کیونکہ حسابی اندازہ سے چاند گرہن ۵ گھنٹہ پہلے شروع ہونا چاہیے۔ اس لیے زمین ان ۲۶۳۴ برس مین مجموعی طور پر ۵ گھنٹے پیچھے ہو گئی ہو اور بیسوین صدی عیسوی مین زمین کی حرکت اتنی سُست ہو گئی ہو کہ آٹھوین صدی قبل از مسیح کی نسبت ۹۷۰ ہزار گردشین کرنے مین ۱۳ ثانیہ زائد دیر کرتی ہو گویا آجکل ہر ایک دن عہد بابل کے دنون سے ایک ثانیہ کا اٹھائیسوان حصہ زیادہ بڑا ہو اور ہر سال عہد بابل کے سال سے ۱۳ ثانیہ بڑا ہوتا ہو۔

اس قسم کی اور بہت سی مثالون سے اندازہ لگایا گیا ہو کہ زمین کی رفتار ہر صدی مین نصف ثانیہ فی سال کم ہو رہی ہو یعنی ۱۹۱۳ء مین ۳۶۵ محوری گردشون کے لیے ۱۸۱۳ء کی نسبت نصف ثانیہ زیادہ درکار ہو۔ یہان اس امر کی توضیح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہو کہ زمین کی رفتار کی تبدیلی زمانہ ماضی اور زمانہ حال کے وقت کے مجموعی فرق سے بالکل جُدا ہو۔ فی سال زمین کی رفتار $\frac{1}{400}$ ثانیہ سُست ہوتی ہو اسطرح ہر ایک دن گزشتہ دن کی نسبت ثانیہ کا سات ہزاروان حصہ لمبا ہوتا ہو اور آنے والے دن سے اتنا ہی چھوٹا ہوتا ہو۔ فی صدی زمین کی رفتار $\frac{1}{4}$ ثانیہ سُست ہوتی ہو اسطرح ساٹھ صدیون کے بعد دن رات حال سے نصف منٹ لمبا ہو جائیگا۔ یہ اعداد بالکل خفیف اور بے بضاعت معلوم ہوتے ہین لیکن جس وقت ہم قرنہائے دراز مین اپنی نظر کو وسعت دیتے ہین اور زمین کی پوری تاریخ ابتدا سے انتہا تک معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہین تو حرکت محوری مین یہ قلیل کمی عالیشان نتائج کا پیش خیمہ بن جاتی ہو۔ ہم اس موضوع پر آئندہ ایک جُداگانہ مضمون مین (بعنوان زمین کی محوری حرکت کے بعض اہم نتائج) بحث کرینگے اور دکھائین گے کہ کس طرح ہم زمانہ ماضی مین دور بین نظر کے ساتھ چاند کو زمین سے علیحدہ ہوتے ہوئے دیکھ سکتے ہین۔

بہت سے صاحب شاید اس امر کو آسانی سے نہ سمجھ سکین کہ اگر زمین کی رفتار فی صدی نصف ثانیہ کی قلیل مقدار سے کم ہو رہی ہو تو کس طرح ۲۶۳۴ سال کے عرصے مین زمین نے تقریباً ۵ گھنٹے ضائع کر دیئے مین جیسا کہ ہم نے بابل والے چاند گرہن کی مثال مین ذکر کیا ہو۔ اس بات کو آسانی سے ذہن نشین کرنے کے لیے فرض کیجیے کہ آج سے ۲۶۳۴ سال پہلے بابل مین ایک صحیح گھڑی قائم کی گئی تھی جو آج تک بالکل صحیح طور پر چل رہی ہو۔ سوال صرف یہ ہو کہ بمقابلہ اس صحیح گھڑی کی زمین کتنے گھنٹے پیچھے رہ گئی ہو۔ ہماری مثال کے مطابق اگر وہ قدیم گھڑی عین نصف النہار کے وقت چلائی گئی تھی یعنی شروع مین دوپہر کے وقت اس گھڑی مین ٹھیک بارہ بجے تھے تو موجودہ صدی مین دوپہر کے وقت اُس صحیح گھڑی مین بجائے ۱۲ کے سہ پہر کے ۵ بجے ہونگے اگر ہم مشاہدہ کے بجائے گزشتہ ۲۶۳۴ سال کے ہر ایک سال کی کمی جمع کرتے جائین تو اسی نتیجہ پر پہنچین گے۔ مثلاً پہلی صدی کے پہلے سال مین زمین نے $\frac{1}{200}$ ثانیہ کھوئے دوسرے سال مین $\frac{2}{200}$ ثانیہ ..... پچاس سال مین $\frac{50}{200}$ ثانیہ اور سوین سال مین $\frac{100}{200}$ ثانیہ ان اعداد کے جمع[1] کرنے سے معلوم

[1] جمع کرنے کا ایک آسان قاعدہ یون حاصل ہو سکتا ہو: پہلے ۵ عدد کی جمع ۱۵ برابر ہو $\frac{1}{2}$ (۵ × ۶) یعنی پہلے پانچ اعداد کی جمع ۵ ضرب ۶ کے نصف ۱۵ کے برابر ہو۔ عام قاعدہ جس کا آسان الجبری ثبوت دیا جا سکتا ہو یہ ہو کہ جتنے اعداد کی لڑی کے بعد جمع کیے جائین ان کی تعداد مین ایک بڑھا کر دو سے تقسیم کرو اور حاصل تقسیم کو آخری عدد سے ضرب دیدو۔ پہلی صدی مین وقت کا مجموعی نقصان اس قاعدہ سے $\frac{100 \times 101 \times \frac{1}{2}}{200}$ یعنی $\frac{101}{4}$ = $25\frac{1}{4}$ ثانیہ ہوتا ہو اسطرح دو صدیون کا مجموعی نقصان $\frac{200 \times 201 \times \frac{1}{2}}{200}$ = $100\frac{1}{2}$ ثانیہ ہو اور ۲۶ صدیون کا مجموعی نقصان ۲۶۰۱ کو ضرب تقسیم کی صورت کرکے ... یعنی ... اگر مان لیا جائے تو $\frac{2600 \times 2601 \times \frac{1}{2}}{200}$ = ... ثانیہ ہوتا ہو۔

ہوتا ہو کہ پہلی صدی مین زمین گھڑی سے ۲۵ ثانیہ پیچھے رہ گئی اسطرح دوسری صدی کے پہلے سال مین زمین نے نصف ثانیہ کھویا۔ دوسرے سال مین ۱۰۱/۲۰۰ ثانیہ اور سوین سال مین پورا ایک ثانیہ۔ گویا شروع دوسری صدی مین گھڑی سے ۷۵ ثانیہ پیچھے رہ گئی اور اسطرح دوسری صدی کے اختتام پر زمین گھڑی سے ۱۰۰ ثانیہ پیچھے ہو گئی۔ اس طرح ہر صدی مین زمین گھڑی سے زیادہ زیادہ پیچھے ہوتی گئی۔ ستائیسوین صدی کے شروع سال مین زمین نے ۱۳ ثانیہ ضائع کئے۔ دوسرے سال مین ۱۳ ۱/۲۰۰ ثانیہ علی ہذالقیاس ساری صدی مین ۱۳۲۵ ثانیہ ضائع گئے۔ اب اگر ہر صدی کے نقصان کو جمع کرین تو مجموعی نقصان کا پتہ چل جائیگا یعنی یہ معلوم ہوگا کہ آج زمین گھڑی سے کسقدر پیچھے گئی ہو۔ حاصل جمع یون نکلیگی:

(۲۵+۷۵+۱۲۵+۱۷۵+ . . . . ۱۳۲۵) ثانیہ

۲۵(۱+۳+۵+۷ . . . . . ۵۳) ثانیہ

۲۵×۵۴×۲۷/۲ = ۲۵×۲۷×۲۷ = ۱۸۲۲۵ ثانیہ = ۵ گھنٹہ ۳ منٹ ۴۵ ثانیہ

فیروزالدین مراد

تاریخی تصوّرات کا انقلاب

اُنیسوین صدی کی علمی کوششون اور ترقیون نے جہان ہمارے اور خیالات پر گہرا اثر ڈالا اور ہمارے تخیل کا رُخ بدل دیا ہو وہان ہمارے تاریخی تصورات مین بھی اہم انقلاب واقع ہوا ہو۔ اٹھارھوین صدی کی دُنیا بہت محدود تھی اور کرۂ ارض دوشیزہ معلوم ہوتی تھی۔ تاریخی زمانے بالکل کم سن بچے تھے لیکن جب ان پر اُنیسوین صدی کے اکتشافات کی روشنی مین نگاہ ڈالی جاتی ہے تو وہ نوعمر نہین بلکہ ضعیف العمر اور سفید ریش نظر آتے ہین۔ تاریخی زمانہ صغیر سن بچہ نہین بلکہ پختہ جوان اور نشہ شباب مین سرشار نظر آتا ہے۔

دُنیا کی چھ ہزار سال عمر کا خیال

دُنیا کو چھ ہزار سال سے قائم سمجھنا ایک معمولی بات تھی اور لوگ لکیر کے فقیر اور بزرگون کی آرا کے ایسے پابند تھے کہ کچھ چون وچرا کرنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ یورپ جو تمام علمی ترقیون کا مصدر و مسکن ہو دُنیا کو چند ہزار برس سے سمجھتا تھا۔ اسکی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ سترھوین صدی مین آئرلینڈ کے آرچ بشپ صاحب آشر نے بائبل مین جن بزرگون کا ذکر آیا ہو انکی نسلون کو جمع کر کے انکی ولادت اور موجودگی کا ایک زمانہ قرار دیا اور مسیحی دین کے بانی کی پیدائش سے چار ہزار سال قبل دُنیا کا وجود پذیر ہونا ٹھہرایا۔ یہ تاریخ بعض بائبلون کے حاشیہ پر مطبوع ہو کر مروج رہی۔ اس طرح سے دُنیا کی عمر چھ سات ہزار سال شمار ہونے لگی۔ لیکن اُنیسوین صدی سائنس کی تحقیقات، عالمانہ تنقید اور محققانہ طریقۂ استدلال کے لیے اپنی سابقہ ہمنون پر ہمیشہ ممتاز رہیگی۔ مخالفون کے ایک گروہ نے بشپ آشر کے تخمینہ کو تہ و بالا کر کے بالکل ناقابل اعتبار قرار دیا۔

سائنسی اکتشافات سے ہمارے خیالات پر بہت گہرا اثر ہوا ہو اور پُرانے تصورات بالکل بدل گئے ہین۔ اسکے کئی وجوہ ہین اور سب سے بڑی وجہ علوم طبیعی کی غیر معمولی ترقی ہو۔ اس سے ہماری مراد ارضیات طبعیات کیمسٹری، فلکیات اور اثریات (آرکیالوجی) سے ہو۔ علم مذاہب علم انواع انسان اور علم الالسنہ کی ترقیون نے بھی اس انقلاب مین بڑا جاری حصہ لیا ہو۔ مگر تاریخی تصورآت کی تبدیلی کا سہرا سب سے پہلے اثریات پھر ارضیات اور اخیر مین علم المعاشرت (سوشیالوجی) کے دو شعبون علم نوع انسان اور علم مذہب کے سر بندھتا اور تاریخی زمانہ کی توسیع کی نیکنامی کا طرہ اثریات کے محققون اور عالمون کی دستار فضیلت

العصر

حرکت کا پہلا قانون

زمین کی محوری حرکت بند ہوگئی ہے! کل صبح آفتاب عالمتاب افق شرقی سے طلوع نہیں ہوگا بلکہ صبح کی نورانی سفیدی کبھی آشکارا نہیں ہوگی!! جہاں دن ہے وہاں دن رہیگا اور جہاں رات ہے وہاں رات کی ابدی تاریکی صفحۂ زمین کو انسان کی آخری نسلوں کا ایک عالمگیر قبرستان بنا دیگی!!!

انسانی طبائع کا صحیح مطالعہ کرنا مقصود ہو تو کسی طریقہ سے اس سنسنی خیز خبر کو عارضی شہرت دیدیجیے پھر دیکھیے جہالت کی نیند کے متوالوں کی آنکھیں کس طرح کھلتی ہیں۔ مارکونی گرام[1] اور تاربرقیاں کس عجلت اور شوق کے ساتھ پڑھی اور سُنی جاتی ہیں۔ کیسی مستعدی کے ساتھ اجرام فلکی کا مشاہدہ کیا جاتا ہے اور خواہش ظاہر کی جاتی ہے کہ اگر ایک دفعہ پھر زمین کی باقاعدہ اور مسلسل حرکت شروع ہوجائے تو اُسکا وسیع مطالعہ کرینگے۔ لیکن جبکہ گرانبہا نعمت ہمیں عطا کی گئی ہے اور ہم ہر لمحہ اُس نعمت کے جان بخش فوائد سے متمتع ہوئے ہیں ہماری غفلت شعاری اور کوتاہ اندیشی ہمیں اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم ان آسان لیکن مہتم بالشان مسائل پر کماحقہ غور کریں اور زمین کی محوری حرکت کے علل اور نتائج پر عبور حاصل کرنے کے بعد اُس کے مسلسل اور باقاعدہ قیام کے متعلق جہاں تک انسانی سمجھ اور علم کام آسکتا ہو غایت درجہ کے مشتاق ہو جائیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف انسانوں کے میل ملاپ میں بلکہ مظاہر قدرت کے متعلق بھی حضرت انسان کا یہی معمول ہے کہ بے تکلفی اور روزمرّہ کی ملاقات کا نتیجہ اگر نفرت نہیں تو لاپروائی ضرور ہوتا ہے۔ اس اصول کی تشریح مذکورۂ بالا عسیر الحصول اور مرگ افزا مثال سے اگر کافی طور پر نہ ہوتی ہو تو

---

[1] مارکونی گرام (Marconigram) جو پیغام برقی رو کی مدد سے تاروں کے بغیر اتھیر کے تموج اور برقی لہروں کے ذریعہ سے ایک مقام سے دوسرے مقام پر وصول کیے جاتے ہیں ان کو بغیر تار کی برقی پیغام رسانی کے ایک طاقتور موجد یعنی مارکونی (Marconi) کے نام پر مارکونی گرام کہتے ہیں۔

اپنی زندگی کے جس شعبہ پر چاہو نظر ڈالکر اپنی تسلی کر لو جب یورپ میں بغیر تار کے برقی پیغام رسانی کا سلسلہ شروع ہوا تو ہر شخص اسکے سمجھنے کے لیے حد سے زیادہ خواہشمند نظر آتا تھا اور علمی ترقی کے میدان میں پیچھے رہ جانے ممالک کے سرتاج نیم وحشی نیم مہذب ملک ہندوستان میں تو آج تک یہی حالت ہے کہ وہ لوگ بھی جو علمی نقطۂ خیال سے مردوں کا حکم رکھتے ہیں اور علمی دنیا سے تمام تر بیخبر ہیں "بلا تار برقی" کے نئے نام سے چونک اُٹھتے ہیں۔ علمی زندگانی کی ایک عارضی لہر انکے مُردہ دلوں کو جلا دیتی ہے اور اس عجوبۂ یافت کے سمجھنے کے متمنی نظر آتے ہیں حالانکہ یہی وہ لوگ ہیں جنکو معمولی تار برقی پیغام رسانی کے متعلق ذرہ برابر ادراک نہیں ہے اور نہ ہی اسکے سمجھنے کی خواہش ہے۔ فرق دونوں حالتوں میں صرف یہ ہے کہ "معمولی تار برقی" ایک روزمرہ کی چیز ہے جب سے ہمنے ہوش سنبھالا ہے معمولی تار برقی کا نام سنتے آئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اگر نفرت نہیں تو لاپروائی اس کے متعلق ضرور پیدا ہو گئی ہے۔ برعکس اس کے "بلا تار برقی" ایک انوکھی چیز ہے اگر اس کے متعلق تھوڑی بہت گفت و شنید کرتے ہیں تو ہماری فطری جدت پسندی کی تسکین ہو جاتی ہے۔ ورنہ علمی نقطۂ خیال سے معمولی تار برقی اس امر کی زیادہ مستحق ہے کہ اسے بلا تار برقی سے پہلے سمجھا جائے میں خیال کرتا ہوں کہ اگر دنیا میں قدیم سے یہی رواج ہوتا کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ کھوکھلی نلیوں کے ذریعہ سے باتیں کرتے یعنی آواز کی موجوں کو کھلی ہوا میں گزارنے کی بجائے نلیوں میں سے گزارتے تو شاید نلیوں کی مدد سے باتیں کرنا ایک ویسی ہی معمولی بات سمجھی جاتی جیسی کہ تار کے ذریعہ سے برقی رو کا گزرنا سمجھا جاتا ہے۔ اور نلیوں کی وساطت کے بغیر براہ راست کھلی ہوا کے ذریعہ سے باتیں کرنا ویسا ہی عجوبہ مقصود ہوتا جیسا بغیر تار کے برقی پیغام رسانی کا سلسلہ فی زمانہ سمجھا جاتا ہے حالانکہ بغیر نلی کے باتیں کرنا جیسا کہ ہم ہمیشہ بغیر سوچے سمجھے کرتے ہیں ویسا ہی ہے جیسا کہ بغیر تار کے برقی رو کا ایک مقام سے دوسرے مقام تک بھیجنا۔ ایسا ہی چیزوں کے بوجھ کا مسئلہ اور اُن کا زمین کی طرف گرنا ایک ایسا عام مشاہدہ ہے کہ محض عمومیت کی وجہ سے لوگوں کی نظروں میں اس کی اہمیت باقی نہیں رہی۔ جہاں معمولی سے معمولی سمجھ کا آدمی یہ سوال کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے کہ یہ امر کیوں ہوا؟ اور وہ امر کیوں ہوا؟ اس کے دل میں اس خیال کا خیال بھی نہیں آتا کہ زمین چیزوں کو کیوں کھینچتی ہے؟

مندرجۂ بالا اصول کسی مفصل تصدیق کا محتاج نہیں ہے اور نہ اسکے ثبوت کا بہم پہنچانا ہمارے مبحث میں داخل ہے۔ ہمارا منشا موجودہ سلسلۂ مضامین کے لکھنے سے برادران وطن میں ایک علمی تحریک پیدا کرنا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ہمنے ایسے مضامین انتخاب کیے ہیں جن سے ناظرین میں اپنے مشاہدات اور عام علمی استعداد بڑھانے کی خواہش پیدا ہو۔ مضمون زیر بحث یعنی حرکت کے پہلے قانون کے ضمن میں زمین کی روزانہ اور سالانہ گردش کے متعلق چند نہایت ضروری سوالات ہیں کہ زمین کیوں اپنے محور اور سورج کے گرد گھومتی ہے؟ ہم کس طرح اس بات کا یقین کرتے ہیں کہ یہ ہمیشہ اسی رفتار کے ساتھ اپنے محور اور سورج کے گرد گھومتی رہیگی؟ ہمارے پاس اس یقین کے لیے نظری اور عملی ثبوت کیا ہیں؟ ان سوالات کا مفصل تسلی بخش جواب اپنی اپنی جگہ پر اس مضمون کے دوران میں آ جائے گا۔

نظام بطلیموسی[1] کے مطابق زمین ساکن متصور کی جاتی تھی اور اسے عالم کا مرکز مانا جاتا تھا۔ گردش لیل و نہار یعنی طلوع و غروب آفتاب کے متعلق متقدمین کے عجیب عجیب خیالات تھے۔ قاعدہ کی بات ہے کہ انسان اپنے گرد و پیش کے واقعات کی توجیہ کے لیے ضرور کوئی نہ کوئی وجہ بنا لیتا ہے جس سے ایک حد تک اس کے دل کی تسلی ہو جاتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اسکے دریافت کردہ اسباب صحیح نکلیں یا غلط۔ لیکن یہ ضرور ہوتا ہے کہ

[1] بطلیموس (Ptolemy) زمانۂ قدیم میں ایک قابل مہندس ہو گزرا ہے جسنے پہلی صدی عیسوی میں فروغ پایا تھا۔

اِن اسباب کی حقانیت کا اعتبار اس زمانہ کی معلومات کے مطابق ہوتا ہے آج جن باتوں پر مدرسہ کے طلباء کو ہنسی آتی ہے وہی باتیں اپنے اپنے وقت میں لاانتہا دماغ سوزی کا نتیجہ ہونے کی وجہ سے مقبول خاص و عام تھیں۔ ہم لکھ رہے تھے کہ طلوع و غروب آفتاب کے متعلق متقدمین کے عجیب و غریب خیالات تھے۔ شروع شروع میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ سورج ایک دیوتا کا مظہر ہے جو اپنے رتھ میں بیٹھ کر ہر روز مشرق سے مغرب کی طرف سیر کرتا ہے۔ یاد رہے کہ یونان میں ہندوستان کی طرح ہر قدرتی طاقت کا کم از کم ایک دیوتا ضرور ہوتا تھا۔ لہٰذا سب سے پہلے اُنھوں نے سورج کے دیوتا کی سواری سے سورج کے طلوع اور غروب ہونے کو تعبیر کیا۔ ازاں بعد متقدمین میں یہ خیال رائج ہوا کہ سورج دیوتا نہیں ہو سکتا اس لیے کہ کبھی کبھی (گرہن کے موقع پر) اسکی روشنی میں نقص واقع ہوتا تھا لہٰذا اُنھوں نے سوچا کہ ولکن[1] ہر روز جلتی ہوئی آگ کا ایک بہت بڑا گولا بنا کر مشرق کی سمت سے نہایت زور کے ساتھ اوپر کی طرف پھینک دیتا ہے۔ چونکہ گرمیوں میں سردیوں کی نسبت سورج آسمان پر زیادہ مسافت طے کرتا نظر آتا ہے اس لیے اُنھوں نے خیال کیا کہ ولکن سورج کو مختلف موسموں میں کم و بیش زور کے ساتھ اوپر کی طرف پھینک دیتا ہے۔ شام کے وقت ان کا خیال تھا کہ سورج بحرِ ظلمات میں گر کر ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ ساری رات ولکن ایک نیا سورج بنانے میں مصروف رہتا ہے اور علی الصبح اُسے ختم کر کے پھر اوپر کی طرف پھینک دیتا ہے۔ اس کی توجیہ کے خلاف خود ہی اُن کے دل میں دو اعتراضات گذرے۔ ایک تو یہ کہ ہر روز ایک نئے سورج کا بنانا ولکن کے لیے بھی باوجود اس کی دیوتائی طاقتوں کے زحمت سے خالی نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ جہاں سورج بحرِ ظلمات میں گرتا ہوگا وہاں اسکے گرنے اور سرد ہونے سے بہت شور ہوتا ہوگا اور پانی میں ایک طوفان اُٹھتا ہوگا اس لیے اُنھوں نے ایک اور وجہ سوچی جو اِن دونوں نقائص سے مبرا تھی۔ اس نئی تجویز کے مطابق ولکن علی الصبح سورج کے پھینکنے کے بعد ایک سنہری کشتی میں بیٹھ کر مغرب کی جانب جلدی جلدی پہنچ جاتا ہے اور شام کے وقت سورج کو سمندر میں گرنے سے بچا لیتا ہے۔ اس تجویز کے مطابق نہ تو ہر روز ایک سورج کا نقصان ہوتا ہے اور نہ سمندر میں طوفان ہی برپا ہوتا ہے۔ ساری رات ولکن سورج کو کشتی میں لیے ہوئے مشرق کی طرف چلا آتا ہے اور صبح ہونے پر پھر وہی پہلے دن کا سا حساب ہوتا ہے۔

بطلیموس کا نظام اور یہ لچر پوچ توہمات یورپ میں ازمنۂ مظلمہ میں تقریباً ڈیڑھ ہزار برس تک مقبول خاص و عام رہے ہیں۔ سولھویں صدی عیسوی میں کوپرنیکس (Copernicus) نے جو سنہ ۱۴۷۳ء میں پولینڈ میں پیدا ہوا تھا اور نیوٹن اعظم کی پیدائش سے پوری ایک صدی پہلے سنہ ۱۵۴۲ء میں مرا تھا بطلیموسی نظام اور ان قدیم توہمات اور دیو پری کی قصہ کہانیوں کا قلع قمع کیا۔ اس نے ثابت کیا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور یہ کہ سورج نظامِ شمسی کا مرکز ہے نہ کہ زمین! لیکن کوپرنکی نظام باوجودیکہ پہلے نظاموں سے بدرجہا اعلیٰ اور بہتر تھا اور آج تک صحیح مانا جاتا ہے لیکن اُس وقت یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ زمین کیوں سورج کے گرد گھومتی ہے۔ اس کے لیے ابھی ایک اور صدی کی علمی تحقیقات اور علم دوستوں کی تین پشتوں کی ضرورت تھی۔ کیپلر (Kepler) نے سنہ ۱۵۷۱ء سے سنہ ۱۶۳۰ء تک اور (Galileo) گے لی لیو نے سنہ ۱۵۶۴ء سے سنہ ۱۶۴۲ء تک اور سب سے زیادہ سر آئیزک نیوٹن نے سنہ ۱۶۴۲ء سے سنہ ۱۷۲۷ء تک اپنی قیمتی عمر کی لگاتار محنت کے بعد بیشمار دوسرے ہیئت دانوں کی عمر بھر کی محنتوں کا فائدہ اُٹھا کر نظامِ شمسی کے مختلف افراد کی حرکتوں کو قوانینِ حرکت سے منضبط کیا۔ سب سے زیادہ قابل قدر کام جو انکی وسیع تحقیقات نے سرانجام کیا

---

[1] ولکن ایک دیوتا کا نام ہے۔

وہ حرکت کے پہلے قانون کو صحیح طور پر سمجھتا تھا۔ کیپلر نے سیارگان نظام شمسی کی حرکت کے انضباط کے لیے تین قوانین وضع کیے جو قوانین کیپلر کے نام سے موسوم ہیں لیکن وہ بھی اس عقدہ کو کہ سیارے ایک ہی مرکز کے گرد کیوں گھومتے رہتے ہیں حل نہ کر سکا۔ یورپ کے ایام جہالت کے توہم پرستوں کی طرح اُس نے بھی ہر سیارے کا محرک (حرکت دہندہ) ایک جابک سوار دیوتا یا روح مقرر کیا جو اپنی اَن تھک طاقت سے سیاروں کو ان کی گردشوں میں سست نہیں ہونے دیتا تھا۔ سب سے بڑی بات جو انسانی دماغ میں موجزن تھی وہ سیاروں کی گردش کے متعلق تھی۔ سیارے کیوں متحرک ہیں؟ اُس زمانہ میں عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ ہر متحرک چیز کی حرکت قائم رکھنے کے لیے ایک لگاتار کام کرنیوالی طاقت کی ضرورت ہے۔ یہی ایک خیال تھا جس کا ظہور مختلف صورتوں میں ہوتا رہتا تھا۔

گیلیلیو کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ کوپرنیکی نظام کا ثبوت اور زمین کی حرکت کا سبب بیان کرنا ہے۔ لیکن پیشتر اس کے کہ ہم گیلیلیو کے طریقۂ ثبوت پر نظر ڈالیں ہم چاہتے ہیں کہ اس جلیل القدر عالم کی پُر آشوب زندگی سے ناظرین کو مختصر الفاظ میں واقف کرادیں۔ گیلیلیو فلارنس کے ایک معزز گھرانے میں ۱۰ فروری ۱۵۶۴ء کو پیدا ہوا تھا۔ ۱۷ برس کی عمر میں پیزا (Pisa) کی یونیورسٹی میں طب کی تعلیم کے لیے داخل ہوا۔ طالب علمی کے زمانہ ہی میں گیلیلیو نے اپنی خداداد ذہانت کا ثبوت اس طرح دیا کہ اپنے معلموں کو گرنے والے اجسام کے متعلق انکی غلطی سے متنبہ کیا۔ گے لی لیو کے زمانہ تک ارسطاطالیس یعنی ارسطو کی متابعت میں تمام یورپ اس بات کا قائل تھا کہ ایک ہی بلندی سے گرنے کا وقت مختلف وزن کی چیزوں کے لیے مختلف ہے۔ دنیا میں اگر بڑے نام نے صدیوں تک بنی نوع انسان کو گمراہ کیا ہے تو وہ ارسطو کا نام ہے۔ ارسطو کا معمول تھا کہ ناکافی مشاہدات کی بنا پر غلط نتائج جلدی سے مترتب کر لیتا تھا۔ ہم کسی دوسرے موقع پر ارسطو کی غلطیوں کے متعلق بحث کرینگے۔ یہاں صرف یہ دکھانا مطلوب ہے کہ علمی حوصلہ نام سے نہیں ڈرتا۔ بلکہ رعب میں آنے کے بجائے تجربہ کی طرف راجع ہوتا ہے۔ گے لی لیو نہ تو اپنے اُستادوں کے غلط ادعا سے متأثر ہوا اور نہ ارسطو کے باسطوت نام سے مرعوب ہوا۔ ایک دن علی الصبح شہر پیزا کے مینار لرزاں کے اوپر دو پتھر لے کر چڑھ گیا۔ ایک کا وزن ۵۰ سیر کے قریب تھا اور دوسرے کا نصف سیر۔ ارسطو کے قانون کے مطابق چاہیے تھا کہ اگر ۵۰ سیر وزنی پتھر زمین پر ۵ ثانیہ میں گرے تو نصف سیر وزنی پتھر اس وقت سے سوگنا زیادہ وقت میں گرے یعنی ۵۰۰ ثانیہ میں۔ گے لی لیو نے نہایت شد و مد سے اس غلط فلسفہ کی تردید کی اور عملی طور پر دکھا دیا کہ دونوں پتھر اگرچہ ان کے وزن میں بہت فرق تھا ایک ہی وقت میں گرتے ہیں۔ اُس نے مینار کے کنارہ پر دونوں پتھروں کو رکھدیا اور پھر ایک ساتھ نیچے گرا دیا۔ دونوں ایک ساتھ گرے اور ایک ساتھ ہی سطح زمین سے ٹکرائے۔ یہ صحیح ہے کہ ہلکے اجسام مثلاً کاغذ کے ٹکڑے وغیرہ ہوا کی وجہ سے آہستہ گرتے ہیں لیکن یہ فرق ذاتی نہیں ہے بلکہ ہوا کی رُکاوٹ کی وجہ سے ہے۔ اگر کسی جسم میں سے ہوا نکال لیجائے اور دو مختلف چیزیں ایک ہلکی اور ایک بھاری ایک ساتھ گرائی جائیں تو وہ یکساں رفتار کے ساتھ اس خلا میں گرتی ہیں۔ اسی امر کی توضیح کے لیے ایک عام تجربہ Guinea and Feather Experiment گنی اور پر کے نام سے مشہور ہے۔ چونکہ گے لی لیو نے ایک مقبول عام خیال کی تردید کی اس لیے پیزا میں اسکی ہر دلعزیزی میں فرق آگیا اور بہت سے فلسفیوں کو اس سے کینہ ہو گیا۔ لہذا ۱۵۹۲ء میں اس نے پاڈوا کی یونیورسٹی میں پروفیسری قبول کر لی۔

دوسرا بڑا کارنامہ جو گے لی لیو نے اپنی زندگی میں کیا وہ دُوربین کی تکمیل ہے۔ ہم گے لی لیو کو دُوربین کا موجد نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس

حیرت انگیز ایجاد کا فخر ۱۶۰۸ء میں ایک عینک ساز مڈل برگ کے رہنے والے ہنس لیپرشے (Hans Lippershey) کے شاگرد پیشہ لڑکے کے حصہ میں آیا ہے۔ لڑکے نے دو عینک کے شیشوں کو کھیل کے طور پر ایک دوسرے کے آگے رکھ کر دیکھا تو نزدیک کے گرجا کی چوٹی اُلٹی اور بہت نزدیک نظر آئی۔ افواہ ہے کہ جرمنی کے ایک امیر آدمی نے لڑکے سے اُس کھلونے کو خرید لیا اور ایک شہزادہ کو بطور نذر پیش کیا لیکن ہمارے لیے جو ضروری بات ہے وہ یہ ہے کہ اس واقعہ کی خبر کسی نہ کسی طرح سے گے لی لیو تک پہنچ گئی۔ خبر سنتے ہی اُس نے اس کے متعلق تحقیقات شروع کر دی۔ وہ تمام رات جاگا اور بالآخر ۱۶۰۹ء ہی میں اس نے دوربین کے نظریہ کو عملی طور پر ایک کمال تک پہنچا دیا کہ مشتری (جوپی ٹر Jupiter) کے چاند دریافت کیے۔ زہرہ اور عطارد کو دیکھا کہ وہ چاند کی طرح گھٹتے بڑھتے اور ہلال اور بدر کی شکلیں اختیار کرتے ہیں۔ زحل کے حلقے دیکھے اور اس طرح کوپرنیکی نظام کو دوربین کی مدد سے ایک مضبوط بنیاد پر کھڑا کر دیا۔ آخری حصۂ عمر میں گے لی لیو گرنیوالے اجسام کے مطالعہ سے حرکت کے قوانین کی بنیاد ڈالتا رہا۔ آخر عمر میں اس نے ایک کتاب شائع کی جس میں بطلیموسی نظام اور کوپرنیکی نظام کے متعلق چار مکالمات درج ہیں۔ روما کے پوپ کا حکم صادر ہوا تھا کہ زمین چپٹی ہے ساکن ہے اور عالم کا مرکز ہے۔ اس کے خلاف عقیدہ رکھنا کفر تھا۔ ستر برس کی عمر میں گے لی لیو کو کفر کے الزام سے روما میں طلب کیا گیا وہاں قید اور تکالیف شدیدہ[1] کے بعد بوڑھے آدمی نے تنگ آکر گھٹنے ٹیک کر اور ہاتھ باندھ کر زمین کے گول اور متحرک ہونے سے انکار کیا باوجود ان تمام سزاؤں کے بقیہ عمر کے لیے گے لی لیو سرکاری طور پر قید رہا۔ اسکی توبہ کے بعد فی الفور زمین کی حرکت سے انکار اور اسکے چپٹا ہونے کا بیان تمام یونیورسٹیوں میں بھیجا گیا تاکہ پروفیسر اپنی اپنی جماعتوں میں طلبا کو پڑھ کر سنائیں۔ ملٹن کی طرح گے لی لیو کی زندگی کے آخری ایام نورانی اندھیرے میں کٹے۔ وہ جس نے دوسروں کو علم کی روشنی دکھائی اور آسمانوں کی سیر کرائی تھی خود اندھا ہو کر اپنے آس پاس کی چیزوں کے دیکھنے سے عاجز ہو گیا۔ علم کی بڑھتی ہوئی روشنی کے رومائی دشمنوں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے کہ گے لی لیو کی زندگی کا خاتمہ کرنے کے ساتھ اُس کے کام کا بھی خاتمہ ہو جائے لیکن انسانی کوششیں کبھی ایسے نمایاں طریقہ سے ناکام نہیں ہوئی تھیں جس طرح رومائی کوششیں علم کی روشنی کے مٹانے میں ناکامیاب ہوئیں۔ جس سال گیلیلیو مرا اُسی سال نیوٹن پیدا ہوا اور جو کام گے لی لیو نے شروع کیا تھا نیوٹن نے اُسے پایۂ کمال تک پہنچایا۔

رومائی کوششوں سے گے لی لیو کی تقریباً ساری کتابیں جلا دی گئی تھیں خود اسکے بیٹے نے اپنے باپ کے بہت سے مسودے آگ کے سپرد کر دیے تھے لیکن اسکی ایک تصنیف حرکت اور مشینوں کے متعلق ملموسوم میکانیک (میکینکس Mechanics) خوش قسمتی سے اسکے ایک شاگرد رشید کی وساطت سے بچ گئی تھی۔ شاگرد موصوف گے لی لیو کو اسکی موت سے دو تین سال قبل ملنے آیا تھا اور حسن اتفاق سے یہ کتاب اپنے ساتھ لیجانے میں کامیاب ہوا تھا۔ ازاں بعد اُس نے اِسکو ہالینڈ میں شائع کر دیا۔ گے لی لیو نے مدت العمر کی محنت سے اجسام کی حرکت کے متعلق اپنی جملہ معلومات کو چند قوانین کی شکل میں بیان کیا تھا۔ نیوٹن نے بعد ازاں اُنھیں قوانین کو نہایت قابلیت کے ساتھ مختصر الفاظ میں رکھا۔ آج زمانہ میں نیوٹن کی بڑھی ہوئی شہرت کے غلبہ سے حرکت کے یہ تین قوانین نیوٹن کے قوانین حرکت کہلاتے ہیں۔

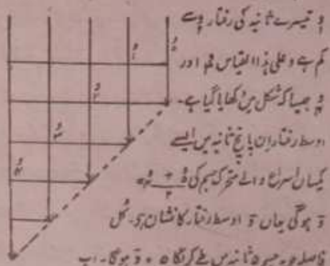
حرکت کا پہلا قانون نیوٹن کے الفاظ میں یوں ادا کیا جا سکتا ہے:

[1] روما میں کافروں کی تادیب کے لیے ایک نرالا عدالت بنام انکویزیشن (Inquisition) قائم تھی جس کا ادنیٰ کارنامہ یہ ہے کہ علم اور حق کی حمایت کی پاداش میں سیکڑوں ہی چتا پر جلا دیے گئے اور ہزاروں شکنجہ کی مصائب میں مبتلا کیے گئے۔

"ہر ایک جسم تاوقتیکہ اُس پر کوئی طاقت عمل نہ کرے اپنے سکون یا حرکت کی حالت پر قائم رہتا ہے"۔ یا بالفاظ دیگر "اگر کوئی طاقت ایک متحرک جسم پر عمل نہ کرے تو وہ ایکساں رفتار کے ساتھ متحرک رہتا ہے"

اس زبردست قانون کے متعلق چند باتیں قابل غور ہیں۔ اگر ایک جسم ساکن ہی تو وہ خود بخود متحرک نہیں ہو سکتا۔ ایک ساکن جسم میں حرکت جبھی پیدا ہوتی ہے جب کوئی طاقت اُس پر عمل کرے۔ اگر وہ جسم متحرک ہے تو وہ اپنے آپ یکساں رفتار کے ساتھ حرکت کرتا رہیگا۔ اس کی حرکت میں کمی بیشی یا کجی جبھی واقع ہوگی جب کوئی طاقت اُس پر عمل کرے۔ ایک متحرک جسم کی حرکت قائم رکھنے کے لیے کسی طاقت کی ضرورت نہیں۔ طاقت کی ضرورت صرف اُسکی حرکت میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ حرکت میں تبدیلی دو طرح پر ہو سکتی ہے۔ یا تو رفتار میں کمی بیشی یعنی اسراع اور تعویق ہو یا سمت بدل جائے۔ نیوٹن اور گیلیلیو کے اس حصۂ کام کی زیادہ وقعت اس لیے ہے کہ ان مقدمات کی مدد سے عالم میں ستاروں وغیرہ اجرام فلکی کی حرکات بالعموم اور نظام شمسی کے افراد کی حرکات بالخصوص بنی نوع انسان کو ایسے طریقہ پہ سمجھ میں آگئی ہیں کہ اب ان میں شک و شبہ یا اور کسی طرح کے رد و بدل کا امکان نہیں ہے۔ موجودہ سائنس یہ کہنے سے عاجز ہے کہ سب سے پہلے اجرام فلکی کی حرکت کس طرح شروع ہوئی۔ لیکن اگر یہ سوال خارج از بحث کر دیا جائے تو باقی مسئلہ تمامہ سائنس نے کما حقہ سمجھ لیا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ مشیت ایزدی سے اجرام فلکی متحرک ہوگئے تو اور کسی بیرونی طاقت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ تشریح کے لیے ہم زمین ہی کی مثال لیتے ہیں۔ جب یہ ایک دفعہ اپنے محور کے گرد گھومنی شروع ہوگئی تو حرکت کے پہلے قانون کے مطابق اب کسی طاقت کی ضرورت اِس محوری حرکت کے قیام کے لیے باقی نہیں رہتی۔ متقدمین کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ ان کے

ف۲۰۱ حرکت کے متعلق چند اصطلاحات ضروریہ کی تشریح مناسب معلوم ہوتی ہے۔ اگر ایک جسم کبھی ایک مقام پر اور کبھی دوسرے مقام پر ہو تو اُس جسم کو متحرک کہتے ہیں گویا حرکت نقل مکانی کا دوسرا نام ہے۔ جتنا فاصلہ ایک متحرک جسم ایک ثانیہ میں طے کرتا ہو اُسے رفتار کہتے ہیں۔ مثلاً ایک متحرک جسم ایک منٹ میں بیس گز چلتا ہو تو اسکی رفتار (Velocity) بیس گز فی منٹ یا ایک فٹ فی ثانیہ ہوگی۔ جس رفتار میں کمی بیشی نہ ہو یعنی مختلف اوقات پر برابر برابر عرصہ میں برابر فاصلے طے ہوں اُسے یکساں رفتار یا حرکت غیر (Non-accelerated Motion or Uniform Velocity) کہتے ہیں۔ جس کی رفتار میں کمی بیشی ہوتی رہے وہ بدلی ہوئی (Variable Velocity) کہتے ہیں۔ ایک ثانیہ میں رفتار جس قدر بڑھتی یا گھٹتی ہو اُسے اسراع (Acceleration) یا تعویق (Retardation) کہتے ہیں۔ مثلاً ایک ریل گاڑی اسٹیشن سے روانہ ہونے کے بعد پہلے پانچ منٹ میں دو میل اور دوسرے پانچ منٹ میں چار میل فاصلہ طے کرے تو اُسکی اسراع ۲/۵ میل فی منٹ ہوگی۔ اگر ایک جسم کو بلندی سے اوپر سے نیچے کی طرف پھینکا جائے تو زمین کی کشش سے اسکی رفتار لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جائیگی چونکہ کشش زمین ایک نہ بدلنے والی طاقت ہی۔ ہر لمحہ اسراع برابر مقدار ہوگی۔ فرض کیجیے کہ ایک متحرک جسم کی رفتار یکساں اسراع کے ساتھ بڑھ رہی ہے یعنی پہلے ثانیہ میں رفتار $ر_1$ دوسرے ثانیہ کی رفتار $ر_2$ سے اتنی کم ہو جتنی کہ $ر_2$ تیسرے ثانیہ کی رفتار $ر_3$ سے کم ہے و علیٰ ہذا القیاس $ر_4$ اور $ر_5$ جیسا کہ شکل میں دکھایا گیا ہے۔



اوسط رفتار ان پانچ ثانیہ میں ایسے یکساں اسراع والے متحرک جسم کی $\frac{ر_1 + ر_5}{2} = \bar{ر}$ ہوگی جہاں $\bar{ر}$ اوسط رفتار کا نشان ہی۔ کل فاصلہ جو یہ جسم ۵ ثانیہ میں طے کریگا $5 \times \bar{ر}$ ہوگا۔ اب اگر اسراع کو $ر_2 - ر_1 = ر_3 - ر_2 = ر_4 - ر_3 = ر_5 - ر_4$ کو ب کہا جائے تو پہلے ثانیہ میں رفتار کی زیادتی ب ہو (باقی بر صفحہ آیندہ)

نزدیک حرکت جاری رکھنے کے لیے ایک مستقل طاقت کی ضرورت تھی اُور اسی لیے انھیں اتنی دوراز کار تاویلیں کرنا پڑتی تھیں۔ ایک آدمی جو بائیسکل پر بیٹھا "بائیسکل چلا رہا ہے" فی الاصل اپنی طاقت بائیسکل کو حرکت دینے میں صرف نہیں کرتا بلکہ اُس مزاحمت کے اثر کو رفع کرنے کے لیے طاقت صرف کرتا ہی جو بوجہ راستہ کی رگڑ اور ہوا کی رُکاوٹ کے بائیسکل کی رفتار میں تعویق پیدا کرتی ہی۔ اگر راستہ بالکل صاف اُور بغیر رگڑ (Friction) کے ہو تو صرف ہوا کی رکاوٹ باقی رہجاتی ہے اور اس حالت میں بائی سکل کی رفتار یکساں رکھنے کے لیے کم طاقت صرف کرنا پڑتی ہے ازاں بعد رفتار کی کمی جو رگڑ اور ہوا کی مزاحمت سے پیدا ہوتی ہے طاقت کے صرف سے پوری کیجاتی ہی۔ اگر یہ نہ ہو تو بائیسکل ابدالآباد تک ایک سیدھی لکیر میں یکساں رفتار کے ساتھ چلتی رہے بعینہ یہی مثال اجرام فلکی کی حرکت کے لیے مفید ہو سکتی ہی۔ اجرام فلکی ایک دفعہ متحرک کیے گئے ہیں۔ ان کے راستہ میں کوئی چیز ایسی نہیں ہی جو حرکت کی مزاحم ہو سکتی ہی۔ اس لیے اب ابدالآباد دائمی حرکت یکساں حالت میں جاری رہیگی۔ راستہ کی رگڑ وغیرہ کے علاوہ اور بھی اسباب حرکت کے مانع ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اگر بائی سکل کے بریک باندھ دیے جائیں تو بائیسکل کی رفتار کم ہو جائیگی۔ اسی طرح زمین کی محوری حرکت کی حالت میں جہاں تک سائنس کی معلومات کام کر سکتی ہیں کوئی ایسی طاقت از قسم راستہ کی رگڑ وغیرہ نہیں ہی۔ اس لیے سائنس داں امید کرتے ہیں کہ اگر کوئی اُور ایسی طاقت جس کا اُنھیں فی الحال علم نہیں ہی زمین کی محوری حرکت بند یا سُست[1] نہ کر دے تو زمین ہمیشہ یکساں رفتار کے ساتھ اپنے محور کے گرد حرکت کرتی رہیگی اور گردش لیل و نہار کبھی منقطع نہ ہوگی۔

زمین کی سالانہ حرکت جس میں سورج کے گرد یہ گھومتی ہی اسی طرح نقص یا زیادتی سے آزاد خیال کیجاتی ہی۔ حرکت کے پہلے قانون کے مطابق زمین کو ایک خط مستقیم میں حرکت کرنا چاہیے لیکن یہاں ہمیں ایک اور مستقل مرکزی طاقت سے واسطہ پڑتا ہی۔ سورج چونکہ زمین سے بہت بڑا ہی اس لیے تجاذب ماذی کے عالمگیر قانون کے مطابق زمین سورج کے مرکز کی طرف کھینچی جاتی ہی۔ پس یہاں دو طاقتوں کا مقابلہ ہے۔ ایک تو وہ طاقت جس نے ہمیشہ کے لیے زمین کو ایک خط مستقیم پر چلا دیا ہی اور دوسری سورج کی کشش جو ہر لحظہ عمل کر رہی ہے۔ ان دونوں قوتوں کی مثال آسانی سے یوں دیجا سکتی ہے۔ ایک پتھر کو کسی رسی کے ایک سرے سے باندھیے۔ دوسرے سرے کو پکڑ کر پتھر کو زور سے گھمائیے۔ آپ محسوس کرینگے کہ پتھر کی Centrifugal Porce (یعنی وہ طاقت جس کی وجہ سے پتھر مرکز سے دور بھاگنا چاہتا ہی) کی وجہ سے رسی آپ کے ہاتھ سے چھوٹ جانا چاہتی ہے لیکن آپ کے ہاتھ کی Centripetal Force (یعنی وہ طاقت جو پتھر کو مرکز کی طرف کھینچتی ہے) پتھر کو ایک دائرہ میں گھماتی ہی۔ جتنے زور سے آپ

(بقیہ صفحہ گزشتہ) دوسرے میں ۲ × ب۔ تیسرے میں ۳ × ب وغیرہ وغیرہ۔ ت عدد ثانیہ میں رفتار کی زیادتی = ت × ب آخری ثانیہ کی رفتار برابر ہوتی ہے حاصل جمع رفتار کی زیادتی کے۔ اسلیے ت ثانیہ کے ابدتھی رفتار = ؤ × ت × ب۔ لہذا اوسط رفتار و = ؤ + ؤ + ت × ب / ۲ = ؤ + ۱/۲ ت × ب اور کل فاصلہ جو اس اثنا میں طے ہوا = ۱/۲ ت × و = ت ؤ + ۱/۲ ب ت۲۔ اگر ایک جسم سکون کی حالت سے شروع ہو تو چونکہ ؤ صفر کے برابر ہے د = ۱/۲ ب ت۲۔ اگر ایک جسم ساکن زمین کی طرف سکون کی حالت سے گرایا جائے تو شاہدہ سے دیکھا گیا ہی کہ پہلے ثانیہ میں ۱۶ فٹ گرتا ہی دوسرے ثانیہ میں ۴۸ فٹ تیسرے میں ۸۰ فٹ وعلی ہذا القیاس۔ گویا پہلے ثانیہ میں رفتار ۱۶ فٹ فی ثانیہ دوسرے میں ۴۸ فٹ فی ثانیہ اور تیسرے میں ۸۰ فٹ فی ثانیہ ہوتی ہی۔ لہذا زمین کی کشش کا اسراع ۳۲ فٹ فی ثانیہ ہی۔ کل فاصلہ جو یہ جسم ایک ثانیہ میں طے کرتا ہی ۱۶ فٹ ہی۔ دو میں ۶۴ فٹ تین ثانیہ میں ۱۴۴ فٹ وعلی ہذا القیاس۔

[1] ہمنے ایک جداگانہ مضمون میں جس کا عنوان "کیا زمین کی حرکت فی الواقع سست ہو رہی ہی" ہے اس موضوع پر مفصل بحث لکھی ہے۔

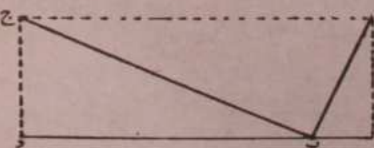
پتھر کو گھمائیں گے اُتنے ہی زور سے آپ کو مضبوطی کے ساتھ رسی پکڑنی ہوگی اور جتنی رسی لمبی ہوگی اُتنا ہی زیادہ وقت ایک دائرہ کی تکمیل کے لیے درکار ہوگا۔ اگر آپ رسی کو ہاتھ سے چھوڑ دیں تو پتھر سیدھا ایک سمت میں جائیگا اُسی سمت میں جس میں وہ اُس وقت حرکت کر رہا تھا جب آپ نے ہاتھ سے رسی چھوڑی۔ بالکل یہی حالت سورج اور زمین کے درمیان ہے۔ رسی کے بجائے یہاں تجاذبِ مادی کی باہمی کشش ہے جسکے لیے کسی مادی میڈیم (Medium) (اُس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ یا جس کے بیچ میں سے گزر کر کوئی اثر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا ہو) کی ضرورت نہیں ہے۔ جب تک سورج کی کشش میں کوئی فرق نہیں آئیگا زمین اپنی سالانہ گردش میں متواتر مصروف رہیگی۔

پس ہم دیکھتے ہیں کہ قدرت کے تجربہ خانہ (معمل۔ لے بلیے ٹری Laboratory) میں حرکت کے پہلے قانون کا ثبوت ہمارے مشاہدہ میں ایک عظیم الشان پیمانہ پر آتا ہے۔ ہمارا نظریہ ہے کہ فضای بسیط کے ایتھر میں یہ خاصہ ہے کہ اجرام فلکی اس میں بغیر رگڑ کے حرکت کرتے ہیں لہذا چونکہ حرکت کی کمی کے لیے کسی طاقت کی ضرورت ہے اور اجرام فلکی کی حرکت کم کرنیوالی کوئی طاقت نظر نہیں آتی امید ہے کہ یہ حرکت ہمیشہ کے لیے قائم رہیگی یہاں تک کہ کوئی غیر متوقع حادثہ جو سر دست ہمارے ادراک سے باہر ہے نظام عالم کا خاتمہ نہ کرے۔

ہم زمین پر حرکت کے پہلے قانون کا ثبوت صرف ایک ناممکمل طریقہ سے دے سکتے ہیں۔ اس لیے کہ رگڑ وغیرہ حرکت کی کم کرنیوالی طاقتیں ہم کبھی معدوم نہیں کر سکتے ہاں ان کو ایک خاص حد تک جتنا چاہیں کم کر سکتے ہیں اور اس حد تک اپنے مشاہدات کو وسیع کر سکتے ہیں۔ گزشتہ صدی کے ایک نہایت ہی قابل سائنس داں کلرک میکسویل مں (Clerk Maxwell) نے حرکت کے پہلے قانون کو اس طرح ثابت کیا تھا کہ اُس نے مخرج الہوا کے ذریعہ سے ایک برتن میں سے جہاں تک اس سے ہو سکا تمام ہوا نکال لی اور پھر اپنا بنایا ہوا ایک بہت بڑا لٹو (Top) اسکے اندر گھمایا تو گھنٹوں تک اُسکی حرکت بند نہیں ہوتی تھی۔ حالانکہ کھلی ہوا میں بہت جلدی اُسکی گردش جاتی رہتی تھی۔ اسی طرح صاف زمین پر ایک گول پتھر بہت دور تک لُڑھکتا ہوا چلا جاتا ہے اور اگر برف کی صاف سطح میسر ہو تو پتھر کی حرکت بہت سا فاصلہ طے کرنے کے بعد ضائع ہوتی ہے۔ رگڑ کے کم کرنے کے لیے کلوں کے پرزوں کو تیل (جس کو اصطلاح میں لُبری کنٹ Lubricants کہتے ہیں) لگایا جاتا ہے۔ گریفائٹ (Graphite) جس سے غلط طور پر مشہور ہے کہ پنسلیں بنتی ہیں رگڑ کم کرنے کے لیے کئی تیلوں سے بہتر ہے۔ لیکن کیسا ہی عمدہ سے عمدہ لُبری کنٹ کیوں نہ ہو تھوڑی بہت رگڑ ضرور باقی رہتی ہے۔ لہذا یہ تمام تجارب جن میں ایک ٹھوس جسم کی حرکت دوسرے ٹھوس جسم کے مقابلہ میں دیکھی جاتی ہے ذیل کے تجربہ سے افضل نہیں ہیں۔

ایک باریک دھاگا یا تار کو کسی اونچی جگہ باندھیے اور نچلے سرے کے ساتھ ایک بھاری جسم لٹکا کر اسے ہلا دیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ کہ وہ بھاری جسم بہت دیر تک ادھر سے اُدھر تک حرکت کرتا رہیگا اور اگر یہی تجربہ خلا میں کیا جائے تو اور بھی زیادہ کامیاب ہوگا۔

گے لی لیو کا اصلی تجربہ جس کی بنا پر حرکت کا پہلا قانون وضع ہوا تھا اس قابل ہے کہ اسے غور کے ساتھ سمجھا جائے۔



دو لکڑی کے تختے اب اور ب ج لیجیے اور ان کے نچلے سروں

کو ملاکر ڈھلوان رکھ دیجیے اس طرح کہ خطِ مستقیم س ب د سے ان کے اوپر کے سروں کا عمودی فاصلہ برابر ہو۔ گے لی لیو نے مشاہدہ کیا کہ اگر ایک جسم ایک تختہ کی چوٹی پر رکھ کر چھوڑ دیا جائے تو اُس میں اتنی حرکت پیدا ہو جاتی ہے کہ دوسرے تختہ کی چوٹی تک پہنچ جاتا ہے۔ اگر دونوں تختے کافی صاف ہوں اور رگڑ بہت کم ہو تو دوسرے تختہ کی لمبائی خواہ کتنی زیادہ ہو لڑھکتا ہوا جسم اُسکی چوٹی تک پہنچ جائیگا بشرطیکہ اسکی عمودی بلندی پہلے تختہ کی عمودی بلندی کے برابر ہو۔ بہ الفاظ دیگر رفتار کی کمی اگر رگڑ نہ ہو تو صرف عمودی بلندی سے واقع ہوتی ہے پس انتہائی حالت میں اگر دوسرا تختہ بالکل افقی ہو اور اس میں رگڑ نہ ہو تو حرکت و رفتار میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی متحرک جسم ابد الآباد تک ایک افقی خطِ مستقیم میں یکساں رفتار کے ساتھ حرکت کرتا رہے گا۔

حرکت کے پہلے قانون کا یہ نظری ثبوت اس قابل ہے کہ اسکے متعلق مفصل بحث کی جائے لیکن ہم طوالت کے خوف سے اسی اجمال پر اکتفا کرتے ہیں۔

فیروز الدین مراد

تحصیل سائنس کی اہمیت

انگلستان کے مشہور فلاسفر فرانسس بیکن نے ایک کتاب نیو اٹلانٹس (New Atlantis) کے عنوان سے لکھی تھی جسمیں کامل سوسائٹی اور قابلِ نمونہ انتظامِ ریاست سے بحث کی ہے۔ وہ ایک جگہ سلیمان کے مکان کی بابت کہتا ہے :-

اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ موجودات کی مخفی حرکات، انقلابات اور اسباب کا علم حاصل کریں، اور بنی آدم کی سلطنت کی حدود کو وسیع کریں تاکہ وہ سب چیزوں پر حاوی ہو جائے۔

اس سے بیکن نے علم سائنس کا منتہائے کمال ظاہر کر دیا ہے جس کی غایت نہ صرف کائنات کے اندرونی تغیرات و تبدلات کے اسباب و نتائج کا کھوج لگانا بلکہ انسانی علوم کو اتنا وسیع کرنا ہے کہ کوئی شے زمین و آسمان میں ان کے احاطے سے باہر نہ رہنے پائے۔

تجربی علم کی ضرورت

لوگ پوچھتے ہیں کہ سائنس کے کیا فائدے ہیں؟ کیوں اپنے لڑکوں کو طبیعیات کیمسٹری وغیرہ پڑھائی جائے؟ اس سے تو کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا ہم ایسے غیر مفید علموں کی تحصیل میں کیوں اپنا وقت، اپنی دماغی محنت، اور روپیہ صرف کریں؟ جو لوگ زندگی کو بنیاگری کے اصول پر بسر کرنا چاہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ جو آدمی بنیے بقالوں کی طرح ہر معاملہ میں نفع و نقصان کو مدِ نظر رکھتے ہیں انھیں جیالوجی، فلکیات، باٹنی، زوآلوجی، بیالوجی وغیرہ کے مطالعہ کے استفادہ سے خبر نہیں لیکن سائنس کی کائنات اسی جگہ ختم نہیں ہوتی۔ وسیع ترین معنی میں اس کا اطلاق تمام اُن علوم و فنون پر ہوتا ہے جو انسان نے صدیوں کی دماغی محنتِ شاقہ اور ذہنی کاوش سے حاصل کیے ہیں اور نیز اس سے مراد ایسا علم بھی ہے جس کی صحت کی تجربہ سے تائید و تصدیق ہو سکتی ہے ایسا علم حاصل کرنا ہر ایسے انسان کے لیے لازمی ہے جو کشاکشِ زیست میں اپنے ہم جنسوں کے مقابلہ میں عہدہ برآ ہونا اور مہذب و متمدن اقوام کے افراد کے ساتھ مساوانہ رابطہ کرنے کا آرزومند ہے۔ تحصیل سائنس کے فوائد کا پوچھنا گویا علم کی ضرورت اور اہمیت پر شک کرنا ہے۔

سائنسی اختراعات کی خدمات

سائنس کے فوائد پر مطول بحث کرنا لا حاصل ہے۔ ہم اسکے بعض اکتشافات اور فتوحات کا مختصر ذکر کیے دیتے ہیں جس سے اس کی فیض رسانی آپ آپ

منکشف ہو جاتی ہے۔ یہ تار جو تھوڑی سی دیر میں ایک روپیہ کے صرفہ سے آپ کے عزیز کو آپ کا پیام بمبئی میں پہنچا دیتا ہے سائنس کی اختراع ہے۔ ریل گاڑی کا انجن جو ہزاروں من بوجھ ایک دن میں سیکڑوں میلوں پر لیجا کر ڈال دیتا ہے سائنس کے توسط سے وجود میں آیا تھا۔ دیا سلائی کی ڈبیا جس سے آپ کئی ہفتوں تک کام لیتے ہیں سائنس کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ اسی طرح آٹا پیسنے، کپڑے بُننے، سُوت کاتنے، کپڑے سینے کی کلیں، گاڑیاں موٹر کار اور سیکڑوں آلات جو ہماری جسمانی راحتوں کے ضروری ستون ہیں سائنس ہی کے معجزے ہیں۔ یورپ کیوں تمام دنیا پر حکمران ہے؟ سائنس کے زور سے جاپان نے کیوں روس ایسی زبردست سلطنت کو جس سے بڑی بڑی سلطنت خائف رہتی تھیں تھوڑے ہی عرصہ میں تمام دنیا میں ذلیل و خوار کیا اور اب ترقی یافتہ اقوام کی اگلی قطار میں کھڑا ہے؟ سائنس کی بدولت۔ الغرض کہاں تک بیان کیا جائے۔ سائنس کے اکتشافات کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔

سائنس کا مقصد

سائنس کا اصل مقصود یہ ہے کہ اشیا کے انقلابات کا مشاہدہ کرے۔ اشیا اور ان کے تغیرات کے درمیان جو تعلق ہے اُسے دیکھے۔ اور نیز یہ دریافت کرے کہ اشیا یعنی اسباب و نتائج کا ایک دوسرے کے ساتھ کیا لگاؤ ہے اور جو شخص موجودات کے مشاہدہ اور اپنے مشاہدہ کے صحیح صحیح حالات قلم بند کرنے یا کائنات کے اندر کوئی بڑا قانون معلوم کرنے کی دُھن میں مستغرق رہتا ہے وہ سائنس کے فوائد کی داستان سننے کی چنداں پروا نہیں کرتا۔ کئی اعتبار سے سائنس صناعی کی طرح ایک ہنر بنجاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ صناع قلم اور برش سے مختلف رنگ ملا کر ایک صورت پیدا کر دیتا ہے مگر سائنس داں اپنے قلم سے اشیا کا ایسا چشم دید اور واضح بیان لکھتا ہے کہ پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے ایک لفظی تصویر کھنچ جاتی ہے۔ سائنس ایک ہنر یا پیشہ ہے جو انسان کی ذہنی راحت اور اخلاقی مسرت کا موجب ہوتا ہے۔ ہکسلے کہتا ہے:-

اور جتنی خوشیاں ہیں ان میں ایک یہ بات عجیب ہے کہ ان سے طبیعت بہت جلد سیر ہو جاتی ہے۔ جب طبیعت کو ایک دفعہ حظ حاصل ہو گیا تو وہ جلد از جلد بدمزہ اور پھیکی ہو جاتی ہے۔ مگر علم کی خوشی کی یہ کیفیت ہے کہ طبیعت بھرتی ہی نہیں۔ جی اکتاتا نہیں بلکہ جتنا حاصل کرو اور لطف اٹھاؤ اتنا ہی اشتیاق تیز ہوتی ہے۔ اس لیے تحصیل علم کی خوشی مستقل، اعلیٰ، اور پاک ہے۔

اس امر پر بحث کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ خوشی اور شادمانی اخلاقی، روحانی، ذہنی اور جسمانی زندگی کے لیے کتنی ضروری اور مفید ہے۔ سو غذاؤں کی ایک غذا خوشی اور شادمانی ہے۔ اگر آپ کا دل مغموم اور کبیدہ ہے تو آپ کوئی کام انجام نہیں دے سکتے اگر طبیعت پر ظلم کر کے کیا بھی تو وہ خوبی اور کمالیت کبھی نہیں پیدا ہو سکتی جو شادا و خوش دل سے ممکن ہے۔ اس واسطے سائنس کے مطالعہ اور نئی نئی باتوں کی ٹوہ میں رہنے سے راحت قلبی اور لطف عقلی حاصل ہوتا ہے جو زندگی کے جھگڑے کے پہیوں کے لیے بمنزلہ تیل کے ہے اگر یہ نہ ہو تو شور و غل پیدا ہوتا اور رفتار دھیمی رہتی ہے۔

سائنس اور روزانہ زندگی

تحصیل سائنس کے لیے ضروری نہیں کہ آپ اپنا گھر بار چھوڑ کر کسی بڑی یونیورسٹی میں داخل ہوں اور وہاں اسکے مختلف شعبوں کا بڑے بڑے محققوں اور عالموں کے زیر نگرانی مطالعہ کریں۔ نہیں نہیں۔ آپ سائنس کے مسائل سے روزمرہ کے کاروبار میں دوچار ہوتے ہیں اور جس ڈھنگ سے مختلف ملکوں اور صدیوں میں روزانہ ضروریات زندگی کو بہم پہنچانے کی کوشش کی گئی اس سے سائنس کو ترقی نصیب ہوئی۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ اگر آپ سائنس کے مسائل کی تاریخ پر نگاہ ڈالیے گا تو یہ امر بخوبی ثابت ہو جائیگا۔ آپ علم نباتات کو لیجیے۔ باغوں کے پودوں، ان کے خواص و فوائد، کھیتوں کی جڑی بوٹیوں کی معمولی واقفیت سے اسکی ابتدا ہوئی۔ یہی حال طب کا ہے۔ جڑی بوٹیوں کے خواص اور فوائد کے علم کی وسعت سے اس علم کی بنیاد پڑی۔ جو علم الحیوٰۃ (بیالوجی) کی ایک شاخ ہے۔ پھر پودوں کو پھل پھول کی خاطر لگانے اور ان سے عمدہ اور بکثرت پھل

حاصل کرنے کی کوشش کیجاتی ہے۔ اس لیے خاص طریقہ وضع کیے جاتے ہیں جو سب کے سب علم نباتات کے تحت میں آتے ہیں۔ یہی کیفیت علم حیوانات (زوآلوجی) کی ہے جو خانگی جانوروں یعنی کتے، بلی، گائے، بھینس، گھوڑے، خچر، بھیڑ، بکری، مرغ، کبوتر، تیتر، بٹیرے شروع ہوتا ہے۔ پھر اس کا تصرف علاقہ کے جانوروں پر ہوا۔ بعدازاں ضلع پھر صوبہ پھر ملک اور اخیر میں تمام دنیا کے چرند و پرند اسی کے ماتحت نظر آتے ہیں۔ گویا سائنس جائے گھروں میں وجود قبول کرتا ہے اور ہماری خدمت گزاری کے لیے ہے جسے اگر وفادار خانہ زاد کے نام سے پکارا جائے تو غیر موزوں نہ ہوگا۔

روزمرہ ضروریات زندگی سے سائنس پیدا ہوا

پروفیسر ایسی نس کا یہ مقولہ ہے کہ عمل خیال پر مقدم رہتا ہے یعنی ہم عملاً سائنس کی بہت سی باتیں سیکھ لیتے ہیں۔ تجربے کرتے رہتے ہیں لیکن نظریہ یا مسئلہ بعدازاں بنتا ہے جبکہ ہم اپنے علم کو معقول اصول اور طریقہ سے ظاہر کرتے ہیں۔ اب آپ اس سے اندازہ کر لیجیے کہ سائنس کا ہماری عملی زندگی سے کتنا اہم اور قریبی تعلق ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ روزمرہ کے مشاہدہ اور تجربہ سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ نامعقول اور سائنس کے متضاد نہیں جیسا کہ سائنس کی چند کتابیں پڑھ کر بعض لوگ اپنے کو منتہی تصور کرنے لگتے ہیں اور بعض مروجہ دستوروں اور رایوں کو دقیانوسی، فرسودہ، ناموافق زمانہ، ٹھہرانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اصل یہ ہے کہ تمام علوم، سائیکالوجی اور سوشیالوجی کے ماسوا، قوم کے روزانہ کاروبار اور تجربہ سے وجود قبول کرتے ہیں۔ ریاضیات مجرد علم سے سمجھا جاتا ہے لیکن اسکی تاریخ بھی یہی ظاہر کرتی ہے کہ تجربہ اور روزانہ کاروبار کے درمیان اسکی ولادت ہوئی تھی۔ پروفیسر ٹی۔ کیس صاحب لکھتے ہیں :-

حساب کی ابتدا ہاتھ و پاؤں کی انگلیوں کی گنتی سے ہوئی تھی اور مساحت نے ہاتھ پاؤں اور بازوؤں کی لمبائی چوڑائی سے وجود حاصل کیا تھا۔ مدت تک ہاتھ اور بازو کی لمبائی اجسام کے طول و عرض کی پیمائش کا پیمانہ تسلیم ہوتی رہی۔ مساحت کی معنی زمین کا پیمانہ ہے۔ مصریوں کی سب سے پہلی اور پرانی کتاب اس فن پر ۱۷۰۰ ق م میں تصنیف ہوئی تھی جس میں سطح ستون، مخروطی مینار، کھلیان اور دیگر چیزوں کی پیمائش کا ذکر ملتا ہے۔ الغرض ریاضیات کا آغاز محسوسات سے ہوا اور رفتہ رفتہ مجردات کی بحث میں غائب ہو گیا۔

سائنس کا دھرم پتا

یہ امر قابل غور ہے کہ سائنس نے ہمارے معمولی پیشوں اور ہنروں کے جھگڑے میں جنم لیا تھا مگر یہ ایک اہم اخلاقی پہلو بھی لیے ہوئے ہے۔ مسٹر برانٹ فرڈ لکھتے ہیں کہ "ہم اپنے بزرگوں کی یاد کو فراموش نہیں کر سکتے۔ جیسے محقق جنیات لوہار ہے اسی طرح ماہر نباتات کسان۔ اور عالم حیوانات شکاری۔ جغرافیہ داں ملاح، مورخ بازاری ڈاکٹر جادوگر، اور قانون داں ملا ہے۔ رہا ریاضی داں، اس کا علم بہت سے پیشوں اور ہنروں سے ماخوذ ہوا ہے اور سب سے پرانا ہے۔ اگر وہ اپنے علم کی ابتدا اور اسکی عہد بہ عہد ترقیوں پر غور کرے تو وہ اپنے کو تمام زمانوں اور قرنوں کے پیشہ وروں کا وارث پائیگا۔ پھر اسے ہمارے تمام دھندوں سے بہت ہمدردی پیدا ہو جائیگی۔ اس اہم امر کو بھی مت بھولو کہ تمام علم اور علمی مسائل اور علوم کے شعبے ابتداً اس تجربے سے وجود پذیر ہوئے جو انسان نے مختلف ہنروں سے حاصل کیا تھا۔ یہ مت سمجھو کہ سائنس کوئی جانور ہے جو آسمان میں اڑتا پھرتا ہے۔ اور اسے ہمارے دنیا کے روزانہ قصوں سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے اور کسی نامعلوم طریقہ سے ترقی کرتا رہتا ہے..."

سائنس شروع شروع میں ان کوششوں اور خواہشوں سے پیدا ہوا تھا اور پیدا ہو رہا ہے جو اسکے ہول میں موجودات کے انقلابات اور باہمی راہ و رسم کی تہ میں تبدیلی اصول دریافت کر کے اپنے پیشوں میں کمال حاصل کرنے کے متعلق پیدا ہوئی تھی۔

مختلف علوم کی گوناگوں خدمات

سائنس کے فوائد اور اس سے انسان جو خدمات حاصل کر رہا ہے انکا ذکر قدرے وضاحت سے کرنا چاہیے۔ سنہ ۱۹۱۲ء کے شروع میں مسٹر ہنکس نے ایک کتاب فلکیات پر لکھی تھی اور ایک جگہ اُسکے عملی فوائد کا ذکر کیا ہے جسے ہم نقل کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے :-

جہازرانی فلکیات ہی کے وسیلہ سے ہوتی ہو۔ زمین کی پیمائش کرنے اور نقشے مرتب کرنے والے اسی علم کی بدولت روٹی کھاتے ہیں۔ وہ دنیا کو صحیح وقت بتاتے ہیں۔ سمندر میں جو جہاز چلتے ہیں فلکی انھیں پیام بے تار کے وسیلہ سے دن اور وقت بتاتے رہتے ہیں۔ کیمسٹری کے معرض وجود میں آنے سے پہلے پوزہ کشی، صابون سازی اور رنگسازی کا رواج تھا لیکن علم کیمیا کی بدولت کتنی دستکاریاں اور فن پھیل رہے ہیں ان کا بیان کرنا ہی دشوار ہی۔ خام سونے چاندی اور دیگر دھاتوں کو اسی علم کے وسیلے صاف اور خالص کیا جاتا ہی۔ کوئلے تارے سے بنزو ئین بنتی ہی اور اس سے انکے اور بہت سے مرکبات طیار ہوتے ہیں۔ مصنوعی رنگ جیسے نیل کیمیا ہی کے وسیلے تیار ہوتا ہی۔ فولاد کو بہتر بنایا جاتا ہی۔ برقی قوت کے وسیلے سے جو چیزیں تیار ہوتی ہیں وہ کیسی اعلیٰ ہوتی ہیں۔ زمین کو زرخیز بنانے کے لیے نائٹروجن سے کام لیا جاتا ہی۔ یہ سب کیمسٹری کے کرشمے ہیں۔ طبعیات کی بدولت تار، ٹیلیفون، بے تار برقی، برقی انجن، اور اڑنے کی کلیں تیار ہو گئی ہیں۔ جمادات اور علوم ارضیہ کی بدولت لوہا، سیسہ، تانبا، اور دیگر فلزات، کوئلہ وغیرہ صدہا چیزیں انسان کے فائدہ کے لیے دستیاب ہو رہی ہیں۔ دبے خزانے شکم زمین سے برآمد ہو گئے ہیں اور ہو رہے ہیں سمندر سے مچھلیاں نکل رہی ہیں اور علم حوادث ارض و سما سے جاڑوں، گرمیوں اور فصلوں کی بابت پہلے ہی سے کچھ علم ہو جاتا ہی کہ کیسا موسم ہوگا اور اس سے کس قسم کی فصلیں ہونے کی امید ہی۔ اس علم سے موسموں کے تغیر و تبدل اور اسکے وسیلے سے زرعی پیداواروں کی آیندہ کیفیت معلوم ہو جاتی ہے۔ بیکٹیریا (Bacterica) جراثیم کے انکشافات سے فن جراحی، حفظان صحت اور زراعت پر نہایت عمدہ اثر پڑا ہی اور اس سے اشیاے خوردنی بھی دیر تک محفوظ رہ سکتی ہیں فزیالوجی کے انکشافات سے افعال اعضا کے عیب معلوم ہو گئے ہیں۔ مینڈل کے معلوم کردہ قانون توارث (Law of Heredity) سے ہم گھریلو جانوروں کی نسل عمدہ بنا سکتے ہیں اور اس سے کام لیکر پودوں کی قدرتی حالت کو بدل سکتے ہیں۔

انیسویں صدی کے تیرہ اختراعات

ڈاکٹر والس نے ایک کتاب لکھی ہو جس میں انیسویں صدی کی اختراعات کا ذکر کیا ہو۔ وہ لکھتے ہیں گذشتہ صدی میں تیرہ اختراعات سے روزانہ کاروبار میں کام لیا گیا اور انکی بدولت ہمارے طرز معاشرت میں مستقل انقلاب پیدا ہو گیا ہو۔ وہ حسب ذیل ہیں۔ ریلوے، اسٹیم انجن کے وسیلے جہازرانی، تار برقی، ٹیلیفون، دیا سلائی، گیس کی روشنی، برقی روشنی، فوٹوگرافی، فونوگراف، ایکسرے، اسپکٹروسکوپ کے ذریعہ سے تاروں کے اجزائے ترکیبی معلوم کرنے کا طریقہ، مخدرات (Anaesthetics) کا استعمال، اپریشن کے بعد زخم کو ایسے طریقہ سے باندھنے کا ڈھنگ جس سے مضر جراثیم اسے خراب نہ کر سکیں۔ اس سے پیشتر کی صدیوں کی نہایت مفید اختراعات دوربین، چھاپہ، قطب نمائے بحری، اعداد، اور رسم الخط ہیں۔ اور انکے ساتھ مقیاس الہوا اور اسٹیم انجن بھی شامل ہو سکتا ہی۔ علم تراشہائے مخروطی اور علم ہندسہ سے جہازوں، قلعوں، عمارتوں وغیرہ کے بنانے میں ہمیں کس قدر فائدہ حاصل ہوتا ہی بیسویں کلیں اقلیدس کے قاعدوں سے بنتی اور چلتی ہیں جس سے ہمارے سیکڑوں کام انجام پذیر ہوتے ہیں اور ہمیں بیحد نفع پہنچ رہا ہی۔ فرانس کے مشہور محقق پاسٹر (Pasteur) کی تحقیقات سے بنی آدم کو کتنا عظیم نفع پہنچ رہا ہی اسکے مسئلہ جراثیم کے انکشافات سے کیمیائی حرفتوں میں انقلاب پیدا ہو گیا۔ اب سگ گزیدگی کا خاطرخواہ علاج ہوتا ہی۔ مرغوں مرغیوں اور مویشیوں کی وبا کا انسداد ہو سکتا ہی۔ اسکی دریافت سے جوزف لسٹر نے جراحی میں کام لیا اور اس امر کا خاطرخواہ انتظام کر لیا کہ اپریشن کے بعد زخم سڑنے نہ پائے۔ الغرض کہاں تک بیان کیا جائے کہ سائنس انسان کی خدمت کس طرح کر رہا ہی۔ ہربرٹ اسپنسر نے اسکا فیصلہ کر دیا ہی۔ وہ کہتا ہے "سائنس زندگی کے لیے ہی اور زندگی سائنس کے واسطے"۔ پروفیسر آرتھر ٹامسن کہتے ہیں:۔

بیشک سائنس زندگی کے راحت و آرام کے لیے ہی۔ مگر "زندگی" کی نسبت کوئی تنگ خیال نہ ہونا چاہیے۔ کیا زندگی کھانے پینے سے زیادہ نہیں ہی اور کیا لباس عبث لباس سے جانیں ہی؟ آج کل کی مہذب قوموں کے نوجوانوں کی زندگی کا کچھ

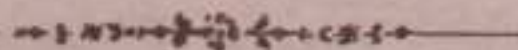
حصہ سائنس کی تحقیقات کے لیے بھی ہونا چاہیے ورنہ وہ تہذیب کے تمام لوازم سے بہرہ یاب نہیں ہوں گے۔ ہماری رائے یہ ہو کر سائنس ہی مہذب آدمی کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچاتا ہو بشرطیکہ اُسے کام کرنے کا موقع دیا جائے۔

سائنسی مطالعۂ فطرت کا اثر اخلاق ذہن اور روح پر

سائنس ہماری تمدنی راحت و آرام میں اضافۂ کثیر کرنے کے علاوہ ہمارے ذہن کی تربیت کرتا ہی۔ ہمیں صحیح صحیح مشاہدہ کرنے کی تلقین دیتا ہو۔ ہمارا دماغ سوچنے اور غور کرنے کے قابل بنتا ہو۔ ہماری قوتِ ممیزہ شستہ اور قوتِ استدلال صائب اور قوی بنتی ہو۔ سائنس سے موجودات اور اپنے اردگرد کی اشیا کا بغور ملاحظہ ضروری ہو۔ اس سے ہم ان کے درمیان مشابہت یا اختلاف اتحاد نوعی یا تفریق جنسی دیکھتے ہیں جس سے رفتہ رفتہ ذہن بال کی کھال اُتارنے کے قابل ہو جاتا ہو۔ ہمارے خیالات اور آراپختگی، اصابت، اور معقولیت حاصل کرتے ہیں۔ اس سے ہمارا علم حقیقی اور صحیح علم بنتا ہو۔ کتابی علم مردہ ہوتا ہو۔ سائنس ہمارے اخلاق کو بھی سدھارتا ہو۔ ہم کائنات کی خوبصورتی کی قدر کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ ہم مناظرِ طبعی سے حظ حاصل کرتے ہیں۔ زمین و آسمان کی اشیا ہمارے مشاہدے کے لیے ہیں اور ہم ان سے لطف اٹھانے کے مجاز ہیں اور سب کے اخیر میں سائنس حاسۂ مذہب اور ایمان قادر علی الاطلاق کو قوی اور اعلیٰ بناتا ہو۔ ہم کائنات کے اندر ہزاروں عجائبات دیکھتے ہیں اور جب اُن کی بناوٹ اور ماہیت پر نگاہ دوڑاتے ہیں تو صانع حقیقی کی صنعت کاریوں اور اُسکی حکمت و دانش کی بجید تعریف کرتے ہیں بلکہ عقل حیران ہو جاتی ہو اور اُسکی قدرتِ لایزال اور ہستی لازوال کی بے اختیار داد دیتے ہیں۔ ہم اپنی طبعی کمزوری اور خامی سے واقف ہو کر اُس ہستی کی طرف رجوع ہوتے ہیں جو دانائی اور حکمت کی مصدر، زمین اور آسمان کی خالق و مالک ہو۔

تاروں بھری رات میں ذرا مکان کی چھت پر چڑھ کر کہکشاں اور دیگر تاروں کو دیکھو۔ اُنکی ماہیت پر غور کرو۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد سوچتے سوچتے عقل آپ سے آپ ان روشن بلوروں اور نامعلوم عالموں کے بنانیوالے کی طرف مائل ہو گی اور اپنی لاچاری اور مجبوری سے ہو کر خداوند قادرِ مطلق کے سامنے جھک جائیگی اور اُسکی ثناخوانی میں محو ہو جائے گی۔ اس وجہ سے مطالعہ سائنس روحانیت پیدا کرتا ہو حاسۂ مذہب کو بیدار کر کے اُسے استحکام بخشتا ہو۔ کیونکہ اس سے خدا کی حکمتوں اور صنعتوں کے راز ہمپر آشکارا ہوتے ہیں۔ اور اس کے ذریعہ سے ہمارا ایمان زور پکڑتا اور کفر و الحاد دُم دبا کر چلدیتا ہو۔ سائنس کے فوائد پر کتاب لکھی جا سکتی ہو مگر ہمارے مطلب کے لیے یہی کافی ہے۔ اس سے پڑھنے والوں کے دلوں میں اس کے استفادے کا علم پیدا ہوگا اور وہ بطور خود سوچنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔

جے۔ آر۔ رائے



انسانی دماغ کی ماہیت

دُنیا مین سبسے عجیب بلکہ سبسے قیمتی مادہ وہ ہو جس سے دماغ تیار ہوتا ہو۔ اگر ہم اس مادہ کو بخوبی سمجھ سکتے اور اس کے اجزا کی پہچان ہمین حاصل ہو سکتی تو انسان کی ہستی کے متعلق ہمین بہت سے راز معلوم ہو جاتے۔

(سر جیمس کرکٹن براؤن)

وہ سفید مادہ جسکو عرفِ عام مین دماغ کے نام سے پکارا جاتا ہو، ساخت کے لحاظ سے مختلف حیوانات ہی مین مختلف نہین ہوتا بلکہ ایک ہی انسانی دماغ کے مختلف حصو نمین ایک دوسرے سے اختلاف رکھتا ہو جن عناصر سے وہ مرکب ہو اُنکی تعداد، صورت، انتظام اور تعلق کے اعتبار سے دو انسانی دماغون کا مادہ کبھی یکسان نہین ہوتا۔ نہ آج تک کبھی یکسان دیکھا گیا، اور نہ آیندہ دیکھا جا سکتا ہو کیونکہ اسکا تعلق ہی انفرادی شخصیت سے ہو لیکن کیمیائی ترکیب کی رو سے دیکھو تو دماغی مادہ قریب قریب ہر حالت مین یکسان ہی پایا جاتا ہو۔ ایک امتحانی نلی مین کسی بیوقوف اور دوسری مین کسی فیلسوف کے دماغی ٹکڑے کو رکھکر ان کا تجزیہ او ران تجربات کا مقابلہ کرو تو دونون مین ذرّہ برابر فرق نہ معلوم کر سکوگے۔ باوجود اس کے یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہو کہ دونون صورتون مین کیمیائی اختلافات ضرور موجود ہوتے ہین۔ قصور اگر ہو تو صرف ہماری نظر یا سمجھ کا ہو۔

دماغ کی خاص خاص مریضانہ حالتون مین عصبی ریشون اور اِس رقیق مادہ کے اندر جو دماغ اور ریڑھ سے تعلق رکھنے والی ہڈی اور گنبد کو چکنا کئے رکھتا ہو کیمیائی تبدیلیان دیکھی گئی ہین اور یہ قرین قیاس ہو کہ دماغی مرکبات اور اجزا مین فرق واقع ہونے سے انسان کے مزاج اور اس کے عادات مین بھی فرق آجاتا ہو۔

وہ تمام عجیب وغریب باتین اور حیرت خیز عقلی ونقلی دلائل جو انسان کو سوجھتے ہین درحقیقت اِس دماغی مادہ کی مضبوطی اور عمدگی سے تعلق رکھتے ہین۔ یہی وجہ ہو کہ ہر حالت مین دماغ کی مناسب غذائیت کو نہایت اہم معاملہ سمجھا جاتا ہو۔ اگر تم دماغ سے کام لینا چاہتے ہو تو ضروری ہو کہ اسے مناسب غذا بہم پہنچاؤ۔ لیکن سوال یہ ہو کہ وہ کونسی غذا ہو جو دماغی تقویت کے لیے بہترین سمجھی جاسکتی ہو۔ یہ ایک نہایت دلچسپ سوال ہو اور ہم چاہتے ہین کہ ان سطور مین اس پر کسیقدر تفصیل کے ساتھ بحث کیجائے۔

حکما متفق ہین کہ جسم کے باقی حصون کیطرح دماغ کو بھی باقاعدہ غذا ملتی رہنی چاہیئے جس حالت مین انسان کے خون کا دوران باقاعدگی سے ہوتا ہو تو جسم دماغ کے روبرو متعدد اغذیہ پیش کرتا ہو۔ انمین سے جو چیزین اس کے مطلب کی ہوتی ہین دماغ انھین منتخب کرلیتا ہو۔ لیکن بدقسمتی سے خون اور اسکا دوران ہمیشہ باقاعدہ نہین ہوتا بعض اوقات خون کمزور ہوتا ہو۔ اس صورت مین دماغ کو اسکی پوری غذا حاصل نہین ہوتی اور اسکی طاقت کم ہونے لگتی ہو بعض اوقات خون غلیظ ہوجاتا ہو اس وقت دماغ کو ضرورت سے زیادہ چیزین ملتی ہین اور وہ بھی اسکے لیے خرابی کا باعث ثابت ہوتی ہین۔ ان دونون حالتون کے علاوہ بعض صورتون مین خون کے ساتھ خراب اجزا دماغ تک پہنچ جاتے ہین جن سے اسکے اندر زہریلا مادہ پیدا ہوجاتا ہو۔

سچ پوچھو تو کوئی چیز خصوصیت کے ساتھ ایسی نہین جسے دماغی غذا قرار دیا جاسکے۔ لیکن خوراک کے بعض اجزا اس قسم کے ہین جو دماغ کی غذائیت کے لیے ضروری تصور کیئے جاتے ہین۔ اور ان مین سے جس کو سب سے بڑا رتبہ دیا گیا ہو وہ فاسفورس ہو۔ بکنر کا قول ہو کہ "فاسفورس کے بغیر انسان مین سوچنے کی طاقت نہین آسکتی"۔ لیکن یہ بیان ایک قسم کے مبالغہ پر مبنی ہو جسکی بنا اس اصول کو قرار دیا جاسکتا ہو کہ ایک خاص فاسفورس دار چربی دماغی اجزا کی ساخت مین موجود پائی جاتی ہو۔ مبالغہ اس لیے ہو کہ اگر ہم کہین "نمک یا لوہے کے بغیر انسان مین سوچنے کی طاقت نہین ہوتی" تو وہ بھی کچھ کم درست نہین ہو۔

جب سے (۱۶۶۹ء) فاسفورس دریافت ہوا ہو اسے دماغی تکمیل کے لیے جزو لازم سمجھا جاتا رہا ہو۔ گو یہ خیال سائنٹفک تحقیقات پر اسقدر مبنی نہین جتنا بعض لوگون کا خیال ہو۔ باوجود اس کے جدید تجربات اور دریافتون نے اِس امر کی تصدیق کی ہو کہ اس سے دماغی ترقی عمل مین آتی ہو جن حالتون مین دماغی ترقی زیادہ تیز دیکھی گئی اسکی وجہ فاسفورس کا مقدار کثیر مین موجود ہونا ہی پایا گیا ہو۔ یہ بھی معلوم ہوا ہو کہ جس وقت دماغ اور ہڈیان بالیدگی کے عمل مین ہون تو انھین فاسفورس کی کافی مقدار درکار ہوتی ہو۔

اِن باتون کو مدنظر رکھتے ہوئے ضروری معلوم ہوتا ہو کہ بچون اور کمزور دماغ والون کو فاسفورس کا معقول جزو بذریعہ خوراک بہم پہنچایا جائے اور ہرچند کہ غذا مین فاسفورس کی مقدار کم ہوجانے سے کوئی بدیہی مریضانہ علامات نمودار نہین ہوتین تاہم ہمارا اس نتیجے پر پہنچنا کچھ بے جا نہوگا کہ جس طرح غذا مین چونے کا جزو کم ہونے سے جسم کی ہڈیان نرم ہوجاتی ہین اسیطرح فاسفورس کی مقدار کا کم ہونا دماغ کو سُست کرتا اور اسکی بالیدگی مین مانع آتا

لیکن باوجود اسکے کہ فاسفورس دماغی ترقی اور برقراری صحت کیلیے اسقدر ضروری سمجھا جاتا ہی اس کا استعمال فاسفیٹ کی قسم کے مرکبات کی صورت مین چندان ضروری نہین کیونکہ ضرورت کے اعتبار سے اسکی کافی مقدار معمولی ملے جلے کھانے مین پائی جاتی ہی فی الحقیقت یہ بات ثابت ہو چکی ہی کہ آخر الذکر صورت مین استعمال کیا ہوا فاسفورس اول الذکر صورت کی نسبت زیادہ مفید ثابت ہوا ہی اس لیے مناسب ہی کہ جسم کو جس قسم کا فاسفورس مہیا کیا جائے وہ اُن گولیان یا مٹی ملے ہوے فاسفیٹ کی صورت مین نہ ہو بلکہ معمولی کھانون ہی کی صورت مین دیا جائے۔

مختلف کھانون مین فاسفورس کی مقدار کا تناسب مختلف ہوتا ہی اور اسلیئے ضروری ہی کہ نوجوانون کے لیے جو کھانے منتخب کیئے جائین وہ ایسے ہون کہ انمین فاسفورس کی مقدار نسبتاً زیادہ ہو۔

اگر سبزی خورون کے عقیدے کے مطابق چند بچون کی پرورش صرف بقولات پر کیجائے تو کچھ عرصہ گذرنے پر ان کا دماغ یقیناً کمزور پایا جائیگا۔ اگر کسی بچے کو محض گاجرین اور شلغم کھلا کر بالغ کیا جائے جن مین علی الترتیب ۰۳۶، ۱. اور ۰۵۰. ۱. فیصدی فاسفورک ایسڈ ہوتا ہی تو اول تو انکا بالغ ہونا ہی مشکل ہی اور اگر ہون بھی تو دماغی اعتبار سے اس بچے کے مقابلے مین بہت کمزور رہون گے جس کی پرورش انڈون اور بھیڑ کے گوشت پر کیگئی ہو جن مین علی الترتیب ۳۳۶، ۱. اور ۴۲۵ ، ۰. فیصدی فاسفورک ایسڈ پایا جاتا ہی۔

تمام معمولی کھانون مین پنیر کے اندر فاسفورس کی مقدار سب سے زیادہ پائی گئی ہی۔ اسکے اندر فاسفورس پنٹ اکسائڈ (فاسفورس ایک حصہ اور آکسیجن ۵ حصہ) کی مقدار ۱۰۱ ، ۱ فیصدی پائی جاتی ہی۔ بجائیکہ معمولی سبزیون مین صرف ۱۸ ۱۰ ، ہوتی ہی چونکہ پنیر مین فاسفورس کے علاوہ وہ تمام اجزا جو اعصاب و عضلات کو تیار کرنے مین مدد دیتے ہین بہت بڑی مقدار مین موجود ہوتے ہین یہان تک کہ ایک پونڈ بہترین پنیر مین اسقدر روغنیت اور مادۂ کیسین پایا جاتا ہی جتنا کہ ایک گیلن دودھ مین ہوتا ہی اسلیئے نوجوانون کے لیے یہ بہترین غذا خیال کی جاتی ہی۔ اس مین اگر کوئی نقص ہی تو صرف یہ ہی کہ کمزور معدے اسے ہضم نہین کر سکتے اور ظاہر ہی کہ نوجوان معدے بالغ معدون کے مقابلے مین کمزور ہوتے ہین۔

بعض لوگ پنیر سے طبعاً متنفر ہوتے ہین لیکن اکثر اسے اسلیئے استعمال نہین کرتے کہ وہ دیر مین ہضم ہوتا ہی اور اس دیر مین ہضم ہونیکی بڑی وجہ یہ ہی کہ لوگ اسے بخوبی چبا کر نہین کھاتے، یا پیٹ بھر کر کھانا کھانے کے بعد اسے زیادہ مقدار مین کھا لیتے ہین، یا اسوقت کھاتے ہین جبکہ وہ خشک اور سخت ہو گیا ہو۔ اگر پنیر عمدہ قسم کا ہو اور عمدہ طور پر کھایا جائے تو یہ ایسی چیز ہی کہ بھوک لگاتی، غذائیت بہم پہنچاتی، اور طبیعت کو فرحت دیتی ہی گوشت کے مقابلے مین یہ نہ صرف ارزان غذا ہی بلکہ فائدہ مین بھی بہتر ہی اور جو لوگ گوشت نہین کھاتے اُن کے لیے نعمت غیر مترقبہ سمجھی جا سکتی ہی۔

اِن صفات کو مد نظر رکھتے ہوئے اور نیز اس خیال سے بھی کہ اس مین گوشت اور دماغی مادہ پیدا کرنے والے اجزا موجود ہوتے ہین اور یہ مادہ ناکس ہے جو نقرس پیدا کرتا ہی بری ہوتا ہی امید کیجا سکتی ہی کہ زمانہ آئندہ مین بچون اور کمزور دماغ والون کی غذا مین پنیر کا جزو کافی رکھا جایا کرے گا۔

فاسفورس کے دماغی غذا تسلیم کیئے جانے کے سلسلہ مین بہت سے لوگ جنھین دماغی محنت کا کام پڑتا ہی اس خیال سے مچھلی کا استعمال بکثرت کر رہے ہین کہ اس مین اسکا جزو غالب ہوتا ہی۔

لیکن تحقیقات سے معلوم ہوا ہو کہ یہ خیال ایک بڑی حد تک غلط ہو اور اسکار واج ڈوماتامی ایک مشہور کیمیا دان کے ایک سرسری بیان پر مبنی ہو۔ جو لوگ مچھلی کے گوشت سے فاسفورس حاصل کرنا چاہتے ہین انھین اس تلاش مین یقیناً مایوسی حاصل ہوگی۔ باوجود اس کے اِن لوگون کے لیے جنھین مٹھک کا اور دماغی کام کرنا پڑتا ہو مچھلی ایک عمدہ غذا ہو۔ کم از کم اس قسم کی مچھلیان جو زیادہ موٹی نہین ہوتین اور جنکے اندر اجزائے پروٹیڈ کا تناسب کم ہوتا ہو۔ ان نوجوانون کے لیے جن کا نظام عصبی اشتعلال پذیر تھا اور بہت جلد اسمین فتور واقع ہو سکتا ہو گوشت کے بجائے مچھلی بہتر غذا تسلیم کی جاتی ہو۔

ایک زمانہ مین لوگون نے اسی فاسفورس کی تلاش مین اس خیال سے کہ یکسان چیزین ایک دوسرے کو غذائیت بہم پہنچا سکتی ہین حیوانات کا مغز بطور خوراک استعمال کرنا شروع کر دیا تھا لیکن جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہو کہ گو اس قسم کی خوراک کا خواہ کوئی اور فائدہ ہو لیکن اِس سے انسانی دماغ پر کچھ مفید اثر نہین ہو سکتا۔

بعض حیوانات کے غدود یا ان غدود کے اندر سے حاصل کیے ہوے لعاب کے استعمال سے چند صورتون مین جو تعجب خیز اثرات دیکھنے مین آئے ہین انکی وجہ سے لوگونکے دل مین اُمید پیدا ہو گئی ہو کہ اگر جانورونکا مغز یا اُن کے مغز کا جوہر حاصل کر کے اسے بطور خوراک استعمال کیا جاے تو اس سے خون کو اس قسم کی قابل تحلیل غذا حاصل ہو سکتی ہو جو دماغ کو تقویت دیتی ہو۔ جو لوگ سائنس کے مختلف شعبون مین دلچسپی لیتے ہین ان سے یہ بات پوشیدہ نہو گی کہ تجربات سے معلوم ہو چکا ہو کہ دماغی کمزوری کے ایسے مریضون کے اندر جن کی حالت حد درجہ افسوسناک تھی (یعنی جو قد کے بونے دل کے کمزور صورت مین مینڈک کے ایسے نظر آتے تھے) بھیڑون کے غدود سے ایک قسم کا مرکب تیار کر کے پہنچایا گیا تو نہ صرف ان کا قد لقدر ایک ہاتھ کے زیادہ ہو گیا بلکہ شکل و صورت بھی عمدہ نکل آئی جسکی وجہ محض یہ تھی کہ جو مادہ خود ان کے اندر موجود نہ تھا وہ دوسری جگہ سے حاصل کر کے ان کے اندر پہنچا دیا گیا۔ ایسے لوگون کی مثالین موجود ہین جو پہلے بالکل فاتر العقل تھے لیکن اس عمل سے ذہین اور سمجھدار ہو گئے۔

ان تجربات مین کامیابی حاصل ہونے کی وجہ سے بعض حیوانی غدود و اجسام پر بھی عمل کیا گیا تاکہ غذائیت کی کمی : دماغی کمزوری کے مختلف مدارج معلوم کیے جا سکین لیکن جو عرصہ دراز کی محنتون کے اِس بارے مین کوئی نمایان کامیابی حاصل نہین ہو سکی۔ اس قسم کے جوہر کا اثر بدن پر کچھ پڑتا ضرور ہو مگر دماغی امراض مین اِس سے اطمینان بخش فائدہ حاصل نہین ہو سکا۔ اِس صورت مین ممکن ہو کہ لوگ حیوانات کے مغز کو ایک لذیذ اور زود ہضم غذا سمجھکر استعمال کرتے ہین لیکن یہ ناممکن ہو کہ اِس سے انسانی دماغ کو زندار یا مضبوط بنانے مین کوئی خاص مدد مل سکے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہو دماغ کے لیے کوئی خاص غذا تجویز نہین کی جا سکتی۔ زندگی کی تمام منازل مین کفایت شعاری اور فضول خرچی دونون کے انتہائی پہلوؤن کو چھوڑ کر اگر مناسب اور عمدہ کھانا کھایا جائے تو دماغ خود بخود ان مین سے اپنے مطلب کی غذا چن لیتا ہو۔

بچپن مین جبکہ بچہ شیرخوار ہوتا ہو ماں کا دودھ ہی اسکے لیے بہترین دماغی غذا ہو۔ ماں کے دودھ مین جو تاثیر ہی وہ نہ تو انا کے دودھ مین ہو سکتی ہو نہ گائے یا بکری کے اور نہ اسکے

مقابلہ مین کوئی پیٹینٹ فوڈ یا بوتل مین دودھ پلانے کا طریقہ مفید قرار دیا جا سکتا ہو۔ بہت سی ننھی جانین محض اسی لیے ضائع ہو جاتی ہین کہ انھین وہ غذا نہین دیجاتی جسکی وہ قدرتی طور پر حقدار ہین اور اس طرح پر شیر خواری کے ایام مین نامناسب غذائین دے دے کر انکے دماغ کی بالیدگی مین رکاوٹ پیدا کی جاتی ہو۔

ایام شیر خواری کے بعد زندگی کے تمام مدارج مین غذا کو عام اصول کے مطابق باقاعدہ بنایا جا سکتا ہو۔ اس بات کی ضرورت بالکل نہین کہ دماغ کی تقویت کے لیے کوئی خاص غذا استعمال کیجائے۔ اسمین شک نہین کہ ہر عمر مین خوراک کی بہت سی غلطیون سے بچنا اور اسمین خاص ترامیم کرنا ضروری ہو لیکن ان سب کی تفصیل اس جگہ ناممکن ہو۔

ضروری ہو کہ زندگی کے ہر حصہ مین انسان کو مادہ پروٹیڈ کافی مقدار مین ملتا رہے کیونکہ یہی وہ چیز ہو جو جسمانی ریشون کو تیار کرتی ہو اور اسی کا دماغ سازی پر مفید اثر پڑتا ہو۔ جون جون انسان کی عمر زیادہ ہوتی جاے اسے لازم ہو کہ حیوانی غذا کا استعمال بھی بڑھا دے کیونکہ مادہ پروٹیڈ قابل انضمام صورت اور کثیر مقدار مین اسی چیز کے اندر موجود پایا گیا ہو۔

انسان کی زندگی مین ایک خاص وقت ایسا ہوتا ہو جب دماغ کی مناسب غذائیت کا خاص طور پر خیال رکھنا ضروری ہو یعنی اسوقت جبکہ وہ بچپن سے نکلکر جوانی مین قدم رکھنے لگا ہو۔ اس تبدیلی کے ساتھ ہی خوراک کی خواہش مین بھی ایک نمایان تبدیلی واقع ہوا کرتی ہو۔

جس وقت عقل ڈاڑھ نکلتی ہو تو اسوقت کھانون کی رغبت مین بھی فرق واقع ہوتا ہو۔ لڑکے اس زمانے مین پھلون اور مٹھائی کو زیادہ پسند نہین کرتے بلکہ حیوانی غذا اور اسی قسم کی دوسری لذیذ چیزون کے خواہشمند پائے جاتے ہین۔ بخلاف اس کے لڑکیان مٹھائی کی زیادہ خواہشمند ہو جاتی ہین۔ بعض صورتون مین اس تبدیلی کے ایام مین وہ مٹی کھریا مٹی، یا کچے چاول کھانے لگ جاتی ہین۔ ان چیزون کا استعمال سخت مضر ہے اور اس قسم کی عادات کو فی الفور ترک کر دینا لازم ہو۔ غرضکہ اس تبدیلی کے ایام مین اور اس کے بعد ایک عرصہ تک اس بات کا احتمال ہوتا ہو کہ انسان خراب یا کم غذا کھانے لگے اور اسے قلت خون کا مرض لاحق ہو جائے، اس لیے ضروری ہو کہ سن بلوغ کی نسبت ان دنون مین غذا نہ صرف زیادہ بلکہ مقوی بھی ہو۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو عصبی کمزوری اور بےچینی پیدا ہو جائے گی۔ جس کے بعد ممکن ہو کہ مسکرات کے استعمال کی خواہش پیدا ہو جائے۔ درحقیقت یہی وہ زمانہ ہو جبکہ شراب پینے کی تباہ کن عادت اختیار کر لی جاتی ہو۔ پس لازم ہو کہ غذا کی طرف پوری توجہ دیکر الکحل کو اسکی تمام صورتون مین دور رکھا جائے۔ سر جیمز کرچٹن براؤن کا خیال ہو کہ "بعض لوگ جو مذہبی خیال سے یا کسی اور وجہ سے خاص خاص کھانون بالخصوص گوشت کا استعمال ترک کر دیتے ہین یہ بہت برا ہو جہان تک ہو سکے لوگون کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

ایک چیز البتہ ایسی ہو جو دماغ کے لیے خاص طور پر مفید سمجھی جا سکتی ہو اور جس کا بچپن اور اس کے بعد شباب سے بیشتر کے زمانے مین استعمال واجب ہو وہ چیز جو کی یا جئی کا آٹا (Oat-Meal) ہے۔ درحقیقت یہ تمام کھانون مین سب سے زیادہ غذائیت بخش چیز ہو اور اسمین چربی فاسفورس اور دیگر مقویات کے اجزا بافراط پائے جاتے ہین۔

اسمین کچھ شک نہین کہ سفید گیہون ہم ہندوستانیون

کی عام غذا ہی اور اسمین قابل تحلیل پروٹینڈ کی بہت سی مقدار پائی جاتی ہی کیونکہ مین غذائیت اور چربی پیدا کرنیوالے مادے بہت پائے جاتے ہین، چاول بسبب زیادہ نشاستہ رکھنے کے بعض اقوام مثلاً کشمیریون یا بنگالیو نمین زیادہ استعمال ہوتے ہین، اور جو مین معدنی مادے زیادہ پائے جاتے ہین، تاہم ان سب باتون کو زیر نظر رکھتے ہوئے یہی تسلیم کرنا پڑتا ہی کہ جئی مین جو صفات موجود ہین وہ انمین سے کسی چیز مین بھی نہین پائی جاتین۔

اگر تم کسی شخص سے اسکا ذکر کرو تو وہ یہی کہے گا کہ جئی تو گھوڑون کی خوراک ہی۔ یورپ مین بھی سولے باشندگان اسکاٹ لینڈ کے بہت کم اقوام اسے استعمال کرتی ہین۔ حال مین ایک فرانسیسی نے لکھا تھا کہ "جئی کی روٹی موٹی اور کھُردری ہوتی ہی اور اسے صرف غریب ملکو نمین کھایا جاتا ہی" لیکن کچھ عرصے سے اسکا رواج انگلستان مین زیادہ ہونے لگا ہی۔ بدقسمتی سے وہان بھی مزدور پیشہ جماعتین اسے اب کم استعمال کرتی ہین۔ نتیجہ یہ ہی کہ اس طبقہ کے لوگ اب ویسی مضبوط کاٹھی اور جسمانی تحریک نہین رکھتے جیسی ان کے پیشروؤن مین پائی جاتی تھی۔

جب سے جدید تہذیب نے ترقی حاصل کرنی شروع کی ہی لوگ ان سادہ کھانو نکو چھوڑ کر چاء، بسکٹ، وغیرہ استعمال کرنے لگ گئے ہین۔ ایک مشہور اہل الرائے کا قول ہی کہ "جئی کا آٹا دودھ مین ملاکر استعمال کیا جائے تو لاکھ چائین اور قہوے اس پر سے قربان کر دیے جا سکتے ہین کیونکہ یہ مرد، عورت، بچہ، سب کے لیے بہترین غذا ہی"۔

حال کی بعض علمی تحقیقات سے اس بارے مین مزید روشنی حاصل ہوئی ہی کہ جئی کے آٹے کا اثر جسم پر کیا پڑتا ہی۔ تجربے سے ثابت ہوا ہی کہ ۸ ہفتہ تک جن چوہون کی پرورش جئی کے آٹے اور پانی پر کی گئی انمین وہ غدود جسے اصطلاح مین (Thyroid Gland) کہتے ہین ان چوہون کے غدود کی نسبت جن کو دودھ اور روٹی کھلائی گئی تھی دوگنے تھے۔ جیسا کہ قبل ازین بیان کیا جا چکا ہی اس غدود کا لعاب جسم کے ہر حصہ مین غذائیت کا اثر پیدا کرتا ہی شاید یہی وجہ ہی کہ شمالی انگلستان کے باشندے بچپن مین جئی کے استعمال کے باعث مضبوط اور تنومند ہوتے ہین۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہی کہ جئی کا آٹا اس غدود پر اثر ڈالکر دماغ سازی کے عمل مین بہت مدد دیتا ہی۔ پھر رام

العصر

سائنٹفک اعداد اور اکائیان

از شیخ فیروز الدین مراد صاحب بی اے، ایم ایس سی، پروفیسر علوم طبیعات ایم اے او کالج، علی گڈھ

(۱)

تمہید انسانی علم کی وسعت و ترقی کے لوازمات مین سے ایک ضروری شرط مختلف چیزون کی مقدار کی صحیح پیمائش ہی جب تک کسی چیز یا مقدار کے متعلق ہمین کامل طور پر اسکی "کمی" کا علم نہو، ہمارا علم اس چیز یا مقدار کے متعلق ناقص اور ادھورا ہوتا ہی لیکن کسی چیز یا مقدار کے اندازہ یا پیمائش کے لیے ضروری ہی کہ ہمارے ذہن مین اندازہ یا پیمائش کرنے کے لیے اکائی کا مفہوم واضح ہو۔

پیمائش کی تشریح ہر چیز کے تعینِ مقدار کے لیے دو امور کا ذکر ضروری ہوتا ہی ان کے بغیر تعین مقدار ناممکن ہے۔ ان دو اجزا مین ایک تو اسی قسم کی ایک خاص مقدار کا نام ہوتا ہی کہ جس قسم کی مقدار کا تعین مقصود ہوتا ہی اس خاص مقدار کو حوالہ دینے کے لیے اصل مانا جاتا ہی۔ دوسرا جز اس بات کا اظہار ہوتا ہی کہ وہ خاص مقدار کتنی دفعہ ملکر اس پیش کردہ مقدار کے برابر ہوتی ہی۔ پہلے جز کا اصطلاحی نام "اکائی" ہی اور دوسرے جز کو اُس مقدار کی پیمائشی قیمت کہتے ہین۔

اندازہ صفتی اور اندازہ پیمائشی سائنس کی ترقی کے دو مدارج ہین پہلے حصہ مین جو وقت کے لحاظ سے انسانی تاریخ مین پہلے آتا ہی ہم صرف مظاہر قدرت کے مطالعہ مین یا دیگر مشاہدات مین صرف اس منظر یا مشاہدہ کی نوعیت کی تعیین کافی سمجھتے ہین۔ دوسرے حصہ مین نہ صرف نوعیت کے سطحی اور ادھورے مطالعہ پر اکتفا کیا جاتا ہی بلکہ مقدار کی صحیح پیمائش کی جاتی ہی۔ پہلے درجہ کو "اندازہ صفتی" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہی اور دوسرے ترقی یافتہ حصہ کا نام "اندازہ پیمائشی" ہی۔

تمثیلات ان تمہیدی کلیات کی تفہیم کے لیے عملی مثالون اور روز مرہ کی زندگی کے واقعات سے بہت مدد ملتی ہی۔

تعمیرات کی خیال ایک کسن بچے یا فاتر العقل شخص کے ذہن مین تعمیر کے اخراجات کا کوئی صحیح اندازہ نہین ہوتا۔ اس حالت مین یہ کہا جائے گا کہ بچہ کی

عقل کا درجہ سن شعور سے سن تمیز تک نہیں پہنچا۔ لیکن جب بچہ کی سمجھ میں یہ بات آجاتی ہو کہ ایک ہی قسم کے دو مکانات بنانے میں ایک مکان کی تعمیر پر دوگنا خرچ ہوتا ہو۔ تو اس کا علم اندازۂ صفتی کے درجہ تک پہنچ جاتا ہو۔ اس سے آگے جب بڑے ہو کر اسی بچہ کو خود مکان بنوانا پڑتا ہو تو اسے مکان کی تعمیر کی اصلی لاگت کے صحیح اعداد و شمار میں اندازۂ پیمائشی حاصل ہوتا ہو۔

علم ہیئت کی مثال | علی ہذا القیاس قدیم ہیئت دان سیارگان نظام شمسی کے متعلق یہ امر دریافت کر چکے تھے کہ سورج سے زہرہ اور عطارد کا فاصلہ زمین کے بُعد سے کم ہے اور مشتری مریخ زحل وغیرہ کا بُعد زمین سے زیادہ ہے۔ لیکن انھوں نے اعداد و شمار میں تفاوتِ بُعد کا اندازہ نہیں کیا تھا۔ زمانۂ حال میں علم ہیئت کی ترقی کے ساتھ یہ دوسرا مرحلہ بھی طے ہو چکا ہو۔

حرارت کی مثال | یہ امر عام طور پر معلوم ہو کہ حرارت کی کمی یا بیشی سے مختلف اجسام سکڑتے یا پھیلتے ہیں۔ اس سے زیادہ بعض یہ بھی جانتے ہیں کہ مختلف اجسام کم و بیش سکڑتے اور پھیلتے ہیں لیکن صرف سائنس دان یہ ضروری علم رکھتے ہیں کہ ایک درجہ حرارت کی کمی بیشی سے اجسام کے طول، قطر یا حجم میں کس قدر فرق واقع ہوتا ہو۔

برقی رَو کی مثال | اگر ایک زبردست برقی رَو انسانی جسم میں سے گذرے تو اس بات کا عام طور پر عوام الناس کو بھی علم حاصل ہو کہ انسان مرجاتا ہو یا کم از کم اس کو صدمہ پہنچتا ہو۔ لیکن ایک برقی انجنیر صحیح طور پر جانتا ہو کہ برقی رَو کی طاقت کا مقابلہ کس حد تک کیا جانا ممکن ہو اور کن ذرائع سے؟

اگر آپ تھوڑی دیر بھی غور کریں گے تو آپ کو خود اسی قسم کی بہت سی مثالیں ملیں گی جن سے یہ امر صاف طور پر عیاں ہو جاتا ہو کہ کسی چیز[1] یا مقدار[2] کے متعلق صحیح علم حاصل کرنے کے لیے ہمیں نہ صرف اندازۂ صفتی بلکہ اندازۂ پیمائشی کی بھی اطلاع ہونی چاہیے" اور یہ سب تمثیلات اس امر کی شاہد ہیں کہ علم انسانی کی انتہائی منزل اندازۂ پیمائشی پر مختتم ہوتی ہو۔ ہم اس سادہ مسئلہ کی مزید تشریح کو بخیال طوالت تصور کرکے نظر انداز کرتے ہیں۔

اکائی کا مفہوم | شروع مضمون میں ہم نے کہا تھا کہ پیمائش کے لیے اکائی کی ضرورت ہوتی ہو۔ آپ بزاز سے کپڑا خریدنے جاتے ہیں بزاز تین روپیہ فی گز نرخ بتاتا ہو۔ گویا کپڑے کی پیمائش کی اکائی گز ہو اور کپڑے کی قیمت کی اکائی روپیہ ہو۔ عام طور پر کپڑا صرف طول سے ناپا جاتا ہو، عرض کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ اس لیے آپ کہیں گے کہ گز طول کی اکائی ہو۔ فرشی کپڑا مثلاً دری جا جم مربع گز کے حساب سے بکتا ہو جسے دوکاندار یوں بتاتے ہیں ایک گز اس طرف سے اور ایک گز اس طرف سے یہاں کپڑے کے طول کا خیال اس کے رقبہ سے کم کیا جاتا ہو۔ شیشم کی لکڑی کے تختے بھی بکتے ہیں لیکن زیادہ مقدار کے خریدار تختوں کے بجائے شہتیر اور شہتیریاں خریدتے ہیں اور نرخ فی مکعب فٹ کہا جاتا ہو یعنی لکڑی کا ٹکڑا جس کا طول عرض اور موٹائی سب ایک ایک فٹ ہوں (اصطلاح میں اسے ایک مکعب کہتے ہیں) حجم کی اکائی ہو۔ علی ہذا القیاس ہماری زندگی میں بے شمار مثالیں آپ کے پیش نظر ہوں گی جن سے پیمائش کے اصول واضح کیے جا سکتے ہیں۔

تین اصلی اکائیاں | امثلہ بالا سے علاوہ اور ضروری نتائج کے ایک اہم نتیجہ

---

[1] چیز اور مقدار کی تشریح۔ چیز سے مراد تمام خارجی ہستیاں ہیں جو عرف عام میں تمام بالذات تسلیم کی جاتی ہیں یعنی جن کا وجود یا عدم وجود حواس خمسہ کی شہادت، کیفیات نفسی یا قوائے عقلیہ پر منحصر نہیں ہو۔ مثلاً مادہ اور تمام مادی اجسام اشیا ہیں۔ علی ہذا القیاس حرکت اور رنگ مختلف مقامات ہر چیز کی تعریف میں شامل ہیں۔ یہ ایک بحث طلب مسئلہ ہو۔ ہم ایک علاحدہ مضمون "مادہ کی اصلیت" میں اس کے متعلق مختلف آرا اور مذاہب پر روشنی ڈالیں گے۔

[2] مقدار کو دراصل کسی چیز کی مقدار کا اختصار سمجھنا چاہیے لیکن سہولت کے لیے علمی دنیا میں اسی لفظ (واحد مقدار) کو چیز کا مرادف قرار دیا جاتا ہو اور یہ صیغۂ واحد کی طرح جمع "مقادیر" بالعموم مختلف چیزوں کی مقدار کے لیے استعمال کرنا جائز سمجھا جاتا ہو۔ مزید تشریح متن سے ہو جائے گی۔

نکلتا ہے کہ مختلف چیزوں کی پیائش یعنی ان کی مقدار کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے چند ایک "اعداد اساسی" کی ضرورت ہے۔ سائنس دانانِ عالم کے اتفاق رائے سے تین مستقل یا اساسی چیزیں چن لی گئی ہیں اور اگر آپ غور کریں گے تو یہ امر واضح ہو جائے گا کہ تمام چیزوں کا تعیین صرف تین چیزوں کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ یہ تین اساسی چیزیں مفصلۂ ذیل ہیں:-

(۱) طول (۲) مقدار مادہ جسے انگریزی میں ماس کہتے ہیں اور (۳) وقت۔

تین اشیاء اساسی | گویا کہ وقت مادہ اور فضا اساسی مقداریں ہیں اور باقی تمام مقداریں ان کی وساطت سے پیائش کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً کپڑے کی خرید میں صرف دو چیزوں کی ضرورت ہے طول اور مقدار مادہ کی اتنی چاندی یا سونے کے تبادلے سے اتنا کپڑا خریدا جا سکتا ہے۔ رقبہ کی پیائش کے لیے صرف طول کی ضرورت ہے حجم کے لیے بھی علیٰ ہذا القیاس صرف ایک قسم کی پیائش کی ضرورت ہے۔ رفتار کے لیے وقت اور فضا کی پیائش درکار ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ ریل گاڑی ایک گھنٹہ میں تیس میل چلتی ہے جسے تیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے تعبیر کیا جاتا ہے اسی طرح جیسا کہ بقیہ مضمون میں دکھایا جائے گا دنیا میں علمی کام چلانے کے لیے تین چیزوں کی پیائش کی حقیقی طور پر ضرورت ہے ان تین چیزوں کو ہم آئندہ "اشیاء اساسی" کے نام سے یاد کریں گے۔ لہذا اشیاء اساسی یہ تین چیزیں ہیں۔ (۱) طول یعنی مقدار فضا (۲) ماس یعنی مقدار مادہ (۳) وقت یعنی مقدار دقیقہ شعوری۔

اکائی کی تعریف | پیائش کا طریقہ اس قدر آسان ہے کہ ہمیں تشریح کرنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی کسی چیز کی ایک خاص مقدار کو ایک مستقل حیثیت دی جاتی ہے اور بعد ازاں اس چیز کی پیائش اسی خاص اندازے سے کی جاتی ہے اس خاص مقدار کو اس چیز کی "اکائی" کہتے ہیں بالفاظ دیگر کسی چیز کی اکائی اس چیز کی ایک خاص مستقل مقدار کا نام ہے جس کی وساطت سے بعد ازاں اس چیز کی مختلف مقداروں کا تعیین کیا جاتا ہے۔ یا اسے یوں خیال فرمائیے کہ کسی چیز کی مقدار کا اندازہ وہ ہندسی تناسب ہے جو اس چیز کی مجموعی مقدار اور اکائی کے درمیان پایا جائے۔

پیائش کا مفہوم | مثلاً آپ ایک سڑک کی لمبائی ناپنا چاہتے ہیں۔ لوہے کی ایک زنجیر لیتے ہیں اور اسے سڑک کے اوپر پھیلا کر دیکھتے ہیں کہ کتنی دفعہ وہ زنجیر سڑک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلائی جا سکتی ہے اور پھر کہتے ہیں کہ فلاں سڑک سو جریب لمبی ہے۔ زنجیر کی لمبائی کو لفظاً جریب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک کپڑے کا ٹکڑا لوہے کے ایک ٹکڑے یا فیتہ سے ناپا جاتا ہے۔ اگر لوہے کے ٹکڑے یا فیتہ کی لمبائی آپ کی اکائی ہے جس کا نام گز ہے تو آپ کہتے ہیں کہ کپڑا چھ گز یا نصف گز لمبا ہے جیسی بھی حالت ہو۔

ہندسی قیمت | یہ امر صاف ظاہر ہے کہ اکائی کی تبدیلی سے مجموعی مقدار کی ہندسی قیمت بدلتی ہے مثلاً کپڑے کا ایک ہی ٹکڑا آٹھ گرہ ڈیڑھ فٹ یا اٹھارہ انچ لمبا ہوتا ہے لیکن چونکہ ان سب کا مطلب ایک ہی ٹکڑے کی لمبائی کا تعیین ہے اس لیے ظاہر ہے کہ باوجود اختلافات کے یہ سب اندازے بالکل ایک دوسرے کے برابر ہیں گو اٹھارہ آٹھ سے اور آٹھ ڈیڑھ سے بہت مختلف ہے[1] حاصل یہ کہ کسی مقدار کے تعیین کے لیے کم از کم دو چیزوں کی ضرورت ہے اولاً اکائی اور دوم

اکائی اور انسانی آراء [1] اکائی کا اختلاف ایک لطیف پیرایہ میں یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ ایک ہی ترغیبِ اشتعال کے نزدیک مختلف اہمیت رکھتا ہے بلحاظ یہ ہوتی ہے کہ اہمیت کی اکائی میں فرق ہوتا ہے ایک بازاری آدمی کے نزدیک جو مقدار ذرا سی دل لگی کی ہو کمادی ہوتا ہے عزت کی اہمیت بہ نسبت ایک شریف آدمی کے بہت کم ہوتی ہے شریف کے نزدیک ایک سخت سست لفظ ایک بڑی بات ہوتی ہے مگر رذیل کے لیے معمولی اور خفیف بات ہوتی ہے۔ فجر کی نماز خواب غفلت کے متوالوں پر گراں گذرتی ہے لیکن ایک خدا ترس فرض شناس کیلئے باعث لذت و خوشی کی ہے حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں ہر انسان ہر ایک معاملہ کو اپنے گز سے ناپتا ہے اور بعض کا گز بڑا ہوتا ہے بعض کا چھوٹا۔ اگر کپڑے کے ناپنے والے گز کی طرح سب کا نقطۂ نگاہ ایک ہو تو آراء کا اختلاف کم از کم معاملات ضروریہ میں بہت کم ہو۔ اللہ تعالیٰ کے کلام پاک میں آیا ہے۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ اس کی صحیح تفسیر مشقت اور ریاضت کے وہ مختلف مدارج ہیں جو انسان ایک بڑی حد تک خود وضع کرتا ہے۔ چھوٹی اکائی رکھنے سے چھوٹی چیز بھی بڑی معلوم ہوتی ہیں اور بڑی اکائی رکھنے سے بڑی چیز بھی چھوٹی معلوم ہوتی ہے۔

تناسب ہندسی اگر دنیا کے کاروبار مین ابسا اوقات اکائی محذوف لکھی جاتی ہو بدین خیال کہ متکلم اور سننے والا دونون کے ذہن مین ایک ہی خاص اکائی ہوتی ہو اور بطور اختصار صرف تناسب ہندسی کے ذکر پر کفایت کیجاتی ہو۔

(۶)

ایک مشترک پیمانہ کی ضرورت اور احاد اساسی

علمی کام کے لیے ازبس ضروری ہو کہ تمام کام کرنے والے کے نتائج مین یکسانیت ہو۔ یہ غرض اس وقت تک حاصل ہونی ناممکن ہو جب تک کہ ایک مشترک پیمانہ احاد اساسی کے متعلق قرار نہ دیا جاے۔ اگر آپ کی اصلی اکائیان یعنی وقت، وزن اور طول کی اکائیان ایسی ہین جو دوسرے سائنس دانون کے نزدیک مسلمہ ہین تو آپ کے نتائج انکے نتائج سے براہ راست منطبق ہو جائینگے ورنہ باہمی تطبیق کے لیے دونون کی اکائیون کا تناسب معلوم ہونا چاہیے۔ مثلاً آپ دریافت کرتے ہین کہ ایک گز لمبی لوہے کی سلاخ ایک درجہ حرارت سنٹی گریڈ کے اختلاف سے گرہ کا اتنا حصہ بڑھتی یا گھٹتی ہو اور ایک دوسرا آدمی اسی تجربہ کے نتائج ان الفاظ مین دیتا ہو کہ ایک فٹ لمبی لوہے کی سلاخ ایک درجہ حرارت فارن ہائیٹ (ہم ان ہر دو نظامون کی تشریح درجہ حرارت کی پیمائش کے بیان مین کرینگے) کے اختلاف سے انچ کا اتنا حصہ بڑھتی گھٹتی ہو۔ اب اگرچہ دونون کے نتائج بالکل صحیح ہونگے لیکن بظاہر فرق معلوم ہوگا اس آسان حالت مین تطبیق آسانی کے ساتھ مستعمل اکائیون کے باہمی تناسب ہندسی جاننے سے ہو سکتی ہو۔ لیکن مشکل دراصل یہ ہوتی ہو کہ زیادہ پیچیدہ اور اَدَق مسائل مین اس سطحی اختلاف سے بہت گڑبڑ لاحق ہوتی ہو بالخصوص اس وقت جب کہ کثرت استعمال کے سبب جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہو اکائیان صحیح طور پر بیان نہین کی جاتین۔ مثال بالا مین اگر طول کے پیمانے سب یکسان ہون کہ ہر دو بیانات مین صرف ایک درجہ حرارت مذکور ہوا ور یعنی گریڈ و فارن ہائیٹ نہ لکھا جاے تو آخری نتیجہ پہلی حالت مین بہ نسبت دوسرے نتیجہ کے ۹/۵ گنا بڑا ہوگا۔

جس اشکال کا نہایت واضح بیان ہم نے کیا ہو احاد تبعی کی حالت مین نہایت اہم ہو جاتی ہو۔

احاد تبعی احاد تبعی سے مراد اُن مقدارون کی اکائیان ہین جو تین اساسی مقدارون کے اوپر مبنی ہوتی ہین۔ مثلاً رفتار کی مقدار کے لیے کوئی خاص اکائی مقرر نہین ہو۔ اس کائی کا انحصار وقت اور طول کی اکائی پر ہوگا اور ایک ہی رفتار کا ہندسی اندازہ مختلف ہو سکتا ہو۔ اگر احاد اساسی کا تعین ٹھیک طور پر نہ کیا جاے۔ رفتار کی اکائی میل فی گھنٹہ، منزل فی یوم، میل فی منٹ، میل فی ثانیہ، فٹ فی ثانیہ، سنٹی میٹر فی ثانیہ وغیرہ وغیرہ کئی مختلف طریقون سے ظاہر کی جا سکتی ہو۔ لیکن اگر احاد اساسی مقرر ہون تو پھر رفتار کی اکائی صرف ایک ہی ہو سکے گی۔ علم البرق اور مقناطیس کی اکائیون مین شروع شروع مین احاد اساسی کے تعین نہ ہونے سے بہت ہی زیادہ گڑبڑ تھی اور کئی نظام مروج تھے۔ سادگی کا تقاضا یہی ہو کہ یگانگت پیدا ہو جاے۔ آپ ملک کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ مین چلے جائین یا ایک مہذب ملک سے دوسرے ملک مین چلے جائین بے فائدہ طور پر احاد کے اختلاف سے ضروری مقدارون کے اندازہ مین وقت ضائع نہ ہو یعنیہ جس طرح تمام ملک مین ایک ملکی یا عالمگیر زبان اُردو یا اسپرانٹو وغیرہ کی ضرورت اسی طرح یہ بھی ضروری ہو کہ مختلف حصص ملک اور اس سے بڑھ کر مختلف تہذیب یافتہ ممالک علمی حیثیت سے ایک مشترک نظام احاد کے سلسلہ مین منسلک ہو جائین تا کہ ایک جگہ کا سائنٹفک یا تجارتی کام دوسری جگہ کے سائنٹفک یا تجارتی کام سے خواہ مخواہ نہ بگڑ جاے۔

صرف ہندوستان مین یہ کمی باقی ہو باقی تمام مہذب ممالک نے کم و بیش اس یکسانیت کو محسوس کر لیا ہو اور موجودہ تہذیب کے کرشمون مین ایک یہ بات ہو کہ ساری دنیا کے علما و فضلا علمی کامون کے لیے اعداد و شمار اور اکائیون پر اتفاق راے کرتا ہو گویا کہ ساری پراگندگی کی بجاے اب مختلف ممالک کے سائنٹفک تحقیقات کرنے والے عالم اس طور سے کام کرتے ہین کہ گویا

ایک کے علمی نتائج یا نظری قیاسات دوسرے کی سمجھ مین آسکتے ہین البتہ اگر اُس بات کا تذکرہ بے محل نہ ہو تو ہم بتائین گے کہ یورپ مین تمام علمی کتب اور رسالجات کی تقطیع بیرونی شکل اور حجم یکسان کرنے کی تجاویز ہو رہی تھین کہ موجودہ خونریزی نے تمام کوششون کو شل کر دیا۔

فرانسیسی نظام اعداد سائنٹفک اکائیون کا نظام جو کہ تمام علمی دنیا مین مروج ہی وہ حقیقتاً انقلاب فرانسیسی کی ایک نشانی یادگار ہی اور اگرچہ علمی دنیا مین اسکا نام کچھ اور رہی لیکن بعض اوقات اسے اکائیون کا نظام فرانسیسی بھی کہتے ہین۔

سنٹی میٹر یعنی طول کی اکائی اس نظام کے مطابق طول کی اکائی کو سنٹی میٹر کہتے ہین ایک انچ مین تقریباً ۲½ سنٹی میٹر ہوتے ہین سنٹی میٹر کے معنی میٹر کا ایک سوان حصہ ہی گویا کہ ایک سو سنٹی میٹر ایک میٹر کے برابر ہوتے ہین۔

میٹر کی تعریف ایک میٹر کی لمبائی فی الاصل کرۂ زمین کے اس ربع محیط کے (جس مین پیرس واقع ہی قطب سے لیکر خط استوا تک) چھوٹی سے چھوٹی لمبائی کے ایک کروڑوین حصہ کے برابر مقصود کی گئی تھی اور کوشش اس امر کی گئی تھی کہ انسانی پیمائش مین طول کی اکائی کو مستقل طور پر زمین کی نہ بدلنے والی پیمائش سے وابستہ کر دیا جائے اور اس طرح سے میٹر کو ایک ارفع و اعلیٰ حیثیت کے ساتھ ممتاز کر دیا جائے لیکن محیط زمین کی بعد ازان کی پیمائش نے ثابت کر دیا ہی کہ فرانسیسی علماء کا یہ خیال خام ہی کیونکہ اب میٹر کی لمبائی اس کی اصلی تعریف سے ذرا مختلف ہے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ میٹر کی لمبائی کو بعد کی زیادہ صحیح پیمائش کے مطابق قرار دیا جاتا لیکن اس سے سابقہ نتائج مین ایک وسیع تبدیلی کرنی پڑتی تھی اور پھر یہ امر بھی محفوظ خاطر ہونا چاہیے کہ یہ تعریف ایک حد تک سائنٹفک تعریف نہین ہی۔ موجودہ میٹر کی تعریف یہ ہی کہ میٹر پلاٹینم کی اُس سلاخ کے اوپر (جب اُس سلاخ کا درجہ حرارت صفر ہو جاتا ہی) دو خطون کے درمیانی فاصلہ کا نام ہی جو پیرس مین بورو ڈے آرچے (BUREAU DES ARCHI ایک عمارت اور محکمہ کا نام ہی) مین محفوظ ہی۔

حرارت کا اثر میٹر کی اس تعریف مین دو باتین قابل غور ہین۔ چونکہ حرارت سے اجسام پھیلتے ہین اس لیے طول کے تعین کے لیے درجہ حرارت کی تخصیص اشد ضروری ہی۔ اگر میون مین تمام گز اصلی گز سے لمبے ہو جاتے ہین اور سردیون مین بھی چونکہ درجہ حرارت صفر سے اوپر ہی رہتا ہی تھوڑے سے لمبے ہوتے ہین لیکن یہ تبدیلی اتنی خفیف ہوتی ہی کہ تجارتی کاروبار مین اسے نظر انداز کیا جاتا ہی اور گز کی سرکاری سند مین بھی اس امر کا خیال نہین رکھا جاتا۔

مستقل پیمانون کی دو قسمین البتہ علمی کامون مین یہ خفیف تبدیلی بھی نہایت اہم ہی۔ دوم فاصلہ کے تعین کے دو طریقے ہین ایک تو یہی معمولی طریقہ جس کی بنا صحت کی نسبت سہولت پر زیادہ ہی۔ اس کے مطابق گز کی سلاخ کی لمبائی ایک سرے سے دوسرے سرے تک پوری ایک گز ہوتی ہی۔ اس طریقہ مین نقص یہ ہی کہ کثرتِ استعمال سے گھسکر لمبائی مین فرق آجاتا ہی لیکن معمولی کاروبار مین یہ فرق سالہا سال تک غیر محسوس رہتا ہی اسلیے طول کے پیمانے اس قاعدہ کے مطابق بنائے جاتے ہین۔ البتہ علمی کامون کے لیے اس نقص کا دفعیہ یون کیا جاتا ہی کہ سلاخ کے سرون کے قریب دونون طرف دو خط کھینچ دیے جاتے ہین اور ان کے مابین فاصلہ ناپا جاتا ہے۔ تاکہ یہ خطوط گھسنے سے ناقص نہ ہو جائین احتیاط یہ کی جاتی ہی کہ ان خطون کو چھوٹے چھوٹے سوراخون کے وسط مین سطح سے نیچے کندہ کیا جاتا ہے۔ اصلی میٹر اور اس کی مستند نقلون مین یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہی لیکن چونکہ عام کامون کے لیے یہ طریقہ عمل باعث تکلیف ہی اس لیے معمولی علمی کامون کے لیے ایسا نہین کیا جاتا۔

اب آپ نے سمجھ لیا کہ طول کی اکائی کس طرح محفوظ ہی اور کس طرح تمام دنیا مین ایک ہی اکائی کا رواج ہی۔ میٹر کے جتنے بھی پیمانے مروج ہین ان کا اصلی میٹر کی مستند نقلون کے ساتھ مقابلہ کر لیا جاتا ہے اور ہر ایک علمی کام مین لمبائی کا اندازہ سنٹی میٹرون مین کیا جاتا ہے۔

گرام یعنی مقدار مادہ کی اکائی علی ہذا القیاس مقدار مادہ کی اکائی کو گرام کہتے ہیں اور گرام کی تعریف پلاٹینم کے ایک ٹکڑے کے مقدار مادہ کا ہزارواں حصہ (دیکھو) ہے جس کو مستند کلوگرام (یعنی ہزار گرام) کہتے ہیں اور جو پیرس کے محکمہ اوزان پیمائش میں محفوظ ہے اور جس کا وزن ۴ درجہ حرارت سنٹی گریڈ والے ایک لٹر پانی (یعنی ہزار مکعب سنٹی میٹر پانی) کے وزن کے برابر ہے۔ علمی دنیا میں وزن کے جتنے پیمانے استعمال ہوتے ہیں وہ گرام سے مشتق ہوتے ہیں اور جس طرح میٹر کی مستند نقلیں تمام ممالک میں استعمال کی جاتی ہیں اسی طرح گرام اور کلوگرام کی مستند نقلیں مستعمل ہیں۔

پانی کے حجم پر حرارت کا اثر پانی اپنے درجۂ انجماد کے قریب بے قاعدہ طور پر اپنا حجم بدلتا ہے برف پانی سے ہلکی ہوتی ہے اور پانی پر تیرتی ہے جب برف پگھلتی ہے تو پانی کا حجم برف کے حجم سے کم ہوتا ہے پھر جب صفر درجہ حرارت سے اوپر یہ پانی گرم کیا جاتا ہے تو عام قاعدہ کے خلاف پھیلنے کی بجائے سکڑتا ہے یعنی اس کا حجم کم ہو جاتا ہے۔ حجم کی یہ کمی ۴ درجہ حرارت سنٹی گریڈ تک بڑھتی جاتی ہے اور اس کے بعد پانی عام قاعدہ کے مطابق پھیلتا ہے۔ بالفاظ دیگر پانی کی ایک خاص مقدار (مثلاً ایک سیر) کا حجم ۴ درجہ حرارت س پر کم سے کم ہوتا ہے اور چونکہ کسی چیز کی کثافت وزن کو حجم سے تقسیم کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے باقی تمام درجہ حرارت کی نسبت ۴ درجہ س پر پانی کی کثافت زیادہ سے زیادہ ہوتی ہے اس لیے اس درجہ حرارت کو پانی کے لیے مستند قرار دیا جاتا ہے ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ ایک مکعب سنٹی میٹر پانی کا وزن اس کے زیادہ سے زیادہ کثافت والے درجہ حرارت پر ایک گرام ہوتا ہے جس سے تمام حسابی اندازوں میں پانی کی کثافت ایک ہونے سے ایک عمدہ سہولت اور سادگی پیدا ہو جاتی ہے۔

ثانیہ کی تعریف تیسری اساسی اکائی کا نام سیکنڈ (ثانیہ) ہے جس کی تعریف ایک دوپہر سے دوسری دوپہر تک کے وقفہ کا ۱/۸۶۴۰۰ حصہ ہے۔ جب سورج کسی مقام پر سب سے اونچا نظر آتا ہے یا بالفاظ دیگر جب ان کی اشیاء کا سایہ چھوٹے سے چھوٹا دکھائی دیتا ہے تو اس وقت اس مقام کی دوپہر ہوتی ہے۔ ایک شبانہ روز میں ۸۶۴۰۰ ثانیے ہوتے ہیں۔

(۳)

اشیاء اساسی کے انتخاب کے پانچ شرائط اب ہم بالتفصیل یہ بتانا چاہتے ہیں کہ تین اشیاء اساسی کے انتخاب میں بالخصوص وقت، مقدار مادہ اور طول کو کیوں چنا گیا ہے اور ان کے علاوہ اور تین چیزوں کو بطور اساسی اشیاء کے کیوں نہیں تسلیم کیا گیا۔

احاد اساسی کے انتخاب میں مفصلۂ ذیل باتیں بالخصوص ملحوظ ہونی چاہئیں:—

(۱) یہ ایسی مقداریں ہونی چاہئیں کہ اسی قسم کی دیگر مقداروں کے ساتھ ان کا مقابلہ نہایت درجہ کی صحت کے ساتھ ہو سکے۔

(۲) ایسا مقابلہ ہمیشہ ممکن ہونا چاہیے۔ اس لیے اصلی پیمانوں کو دیرپا ہونا چاہیے۔ جو کہ مرورِ وقت کے ساتھ نہ تو اپنی وسعت کو بدلیں اور نہ تلف ہو جائیں۔

(۳) ایسا مقابلہ ہر جگہ ممکن ہونا چاہیے۔ اس لیے اصلی پیمانے ایسے ہوں کہ جگہ بہ جگہ لیجانے سے ان میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو۔

(۴) ایسا مقابلہ آسان اور براہ راست ہونا چاہیے۔

مقدار مادہ اور وزن کسی جسم کے مقدار مادہ اور وزن میں عام طور پر کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا کیونکہ مقدار مادہ براہ راست وزن کے متناسب ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر اگر دو چیزوں کا وزن برابر ہے تو ان میں مادہ کی مقدار بھی برابر ہے۔ ایک سیر روئی اور ایک سیر لوہا وزن اور مادہ کے لحاظ سے برابر ہیں اختلاف صرف ان کی کثافت اضافی یا وزن مخصوص (وزن اور حجم کے تناسب کو کثافت کہتے ہیں) میں ہوتا ہے۔ اس بحث کے متعلق مزید معلومات زمین کے وزن والے مضمون میں ملیں گی۔

(۵) اکائیاں اساسی ایسے ہونی چاہئیں کہ اکائیوں تبعی کی وسعت نہ بہت بڑی ہو اور نہ بہت چھوٹی اور علاوہ اسکے اکائی تبعی کی تعریف اکائی اساسی کی مدد سے بآسانی ہو سکے۔

اگر ہم سنٹی میٹر، گرام، اور ثانیہ، کی تعریفوں کو اس محک پر پرکھیں اور ساتھ ہی دیگر چیزوں کی اکائیوں کو بھی اس محک پر پرکھیں تو مقابلتاً معلوم ہوگا کہ طول، مقدار مادہ اور وقت سے بہتر اور زیادہ موزون اور کوئی چیز اساسی مقدار کہلانے کی مستحق نہیں ہیں۔

علمی نظام اکائی یا س گ ث نظام اکائی فرانسیسی نظام اکائی جس کو علمی دنیا سی جی ایس نظام اکائی کہتی ہے اردو میں "علمی نظام اکائی" کے نام سے مشہور ہونا چاہیئے۔ اس لیے کہ گو انگلستان اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اکائیوں کا ایک اور نظام مروج ہے جسے انگریزی نظام اکائی بھی کہتے ہیں لیکن عام طور پر علمی دنیا میں اب ایک ہی نظام بتا گیا ہے جس نظام کی ہم ابھی تشریح کر رہے تھے اس کو سی جی ایس نظام اکائی مختلف اکائیوں کے پہلے حرف تہجی کی مناسبت سے کیا گیا ہے اردو میں اس کا مرادف س۔ گ۔ ث نظام اکائی ہوگا یعنی اکائیوں کا وہ نظام جس میں سنٹی میٹر گرام اور ثانیہ طول، مقدار مادہ، اور وقت کی اکائیاں ہیں۔ اور گو انگریزی قاعدہ کے تتبع سے بعض اصحاب اردو زبان کے لیے "علمی نظام اکائی" کی نسبت س۔ گ۔ ث۔ نظام اکائی کو مرجح سمجھیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ تقلید قابل تحسین نہیں ہے۔ انگریزی زبان میں چونکہ ایک دوسرا نظام بھی مروج ہے اس لیے دونوں کو ایک دوسرے سے تمیز کرنے کی خاطر سی۔ جی۔ ایس۔ نام کو لیا گیا تھا ہمارے ہاں چونکہ سے کوئی نظام مروج نہیں اس لیے ہم جب ایک باقاعدہ علمی نظام اختیار کرتے ہیں تو کیوں نہ اس کا تشریحی نام اختیار کریں۔

علمی نظام اکائی کی خصوصیات علمی نظام اکائی کی ممتاز خصوصیات یہ ہیں۔

(۱) فی زمانہ یہ نظام تمام علمی دنیا میں رائج ہے۔ اور کوئی دوسرا نظام اس کی عالمگیر مقبولیت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

(۲) اس نظام کے مطابق اجسام کے اوزان مخصوصہ اور کثافت اضافی دونوں برابر ہو جاتے ہیں۔

کسی چیز کی کثافت ہم اوپر بتلا چکے ہیں کہ اس چیز کے وزن اور حجم کی حاصل تقسیم ہوتی ہے۔ یا بالفاظ دیگر ایک مکعب سنٹی میٹر چیز کا وزن اس چیز کی کثافت یا وزن مخصوص کہلاتا ہے۔

کثافت یا وزن مخصوص کی تعریف اسے اور زیادہ عمومیت کے ساتھ کہنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ کثافت وزن، حجم یا اکائی حجم کے وزن کو کہتے ہیں۔

کثافت اضافی کسی چیز کی کثافت اور پانی کی کثافت کے تناسب کو اس چیز کی کثافت اضافی کہتے ہیں۔

علمی نظام اکائی کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس کے مطابق چیزوں کی کثافت اور کثافت اضافی دونوں کا اندازہ ایک ہی ہندسے سے ہو جاتا ہے اس لیے کہ اس نظام کے مطابق چار درجہ حرارت میں چونکہ ایک مکعب سنٹی میٹر پانی کا وزن ایک گرام ہوتا ہے اس لیے پانی کی کثافت بھی ایک ہوئی اور باقی چیزوں کی کثافت ان کی کثافت اضافی کے برابر ہوگی۔ کثافت اضافی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کوئی چیز پانی سے کس قدر بھاری ہے لفظ بھاری

بھاری و ہلکے اجسام کا صحیح مفہوم اور ہلکا روزمرہ کی زبان میں غلط معانی میں استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ ریت کے ذرے ہلکے ہیں اس لیے وہ ہوا میں اُڑتے ہیں، اور بمقابلہ ان کے لکڑی کو بھاری کہا جاتا ہے۔ اس قسم کا مقابلہ چونکہ کسی خاص شرط کا پابند نہیں ہوتا اس لیے اسے غیر علمی قرار دیا جاتا ہے۔ علمی نقطہ خیال سے جو کہ فی الاصل حقیقت حال کے مطابق ہے ریت لکڑی سے بھاری ہے کیونکہ ریت کا وزن مخصوص لکڑی کے وزن مخصوص سے زیادہ ہے یا دوسرے لفظوں میں اگر دونوں چیزوں کے برابر حجم لیکر ان کا وزن نکالا جائے تو ریت کا وزن لکڑی کے وزن سے زیادہ ہوگا۔

نکتہ۔ ایک مبتدی کے دل مین قدرتاً یہ سوال پیدا ہوگا کہ سنٹی میٹر کو میٹر کے بجائے کیون طول کی اکائی مانا گیا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ انتخاب کی پانچ شرائط کے لحاظ سے گرام کلوگرام سے مرجح ہے اس لیے کہ کلوگرام ایک بہت بھاری وزن ہے اور علمی عمل مین جو نازک اور صحیح (کیمیائی) ترازو استعمال کیے جاتے ہین ان کے لیے کلوگرام فی الحقیقت بہت زیادہ وزن ہے۔ زیادہ وزن تولنے کے لیے صحیح ترازو بنائے جا سکتے ہین لیکن ان کی قیمت بہت زیادہ ہو جائے گی۔ اور دوسرے

ترازو کی حسّیت کی تعریف

ترازو کی حسّیت وزن کی زیادتی سے کم ہوتی جاتی ہے۔ حسّیت کا مفہوم یون سمجھا جا سکتا ہے کہ بازاری ترازو کے ایک پلڑے مین اگر ایک رتی ڈال دی جائے تو ڈنڈی بمشکل ٹیڑھی ہوگی لیکن کیمیائی ترازو یا جوہری کے ترازو مین ایک رتی سے بہت فرق ہوتا ہے۔ ترازو کی حسّیت سے مراد وہ کم از کم وزن ہے جو ہم صحت کے ساتھ تول سکتے ہین۔ باین وجوہ کلوگرام بحیثیت اکائی کے ناکارہ ہے اور گرام عین مناسب ہے۔ اب اگر گرام کے ساتھ طول کی اکائی میٹر ہوتی تو میٹر کے خلاف علاوہ اور اعتراضات کے یہ اعتراض آتا ہے کہ گرام اور میٹر کو اکائیان ماننے سے پانی کی کثافت دس لاکھ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ایک مکعب میٹر مین ۱۰۰ × ۱۰۰ × ۱۰۰ یعنی دس لاکھ مکعب سنٹی میٹر ہوتے ہین۔ اس سے یہ قباحت پیدا ہوتی ہے کہ چیزون کی کثافت ان کی کثافت اضافی سے دس لاکھ گنا ہو جاتی ہے۔ گرام اور سنٹی میٹر کو اکائیان ماننے سے یہ نقص بالکل رفع ہو جاتا ہے۔

(۳) علمی نظام اعداد کی ایک بڑی ممتاز خصوصیت ان کے ذریعے حسابی اندازہ کی سہولت ہے۔ تمام اکائیون (اساسی اور تبعی دونون) کے حصے بڑے یا چھوٹے سب کے سب صحیح طور پر دس سے منقسم ہو جاتے ہین۔

(۴)

دس کی خصوصیت

حضرت انسان نے ایک بڑی حد تک علوم کی ترقی مین بھی اپنا جسمانی عنصر نہین بھلایا۔ دونون ہاتھون اور دونون پاؤن کی دس انگلیان ہونے سے دس کے عدد کو ایک خاص اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ اور حساب مین اگر کوئی عدد متبرک کہا جا سکتا ہے تو فی الحقیقت دس ہے۔

کسرون کی تحریر کا ایک بہتر طریقہ

عام طور پر کسرین ۱/۲، ۲/۳ و ۹/۱۰ یا ۱/۱۲ لکھی جاتی ہین۔ اس ـ او کے لیے تو کسور اعشاریہ جن کا مختصر ذکر ہم بھی کرین گے بالکل کافی ہین۔ اس لیے ہندسی کسرین علمی کامون مین مفقود ہوتی جاتی ہین لیکن تناسب کے نشان یعنی ـ کی اہمیت ہمین نظر انداز نہین کرنی چاہیے۔ یہ نشان ایک طرح کی اعلیٰ مختصر نویسی ہے لیکن بجائے اس کے کہ ہم وزن/حجم لکھین جو چھپائی مین سطرون کی یکسانیت کے منافی ہے اور جو ایسی مثالون مین جہان ایک سے زیادہ تناسب ہوتے ہین چھپائی مین بالکل نہین آ سکتا۔ مثلاً سُرعت کی تعریف فاصلہ/وقت ہے اور رفتار کی تعریف سرعت/وقت ہے اس لیے اسراع کو یون لکھنا ہوگا (فاصلہ/وقت)/وقت جو کہ صاف طور پر بُرا معلوم ہوتا ہے۔ ہمین تناسب کے نشان کو متوازی لکھنے کے بجائے آڑا لکھنا چاہیے یعنی وزن / حجم یا اسراع = فاصلہ / وقت / وقت۔ اس طرز تحریر کے فوائد اور سہولت عیان ہین۔

کسور اعشاریہ

ہندسی کسرون کے لیے کسور اعشاریہ جس کا مجموعی نام نظام اعشاریہ ہے زیادہ مناسب ہین۔ مثلاً ۲/۵ = ۴/۱۰ = ۴ء، اور ۹/۸ = ۱۲۵ء۱ وغیرہ۔ کسور اعشاریہ نہ صرف چھپائی کے لیے زیادہ موزون ہین بلکہ تمام ہندسی عمل ان کے ذریعے زیادہ آسانی کے ساتھ حل ہو سکتے ہین۔

اعداد اساسی کے علمی نظام اعداد اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے کہ اس کے بڑے چھوٹے حصے یعنی اکائیون کے حصے سب دس کی ضرب یا تقسیم سے حاصل ہوتے ہین، نظام اعشاریہ کے بالکل مطابق ہے اور اسلیے سائنٹفک شمارات مین بہت سہولت رہتی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سنٹی میٹر میٹر کا ۱/۱۰۰ حصہ ہے۔ اگر ہم اس قاعدہ کو اختیار کرلین کہ اختصار کے لیے کسی اکائی کا پورا نام لکھنے کے بجائے اس کا پہلا حرف تہجی لکھ دیا جائے تو س = ۰۱ء م۔

باقی حصے سب کے سب اسی قاعدے کے ماتحت ہین۔ میٹر کے دس سو اور ہزار گنے حصون کے مختص نام ڈیکا میٹر ہیکٹو میٹر اور کلو میٹر ہین ان مین سے صرف کلو میٹر مروج ہے باقی دو تون شاذ و نادر استعمال مین آتے ہین۔ اسی طرح گرام کے دس سو اور ہزار گنے حصون کے مختص نام ڈیکا گرام ہیکٹو گرام اور کلو گرام ہین جن مین سے صرف کلو گرام مروج ہے باقی شاذ و نادر ہی استعمال مین آتے ہین۔ میٹر اور گرام کے چھوٹے حصے دسوان اور سوان ہزاروان حصے ہین جن کے لیے یہ اصطلاحات مستعمل ہین۔ ڈیسی، سنٹی اور ملی۔

ہم ان نامون کو ایک جدول مین درج کرتے ہین:۔۔۔

(۱) طول کا پیمانہ
ملی میٹر = ۱/۱۰۰۰ م = ۰٫۰۰۱ م۔
سنٹی میٹر = ۱/۱۰۰ م = ۰٫۰۱ م۔
میٹر = ۱/۱ م = ۱٫۰ م۔
کلو میٹر = ۱۰۰۰/۱ م = ۱۰۰۰٫۰ م

(۲) وزن کا پیمانہ
ملی گرام۔ ۱/۱۰۰۰ گ = ۰٫۰۰۱ گ
گرام۔ ۱ گ = ۱٫۰ گ
کلو گرام۔ ۱۰۰۰ گ = ۱۰۰۰٫۰ گ

کسی چیز کی لمبائی یون ظاہر کی جاتی ہے ۱۷٫۵۴ سنٹی میٹر اور اسی طرح وزن ۱۷٫۰۵۴ گرام یعنی ۱۷ گرام اور ۵۴ ملی گرام۔

اردو کی مرادف اصطلاحات | بطور جملہ معترضہ کے ہم بیان اس امر کا اظہار ضروری سمجھتے ہین کہ زبان اردو مین بھی کم از کم ملی، سنٹی اور کلو یعنی ہزاروین اور سوین حصہ اور ہزار گنے حصہ کے لیے مرادف الفاظ وضع کئے جانے چاہئین ہم خود علمی اصطلاحات کے متعلق ایک جداگانہ مضمون مین اپنے خیالات ظاہر کرین گے علاوہ ان تین ضروری اسماء کے لاکھ گنا اور لاکھوین حصہ کے لیے انگریزی مین دو نہایت مختصر نام مروج ہین میگا اور مائکرو جنکا ترجمہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً برقی رَو کو کسی جسم مین سے گذرتے ہوے جو مزاحمت پیش آتی ہے اس مزاحمت کی عملی اکائی کو "اوہم" کہتے ہین اور چونکہ بعض اجسام کی جن مین سے عام طور پر بجلی گذرنے نہین پاتی، اور جو عرف عام مین غیر موصل اجسام کہلاتے ہین برقی مزاحمت بہت زیادہ ہوتی ہے اس لیے ایک خاص اکائی جس کا معیار دس لاکھ "اوہم" ہے میگا اوہم کے نام سے مروج ہے۔ علی ہذا القیاس اگر ایک چیز ملی میٹر کا ایک ہزاروان حصہ لمبی ہو تو اس کی لمبائی کو ایک مائکران کہتے ہین۔ مائکران میٹر کا دس لاکھوان حصہ ہوتا ہے۔ روشنی کی لہرون کی لمبائی مائکران سے بھی کم ہوتی ہے بعض اوقات مائکرو غلطی سے ہزاروین حصہ کے لیے بھی مستعمل ہوتا ہے لیکن ایسا استعمال حکم شاذ رکھتا ہے اور قابل تقلید نہین ہے۔

انسانی اور قدرتی پیمانے | ایک اور ضروری بات قابل غور یہ ہے کہ جملہ اوزان اور پیمانے سب کے سب انسان کے وضع کردہ ہین اور اس لیے کسی قدرتی اٹل قانون کے تابع نہین ہین۔ مثلاً طول کے پیمانہ مین سنٹی میٹر کو اکائی قرار دیا گیا ہے حالانکہ پلاٹینم کی اصلی سلاخ کی لمبائی ایک میٹر ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس چیز کو ہم میٹر کہتے ہین اسے سنٹی میٹر کیون نہین کہتے؟ اسکا جواب نہایت آسان اور سادہ ہے اور وہی ہے جو عام طور پر دنیا کے نامون کے متعلق دیا جا سکتا ہے اور جس کا فلسفہ قرآن شریف مین بھی یون بیان کیا گیا ہے کہ نامون کی علت غائی یہ ہے کہ تم آپس مین ایک دوسرے کو اور علی ہذا القیاس گرد و پیش کی چیزون کو پہچان سکو۔ بیشک ہم سنٹی میٹر کو موجودہ میٹر کے برابر لمبا بناتے ہین اور میٹر کو اس سے سو گنا بڑا لیکن ایسا کرنے کے بعد بھی شکل ویسی کی ویسی رہتی ہے یعنی کیا وجہ ہے کہ ایک خاص لمبائی کو سنٹی میٹر کا نام دیا گیا ہے اور کسی دوسری لمبائی کو یہ نام نہین دیا گیا؟ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ آخر کسی نہ کسی لمبائی کو کوئی ایک نام دینا ضروری تھا اس لیے کسی ایک لمبائی کو ایک خاص نام دیدیا گیا اور بعد ازان تمام آدمیون نے باہم گر اتفاق رائے کر لیا کہ آئندہ ہمیشہ اس خاص لمبائی کو اس نام

نام سے پکارتے ہین اور اس طرح سے ایک آدمی کا مطلب دوسرا آدمی سمجھ جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر نام ایک طرح کا معاہدہ ہو خفی یا جلی اس سے بحث نہین ہی، ہوتے ہین مابین متفرق اشخاص کے اس امر کے متعلق کہ ہر چیز کو ایک خاص طریقہ سے یاد کیا جائے گا، اور جب تک اسکی حیثیت نہ بدلے یہ طریقہ یعنی اسکا نام نہ بدلا جائے گا۔ دوسرا سوال یہ کیا جا سکتا ہی کہ میٹر کے معین گز کو سوین حصے سے ترجیح دیکر کیون طول کی اکائی قرار دیا گیا ہی؟ اس کا جواب بھی سہولت و آسانی اختیار ہی لیکن ایک دفعہ اختیار کر لینے کے بعد ردوبدل شیوۂ عقل نہین سمجھا جاتا۔

علمی اکائیاں روزمرہ زندگی مین علمی پیمائش اور روزمرہ کی زندگی کے کامون مین ایک فرق یہ ہی کہ سائنٹفک اندازون مین خواہ کوئی لمبائی بڑی ہو یا چھوٹی اس کو ہم سنٹی میٹر ہی سے ظاہر کرتے ہین گو ناپتے وقت پیمائش سنٹی میٹر سے نہین کیجاتی لیکن نتیجہ ہمیشہ اتنے سنٹی میٹر کہا جاتا ہی خواہ وہ نتیجہ سنٹی میٹر سے کتنا ہی بڑا یا کتنا ہی چھوٹا کیون نہ ہو۔ مثلاً روشنی کی رفتار فی ثانیہ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل یانی دقیقہ (منٹ) ایک کروڑ میل ہی، علمی اصطلاح مین روشنی کی رفتار ۳۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ تیس ارب سنٹی میٹر ہی۔ اتنی بڑی رقوم کے اظہار کا ایک مختصر طریقہ اسی مضمون کے آخر مین تشریح کیا گیا ہی۔ اگر میٹر کو اکائی مانا جائے تو روشنی کی رفتار ۳ کروڑ فی ثانیہ ہوتی ہے اور اگر کلو میٹر کو اکائی مانا جائے تو وہی رفتار ۳ لاکھ کلو میٹر فی ثانیہ رہجاتی ہی۔

جس سمجھوتے اور باہمی اتفاق رائے کا ہم نے ذکر کیا ہی اسکی مثال نہ صرف علمی دنیا مین پائی جاتی ہی بلکہ تجارتی دنیا بھی ایسے ہی سمجھوتون پر چلتی ہے۔ فرق صرف یہ ہی کہ علمی دنیا کی اکائیان جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہین اب مسلمہ طور پر تمام مہذب ممالک مین رائج ہین تجارتی دنیا کی اکائیان ملک بہ ملک مختلف ہوتی ہین۔ انگلستان کا سکہ جرمنی کا اور فرانس کا ان دونون سے مختلف ہی لیکن ان سب کے علمی پیمانے یعنی سائنٹفک اکائیان اب ایک ہی ہین۔

(۵)

انگلستان کی سائنٹفک کمیٹی علمی اکائیون کے وضع کرنے کیلیے ۱۸۷۳ء سے پہلے بالعموم انگلستان مین سی جی ایس نظام اعداد مروج نہین تھا لیکن اسی سال انگلستان کے سربرآوردہ علمائے سائنس کی ایک کمیٹی نے اپنے متعدد اجلاس مین غور و خوض کے بعد ملک سے سفارش کی کہ سنٹی میٹر گرام اور ثانیہ کو اختیار کر لیا جائے۔ اس کمیٹی مین لارڈ کیلون، کلارک میکسویل وغیرہم بڑے بڑے جلیل القدر سائنس دان شامل تھے، اور ہم اس تذکرہ سے اس بات پر زور دینا چاہتے ہین کہ مناسب اکائیون کے انتخاب کا مسئلہ بالخصوص علمی کامون کے لیے کوئی معمولی یا غیر ضروری فضول کام نہین ہی۔ اس کمیٹی کی رپورٹ کا ترجمہ اگر اردو خوان اصحاب کے سامنے پیش کیا جائے تو ان کو معلوم ہوگا کہ س۔ گ۔ ث۔ نظام اعداد ان تمام خوبیون سے متصف ہے جو کہ ایک علمی نظام اعداد مین موجود ہونی چاہئین۔ اس رپورٹ مین قابل شکر کمیٹی نے شرح و بسط کے ساتھ تمام میکانیکی اور برقی تبعی اکائیون کے متعلق بھی اپنی رائے ظاہر کی ہی اور ان کے مخصوص نامون سے بحث کی ہی۔ چونکہ ابھی تک اردو زبان مین کوئی مستند کتاب علوم طبیعیات کے متعلق موجود نہین ہی اور بالعموم اردو دان اصحاب علوم طبیعیات سے ناواقف ہین اسلیے اس رپورٹ کا ترجمہ یا اس پر تبصرہ لکھنا درست فضول ہوگا۔ علمی ترقی کے ساتھ آئندہ خود بخود اس کمی کے پورا کرنے کی ضرورت محسوس ہوگی اور یہ کام ہو جائے گا۔

س گ ث تبعی اکائیان تمام تبعی اکائیان جن کا ماخذ علمی نظام اعداد کی تین اساسی اکائیان ہین س گ ث اکائیان کہلاتی ہین ہم یہاں ان تبعی اکائیون مین سے چند کا مختصر ذکر کرنا ضروری خیال کرتے ہین۔ تبعی اکائیون مین سے بعض ایسی ہین جن کا انحصار صرف ایک ہی اساسی اکائی پر ہی۔ مثلاً رقبہ کی اکائی کہ یہ سنٹی میٹر ضرب سنٹی میٹر کے برابر ہوتی ہی اس لیے رقبہ کی اکائی ایک مربع سنٹی میٹر ہوئی۔ علیٰ ہذا القیاس حجم کی اکائی مکعب سنٹی میٹر ہوگی۔ دوسری

قسم کی رتبی اکائیان ہین جو ایک سے زیادہ سادہ سی اکائیون پر منحصر ہین مثلاً رفتار کہ اس کا تعلق طول مین طے شدہ مسافت اور وقت دونون سے ہے۔ اس لیے رفتار کا تعین اتنے سنٹی میٹر فی ثانیہ سے ہوگا۔ پھر بعض رتبی اکائیان ایسی ہین کہ ان کے لیے کوئی خاص نام نہین وضع کیا گیا۔ مثلاً کثافت رفتار یا اسراع۔ اور بعض ایسی ہین کہ ان کے لیے بوجہ کثرت استعمال یا یون ہی مختصر نام وضع کئے گئے ہین۔ مثلاً طاقت کی اکائی کو اسے علمی نظام اعداد کے مطابق ڈائن کہتے ہین یا کام کی اکائی کو اسے ”ارگ“ کہتے ہین وغیرہ وغیرہ۔

طاقت اور کام ڈائن اور ارگ کے متعلق ان کی علمی اہمیت کے لحاظ سے چند سطور بے محل نہ ہون گی۔ مادی اجسام نہ خود بخود حرکت کرتے ہین اور نہ خود بخود ساکن ہو جاتے ہین اور نہ اپنی حرکت کی رفتار بغیر کسی بیرونی اثر کے بدلتے ہین یہ صفت مادی اجسام کی ممتاز خصوصیت مانی جاتی ہے اسے مختصر علمی اصطلاح مین ”جمود“ یا جموٹ کہتے ہین اور یہ جمود مادہ کی مادیت کا معیار سمجھا جاتا ہے یعنی جس چیز مین یہ صفت ہوگی اسے مادی چیز کہین گے۔ ہم اس مضمون پر مفصل بحث اپنے ایک عام فہم مضمون ”حرکت کا پہلا قانون“ مطبوعہ العصر جون ۱۹۱۳ء مین کر چکے ہین۔ یہان صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ طاقت کی تعریف اسی جمود پر مبنی ہے طاقت وہ ہے جو کسی جسم کی حالت متحرکہ یا حالت سکون کو بدل سکتی ہے۔ جو طاقت ایک ثانیہ عمل کرنے کے بعد ایک گرام مین ایک سنٹی میٹر فی ثانیہ کی رفتار پیدا کر دے اس کو طاقت کی اکائی یا ڈائن کہتے ہین۔ جب کسی طاقت کا نقطۂ عمل ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جاتا ہے تو وہ طاقت کچھ نہ کچھ کام کرتی ہے اور کام کا معیار طاقت اور فاصلہ کا حاصل ضرب ہے۔ اس لیے ارگ یعنی کام کی اکائی کام کی وہ مقدار ہے جو ایک ڈائن طاقت کے ایک سنٹی میٹر حرکت کرنے سے نتیج ہوتا ہے۔ کام کرسکنے کی قابلیت کا نام اصطلاح مین قوت ہے اور اس لحاظ سے علمی طور پر قوت اور طاقت ممتاز اور جداگانہ ہستیان ہین گو معمولی محاورہ مین ان کو سہولت کے لیے ہم معنی قرار دیا جاتا ہے۔

زمین کی کشش کی طاقت بہت زبردست ہے۔ ایک گرام مین جتنا مقدار مادہ ہوتی ہے اسکو زمین کی کشش تقریباً ۹۸۱ ڈائن کی طاقت سے اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اس لیے اگر آپ ایک گرام کو ایک سنٹی میٹر عمودی فاصلہ اوپر اٹھائین تو آپ ۹۸۱ ڈائن کی طاقت کا مقابلہ ایک سنٹی میٹر کے فاصلہ مین کرتے ہین۔ لہذا آپ ایک گرام کے اٹھانے مین ۹۸۱ ارگ کام کرتے ہین اور دو گرام کے اٹھانے مین ۲ × ۹۸۱ یعنی ۱۹۶۲ ارگ۔ اسی طرح ایک گرام کو ۲ سنٹی میٹر اٹھانے مین بھی ۲ × ۹۸۱ ارگ کام کیا جائے گا۔ ارگون مین وزن فاصلہ عمودی اور ۹۸۱ کی حاصل ضرب ہوتا ہے جبکہ وزن اور فاصلہ کا اظہار گرام اور سنٹی میٹر کے ذریعہ سے کیا گیا ہو۔

طاقت اور کام کی یہ علمی تشریح بظاہر دق معلوم ہوتی ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہم اپنی روزانہ زندگی مین اپنے خیال کی تحلیل کیے بغیر اجمالی طور پر ان امور کو بخوبی سمجھتے ہین۔

کام کی ایک عام فہم مثال مثلاً جس آدمی نے کنوئین مین سے کبھی پانی بذریعہ ڈول نکالا ہوگا وہ جانتا ہے کہ کام پانی کی مقدار کے متناسب ہوتا ہے پانی کے دو ڈول نکالنے مین دوگنا کام کرنا پڑتا ہے یا یون بھی کہا جاتا ہے کہ دوگنا پانی نکالنے مین دوگنی طاقت صرف کرنی پڑتی ہے۔ اسطرح یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر ایک کنوان دوسرے سے دوگنا گہرا ہو تو دوگنا کام کرنا پڑتا ہے اور اس حالت مین دو ڈول کھینچنے کے لیے پہلے کی بہ نسبت چارگنی طاقت صرف کرنی پڑتی ہے۔ علی ہذا القیاس یہ بھی عام طور پر معلوم ہے کہ اگر پانی کے بجائے کنوئین مین سے ریت کے ڈول بھر بھر کر نکالے جائین تو کام کی مقدار پہلے سے بڑھ جاتی ہے اور زیادہ زور لگانا پڑتا ہے۔ اب اگر ان سب خیالات کو یکجا جمع کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ کام کی مقدار متناسب ہے وزن کے اور اس بلندی کے جس مین سے وہ وزن اٹھایا جاتا ہے۔ یہان انسانی عنصر یا کھود دکھلاتا ہے اور عضلات کی طاقت کی مناسبت سے کام کی تعریف بالعموم طاقت اور فاصلہ کی حاصل ضرب قرار دی گئی ہے۔ اگر ایک پونڈ وزن کو ایک فٹ

اوپر اٹھایا جائے تو کام کی مقدار ایک فٹ پونڈ کہتے ہیں۔ اسی طرح ایک سیر کو ایک فٹ اوپر اٹھانے میں ایک فٹ سیر کام کیا جائے گا۔ کام کی ایک بڑی اکائی جسے اصطلاح میں ایک گھوڑے کی طاقت کہتے ہیں علمی اکائیوں کے زمانے سے پہلے کی مروج ہے اور تقریباً تینتیس ہزار فٹ پونڈ فی فٹ کے برابر ہوتی ہے آج کل اس اصطلاح کا استعمال زیادہ تر متروک ہے۔ ایک فٹ پونڈ ۱٫۳۵۶ × ۱۰^۷ ارگ۔

مقدار حرارت کی اکائی | ایک ضروری تجربی اکائی علم الحرارت میں مقدار حرارت کی اکائی ہے جتنی حرارت ایک گرام پانی کے درجہ حرارت کو ایک درجہ سنٹی گریڈ بلند کرنے کے لیے درکار ہوتی ہے اسے مقدار حرارت کی اکائی یا کیلوری کہتے ہیں حرارت پیمائی کے لیے مختلف پیمانے مقرر ہیں جن میں سے دو زیادہ مشہور ہیں۔

مقیاس الحرارت | سنٹی گریڈ پیمانہ جس کے مطابق پگھلتی ہوئی برف کا درجہ حرارت صفر کہلاتا ہے اور کھولتے ہوئے پانی کا ایک سو۔ درمیانی درجہ ہائے حرارت اس وقفہ کو برابر کے سو حصوں میں تقسیم کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ بالعموم یہی پیمانہ مقیاس الحرارت علمی دنیا میں مروج ہے اس لیے کہ یہ کسر اعشاریہ کے تابع ہے۔ دوسرا پیمانہ فارن ہائیٹ کہلاتا ہے۔ اس کے مطابق برف کے درجہ حرارت کو ۳۲ اور کھولتے ہوئے پانی کے درجہ حرارت کو ۲۱۲ کہتے ہیں یہ پیمانہ عام طور پر ڈاکٹر اور معالج استعمال کرتے ہیں۔ صحیح جسم انسانی کا درجہ حرارت اس کے مطابق ۹۸٫۴ ہے سنٹی گریڈ پیمانہ[سلہ] میں یہ درجہ حرارت ۳۶٫۹ یا تقریباً ۳۷ کے برابر ہوتے ہیں۔ مقدار حرارت کی اکائی مقرر کرنے میں سنٹی گریڈ پیمانہ استعمال کیا جاتا ہے۔ فارن ہائیٹ کے مطابق کیلوری ۵/۹ یعنی ۵۵ء۰ حصہ چھوٹی ہو جائے گی۔

اسی طرح روشنی برق اور علم الصوت میں ضروری اکائیاں مقرر کی جا سکتی ہیں جن کا استحصار کرنا یہاں مقصود نہیں ہے۔

وقت کی تقسیم | ہم نے اعداد اساسی کا ذکر کرتے ہوئے ارادۃً وقت کی اکائی کا ذکر نہیں کیا۔ اس لیے کہ تمام مختلف نظام صرف وقت کی اکائی کے متعلق متفق ہیں بلکہ وقت کی تقسیم کے مطابق بھی کوئی اختلاف الرائے نہیں ہے۔ ساٹھ ثانیہ کا ایک دقیقہ (منٹ) ہوتا ہے ساٹھ دقیقہ کا ایک گھنٹہ اور چوبیس گھنٹہ کا ایک دن رات اور سات دن رات کا ایک ہفتہ۔ یہاں تک کوئی اختلاف نہیں ہے اس کے بعد مہینہ اور سال میں کسی قدر اختلاف ہے۔ مگر علمی اور عملی کاموں کے لیے شمسی سال اور ماہ اب عام طور پر تمام دنیا میں مروج ہیں۔

ثانیہ اور دقیقہ | ثانیہ اور دقیقہ سیکنڈ اور منٹ کا صحیح لغوی ترجمہ ہیں اگر انگریزی الفاظ کو خواہ مخواہ استعمال کرنے کی عادت نہ ہو تو ثانیہ اور دقیقہ صحیح ہیں۔ ہاں اس خیال سے کہ سیکنڈ اور منٹ نہایت مختصر اور آسان الفاظ ہیں ان کے

چند مشہور درجاتِ حرارت سلہ چونکہ عام طور پر عوام الناس درجہ حرارت سے ناواقف ہوتے ہیں اس لیے سنٹی گریڈ پیمانہ کے مطابق چند مشہور اور مفید درجات حرارت عام آگاہی کے لیے یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

		درجہ سنٹی گریڈ
سورج	تقریباً	۶۰۰۰
بجلی کی آرک۔		۳۵۰۰
لوہا پگھلتا ہے		۱۵۰۰
حرارت کا درجہ ابیضاض		۱۲۰۰
چاندی پگھلتی ہے		۹۶۰
حرارت کا درجہ احمرار		۷۰۰

	درجہ سنٹی گریڈ
کوئلہ جلتا ہے۔	۴۰۰
پارہ کھولتا ہے۔	۳۵۷
سیسہ پگھلتا ہے	۳۲۷
قلعی پگھلتی ہے۔	۲۳۲
گندھک پگھلتی ہے۔	۱۱۵
نمک اور برف کے ملانے سے کم از کم خنکی	۱۷ و ۲۱ درجے
ہوا مائع ہو جاتی ہے	۱۸۰

رتاریخ مین بھی سوائے زبان کی گندگی کے اور کوئی خاص اعتراض ثقل وغیرہ کا پیش نہین کیا جا سکتا۔

قمری ماہ کا فلسفہ مسلمانون کے ہان قمری مہینہ بلا وجہ مروج نہین ہی کاروبار کے لیے ضروری طور پر شمسی ماہ اور سال مسلمانون کو بھی اختیار کر لینا چاہیے ایسکے فوائد اظہر من الشمس ہین قمری ہجری سنہ ۱۳۳۳ ہی لیکن اگر شروع شروع مین اسکے

شمس ہجری سنہ ۱۲۹۳ ساتھ ساتھ شمسی ہجری کا سال استعمال کیا جائے جیسا کہ مصر یا بعض دیگر ممالک اسلامیہ مین ہوتا ہی تو بتدریج شمسی سال مسلمانون کے درمیان بھی مروج ہو سکتا ہی۔ تاریخ قدیم مین البتہ اس تبدیلی سے دقت واقع ہو سکتی ہی لیکن وہ دقت اس نوع کی ہوگی جیسی کہ آجکل انگریزی خوان مسلمانون کو بالخصوص میلادی (ع) اور ہجری سال کی تطبیق مین واقع ہوتی ہی۔ قمری مہینون کا بڑا فائدہ رمضان اور حج کی عالمگیری پر غور کرنے سے سمجھ مین آسکتا ہی اور یہ ایسا فائدہ ہی کہ اس کا نعم البدل اور کسی طریقہ سے حاصل نہین ہو سکتا۔ اگر رمضان کا کوئی خاص وقت مقرر کر دیا جائے تو نصف کرۂ شمالی کے لیے اگر سہولت ہو تو نصف کرۂ جنوبی کے لیے مشکل پڑے گی کیونکہ ان دونون مین موسم بالکل متضاد ہوتے ہین۔ ہماری سردی کا موسم وہان کی گرمی ہوتی ہی اور اگر اس کا کوئی ناقص حل کیا جائے تو ساری دنیا کے مسلمان ایک ہی وقت روزہ دار نہ ہون گے۔ علی ہذا القیاس حج کے متعلق کہا جا سکتا ہی اس خالص اسلامی مسئلہ کے متعلق تفصیل سے لکھنا موجودہ علمی مضمون کے منافی ہوگا۔ ہم اپنے مفصل خیالات کسی دوسرے موقع پر ظاہر کرین گے۔

دوپہر اور سہ پہر وقت کی تقسیم کے متعلق صرف یہ لکھنا باقی ہی کہ ہندوستان مین گھڑیون کی ایجاد سے پیشتر دن رات کے آٹھ پہر ہوتے تھے اور اگرچہ ہر پہر کی وسعت برابر نہ ہوتی تھی لیکن پھر بھی کام چلایا جاتا تھا اس تقسیم کی یادگار بالفاظ دوپہر اور سہ پہر ابھی تک باقی ہی۔

(۵)

دوسرا نظام اعداد س۔ گ۔ ث نظام اعداد کے علاوہ دوسرا نظام جس سے انگریزون کے ذریعے سے ہم بھی واقف ہین ف۔ پ۔ ث نظام اعداد کہلاتا ہی اس مین طول کی اکائی فٹ ہی اور یہ ایک خاص سلاخ کا جو لندن مین محفوظ ہی تیسرا حصہ ہوتا ہی۔ مقدار مادہ کے لیے پونڈ ہی جسکی تعریف بھی کلوگرام کی طرح دھات کے ایک ٹکڑے سے کی جاتی ہی جو لندن مین محفوظ ہی۔ وقت کی اکائی ثانیہ یعنی ایک دوپہر سے دوسری دوپہر تک کے وقفہ کا ۱/۸۶۴۰۰ وان حصہ ہی۔ اس نظام کی اعداد بھی بدستور سابق حاصل کی جاتی ہین۔ طاقت کی اکائی کو ایک پونڈل کہتے ہین اور کام کی اکائی کو ایک فٹ پونڈ۔ ہم نے دیکھا ہی کہ زمین کی کشش کا اسراع علمی نظام اعداد کے مطابق ۹۸۱ ہی اور یہی اس طاقت کا ہندسی معیار ہی جو زمین کی کشش ایک گرام کے اوپر

طاقت اور اسراع کی مزید تشریح لگاتی ہی۔ طاقت اسراع اور مقدار مادہ کا تعلق اس مساوات سے ظاہر ہی۔ طاقت = مقدار مادہ × اسراع۔ اب اگر مقدار مادہ کو اکائی رکھا جائے تو طاقت = اسراع۔ ۹۸۱ کو سمجھنے کے لیے آپ یہ خیال فرمائین کہ ایک ساکن جسم اگر زمین کی طرف گرا دیا جائے تو شروع ثانیہ مین اسکی رفتار صفر ہوتی ہی اور اخیر ثانیہ مین ۹۸۱ سنٹی میٹر (۳۲ فٹ) فی ثانیہ بالفاظ دیگر ایک ثانیہ مین کسی ساکن جسم کی رفتار مین جب وہ زمین کی طرف گرتا ہی ۹۸۱ سنٹی میٹر فی ثانیہ (۳۲ فٹ فی ثانیہ) کی تبدیلی واقع ہوتی ہی۔ اوسط رفتار ظاہر ہی کہ پہلے ثانیہ مین ۹۸۱/۲ یعنی تقریباً ۴۹۰ سنٹی میٹر فی ثانیہ ہوگی۔ اس لیے پہلے ثانیہ مین ساکن جسم ۴۹۰ سنٹی میٹر (یعنی ۱۶ فٹ) فاصلہ زمین کی طرف گرتا ہی دوسرے مین ۱۴۷۱ سنٹی میٹر (۴۸ فٹ) یعنی پہلے دو ثانیہ مین ۱۹۶۲ سنٹی میٹر (۶۴ فٹ) گرتا ہی

مختلف درجہ پیمانون کے باہمی تعلقات اب صرف ہندوستانی اوزان اور پیمانون کے علمی اوزان اور پیمانون کے ساتھ باہمی تعلقات بتلا دینے باقی ہین۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہین کہ ایک انچ تقریباً ۲½ سنٹی میٹر جس سے ایک فٹ مین تقریباً ۳۰ اور ایک گز مین ۹۱ سنٹی میٹر نکلتے ہین اور ایک میٹر ۳۹ انچ یا ۳۹.۳۷ انچ ایک ملی میٹر انچ کا ۱/۲۵ حصہ ہوتا ہی۔ ایک کلومیٹر تقریباً ۵ فرلانگ کے برابر ہوتا ہی اور سولہ سو میٹر تقریباً ایک میل ہوتے ہین۔ ہندوستانی گز

ہاتھ اور قدم جو کہ علی الترتیب کپڑے اور زمین کی پیمائش میں کام آتے ہیں، مفصلہ بالا مساوات سے علمی اعداد کے ساتھ ملائے جا سکتے ہیں۔ یہ پریشانی اور پراگندہ معانی کا ایک مجسم نمونہ ہندوستانی کوس ہے جس کی ملک کے مختلف حصص میں مختلف قیمتیں ہیں۔

چونکہ اور حجم کے پیمانے استعمال میں کم آتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم کو یک لخت سنٹی میٹر کو اپنی اکائی مقرر کر لینا چاہیے بلکہ یہ کام بتدریج ہونا چاہیے جوں جوں ملک میں علمی تعلیم کا چرچا ہوگا سائنس دانوں کی تعداد بڑھے گی، اور آہستہ آہستہ سنٹی میٹر اور علمی نظام اعداد کی خوبیاں دلپذیر ہوتی جائیں گی۔ اور پھر گو ایک حد تک اس امر سے بڑی سہولت ہوتی ہے کہ تجارتی کاروبار اور علمی تحقیقات کے ایک جیسے پیمانے ہوں لیکن ضرورت زیادہ تر صرف اس بات کی ہے کہ علمی کاموں کے لیے ہمارے ہاں وہی اکائیاں مروج ہو جائیں جو باقی مہذب ممالک میں رائج ہیں۔ تجارتی کاروبار بھی آہستہ آہستہ تغیر پذیر ہوتے جائیں گے لیکن یہ ہم ضرور کہیں گے کہ جہاں خالص ہندوستانی پیمانوں کو چھوڑا جائے اور ان کی جگہ کوئی غیر ہندوستانی پیمانہ اختیار کیا جائے وہاں بہتر ہوگا کہ ہم سائنٹفک نظام اعداد کو اپنا رہبر بنائیں۔ مثلاً اگر گرہ کو کسی زمانہ میں متروک کیا جائے تو انچوں کی بجائے سنٹی میٹر زیادہ موزوں ہوں گے

وزن اور حجم کے تناسب کو ہم پہلے بھی کثافت کے ذکر میں بیان کر چکے ہیں۔ یہاں صرف یہ امر واضح کرنا ہے کہ اگر دودھ کو بجائے تولنے کے ناپا جائے تو کثافت کا علم ضروری ہے اور حجم کے حساب سے دودھ یا کسی اور مائع کی خرید میں اس کی کثافت اضافی کا جاننا لازمی ہے۔

اوزان کے متعلق صرف یہ کہنا باقی ہے کہ ہمارے ہاں وزن کا تعلق شاذ ہی حجم کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ پونڈ اور سیر کا تعلق مختلف حالات میں مختلف ہوتا ہے ۸۰ تولہ یا ۱۶ چھٹانک کا سیر ۲٫۰۵ پونڈ کے برابر ہوتا ہے بالفاظ دیگر ایک پونڈ میں تقریباً ۸ چھٹانک ہوتی ہیں لیکن کبھی کبھی ایک پونڈ ۳۹ تولہ کا بھی ہوتا ہے اب چونکہ ایک پونڈ میں ۴۵۳ گرام ہوتے ہیں اور ۲٫۲۰۵ پونڈ ایک کلوگرام کے برابر ہوتے ہیں اسلیے ایک سیر ایک کلوگرام سے ذرا بڑا ہوتا ہے صحیح طور پر ایک سیر تقریباً ۱۰۴۵ گرام کے برابر ہوتا ہے اس لیے ایک چھٹانک میں تقریباً ۶۵ گرام ہوے اور ایک تولہ میں تقریباً ۱۳ گرام ہوتے ہیں چونکہ ۱۲ ماشہ کا تولہ ہوتا ہے اس لیے ایک ماشہ تقریباً ایک گرام وزنی ہوتا ہے علمی کاموں کے لیے گرام کے ایک ہزارویں حصہ کو ملی گرام کہتے ہیں۔ اس لیے ایک رتی میں تقریباً سوا سو ملی گرام ہوتے ہیں اعلی معملوں میں جو کیمیائی ترازو ہوتے ہیں انکی مدد سے بآسانی ایک ملی گرام کا دسواں بلکہ سوواں حصہ صحت کے ساتھ تولا جا سکتا ہے بالفاظ دیگر رتی کا دس ہزارواں حصہ بھی صحیح طور پر تولا جا سکتا ہے

رتی کے دس ہزارویں حصہ تولنے کی مثال اس چھوٹے سے وزن کا صحیح مفہوم سمجھ میں یوں آ جائے گا کہ آپ ایک ترازو کے دونوں پلڑوں میں کاغذ کے دو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ڈال کر ڈنڈی کو سیدھا کر لیں اور پھر ایک ٹکڑے کے اوپر پنسل سے رتی لکھ کر ترازو میں رکھیں تو جس قدر اختلاف وزن میں اس تحریر سے پیدا ہوگا وہ سہولت کے ساتھ ہم اپنے ترازو کی مدد سے معلوم کر لیں گے!

ایک گرام تقریباً ۱۵½ گرین کے برابر ہوتا ہے اس لیے ایک گرین میں تقریباً ۶۵ ملی گرام ہوتے ہیں ہزار مکعب سنٹی میٹر پانی کا وزن ایک کلوگرام ہوتا ہے اس لیے ایک سیر پانی کا حجم تقریباً ایک ہزار پینتالیس مکعب سنٹی میٹر ہوا چونکہ ہزار مکعب سنٹی میٹر کو ایک لیٹر بھی کہتے ہیں اس لیے ایک سیر پانی ۱٫۰۴۵ لیٹر کے۔ اسی طرح ایک لیٹر پانی کا وزن ۲٫۲ پونڈ ہوتا ہے (جو ۲٫۲۰ پونڈ اور ڈیوڑھے کے برابر ہوتے ہیں) دس پونڈ پانی تقریباً ایک گیلن کے برابر ہوتا ہے اس لیے ایک گیلن میں ۴٫۵ لیٹر ہوتے ہیں چونکہ ایک گیلن میں چار کوارٹ ہوتے ہیں اس لیے ایک کوارٹ ۱٫۱۲۵ لیٹر اور ایک پائنٹ ۵۶۲ مکعب سنٹی میٹر۔

(۷)

مساوات وسعتی علی ہذا القیاس تمام اکائیوں کے لیے تحویل کے جدول تیار کیے جا سکتے ہیں جو کہ درست مطلوب نہیں ہیں لیکن اکائیوں کے ایک نظام

سے دوسرے نظام میں تحویل کرنے کے لیے چند سہل قواعد بآسانی حاصل کیے جاسکتے ہیں مثلاً اگر بات مرزو طول لی جائے ط سے مقدار مادہ اور روے وقت تو ہم دیکھتے ہیں کہ رقبہ = ط × ط = ط² رفتار = ط/و جسے یون بھی لکھا جاسکتا ہے (ط) (و)⁻¹ اجہان نفی ریا ۔۱ کا مفہوم یہ ہے کہ کسر کے حصہ زیرین میں آتا ہے ایسی مساوات جن میں اکائیوں کا ذکر نہیں کیا جاتا مساوات وضعی کہلاتی ہیں

اور ان سے کسی مقدار کی نہایت عام تعریف کا پتہ چلتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ مقدار کسی حد تک اشیاء اساسی پر منحصر ہے۔ مثال اعداد نہایت آسان ہیں فرض کیجیے کہ ایک سطح کا رقبہ ۵٫۳۰ و ۱۹ مربع سنٹی میٹر ہو تو ہم اسی سطح کا رقبہ مربع انچوں میں نکالنا چاہتے ہیں حالانکہ ہمیں معلوم ہے کہ ایک انچ ۵۴ و ۲ سنٹی میٹر کے برابر ہوتا ہے چونکہ رقبہ کی سمت کل بن دو ہے اس لیے اس سطح کا رقبہ مربع انچوں میں ۳۰ و ۱۹ / (۵۴ و ۲)² = ۰٫۰۳۵ و ۳ نکلتا ہے۔ ایک مادہ پیچیدہ مثال طاقت کی لی جاسکتی ہے طاقت مقدار مادہ و اسراع اس لیے طاقت = م × ط/و² = م ط و⁻² [و] کو اسے الفاظ میں یوں بیان کریں گے کہ طاقت کی سمت م میں ایک ط میں ایک اور و میں نفی دو ہیں۔ اب اگر ڈائن کو پونڈلوں میں تحویل کرنا چاہتے ہیں تو چونکہ دونوں نظاموں میں جزو مشترک و برابر ہے اس لیے ایک ڈائن = ۱/(۳۵۹ و ۴۵۳ × ۴۸ و ۳۰) = ۱/۰۰۰۱۵۰ ۱۳۸۲ پونڈل یعنی ایک پونڈل = ۱۳۸۲۵ ڈائن کے ✲

(۸)

بہت بڑی اور چھوٹی رقوم کی تحریر کا ایک مختصر طریق نوشت	علمی نظام اعداد کے استعمال سے ایک دقت یہ لاحق ہوتی ہے کہ بسا اوقات بہت چھوٹی یا بہت

بڑی رقوم کو لکھنا پڑتا ہے جن میں بہت سے صفر استعمال ہوتے ہیں لیکن اس مشکل کا حل گذشتہ چند سال میں ایک مختصر طریق نوشت کی مدد سے ہوگیا ہے اس مختصر طریق نوشت کے حصول کا انحصار دس کی طاقتوں پر ہے۔ اس کی طاقت سے مراد یہ ہے: ۱۰ × ۱۰ = ۱۰۰ = ۱۰² ؛ ۱۰ × ۱۰ × ۱۰ = ۱۰۰۰ = ۱۰³ وغیرہ یا ۱/۱۰ = ۰٫۱ = ۱۰⁻¹ ؛ ۱/۱۰۰ = ۰٫۰۱ = ۱۰⁻² ؛ ۱/۱۰۰۰ = ۰٫۰۰۱ = ۱۰⁻³ جہان دس کے ساتھ

اوپر کی طرف بائیں جانب جو چھوٹا سا ہندسہ لکھا جاتا ہے اسے دس کی طاقت کہتے ہیں مثلاً مثلاً بالا میں ۱۰² = ۱۰۰ میں ۲ کو دس کی طاقت کہا جاتا ہے یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر دس کی طاقت مثبت ہے تو رقم ایک سے بڑی ہے اور اگر دس کی طاقت منفی ہے تو رقم ایک سے چھوٹی ہے اس طریق نوشت کو ہم نے ذیل کی جدول میں واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

$10^0 = 1$

$10^{1} =$	10	$10^{-1} = \frac{1}{10} = 0.1 =$	1/10
$10^{2} =$	100	$10^{-2} = 0.01 =$	1/100
$10^{3} =$	1000	$10^{-3} = 0.001 =$	1/1000
$10^{4} =$	10000	$10^{-4} = 0.0001 =$	1/10000
$10^{5} =$	100000	$10^{-5} = 0.00001 =$	1/100000
$10^{6} =$	1000000	$10^{-6} = 0.000001 =$	1/1000000

وغیرہ وغیرہ

اس طریق عمل کی نگہداشت میں یہ بات یاد رکھنا موجب سہولت ہوگا کہ صفروں کی تعداد ہر حالت میں دس کی طاقت کے برابر ہے مثلاً ایک لاکھ میں پانچ صفر ہیں تو ایک لاکھ = ۱۰⁵ یا دس لاکھ میں جو صفر ہیں تو دس لاکھ (جسے ملین بھی کہتے ہیں) = ۱۰⁶ اسی طرح کسری رقومات میں اگر نشان اعشاریہ (یعنی چھوٹی ڈاٹ جو صفروں کے اوپر لکھی جاتی ہے) کے ماقبل کا صفر ایک سے پہلے کے صفروں میں شامل کر لیا جائے تو ۱۰ کی منفی طاقت کا ہندسہ صفروں کی مجموعی تعداد کے برابر ہوتا ہے۔ ایک بٹہ دس لاکھ = ۱۰⁻⁶ اور ایک سو اسی حصے کو ۱۰⁻² یا ۰٫۰۱ لکھیں گے۔

اگر رقم میں ایک کے علاوہ اور ہندسے بھی ہیں مثلاً پانچ کروڑ تو اس کے جزو بنائے جاتے ہیں پانچ کروڑ = ۵ × ایک کروڑ = ۵ × ۱۰⁷ کیونکہ ایک کروڑ کے لیے سات صفر ہوتے ہیں ۴۴ کروڑ = ۴۴ × ۱۰⁷ لیکن چونکہ ۴۴ = ۴٫۴ × ۱۰

✲ یہ ایک دلچسپ اصلاحی مضمون ہے۔ علم البرق میں اس کی تفصیل مقالہ میں بہت مد دیتی ہے ہم نے یہاں صرف مختصراً اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔

اس لیے ۴۲ کروڑ = 4.2×10^{8} اسی طرح کی لکھی ہوئی رقوم کی ضرب تقسیم دس کی طاقتوں کو جمع یا تفریق کرنے اور باقی اجزا کی معمولی ضرب سے حاصل ہوتی ہے مثلاً ہمیں ۶۰ کروڑ کو ۱۲ ہزار سے تقسیم کرنا ہے تو $6 \times 10^{8} \div 1.2 \times 10^{4} = 5 \times 10^{4}$ اور اگر ان کو ضرب دینا ہو تو حاصل ضرب $6 \times 1.2 \times 10^{12} = 7.2 \times 10^{12}$ ہوتا۔ اسی طرح منفی طاقتوں کے متعلق کرنا چاہیے البتہ اس حالت میں الجبری جمع کی ضرورت ہوتی ہے۔ الجبری کی مثال یہ ہے $5 + (-3) = 2$ یا $-7 + 3 = -4$۔ بالفاظ دیگر الجبری جمع میں معمولی جمع تفریق دونوں شامل ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک لاکھویں حصہ کو ۵ ہزار سے ضرب دینا ہو تو $10^{-5} \times 5 \times 10^{3} = 5 \times 10^{-2}$ اور اگر انہی اعداد کو تقسیم کرنا ہوتا تو $10^{-5} \div 5 \times 10^{3} = 10^{-8} \times 5^{-1}$۔ غرضکہ اس مختصر طریق نوشت کی مدد سے بڑی سے بڑی رقم بآسانی لکھی جا سکتی ہے۔

(۹)

سائنٹیفک اعداد | اب ہم اس مضمون کو علوم طبیعیات میں سے علمی اعداد کی چند موٹی موٹی مثالیں بیان کرنے کے بعد ختم کرتے ہیں۔ علوم طبیعیات میں انسانی دماغ ایک طرف کروڑہا اور کروڑہا گرام اور ان سے بہت سنٹی میٹر اوزان اور فاصلوں کو دریافت کرتا ہے، دوسری طرف ایک سنٹی میٹر اور گرام کے کروڑویں حصے کو بھی اپنی دسترس سے باہر نہیں سمجھتا۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ روشنی کی رفتار فی ثانیہ 3×10^{10} سنٹی میٹر ہے۔ بعض ستاروں کا بُعد اس قدر زیادہ ہے کہ ان کی روشنی کو ہمارے پاس پہنچنے کے لیے ہزارہا سال درکار ہیں۔ ایسے بڑے فاصلوں کے لیے روشنی کی رفتار فی ثانیہ یعنی 3×10^{10} سنٹی میٹر کو اکائی قرار دینا بھی چنداں مفید نہیں پڑتا۔ سورج ہم سے ۹ کروڑ میل دور ہے اور سورج کی روشنی ہمارے پاس ۸ یا ۹ دقیقہ میں پہنچتی ہے۔ صرف اسی ایک مثال سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ستاروں کا بُعد کیا ہوگا۔

سب سے قریب ستارے الفاسنطاری کا بُعد | سب سے قریب ترین ستارے کی روشنی تقریباً ۴ سال میں ہمارے پاس پہنچتی ہے اور اس کا فاصلہ تقریباً 4.3×10^{18} سنٹی میٹر ہے یعنی ایک کے بعد اٹھارہ صفر۔ اسیلون میں یہ فاصلہ = 2×10^{13}۔ اگر آپ اس رقم کو شمار کرنے کی کوشش کریں تو بلا مبالغہ تین لاکھ سال درکار ہوں گے۔ ہم عنقریب روشنی کی رفتار کے متعلق ایک دلچسپ بحث کے عنوان سے ایک جداگانہ مضمون شائع کریں گے۔ ستاروں کے علاوہ ان کا وزن اور حجم بھی جن کے صحیح اندازہ کرنے کے طریقے آج کل بخوبی معلوم ہیں اس نسبت کے ساتھ بڑا ہے۔ اس کے بعد ہم نظام شمسی میں آتے ہیں جہاں مختلف سیاروں کا فاصلہ سورج اور زمین سے ناپا گیا ہے۔ سورج سے زمین کا بعد 1.5×10^{13} سنٹی میٹر ہے۔ عطارد جو کہ سورج سے قریب ترین سیارہ ہے سورج سے 5.8×10^{12} سنٹی میٹر کے فاصلہ پر ہے۔ اجرام فلکی میں ہمارا سب سے قریب ترین پڑوسی چاند ہے جس کا بُعد زمین سے 3.85×10^{10} سنٹی میٹر ہے۔ زمین کا محیط 4×10^{9} سنٹی میٹر ہے اور کوہ ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی 8×10^{5} سنٹی میٹر بلند ہے۔ آدمی کی اوسط لمبائی 1.08×10^{2} سنٹی میٹر ہے۔ اگر ان رقوم میں سنٹی میٹروں کی بجائے میٹر کلو میٹر یا میل لکھنے ہوں تو علی الترتیب 10^{2} و 10^{5} اور 1.61×10^{5} سے تقسیم کرنا ہوگا۔

چھوٹے اعداد | یہ تو دوربین کے کرشموں کا اجمالی ذکر ہے۔ خوردبین کی مدد سے ہم بہت چھوٹے فاصلے کو دیکھ سکتے ہیں۔ کسی آلہ کی امداد کے بغیر ان کو بآسانی انچ کے تین سوویں یا چار سوویں حصے سے پانچ سوویں حصے تک تمیز کر سکتی ہے۔ بالفاظ دیگر اگر ایک انچ میں ۵۰۰ خط کھینچے جائیں تو آنکھ ان کو علیحدہ علیحدہ دیکھ سکتی ہے۔ انچ کا پانچ سواں حصہ سنٹی میٹر کا دوسواں یا ملی میٹر کا بیسواں حصہ بنتا ہے۔ خوردبین کی مدد سے ہم ملی میٹر کا ہزارواں حصہ (بلکہ اس سے بھی کمتر) دیکھ سکتے ہیں۔ روشنی کی بڑی سے بڑی لہروں کی لمبائی اس کے نصف سے شروع ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر روشنی کی ۳۴ ہزار لہریں ایک انچ میں تیرہ ہزار دو سو لہریں ایک سنٹی میٹر میں آجاتی ہیں۔ سب سے چھوٹی ہستی جس سے انسان واقف ہے برقیہ یعنی برق سالبہ کا خاندہ ہے جس کی دریافت سے

برقیے | نہ صرف علم البرق کے تمام عقدے حل ہو جاتے ہیں بلکہ روشنی حرارت

نور ریڈیم کے عجیب و غریب خواص اور خود مادہ کی ماہیت کے متعلق ان کی مدد سے بہت کافی معلومات بہم پہنچی ہیں۔

خاتمہ۔ باوجود اس حیرت انگیز وسعت کے انسانی علم بہ نسبت محدود و بلا سلسلہ طور پر بے حد و حساب ناقص ہے۔

فیروز الدین مراد

مبادئی حیات

از منشی تیرتھ رام صاحب فیروزپوری۔ ایڈیٹر رسالہ ترجمان۔ لاہور

گلی یا بازار و حیات میں جہاں کہیں ہم نظر ڈالتے ہیں اس قسم کی چیزیں دکھائی دیتی ہیں جنھیں دو خاص اقسام پر منقسم کیا جا سکتا ہے ایک بے جان مثلاً گھر، چٹانیں، پتھر وغیرہ اور دوسرے جاندار جیسے آدمی، چڑیاں، و علی ہذا القیاس۔ آخر الذکر میں جو ظاہری خوبروی اور طاقت حرکت پائی جاتی ہے وہی انکی نمایاں صفت ہے جو ان کو بے جان نوعی اشیا سے تمیز کرتی ہے لیکن اگر ہم اس بارے میں زیادہ غور سے کام لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آخری قسم میں بعض ایسی چیزیں بھی شامل ہیں جو ہر چند کہ گھروں یا پتھروں کی طرح ایک ہی جگہ کھڑی رہتی ہیں اور بظاہر بے حس ہیں تاہم جاندار ضرور ہیں۔ میری مراد درختوں، گھاس، پودوں اور جھاڑیوں سے ہے ان میں بھی پرندوں اور حیوانوں کی طرح جان ہے گو طاقت حرکت موجود نہیں ہے پرندے کی گردن مروڑ دو تو مر جائے گا پودہ کی جڑ اکھاڑ دو تو مرجھا جائے گا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جاندار دونوں ہیں گو ان کی زیست کا معیار جداگانہ ہے۔

پس مختصر لفظوں میں ہمارے گرد دو قسم کی موجودات ہیں:—

(۱) بے جان اشیاء (INORGANIO

(۲) جاندار وجود (ORGAII.C

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں کی تاریخ کا سلسلہ کہاں تک ممکن العمل ہے۔ میرے ہاتھ میں ایک شیشہ کا ٹکڑا یا اینٹ ہے میں جانتا ہوں کہ دونوں کی ترکیب ان نہایت چھوٹے چھوٹے ذرات کی بدولت ہے جو کم و بیش ترتیب کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں اس بارے میں تحقیقات کرتے وقت یہ سوال مطلق پیدا نہیں ہوتا کہ اینٹ اینٹ سے پیدا ہوئی یا شیشہ شیشے سے لیکن اگر

بخلاف ازیں میں کسی شیشم کے درخت یا گھوڑے کے قریب کھڑا ہو کر اس پر غور کروں تو فوراً خیال ہوتا ہے کہ انکی ابتدا نہایت چھوٹے درجے سے ہوئی تھی اور یہ کہ انھوں نے بتدریج اس حد تک ترقی کی ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانی ہاتھوں میں انھیں تیار کرنے کی قدرت نہیں اور یہ کہ گھوڑا گھوڑی سے اور شیشم کا درخت بیج سے پیدا ہوا ہے۔ اسی طرح ہمیں اپنے اردگرد جس قدر آدمی نظر آتے ہیں ان سب کی نسبت ہمیں یقین ہے کہ اُن کی ابتدا اُن کے والدین سے ہوئی۔ وہ براہ راست مٹی یا گوشت پوست سے تیار نہیں ہوئے۔

ممکن ہے کوئی شخص یہ کہے کہ ایک باریک جرم کا کسی موجود جرم سے پیدا ہونا یا کوکر موتے کا کوکر موتے کے بیج سے پیدا ہونا ضروری نہیں۔ کیونکہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ جراثیم اور کوکر موتے خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں اور اگر پنیر کو کسی نمدار جگہ پر پڑا رہنے دیا جائے تو اس کے اندر خود بخود کیڑے پیدا ہونے لگتے ہیں تاہم حقیقت یہ ہے کہ علماء نے اس بارے میں جو تحقیقات کی ہے اس سے وہ بالآخر اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جو بات حضرت انسان کی پیدائش پر صادق آتی ہے وہی ادنےٰ درجہ کی حیوانی اور نباتاتی ہستیوں پر عاید ہوتی ہے۔ سائنس دانوں کا قول یہ ہے کہ پنیر کے کیڑے خود بخود پنیر کے اندر سے پیدا نہیں ہوتے بلکہ انکی پیدائش بھی اُن کے والدین ہی کے ذریعے ہوئی ہے۔ اس بارے میں علمائے یورپ نے وقتاً فوقتاً مختلف اصول قائم کیے ہیں یہ اصول بجائے خود بہت بڑی تاریخی اہمیت رکھتے ہیں اور جیسا کہ تاریخ علوم میں لازمی ہے ان میں وقتاً فوقتاً ابحاث کی تحقیقات کی بنا پر ترمیم و اصلاح ہوتی رہی ہے۔ ہاروے نے جس نے دوران خون کا مسئلہ دریافت کیا تھا اور وحید العصر سائنسدان تسلیم کیا جاتا ہے عمر بھر مشغول رہنے کے

بہ انجام کار اس فیصلے پر پہنچا تھا کہ ہر قسم کی ہستی کی ابتدا بیضے سے ہوتی ہے۔ لیکن اسکے بعد بیسوین صدی مین علمی ترقیات کی بدولت اور خوردبین کی مدد سے اس نظریہ مین بہت کچھ ترمیم ہوگئی ہے۔

شوان اور چوئے تحقیقات ابعد کی بنا پر نظریہ قائم کیا تھا کہ بدنی نمو کی ابتدا بدنی کوٹھریون سے ہوتی ہے۔ اس محقق کا بیان یہ تھا کہ ہر جاندار شے بدنی کوٹھریون یا خانون سے مرکب ہوتی ہے لیکن اسکے ساتھ ہی چونکہ اغلب ہے کہ ادنے درجہ کی ہستیان ابھی اسقدر ارتقا حاصل نہین کرسکین کہ ان کے بدن کوٹھریون کی صورت مین آگئے ہون اس لیے اس نظریہ کی ترمیم شدہ اور صحیح صورت یہ ہے کہ "ہر قسم کی ہستی ہستی سے پیدا ہوتی ہے"۔ اس کا مطلب صاف لفظون مین یہ ہے کہ اگر زمین مین حیاتی عناصر نہ ہون تو نواحی حالات خواہ کیسے ہی کیون نہ ہون اس زمین سے ایک بھی چھوٹے سے چھوٹا کیڑا پیدا نہین ہوسکتا۔ یہ عقیدہ زمانہ حال کے قریب قریب تمام ماہران علم الحیوۃ کا ہے۔

روے زمین پر ہستی کی ابتدا کب اور کیونکر ہوئی

آگے چل کر مین اس عالمگیر عقیدہ کی وجوہ پر تفصیلی بحث کرون گا مگر سردست یہ فرض کر لینے کے بعد کہ علما آغاز حیات کے بارے مین کسی متفقہ فیصلہ پر نہین پہنچے مین ان مختلف خیالات کا سرسری طور پر ذکر کرونگا جو لوگون مین روے زمین پر ہستی کی ابتدا کے بارے مین قدیم سے چلے آتے ہین۔ اس کے متعلق چار مختلف عقیدے بیان ہین بلکہ شاید انھین سالہا سال تین کتنا زیادہ موزون ہوگا کیونکہ ایک تھیوری زیادہ تر قیاسیہ ہی ہے۔ ایک خیال یہ ہے کہ جب سے سطح زمین اسقدر سرد ہوئی کہ اس پر پانی اپنی مائع صورت مین موجود رہنے لگا اسی وقت سے لیکر دنیا مین جاندار مادہ کی نہایت باریک اور سادہ صورتین تیار ہو رہی ہین اور یہ کہ جہان کہین کیفیات مناسب حال ہین اب بھی ایسی ہی صورتین تیار ہوتی رہتی ہین۔ اس خیال کی مسئلہ بقا اور ارتقا سے مطابقت ہے جو زمانہ حال کا ایک عالمگیر اور نہایت قیمتی نظریہ ہے۔ اسکی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ روے زمین پر ہر جگہ ادنے ترین قسم کی ہستیان موجود پائی جاتی ہین۔ لیکن مین اوپر بیان کر چکا ہون کہ علماے حال اس امکان کے خلاف ہین۔

اس کے ساتھ ہی جب ہم زمانہ حال کے عقیدہ "ہر قسم کی ہستی ہستی سے پیدا ہوتی ہے" پر غور کرین تو خواہ مخواہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابتدا مین جو ہستی یہان موجود تھی اور جو بعد کی تمام ہستیون کی ماں تھی وہ کہان سے آئی تھی؟ اسکا ماہران علم الحیوۃ کے پاس کوئی جواب نہین بجز کہتے ہین کہ یہ اصول درحقیقت ہمیشہ اسی طرح نہ تھا۔ ان کا قول ہے کہ گو آج بے جان مادے سے جاندار چیز تیار نہین ہوسکتی تاہم ماضی بعید مین حالات اس قسم کے تھے کہ روے زمین پر ہستی کا آغاز قدرتی طور پر بذریعہ ارتقا ہوگیا تھا۔ ٹنڈل کہتا ہے:—

"اگر فرض کرلیا جاے کہ ایک سیارہ سورج سے جدا ہوکر اس سے اسقدر فاصلہ پر گھومتا رہے جسقدر کہ ہماری زمین ہے تو کیا اس کا ایک نتیجہ جاندار ہستیون (آرگینک) کا ظہور نہ ہوگا؟ مجھ سے پوچھو تو جواب مثبت مین ہے"

اور اس بارے مین زمانہ حال کے اکثر آئندہ علما بھی ٹنڈل ہی کے ہم خیال ہین۔ لیکن پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ زمانہ ماضی مین وہ کون سے حالات تھے جن کی بدولت کرہ زمین پر ہستی کا ارتقا عمل مین آیا؟ یہ تو یقیناً ناممکن ہے کہ اسکے لیے زیادہ تیز حرارت کی ضرورت ہو کیونکہ اس زمانہ مین کرہ زمین کی حرارت اس درجہ سے کم ہوگی جس پر کہ پانی ابلنے لگتا ہے لیکن خیال یہ بھی ہے کہ شاید اس قدیم زمانہ مین جسے گذرے ہوے بقول لارڈ کیلون دس کروڑ سال سے بھی زیادہ عرصہ ہوچکا ہے زمانہ موجودہ کی نسبت کرہ ارض پر اس ارتقا کے لیے زیادہ موزون اسباب کیمیائی موجود ہونگے۔ لیکن ماہران علم کیمیا اس خیال کی تکذیب کرتے اور کہتے ہین کہ بجاے اس کے زمانہ موجودہ مین زمین بے شمار اقسام کے پیچیدہ کیمیائی مرکبات سے بھری ہوئی ہے جن کا جاندار مادہ کی صورت اختیار کر لینا ہر طرح قرین قیاس ہے۔ مگر حقیقتاً ایسا آجتک کبھی نہین ہوا پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ زمانہ ماضی مین جبکہ یہ اشیا ابھی اس کثرت سے موجود نہ تھین جاندار مادہ جس مین اس قسم کے مرکبات پائے جاتے ہین خود بخود پیدا ہوگیا۔ بڑی مشکل اور ناقابل یقین دلیل ہے۔

تیسرا عقیدہ وہ ہے جسکے بانی لارڈ کیلون ہین۔ لارڈ کیلون گرچہ علم الحیوۃ

کے ہر چند تاہم ایک جید اور متبحر عالم ضرور ہیں۔ ان کی رائے میں روئے زمین پر جاندار مادہ کے اول مرتبہ ظہور پذیر ہونے کی دلیل سوائے اسکے اور کوئی نہیں کہ یہ خدا کا ایک خاص عمل۔ ان کے الفاظ یہ ہیں کہ سائنس بتاتی ہے کہ وہ قوت تخلیق کی محتاج ہے۔ جب لارڈ کیلون نے یہ رائے ظاہر کی تھی تو اکثر ماہران علم الحیات نے اعتراضات و نکتہ چینی کا ایک طوفان برپا کر دیا تھا۔

میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ کرۂ ارض پر ابتدائے حیات کے بارے میں چار مختلف تصویریں ہیں۔ تین کا ذکر ہو چکا، چوتھی جو زیادہ تر ایک قیاسیہ خیال ہے اور جس کے بانی خود لارڈ کیلون ہی ہیں، یہ ہے کہ آج سے قرنہا قرن پہلے جب کسی دوسری دنیا میں قیامت برپا ہوئی ہوگی جراثیم حیات اُس دنیا کی کائی سے ڈھنپے ہوئے کھنڈروں میں مل کر اس دنیا پر پہنچ گئے ہونگے۔ تخیل بڑا زبردست ہے، مگر امید نہیں کہ تحقیقات جدید کو پیش نظر رکھتے ہوئے خود لارڈ کیلون بھی اس خیال کو صحیح تسلیم کرنے پر آمادہ ہوے ہوں۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ شہاب ثاقب، اصل میں دمدار ستاروں کے ٹکڑے نہیں بلکہ دوسری دنیاؤں کے کھنڈر ہوتے ہیں اور اسکے ساتھ ہی یہ بھی مان لیں کہ ایسے شہاب اس دنیا تک پہنچتے ہوے راستہ میں اس قدر گرم نہیں ہو جاتے کہ ان پر جسقدر جراثیم حیات موجود ہوں وہ تلف ہو سکیں، تو پھر سوال بدستور یہی قائم رہتا ہے کیونکہ اسکی توضیح کس طرح کی جا سکتی ہے کہ اس دوسری دنیا میں ابتدائے حیات کیونکر ہوئی؟

پس معاملہ صرف پہلی دو دلائل ہی میں اٹک رہتا ہے یعنی یہ کہ یا تو بقول سیڈوفسن اس وقت بھی روئے زمین پر جاندار مادہ کی تیاری کا عمل ظہور میں آ رہا ہے اور ہمیشہ سے اسی طرح ہوتا چلا آیا ہے یا یہ کہ قدیم زمانہ ماضی میں ایک قدرتی ارتقاء کے ذریعہ سے اس قسم کا مادہ صرف ایک بار ظہور پذیر ہوا تھا اور اسکے بعد ایسا ہونا بند ہو گیا ہے۔

کیا بے جان مادہ سے جاندار مادہ تیار ہو سکتا ہے

ان دو دلیلوں میں سے بھی گذشتہ ۴۰ سال کی سرگرم بحث کے بعد اب جس دلیل کو صحیح تسلیم کیا جاتا ہے یہی ہے کہ ہر قسم کی ہستی ہستی سے پیدا ہوتی ہے۔ ٹنڈل، ہکسلے، پاسٹیور اور ڈاکٹر بیسٹین میں مدتوں اس بارے میں بحث چھڑی رہی تھی، اور اس بحث کا علمی نتیجہ یہی نظریہ ہے جسے علمائے حال تسلیم کرتے ہیں کہ خود بخود آغاز حیات کے فرضی خیال کی کامل طور پر تردید ہو چکی ہے اور اب مسئلہ یہی ہے کہ ہر قسم کی ہستی ہستی سے پیدا ہوتی ہے۔ یہی عقیدہ ہے جو آجکل کے طلبائے علم الحیوانات و علم النباتات کے ذہن نشین کرایا جاتا ہے۔ لیکن زیادہ عرصہ نہیں گذرا جبکہ زمانہ حال کے بعض مشہور سائنسدانوں میں اس سوال پر بحث چھڑ گئی تھی۔ سر آلیور لاج اور پروفیسر شیفر نے اس بارے میں اخبار ٹائمز میں متعدد مضامین شائع کرائے تھے اور ڈاکٹر بیسٹین نے اسپر ایک کتاب لکھنے کے علاوہ ہفتہ وار اخبار "نیچر" میں بعض نہایت اہم آرٹیکل شائع کئے تھے۔ اس بحث کے دوران میں یہ امر بطریق احسن واضح کر دیا گیا تھا کہ اگر اس قسم کے مادوں کو جنہیں عام طور پر اگر کھلا چھوڑ دیا جائے تو ان میں لاانتہا کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں، اگر کافی طور سے ابالا جائے اور اس کے بعد ایسے طریق پر محفوظ رکھا جائے کہ وہ ہر قسم کی خارجی چھوت سے بچے رہیں تو پھر ان میں کیڑے، مچھر، جراثیم غرض کچھ بھی نہیں پیدا ہوتا۔ دلیل یہ ہے کہ اس مادہ میں جراثیم حیات پہلے سے موجود تھے جب اُسے ابالا گیا تو وہ تلف ہو گئے اور اب اس وقت تک کہ مادہ بالکل بے جان پڑا رہے گا جب تک کہ خارجی طور پر اس میں جاندار مادہ نہ پہنچایا جائے۔ پس ثابت ہوا کہ ہستی کا خود بخود ظہور میں آنا محض غلط خیال ہے ہستی کی ابتدا کسی موجودہ ہستی ہی سے ہو سکتی ہے۔

ان مباحثات کو یہیں چھوڑ کر آؤ اب ہم ذرا یہ دیکھیں کہ علمائے قدیم کی اس بارے میں کیا رائے تھی؟ آج تقریباً ڈیڑھ سو سال کا عرصہ گذرتا ہے کہ اپنے زمانہ کے مشہور سائنسدان عمانوئیل کینٹ نے نظریۂ سحابیہ کو دنیا کے روبرو پیش کیا تھا۔ اس نظریہ کا منشا یہ ہے کہ نظام شمسی کا آغاز گیس کے ایک بادل سے ہوا تھا۔ جب اس دھندلے بادل میں سے زمین اپنی ابتدائی حالت میں ہٹ کر اپنے موجودہ مقام پر سرد ہونے لگی تو اسکے بعد ایک زمانہ ایسا آیا کہ پانی جو اس وقت تک گرم ہوائی

مین بخارات کی صورت مین موجود تھا اس پر طبع صورت اختیار کرکے آگرا اور وہی سمندر رہنا۔ اس نظریہ کو پیش خیال رکھتے ہوے مشہور معروف کونٹ ڈمی لفن نے رائے ظاہر کی تھی کہ ہستی کی ابتدا شاید سمندرون بلکہ قطبی سمندرون مین ہوئی تھی کیونکہ سب سے پہلے وہی سرد ہوے ہون گے۔ ابھی زیادہ عرصہ نہین گذرا کہ ایک ملتہ اس فرانسیسی نے کہا تھا کہ بدن انسانی مین نمک کا جو جز پایا جاتا ہے وہ در اصل اسی بات کی یادگار ہے کہ اسکے اسلاف کی پیدائش سمندر سے ہوئی تھی جس کا پانی کھاری ہوتا ہے۔

کینٹ کے بعد ہربرٹ اسپنسر نے ارتقاے عالمگیر کا نظریہ قائم کیا جو ایجال کے تمام سائنٹیفک عقائد کی کنجی ہے۔ مگر اس نے بھی ابتداے حیات کے بارے مین یہی رائے ظاہر کی کہ ہستی کا آغاز جاندار مادہ ہی سے ہو سکتا ہے بے جان مادہ کبھی ارتقا حاصل کرکے جاندار نہین بنتا۔

چارلس ڈارون نے جب قدرتی انتخاب کے ذریعہ سے پودون اور حیوانات کی اقسام کی ابتدا کا امکان ثابت کیا تو اس نے یہی فرض کر لیا تھا کہ شروع مین جاندار مادہ کی "بعض سادہ صورتین" موجود تھین۔ ان کی ابتدا کا مسئلہ چونکہ اسکے دائرہ بحث سے خارج تھا اس لیے اس نے اس پر کبھی رائے زنی نہین کی۔

پروفیسر ہیکل نے ابتداے حیات کے متعلق کاربن کا نظریہ قائم کیا تھا مگر اسکے بعض ایسے ماحون کے سوا جو علمی معاملات مین کوئی مستند رائے نہین رکھتے، کبھی کسی شخص نے اسکے خیالات کی تائید نہین کی اور آخر کار اس کو یہی ماننا پڑا کہ بحالات موجودہ بے جان مادہ سے جاندار کی ابتدا نہین ہو سکتی۔

سوال کا دوسرا رخ

سطور بالا مین جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے دو باتین واضح ہوتی ہین۔ ایک تو یہ کہ اگر کسی رقیق مادہ کو ابالا جائے تو اس کے اندر غیر معین عرصہ تک جراثیم پیدا نہین ہون گے اور دوسرے یہ کہ آجتک کوئی بڑے سے بڑا سائنسدان بھی آلات و مرکبات کی مدد سے ادنےٰ سے ادنےٰ قسم کا جاندار مادہ تیار نہین کر سکا ہے کیمیا ترکیبی کے بانی موسیو برتھلوٹ کو سب سے کامیاب ہے گو وہ بھی صرف اتنا کر سکے ہین کہ لاکھون جتن کرکے بیضہ سادہ قسم کا پروٹیڈ یا البومن وار مادہ تیار کر لین اور وہ بھی اس قسم کی متنوع حرارتون کی مدد سے جس کا نظام فطرت مین ظہور پذیر ہونا غیر ضروری ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اگر کسی ایسے مرکب کو جس مین بالعموم پڑا رہنے سے کیڑے نظر آنے لگتے ہون پاسٹیور یا برکفیلڈ کے طرز الیوان پر فلٹر کیا جاے اور اسطرح اسکے اندر سے باریک ترین قسم کے جاندار مادے جدا کر دیے جائین تو ہمین اسوقت تک کسی قسم کے جراثیم پیدا نہین ہوتے جب تک کہ خارجی قوت اثر پذیر نہو اس حد تک اس نظریہ کی پورے طور پر تصدیق ہوتی ہے کہ ہر قسم کی ہستی ہستی سے پیدا ہوتی ہے۔ مگر انصاف چاہتا ہے کہ تصویر کا دوسرا رخ بھی واضح طور پر دکھایا جائے اور اس کے بعد اس بارے مین کوئی خاص رائے قائم کرنے کی کوشش کیجائے۔

چالیس سال کا عرصہ گذرتا ہے کہ ڈاکٹر چارلٹن بیسٹین (ایف۔ آر۔ ایس) جو ہستی کے خود بخود ظہور پذیر ہونے کے قائل ہین اس بحث مین بظاہر مغلوب ہو گئے تھے لیکن حقیقت مین اُنھون نے اپنی بہت سی مصروفیتون کے باعث اس بحث مین حصہ لینا چھوڑ دیا تھا اور لوگ اُن کی خاموشی کو رضامندی پر محمول کرنے لگے تھے۔ انھون نے کئی اہم کتابین شائع کین جن مین بدست خود نہایت سے تصویرین کھینچکر دکھایا تھا کہ خورد بین کے ذریعہ سے مجھے بہت سی ایسی باتین معلوم ہوئی ہین جو مقبول عام نظریہ کے خلاف ہین۔ لوگ ان کی تحقیقات پر ہنسی اُڑاتے اور ان تمام معلومات کو اُنکے تخیل کی بلند پروازی سے منسوب کرتے تھے۔ اس وقت تو ڈاکٹر بیسٹین خاموش ہو رہے لیکن آخرکار پیرانہ سالی کے عرصہ سے پانچ سال پہلے یونیورسٹی کالج ہسپتال کے عہدہ پروفیسری سے مستعفی ہو کر اُنھون نے خورد بینی فوٹو گرافی کا مشکل کام سیکھا اور اس کے بعد کم و بیش پانچ ہزار اس قسم کی فوٹو کی تصاویر تیار کین جنکا تعلق کسی نہ کسی طرح آغاز حیات کے مسئلے سے تھا۔ اس اثنا مین اُنھون نے جو عجیب و غریب مشاہدات کیے ان کا حیرت خیز حصہ اس مضمون کی صورت مین قلمبند کیا گیا تھا جو انھون نے رائل سوسائٹی کے روبرو پیش کیا۔ لیکن انسان کی فطری کمزوریان بے جید تعصب بنا دیتی ہین۔ نہ صرف سوسائٹی نے اس مضمون کو سننے سے انکار کر دیا بلکہ اس کے ایک مشہور معروف ممبر نے تو حقیقت بھی گمانہ کی کرر ایل

سوسائٹی کی لائبریری میں دو قدم چل کر ڈاکٹر بیسٹیین کے تیار کردہ نمونوں کو دیکھ لیتا۔

اس سوال کے جواب میں کہ ابلے ہوئے یا فلٹر کیے ہوئے رقیق مادوں میں جراثیم سے خالی رہنے کی تاثیر کیوں پیدا ہو جاتی ہے، ڈاکٹر بیسٹیین کہتے ہیں کہ جاندار مادہ کی پیدائش کے لیے بعض مخصوص کیمیائی مرکبات کی موجودگی لازمی امر ہے۔ پھر اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ ابالنے کے عمل سے یہ مرکبات تلف ہو جاتے ہیں تو یہ امر صحیح نہیں سمجھا جا سکتا کہ جاندار مادہ یہاں عرق سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ اب حقیقت میں یہ امر مسلمہ ہے کہ ابالنے کے عمل سے اس رقیق مادہ کے کیمیائی مرکبات میں جسے ابالا گیا ہو تبدیلی یا انحطاط واقع ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی شخص اعتراض کرے کہ فلٹر کرنے سے تو ایسی تبدیلی یا انحطاط ظہور پذیر نہیں ہو سکتا لیکن تجربات سے ثابت ہو چکا ہے کہ فلٹر کرنے کا عمل بھی فلٹر شدہ عرق کے اندر کیمیائی تبدیلیاں پیدا کر دیتا ہے۔ پس ان تجربات سے ہستی کے خود بخود پیدا ہونے کے خیال کی مطلق تردید نہیں ہوتی۔ یہ ڈاکٹر بیسٹیین کی رائے ہے۔

یہاں تک تو منفی ثبوت تھا۔ اپنی تحقیقات کے مثبت نتائج کے بارے میں صاحب موصوف کا بیان ہے کہ انہوں نے مشاہدہ کرنے سے دیکھا گیا ہے کہ ایک بالکل شفاف عرق میں کچھ عرصہ بعد ذرا ذرا سے سیاہی کے داغ نظر آنے لگتے ہیں جو بتدریج بڑے ہو کر بیکٹیریا کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس تبدیلی کے مختلف مدارج کو پورے طور سے ظاہر نہیں کیا جا سکتا لیکن اگر خوردبین کے ساتھ سنیمٹوگراف کی تصاویر اتارنے کا آلہ لگا دیا جائے تو ایسا کرنا ناممکن نہیں ہے اور اس کے بعد کسی شخص کو ڈاکٹر بیسٹیین کی تحقیقات پر حرف گیری کا موقع نہ رہے گا۔

اس جگہ ڈاکٹر بیسٹیین کی ایک عجیب غریب عکسی تصویر کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جس میں ایک نہایت چھوٹے آبی جانور (CYCLPP) کے نخاع کو سات سو گنا بڑا کر کے دکھایا گیا ہے۔ اس نخاع کے اندر جس میں چھوٹے سے چھوٹا جاندار بھی داخل نہیں ہو سکتا، بتدریج اس قسم کے داغ نمودار ہونے لگتے ہیں جو انجام کار بیکٹیریا کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ نخاع کے اندر ان کی موجودگی کی صورتیں صرف دو ہو سکتی ہیں، یا تو یہ کہ وہ اس لحمی ریشہ میں بالکل ہی نئے پیدا ہوئے ہیں یا وہ ان بیکٹیریا کی نمودار صورتیں ہیں جو ایسی باریک ہوتی ہیں کہ خوردبین سے بھی نظر نہیں آتیں اور کسی طرح پر نخاع کے سخت پردوں سے ہو کر اندر داخل ہو جاتی ہیں لیکن جواب کی آخری صورت محض ایک مسلم مفروضہ ہے جس کی تصدیق کے لیے ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں اور کسی خالص ثبوت کی عدم موجودگی میں اپنی بات پر اڑے رہنا سائنس نہیں بلکہ ایک ضد ہے۔ جو لوگ اس نظریہ کی تردید کر سکتے ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ ایسے جراثیم کی ہستی ثابت کریں جو خوردبین کے ذریعے نظر نہیں آ سکتے اور یہ بھی واضح طور پر دکھائیں کہ وہ CYCLOPS نخاع میں داخل ہو سکتے ہیں۔

ڈاکٹر بیسٹیین کی ایک اور تیار کردہ عکسی تصویر میں آلو کی کوٹھڑیوں میں ایسے بیکٹیریا کے ارتقا کی صورتیں دکھائی گئی ہیں جن کے اجداد کے ان میں پہلے سے موجود ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ صحیح یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں بیکٹیریا ایک ایسے ریشہ کے اندر پیدا ہوتے ہیں جو پہلے ہی "آرگینک" ہے۔ لیکن اس سے کم از کم یہ تو ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ آج جو بیکٹیریا سطح زمین پر موجود ہیں وہ سب انھیں بیکٹیریا کی نسل نہیں ہیں جو کروڑوں سال پہلے یہاں موجود تھے اور یہ کہ قدرتی عمل ارتقا کے ذریعہ سے آج بھی یہاں اسی طرح جاندار مادہ پیدا ہو رہا ہے جیسے کسی زمانہ میں ہوا تھا۔

نتیجہ کیا نکلتا ہے

ڈاکٹر بیسٹیین کی اس تحقیقات سے کسی قدر مشابہ اور لارڈ کیلون کے نظریہ کے خلاف پروفیسر پکرنگ کی تحقیقات ہیں جنہوں نے معلوم کیا ہے کہ چاند پر سبزی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اب یہ امر مسلمہ ہے کہ چاند زمین سے اس وقت جدا ہوا تھا جب زمین اس قدر گرم تھی کہ اس پر کسی قسم کے جاندار مادہ کا قائم رہنا ناممکن تھا، اس لیے بقول پروفیسر پکرنگ چاند کی سطح پر یہ روئیدگی خود بخود پیدا ہو گئی ہے چونکہ عالم

مین اس قسم کی نباتات کی موجودگی محض بے مطلب ہو اس لیے قیاس لگتا ہو کہ وہ خالق کون و مکان کا فعل خاص ہو یقیناً غلطی ہو۔

اس مین شک نہین کہ جو کچھ ڈاکٹر ویسٹین کہتے ہین وہ خالص دہریت ہو کیونکہ اس سے اس ذات خالق کے اختیارات مین فرق آتا ہو جو تمام اشیا کو بنانے یا بگاڑنے کی طاقت رکھتی ہو مگر ان فریقین کے دلائل زبردست ہین اور ایک ثالث شخص کو سوائے سننے اور خاموش رہنے کے کچھ بن نہین آتا۔ وہ جس کا کھوج لگانے مین شیون جیسوں نے عمرین صرف کر دین اور جس کے لیے یا دنیاوی مذاہب نے سوائے اسکے چارہ نہ دیکھا کہ اپنے پیروؤن کی تسکین خاطر کیلئے چند غیر مصدقہ اصول قائم کر دین اور جس سائنس اسکا حقیقی سراغ چلانے سے عاجز ہو اور علوم کے دریا نے ہین صرف ایک پیا بھکے جانے کی قدرت رکھتے ہین جہان ہیچ کرے اختیار نظیر کا یہ شعر زبان سے نکل جاتا ہو ~

پڑے بھٹکتے ہین لاکھون دانا کروڑون پنڈت ہزارون سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتین خدا ہی جانے

(ترجمہ) تیرتھ رام

العصر

کرۂ ہوائی کے متعلق دلچسپ معلومات

تمہید

عالم ارضیات۱؎ اور ہیئت دانون کا متفق علیہ قیاس ہے کہ یہ زمین جس پر ہم بستے ہین خلا مین معلق ایک کرہ ہے، جو وقتِ معینہ پر ایکدفعہ اپنے محور پر گھومتی، اور آفتاب کے تجاذب سے سال مین ایک دفعہ آفتاب کے گرد چکر لگاتی ہے۔ اسکا اندرونی حصہ مرکز کے قریب غالباً مائع اور سیال ہے، لیکن سطح پر اور سطح سے بہت دور اندر کی طرف پتھرون اور چٹانون کی ایک موٹی ٹھوس تہ "کرسٹ" (Crust) مائع اور سیال مادہ کے انجماد سے پیدا ہو گئی ہے۔ اسکی سطح کے بعض حصص تو خشک ہین لیکن اکثر حصون کے اوپر پانی کے بخارات نے ٹھنڈے ہوجانے کی وجہ سے سمندر۳؎ کی شکل اختیار کرلی ہے۔ سطح زمین کے اوپر کئی میلون کی اونچائی تک ہوا۴؎ کا ایک وسیع اور عمیق سمندر ہے، اور اس سے ادھر فضائے بسیط مین "ایتھر" کا بحرِ بیکران ہے۔

۱؎ نوٹ: جیآلوجسٹ (Geologist) یعنی عالمانِ علم طبقات الارض نے جیآلوجی (Geology) کا ترجمہ امادۂ ارضیات کیا ہے۔ انگریزی زبان مین تمام علوم کے نام ایک ہی طرز پر وضع کئے گئے ہین، مثلاً زوآلوجی، عرقی آلوجی، سوشی آلوجی، وغیرہ تمام جدید علوم اسی طرز پر پکارے جاتے ہین۔ قدیم علوم مثلاً فزکس یا باٹنی وغیرہ مستثنیات ہین۔ کیا ہی اچھا ہو اگر اردو مین بھی سوا ان علوم کے جن کے نام پہلے سے وضع ہو چکے ہین یا اب شکل سے وضع ہوگئے

۲؎ اس بحث کے متعلق ہم ایک جداگانہ مضمون مین تفصیل کے ساتھ بحث کرینگے۔ دُنیا مین بہترین گھڑی مرورِ وقت کے اندازہ کے لیے زمین کی گردش لیل و نہار سمجھی جاتی ہے لیکن فی زمانناسائنس کی حیرت انگیز ترقی نے یہ ثابت کردیا ہے کہ زمین کی روزانہ گردش کا وقت بڑھ رہا ہے۔ گویا ایک شبانہ روز کا عرصہ موجودہ زمانے مین آج سے چند ہزار صدیان پہلے سے چند ایک دقیقہ کی مقدار سے لمبا ہے۔ بالفاظ دیگر ہمارے دن رات لمبے ہو رہے ہین لیکن سال اسی تناسب سے چھوٹا ہو رہا ہے۔

۳؎ کرۂ آبی ہائڈروسفیر Hydrosphere

۴؎ کرۂ ہوائی = Atmosphere

۱۔ کرۂ ہوائی کرۂ زمین کا ایک جزو لاینفک ہی

زمین اپنی سالانہ گردش مین ۱۹ میل فی ثانیہ یا تقریباً ۶۶ ہزار میل فی گھنٹہ کی حیرت انگیز رفتار سے حرکت کرتی ہی۔ لیکن کرۂ ہوائی بعینہٖ اسیطرح زمین کے ساتھ متصل رہتا ہی جسطرح ہم سطح زمین پر رہتے ہین۔ اسی طرح کرۂ ہوائی کرۂ زمین کے ساتھ زمین کی یومیہ گردش مین بھی متصل رہتا ہی۔ زمین کا محیط تقریباً ۲۵ ہزار میل ہی۔ لہذا خط استوا کے قریب کرۂ ہوائی کے وہ حصے جو سطح زمین سے قریب ہین ساڑھے دس سو میل فی گھنٹہ یا ۱۸ میل فی منٹ کی رفتار سے گھومتے ہین' اور وہ حصے جو عرض بلد ۳۰ کے قریب ہین ۹۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھومتے ہین' اور وہ حصے جو عرض بلد ۶۰ کے قریب ہین سوا پانچ سو میل فی گھنٹہ یا ۹ میل فی منٹ کی رفتار سے گھومتے ہین۔ بعض حضرات غلطی سے یہ خیال کرتے ہین کہ کرۂ ہوائی زمین کی روزانہ گردش مین شامل نہین ہوتا بلکہ زمین اُس کے نیچے اسطرح پھسلتی رہتی ہی جسطرح ایک متحرک جسم دوسرے ساکن جسم کے نیچے حرکت کرتا ہی۔ وہ یہ خیال نہین کرتے کہ کشش زمین جسکی بدولت باقی تمام مادی اجسام زمین کے ساتھ حرکت کرتے ہین ہوا پر بھی بحیثیت ایک مادی جسم ہونے کے اسی طرح عمل کرتی ہی اور زمین کے ساتھ کرۂ ہوائی اسیطرح گردش کرتا ہی جسطرح ایک متحرک صندوق کے ساتھ اسکے اندر کی چیزین حرکت کرتی ہین۔ ایسی مثالون مین ایک بڑی مشکل یہ ہوتی ہی کہ الفاظ کے مفہوم کو غلط طور پر محدود کردیا جاتا ہی۔ اس بحث مین سطح زمین کے اوپر کرۂ ہوائی اور دیگر مادی اجسام کی وہی حالت ہی جو ہماری مثال مین صندوق کے اندر کی چیزونکی ہی

(بقیہ صفحۂ گذشتہ) تبدیل کیے جاسکتے ہین تمام نئے نام "ارضیات" کے وزن پر یعنی "یات" کی آواز پر ختم ہون مثلاً علم ادب کو ادبیات' علوم طبعی کو طبعیات' کانونکے علم کو معدنیات' علم کیمیا کو کیمیات' علم نباتات کو نباتیات وغیرہ نام دیئے جائین۔ ہماری زبان مین علمی ترقی کے لوازمات مین سے ایک یہ بھی ہی کہ اصطلاحات علمی مناسب طریقہ پر وضع کی جائین۔ میرا مدعا ہرگز یہ نہین ہی کہ موٹے موٹے عربی کے الفاظ اُردو لغت مین شامل کیے جائین؛ مین صرف بہترین یکجہتی کا حامی ہون۔ انگریزی زبان کی علمی اصطلاحات مین کیسی عمدہ اور قابل تعریف یکجہتی ہی۔ کیمیات یعنی Chemistry کے متعلق علمی کتب کا اُردو مین ترجمہ کرنا تقریباً محال ہی' تاوقتیکہ جیسی یکسان اصطلاحات (Nomenclature) انگریزی زبان مین کیمیائی مرکبات کے لیے وضع ہین اُردو مین بھی وضع نہ کیجائین۔ ایک اور گزارش جو مین العصر کی علمی تحریک سے فائدہ اُٹھا کر علم دوست اصحاب کی خدمت مین پیش کرنا چاہتا ہون' وہ یہ ہی کہ تمام علمی آلات Scientific Instruments کا نام اُصول متذکرہ صدر کے مطابق اُردو لغت مین یکسان وضع کرنا چاہیے۔ مثلاً آلات بالعموم دو قسم کے ہوتے ہین۔ ایک وہ جن کے نام کا آخری حصہ اسکوپ (—scope) ہوتا ہی اور دوسرے وہ جن کے نام کا آخری حصہ میٹر (—meter) ہوتا ہی۔ میٹر والے آلات وہ ہوتے ہین جن کی مدد سے مختلف چیزونکا صحیح طور پر اندازہ کیا جاتا ہی۔ برعکس اس کے اسکوپ والے آلات صرف چیزون کے باہمی تعلقات عام طور پر دکھانے کے لیے استعمال ہوتے ہین۔ میرے نزدیک اگر ان آلات کا ترجمہ "پیما" کی مدد سے کیا جائے تو نہایت موزون ہوگا۔ مثلاً ایلکٹرومیٹر Electro-meter "برق پیما" ایلکٹراسکوپ Electro-scope "برق نما" وغیرہ۔ ایک تیسری قسم کے آلات جو حال ہی مین مروج ہوئے ہین خود بخود بغیر کسی بیرونی مدد کے اپنے نشانات لکھتے جاتے ہین۔ ایسے آلات حوالہ دینے کے لیے نہایت مفید اور کارآمد ہین۔ انکی صفت سیلف ریکارڈنگ ہی جسکا صحیح ترجمہ "خود نویس" ہوسکتا ہی۔ ایسے آلات بالعموم گراف —graph پر ختم ہوتے ہین۔ مین تجویز پیش کرتا ہون کہ انھین نویس کہا جائے۔ مثلاً تھرموگراف Thermograph جو تکرار آب و ہوا مین استعمال ہوتے ہین "حرارت نویس" کیے جائین۔ فقط۔

جس طرح متحرک ہونے کے لیے صندوق اور اس کے اندر کی چیزین ایک جسم کا حکم رکھتی ہین اسطرح تجاذب مادی[1] کی بدولت زمین کرۂ ہوائی اور تمام مادی اجسام جو زمین کی کشش کے احاطۂ اثر مین داخل ہین زمین کی روزانہ اور سالانہ گردشون مین ایک جسم ایک حکم رکھتے ہین یہانتک کہ ہمارا چاند جو زمین سے تقریبًا ۲ ۱/۴ لاکھ میل کے فاصلے پر ہو اسی طرح زمین کی مختلف حرکتون مین حصہ لیتا ہو جسطرح ہم اور تم جو کہ سطح پر رہتے ہین یا قصہ کہانیون کا سمندر جو زمین کی اندرونی چٹانون کے پتھرون کے اندر جاگزین ہو۔ اگر بفرض محال ایک لمحہ کے لیے یہ مان لیا جائے کہ کرۂ ہوائی زمین سے کم از کم اسکی روزانہ حرکت کے لحاظ سے علیحدہ ہو تو ایک غبارہ باز یا ہوا مین اڑنے والے جانور اگر صبح کو ہندوستان کی زمین سے ہوا مین اڑنا شروع کرے تو تقریبًا بارہ گھنٹہ کے بعد شام کے وقت وسطی امریکہ یعنی میکسیکو وغیرہ کی زمین پر اتر سکتا ہے!!!

متقدمین زمین کی روزانہ گردش کے قائل نہین تھے۔ منجملہ دیگر غلط اعتراضات کے جو وہ روزانہ گردش کے خلاف پیش کرتے تھے ایک اعتراض اسی نوع کا تھا جس کے متعلق ہم ابھی بحث کر چکے ہین۔ وہ کہتے تھے کہ اگر زمین ورحقیقت ایک دفعہ گھومتی ہو تو جیسا اوپر ذکر کیا گیا ہو خط استوا اور اسکے قرب وجوار کے ممالک مین ہمیشہ اتنے زور کی آندھی چلنی چاہیے کہ درخت جڑ سے اکھڑ جائین اور مکانات مسمار ہو جائین اس لیے کہ وہان ہوا کی رفتار زمین کے مقابلے مین ۱۰۴۰ میل فی گھنٹہ ہو گی۔ بالفاظ دیگر ان کا اعتراض یہ تھا کہ زمین تو ۱۰۴۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آگے بڑھیگی لیکن ہوا جو زمین کی حرکت مین کوئی حصہ نہین لے رہی زمین کی اشیا کے اوپر اسی رفتار کے ساتھ رگڑ کھاتی رہیگی۔ زمانۂ حال مین تجاذب مادی کے مسئلہ کو سمجھ لینے کے بعد اس قسم کے جملہ اعتراضات خود بخود رفع ہو جاتے ہین۔

۲۔ ہوا مین مد و جزر۔ ہوائی جہاز رانی کا مسئلہ

زیادہ تر چاند کی کشش سے اور ایک تھوڑی حد تک سورج کی کشش سے سمندر مین دو دو دفعہ مد و جزر ہوتا ہو۔ پانی کا جو حصہ چاند کے مقابل آتا ہو وہ چاند کی طرف کھنچ جاتا ہو۔ نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ بندرگاہ مین ہر ۲۴ گھنٹہ مین سمندر کا پانی دو دو دفعہ اونچا چڑھتا ہو اور دو دو دفعہ معمول سے کم نیچے ہو جاتا ہو۔ جب سورج اور چاند کی کشش ایک ہی سمت مین اثر کرتی ہو تو بڑے جوار بھاٹے پیدا ہوتے ہین اور جب ان کی کشش مخالف سمتون مین اثر کرتی ہو تو معمول سے چھوٹے مد و جزر ہوتے ہین۔ سطح زمین کے نزدیک ایک بہت موٹی ٹھوس تہ ہونے کا ایک بدیہی ثبوت یہ ہو کہ سمندر مین مد و جزر ہوتا ہو۔ اگر یہ تہ کم گہری ہو تو چونکہ پانی کے ساتھ نیچے سے سمندر کی تہ بھی اوپر کی طرف کھنچی آئے مد و جزر ایسے نمایان نہ ہون۔ قیاس کیا جا سکتا ہو کہ چاند اور سورج کی کشش سے کرۂ ہوائی مین بھی سمندر کی طرح مد و جزر ہوتا ہو گا۔ بہت سے سائنس دان علمی طریقے پر ہوائی مد و جزر کی تحقیقات مین مصروف ہین کیونکہ ہوائی مد و جزر نہ صرف علمی حیثیت سے دریافت طلب ہو بلکہ اب جبکہ ہوائی جہاز دن بدن زیادہ استعمال کیے جا رہے ہین اسکی ضرورت اور زیادہ ہو گئی ہو کرۂ ہوائی مین مد و جزر کے یہ معنی ہین کہ ہوائی جہاز رانون کو ملاحون کی طرح ہوائی مد و جزر کے اوقات کا خیال رکھنا لازم ہو گا۔ ہان چونکہ ہوائی سمندر ہماسوائے

---

[1] تجاذب مادی سے مراد نیوٹن کا وہ عالمگیر قانون یعنی Law of Univereal Gravitation ہو جس کے مطابق عالم مین مادہ کا ہر ایک ذرہ باقی تمام مادی ذرات کو اپنے مرکز کی طرف کھینچتا ہو۔

صرف چند ایک رکاوٹون کے جو بلند پہاڑونکی وجہ سے اس کی عالمگیر یکسانیت مین واقع ہوئی ہین مدوجزر کے لیے وسط سمندر کا جہان پانی کی سطح کا نشیب وفراز بندرگاہون سے کہین کم ہوتا ہو حکم رکھتا ہو اور دوسرے ہوا پانی سے کئی سو گنا ہلکی ہو کرۂ ہوائی مین مدوجزر کی وہ شدت نہین ہوتی جو تنگ بندرگاہون مین ہوتی ہو یہی وجہ ہو کہ آج تک اس صیغۂ علم کی طرف کچھ زیادہ توجہ نہین کیگئی اور مقیاس الہوا مین پارے کے اوپر نیچے ہونیسے ہوائی مدوجزر کا پتہ نہین لگ سکتا جب تک زیادہ نازک طریقے اختیار نہ کیئے جائین گے یہ مسائل ایک بڑی حد تک علمی حیثیت سے راز سربستہ رہین گے۔

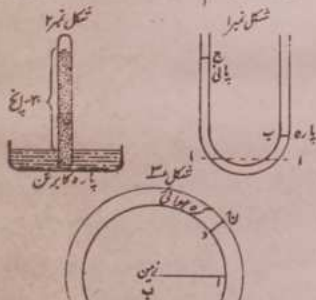
۳۔ ہوا کے اعلیٰ طبقات کے دلچسپ حالات

کرۂ ہوائی کے متعلق جدید ترین معلومات اس کے طبقات اعلیٰ کے حالات کی مفصل دریافت ہو۔ غبارہ کے ذریعہ سے آدمی زیادہ سے زیادہ پانچ میل کی بلندی تک جا سکتا ہو۔ دُنیا مین سب سے اونچا پہاڑ بھی تقریبًا پانچ میل بلند ہو لیکن ان پانچ میلون کی بلندی کا حال بھی ان طریقون سے وسیع طور پر فی الحال معلوم نہین ہو ہان حال ہی مین ایک نیا طریقہ ایجاد ہوا ہو جس سے ۱۰ میل کی بلندی تک کے حالات معلوم کیئے گئے ہین۔ اس سے پیشتر کہ ہم ان دلچسپ معلومات کا مفصل ذکر کرین ہم موازنہ کی خاطر کرۂ آبی اور کرۂ ہوائی کا مختصر سا مقابلہ کرتے ہین۔

جس طرح مچھلیان اور دوسرے آبی جانور پانی کے سمندر مین رہتے ہین اسی طرح انسان اور خشکی پر رہنے والے حیوانات ہوا کے ایک سمندر مین رہتے ہین جو پانی کے سمندر سے کیا بلحاظ وسعت اور کیا بلحاظ گہرائی کے ہر طرح سے بڑا ہو۔ سطح زمین کا صرف ایک چوتھائی حصہ خشک ہو جو عرف عام مین ربع مسکون کے غلط نام سے مشہور ہو۔ باقی تین چوتھائی حصہ پانی کے سمندرون سے گھرا ہوا ہو گویا سمندر کی وسعت سطح زمین کے مجموعی رقبہ کی تقریبًا تین چوتھائی کے برابر ہو۔ لیکن کرۂ ہوائی کے متعلق یہ امر دلچسپی اور افادہ سے خالی نہین کہ سطح زمین کا ایک چپہ بھر حصہ تو ایک طرف ایک ذرہ بھی ایسا نہین جسے کرۂ ہوائی احاطہ کیئے ہوئے ہو اور جس کے اردگرد ہوا کے سمندر کی لہرین ہر وقت جاری وساری نہ ہون۔ بالفاظ دیگر رقبہ کے لحاظ سے کرۂ ہوائی سطح زمین کی وسعت کے بالکل برابر ہو اور ایسا ہونا ہی ضروری ہو اسلئے کہ پانی کے بغیر انسان کچھ دن تک زندہ رہ سکتا ہو لیکن اگر ہوا ایک لمحہ نہ ملے تو جان بلب ہو جاتا ہو۔ زیست کے لیے ہوا سب سے پہلی ضرورت ہو ہان اگر ہماری خلقت موجودہ سے بالکل مختلف ہوتی تو غالبًا صانع قدرت ہمین اسقدر ہوا کا محتاج نہ بناتا۔

۴۔ کرۂ ہوائی کا مجموعی وزن نیچے وزن سے سوس لا کھ کم ہو

یہ اندازہ آسانی کے ساتھ یون لگایا جا سکتا ہو۔ اگر انگریزی حرف یو U کی شکل کی ایک شیشے کی نلی لیجائے اور اس مین پانی یا پارہ یا اور کوئی ایک مائع جسم ڈالدیا جائے تو دونون بازو مین مائع کی



سطح ایک جتنی بلندی پر ہوگی لیکن ایک بازو مین پارہ اور دوسرے

مین پانی ڈالا جائے تو پانی کی سطح ج کی بلندی خط مستقیم ۱۰۰۱ سے اوپر پارہ کی سطح ب کی بلندی خط ۱۰۰۱ سے اوپر کی نسبت تقریباً ۱۳½ گنا زیادہ ہوگی اسلئے کہ پارہ پانی سے ۱۳½ گنا زیادہ بھاری ہو۔ دوسری شکل مین ایک شیشہ کی نلی پارہ سے بھر کر پارہ کے برتن مین الٹی کھڑی کی گئی ہو۔ نلی مین پارہ برتن کے پارہ کی سطح سے ۳۰ انچ اونچا کھڑا ہوتا ہو۔ یو شکل کی نلی والے تجربون سے فائدہ حاصل کر کے آپ کہہ سکتے ہین کہ یہان بھی ایک یو شکل کی نلی ہو جسکا ایک بازو دکھائی نہین دے رہا اس لیے کہ اسمین ہوا بھری ہو اور دوسرے بازو مین پارہ بھرا ہو۔ گویا ۳۰ انچ لمبی پارہ کی نلی ہوا کی ایک غیر مرئی لمبی نلی کے وزن کی وجہ سے پارہ کی بیرونی سطح سے (جس پر ہوا کے وزن کا دباؤ اثر کر رہا ہو) اوپر کھڑی ہو بعینہ اسیطرح جسطرح شکل اول مین پانی کی ایک ۱۳½ گنا لمبی نلی پارہ کی ایک چھوٹی نلی کو سہارا دیئے ہوئے ہو۔ ان تجارب کی بنا پر ہم فوراً کرۂ ہوائی کی بلندی کا اندازہ لگا سکتے ہین بشرطیکہ کرۂ ہوائی نیچے سے اوپر تک ایک جتنا کثیف ہو۔ اس شرط کو صحیح مان کر یکسان کثافت کی ہوا کے کرہ کی بلندی چونکہ پارہ ہوا سے دس ہزار گنا بھاری ہو ۳۰ + ۱۰۰۰۰ انچ یعنی تقریباً پانچ میل نکلتی ہو لیکن چونکہ ہوا جون جون ہم اوپر چڑھتے جائین لطیف ہوتی جاتی ہو کرۂ ہوائی کی اصلی بلندی کا اندازہ تمام ان باتون کا لحاظ کر کے تقریباً پینتالیس میل لگایا گیا ہو۔ اس علم کے ساتھ ہم کرۂ ہوائی کے وزن کا تناسب زمین کے وزن کے ساتھ تیسری شکل کی مدد سے معلوم کر سکتے ہین۔ زمین کی کثافت اضافی پانی کے مقابلے مین ۵½ ہو بالفاظ دیگر اگر زمین کا حجم رکھنے والے پانی کے پانچ کو اکٹھے کئے جائین تو ان کا مجموعی وزن زمین کے وزن سے کچھ کم ہوگا اب اگر آپ ایک کعب فٹ پانی کا وزن جانتے ہین تو زمین کا وزن ان اعداد سے بآسانی نکل سکتا ہو۔ زمین کا حجم $\frac{۴}{۳} + \frac{۲۲}{۷} \times (۴۰۰۰)^{۳}$ مکعب میل ہو۔ کرۂ ہوائی کا وزن دریافت کرنے کے لیے ہم مقیاس الہوا کی نلی (شکل دوم) کو پھر استعمال کرینگے ہمکو کرۂ ہوائی کی بلندی بالکل صحیح طور پر معلوم نہین ہو لیکن یہ معلوم ہو کہ تمام کرۂ ہوائی کا بوجھ پارہ کی ۳۰ انچ گہری تہ کے بوجھ کے برابر ہو پس شکل ۳ مین آپ یون سمجھئے کہ بجائے زمین کے گرد ۴۵ میل گہری ہوا کی ایک تہ ہونے کے پارہ کی ایک ۳۰ انچ گہری تہ ہو جس کا حجم تقریباً $۴ + \frac{۲۲}{۷} \times (۴۰۰۰)^{۲} \times \frac{۳۰}{۳۶ + ۱۷۶۰}$ مکعب میل ہو۔ پارہ پانی سے ۱۳½ گنا زیادہ بھاری ہو اور زمین پانی سے ۵½ گنا بھاری ہو اس لیے کرۂ ہوائی کے وزن کو زمین کے وزن سے وہی نسبت ہو جو $۴ + \frac{۲۲}{۷} \times (۴۰۰۰)^{۲} + \frac{۳۰}{۳۶ + ۱۷۶۰} + \frac{۲۷}{۲}$ کو $\frac{۴}{۳} + \frac{۲۲}{۷} + (۴۰۰۰)^{۳} + \frac{۱۱}{۲}$ سے ہو یا ایک کو دس لاکھ سے۔ المختصر کرۂ ہوائی کا مجموعی وزن زمین کے وزن سے دس لاکھ گنا کم ہو۔

۵۔ ہوا کا دباؤ

بہت سے حضرات متعجب ہون گے کہ اگر فی الواقع ہوا کا اتنا بوجھ ہو اور ہم ہوا کے بوجھ کے نیچے ہین تو پھر کیون ہم اس دباؤ کو محسوس نہین کرتے۔ بات اصل مین یہ ہو کہ ہوا کا دباؤ ہمارے اندر باہر جار بدن مین مسامات وغیرہ کی وجہ سے دونون طرف برابر ہو اور اس لیے اس کا مجموعی اثر ہمارے بدن کے اوپر صفر محض یعنی کالعدم ہو۔ اگر ایسا نہوتا تو چونکہ فی مربع انچ ہوا کا دباؤ تقریباً ۶⅕ سیر ہو اور تخمیناً ہمارے جسم کی بیرونی سطح کا رقبہ ۶٫۵ ہزار مربع انچ ہوتا ہو ہمارے جسم پر کچھ کم سوا چالیس ہزار سیر یا دس ہزار پانچ سو من کے دباؤ سے ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ لیکن تعجب ہوتا ہو کہ کس عمدگی کے ساتھ ہم ہوا کے حیرت انگیز دباؤ سے بالکل بے خبر ہین اور اسے کبھی محسوس تک نہین کرتے۔ (پانی چونکہ ہوا سے تقریباً ساڑھے آٹھ سو گنا بھاری ہو اگر ہم پانی کی سطح سے ۳۴ فٹ نیچے جائین تو ہمارے جسم پر اتنا ہی دباؤ

پڑتا ہی جتنا کہ کرۂ ہوائی کے بوجھ سے پڑ سکتا ہی۔ اب آپ خیال فرمائیے کہ اُن آبی جانورون کی ہڈیان اور تمام جوارح کس قدر مضبوط ہونگے جو سطح سمندر سے ہزارون فٹ نیچے نشو و نما پاتے ہین!!! اگر ایک شیشے کے برتن مین مخراج الہوا کی مدد سے ہوا کا اکثر حصہ خارج کر دیا جائے اور شیشہ کافی مضبوط نہ ہو تو ہوا کے دباؤ کا اثر برتن کے ٹوٹ جانے مین آسانی کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہی۔ اگر ہمارے جسم بھی شیشے کی طرح غیر مسامدار ہوتے اور ان کے آر پار ہوا نہ گذر سکتی تو نہایت سختی کے ساتھ ہمکو ہوا کے دباؤ کا یقینی احساس ہوتا۔ لیکن چونکہ ہوا ہمارے جسم کے اندر باہر آسانی سے گذرتی ہی اس لیے نتیجہ ہمارے حق مین حد درجہ مفید ہی۔

۱۰۶- اسٹریٹو سفیر یا کرۂ زمہریر

کرۂ ہوائی کے متعلق ایک دلچسپ امر جو متعدد اور مختلف تجارب اور مشاہدات کی بنا پر معلوم ہوا ہی یہ ہی کہ تقریباً چھ میل کی بلندی تک ہوا کا درجۂ حرارت تین سو فٹ کی بلندی کے لیے ایک درجۂ فارن ہیٹ کم ہوتا چلا جاتا ہی۔ لیکن چھ میل کی بلندی سے اوپر درجۂ حرارت مین کوئی کمی واقع نہین ہوتی یہانتک کہ ۱۰ میل کی بلندی تک ایک ہی درجۂ حرارت ہوتا ہی۔ اس لحاظ سے کرۂ ہوائی دو حصون مین منقسم ہو جاتا ہی۔ ایک تو وہ حصہ جو سطح سے لگا ہوا تقریباً چھ میل کی بلندی تک اوپر جاتا ہی اور جس مین ہوا کا درجۂ حرارت بلندی کے ساتھ کم ہو جاتا ہی اور فی میل ۱۸ درجہ فارن ہیٹ کم ہوتے ہوئے انتہائی حد پر صفر سے تقریباً پچاس درجہ فارن ہیٹ نیچے یعنی منفی ۵۰ فارن ہیٹ ہو جاتا ہے۔ اِس حصے کو کرۂ حرارت (ٹراپو سفیر Troposphere) کے نام سے تعبیر کرتے ہین۔ دوسرے حصے کو اسٹریٹو سفیر (Stratosphere) کہتے ہین ہم اسکو کسی خاص صحیح نام سے اُردو مین تعبیر نہین کر سکتے سہولت کے لیے مین نے جلدی سے اسکے لیے کرۂ زمہریر استعمال کر لیا ہی ہوا کے اس اعلیٰ طبقہ کا عجیب خاصہ یہ ہی کہ اس مین درجۂ حرارت میلون تک یکسان رہتا ہی۔ شروع مین خیال کیا گیا تھا کہ اس طبقے کا درجۂ حرارت بدلتا نہین ہی اور اسے طبقۂ مساوی حرارت کہتے تھے لیکن بعد کے تجارب نے ثابت کر دیا ہی کہ سطح زمین پر مختلف مقامات کے اوپر یہ طبقہ مختلف بلندیون پر شروع ہوتا ہی بلکہ اسکا اصلی درجۂ حرارت بھی مختلف ہوتا ہی۔ علاوہ ازین ایک ہی مقام کے اصلی درجۂ حرارت مین تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہی لیکن ان تمام اختلافات کے باوجود ایک امر جسکی وجہ سے یہ اعلیٰ طبقہ طبقۂ اسفل سے ممتاز ہی یہ ہی کہ جہان سے شروع ہوتا ہی اس کے پرے اوپر کیطرف پھر کوئی تبدیلی درجۂ حرارت مین واقع نہین ہوتی۔

یہ امر دلچسپی سے خالی نہوگا کہ ہوا کے اس اعلیٰ طبقہ اسٹریٹو سفیر کا مطالعہ کن ذرائع سے کیا گیا ہی۔ ہم اوپر ذکر کر چکے ہین کہ پہاڑون کی مدد سے یا انسانی غبارون کی مدد سے ہم زیادہ سے زیادہ بصد مشکل ۵ میل سے کم تک کی بلندی پر پہنچ سکتے ہین۔ ہوا کے اعلیٰ طبقات

۱؎ درجۂ حرارت کی پیمائش کے لیے یوروپ مین اور دوسرے ممالک مین جہان یوروپ کے علوم مروج ہین برف اور بھاپ کی درجۂ حرارت کے درمیانی وقفہ کو مختلف پیمانون کے مطابق تقسیم کیا جاتا ہی۔ فارن ہیٹ کا پیمانہ ان مین سے ایک ہی۔ اسکے مطابق جمتے ہوئے پانی یا برف کا درجۂ حرارت ۳۲ کہلاتا ہی اور کھولتے ہوئے پانی کی بھاپ کا درجۂ حرارت ۲۱۲۔ برف سے کم درجۂ حرارت کی پیمائش اسی حساب کے مطابق ہوتی ہی مثلاً ایک جسم کا درجۂ حرارت جو برف سے اتنا ہی زیادہ ٹھنڈا ہو جتنی کہ بھاپ بمقابلہ برف گرم ہی فارن ہیٹ کے پیمانے کے مطابق ۳۲ — ۱۸۰ یعنی منفی ۱۴۸ (منفی سے مراد صفر کے نیچے ہی) ہوگا۔ سنٹی گریڈ پیمانے پر برف اور بھاپ کی درجۂ حرارت کا وقفہ سو برابر حصون مین منقسم ہوتا اور ریومر مین اسی حصون پر۔ برف کا درجۂ حرارت ایک مین صفر سنٹی گریڈ اور دوسرے مین صفر ریومر کہلاتا ہی بھاپ کا درجہ ایک مین سو سنٹی گریڈ اور دوسرے مین ۸۰ ریومر کہلاتا ہی۔

کا مطالعہ زمانۂ حال سے شروع ہوتا ہی۔ سنہ ۱۸۶۲ عیسوی مین ایک من چلا
علم دوست یوروپ کا بیٹا گلیشر (Gleisher) اس امر کے درپے
ہوا اور ایک بہادرانہ کوشش کے بعد ۲۹ ہزار فٹ کی انتہائی بلندی
تک ہوائی سیر کر آیا۔ بیسوی صدی کے شروع تک اس کے بعد پھر
کوئی کوشش ہوا کے مطالعہ کی نہین کی گئی لیکن گذشتہ دس بارہ
سالو مین اپنے آپ کام کرنے والے آلات کی تکمیل کی وجہ سے یہ کام
از سرِ نو نہایت زورون کے ساتھ شروع ہی۔

سب سے زیادہ مفید چیز اس ضمن مین آزمائشی غبارہ (ساونڈنگ
بیلون یعنی Sounding Baloon) ہی جو کہ نہایت عمدہ کھچے
ربڑ کا بنا ہوا ہوتا ہی اور ہائیڈروجن گیس سے بھرا جاتا ہی صعود سے
پہلے اس کا قطر تقریباً ایک گز ہوتا ہی۔ جون جون غبارہ اوپر چڑھتا ہی
ہوا کے بیرونی دباؤ کے کم ہونے سے غبارہ کے اندر کی ہائیڈروجن گیس
پھیلتی جاتی ہی حتی کہ ایک خاص حد تک پھیلنے کے بعد غبارہ پھٹ
جاتا ہی اور نیچے گر پڑتا ہی۔ غبارہ کے اندر عام طور پر کم از کم دو آلات
ہوتے مین یعنی ایک آلۂ حرارت نویس جو خود بخود درجۂ حرارت کی پیمائش
کرتا ہی اور ایک کاغذ کے لمبے ٹکڑے پر ہر لمحہ ایک یادداشت لکھتا جاتا
ہی اسے انگریزی اصطلاح مین تھرموگراف (Thermograph)
کہتے مین۔ دوسرا ہوا کے دباؤ کی پیمائش کے لیے ہوتا ہی اور پہلے کی طرح
یہ بھی اپنا کام خود بخود کرتا ہی اور ایک کاغذ کے لمبے ٹکڑے پر یادداشت
لکھتا ہی اسے نقل نویس (بیروگراف Barograph) کہتے مین
ان دونو آلات کے مختصر مجموعہ کا نام میٹیروگراف Metereo graph
ہی کمال یہ ہی کہ میٹیروگراف کا مجموعی وزن ایک چھٹانک سے کم ہوتا ہی اور
اسی ہلکے پن کی وجہ سے غبارہ مع آلات دس بارہ پندرہ بلکہ بعض
اوقات ۲۰ میل کی بلندی تک اوپر چڑھ جاتا ہی۔ غبارہ کے اندر آلات کے
ساتھ ایک انعامی اشتہار ہوتا جس مین پانے والے کے لیے غبارہ اور
آلات کو حفاظت سے بند کر کے مالک کے پاس واپس بھیجنے کے لیے مفصل ہدایات
درج ہوتی ہین۔ اس ترکیب سے بہت سے غبارے اپنے فرض کی تکمیل کے بعد
اپنے مالک کے پاس پہنچ جاتے ہین۔ نہ صرف خشکی پر بلکہ سمندر مین بھی غبارہ کے
ضائع ہونیکا کم امکان ہی کیونکہ یوروپ جہان یہ سب علمی چرچے ہین وہان
کی ہوا مین بھی علم کی لہرین سرایت کر گئی ہین اور ہر پیر و جوان علمی شاغل
کی اعانت مین سرگرم ہی۔

اسٹریٹوسفیر یعنی ہمارے کرۂ زمہریر کے متعلق ایک دلچسپ امر دریافت
طلب امر یہ ہی کہ سطح زمین کے اوپر مختلف مقامات پر کرۂ حرارت (ٹراپوسفیر
Troposphere) اور کرۂ زمہریر مین حد فاصل کی بلندی کیا ہی اور
وہان درجۂ حرارت کیا ہی۔ بالعموم دونون کرون کی حد فاصل ایک
دوسرے سے بدیہی طور پر ممتاز ہوتی ہین گو بعض حالات مین یہ بھی
پایا گیا ہی کہ درجۂ حرارت میلون تک بہت آہستہ آہستہ کم ہوتا چلا جاتا
ہی۔ انگلستان کے اوپر کرۂ زمہریر کی نچلی تہ ۵ سے ۷ میل کی بلندی پر
شروع ہوتی ہی اور اسکا درجۂ حرارت تخمیناً منفی ۶۵ فارن ہیٹ
ہی۔ دنیا کے مختلف حصو نیز مشاہدات کا موازنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہی
کہ کرۂ زمہریر کی بلندی خط استوا کے اوپر سب جگہون سے زیادہ اور قطبین
کے اوپر سب جگہون سے کم ہی جتنی زیادہ بلندی ہوتی ہی درجۂ حرارت اتنا ہی
کم ہوتا ہی لہذا اگر کرۂ حرارت کسی مقام کے اوپر زیادہ بلندی پر ختم ہوتا ہی تو
وہان کرۂ زمہریر کا درجۂ حرارت بہت کم ہوتا ہی۔ ان امور کے انطباق سے یہ
حیرت افزا نتیجہ نکلتا ہی کہ سب سے زیادہ سردی ہوا کے اعلی طبقات مین
خط استوا کے اوپر ہی نہ کہ قطبین کے اوپر۔ وسط افریقہ مین ایک صعود سے
معلوم ہوا کہ کرۂ زمہریر کا درجۂ حرارت جھیل وکٹوریا نینزا کے اوپر منفی ۱۴۹ درجہ فارن ہیٹ
یعنی پانی کے درجۂ حرارت انجمادی سے ڈیڑھ سو درجے نیچے ہی۔ مصنوعی طریقو نسے
اس سے کم درجہ کی سردی حاصل کرنا ممکن ہی لیکن غالباً قدرت مین
یہ سب سے کم درجہ کی سردی ہوگی۔

فیروز الدین مراد

پانی

اسکی مختلف صورتون اور اسکی عمومیت پر ایک نظر

پانی کی نسبت تکوین سے

یہ کہنے مین ذرا بھی تامل نہین ہو سکتا کہ پانی عالمگیر ہو تخلیق عالم سے اسے خاص تعلق ہو۔ یہ ہر جگہ موجود ہو۔ کوئی جاندار شے اس سے خالی نہین ہو۔ اسکی نسبت جو آفرینش اور موجودات سے ہو اسکی نسبت وحشی اور مہذب ہر دو اقوام مین طرح طرح کے روایات و خیالات رائج ہین یہان تجھے اختصار سے غیر تہذیب نا آشنا قومونکی روایات درج کیجاتی ہین جو مضمون ہذا کے لطف کو دوبالا کیے بغیر نہ رہینگی

جنوبی امریکہ مین ایک وحشی قوم رہتی ہو جو ابی پون کہلاتی ہو۔ لارڈ آوبری اور ایک مشہور محقق و عالم علم بنی آدم اسکی روایات کا ذکر کرتے ہوے کہتے ہین کہ اس قبیلہ کے خیال کے مطابق ابتدا مین پانی ہی پانی تھا جس کے درمیان سے دنیا نکلی۔ یہ خیال قدیم زمانہ کی بعض ترقی یافتہ قومون مین بھی رائج تھا۔ بابل مین نہایت قدیم زمانہ مین ایک قوم آباد تھی جس سے اہل بابل نے رسم و رواج علم و فن اور تہذیب و شائستگی حاصل کی تھی اور خط میخی کی اختراع اس قوم سے منسوب کیجاتی ہو۔ اس کا نام اکاڈین تھا۔ اس کا یہ گمان تھا کہ موجودات پانی سے پیدا ہوئی ہین۔ ان کے خیال مین زیست کا قیام پانی پر موقوف ہو اور جب دنیا کو ترکیب دینے کے لیے ایک قدرت بالا کی ضرورت لاحق ہوئی تو وہ پانی کے اندر سے نکل آئی۔ مسٹر ہال مشہور عالم انتھروپالاجی نے جنرل آف انتھروپالاجی مین جاپان کی ایک نہایت پرانی روایت کا ذکر کیا ہو جو تکوین کی بابت ہو۔ اور وہ یہ ہو کہ "ابتدا مین زمین پانی پر تیرتی تھی۔ اس کے درمیان سے ناگر مو تھا نکلا جس کے اندر سے زمین بنانے والا دیوتا پیدا ہوا"۔ کئی وحشی قبائل پالنیشیا اور آبشنیا کے مختلف جزائر مین رہتے ہین جنکے درمیان تکوین کی بابت جو روایات رائج ہین ان سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ ابتدا مین ہر جگہ پانی تھا اس کے درمیان سے کرۂ ارض نکلی۔ ان قومون سے بہتر قبائل جو آہستہ آہستہ وحشی کیطرف لڑکھڑاتے ہوے چلے آرہے ہین ان کا یہ خیال ہو کہ زمین پانی کے اندر سے نکلی تھی۔ ابتداے عالم مین ہر جگہ پانی ہی پانی تھا جیسے شمالی

اور جنوبی امریکہ کے بعض حصون مین بستے ہین۔ شمالی امریکہ کے ایک اور وحشی قبیلہ کا یہ خیال ہو کہ ابتدا مین سمندر تھے اور ان کے درمیان ایک جزیرہ تھا جو رفتہ رفتہ دنیا کی صورت مین تبدیل ہوگیا۔ برٹش کولمبیا (کینیڈا) مین ایک وحشی قبیلہ ہو اسکے ہان یہ روایت مروج ہو کہ ابتدا مین پانی تھا[1] اور اس کے اندر ایک چھچھوندر رہتی جب اسے بھوک لگی تو وہ پانی کی تہ مین خوراک کی تلاش مین گئی وہان کچھ پانی نکالکر جمع کرتی رہی جس سے بعدازان دنیا بنی۔

اہل چین کا خیال دربارۂ تکوین سوال و جواب کی صورت مین ہو جو اس ملک کے مشہور حکیم کیفوشش سے عالم کی ابتدا کے باب مین پوچھے گئے تھے حسب ذیل اقتباس کا ماخذ مسٹر میکلا کتی کا ترجمہ ہو[2] جو انھون نے حکیم موصوف کے سوال و جواب کا انگریزی مین کیا ہو۔ شروع مین دو چیزین پانی اور آگ تھین۔ پانی کے ساتھ جو چیزین مخلوط تھین ان کے تہ پر جم جانے سے زمین پیدا ہوئی۔ اگر کسی بلند پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر قرب و جوار کی پہاڑیون کو دیکھو تو وہ سمندر کی لہرون کی مانند نظر آمین گی بعینہٖ ابتدا مین پانی اسطرح بہتا پھر اٹھا مین نہین جانتا کہ کس زمانہ مین منجمد ہوا تھا۔

ہندوؤن کی دھرم پستکون مین جہان تکوین کا ذکر ہو وہان پانی کو ایک خاص عظمت و تفوق حاصل ہو مثلاً رگوید کے ایتریہ ارنیہ مین لکھا ہو[3] سو ابتدا مین عالم جو ہر ہی جو ہر تھا۔ اسکے سوا کوئی جاندار اور بیجان شے موجود نہ تھی۔ اُسے دنیا پیدا کرنے کا خیال آیا۔ اس نے پانی، روشنی اور مخلوقات وغیرہ پیدا کر دیے یجروید مین[4] لکھا ہو ابتدا مین پانی ہی پانی تھا یہ دنیا بھی آرنبھ مین جل تھی۔ رگوید کے آخری منترون مین پانی کو موجودات کا مبدا و ماخذ قرار دیا گیا ہو جس سے آگ اور ہوا نکلی۔ منو جی اپنے سمرتی مین لکھتے ہین ابتدا مین تاریکی محیط تھی۔ ایشور بھگوان نے اصول اولیہ یعنی ابتدائی عناصر وغیرہ مع پانی پیدا کیے۔ اس کے اندر اُگنے والا تخم تھا۔ اس سے نہایت براق سنہری انڈا نکلا جس کے اندر برہما جی تھے۔۔۔۔ الخ[1]

یونانیون مین سب سے مشہور شاعر ہومر ہو اس نے رزمیہ کتابین تصنیف کر کے غیر فانی شہرت حاصل کی ہو۔ وہ ایک جگہ عالم کی ابتدا پر بحث کرتا ہوا سمندر کو اس کا سبب ٹھیراتا ہو یعنی یہ خیال ظاہر کیا ہو کہ دنیا سمندرون کے پیٹ سے برآمد ہوئی تھی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد طالیس تقریباً چھٹی صدی قبل مسیح مین پیدا ہوا۔ یہ شخص یونانی علوم تجربیہ کا محرک اور بانی اول تھا۔ اس نے طبعیات، ہیئیات وغیرہ کے متعلق کچھ انکشافات کیے۔ اس نے پانی کو منبع عالم اور علت العلل مانا۔ یہ شاید پہلا حکیم ہو جس نے اس مسئلہ کو فلسفیانہ اصول پر قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے شاگردون ہی نے اس نظریہ کو رائج کرنے کی کوشش کی طالیس کا یہ بھی خیال تھا کہ صورت بگڑنے پر چیزین پھر پانی ہی مین جا ملتی ہین جس سے وہ برآمد ہوتی ہین۔

دنیا کی بربادی کی نسبت پانی سے | اکثر وحشی اور مہذب اقوام کے درمیان یہ روایت مروج ہو کہ یہ دنیا پانی کے وسیلے سے برباد ہو چکی ہو۔ قدیم زمانہ میکسیکو کے باشندے آزٹک اور یوکٹن (وسطی امریکہ) کے باشندے مایہ کے ہان یہ روایت مشہور تھی کہ دنیا ایک مرتبہ پانی کے خوفناک طوفان اور تین مرتبہ آگ وغیرہ سے برباد ہو چکی ہو۔ بائبل مین طوفان نوح کا ذکر آیا ہو جس سے تمام دنیا ایک مرتبہ غرقاب تباہ ہوئی تھی۔ زمانہ حال کے

---

[1] ماخوذ از تاریخ عالم جلد اول مطبوعہ سلسلہ اخبارات لندن سنہ ۱۹۰۷ء [2] منقول از میزان الحق مترجمہ انگریزی ترجمہ صفحہ ۱۰ [3] ایضاً صفحہ ۱۰ [4] ماخوذ از نیو انٹرنیشنل انسائیکلوپیڈیا جلد جبرہ صفحہ ۵۷۵۔

[1] میزان الحق صفحہ ۱۹ [2] نیو انٹرنیشنل انسائیکلوپیڈیا صفحہ ۵۷۴ [3] ماخوذ از "انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس" جلد اول صفحہ ۱۰۳۔

سائنس کے رو سے ان خیالات کی ایک حد تک تائید ہو چکی ہے۔ جیالوجی شہادت سب سے قوی اور نہایت معتبر ہے۔ ایک مقررہ میعاد کے بعد قطب شمالی کی طرف سے برف کے سیلاب آتے تھے، اور دنیا پر چھا جاتے تھے۔ نباتات اور حیوانات کو برباد کر دیتے تھے جیالوجی میں اسکا نام عہد برف یعنی گلیشل پریڈ ہے۔ دنیا کی تباہی کی بابت سائنس دانوں کا ایک خیال یہ بھی ہے کہ وہ قلت آب سے برباد ہوگی۔ پانی دن بدن گھٹتا جاتا ہے۔ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ ہماری کرۂ ارض کا حشر وہی ہوگا جو چاند کا ہوا ہے، یا سیارۂ مریخ کا ہوا چاہتا ہے جہاں پانی کا عنصر گھٹتے گھٹتے بہت تھوڑا سا رہ گیا ہے تھوڑے عرصہ میں وہ بالکل ختم ہو جائیگا اور وہاں کے چرند و پرند، انسان اور روئیدگی سب سوکھ کر برباد ہو جائے گی۔ دوسرا گمان یہ ہے کہ چند ہزار سال کے بعد دوسرا برفانی طوفان پھر آئے گا اور دنیا کو برباد کرے گا۔

پانی کی عمومیت اس دنیا کا کوئی حصہ نہیں ہے جہاں پانی کسی نہ کسی صورت میں موجود نہو، بلکہ حال کے سائنسی انکشافات کی روشنی میں یہ کہنا بجا معلوم ہوتا ہے کہ عالم پانی کے وجود سے خالی نہیں ہے، ہمارے سروں پر گنبد فلک کی جو نیلگون چھت نظر آتی ہے بخارات کا کرہ ہے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ کسی زمانہ میں چاند میں روئیدگی تھی۔ وہاں آتش فشاں تھے جنکے دہانے ابتک سطح چاند پر بذریعہ دوربین صاف دکھائی دیتے ہیں۔ وہاں کسی زمانہ میں پانی تھا، مگر حرارت کے اخراج کے ساتھ گھٹتے گھٹتے بالکل معدوم ہو گیا۔ اب وہاں نہ سبزی ہے اور نہ روئیدگی، اب اُسے مردہ دنیا کے نام سے پکارا جاتا ہے، اٹلی کے مشہور عالم ہیئیات شیاپریلی نے ۱۸۷۷ء میں سب سے پہلے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ مریخ (منگل) سیارہ آباد ہے جہاں انسان رہتے ہیں جنھوں نے آبپاشی کی غرض سے بڑی بڑی عظیم الشان نہریں بنا رکھی ہیں جنکی ساخت دیکھکر عقل انسانی دنگ ہو جاتی ہے۔ وہاں فصلیں ہوتی ہیں۔ الغرض منگل کی دنیا ہماری دنیا ایسی قرار پائی۔ پروفیسر لوئل نے یہ خیال ظاہر کیا، اور اسکی تائید اور عالمان فلکیات نے بھی کر دی ہے کہ مریخ میں پانی کا منبع قریب الاختتام ہے تھوڑے عرصے کے بعد بالکل خشک ہو جائے گا۔ اور وہاں کے انسان، جاندار اور نباتات بالکل نابود ہو جائے گی بعض محققان عالم بالا کا یہ بھی خیال ہے کہ زحل (سنیچر) اور برہسپت میں بھی بڑی بڑی دوربینوں کے وسیلے سے روئیدگی کے آثار معلوم پڑتے ہیں مگر یہ صرف قیاس ہے کہ جو تصدیق طلب ہے ممکن ہے کہ یقینیات کا درجہ حاصل کرے یا بالکل بے بنیاد ثابت ہو۔ مگر ان واقعات سے پانی کی عالمگیری بخوبی ظاہر ہوتی ہے۔

پانی کا رتبہ عناصر اربعہ میں زمانۂ قدیم کے ارباب تحقیق کا خیال جب مظاہر فطرت اور تبدلات طبعی کے اسباب کے کھوج کی طرف رجوع ہوا، تو انھیں ہر جگہ اور تقریباً ہر شے میں کسی نہ کسی صورت میں پانی نظر آیا جس سے انھیں ضرور حیرت ہوئی ہوگی، اور اسکی عالمگیری دیکھکر اسے دنیا و مافیہا کا مبدا و منبع قرار دیا۔ بعض یونانی اور ہندو فلاسفر اسکی نسبت متفق الرائے ہیں۔

جب سلسلہ اسباب و نتائج کی تفتیش بہت ہوشیاری اور بالغ نظری سے ہونے لگی، اور علوم و فنون کو خاص ترقی حاصل ہو چکی، تو پانی کے ساتھ آگ ہوا، اور خاک بھی موجودات کی علت قرار پائی اور رفتہ رفتہ عناصر اربعہ کا مسئلہ رائج ہو گیا جس کے نہ صرف یونان کے حکما ہی مسیح سے تین چار سو سال قبل قائل و حامی تھے، بلکہ ہندوستان والے بھی مانتے تھے، اور اسی پر ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ہمارے ہاں پانچواں عنصر ایتھر مانی گئی تھی، جو مغرب میں کئی صدیاں گزرنے کے بعد تسلیم ہوئی۔ سکندریہ روما وغیرہ کے تمام محققین اور فلاسفر اس مسئلہ کے حامی تھے، اس کے متعلق تحقیق جاری رہی۔ یورپ کے زمانہ جہالت اور عرب کے زمانہ عروج میں بھی عناصر اربعہ کا مسئلہ رہا۔ قرون وسطی میں بھی اس کا دور دورہ رہا۔ آخر کار جب یورپ میں عقلی بیداری کا زمانہ شان و شوکت کے ساتھ شروع ہوا، اور صدیوں کی غفلت اور کاہلی کے بعد علمی ترقیاں ہونے لگیں

تو رابرٹ بائل نے سترھوین صدی مین پانی کو مرکب قرار دیا۔ عناصر اربعہ کے مسئلہ کو اسکی کیمیائی دریافتون سے بہت سخت صدمہ پہنچا، جو اٹھارہ انیس سو برس سے مفردات تسلیم ہوے تھے، وہ بالآخر مرکبات ثابت ہوے۔ پانی اپنے سوتیلے بھائیون سمیت مفردات و عناصر ابتدائی کے زمرہ سے خارج ہو کر مرکب قرار پایا۔

پانی کی نسبت دنیا اور جسم انسانی سے پانی خشکی پر بھی غالب ہے کرۂ ہوا اسی سے محیط ہے۔ اگر پانی کسی روز جوش مین آئے اور اپنا ظرف چھوڑ کر زمین پر چڑھ آئے تو طرفۃ العین مین ہماری دنیا و مافیہا کو ہڑپ کر لے اور ہم سب چند منٹون کے لیے آبی مچھلیان بنجائین۔ کرۂ ارض کی ساحت خشکی اور تری، کل اُنیس کروڑ ستر لاکھ مربع ہے۔ اس مین بہتر فیصدی پانی ہے اور ۲۸ فیصدی زمین۔ بالفاظ دیگر چودہ کروڑ بیس لاکھ مربع میلوں پر سمندر، دریا، جھیلین، وغیرہ قطعات آبی ہین، اور صرف ساڑھے پانچ کروڑ مربع میل خشکی ہے جسکے ایک حصے پر انسان آباد ہین، اور دوسرا صحراؤن جنگلوں اور بیابانوں کا مسکن بنا ہوا ہے۔ سمندر کا عمق بالاوسط ۱۲۰۰۰ فٹ ہے، مگر بعض مقامات مین اس سے بھی گہرا ہے۔ مثلاً جزائر غرب الہند کے شمال کی طرف بحر اوقیانوس ۱۶۶۰ فیدم گہرا ہے اور بحر الکاہل مین گوام سے پچھتر میل جانب جنوب بڑی سے بڑی گہرائی ۳۱۶۱۴ فٹ معلوم ہوتی ہے۔ اب اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کتنا پانی ہے اور اسکی مقدار کتنی ہوگی۔

انسان خلاصۂ عالم کہلاتا ہے یعنی ایک بہت ہی محدود پیمانہ پر ایک ننھی سی دنیا ہے جن چیزون سے دنیا مرکب ہے وہ تقریباً سب کی سب انسان کے بدن مین موجود ہین۔ بدن انسانی چودہ مختلف عناصر کا مجموعہ ہے۔ پانی کا جسم انسانی مین بڑا حصہ ہے۔ ڈیڑھ سو پونڈ (پونے دو من) آدمی کا جو ہوتا ہے وہ اپنی جسم کے اندر ساڑھے نو گیلن[1] پانی ہوتا ہے یا اوسط درجہ کا حساب ہے۔ بالاوسط انسان کے جسم کا بوجھ ایک من تیس سیر ہوتا ہے جس مین ساڑھے چونتیس سیر کے قریب یہی عنصر پایا جاتا ہے اور یہ جسم کے ہر حصہ مین موجود رہتا ہے گویا ہمارا بدن نصف پانی کا ہے اور باقی نصف اور چیزون سے مرکب ہے۔

پانی کی کیمیائی ترکیب جیسا پیشتر مذکور ہوا پانی دو ہزار برس تک مفرد اور عنصر شمار ہوتا رہا۔ آخرکار سترھوین صدی مین رابرٹ بائل (ایک مشہور انگریز کیمیا دان) کی کوششون سے مرکب ثابت ہوا یایون کہو کہ اس عالم کی تحقیق نے عناصر اربعہ کا خاتمہ کر دیا۔ اسکے بعد اور ارباب کیمیا اسکی تفتیش کرتے رہے اور اب یہ امر ہر طرح پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ پانی ہائڈروجن اور آکسیجن سے مرکب ہے۔ اول الذکر ۱۱ء۱۱ فیصدی اور ثانی الذکر ۸۸ء۸۹ فی صدی مقدار مین پائی جاتی ہے۔

پانی کی تین حالتین پانی کی تین بڑی صورتین ہین، جن پر کوئی دقت نہین۔ اس کے ماسوا اور صورتون مین اور مرکبات کے ساتھ مخلوط بھی پایا جاتا ہے۔ مگر غیر مخلوط اور غیر مرکب حالت مین اسکی تین ہی صورتین ہین۔ یعنی مائع، ٹھوس یا منجمد، بخارات یا گیس۔ سنٹی گریڈ مقیاس الحرارت کے درجۂ صفر اور فارن ہیٹ مقیاس الحرارت کی ۳۲ ڈگری تک پانی سیال رہتا ہے اور اس سے نیچے منجمد ہو جاتا ہے۔ اول الذکر آلہ کے ۱۰۰ ڈگری اور موخرالذکر کے درجہ ۲۱۲ ڈگری پر ابلتا ہے اور اپنی سیال صورت بدل کر بخار بن جاتا ہے۔ پانی کی بڑی سے بڑی کثافت درجہ ۴ ڈگری سنٹی گریڈ مقیاس الحرارت پر ہوتی ہے۔ اسکی حرارت نوعی سوائے ہیڈروجن گیس کے سب چیزون سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ پانی کو روئی یا گھاس یا گیس کی طرح دبا کر چھوٹا اور ٹھوس نہین بنایا جا سکتا۔ اگر بلندی سے خالص پانی کو دیکھا جائے تو اس کا رنگ بہت ہی ہلکا نیلگون ہوتا ہے جس پانی مین کیلسیم کاربونیٹ ہو وہ غیر شفاف ہوتا ہے، اور اس مین سے

[1] ایک گیلن برابر ہے تین سیر دس چھٹانک کے۔

کوئی شے نظر نہیں آتی لیکن اگر کاربانک ایسڈ گیس اسکے اندر داخل کرو تو اس کا رنگ زرد سے نیلا ہوجائے گا۔ بعض عالموں نے اس سے یہ خیال اخذ کیا ہے کہ پانی کی طبعی رنگت کا کاربانک ایسڈ کی مقدار پر موقوف ہوتی ہے جو مختلف مقامات کے پانیوں میں مختلف ہوتی ہے تاہم اسکی رنگت کا انحصار ایک بڑے درجہ تک ظرف کے پیندے اور آسمان کی نیلگونی پر ہے۔ جب پانی مائع حالت میں ہوتا ہے تو اس میں حرارت بآسانی سرایت نہیں کرسکتی۔ بالکل خالص پانی میں بجلی کوئی اثر نہیں پیدا کرسکتی۔ اور نہ اسے دوسری طرف نکلنے میں کوئی مدد ملتی ہے۔

(۱) سیال پانی کی طبعی اقسام سب سے پہلے سیال پانی کی طبعی حالتوں اور قسموں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلی قسم مینھ کا پانی ہے۔ سورج کی گرمی سے بخارات اڑ کر ہوا میں جا ملتے ہیں اور جب کرۂ ہوا کے کسی سرد طبقہ میں پہنچتے ہیں تو بادلوں کی صورت اختیار کرلیتے ہیں اور پھر بارش بن کر زمین پر آجاتے ہیں مگر کرۂ ہوا سے گزرتے وقت انکے ساتھ کئی چیزیں مل جاتی ہیں۔ مثلاً نوشادر، سوڈیم، کلورائیڈ اور دیگر قسم کے معدنی نمک اور کھاد نیز نباتاتی مادہ بھی پایا گیا ہے۔ جس خطہ میں کارخانے ہوں اور وہاں کوئلہ جلتا ہو تو بارش کے پانی میں گندھک کا تیزاب ملا ہوا ہوگا۔ دوسری قسم کا سطح کا پانی ہے جو دریاؤں اور ندی نالوں اور تالابوں میں ہوتا ہے۔ یہ بارش کے پانی سے کم خالص ہوتا ہے۔ اسکے اندر جو چیزیں پائی جاتی ہیں وہ اس زمین کی نوعیت اور روئیدگی پر موجود ہے جسکے درمیان سے گزرتا ہے۔ اس پانی میں کاربونیٹ کلورائیڈ الکلی کے سلفاٹ اور کئی قسم کی مٹیاں ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں لوہے اور منگنیز کی بھی ہلکی مقدار پائی جاتی ہے اور کئی قسم کی نباتات کے نمک بھی پائے جاتے ہیں۔ تیسری قسم طبعی پانی کی کنوئیں کا پانی ہے جو کنوؤں سے نکالا جاتا ہے اور جو انکے اندر زمین کے گہرے اور اندرونی طبقوں سے آکر جمع ہوتا ہے۔ یہ پانی دیہات و قصبات میں کھانا پکانے پینے اور نہانے، دھونے کے کام آتا ہے۔ مگر اس میں بعض دفعہ مضر مواد بھی ملا ہوتا ہے جس سے ہیضہ، ملیریا وغیرہ وبائی امراض پھیل جاتے ہیں۔ اس پانی کے اندر شورہ اور نوشادر پایا جاتا ہے جس سے اس کا مزہ کھاری ہوتا ہے اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس میں نہایت مضر صحت مواد موجود ہے۔ سوفٹ سے اوپر جو کنوئیں گہرے ہوتے ہیں ان کا پانی البتہ بہت خالص ہوتا ہے۔ چوتھی قسم کا پانی معدنی ہے۔ اس میں کئی قسم کی معدنیات کی مقدار پائی جاتی ہے جنکی خاصیت دوائی ہوتی ہے اور عموماً کئی قسم کی بیماریوں کے علاج میں کام آتا ہے۔ کوئی ٹھنڈا کوئی گرم اور کوئی شیر گرم ہوتا ہے۔ اسکے اندر الکلائن نمک، کاربونک ایسڈ، کاربونیٹ، سلفاٹ اور کلورائیڈ، سلفیورک ایسڈ، ہیڈروکلورک ایسڈ اور سلسلک ایسڈ پایا جاتا ہے سوڈیم بھی بعض پانیوں میں ہوتی ہے۔ پانچویں قسم فطرتی پانی کی سمندری پانی ہے۔ سمندر میں ہر قسم کے ندی نالوں اور دریاؤں کا پانی گرتا رہتا ہے جو غیر خالص ہوتا ہے۔ اس میں کئی قسم کی اشیاء مخلوط حالت میں پائی جاتی ہیں۔ اسکا مزہ تلخ اور نمکین ہوتا ہے۔ بخارات بن کر جو پانی اڑ جاتا ہے وہ البتہ خالص ہوتا ہے اور اسکے کثیف اجزا سمندر میں رہجاتے ہیں۔ دنیا کے مختلف حصوں میں سمندری پانی کے ساتھ مختلف چیزیں مختلف تناسب اور مقدار میں پائی جاتی ہیں۔ شمالی خطہ سمندر میں برف جم جاتی ہے چونکہ سے عموماً گھرا ہوتی ہے پانی کو ہلکا یا بھاری کہکر پکارا جاتا ہے جس کا یہ مطلب ہے کہ کیلسیئم اور میگنیشیئم کی مقدار خاص تناسب سے اسکے اندر موجود ہے۔

(۲) پانی کی منجمد حالت پانی کی دوسری صورت برف ہے جسے اسکی منجمد یا ٹھوس حالت سمجھا جاتا ہے جب پانی مائع سے منجمد بنتا ہے تو اسکی جسامت میں توسیع ہوجاتی ہے یہی وجہ ہے کہ شملہ جیسے سرد برفانی مقامات میں جب رات کو پانی بھر کر رکھا جاتا ہے تو صبح کو گھڑے شکستہ پائے جاتے ہیں۔ یہ کیفیت کانگڑہ، کشمیر، مری، ڈلہوزی، کلو، منصوری وغیرہ میں بھی موسم سرما میں دیکھنے میں آتی ہے جہاں پانی کی نالیاں ہوتی ہیں وہ رات کو پانی جمنے سے پھٹ جاتی

ہین۔ پانی کا انجماد اور تبدیلی صورت ہوا کے درجہ حرارت برودت پر موقوف ہے اگر ہوا مین گرمی ہے تو انجماد بآسانی واقع نہین ہوتا مگر جب برودت بہت ہو تو البتہ اسکی سیال صورت برباد ہو جاتی ہے پہاڑون اور سرد مقامون مین موسم سرما مین پانی آپ سے آپ جم جاتا ہے جسے یخ کہتے ہین۔ یہ شفاف اور ٹھوس ہوتی ہے۔ اور جب بخارات تصاعد کرکے زمہریر مین پہنچتے ہین تو وہ بھی جم جاتے ہین اور برف کے گالون کی صورت مین سرد پہاڑی مقامات مین گرتے ہین اور تہ بہ تہ جمکر یخ کا تختہ بنجاتے ہین۔ دوسری مصنوعی برف ہوتی ہے جو تمام بڑے بڑے شہرون مین گرمی کے موسم مین فروخت ہوتی ہے اور سب چھوٹے بڑے شربت یا پانی مین ڈال کر پیتے اور اپنے کلیجہ کی سوزش بجھاتے ہین۔

(۳) پانی بخارات یا گیس کی صورت مین

پانی تیسری صورت مین بخارات یا گیس بنجاتا ہے کرہ ہوا اس کا مسکن ہے۔ ہوا کی خنکی اور گرمی بخارات کی کثرت اور قلت پر منحصر ہے۔

پانی کا ایک گرام (چنے کے برابر وزن) جب ۱۰۰ ڈگری سنٹی گریڈ پر بھاپ بنجاتا ہے تو اسکے لیے حرارت کی ۵۳۶ ڈگری اکائیان درکار ہوتی ہین جو اسکے اندر جذب ہو کر اسکی ہیئت کو بدل دیتی ہین بھاپ کا کوئی رنگ نہین ہوتا اور بالکل صاف ہوتی ہے لیکن اگر سرد ہوا لگے تو انجماد واقع ہوتا ہے اور بخارات دھوئین کی صورت اختیار کر لیتے ہین۔ آفتاب کی حرارت سے دریاؤن جھیلون ندی نالون اور سمندرون سے ہر وقت بیشمار بخارات اڑتے رہتے ہین اور کرہ ہوا مین پہنچکر معلق ہو جاتے ہین۔ جب ہوا کی لہر انھین بالائی طبقات مین جہان انتہا برودت بہت ہوتی ہے لیجاتی ہے تو بادل کی شکل مین نمایان ہوتے ہین پھر وہان سے مینھ یا برف یا اولے بنکر زمین پر آجاتے ہین بہکر سمندر مین جاتے ہین جہان سے حرارت انھین پھر اوپر دھکیل دیتی ہے اسی طرح آواگون کا سا دور جاری رہتا ہے اور پانی گنہگار کی طرح پورانک خیال کے مطابق اسی چکر مین الجھا رہتا ہے شروع سے چلا آتا ہے اور آخر تک چلا جائے گا۔

پانی کے فوائد

جاندار کائنات کو پانی کے وجود سے بیشمار فائدے حاصل ہوتے ہین۔ نباتات کی اسے روح کہنا بیجا نہ ہوگا اسکے بغیر انکی زیست ناممکن ہے پھل پھول اور فصلین سبھی پانی کی احسان مند ہین حضرت انسان بھی اپنے کو اس کے احسانون سے بری نہین سمجھ سکتے۔ ہوا سے دوسرے درجہ پر پانی ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے۔ یہ ہمیشہ اور ہر وقت ہمارے ساتھ رہتا ہے۔ پیدائش سے لیکر وفات تک ہمارے ہمدوش رہتا ہے جب ہم اس عالم مین داخل ہوتے ہین تو ہمارا یہ خیر مقدم کرتا ہے اور ہمارے ہاتھ پاؤن اور بدن کو پاک صاف کرکے اس دنیا کے تماشا گاہ مین لاتا ہے۔ اور پھر جب ہم یہان سے اگلے جہان کو کوچ کرتے ہین تو بھی قبر کے کنارہ تک ہمارا ساتھ دیتا ہے دوران مسافت مین جو گرد و غبار ہمارے پاؤن ٹانگون اور چہرون کو لگ جاتا ہے اور ہم خاکیون سے منسوب ہو جاتے ہین آخری الوداع کے وقت پانی اسے صاف کرتا ہے اور ہم پاک اور شستہ ہو کر ملک عدم کی سرحد مین داخل ہوتے ہین۔ پانی کے ہم پر بیشمار احسان ہین جس سے سبکدوش ہونا ہمارے امکان سے بعید ہے بیماری کی حالت مین ہماری کئی ضروری خدمات بجا لاتا ہے۔ دوا کے ساتھ مل کر جسم کے اندر داخل ہوتا ہے اور خون مین مخلوط ہوکر مضر مواد کو جسم سے خارج کرنے مین شامل حال رہتا ہے۔ مسامون کو صاف کرکے پسینہ کے لیے راستہ صاف کر دیتا ہے جو اسی کا چچیرا بھائی ہے جب حرارت بدن مین اعتدال سے بڑھکر ہمین پریشان کرتی ہے تو اسوقت سرد پانی یا برف اسے گھٹا کر ہمین تسکین دیتی ہے معدنیات کے ساتھ ملکر ہمارے جسم کی دکھون کو دور کرتا ہے جب ہم توانا و تندرست ہوتے ہین تو پانی ہماری صحت اور طاقت کو برقرار رکھنے مین بڑا ساعی ہوتا ہے۔ ہمارے بدن کو کئی قسم کی غلاظتون سے صاف کرتا ہے ہمین اجلے کپڑے اسی کی بدولت پہننے کو نصیب ہوتے ہین ہماری رقیق غذائین اس کے ساتھ مخلوط ہوکر پانی پہلے

دل ودماغ اور تمام قواے جسمانی کو تقویت دیتا ہی۔ ہماری عبادت مین بھی پانی شامل ہوتا ہی۔ مسلمان نماز پڑھنے سے پیشتر وضو اور ہندو اشنان کرتے ہین۔ عیسائی جب بچے یا کسی غیر آدمی کو اپنے مذہب مین شامل کرتے ہین تو اسے بھی پانی ہی کا بپتسمہ دیتے ہین۔ پاکیزگی عبادت مین نہایت ضروری ہی اور سب مذہب اسکی تلقین و تاکید کرتے ہین مگر پانی کے بغیر یہ بھی ممکن نہین۔ اسی طرح یہ ہماری عبادت مین شریک ہی۔ اگر پانی دھوبی بنکر ہمارے میلے کچیلے کپڑے صاف و سفید کرتا ہی تو مینھ کے ذریعہ سے بھنگی بنکر ہمارے گلی کوچے صاف کردیتا ہی اور ہمین کئی قسم کی تکلیفون سے بچاتا ہی۔ ایک حد تک پانی ہماری جان ہی۔

پانی کے کرشمے موجودات کے اندر

اوس یا شبنم کو سبھی جانتے ہین۔ طلوع آفتاب سے پیشتر ذرا کسی باغ یا کھیت کی سیر کرو۔ وہان پانی اپنا نیا کرشمہ دکھاتا ہی۔ اسکے ننھے ننھے قطرے پھولون اور پودون پر جو بہار دیتے ہین وہ اور کہین دیکھنے مین نہ آئے گی۔ انکی ہلکی آب کے سامنے موتی اور ہیرے پانی ہوجاتے ہین اور یہی موتی پھولون اور پودونکی غذاے خاص ہین ان پر وہ پرورش پاتے ہین۔ کھیتیان انھین کے سبب سے لہلہاتی نظر آتی ہین یہ انھین شب کو غسل دیتی اور نیک دل دایہ کی طرح انھین ان کی دلپسند خوراک کھلاتی ہی۔ کونپلین اسی کے اشارے سے وجود پذیر ہوتی ہین۔ کلیان اسکے رونے سے ہنستی ہین۔ ننھے ننھے پھل اسکے دیکھنے کو آتے ہین اور شادمان ہوتے ہین۔ الغرض شبنم ان کی جان اور انکی غذاے پسندیدہ ہی۔ جب سورج نکلتا ہی تو بیچاری شبنم اپنا بوریا بدھنا سنبھال اپنے عزیزون سے رخصت ہوتی ہی اور رات گئے پھر ان مین موجود ہوتی ہی اور ان کی پرورش کرتی ہی۔ اس کی محبت بھری کوششون سے پھل اور پھول، پودے اور نباتات، سبزی، ترکاری، کھیتی کیاری وغیرہ کمال پر پہنچتے ہین، اور اپنے اپنے خزانے حضرت انسان کے پاؤن مین لا کر ڈال دیتے ہین جس سے وہ شادمانی اور فراوانی کی زیست بسر کرتا ہی۔ پانی شبنم اور کہر وغیرہ بن کر بھی انسان کی خدمتگزاری سے انحراف نہین کرتا۔

پانی کی قوت

پانی جب شتر بے مہار کی طرح بپھرتا ہی تو بربادی ڈھاتا ہی۔ فائدہ کے بجائے نقصان اور ظاہری دوستی کے پردہ مین دشمنی کرتا ہی سمندر مین بگڑ کر جہازون کو غرق کرتا ہی اور خشکی کی حالت مین دریا بن کر دیہات قصبات پر ہاتھ صاف کرتا ہی۔ رحم اندر کا حکم پاکر مکانون کو ڈھاتا ہی اور جاندارون کو بے کفن گور مین لٹاتا ہی۔ فصلون کو برباد کرتا ہی اور ہزارون جاندارون کو مصیبت مین پھنساتا ہی۔ لیکن جب اسے قابو مین کرلیا جاتا ہی تو اس سے طرح طرح کی خدمات لی جاتی ہین۔ دریاؤن سے نہرین کاٹ کر لاکھون کروڑون اراضی جو صدیون سے غیر مزروعہ اور غیر آباد پڑی ہوئی تھی سیراب کی جاتی ہی اور اس طرح ہزارون بندگان خدا کی روزی بہم پہنچتی ہی۔ ندی نالون کے کنارون پر پن چکیان لگا کر اس سے پسنہاری کی نوکری لی جاتی ہی۔ جھرنون سے برقی قوت پیدا کی جاتی ہی جس سے ریلین اور کارخانے چلتے ہین اور سیکڑون مصنوعات تیار ہوتی ہین۔ اسی پانی کی عجیب مخفی قوت برق سے کسی روز مارکونی اور اس کے ہمخیال ماہران برقیات مریخ کے باشندون سے نامہ و پیام کا تبادلہ کرنے کی خوشگوار اور معرکۃ الآرا امیدین لگا رہے ہین۔ اس کام کے لیے نیاگرا کے آبشار رو برق پیدا کرنے کا انتظام ہو رہا ہی۔ پانی اور آگ سے جو اسٹیم یعنے بھاپ یا دخان پیدا کیا جاتا ہی اس سے انجن ہزارون من بوجھ اور بیسیون آدمیون کو شام تک سیکڑون میلون پر پہنچا دیتا ہی۔ پیدل سفر اور ہاتھ سے کام کرنے سے جو زحمتین حضرت انسان کو برداشت کرنی پڑتی ہین پانی کی بدولت ان سے رستگاری نصیب ہوگئی ہی اور آرام و آسایش کے سامان بہم پہنچ گئے ہین۔

جہاز رانی مین پانی نے بڑا حصہ لیا ہی اور اب ہوائی جہاز رانی کو

بھی اپنا مرہونِ احسان بنالے گا جس کے متعلق اس قدر دھوم دھام سے کوششیں ہو رہی ہیں۔ جب پہلے پہل بیلون کا تجربہ کیا گیا تو پانی کی ایک کیمیائی جز یعنے ہیڈروجن سے کام لیا گیا تھا اور اب بھی لیا جاتا ہے۔

غرض کہ پانی کی خدمات اور احسانات کا کہاں تک ذکر کیا جائے زمانۂ حال کے سائنس نے اسکے استعمالات اور فوائد کو بہت اچھی طرح ظاہر کردیا ہے۔

(منقول از ترقی)

مصنوعات دکن

ارباب سیاست مدن کا جدید فرقہ جس نے اس فن کو ایک مستقل علم بنا دیا ہو اور ترقی و تنزل ملک کے اسباب اور ان کے معالجات کو کمال شرح و بسط کے ساتھ مدون کیا ہو۔ دولت کی تعریف اسطرح کرتا ہو کہ۔ دولت سونے یا سونے چاندی کا نام نہیں ہو۔ بلکہ اشیاء احتیاج اور سامان عیش و آرام کا نام ہو۔ اس لیے جو ناظرین سیاست ان کے اصول سے کسی قدر بھی مُتعرف ہونگے وہ ضرور ہمارے اس قول کی تصدیق کرینگے کہ زندہ اور سرسبز و شاداب صرف وہی ملک ہو جہان کے باشندے اپنے اشیاء احتیاج کو اپنے ہاتھوں سے تیار کرتے ہین اور اپنے ملک والون کی ضروریات کے پورا کرنے کے بعد دوسرے شہرون کو بھیجتے ہین تاکہ ان کی دولت کو اپنی محنت کے ذریعہ سے اپنی طرف جذب کرین۔ جو ملک اپنے حوائج ضروری آپ مہیا نہین کر سکتا بلکہ تمام خورد و نوش آرام و آسایش کے اسباب مین دوسرون کا دست نگر رہتا ہو۔ ایسے ملک کو اگر مردہ بدست زندہ کہین تو بیجا نہین ہو۔ جیسے کہ آجکل ہمارا ملک دکن ہو۔ بالفاظ دیگر جو ملک اپنے حوائج مین دوسرے کا محتاج نہو یا ان کا تبادلہ اپنے مصنوعات سے برابر کر سکتا ہو وہ زندہ اور دولتمند ملک ہو جیسے کہ آجکل انگلستان ہو۔ اب مین اس مطلب کو کہ ہمارا ملک دکن ایک مفلس ملک ہو اور انگلستان ایک دولتمند ملک ہو کسی قدر وضاحت سے بیان کرتا ہون۔ ہم لوگ جس قدر اشیاء احتیاج و سامان عیش و آرام استعمال کرتے مین وہ ہمارے ملک کی بنی ہوئی نہین ہین اس سے معلوم ہوا کہ یہ تمام اشیاء ضرور لندن یا جرمن یا فرانس یا امریکہ کی بنی ہوئی ہوتی ہین اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہو کہ ہمارا ملک ایک ایسا ملک ہو جو اپنے مصنوعات سے نہ اپنے باشندون کے لیے کافی سامان ارزانی کے ساتھ مہیا کر سکتا ہو نہ غیر ملکی اشیاء کا تبادلہ کرتا ہو۔ برعکس اسکے انگلستان ایسا ملک ہو جو اپنے باشندون سے گزر کر ہماری حاجات رفع کرتا ہو بلکہ آج تمام ہندوستان اس کا محتاج ہو۔ علاوہ اسکے ہم برابر یہ دیکھتے ہین کہ ہمارے ما یحتاج جملہ اشیاء از قسم پارچہ و آلات آہنی و چوبی سے صابون دیاسلائی سوئی اور تلنگے تک بوجہ ارزانی ولایت سے چلے آتے ہین اور ہمارے ملک سے سوائے اجناس خام کے کوئی چیز دستکاری کی نہین جاتی اور جاتی بھی ہو تو اس قدر کم کہ اس کا عدم و وجود برابر ہو۔ ہم یہان اصول علم پولیٹیکل اکانمی سے بحث کرنا نہین چاہتے لیکن جو کچھ اوپر ذکر کیا گیا ہو وہ ایک مسلمہ مسئلہ ہو۔ اب مین ناظرین کی توجہ اصل مطلب یعنی دکن کن کن صنعتون کے لحاظ سے مشہور ہو انکے فروغ کا زمانہ کب تھا" کی طرف منعطف کرتا ہون۔

دکن کی گذشتہ اور موجودہ مصنوعات پر بحث کرتے وقت ضروری تھا کہ اسکی تجارت کا حال بھی لکھا جاتا لیکن بخوف طوالت مین اسکو قلم انداز کرتا ہون صرف اتنا بیان کرنا ضروری سمجھتا ہون کہ دکن مین پیٹھان[۵۱] (واقع اورنگ آباد دکن) اور تگر[۵۲] (دھارور) پہلی صدی عیسوی مین مشہور تجارتی منڈیان تھین۔

---

۵۱ پٹن ضلع اورنگ آباد معروف بہ مونگی پٹن وسط الراس شالواہن بود و دولت کا مرد زہم بسا رنی بانی دیگر زی صفت و مشہور است ۱۲۔

۵۲ تگا مادیو گیر دولت آباد است ۱۲۔

دکن سے گاڑیوں میں مال لاد کر کوہستان سے ہوتا ہوا پیٹھان جاتا تھا وہاں سے دس دن میں نگرا پہنچتا تھا۔ پھر وہاں سے دو قسمیں ہو جاتی تھیں۔ ایک طرف سے تو اجنٹہ کے گھاٹ سے ہندوستان کی جانب مال چلا جاتا تھا۔ دوسری جانب خلیج بنگال سے یورپ اور دوسرے ممالک کو روانہ ہو جاتا تھا۔

چودھویں صدی عیسوی میں یعنی بادشاہان بہمنیہ کے زمانہ میں انکے مشہور بندرگاہوں دگول چول بندر سے مال حبش و عربستان کو جاتا تھا۔ اور شاہی جہاز یورپ سے بھی مال لایا کرتے تھے دکن کی اشیاء برآمد اسوقت مندرجہ ذیل تھیں۔

تیل۔ شکر۔ چانول۔ ادرک۔ روئی۔ کپڑا۔ ریشم۔ تاگہ۔ نیل۔ ہیرا۔ سنگ سلیمانی۔ موتی۔ معدنیات وغیرہ۔

دکن کی قدیم دستکاری یوں تو دکن کی پرانی دستکاری کا حال ایلورا کے غار اور اجنٹہ کے نقش و نگار سے بخوبی معلوم ہوتا ہے لیکن علاوہ اسکے دکن میں سکیا منی یا بودھ کے زمانہ میں بھی کالنگا کی ململ مشہور تھیں۔ اور مسولیا کی عمدہ ململ کا ذکر کتاب پری پلس میں جو ۷۰ء میں تصنیف کی گئی ہے موجود ہے۔

تیرھویں صدی عیسوی میں مسلمان حملہ آوروں نے دکن میں بہت سے کاریگروں کو آگرہ۔ دہلی۔ گجرات۔ احمد آباد سے بلا کر آباد کیا۔ اس کے بعد محمد تغلق نے چودھویں صدی عیسوی میں دولت آباد کے قریب بہت سی بستیاں دستکاروں کی بسائیں۔ بادشاہان مغلیہ نے بھی بہت سے اہل حرفہ کو بسا کر نئی نئی صنعتیں ایجاد کیں۔ دکن کے صنوعات کی اعلیٰ درجہ کی ترقی کا زمانہ چودھویں صدی عیسوی سے آخر سترھویں صدی عیسوی تک یعنی بادشاہان بہمنیہ اور ان کے بعد ریاست گولکنڈہ کے قیام تک سمجھنا چاہیے۔ پس اسکے بعد ہی زوال کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے۔

اب ہم ذیل میں اُن مصنوعات کو ترتیب وار بیان کرتے ہیں جنکی وجہ سے دکن[1] مشہور تھا۔ ناظرین کو یہ خیال رہے کہ پہلے جو چیزیں دکن میں بنتی تھیں اب بھی بنتی ہیں۔ صرف فرق اتنا ہے کہ پہلے کثرت سے تیار ہوتی تھیں اور ان کی مانگ بھی اسی نسبت سے تھی۔ اب کس مپرسی کی حالت میں ہیں۔

ہیرا تراشنا اور صاف کرنا دکن میں سب سے زیادہ قابل ذکر یہ بات ہے کہ کس طرح حیدرآباد سے ایک خاص قسم کی دستکاری نیست و نابود ہو گئی یعنی ہیرا تراشنا اور صاف کرنا۔ سلطنت مغلیہ میں ریاست گولکنڈہ کے الحاق ہونے کے قبل تک اس ریاست کے مشرقی اور جنوبی اضلاع کی کانوں میں بیش بہا پتھر ملا کرتے تھے اور حیدرآباد اور گولکنڈہ میں تراشنے اور صاف کرنے کے لیے لائے جاتے تھے۔ تمام فرنچ سیاحوں نے ان مقامات کے ہیرے تراشنے والوں کا ذکر کیا ہے۔ موسیو تھونیو ایک فرنچ سیاح جو سنہ ۱۶۶۷ء میں وارد گولکنڈہ ہوا اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے "قلعہ میں بادشاہ نے اچھے اچھے کاریگر آباد کیے ہیں۔ ان کے لیے سرکاری مکانات بنوا دیے گئے ہیں اور مکانوں کا کرایہ نہیں لیا جاتا۔ جوہریوں کو بھی اس نے اپنے محلات میں رکھ چھوڑا ہے۔ بیش بہا جواہرات کا کام انھیں کے سپرد ہوتا ہے اور حکم دے رکھا ہے کہ یہ لوگ جو کام وہاں کریں اس کا بھید کسی کو نہ بتائیں مبادا ایسا ہو کہ اورنگ زیب کو یہ خبر مل جائے کہ بادشاہ گولکنڈہ کے یہاں کاریگر ایسے ایسے قیمتی جواہرات کا کام کرتے ہیں اور وہ انھیں اس سے طلب کرنے لگے۔ یہ قلعہ کے کاریگر بادشاہ کے تمام پتھروں کے بنانے میں لگے رہتے ہیں اور گو وہ کثیر التعداد ہیں۔ مگر دوسرا کام کرنے کے لیے ان کو مشکل سے فرصت ملتی ہے۔ ہیروں کو یہ لوگ تاروں کی کمان سے کاٹتے ہیں۔ جب کاریگر کمان چلاتا ہے تو دوسرا شخص ایک نہایت رقیق محلول اس پر ڈالتا جاتا ہے یہ محلول جو سفید مرود کے سفوف کو پانی میں ملا کر بنایا جاتا ہے کاریگروں کے لیے

[1] دکن سے میری مراد صرف وہی ہے جو اس وقت ہمارے حضور نظام خلد اللہ ملکہ کے زیر حکومت فرمان ہے۔

بہت کچھ سہولت اور آسانی کا موجب ہو یہ سفید امرو تیھرون مین ملتا ہو اور اس سلطنت کے ایک خاص مقام پر ہوتا ہو جسے تلنگی زبان مین دکرنلا کہتے ہین۔ ایک گرادن اور روپیہ کلدار کو آدھ سیر آٹا ہو جب کاریگر اُسے کام مین لانا چاہتے ہین تو پیسکر سفوت بنا لیتے ہین جب کسی ہیرے کو ریت کی کنگری یا کسی اور نقص کی وجہ سے تراشنا چاہتے ہین تو اس مقام پر جہان ان کو تراشنا ہوتا ہو ذرا سا نشان کر دیتے ہین پھر ایک لکڑی لیتے ہین جس مین ایک سوراخ ہوتا ہو ہیرے کو اس سوراخ پر رکھتے ہین اور لوہے کی ایک چھوٹی سی چھینی لیکر اس جگہ رکھتے ہین جہان چیرنے کا نشان بنا ہوا ہوتا ہو اور نہایت آہستہ آہستہ ٹھوکتے ہین اور اسطرح ہیرے کو تراش لیتے ہین۔

لوہا ممالک محروسہ سرکار عالی کے مشرقی اور متوسط اضلاع مین پایا جاتا ہو اور ورنگل۔ کرنہ سمندر (کناسمدرم)، دندرورتی۔ کمارپلی۔ ایراپلی نرمل۔ گدکول۔ ملیورم۔ راورتہ۔ جگتیال۔ ایل چل۔ رنگمپیٹہ۔ کند ریورم کولور۔ انند گیری۔ لنگم پلی۔ نظام آباد۔ کلیانی وغیرہ مین گلایا جاتا تھا۔

فولاد زمانہ قدیم مین ہندوستان کا فولاد مشہور تھا۔ عمدہ فولاد ممالک محروسہ مین کناسمندرم نرمل (ضلع نامڈیڑ) کے قریب تیار ہوتا تھا ضلع ایلگندل ابراہیم پٹن۔ کوناپور۔ جنگلہ پیٹہ۔ گدکول وغیرہ مین بھی فولادی چیزین تیار ہوتی تھین۔ لیکن کناسمندرم کے مقابلہ کا فولاد کہین نہین ہوتا تھا۔ ڈاکٹر واکر ابراہیم پٹن اور دوسرے دیہات علاقہ ایلگندل کے فولادی کارخانون کا ذکر کرتے ہوے لکھتا ہو کہ جو فولاد ان دیہات مین بنایا جاتا ہو وہ کناسمندرم (کرنہ سمندر) کے فولاد سے کم درجہ کا ہوتا ہو اور نصف قیمت بھی ملنی مشکل ہوتی ہو۔ کناسمندرم جو زمانہ دراز سے فولاد کے لیے مشہور ہو اب بھی وہان تھوڑا بہت کام چلتا ہو اور وہان سے دوسرے ملکون کو روانہ کر دیا جاتا ہو۔ فولاد جاقو تلوار اور دوسرے ہتیارون کے بنانے مین کام آتا ہو پہلے اسکو مغل یا ایرانی کارخانون سے خریدتے تھے۔

ایک ایرانی نے ڈاکٹر والیس ماہر فن طبقات الارض سے جو عرصہ ہوے کئی سال پیشتر فولادی بھٹیون کو دیکھا بیان کرتا تھا کہ ایران مین کئی بار امتحان کیا گیا لیکن کناسمندرم کے مقابلہ کا فولاد بنانے کی کوشش بیکار گئی۔

بیدری اشیاء مشہور بیدری برتنون کی ایجاد ہندو راجگان بیدر کی طرف منسوب کی جاتی ہو بیان کیا جاتا ہو کہ سب سے پہلے بیدر کے ایک ہندو راجہ نے ایک گلدان بت کے سامنے پھول وغیرہ رکھنے کے لیے بنوایا تھا پھر اسکے جانشینون نے اس مین ترقی کی لیکن زیادہ حال مین جو شان و شوکت نظر آتی ہو وہ مسلمانون کی ایجاد ہو مسلمان فاتحین کی عادت تھی کہ جہان جاتے تھے وہان کے دستکارون ہی کی سرپرستی نہ کرتے تھے بلکہ دوسرے ممالک ہندوستان اور مغربی ایشیا سے بھی مال منگوایا کرتے تھے۔

بیدری کام کی معمولی چیزین حسب ذیل ہوتی ہین۔

حقہ، اگر دان، گراری، (فرشی)، پیکدان، پاندان، آفتابہ، طرحی، آبخورہ، رکابیان، ڈبیہ وغیرہ مسلمانون کی سلطنت برباد ہونے کی وجہ سے جس طرح ہندوستان کی دوسری مصنوعات کا زوال ہوا، اسی طرح اس کام کا بھی زوال ہوا۔ اس مین شک نہین کہ مشہور لوگون مثلاً ڈاکٹر ہین ڈاکٹر بکانن ڈاکٹر اسمتھ۔ مسٹر ڈی سیلمٹن۔ کپتان میو بالڈ وغیرہ نے اس کی طرف بہت توجہ کی لیکن نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلا، دوسری وجہ زوال کی یہ ہو کہ ملک مین مانگ کم ہو گئی ہو کاریگر بہت غریب ہین۔ ان کے پاس سرمایہ اس قدر نہین ہو کہ قیمتی برتن تیار کر کے دوکان مین رکھین۔ تاہم اس گئی گذری حالت مین بھی ہر چیز فرمایش پر اب بھی تیار ہو جاتی ہو۔

تلوارین کم درجہ کی تلوارون کے پھل حیدرآباد۔ گدوال، دیورتی کولاپور وغیرہ مین تیار ہوتے ہین اب صرف حیدرآباد مین بنائے جاتے ہین جو ہر دار تلوارین ایران اور گجرات مین ہوتی ہین مگر ممالک محروسہ سرکار نظام مین جگدیر پو ضلع کھمم مین بھی عمدہ تیار ہوتی ہین۔

تلوارون کے مفصلۂ ذیل اقسام ممالک محروسہ مین تیار ہوتے ہین

۱- جوہردار- اس کی قیمت سب سے زیادہ ہوتی ہی اور کنا سمرم کے فولاد سے تیار کی جاتی ہی-

۲- سروہی- جگدیوپور مین تیار ہوتی ہی اکثر راجپوت باندھتے ہین-

۳- تیغہ- کم درجہ کے فولاد سے تیار ہوتا ہی-

۴- اصیل- اس کی کئی قسمین ہین صرف فرق اتنا ہی کہ بعض سیدھی ہوتی ہین اور بعض خمدار- عام طور پر باندھی جاتی ہی جگدیوپور مین تیار ہوتی ہی-

۵- مصری- عمدہ فولاد سے تیار کیجاتی ہی معززین باندھتے ہین-

۶- فرنگ- کم درجہ کے فولاد سے تیار ہوتی ہی بہت چوڑی اور وزنی ہوتی ہی-

۷- دھوپ- عمدہ فولاد سے تیار ہوتی ہی- شہر کے شرفا اور معززین باندھتے ہین-

۸- پٹہ- بہت پرانی وضع کی تلوار ہی اب نہین بنائی جاتی شاذونادر نظر آتی ہی-

۹- نیمہ زنخانی- یہ بھی پرانی وضع کی تلوار ہی اب نہین بنائی جاتی-

مذکورۂ بالا ہتیارون کے علاوہ مندرجہ ذیل ہتیار بھی ممالک محروسہ مین تیار ہوتے ہین-

۱۰- جمبیہ- عمدہ تو عربستان مین بنتا ہی لیکن حیدرآباد مین بھی نرمل کے فولاد سے اچھا تیار کیا جاتا ہی اس کی قیمت ؏ سے ؏ تک ہوتی ہی- عرب باندھتے ہین اور اس کو سونے اور چاندی سے مرصع کرتے ہین

۱۱- سکین- ایک قسم کا چاقو ہوتا ہی- اسکا پھل خمدار ہوتا ہی گدوال جگدیوپور حیدرآباد اور چند دیہات مین تیار ہوتا ہی-

۱۲- کٹارہ- اکثر مہدوی پٹھان باندھتے ہین- گدوال اور ممالک محروسہ کی کئی جگہ تیار ہوتی تھی-

۱۳- پیش قبض- اکثر روہیلے باندھتے ہین-

۱۴- بانک- ایک قسم کا خنجر-

۱۵- بچھو-

۱۶- جمدھرا-

۱۷- بلم-

۱۸- خنجر-

۱۹- سنانی-

۲۰- صفدرہ-

۲۱- فردلی

۲۲- سپر-

۲۳- کرچ-

۲۴- آتش گیر- (چقماق) ممالک محروسہ مین ہر جگہ تیار ہوتا ہی عرب رکھتے ہین؛ سلحداری فوج کی تلوارین حیدرآباد کے ورکشاپ مین تیار ہوتی تھین- جب سے ورکشاپ بند ہوا اسوقت سے وہ تلوارین بننا بھی موقوف ہوگئین-

بندوق دراز نالیون کی بندوقین جیسی کہ عربون کے پاس ہین گدوال اور چند دیہات مین بنائی جاتی تھین اب صرف حیدرآباد مین بنتی ہین-

قرابین یعنی چھوٹی بندوق جسکا منہ بڑا ہوتا ہی- اکثر روہیلے رکھتے ہین اس کی دو قسمین ہین- شیر بچہ اور قسمت شکن- گدوال- اور نرمل وغیرہ مین ہوتی تھین-

بارود بارود کا کارخانہ اب صرف حیدرآباد مین بمقام چنداگٹہ ہی- بارود عمدہ نہین ہوتی-

کمربند تلوار لٹکانے کے کمربند حیدرآباد- گدوال- امرچنتہ ورنگل وغیرہ مین نہایت عمدہ بنائے جاتے ہین ان پر زردوزی کا کام کیا جاتا ہی بلکہ بعض امرا موتی- جواہر بھی ٹانکتے ہین- معمولی قیمت ؏ سے ؏ تک ہوتی ہی-

شطرنجیان و قالین | زمانۂ قدیم سے ورنگل کی شطرنجیان مشہور ہین دکن مین اس ایجاد کی حکایت اسطرح بیان کی جاتی ہے کہ مسلمان حملہ آورون کے ساتھ ایک سنی مسلمان شیخ تھا جس نے اس کام کو دکن مین شروع کیا۔

قالین تین قسم کے بنائے جاتے ہین۔ ریشمی، سوتی، اونی۔

شطرنجی قالین مختلف رنگون کے ہوتے ہین۔

۱۸۵۱ء مین انگلستان کی نمایش مین ریشمی قالین دکن سے بھیجے گئے تھے۔ ان کی قیمت ۱۰ پونڈ فی مربعہ گز تھی۔ ریشمی قالینون کی معمولی قیمت ۱۰ روپیہ گز سے ۱۵ تک ہوتی ہے۔ اس وقت گلبرگہ کے محبس مین بھی شطرنجیان اور قالین بنے جاتے ہین

نرمل اور عالم پور مین شطرنجیان بنی جاتی ہین۔

کپڑا | **کمخواب** | کوئی ایسا زمانہ تھا کہ دکن مین اورنگ آباد کا کمخواب مشہور تھا۔ پہلے یہ کثرت سے تیار ہوتا تھا اور نہایت گران بکتا تھا اور بہت پائدار ہوتا تھا۔

[illegible]ء مین ایک ایرانی سفیر شاہ گولکنڈہ سے ملنے کے لیے آیا اور اتفاق سے اسکو چھ سال تک دکن مین رہنا پڑا۔ واپسی کیوقت دکن کی مصنوعات بطور تحفہ لے چلا۔ ان مین ایک کمخواب کا تھان بھی تھا اسکی قیمت اسقدر لگی کہ اس قیمت سے پانچ سال تک کارخانہ کا کام چلتا رہا۔ پیٹھان مین بھی کمخواب بنتا تھا اب ممالک محروسہ مین صرف اورنگ آباد ہی ایک شہر باقی ہے جہان چند کاریگر موجود ہین تھوڑا بہت جو کچھ بناتے ہین حیدرآباد بھیجدیتے ہین۔

کمخواب کے تھان کا عرض ایک گز اور طول تین گز ہوتا ہے معمولی قیمت ۱۰ روپیہ سے ۱۵ روپیہ تک ہوتی ہے اور اعلےٰ درجہ کے کمخواب کے تھان کی قیمت ایک ہزار تک ہوتی ہے۔ مگر یہ فرمائش پر تیار ہوتا ہے مشروع۔ ہمرو، جامہ وار، زربفت، کلابتو، اور ریشمی کپڑے یہ چیزین خاص اورنگ آباد مین تیار ہوتی ہین،

چھینٹ | حیدرآباد اور مچھلی بندر کی چھینٹ ایک زمانہ مین اعلیٰ درجہ کی ہوتی تھی اور اس تمام دنیا مین اسکی تجارت ہوتی تھی۔ یہ چھینٹین نہایت پائدار اور خوشرنگ ہوتی تھین اب اس کام کا بالکل خاتمہ ہوگیا۔

زرین کام کیے ہوئے پارچے رومال اور ریشمی ساڑیان نانڈیڑ و نارائن پیٹھ کی مشہور تھین۔ اب بھی کچھ کام چلتا ہے۔

سندیل، سیلے، تورہ دار ململین نانڈیڑ کی مشہور ہین۔ بہت عمدہ اور پائدار ہوتی ہین۔

سوتی ساڑیان، دھوتیان، کھادی، لنگیان، کمربند، رومال کمل، نمدہ، ٹاٹ ممالک محروسہ مین کئی جگہ مثلاً نانڈیڑ، گدوال، پنجاگری، ورنگل، اندور، گلبرگہ، ملدرگ، سنگاریڈی، عالمپوہ وغیرہ مین تیار ہوتے ہین

جاجم، پردے دسترخوان میدک کے مشہور ہین۔

محبس گلبرگہ مین پردے کے کپڑے، شکاری کپڑے، ڈیرے کے کپڑے بھی تیار ہوتے ہین۔ تلنگانہ کی ململ اور دوسرے سوتی کپڑے زمانۂ دراز سے مشہور ہین۔ مارکو پولو جس نے بارھوین صدی مین ہندوستان کی سیاحت کی ہے ورنگل کی مصنوعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس ریاست مین بکرم نہایت عمدہ بنتا ہے اور جو قیمتی ہوتا ہے وہ بہت صاف اور مہین مثل مکڑی کے جالے کے نظر آتا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ دنیا مین کوئی بادشاہ یا شہزادی ایسی نہین ہے جو اسے پہن کر خوش نہو۔

اس فقرہ پر کرنل یول نے یہ نوٹ لکھا ہے کہ بکرم ایک خاص قسم کے سوتی کپڑے کو کہتے ہین مچھلی پٹن اور اسکے نواحی اضلاع دکن مین ململ اور رنگین چھینٹون کے لیے مشہور تھے۔

رنگ | نیل ہنمکنڈہ، الگندل، اور میدک مین تیار کیا جاتا تھا اب بہت سے اضلاع مین قدیم طریقہ نیل بنانے کا موقوف ہوگیا ہے نئے طریقہ سے بناتے ہین، صرف کھمم مین قدیم طریقہ پر نیل بنتا ہے۔ اسوقت وہان (۲۰) کارخانے نیل کے ہین لیکن وہ بہت چھوٹے چھوٹے

جمع کیے جاتے ہیں۔ اس لیے عمدہ نہیں بنتا۔ تانا رنگنے کے لیے چند قسم کے رنگ مثلاً نارنجی گل انار وغیرہ کسم کے پھول تنگ کی لکڑی اور جنگلی لکڑیوں سے تیار کیے جاتے تھے جو اس قدر پائدار ہوتے تھے کہ جس قدر اسکے رنگے ہوئے کپڑے دھوئے جاتے تھے اُتنے ہی خوشرنگ اور چمکدار نکلتے تھے۔ اب انگریزی پاؤڈر کے رنگوں نے ان قدیم رنگوں کا خاتمہ کردیا ہے لیکن پرانے وقتوں کی جاجمین شطرنجیاں اور چھینٹین وغیرہ جن مین وہ رنگ سو برس پہلے کا ابتک دیکھا جاتا ہے اُس زمانہ کی یادتازہ کرتی ہین۔

تیل | تل کوڑ۔ السی۔ کاریلا۔ ارنڈی وغیرہ کا تیل کولہون کے ذریعہ سے حیدرآباد اور ممالک محروسہ کے تقریباً ہر ضلع کے ہر بڑے گاؤن مین تیار ہوتا ہے نئے طریقہ پر یعنی بذریعہ مل کے تیل نکالنے کے کارخانے اکثر جگہ مثل اورنگ آباد و حیدرآباد و فرخ نگر وغیرہ مین چند سال سے قائم ہوے ہین۔

عطر | ہر قسم کا عطر خس، روح، حنا، جنبیلی، صندل، اورنگ آباد و حیدرآباد مین تیار ہوتا ہے مگر لکھنؤ و قنوج کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ البتہ کیوڑا یہان کا ہر جگہ سے بہتر ہوتا ہے اور دہلی لکھنؤ قنوج کو یہان سے بھیجا جاتا ہے۔

چرمی کام | حیدرآباد اور ممالک محروسہ سرکار عالی مین چمار ہر جگہ جوتے۔ ہارنس۔ زین بندوق کے غلاف وغیرہ تیار کرتے ہین۔ اورنگ آباد و ناندیڑ کے جوتے مشہور ہین۔ بہت ہی ملایم ہوتے ہین۔ بیڑ اور ناندیڑ کی چھاگلین مشہور ہین۔ حیدرآباد و سکندرآباد اورنگ آباد وغیرہ مین بوٹ شوز وغیرہ کے کارخانے بھی ہین مگر کوئی کام قابل تعریف نہین ہوتا۔

سونے کا کام | حیدرآباد اور ممالک محروسہ کے ہر ایک گاؤن مین سنار موجود ہین اور ہر قسم کے زیورات مثل پازیب توڑہ۔ چھلے۔ جھمکے کرن پھول۔ چاند بالیان وغیرہ تیار کرتے ہین۔

چاندی کا کام | چاندی کا کام بھی ہر جگہ ہوتا ہے لیکن ایلگندل اورنگ آباد حیدرآباد کی تھالیان عطردان پاندان وغیرہ مشہور ہین۔ اورنگ آباد کا سوزن کاری کا کام مشہور ہے اور نہایت نفیس ہوتا ہے چاندی کے تار کا کام کریم نگر مین بھی اچھا ہوتا ہے۔

پیتل اور تانبے کا کام | پیتل اور تانبے کے گھڑے۔ تھالیان لوٹے رکابیان۔ کٹورے۔ دیگچیان۔ دیگین وغیرہ ہر جگہ تیار ہوتی ہین۔

لوہے کا کام | ممالک محروسہ کے ہر ایک تعلقہ مین لوہار موجود ہین۔ مگر کوئی عمدہ کام نہین کرتے موٹے موٹے کام کرتے ہین۔ اپنی ضرورتون کو بقدر ضرورت پورا کرلیتے ہین۔ حیدرآباد مین چند سال سے بیرن یا قوت پلوہ ایک آہنی کارخانہ قائم ہوا ہے۔ مگر کام سستی سے چلتا ہے۔

شراب | ممالک محروسہ مین مہوہ کی شراب ہر جگہ کثرت سے بنتی ہے

گڑاکو | گڑاکو بھی ہر جگہ بنایا جاتا ہے تمباکو اور گڑ ملاکر بناتے ہین۔

بھنگ | بھنگ بھی ہر جگہ بنائی جاتی ہے گانجہ کو پیکر اُبالتے ہین پھر اس مین گھی اور شکر ملاتے ہین۔

گڑ شکر | گنے کی پیداوار ممالک محروسہ مین کثرت سے ہوتی ہے اور بہ نسبت حصہ تلنگانہ کے مرہٹواڑی کے حصہ مین زیادہ ہوتی ہے اس لیے ہر جگہ گڑ اور شکر تیار کی جاتی ہے۔ بیدر کی شکر شوالی اور راب زیادہ مشہور تھا حیدرآباد مین حسین شاہ ولی کی درگاہ کے قریب شکر بنتی ہے۔ درگاہ کی شکر کے نام سے مشہور ہے۔ دکن کی شکر صاف نہین ہوتی گو میٹھی زیادہ ہوتی ہے۔

نمک | ممالک محروسہ مین خصوصاً اورنگ آباد وغیرہ مین نمک بنایا جاتا ہے کئی سال سے سرکار انگریزی نے موقوف کردیا اب صرف ضلع لنگسور مین نمک کی کان ہے وہ بھی کڑوا ہونے کی وجہ سے کھانے کے قابل نہین ہوتا چمڑوان کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

شورہ | ممالک محروسہ مین کئی جگہ شورہ تیار کیا جاتا ہے۔

کاغذ | چند قسم کے دیسی کاغذ انمور، میدک، حیدرآباد، گلبرگہ وغیرہ مین تیار کیے جاتے ہین۔ ان سب مین عمدہ کاغذ کاغذپورہ (دولت آباد کے قریب) ہوتا ہے۔

لکڑی کا کام اندور، اورنگ آباد، ایلگندل، گلبرگہ، کھم میں ہر قسم کی لکڑی کا کام ہوتا ہے۔ صندل کے صندوق، قلمدان، عطردان کھم اور اورنگ آباد میں عمدہ بنتے ہیں۔

پلنگ کے پائے بیگن پلی میں نہایت عمدہ رنگ کے خوشنما لاجوردی رنگ کے تیار کئے جاتے ہیں۔

کانچ کا کام جالنہ، بکبردان وغیرہ میں کانچ کی بوتلیں اور گلاس وغیرہ تیار ہوتے ہیں پہلے کام خوب چلتا تھا۔ اب بھی کاریگر موجود ہیں لیکن کام بہت سستی سے چلتا ہے ترقی کی امید نہیں۔

مٹی کے برتن ممالک محروسہ سرکار عالی میں ہر قسم کے مٹی کے برتن مثل تھالی، لوٹہ، صراحی، آبخورہ، چلم وغیرہ تیار ہوتے ہیں۔ بھونگیر کے برتن زیادہ مشہور ہیں۔ رنگین چلمیں رائچور میں عمدہ بنتی ہیں۔ بچوں کے کھلونے مثل سانپ، بچھو، کتا، بلی، تیتر، بٹیر وغیرہ اور پھل جیسے آم، شریفہ، بادام، پپیتہ وغیرہ جالنہ، اورنگ آباد، اندور میں عمدہ اور خوش رنگ بنائے جاتے ہیں۔

ناظرین! آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ دکن کن کن صنعتوں کے لحاظ سے مشہور ہے۔ ان صنعتوں کے فروغ کا زمانہ کب تھا۔ اب کونسی صنعتیں دکن میں موجود ہیں اور کہاں کہاں ہیں اور کس حالت میں ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جو انکے زوال کا باعث ہوئے۔

مورخوں نے مصنوعات دکن کے زوال کے کئی ایک اسباب لکھے ہیں۔

(۱) اورنگ زیب کی خونخوار لڑائیاں شاہان دکن کے ساتھ۔

(۲) مسلمانوں کی سلطنت برباد ہونے کی وجہ سے جس طرح ہندوستان کی مصنوعات کا زوال ہوا اسی طرح دکن کی مصنوعات کا بھی ہوا۔

(۳) ملک میں مانگ کم ہو گئی۔ وجہ اسکی یہ ہوئی کہ یورپ سے اشیاء کثرت سے آنے لگیں اور نہایت ارزاں فروخت ہونا شروع ہوئیں عام طور پر لوگ ان کو استعمال کرنے لگے۔

اب کیا تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں جن سے ان کو پھر فروغ ہو۔

یہ ایک نہایت اہم مسئلہ ہے۔ بڑے بڑے اہل الرائے اپنا اپنا زور صرف کر چکے ہیں مگر نتیجہ کچھ نہ ہوا۔

باشندگان ہندوستان و انگلستان کی توجہ مصنوعات دکن پر منعطف کرنے کے لئے گورنمنٹ نظام خلد اللہ ملکہ نے بہت کوششیں کیں۔ چنانچہ ۱۸۵۱ء میں ورنگل کی مشہور شطرنجیاں و قالین نمایش گاہ انگلستان میں روانہ کئے گئے اسکے بعد نومبر ۱۸۵۶ء میں سر سالار جنگ اول مرحوم نے حیدرآباد بمقام چادر گھاٹ ایک نمائش گاہ قائم کی جہاں ممالک محروسہ سرکار نظام کی ہر ایک چیز جمع کی گئی لیکن نتیجہ خاطر خواہ نہ ہو سکا۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت سے اب تک سرکار نظام تمام نمائشوں میں خواہ ہند میں ہوں یا یورپ میں برابر حصہ لیتی رہی ہے لیکن سوائے زوال کے ترقی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اس کی وجہ کیا ہے۔

اس کی وجہ سوائے اس کے اور کوئی نہیں ہے کہ ہمارا تمدن درست نہیں ہے۔

جب تک ہم خود اپنے تمدن کو درست نہ کریں اس وقت تک کچھ نہیں ہو سکتا۔

سرکار ہمارے تمدن کو درست نہیں کر سکتی۔ اس کا یہ کام نہیں ہے کہ ہمارے خانگی انتظامات کی طرف متوجہ ہو اور ہم سے آکر بدتمیزی دور کرے سرکار کا یہ احسان کیا کم ہے کہ اس نے ہم کو حالت امن میں رکھا ہے اور ہماری تعلیم و تربیت میں لاکھوں روپیہ صرف کرتی ہے اپنے فیض تربیت سے ہم کو اس قابل بنایا ہے کہ ہم تمدن کے معنی سمجھیں اور اپنی حالت کو درست کریں یا یوں کہو کہ سرکار نے ہمارے ہاتھ میں ایک شفاف آئینہ دیا ہے اور ہمیں چاہئے کہ اس میں اپنی صورت دیکھ کر اپنے چہرے کے عیوب سے واقف ہوں اور ان کے ازالہ کی فکر کریں۔

ملک کا دولتمند ہونا اس پر موقوف نہین ہی کہ غیر ملکون سے روپیہ یا چاندی یا سونا اس مین لایا جائے بلکہ اسپر موقوف ہی کہ غیر ملکون سے وہ اشیاء معیشت لائی جائین جن کے پیدا کرنے کی انھین ملکون کو خصوصیت حاصل ہو اور اسکے عوض مین وہ چیزین بھجوائی جائین جن کو ہمارے ملک مین پیدا ہونے کی خصوصیت حاصل ہی۔

ہمین اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ ہماری ضرورت و آرام کی اشیا ہمارے ملک مین ارزانی کے ساتھ تیار ہونے لگین۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہی کہ اشیاء معیشت کو آسان و ارزان کرنے کی کیا تدبیر ہی۔

اس مسئلہ کا جاننا چند باتون کے جاننے پر موقوف ہی

محنت اور راس المال دولت پیدا کرنے کے لیے لازمی ہی۔

جو چیزین کہ محنت کرنے کی قابلیت کو زیادہ کرتی ہین وہ علم و ہنر ہین۔

تقسیم محنت سے پیدائش کی کسقدر آسانی ہوتی ہی۔

تقسیم راس المال یعنی کمپنی کے قائم کرنے سے کیا حاصل ہی۔

مختصر یہ کہ جب تک ہم اپنی بے خبری کو اپنے سے دور نہ کرین اور ان طریقون کو جو ملکی ترقی مین زیادہ موثر ہین اپنا نصب العین نہ بنائین اسوقت تک ممکن نہین کہ ہمارا ملک ترقی کر سکے۔ ہمین اپنے ملک کو دوسرے ملکون سے بے نیاز کرنے کے لیے ضروری ہی کہ ہم ان اصولون کی پیروی کرین۔ جو ہم کو غافل سے باخبر۔ کاہل سے چست۔ مفلس سے دولتمند بنا سکتی ہین۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے ملک جاپان سے سبق سیکھین تو روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے حوائج اپنے ملک مین تیار کر سکتے ہین۔

اے ملکی بھائیو! ذرا غفلت سے بیدار ہو۔ بے خبری کو اپنے سے دور کرو آنکھین کھولکر دنیا مین دیکھو کہ کیا ہو رہا ہی۔ ملک اور رعیت کیا چیز ہی ملک کی ترقی و تنزل کے کیا اسباب ہین؟ اور اس کا بھلا یا برا اثر ہم پر کیونکر پہنچتا ہی؟ اب ہم کو کونسی تدبیرین اختیار کرنی چاہئیین؟ جبتک ہم اپنے ملک کی حالت پر سطحی نظر نہ ڈالین گے اور اسکی اصلاح مین اپنی عزت و دولت و جان کو رہن نہ رکھین گے اسوقت تک ممکن نہین کہ ہمارا ملک ترقی کر سکے۔

اب مین اس مضمون کو بخوف طوالت ختم کرتا ہون فقط

حافظ سید ابراہیم (حیدرآبادی)

فہرست مضامین

نثر

نظم

فہرست مضامین

نثر

صفحہ

صفحہ

نظم

فہرست مضامین جلد سوم

نثر

نظم

فہرست مضامین جلد چہارم

نثر

نظم

فہرست تصاویر

فہرست مضامین جلد پنجم

نثر

نظم

فہرست تصاویر

فہرست مضامین جلد ششم

نثر

نظم

فہرست تصاویر

فہرست مضامین جلد ہفتم (۷)

(نثر)

(نظم)

KHUDA BAKHSH LIBRARY

JOURNAL

13-14-15

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
Patna